فنون

مجلّہ

مدیر

احمد ندیم قاسمی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۵۷۹
ٹیلیفون نمبر ۶۹۵۸۰

مجلّہ فنون لاہور

سالنامہ (جلد اوّل) ۸۰-۱۹۸۱ء

مدیر:

احمد ندیم قاسمی

تزئین: موجد

شمارہ : ۱۵
جنوری، فروری ۱۹۸۱ء

مقامِ اشاعت : ۴ - میکلوڈ روڈ، لاہور

مندرجات

حرفِ اوّل	ندیم ،	۸
حمد و نعت		
نغمۂ محمدیؐ	گوئٹے ـــ شان الحق حقی ،	۱۱
نعت	سلیم گیلانی ،	۱۲
نعت	سلیم گیلانی ،	۱۲
بسم اللہ	جلیل عالی ،	۱۳
پندرھویں صدی ہجری کے پہلے دن کی نظم	ناہید قاسمی - ،	۱۴
مہک	ناہید قاسمی ،	۱۴
سچ	ناہید قاسمی ،	۱۴
کیمیاگر	ناہید قاسمی ،	۱۴
اسمِ اعظم	حنیف اسعدی ،	۱۵
نعت	ریاض حسین چودھری ،	۱۶
رفتگان		
بیادِ اطہر نفیس		
اطہر نفیس کی آخری غزل	عطیہ : ساقی فاروقی ،	۱۷
دو غزلیں	اطہر نفیس	۱۸
سید سلیم احمد کو ایک رپورٹ	اسد محمد خاں ،	۱۹
موت ہمارے درمیان کب نہیں تھی	اسد محمد خاں ،	۱۹
دریا کے دونوں کناروں سے ایک دعا	اسد محمد خاں ،	۲۰
اطہر قریۂ غزل	محشر بدایونی ،	۲۱
اطہر نفیس کے لیے ایک نظم	امجد اسلام امجد ،	۲۲
اطہر نفیس کے لیے ایک غزل	نجیب احمد ،	۲۳
اطہر نفیس کی یاد میں	احمد ندیم قاسمی ،	۲۴
بیادِ ساحر لدھیانوی		
فاتح شاعر، تنہا آدمی	قتیل شفائی ،	۲۵
	طاف قریشی ،	۲۸
بین ال	احمد ،	۲۹
روزنِ در		
جدید فکشن کے تخلیقی اور تنقیدی رویّے	فتح محمد ملک ،	
گوشۂ شیرانی		
پنجاب میں اُردو ـــ ایک تبصرے پر تبصرہ	حافظ محمود شیرانی ،	۳۴
حافظ محمود شیرانی کے نام چند خطوط	سید حسن امام، نجیب اشرف ندوی، مولوی محمد شفیع ، غلام ربانی عزیز اور دیگر حضرات ،	۳۹
میرے باباجان	پروین اختر شیرانی - ،	۴۶
مقالات		
کلامِ خوشحال میں شعرِ عرب کی جھلک	ڈاکٹر سید عبداللہ ،	۶۳
اکبر ـــ بطور موضوعِ سخن	خواجہ منظور حسین ،	۶۸
غالب کی شاعری کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر آفتاب احمد ،	۹۰
روایت اور جدیدیت	محمد علی صدیقی ،	۹۷
تخلیق، تخلیقی عمل اور وجدان	ڈاکٹر سلیم اختر ،	۱۰۳
کیا انشائیہ ایک سنجیدہ صنفِ سخن ہے؟	مشکور حسین یاد ،	۱۱۳
غالب ـــ ہمارا معاصر	سعادت سعید ،	۱۱۶
صداقتوں کی سفیر ـــ "پیاسی چڑیا"	منصورہ احمد ،	۱۲۶
بحث		
عام فکری مغالطے	سید علی عباس جلالپوری ،	۱۳۳
عام فکری مغالطے - (ایک تجزیہ) ۲	محمد ارشاد ،	۱۵۱
تحقیق		
غنی کاشمیری	محمد عبداللہ قریشی ،	۱۶۳
کجدار و مریز	عبدالعزیز خالد ،	۱۸۸

غزلیں

ظہور نظر ،	۲۲۶	ظہور نظر ،	۲۲۷
ضیا جالندھری ،	۲۲۷	سلیم احمد ،	۲۲۸
سلیم احمد ،	۲۲۸	قتیل شفائی ،	۲۲۹
قتیل شفائی ،	۲۳۰	قتیل شفائی ،	۲۳۰
قتیل شفائی ،	۲۳۱	قتیل شفائی ،	۲۳۱
محشر بدایونی ،	۲۳۲	حسن عابدی ،	۲۳۲
حسن عابدی ،	۲۳۳	حسن عابدی ،	۲۳۳
فارغ بخاری ،	۲۳۴	فارغ بخاری ،	۲۳۴
احمد ظفر ،	۲۳۵	احمد ظفر ،	۲۳۵
جمیل ملک ،	۲۳۶	جمیل ملک ،	۲۳۶
منظور عارف ،	۲۳۷	منظور عارف ،	۲۳۷
شان الحق حقی ،	۲۳۸	شان الحق حقی ،	۲۳۸
رضا ہمدانی ،	۲۳۹	صہبا اختر ،	۲۳۹
گوہر ہوشیارپوری ،	۲۴۰	گوہر ہوشیارپوری ،	۲۴۰
گوہر ہوشیارپوری ،	۲۴۱	گوہر ہوشیارپوری ،	۲۴۱
احمد شمیم ،	۲۴۲	احمد شمیم ،	۲۴۲
	۲۴۳	شہزاد احمد ،	۲۴۳
	۲۴۴	مسعود قریشی ،	۲۴۴
رضی اختر شوق ،	۲۴۵	رضی اختر شوق ،	۲۴۵
محسن احسان ،	۲۴۶	محسن احسان ،	۲۴۶
محسن احسان ،	۲۴۷	محسن احسان ،	۲۴۷
خورشید رضوی ،	۲۴۸	خورشید رضوی ،	۲۴۸
انور مسعود ،	۲۴۹	انور مسعود ،	۲۴۹
حزیں لدھیانوی ،	۲۵۰	حزیں لدھیانوی ،	۲۵۰

سحرانصاری ،	۲۵۱	سحرانصاری ،	۲۵۱
عالمتاب تشنہ ،	۲۵۲	عالمتاب تشنہ ،	۲۵۲
صمد انصاری ،	۲۵۳	صمد انصاری ،	۲۵۳
رشید قیصرانی ،	۲۵۴	رشید قیصرانی ،	۲۵۴
اختر امام رضوی ،	۲۵۵	اختر امام رضوی ،	۲۵۵
اختر امام رضوی ،	۲۵۶	خاقان خاور ،	۲۵۶
خاقان خاور ،	۲۵۷	خاقان خاور ،	۲۵۷
اقبال کوثر ،	۲۵۸	اقبال کوثر ،	۲۵۸
خلیل رامپوری ،	۲۵۹	خلیل رامپوری ،	۲۵۹
لیث قریشی ،	۲۶۰	لیث قریشی ،	۲۶۰
لیث قریشی ،	۲۶۱	ظفر ابن متین ،	۲۶۱
ظفر ابن متین ،	۲۶۲	حلیم قریشی ،	۲۶۲
حلیم قریشی ،	۲۶۳	آصف ثاقب ،	۲۶۴
آصف ثاقب ،	۲۶۴	صوفی عبدالرشید ،	۲۶۵
صوفی عبدالرشید ،	۲۶۵	احسان اکبر ،	۲۶۶
احسان اکبر ،	۲۶۶	محسن نقوی ،	۲۶۷
محسن نقوی ،	۲۶۷	نکہت بریلوی ،	۲۶۸
نکہت بریلوی ،	۲۶۸	کاوش بٹ ،	۲۶۹
کاوش بٹ ،	۲۶۹	ممتاز جاوید ،	۲۷۰
ممتاز جاوید ،	۲۷۰	رُوحی کنجاہی ،	۲۷۱
رُوحی کنجاہی ،	۲۷۱	رشک خلیلی ،	۲۷۲
رشک خلیلی ،	۲۷۲	خاور رضوی ،	۲۷۳
خاور رضوی ،	۲۷۳	امداد ہمدانی ،	۲۷۴
امداد ہمدانی ،	۲۷۴	بشیر اسیر زیدی ،	۲۷۵
یلین قدرت ،	۲۷۵	اکبر حمیدی ،	۲۷۶
اکبر حمیدی ،	۲۷۶	دل نواز دل ،	۲۷۷
دل نواز دل ،	۲۷۷	پروین اختر شیرانی ،	۲۷۸
پروین اختر شیرانی ،	۲۷۸	یوسف علی لائق ،	۲۷۹
یوسف علی لائق ،	۲۷۹	احمد ندیم قاسمی ،	۲۸۰

احمد ندیم قاسمی ، ۲۸۰

افسانے

سندرتا کا راکشس	ممتاز مفتی ،	۲۸۱
پرہیا	سجاد حیدر ،	۲۹۰
سکائی لیب	اختر جمال ،	۲۹۳
پابند	بانو قدسیہ ،	۲۹۸
سفر نامہ	مسعود اشعر ،	[illegible]
آنکھ کھلی تو —	اکرام اللہ ،	۳۱۵
الاؤ	خالدہ حسین ،	۳۱۹
گھیراؤ	انور سجاد ،	۳۲۳
تماشا	محمد منشا یاد ،	۳۲۷
پنجرے میں پالی ہوئی بات	منظر الاسلام ،	۳۳۳
گھر	اسد محمد خان	۳۳۶
افسانہ	ضیا بٹ	۳۳۹
چارہ گروں کا معجزہ	منصور قیصر ،	۳۴۱
تیس پارے	مسرت لغاری ،	۳۴۶
نقشہ	علی تنہا ،	۳۴۹
کالج کا شہر	احمد جاوید ،	۳۵۴
راؤنڈ دی کلاک	محمود احمد قاضی ،	۳۵۶
چاندنی	شفقت ضیاء ،	۳۵۸
بروکن ہوم	خورشید احمد ملی ،	۳۶۱
روم میٹ	محمد عبدالحی ،	۳۶۷

تراجم

ایلس — عجائبستان میں	لیوس کیرل / محمد خالد اختر	۳۷۳
راون	چندن نیگی / شریف کنجاہی	۳۸۱

ایک ناول کا باب

انقلاب فرانس سے پہلے	ڈاکٹر آغا افتخار حسین ،	۳۸۳

پاکستان کا لوک ورثہ

ہیررنگ کوند	روبینہ قزلباش ،	۳۹۲

نظمیں

آج کے دن کو زندہ رکھنا	ظہور نظر ،	۴۰۹
پھر بہار آئی	اختر حسین جعفری ،	۴۱۰
شکستہ ساعتوں کے معمار	اختر حسین جعفری ،	۴۱۱
آئینہ خانہ — ا	اختر حسین جعفری ،	۴۱۲
آئینہ خانہ — ب	اختر حسین جعفری ،	۴۱۲
نوحہ گروں کا نوحہ	ساقی فاروقی ،	۴۱۳
یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں	قتیل شفائی ،	۴۱۴
جہانگیر عادل	قتیل شفائی ،	۴۱۵
اجنبیت کا ذائقہ	فارغ بخاری ،	۴۱۶
پیاسے ہاتھ	فارغ بخاری ،	۴۱۶
کوہ قاف	احمد ظفر ،	۴۱۷
شجر ممنوع کے مسافر	احمد ظفر ،	۴۱۷
نوری کا جنم	جلیل حشمی ،	۴۱۸
بند دروازے میں کرن کی درز	آفتاب اقبال شمیم ،	۴۱۹
میں کیا کرتا	آفتاب اقبال شمیم ،	۴۱۹
میرنا بلس	آفتاب اقبال شمیم ،	۴۲۰
نیم اجنبیت کے پل پر ایک شام	آفتاب اقبال شمیم ،	۴۲۰
[illegible]	ادیب سہیل ،	۴۲۱
قصر ہوا کا فرد	ادیب سہیل ،	۴۲۲
چاند کا مسافر	ادیب سہیل ،	۴۲۲
بود و نبود	سحر انصاری ،	۴۲۳
پنٹونولی	ایوب صابر ،	۴۲۵
بصارت اور آگہی	پروین فنا سید ،	۴۲۷
تجدید عہد وفا	پروین فنا سید ،	۴۲۷
روپہلے سوار اور چمکیلی ٹاپ	خالد احمد ،	۴۲۸

بائیکو — اتا ۲ — خالد احمد ، ۴۲۹
جانگ کہانی — سرمد صہبائی ، ۴۳۰
خوشحال خاں خٹک کے لیے ایک نظم — امجد اسلام امجد ، ۴۳۲
تاریخ — امجد اسلام امجد ، ۴۳۳
ایک نظم — حسن ناصر ، ۴۳۳
سلوموشن — حسن ناصر ، ۴۳۴
سردی کی برکھا — اقبال کوثر ، ۴۳۵
آہ روزِ آفتاب — اقبال کوثر ، ۴۳۵
ناتمام — حلیم قریشی ، ۴۳۶
ایک نظم — حلیم قریشی ، ۴۳۶
یہ لوگ — حلیم قریشی ، ۴۳۷
امتحان — حلیم قریشی ، ۴۳۷
وہ زندہ لفظ خوشبو ہیں — احسان اکبر ، ۴۳۸
کائنات کے خالق — پروین شاکر ، ۴۳۹
میرا لال — پروین شاکر ، ۴۳۹
اب زمیں لپیٹ دو — نثار ناسک ، ۴۴۰
یرغمال — سجاد بابر ، ۴۴۱
بانجھ بہار — سجاد بابر ، ۴۴۱
ایک دُعا — جلیل عالی ، ۴۴۲
پسند کا محاذ — جلیل عالی ، ۴۴۲
زرد پتے کی سوچ — جلیل عالی ، ۴۴۲
ڈرانے والی بشارت — غلام محمد قاصر ، ۴۴۳
وہی روز و شب — غلام محمد قاصر ، ۴۴۳
بدن کی خزاں — حسن اختر جلیل ، ۴۴۴
یہ ایک لمحہ کہ جو اَبد ہے — تاثیر وجدان ، ۴۴۴
عراق ایران جنگ کے پس منظر میں پانچ نظمیں — شورش ملک ، ۴۴۵
تمہارے لیے ایک نظم — عطاء الحق قاسمی ، ۴۴۷
تعاقب — ناہید قاسمی ، ۴۴۸
قطرہ قطرہ دریا — ناہید قاسمی ، ۴۴۸
اے ہوا — ناہید قاسمی ، ۴۴۸
تحفہ — صفدر سلیم سیال ، ۴۴۹
امرسمے کی خواہش — اعتبار ساجد ، ۴۴۹
اسیر لوگو — عشرت آفریں ، ۴۵۰
گھاؤ — عشرت آفریں ، ۴۵۰
ریسٹ ہاؤس — عشرت آفریں ، ۴۵۱
زہر — عشرت آفریں ، ۴۵۱
ورائے بدن — منصورہ احمد ، ۴۵۲
نارسا — منصورہ احمد ، ۴۵۲
ایسا کیوں ہے — منصورہ احمد ، ۴۵۳
عذابِ شعور — منصورہ احمد ، ۴۵۴
میں موسم کے معنی نہیں جانتی — شاہین مفتی ، ۴۵۵
تیسری آنکھ — حسن عباس رضا ، ۴۵۶
نئے نینوا کا المیہ — حسن عباس رضا ، ۴۵۶
اجنبی بستیوں کا فسوں — انور زاہدی ، ۴۵۷
شکستِ خواب — قمر جاوید ، ۴۵۸
گلاب کونپلیں — قمر جاوید ، ۴۵۸
چودھویں صدی کی آخری نظم — افتخار بخاری ، ۴۵۹
دُعا — کرن بابر ، ۴۵۹
بدستور — احمد ندیم قاسمی ، ۴۶۰
زندگی کے لیے ایک نظم — احمد ندیم قاسمی ، ۴۶۱
ڈر — احمد ندیم قاسمی ، ۴۶۲

غیر مُلکی نظموں کے تراجم

محمود درویش کی تین نظمیں — محمد کاظم ، ۴۶۳
بیٹے کی موت — جان سلکن — ساقی فاروقی
شہرزاد — جیسیکا ڈسٹے — ساقی فاروقی
آٹھ ہندی نظمیں — سرویشور دیال سکسینہ — اسد محمد خاں
اپنی بٹیا کیلئے دو کو بتائیں — سرویشور دیال سکسینہ — اسد محمد خاں
پولینڈ کی چار نظمیں — تادیوش روزے وِیچ — اسد محمد خاں
خدا کو بتاؤ — اکوتھو جینڈو — امجد اسلام امجد
اپنی زمین کے گیت گاؤ — انی سیبو سلویرا — امجد اسلام امجد
آؤ اپنے ہونے پر فخر کریں — پروڈینیکو — امجد اسلام امجد
تمہارے قریب — ڈیوپ — امجد اسلام امجد ، ۴۷۵

سفرنامے

مغربی جرمنی میں ایک برس — (۱۴) محمد کاظم ، ۴۷۶
خانہ بدوش — (باہر رات ہے) مستنصر حسین تارڑ ، ۴۹۰
مسافتیں — عطاء الحق قاسمی ، ۵۱۴

طنز و مزاح

ہونے والا بادشاہ — محمد خالد اختر ، ۵۱۸

انشائیہ

فتح و شکست — مشکور حسین یاد ، ۵۲۳

غزلیں

انور شعور ، ۵۲۶ — انور شعور ، ۵۲۶
انور شعور ، ۵۲۷ — انور شعور ، ۵۲۷
کشور ناہید ، ۵۲۸ — کشور ناہید ، ۵۲۸
ثروت حسین ، ۵۲۹ — ثروت حسین ، ۵۲۹
پروین شاکر ، ۵۳۱ — پروین شاکر ، ۵۳۱
پروین شاکر ، ۵۳۲ — پروین شاکر ، ۵۳۲
خالد احمد ، ۵۳۳ — خالد احمد ، ۵۳۴
خالد احمد ، ۵۳۴ — خالد احمد ، ۵۳۵
خالد احمد ، ۵۳۵ — سجاد بابر ، ۵۳۶
سجاد بابر ، ۵۳۶ — سجاد بابر ، ۵۳۷
امجد اسلام امجد ، ۵۳۷ — امجد اسلام امجد ، ۵۳۸
امجد اسلام امجد ، ۵۳۸ — عطاء الحق قاسمی ، ۵۳۹
عطاء الحق قاسمی ، ۵۳۹ — عطاء الحق قاسمی ، ۵۴۰
عطاء الحق قاسمی ، ۵۴۰ — عطاء الحق قاسمی ، ۵۴۱

عطاءالحق قاسمی ،	۵۴۱	عطاءالحق قاسمی ،	۵۴۲
عطاءالحق قاسمی ،	۵۴۲	تنویر سپرا ،	۵۴۳
تنویر سپرا ،	۵۴۳	نجیب احمد ،	۵۴۴
نجیب احمد ،	۵۴۴	ستار سید ،	۵۴۵
ستار سید ،	۵۴۵	غلام محمد قاصر ،	۵۴۶
غلام محمد قاصر ،	۵۴۶	عدیم ہاشمی ،	۵۴۷
عدیم ہاشمی ،	۵۴۷	فیصل عجمی ،	۵۴۸
فیصل عجمی ،	۵۴۸	حسن ناصر ،	۵۴۹
حسن ناصر ،	۵۴۹	یوسف حسن ،	۵۵۰
یوسف حسن ،	۵۵۰	یوسف حسن ،	۵۵۱
یوسف حسن ،	۵۵۱	جلیل عالی ،	۵۵۲
جلیل عالی ،	۵۵۲	خالد شیرازی ،	۵۵۳
اظہر عنایتی ،	۵۵۳	شفیق سلیمی ،	۵۵۴
شفیق سلیمی ،	۵۵۴	نثار ناسک ،	۵۵۵
نثار ناسک ،	۵۵۵	نثار ناسک ،	۵۵۶
نثار ناسک ،	۵۵۶	غلام حسین ساجد ،	۵۵۷
غلام حسین ساجد ،	۵۵۷	صفدر سلیم سیال ،	۵۵۸
صفدر سلیم سیال ،	۵۵۸	صفدر سلیم سیال ،	۵۵۹
صفدر سلیم سیال ،	۵۵۹	محمد اجمل نیازی ،	۵۶۰
محمد اجمل نیازی ،	۵۶۰	عشرت آفریں ،	۵۶۱
عشرت آفریں ،	۵۶۱	صابر ظفر ،	۵۶۲
صابر ظفر ،	۵۶۲	شہناز پروین سحر ،	۵۶۳
شہناز پروین سحر ،	۵۶۳	شہزاد قمر ،	۵۶۴
شہزاد قمر ،	۵۶۴	شہزاد قمر ،	۵۶۵
شہزاد قمر ،	۵۶۵	شہزاد قمر ،	۵۶۶
شہزاد قمر ،	۵۶۶	قائم نقوی ،	۵۶۷
قائم نقوی ،	۵۶۷	محسن الشیخ ،	۵۶۸
محسن الشیخ ،	۵۶۸	جمال احسانی ،	۵۶۹
جمال احسانی ،	۵۶۹	سلیم کوثر ،	۵۷۰
سلیم کوثر ،	۵۷۰	سلیم طاہر ،	۵۷۱
سلیم طاہر ،	۵۷۱	ایوب خاور ،	۵۷۲
ایوب خاور ،	۵۷۲	حسن رضوی ،	۵۷۳
حسن رضوی ،	۵۷۳	علی اکبر عباس ،	۵۷۴
علی اکبر عباس ،	۵۷۴	راشد مراد ،	۵۷۵
راشد مراد ،	۵۷۵	ساجد امجد ،	۵۷۶
ساجد امجد ،	۵۷۶	اعتبار ساجد ،	۵۷۷
اعتبار ساجد ،	۵۷۷	زمان کنجاہی ،	۵۷۸
زمان کنجاہی ،	۵۷۸	حسن عباس رضا ،	۵۷۹
حسن عباس رضا ،	۵۷۹	انعام الحق جاوید ،	۵۸۰
انعام الحق جاوید ،	۵۸۰	شجاعت علی راہی ،	۵۸۱
شجاعت علی راہی ،	۵۸۱	شجاعت علی راہی ،	۵۸۱
خالد اقبال یاسر ،	۵۸۲	یوسف جبلی ،	۵۸۲
منصورہ احمد ،	۵۸۳	منصورہ احمد ،	۵۸۳
زاہد فخری ،	۵۸۴	زاہد فخری ،	۵۸۴
خرم خلیق ،	۵۸۵	خرم خلیق ،	۵۸۵
جاوید احساس ،	۵۸۶	جاوید احساس ،	۵۸۶
راشد متین ،	۵۸۷	عارف محمود ،	۵۸۷
مقبول عامر ،	۵۸۸	مقبول عامر ،	۵۸۸
محمد افضل ،	۵۸۹	نورین طلعت ،	۵۸۹
فیروز شاہ ،	۵۹۰	فیروز شاہ ،	۵۹۰
قمر جاوید ،	۵۹۱	محمد الیاس چیمہ ،	۵۹۱

اختلافات

مشکور حسین یاد، ڈاکٹر سلیم اختر، امتیاز علی خاں، منصورہ احمد، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، احمدی بیگم، حفیظ احسن، مسرت ہاشمی، یوسف حسن، ایوب خاور، اظہر عنایتی، جابر علی سید، آصف ثاقب ، ۵۹۲

تبصرے

آخر شب (محمد صفدر میر)	فتح محمد ملک ،	۶۱۲
چھ رنگین دروازے (منیر نیازی)	فتح محمد ملک ،	۶۱۴
مثبت نتائج (زاہد ملک)	کرنل محمد خان ،	۶۱۷
شام کا پہلا تارا (زہرا نگاہ)	ساقی فاروقی ،	۶۱۹
سورج نگر (حسن عابد)	ڈاکٹر ظہیر فتحپوری ،	۶۲۹
۲+۲=۵ (شمیم احمد)	جابر علی سید ،	۶۳۰
تیس پروانے شمع رسالت کے (طالب الہاشمی)	محمد عبداللہ قریشی ،	۶۳۳
جہلم سے عرفات تک (شمس کاشمیری)	محمد عبداللہ قریشی ،	۶۳۴
وصال (ناصر زیدی)	جمیل ملک ،	۶۳۵
سینۂ سنگ پہ ریشم کا راستہ (مسعود سلطان)	اے حمید ،	۶۳۷
داستان ہیر رانجھا (فضل حسین تبسم)	ڈاکٹر محمد ریاض ،	۶۳۸
غمگسار (میرزا ریاض)	صدیق جاوید ،	۶۳۹
بے آب سمندر (میرزا ریاض)	ڈاکٹر سلیم اختر ،	۶۴۱
دجلہ (شفیق الرحمٰن)	امجد اسلام امجد ،	۶۴۲
جل تھل (محمد اجمل نیازی)	امجد اسلام امجد ،	۶۴۳
ماس اور مٹی (محمد منشا یاد)	امجد اسلام امجد ،	۶۴۴
لفظ کھردرے (تنویر سپرا)	شفیع ضامن ،	۶۴۶
لوح محفوظ (جوہر نظامی)	صفدر سلیم سیال ،	۶۵۰
"سب رس" کا یادرفتگاں نمبر	سید ذاکر اعجاز ،	۶۵۱
جزیرہ (شبنم رومانی)	احمد ندیم قاسمی ،	۶۵۲
صد برگ (پروین شاکر)	احمد ندیم قاسمی ،	۶۵۴
داغ داغ دل (دلنواز دل)	احمد ندیم قاسمی ،	۶۵۵

سرورق : ناہید قاسمی

حرفِ اوّل

ندیم

نفیِ فن کے چرچے

آج کل نفیِ فن کے بڑے چرچے ہیں۔ جو بھی اٹھتا ہے، شعر و ادب اور دیگر فنون پر نیزہ تانے اٹھتا ہے۔ بہت کم فنکاروں کو اس منفی تحریک کا ادراک حاصل ہے حالانکہ فن کی جڑیں آہستہ آہستہ کاٹی جا رہی ہیں اور کوئی دن جاتا ہے جب شعر و ادب اور دیگر فنون کو مکمل طور پر مردود سمجھا جانے لگے گا۔ فن کی نفی کی یہ مہم کوئی نئی مہم نہیں ہے۔ اس کا آغاز تو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہو گیا تھا جب پورے ملک میں یہ افواہ اُڑا دی گئی تھی کہ ادب و فن پر جمود مسلّط ہو چکا ہے، حالانکہ یہی وہ دور تھا جب ادب و فن، باہر کی اور خود اپنے اندر کی حدت سے پگھل رہے تھے اور نئے افقوں کو چھو رہے تھے اور نئی ہیئتیں آزما رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ملک میں ایک ایسا حلقہ پیدا ہوتا رہا جو فن کو عیاشی کے زمرے میں شامل سمجھتا تھا اور جس نے مذہب کی آڑ لے کر اپنے لئے یہ نقطۂ نظر پسند کیا تھا کہ فنکار، ملک کی سب سے نکمی مخلوق ہوتے ہیں اور غیر ذمہ دار ہوتے ہیں اور اخلاق باختہ ہوتے ہیں چنانچہ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" کے مصداق فنکاروں سے پیچھا چھڑانے کے لئے، فن کو ہی بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ فن کی مکمل اور غیر مشروط نفی کے اس پرچار کے پہلو میں ایک اور حلقہ بھی پرورش پاتا رہا۔ یہ فن کو تو تسلیم کرتا تھا مگر فن کار کے احساسِ ذمہ داری اور اس کے معاشرتی اور تہذیبی منصب کی نفی کرتا تھا اور ادب برائے تعمیرِ حیات و تطہیرِ حیات کے علمبرداروں کا ذکر (علامہ اقبال کو مصلحتاً چھوڑ کر) نہایت تضحیک سے کرتا تھا، جیسے فن چرس کے ایک کش اور افیون کی ایک گولی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ حلقہ فن کی مکمل نفی کرنے والوں سے کچھ کم خطرناک نہیں تھا کیوں کہ وہ فن کی ایک خاص نوعیت کا اثبات کر کے ہی اس کی نفی کرتا تھا اور یوں اس کا حلقۂ اثر قارئین کے ذہنوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نفیِ فن کی ایک اور صورت سامنے آئی کہ ترقی پسند کہلا کر گزشتہ ربع صدی کے اُس ترقی پسند ادب کی مذمت کی جائے جس کی برکت سے نفیِ فن کی ان تمام تحریکوں کے باوجود پاکستان میں فن زندہ رہا۔ فن کے مخالفین کی یہ اقسام ایک ہی جذبے کی تخلیق ہیں اور وہ جذبہ یہ ہے کہ کوئی حق بات نہ کہہ سکے، کوئی بے انصافی کی نشان دہی نہ کر سکے، کوئی پتھروں کو گداز نہ کر سکے اور کوئی بھڑکتے ہوئے شعلوں پر شبنم افشانی نہ کر سکے۔ دنیا بھر میں جو صورتِ حال موجود ہے وہ موجود رہے، جو ظلم ہوتا ہے اسے ہونے دیا جائے، سامراج جو کھیل کھیلنا چاہتا ہے، وہ اسے کھیلنے دیا جائے کہ یہ سیاست کے معاملات ہیں اور ادب و فن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو نہیں ہونا چاہیے۔ نفیِ فن کی تحریک کے جو مظاہر آئے دن ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کے عقب میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ خود یہ جذبہ سراسر سیاسی ہوتا ہے۔

نفیِ فن کا مسکت جواب تخلیقِ فن ہے

سیاست صرف سیاست دانوں کی میراث نہیں ہے۔ آزاد ملکوں میں ہر شخص سیاسی ہوتا ہے اور اسے سیاسی ہونا چاہیے ورنہ اگر اس کا ذہن آزادی کا مقصد و مفہوم کھو بیٹھا تو سیاست پر چند گنے چنے لوگوں کا اجارہ قائم ہو جائے گا۔ اہلِ فن، اہلِ قلم اور اہلِ علم کو اور کچھ نہیں تو کم سے کم اپنی ملکی سیاست پر تو ضرور حاوی ہونا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ اجتماعی حیثیت سے وہ کہاں کھڑے ہیں اور بین الاقوامی سیاسیات میں ان پر کیا کیا دباؤ پڑ رہے ہیں اور وہ کس حد تک مجبور ہیں اور کس حد تک مختار ہیں۔ صرف وہی فنکار فن فروشی کی سطح پر گر سکتا ہے جسے ان سیاسی مصلحتوں کا ادراک ہی حاصل نہیں ہوتا جو اسے فن فروشی پر مجبور کر دیتی ہیں، اور فن فروشی اور دانش فروشی ملکی خود مختاری کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نفیِ فن والوں کا پہلا وار اس فن پر ہوتا ہے جو سیاست کو فن کے لئے "آؤٹ آف باؤنڈز" نہیں سمجھتا۔ نفیِ فن کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے خود فن کے بارے میں اہلِ فن اور شائقینِ فن کو واضح ہونا چاہیے اور انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فنون تو انسان کے کردار ساز ہوتے ہیں۔ فنون تو کردار سازی کا اتنا موثر ذریعہ ہیں کہ اس کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے کسی بڑے تحقیقی کارنامے کی ضرورت نہیں ہے۔ مانا کہ کردار سازی کے اور بھی کئی ذرائع ہیں مگر ان ذرائع میں سے ایک موثر ذریعہ شعر و فن کا بھی ہے۔ بہر حال فنکاروں اور فن پرستوں کو نفیِ فن کے کسی بھی روپ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے اور نفی کے اس ماحول میں فن کا اثبات

کرتے رہنا چاہیئے۔ فن کا اثبات صرف اس طرح ممکن ہے کہ ویسا اچھا اور معیاری اور اعلیٰ فن مسلسل تخلیق ہوتا رہے جو انسان کے جذبہ و شعور کی مسلسل تہذیب کرتا رہے اور عالمی شعر و فن کی دنیا میں پاکستان کو سربلند رکھے اور پاکستانیت ہی سے اپنی پہچان اور اپنے تشخص کا سامان کرے۔

"فنون" کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا

"فنون" کے گزشتہ شمارے کے مختصر سے اداریے میں اہل قلم کی خدمت میں درخواست کی گئی تھی کہ بعض طبقوں نے بعض اہل قلم کے خلاف بہتان و دشنام کا جو ناپاک سلسلہ گزشتہ چند برس سے شروع کر رکھا ہے، اسے بند کرنے کی کوئی سبیل ڈھونڈنی چاہیئے کہ اہل قلم کا اصل سرمایہ تو تخلیق شعر و ادب ہے اور ایک دوسرے کے خلاف افترا پردازی اور طعنہ زنی کا شغف کم سے کم ان اہل قلم کو قطعی زیب نہیں دیتا جو لفظ کی تقدیس کے قائل ہیں بجائے اس کے کہ ان گزارشات کی تائید میں کچھ کہا جاتا، "اہل قلم" ہی کے ایک طبقے نے "فنون" کی ان ادارتی سطور کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھئے، یہ مجلہ ہم سے گالی دینے کی آزادی چھین لینے کے درپے ہے۔ یہ استفسار بھی کیا گیا کہ اگر "فنون" میں اخلاقی جرات ہے تو وہ یہ بھی بتائے کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جن کی گزر بسر بہتان و دشنام پر ہے۔ ثابت ہوا کہ "فنون" کے اس ننھے سے اداریے کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے چنانچہ انہی عناصر نے اس اداریے کے خلاف واویلا مچایا ہے جو اس اداریے کے مخاطب تھے۔ ان عناصر نے اپنی نشان دہی خود ہی کر دی ہے۔ اس صورت میں "فنون" سے اپنے ہی نام پوچھنا ان سرگرم دشنام عناصر کا محض تکلف ہے۔

سالنامے کی دو جلدیں

تاخیر سے شائع ہونا "فنون" کی مجبوری بن گئی ہے مگر ہم وعدہ کرتے ہیں (اگرچہ کئی بار یہ وعدہ کر چکے ہیں) کہ آئندہ اول تو تاخیر ہوگی نہیں، اور اگر ہوئی تو تاخیر کا وقفہ اتنا طویل نہیں ہوگا جیسے یہ سالنامہ ایک سال کی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ سالنامے کی ضخامت ایک ہزار صفحات سے متجاوز ہونے لگی تو ادارے نے طے کیا کہ سالنامے کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ سالنامے کی جلد اول قارئین کرام کے سامنے ہے۔ جلد دوم انشاء اللہ دو تین ماہ کے بعد قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی اور یوں ۱۹۸۰ء کی طویل تاخیروں کی کسی حد تک تلافی ہو جائے گی۔

رفتگاں

گزشتہ چند ہفتوں کے اندر علم و فن کی بعض اہم شخصیات کے انتقال سے علم و فن کی دنیا کچھ اور غریب ہوگئی۔ پاکستان میں اطہر نفیس اور ہندوستان میں ساحر لدھیانوی کی وفات سے اردو شاعری کو شدید صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ پھر پاکستان میں عظیم قریشی اور لطافت قریشی کی رحلت نے اور ہندوستان میں جمیل مظہری اور میلا رام وفا کی رخصت نے اردو شاعری کے اس خلا کو مزید دردناک بنا دیا۔ اس دوران میں افسانہ نگار ریاض روفی بھی ہم سے چھن گیا۔ پاکستان میں معروف الغوزہ نواز مصری خاں جمالی اور ہندوستان میں مشہور گلوکار محمد رفیع بھی انتقال کر گئے۔ حکیم یوسف حسن بھی چل بسے اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی۔ ڈاکٹر عبدالحمید بھی رخصت ہو گئے، اور ملک محمد پناہ بھی۔ محترمہ رقیہ خلیل عرب اور ڈاکٹر شجاع ناموس بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ ابھی ابھی جب ہم یہ سطور کتابت کے لئے بھجوا رہے تھے تو اطلاع ملی کہ اقبالیات کے معتبر ترین ماہر اور نامور مصنف سید نذیر نیازی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اطہر نفیس

اطہر نفیس کا سا اندر باہر سے نہایت خوبصورت انسان ایک بے مثال غزل گو بھی تھا اور ایک ایسا وجود بھی جس کے خلوص اور نیکی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے عزیزوں، اور دوستوں کے علاوہ ہزاروں دلدادگان شاعری کا بھی محبوب تھا۔ معاصر اردو غزل میں اطہر نفیس کی آواز قطعی طور پر منفرد ہے۔ اس میں محسوسات کے دور دراز گوشوں تک اتر جانے کی جو کیفیت اور گھلاوٹ ہے وہ دوسرے غزل گوؤں کے مقابلے میں بآسانی الگ سے پہچانی جا سکتی ہے۔ اطہر نفیس نے اپنی غزل میں ماورائیت کو حقیقت میں کچھ اس طرح مدغم کر رکھا تھا اور اس کے دکھ میں سرخوشی کا جو حیات افروز عنصر تھا اور اس کے ہاں بہت کچھ کھو دینے میں بہت کچھ پا لینے کی جو حیرت انگیز کیفیت تھی، وہ شاذ ہی کسی شاعر کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ بڑے توازن اور تدریج کے ساتھ اپنے فن کی ان خصوصیات کو نکھار رہا تھا کہ بے وقت موت نے اس کی راہ کاٹی اور وہ جو ہزاروں کے دلوں میں بستا تھا، زیر خاک جا بسا۔

ساحر لدھیانوی

اردو کے نہایت مقبول شعراء میں ساحر لدھیانوی کا نام سالہا سال سے شامل تھا اور اس کی موت کے بعد بھی ساحر کی اس ہر دل عزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنی مقبولیت کو اتنی مدت تک قائم رکھنا بہت دشوار ہوتا ہے مگر وہ شعراء جن کی مقبولیت لمحاتی یا ہوائی نہیں ہوتی، اپنے معیاروں کو نہ صرف قائم رکھتے بلکہ خوب سے خوب تر کی سمت اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔ ساحر انہی معیاری شعراء میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی نظموں، غزلوں اور گیتوں میں عالم انسانیت کی اس اکثریت کی حسرتوں اور امنگوں کی ترجمانی کی جو مروجہ غیر منصفانہ اور سفاک معاشی نظاموں کے پاٹوں میں صدیوں سے پس رہے ہیں۔ ہندوستانی فلموں میں اس نے آرزو لکھنوی کی طرح نہایت معیاری گیت لکھے اور یوں فلموں میں تک بندی کی بجائے اعلیٰ پائے کی شاعری کو رواج دیا

سید نذیر نیازی

قیام پاکستان سے پہلے سید نذیر نیازی نے جامعہ ملیہ کے ایک استاد اور ماہنامہ "طلوع اسلام" کے مدیر کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت ادیب تھے کہ انہیں برسوں تک علامہ اقبال کی صحبت میسر رہی اور انہی کے ارشاد پر سید صاحب نے علامہ کے خطبات کو اُردو میں منتقل کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لاہور میں بسلسلہ تدریس بعض اہم اداروں سے وابستہ رہے اور اس دوران میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ علامہ اقبال کے مبسوط سوانح لکھ رہے تھے۔ سوانح کی پہلی جلد "دانائے راز" کے نام سے اقبال اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے مگر ان کا ارادہ سوانح کو چار جلدوں میں مکمل کرنے کا تھا اور اس کے لئے انھوں نے بہت قیمتی مواد جمع کر رکھا تھا۔ خدا کرے ان کے تمام مسودات محفوظ رہیں کیونکہ یہ مسودات پاکستان کا تہذیبی اثاثہ ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ہمارے ملک کے ایک نامور ماہر تعلیم اور تبحر مورخ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک وہ حکومت میں بھی شامل رہے۔ بعد میں کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اب مقتدرہ قومی زبان کے چیرمین تھے۔ مورخ کی حیثیت سے انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ میں سے ان تمام اضافوں کو مستند حوالوں کے ساتھ خارج کر دیا جو یورپین اور ہندو مورخین نے محض بربنائے تعصب شامل کر رکھے تھے۔

ڈاکٹر عبدالحمید

اسی طرح ڈاکٹر عبدالحمید بھی پاکستان کے مسلم الثبوت مورخ تھے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایک مدت تک وابستہ رہے چنانچہ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے اور یہ سب ڈاکٹر عبدالحمید کا ذکر یوں عزت اور اپنائیت سے کرتے ہیں جیسے وہ ان کے استاد کے علاوہ ان کے دوست اور ہمدرد بھی تھے۔ ڈاکٹر عبدالحمید نے متعدد نگارشات اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

حکیم یوسف حسن

جب اُردو کے معیاری ادبی مجلّوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو "مخزن" اور "زمانہ" کے ساتھ ہی شاہد احمد دہلوی کے "ساقی" اور حکیم یوسف حسن کے "نیرنگ خیال" کا تذکرہ جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ حکیم یوسف حسن نے اپنا رسالہ آخری دم تک جاری رکھا۔ کیونکہ انہیں سلطان رشک کا سا دستِ راست میسر آ گیا تھا۔ چغتائی، پطرس، سالک، امتیاز علی تاج، تاثیر، ہری چند اختر ــــ (یہ فہرست بہت طویل ہے) "نیرنگ خیال" ہی کے صفحات پر نمایاں ہوئے اور ادب و فن کی دنیا پر مدتوں حکمراں رہے۔

عظیم قریشی اردو کے ایک منفرد بزرگ شاعر اور الطاف قریشی اردو اور پنجابی کے نہایت ذہین اور ہونہار شاعر تھے۔ اسی طرح جمیل مظہری اردو زبان کے سینیر شعرا میں ایک اہم مقام رکھتے تھے اور میلارام وفا نے بھی ایک وقت میں اپنی خوبصورت اور سلیس شاعری میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ ریاض رودَوی نے ایک زمانے میں بہت کامیاب افسانے لکھے تھے اور ان کا شمار پاکستان میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو لاہور میں ایک یادگار کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کے مختلف اجلاسوں کی صدارت کے لئے جو "پریذیڈیم" چنا گیا تھا، اس میں فیض احمد فیض اور سید مطلبی فریدآبادی وغیرہ کے ساتھ ریاض رودَوی بھی شامل تھے۔ ملک محمد پناہ کا شمار اردو اور بلوچی زبانوں کے ممتاز مصنفین میں ہوتا تھا۔ محترمہ رقیہ خلیل عرب ایک عالمہ، محدثہ، ادیبہ اور مصنفہ تھیں اور ڈاکٹر شجاع ناموس مختلف زبانوں اور علوم پر حاوی ایک بزرگ دانشور اور مصنف تھے۔ سندھ کا الغوزہ نواز مصری خاں جمالی اپنے فن میں یکتا تھا۔ اس نے اپنی ندرت فن سے اس بظاہر سیدھے سادے ساز کو اتنے سلیقے سے استعمال کیا کہ اس کے الغوزے سے نکلی ہوئی ہر آواز ایک اعجاز معلوم ہوتی تھی۔ گلوکار محمد رفیع نے برسوں ہندوستانی فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ وہ جتنا ہندوستان میں مقبول تھا، اتنا ہی پاکستان میں بھی مقبول رہا۔ اس کی گائی ہوئی غزلوں اور گیتوں سے پاکستان و ہند کی فضائیں مدتوں گونجتی رہیں۔ ادارۂ "فنون" ان سب رفتگاں کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ویسے اہلِ فن اور اہلِ علم کے پس ماندگان میں تو وہ سبھی لوگ شامل ہوتے ہیں جنھوں نے ان کے علم و فن سے استفادہ کیا ہو اور جو اُن کے مزید ارشادات و نگارشات سے محروم ہو گئے ہوں۔

معذرت

گذشتہ شمارے میں جناب افسر ماہ پوری کے بارے میں ایک بے بنیاد خبر شائع ہو گئی تھی جس کے لئے ہم افسر صاحب اور قارئین کرام سے معذرت خواہ ہوں۔

شان الحق حقی

نغمۂ محمدیؐ

(گوئٹے کی نظم SONG OF MOHAMMAD کا ترجمہ)

وہ پاکیزہ چشمہ جو اوجِ فلک سے چٹانوں پہ اُترا
درخشاں ستارے کی بھنی جوت جس کے بدن میں
سحابوں سے اُوپر بلند آسماں میں پر افشاں ملائک
کی چشمِ نگہدار کے سائے سائے
چٹانوں کی آغوش میں عہدِ برنائی تک جس کے جولاں بنا

چٹانوں سے نیچے اُترتے اُترتے
وہ کتنے رنگا رنگ اَنگھڑ خزف ریزے
دامانِ شفقت میں اپنے سمیٹے
بہت سے سِسکتے ہوئے، رینگتے، سُست، کم مایہ سوتوں کو
چونکاتا، للکارتا، ساتھ لیتا ہُوا، خوش خراماں چلا
بے نمو وادیاں جاگ اُٹھیں، لہلہانے لگیں
پھُول ہی پھُول چاروں طرف کِھل اُٹھے
جس طرف اس کا رُخ پھر گیا
اس کے فیضِ قدم سے بہار آ گئی

اُس کے آگے ابھی اور صحرا بھی تھے
خشک نہریں بھی تھیں، اُترے دریا بھی تھے
سب اُسی سیلِ جاں بخش کے منتظر
جوق در جوق پاس اُس کے آنے لگے
شور آمد کا اُس کی اُٹھانے لگے :
راہبر، ساتھ ہم کو بھی لیتے چلو
کب سے تپتیں پستیاں ہم کو جکڑے ہوئے
راہ گھیرے ہوئے، پاؤں پکڑے ہوئے
یاد آتا ہے مسکن پرانا ہمیں
آسمانوں کی جانب ہے جانا ہمیں

ورنہ یونہی نشیبوں میں دھنس جائیں گے
جال میں ان زمینوں کے پھنس جائیں گے
اپنے خالق کی آواز کانوں میں ہے
اپنی منزل وہیں آسمانوں میں ہے
گرد آلود ہیں، پاک کر دے ہمیں
آ ہم آغوشِ افلاک کر دے ہمیں

وہ رواں ہے، رواں ہے، رواں اب بھی ہے
ساتھ ساتھ اس کے اِک کارواں اب بھی ہے
شہر آتے رہے، شہر جاتے رہے
اُس کے دم سے سبھی فیض پاتے رہے
اُس کے ہر موڑ پر ایک دُنیا نئی
ہر قدم پر طلوع ایک فردا نئی

قصر اُبھرا کے خواب ہوتے گئے
محو نقشِ سرِ آب ہوتے گئے
شاہ اور شاہیاں خواب ہوتی گئیں
عظمتیں کتنی نایاب ہوتی گئیں

ہے وہ رحمت کا دھارا مسلسل رواں
از فلک تا زمیں
از زمیں تا فلک
از ازل تا ابد، جاوداں بیکراں
دشت و در گلشن و گل سے بے واسطہ
فیض یاب اُس سے گُل
اور خود گل سے بے واسطہ

سلیم گیلانی

نعت

مہرِ سامانیٔ دربارِ نبیؐ یاد آئی
دردکو لذّتِ درماں طلبی یاد آئی

عِلم کو صحبتِ اُمّی لقبی یاد آئی
نُور کو بخششِ ماہِ عربی یاد آئی

جبل النّور سے جب مہرِ رسالت اُبھرا
قرن با قرن کی تاریک شبی یاد آئی

چاندتاروں سے سجی جب بھی بساطِ افلاک
بزمِ اصحابِ رسولِؐ عربی یاد آئی

رحمتِ کُل کی گھٹائیں جو گُہر بار ہوئیں
رُوحِ پژمردہ کو اِک پیاس نئی یاد آئی

نام جب اُن کا لیا، لُطف کے عنواں جاگے
ذکر جب اُن کا ہُوا شیریں لبی یاد آئی

ہو رہی تھی مرے اعمال کی پُرسش کہ مجھے
نسبتِ ہاشمی و مطّلبی یاد آئی

[illegible] پہ کسی درد کا احساس نہ تھا
وقتِ رخصت مجھے درماں طلبی یاد آئی

نعت

ذکرِ اطہر سے ہوئی موجِ ہوا عطر آگیں
غنچۂ فکر کھلا، نطق ہُوا عطر آگیں

اُن کی رحمت سے مرے صبح و مسا عطر آگیں
جن کی بعثت سے ہوئے ارض و سما عطر آگیں

لُطفِ پیہم کی برستی ہے گھٹا عطر آگیں
جبل النّور، اُحد، کوہِ صفا عطر آگیں

گلشنِ خُلد کا ٹکڑا ہے مدینے کی زمیں
جس کے ذرّوں سے ہوئی جھونکے صبا عطر آگیں

صدیوں پہلے کی رفاقت کا کرشمہ کہیے
آج تک غارِ حرا کی ہے فضا عطر آگیں

کون گزرا ہے کہ افلاک مہک اُٹھے ہیں
کون آیا کہ ہُوا عرشِ علا عطر آگیں

مرحبا، صلِّ علیٰ، سیّدِ نا، مُرسلِنا
عطر خود آپؐ کی خوشبو سے ہُوا عطر آگیں

نام ہی خُوب تھا، نسبت ہی بہت اچھی تھی
لب پہ آتے ہی ہُوا حرفِ دُعا عطر آگیں

کاغذی ہیں مرے گلہائے عقیدت، آقا!
ہو عطا ان کو بھی دامن کی ہوا عطر آگیں

جمیل عالی

بسم اللہ

وہ ایک لمحہ
کہ جو زمانوں کی ابتدا ہے
وہ بے نشاں بیکراں سمندر
کہ جو زمینوں کی، آسمانوں کی
سب جہانوں کی انتہا ہے
وہ روحِ عالم
جو سب میں شامل بھی ہے
مگر سب سے ماوراء ہے
وہ رشتۂ جسم و جاں
خیال و نظر کی بے انت دُوریوں پر بھی
جو ترا میرا رابطہ ہے
وہی
جو ٹوٹے دلوں کے گنبد میں
گونجتی ہوئی صدا ہے
وجود کے اس مہیب جنگل میں یاد جس کی
مرے تجسّس کی آنکھ سے پھُوٹتی ضیا ہے
اسی کی چاہت قدم قدم میری رہنما ہے

ناہید قاسمی

پندرہویں صدی ہجری کے پہلے دن کی نظم

اے مرے آقاؐ! میرے پیارے رسولؐ
آج سورج طلوع ہوتے ہی
آپؐ کا دَور مجھ کو یاد آیا
اور میں سوچنے لگی کہ مجھے
کاش پہلی صدی ملی ہوتی
پہلی ہجری صدی کا پہلا سال
میری تقدیر میں لکھا ہوتا

آپؐ کے حکم پر، مدینے کو
میں بھی ہجرت کا لُطف پا لیتی
آپؐ کو تکتی ۔ آپ کو سُنتی
اور پھر گرد گرد پلکوں سے
آپؐ کے سب نقوشِ پا چُنتی
میری آنکھوں میں چاند بس جاتے ۔ میرے کانوں میں انگبیں گھُلتی
رات کی تیرگی چمک اُٹھتی ۔ رُوح کی خامشی چہک اُٹھتی
آپؐ کے نقشِ پا سے اُڑتے ہوئے
ریت کے آفتابی ذرّوں کو
اپنی چادر میں ٹانک لیتی مَیں
میرے سر پر جو ہاتھ رکھتے آپؐ
میں اس اعزازِ لمس کے دم سے
عمر بھر کے لیے سنور جاتی
کاش میں اب نہ ہوتی ۔ تب ہوتی!

مہک

یارب!
تیرے آخری پیغمبرؐ نے
صحرا میں جو نہر نکالی تھی
اُس کے بھیگے بھیگے اور شاداب کناروں پر
(جو آفاق پہ پھیل گئے ہیں)
دو عالم کے سارے بھید
سدا بہار گلوں کے روپ میں
مہک رہے ہیں

سچ

جب بھی "محمدؐ" کہتی ہوں
تو یوں لگتا ہے
میں دُنیا کا سب سے بڑا سچ بولی ہوں!

کیمیا گر

آپؐ کے جیسا کہاں ملے گا؟
آپؐ تو مٹی کے بدلے سونا دیتے ہیں
میں نے جب بھی اپنے دُکھ کو
آپؐ کے سامنے رکھا ہے
آپؐ نے میری جھولی سُکھ سے بھر دی ہے!

حنیف اسعدی

اسمِ اعظم

(جناب شبنم رومانی کی ایک مقبول نعت پر تضمین)

مرتبہ یہ ہے خیر الانام آپؐ کا
ہے کلامِ الٰہی کلام آپؐ کا
ذکر کرتے ہیں سب خاص و عام آپؐ کا
"وِرد کرتا ہوں میں صبح و شام آپؐ کا
واقعی اسمِ اعظم ہے نام آپؐ کا"

دینِ حق کے سپاہی غلام آپؐ کے
راہبر ہوں کہ راہی غلام آپؐ کے
سج گئے سب بارگاہی غلام آپؐ کے
"کر گئے بادشاہی غلام آپؐ کے
بادشاہوں کو دیکھا غلام آپؐ کا"

خیر ہیں، خیر کی آخری حد بھی ہیں
باعثِ کُن بھی ہیں، کُن کا مقصد بھی ہیں
خود بھی حامد ہیں، ممدوحِ سرمد بھی ہیں
"آپ احمدؐ بھی ہیں اور محمدؐ بھی ہیں
حمد ہے لازمی جزوِ نام آپؐ کا"

یوں تو تکمیلِ دینِ متیں کے لیے
اُترے احکامِ حق مرسلیں کے لیے
بر عطا تھی فقط شاہِؐ دیں کے لیے
"آسماں کے صحیفے زمیں کے لیے
آسماں کو زمیں سے پیام آپؐ کا"

سربسر خُلق تھی زندگی آپؐ کی
دشمنوں تک نے تعریف کی آپؐ کی
لُطف سے کم نہیں برہمی آپؐ کی
"عدل سے بھی سوا منصفی آپؐ کی
انتہائے کرم انتقام آپؐ کا"

بیقراریِ قلب و نظر کے لیے
دردِ دل کے لیے، چشمِ تر کے لیے
عاصیوں کی دُعا میں اثر کے لیے
"دفعِ شر اور وقارِ بشر کے لیے
نام کافی ہے خیر الانام آپؐ کا"

آپؐ سردار و سرور ہیں، یا سیّدی
وجہِ تخلیق ہیں آپؐ ہی یا نبیؐ
جزو و کل آپؐ تھے، کائنات آپؐ کی
"آپؐ ہی سے عبارت ہے کُل زندگی
زندگی کا یہ کُل ہے نظام آپؐ کا"

ریاض حسین چودھری

نعت

یاخدا، میرے لفظوں کو عشق و محبت کی سرشاریاں کر عطا
یاخدا، میرے نطق و بیاں کو ثنائے محمدؐ کی توفیق دے

تمدن کی ویران آنکھیں ہراساں
کہ دم توڑتی ساعتوں کے کھنڈر
اپنے ملبے کی تقدیس پر غم زدہ
روشنی کے لیے معبدوں میں کئی ایک صدیوں سے انسانیت کا لہو جل رہا تھا
آدمی اپنی پہچان تک کھو چکا تھا
اور حوا کی بیٹی کے زرخیز، ننگے بدن پر صلیبوں کی فصلیں اُگائی گئی تھیں
یہ کچلے ہوئے جسم اپنی ہی قبروں کے پتھر بنے تھے
آنسوؤں سے مرصع تھی جھالر زمیں کی
بے نوا زندگی کے در و بام پر تھی اُداسی مسلّط ہزاروں برس سے
عارضِ وقت پر اِن جلے موسموں کے نشاں دیکھ کر
ابر آتا تھا لیکن برستا نہ تھا
چھاگلیں ریگِ صحرا سے لبریز تھیں
اور آدم کے خوں میں ملوث یہ تہذیب کی انگلیاں
شغلِ تنویم میں پھر بھی مصروف تھیں
دم بخود عہد ناموں کے اوراقِ خستہ
مصحفِ حرف تفہیم کے نور سے نابلد
آدمیت کے شفاف، اجلے بدن پر بھی راکھ کے پیرہن
دھڑکنیں وقت کی منجمد
اور ساقط رگوں میں یقیں کا لہو،

خشک پتوں، جلی ٹہنیوں کو ہوا نے دلاسہ دیا
کہ اِک سیلِ رحمت، نویدِ بہاراں لیے آ رہا ہے
عرشِ اعظم پہ مژدہ سنایا گیا کہ زمیں کا مقدر سنورنے کو ہے

کُل جہانوں کی قسمت بدلنے کو ہے
منتظر جن و انسان و حور و ملائک
ازل سے ابد تک زماں منتظر
زمیں منتظر آسماں منتظر
قافلے خیمہ زن کہکشاؤں کے ہر سو کہ تخلیق ان کی اسی ایک لمحے کی خاطر ہوئی تھی

سرزمینِ عرب اپنے بختِ ہمایوں پہ مسرور تھی
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحا کی مقبولیت کی گھڑی آ گئی
آسمانوں نے بڑھ کر زمیں کے قدم چھو لیے
ثنائے محمدؐ میں مصروف ارض و سما
نغمۂ جانفزا، مصطفےٰ، مصطفےٰ
قطاریں ملائک کی صلِّ علیٰ کہہ رہی تھیں
صبا وردِ اسمِ محمدؐ کا کرنے لگی
شفق نے شہادت کی انگلی اٹھائی
حریمِ رسالت سے سورج نکلتا چلا آ رہا تھا
آسمانوں زمینوں کی پوشاک بدلی گئی
اور کائی زدہ منجمد پانیوں میں تموّج کے آثار پیدا ہوئے
ریگزاروں سے کرنوں کا پھیلا کے دامن
ستاروں نے خیرات مانگی ضیا کی
ظلمتِ شب کے معبد میں صدیوں پرانی رعونت کی تہذیب ماتم کناں تھی
صدا غیب کی وادیوں سے یہ آئی
یہ انسانِ کامل ہے، اس کے نقوشِ قدم پر عبادت کریں گے فرشتے
روایات کے جلتے بجھتے چراغوں سے کہہ دو کہ بجھ بھی چکیں
نئے دن کا سورج اُفق پر فروزاں ہوا ہے
نئے دن کا سورج اُفق پر فروزاں رہے گا

(نامکمل)

اطہر نفیس کی آخری (؟) غزل

پیارے قاسمی صاحب!

اطہر کی موت نے اُجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ آپ نے "جنگ" میں جس دُکھ سے ہم سب اطہر کے عاشقوں کے قلق کو زنجیر کیا ہے، آپ ہی جیسے درد گُسار کا حصّہ ہے۔ سچ ہے دیسا دوست اب نہیں ملے گا۔ وہ میرا بھی کراچی میرا بھی پاکستان تھا۔ میرے لیے سارے رشتے اسی کی نسبت سے تھے۔ ۲۵ برس کی یادیں ہیں۔ ہر مہینے یا چھٹے ہفتے اس کا خط آتا تھا۔ یہ اصول اُس نے ۱۷ برس سے بنا رکھا تھا۔ ہر دن اس کے بچھڑنے کا ملال بڑھتا جائے گا۔ اس نے آخری خط ۲۵ اکتوبر کو لکھا تھا جو مجھے پہلی نومبر ۸۰ء کو ملا تھا۔ وہی کہ اب اچھا ہو گیا ہوں۔ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے وغیرہ۔ اس نے اپنی تازہ غزل بھی بھیجی تھی اور رائے مانگی تھی۔ یہ میں کیسے مانوں کہ اس کا جواب اب نہیں آئے گا۔ خدا کرے اسے میرا خط ملا بھی ہو اور اس نے اسے پڑھا بھی ہو۔ اسے کیسے رخصت کروں۔ اس کی غزل نقل کیے دیتا ہوں "فنون" کے لیے۔ شاید یہ اس کی آخری غزل تھی۔ اُس نے لکھا تھا "..... اچھا اب نئی غزل سُن لو جو اس علالت سے ذرا پہلے کہی تھی ....." ——— ساقی فاروقی (لندن)

○

مرے لہو کی صدا تھا، مری پکار تھا وہ
مری زباں پہ عجب حرفِ بے قرار تھا وہ

اس ایک حرف کا امکان و اعتبار تھا میں
مرے وجود کا امکان و اعتبار تھا وہ

نئے اُفق تھے معانی کے، اس کے پرتو میں
وہ حرف تھا کہ کوئی مہرِ زرنگار تھا وہ

میں اس سے جیت گیا، کتنا کم سواد تھا میں
وہ مجھ سے ہار گیا، کیسا ہوشیار تھا وہ

مری نگاہیں پلٹ آئیں اس غبار کے ساتھ
کسی نے یہ نہ بتایا، پسِ غبار تھا وہ

یہ بات کیسے بتاؤں کہ خود غرض تھا میں
اور اس کے بعد بھی یارِ وفا شعار تھا وہ

سمجھ رہا تھا جسے کوچۂ خیال میں ایک
میں اس کو ڈھونڈنے نکلا تو بے شمار تھا وہ

کبھی جو اس کو صفِ دشمناں میں دیکھو تم
تو اس کو یاد دلانا کہ میرا یار تھا وہ

اطہر نفیس

○

چاروں سمت سمندر ہے
پانی سر سے اُوپر ہے

اپنے اندر چھپ کر بیٹھ
باہر دشمن لشکر ہے

کس سے مانگیں نقدِ حیات
سب کے ہاتھ میں خنجر ہے

لہروں میں مت دیکھ مجھے
مجھ میں ایک سمندر ہے

مجھ کو میرا حال بتا
کیا کچھ میرے اندر ہے

میرے کتنے چہرے ہیں
میرا کون سا منظر ہے

ہے کوئی میرا چہرہ بھی
یا سب قصّۂ دیگر ہے

اپنی اپنی آنکھیں ہیں
اپنا اپنا منظر ہے

اپنے آپ سے پوچھ ذرا
کس کس کا تو چاکر ہے

ریشم جیسی ذات اُس کی
باقی سب کچھ پتھر ہے

(ایک پرانی غیر مطبوعہ غزل)

○

نیا سودا ہے وحشتیں ہیں نئی
دلِ زندہ کی حیرتیں ہیں نئی

نئی کونپل دلوں میں پھوٹتی ہے
دونوں جانب محبتیں ہیں نئی

وہ بھی آیا ہے کچھ نیا ہو کر
اور اپنی بھی حسرتیں ہیں نئی

اُس کی خوشبو کا لمس تازہ ہے
شبِ زندہ کی لذتیں ہیں نئی

کچھ ہمیں بھی تکلّفات نئے
کچھ اُسے بھی قباحتیں ہیں نئی

لبِ گفتار کو میسّر آج
زہرِ غم کی حلاوتیں ہیں نئی

تہمتوں کے حصار کھنچنے لگے
لمحہ لمحہ ملامتیں ہیں نئی

اب کے شاید نئے عذاب ملیں
اب کے شاید رفاقتیں ہیں نئی

کتنے روشن ہیں منبر و محراب
دل و جاں کی عبادتیں ہیں نئی

اب سے پہلے بھی تھیں مگر اب تو
دلِ تنہا کی خلوتیں ہیں نئی

اُس کے اندازِ نو بہ نو سے الگ
آج اپنی بھی نیتیں ہیں نئی

اب نہیں دھوپ میں پڑاؤ کے دن
سایۂ ابر کی چھتیں ہیں نئی

سارے لمحے نئے ہوئے یارو
آج سے ساری ساعتیں ہیں نئی

اسد محمد خاں

سید سلیم احمد کو ایک رپورٹ

کراچی - ۲۱ر نومبر ۱۹۸۰ء

(دوپہر) (دوپہر) (دوپہر)
ہم سات آدمی جمال خاں کے کمرے میں بیٹھے ہیں
اس لیے کہ یہاں سے میل بھر دُور
آپ کے راج ہنس کو کسی مان سرووَر لے جانے کے لیے
تیار کیا جا رہا ہے
(ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے)

مگر ہم ساتوں آدمی
ایک تیز سفید کپڑے اور ایک تیز سفید خوشبو کو
اس لال کنول والے سے ایسوسی ایٹ نہیں کر پا رہے

سیّد سلیم احمد! ہدایات کا انتظار ہے
رنگوں اور خوشبوؤں کی اس بے ربطی کے بارے میں
ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟

(رپورٹ ختم ہوئی)

موت ہمارے درمیان کب نہیں تھی

موت ہمارے درمیان کب نہیں تھی
مگر، یاد پڑتا ہے
کہ ایک حیات آفریں آواز والا
بلند قامت آدمی
ہمیں اپنی اوٹ میں لیے کھڑا تھا —
وہ موت کی بدصورتی اور وحشت ناکی سے ہمارا تعارف نہیں
ہونے دیتا تھا

اب
جو وہ ہٹ گیا ہو
تو دیکھ لو
جیسا جس کو دکھائی دیتا ہو
دیکھ لو

اسد محمد خاں

دریا کے دونوں کناروں سے ایک دُعا

میں دریا کے دونوں کناروں سے
تمہارے لیے سربلندی کی دعا بھیجتا ہوں

شکریہ اطہر نفیس
شکریہ میری جان

میں بے نوا ــــ حقیر و فقیر
تم نے مجھے
آواز
قامت
ماں
باپ
بہن بھائی
مرشد
دوست
اور بہت سی خوبصورت چیزوں سے
اور بہت سی قیمتی چیزوں سے خالی پایا
مجھے خالی پایا
سو مجھے بھر دیا

شکریہ اطہر نفیس
شکریہ میری جان

اس مہرِ بے نہایت کے لیے

میں
تمہاری پیشانی
تمہاری آنکھیں
تمہارے رُخسار
تمہارے شانے
تمہارے ہاتھ
تمہاری انگلیاں چُومتا ہوں

میں دریا کے دونوں کناروں سے
تمہارے لیے سربلندی کی دُعا بھیجتا ہوں

میرے لکھ لُٹ
تمہارا کہا نسلوں کے محیط میں گونجتا رہے
میرے لکھ لُٹ
تمہارا لکھا چمکتے حرفوں میں لکھا رہے
میرے لکھ لُٹ
تمہارا نہ ختم ہونے والا وقت
کسی اطہر نفیس کی رفاقت میں گزرے

کہ اس سے اچھی دُعا
میں سوچ بھی نہیں سکتا

محشر بدایونی

اطہر قدریۂ غزل

"یہ نظم میرے زخمِ دل کا مرہم تو نہیں ہے لیکن کسی حد تک تسکین ساماں ضرور ہے۔ کاش روحِ اطہر بھی دلِ ریزہ ریزہ کے اِس ہدیئے کو قبول کر لے"۔ محشر

اطہرِ قدریۂ غزل کو مدام	جستجوئے جمال میں دیکھا
نغمہ پیرا د زمزمہ افشاں	کیفِ ہجر و وصال میں دیکھا
کبھی چُپ اِس سوالِ کاوش میں	کبھی گُم اُس خیال میں دیکھا
کر دیا سب وہ رنگ نذرِ غزل	جو بھی شہرِ غزال میں دیکھا
کِس تحمل سے اُس کو گرمِ سفر	گردشِ ماہ و سال میں دیکھا
لیے لفظوں میں پیار کی خوشبو	قید سانسوں کے جال میں دیکھا
اُس کو دیکھا مخاطبِ ہر جبر	اور حدِ اعتدال میں دیکھا
نہ فسادِ اجتناب و رنجش میں	نہ جنوں اشتعال میں دیکھا
بے گناہی کے باوجود بھی غرق	عَرَقِ انفعال میں دیکھا
اُس نے خود کو اجل کے موڑ پہ بھی	زیست کے خدّ و خال میں دیکھا
مرض ایسا، مگر کبھی چہرہ	نہ غبارِ مآل میں دیکھا
اس کے چارہ گروں کو اُس سے سوا	گم، غمِ اندمال میں دیکھا
شاذ ہی ایسا نقشِ زندہ دلی	زندگی کی مثال میں دیکھا
پھر ہُوا یہ بھی سانحہ کہ اُسے	جاں بلب ہسپتال میں دیکھا
مہرِ ارضِ مسافرت کو نڈھال	گرد و بادِ زوال میں دیکھا
آہ کِس طرح زندگی نے اُسے	ساعتِ انتقال میں دیکھ

کم ہی دیکھا جو اعتبارِ کمال
اطہرِ باکمال میں دیکھا

امجد اسلام امجد

اطہر نفیس کے لیے ایک نظم

وہ ایک ہمدرد آئینہ تھا
کہ اُس کی آنکھوں میں جو بھی اک بار دیکھتا تھا
یہ سوچتا تھا،
وہ اب اکیلا نہیں رہا ہے!
عجب تسلّی بدوش تھیں وہ نگار آنکھیں
وہ زندگی کی اُمید، روشن نوید ایسی بہار آنکھیں
جو سو گئی ہیں —
وہ رتجگوں کے دھوئیں میں لپٹا اُداس چہرہ
مگر وہ آنکھیں!!
وہ آگہی کی سفیر آنکھیں جو کھو گئی ہیں —
وہ جس کے لفظوں میں چاہتوں کے چراغ جلتے تھے
بُجھ گیا ہے
وہ جس کے لہجے میں پھول کھلتے تھے
اُس کی آواز جل گئی ہے
وہ دوستی کا شفیق موسم
وہ روشنی کی لکیر، آگے نکل گئی ہے

وہ اک جزیرہ تھا دوستی کا
جو ہولے ہولے سمندروں کے نمک کی چھریوں سے کٹ رہا تھا
اُلجھتی سانسوں کے زیر و بم میں
وہ روز و شب کے اُداس صفحے اُلٹ رہا تھا
ہماری آنکھوں میں پھیلنے کو سمٹ رہا تھا

نجیب احمد

○

اطہر نفیس کی یاد میں

جو سر تجھے شانوں پہ، سودا بھی سر میں رہنا تھا
ہمیں کسی نہ کسی رہگزر میں رہنا تھا

گھروں کو لوٹنے والے گھروں کو لوٹ چکے
چلے تھے گھر سے کہ ہم کو سفر میں رہنا تھا

ہُنر کے قصر میں پاؤں دھریں، نصیب نہ تھے
ہمیں تو رنجِ شکستِ ہُنر میں رہنا تھا

تمام عُمر تھی گلنار، چاند یادوں سے
کہ طائروں کو تو کنجِ شجر میں رہنا تھا

کوئی بھی دَرد کی دہلیز پار کر نہ سکا
ہمیں تو گھر میں ٹھہرنا تھا، گھر میں رہنا تھا

دِنوں کے ساتھ دِلوں کے تمام ربط گئے
نجیب ربط فقط سنگ و سر میں رہنا تھا

احمد ندیم قاسمی

اطہر نفیس کی یاد میں

ہم آج خود سے بچھڑنے لگے ہیں تیرے بعد
تُو چل بسا ہے کہ ہم مر گئے ہیں تیرے بعد

دلوں کو آبِ روانِ وفا کہاں سے ملے
محبّتوں کے چمن جل بجھے ہیں تیرے بعد

ہر ایک شاخ صلیبِ بہار لگتی ہے
شجر شجر سے وہ پتّے گرے ہیں تیرے بعد

تُو کیا گیا کہ وہ معیارِ رنگ و بو بھی گیا
دہانِ زخم ہیں، جو گُل کھِلے ہیں تیرے بعد

جدھر نگاہ اُٹھے، کچھ نظر نہیں آتا
کہ کائنات میں آنسو بھرے ہیں تیرے بعد

تری جہت ہی چُنی شش جہات میں ہم نے
تری طرف ہی قدم اُٹھ رہے ہیں تیرے بعد

وہ سفر، کہ جو باقی ہے، کون کاٹے گا
دیئے حیات نے گُل کر دیئے ہیں تیرے بعد

فاتح شاعر — تنہا آدمی

قتیل شفائی

چودھری صاحب کو شادیاں کرنے کا بہت شوق تھا کیونکہ وہ بڑے زمیندار تھے۔ پہلی بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی انھوں نے ساحر کی ماں سے شادی کرنا اس لئے ضروری سمجھا تھا کہ بڑے زمینداروں کی یہی پہچان ہے اور ساحر کی پیدائش کے دو تین سال بعد ہی انھوں نے ساحر کی ماں کو الگ کر دینا اس لئے مناسب سمجھا تا کہ وہ کسی اور ساحر کی ماں کو اپنے حرم کی زینت بنا سکیں۔

ساحر نے ہوش سنبھالا تو وہ ایک ایسا یتیم تھا جس کا باپ مرا نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں کو زندہ باپ کے ہاتھوں بیوہ ہوتے دیکھا تھا وہ ایک ایسا بچہ تھا جسے حالات نے وقت سے بہت پہلے بالغ بنا دیا تھا۔ اس کا بچپن کبھی اپنی ماں کی بیرکتیز چُپنی کو حیرت سے دیکھتا اور کبھی اپنے باپ کے اونچے شملے کو۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا جب اس کی حیرتیں ایک تیج بولتی روشنی میں بدل گئیں اور دور دور تک پھیلی ہوئی سماجی ناانصافیوں کے مکروہ چہرے صاف نظر آنے لگے، اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے عبدالحئی سے ساحر لدھیانوی بن گیا۔

ساحر سے میری بالمشافہ ملاقات آزادی کے بعد لاہور میں ہوئی۔ اس سے پہلے صرف خط و کتابت تھی۔ میں اور فکر تونسوی "ادب لطیف" میں کام کرتے تھے اور کبھی کبھار ساحر سے نظم کی فرمائش کے سلسلے میں ایک آدھ خط کا تبادلہ ہو جایا کرتا تھا۔ اور بس ۔۔۔ لیکن ساحر جب اپنی ماں اور نانی کے ہمراہ تقسیم کے بعد لاہور آیا تو وہ مجھ سے یوں ملا جیسے یہ ہماری پہلی ملاقات نہ ہو۔ اور پھر جب تک ساحر لاہور میں رہا ہمارے صبح و شام ایک ساتھ ہی گذرتے رہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایک لاہور اُجڑ چکا تھا اور ایک لاہور آباد ہو رہا تھا۔ اس اجڑنے اور آباد ہونے کے عمل نے کئی مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو اُن پناہ گزینوں کا تھا جو اپنے گھر بار چھوڑ کر ایک ایسے وطن میں آ رہے تھے جہاں انھیں سر چھپانے کے لئے گھروں کی ضرورت تھی۔ جہاں انھیں پیٹ بھرنے کے لئے کام کاج کی تلاش تھی۔ ساحر بھی انھیں پناہ گزینوں میں سے ایک تھا۔ اسے فوری طور پر گھر نہ ملا تو وہ کمیونسٹ پارٹی آفس کے ایک کمرے میں سمٹ سما کر رہنے لگا۔ پھر ایبٹ روڈ کی ایک بلڈنگ کے چند کمرے اُسے الاٹ کر دیئے گئے تو پیٹ بھرنے کا سوال سامنے آکھڑا ہوا۔ "سویرا" کی ادارت اور اکا دکا مشاعروں سے جو کچھ ملتا اس سے گذر بسر کیا ہوتی۔ بیچاری ماں کے پاس جو کچھ تھا بیٹے کی تھوڑی سی آمدن میں شامل ہو کر پیٹ کا ایندھن بننے لگا لیکن یہ بھی کب تک ۔۔۔؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ساحر کے جاگنے سے پہلے صبح ہی صبح اس کے بعض بیروزگار دوست اس کے ہاں ناشتہ کرنے پہنچ جاتے تھے، اور ساحر کی ماں ان سب کی تواضع بالکل اسی طرح کرتی جیسے وہ سب کے ساحر ہی ہوں۔ اور یہ سلسلہ بہت دیر تک چلتا رہا لیکن ہوتے ہوتے انڈے پراٹھے پھلکوں میں بدل گئے، اور پھر یہ پھلکے بھی مہمانوں سے پردہ کرنے لگے۔ ایسے حالات میں کوئی کہاں تک اپنی وضع داری قائم رکھ سکتا ہے۔ ایک دن ساحر کی ماں کے جواب میں ساحر کے ماموں کا خط الٰہ آباد سے آیا اور یہ چھوٹا سا کنبہ اچانک لاہور سے کوچ کر گیا۔

تقسیم سے پہلے ساحر بمبئی کی فلم انڈسٹری میں قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا اور میں لاہور میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا تقسیم کے بعد جب ساحر بھی لاہور چلا آیا تو ہم نے مل کر فلموں کے گانے لکھنے کا پروگرام بنایا لیکن کہاں کی فلمیں، اور کہاں کے گانے؟ سال میں ایک دو سے زیادہ فلمیں بنتی ہی نہ تھیں۔

اس نے قدرت ساری سوجھ کا ساتھ نہ دے سکی۔ پھر جب ساحر بمبئی کا ارادہ کرنے لگا تو اس نے مجھے بھی اکسانے کی کوشش کی لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ جب ساحر بمبئی میں قدم جما چکے گا تو پیچھے پیچھے میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ لیکن ساحر لاہور چھوڑنے کے بعد بمبئی نہیں گیا بلکہ اس نے دلی میں ڈیرے ڈال دیئے اور رسالہ "شاہراہ" ایڈٹ کرنے لگا۔ ادھر لاہور میں فلموں کی پروڈکشن بڑھی تو میری بھی پوچھ گچھ ہونے لگی سو میں نے گھر کی آدھی کو باہر کی ساری پر ترجیح دی اور بمبئی جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بمبئی نام کی بہت بڑی دنیا ہے۔ وہاں ایک بار کسی کے جوہر کھلیں تو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ساحر کی خوش قسمتی کہ اسے پہلی ہی فلم میں کچھ کر کے دکھانے کا موقع مل گیا۔ وہ فلم کے دوسرے شعرا سے الگ ایک نیا اسلوب لے کر جب میدان میں اترا تو سارے ہندوستان کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں اور وہ ہندوستانی سکرین کی ضرورت بن گیا۔ اس نے یہ کامیابی سستے اور لذیذ گانے لکھ کر حاصل نہیں کی تھی بلکہ گلی بندھی اور گھسی پٹی تشبیہوں کو ایک نئے رنگ کی شاعری دے کر ذہنوں کو ایک نئے ذائقے سے ہمکنار کر دیا۔ اس نے ہجر و وصال کے روایتی مضمونوں کو توڑ کر ایسے ترانے چھیڑے جن میں سماجی شعور نمایاں تھا۔ اس نے فلموں کو بھی انہی جذبات سے نکھارا سنوارا جن سے وہ اپنی تصنیف "تلخیاں" کو مقبولیت کی سند دلا چکا تھا یہ اس لئے کہ ساحر کو دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں جو کچھ دیا تھا وہی کچھ وہ اسے لوٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سماجی ناانصافیوں نے جو حالات اس کے لئے پیدا کر دیئے تھے ان حالات کا شکار محض ایک ساحر نہیں دنیا کے لاکھوں کروڑوں ساحر ہیں۔ اور جب کسی ایک ساحر کے ہونٹ غلط معاشرے کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو ان گنت ساحروں کی سماعتیں اس آواز کی جانب کھنچنے لگتی ہیں۔ وہ حقیقتوں کا شاعر تھا، وہ سچائیوں کا شاعر تھا۔ وہ جدتوں کا شاعر تھا، وہ اجتہاد کا شاعر تھا۔ اس نے زندگی بھر وہی کچھ لکھا جو وہ لکھنا چاہتا تھا۔ اس کی لغت میں سمجھوتا بازی نام کی کوئی اصطلاح موجود ہی نہ تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی شرائط سے قلم اٹھایا۔ اپنی پسند کی کہانی کے لئے شاعری کی۔ اپنی شاعری سے وفا کرنے والے موسیقاروں کو آگے بڑھایا اور اپنے فن کے منہ مانگے دام وصول کئے۔ وہ جب بھی مجھ سے ملا اس نے محبت سے پوچھا "تم لاہور میں وہی چیزیں کیوں نہیں کرتے جو میں بمبئی میں کرتا ہوں" میری شاعری کا دل سے قدردان تھا۔ اس نے جب اپنی تصنیف "پرچھائیاں" پیش کی تو اس پر لکھا ——— "ہندوستان کے قتیل شفائی کی طرف سے پاکستان کے ساحر لدھیانوی کے لئے" ——— وہ چاہتا تھا کہ پاکستان میں فلم سے تعلق رکھنے والے شاعروں کا وقار بلند کرنے کا فریضہ میں ادا کروں لیکن میں اسے کیوں کر سمجھاتا کہ جہاں علم و دانش کی باگیں جہل اور ذلت کے ہاتھوں میں ہوں وہاں فنکار اور گدھے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔

ساحر سے میری آخری ملاقات نومبر ۱۹۷۹ء میں ہوئی۔ جب میں خاص طور پر ساحر، کیفی اور راجندر سنگھ بیدی کی مزاج پرسی کے لئے بمبئی گیا تھا جب میں بمبئی پہنچا تو ساحر اپنے عزیزوں کے پاس الٰہ آباد گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو اس نے پہلی فرصت میں مجھے فون کیا اور اپنی غیر حاضری کی معذرت چاہی۔ مجھے معلوم تھا کہ ساحر کو دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ اس لئے میں نے ساحر سے کہا "تم لمبے سفر سے واپس آئے ہو آج کا دن آرام کرو کل میں تمہارے گھر آؤں گا" لیکن ساحر نے اصرار کیا کہ وہ آج ہی اسی وقت مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ آیا گلے ملا اور چمکتی آنکھوں میں خوشی کے چراغ جلا کر مجھے اچھی طرح دیکھا۔ "یار تم تو بالکل ویسے ہی ہو جیسے پہلے تھے۔ تم میں تو ذرہ برابر فرق نہیں آیا" ——— وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور میری حالت اس غبارے کی سی ہو رہی تھی جس میں کوئی بچہ گنجائش سے زیادہ ہوا بھر رہا ہو ——— میں نے بات بدلنے کے لئے پوچھا ——— "کوئی نیا مجموعہ آ رہا ہے تمہارا؟" ——— اس نے چونک کر کہا ——— "ارے ہاں۔ معاف کرنا۔ دیکھو تم نے اپنے گیتوں کا دیباچہ لکھنے کو کہا بھیجا تھا۔ بھلا تمہیں اب دیباچوں کی کیا ضرورت ہے۔ اگر دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے ایسا کر رہے ہو تو جو من میں آئے خود ہی لکھ لو۔ اس طرح ہم دونوں سرخرو ہو جائیں گے"۔ اس ملاقات کے بعد مجھے ملکیشور صاحب کے ہاں ہندی ادیبوں کے ایک استقبالیے میں جانا تھا چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اب اگلے روز ساحر کے ہاں شام گذرے گی اور جی بھر کے باتیں ہوں گی۔

سترہ برس پہلے ۶۲ء میں بھی ساحر نے میری بہت خاطر تواضع کی تھی۔ اس سے پہلے ۶۱ء میں بھی گورو دت سے ایک فلم کا معاملہ طے کرایا تھا اور سب تنازعہ گذر جانے کے بعد بھی ساحر کے تپاک میں کوئی فرق نہیں آیا تھا بلکہ ساحر اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو سے گرو دت کو حیرت ہوئی

تھی اور اس نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ ساحر کہیں آپ سے ڈرتا تو نہیں — ؟ بھلا ساحر مجھ سے کیا ڈرتا یہ معاملہ تو پیار کا تھا۔ لیکن اس کا یہ پیار ملاقات میں ایک عجیب صورت اختیار کر جاتا۔ خدا جانے اس کے تحت الشعور میں کیا بات تھی کہ وہ مجھے ہمیشہ بمبئی میں مستقل قیام پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اس بار تو ساحر کا اصرار حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنی عالیشان بلڈنگ "پرچھائیاں" کا ایک خوبصورت فلیٹ بھی مجھے آفر کیا اور شہریت دلانے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ مگر میری طرف سے جب حسبِ معمول دو چار بے تکلف جملے اس پر حملہ آور ہوئے تو وہ خاموش ہو گیا۔

زندگی کے آخری چند برسوں میں ساحر کے مزاج میں ایک عجیب قسم کی چڑچڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بڑے خلوص سے احباب کے لیے دعوتوں کا اہتمام کرتا، پہلے اچھی اچھی باتیں ہوتیں، پھر ذرا ترنگ میں آتا تو کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے احباب سے الجھ پڑتا اور انہیں گالیاں تک دینے سے دریغ نہ کرتا۔ یہ المناک صورتِ حال شاید اس کے تجرد کا نتیجہ تھی۔ اس کے اندر کا مرد جانے کیسے کیسے ریشمی خواب بُنتا ہو گا لیکن وہ جو باہر سے دکھائی دینے والا ساحر تھا، اس پر کسی گرم ہاتھ کی مہرِ ثبت نہ ہو سکی تھی۔ وہ اپنی شاعری میں کئی حسیناؤں کا محبوب تھا لیکن اپنی ذات میں اس جیسا تنہا کوئی نہ تھا اور یہی احساسِ تنہائی اسے مار گیا۔

۲۶ اکتوبر کی صبح کو جب آل انڈیا ریڈیو نے ساحر کے انتقال کی خبر نشر کی تو میری نظروں میں ساحر کی پوری شخصیت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ گھوم گئی اور میں نم آلود آنکھوں، دکھی ذہن سے دیر تک سوچتا رہا کہ ساحر کی گالیاں کھا کر بے مزا نہ ہونے والا ہندوستان اب کس کی ناز برداری کرے گا۔

الطاف قریشی

○

دونوں ہاتھوں سے ترا چہرہ چھپائے رکھنا
خوب تڑپانا تجھے خوب ستائے رکھنا

تھام لینا ترے دامن کو کھلی راہوں میں
چشمِ دنیا سے تجھے سخت ڈرائے رکھنا

تیز نظروں سے تجھے دیکھتے رہنا پیہم
تیرے اطراف میں شمعیں سی جلائے رکھنا

اپنی تنہائی میں لے آنا بہانوں سے تجھے
اور پھر پہروں تجھے پاس بٹھلائے رکھنا

تیرا ارشاد بھی سن لینا توجہ سے مگر
دل کی آواز پہ بھی کان لگائے رکھنا

دل کو جذبوں سے بھرے رکھنا ہمیشہ الطافؔ
جس جگہ بیٹھنا، میلہ سا لگائے رکھنا

○

ضبط کا پندار ٹوٹے، ناشکیبائی سے ملے
درد کی تشہیر ہو، زخموں کو رسوائی ملے

جڑ گئے ہیں ہونٹ میرے حسرتِ اظہار میں
اے خدائے حرف و معنیٰ! اذنِ گویائی ملے

سنگ جو شہروں میں بستے ہیں وہ پھر آزاد ہوں
پھر سرِ شوریدہ کو زخموں کی گہرائی سے ملے

روندتی پھرتی ہے گلیوں میں جنہیں خلقِ خدا
اُن لہو کے لوتھڑوں کو اب توانائی ملے

رات بھر میں جاگتا رہتا ہوں کس کے خوف سے
مجھ کو کچھ کہنا ہے لوگو! مجھ کو شنوائی ملے

میں تو ہوں الطافؔ بندہ اُس کریم انسان کا
جس کے در پر دشمنوں کو بھی پذیرائی ملے

بین السطور

خالد احمد

"اقبالؒ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور قومی بیداری کے سلسلے میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔

اقبالؒ جو دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں اور اُن کا شمار عظیم ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ ہمیں ایسے بڑے شاعر، ایسے بڑے آدمی کا اپنا ہونے پر بالکل بجا فخر ہے۔ اقبالؒ میرے پرانے دوست تھے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں جب میں پنجاب آیا تو پہلے شخص جن سے میں ملا وہ اقبالؒ تھے۔ میں نے اپنے خیالات اُن کے سامنے رکھے تو انھوں نے فی الفور لبیک کہا اور اُس دم سے تادمِ مرگ وہ میرے ساتھ چٹان کی طرح جمے رہے۔

"اقبالؒ کی شاعری زندہ رہے گی جب تک کہ اردو زبان زندہ رہے گی۔

مسلمانوں کے لئے اقبالؒ شیکسپیئر سے بڑھ کے ہیں۔ کارلائل کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اُس سے پوچھا گیا، "اگر تمہیں برطانیہ اور شیکسپیئر میں ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو تم کسے چنوگے؟"—— تو وہ بے اختیار پکار اُٹھا—"میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا"—گو میرے پاس سلطنت نہیں لیکن مجھے سلطنت مل بھی جائے اور مجھے اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑ جائے تو میں بلا تامل اقبالؒ کو چن لوں گا۔"

(قائدِ اعظم محمد علی جناح علیہ الرحمہ، بتاریخ ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء بمقام پنجاب یونیورسٹی ہال لاہور، بہ تقریب یومِ اقبال علیہ الرحمۃ)

ادیب اور مملکت کے موضوع پر قائدِ اعظمؒ کی تقریر کا یہ درجِ بالا اقتباس، تمام پاکستانی ادیبوں اور تمام پاکستانی حکومتوں کی راہ نمائی کے لئے کافی ہے۔ ادیب مملکت ساز ہوتا ہے۔ ادیب مملکت ہوتا ہے۔

درجِ بالا اقتباس کی ایک اور تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ خطبہ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قراردادِ لاہور کی منظوری حاصل کر لینے کے صرف دو دن بعد ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو دے رہے تھے۔ یعنی مملکت کی بنیاد رکھے جانے کے فوراً بعد۔

ادیب کے مملکت ساز یا مملکت ہونے کے بارے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ بات پھر پھر کر ادیب اور ذمہ داری پر آ ٹھہرے گی۔ کیا ادیب کی کوئی خارجی ذمہ داری بھی ہوتی ہے یا نہیں؟ کیا ادیب اپنی داخلی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد اپنے فریضے کی ادائی سے فارغ ہو جاتا ہے؟

ادیب کا داخل ادیب کے خارج کا پرتو ہوتا ہے۔ یوں وہ اپنی داخلی صورتِ حال کے ابلاغ کے بعد ایک حد تک خارجی صورتِ حال کے بارے میں اپنا ردِّ عمل ظاہر کر چکا ہوتا ہے۔ مگر ہر شخص کی داخلی توانائی برابر نہیں ہو سکتی۔ خارجی حالات بعض صورتوں میں ایک شخص کے داخلی توانائی کے سوتوں کو درہم برہم کر سکتے ہیں اور اُس کی داخلی بلندیوں سے پھوٹنے والا اباسین، بحیرۂ عرب میں گرنے کی جگہ گنگا میں مل کر اپنی شناخت کھو سکتا ہے۔ صد ہزار شکر کا مقام ہے کہ داخل کی سرزمین پر اتنے بڑے بھونچال اور اتنی گہری تبدیلیاں

بہت ہی شدید خارجی حالات کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ مکر اور فریب کے تانے بانے پر کڑھے ہوئے موقع پرستی کے عارضی پھول معمولی سی ہوا پر بھی داخل میں وہ عارضی تبدیلیاں پیدا کر لینے پر قادر ہوتے ہیں جو بڑے سے بڑا بھونچال بھی ایک عام سی شخصیت کے داخل میں پیدا نہیں کر پاتا۔ ایسے فرد ذہنی امراض کے شکار ہوتے ہیں اور ذہنی مریض نغمی کی بھنبھن تو بُن سکتا ہے، ایک سچا پھول نہیں چُن سکتا۔ اس کے لئے تو تمام پھول، تمام پیڑ، تمام بلوط — محض عطریات، عمارتی لکڑی، اور سوختنی لکڑی کے کاروبار کا سامان ہوتے ہیں۔

ذہنی مریض "فن کار" بن سکتے ہیں، اس امر میں کوئی شبہ نہیں۔ مگر ایسے فن کار سب کو ذہنی مریض نہیں بنا سکتے، چاہے وہ کتنا ہی "بڑا" فن تخلیق کر لیں کیونکہ فن تو عبارت ہے دانائی سے، توازن سے، جمال سے، جمالِ حیات سے——— اور ایک ذہنی مریض کسی صورت توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ایک غیر متوازن ذہن کی سچائی کسی صورت میں دانائی نہیں ہو سکتی۔ ایک نادان کا احساسِ جمال حرارت اور روشنی کا ذکر تو کر سکتا ہے، اُن میں تمیز پر قادر نہیں ہو سکتا، اور تفریق کرنے کی صلاحیت سے عاری فرد، جمالِ حیات تو دور کی بات ہے، جلالِ حیات کی تاب بھی نہیں لا سکتا۔ فن کا ایک عام ناظر، سامع یا قاری بھی، جو تھوڑے پڑھے کو ہی بہت جانتا ہو، اتنی سی بات ضرور جان سکتا ہے کہ اس وقت اُس کے پیشِ نظر فن ہے یا ردِّ فن، دانائی ہے یا ردِّ دانائی، توازن ہے یا ردِّ توازن، جمال ہے یا ردِّ جمال، جمالِ حیات ہے یا ردِّ جمالِ حیات۔

قاری، ادیب اور حکمت کی گفتگو میں، ادیب اور معاشرے کے تعلق کی علامت بن کر در آتا ہے۔ معاشرہ ادیب کے لئے ایک چھلنی کا کام دیتا ہے۔ کثیف ادب اس چھلنی سے ورے ہی رہ جاتا ہے، نسبتاً لطیف ادب اس چھلنی کے پار تک اپنے پاؤں پھیلا لیتا ہے حتیٰ کہ وقت کی باریک چھلنی اُس کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور حقیقتاً لطیف ادب ہی اس چھلنی کی دوسری سمت کی فضا دیکھ سکنے پر قادر ہوتا ہے۔

یہ ادیب اور معاشرے کی گفتگو تھی، درحقیقت ادیب اور ادیب کے احساسِ ذمہ داری کی گفتگو ہے، چاہے یہ قاری کا معیارِ نظر بلند کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے سے متعلق، چاہے قاری کی کور ذوقی اور ادیب کی اپنی بلندیوں پر براجمان رہنے کی آزادی کے حوالے سے۔ دونوں صورتوں میں ادیب کی ایک ذمہ داری ضرور بنتی ہے اور وہ یہ کہ اپنے قاری کی تربیت کرے، جن دنیاؤں میں وہ رہتا ہے اُن دنیاؤں کی سیر وہ اپنے قاری کو بھی کرائے، جس طرح اس نے پائی، اسی طرح وہ اُن عالموں کی شہریت اپنے قاریوں کے لئے حاصل کرے اور یوں ابلاغ کا مسئلہ ایک بار پھر بغیر بحث کے طے ہوتا ہوا اس گفتگو کو معاشرے اور حکومت کے باب میں داخل کر دیتا ہے۔

حکومتیں اپنے آپ کو مملکت کی محافظ کہتی ہیں۔ درحقیقت وہ معاشرے کی پاسبان ہوتی ہیں، معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہیں معاشرے کے رویوں کی عکاس ہوتی ہیں۔ معاشرہ حکومتیں تخلیق کرتا ہے۔ جیسا معاشرہ ہوتا ہے، ویسی ہی حکومتیں ہوتی ہیں۔ جن عقاید پر معاشرہ کاربند ہوتا ہے، حکومتیں، انہی عقاید کی پاسداری میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ سو ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ معاشرہ مملکت سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے اور وہ بھونچال دیکھنے میں آتے ہیں کہ مملکت دو نیم ہو جاتی ہے۔

تمام حکومتیں اپنے آپ کو مملکت کی نگہبان اور معاشرے کی خادم کہتی ہیں۔ چاہے صورت حال اس سے صد فی صد برعکس ہو۔ اور اسی برعکس صورت حال میں ایک بار پھر ادیب کی موجودگی اور اس کی ذمہ داری کی گفتگو چل پڑتی ہے۔ معاشرہ ادیب کے انتباہات کو قبول نہیں کرتا۔ حکومت معاشرے کی خادم ہونے کے ناتے ادیب کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ حکومت مملکت کی نگہبان بھی ہوتی ہے، وہ ادیب کے انتباہات کی وسیع تر تشہیر میں معاون نہ ہو کر معاشرے کو سوچنے کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

آج کے ادیب کی ذمہ داری کیا ہے؟ وہی جو کل کے ادیب کی ذمہ داری تھی——— وہی جو اس سے پہلے کے ادیب کی ذمہ داری

تھی —— وہی جو آج کے بعد اور اس کے بعد آنے والے ادیب کی ذمہ داری ہوگی —— ہر حکومت کو صرف مملکت کے منسلک مفادات سے ہم آہنگ اقدامات پر آمادہ رکھنا اور مملکت کے تخریب پسند عناصر میں سے معاشرے کے مفادات کو ترک کر دینے کا حوصلہ بخشنا۔

اگر کوئی ادیب اپنی وفاداریاں صرف معاشرے سے وابستہ رکھتا ہے تو وہ ایک طرح ایک خاص عہد میں کسی خاص حکومت کا آلۂ کار بن کے رہ جاتا ہے یا کسی خاص عہد میں آنے والی حکومت کے لئے کام کرنے والا سیاسی کارکن بن کے رہ جاتا ہے۔ ایک ادیب کی وفاداری کا مرکز اگر مملکت ہے تو آنے جانے والی حکومتیں اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس کے لئے یہی خوشی بہت ہے کہ اس کی مملکت قائم ہے، اس کا وجود برقرار ہے، اس سے ہم نفس زندہ ہیں۔

ایک پاکستانی ادیب کی وفاداری سہ جہتی ہے۔ اس کی پہلی وفاداری مملکت سے ہے جو ایک رقبہ اور ایک آبادی پر مشتمل ہے۔ اس کی دوسری وفاداری قرار دادِ مقاصد سے ہے اور اس کی تیسری وفاداری معاشرے کی بہتری سے ہے۔ اگر کوئی ادیب ایک وقت تینوں جہات میں یقین کا حامل نہیں تو وہ پاکستانی ادیب نہیں۔ وہ ایک ترقی پسند ادیب نہیں۔ وہ ایک اسلام پسند ادیب نہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں —— نہ قومی نہ بین القومی۔

بین القومیت کے حوالے سے یہ بات [illegible] دیکھنے میں آ رہی ہے کہ ہمارے [illegible] نہیں مانتے ہیں بلکہ مملکت کے مفادات کی نسبت بین القومی مفادات کا ذکر زیادہ رہا۔ اور آئندہ بھی یہی کچھ نظر آ رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوا، رہا یا ایسا ہوتا چلے جانے کے امکانات کیوں روشن تر ہیں؟ اس کا ایک سبب تو ہماری مملکت کی غیر معمولی جغرافیائی سرحدیں ہیں۔ دوسرے ہمارا انتقادی شعور ایک طویل عرصے سے غیر جغرافیائی پیدا رہا ہے۔ جغرافیائی حقائق سے ہماری گونا گوں [illegible] ہمارے [illegible] کا حصہ بن گئی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے ادیبوں کو ایک بار پھر پورے وثوق اور بھرپور اعتماد کے ساتھ مملکت کے مفادات کو سامنے رکھ کر معاشرے کی تربیت کے لئے آگے آنا ہے تاکہ ہماری خواہشوں کا بچپن کچھ کم ہو اور تمام حکومتیں —— موجودہ اور آنے والی تمام حکومتیں —— یہی [illegible] مملکت کی نسبت [illegible] ہو کر مملکت کے مفادات میں لچک بڑھا سکیں۔

ایک مملکت کے تصور کا جامع ترین اظہار اس کا تشخص ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خاص انعام کے طور پر ہم اس عہد میں ایک نمایاں ترین شخصیت کے حامل ہیں۔ پاکستان زندہ ہے کہ اقبال زندہ ہے۔ اقبال زندہ ہے کہ ہم زندہ ہیں —— ہم جو پاکستانی ادیب ہیں —— ہم جو پاکستان کا تشخص ہیں۔

جدید فکشن کے تخلیقی اور تنقیدی رویّے

فتح محمّد ملک

"وہ لوگ جو اپنی جڑوں سے منکر ہیں بڑے سکالر تو شاید بن جائیں مگر بڑے فن کار کبھی نہیں بن سکتے۔ ادب، ادیب کی اصل ہے، ادیب کی جڑوں سے کاملاً وابستہ ہے۔ تمام عظیم فن کار اپنی قوم سے، اٹوٹ رشتوں میں منسلک تھے۔ ٹالسٹائی، دستوفسکی اور گوگول نے ہر ممکن حد تک روسی بننے کی کوشش کی۔ بڑے ادیبوں میں صرف کافکا ایسے شخص تھے جن کی جڑیں نہیں تھیں مگر انھوں نے اپنی جڑیں ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ عمر بھر جڑوں کی تلاش میں رہے۔"

یہ ۱۹۷۸ء کا نوبل انعام حاصل کرنے والے امریکی ناول نگار آئزک سنگر کے خیالات ہیں۔ آئزک سنگر قومی وابستگی کو اپنی عظمت کا سب سے بڑا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ سنگر نے نیویارک ٹائمز کے سنڈے میگزین میں آفاقیت اور مقامیت کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ:

"آفاقیت کے زعم میں مبتلا کوئی بھی شخص اچھا ناول یا افسانہ نہیں لکھ سکتا اس لئے کہ لکھنے والا اپنے قبیلے، اپنے لوگوں سے پیوستہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص آفاقی ناول لکھنے بیٹھے اور صرف محض انسان کے بارے میں لکھنا چاہے تو کبھی نہ لکھ سکے گا۔ بات یہ ہے کہ محض انسان کا تو کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو انسانوں کی محبت کی کہانی، ان کے مخصوص ماحول اور مقامی پس منظر کو پیش کئے بغیر کہی ہی نہیں جا سکتی۔ صرف ایک خاص ماحول میں رہنے والے خاص طرح کی زبان بولنے والے مخصوص افراد ہی فکشن کا موضوع بن سکتے ہیں۔"

یہ خیالات ہمارے ان ادیبوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں، جو وسیع المشربی اور آزاد خیالی کی دھن میں، اپنی قوم سے لاتعلقی اور مقامی آب و رنگ سے بے نیازی پر ناز کرنے کے خوگر ہیں۔ فن اور فن کار کے تعلق پر آئزک سنگر نے یوں اظہارِ خیال کیا ہے:

"ادب میں دریافت کے عمل کا رُخ اتنا اسلوب کی طرف نہیں ہونا چاہیے جتنا زندگی کے نت نئے رنگوں اور نئی سے نئی جلوہ گاہوں کی جانب۔ وہ ادیب جو ہر وقت اپنی ذات اور اپنے اسلوب میں محو رہتا ہے وہ کبھی کوئی نئی فنی دریافت نہیں کر سکتا۔ فنی عظمت کا مرحلہ صرف وہی ادیب طے کر سکتے ہیں جو دوسرے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ٹالسٹائی، بالزاک، ڈکنز، دستوفسکی اور گوگول نے اپنی ذات کو فن کا موضوع کبھی نہیں بنایا۔ ان لوگوں نے حتی الامکان صیغۂ واحد متکلم کے استعمال سے بھی گریز کیا ہے۔ ادیب میں کم از کم کچھ دیر کے لئے تو خود کو بھول جانے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔"

بیسویں صدی کے ادب میں داخلیت پسندی کے انتہائی رجحان پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے سنگر نے تخلیقی عمل کے باب میں نفسیاتی نظریات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

"ہمارے عہد میں فرائیڈ کے زیرِ اثر اپنی ذات کی اسیری کا رجحان خوب پھلا پھولا۔ یار لوگ اپنے آپ میں، اپنے چھوٹے جذبوں اور معمولی دکھوں میں کھو کر رہ گئے۔ یہ حقیقت انیسویں صدی کے ادیبوں پر خوب روشن تھی کہ ادب کے لئے سونے کی اصل کان ادیب کی ذات کی بجائے دوسرے لوگ ہیں۔ چیخوف کے ہاں ایک بھی ایسا افسانہ نہیں ملتا جس کا موضوع اس کی اپنی ذات ہو۔ میں شعور کی رو کی تکنیک کے خلاف ہوں

کیونکہ یہ تکنیک ہر وقت اپنے آپ سے بڑبڑاتے رہنے کا نام ہے۔"

رچرڈ برگن نے جو سنگر کو انٹرویو کر رہے تھے، شعور کی رَو کی تکنیک میں فاکنر اور جوائس کی فنی تخلیقات کا حوالہ دیا تو موصوف نے کہا کہ:

"میں نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کا فن حقیقی عظمت کا حامل ہے۔ یہ بات کہ کوئی شخص کیا سوچ رہا ہے ہمیں اس کے بیان سے نہیں بلکہ اس کے عمل سے معلوم ہو سکتی ہے۔ ایک آدمی گھنٹوں آپ کے سامنے یہ تقریر کر سکتا ہے کہ وہ کیا سوچتا ہے مگر واقعتاً وہ ہے کیا؟ یہ ہمیں اس کے اعمال ہی بتا سکتے ہیں۔ ٹالسٹائی اور دستوفسکی بھی کبھی کبھی ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کے ہیرو دل ہی دل میں کیا سوچ رہے ہیں مگر ان کے ناول عمل سے بھرپور ہیں۔ فی الحقیقت شعور کی رَو کی تکنیک کہانی اور کردار نگاری سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے اور بہت آسان ترکیب ہے۔ ناول نگار ایک کردار کو اجازت دیتا ہے کہ وہ تین سو صفحات تک بڑبڑاتا چلا جائے۔ شعور کی رَو کی ان خامیوں کے باوجود غیر معمولی ذہانت کے حامل فن کار کے لیے کوئی بھی تکنیک اہمیت نہیں رکھتی۔ عظیم فن کار شعور کی رَو میں بھی بھرپور عمل کا جلوہ دکھا سکتا ہے مگر میرے خیال میں ابھی تک اس تکنیک کو اس طور پر نہیں برتا گیا۔"

جب ۴۰ سال سنگر سے فن پر خوابوں کے اثرات کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ:

"میں ہمیشہ سے خواب دیکھتا چلا آیا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ نیند کی آغوش میں پہنچتے ہی ہم سب جینیئس بن جاتے ہیں کیونکہ نیند میں ہم غیر متوقع معنی خیز اور پُراسرار چیزوں کو شدید جذباتی انہماک کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے خوابوں کا خالق ایک فانی جینیئس ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک صوفی، ایک علامت نگار اور ایک کٹر حقیقت نگار ہوتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ بیشتر لوگ جاگتے میں خواب دیکھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ صرف سوتے میں خواب دیکھتے ہیں اور پھر ان میں بیشتر خوابوں کو وہ بیدار ہوتے ہی بھول جاتے ہیں۔ ایسے لوگ فن کار کو خواب کار کا نام دیتے ہیں اور اس میں صداقت کا شائبہ موجود ہے۔ تخلیقی عمل بڑی حد تک خواب دیکھنے کا عمل ہے۔ تخلیق کاری اور خواب کاری میں صرف ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ خواب میں جو عمل دو منٹ میں ممکن ہے اسے تخلیقی اور فنی روپ دینے میں بسا اوقات دو سال کی مدت بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔"

عصرِ حاضر میں بِن کہانی، بغیر پلاٹ، اور بسا اوقات بِن کردار کے ناول کا رواج عام ہے مگر آئزک سنگر اسے فکشن کے زوال کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں۔ انھیں اس بات سے بھی اختلاف ہے کہ ناول کی صنف قریب المرگ ہے۔ انھیں ناول اور افسانے کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے اور وہ کہانی کے ان فنی لوازم کی پابندی ضروری خیال کرتے ہیں جو ارسطو نے مقرر کیے تھے، چنانچہ اپنے ناولوں اور افسانوں میں پلاٹ کو ضروری سمجھتے ہیں اور ارسطو کی مقرر کردہ حدود کے مطابق کہانی کے باقاعدہ آغاز، نشو و نما، نقطۂ عروج اور انجام کے قائل ہیں۔ کردار نگاری کے ضمن میں سنگر کے خیالات خود انھی کے الفاظ میں پڑھیے:

"پلاٹ کے لیے کرداروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں بجائے کردار ایجاد کرنے کے ان لوگوں کی طرف دیکھتا ہوں جن سے میں اپنی زندگی میں مل چکا ہوں۔ میں کردار اس لیے ایجاد نہیں کرتا کہ خالقِ اکبر نے اربوں کھربوں کردار پہلے ہی سے ایجاد کر رکھے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ عالمِ انسانیت کی اربوں سال پر پھیلی ہوئی تاریخ میں آج تک ایک دوسرے کے ساتھ قطعی مشابہت رکھنے والے کوئی سے دو شخص پیدا نہیں ہوئے۔ جس طرح انگلیوں کے نشانات پڑھنے کے ماہر نشانات ایجاد نہیں کرتے بلکہ پہلے سے موجود نشانات کو پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں اسی طرح ادیب خدا کے تخلیق کردہ کرداروں کو پڑھنے کا فن سیکھتے اور برتتے ہیں۔"

عہدِ حاضر کے ایک اہم تخلیقی فن کار کے یہ چند خیالات موجودہ دور کی اردو فکشن کے تخلیقی اور تنقیدی رویّوں کو سمجھنے میں چاہے ہماری زیادہ مدد نہ کریں مگر یہ ایسے متنازعہ فیہ خیالات ہیں جو ہمیں غور و فکر کی ترغیب ضرور دیں گے اور میری نظر میں یہی ان خیالات کی اہمیت ہے۔

پنجاب میں اردو

ایک تبصرے پر تبصرہ

حافظ محمود شیرانی

[پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی معرکہ آرا کتاب "پنجاب میں اردو" پہلی بار ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب پر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کا مخالفانہ تبصرہ رسالہ "اردو" کے شمارہ جولائی ۱۹۲۸ء میں چھپا۔ اس جانبدارانہ تبصرے سے شیرانی صاحب کو افسوس ہوا، چنانچہ ڈاکٹر محی الدین زور قادری کے نام اپنے ۲ر اپریل ۱۹۲۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"پنجاب میں اردو کے متعلق آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے لئے آپ میرا شکریہ قبول کیجئے۔ عبدالحق صاحب کے تبصرے نے تو مجھ کو سخت مایوس کیا ہے بلکہ میں اس کو بیداد سمجھتا ہوں۔"

شیرانی صاحب کے کاغذات کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے ایک نامکمل مضمون کا مسودہ ہاتھ لگا۔ اسے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مولوی صاحب کے "پنجاب میں اردو" پر محولہ بالا تبصرے کے جواب کا خاکہ ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ جواب کبھی تکمیل پاکر شائع نہیں ہوا۔ (مظہر محمود شیرانی)]

قولہ: "یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جو شخص پنجاب سے ہو یا وہاں رہ کر دہلی آئے تو وہ اپنی زبان دہلی میں رائج کرے گا۔ وغیرہ"

مولانا، غزنوی دور میں مسلمانوں کے قیام پنجاب کو، جو پانچویں صدی ہجری کی ابتدا سے چھٹی صدی ہجری کے خاتمہ تک رہا ہے بالکل فراموش کر دیتے ہیں، اور مسلمانوں کے وہاں قیام و بود و باش وغیرہ کے قصہ کو نسیاً منسیا قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ وہ زمانہ ہے جس میں مسلمان ہندوستان میں آباد ہو کر ہندوستانی بن جاتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اختیار کرتے ہیں، اور ہندی زبان میں وہ ترمیم شروع کر دیتے ہیں جس کے اصول پر اردو زبان بعد میں نشو و نما پاتی ہے مثلاً کوٹوال کا کوتوال، پانڑی کا پانی بنا لیا گیا۔ مولانا کا یہ خیال محض دور از کار ہے کہ "پنجاب کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہاں کوئی زبان مستقل صورت بن سکتی۔ وہ اس زمانہ میں اس قدر پامال رہا اور اس کی حالت ایسی ناقابل اطمینان تھی کہ وہاں اس کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی۔" خدا جانے مولانا نے اس سے کیا مراد لی ہے۔

غزنوی دور میں پنجاب کو امن و سکون میسر تھا۔ مسلمان مختلف شہروں میں آباد تھے۔ لوگ کثرت کے ساتھ مسلمان ہوئے، اور ہو رہے تھے حتیٰ کہ البیرونی بھی اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا ایسے ابتدائی زمانہ میں (۴۲۳ھ میں) ذکر کرتا ہے دیکھو کتاب الہند (ص ۹۱) "وقد فتحنا الاسلام کما فتح اکثر ما فی الارض الصند التی اسلوا اھلھا والحمد للہ" یہ جملہ ہندوؤں کی بعض رسوم قبیحہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جب بیرونی کے عہد میں اسلام پنجاب میں شائع ہو رہا ہے تو اس عہد سے دو صدی بعد تو پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد، بذریعۂ مہاجرت از ممالک غیر و تبلیغ، بہت کچھ اضافہ ہو گئی ہوگی۔ ملتان محمود کے عہد سے پیشتر ملاحدہ کے تحت حکومت تھا۔ اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ قطب الدین کے ساتھ جو لوگ دہلی میں آباد ہوئے وہ کون تھے۔ مولانا یہ فرض کر رہے ہیں کہ وہ سب بیرونی تھے اور ہندوستان کے نہیں تھے۔ اگر تاریخ کو بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کا یہ خیال کہ مسلمان جو غزنی، ترکستان اور ایران سے آئے تھے اور کہ وہ پنجاب سے گزر کر دہلی میں آباد ہو گئے، واقعات کے بالکل مخالف ہے۔ اول تو ترکستان سے مسلمانوں کی آمد بہت کچھ قیاس اور مفروضہ ہے۔ یہی حالت ایران کی ہے۔ شہاب الدین کی فوجوں میں ہم



پروفیسر حافظ محمود شیرانی

۱۸۸۰   ۱۹۴۶ء

بڑا عنصر خلجیوں اور افغانوں کا دیکھتے ہیں لیکن جب پنجاب میں غزنوی حکومت محدود ہو چکی ہے اور قطب الدین لاہور فتح کر لیتا ہے تو کیا یہ مان لیا جائے کہ اس کی فوجوں میں قسم کھانے کو بھی اہل پنجاب کو نہیں داخل کیا گیا تھا اور آخر یہ کیوں؟ اس وقت مسلمان پنجاب کے مختلف شہروں میں لاکھوں کی تعداد میں موجود تھے۔ ان میں بیرونی اقوام کے افراد بھی تھے جو غزنوی دور میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اس کے علاوہ ایسے مسلمان بھی تھے جو غزنوی دور سے پیشتر ملتان وغیرہ علاقوں میں آباد تھے۔ اور وہ بھی شامل تھے جو اسلام لے آئے تھے۔ میں دریافت کرتا ہوں کہ شہاب الدین اور اس کا سپہ سالار قطب الدین اس عنصر سے جو پنجاب میں کثیر تعداد میں موجود تھا اور جو تمام بیرونیوں، ترکستانیوں، ایرانیوں اور غزنویوں کے مقابلہ میں زیادہ مفید بھی تھا کیونکہ یہ لوگ اس ملک کی آب و ہوا کے عادی تھے، زبان سے اور رسوم سے واقف تھے، یہاں کے مالیات و ملکی معاملات کا تجربہ رکھتے تھے میں دریافت کرتا ہوں کہ آخر قطب الدین ان لوگوں سے کیوں نہ کام لیتا۔ مولانا کے مفروضہ ترکستانی و ایرانی، جو اس ملک کی آب و ہوا کے عادی نہ تھے، زبان و رسوم سے اجنبی تھے۔ دہلی پہنچ کر اس کو کیا مفید ہوتے۔ دوسرے مولانا کو یہ بھی ثابت کرنا چاہیئے تھا کہ ان ایام میں ترکستان و ایران سے لوگ بڑی تعداد میں اُٹھ کر قطب الدین کے ساتھ دہلی گئے ہیں۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہے ایسی کوئی بڑی مہاجرت کا ذکر ترکستان و ایران کی تاریخ میں نہیں آتا۔ مولانا نے غریب ایرانیوں کو ناحق بدنام کیا ہے۔ وہ فوجی امور کے بالکل نا قابل تھے اور نہ فوجی خدمات ان کے سپرد ہوئیں۔ ملکی یا سول سروس سے ان کا تعلق رہا ہے۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ ترکستان و ایران سے ان ایام میں کوئی بڑی مہاجرت نہیں ہوئی۔ یہ لاکھوں نفوس جو قطب الدین کے ساتھ دہلی جاتے ہیں کہاں سے ابل پڑے۔ صرف غزنین یہ تعداد نہیں دے سکتا تھا ممالک غور سے یہ لوگ نہیں آ سکتے تھے۔ غور کا اور غزنین کا علاقہ نہایت مختصر ہے۔ آخر یہ تعداد کہاں سے آ گئی جس نے دہلی پہنچ کر ہندوستان کے اس وسیع علاقے پر جو ایک طرف گجرات سے ملحق ہے، دوسری طرف ہمالیہ کے دامن سے لگ گیا ہے، تیسری طرف خلیج بنگال تک پہنچ گیا ہے اور جس میں صوبہ دہلی، آگرہ، اودھ، مالوا، بہار، بنگال، راجپوتانہ شامل ہیں، اور جو طاقتور ہندو راجاؤں کے ہمسایہ میں واقع تھا کس طرح فتح کیا اور کس طرح اس قابض ہو گئے اور کس طرح اس کا انتظام کیا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہمیں بغیر پنجاب کی امداد کے مفر نہیں۔ پنجابی زبان سے واقف، ملک کی آب و ہوا کے لیے موزوں تھے۔ یہاں کے انتظامات، طریق جنگ کا ان کو تجربہ تھا۔ اس لئے شہاب الدین اور اس کے جنرل قطب الدین نے ان لوگوں سے یقیناً کام لیا۔ ایک سوال یہ باقی رہتا ہے کہ آیا پنجابی فوجی خدمات کے لئے موزوں تھے؟ اس کے لئے عرض ہے کہ یہ قوم جنگجوئی کے لئے ہمیشہ نامور رہی ہے۔ پنجاب کے جاٹ اور جنجوئے اور کھوکھر جنگی کارناموں کے لئے مشہور رہیں۔ محمود نے پنجابیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ غزنین میں ان کی ایک فوج مقیم تھی۔ اس کے فرزند نے انہیں کرمان بھیجا اور نیالتگین کی سرکوبی کے لئے یہ لوگ تلک کی ماتحتی میں ہندوستان بھیجے گئے۔ جب خود سلطان محمود پنجابیوں کی جنگی استعداد کو مانتا ہے اور ان کو اپنی ترک و افغان و عرب افواج کے ساتھ شامل کرتا ہے تو ہم یقین کر سکتے ہیں کہ اس کے اخلاف و اعقاب نے کیا ان لوگوں سے کام نہیں لیا ہوگا۔ پھر شہاب الدین اور قطب الدین کیا ان سے کام نہ لیتے؟ ہمارے اپنے زمانے میں افواج ہند کا غالب عنصر پنجابی ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں: "مسلمان جو ترکستان و ایران و غزنین سے اُٹھ کر آئے تھے ان کی زبان فارسی تھی اور آپس میں یہی زبان بولتے تھے۔ نوکر چاکروں سے جو مقامی زبان میں ایک آدھ فقرہ بول لیا جاتا ہے اس کی حالت جیسی کچھ ہوتی ہے وہ ظاہر ہے جسے اس کی شان دیکھنی ہو وہ کسی انگریز کو اردو بولتے ہوئے دیکھ لے۔

مولانا کا یہ استدلال نہایت عجیب و غریب ہے۔ اول تو میں یہ تسلیم ہی نہیں کرتا کہ دہلی کے آباد کاروں میں غالب عنصر ایرانیوں اور ترکستانیوں کا تھا۔ ایرانیوں اور ترکستانیوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ لوگ اپنے ممالک سے اُٹھ کر یہاں آتے۔ ایران پر خوارزم شاہیوں کا قبضہ تھا اور خود ان کو فوجی خدمات کے لئے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اب ترکستانی اور ایرانی جو سرد ملک کی آب و ہوا کے عادی ہیں یہاں کیوں آتے جبکہ خود ان کے ملک میں ان کے لیئے ان خدمات کی ضرورت تھی۔ ویسے جو لوگ ہمیشہ نقل مکانی کرتے رہتے تھے، ان کو کسی شمار میں نہیں آنا چاہیئے اور نہ وہ آبادی کا نمایاں عنصر

بن سکتے۔

انگریزوں کی مثال بالکل بے محل ہے اس لیئے کہ اکثر مالی و ملکی ملازمتیں خود ہندوستانیوں کے پاس ہیں۔ دوسرے جب ہندوستانیوں نے انگریزی سیکھنی شروع کر دی ہے تو ان کو کیا ضرورت ہے کہ ہندوستانی زبان سیکھیں لیکن غزنویوں اور غوریوں کا زمانہ بالکل مختلف تھا۔ ہندوؤں کی آبادی اس عہد کے ہندوؤں کے برخلاف مفتوح ہونے کی حالت میں بھی بالکل قدامت پرست تھی۔ انھوں نے تبدیلی حکومت کے باوجود اپنی معاشی داخلی زندگی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ آج جب کہ چند لاکھ صاحب بہادروں کی خاطر تمام ہندوستان انگریزی سیکھنے پر آمادہ ہے اور اپنی داخلی و خارجی زندگی میں ہر قسم کے انقلاب کو ترتیب دے رہا ہے، اس عہد کا ہندو اپنی روایات قدیمہ کا پابند تھا۔ اس نے ایک اجنبی سلطنت کا جوا اپنے سر پر لے لیا لیکن اور امور میں اس نے سلطنت کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ اس نے اجنبی سلطنت کی زبان سیکھنے یا سلطنت کے عہدے مانگنے کی مطلق خواہش ظاہر نہیں کی۔ اس کا جہاں تک بس چل سکا عدم تعاونی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ فاتحین کو باوجود طاقت کے مختلف امور میں مفتوحین کے قواعد و ضوابط کو اختیار کرنا پڑا۔ سکہ میں بھی انھوں نے تین صدیوں تک مفتوحین کے جذبات کا احترام کیا۔ محمود کے جانشینوں نے ہندوستان میں جو سکہ جاری کیا تھا، اس میں ایک طرف سوار اور دوسری طرف نندی بیل ہوتا تھا اور دونوں طرف یا ایک طرف سنسکرت الفاظ منقوش ہوتے تھے۔ زبان کی بھی یہی حالت تھی۔ فاتح گروہ مفتوحین کی زبان سیکھنے پر مجبور تھا۔ یہی نہیں بلکہ خود فاتحین میں ایسی جماعتیں تھیں جو مختلف زبانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ مثلاً ترک، افغان، خلج، ایرانی، عرب، ہندی مسلمان اور ہندو اپنی اپنی مختلف بولیاں بولتے تھے۔ ایرانیوں کے سوا باقی جماعتیں فارسی سے ناواقف تھیں۔ یہی حالت عربی کی تھی۔ یہی حالت ترکی کی تھی۔ اب ایک ایسے مجموعۂ اضداد کے لئے ایک ایسی زبان درکار تھی جس میں وہ خود گفتگو کر سکیں اور ان کی رعایا بھی جانتی ہو۔ اس لئے اس ملک میں آ کر فاتحین کو شروع ہی سے یہاں کی کوئی نہ کوئی زبان اختیار کر لینی پڑی ہے۔

پگ، منھ، انب، گڈی، تل وغیرہ الفاظ کے متعلق جو اب اردو میں پاگ، ماٹ، آنب، گاڑی اور تال بن گئے ہیں۔ مولانا کا یہ خیال کہ دونو صورتوں میں بولے جاتے تھے اور اب بھی بولے جاتے ہیں۔ فرق یہ ہوا ہے کہ ایک صورت ادبی زبان میں ترک ہو گئی اور دوسری قائم رہی ہیں تسلیم نہیں کر سکتا۔ اول تو ہمیں جہاں تک علم ہے کسی ایک شہر یا قصبہ یا گاؤں میں ان دو لہجوں کا بولا جانا کہ پگ بھی کہتے ہوں اور پاگ بھی، منھ بھی کہتے ہوں اور ماتھ بھی، انب بھی کہتے ہیں اور آنب بھی وغیرہ وغیرہ نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے ہندوستان بڑا ملک ہے۔ مولانا کچھ متعین فرما دیتے کہ کونسے علاقے میں دونوں لہجے جاری ہیں تو اور بھی اچھا ہوتا۔

لیکن یہ مان کر کہ ان ایام میں دہلی میں دونوں قسم کے لہجے رائج ہیں ہم قدرتاً یہ توقع کریں گے [کہ] اس دور کے مصنف جبکہ ابھی زبان فصیح کا معیار قائم نہیں ہو چکا تھا، ان الفاظ کو دونوں طرح ہی سے تحریر میں لاتے مثلاً کھاٹ بھی لکھتے اور کھٹ بھی، پاگ لکھتے اور پگ بھی، بھانڈ لکھتے اور بھنڈ بھی۔ مگر امیر خسرو، ضیاؔ برنی، محمدؔ کرمانی کے ہاں جو آٹھویں صدی کے مصنفین ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ الفاظ لک، پگ اور کھٹ بار بار ملتے ہیں لیکن یہ بزرگ ہر بار اسی شکل میں لکھتے ہیں اور کبھی بھول کر بھی لاکھ، پاگ اور کھاٹ نہیں لکھتے۔ حالانکہ یہ لہجہ بھی دہلی کی ہندو آبادی سے رات دن سننے میں آتا ہوگا۔

حضرت مولانا نے اپنی سنسکرت شناسی کا بے جا استعمال کیا ہے۔ ہمیں آم اور مونگ کی اصل سے کوئی تعلق نہیں، نہ یہ جاننے کی ضرورت ہے جہاں تک کہ اردو کا تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کی زندہ زبانوں سے تعلق میں آئے سنسکرت سے براہ راست ان کو کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس لئے جو ہندی الفاظ انھوں نے اپنے لئے لیے ہیں ہندوستان کی زندہ زبانوں سے لیے ہیں۔ مثلاً میں بھی یہ ہی دو لفظ انبہ اور منگ لیتا ہوں جس کو ساتویں صدی کے مصنفین اسی شکل میں لکھتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ آم کو سنسکرت میں انبہ کہتے ہیں اسی سے انب ہوا اور اسی سے آم۔ مونگ سنسکرت میں مدگ ہے اور اسی مونگ اور منگ بن گیا۔ جامن کو سنسکرت میں جمبو کہتے ہیں اسی سے

جامن اور جمو ہوگیا۔ یہ استدلال ایک فرہنگ نگار کے لئے موزوں ہے نہ اردو کے مورخ کے لئے۔ یہ مانا کہ الفاظ براہِ راست سنسکرت سے لئے گئے ہیں لیکن بحیثیت اُردو زبان کے مورخ کے ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ یہ بھی دکھائیں کہ مسلمانوں نے یہ الفاظ کہاں سے لیئے ہیں۔ اب سنسکرت میں بھی انبہ ہے اور پنجابی میں بھی انبہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فارسی والوں نے یہ لفظ براہ راست سنسکرت سے نہیں لیا ہے بلکہ پنجاب سے یہی حالت مونگ کی ہے۔ پرانی فارسی خواں اس کو منگ لکھتے ہیں لیکن یہ لہجہ پنجاب کا ہے اس لئے یہ کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ لفظ پنجاب سے لیا گیا ہے میں ایک اور لفظ مثال میں پیش کرتا ہوں یعنی 'دند' جو ابوالفرج رونی کے شعر ذیل آتا ہے:

بشکل فیل یک دندش نگہ کن
نعم چوں فیل یک دندش ہزار است

اس بیت میں لفظ 'دند' تشریح طلب ہے۔ صاحبِ فرہنگ رشیدی نے کہا ہے کہ یہ ہندی ہے۔ فرہنگ آنندراج میں مرقوم ہے "گویا این معرّبِ دنت باشد کہ لغت ہندی است" مولانا عبدالحق پھر اپنی سنسکرت کا 'دنتک' پیش کریں گے لیکن ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ ابوالفرج لاہوری ہیں اور 'دند' بمعنی دانت لاہوری لہجہ میں لکھ دیا ہے 'پیل یک دند' سے شاعر کی مراد اک دنتا ہاتھی ہے۔ اب مولانا پھر یہی فرمائیں گے کہ ان الفاظ کو پنجابی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

مگر ایک ایسے بزرگ کو کیا کہا جائے جو یہ کہہ دے کہ "آٹھویں اور نویں صدی کی کتب تاریخ ولغات کی شہادت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں اور فارسی لغات بھی اس معاملے میں مستند نہیں ہوسکتیں"۔ آخر کیا صرف مولانا کو اس بارہ میں سند مان لیا جائے۔

حالانکہ فارسی کتابیں ولغات ان ایام میں اردو کے وجود کے لیئے (ایسے زمانہ کے واسطے جب کہ اس زبان کی تحریری دستاویزیں موجود نہیں) سب سے بہتر شہادت پیش کرتی ہیں لیکن مولانا ان کو بھی نہیں مانتے۔

اردو اور پنجابی صرف ونحو کی مشابہت اور تعلقات کا سب سے بہتر مطالعہ یہی ہے کہ ہم ان میں جو کچھ جزوِ مشترک ہے اس کو معلوم کرلیں۔ مولانا نے اس کے مختلف فیہ عنصر کو لے کر فرمایا ہے کہ ان میں یہ اختلاف موجود ہے۔ یہ تو کسی کا بھی دعویٰ نہیں ہے کہ دونوں زبانیں ایک ہیں۔ آخر جب دو زبانیں ہیں تو اختلاف لازمی ہے اور اگر ہر امر میں ایک دوسری کے موافق ہوتیں تو پھر یہ سوال ہی کاہے کو اٹھتا۔ مولانا اگر صحیح دلیل پیش کرنی چاہتے تھے تو چاہیئے تھا کہ ہندوستان کی کوئی ایک زبان لے کر اردو کا مقابلہ کرکے فیصلہ کرتے کہ اردو فلاں زبان سے نکلی ہے یا اس کے قریب ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اردو سے زیادہ پنجابی سے قریب تر کوئی اور زبان نہیں ہے ورنہ یوں تو ہندوستان کی زبانیں خاصی ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جو تھوڑی بہت مشابہت اردو اور پنجابی میں پائی جاتی ہے وہ اردو کا اثر ہے نہ پنجابی کا۔ میں اس کے ماننے کے لئے تیار ہوں۔ اردو کا اثر آخری زمانہ میں گویا مغلیہ عہد میں، میں کہتا ہوں نہ صرف پنجابی پر رہا ہے بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں پر بھی رہا ہے اور کیا وجہ ہے کہ دارالسلطنت کی زبان دوسری زبانوں پر اپنا اثر نہ ڈالتی لیکن اس سے پنجابی اور اردو کی مماثلت کا پورا حل نہیں ہوتا ان زبانوں کی مماثلت ماہر لسانیات کے لئے بہت کچھ تعجب خیز ہے۔ مولانا تو صرف تھوڑی بہت مشابہت کے قائل ہیں لیکن ہمارے عہد کے لسانیات کے ماہر سر جارج گریرسن دونوں زبانوں کی موجودہ حالت کو دیکھ کر ان کی بڑی مماثلت کے قائل ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ صرف اسی بنا پر انھوں نے پنجابی زبان کو ہندوستانی زبانوں کے مرکزی تقسیم میں شامل کرلیا ہے اور لہندا کو خارجی دائرہ میں رکھا ہے۔ اگر ان کے پاس پنجابی اور اردو کا قدیم ذخیرہ موجود ہوتا جیسا کہ ہمارے پاس ہے تو وہ قطعاً ان دونوں زبانوں کی ایک ہی اصل ثابت کرتے۔ پنجابی اور اردو کی مماثلت صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ سنسکرت سے متخرج ہیں۔ مولانا اس مماثلت کو اردو کے اثر سے یاد کرتے ہیں۔۔ لیکن یہاں پھر ایک سوال ہوتا ہے کہ اردو آخر کوئی قدیمی

زبان تو ہے نہیں جو مسلمانوں کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں موجود تھی بلکہ یہ نتیجہ ہے ہندوستان میں اس انقلاب کا جس کو ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے توطن سے تعبیر کرتے ہیں۔ پنجابی اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل موجود تھی یا دوسرے لفظوں میں اردو کی آمد سے پہلے سے رائج تھی بظاہر حالات تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک پرانی زبان ایک نئی زبان پر اثر ڈالے اور اس کی شہادت بھی ہمیں بعض محاوروں میں ملتی ہے۔ مثلاً ان اردو کے محاورات کو لیجئے، مانگنا تانگنا، دن دہاڑے، چپ چپاتے، اور بلنا جلنا جن کے آخری حصوں کو اہل اردو تابع مہمل مانتے ہیں لیکن جب ہم پنجابی زبان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ مہمل نہیں ہیں بلکہ بامعنی۔ چنانچہ تانگنا کے وہی معنی ہیں جو مانگنا کے ہیں۔ دہاڑا دن کے معنوں میں اور چپاتا چپ کے، اور جلنا چلنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اب اگر یہ اردو کا اثر پنجابی پر ہوتا تو اردو ان الفاظ کی تشریح کر سکتی تھی لیکن جب اردو ان کے معنوں ہی سے ناواقف ہے، اور پنجابی تشریح کر رہی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ پنجابی کا اردو زبان پر اثر ہے۔ محاورے کیا، افعال میں بھی یہی صورت موجود ہے۔ کھڑنا پنجابی میں مصدر ہے جس سے اسم مفعول کھڑا بنا۔ اردو میں صرف کھڑا مستعمل ہے اور مصدر ہونے یا کرنے کے ساتھ ترکیب بنایا جاتا ہے مثلاً کھڑا ہونا یا کھڑا رہنا وغیرہ۔ اس صورت میں کیا وجہ ہے کہ پنجابی کا اردو پر اثر نہ مانا جائے۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "جس طرح اردو مسلمانوں کی ایک عام زبان بن گئی تھی ...... اسی طرح ہندوؤں میں ہندی عام زبان تھی"۔

یہاں مولانا نے بہت کچھ قیاس سے کام لیا ہے۔ آخر ہندوؤں میں یہ کون سی ہندی زبان تھی، راقم کو اس کی متعلق اطلاع نہیں۔ مولانا کو یہ امر واضح [ہو] کہ یہ ہندی جو آج کل اردو کے مقابلہ میں لا کھڑی کی گئی ہے وہ صرف ڈاکٹر گلکرائسٹ کے دماغ کا نتیجہ ہے ورنہ ان کے عہد سے پیشتر اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

سی علامت مستقبل کے سلسلے میں مولانا نے کافی تحقیقات کی ہے۔ وہ سنسکرت تک پہنچے ہیں اس کے بعد اس کو مختلف زبانوں مثلاً گجراتی، مشرقی راجستانی، مرجوائی، بھوج پوری اور سوراسینی اور اپ بھرنش وغیرہ میں اس کی مختلف شکلوں سے بحث کی ہے۔ اور پھر مولانا نے اسی امر پر زور دیا ہے کہ یہ علامت پنجاب سے نہیں آئی بلکہ اس کی اصل سنسکرت ہے لیکن آخر اردو میں یہ علامت کون سی زبان سے آئی؟ یہ سوال بدستور باقی رہتا ہے۔ یہ امر تو بدیہی ہے کہ مسلمان ایران و ترکستان سے تو اسے لے کر نہیں آئے۔ اسی طرح یہ امر بھی صاف ہے کہ سنسکرت سے انھوں نے براہ راست نہیں لیا۔ اور غالباً مولانا میرے ساتھ اس امر میں بھی متفق ہوں گے کہ مرجوائی اور بھوج پوری یا گجراتی سے بھی انھوں نے نہیں لیا، اور جب پنجابی سے بھی مولانا کو انکار ہے تو آخر یہ علامت آئی کہاں سے۔ مشرقی راجستانی میں یہ علامت زیادہ تر شی، شو، شاں ہے تو پھر کیا یہ سمجھا جائے کہ اردو سے یہ علامت پنجابی میں گئی ہے۔

اسی طرح متروک امر کی علامت کھائیں، جائیں ہے جو پھر اردو اور پنجابی میں عام ہے۔ مولانا پھر وہی سنسکرت کو آگے دھریں گے اور تمام زبانوں کی گردن خم دیا کر دیں گے۔

میرے نزدیک ان سب کا ایک ہی حل ہے کہ اردو نے جہاں سے 'سی' اور 'گا' مستقبل، الف آخر اسم میں، نے علامت فاعلیت 'اں' جمع کے لئے لیا ہے وہیں سے 'ایں' امر بھی لیا ہے، اور اگر یہ امور پنجابی اور اردو میں عام ہیں تو یقیناً اردو پنجاب سے ہے۔ اور اگر بھوج پوری اور اردو میں عام ہیں تو یقیناً بھوج پوری سے اردو نکلی ہے اور باقی بحث بالکل فضول ہے۔

حافظ محمود شیرانی کے نام چند خطوط

سید حسن امام، نجیب اشرف ندوی، مولوی محمد شفیع
غلام ربانی عزیز - اور - دیگر

(پروفیسر شیرانی صاحب مرحوم کے کاغذات کھنگالتے ہوئے موصوف کے نام جو خطوط دستیاب ہوئے ان میں سے چند اہل علم کے خطوط ترتیب دے کر "فنون" کی وساطت سے شائع کئے جا رہے ہیں۔ ان میں بعض مشاہیر مثلاً علامہ اقبال، سر شیخ عبدالقادر، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال وغیرہم کے رقعے اور خطوط شامل نہیں کئے گئے جو اپنی اپنی جگہ مستقل موضوعات کا حکم رکھتے ہیں - مظہر محمود شیرانی)

(پروفیسر محمد ابراہیم ڈار - احمد آباد)

(۱)

احمد آباد

۲۲ دسمبر ۱۹۳۶ء

قبلہ شیرانی صاحب مدظلکم العالی

حسب وعدہ مطلوبہ کاغذات[1] ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ کتاب کا نام مفتاح القلوب و ازالۃ الکروب ہے مصنف کا نام عبدالرزاق المشہور بہ اسلام خاں ہے۔ یہ مناقب و کرامات کی کتاب ہے۔ مصنف نے اکثر احوال شیخ زادگان و مریدان سے سنے ہیں۔ کتاب کو لمعات کی طرح مفتاحوں پر تقسیم کیا ہے۔ کل مفتاح ۱۰۷ ہیں جن میں سے پہلے ایک سو ایک تو مصنف نے جمع کئے ہیں اور ۱۰۲ سے ۱۰۷ تک حضرت شیخ جمال نے جو خلف محمود دریائی کے فرزند ہیں، جمع کئے ہیں۔ یہ مفتاح یکساں نہیں بلکہ بعض بہت لمبے ہیں اور بعض بہت چھوٹے۔ اکثر مفتاحوں کے خاتمہ پر مصنف اللہ اعلم بالصواب کی قید لگا دیتا ہے۔ کتاب میں محمود دریائی کے حالات بہت کم دیئے گئے ہیں۔ زیادہ تر کرامتیں درج ہیں مثلاً مردہ زندہ کرنا کھانے میں ضافہ کرنا، بیماروں کو شفا بخشنا الہور ونا، پیش گوئی کرنا۔ آپ کا وطن بیرپور ہے اور آپ مشہور قاضی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اپنے والد شاہ جاالمند کے مرید تھے۔ صاحب حال تھے۔ اکثر پاس کی ایک پہاڑی پر جایا کرتے تھے جس کا نام الت تھا اور مصنف اسے طور سینا سے تشبیہ دیتا ہے۔ آپ نے سیر و سیاحت بھی خوب کی ہے۔ اکثر آپ جانپانیر (جس کا نام محمود بیگڑہ نے محمد آباد رکھا تھا) تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ احمد آباد اور پٹن بھی کئی مرتبہ گئے۔ دکن کی طرف بھی آپ کی سواری کا ذکر ہے۔ آپ چیتوڑ بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے بیرپور میں جامع مسجد کی بنا ڈالی جس کا موذن ایک شخص عبداللہ سندھی تھا۔ آپ کو شکار کا بہت شوق تھا۔ سواری آپ کو بہت پسند تھی۔ سماع آپ اکثر سنا کرتے تھے۔ سلطان مظفر اور بہادر شاہ کو آپ سے عقیدت تھی۔ بہادر شاہ کے سامنے آپ اعلائے کلمۃ الحق سے نہیں جھجکے۔ مصنف جا بجا قاضی صاحب کے دوہے نقل کرتا ہے۔ مصنف نے آپ کے لقب دریائی کی کوئی تصریح نہیں کی لیکن کئی مواقع پر ایسی کرامتوں کا ذکر کیا ہے جس میں آپ نے ڈوبتوں کو بچایا ہے۔ قاضی صاحب کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات دونوں کا ذکر موجود ہے۔ مصنف قاضی صاحب کو شاہ محبوب اللہ، قطب عالم اور پیر دستگیر کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

---

[1] شیرانی صاحب کو صوبہ گجرات کے دبستان اردو پر لکھنے کے سلسلے میں قاضی محمود دریائی کے سوانح حیات درکار تھے۔ اس کے لئے انہوں نے پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب کو مامور کیا جو احمد آباد (گجرات) میں مقیم تھے۔ اس کے جواب میں یہ خط قلمی ہوا۔

سنہ کتابت درج نہیں۔ یہ کتاب پیر محمد شاہ کی درگاہ کے کتب خانہ میں ہے۔ سنی بوہروں کی ایک جماعت اس درگاہ کی متولی ہے۔

آپ کا نیازمند

محمد ابراہیم

آپ کی زندگی میں آپ کی شہرت دہلی و دکن تک پہنچ گئی تھی چنانچہ دہلی سے برہان حلوائی اور دکھن کے دو آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

(۲)

دیوان صاحب کا بنگلہ ۲۴ جنوری سنہ ۴۶ء

رائے کھڈ۔ احمد آباد

استاذ محترم شیرانی صاحب قبلہ مدظلکم تسلیم

تین چار ماہ ہوئے کہ آپ کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا جواب سے اب تک محروم ہوں۔ خدا کرے کہ آپ کا مزاج گرامی بخیر ہو۔

آج میرے حاضر خدمت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شمس العلما عبدالغنی نے آپ کے تبصرہ[۱] کا جواب[۲] لکھ کر اپنے جہل مرکب کا مزید ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ یہ جواب رسالہ 'معارف' کے ضمیمہ کے بطور چھپا ہے۔ اگر آپ کے پاس اس کا نسخہ پہنچ گیا ہو تو خیر ورنہ میں اپنا نسخہ ارسال خدمت کردوں۔ اسی سلسلہ میں دوسری گذارش یہ ہے کہ اگر آپ کی صحت مانع ہو تو آپ کا یہ شاگرد[۳] حاضر ہے تاکہ شمس العلما کے جواب کا جائزہ لے۔ میرے نزدیک ان کی ہر لایعنی چیز کا جواب دینا بے سود ہوگا۔ یہ بہتر ہوگا کہ ایک مختصر مضمون میں ان کے جہل مرکب اور دجل و تلبیس کو آشکارا کر دیا جائے۔ بہر حال میں آپ کے ارشاد کا منتظر ہوں گا۔ والسلام مع الاکرام

نیازمند

محمد ابراہیم ڈار

(سید حسن امام گیا)

گیا جنین منزل — باسمہ سبحانہ — ۱۵ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ

(دوشنبہ) — یکم جنوری سنہ ۱۹۴۵ء

مکرمی۔ سلام مسنون

آپ مجھے جانتے بھی نہ ہوں گے مگر میں آپ سے اسی حد تک واقف ہوں کہ ..... کی وقعت میری نظر میں اسی وقت سے کم ہو گئی۔ جب انھوں نے ..... کو آپ پر ترجیح دی تھی۔

تنقید شعر العجم اور پروفیسر شمس العلما عبدالغنی کی کتاب پر آپ کا مضمون دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ پنجاب میں لائبریری انمول جو ہرات کا خزانہ ہے۔ مجھے مولانا محب اللہ بہاری اور ملا موہن اصلی مولانا محی الدین بہاری کے متعلق معلومات کی ضرورت ہے۔ آزاد بلگرامی کی 'سبحۃ المرجان' اور

---

[۱] شمس العلما عبدالغنی کی کتاب "ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب" (بزبان انگریزی) پر شیرانی صاحب کا تبصرہ رسالہ 'اردو' کے جنوری ۱۹۴۳ء کے پرچے میں چھپا تھا۔

[۲] یہ جواب سید حسن امام کی تحریک پر لکھا گیا تھا۔ ابراہیم ڈار صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"شمس العلما کی توجہ جواب تبصرہ کی طرف سب سے پہلے سید حسن امام نے مبذول کرائی اور ان کو باصرار تمام اس فرض کی انجام دہی پر آمادہ کیا۔"

[۳] شیرانی صاحب کی اجازت سے پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب نے شمس العلما عبدالغنی صاحب کے جواب کا مبسوط جائزہ لیا جو اورینٹل کالج میگزین کے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء کے شماروں میں چھ قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ مضمون "مقالات حافظ محمود شیرانی" کی چھٹی جلد کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔

شیرانی صاحب نے ڈار صاحب کو اجازت دیتے ہوئے اپنے جنوری ۱۹۴۶ء کے خط میں لکھا تھا:

"شمس العلما کا جواب میں نے نہیں دیکھا۔ اگر آپ بھیج دیں گے تو میں دیکھ لوں گا لیکن میری یہ حالت نہیں کہ جواب دے سکوں ..... بیماری نے بالکل گھلا دیا ہے۔ بجد ضعیف ہو چکا ہوں۔ مجھ میں اور قبر میں بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔ اگر آپ جواب کی ضرورت سمجھتے ہیں تو جواب دیجئے ..... یاد رہے کہ زبان اور لہجہ نرم اور مناسب ہونے چاہیئے۔"

ناتراکرام، نیز رحمان علی ریوان والے کی کتاب "تذکرہ علمائے ہند" پیش نظر ہے۔ ان ماخذوں کے علاوہ اگر دیگر ذرائع سے مزید معلومات حاصل ہو سکیں تو بڑا کام نکلے۔ جواب کے لئے لفافہ حاضر ہے۔ زحمت دہی معاف فرمائی جائے

ننگ نام
سید حسن امام غفرلہ

(پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی)

(۱)

۷۸۶

اندھیری۔ بمبئی ۲۵ مارچ ۱۹۴۵ء

مخدوم بندہ نواز۔ سلام نیاز

والانامہ موصول ہوا۔ اس عنایت بے غایت کے لئے ممنون ہوں کہ حجاب دور ہوا۔ اگر ریل کا سفر تکلیف دہ ہے تو ہم نیازمند انشاء اللہ خود حاضر ہوں گے اور روحانی، دماغی اور جسمانی ہر قسم کے فیوض متنوعہ و متفرقہ سے فیض یاب و محظوظ ہوں گے انشاء اللہ۔ میرے آنے کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ میں وہاں سے خالی ہاتھ واپس نہ لوٹوں۔ سنا جب مولوی عبدالحق صاحب وہاں تشریف لے گئے تھے تو واپسی میں آپ نے ان کے ساتھ بہت سی کتابیں کردی تھیں[۱]۔ میری بھی یہی کمزوری ہے۔

جی ہاں وہی رسالہ ہے جس میں کسی ایرانی نے ولادت باسعادت کے متعلق ذلیل ترین باتیں لکھی ہیں۔ تلاش فرمایئے اور مل جائے تو بھیج دیجئے۔ اس کے ساتھ گذارش ہے کہ آپ جن اوراق کو جلانا چاہتے ہیں وہ جلایئے نہیں بلکہ مجھے دے دیجئے۔ ممکن ہے کہ کوڑہ میرے لئے بیش بہا خزانہ اور استاد کا عطیۂ عظمیٰ ثابت ہو۔

جناب پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب مع الخیر ہیں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

آپ کا خادم و نیازمند شاگرد
نجیب اشرف ندوی

(۲)

۷۸۶

اندھیری ۸ جون ۱۹۴۵ء

مخدوم بندہ۔ سلام نیاز

والانامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ اس حالت میں بھی اپنے نیازمندوں کو نہ بھولنا معراج محبت اور میرے لئے باعث صد نازش و افتخار ہے۔ اللہ پاک آپ کو صحت عاجل اور حیات خضری عطا فرمائے ورنہ یقین جانیئے کہ آپ کے بعد عالم بدہن سناٹا ہی سناٹا ہے۔ اللہ پاک ادب و تاریخ ہی کے لئے آپ کو صحیح و سلامت رکھے، آمین۔ از راہ عنایت برادرم اختر[۲] ہی کے ہاتھ سے چند سطریں اپنی صحت کے متعلق لکھوا کر بھیجئے۔ ڈار صاحب[۳] ۱۶ر کو یہاں آرہے ہیں۔

آپ کا نیازمند
نجیب اشرف ندوی

---

[۱] مولوی عبدالحق مرحوم مئی ۱۹۴۳ء کے اواخر میں شیرانی صاحب کی دعوت پر ٹونک تشریف لائے تھے۔ اس سہ روزہ قیام کے بعد واپس جاتے ہوئے میزبان نے مہمان کی خدمت میں انجمن ترقی اردو کے لئے تین سو روپے کی رقم اور چند نایاب کتابیں نذر دی تھیں۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔

[۲] اختر شیرانی صاحب مرحوم۔ [۳] پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب مرحوم

(ڈاکٹر مولوی محمد شفیع)

۴۲ میین روڈ لاہور

20-4-45

مکرمی شیرانی صاحب

آپ نے جو کچھ فرمایا نظر بحالات درست و مناسب ہے[۴۹]۔ عزیز[۴۸] واپس بمبئی جا چکا ہے اور مضمون عنایت نامہ سے میں نے اسے مطلع کر دیا ہے۔ اب اس کا جواب آئے تو کچھ عرض کروں۔

عبداللطیف شوستری کی تحفۃ العالم سے آپ واقف ہوں گے۔ وہ میر عالم شوستری حیدرآبادی کا عم زادہ تھا اور ۱۲۱۶ میں اس نے یہ کتاب لکھی۔ یہ ایران سے ہندوستان آیا۔ یہاں کے حالات میں لکھتا ہے:

"مردم شاہجہان آباد کہ دارالسلطنۃ است بسبب تسلط مغولیہ و شدت امرای قزلباشیہ کہ دراں سرکار بمناصب عظیمہ سربلند بودہ اند زبانی مرکب از عربی و فارسی و ترکی و ہندی اختراع نمودہ اند کہ آنرا ریختہ و زبان اردو گویند در تمامی کشور و جمیع قلمرو، ان زبان کما بیش رواج دارد فصحا بان لغت تکلم کنند و ما بقی ہرکدام از صوبجات را زبانی علیحدہ است۔" (ص ۴۵۹)

آپ کا یہ خیال کہ صاحبِ نوطرزِ مرصع تالیف ۱۲۱۳ نے سب سے پہلے زبان اردوئے معلی ادبیات میں اختیار کیا اس عبارت کی رو سے قدرے مشکوک معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایرانی نوطرزِ مرصع سے واقف ہو یا اس کی وضع کردہ اصطلاح دو تین سال میں اتنی شائع ہو جائے کہ ایک اجنبی اس کو اس بے تکلفی سے ایک مشہور اصطلاح کے طور پر استعمال کرے۔

امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

والسلام
محمد شفیع

(رادھا کرشنا جالان[۵۰] پٹنہ)

QUILA HOUSE

PATNA CITY

24-7-45

DEAR PROFESSOR SHAIRANI

IT HAS GIVEN ME THE GREATEST PLEASURE TO HAVE YOUR ACQUAINTANCE DURING MY VISIT TO TONK. LEARNED, NOBLE AND ABLE MAN LIKE YOU ARE VERY RARE. I HOPE YOU WILL BE GOOD ENOUGH TO FULFIL MY WISHES BY VISITING PATNA SOME DAY. IT IS MY HONEST WISHES AS VERBLY REQUESTED YOU THAT YOU

---

۴۸ پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب اپنے صاحب زادے احمد ربانی صاحب کی خواہش پر شیرانی صاحب کا مجموعۂ مسکوکات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے صرف چاندی کے سکوں کے پانچ ہزار لگائے۔ شیرانی صاحب نے جواب میں انھیں لکھا کہ چاندی کے سکوں کے وزن کے اعتبار سے چاندی کے مروجہ نرخ کو دیکھتے ہوئے بھی دس ہزار روپیہ قیمت بنتی ہے۔ مولوی صاحب کا یہ فقرہ اس کا جواب ہے۔

۴۹ احمد ربانی صاحب مراد ہیں جو غالباً ملازمت کے سلسلے میں بمبئی میں مقیم تھے۔

۵۰ ان صاحب نے شیرانی صاحب کا مجموعۂ مسکوکات (طلائی و نقرئی) مبلغ تیس ہزار روپے میں خرید کیا تھا۔ اس مقصد سے یہ جولائی ۱۹۴۵ء میں ٹونک آئے تھے۔ واپسی پر ان کی خواہش کے مطابق شیرانی صاحب بے پورتک ان کے ساتھ گئے۔ یہ خط انھوں نے واپس پٹنہ پہنچ کر لکھا تھا۔

WOULD KINDLY GRACE ME BY YOUR AUGUST VISIT.

I AM FEELING VERY SORRY FOR NOT BEING ABLE TO OFFER YOU RETURN FARE FROM JAIPUR, THOUGH I FEEL IT WAS MY DUTY WHEN I MADE YOU TO COME TO JAIPUR. THOUGH THE AMOUNT IS VERY SMALL STILL I EARNESTLY REQUEST YOU TO KINDLY ACCEPT, JUST TO OBLIGE ME AND PARDON ME ON MY NEGLIGENCE.

I SHALL WRITE TO YOU THE YEAR AND WRITER'S NAME OF THE QORAN ABOUT WHICH I SPOKE TO YOU.

HOPING YOU ARE KEEPING FIT.

WITH KINDEST REGARDS

YOURS SINCERELY

RADHA KRISHNA JALAN

(بیگم خدیجہ فیروز الدین)

۳۷ ملتان روڈ۔ لاہور

20-8-45

مکرمی محترمی زاد عنایتکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ایک عرصے سے آپ کی عافیت معلوم نہیں۔ برادر مرحوم کی وفات کے بعد ہم مزید مصائب کا شکار رہے اس لئے قلم نہ اُٹھایا۔ عبدالستار خاں آپ کی شفقتوں کو نہیں بھولا۔ ہمیشہ یاد کرتا ہے اور آپ کے فیض صحبت سے محرومیت کا احساس دل میں لئے ہے۔

عبدالستار خاں کا تھیسس ابھی ممتحنوں کے پاس ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں یونیورسٹی کو پیش کیا تھا۔ دو سال ہونے کو آتے ہیں۔ نہ معلوم اس بے حسی کے لئے کون ذمہ دار ہے۔ محققین کو تین سال تیاری کے لئے دیئے جاتے ہیں اور دو سال وہ اپنے نتیجے کے لئے گھڑیاں (گنا) کریں۔

آں محترم کو یاد ہوگا کہ میں نے سلطان معزالدین پر کچھ کام شروع کیا تھا۔ پھر وہ واقعۂ فاجعہ پیش آیا جس نے دل و دماغ کو بے حس بنا دیا دو سال اس طرح گزر گئے۔ اب عزیز عبدالستار خاں کے اصرار پر پژمردہ دل کے ساتھ ان اوراق کو جو طاق نسیاں کی زینت ہو چکے تھے نکالا ہے۔ یونیورسٹی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری میں جو مواد حاصل ہو سکا اس سے میں پہلے ہی استفادہ کر چکی ہوں۔ اب یہاں کوئی نئی چیز نظر نہیں آتی۔ لکھنؤ پبلک لائبریری میں تاریخ الفی کا قلمی نسخہ بھی دیکھ لیا تھا۔ خدابخش لائبریری میں عرفات العاشقین دیکھنی باقی ہے۔

اگر آں محترم کی نگاہ میں کوئی اور ماخذ ہوں تو مجھے ان تک پہنچایئے۔

خوشحال کے متعلق بھی کچھ امداد درکار ہے۔ تھیسس کو طبع کروانا ہے اس لئے ضروری ہے کہ جتنا مواد اور مل سکے شامل کیا جائے۔

اپنی صحت سے بھی مطلع کیجیے۔

والسلام بالاحترام

دعاگو

خاکسار خدیجہ بیگم فیروز الدین عفی عنہا

(ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں)

۷۸۶

کنگ ایڈورڈ کالج
امراؤتی (برار)

۲۴ اگست
۱۹۴۵ء

مخدومی السلام علیکم

تعارفاً عرض ہے کہ میں اس کالج میں اردو پڑھاتا ہوں اور سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ) پر تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ عرصہ ہوا کہ لاہور میں پروفیسر محمد ابراہیم صاحب کے ساتھ حاضر خدمت ہوا تھا اور تاریخ بہرام شاہ غزنوی کے متعلق آپ سے استفادہ کیا تھا۔

(۱) سید حسن غزنوی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے چاہتا ہوں کہ ہر صنف کلام کی مختصر تاریخ بھی دے دوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کے وقت تک اس صنف میں کتنی ترقی ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں آپ کی کتاب تنقید شعر العجم سے بہت فائدہ ہوا لیکن ترکیب بند اور ترجیع بند کے قدیم نمونے مجھے کہیں نہ مل سکے۔ لباب وغیرہ میں بھی سید حسن کے پہلے کے نمونے نہیں ملے۔ آپ کی نظر میں ہوں تو مطلع فرمائیے۔

(۲) سنجر کے مشہور وزیر ابوالقاسم قوام الدین (م ۵۲۸ھ) کا نام "معجم البلدان (۲: ۵۶۹) میں ناصر بن علی ہے"۔ حبیب السیر (۲: ۴: ۱۰۲) میں ناصر بن حسن ہے اور "آثار الوزراء" (بانکی پور) میں ناصر بن حسین ہے۔ سید حسن کے ایک قصیدہ میں ناصر بن حسین نام آیا ہے لیکن نجم الدین لقب ہے۔ اس کے لئے آپ کا فیصلہ کیا ہے؟ —— یا یہ کوئی دوسرا وزیر ہے۔

(۳) خالد بن ربیع کو "لباب" (۲: ۱۳۸) میں الملکی لکھا ہے لیکن آپ نے کتاب تنقید شعر العجم میں (۲۰۶-۲۵۸) المالکی لکھا ہے۔ یہی صحیح ہوگا کیونکہ سید حسن نے بھی ایک قصیدے میں خالد مالکی لکھا ہے۔ معلوم نہیں کہ آپ کو "مالکی" صحیح قرأت کا خیال کیوں کر پیدا ہوا۔ واقعی آپ کی قرأت صحیح ہے۔

(۴) سید حسن کا ایک ممدوح۔ ع —— صدر باعزت و با مرتبہ عبدالجبار —— ہے۔ اس کا حال معلوم نہیں ہوا اور قصیدے میں بھی کچھ تفصیل نہیں ہے: صدر کے معنی وزیر محض نہ لئے جائیں بلکہ صدر دین لئے جائیں تو پھر عبدالجبار ضرور اس عہد میں مفتی بیہقی (تتمہ۔ عربی۔ ص ۲۱۵) ملتے ہیں۔ آپ کے مفید مشورہ کا طالب ہوں۔ امید ہے کہ جلد جواب سے سرفراز فرمائیں گے[۱]۔

(۵) سنائی کا قصیدہ (خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ است) سید حسن کے دواوین میں بھی ملتا ہے۔ فقط والسلام۔

نیازمند غلام مصطفیٰ خاں

(شیخ عبدالعزیز[۲] بار ایٹ لاء)

16-1-46

4 DAVIS ROAD
LAHORE

مکرمی و محترمی۔ السلام علیکم

آپ ہرگز اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آج جو آپ کا لفافہ آیا اس کو دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کے متعلق ایک وحشت ناک خبر[۳] ایسی سنی تھی کہ اس سے ہوش اڑ گئے۔ لاہور میں ہر ایک سے دریافت کرتا پھرا۔ کسی سے کچھ پتہ نہ ملا۔ آپ کو کارڈ لکھا۔ اس کا جواب بھی بہت دیر کے بعد آج آیا ہے۔

---

[۱] اس خط کا جواب جو شیرانی صاحب نے ارسال کیا تھا۔ محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب (حیدرآباد سندھ) نے عطا فرمایا ہے۔ اسے شیرانی صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

[۲] شیخ عبدالعزیز صاحب بار ایٹ لا، (بٹالہ والے) سے شیرانی صاحب کا تعارف قیام لندن کے عرصے میں سنہ ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا۔ پھر یہ دوستی تا حین حیات قائم رہی۔

[۳] سنہ ۱۹۴۵ء کے اواخر میں شیرانی صاحب کی وفات کی افواہ لاہور میں پھیل گئی تھی۔ اس کی طرف اشارہ ہے۔

آپ کی بیماری تو ہے ہی مگر آپ کی زندگی ایک بہت قیمتی [اثاثہ] ہے جو ہم لوگوں کے لئے باعث فخر و ناز ہے۔
ملاقات کے لئے تڑپتا ہوں مگر نہ تو مجھ میں وہاں جانے کی ہمت اور نہ آپ کے یہاں آنے کی امید۔ خواہش کیسے پوری ہو۔
میرے لئے آپ آج دوبارہ زندہ ہوئے۔ گویا مردہ کو زندہ کرنے کا معجزہ وقوع میں آگیا۔
کہئے آپ کس کے زیر علاج [ہیں] اور آیا کچھ تھوڑا بہت افاقہ ہے یا نہیں۔ دن کو طبیعت کے بہلانے کا کیا مشغلہ ہے۔ کوئی تصنیف کا کام ہو سکتا ہے یا نہیں؟

آپ کا صادق دوست
عبدالعزیز

(پروفیسر غلام ربانی عزیز)

گورنمنٹ کالج ملتان (پنجاب)
[۹۰]
11-2-46

مکرم و محترم جناب شیرانی صاحب قبلہ۔ السلام علیکم

ممکن ہے کہ آپ کو یاد رہ گیا ہو کہ آج سے چند برس پیشتر میں نے فارسی پی ایچ ڈی کے لئے "خاندان خوارزم شاہی کی تاریخ اور علمی ادبی کارنامے" بطور موضوع مقالہ کے انتخاب کیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کتب ذیل سے استفادہ کا موقعہ ملا:

(۱) ابن اثیر (۲) ابن خلدون (۳) ابوالفدا (۴) سیرۃ جلال الدین خوارزم شاہ از نسوی
(۵) جہاں کشائے حصہ اول و دوم (۶) جامع التواریخ (۷) روضۃ الصفا (۸) حبیب السیر
(۹) تاریخ گزیدہ (۱۰) طبقات ناصری

تاریخ یافعی اور مجمل فصیحی مل نہیں سکیں۔ کیا آپ کی کتب میں جو یونیورسٹی نے خریدی تھیں ان کتابوں کا کوئی نسخہ ہے۔ اگر نہیں تو کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کتب کے علاوہ آپ اور کون سی کتابوں سے استفادے کا مشورہ دے سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایئے کہ اس عہد کی علمی اور ادبی تاریخ لکھنے کے لئے کون کون سے تذکرے مفید ہو سکتے ہیں اور پھر وہ کون سے شاعر ایسے ہیں سوائے ادیب صابر اور وطواط کے جنھوں نے خوارزم میں دربارداری کی۔ فارسی کے نثاروں کے علاوہ مجھے عربی کے شاعروں اور نثاروں کے متعلق بھی قلم فرسائی کرنی ہے۔ اس لئے اگر ہر عنوان کے ماتحت پانچ پانچ علماء اور شعرا کے نام دے دیئے جائیں تو غالباً کافی ہی ہوں گے۔ براؤن کی ہسٹری موجود ہے لیکن عین بعین اسے کیسے نقل کر دوں۔

ایک فصل مسکوکات پر بھی لکھنی ہے۔ یہ عنوان آپ کے ارشاد کی تعمیل میں بڑھایا گیا تھا۔ حیران ہوں کہ اس پر کیا لکھوں اور کہاں سے امداد لوں۔
اس کے علاوہ ایک فصل حکومت کا نسق اور انتظام ہے۔ جس قدر کتب میری نظر سے گزر چکی ہیں وہ سب اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ نظام الملک کا سیاست نامہ ہے۔ لیکن وہ سلجوقی عہد کی تصنیف ہے۔
لطف گرامی کا حد درجہ ممنون ہوں گا اگر آپ اس سلسلے میں مشورہ دے سکیں۔ امید ہے مزاج سامی مع متعلقین بہ خیر و عافیت ہوں گے۔

نیازمند
غلام ربانی عزیز

---

[۹۰] غالباً یہ خط شیرانی صاحب کی نظر سے نہیں گزر سکا کیوں کہ ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کو ان کا انتقال ہوا اور اس سے چند روز قبل سے وہ نیم بیہوشی کی حالت میں تھے۔

میرے باباجان — حافظ محمود شیرانی مرحوم

پروین اختر شیرانی

میرے باباجان دنیا کے لئے خواہ کتنے ہی بڑے عالم و فاضل، نقاد، تاریخ داں، محقق، ماہرِ عتیقیات و لسانیات اور اُن کے شاگردوں کی نظر میں ایک شفیق، محترم اور لائق استاد اور ایک نابغۂ روزگار شخصیت کیوں نہ ہوں، میرے لئے صرف وہ میرے باباجان تھے۔ اولاد سے بے حد و حساب محبت کرنے والے، پدرانہ شفقتوں اور چاہتوں کی تجسیم، جو ہماری ذرا سی تکلیف پر ماؤں سے بڑھ کر بے چین اور مضطرب ہو جاتے تھے، جو بہادر اور حوصلہ مند ہونے کے باوجود اپنے بچوں کی آنکھوں میں ایک آنسو تک برداشت نہ کر سکتے تھے اور تڑپ اُٹھتے تھے، جن کی شخصیت ہمارے لئے باعثِ رحمت اور جن کا وجود زمانے بھر کی مصیبتوں اور ابتلاؤں کے مقابلے میں احساسِ تحفظ کی ضمانت تھا۔ کسی ماہرِ نفسیات کا قول ہے کہ "بچے کے لئے اس کے باپ کی حیثیت الہ دین کے چراغ والے جن کی سی ہوتی ہے جو اُس کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے، ہر ممکن بات کو ممکن بنا سکتا ہے اور ہر دشوار الحصول شے کو حاصل کر سکتا ہے۔" ہمارے لئے بھی ان کی یہی حیثیت تھی۔

جب وہ ہمیں شکار کی کہانیاں سناتے اور ہم مکان کی نچلی منزل پر آ کر آپس میں ان کہانیوں کے متعلق باتیں کرتے تو والد مرحوم اکثر سُن کر کہا کرتے تھے کہ "بیٹے! ان کہانیوں اور سب باتوں کو، جو بھی بابا سناتے ہیں، لکھ لیا کرو۔" لیکن یہ بدقسمتی ہی تھی کہ کمسنی کی نادانی اور لاپروائی نے کبھی ہمیں ان کی اس بات پر دھیان نہ دینے دیا۔ کبھی خیال تک نہ آیا کہ یہ دور دائمی نہیں ہے اور ہمارے وہ پیارے اور شفیق باباجان ہم سے یوں رخصت بھی ہو سکتے ہیں جن کے زیرِ سایہ ہمیں دنیا بھر کی پریشانیوں سے تحفظ حاصل تھا اور جن کی ذات ہمارے لئے بھرپور محبتوں اور شفقتوں کا انمول خزانہ تھی۔ ہمیں وہم تک نہ تھا کہ یہ چاہنے والی شخصیتیں تو مہمان ہوتی ہیں جن کی اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ ان کی رخصتوں کے بعد ہی ہوا کرتا ہے کہیں دور دور تک احساس نہ تھا کہ لاپروائی اور بے فکری کا یہ دورِ مسعود فرصتِ چند روزہ ثابت ہوگا اور گردشِ ہفت آسمان پردۂ افلاک میں ہمارے لئے کیسی کیسی جدائیوں کے زخم پوشیدہ کئے ہوئے ہے۔ چاہنے والے باباجان، دادی مرحومہ اور اولاد کے عاشق باپ کے بعد اب شوہر اور نوجوان بھائی کا یکے بعد دیگرے داغِ مفارقت دے جانا میرے قلب و ذہن کو ماؤف کر گیا ہے۔ اتنی چاہنے والی ہستیوں کے بعد زندہ رہنے کا کیا لطف باقی رہ جاتا ہے، دانا ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو آبِ حیات کے بارے میں کیسا کھرا مشورہ دیا تھا۔

مجھے ان کے متعلق لکھنا تو ضرور ہے اور بہت کچھ لکھنے کو جی بھی چاہتا ہے لیکن ان کے علمی کارناموں پر لکھنے کی نہ مجھ میں قابلیت ہے اور نہ ہی یہ میرا منصب ہے۔ یہ کام دراصل ان کے شاگردوں اور میرے ان بزرگوں کا تھا اور ہے جو اُن کے مداح اور ہم عصر دوست تھے اور جنھوں نے انھیں دیکھا اور جانا اور سمجھا ہے مگر ان کی ایک کثیر تعداد اب اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہے اور اب ایسے اصحاب خال خال ہی رہ گئے ہیں جن کا دم اس عہدِ قدر ناشناساں میں غنیمت ہے۔ میں تو محض ان کی شخصیت پر بحیثیت اولاد کے نظر ڈالوں گی یا کچھ گھریلو حالات، چند شکار کے واقعات اور کچھ اپنی یادیں اور باتیں بیان کروں گی کہ اس ذاتِ بابرکات کے حضور عقیدت و محبت فرزندی کا خراج ادا کرنا میرا فرضِ عین ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں یہ حق کما حقہٗ ادا نہیں کر سکوں گی مگر کوشش کرتی ہوں کہ کچھ نہ کہنے سے کچھ نہ کچھ کہہ ڈالنا بہتر ہے۔ پھر مجھے اپنے بہن بھائیوں میں یہ فخر و اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں نے بڑی ہونے کے ناتے ان کی نسبت اپنے باباجان سے زیادہ پڑھا ہے اور یوں ان کی علمیت سے زیادہ فیض حاصل کیا ہے۔ سو یہی ذکر پہلے کر دوں۔

وہ ایک عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے شفیق استاد بھی تھے جو صحیح معنوں میں علم کے قدردان، اور اسے تقسیم کرنے میں بے حد سخی اور فیاض تھے۔ مجھے یاد ہے جب وہ مجھے فارسی پڑھایا کرتے تھے تو اگر گلستان یا بوستان پڑھاتے وقت کہیں، کوئی ایک لفظ بھی ایسا آجاتا جو مختلف المطالب ہوتا یا انہیں ذرا سا بھی شک ہوتا کہ یہ معنی یہاں صحیح طور پر فٹ نہیں رہے تو وہ صرف اس ایک لفظ کے صحیح معنی تلاش کرنے کے لئے، اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود کئی لغات کھنگال ڈالتے اور جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے کہ انھوں نے اپنے بچوں کو اس کے بہترین اور موقع محل کے لحاظ سے پوری طرح درست معنی بتا دیئے ہیں، وہ سبق کو آگے نہ بڑھاتے اور اس لفظ کے لغوی، و مرادی معنوں کی علیحدہ علیحدہ تشریح کر کے اپنا اطمینان حاصل کرتے۔ انھیں پڑھانے میں بھی لطف آتا تھا جب پڑھنے والا بھی دل لگائے۔ اور جب وہ دیکھ لیتے کہ واقعی طالب علم کچھ سیکھنا چاہتا ہے تو پھر دل و جان سے باقاعدہ تفصیل و تشریح کے ساتھ سبق دل نشیں انداز میں یوں ذہن میں اتار دیتے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے دل پر کندہ ہو جاتا۔ اشعار کی تشریح تو اتنے خوبصورت انداز میں کرتے تھے کہ سننے والے میں خود بخود علمی اور ادبی ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ یوں نفسِ مضمون میں ڈوب کر پڑھانا ہر استاد کی فطرت نہیں ہوتی۔

مزاج چونکہ عالمانہ کے ساتھ ساتھ شاعرانہ بھی تھا اس لئے ان کی تشریح سے اشعار کے محاسن و مطالب و اشگاف طور پر سامنے آجاتے اور معانی کی پرتیں کھلتی جاتیں اور پڑھنے والے کا ذہن روشن ہوتا جاتا۔ اگرچہ کم عمری کے باوجود میں نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا تاہم سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ ہم اس وقت بچے تھے اور اسی لئے اس دور میں بھی پیاسے ہی رہے جب ہمارے گھر میں علم و ادب کے دریا بہتے تھے اور تشنہ کامان علم دور دور سے آکر اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ پھر جب ہم نے ہوش سنبھالا تو ساری داستان ہی ختم ہو چکی تھی، وہ محفلیں ویران ہو چکی تھیں۔ وہ حکایتیں انجام کو پہنچ چکی تھیں۔ صرف گردِ کارواں باقی رہ گئی تھی۔ قافلہ آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

میری پیدائش سے ایک سال پہلے میری پھوپی دس سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھیں۔ اس لئے بھی اور کلوتے بیٹے کی پہلی اولاد ہونے کے سبب بھی مجھ سے بے اندازہ محبت تھی۔ اور ان کی پدرانہ شفقت و محبت کے لازوال خزانے مجھ پر بے دریغ لٹائے گئے۔ تقریباً سوا دو سال بعد میرا بھائی محمد جاوید پیدا ہوا تو گھر میں جیسے چاند نکل آیا۔ مارونہ جا کر قبیلے میں اس کا عقیقہ کیا۔ گیارہ بکرے ذبح کیے گئے۔ پورے قبیلے کی ضیافت ہوئی۔ مٹھائیاں تقسیم کی گئیں۔ دور نزدیک کی دھیانیوں کو حسبِ مراتب جوڑے اور دوپٹے دیئے گئے۔ لیکن یہ ساری خوشیاں عارضی ثابت ہوئیں۔ جاوید صرف تیرہ ماہ کی عمر میں بعارضہ نمونیہ فوت ہو گیا۔ میری عمر اگرچہ اس وقت سوا تین سال تھی مگر بھائی سے اس قدر محبت تھی کہ آج اتنے عرصے کے بعد بھی مجھے اس کا کھیلنا، بیماری، وفات، غسلِ میت، گھر والوں کی غم غیر حالت، سب کچھ یوں یاد ہے جیسے ذہن پر یہ سب کھُد کر رہ گیا ہو۔ جب میں بھائی کے لئے روتی تو ہماری چھوٹی دادی جان، جنہیں ہم پنجاب کے قاعدے کے مطابق "ماں" کہتے تھے، مجھے بہلانے کے لئے کہہ دیتیں کہ "کاکے کو ہسپتال لے گئے ہیں۔ بڑا ہو کر آجائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا ملازم کھلاتا رہتا ہے"۔ ایک عرصے تک میں اسی بہلاوے میں رہی کہ اب جلد ہی میرا بھائی واپس آجائے گا۔ لیکن آٹھ ماہ کے انتظار کے بعد نسرین آئی، اور پھر سوا دو سال کے مزید انتظار کے بعد ہمارے گھر میں مظہر طلوع ہوا۔ لیکن ہماری والدہ اتنی زیادہ بیمار رہتی تھیں کہ ڈاکٹروں نے صاف طور پر کہہ دیا۔ "اگر اب مزید بچہ ہوا تو ان کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی"۔ سب کی تمنا تھی کہ مظہر بھی ولد مرحوم کی طرح اکلوتا نہ رہے اور کم از کم ایک بھائی تو اور ہو۔ لیکن والدہ کی صحت اور زندگی کا سوال تھا۔

آخر ٹونک جانے کے بعد وہاں کی آب و ہوا انھیں راس آئی اور تب مظہر کی آٹھویں سالگرہ کے دن ہمارا چھیتا بھائی تاثیر محمود پیدا ہوا جس کو آج مرحوم کہتے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بابا جان نے بچے کو گود میں لے کر فرمایا "بیٹے! تم بہت دیر سے آئے۔ ہم تو اب چلنے کو تیار بیٹھے ہیں"۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ مظہر جلد از جلد بڑا ہو کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ کبھی کبھی میرے متعلق ماں سے کہتے "کاش! یہ بیٹا ہو جاتی تو میں اسے پڑھا لکھا کر اپنے سارے ارمان تو پورے کر لیتا"۔ لیکن مظہر ابھی پانچ جماعت بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ان کا وقت موعودہ آن پہنچا اور وہ رخصت ہو گئے۔ اولاد کی اعلیٰ تعلیم کی ساری آرزوئیں دل میں لئے۔ اس کے باوجود یہ ہم پر خدا کا بڑا احسان ہے اور ان کی نیکیوں کا صدقہ بھی، کہ مظہر نے صرف ڈھائی سال کے عرصے میں یکے بعد دیگرے ماپ

اور دادا کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے باوجود مرحوم کی عزیز ترین تمنا پوری کی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ ان کے نا تمام علمی کام کو بھی مکمل کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور یوں خود کو اپنے لائق باپ، اور قابل دادا کے علمی و ادبی ورثے کا صحیح جانشین اور حقدار ثابت کر دکھایا۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ کے ہمت بندھانے اور حوصلہ بڑھانے سے میں بھی اپنی تمام تر مصروفیتوں، اور مسائلِ زیست کے باوجود فارسی، ادب میں ایم اے کر سکی، اور ڈاکٹریٹ کے لئے رجسٹریشن کرانے کا اس سال پختہ ارادہ تھا مگر تاثیر کی بے وقت اور اچانک وفات نے دل کو جیسے نچوڑ لیا ہے کہ کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا۔ کتنی چاہنے والی ہستیاں، ایک ایک کر کے پیوندِ زمیں ہو گئیں اور پھر تاثیر تو! — ع ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد! —— شاید خدا اسی زندگی بھر کے صبر کو توشۂ آخرت بنانا چاہتا ہو۔ شاید یہی اس کی مصلحت ہو۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

ماں کو چونکہ اولاد نہ تھی اس لئے انھوں نے میری پیدائش سے پہلے ہی سب سے کہہ دیا تھا کہ "پہلا بچہ میرا ہوگا۔" اور پھر انھوں نے میری پرورش یوں کی کہ سات سال کی عمر تک تو گودی میں رکھتی تھیں۔ اور بوتل سے دودھ پلاتی تھیں۔ گرمیوں میں چھت پر سوتے تھے تو کام سے فارغ ہو کر گود میں اُٹھا کر اوپر لے جاتی تھیں۔ خانہ داری کے سارے کاموں کے ساتھ ساتھ ہم بچوں کی اور خصوصاً میری پرورش ایسی دلسوزی کے ساتھ کی کہ ہم آج بھی درحقیقت انہی کو اپنی ماں سمجھتے ہیں اور ہمیں اپنی والدہ سے بھی زیادہ ان سے محبت ہے۔ مظہر ان کی اجازت یا مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ بابا جان کے انتقال کے بعد سے اور خصوصاً پچھلے بیس سال سے تو انھیں صرف نماز قرآن ہی سے واسطہ ہے۔ وہ بھی بابا جان کی طرح دمے کی مریض ہیں لیکن ان کی عبادت کی برکتوں اور دعاؤں سے اور گھر اور بچوں کو بابا جان کی وصیت کے مطابق اپنے زیر سایہ، بڑے حوصلے کے ساتھ لئے بیٹھے رہنے سے ہمارے گھر میں خدا کی رحمتیں سایہ کناں رہی ہیں۔ تاثیر کی جواں مرگی مقدر نہ ہوتی تو ہمارا گھر نہ صرف خاندان بلکہ معاشرے میں بھی ایک مثالی گھر تھا جہاں باوجود اس کے کبھی کوئی لڑائی جھگڑا، جیسا عام طور پر گھروں میں ہوتا رہتا ہے، نہیں ہوا۔ کہ میری والدہ ایک بہو اور ان کی دو ساسیں تھیں اور بعد میں ماں، والدہ اور ان کی دو بہویں میری دونوں بھاوجیں تھیں۔

لاہور میں ہمیں اسکول میں داخل نہیں کروایا گیا تھا۔ گھر پر ہی ہر قسم کی تعلیم کا انتظام تھا۔ فارسی خود پڑھاتے تھے۔ انگریزی ہمارے ایک رشتے کے چچا پڑھاتے تھے جو بغرض تعلیم ہمارے پاس لاہور میں مقیم تھے۔ اردو، حساب، تاریخ جغرافیہ وغیرہ کے لئے ایک سفید ریش، بزرگ ماسٹر صاحب عبدالعزیز نامی آتے تھے جو میری یادداشت کے مطابق مسلم ہائی اسکول شیرانوالہ گیٹ کے ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ قرآن پاک ماں پڑھاتی تھیں۔ وہاں ہم تیسری منزل پر قید رہتے تھے۔ نہ کسی کو آنے کی اجازت تھی اور نہ ہی کسی کو کہیں جانے کی۔ سوائے اس کے کہ بابا جان، اور اُن کے خاص ملازم فضل کے ساتھ جو ایبٹ آباد کا رہنے والا تھا، ان کے قابلِ اعتماد تانگے والے فیروز کے تانگے میں گھومنے چلے جاتے۔ ملکہ کے بت کے قریب سے گذر کر مال روڈ (شاہراہِ قائدِ اعظم)، اور باغِ جناح جو اُن دنوں لارنس گارڈن کہلاتا تھا، ہماری خاص تفریح گاہ تھی۔ شملہ پہاڑی، اور چڑیا گھر بھی ان میں شامل تھے۔ کبھی کبھی شالامار بھی ہو آتے تھے۔ ویسے قیام لاہور کے آخری چند برسوں میں، جب ڈاکٹروں نے دمے کے حملے کے بعد انھیں خاص طور پر رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے کا مشورہ دیا تھا، ہم اکثر رات کو ان کے ہمراہ چہل قدمی کو جاتے تھے۔

فلیمنگ روڈ پر ان دنوں میوہ منڈی ہوتی تھی۔ ہم ادھر سے گذر کر بیڈن روڈ پر (جہاں تک میری یادداشت کا تعلق ہے) دائیں طرف مڑ جاتے کچھ آگے بڑھ کر پرستان پارک تھا جو بچوں کی تفریح گاہ تھی۔ پیتل یا لکڑی پر پیتل منڈھے ہوئے گھوڑے ایک بیضوی حلقے کی صورت میں گردش کرتے رہتے تھے۔ بچے ان پر سواری کرتے تھے۔ اور بھی وہاں بہت کچھ تفریحات تھیں جو اب مجھے سرسری طور پر بھی یاد نہیں۔ بہرحال ہم وہاں سے محض بقول شاعر ——
ع بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں! —— حیثیت سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ کبھی ان گھوڑوں پہ سواری نہیں کی نہ ہی دوسری تفریحات میں حصہ لیا۔ یا پھر دوسری جانب چوک برف خانہ سے گذر کر ریلوے روڈ پر امرت دھارا بلڈنگ کی طرف نکل جاتے۔ آگے بڑھ کر چچا تاج صاحب مرحوم کا ادارہ دارالاشاعت پنجاب تھا۔ کبھی بیڈن روڈ پر ڈاکٹر صادق حسین صاحب کے ہسپتال پہنچ کر پندرہ بیس منٹ دم لیتے اور واپس چلے آتے۔ ڈاکٹر صاحب

ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے۔ بہت قابل ڈاکٹر اور بڑے نیک اور مخلص انسان ہیں۔ اس وقت کا لاہور میرے ذہن میں آج بھی موجود ہے۔ ویسے تو خیر لاہور جیسا زندہ اور دل کی طرح دھڑکتا ہوا شہر سطحِ زمین پر کوئی اور مشکل ہی سے ملے گا۔ خدا اسے ہمیشہ آن بان سے بلند و زندہ و پائندہ رکھے لیکن وہ لاہور کچھ اور ہی تھا۔ باباجان کو بھی والد مرحوم کی طرح خاکِ پاکِ لاہور سے بہت محبت تھی۔ لاہور وہ اپنا دوسرا وطن ثانی سمجھتے تھے۔ یہاں سے جا کر بھی وہ لاہور کو کبھی نہ بھول سکے اور ـــــ ع خطای بزرگاں گرفتن خطاست ـــ کے باوجود، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا لاہور کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا دوراندیشی سے بعید تھا۔ ساڑھے چار سال کا یہ عرصۂ حیات جو انھوں نے لاہور سے جدا ہو کر اپنے وطن مالوف میں گزارا، اس دور میں بھی وہ ایک لمحے کے لئے لاہور کو فراموش نہ کر سکے تھے جو انہیں بہت عزیز تھا اور جس کی محبت ان کی رگ رگ میں بس گئی تھی۔ حق یہ ہے کہ لاہور نے بھی ان کو بے اندازہ محبت اور خلوص دیا۔ ان کے چاہنے والوں اور خیرخواہوں نے انہیں یہی مشورہ دیا تھا کہ "آپ کچھ عرصے کے لئے بے شک ٹونک چلے جائیں مگر یہ نہیں ہے کہ لاہور کو قطعی طور پر ہی نہ چھوڑیں کہ آپ کے بچوں کے لئے بھی لاہور سے اچھی کوئی جگہ نہیں اور پھر یہ شہر آپ کا ہے اور آپ اس کے ہیں۔ آپ دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق ہیں"۔ لیکن ان کی مٹی لاہور کی نہیں تھی۔ اگرچہ مجھے خوب اندازہ ہے کہ آبائی جائداد اور معاشی معاملات کی مختلف الجھنوں میں گھر کر وہ اپنے عزیز لاہور سے جدا ہوئے۔ میں اب بھی سوچتی ہوں کہ کاش ہم اس وقت یہاں سے نہ گئے ہوتے، ہمیں نہ جانا پڑا ہوتا اور ان مسائل و مصائب سے دوچار نہ ہونا پڑتا جن سے ہمیں بعد کے دور میں گزرنا پڑا۔

ایک الجھن یہ بھی تھی کہ یہاں لاہور میں اُن کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری رہائش کا کوئی انتظام نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ان کی درویش صفتی نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ یہاں کوئی مکان بنوا لیں یا کم از کم پلاٹ ہی خرید لیں۔ ان کے ایک عزیز شاگرد محمد علی خاں غلزئی کے والد تعمیراتی کام کرتے تھے۔ اتنا مجھے یاد نہیں کہ کسی تعمیراتی کمپنی کے مالک تھے یا ٹھیکے دار تھے۔ بہرحال اتنا یاد ہے کہ محمد علی خاں نے کئی بار باباجان کو مجبور کیا تھا کہ "وہ مکان خود بنوا دیں گے اور قیمت بھی قسطوں پر کٹتی رہے گی۔ آپ صرف اجازت دے دیں"۔ لیکن انھوں نے احسان لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں کئی بار ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم پرنسپل اورینٹل کالج نے زور دے کر بھی کہا اور اپنے بچوں سے بھی کہا کہ "شیرانی صاحب کو مجبور کرو تاکہ وہ لاہور سے نہ جائیں: جب سب بچے جو باباجان کو تایا کہتے تھے، مل کر ان کا گھیراؤ کرنے لگے تو باباجان نے کہا "بچو! اپنے اباجی سے کہو۔ آدھی کوٹھی اور آدھی تنخواہ دے دیں تو میں یہاں سے نہ جاؤں"۔ اور ان کے عزیز دوست نے مسکرا کر اقرار کر لیا۔ بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ لیکن سب دوستوں اور خیرخواہوں کے سمجھانے کے باوجود وہ رُک نہ سکے۔ اور پھر پریشانیاں ہمارا مقدر بن کر رہ گئیں۔ باباجان کی خرابیٔ صحت، والد مرحوم کی مے نوشی میں زیادتی اور اس کے مضر اثرات جو درونِ خانہ بھی مترتب ہوتے تھے اور بیرونِ در بھی اور ان کی اپنی صحت پر بھی۔ ان کی دن رات کی یک گونہ بے خودی نے باباجان کی خطرناک اور شدید علالت کے ساتھ مل کر سب گھر والوں کو سہما رکھا تھا۔ اور پھر ہم پر قیامتیں ٹوٹنا شروع ہوئیں۔ ۶ر فروری ۱۹۴۶ء کو باباجان ایک طویل علالت کے بعد رخصت ہوئے۔ اور جون ۱۹۴۷ء میں ہم سب قسطوں میں لاڑکانہ (سندھ) اپنے عزیزوں کے ساتھ آنا شروع ہوئے تھے کہ وہاں سے لاہور والد مرحوم کے پاس چلے جائیں گے جو اپریل ۱۹۴۷ء ہی میں حیدرآباد اور جودھپور کے راستے ہوتے ہوئے لاہور چلے گئے تھے۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو نسرین، تاثیر، امی (بڑی دادی صاحبہ) اور والدہ لاڑکانے پہنچیں اور ۸ر ستمبر کو لاہور میں والد مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ اور ہم جو ۵ر اگست ۱۹۴۲ء کو ہنستے مسکراتے لاہور سے رخصت ہوئے تھے، صرف چھ برس میں دلوں پر کتنے زخم لے کر بجائے لاہور جانے کے عالم یاس و نومیدی میں لاڑکانہ ہی میں رہ گئے۔

مزاج اور شخصیت

میرے باباجان کی طبیعت میں تواضع، فیاضی، انکساری، سیرچشمی اور خوش خلقی تھی۔ صحیح معنوں میں کنبہ پرور اور دوست نواز تھے۔ صلۂ رحمی کا مبالغے کی حد تک خیال رکھتے تھے۔ اعزہ و اقارب کے ساتھ حسن سلوک میں کبھی سگے سوتیلے یا قریبی اور دور کے رشتوں کا فرق روا نہ رکھا۔ حتی الامکان ہر شخص اور ہر عزیز، ہر ہمسائے، اور ہر شاگرد کو اپنی ذات سے ہر ممکنہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ تنگ دستی کے دنوں میں شاید ہی کوئی دور و نزدیک کا عزیز ایسا ہو جس پر ان کے خاموش اور ظاہر و پوشیدہ احسانات نہ ہوں۔ گوشہ نشینی، کم آمیزی اور کم سخنی فطرتِ ثانیہ بن چکی

تھی۔ درویش صفتی خاندانی وراثت تھی۔ مزاج میں منکسر المزاجی اور کسرِ نفسی تھی۔ ریاکاری، غرور، منافقت اور دکھاوے سے سخت نفرت تھی۔ ہمدردی مہمان نوازی، بہادری اور ہتھیاروں سے محبت افغانی نسل اور سپاہیانہ مزاج کا خاصہ تھی۔ اس کے باوجود بے حد نرم طبیعت اور رحم دل اور مخلص مزاج تھے۔ اندر سے بھی وہی کچھ تھے جیسے باہر سے نظر آتے تھے۔ دکھ تکلیف اور پریشانی میں اپنے جانی دشمن کو بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ ابرِ بہار کی طرح باغ و راغ اور دشت و صحرا سب پر یکساں برستے تھے۔ جوایا خواہ شیخ سعدیؒ کے بقول باغ میں لالہ اُگیں یا شور زمین میں گھاس پھوس (دشمنیاں)، ان کی لطافتِ طبع میں ابرِ بہاراں کی طرح کوئی فرق نہ آتا تھا۔ اس فیاضی، سخاوت اور ہمدردی میں اپنوں اور بیگانوں، عزیزوں یا غیروں، مسلم یا غیر مسلم، انسان یا حیوان کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ لاہور ہائی کورٹ کے ایک ہندو جج جو پنجاب یونیورسٹی سینٹ کے ممبر بھی تھے، عمر بھر ان کی مخالفت کرتے رہے۔ جب بھی ان کی مدتِ ملازمت میں توسیع کا مسئلہ سینٹ میں پیش ہوتا، وہ ان کی مخالفت میں پیش پیش ہوتے اور ان کا ووٹ ہمیشہ بابا جان کے خلاف جاتا تھا لیکن جب یہی جج صاحب آں جہانی ہوئے تو مجھے خوب یاد ہے کہ بابا جان کالج سے آکر فوراً دوبارہ باہر جانے کے لئے تیار ہوئے اور ماں نے پوچھا تو انہیں بتایا کہ وہ جج صاحب کی ارتھی کے ساتھ جا رہے ہیں۔ ماں نے جل کر کہا "خس کم جہاں پاک"۔ وہ تو آپ کے مخالف تھے"۔ مگر بابا جان عالی ظرف اور وسیع القلب تھے۔ کہنے لگے: "دوستی اور دشمنی کی حدیں تو موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ مجھے بہرحال ان کی ارتھی کے ساتھ جانا ہے"۔ اور یوں میرے فرشتہ سیرت بابا جان نے ہمیں انسانیت اور شرافت کا ایک عملی اور قیمتی سبق دیا۔ آج تک ان کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں کہ "دوستی اور دشمنی کی حدیں تو موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں"۔ کتنا پاک سبق تھا اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کا۔ آج کے زمانے کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں: "کیا واقعی وہ سانچے ٹوٹ گئے جن میں اُن اُجلی، روشن، پاکیزہ اور مینارۂ نور شخصیتیں ڈھلا کرتی تھیں؟"

اسی طرح ٹونک میں محلہ مہندی باغ میں ہماری حویلی کے بالکل پہلو میں ہندو تیلیوں کا محلہ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں ایک غریب لاولد تیلی مرگیا۔ صرف ایک بیوہ نوحہ کناں تھی۔ ہمارے ہاں کی خواتین کو کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ دراصل انھیں مستورات کا کہیں آنا جانا بالکل پسند نہ تھا حتیٰ کہ خود ہمارے عزیزوں، رشتہ داروں کے ہاں بھی، مجھے یاد نہیں کہ کبھی ہم لوگ کسی خاص تقریب یعنی دعوت، شادی، پیدائش، موت یا خاص وجہ کے بغیر گئے ہوں۔ حالانکہ ایک ہی بڑے احاطے کے گرد سب اعزہ کے مکانات تھے اور خود بھی اپنے حقیقی بھانجوں بھتیجوں کی شادیوں تک میں شریک نہ ہوتے تھے کہ ہنگامے سے سخت گھبراتے تھے۔ اس کے باوجود رات کے وقت جب اس کے گھر لوگوں کا جمگھٹ کم ہو گیا تو بابا جان خود اپنی دونوں بیگمات سمیت ہم بچوں کو ساتھ لے کر اس بیوہ کے پاس تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ وہ بے چاری حیران رہ گئی اور خواتین کے پاؤں چھو کر رونے لگی۔ یہ کہتی جا رہی تھی کہ "سا سوجی! تمہارا بیٹا مجھے دنیا میں اکیلی چھوڑ گیا۔ اب میں کیا کروں گی؟" اسے سب نے تسلی دی اور بابا جان نے کہا: "جو بھی ضرورت ہو اپنی ساسوں سے آکر کہہ دینا اور کسی قسم کی تکلیف نہ اُٹھانا"۔

مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی۔ دوسروں کا دکھ قطعاً برداشت نہ کر سکتے تھے۔ دردمند دل ملا تھا حتی الوسع ہر ایک کی تکلیف رفع کرنے اور آرام پہنچانے کی دامے، درمے، قدمے، سخنے کوشش کرتے تھے۔ وہ خواہ انسان ہو یا جانور، انھیں نیکی کرنے سے کام تھا۔ ہماری جن بلیوں کا مظہر نے ان کے حالات زندگی میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے کوئی بلی جب بچے دیتی تو اس کے لئے باقاعدہ حلوہ پکانے کا حکم ہوتا تھا اور اس کا دودھ اور چھیچھڑوں کا راشن بڑھا دیا جاتا تھا کہ اسے بچوں کو دودھ پلانے کے لئے زیادہ خوراک کی ضرورت ہو گی۔

وقت کی پابندی ان کا اصول تھا۔ کہیں کا سفر درپیش ہوتا تو ٹرین کی آمد سے آدھ پون گھنٹے پہلے اسٹیشن پہنچ جاتے۔ حالانکہ سٹیشن ہمارے گھر ۱۸۔ فلیمنگ روڈ سے کچھ ایسا دور بھی نہ تھا۔ طبیعت میں کچھ وہم بھی تھا۔ ایک بار لندن میں کہیں جانے کے لئے ٹرین پکڑنا تھی۔ مجھے سبب یاد نہیں لیکن بہرحال باوجود کوشش کے گاڑی چھوٹ گئی۔ ٹرین چلی گئی اور اگلے ہی اسٹیشن پر حادثے کا شکار ہو گئی۔ یہ اور اس قسم کے چند واقعات نے، جن میں قدرت نے انھیں حادثات سے بال بال بچا لیا تھا، ان کے ذہن میں یہ بات پختہ کر دی تھی اور اکثر دہرایا کرتے تھے کہ "میں حادثے کی موت نہیں مروں گا"۔

رات کو کبھی کبھی ہمیں کہانیاں بھی سناتے تھے۔ کہانی خواہ کوئی عام سی ہو یا ان کے شکاری تجربے کی ہو، سنانے کا انداز بڑا دلکش ہوتا تھا۔ کیسی ہی شدید مصروفیت کیوں نہ ہو، ہمارا دل میلا نہیں کرتے تھے۔ اور جب ہم سب بہن بھائی مل کر کہانی سنانے کے لئے کہتے تو اپنے سامنے پھیلے کاغذات اور کھلی کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے اور کہانی سنانے لگتے۔ یا پھر اگر کوئی ضروری کام مثلاً صبح کے لیکچر کی تیاری کرنا ہوتی یا امتحانی پرچے جانچنے ہوتے تو اگلے دن یا دو تین دن بعد کا وعدہ کرتے اور ہمیشہ وعدہ پورا کرتے۔ اور یوں سناتے تھے کہ محسوس ہوتا تھا جیسے ہم خود بھی ان کے ہمرکاب ہوں اور تمام حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ پرانے قلعے، تاریخی مقامات، گھنے اور خوبصورت جنگلات، ساحلوں اور میدانوں اور پہاڑوں کا ذکر سن کر بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کم سے کم ایک بار ان سب جگہوں کو خود جا کر دیکھیں۔ اور آج تک یہ خواہش دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ یہ سب محض ان کا انداز بیان تھا۔

عالم ہونے کے باوجود مزاج شاعرانہ تھا۔ مناظر قدرت بہت پسند تھے۔ ہنگاموں سے نفرت تھی۔ کھلی فضائیں، کنارِ دریا، تازہ ہوا، پرسکون ماحول، گھنے جنگل اور وسیع صحرا اور شکار، یہ ان کا پسندیدہ ماحول تھا اور یہ مشغلہ۔ مارواڑ میں ہم تین ماہ کی چھٹیاں گزارنے جایا کرتے تھے۔ پندرہ جون سے پندرہ ستمبر تک یہ وقفہ ہوتا تھا۔ ہم عام طور پر پندرہ کی صبح لاہور سے روانہ ہو کر سولہ کو وہاں پہنچ جاتے تھے۔ قصبہ شیرانیاں کے تقریباً درمیان میں ہماری حویلی تھی جو سرخ اور زرد رنگ کے پتھروں کو بڑی بڑی اینٹوں کی شکل میں تراش کر بنائی گئی تھی۔ اس کا نام "قصرِ صحرا" تھا۔ حویلی کے سامنے ایک بڑا سا قدرتی ٹیلہ تھا اور اس ٹیلے کے پرلی طرف ایک بڑا تالاب تھا جس میں عام حالات میں تو کم پانی رہتا تھا لیکن برسات میں بارش کے پانی کے نالے ہر طرف سے آ آ کر اسے لبالب بھر دیتے تھے۔ بعض اوقات تو اس قدر بارش ہوتی تھی کہ ریت میں آباد ہونے کے باوجود بستیوں کو خطرہ پیدا ہو جاتا تھا کہ کہیں تالاب ابل کر پانی آبادی میں نہ گھس آئے۔ اس تالاب کے بیچوں بیچ ایک اونچا سا ٹیلہ تھا بالکل ایک جزیرہ نما کی طرح۔ برسات کے دنوں میں تو پورا جزیرہ ہی بن جاتا تھا۔ ہم صبح بارہ بجے گھر پہنچتے تھے اور عصر کے وقت اس جزیرہ نما پر باباجان کی چھولداری لگا کر محفل سجا دی جاتی تھی۔ گھر گرہستی کا پورا سامان مع فالتو بندوقوں اور کارتوسوں کے ڈبوں سے بھرے ہوئے صندوقوں سمیت وہاں موجود ہوتا تھا۔ جزیرے پر رات کے دو دو تین تین بجے تک چوپال جمی رہتی۔ وہاں ہم چونکہ جون کے وسط میں جاتے تھے لہٰذا ہمارے جانے کے دوسرے تیسرے دن ہی اکثر بارش ہو جاتی تھی۔ سب لوگ کہتے تھے "لاہور والے بارش ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اب یہ آ گئے ہیں تو بارش بس صبح شام میں ہوئی سمجھو۔" لوگ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہاں آ بیٹھتے۔ حقے اور چلم کا دور چلتا رہتا سیروں تمباکو منگوائی جاتی۔ بوڑھے اور ضعیف لوگ جنھیں کھیتی باڑی کا کام کرنا ہوتا، رسیاں بٹنے یا کوئی اور ایسا ہلکا پھلکا کام لے کر دن بھر ان کے گرد حلقہ باندھے رکھتے جیسے پروانوں کا جمگھٹ شمع کے گرد ہوتا ہے۔ باتیں ہوتی رہتیں، مذاق ہوتا، چہلیں ہوتیں، شرارتیں کی جاتیں۔ ان کی حیثیت وہاں ایک طرح سے قبیلے کے ایک ایسے سردار کی تھی جو جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد اگرچہ گاؤں چھوڑ کر شہر جا بسا ہو لیکن پھر بھی اپنے قبیلے کی آنکھ کا تارا ہو۔ ہر دلعزیز، در مقبول عام و خاص۔ آپس کے جھگڑے ان کے سامنے پیش ہوتے۔ فیصلے ان کی مرضی کے مطابق بھی ہوتے اور بعض اوقات جمہوری طریقے سے ان سے اختلاف بھی کیا جاتا۔ جسے یا تو وہ خندہ پیشانی سے تسلیم کر لیتے یا پھر اپنی رائے کو دلائل و براہین سے منوانے کی کوشش کرتے اور جب وہ واپس چلے جاتے تو سارا قبیلہ پورے نو ماہ تک "اگلی بہار" کی راہ دیکھتا۔ اور ایک ایک دن ان کے انتظار میں گنا جاتا اور جب ہم لوگ اگلے سال وہاں پہنچتے تو لوگ ایک دوسرے کو خوش خبری اور مبارکباد دیتے کہ "مبارک ہو، وہ آ گئے ہیں۔"

پھر جب دوسرے تیسرے دن باباجان اپنے ساتھ پندرہ بیس لوگوں اور اونٹوں کا قافلہ لے کر شکار کو نکل جاتے تو ایک دم ان کا جزیرہ سونا ہو جاتا۔ دو دو تین تین دن صحرا میں گزارنے کے بعد ڈھیروں شکار لے کر واپس آتے۔ تیتر، بٹیریں، ہرن، خرگوش، نیل گائے ہر قسم کا شکار ان کے ہمراہ ہوتا۔ مصالحے پستے، قسم قسم کے کھانے پکتے، خوشبوؤں سے گھر مہکا رہتا۔ اکثر ان کی غیر حاضری میں بارش بھی ہو چکی ہوتی اور پکوان تلے جا رہے ہوتے۔ صحرائی دیہات کا ماحول بارش سے بہت خوبصورت ہو جاتا۔ خوشگوار اور ہوا میں شراب کی تاثیر رکھنے والی فضائیں دل پر عجیب سرمستی کی سی کیفیت طاری کر دیتی

تھیں۔ بارش کے دوسرے ہی دن ریت پر سبز گھاس کا مخملیں فرش بچھ جاتا جس پر جا بجا سرخ رنگ کی بیر بہوٹیاں عجب بہار دیتی تھیں۔ اب تو خیر وہاں واٹر سپلائی سسٹم ہو گیا ہے۔ گندم بھی اُگنے لگی ہے۔ اسکول کھل گئے ہیں۔ لوگوں نے جا بجا اپنے اپنے کھیتوں میں کنوئیں کھدوا لئے ہیں۔ بڑی تعداد میں بسوں کی آمد و رفت بھی ہو گئی ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں جا بسی ہے لیکن اُس دَور میں پورے علاقے میں صرف دو کنوئیں تھے۔ ایک بستی میں کھاری پانی کا اور دوسری میں میٹھے پانی کا جو چاروں بستیوں کی پینے کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ سواری کی ضروریات بھی صرف اونٹ پورا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی بڈا بروہا یا گھاٹو ریلوے سٹیشن پر اتر کر اونٹوں پر گھر جانا پڑتا تھا۔ جہاں پہلے سے تار پہنچ جانے کے سبب لوگوں کی ایک کثیر تعداد اونٹوں سمیت ہمارے استقبال کے لئے موجود ہوتی تھی۔ گھاٹو سے ایک بہلی بھی کرائے پر لی جاتی تھی جس پر خواتین سوار ہوتی تھیں اور پردے پڑے ہوتے تھے۔ مرد اور بچے اونٹوں پر سوار ہوتے تھے۔ حویلی کے اندر خواتین کا ایک اژدہام ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوتا تھا اور جب تک ہم وہاں قیام کرتے، اسی طرح ہر وقت گھر کا صحن خواتین اور بچوں سے رات کے دو دو بجے تک بھرا رہتا تھا۔ اس دو ماہ کے دوران بچے بچے کی مسرت دیدنی ہوتی تھی۔

ایک بار ہم چھٹیاں گذار کر واپس لاہور جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ ہمیں خدا حافظ کہنے کے لئے اپنے اپنے اونٹ لے کر آگئے تاکہ اسٹیشن تک پہنچا ئیں۔ خواتین کے لئے ایک دن پہلے گھاٹو اطلاع بھیج کر بہلی کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ سو وہ بھی تیار تھی۔ ایک اونٹ جو بہت تیز مزاج اور شوخ و شریر تھا۔ اتفاق سے اس پر مجھے اور بڑے چچا جان کو جگہ ملی۔ جو بابا جان کے سب سے بڑے بھائی محمد ابراہیم خاں کے صاحبزادے تھے ان کا نام عبدالعظیم خاں تھا۔ بابا جان کو اپنے ان بھائی سے بہت محبت تھی۔ سوتیلے ہونے کے باوجود مثالی برادرانہ تعلقات تھے۔ مجھے یاد ہے بابا جان بڑے بھائی کا کس قدر احترام کرتے تھے۔ ان کا میانہ قد اور سفید داڑھی بالکل بابائے اُردو کی سی شباہت تھی۔ وہ بھی بابا جان کو "بابو" کہتے تھے اور بہت چاہتے تھے۔ ستمبر کی دھوپ چمک رہی تھی۔ تھوڑی دور جا کر چچا میاں نے مجھے دھوپ سے بچانے کے لئے چھتری کھول لی۔ اونٹ نے اپنی پیٹھ پر جو سیاہ رنگ کی چیز اچانک کھل کر پھیلتے دیکھی تو بے اختیار چونک کر اُچھلا اور اس قدر بھڑکا کہ چچا جان سنبھلنے نہ پائے اور ایک ہاتھ میں چھتری سنبھالے اور دوسرے سے مجھے مضبوطی کے ساتھ سینے سے لگائے ریت پر آپڑے۔ اگرچہ ریت تپی ہوئی تھی لیکن ان کے پیٹھ کے بل گرنے کے سبب میں ان کے سینے پر رہ گئی تھی اس لئے چوٹ بالکل نہیں آئی۔ انھوں نے فوراً کھڑے ہو کر مجھے اٹھا لیا اور ابھی پوچھ ہی رہے تھے کہ "بیٹے! کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" اتنے میں بابا جان کا اونٹ بھی آن پہنچا اور ان پر لمحہ بھر میں ساری حقیقت کھل گئی۔ فوراً اونٹ بٹھایا گیا۔ خود اُترے اور میرے یہ کہنے کے باوجود کہ "مجھے بالکل چوٹ نہیں آئی" مجھے چچا جان سے لے کر سینے سے لگا لیا اور انھیں سینکڑوں صلواتیں سنا ڈالیں۔ "نالائق! بیہودہ! ابھی میری بچی کو مار ڈالتا"۔ پھر ہمیں دوسرے اونٹ پر بٹھایا۔ اس اونٹ کے مالک کو بھی بُرا بھلا کہا کہ "پہلے کیوں نہیں بتایا تھا؟" چچا جان کو ہدایت کی کہ "اب میرے ساتھ ساتھ رہنا تاکہ میں اس کا خیال رکھ سکوں"۔ بچوں کے سلسلے میں انھیں میرے والد یا والدہ تک پر اعتماد نہ تھا۔ میری نانی مرحومہ ان کی چچا زاد بہن تھیں اور اس طرح والدہ بھانجی تھیں۔ انھیں ہمیشہ "دیوانی" کہتے تھے۔ نام کبھی نہ لیا۔

ایک مرتبہ مارواڑ میں بابا جان شکار سے آئے تھے۔ اور شکاری لباس برجس، خاکی قمیص اور ہیٹ، فل بوٹ، پنڈلی پر لپیٹنے والی خاکی رنگ کی پٹیاں، بندوقیں، کارتوس کی پیٹیاں (گلے میں حمائل کرنے والی) سب چیزیں مع ڈھیروں شکار کے گھر میں آئیں۔ سب لوگ شکار کو صاف اور تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ کھانے پکنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چچا میاں نے ہیٹ کو کھونٹی پر رکھا اور کارتوس کے ڈبے رکھنے کے لئے لکڑی کا بڑا صندوق کھولا۔ صندوق میں حرکت ہوئی تو اس کے نیچے سے ایک ہزار پایہ نکلا۔ چچا جان نے اسے فوراً مار ڈالا۔ ہم دونوں بہنیں اس وقت پلنگ پر کھڑی تھیں جہاں ہیٹ ہماری دسترس میں تھا اور ہم اسے اتار کر باری باری اپنے اپنے سروں پر پہن کر دیکھ رہے تھے۔ میری باری آنے پر میں نے پہلے تو اسے سر پر پہن کر دیکھا، پھر جانے کیا سوجھی کہ اتار کر اسے اندر سے دیکھا۔ چمڑے کا حلقہ ہٹایا تو کیا دیکھتی ہوں کہ اس میں ایک بڑا ہزار پایہ بڑے اطمینان سے پنجے گاڑے بیٹھا ہے میں نے چچا میاں کو پکارا اور بتایا۔ گھر کی خواتین نے تو کوئی توجہ نہ دی۔ نہ والدہ نے نہ پھپھیوں نے نہ دادی جان نے لیکن چچا جان کو میری کمسنی کے باوجود مجھ پر

تنا اعتماد تھا کہ فوراً لپکے اور میرے ہاتھ سے ہیٹ لے کر دیکھا تو چیخ اُٹھے "بچی بی! اس میں تو واقعی ہزار پایہ موجود ہے۔ بھلا میرا بیٹا غلط بات کہہ سکتا ہے"۔ سے نکال کر مارا اور مجھے اُٹھا کر بابا جان کے ڈیرے پر لے گئے۔ انھیں بتایا کہ آج بیٹے نے آپ کو اتنی بڑی آفت سے بچا لیا ورنہ جب صبح آپ ہیٹ پہنتے تو خدا نخواستہ آپ کو ضرر پہنچتا۔ بابا جان نے مجھے اپنی گود میں بٹھا کر بہت پیار کیا اور کہا "خیر نوشہ میاں! (یہ ان کی عرفیت تھی) میرا تو کچھ نہیں مگر میرے بیٹے کو نقصان پہنچ جاتا تو میں کیا کرتا۔ خدا کا شکر ہے یہ بچ گیا۔ کچھ صدقہ وغیرہ کر دو"۔

کبھی کبھی لاہور میں بھی پوری بس کرائے پہ لے کر مضافات لاہور کے جنگل میں چلے جاتے۔ موہن وال اور ڈھولن وال آبی گاؤں تھے۔ اس جنگل میں جہاں آج عالی شان بنگلے اور کوٹھیاں کھڑی ہیں اُس دور میں ہرن، جنگلی مرغ، تیتر، خرگوش اور نیل گائے تک مل جاتی تھی۔ بہت سے احباب بھی ساتھ ہوتے تھے۔ چائے اور کھانے کے برتن، سامان خوراک اور ساتھ ہی کیک، بسکٹوں کے ڈبے، پیسٹریاں بھی ڈھیر ساتھ ہوتی تھیں۔ میں ان دنوں بہت چھوٹی تھی، پیسٹری کو کٹوری کہا کرتی تھی چونکہ وہ کاغذ کی خوبصورت رنگین کٹوریوں میں ہوتی تھیں۔ جب شکار سے واپس آتے تو بہت سا سامان بھی واپس آتا۔ ظاہر ہے رنگ برنگی کٹوریاں کھانے کو ملتیں تو میں بہت خوش ہوتی۔

میرے ایک چچا ہمارے ہاں رہتے تھے جن کا نام تو علی اکبر تھا لیکن ٹونک کے قاعدے، برعکس نہند نام زنگی کافور کے مطابق گورے رنگ کے سبب ان کی عرفیت "کالا" تھی۔ وہ بابا جان کے بھتیجے تھے اور بعد میں انھیں کے چھوٹے بھائی علی گوہر خان سے میری شادی ہوئی۔ وہ مجھے خوش دیکھنے تو چھیڑنے کے لیے کہتے: "وہاں جب ہم جنگل میں پہنچتے ہیں تو بابا تو شکار کو چلے جاتے ہیں اور میں یہ پیسٹریاں درختوں اور جھاڑیوں سے توڑ توڑ کر کھاتا رہتا ہوں، اور کچھ جمع کر کے گھر بھی لے آتا ہوں۔ جنگل کے سارے پیڑ اور پودے اور جھاڑیاں ان سے لدے ہوتے ہیں"۔ میں حیران اور خوش ہو کر کہتی "چچا چا! آپ بہت ساری توڑ کر لے آیا کریں نا"۔ جواب ملتا "زیادہ توڑ کر کیا کروں بس تھوڑی سی ضرورت کے لائق ہی توڑتا ہوں"۔ اور میں ایک عرصے تک یہی سمجھتی رہی کہ واقعی یہ بات سچ ہے اور پیسٹریاں جنگل ہی میں لگا کرتی ہوں گی۔ یہ تو بہت بعد میں پتہ چلا کہ وہ جنگل دراصل انارکلی کی محکم دین کی بیکری ہے۔

بابا جان روزے کے بڑے پابند تھے۔ آخری ایک دو سالوں میں، جب دمے نے بالکل بے حال کر دیا تھا، روزے چھوٹے تھے۔ حافظ قرآن تھے، سو دل ہی دل میں اکثر قرآن پڑھتے رہتے تھے، لیکن محض عبادات و عقائد ہی کے قائل نہ تھے۔ معاملات اور عمل صالح پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ ذہن قدامت پرستی اور مذہب پسندی کے باوجود وسیع اور روشن تھا۔ اسلحہ تو خیر ویسے بھی مرد اور خصوصاً پٹھان کا زیور ہے لیکن اس میں بیٹے اور بیٹی کی تخصیص نہ تھی۔ چھرے دار بندوق سے ہم سب کو نشانہ بازی سکھاتے تھے۔ باقاعدہ مشقیں ہوتی تھیں۔ ہم دونوں بہنوں کو بھی نشانہ بازی کے علاوہ سائیکل سواری، ڈرائیونگ سب کچھ سکھانے کا شوق تھا۔ اپنے ایک بھانجے کو مجھے ڈرائیونگ سکھانے کی تاکید کی تھی لیکن کم عمری آڑے آئی کیونکہ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ونڈ اسکرین سے باہر نہ دیکھ سکتی تھی۔ اور بعد کے وعدے پر ٹل گئی۔ پھر جلد ہی پردہ کرا دیا گیا۔ سائیکل سواری محدود جگہ میں باوجود کوشش کے نہ آئی کہ اس کے لیے وسیع اور کھلا میدان یا سڑک چاہیئے تھی کم جگہ میں، توازن قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ نشانہ بازی البتہ سیکھی کہ اس کے لیے پائیں باغ ہی کافی تھا اور پردہ بھی حارج نہ ہوتا تھا۔

غرض قدیم تہذیب اور اسلامی اقدار سے انتہائی لگاؤ کے باوجود، جدیدیت سے یکسر بیزار بھی نہ تھے۔ طرزِ کہن پہ اَڑنے کی عادت نہ تھی۔ بلکہ خذ ما صفا کے قائل تھے۔ اس دور میں دس بارہ سال لندن میں گذارنے کے باوجود ان کا ذہن اسلامی رہا۔ بلکہ اپنے مذہب، وطن اور اپنی تہذیبی اقدار سے محبت اور بڑھ گئی تھی۔ ٹیپو سلطان کا مرثیہ ان کے دل میں آزادی کی تڑپ اور انگریز سے بے پناہ نفرت کا ایک زندہ اور روشن ثبوت ہے۔ شاعری بہت کم کی تھی۔ ہمارے پرچے "رومان" میں ایک دو غزلیں شائع ہوئی تھیں۔ جس کے مطلع کا ایک مصرع تھا:

تنگ آئے ہیں گلوں سے جاتے ہیں گلستاں سے

اور ایک شعر تھا: کس کی کریں شکایت، تقدیر آسمانی چھوٹے اگر قفس سے پالا پڑا خزاں سے

آخری شعر: ذوقِ سخن نہیں ہے یارانِ بےخبر میں ہم واپس گئے جا کر حالِ خوش بیاں سے

ٹیپو سلطان کا مرثیہ اور یہ غزل ۱۹۱۵ء میں لندن میں لکھی گئی۔ علاوہ ازیں دو ایک مزاحیہ قسم کی طویل مثنویاں بھی لکھی تھیں لیکن انھیں شائع نہیں کرایا۔ وہ بھی وہیں ٹونک میں کاغذات کے ساتھ رہ گئیں۔ گہرے بادامی رنگ کے کاغذ کی چوڑی کاپیوں پر لکھی ہوئی یہ مثنویاں میں نے دیکھی تھیں۔ اس لئے کہ ان کی کتابیں اور کاغذات زیادہ تر میری تحویل میں رہتی تھیں لیکن دور نادانی کا تھا۔ اب کچھ یاد نہیں کہ کیا کچھ لکھا ہوا تھا۔ میرے خیال میں یہ لندن سے واپسی کے عہد جوانی ہی کی کاوشیں تھیں کیونکہ اس کے بعد انھوں نے کبھی شاعری نہیں کی، سوائے اس کے کہ آخری عمر میں دو ایک نظمیں کہی تھیں۔ شاید بعد میں سنجیدگی کے دور میں خود انھوں نے بھی انھیں کوئی اہمیت نہ دی ہو اور اسی لئے غیر مطبوعہ رہ گئی ہوں۔

علامہ اقبال مرحوم سے بابا جان کی دوستی تھی۔ ان کے دوستوں میں سر شہاب الدین، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر برکت علی، سر عبدالقادر، بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر فضل الدین قریشی صاحب، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب اور ان کے علاوہ بہت سے معززین اور علماء شامل تھے۔

علامہ اقبال کے انتقال سے چند روز پہلے، رات کے تقریباً آٹھ بجے بابا جان کے ہمراہ ہم فیروز کے تانگے میں ان کے دولتکدے پر حاضر ہوئے۔ علامہ مرحوم کوٹھی کے برآمدے کے قریب صحن میں ایک پلنگ پر بیٹھے تھے۔ خاکی رنگ کی قمیص اور تہمد پہن رکھا تھا حقہ پی رہے تھے۔ سامنے کرسیاں پڑی تھیں۔ جن میں سے ایک پر بابا جان بیٹھ گئے۔ گیٹ کے ساتھ باغیچہ تھا۔ ہم بچے بڑے خاموش اور شرمیلے تھے لیکن اس روز جانے کیا ہوا کہ نسرین اور مظہر نے کافی تنگ کیا۔ کبھی شرارتیں کرتے کبھی شور مچاتے۔ بابا جان نے ڈاکٹر صاحب کی علالت کے پیش نظر ہمیں فصل کے ساتھ گیٹ کے باہر تانگے پر بیٹھنے کے لیے بھجوا دیا۔ پھر بھی یہ باز نہ آئے تو دو تین بار مرحوم ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش کے ذریعے بھی شور مچانے سے منع کروایا۔ اور جب ہم واپس آئے تو ہمیں سمجھاتے رہے کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت خراب تھی۔" تیسرے یا چوتھے دن صبح آٹھ بجنے سے بھی پہلے شہر میں ان کے انتقال کی خبر پھیل گئی آج سوچتی ہوں تو فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے قومی شاعر کو اتنا قریب سے دیکھا تو تھا۔ اور لطف یہ کہ اتنے بڑے آدمی کے سامنے شرارتیں کرنے اور شور مچانے کی جرأت وحماقت بھی کی تھی ہمیں کیا خبر تھی کہ ہم ایک نابغۂ روزگار اور نامور شخصیت کو دیکھ رہے ہیں اور یہ کہ اب ان کی زندگی صرف دو چار روز رہ گئی ہے۔

ایک بار لاہور میں زلزلہ آیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ بابا جان تیسری منزل پر اپنے کمرے میں بیٹھے کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ لباس تبدیل کر چکے تھے۔ بالوں میں برش کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ زلزلے کے جھٹکے شروع ہو گئے۔ ماں ان کے لئے چائے بنا رہی تھیں۔ وہ باورچی خانے سے نکل آئیں، قرآنی آیات کا ورد کرنے لگیں اور ساتھ ہی ہم سب کو باہر صحن میں آجانے کے لئے کہا۔ اچانک ہمارے سامنے کے ایک مکان کی دیوار کا بڑا سا ٹکڑا ٹوٹ کر سڑک پر جا گرا۔ ہم بچے صحن میں جانے کی بجائے بابا جان کا ردِعمل دیکھنے کے لئے ان کے کمرے میں گھس گئے۔ ماں ہمارے پیچھے آئیں۔ ہم نے دیکھا کہ انھوں نے پلنگ کے سرہانے سے ایک تکیہ اُٹھا کر یہ کہتے ہوئے بڑے اطمینان و احتیاط کے ساتھ اپنے سر پر رکھ لیا کہ "میرے بال خراب ہو جائیں گے" اور اسی سکون کے ساتھ بیٹھے رہے حالانکہ مکان جھٹکے کھا رہا تھا۔ اور یوں انھوں نے ہنگامی اور پریشان کن صورت حال میں بھی صبر و سکون اور ذات خداوندی پر مستحکم اعتقاد کا ایک ایسا عملی ثبوت ہمیں دیا کہ خدا کا شکر ہے اب بھی ہم کسی قسم کی صورت حالات سے گھبرا کر اوسان نہیں کھوتے اور حواس قائم رکھتے ہیں۔

مزاج میں حسِ مزاح بھی بہت تھی۔ ایک بار سالن میں شوربا کچھ زیادہ پتلا ہو گیا۔ کھانا چنا گیا تو بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے "بیٹے! ذرا میری لنگی تو لے آؤ" ہم حیران ہو کر سیدھے ماں کے پاس پہنچے جو روٹی پکانے میں مصروف تھیں اور ان کے لئے خاص قسم کے ننھے ننھے بالکل ورق کے سے پتلے پھلکے پکا رہی تھیں۔ انھیں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو کر بولیں "جاؤ، جا کر پوچھو کہ اس وقت لنگی کا کیا کام پڑ گیا؟" ہم نے پوچھا تو جواب ملا "ذرا اس شوربے میں غوطہ لگا کر معلوم کروں گا کہ اس سمندر کی تہ میں بھی کچھ ہے یا نہیں؟"

نیند اتنی ہلکی تھی کہ بند کمرے میں سوتے ہوتے اور صحن میں چڑیا بول جاتی تو جاگ جاتے تھے۔ بہت کم سوتے، ور زیادہ سے زیادہ وقت اپنے لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ ماں دن بھر کی تھکی ہاری رات کے گیارہ بجے تک جاگی ہوئی جب عشا کی نماز کے بعد لیٹتیں تو بہت گہری نیند سوتیں کیونکہ انھیں اکثر رات کو ہم بچوں کی وجہ سے جاگنا بھی پڑتا تھا، ادھر صبح چار بجے اٹھ کر بابا جان کو چائے بنا کر دینا ہوتی تھی کیونکہ بارہ ایک بجے سے چار بجے رات تک عام طور پر سوتے تھے ماسوائے اتوار کے، کہ اس دن صبح آٹھ بجے بیدار ہوتے تھے۔ ماں دوپہر کے کام سے فارغ ہو کر کچھ دیر دن میں نیند پوری کر لیا کرتی تھیں۔ ان کی نیند سے نالاں تھے اور اکثر انھیں کہا کرتے تھے: "غضب خدا کا چوبیس میں سے چھتیس گھنٹے سوتی ہو!" چند مرتبہ تو انھوں نے بات پر غور نہیں کیا اور اپنے کام میں لگی رہیں۔ آخر ایک روز اچانک دھیان آ ہی گیا۔ اور پوچھ بیٹھیں "ننھی کے بابا! دن رات میں تو صرف چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں، میں یہ مزید بارہ گھنٹے سونے کے لئے کہاں سے نکال لیتی ہوں؟" مسکرائے اور فرمایا "میرا اندازہ تو یہی ہے"۔

ماں کی بھی خراٹے لینے کی عادت تھی اور والد مرحوم کی بھی۔ جب بابا جان سنہ ۱۹۳۳ء میں بابائے اردو کی دعوت پر دہلی گئے اور وہاں انجمن کے دفتر واقع دریا گنج دہلی میں دو ماہ تک انہی کے پاس مقیم رہے تو والد مرحوم ان کے ساتھ تھے اور ان دنوں انجمن کے لئے محمد عوفی کی کتاب "جوامع الحکایات" کا اردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹے ایک ہی کمرے میں سوتے تھے اس لئے خراٹے وہاں بھی ہم قدم رہے، پھر وہاں سے ڈاکٹر اقبال صاحب مرحوم کے بے حد اصرار پر ایک ماہ کے لئے لاہور چلے گئے۔ یہ لاہور کا آخری پھیرا تھا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب کے خراٹوں سے واسطہ پڑا۔ واپس آئے تو فرمایا کرتے تھے "میری عادت خراب نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ دہلی اور لاہور میں بھی تمام رات میرے اردگرد شیر دہاڑتے رہتے تھے"۔

ہم جب ہمیشہ کے قیام کے لئے ٹونک پہنچے تو وہی ٹونک جہاں جانے کے لئے ہم سال بھر منتظر رہتے تھے، چند ماہ ہی کی مستقل رہائش کے بعد ہم سب بچے وہاں اکتا گئے۔ عزیز و اقارب تھے۔ مختلف قسم کی دلچسپیاں تھیں کھیل کود کے لئے بھی لاہور کے مکان کے مختصر سے صحن کی بجائے وسیع و عریض میدان اور پائیں باغ تھا جو اُجڑ چکا تھا لیکن والد مرحوم کے شوق نے اسے بہت ہی کم عرصے میں دوبارہ آباد کر لیا تھا۔ درختوں میں جھولے پڑے تھے۔ ایک اندر حویلی کے صحن میں نیم کے درخت میں اور دوسرا صحن باغ میں گونی کے ایک قدیمی درخت میں۔ تاریخی عمارتوں کی سی پتھر اور چونے سے بنی اور کائی سے سیاہ پڑی ہوئی بلند و بالا دیواروں، روشوں، دالانوں، سہ دریوں، صحنچیوں، اکدروں اور ڈیوڑھیوں، دیوان خانوں والی بہت بڑی حویلی تھی۔ سب کچھ تھا مگر لاہور قدم قدم پر یاد آتا رہا۔ چھجو کے چوبارے کی طرح "کہ نئیں ریساں شہر لاہور دیاں"۔ لاہور میں تنہا رہنے کے عادی تھے اس لئے بیمار بھی کم ہی ہوتے تھے۔ اب زیادہ بچوں سے ملنے جلنے کے مواقع جو ملے تو بیماریاں بھی بڑھ گئیں۔

اب ہمیں لاہور کے شب و روز یاد آتے تھے۔ گھر کی خواتین اپنے عزیزوں سے ملنے جلنے کے مواقع پا کر خوش تھیں۔ اور ہم تینوں بہن بھائی لاہور کی جدائی پر کڑھتے رہتے تھے۔ ٹونک کی جی بھر کر برائیاں کرتے اور ساری دنیا کی خوبیاں لاہور سے وابستہ کر کے خوش ہو لیتے۔

ٹونک میں لڑکیوں کو بہت جلد پردے میں بٹھا دینے کا رواج تھا اور بابا جان، صبح تاروں کی چھاؤں میں، اور شام کو پانچ بجے، دونوں وقت بچوں کو ساتھ لے کر چہل قدمی کو نکلا کرتے تھے۔ اگرچہ ہم شہر سے باہر باہر ہسپتال کے قریب ہو کر یا مختصر ترین بازار سے گذر کر باغوں کے سلسلے کی طرف نکل جاتے تھے اور صبح سات بجے اور رات کو ساڑھے آٹھ بجے تک گھوم پھر کر واپس آ جاتے تھے، لیکن بہرحال تھوڑی دور تو بازار سے گذرنا ہی پڑتا تھا۔ یہ شاید سنہ ۴۱ء کا واقعہ ہے۔ ایک دن ہم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک حلوائی کی دوکان کے قریب کھڑا ہوا ایک شخص اچانک دوسرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دیکھو! پہلے تو یہ اچھے بھلے مسلمان ہوا کرتے تھے اور اب بارہ چودہ برس لندن میں کیا گذار کر آئے، بالکل ہی کرستان ہو گئے ہیں۔ فرنگیوں کی طرح، تنی بڑی بڑی بیٹیوں کو بے پردہ ساتھ لئے پھرتے ہیں"۔

بس اسی روز سے میرا باہر جانا موقوف ہوا اور باقاعدہ پردے میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جب ہم ہمیشہ کے لئے ٹونک آ بسے تو صرف نسرین اور مظہر ہی اپنی اپنی ٹرائسکلوں پر ان کے ساتھ گھومنے جاتے اور ہم ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور

س ظالم کو دعائیں دیتے جس کی زہریلی زبان نے دم بھر کی آزادی بھی چھین لی تھی، اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا "قید فرنگ" کے احکامات میں تندی تیزی آتی گئی، اور رشتے دار خواتین کے اعتراضات بھی شروع ہو گئے۔ "سر پر دوپٹہ اوڑھو"۔ "سنبھل کر چلو"۔ "زبان بند رکھو"۔ "بیٹیاں کسی کو الٹ کر جواب نہیں دیتیں خواہ کوئی برا بھلا ہی کیوں نہ کہے"۔ "بیٹیاں یوں اٹھتی ہیں"۔ "یوں بیٹھتی ہیں"۔ "یوں چلتی پھرتی ہیں"۔ "اس طرح بات کرتی ہیں"۔ اور یہ ظلم تھا کہ والدہ بھی جو لاہور میں خاصی روشن خیال ہو گئی تھیں، اب انہی سب کی ہم خیال ہو گئی تھیں۔ اب ہم مردہ بدست زندہ تھے، ہر حکم پر خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز، خاموشی سے سر جھکا دینا ہمارا فرض اولیں تھا کہ بیٹیوں کو سسرال جا کر گذارا کرنے کے لئے ان "ٹپی کینٹس" پر عمل کرنا ضروری تھا جو اس دور میں خوبیاں تھے اور آج کی دنیا میں حماقتیں سمجھے جانے لگے ہیں۔

قدیم شرفا کے بے لچک خاندانی قوانین اور آداب محفل، اور دستورہائے خانہ کے تنگ نظریات نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ ان دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک پرندہ ہوں جس کے پر قینچ کر کے سے کنج قفس میں بند کر دیا گیا ہے لیکن بابا جان کی شفیق ذات اور چاہنے والا وجود بہرحال میرے لیے ایک ڈھال تھے۔ میرا پورا وقت ہی تقریباً انہی کے قریب گذرتا۔ ان کے حکم پر ان کی مطلوبہ کتاب نکال کر دینا، وقت پر سبق لینا، اور ان کے دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنا۔ بس مجھے ہر وقت اپنی نظروں کے سامنے رکھتے تھے جتنے نازوں سے انھوں نے ہماری پرورش کی تھی وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ بیٹی تو کبھی نہ کہا ہمیشہ "میرا بیٹا" ہی کہتے تھے اور اسی لئے ابتدا ہی سے میری عادت مردانہ بولی بولنے کی پڑ گئی تھی جو بڑی مشکل سے شادی کے بعد کہیں چھوٹی، بلکہ میرے شوہر نے خود چھیڑ چھیڑ کر چھڑوائی کہ جب میں باوجود کوشش کے کبھی غلطی سے مردانہ بولی بول جاتی تو وہ جواباً شرارت سے زنانہ بولی میں جواب دیتے اور میں جھینپ کر رہ جاتی اور دل ہی دل میں آئندہ احتیاط رکھنے کا عہد کرتی۔

خانہ داری کے کاموں کی بھی اجازت نہیں تھی نہ بابا جان کی طرف سے اور نہ ہی والدہ مرحوم کی طرف سے۔ دونوں ہی کو یہ خوف رہتا تھا کہ کہیں میں چولھے کے پاس بیٹھوں تو ہاتھ نہ جلا لوں، دھوئیں سے میری آنکھیں خراب نہ ہو جائیں، مسالہ پیسنے سے ہاتھوں میں جلن نہ ہو جائے "برتن دھونے سے میرے بیٹے کے ہاتھ خراب ہو جائیں گے"۔ دونوں یہی کہا کرتے تھے، بلکہ بابا جان تو اور بھی آگے تک جاتے تھے اور یہاں تک کہہ دیتے تھے "تم تینوں کس لئے ہو کہ میرا بیٹا گھر کا کام کرے"۔ اور ماں دبی زبان سے کبھی یہ بھی کہہ دیتی تھیں کہ "بادا جہیز میں بھی کام کرنے کے لئے باندیاں دیں گے نا"۔ دستکاری اور سلائی بھی چھپ چھپ کر سیکھی تھی ورنہ شاید انگلی میں سوئی چبھ جانے کے خوف سے اس کی بھی اجازت نہ ملتی لیکن جب میں نے پہلی بار کراس اسٹچ ورک کے پھول ان کے غلافوں پر بنا کر تکیوں پر غلاف چڑھائے تو مجھے دس روپے انعام میں ملے وہ بے حد خوش ہوئے۔ فرمایا "میرا بیٹا تو بڑا کاریگر ہو گیا ہے۔ کیسے اچھے پھول بنائے ہیں"۔ مظہر نے وہ غلاف آج تک بابا جان کی یادگار کے طور پر اسی طرح رکھے ہوئے ہیں۔

جس طرح خود شادیوں وغیرہ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اسی طرح مجھے بھی نہیں جانے دیتے تھے۔ ماں سے کہتے "تم سب جاؤ۔ ہم باپ بیٹا گھر رہیں گے"۔ چنانچہ اکثر ایسا ہی ہوا کہ میں خاندان کی کسی بھی تقریب منگنی، ساچق، مہندی، چوتھی وغیرہ میں شریک نہ ہوئی بس تھوڑی دیر کے لئے بارات اور ولیمے میں تو صرف ایک گھنٹے کے لئے دلہن دیکھنے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ سو نتیجتہً میں بھی انہی کی طرح خاموش، اور تنہائی پسند ہو گئی۔ گوشہ نشینی اور مردم بیزاری کی سرحدیں چھونے لگیں۔ وہ تو تھے ہی مردم گزیدہ، میں نے بھی ان کا پورا اثر قبول کر لیا۔ پھر خواتین کے اعتراضات اور نصیحتوں نے اور کڑوا کریلا نیم چڑھا دیا۔ نفسیاتی طور پر مجھے انسان کا قرب برا لگنے لگا اور آج تک تنہائی ہی عزیز لگتی ہے حالانکہ لوگ کہتے ہیں کہ تنہائی بہیں ڈستی ہے لیکن میں تو

"ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال"

کی قائل ہوں اپنے اس ذہنی تاثر اور نفسیاتی کیفیت سے محکمہ تعلیم کی ملازمت میں رہ کر بھی میں دامن نہ چھڑا سکی۔ ہنگاموں سے مجھے اب بھی ہول آتا ہے، دل بے طرح دھڑکتا ہے، پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ وراثت میں بس یہی دو شوق ملے ہیں۔ ایک تو یہ فراغتی و کتابی و گوشۂ تنہا! ——— اور دوسرے اقبال کی "ایک آرزو" میں بیان کیا گیا ماحول یعنی یہ ——— دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو ——— تنہائی، اور سکون، امن، خاموشی اور بے فکری اور

عزلت کے دن" لیکن جانے قدرت کی کون سی مصلحتیں کارفرما تھیں کہ دونوں ہی نہ ملیں۔ ساری زندگی اپنے مزاج اور طبیعت سے قطعاً مختلف ماحول میں کٹی۔

ہم لوگ ندی پر مقیم تھے۔ برشگال کا موسم پورے عروج پر تھا۔ مجھے ملیریا بخار آ گیا۔ گھر گھر لوگ اس میں مبتلا تھے۔ بخار شدید تھا اور مجھے سخت تکلیف تھی۔ باباجان مجھے اس حالت میں چھوڑ کر اپنے خیمے میں نہ جانا چاہتے تھے۔ پھوس کے بڑے سے کمرے میں جو سرکنڈوں کو باندھ باندھ کر بنایا جاتا تھا اور وہاں کی ساحلی زبان میں "بنگلہ" کہلاتا تھا۔ بڑی بڑی چوکیوں کا فرش بچھا تھا۔ اس پر بستر لگا ہوا تھا۔ چنانچہ اپنے کاغذات وہیں منگوا لئے اور میرے قریب بیٹھ کر اپنا کام کرنے لگے لیکن لکھنے پڑھنے میں دل قطعاً نہ لگ رہا تھا۔ بار بار میری نبض دیکھتے تھے۔ آخر ماں سے کہنے لگے "مجھ سے اس کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ خدا اسے تندرست کر دے اور اس کے عوض مجھے بخار آ جائے"۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی رات میرا بخار اتر گیا اور صبح ہوتے ہوتے باباجان کو آیا اور بے حد شدید۔ سارا دن اور ساری رات اس قدر تکلیف رہی کہ ہم بے چین ہو گئے۔ اور میں نے دعا مانگی "اللہ میاں! میرے باباجان کا بخار اتر جائے اور بیشک مجھی کو آ جائے"۔ اب جانے میرا بخار باری کا تھا یا خدا بہتر جانتا ہے کہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے ان کا بخار اتر گیا اور پھر میری باری آ گئی۔ تیز گرمی اور بخار کے سبب جب لبوں پر پپڑیاں جمنے کی نوبت آ گئی تو ان کی محبت پدری نے پھر جوش مارا اور پھر وہی دعا مانگی کہ "میرے بیٹے سے تو مجھی کو آ جائے تو بہتر ہے"۔ ماں کہنے لگیں "تم باپ بیٹی یونہی ایک دوسرے کا بخار مانگتے اور دونوں ہلکان ہوتے رہو گے۔ بہتر یہ ہے کہ خدا پر ہی چھوڑ دو"۔

میں نے گلستاں، بوستاں، اخلاق محسنی، اور رقعات عالمگیری باباجان سے پڑھی تھیں۔ اخلاق محسنی اور رقعات عالمگیری ان دنوں لاہور بورڈ کے امتحان منشی میں شامل تھیں۔ باقی کتابیں مجھے یاد نہیں کہ کیا کیا تھیں۔ لاہور بورڈ سے السنۂ شرقیہ یا میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ٹونک سے قریب ترین سنٹر دہلی تھا جو وہاں سے تقریباً پونے تین سو میل دور تھا۔ میرے داخلے بھی جا چکے تھے اور تیاری بھی مکمل تھی لیکن باباجان کی صحت کی، چونکہ خرابی نے عمر بھر کو حواس باختہ کر دیا اور میرا امتحان دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اور پھر برسوں کے بعد جب ملازمت کا ارادہ کیا تو لاہور بورڈ ہی سے پہلے ادیب عالم، ادیب فاضل اور منشی فاضل کر کے میٹرک، ایف اے، بی اے کے انگلش پیپر دیئے۔ فارسی ادب میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اعزازی پوزیشن حاصل کی۔ تعلیم میں زیادہ مشکل تو اس لئے پیش نہیں آئی کہ خدا مرنے والوں کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ہر طرح کی تعلیم گھر پر ہی دلا گئے تھے۔ بہرحال ایک بار تو کورس کی کتابوں کو پڑھنا ہی پڑتا تھا۔ پھر ادھر گھر پر اوقت مانگتا تھا۔ ادھر بچے مکمل توجہ کے طلبگار تھے۔ تیسری طالب جان ملازمت تھی۔ اور چوتھا ذریعۂ مصروفیت کورس کی کتابیں تھیں۔ سو میں موم بتی کے دونوں سرے جلاتی رہی اور صبر کرتی رہی اور کر رہی ہوں۔ بہرحال اتنا احساس مسرت ضرور ہے کہ میرے باباجان کو تمنا تھی کہ میں فاضل فارسی اور ایم اے کروں سو میں نے یہ ساری محنت کر کے ان کی ایک عزیز تمنا پوری کی ہے۔ مگر جب یہ سوچتی ہوں کہ میرے باباجان نے کتنی نازبرداریوں سے میری پرورش کی تھی اور میرے لئے کیا کیا سوچا تھا اور ان کے نہ ہونے سے مجھ پر زمانے کے ہاتھوں کیا کیا بیت گئی تو دل خون ہو جاتا ہے۔

فروری سنہ ۵۴ء میں جب ان کی طبیعت اچانک زیادہ خراب ہوئی اور فوری طور پر علاج کے لئے جے پور جانا پڑا تھا تو وہاں ایک جرمن ڈاکٹر ہیلک کے علاج سے انہیں بہت فائدہ ہوا۔ مریض اور معالج دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرنے لگے تھے۔ وہاں سے آنے کے بعد کمزوری کی وجہ سے اٹھنے یا بیٹھ کر لکھنے کی قطعی ہمت نہ تھی۔ ان دنوں اُن کے نام آنے والے اکثر خطوط کے جوابات لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ جن میں سے ان کے عزیز ترین دوست ڈاکٹر اقبال صاحب جنہیں ہمارے گھر میں صرف "ڈاکٹر صاحب" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق جو ہمارے ہاں صرف "مولانا" تھے اور مرحوم ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ظاہر ہے نوعمری اور کچا ذہن تھا۔ میں اتنی بڑی اور قدآور علمی شخصیتوں کو لکھتے ہوئے بے حد نروس تھی لیکن باباجان کا حکم تھا۔ صرف ڈاکٹر صاحب کو لکھتے ہوئے مجھے کوئی ذہنی الجھن پیش نہیں آئی کہ وہ ہمارے معالج رہے تھے اور ہم بچوں سے بیحد قریب تھے جیسا کہ ایک فیملی ڈاکٹر کو ہونا چاہیئے۔ بہرکیف حکم حاکم مرگ مفاجات، خط لکھے گئے اور اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب مرحوم ڈاکٹر اقبال صاحب کا گرامی نامہ میرے نام آیا جس کے ایک ایک لفظ سے محبت اور شفقت ہویدا تھی۔ انھوں نے مجھے "نور چشمی عزیزی پروین" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ لیکن لطف تو بابائے اردو کے معاملے میں آیا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو تو میں نے بعد میں کئی خطوط لکھے اور جواب سے بھی ہمیشہ سرفراز ہوئی لیکن "مولانا" کی بات دوسری تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے تو ہم اکثر ملتے ہی رہتے تھے۔ اور پھر وہ باباجان کے اتنے قریب تھے کہ ان کی بیگم کے انتقال کے بعد سے ہمارے لاہور چھوڑنے تک باباجان اپنے بیلے دوست

کی دلجوئی کے لئے تقریباً دس سال تک یہ وتیرہ بنائے رکھا تھا کہ ہر ہفتے کے دن ۹ بجے ہی سے ان نے ۱۲ بجے ماڈل ٹاؤن چلے جاتے تھے اور پھر اتوار کی چھٹی وہاں ان کے اور ان کے بچوں کے ساتھ گذار کر پیر کو انہی کے ساتھ کالج آتے اور دوپہر کو چھٹی کے بعد گھر آتے تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو بھی ان سے اتنی محبت تھی کہ وہ بابا جان کے بعد صرف دو سال دو ماہ زندہ رہے۔ اُنھوں نے اس جدائی کا صدمہ بے طرح محسوس کیا تھا۔ بابا جان کے انتقال کے بعد ان کی حالت اتنی غیر تھی کہ خود سے تعزیتی خط بھی نہ لکھ سکے تھے بلکہ اپنے صاحبزادے سے لکھوایا تھا اور کافی دنوں کے بعد والد مرحوم اور میرے پاس الگ الگ ان کے تعزیت نامے آئے تھے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب سے تو پھر بھی، اتنا خوف نہ آتا تھا۔

مولانا کو میں نے لکھا تھا کہ "میں ایک جاہل اور ان پڑھ لڑکی ہوں اور اپنے اس عریضے کی غلطیوں کی پیشگی معافی چاہتی ہوں"۔ لیکن جب بابائے اردو کا جواب ملا اور وہ بھی ان الفاظ میں کہ "خدا نہ کرے تم جاہل اور ان پڑھ کیوں ہونے لگیں تم نے تو اتنا اچھا خط لکھا ہے کہ تمہارے باوا بھی نہیں لکھ سکتے"، تو اسے پڑھ کر بابا جان بھی مسکرا دیئے اور میری جان میں جان آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب ہمارے افرادِ خانہ قسطوں میں لاڑکانہ پہنچے اور گھر کا سارا اسباب وہیں کمروں میں بند کر دیا گیا تو پہلا شبخون ہمارے ہی عزیزوں نے مارا اور دوسرا غیروں نے۔ اور قیمتی کتب اور ظروف اور سکوں اور اسبابِ خانہ داری کے ساتھ وہ بیش بہا خطوط بھی تلف ہو گئے جو ان بزرگوں نے مجھے لکھے تھے۔ ایک آدھ شاید مظہر کے پاس ہوگا ساتھ ہی بابا جان کی وہ تحریریں بھی جو نامکمل تھیں۔ مضامین کے ادھورے مسودے اور ان کے نام آنے والے مشاہیرِ علم و ادب کے خطوط اور تحریریں، جو بڑا قیمتی سرمایہ تھا سب کچھ آزادی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ڈاکٹر صاحب اکثر میرے خط کا جواب بابا جان ہی کے خط میں ایک الگ لفافے میں بند کر کے رکھ دیتے تھے اور میرے بابا جان اتنے اعلیٰ ظرف کے مالک تھے کہ جب بھی ان صاحبان کا کوئی شفقت نامہ میرے نام آیا، ہمیشہ مجھے بلا کر بند خط میرے ہاتھ میں دے دیا۔ کبھی خط کھولنے یا یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کہ کہ خط میں کیا لکھا ہے؟ (اگرچہ کھولنے کے بعد میں ہمیشہ ان کو دکھا دیا کرتی تھی)۔ لیکن انھیں ہم پر اعتماد ظاہر کرنا اور ہمیں یہ خاموش اخلاقی و عملی سبق بھی دینا تھا کہ کسی کا خط کھولنا یا بے اجازت پڑھنا خیانت ہے۔

شکار کے چند دلچسپ واقعات

ایک بار ریاست جے پور کے علاقے میں جس کی سرحدیں ٹونک سے ملحق ہیں، شکار کو چلے گئے۔ ان کے پاس اگرچہ کل ہند شکار کا لائسنس تھا لیکن پھر بھی ریاست چونکہ ہندو تھی اس لئے نیل گائے کا شکار ممنوع تھا کہ اس میں "گائے" کا لفظ بھی آتا تھا اور گائے ان کے لئے "ماتا" کا درجہ رکھتی ہے۔ سرحدی چوکی پر جو لوگ حفاظت کے لئے متعین تھے وہ سب شرابی پی پی کر ہولی منانے کے لئے آس پاس کے گاؤں میں چلے گئے تھے، جو دو ایک سپاہی وہاں باقی بچے تھے وہ بھی نشے میں دھت پڑے تھے۔

بابا جان کے ساتھ دو ملازم تھے اور اپنے تانگے پر سوار تھے جس میں بیل جتے تھے۔ گدا اچھا اور گاؤ تکیہ لگا تھا۔ چوتھا آدمی گاڑی بان جو تانگا چلا رہا تھا۔

ایک خشک برساتی نالے کے پاس سے گذر رہے تھے کہ پرلے کنارے پر ایک نیل گائے کھڑی نظر آئی۔ شکاری اور شکار کو دیکھ کر ضبط کر سکے؟ فوراً فائر کیا، اور شکار چکرا کر نالے میں جا گرا۔ فائر کی آواز دور دور تک گئی۔ تو ایک بوڑھا ہندو وہیں کہیں جنگل سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیتل کی لٹیا تھی سامنے آیا تو ایک معزز مسلمان کو تانگے اور بندوق سمیت پایا۔ سمجھ تو گیا کہ کیا بات ہے مگر یہ نہ پتہ چلا کہ مارا بھی نیل گائے کو ہے۔ ایک ملازم پہلے ہی چھلانگ لگا کر شکار کو ذبح کرنے کے لئے نالے میں اُتر چکا تھا۔ بوڑھے کو علم تھا کہ چوکی قریب ہے اور کوئی نہ کوئی سپاہی بندوق کی آواز سن کر آنے ہی والا ہوگا۔ اس لئے انہیں باتوں میں لگا کر روکے رکھنے کے لئے اس نے خوفزدہ ہونے کے باوجود چالاکی سے کام لیا اور ایک عجیب مضحکہ خیز حرکت کی۔ پہلے زمین پر اکڑوں بیٹھ کر لٹیا کو ریت سے مانجھ کر صاف کیا۔ پھر کھڑا ہوا اور چندرا کر پوچھا "آ بندوک کن بائی چھی؟" (یہ بندوق کس نے چلائی تھی؟) غیر جگہ تھی اور ریاستی معاملہ، غلطی ہو چکی تھی لہذا تحمل سے کام لے کر اسے اتنا سیدھا جواب دیا کہ جانتے تھے کہ اگر اس نے شور مچا دیا تو کہیں سارا گاؤں ہی نہ دوڑا چلا آئے۔ پھر شکار بھی "گائے" تھی سو اسے بتایا کہ "بھائی! بندوق بھری تھی اور ہم تانگے سے اتر رہے تھے، گھوڑا دب گیا اور اتفاق سے چل گئی۔"

لیکن وہ گرگ باراں دیدہ تھا۔ ان کی باتوں میں کیا آتا۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر پھر وہی حرکت کی۔ نیا میں ریت ڈالی۔ اسے رگڑ رگڑ کر مانجھا اور دوبارہ وہی سوال کیا: "بندوک کن بائی تھی؟" پھر اسے نرمی سے وہی جواب دے دیا گیا۔ لیکن جب اس نے تیسری بار بڑے سکون سے چند قدم بڑھ کر وہی حرکت اور وہی سوال کیا تو افغان خون بے قابو ہو گیا۔ بابا جان کو سخت غصہ آگیا۔ انھوں نے گاڑی بان سے کہا تانگہ آگے لے جاؤ اور درختوں کی آڑ لے کر نیلا اس پر لاد لو۔ پھر دونوں ملازموں کو بٹھا کر تیزی سے اپنی سرحدوں کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ اسے میں سنبھال لیتا ہوں۔ آدھ گھنٹے میں تم سے آن ملوں گا۔" حسب ہدایت تانگا روانہ ہو گیا، اور جب چوتھی بار زیادہ قریب آکر اس شخص نے وہی سوال کیا تو اسے ڈپٹ کر جواب دیا کہ "میں نے چلائی تھی اور اب تو جو کرنا چاہتا ہے کر لے میں تیرے سامنے ہوں۔" اسے اب تک یہ اطمینان تھا کہ فائر کو کافی دیر ہو چکی ہے بس اب سپاہی آتے ہی ہوں گے میں انہیں یوں بیوقوف بنا کر اتنی دیر روکے رکھوں گا۔ یہ مجھے پاگل سمجھ کر کچھ کہیں گے نہیں اور اتنے میں سپاہی آکر انھیں گرفتار کر لیں گے۔

اب جو سپاہی بھی نہ آئے اور الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں تو گھبرا گیا۔ اور جب اس کے سینے پر بندوق تان کر کہا گیا "اب اگر تیری زبان سے ایک لفظ بھی نکلا تو گولی تیرے سینے سے پار ہو گی" تو جھٹ سیدھا ہو گیا۔ اب کسی کے آنے کی امید بھی نہ رہی تھی کیونکہ کافی دیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ "مہاراج! مجھ سے غلطی ہو گئی، معاف کر دیں۔" جب اسی طرح کافی دیر ہو گئی وہ کانپتا رہا اور بابا جان کو یقین ہو گیا کہ اب ان کا تانگا ٹونک کی سرحدوں میں داخل ہو گیا ہو گا تو اسے چھوڑ کر اور معافی دے کر چل پڑے اور حسب وعدہ تھوڑی دیر میں سرحد پر پہنچ گئے جہاں تانگا شکار سمیت ان کا منتظر تھا۔

ایک بار ایک ایسی جگہ شکار کو گئے جہاں سے قریب ہی ایک رَکھ تھا۔ رَکھ وہاں کی زبان میں خشک گھاس کی سرکاری چراگاہ کو کہا جاتا تھا۔ اس رَکھ میں ایک خاص قسم کی گھاس تھی جس کو سُروالا گھاس کہا جاتا تھا۔ اس میں اگر آگ لگ جائے تو اس کا بجھانا قطعاً ناممکن ہوتا ہے۔ بابا جان تانگہ مع گاڑی بان اور ایک ملازم کے وہیں چھوڑ کر صرف ایک ملازم کے ساتھ شکار کے لئے جنگل میں گھس گئے۔ گاڑی بان بے چارہ تھکا ہارا لیٹا تو اسے نیند آگئی اور دوسرے ملازم صاحب نے جو بیڑی سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی تو انھیں خیال آیا کہ سنا ہے سُروالے گھاس میں آگ لگ جائے تو لاکھ جتن کرو نہیں بجھتی۔ آج ذرا تجربہ کر کے تو دیکھیں، بڑھنے لگی تو بجھا دیں گے۔ اکھڑ اجڈ آدمی تھا، جو سوچا فوراً ہی کر بھی ڈالا اور بیڑی کے ساتھ ساتھ خشک گھاس کو بھی تیلی دکھا دی۔ ہوا تیز گرم تھی۔ گرمیوں کے دن تھے پچھوا ہوا چل رہی تھی۔ گھاس نے جو آگ پکڑی تو ابھی یہاں اور ابھی وہاں، چپکے چپکے بہتیرا بجھانے کی کوشش کی لیکن مثل غلط نہیں تھی۔ آگ باوجود کوشش کے پھیلتی چلی گئی۔ بیل گرمی سے گھبرا کر بھڑک اٹھے۔ گاڑی بان گھبرا کر جاگ گیا اور آگ دیکھ کر گھبرا گیا۔ بابا جان تھے تو کافی فاصلے پر لیکن ایسی اونچی جگہ پر تھے کہ انھوں نے رَکھ میں آگ لگتے دیکھ لی تھی اور واپس اسی طرف چل پڑے۔ اِدھر تانگہ جوت کر یہ دونوں ان کی طرف روانہ ہوئے۔ جب بابا جان نے پوچھا "کیا یہ حرکت تم میں سے کسی نے کی ہے؟" تو دونوں نے کانوں پر ہاتھ دھرے۔ خوف کے مارے آگ لگانے والے نے بھی یہی کہا "باپ قسم! میں نے نہیں لگائی۔ میں بھلا ایسا غلط کام کیسے کر سکتا تھا۔" بہرحال بہزار دقت و خرابی گھر پہنچے۔ راستے بھر افسوس کرتے رہے کہ "اب ریاست کا کتنا نقصان ہو گا۔ جانے یہ کس کی حرکت تھی۔" برسوں بعد جب ریاست سے جلاوطنی کے بعد کافی عرصہ مارواڑ اور مدنیں (؟) لاہور میں گذارنے کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء میں واپس ٹونک آئے اور قدیمی نمکخوار پھر ان کے گرد جمع ہوئے تب اس شخص نے ایک روز باتوں باتوں میں ان کے حضور اعتراف کیا کہ واقعی آگ اسی نے لگائی تھی۔

پرانے مقامات اور آثار قدیمہ دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا چنانچہ مادھو پور، چتوڑ، رنتھنبور، دیسوری (جودھپور) اجین، بڑودہ، دھار، مانڈو، مندسور، بھوپال، اجمیر، اندور، گوالیار اور رہتاس کے علاوہ رامپور، لکھنؤ، گجرات، احمدآباد، کلکتہ، اور بمبئی کے سفروں میں قدیم کتب، مسکوکات اور دوسری متبقبات کی تلاش کے علاوہ وہاں کے قلعے اور قدیم آثار دیکھنے کا شوق بھی شامل تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں سوائی مادھو پور کا پیش آمدہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ یہ سنہ [illegible]ء کا واقعہ ہو گا۔ یہ شہر پہاڑیوں کے درمیان آباد ہے۔ ایک بار وہاں جانا ہوا تو ایک حیرت انگیز بات یہ دیکھی کہ شام پڑتے ہی گلیاں سنسان ہو گئیں، دکانیں بند ہو گئیں اور جیسے جیسے غروب آفتاب کا وقت قریب آتا گیا لوگ تیزی سے اپنے اپنے گھروں کا رخ کرنے لگے۔ ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچ جائے۔

جس مکان کی اوپر کی منزل پر انہیں ٹھہرایا گیا تھا اس کی منڈیر پر سے جھانک کر یہ بھی تماشا دیکھ رہے تھے اور سخت متعجب تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ سارا نو انسان کتنے تک گھروں میں گھس گھس کر کسی کونے کھدرے کی تلاش میں ہیں؟ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مغرب ہو گئی، سورج ڈوب گیا۔ اب شہر بھر پر ایسا سناٹا تھا کہ شہر خاموشاں کا گماں ہوتا تھا۔ چاند نکلا تو تجسس کے زیر اثر گلی میں جھانکا، دیکھا کہ گلدار یعنی چیتے گلی میں ٹہل رہے ہیں۔ بہت حیران ہوئے۔ صبح لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو یہاں کا معمول ہے کہ دن انسانوں کے ہوتے ہیں اور راتیں چیتوں کی۔ کتوں کو پکڑ کر پھاڑ کھاتے ہیں۔ اس لئے وہ بے چارے بھی شام ہوتے ہی گوشۂ عافیت تلاش کر لیتے ہیں اور لوگوں کی ڈیوڑھیوں میں جا چھپتے ہیں۔

قیام بھوپال کے زمانے کا ذکر ہے، سنٹرل انڈیا کے جنگلات میں درندے اور شکار بہت ہوتے ہیں۔ شکار کی ایک مہم سے واپس آ رہے تھے ایک پولیس کا سپاہی ساتھ تھا۔ چلتے چلتے دیر ہو گئی۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ گاؤں کے سارے گھروں کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ بالکل گاؤں کے سرے پر جو پہلا مکان نظر پڑا اسی طرف کو چل دیئے۔ دیکھا کہ ایک بڑھیا اس کا دروازہ بھی بند کر رہی ہے۔ انھوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر ایک پاؤں ڈیوڑھی میں رکھ دیا تاکہ کواڑ بند نہ ہو سکیں کیونکہ رات سر پر تھی، اور برسات کے دن تھے کہیں ٹھکانہ تلاش کرنا ضروری تھا۔ بڑھیا سے رات بھر کے لئے اس کی ڈیوڑھی میں ٹھہرنے کی درخواست کرنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ کچھ کہے سُنے یا احتجاج کئے بغیر ہی لوٹ کر اندر چلی گئی اور اندرونی دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھا لی۔

حیرت تو ہوئی مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا ڈیوڑھی میں دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ کچھ سامانِ خوراک ان کے ہمراہ تھا دونوں نے مل کر کھایا اور اب سونے کی تیاری کی۔ اس علاقے میں بارش بہت ہوتی ہے۔ ترشح سا ہو رہا تھا۔ دن میں بھی بارش ہو چکی تھی۔ ان کا ارادہ باہر کھلی جگہ میں سونے کا تھا کیونکہ ہمیشہ روشن، صاف اور کھلی جگہ سونا اور بیٹھنا پسند کرتے تھے لیکن سپاہی اندر سونے پر بضد تھا۔ خیر سپاہی نے انہیں ایک چارپائی باہر نکال کر بچھا دی ساس پر ان کا ہلکا سفری بستر لگا دیا، اور خود اندر سے کمرہ بند کر کے سو گیا۔ بابا جان بھی مچھروں سے بچاؤ کے لئے چادر تان کر آرام سے سو رہے۔

رات کے پچھلے پہر آنکھ کھلی تو دیکھا۔ ایک بڑا سا کتا سرہانے کھڑا ہے۔ اندھیرا تھا۔ کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ جب بھی گھر سے باہر ہوتے تو ہمیشہ گدیلے اور دری کے درمیان نال کا رخ پائنتی کی طرف کر کے بھری ہوئی بندوق پہلو میں رکھ کر سوتے تھے۔ ہاتھ سے بندوق کو ٹٹول کر دیکھا مگر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ رات گذر گئی۔ صبح اُٹھ کر دیکھا تو پلنگ کے پائے سے صرف ایک فٹ دور شیر کے پنجوں کے نشان تھے جو گیلی زمین پر صاف پہچان میں آ رہے تھے۔ اب پتہ چلا کہ اسی شیر کے خوف سے سارا گاؤں سرِشام گھروں کو بند کر کے سو جاتا تھا۔

ایک بار بھوپال کے کسی قدیم قلعے کے کھنڈر دیکھنے گئے۔ سید صاحب مرحوم نے حسبِ معمول ایک سپاہی اردلی میں دے دیا۔ یہ تو قلعے کی عمارتوں اور کھنڈرات کو دیکھنے میں لگے رہے اور ادھر سپاہی صاحب پھرتے پھرتے ایک ایسی کھوہ میں جا پہنچے جہاں شیر کے تین بچے ایک جگہ بلی کے بچوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹے بیٹھے تھے۔ سپاہی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ کاندھے سے انگوچھا اتارا (ڈھائی گز کا ایک سوتی رومال جو مرد عام طور پہ کاندھے پر رکھتے تھے) ایک بچہ اس میں لپیٹ کر بغل میں دبایا اور خاموشی سے چلے آئے۔ ان کی ماں کہیں اِدھر اُدھر شکار کی تلاش میں گئی ہو گی۔ بابا جان اپنی سوچوں میں تھے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ ساتھ میں کیا بلا لگ گئی ہے اور شام کے دھندلکے میں دونوں ٹہلتے ہوئے اطمینان سے تھانے پہنچ گئے۔

اسی رات تھانے کے چند سپاہیوں نے شہد کی بڑی مکھی کے چھتے گھنے جنگل سے توڑ کر لانے کا پروگرام بنایا تھا۔ شام ہوئی سید صاحب تو گھر چلے گئے۔ بابا جان تھکے ہارے تھے۔ گہری نیند سو گئے اور آٹھ نو سپاہی چپکے سے کھسک گئے۔ جب رات کو کسی وقت آنکھ کھلی تو تھانے کے صحن میں جگہ جگہ آگ روشن نظر آئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو آٹھ چولہے بنے ہیں اور ان پر شہد سے بھرے ہوئے آٹھ مٹی کے گھڑے گرم ہو رہے ہیں (تاکہ شہد صاف کیا جا سکے) اور تھانے کے پچھلی طرف سے پندرہ بیس گز کے فاصلے سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آ رہی ہے۔ حیران تو ہوئے مگر خاموش رہے۔ صبح جب سید صاحب نے تھانے والوں سے پوچھ گچھ کی کہ آخر یہ سبب کیا ہے؟ آج تک تو کبھی کسی شیر نے ہم لوگوں سے دوستی گانٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آج رات یہ کیا قصہ

تھا کہ اتنا نڈر ہو کر اور اس قدر قریب آکر دھاڑ رہا تھا؟

تب ایک اور سپاہی نے شکایت کی کہ صاحب فلاں سپاہی جو گل خاں صاحب کے ساتھ قصبے گیا تھا، کہیں سے شیر کا ایک ننھا سا بچہ پکڑ لایا ہے اور شیرنی اپنے بچے کی خوشبو پر یہاں تک آگئی ہے اور تمام رات تھانے کے آس پاس پھرتی اور دھاڑتی رہی ہے۔ وہ تو اتفاق سے آج شہد گرم کرنے کے لئے جگہ جگہ آگ روشن تھی ورنہ وہ احاطے میں داخل ہو کر کسی نہ کسی کو ضرور زخمی کر جاتی اور شاید خود اسے تو جان ہی سے مار ڈالتی۔ لیکن وہ وہ صرف آگ کے خوف سے اندر آنے سے باز رہی۔ سید صاحب نے اسے اچھی طرح ڈانٹ ڈپٹ کی اور پھر باباجان سے درخواست کی کہ "بندوق لے کر اس کمبخت کے ساتھ جائیں اور بچے کو وہیں کہیں چھوڑ آئیں ورنہ شیرنی آدم خور ہو جائے گی"۔ چنانچہ باباجان تیار ہو گئے لیکن اب سپاہی صاحب خوف سے لرز رہے تھے کہ "شیرنی تو مجھے کھا جائے گی"۔ بہر حال بچہ بہزار دقت و خرابی واپس پہنچا دیا گیا مگر شیرنی اب بھی انتقاماً قریبی قصبے کو جانے والے راستے پر تاک لگائے بیٹھی رہتی تھی اور باباجان کے وہاں سے چلے آنے کے بعد کی اطلاع کے مطابق اس نے گیارہ آدمیوں کو ہلاک و زخمی کر دیا تھا۔

یہ واقعہ بھی بھوپال ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے یہ بتا دوں کہ باباجان کے بچپن کے دوست سید زبیر میاں بھوپال میں تھانیدار تھے۔ یہ سید احمد شہیدؒ کی، دلاویں سے تھے اور سید صاحب کی شہادت کے بعد نواب ٹونک نے انھیں خیرپور سے بڑی کوششوں کے بعد ٹونک بلا لیا تھا۔ ان کا تعلق چونکہ سید صاحب کے قافلے سے تھا اس لئے جس محلے میں انھیں آباد کیا گیا تھا وہ اسی نسبت سے قافلہ کہلاتا تھا۔ اور یہ خاندان "سادات قافلہ کا گھرانا" کے نام سے مشہور تھا۔ کراچی میں اس گھرانے کے افراد اب بھی موجود ہیں اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہو کر ملک کی خدمت میں مصروف ہیں۔ میرے والد مرحوم پر پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے والے ڈاکٹر یونس حسنی صاحب (کراچی یونیورسٹی) کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔ اور یہ خاندان ہمارے گھرانے سے بے حد قریب رہا ہے کیونکہ باباجان کے دادا حاجی چاند خاں شیرانی، سید شہید علیہ الرحمۃ کے جہاد میں شریک رہے تھے اور انھیں ان کی آل اولاد سے بے حد محبت و عقیدت تھی۔ سو باباجان اور سید صاحب کی دوستی بھی بہت قدیم تھی۔ انہی کے ایک بھائی سید طلحہ لاہور کے ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ تیسرے بھائی سید عمر میاں جرمنی سے تعلیم حاصل کر کے جب لوٹے تو ریاست کے چیف انجینیر بنا دیئے گئے۔ باباجان کے ساتھ صبح کی سیر کے دوران لوٹتے وقت دو ایک بار ان کے بنگلے پر جو آفیسرز کالونی میں تھا، چائے پینے کی سعادت بھی ہمیں حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ باباجان کو لاہور میں یہ اطلاع ملی تھی تو بے حد غمگین ہوئے تھے اور کئی دن خاموش رہے تھے سو ہمیں تبھی سے اس خاندان کی اس محبت اور اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا جو ان کے دل میں تھی۔

بہر حال سید صاحب نے انھیں ایک ایسا سپاہی دے دیا جو فہمی تھا۔ شام کو ہرنوں کا شکار کھیلنا تھا۔ چند لوگوں کو ہرنوں کو گھیر کر ایک کھلے میدان میں لانے کے لئے ہانکا کرنے پر مقرر کر دیا گیا تھا۔ باباجان اور ان کے ساتھ چند اور سپاہی جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھے تھے۔ ہرنوں کی پوری ڈار کو اس میدان میں گھیر لیا گیا۔ لیکن اتفاق سے عین اسی وقت ان سپاہی صاحب کو پینک آگئی۔ اب دوسرے سب تو تھے ہوش میں، ہرن بھاگ بھاگ کر سیدھے اسی طرف کو آنے لگے، اور جب انھوں نے اسے انسان ہوتے ہوئے اتنا بے ضرر پایا تو ایسے بے خوف و بے باک ہوئے کہ اس کے سر پر سے چھلانگیں لگا لگا کر جانے لگے اور باباجان مع دوسرے سپاہیوں کے دانت پیس کر رہ گئے۔ پہلے اسے اشارہ سے کہا کہ نشانہ لے کر فائر کرے۔ جواب نہ ملنے پر ہلکی آوازوں سے پکارا، پھر زور زور سے آوازیں دیں مگر وہ تو "قطب از جا نمی جنبد" بنا بیٹھا تھا۔ آخر کار جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک ہرن کی ٹانگوں میں الجھ کر اس کی پگڑی بھی اُتر کر دور تک پھیلتی چلی گئی تو مجبوراً یہ سب کھڑے ہو گئے کہ اب نشانہ تو لے ہی نہیں سکتے تھے کہ خود فہمی صاحب کو لگنے کا خطرہ تھا۔ وہاں پہنچے، اسے جھنجھوڑا، مگر وہ تو بالکل ہی غین ہو رہا تھا۔ لوگ بڑی مشکل سے اُٹھا کر تھانے تک لے گئے۔

شکار کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کہیں ندی یا تالاب کے قریب جہاں عام طور پر رات کو جانور پانی پینے آتے ہیں، شکاری زمین میں ایک گڑھا کھود کر اس میں بیٹھ جاتا ہے اور اوپر ہلکی سی لکڑیاں یا درختوں کی شاخیں رکھ کر اس پر خشک یا سبز گھاس وغیرہ پھیلا دیتے ہیں۔ اس گڑھے کو وہاں کی زبان

میں "اودی" کہتے ہیں۔ ایک رات بھوپال میں بابا جان نے ایک ایسی اودی کھدوائی اور اس میں بیٹھے۔ چونکہ دیر ہوگئی تھی اس لئے سپاہی سے کہا "تم اب اکیلے تھانے تک کہاں جاؤگے، یہیں اودی میں میرے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ مگر خبردار جنبش بالکل نہ کرنا بلکہ سانس بھی آہستہ لینا ورنہ شکار چوکنا ہو کر بھاگ جائے گا۔"

وہ بیٹھ تو گیا لیکن وہ تھا باتوں کا عادی۔ وہ جیسے ہی بات کرنا چاہتا بابا جان لبوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کر دیتے جب مجبور ہو کر چپ ہونا پڑا تو اب اس کے جسم میں گھبراہٹ کے مارے خارش شروع ہوگئی۔ وہ جیسے ہی کھجلاتا اس کی خاکی وردی کھڑکھڑ کرتی اور پھر اسے چپ رہنے کا اشارہ ملتا، کیونکہ اب جنگل میں سناٹا طاری ہو چکا تھا اور اکا دکا جانور پانی پینے کے لئے آنا شروع ہوگیا تھا۔ اسے اشارے سے ہی بتایا جاتا کہ "جانوروں کو اگر ذرا بھی آہٹ مل گئی تو وہ پانی تک آئیں گے ہی نہیں، ٹھٹھک کر وہیں رک جائیں گے یا بھاگ جائیں گے" آخر وہ عاجز آگیا۔ مستقل خاموش رہنا اس کے لئے ایک عذاب بن گیا اور وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "حضور میں تو بہکتی بیٹا ہوں، یوں چپ رہنا پڑا تو میرا دم نکل جائے گا۔ خدا کے لئے مجھے اجازت دیجئے کہ واپس تھانے چلا جاؤں۔ ابھی تو وقت ہے زیادہ اندھیرا نہیں ہوا، اور دیر ہوگئی تو راستے میں درندوں سے مڈبھیڑ کا خطرہ بہت بڑھ جائے گا۔"

اور اجازت کا اشارہ ملتے ہی وہ فوراً باہر نکلا اور گھاس پھوس اور لکڑیوں کو دوبارہ درست کرکے نو دو گیارہ ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد جانوروں کی آمد کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ پھر وہاں ایک جنگلی سانڈ آگیا جسے وہاں کی بولی میں "جنگل سانڈ" کہتے ہیں۔ اس نے تالاب سے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ ادھر اُدھر سے چارہ کھایا اور ایک جگہ ریت پر بیٹھ کر کلیلیں کرنے لگا۔ ہلکی ہلکی سی چاندنی پھیلنے لگی تھی۔ سانڈ بہت موڈ میں تھا وہ اپنے سینگوں سے ریت اُچھالنے اور زور زور سے آوازیں نکالنے میں مصروف تھا کہ اچانک خاموش ہوگیا۔ دیکھا کہ ایک شیر دبے پاؤں جا کر پانی پینے کے بعد اس کی طرف آرہا تھا۔ شیر بابا جان سے چند قدم کے فاصلے سے گذر کر آگے بڑھا۔ ادھر سانڈ نے اٹھ کر بھاگنا شروع کیا اور ادھر شیر نے جست لگائی۔ ذرا سی دور جا کر ہی اسے جا لیا اور ایک ہی پنجہ مار کر اس کی گردن توڑ دی اور آرام سے بیٹھ کر خون پیا پھر اسے کھانے لگا۔ بابا جان کی بندوق میں ہلکے کارتوس تھے جو صرف ہرنوں، بارہ سنگھوں، سانبھر نیل گائے وغیرہ کو مارنے کے کام آتے ہیں اس لئے وہ خاموشی سے جنگل کے بادشاہ کو ماحضر تناول کرتے دیکھتے رہے۔ کارتوس نکالنا اور گولی کے کارتوس ڈالنا خطرے کا کام تھا کیونکہ کھٹکا ہوتے ہی جنگل کے سناٹے کی وجہ سے جانور چوکنا ہو جاتا ہے۔ پھر بیٹھے بھی زمین کے اندر گڑھے میں تھے، مچان پر نہیں۔ سو شیر مارنے کا شوق پورا نہ ہوسکا۔

فروری ۱۹۶۵ء کے بعد ان کی علالت بڑھتی ہی چلی گئی۔ ضعف شدید ہوتا گیا۔ انتقال سے دو ماہ پہلے بٹالے سے ان کے ایک عزیز دوست عبدالعزیز صاحب بارایٹ لا کا خط ملا جس میں لکھا تھا ——— "بھتیا! میں یہ کیسی دل خراش خبر سن رہا ہوں۔ مجھے جلد از جلد اپنی خیریت اپنے ہاتھ سے لکھیں یا پھر گھر میں سے کوئی صاحب خدارا مجھے فوراً شیرانی صاحب کی خیریت سے مطلع کریں۔" قصہ یہ تھا کہ ان کو کہیں سے بابا جان کے انتقال کی غلط خبر مل گئی تھی جس سے پریشان اور بدحواس ہو کر انھوں نے یہ خط لکھا تھا۔ اسے پڑھ کر فرمایا "کوئی بات نہیں ذرا کچھ وقت پہلے خبر مل گئی ہے۔" آخری سالوں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب (الٰہ آباد یونیورسٹی) سے باقاعدہ خط و کتابت رہنے لگی تھی۔ وہ بھی سخت پریشان تھے۔ ان کی صحت کے اس عالم سے سب احباب متوحش تھے۔ محترم ابراہیم ڈار صاحب اور نجیب اشرف ندوی صاحب کے بھی بے چینی اور پریشانی سے بھرے خطوط آتے رہتے تھے۔ یہ دونوں صاحبان بابا جان سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔

دوائیں بھی بہتیری کی گئیں اور دعائیں بھی لیکن موعودہ وقت آچکا تھا۔ اور آخرکار ۱۵ فروری ۱۹۶۶ء کی شب کو دس بجے خدا نے ہمارے سروں سے اپنی رحمتوں کا یہ سایہ اٹھا لیا اور ہم زمانے کی کڑی دھوپ میں جلنے کے لئے تنہا اور بے یار و مددگار رہ گئے۔

کلامِ خوشحال میں شعرِ عرب کی جھلک

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

میں نے جب خوشحال خان پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو قدرتی طور سے (اور بڑی حد تک وقت کی تنگی کی وجہ سے) مشہور عام موضوع "اقبال و خوشحال" اختیار کرنے کا خیال آیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ میں کچھ سوچ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ میری پشتو کمزور ہے اور خوشحال کو سمجھنے کے لئے مضبوط اور توانا پشتو کی ضرورت ناگزیر ہے۔ میں نے میجر راورٹی کو بھی دیکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جب اس کے چند ترجمے پڑھے تو مجھے کچھ یوں لگا گویا میں چھچھ کی "ہند کو" پڑھ رہا ہوں یا سن رہا ہوں۔ خوشحال کی توانا کہستانی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ ناچار مجھے پھر اقبال کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس اثنا میں دفعتاً خوشحال شناس اقبال نے میری رہنمائی کی اور مجھے ایک اور سمت کی طرف متوجہ کر دیا۔

اہل علم کو معلوم ہے کہ اقبال نے اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انگریزی رسالہ اسلامک کلچر میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا KHUSHAL KHAN THE AFGHAN WARRIER POET۔ میں اس سے قبل میر عبدالصمد کی کتاب "خوشحال و اقبال" میں اس مضمون کا خلاصہ پڑھ چکا تھا مگر اس نئی ضرورت نے مجھے مجبور کیا کہ میں اصل مضمون پھر پڑھوں۔

اس نئے مطالعہ کے دوران، علامہ اقبال کے جس خیال نے مجھے اپنی طرف فوراً متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ:

> "خوشحال خاں کی شاعری میں ابتدائی عرب کی شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جب ہم اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت و صداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا ہی نظر آتا ہے!"

یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں عربی شاعری کی روح (آزادی و صداقت) کی بڑی عزت تھی چنانچہ انھوں نے "اسرار خودی" کے دیباچے میں معاصر شعرا کو عربی شاعری کی پیروی کی تلقین کی تھی اور فرمایا تھا کہ ع

رجعتے سوئے عرب می بایدت

اور اب جبکہ ان کا ارشاد یہ ہوا کہ خوشحال کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے تو گویا انھیں ہمارے اس پشتون شاعر کی شاعری میں اپنے تصور کی مثالی اور حقیقی شاعری نظر آئی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اقبال نے غالب (اور شاید قدرے نظیری نیشاپوری) کے سوا فارسی اور اردو کے کسی شاعر کو یہ رتبہ عطا نہیں کیا جو انھوں نے خوشحال خاں کو دیا۔ خیر رتبہ شناسی کی یہ کہانی الگ ہے۔ اس وقت میری تمنا یہ ہے کہ میں علامہ اقبال کی اس تنقید پر کچھ کہہ سکوں کہ "خوشحال کی شاعری میں ابتدائی عرب کی شاعری کی روح کارفرما ہے ——" اور اس پر بھی کہ زندگی کے بارے میں خوشحال کا نقطۂ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ عربوں کی شاعری میں تھا۔

معلوم نہیں ابتدائی عرب کی شاعری سے علامہ کیا مراد لے رہے ہیں، تاہم اس سے مراد جاہلی عرب کی شاعری تو یقیناً ہے اگرچہ بعد کی عرب شاعری (یعنی بنو عباس کے دور تک کے شعراء) کو بھی اس سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ عرب شاعری کی موضوعاتی و اسلوبیاتی خصوصیات بہت سی ہیں مثلاً جیسا کہ ابن قتیبہ، جرجی زیدان اور نکلسن تینوں نے اپنے اپنے مخصوص پیرائے میں جاہلی عرب شاعری کی خصوصیات میں غیوری و جسوری اور عزت و ناموس کے لئے جنگ کے علاوہ مروت اور شرف آزادی کو نمایاں حیثیت دی ہے۔ یہ وہ خصائص ہیں جنہیں عرب نقادوں نے مجموعی طور سے حماسہ کا نام دیا ہے۔ حماسہ میں جو خصوصی جذبات منعکس ہیں ان میں چند یہ ہیں: محاربات میں جرأت و جسوری، مصائب و شدائد میں صبر و تحمل، عزت نفس، خودداری اور غیرت و انتقام، کمزوروں کی حفاظت اور زبردستوں، جیرہ دستوں کا مقابلہ و مزاحمت، اور وہ عزم راسخ جس کی نکلسن نے اپنی تاریخ ادب العرب میں ٹینی سن (TENNYSON) کے ایک مصرع میں یوں تشریح کی ہے:

TO STRIVE, TO SEEK, TO FIND AND NOT TO YIELD

غرض عرب شاعری کی اہم خصوصیات میں حماسی جذبات جزوِ اعظم کا درجہ رکھتے ہیں اور جب ابو تمام نے نمائندہ عرب شاعری کے مجموعے کا نام حماسہ رکھا تو یہ بلاوجہ نہ تھا یعنی اس کے نزدیک بھی عرب شاعری کا خلاصہ حماسی خیالات و جذبات پر مشتمل ہے نکلسن نے اس حماسی شاعری کا نمائندۂ اعظم شنفریٰ کو قرار دے کر اس کے لامیہ قصیدے میں عربوں کے حقیقی ابطال اور ہیروز کی ایک عمدہ تصویر پیش کی ہے۔ بہرحال جو بھی ہو بایں طرح مجھے ایک مناسب حال موضوع مل گیا جس پر غالباً کم لوگوں نے کچھ لکھا ہوگا۔ اگرچہ میں بھی چند مجمل اشاروں کے سوا آپ کو کچھ نہ دے سکوں گا۔

عربی شاعری کی جس روح کا علامہ اقبال نے ذکر کیا ہے۔ اس کے نامور نمائندوں (ہیروز) کے خیالات و جذبات یہی ہیں جن کا سطور بالا میں ذکر آیا ہے۔ یہ میری محرومی ہے کہ میں خوشحال کی اصل پشتو سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا لیکن متفرق اشعار کی صورت میں جو مجھے علامہ اقبال میجر راورٹی، دوست محمد کامل اور خصوصاً میر عبدالصمد کی کتاب (خوشحال اور اقبال) سے دستیاب ہوئے ہیں ان کی مدد سے میں بقول اقبال "شاعر افغان شناس" کی روح شاعری کا ہلکا سا تصور دلانے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مُروّت | سب سے پہلے خوشحال کے تصورِ مروت کو لیجئے، اس رویے یا تصور سے کلامِ خوشحال بھرا پڑا ہے۔ یہاں چند نمائندہ اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ خوشحال فرماتے ہیں:

—— اہل شر کے لئے پنجۂ شاہین پیدا کر اور اہل خیر کے لئے کبوتر سے بھی زیادہ حلیم و خاکسار بن جا۔

—— عدل کی تلوار اٹھانے میں تاخیر نہ کر اور ملک میں اسلام پھیلانے کے لئے جنگ کر

—— یا تو خدائے واحد کا تکیہ ہے اور یا تلوار کا۔ ان جرگوں ورگوں سے معاملے طے نہیں ہوتے۔

—— جو شخص شمشیر و سناں سے محبت نہ رکھتا ہو وہ اپنے آپ کو مرد نہ کہے۔ ایسا آدمی تو بس ہاتھوں میں مہندی لگائے اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اپنے آپ کو کسی جوان کے لئے دلہن کی طرح آراستہ پیراستہ کر۔

—— جہاں میں ننگ و ناموس جس چیز سے حاصل ہوتے ہیں وہ عربی گھوڑے ہیں جو میدان جنگ میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

—— جو شخص پیٹھ پر تلوار کا زخم کھائے وہ ہرگز ہرگز بہادر و شجاع نہیں۔

آزادی | آزادی کی فضیلت اور غلامی کی ذلت کے بارے میں بھی خوشحال خاں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ مثلاً

—— جو دوسروں کی نوکری کرتا ہے وہ گیدڑ ہے، شیری صرف آزاد مردوں کا حق ہے۔

—— شیر، عقاب یا تو پہاڑی دروں کی انتہائی بلندیوں پر ہوتا ہے یا پھر اس کی قسمت میں موت یا زنجیر ہوتی ہے

ننگ و ناموس | ننگ و ناموس کے لئے کٹ مرنے کے بارے میں خوشحال خاں کا تصور (بلکہ عمل) یہ ہے:

—— مرد وہی ہے جو باہمت ہو اور ننگ و ناموس اور غیرت و عزت کے لئے سرگرم و مستعد ہو۔

—— مرد وہی ہے جو انتہائی درجے کا غیور اور غایت درجے کا صابر ہو۔

صابری واستقامت | شدائد و مصائب میں صابری کے بارے میں خوشحال خاں کی تلقین یہ ہے:

—— خدا نے جو غم پیدا کیا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں۔ یہ تو ایک کسوٹی ہے جس سے مرد و نامرد پہچانا جا سکتا ہے۔

غرض خوشحال خاں کا تصورِ "مروت" ان کی شاعری میں جابجا منعکس ہے اور یہ عربی شاعری کی روح کے عین مطابق ہے۔

آدمیت | —— اس آدمی کو اچھا سمجھ جو دل کا صاف ہو، شرم و غیرت کا پاسبان ہو جس شخص میں یہ اوصاف نہ پائے جاتے ہوں وہ باقی جو جی چاہے کرے مگر وہ انسان نہیں۔

—— مرد وہ ہے جو انتہائی درجے کا غیور اور غایت درجے کا صابر ہوتا ہے۔ وہ عفو و کرم اور بخشش و درگزر میں مشہور ہوگا۔"

اب بغرض موازنہ و مقابلہ ایک نمائندہ عرب شاعر شنفری کے خیالات ملاحظہ ہوں جن اشعار کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے وہ اس کے قصیدہ لامیہ سے لئے گئے ہیں:

و فی الارض منای للکریم عن الاذی	و فیہا عن خاف القلی متعزل
لعمرک ما فی الارض ضیق علی امرء	سری راغباً او راہباً وہو یعقل
ولی دونکم اہلون سید عملس	وارقط زہلول و عرفاء جیال
ہم الاہل لا مستودع السر ذائع	لدیہم ولا الجانی بما جر یخذل
وکل ابی باسل غیر اننی	اذا عرضت اولی الطرائد ابسل
وان مدت الایدی الی الزاد لم اکن	باعجلہم اذ اجشع القوم اعجل
وما ذاک الا بسطۃ عن تفضل	علیہم وکان الافضل المتفضل
وانی کفانی فقد من لیس جازیاً	بحسنی ولا فی قربہ متعلل
ثلاثۃ اصحاب فواد مشیع	وابیض اصلیت وصفراء عیطل
ہتوف من الملس المتون یزینہا	رصائع قد نیطت الیہا و محمل
اذا زل عنہا السہم حنت کانہا	مرزاۃ عجلی ترن و تعول

قصیدہ لامیۃ العرب للعلامۃ الشنفری، مطبوعہ نظارۃ المعارف قسطنطنیہ، ۱۳۰۰ھ، اشعار ۳ - ۱۳

ترجمہ | —— اور زمین میں شریف انسان کے لئے زیادتی سے دور ہونے کے مقامات اور بغض و عداوت سے خائف کے لئے پناہ گاہیں موجود ہیں۔

—— تیری زندگی کی قسم! جو شخص کسی کام کی امید سے یا کسی کے خوف سے عقلمندی کے ساتھ کہیں آنا جانا چاہے اس کے لئے زمین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔

—— اور میرے لئے تمہارے علاوہ بھی ایسے لوگ (پناہ دینے والے) موجود ہیں جو سفید و سیاہ رنگت والے طاقتور بھیڑیوں، چتکبرے، چکنی جلد والے چیتوں اور لمبی دم والی گوہ کی طرح (طاقتور و توانا) ہیں۔

—— وہی ساتھی مخلص ہیں کہ ان کے پاس رکھا ہوا بھید ظاہر نہیں ہوتا اور ان کے پاس پناہ لینے والا اپنے جرم کی وجہ سے ذلیل و خوار نہیں ہوتا۔

—— ان میں سے ہر ایک غیور، خودار اور بہادر ہے بجز اس کے کہ جب روندنے والے گھوڑوں پر سوار ہو کر حملہ کرنے کا وقت آتا ہے تو میں ان سب میں سے زیادہ بہادر ہوتا ہوں۔

—— اور اگر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائے جاتے ہیں تو میں لالچی شخص کی طرح جلدی جلدی ہاتھ نہیں مارتا (بلکہ اطمینان کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں خواہ مجھے بھوکا رہنا پڑے۔)

یہ سب کچھ میرے، ان پر احسانات کی وسعت کی وجہ سے ہے، اور افضل وہی ہوتا ہے جو دوسروں پر احسان کر کے) دعوئے فضیلت کرے۔
بلاشبہ میں اس شخص کے دور ہو جانے کی کفایت کرنے والا ہوں جو دوسروں پر نیکی کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی اس کے پڑوس میں رہ کر دل کو کوئی تسلی حاصل ہو سکے۔
میرے تین ساتھی ہیں: بہادر دل، سفید صیقل شدہ برہنہ تلوار، اور زرد رنگ کی لمبی کمان۔
وہ (کمان) اپنے ٹھوس اور صاف وجود کی وجہ سے آواز پیدا کرتی ہے، اس کر اس کے ساتھ کا بناؤ سنگھار اور اس کا محمل زینت دیتے ہیں۔
جب تیر اس سے چھوٹتا ہے تو وہ (کمان) جلدی سے اس عورت کی طرح المناک باریک آواز میں بین کرتی ہے جس پر کثرت سے مصیبتیں وارد ہو رہی ہوں۔

دیکھا آپ نے، اشعار مذکورہ بالا سے شعرِ عرب اور کلامِ خوشحال کی مماثلتوں کا کتنا واضح انکشاف ہوتا ہے یقیناً ان سے علامہ اقبال کی مذکورہ رائے کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اب اگر ان اشعار کے ساتھ خوشحال کی ایک اور نظم بھی شامل کر لی جائے تو عرب شاعری کے مسلک مروت کی تصویر کچھ زیادہ روشن ہو جاتی ہے۔ اس نظم کا ترجمہ (جو میر عبدالصمد کی کتاب سے ماخوذ ہے) درج ذیل ہے۔

مرد وہی ہے جو صاحب ہمت و برکت ہو اور دنیا والوں کے ساتھ سلوک اور برتاؤ میں خوش خلق اور شیریں ہو، جس کا ظاہر و باطن ایک ہو، جو صادق القول ہو، اپنے عہد کا پابند ہو، اس میں کوئی جھوٹ اور فریب نہ ہو، اس کا دوسروں کے ساتھ تپاک اور محبت و مروت سے پیش آنا ظاہری و نمائشی نہ ہو، وہ کم گفتار ہو خاموشی میں بسیار کردار ہو، جس کا ذہن تو غنچے کی مانند بند لیکن سینہ چاک (کشادہ) ہو، جب بلندی کا مقام ہو تو وہ عظمت و رفعت میں آسمان ثابت ہو، اور جب پستی کا محل ہو تو مانند خاک ہو، تمکین میں مانند سرو بلند ہو، لیکن جب عجز و انکسار کا موقع ہو تو تاک کی طرح اس کی شاخیں زمین پر ہر سمت پھیلی نظر آئیں، وہ تازہ اور سرسبز باغ میں پھول کی مانند شگفتہ رو اور حسین نظر آئے کہ شیریں نوا بلبلوں کے چہچہے اور نغمے اس کے گرد بلند ہوتے رہیں۔

اب تک میں نے جن مماثلتوں کا ذکر کیا ہے ان سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ مذکورہ عرب شاعری اور خوشحال کی روح شعری ہو بہو یک ہے۔ واقعہ میں ایسا نہیں۔ ان کے مابین فرق بھی بہت ہیں مثلاً کسی بادیہ گرد شاعر اور کوہ نورد شاعر کے مزاج اور ماحول میں جو قدرتی فرق ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ اور شخصی حالات اور کردار میں بھی بڑا فرق ہے چرند پرند بھی الگ ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہیں کہ مماثلتیں بھی خاصی نمایاں ہیں۔

میں نے اس وقت تک علامہ اقبال کی نشاندہی کے مطابق ابتدائی عرب شاعری (یعنی قبل از اسلام کے شعرائے کبار) کی روح شعری کا تذکرہ کیا ہے لیکن موازنہ و مماثلت کا یہ دائرہ آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔

اس سلسلے میں، میں امرؤالقیس اور متنبی کے کلام سے بھی مماثلتوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ امرؤالقیس اور متنبی کے ساتھ کچھ ملامتیں اور مذمتیں بھی وابستہ ہیں مگر ان کے باوجود ان دونوں کی شاعری کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں کلاسیکی عرب شاعری کی توانائی اور جلال و دبدبہ نمایاں ہے اور اس دبدبے کے پیچھے آزادی و بیباکی، جسوری و غیوری اور حرب و ضرب کے وہ نقشے صاف صاف نظر آتے ہیں جو پرانی عربی شاعری کے علاوہ، خود کلامِ خوشحال میں بھی ہیں۔

میں بغرض اختصار امرؤالقیس کو اس سفارش کے ساتھ ترک کرتے ہوئے کہ کوئی عربی اور پشتو کا عالم اس موازنے پر وقت ضرور صرف کرے یہاں اس موقع پر محض سا حوالہ متنبی کی شاعری سے پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں ـــــ متنبی وہی عظیم شاعر ہے جس نے اپنے بارے میں خود کہا تھا:

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی   والسیف والرمح والقرطاس والقلم

ترجمہ ـــــ پس گھوڑے اور رات اور خشک جنگل مجھ کو خوب پہچانتے ہیں اور ضرب شمشیر و نیزہ بھی اور کاغذ و قلم بھی یعنی میں صاحب رزم و بزم اور مردِ سفر و شجاعت و فصاحت ہوں۔

ملاحظہ فرمائیے اس شعر میں ذوقِ سپہگری، جسوری و غیوری، توانائی اور جلال کے ساتھ شاعری کی دلکش پسندی اور شعر پرستی کا کس شان کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ متنبی ہی نے کہا تھا ع السیف اصدق انباءً من الکتب

ترجمہ — تلوار کی دی ہوئی عبرت کتابوں کی دانش کے مقابلے میں زیادہ سچی ہے۔

معرکۂ حق و باطل میں اس کا درج ذیل شعر ہر جہاد پسند قوم کے لئے ایک موثر پیغام کا درجہ رکھتا ہے۔

ان السیوف مع الذین قلوبھم　　　کقلوبھن اذا التقی الجمعان

ترجمہ — بیشک تلواریں ان لوگوں کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہیں، یا ان کی مدد کرتی ہیں جن کے دل بوقتِ مقابلۂ فوجِ دشمن ایسے ہوں جیسے تلواروں کے (بے جگر) دل یعنی جلادت اور بہادری ہیں۔

متنبی سیف الدولہ کے دربار سے متعلق تھا جس نے عمر کا بیشتر حصہ اپنے مسلم مخالفوں کے علاوہ رومی عیسائیوں کے خلاف جہاد میں گزارا اور اس جہاد میں متنبی بھی اس کے ہمراہ شریک تھا چنانچہ اس کے قصائد میں حرب و ضرب و جنگ و جہاد کے جملہ لوازم (اسلحہ و سازو سامان وغیرہ) کے بھرپور مرقعے موجود ہیں۔

متنبی اور خوشحال کے کلام میں لفظی و معنوی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ خوشحال کی شاعری کا نمایاں ترین وصف وہ جنگ آزمائی اور معرکہ طلبی ہے جو اسے مغلوں کے مقابلے میں پیش آئی۔ اس لئے قدرتی طور سے اس کے اس رزمیہ کلام میں تلوار اور نیزہ، زخم اور اسپ جنگی اور زرہ بکتر — اور اس کے استعارے — باز اور شاہین اور عام زندگی میں شوق شکار وغیرہ بکثرت موجود ہیں۔

متنبی کے یہاں رسم زمانہ کے مطابق شعری اصناف اور اسلوبیات کا تنوع ہے لیکن سیف الدولہ کے ساتھ مسلم قبائل اور رومیوں کے ساتھ لڑائیوں میں جنگ و جہاد کی جو وصف نگاری متنبی نے کی ہے اس سے جنگ و جہاد کی عظمت کا تقریباً وہی تصور پیدا ہوتا ہے جو خوشحال کے کلام سے ابھرتا ہے بطور نمونہ یہاں میں متنبی کے صرف ایک قصیدے کا حوالہ دے کر اس کے منتخب اشعار کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

واشقی بلاد اللہ بالروم اھلھا ..... الخ

ترجمہ (۱) خدا کے شہروں میں سب سے بدنصیب شہر وہ ہے جس کے باشندے رومی ہیں، اور ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تیرے مجد و شرف کا منکر ہو۔

(۲) تو نے ان پر سخت غارتیں ڈالی ہیں یہاں تک تو نے ان کو ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ مقام فرنجہ کے پیچھے کی بلکیں بھی جاگتی رہتی ہیں، یعنی لوگ ایسے خائف ہو گئے ہیں کہ فرنجہ سے دور دراز مقام کے لوگ تیرے حملہ کے ڈر کی وجہ سے جاگتے رہتے ہیں۔

(۳) روم کے شہر خون میں رنگے ہوئے ہیں اور قوم بچھڑی ہوئی ہے۔ گویا وہ شہر مساجد ہیں۔ اگرچہ لوگ سجدہ کرنے والے نہیں ہیں۔

(۴) اور ان کے بلند قلعے جو پہاڑ کی چوٹیوں پر واقع ہیں، تیرے گھوڑے ان کی گردنوں کا ہار بن گئے یعنی انھوں نے قلعوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

(۵) لُقان کی لڑائی کے دن تیرے گھوڑے ان پر آندھی کی طرح ٹوٹ پڑے اور وہ ان کو قلعہ ہنزیط پر ہنکا کر لے گئے یہاں تک کہ شہر گورے گورے قیدیوں کی وجہ سے سفید ہو گیا۔

یاد رہے کہ یہ قصیدہ متنبی نے اس وقت پڑھا جب مسلمان ایک مرتبہ عارضی طور سے رومیوں سے شکست کھا گئے تھے لیکن دوسری مرتبہ بڑی سخت لڑائی کے بعد فتحیاب ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نمونے کے لئے یہ اشعار کافی ہیں۔ خوشحال خاں کا جتنا کلام میرے مطالعہ میں آیا ہے اس کی بناء پر مجھے خوشحال میں متنبی کا جلال اور جوش سب سے زیادہ نظر آیا ہے۔ ممکن ہے میرا یہ تاثر غلط ہو لیکن اگر میں اپنے مقالے کے ذریعے کسی پشتون عربی داں محقق کو وسیع تر اور عمیق تر مطالعہ کی طرف متوجہ کر سکوں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی کیونکہ عالم اسلام میں اس وقت، اپنی حیاتِ دماغی کے تسلسل اور وحدت کی جو آرزو اور جستجو جاگ اٹھی ہے اس کے لئے مختلف ملکوں اور علاقوں کے شعراء و بلغا میں ذہنی اور روحانی وحدت کی نشان دہی یقیناً ایک مفید اور تعمیری کام سمجھا جائے گا۔

اکبر۔ بطور موضوعِ سخن

خواجہ منظور حسین

(مصنف کی تازہ تصنیف "غزل کا خارجی روپ بہروپ" کا ایک باب)

اردو غزل کے خارجی عنصر پر کام کرتے ہوئے خیال آیا کہ کسی فارسی شاعر کے کلام کو بھی اسی نسبت سے کرید کے دیکھیں کہ اس میں سے کیا نکلتا ہے۔ فیضی اس لحاظ سے موزوں نظر آیا کہ وہ ایک بلند پایہ شاعر ہے اور ہماری تاریخ کے ایک مہتم بالشان دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاص غرض سے اس کے مافیہ پر نظر گاڑنے کی تحریک غزلیات اور قصاید کے ایک جدید نقش[1] سے ہوئی، اور یوں پہلی بار انکشاف ہوا کہ فیضی نے اکبر کی شخصیت، عقاید اور سیاسی مصالح پر کتنے مختلف زاویوں سے نظر ڈالی ہے۔

اپنے محرمِ دردِ دل خانہ ہونے اور اپنی پُرکار مرقع کشی کی طرف فیضی نے خود اشارہ کیا ہے:

زفرق تا بہ قدم مو بہ موی من نقشی ہست — گماں مبر کہ دریں خانہ نقش دیوارم

کجاست عارفِ آگاہ، تا نظارہ کند — زخط و خال خال توچندیں صنایعِ صانع؟

ایک جگہ "چشم او ترک کماں داری است" کہہ کر فیضی نے اپنے روئے سخن کی اشارہ کردیا۔ اکبر کے ہر خط و خال کا فعل الگ الگ دکھا کر فیضی نے اس کی الجھی ہوئی رنگ برنگی ذات کے ہر روپ بہروپ سے پردہ اٹھایا ہے:

رومی او مومنِ زنار پرست — زلفِ او کافرِ اسلام پرست

گرچہ سرتا بہ قدم آمدہ ای نسخۂ کفر — کعبہ را مردمکِ دیدۂ اسلام توای

گرچہ رویش سادہ لوحی می نمود — چشمِ او نیرنگ در نیرنگ داشت[2]

آں چہ امروز از نگاہش یافتم — با اشاست ہای دوشیں جنگ داشت

داشت گرچہ ہر نگہ در آشتی — ہر نگہ با آشتی صد جنگ داشت[3]

یعنی اکبر کے "مسالکِ محبت" کی حکمتِ عملی متناقض اجزا کی آمیزش سے خالی نہ تھی:

نوش داروی محبت را مپرس اجزا کہ چیست — سودۂ الماس در زہر ہلاہل کردہ اند

بعض جگہ ترکی باک چشم کا فرکی آتشیں نگاہ جہاں سوز کی دہشت[4] کے باوجود فیضی کے ضبط کا پیمانہ اتنا چھلک گیا ہے کہ تلمیح و کنایت کو چھوڑ چھاڑ وہ برہنہ گری پر اتر آیا ہے:

مسلماناں، دلم خوں شد ز چشمِ نامسلمانش

---

[1] کلیاتِ فیضی جلد اول، مرتبہ اے۔ ڈی ارشد (لاہور، ۱۹۶۷ء)

فیضی کے شعری ادراک کے بعض دوسرے اجزا کے لئے دیکھئے مؤلف کی "اقبال اور بعض دوسرے شاعر" (۳۴۶-۳۴۷، ۵۱۳-۵۱۷)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۷ء

[2] عرفی نے اس نیرنگیِ نظر کو تغزل کا روپ دیا ہے:

ازاں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم — کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

طالب آملی نے بھی مزاج کی متضاد کیفیتیں اپنے ایک شعر میں باندھی ہیں:

طبع نازک مشربم دایم بہ یک منوال نیست — ہر چہ امروزم بہ چشم آب است، فردا آتش است

[3] چشمِ ستیزہ جوی تو باعثِ ترس و باک

اکبر کا جو اثر فیضی پر ہوا، اس کے بارے میں فیضی نے خط کے علامتی پردے میں نہ صرف مختلف موقعوں پر بلکہ بعض اوقات ایک ہی جگہ مختلف جذبات ظاہر کیے ہیں:

دربندِ خطِ رخت، چو فیضی — آزاد شدم ز کفر و اسلام[1]
تا خیالِ خطِ جاناں دارم — کافرم، گر غمِ ایماں دارم
فیضی، از خطِ لبت بر دل — زنگ بر آئینۂ جاں دارم

یہ کھلم کھلا اعتراف بھی فیضی نے کیا ہے: خطت، کہ نامۂ فیضی سیاہ کرد
اور خود اس پر ہی کیا موقوف ہے، اس کے نزدیک:

ہر کہ بہ خطِ تو نگہ می کند — نامۂ اعمال سیاہ می کند

اپنے ہمعصر "چہرہ کشایانِ خودہ بیں" کی طرح فیضی جانتا تھا کہ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے:

سر می رود بہ بادِ زباں راگاہ دارا

یہ بھی وہ خوب سمجھتا تھا کہ اکبر کی نظر بندیِ صاحب نظراں کی بدولت سب کن شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے

کسی چوں نالد از بیداد این ترکانِ عاشق کش — کہ می بندند از دہشت زبانِ دادخواہاں را
حرفِ لعلت زیرِ لب داریم و می سوزد زباں — نامِ زلفت بر زباں داریم و می پیچد نفس
از زباں بندیِ چشمِ او نہ گفتم پیشِ کس — داستاں با کز زبانِ سحر سازش داشتم
با ہمہ آتش بیانی ہا کہ دارد در سخن — در ادای حالِ فیضی را نفس دشوار بود

جاسوسی کا دھڑکا سب کو لگا رہتا تھا:

خیلِ مژگانت جواسیس القلوب
نغمۂ ما ہمہ آلودہ خون است، مباد — قدسیاں زمزمۂ چند بہ داؤد برند!

کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادتیوں کا جو شکوہ اکلام میں بند ہے کوئی مقرب اس کا راز بادشاہ پر فاش کر دے! دوں پر پہرا بٹھانے کی ضرورت سے فیضی واقف تھا:

نامزد کن بر دو بر دلہا جواسیس القلوب — تا شود حرزم تو بر مخزونِ دل با پاسباں

فیضی کو شاعروں کی شوریدہ سری اور دیدہ دلیری پر حیرت ہے کہ ان سنگین پابندیوں کے باوجود، وہ اپنے جذبات کو دل سے زبان پر لانے سے باز نہیں آتے:

در حیرتم نفس نفس از گفتگوی خویش
صورت گراں، کہ نقشِ رُخِ او کشیدہ اند
ای من ہلاکِ چہرہ کشایانِ خیرہ چشم!

مگر اس مہیب ماحول میں ان سب کو تصریح پر تلمیح کو ترجیح دینی پڑی۔ یوں بھی اظہار کا یہ پیرایہ ان کے فن کے روایتی آداب و لوازم میں داخل تھا۔ ہر شاعر، فیضی کے بقول:

---

[1] نظیری نے بھی خط اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے، وہ بھی تاثیر اکبر کے تصرفِ نظارہ جند سے منسوب کی ہے،
ہزار شیخ و برہمن ز کیش و دیں برگشت

می کند شرحِ چشمِ پرفن او   نکتۂ حسن او بہ صد تلمیح

کہ کنایت بود بہ از تصریح

نکتۂ حسن کو ادا کرنے کی چند مثالیں یہ ہیں:

عالم خراب حسن قیامت نشان کیست؟   دورِ کدام فتنہ گراست در زمان کیست؟

ای حسن تو بربستہ نظر دیدہ وراں را   در دیدہ نمک ریختہ صاحب نظراں را

بہر غارت کردن دین و دل و ہوش و خرد   عشوہ ہایت بی عدیل و غمزہ ہایت بی بدل   فیضی

آں عشوہ کہ غارت گر صد قافلہ جاں نیست   در سلسلۂ حسن تو اش نام و نشاں نیست   عرفی

فیضی نے 'حرفِ عشق' کے کنایتی استعمال کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

فیضی، ز حرف عشق کسی پی نہ می برد   سربستہ نکتۂ تو معمای دیگر است

اور اکبر کے 'مشربِ عشق' کی نسبت سے اس کی نشان دہی اسی 'حرف' سے کی ہے:

اظہارِ ارادت و ہم رنگی[1]:

من از شاہنشہ چابک خرام عشق می گویم   مقیمِ بزمِ عشقم، از مقام عشق می گویم

مرید پیرِ مغانیم در طریقتِ عشق   بہ او درست بود نسبتِ ارادتِ ما

در مشربِ عشق چو دانیم ز مذہب

ما بہ نورِ عشق آتش در کتاب افگندہ ایم

کو عشق کہ زنجیر در کعبہ گدازیم   در بہر پرستش صنمی چند بسازیم؟

فیضی نے جہاں اکبر سے انتہائی عقیدت مندی اور فکری یگانگت کا اعلان کیا ہے، وہیں اپنی ہمہ جہت آگاہی کی بدولت، اس کے برعکس روگردانی کی حد تک کڑی سے کڑی نکتہ چینی بھی کی ہے:

ایک طرف، اکبر کے مسالک گرم روی کی ہم نوائی:

سلوک گرم رواں یاد گیر از دم فیضی   پیرِ عشق بہ رفتار او مرید نہ دارد

دوسری طرف اسے گمراہی ٹھہراتا ہے:

گرماہ در روش ایں بود آں ناقہ رواں را   گمراہ کند قافلہ کعبہ رواں را

ایک طرف عشق کی زنجیر میں جکڑے جانے کی یہ تڑپ:

ای عشق بہ شورآور اندروں دیروم را   از پای بہ گردن نہ زنجیر جنونم را

دوسری طرف اس سے بددلی کا یہ عالم:

وہ کہ ما وای بلا شد جای ما   وای بر ما، وای بہا، وای ما!

ما و زنداں شکیبائی کہ عشق   ماند زنجیر گراں در پای ما

ما ایم و تہی دستی کونین، کہ عشقت   ہم بی دل و بی دیں خواہد ہم بی سروساماں

---

[1] بیان بہ شاہراہ ارادت شتافتہ فیضی

یاراں ہمہ در طاعت حق دست بہ بستند   فیضی کمر بندگی حضرت شہ بست

خواہی کہ بہ چو من رہ ہدی بشناسی   نہ شناختہ شاہ را، کجا بشناسی؟

ایں سجدۂ نا قبول سودت نہ دہد   اکبر بشناس، تا خدا بشناسی

بادشاہ زمانہ اکبر شاہ ۔۔۔ بہ مدد تربیت اش سلوک مدارج صورت و معنی نمودم و پست و بلند بہ وادی ظاہر و باطن بی پیمودم۔ رفتہ رفتہ در بندگی نواش شدم و بہ سعادت ابد خواہم تا ش قدم۔۔۔

جن حالات کا سامنا ایسے شاعروں کو تھا جو اکبری دربار کے متوسل یا کسی نہ کسی حیثیت میں اس سے وابستہ تھے، ان کا خلجان ضمیرِ فیضی سے زیادہ کون سمجھ سکتا تھا؟ چنانچہ ان کے دل و دماغ کی اندرونی کشاکش اس نے خوب محسوس کر کے بیان کی ہے۔ ایک طرف مغلِ اعظم کا جلال و جبروت:

چہ از جا نہ رود آدمی، کہ از حرکات — زمیں بہ لرزہ در آید بہ گاہِ جولانش
گفتم: دلیر سوی بتاں بنگرم، ولی — از یک نگاہ زہرۂ اسلام می رود
اسیرِ طرۂ آں سرکشم، کہ کشید — بہ قیدِ حلقۂ فتراک شہسواراں را
فیضی، اسیرِ سلسلہ موی ست کز غضب — زنجیرِ فتنہ بر دلِ شیرانِ دیں نہد

دوسری طرف اکبر اور اس کے مشرب کے باب میں آویزشِ دروں:

عشق تا کی شرمسارِ دین و ایمانم کند؟ — نی مسلماں سازد و نی نامسلمانم کند — فیضی
منم و کشمکشِ طبع و دلِ عربدہ ناک — گریبانِ فلک در کف و گہ دامنِ چاک
جای رحم است بر آں عمر دوابی دلِ دیں — کہ بہ ہر نازِ تو صد عرضِ نیاز است او را!
تو، ای کبوترِ بامِ حرم، چہ می دانی — تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پا را
غافل نہ ام ز راہ، مگر آہ، چارہ چیست — زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند
کس راہ گم نہ کرد، کہ خضرِ رہی نہ یافت — ما در میانِ کعبہ و بت خانہ سوختیم
نہ کافرم، نہ مسلماں، مرا کہ آتش زد — کہ ننگِ سوختنِ من بہ دینِ خویش نہاد؟ — عرفی

اکبری مشرب کے دو اجزا: آتش و بادہ:

تا عشقِ بت گرفتہ درون و برونِ ما — آتش بروں و بادہ دروں شست و شوی ما

آتش پروری:

کافر عشقیم، دمی بینیم در روی بتاں — ہم چناں آتش پرستاں را نظر بر آتش است
تا نشستیم در آتش، ز بتی روشن شد — کہ در آتش کدہ ہم نورِ مسلمانی بود
آں گلبنِ نوریم کہ از آب بسوزیم — واں نخلۂ طوریم کہ از شعلہ ببالیم
زاہدا، با من حدیثِ چشمۂ کوثر مگوی — آتشی دارم بہ دل کز آب نتواں چارہ کرد

چراغ افروزی:

بادا چراغِ میکدہ روشن کہ گشت ازو — دوزخ بہشت ایں دلِ آتش پرست را
در دلِ قندیل سوزِ کعبہ آتش در زنم — عشق اگر آتش فروزِ دیر و رہبانم کند
خوش آں دمی کہ بہ دل ہا کند نہاں آتش! — خوش آں دلی، کہ در او آشیاں کند آتش!
دلم، کہ دید در آتش نشانۂ رخِ دوست — سزد، کہ قبلۂ خود جاوداں کند آتش
ہر آنچہ جلوۂ مہتاب در خرابہ کند — درونۂ دلِ من آں چناں کند آتش
دلم بہ عالمِ بالا ہمی کند پرواز — چناں کہ رو بہ سوی آسماں کند آتش

اس مشرب پر پیچ و تاب: بسوخت دین و دل از سوزِ عشق و محرمی ام — کہ ایں معاملہ با خان و ماں کند آتش

یکی بہ پہلوی آتش، خدای را بنشیں — کہ سوزِ من بہ تو خاطر نشاں کند آتش
زماں زماں نفس گرم خیزد از دلِ من — چناں کہ دود دلِ خود عیاں کند آتش
ہزار نالۂ سوزندہ بر زباں دارم — سزد اگر بہ خودم ہم زباں کند آتش
آں کعبہ پرستیم، کہ دیوانۂ دلِ ما — قندیل فروزِ سرایوانِ کنشت است

ایک بار جوش میں آکر انتہائی جسارت سے کام لے کر اکبر کو آتش، فروزی کے مراسم سے روکنا چاہا، پھر ایک دم زبان بدلی اور گویا زبان حال سے کہا: اس فتنہ خو کے در سے ہم اُٹھتے نہیں، اسد — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو! غالب

جذبے کا یہ اتار چڑھاؤ خود فیضی کی زبان میں دیکھیے:

ای عشق، منہ بر دلِ ما داغ جگر سوز — در کعبۂ ما آتشِ زردشت میفروز
ہیہات! چہ گفتم؟ من، واز عشق شکایت؟ — تا چند نصیحت گرِ من عشق بد آموز؟
گو عربدہ بر شیشۂ من سنگ بہ انداز — گو صاعقہ بر خرمنِ من برق بہ اندوز
گر مشعل ما مرد، زہی اخترِ فرخ! — در خانۂ ما سوخت، زہی عالم فیروز!

مگر جب تک آتش پرستوں پر خوب طنز و تعریض اور لعن طعن سے اپنی بھڑاس نہ نکال لی، اس وقت تک چین نہ آیا:

مسوز دل، کہ ز گرمی ہلاک خواہد شد — میاش ایں ہمہ آتش، کہ خاک خواہد شد
ہمت پست قدم چند ز بونم دارد؟ — آبِ فرعون بدہ آتش نمرود بیار؛
بہ جرم عشق اگر سوی دوزخم ببرند — در آتش افتم، و خود را بہ منت گیرم
تابوتِ فیضی از حرمِ کعبہ می برند — آتش درو زنید، کہ بس خام می برند
مریزید آبِ زمزم، دوستاں بر تربتِ من — کہ ایں بد مست تر دامن بہ آتش پاک خواہد شد

تعظیم خورشید:

ابوالفضل آئین چراغ افروزی کے ضمن میں لکھتا ہے:

گیہان فرمانبد روشن دل نور دوستی را ایزد پرستی شمارد و ستایش الٰہی اندیشد۔ نادانِ تیرہ خاطر داور فراموشی و آذر پرستی خیال کندہ، خرد پژدہ ژرف بیں نکو داند۔

چوں از روز یک گھڑی ماند، خدیو عالم اگر سوار باشد، فرود آید و اگر غنود، بیدار گردد، و زہر نقاب جمال آرا یک سو شدہ، ظاہر را بہ رنگ باطن گرداند و چوں روشنی بخشِ جہان نور نورلیش برگیرد، خدمت گزاران سعادت گرائے در دوازدہ لگن ہای زریں و سیمیں کافوری شمعہا افروختہ، در پیش گاہ حضور آورند، و یکے از سرایندگان شیوا بیان شمع در دست، ایزدی سپاس برگزارد و بہ گوناگوں نمط سراید و سپس دعای دولت افزوں برخواند، و انجام سخن کند۔ گیتی خدیو نیایش دنیاز را پایہ برتر نہد و تازہ فروغ دریوزہ کند۔

ابوالفضل آئین شمار دری، کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

خدیو عالم اکثر وقت عبادت اور محاسبہ روحانی میں، دمِ صبح سحر گاہ، کہ دیباچہ بہروزی و عنوانِ نور پاشی است، نیمۂ روز کہ فروغ آفتاب عالمتاب جہاں را در گیرد و سرمایۂ نشاط گوناگوں مردم را آید، و شام گاہ کہ مایہ دور روشنی ہا از چشم خاکیاں پنہاں شود و نور دوستاں را سراسیمگی در گیرد و نیم شباں کہ آں روشنی افزای انجمنِ ہستی رو بہ فراز نہد، و غم زدگانِ تیرہ شب را نوید خوش دلی رساند۔

(منقول از اکرام: رود کوثر ص ۱۲۴، ۱۲۵)

مشربِ مینا؛
دقیقی نے چار خصلتوں کا ذکر کیا ہے؛

دقیقی، چار خصلت برگزیدست ... بہ گیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لبِ یاقوت رنگ و نالۂ چنگ ... میِ خوں رنگ و کیشِ زردہشتی

اکبر ان چاروں کا قائل تھا۔ اس کے کیشِ زردہشتی کا 'می خوں رنگ' ایک لازمی جز تھی اور اس کا ہر مرید یہ چیلا پابند تھا کہ خود کو پیرِ مغاں کے رنگ میں رنگے؛

شاہ اسکندر منش اکبر، کہ در بزمِ مراد ... ہمچو خضر، از چشمۂ حکمت قدح پیمای شد
جامِ می گیر کہ گمراہِ طریقت نہ شود ... آں کہ چوں پیرِ مغاں راہ نمائی دارد
فروغِ باطنِ خود از پیالہ جوی فیضی

فیضی نے اس مشرب کے اجزا میں، دیر و کعبہ، دونوں سے یکساں برگشتگی، اربابِ طاعت، خصوصاً ان کے 'زہدِ خشک' اور زہدِ ریائی سے بیزاری، اور مدرسے پر مے کدہ کی فوقیت کو شامل کیا ہے؛

کفر و دیں در نظرِ مردمِ آزاد یکی است ... حلقۂ کعبہ و کعبِ قدحِ بادہ یکی است
پیشِ ما کعبہ ہماں باشد و بت خانہ ہماں ... غلغلِ ذکر ہماں، نعرۂ مستانہ ہماں
ای من غلامِ مشربِ ساقی، کہ ساغرش ... آتش بہ دیر و کعبہ بہ یک بار می زند!
از کجا گیرم رہِ تقویٰ، کہ خطِ دورِ جام ... دادہ از اربابِ طاعت خطِ بیزاری مرا؟
این زاہدانِ خشک چرا تر نہ می شوند؟ ... چوں ما حریفِ شیشہ و ساغر نہ می شوند؟
ز زہدِ خشک گرد از بس برآورند دم سازاں ... لبِ قرابہ سیراب و گلوی شیشہ تر گرداں
بیا ساقی، از آں می کز وضو بہیم ... ز لوحِ خاطرِ خود توبہ ہای نصوح
فیضی از قیدِ زہد وارستیم ... بادہ خوردیم؛ ہرچہ بادا باد
فیضی از زہدِ ریائی شد ملول ... ساقیا! وردہ شرابِ ناب را
یا رب، آں می چہ عجب بود کہ کیفیتِ آں ... فارغ از وسوسۂ زہدِ ریائی می کرد!
بامِ درِ می خانہ بہ از صد عرفات است ... ما با ہمہ سازیم، بہ سالوس نہ سازیم
زاہداں گر بہ ہم مشربی ما می سازند ... نہ گزاریم کہ آب از قدحِ ما نوشند
حاصل نہ شد ز مدرسہ جز خشکیِ دماغ

مرو بہ مدرسہ از بہرِ کسبِ علم و صلاح ... کہ یک صراحی می بہتر از ہزار صلاح
بیا بہ می کدہ فیضی و رمزِ عشق آموز ... چرا بہ مدرسہ اوقات می کنی ضایع؟

اکبر کے مشربِ رندانہ کے باب میں اپنے تعلق و بے تعلقی، قرب و بعد کے مخلوط رویے کی وضاحت فیضی نے ان اشعار میں کر دی ہے:

محمود با بندۂ عشق می باخت ... ما عشق بہ شاہِ خویش بازیم
رندیم، از کیشِ ما چہ پرسی؟ ... ما زہد فروشِ کیش بازیم

ملامتی و رندِ قدح خوارہ ولی پاکیم   بہ اہلِ حال نمودیم حالِ خود مشروح
رندیم و خراباتی، بر ما چہ بہ افزاید   کز بادہ بہ جام، خورشید فرو ریزد
من و رندی و دیر مشرب ہا   تا بگیرد قرار مذہب ہا
دل پیالہ کش و چشم پارسا داریم   کرامتِ مشربِ رندانہ ای کہ ما داریم
در بادہ غرق، و یک دم از بادہ آگہی نہ   بشناس چون صراحی رندانِ پارسا را

ایک جگہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اس مشرب کے بارے میں جو کچھ خود اس۔نے اور دوسرے شاعروں نے لکھا ہے، وہ اُس کے ماننے والوں کی ترجمانی ہے، گویا تقلید و تبلیغ سے اس کا علاقہ نہیں:

ہر حرف کہ بر ناصیۂ جام نوشتند   رمزی ز حریفانِ می آشام نوشتند

مگر اس ترجمانی کا آہنگ تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مشرب سے کلی بیگانگی اور ایک جداگانہ طریقت سے وابستگی کا علانیہ اظہار بھی کلام میں موجود ہے:

ساقی برو، کہ مستی ام از جای دیگر است   سرگرمی ام ز آتشِ سودای دیگر است
سرم بہ عشوۂ ساقی فرو نمی آمد   کہ مستی دلم از جامِ بینشِ دگر است
مکن ملامتِ فیضی اگر قدح نکشید   کہ او ز بادہ توحید سرخوشِ دگر است

(اکبر بطور خورشید: (مشربِ آتش پرستی کی رعایت سے)

فیضی کے اشارے موجود ہیں کہ اس نے ظلِ یزداں، آفتابِ سلطنت، شاہ ابوالغازی محمد اکبر کو پیکرِ خورشید دیا ہے اور اپنے کلام کو آئینۂ خورشید کہا ہے:

تما، از ذرۂ خورشید بود خرقۂ ما
غافل مشو ز کسوتِ ما خاک نشیناں   کآئینہ خورشید بود در نمدِ ما

اظہارِ عقیدت:

شاہِ خورشیدِ علم، اکبر شاہ   کز دلش نور بہ اقطاب رسید
نیست جز پرتوِ خورشید در عالم   گہ گہی نارِ خلیل است و گہی نورِ کلیم
در شاہ راہِ عشق بلند است مقدمم   کز عاشقانِ حضرتِ خورشید انورم
بہ خورشیدِ عشق سرگرمیم   از ہوای بہشت دل سردیم
ہمچو صبح، از دل او نورِ یقین شعلہ زند   ہر کہ مہرِ رخِ خورشید لقای دارد
(باد از رشتۂ تسبیح گرہ در کارش   کافرش اگر از جز تو خدای دارد)
ای کہ از نیرِ اقبال نظر می خواہی   چشم بکشای، کہ صاحب نظری پیدا شد
نیست یک ذرہ ز خورشیدِ ضمیرش پنہاں   ہمچو خورشید عجب دیدہ وری پیدا شد
گم رہانِ رہ تقلید بہ حسرت بودند   مگر این قافلہ را راہبری پیدا شد؟

اکبر کی تعظیمِ خورشید:

چون شاہِ فلک قدر بہ ہنگام سحر   از صدق کند سوی خورشید نظر
بر دہ مصحف توحید کشا، و ز اخلاص   ہذا ربی، بخواں و ہذا اکبر

بدولی: لاف خورشیدی ازاں دود نہاداں عجب است   کہ فروغ از شرر دور ز اخگر گیرند
فیضی! از قبلہ ز خورشید کند، طعنہ مزن   کہ زبت خانۂ ہند دصنمانِ ہند والست
ہمچو خورشیدِ قیامت، وہ کہ عالم سوز شد   آتشیں روی کہ می دیدیم شمع محفلش!
بر فقر مزن طعنہ، کہ بس برہنہ پایاں   بر دیدۂ خورشید نہا دند قدم را

طالب آملی نے بھی خورشید سے جلوہ نور اخذ کرنے کی بجائے 'درگاہ دل روشن' سے رجوع کرنے کی ہدایت کی ہے:

طالب از روزن خورشید مجو جلوہ نور   نظری دار بہ درگاہ دلِ روشنِ ما

خورشیدِ خاور کی ہم عنانی کو وہ باعثِ ننگ سمجھتا ہے:

چہ شد گر ذرہ ام؛ چوں شہ سواری ہمتی دارم   کہ با خورشید خاور ننگ دانم ہم عنانی را

اکبر بطور آفتاب:

آفتابی نہفتہ در دل ما

ای صبح، دم مزن کہ کم از آفتاب نیست   آئنہ ای کہ ہست نہاں در غلاف ما
من مریداں یک اندیشان کہ چوں صبح مراد   آفتابی در ضمیر خویش پنہاں کردہ اند
گوہرِ ذات اوست در نظرم   گر توجہ بہ آفتاب کنم

اکبر کی تکریم آفتاب!

قسمت نگر کہ در خود ہر جوہر عطا   آئنہ با سکندر و با اکبر آفتاب
او می کند معائنہ خود در آئنہ   ویں می کند مشاہدہ حق در آفتاب
بدولی: فیضی کجا و قطع نظر از بتانِ ہند؛   از کافر آفتاب پرستی نہ می رود

اب ذرا تفصیل سے دین الٰہی کی معجونِ مرکب کے بارے میں فیضی کے تاثرات خود اس کی زبان میں دیئے جاتے ہیں۔ یوں کسی حاشیہ آرائی کے بغیر، اندازہ لگایا جاسکے گا کہ ان سے ترجمانی، ہم نوائی، رد و قدح کا کتنا ادلتا بدلتا رویہ ٹپکتا ہے:

سجدۂ تہنیت تسلیم کرنا:

سجدہ آوردیم بر خاک رہش   شکر للہ قبلہ گاہی یافتیم؛
سجدہ آوریم بر سوی بتاں   کافرانِ عشق را ایں است کیش
شد سجدہ نہاد قبول از سرِ اخلاص   تا نام بتاں بر سرِ سجادہ نوشتند
از بجو دبت چرا آرم سوی محراب رو   من کہ از یک سنگ دانم کعبہ و بت خانہ را؟

سجدے سے منہ موڑنا:

مراد پیش آں بت سجدہ کردن کی روا باشد   کہ از ایمان گرہ در رشتۂ زنار می بینم؛ فیضی
در دیاری کہ بسجدہ خم ابرو رسم است   غیرِ محراب کج و قبلۂ دیراں مطلب نظیری

اکبری مشرب سے موافقت:

چو بہ مشرب نہادہ ایم قدم   الوداع، الوداع، ای مذہب!

فیضی، خبر از طاعتِ زہاد نہ داریم — در مشربِ عشقیم: چہ دانیم ز مذہب؟
من و رندی و سیرِ مشرب ہا — تا بگیرد قرار مذہب ہا
فیضی و مدام مشربِ عشق! — بی چارہ فقیہہ و لافِ مذہب
ز کونین رستند آزادہ جاناں! — چہ دانند این شاہ بازانِ قفس را
در بندِ خطِ رخت چو فیضی — آزاد شدم ز کفر و اسلام
تا خیالِ خطِ جاناں دارم — کافرم، گر غمِ ایماں دارم!
ترا کہ گوہرِ دل دادہ ام بہ نیم بہا — اگر مضائقہ در دیں کنم گنہ گارم

کعبہ روی پر طعن و تعریض:

قبلۂ عالمِ توحید برون از جہت است — صنمِ کعبہ بود از نظر افتادۂ ما
روی با دیوار آوردن دلیلِ کافری است — سجدہ گاہِ عارفاں را حاجتِ محراب نیست
آن کہ می کرد مرا منعِ پرستیدنِ بت — در حرم رفتہ طوافِ در و دیوار چہ کرد؟
نشانِ گرم روانِ حرم چہ می پرسی — کہ غیرِ ریگِ رواں نیست در بیابانش
ز فرق کردہ قدم، رو بہ عالمی دارم — کہ کعبہ ذرۂ ریگ است از بیابانش
طے کردنِ حمازہ دریں راہ ثواب است — بر قافلۂ کعبہ رواں مست بتازیم
دیں کعبہ، کہ حجاج برافراختہ اند — انداختہ چوں دیر اساسی بہ فرازیم
فیضی

کعبہ پرستوں سے نوک جھونک:

دیں قدر کعبہ پرستی کہ تو داری عرفی — از تو آید کہ کنی منعِ من از طوفِ کنشت؟
شرف از کعبہ گر از سجدۂ اربابِ ریاست — گوشۂ بت کدہ ہم ناصیہ سای دارد
ساکنِ کعبہ کجا! دولتِ بیدار کجا! — ایں قدر ہست کہ در سایۂ دیواری ہست
محفلِ دوست گزارند، در رہ کعبہ روند — ہرزہ گرداں، کہ نہ دانند رہِ راست ز کج
عرفی

اسلامی عقاید کے باب میں اکبری راہ و روش:

گر سوی حرم آں بت یک لحظہ نظر اندازد — ہم قبلہ بگرداند، ہم کعبہ بر اندازد
گر زلفِ تو در صومعہ تاز افشاند — آوازۂ کفر از دلِ اسلام برآید

بہشت و دوزخ:

امید و بیم بلا شد، اگر قیامت عشق — بہشت و دوزخِ ما را بہ بادِ صور دہد!
خیال سوختۂ جامِ سلسبیل مباش
ما کلیدِ بہشت بشکستیم — درِ دوزخ بہ روی ما بستند!
طوبی و خلد عاقبت نہ می خرم بہ مشت خس

زنند طعنہ بہ محشر بہشت جویاں را — کہ ایں گروہ رعایای ہمت پست اند — فیضی
آں دُردکشانی، کہ شناسای عیار اند — فردوس بہ یک خوشۂ انگور فروشند
چناں سیراب ساز امروز جاں را — کہ فردا تشنۂ کوثر نہ باشی — نظیری

حشر و معاد:

برحذر باش ازاں غمزۂ بی باک کہ او — جنگ جوی است کہ جز بر صفِ محشر نہ زند!

ملائک:
خندۂ فرشتہ را سینہ کباب می کند
پرِ فرشتہ بر آتش نہم بجائے بخور

وہ عشق است ہماں، بہ کہ ملایک پس ازیں — بر سرِ کعبہ رواں سایہ ز شہپر نہ کنند
نزدیک شد کہ، سرِ ملائک برافگند — ایں شوخ چشمی، کہ ز جانانۂ من است
از تفِ بادۂ ما بالِ ملایک بگداخت — وای آں روز کہ برقی جہد از شیشۂ ما۔

جس کی تمہید ملایک سوزی ہو، اس کا تتمہ کیا ہوگا!

الغرض، کوئی مروجہ عقیدے رکھنے والا نہ تھا جس کا شیشۂ دل چکنا چور نہ کیا گیا ہو:

کدام سنگ پرستِ حرم گذشت آں جا — کہ شیشۂ دل او را چو توبہ نہ شکستند؛

عقاید کی یہ توڑ پھوڑ ایسی نہ تھی کہ ان کی مرمت کی پھر کوئی صورت نکل سکتی:

زاہد از سنگِ در کعبہ نیارد دل بستن — عشق آں رخنہ کہ در بت کدۂ دینش کرد

اعتقاد کی کانٹ چھانٹ کا عرفی نے بھی یہی اثر بیان کیا ہے:

وہ کہ از دوختن ایں چاکِ گریباں رفتہ است — ایں شگافی ست کہ تا دامنِ ایماں رفتہ است

ایک قصیدے میں تو اکبری مشرب کا اظہار اس برملا ہوا ہے کہ اس کے بعض اشعار پر "رخنہ در ارکانِ اسلام" کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے:

بی خود شدہ ای نعرۂ مستانہ ہیوجیم — تکبیر کشِ حی علیٰ را شناسیم
بر نطعِ خراباتِ مغاں سر بسجودیم — سجادہ و محرابِ دعا را نہ شناسیم
از کعبہ نہ پرسیم، در رہِ سعی نہ پوئیم — از مروہ نہ گوئیم، و صفا را نہ شناسیم
جمازہ نہ رانیم، و بہ محمل نہ نشینیم — صوتِ حدی و بانگِ درا نہ شناسیم
از قافلہ ما نہ تواں یافت نشانی — رقصِ جرس و بانگِ حدا را نہ شناسیم
ما از ریا را بہ کفِ زہد نہ گیریم — دراعہ و تسبیح و ردا را نہ شناسیم
در سلسلۂ ماست دوی کفرِ طریقت — ایں کش مکشِ خوف و رجا را نہ شناسیم
از نسیہ مگوئید کہ ما طالبِ نقدیم — داد و ستدِ روزِ جزا را نہ شناسیم
ایوانِ فلک رفعتِ ما زیرِ زمین است — مقصورۂ فردوس بنا را نہ شناسیم

اس قصیدے میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں جن میں اس بے اعتقادی سے صریح اختلاف کیا گیا ہے:

برہانِ ثبوتیم، ز ما نفی نہ آید — از ما نعم آموز کہ لا را نہ شناسیم

اصحاب یقینیم، گماں را نہ پذیریم   ارباب صوابیم، خطا را نہ شناسیم

با اہلِ جدل نکتۂ توحید نہ گوییم   در وحدتِ حق چون و چرا نہ شناسیم

نورِ نبوی در نظر ماست ہویدا   روشن نظرانیم، عمی را نہ شناسیم

اس سے زیادہ دورنگی کیا ہو سکتی ہے؟
اب اکبری مشرب سے برگشتگی کا اعلان سنیئے:

سر سودای تو نہ گذاشت دل و دین ما را
گداختم ز دلِ پادشاہ مشرب خویش

ایک شعر میں فیضی نے اس مشرب اور اس کے مخترع دونوں کو ٹھکرایا ہے:

تا درِ وصل آدم آبلہ پای ہم چناں   حلقۂ کبریای او یازدہ باز پس شدم

درحقیقت یہ باہم متخالف خیالات اس نفسی کیفیت کا آئینہ ہیں جس کا سامنا فیضی کو کرنا پڑا۔ اس کے مافیہ کا ایک مخصوص جزیہی مسائل تھے جن پر بحث و تمحیص، مناظرہ و مجادلہ کا بازار اکبر گرم رکھتا تھا۔ چنانچہ کلام میں ان کے بارے میں وہ روش اختیار کی گئی جس کا اعتراف فیضی نے بڑی صاف گوئی سے کیا ہے:

فیضی، ہمیشہ خانہ ما را دو در بود   یک رو بہ سوی کعبہ و یک رو بہ سوی دیر

در لبِ من در دو لختے بود
در روزگارِ ما ز دورنگی گریز نیست
گر زاہدِ مسجد است فیضی   گہ کافر سومنات باشد

کبھی کبھی یہ گوناگونی چھوڑ کر سادہ لوحی کی طلب بھی محسوس کرتا ہے:

یک چند سادہ لوح برآیم چو آفتاب   تا کی ہزار رنگ چوں حباب بر دمم؟

ملامت گرانِ دہر کے اعتراضات کی دھار کند کرنے کی غرض سے فیضی نے اپنا مسلک اس مصالحانہ پیرائے میں پیش کیا ہے:

فیضی از رقِ قلہ کعبہ رواں بیروں نیست   ایں قدر ہست کہ از ما قدری در پیش است

مسافرانِ طریقت ز من جدا مشوید   کہ دو روز ہنیم و چشم بہ منزل افتادہ است

شبلی نے فیضی کی غیر منقوط تفسیر پڑھ کر جسے وہ بیہودہ مغز کاوی کہتے ہیں، اس کے عقاید کے بارے میں یہ رائے قائم کی:

"ایک ذرہ مسلمات عام کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا۔ ملا بدایونی صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقاید اسلام کا منکر تھا، لیکن وہ ان تمام عقاید کا معترف نظر آتا ہے جن کو معتقدات عوام کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو کچھ سنتے ہیں زبانی سنتے ہیں، تصنیفات میں تو وہ ملای مسجدی ہی نظر آتا ہے" (شعر العجم ۲، ۵۸)

خود فیضی کی زبانی اس امر کی وافر شہادت مہیا کی جا چکی ہے کہ اپنی شاعری میں ملای مسجد کے علاوہ وہ اور بھی روپ بہروپ رکھتا ہے[۵۷]۔

۵۷

زہندی نژادان جادو ترانہ   ز دو خوش نژاد من نوای خراساں
کشد صندلم بر جبیں خاک دہلی   زند ارغنوں بر دمم باد شروان
فرو رفتہ قیم بہ گوشش موزون   بہ پیچیدہ صوتم بہ نائی رہبان
مناجاتیاں خواندہ نثرم بہ نغمہ   خراباتیاں گفتہ نظمم بہ دستاں
دل خانہ، چوں ساقِ عرش است محکم   مرا سینہ چوں سطح کرسی است ذی شاں

بگیر محضرِ دیوانِ فیضی و بنگر   سخن طرازیِ رندِ ہزار مذہب را

فیضی نے اکبر کی ابتدائی بقول شبلی مذہبی خود رفتگی، اور بعد کی بداعتقادی دونوں کا

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

کے لہجے میں ذکر کیا ہے[۱]:

فیضی امروز شہرِ عرصۂ رنداں شدہ است   گرچہ دی بر درِ میخانہ گدائی می کرد
خاکسترِ آتش کدۂ دیرِ مغاں شد   آں کو بہ مشامِ سبحۂ زریگ حرم آورد
بعد از ہزار سعیِ ثواب و مجاہدت   زنار را ہبِ دبتِ ترسا بہ ما رسید!
ما کہ یک چند بہ زہد و ورع افسانہ شدیم   عاقبت حلقہ بگوشِ درِ میخانہ شدیم

(آخری شعر میں ضمناً خود اپنی طرف بھی نظر ڈالی ہے)

فیضی تحلیلی نظر رکھتا تھا جو ان شخصی اور نفسی موثرات پر بھی پڑی ہے جو اکبر کے اس کایا کلپ کا باعث ہے:

چنیں کہ رندی و مستی است مشربِ فیضی   نہیبِ واعظ و پندادیب شد باعث

یہ اشارہ صدر الصدور عبدالنبی کی سخت گیر تربیت اور اس کے شدید ردِ عمل کی طرف ہے۔ بعض اشعار جن سے بے فیض مذہبیت سے بدلی ٹپکتی ہے، اکبر کے ذاتی مشاہدے اور تجربے پر مبنی معلوم ہوتے ہیں:

ذہ کہ در اسلام و کفر امروز معموری نماند!   در چراغِ دیر و قندیلِ حرم نوری نماند
دیدیم کہ از کعبہ بہ جائی نہ رسیدیم   رو سوی بت و پشت بہ محراب نشستیم
ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگ رہِ ما بود   رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم
سال ہا معتکفِ صومعہ بودیم، ولی   غیر بی حاصلی از زہد نہ شد حاصلِ ما
رفتیم سوی کعبہ نشیناں صومعہ   ہر جا نشستہ زاہد فرتوت یافتیم
زاہد بہ عالمِ ملکوت آں قدر نہ یافت   چیزی کہ ما بہ عالمِ ناسوت یافتیم

عرفی نے بھی صوفیوں اور زاہدوں کی (بے توفیقی) شید اور فتنہ گری کو اکبری دور کی نامسلمانی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے:

طعنِ بی توفیقی، ای زاہد بر رنداں بس است   چوب دستی ہای توفیقِ شما ہم دیدہ ایم
کفر و دیں را ببر از یاد کہ ایں فتنہ گراں   در بدآموزیِ ما مصلحت اندیش خود اند
شید صوفی طالبانِ کعبہ را گمراہ کرد   نامسلمانی در آمد فوجِ ایمانی شکست

اس خلل کی یہی تشخیص طالب آملی نے کی ہے:

خانۂ شرع خراب است کہ اربابِ صلاح   در عمارت گریِ گنبدِ دستارِ خود اند

فیضی کے ایک شعر میں ان مذہبی مذاکروں کی طرف خصوصی اشارہ ہے جن میں اکبر نے خود آزما کے دیکھ لیا اور اپنے بھرے دربار کو علانیہ دکھا دیا کہ شیخ و زاہد دینی اور دنیوی بصیرت سے یکساں عاری ہیں، اور بقول شبلی، ان کے پاس لعن اور تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں:

شیخاں و زاہداں را دیدیم و آزمودیم   نی بہرہ ای در آناں، نی حاصلی در ایناں

---

[۱] تمام عمر بہ تسبیح کردہ ام بازی   کجا طبیعت طفلانہ و کجا زنار! عرفی

ان بے سرو پا مجادلوں پر ان سب شاعروں نے جنھیں ان کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملا، مختلف پہلوؤں سے نکتہ چینی اور طعن و تعریض کی ہے:

فیضی، چہ سود کوششِ بحثِ ستیزہ کار

پیوستہ گرمِ بحث و جدل ہیمت ولی   نہ بود نتیجہ تو زگرمی مگر عرق!

عرفی نے اس مبحث پر خصوصی توجہ دی ہے:

گلچینِ عشق شو، بہ خرد واگزار بحث   تا باغِ ذوق را نہ کند خار خار بحث

در بحرِ علم گرچہ سزاوار رہبری است   کشتیِ شبہ را نہ برد بر کنارِ بحث

بگذر ز کسبِ علم، کہ آلودہ کردہ اند   ہر مطلب تمام بہ چندیں ہزار بحث

سیلاب فتنہ خانۂ دیں را خراب کرد   از بس کہ بر عقیدہ بود فتنہ بارِ بحث

زاں قال را ز انجمنِ حال راندہ اند   کز روی خامشی نہ شود شرمسار بحث

یک سخن نیست کہ خاموشی از آں بہتر نیست   نیست علمی کہ فراموشی از آں بہتر نیست

اینک، اصحابِ حرم جرعہ زنِ نزع و صلاح   کو صلاحی کہ قدح نوشی از آں بہتر نیست

دین اگر ایں است کیں جمع پریشاں را   برہمن بر اہلِ دل شاید کہ طنازی کند

دوش در مجلسِ اصحاب نشستم ہمہ گوش   چہ بشنیدم از آں طعنِ برہمن بہ بود

عرفی آں ہا کہ بہ تحقیق مسایل مست اند   خونِ ہم خوردہ از آں چہرہ برافروختہ

از بس کہ در معارضہ دیدم محال ہا   عاجز شدم ز کش مکشِ احتمال ہا

آں را کہ مردِ حال باشد   کے رغبت قیل و قال باشد؟

عرفی جیسا دیدہ ور شاعر ان مسایل اور مباحث کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا جو اس زمانے کی فکری فضا پر چھائے ہوئے تھے، مگر وہ اپنے نہ نشیں مزاج سے بھی بخوبی آگاہ تھا:

ما می گزیم شہدِ ریا را نہ، زاہدا!   تسبیح و شمیم، نہ زنار دوستیم[۱]

مرا نہ حسنِ عبادت، نہ زشتیِ عمل است   متاعِ من دلِ مجذوب و مستیِ ازل است

نہ از شرابِ طہور، از می سخن مستم

نظیری نے رد و قبول کی بحثِ کج پر چھوڑ کے اس داورِ بے باک کے باب میں خود اپنا جداگانہ مسلک واضح کر دیا ہے:

دعویِ عقل جز از عشق مشخص نہ شود   بحثِ کج را بہ درِ داورِ بے باک اندازیم

دلیلِ حجتِ حق دیگر است و حق دیگر   طریقِ جہل ہزار و رہِ شناخت یکی است

علمِ دین کے مدعیوں سے اکبر کی برگشتگی کی بڑی وجہ سیاسی تھی:

واعظ شدہ از غلغلۂ بیہدہ برباد   زاں گونہ کہ در مسجدِ آدینہ نہ گنجد

اس "غلغلۂ بیہدہ" سے مراد علما کی سیاسی امور میں دخل اندازی ہے، جو ہمہ مقتدر اکبر کی نظر میں سراسر خلل اندازی کے مترادف تھی۔ اکبر نے خود اس کی صراحت کی ہے: "می خواہند در فرمان رائی و کار گزاری شریکِ بادشاہی باشند۔" ("رودِ کوثر" ص۱۱۱)

۱؎ غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب   تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں   سودا

یکی از عقل می لافد یکی طامات می بافد   بیا کایں داوری ہا ہم پیشِ داور اندازیم   حافظ

اس کی سزا انھیں یہ ملی کہ عنانِ کار ان سے چھین کر اس نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور یوں بقول شبلی، ان کے جاہلانہ تعصب کا زور توڑ دیا؛[۱]
اکبر کی حکمت عملی کا ایک بنیادی رکن صلح کل کا مسلک تھا جو ہندوانی، زرتشتی، مسیحی، لادینی، غرض ہر ممکن عقیدے کے لئے کھلا ہوا تھا۔[۲] فیضی نے اس کشادہ مشربی کی اس خوبی سے وضاحت کی ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے اکبر بول رہا ہے؛

شائستۂ فروغِ محبت نہ بر دلی است   کز صد ہزار کوہ سرِ طور شد بلند
ہر کس ز تنگ نامی عدم وادی گرفت   فیضی بہ شاہراہِ محبت قدم نہاد
ازاں جا کہ با کفر و دیں صلح دارد   بہ پیشش چہ کافر، چہ مغ، چہ مسلماں

کفر و دیں در نظرِ مردمِ آزادگی است
پیشِ ما کعبہ ہماں باشد و بت خانہ ہماں

کعبہ و بت کدہ یک رنگ حریفاں و دیں   خود مسلمانی و خود برہمنی ساختہ اند
تسبیحِ زاہد را بہ کف، زنارِ کافر را بہ بر   سر رشتہ می باشد ہم در مسجد و بت خانہ ہم
با خلقِ جہاں بر سرِ صلح و مدارا   سر بازیِ میدانِ وغا را نہ شناسیم
فیضی پیِ ہند و صنماں رو کہ ز صد شد   یغماگریِ ترک نژادانِ فراکوز

فیضی نے اکبر کے ہندی رجحان کی عکاسی بھی کی ہے، اور اس کے بارے میں اپنا معکوس ردِعمل بھی واضح کیا ہے؛

تا خطبۂ جلالِ الٰہی کند بلند   بہرِ خطیبِ عقل سرم کردہ منبری
ہندو بتانِ عالمِ دل را بہ من رسید   آدابِ بت پرستی و آئینِ بت گری
فیضی و بت کدہ ہندِ دل آراستہ   از نگارانِ ختای و بتانِ ختنی
زیبندہ باد صندلِ بت بر جبینِ ما   کز سر غبارِ سجدۂ محراب شستہ ایم!
خاکِ حرم بہ ناصیۂ ما عستم ولی   دار و نشانِ صندلِ بت جسم کافرم
من آن برہمنِ بت قبلہ ام کہ می مالم   بہ جای صندل تر خونِ دل بہ پیشانی
بہ صندل تا بدن آلودہ کردی   گلِ خورشید را اندودہ کردی
عبیہ بگیختی از جیب و داماں   نمک از بہرِ چشم سودہ کردی
از چشمِ تو شہرِ بت پرستاں   ز زلفِ تو سوادِ کافرستاں

---

[۱] عرفی کو بھی عالمانِ شہر آشوب سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کے نزدیک ان کے ہنگاموں کے ذمہ دار کم حوصلہ لوگ خود ہیں؛

خروش ولولۂ عالمانِ شہر آشوب   گناہِ حوصلۂ تنگ ظرف بی نہ ماست

[۲] اکبر شاہ صفوی کو ایک خط میں لکھتا ہے؛

"نوعِ انسانی کے مختلف فرقے دولتِ خداداد اور ودیعتِ الٰہی ہیں۔ ان کے ساتھ محبت کا سلوک لازم ہے۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ رحمتِ خداوندی ہر مذہب کے شامل حال ہے، اور دل و جان سے کوشش کرنی چاہیئے کہ صلح کل کے سدا بہار باغ کا لطف اٹھائیں۔ خدائے لایزال اپنی نعمتیں بلاتفریق سب انسانوں کو بخشتا ہے۔ بادشاہوں کو جو ظلِ الٰہی ہیں، یہ اصول ترک نہ کرنا چاہیئے"

ابوالفضل آئینِ اکبری میں رقم طراز ہے؛
"بادشاہ کو مذہبی اختلافات سے بالاتر ہونا چاہیئے اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ ان فرائض کی راہ میں حائل نہ ہوں جو اس پر ہر طبقے اور ہر جماعت کی طرف سے عاید ہوتے ہیں۔ ان کے سایۂ عاطفت میں سب کو آرام ملنا چاہیئے تاکہ ظلِ الٰہی کا فیض عام ہو جائے۔ اسے اپنی کل رعایا کے ساتھ روز افزوں محبت ہونی چاہیئے۔" (بحوالہ ڈاکٹر سید عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ (علی گڑھ، ۱۹۵۵)

مسلماناں، دل و دینم بہ دنبال بتاں گم شد — مگر لطف خدا آرد بہ رہ، گم کردہ راہاں را
مراد ریش آں بت سجدہ کردن کی روا باشد — کہ از ایماں گرہ در رشتۂ زنار می بینم

یہ گرہ شادی کی ہے، جس کے ذریعے اکبر غیر مسلموں سے اپنے سیاسی رشتے ناتے جوڑتا رہتا تھا۔

غم و غصہ کی انتہا اس شعر پر ہوتی ہے:

در عشق بتاں چوں برود جان ز تن ما — از رشتۂ زنار بدوزید کفن ما!

فیضی نے اکبر کو 'صلح کل' یا 'مسلکِ محبت' کی حکمت عملی کے مخدوش پہلوؤں سے بار بار آگاہ کیا ہے۔ اس تنبیہ کا مرکزی نکتہ پہلے شعر میں بیان ہوا ہے:

گرمی کنی بنای محبت[1]، غیور باش — کین خانہ را مدار بہ دیوارِ غیرت است
گرچہ ہندو پسران عشوہ فروش اند ہمہ — حلقہ گوش ترا حلقہ بہ گوش اند ہمہ
گر تو ایں گونہ بمالی بہ جبیں صندل سرخ — گل رخاں روی خود از شرم بہ پوشند ہمہ
بر زمیں چوں نہ زنم سر کہ پی سرگوشی — با تو ایں بوالہوساں دوش بہ دوش اند ہمہ
ای دل سادہ، طلب کارِ گروہی شدہ ای — کہ اگر خون تو یابند، بنوشند ہمہ

از طرہ ہر زمان بتِ من تار بگسلد — ہندو نہ دیدہ ایم کہ زنار بگسلد
فیضی، بہ عہدِ سلسلہ مویاں مبند دل — کیں رشتہ ایست کہ بسیار بگسلد

ہندوؤں کی اطاعت کی قیمت برہمن کیشی:

نکشد سجدۂ بت برہمناں را بہ خدای — تا بہ زلفت نہ رسد سلسلۂ برہمنی

آخر میں ہندو اور صلیبی، ترات دونوں سے پرہیز کی تاکید کی ہے:

ز عشق ہندو نژاداں دل ترا چہ کشاد؟ — کلیدِ کعبہ بجوی، نی صلیبِ رہبانی

مسیحا مشربی:

اسی قسم کے جذبات، اسی سے ملتے جلتے لب و لہجے میں فیضی نے صلیبی اثرات کے بارے میں ظاہر کیے ہیں —— جو پرتگیزی جیزوات پادری پھیلانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے جنھوں نے پے بہ پے تین بار اکبر کی رضا و رغبت سے اس پر نکری دعا وا بولا:

حریفِ آں مسیحا مشربم کز ساغرِ عشرت — بہ ترسا زادہ ای نوشد شرابِ پرتگالی را
صلیبِ در کفِ محرابیاں کعبہ نہاد — ببیں دلیریِ آں ابروی چلیپا را!

عشقِ ترسا ہیں کہ دلقِ شیخِ صنعاں پارہ کرد
از مسیحا مشربی دلقِ بقا خواہم گرفت

چو عشق مغ بچہ است از ازل نصیب مرا — کلیدِ کعبہ نہ باشد کم از صلیب مرا
ایں چنیں کاں بتِ ترسا رہِ دینم زدہ است — نہ تواں یافت دریں دہر چو من رسوائی

طالب آملی نے بھی اکبر کے صلیبی رجحان کا ذکر کیا ہے:

---

[1] عرفی کے بھی مسلک محبت پر ایک شرط عاید کی ہے:

ما برہمن حدیثِ محبت رواست، لیک — در دام طائرِ حرم ایں دانہ خوشتر است

دلم بہ جانبِ رہبان، سرم بہ پای صلیب — چہ شد کہ گوشۂ چشمم بہ سوی محراب است!

نظیری کا ایک شعر، اکبر کے مذہبی نماوٗ کے بعد مسیحی عقاید کے زیر اثر آنے پر تعریض ہے:

بعد از ہزار سعیِ ثواب و مجاہدت — زنارِ راہب و رت ترسا بہ ما رسد،

اکبر پادریوں سے جو بحث و مباحثے کرتا کراتا رہتا تھا، اس پر عرفی نے تعریضاً کہا ہے:

بحث در رد و قبولِ بت ترسا بچہ است — ورنہ از کفر زبونی نہ بود ایماں را!

ان اعتراضات کا جواب ابوالفضل نے اکبر نامہ میں دیا ہے:

"بادشاہ: دانا دل وسعت مشرب، عام شیوۂ کرم و شفقت اور وسیع سلطنت کی بنا پر گروہا گروہ انسانوں کو دوست بناتا تھا اور ہر دین و مذہب کے اہلِ تحقیق سے مطالب دینی اور مقاصد حقیقی کے متعلق گفتگو ہوتی تھی؛ لیکن بعضوں سے بے دانشی اور عدم تحقیق کی بنا پر مناسب جواب نہ ملتا تھا. بالخصوص اس دوران میں فیلسوفان نصاریٰ کی طرف سے متفقہا پر گرفت و گیری ہوتی اور بحث و مباحثہ برپا ہوا جن لوگوں نے جھوٹی علمیت کے بڑے بڑے دعوے باندھ رکھے تھے، ان سے ان علمی اور عقلی بحثوں میں تو کچھ بن نہ آئی لیکن انھوں نے خفیہ خفیہ کہنا شروع کیا کہ ہمیں دین کا غم کھا رہا ہے، اور بادشاہ نے جانبداری سے ہمارے جوابات کو قبول نہ کیا. ان لوگوں نے بے انصافی سے بادشاہ پر تہمتیں لگائیں". (منقول از کرام: رود کوثر، ۱۰

فیضی کی طرح عرفی اور نظیری نے بھی اکبر کے "رموزِ خیال" کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے:

از آں دہاں و زباں می کند سخن فیضی — بیا کہ با تو رموزِ خیال او گویم

آناں کہ دل بہ پردہ سرای تو بستہ اند — در پردۂ خیال نوای تو بستہ اند

ان خیالات کے بارے میں رد و قبول کی وہی ملی جلی صورت ان کے کلام میں بھی ملتی ہے جو فیضی کے کلام میں پائی گئی۔

کشادہ مشربی کی تلقین:

بس کہ در کامم اثر کردہ است ذوقِ اتفاق — باورم ناید کہ زاہد با برہمن دشمن است

دل بہ صد رہ می رود، مراد دل یکی است — راہ اگر دیا نہ باشد، باش اگر منزل یکی است

نسبتِ سبحہ و زنار دو صد رنگ آمیخت — ورنہ ایں رشتہ ہماں است کہ آدم می رشت

کفر و دین و کعبہ و دیر از ازل بود و نہ بود — یک صلح و جنگی بر سرِ تسبیح و زناری نہ بود

عارف ہم از اسلام خراب ست و ہم از کفر — پروانہ چراغِ حرم و دیر نہ داند

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بت خانہ خوشتر است — ہر جا کہ ہست جلوۂ جانانہ خوشتر است

زنار دوستی پر تعریض:

زنار را نیابتِ تسبیح می دہم — ای اہلِ شرع، مژدہ کہ اسلام تازہ شد[۵۱]

مو بہ مویم رشتۂ زنار شد و زنا کسی — در خراباتِ مغاں بدنام اسلامم ہنوز[۵۲]

ای برہمن، چہ زنی طعنہ کہ در معبدِ ما — سجدہ ای نیست کہ آں غیرتِ زنارِ تو نیست؟

---

۵۱ جو مژدہ، عرفی نے تعریضاً اہلِ شرع کو سنایا ہے وہی ہماری آملی نے غیر مشتبہ انداز میں برہمن کو اکبر کے کیش مغاں پر دیا ہے:

برہمن مژدہ کہ با کیش مغانم کار است — تارِ تسبیحِ من از رشتۂ زنار است
خود مقیمِ حرم کعبۂ اسلامم، لیک — ہوسِ ام ہر آتش کدہ کفار است

۵۲ چند گویندم، ببرد زنار بند، ایں بت پرست؛ — در تن حسرت و کدامیں رگ کہ آں زنار نیست؟

رفتم بہ بت شکستن، وہنگامِ بازگشت | با برہمن گذاشتم از ننگ، دینِ خویش را
بہ شیخ صومعہ جستم نشانِ عرفی، گفت | بہ آستانِ برہمن بہ چہرہ سائی رفت

عرفی نے اکبر کے ہندو رجحان میں اس کی راجپوت رانی کے درپردہ اثر کی طرف اشارہ کیا ہے:

بشکنم ناقوس و تسبیحی بہ دست آرم، ولی | چوں کنم، با آں کہ زنّار از میاں می دزدیم؟ — عرفی

نظیری بھی عرفی کی طرح، اس مسلک کا محرک جودھا بائی کو ٹھہراتا ہے

ہمہ سرمایۂ اقرار و ایماں بربود رخسارت | فغاں از نمالِ ہند دیت، کہ کافر کرد غازی را

اکبر کے دینِ عشق سے موافقت:

عالم از عشق در وجود آمد | عشق معمارِ ہست و بود آمد
عشق ہم راہ خویش می آرد | سازگاری و دل پذیرائی
خورش عنبری بہم آمیختہ عشق | خوی بہ خو، بوی بہ بو اتفاق داشت
مسلماں عاشق رخسار، وہندو والہ زلفش | موحد بین کہ باہم مصحف و زنّار می آرد
بگو منصور از زنداں انا الحق گو بروں آید | کہ دینِ عشق ظاہر گشت، باطل گشت مذہب ہا
نظیری پرکشا تا دیدۂ دل در کشا بندت | کہ از تنگی عالم تنگ می گردند مشرب ہا
چند از موذن بشنوم توحید شرک آمیز را | کو عشق، تا یکسو نہم شرعِ خلاف انگیز را

اس مشرب پر نظیری کے ایک شعر میں تعریض کا پہلو بھی نکلتا ہے:

حریفاں نشۂ مہر و محبت را نمی دانند | بہ دست دشمنِ خود می دہم پیمانۂ خود را

ونظر:

ایقان و تشکیک، عقل و نقل کے مسائل تو ہر زمانے میں دعوتِ فکر و نظر دیتے رہے ہیں مگر اکبر کے عہد میں ان مسائل نے بڑی شدت اختیار کر لی تھی۔ فیضی نے انھیں کس زاویے سے دیکھا، اور کس پیرایے میں بیان کیا، اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو جاتا ہے:

بہ عقل و نقل ازاں چہ شدند مدرک من | بہ تحقیق و تقلید گشتم ورق خوان
فروغ ہدایت جدا ساخت یک یک | تصاویر حق از تماثیل بطلان
چہ دیدند باریک بینیانِ بابل | چہ خواندند روشن دروناں یونان
فرو رفتم اندر حواس و طبایع | شدم واقف از ربطِ ارواح و ابدان
شدم فتنہ بر اختلافِ مذاہب | فرو رفتم اندر تصانیفِ ادیان
ازیں علم کسی نہ شد سیر چشم | لبِ فیضی و ہمی نظر ماند جو عان
گہی، چو عقل فرو رفتہ کز چہ دریا بم | رموزِ مکتبِ دانا دلانِ یونانی[۱]
گہی، چو وہم سراسیمہ کز کدام دلیل | برم ظنون و شکوک علومِ ایقانی
چرا بود متخالف رسومِ اسلامی! | چرا بود متشابہ حروفِ فرقانی؟
نہاں کشیدہ بہ دار القضای عجب ریا | شہود کذب نہ دعوی گرانِ ایمانی

---

[۱] اگرچہ ہند نژادم .... مرا ز دانشِ یونانیاں دلی است خبیر

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں این است — ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی!
بر ما کشیدہ تیر ملامت گرانِ دہر — کز راستی، چو تیر، بہ ہر کیش رفتہ ایم

حریفِ خلوتِ من عقل ذوفنونِ من است

اگر ز چہرۂ ای علمم نقاب بردارند — یقین منتہیان اولین ظنونِ من ست
عجب کہ حوصلۂ روزگار برتابد — اگر بروں فگنم آن چہ در درونِ من است
سوختم از دمِ این دود نہادن فیضی! — بہ چراغی بہ رساں روغنِ اندیشۂ ما

معاشرتی شعور:

فیضی کا معاشرتی، معاشی ادراک اس کی بعض اضافتوں میں صاف جھلکتا ہے:

اندوہِ غریبی؛ مفلسانِ عشق؛ دردنوشانِ محبت؛ خانہ خرابان؛ برہنہ پایان؛ گداختہ جانان؛ دل سوختگاں؛ بی دردانِ عالم؛ محتشمانِ خود پرست؛ بلندیِ افتادگانِ خاک نشیں؛ تعظیمِ حالِ درد کشاں؛ تعدیلِ خلق؛ رد و قبولِ خلق؛ غوغای خلق؛ ہنگامۂ مصافِ خلق۔

یہ شعور، یہ آتشِ عشق، نازک دلوں کو بھی، جن کے زمرے میں خود فیضی بھی آتا ہے، بعض اوقات اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے:

عشق در نازک دلاں آتش زند یکبارگی — مرغِ شکر خوار را آمد بہ آتش خوارگی
تاہم آوازہ شد بہ سوختگاں — چنگِ ما نالۂ حزیں گرم ست

اس کی دوسری تاثیر فیضی نے یہ بیان کی ہے کہ پھر ان کا اپنے زمانے کے آسودہ حالوں سے علاقہ نہیں رہتا:

نیست با آسودگانِ دہر ما را نسبتی — خضر و آبِ زندگی، آن بود در خورِ ما
سلطاں پرست، رو، کہ نہ آرند در نظر — خواری کشانِ بے سر و پا تاج و تخت را
سلطاں پرست خیز، کہ در صیدگاہِ ما — بسمل کنند از پرِ ہمت ہمای را
فسانۂ جم و جامش مگو، کزیں دستاں — بسی بہ گوش در آمد، بسی ز گوش برفت

اب دیکھیے کہ اس شعور سے زندگی کی کیا کیا حقیقتیں کھلتی ہیں:

عوام را نہ بود رہ بہ پیش گاہِ خواص
عجب دردی ست بی دردی کہ نتواں یافت درمانش
بر خلق درِ خلق و مدارانہ کشودیم
ما را چہ التفات بہ رد و قبولِ خلق؟

دردمندانیم، با دردِ محبت کردہ خوی — نیست بی دردانِ عالم را خبر از دردِ ما
نازپروردہ، ز گرم و سردِ عالم بی خبر — نیستی آگہ ز اشکِ گرم و آہِ سردِ ما
ز کارِ غمزۂ زناں ہیچ کس نہ می پرسد — چہ دیدہ ہا کہ دریدند سینہ ہا خستند
در خاک و خوں فتادنِ فرہاد را چہ قدر — جای کہ قصۂ شکر و شیر می رود؟
اقلیمِ بتاں نادرہ ملکی ست، کہ باشد — آبادیِ ملک ز ویرانیِ دل!
بہ ملکِ عشق غم و درد را نہایت نیست — ز اغنی کہ تو خواہی، دریں ولایت نیست
کسی چوں نالہ از بیدادِ ایں ترکانِ عاشق کش — کہ می بندند از دہشت زبانِ دادخواہانِ ما

ان دلدوز حقایق کے مشاہدے کے بعد فیضی اربابِ ثروت و اقتدار کو یہی مشورہ دیتا ہے:

ہیچ کس را منگر خوار بہ ہنگامہ دہر
دستِ سطوت ز گریبانِ خلایق بگزار

منکرِ خاک نشیناں مشو، ای نکتہ شناس   کس چہ داند کہ بہ ہر ذرہ چہا بخشیدند
ہر کجا سوختہ ای دردِ دلی پیدا کرد   دردِ بر خود بگرفتند و دوا بخشیدند

اگر حقدار کو اس کا حق نہ پہنچا تو فیضی یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا:

زود ہست کہ در ملک دلم شور و شری ہست

ہر صاعقۂ فتنہ کہ از ابرِ بلا ریخت   دیدیم کہ بر خانۂ معمور فرو ریخت
از مزرعۂ سپہر چہ حاصل، چو ہر شبی   آتش زند بہ خرمن مہ برقِ آہِ ما

فیضی خوب سمجھتا ہے کہ جب دامن تار تار ہو جائے تو رفوگری سے کام نہیں چلتا۔ دلِ دو نیم کو جوڑنے کا کوئی نیا طریقہ ہی وضع کرنا پڑے گا۔

بہ کہ گدازم و ز نو طرحِ دلِ دگر نہم   چند رفوگری کند صبر دلِ دو نیم را

مقاومت کی کوئی صورت اسے نظر نہیں آتی: کوہ کَن نیست کہ بنیاد کَنِ پرویز است
مگر اس کی تڑپ اس کے دل میں پیچ و تاب کھا رہی ہے:

کو یکی برقِ عدالت کہ دریں تازہ بہار   نخلِ بیداد ز اندازہ بروں می بالد؟
بگسلد تکمۂ خورشید و بہ افتد بر خاک   ہمت است گر بہ فلک دست و گریباں گردد

اسی شعور کی بدولت وہ مست ہے و ترانہ خونخواری کو مظلوم و مقہور لوگوں کی دردناک حالت، اور اس ضمن میں ان پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، ان کی طرف بار بار متوجہ کرتا اور اُن کے دکھ درد کا مداوا نہ کرنے کے عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔

کدام ساقی بدمست گرمِ خوں ریزی است   کہ بوی می بہ دماغم ز بوی خوں کم نیست؟
مرا ناگہ گذر افتاد در بزمِ قدح نوشی   کہ دارد بوی خوں می پرستاں بادہ نابش
مست می و ترانہ چہ گردی کہ بیدلاں   در خوں نشستہ، نالۂ جاں کاہ می زنند
خون است بر لب، و خون نابہ جگر   زیں ساقیانِ بزم نشیں دردِ صافِ ما
بہ اندیش چوں بزمِ عشرت بسازی   کہ آلودۂ خوں نوای بر آید
سـ قیا، دریاب مخمورانِ درد آشام را   جام زریں کن ز تابِ می سفال جام را!

دراگر یہ نہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟

جگر آشامیِ ما تلخ کامان جوش خواہد زد

فیضی کے اور نظیری اور عرفی کے معاشرتی اور سیاسی جذبات میں ایک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے:

مقربانِ تو از چشمِ خلق پنہاں اند   عوام را نہ بود راہ در مقامِ خواص
ستانِ گنج بر دلِ مسکیں نہادہ اند   ورنہ خراج بر دہِ ویران نہ بودہ شرط   فیضی

اخراجِ مغل خواہم و تاراجِ قزلباش

نیم بمل شد: ماندیم، نظیری، افسوس   صید در یک دگر افتادہ، و صیاد یکی است   نظیری

تا دل تحت الثری از کشتگان عشق سوخت — یک وردی از شہادت ہای انسان برنخاست
سیرابی و لب تشنگی از ہم دشنا سیم — این است کہ آسایش ما عینِ عذاب است
معمور باد سینۂ عرفی کہ در دو غم — تعمیر این زمین بلاخیز می کند
آسمان، مناز بہ بیدادِ خود، کہ دوش — آہی برای مردم عالم کشیدہ ایم
عرفی

اب ہم کچھ ایسے شعر پیش کرتے ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ فیضی شاعر میں کیا صفات چاہتا تھا، اس کا وظیفہ کیا قرار دیتا تھا اور خود اس کی نظر میں اپنا شعری مزاج کیا تھا:

مطربی خوش لہجہ خواہم گرچہ در دورِ چمن — در کفِ رنداں صراحی را دوم اندر نای شد
مطربی خواہم، کہ سازش راہِ صد محفل زند — زخمہ ای برجاں رساند، ناخنی بر دل زند
مستانِ دل، کہ طنطنۂ آہ می زنند — بر قلبِ خفتگانِ سحرگاہ می زنند
دانا دل و رموز شناس و سخن گزیں — معنی نگار و نکتہ طراز و دقیقہ داں
من آں سکندرِ وقتم کہ جم گدای من است — سفال می کدہ جام جہاں نمای من است
فیضی زندگی مردہ دلاں می خواہی — بایدت گرم تر از صبح قیامت نفسی
فیضی نفسِ گرم تر انگیز، کہ خام اند — آں طایفہ کز شعلۂ ادراک نہ سوزند
چند طلب می کنی نشان قیامت — از دمِ خود غافلی کہ نفخۂ صور است
باز صورِ نفسم را شدہ آوازہ بلند — کہ بہ صحرای دلم جنبشِ استاخیز است
فیضی ز خطِ نورِ معانی بدرخشید — یا صاعقہ ای در شبِ دیجور فرو ریخت
بادہ ای آوردہ فیضی در خمِ معنی بہ جوش — دُرد نوشاں را صلا در دہ، کہ سرجوشم کشند
شب، کہ فیضی سخن از سوزِ دلِ خود می گفت — دلِ صاحب نظراں گرمیِ معنی می سوخت

فیضی نے اپنا آہنگ اسی گرمیِ معنی کی رعایت سے وضع کیا ہے۔ جہاں اس کے خیالات و جذبات میں جوش و حرارت ہے، وہاں ان کے اظہار میں بھی صاعقے کی سی کیفیت ہے:

شہزادہ سلیم، عرفی اور فیضی:— ایک نوٹ

شبلی نے کہ حسنِ ذوق اور ذوقِ حسن دونوں سے بہرہ یاب تھے، شہزادہ سلیم سے عرفی کی ملاقات کا حال بڑے مزے لے لے کر ایک بار نہیں، چند صفحوں کے اندر شعر العجم ۳ میں دو بار لکھا ہے:

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق ہو کر (ہندوستان) آیا (۸۳)، خود عرفی کے متعلق مولانا نے یہ مزید اطلاع بہم پہنچائی ہے کہ 'وہ شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظر رہ چکا تھا' (۱۱۷)۔ 'تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادہ مذکور کا جاں دادہ تھا۔ (اس) کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور جوش ہے جس کا رنگ مداحی کے لباس میں جھلک رہا ہے۔ عرفی جس شان سے دربار میں پہنچا، اور شہزادے نے جس طرح اس سے نگاہِ پنہاں کی زبان میں باتیں کی ہیں، اس کی تصویر عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے:

رموزِ کورنش و تسلیم را ادا کردم — بہ دابِ مردمِ دانا و بذلہ سنج ندیم
نہ گفت او، من بشنودم، ہر آں چہ گفتن داشت — کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم

لبش جو نوبتِ خویش از نگاہ باز گرفت　　　　فتاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم

اخیر کے دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے: شہزادے نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں اس کی نگاہ نے زبان پر پیش دستی کی۔ پھر جب نگاہ سے گزر کر ہونٹوں کی باری آئی تو میرے کان کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب گئے ..... عرفی نے سعدی کے ایک قطعہ پر ایک قطعہ لکھا ہے۔ اس میں شاہزادہ سلیم کی معشوقی کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے:

زحشِ اللہ زہے اندیشیِ عرفی کو را　　　　آں کہ ممدوح بود عشق بہ او بازدہ[1]

جہانگیر نے شہزادگی کے زمانے میں عرفی کا شہرہ سُن کر دربار میں بلایا۔ چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا، ہمہ تن شوق، ور بیتابی کے عالم میں گیا جہانگیر نے نگاہِ لطف سے دیکھا اور اشاروں سے باتیں کیں پھر مسکرا کر قصیدے کی فرمائش کی۔ اس دلچسپ داستان کو قصیدۂ مدحیہ میں ادا کرتا ہے:

رسیدنِ من و اقبال آں ہمایوں فال　　　　چناں فتاد مطابق دراں خجستہ حریم

کہ گر ادب نہ کشیدی عنانِ من قدمش　　　　بہ بوسہ گاہ ہمی کرد بر لبم تقدیم

یعنی، میرا وہاں پہنچ کر زمین بوسی کے لئے گرنا شہزادے کا سامنے آنا اس قدر مطابق پڑا کہ اگر میں ادب سے رک نہ جاتا تو بجائے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے، اس کے قدم میرے لب چوم لیتے (۹، ۱۰، ۱۱)۔ اس کے بعد مولانا نے ان تین شعروں کی تشریح دوبارہ کی ہے جو پہلے کہہ چکے ہیں۔

عرفی نے اکبر کو 'کاروانِ سالارِ شاہاں' کہا ہے اور سلیم کو اس قافلے کا یوسف:

کاروان سالار شاہان آفتابِ مدِ ولی　　　　چوں تو ناید یوسفی در کاروانِ آفتاب

اس کی غزلوں میں سلیم سے پہلی ملاقات کی اس جھلک کے علاوہ جو شبلی نے اس کے ایک قصیدے میں دیکھی۔ اور بھی کیفیتیں ملتی ہیں، مثلاً سلیم کے لیے اس کا دل و جان سے سراپا چشم و گوش ہوتا:

جان و دل بود ندہر کہ بالقایش در سخن　　　　ایں تمامی چشم گردید آں سراپا گوش شد

جلوہ مانعِ نظارہ ام شوی کہ مرا　　　　زشوقِ روی تو سر تا قدم نگہ خیز است

عرفی خوب جانتا تھا کہ وہ جس 'مطلب' کا طالب ہے اس کا بر لا ہونا ممکن نہیں، پھر بھی اپنی طبع محال طلب سے مجبور ہو کر رومی کی زبان میں کہتا ہے:

آنم کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

با آں کہ ہیچ مطلب ممکن روانہ شد　　　　دل خوش نہ می کنیم مگر از محال ہا

'خیالاتِ محال' کا اتار چڑھاؤ ایک اور شعر میں بڑے ڈوبے ہوئے پرسوز لہجے میں ادا ہوا ہے:

آہ ازاں حرماں کہ دل ما از خیالات محال　　　　گاہ می دادم تسلی گاہ خوں می ساختم!

احساسِ حرماں کی تلافی:

بہ دوست نہ می دہد وصالت　　　　دستِ من و دامنِ خیالت

(یہ شعر عرفی کے ایک ترکیب بند سے لیا گیا ہے)

محرومی کا سوز و ساز:

در خونِ جگر عرفی غلطد و می سوزد　　　　در آتشِ خود رقصد، پروانہ چنیں باید!

با ایں ہمہ نامرادی، سلیم ساری عمر اس کے دل میں بسا رہا اور آنکھوں میں پھرتا رہا:

دارم وظیفہ از جگرِ لختِ لختِ خویش

---

[1] نظوری کا بھی، غالب کے بقول، ممدوح و معشوق ایک ہے۔

بہار رفت و خزاں آمد و گذشت جوانی   مرا ہنوز بہ آں گل ہزار دل نگرانی

عرفی غالب کی طرح، ہر اعتبار سے عجمی نہاد تھا۔ اس کی مغرورہ خودی بھی ایک لحاظ سے اس کی خود بینی اور خود نمائی ہی کی ایک شکل تھی۔ یہی نرگسیت اُسے دلِ خوباں میں اُتر کر ملی اور اسی کی ایک صورت سلیم میں نظر آئی:

گشتیم اندر دلِ خوباں، ہمہ خوبانِ خود اند   ہم در شکنِ زلفِ پریشانِ خود اند[1]

حسن اش نیاز مندِ تماشا ز ناز نیست   ما از ذوقِ جلوۂ خود بی نیاز نیست

عرفی کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ فیضی اس سے جلتا تھا اور دونوں میں ہمیشہ نوک جھونک رہتی تھی، چنانچہ اس قسم کے قصے خافی خاں اور بدایونی نے بھی نقل کئے ہیں۔ (شعر العجم ۳، ۵۲)

اس 'نوک جھونک' کی تصدیق فیضی کے اس شعر سے ہوتی ہے:

زبانِ طعن فرو بر، کہ ما نہ آں مستیم   کہ پای مغبچہ بوسیم و دستِ ادگیرم

اس میں عرفی کی بے محابا دلدادگی پر چوٹ کی گئی ہے۔ اس کے برعکس فیضی نے کچھ ایسے شعر بھی کہے ہیں جن کے متغزلانہ آہنگ سے جذب و شوق کی وہی سرشار کیفیت پڑی ٹپکتی ہے جس کا اظہار عرفی نے سلیم کے مدحیہ قصیدے میں کیا ہے:

دیدہ بدمتِ نظر، شوق ہم آغوشِ ہوس   دل ہمی خواست، ولی حوصلہ ای تاب نہ داشت

دل، جگر سوز دا زاں بادہ کہ بر لب داری   جامِ جمشید بدیں گونہ می ناب نہ داشت

بس کہ چشمِ شوخِ او مست و نگہ ہشیار بود   فتنہ در خوابِ گراں، و آرزو بیدار بود

بس کہ گلچیں شوق می رفت و گل فشاں می رسید   از نگاہم تا بہ رخسارش ہمہ گلزار بود

شوق با شوق و تمنا با تمنا راز گوی   گر ادب خاموش می شد عشق در گفتار بود

با دلِ بی صبر می دیدم بہ سویش دیر دیر   کز تکاپوی ہوس پای نظر افگار بود

ماند بی اندازہ حرفِ آرزو در دل گرہ   لب بہ شغلِ بوسہ سرگرم، و زباں بیکار بود

ان اشعار سے فیضی کی ایک غرض تو یہ جتانا ہے کہ وہ عرفی کے جذبات سے باخبر ہے، اور انھیں لطف و خوبی سے ادا کرنے پر قادر ہے۔ گمان گزرتا ہے کہ اس کی دوسری غرض عرفی کی دکھتی رگ کو چھیڑنا ہے۔ اپنی اس والہانہ پیش دستی[2] کی سزا میں۔

مدہ عنانِ تعلق بہ حسنِ ہر ذرہ   بہ آرزوستی و بر دوش آفتاب انداز

بارگاہ محبوب اس پر مسدود کر دی گئی تھی اور وہ اکبر اور سلیم دونوں کے زیرِ عتاب آ گیا تھا۔ اس ماجرے پر فیضی نے چبھتی ہوئی نظر ڈالی ہے:

سوی ات از بی اختیاری گر نگاہی کردہ ام   آں چناں رنجیدہ ای گویا گناہی کردہ ام!

جانِ من، خوش نیست ایں مقدار رنجیدن ترا   گر من بی صبر و دل پیش تو آہی کردہ ام

خود عرفی نے بھی اپنے خصوصی تقرب سے محروم کیے جانے کا ذکر کیا ہے:

از تماشای درونِ بزم دارم بی نصیب   رخصتِ نظارہ گاہے از برونم دادہ اند

---

[1] میر صاحب بھی اس نفسی نکتے تک پہنچے ہیں:

عشق معشوق عشق عاشق ہے   یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق

[2] اس ضمن میں عرفی کا ایک معنی خیز شعر ہے:

قبای نازہ چو پوشی ز من جدا، یاد آر   کہ می کشود کسی بندِ ایں قبا گستا

غالب کی شاعری کا سماجی پس منظر

ڈاکٹر آفتاب احمد

حالی نے 'یادگارِ غالب' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اگرچہ غالب کی زندگی میں کوئی بڑا کام اُن کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی کام نے ان کی زندگی کو مغلیہ ہندوستان کے دورِ آخر کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے 'یادگارِ غالب' اس مہتم بالشان واقعے کی تشریح اور اسے اہلِ نظر سے تسلیم کرانے کی سب سے پہلی اور اپنے زمانے کے تنقیدی شعور کی حدود میں سب سے کامیاب کوشش ہے۔ ظاہر ہے کہ حالی کے لیے غالب کی شاعری کی کوئی سیاسی تعبیر پیش کرنا بہت قبل از وقت ہوتا۔ البتہ غلام رسول مہر نے کہ جنہیں برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ اور سیاست سے بہت گہرا ربط و تعلق تھا، اپنی کتاب 'غالب' میں 'داستانِ غدر' کے بیان میں برملا اس رائے کا اظہار کیا کہ غالب کے اندوہ و ماتم کا سب سے بڑا کردناک باب سلطنت تیموریہ کے زوال کا خونچکاں واقعہ ہے۔ ان کے نزدیک غالب کے 'صریرِ خامہ' کی 'نوائے سروش' نوا نہ تھی بلکہ اس بربادی کا نوحہ اور اس تباہی کا مرثیہ تھی۔

اکرام نے 'غالب نامہ' میں 'غالب اور وطنیت' کی بحث کے دوران غالب کی واقعیت پسندی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مہر کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔ انہوں نے غالب کی شاعری اور انشا پردازی کی سیاسی تعبیر پیش کرنے کی بجائے غالب کو مغلیہ تہذیب و تمدن کا بہترین ترجمان قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں شاہجہاں کا تاج محل اور غالب کی شاعری فن کے دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں، لیکن دونوں کی تہہ میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ اکرام نے اعتراف کیا ہے کہ بظاہر تو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو مغلیہ آئین پر آئینِ فرنگ کو ترجیح دے وہ مغلیہ تہذیب و تمدن کی صحیح طور پر ترجمانی کر سکے لیکن حقیقتاً اس میں کوئی بوالعجبی نہیں۔ غالب دورِ بہادر شاہی کے مغل تمدن کے مداح نہ تھے۔ لیکن وہ بنیادی مغل روایات کے کامیاب ترجمان تھے۔ یعنی جو اصول اور روایات مغل کریکٹر، مغلیہ طرزِ حکومت، مغلیہ فنونِ لطیفہ کی امتیازی خصوصیات ہیں وہی غالب کی شاعری اور زندگی میں نمایاں ہیں اور شاید ان جذبات کا اس سے بڑھ کر ادبی اظہار اور کہیں نہیں ہوا۔

اس تمہید کے بعد اکرام نے غالب کی زندگی اور شاعری کی ان چیدہ چیدہ صفات کا جائزہ لیا ہے جو ان کے خیال میں مغلوں کی نسلی صفات کی عکاسی کرتی ہیں۔ صراحتاً انہوں نے "دع ما کدر خذ ما صفا" کے اصول، نفاست پسندی اور خوش معاشی، ہموار طبعی، رواداری، اولوالعزمی اور بلند نظری، غم کے مقابلے میں عالی حوصلگی وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اکرام نے بحث کی ابتدا تو مغلیہ تہذیب و تمدن کی ترجمانی کے ذکر سے کی جس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ اسی تہذیب و تمدن کے جملہ خارجی مظاہر سے غالب کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی کا رشتہ جوڑیں گے مگر بعد میں وہ اس بنیادی پہلو سے قطع نظر کر گئے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں غالب کی زندگی اور شاعری میں مغلوں کی مزعومہ نسلی صفات کا اثر و نفوذ ڈھونڈنے لگے۔

حمید احمد خاں کی متفرق تحریروں میں بھی غالب کے بارے میں کچھ اسی قسم کے اشارے ملتے ہیں، البتہ انہوں نے تہذیب و تمدن

کے خارجی مظاہر۔ ملا مغل قصوری اور غالب کے اشعار کی صنعت کاری میں مماثلت دکھائی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے بیان میں اکرام کے بیان کے برعکس، تعین اور وضاحت کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

مالک رام نے اپنی کتاب 'ذکرِ غالب' میں اس مضمون پر کوئی مستقل بحث نہیں کی۔ عموماً اکرام ہی کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔ ان کے نزدیک غالب کی فطرت اپنی قوم کے بیشتر خصائص کی حامل تھی۔ البتہ خصائص کی جو فہرست انہوں نے مرتب کی ہے یعنی دوستوں سے وفاپرستی، عیش و عشرت سے دلچسپی، مذہب سے اوپری عقیدت اور دراصل آزاد روی، دشمنی اور مخالفت میں ضد، انجام سے بے پروائی وغیرہ وہ اکرام کی فہرست سے مختلف ہے۔

شاعر کی قوم و نسل سے ہمارے نقادوں کی اس دلچسپی اور شغف کی ایک تاریخی وجہ ہے جس کی وضاحت غیر مناسب نہ ہوگی۔ مغلوں کے زمانے میں مسلمان معاشرے میں سید، شیخ، مغل، پٹھان کی تقسیم بہت عام تھی۔ اکثر شرفا، امرا کے خاندان چونکہ بیرونِ ملک یعنی اس زمانے کی ولایت سے آئے تھے، لہٰذا انہیں اندرونِ ملک اپنا اصلی تشخص برقرار رکھنے پر بہت اصرار تھا۔ ہمارے پرانے شاعر انہی چار قوموں میں کسی ایک سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ہمارے پرانے تذکرہ نگار، شعرا کے سلسلۂ نسب ان کے آباو اجداد کے وطنِ مالوف اور برصغیر میں ان کے وارد ہونے کی تاریخ وغیرہ کا ذکر بہت ضروری سمجھتے تھے۔ حالی، مہر، اکرام اور مالک رام نے اسی دستور کے مطابق غالب کے بارے میں یہ تفصیلات فراہم کی ہیں۔ مگر ہمارے پرانے تذکرہ نگاروں نے اس قسم کی تفصیلات کو کبھی کسی شاعر کا شاعرانہ مرتبہ اور قدر و قیمت متعین کرنے میں کسی استدلال کی بنیاد نہیں بنایا۔ حالی و مہر نے بھی غالب کے سلسلے میں یہ نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکرام اور پھر کسی حد تک مالک رام نے جس طرح غالب کی زندگی اور شاعری میں غالب کی نسلی خصوصیات کا کھوج لگایا ہے وہ اس لحاظ سے غیر معمولی ہے کہ اردو کے کسی شاعر کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خود ہمارے زمانے میں اقبال کی زندگی، شاعری اور فلسفے پر بے شمار تبصرے لکھے گئے ہیں مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اکرام سمیت کسی مبصر نے اقبال کی برہمن زادگی کو، کہ جس کا اقبال نے بارہا ذکر کیا ہے، موضوعِ گفتگو بنایا ہو۔

ادبی روایات کی بنا پر تو شعرا کی تخصیص ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔ جیسے انگریزی میں کلاسیکی اور رومانی یا ہمارے ہاں جذباتی فضا اور نفسیاتی رجحان کی رعایت سے میر و سودا کو 'آہ' اور 'واہ' یعنی غم انگیز اور نشاط آمیز شاعری کا نمائندہ کہا گیا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی تخصیص بھی ہر شاعر کے سلسلے میں ٹھیک نہیں بیٹھتی مگر اتنا تو ہے کہ اس سے ایک واضح تصور ذہن میں آتا ہے اور اس لحاظ سے اسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ شعرا کی نسلی تخصیص سے تو معاملہ اور الجھ جاتا ہے اور ادبی تنقید کا کوئی مقصد حل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ذاتی طور پر مجھے اس نظریے کی صحت اور صداقت میں بڑا شک ہے۔

یہ تو خیر ایک ضمنی بحث تھی۔ اس مضمون کا موضوع دراصل یہ ہے کہ غالب کی شاعری اور انشا پردازی کو مغلیہ ہندستان کے آخری دور کی تہذیب و تمدن سے جو گہرا تعلق تھا اس میں تو کلام نہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ کن معنوں اور کس حد تک اس تہذیب و تمدن کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے، یہاں پھر کچھ تاریخی حقائق کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ مغلوں کے عروج کے دوران یعنی اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کے عہد میں وسط ایشیا ایران و توران کے علاقوں سے ہر قسم کے افراد مسلسل برصغیر میں وارد ہوتے رہے۔ ان افراد کی ایک معتد بہ تعداد معاشرے کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور انہیں مغل بادشاہوں کی سرپرستی اور داد و دہش کی کشش گنگا اور جمنا کی وادیوں میں کھینچ لائی تھی۔ ان میں اہلِ حکومت بھی تھے اور اہلِ حکمت بھی۔

اہل تدبیر بھی اور اہل سیف بھی اہل علم و فضل بھی اور اہل قلم بھی۔ ان میں سے اکثر کو سرکار دربار تک رسائی حاصل تھی یا تو وہ براہ راست دربار سے وابستہ تھے یا وابستگان دربار سے متعلق۔ غرض یہ افراد مغلیہ سلطنت کے ستون تھے۔ ان کے معاشرتی آداب و انداز پُر وقار سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ایسا رعب اور دبدبہ تھا کہ جس کے سامنے اس سرزمین کے اپنے معاشرتی آداب و انداز بالکل ماند پڑ گئے تھے۔ فارسی ادب و شعر کا طوطی بولتا تھا۔ چونکہ فارسی سرکار و دربار ہی کی نہیں اس اونچے طبقے کی زبان بھی تھی اور یہی ملک کے محدود مگر با اثر ثقافتی طبقے کی زبان بھی تھی۔

غالب خود ترکان ایبک سے تھے اور اسی اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اگرچہ ان کا خاندان بہت بعد کی کھیپ میں یعنی اٹھارویں صدی کے پہلے نصف کے دوران سمرقند سے ہندوستان آیا تھا۔ غالب کو اپنی خاندانی وجاہت پر بہت ناز تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پیشۂ آبا سپہ گری کے مقابلے میں شاعری کو ذریعۂ عزت سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ شاعری بھی انہوں نے زیادہ تر اپنی آبائی زبان یعنی فارسی میں کی جو مغلوں کے زمانے میں اونچے طبقے کی ثقافتی زبان تھی۔ غالب کا وہ مجموعۂ اردو جسے ہم حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں، خود غالب کی نظر میں ایک کمتر درجے کی چیز تھا ؎

نیست نقصان یک دو جزو است از سواد ریختہ
کاں ورقم برگے ز نخلستان فرہنگ من است
فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است
فارسی بیں تا بہ بینی کاندر اقلیم خیال
مانی و ارژنگم و آں نسخۂ ارتنگ من است

واقعہ یہ ہے کہ غالب اپنے آپ کو اولاً فارسی شاعر سمجھتے تھے اور بقول حالی اردو میں شعر کہنا اپنی کسرِ شان جانتے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اب فارسی شعر و شاعری کے جاہ و جلال کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یہاں تک کہ فارسی سے ذوق رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی اور وہ محدود سے محدود تر ثقافتی اقلیت کے افراد بن کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ غالب کو کس حسرت سے کہنا پڑا ؎

ز وریدہ گریں حب بود زباں دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

غالب کے سربرآوردہ ہم عصروں میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ اسی قبیل کے بزرگ تھے۔ مولانا فضل حق سے تو غالب کی گہری دوستی تھی۔ ان کا معاملہ جدا ہے۔ آزردہ اور صہبائی فارسی کے نامور سخن سنج اور سخن فہم تھے، غالب کا ان سے ربط ضبط ہم عصر اردو شعرا کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ وہ انہی سے اپنے کلام کی داد خواہ ہوتے تھے۔ آزردہ، غالب کے کچھ بہت زیادہ قائل نہ تھے۔ چنانچہ حالی نے روایت کی کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ہاں ایک محفل میں غالب نے آزردہ کو خاص طور پر مخاطب کر کے ایسے دردناک انداز میں یہ شعر پڑھا کہ حاضرین میں سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی!
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

صہبائی نے غالب اور آزردہ کو ذیل کے مقطعے میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے ؎

چو دیدم غالب و آزردہ را از ہند صہبائی
بخاطر ہیچ یاد از خاکِ ایرانم نمی آید

مہر نے غالب کے فارسی مکاتیب کے حوالے سے چند مشاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں غالب شریک ہوئے اور جن میں اردو فارسی دونوں زبانوں کی غزلیں پڑھی گئیں۔ ہر مرتبہ غالب مشاعرہ میں آزردہ اور صہبائی کو ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ وہ اگر موجود ہیں تو غالب کی خاطر جمع ہے ورنہ کسی کل چین نہیں۔ پہلا مشاعرہ ــ " وہاں پہنچ کر مولانا صدرالدین آزردہ کی زیارت سے رنجِ راہ کی تلافی ہو گئی۔ صہبائی نے طرحی زمین میں غزل پڑھی دو تین شعر دل نشیں تھے۔" دوسرا مشاعرہ۔ "اردو کے بہت سے شاعر جمع تھے۔ اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں۔ مفتی صدرالدین آزردہ بیمار تھے۔ اس لئے شریکِ مشاعرہ نہ ہوئے۔" تیسرا مشاعرہ "اس میں نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سببِ علالت نہ آ سکے، حضرت آزردہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا وہ اگرچہ دیر سے گئے مگر آ گئے، میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اسے براتِ نامقبول کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور اردو کے شعرا کو دردِ سر نہ دوں لیکن حضرت آزردہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔" چوتھا مشاعرہ ــــ "اس میں 'میری خاک' ریختہ گویوں کی آنکھوں کا غبار نہ بنی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ جسے حضرت آزردہ کی خدمت میں بھیج دیا۔" پانچواں مشاعرہ ــــ وہ تھا کہ جس میں غالب ذوق سے ہم طرح ہوئے تھے۔ (ریاں کے لئے۔ زباں کے لئے) اسی کے حال میں لکھا ہے۔ "اپنی غزل دس شعر کی پڑھی۔ میرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر زمینِ طرحی میں سنائے۔ میں ایک بہانے سے اٹھا اور اپنے گھر چلا آیا۔۔۔۔ صبح قلعہ میں گیا۔۔۔۔ وہیں سنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب سے آخر میں سلطان الشعراء (ذوق) نے دو غیر طرحی غزلیں سنائی تھیں"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ریختہ گویوں اور اردو شاعروں کا ذکر غالب کس حقارت آمیز لہجے میں اور کس دل گرفتگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اصل میں ان کی طبیعت اس وقت آسودہ ہوتی ہے جب کہ محفل میں فارسی داں موجود ہوں۔

یوں تو غالب اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے مگر ادبی اور ثقافتی اعتبار سے وہ بہ نسبت اردو شعرا کی روایت کے، برصغیر کے فارسی شعراء کی روایت سے زیادہ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ وہ عرفی۔ نظیری۔ فیضی۔ طالب۔ ظہوری۔ بیدل وغیرہ سے جو ذہنی قربت اور یگانگت محسوس کرتے ہیں وہ میر و سودا سے نہیں۔ غالب نے انہی شعراء کی آواز سے اپنی آواز ملائی ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان شعرا کے لب و لہجہ میں مغلیہ عہد کے عروج کی خود اعتمادی، شان و شوکت، طنطنہ اور شکوہ پایا جاتا ہے۔ مگر غالب تو اسی گذرے ہوئے طوفان کا وہ آخری بادل تھے جو بدقسمتی سے دو ایک صدیوں کے بعد اسی وقت نمودار ہوا جبکہ زمین و آسمان اپنا رنگ بدل چکے تھے۔ دورِ حیات ایک نئی کروٹ لے چکا تھا۔ چنانچہ غالب کی قسمت میں اسی مغلیہ سلطنت کو صفحۂ ہستی سے مٹتے ہوئے دیکھنا بھی لکھا تھا۔ جس کے عروج کی ثقافت کی وہ اس کے زوال کے عہد میں پاسبانی کر رہے تھے۔

اس جان گداز احساس نے، اس آشوبِ آگہی نے غالبؔ کی زندگی اور شاعری میں ایک خاص قسم کی TENSION یا کشاکشِ غمِ نہاں، کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ غالبؔ کے شاگرد اور پہلے سوانح نگار حالیؔ کو اس طرفہ کیفیت کا شدید احساس تھا۔ انہوں نے صاف لکھا ہے کہ غالبؔ کی قدر جیسی کہ چاہیئے یا اکبرؔ کرتا یا جہانگیر و شاہجہاں۔ مطلب یہ ہے کہ غالب دراصل اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے لئے پیدا کئے گئے تھے مگر افسوس ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کے حوالے کر دیئے گئے۔ مگر پھر حالیؔ یہ کہہ کر آنسو پونچھ لیتے ہیں کہ اس عہد میں بھی چند ایسے اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے ہیں۔ علی الخصوص غالبؔ جن کی عظمت و شان اس سے بالاتر تھی کہ ان کو بارہویں یا تیرہویں صدی ہجری کے شاعروں یا انشا پردازوں پر شمار کیا جائے چنانچہ حالیؔ نے یادگارِ غالبؔ، میں اگرچہ غالبؔ کی اردو شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے مگر فارسی شاعری پر تبصرے کے ضمن میں انہوں نے غالبؔ کا فیضیؔ اور ظہوریؔ سے موازنہ کرتے ہوئے غالبؔ کی بڑائی ثابت کی ہے۔

فارسی شعر و ادب کی بالادستی کم و بیش اورنگ زیب کے عہد تک قائم رہی۔ اس کے بعد جب سلطنت کا زوال شروع ہوا تو اس زبان یعنی اردو کا چرچا ہونے لگا، جو فارسی اور برصغیر کی مقامی زبانوں برج بھاشا، کھڑی بولی وغیرہ کی آمیزش سے پیدا ہوئی تھی۔ اردو چونکہ شہروں کے متوسط طبقے کی بول چال کی زبان کی حیثیت سے ابھری تھی، لہٰذا اس کا دائرۂ اثر فارسی سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ وہ سرکار دربار کی زبان تو نہ تھی مگر بازار اور لشکر، خانقاہ اور درگاہ عوام کے تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کی زبان تو تھی۔ رفتہ رفتہ یہ شاعری کی زبان بن گئی۔ اور جب بڑے بڑے باکمال شعراء نے اسے اپنا لیا تو معاشرے میں اس کا مرتبہ اور وقار بڑھ گیا۔ مختصر یہ کہ اردو نے مغلیہ عہد کے زوال میں عروج پایا۔ شہروں کے متوسط طبقے نے تو اس کی نشوونما اور ترقی میں حصہ لیا ہی تھا۔ آخر کو سرکاری زبان نہ ہونے کے باوجود دہلی اور لکھنؤ کے درباروں کی سرپرستی بھی اسے حاصل ہو گئی۔ یہ متوسط طبقہ مغل سلطنت میں کیا حیثیت رکھتا تھا یہ بحث الگ ہے۔ میں فقط اس کی ثقافتی اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں اور اس امر واقعہ پر کہ اس طبقے کی معاشرت بھی مغلیہ عہد ہی کے تہذیب و تمدن کا ایک حصہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس معاشرت میں اونچے طبقے کی فارسی معاشرت کے اثرات کے ساتھ ساتھ مقامی اثرات یعنی برصغیر کی سرزمین کے بسنے والوں کے رسم و رواج طرزِ فکر و احساس اور انداز و آداب ــــ مختصر یہ کہ یہاں کی مٹی کی بُوباس بھی پائی جاتی ہے۔ اردو اسی ملی جلی معاشرت اسی ثقافتی امتزاج کی سب سے حسین یادگار ہے۔ اردو کے تمام قدیم شاعر ولیؔ سے لے کر ذوقؔ تک اسی متوسط طبقے کی معاشرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اسی کی پیداوار تھے اور اسی سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں فارسی اثرات موجود ہیں۔ مگر ان کے مزاج کی ساخت اور دل و دماغ کے تار و پود میں مغایرت کا جو رنگ ملتا ہے وہ غالبؔ کے ہاں نہیں ــــ

میر تقی میرؔ ہوں کہ مرزا رفیع سوداؔ، شیخ مصحفیؔ ہوں کہ سید انشاؔ، خواجہ آتشؔ ہوں کہ شیخ ناسخؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ ہوں کہ شیخ ابراہیم ذوقؔ، سب کے آباؤ اجداد کسی نہ کسی وقت بیرون ملک ہی سے آئے تھے لیکن ذہنی اور فکری طور پر انہوں نے یہاں کے متوسط طبقے کی زندگی اور معاشرت، اس کی زبان اور ثقافتی اقدار کو اس حد تک اپنا لیا تھا کہ ان کی شاعری خاص یہاں کی چیز بن گئی تھی۔ ان سب شعراء نے فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ یہ اس زمانے کا عام دستور تھا مگر اصلاً وہ.

اپنے آپ کو اردو ہی کا شاعر سمجھتے تھے۔ اور اسی پر ناز کرتے تھے۔ وہ لاکھ ایران توران کی بات کریں شعر وہ دلّی اور لکھنؤ ہی میں بیٹھ کر لکھتے تھے۔ غالب کے اپنے زمانے میں اگر غالب کے مقابلے میں ذوق کو زیادہ پسند کیا گیا تو اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ ذوقؔ اس زمانے کے متوسط طبقے کی معاشرت سے زیادہ قریبی تعلق رکھتے تھے اور اس کے زیادہ صحیح ترجمان تھے۔ ذوقؔ کی شاعری میں اسی طبقے کے اعتقادات اور حسیات اور اسی کے اخلاقی رجحانات اور نفسیاتی کیفیتوں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اسی بنا پر فراقؔ نے ذوقؔ پر اپنے مضمون میں ذوقؔ کو "پنچایتی خیالات یا آرائے عامہ کا شاعر" قرار دیا ہے۔ آج آپ ذوقؔ کے بارے میں کچھ ہی کہیے مگر آخر کوئی بات تو تھی کہ ایک معمولی سپاہی زادہ کہ جس کی ساری عمر مفلسی میں گذری، محض اپنی شاعری کے بل بوتے پر کہاں سے کہاں پہنچا۔ قبول عام کی سند بھی پائی اور بادشاہ کے استاد کا منصب بھی حاصل کیا۔

عام طور پر اردو شعرا، خصوصیت سے دلّی کے شعراء میں داخلیت کا رجحان زیادہ قوی ہے۔ مگر سوداؔ کے ہاں خارجیت بھی کافی نمایاں ہے۔ اس رنگ کو انشاؔ نے اور فروغ دیا۔ ان کی شاعری میں جابجا آس پاس کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ دونوں شاعر نظیرؔ اکبر آبادی کے پیش رو تھے۔ مگر میاں نظیرؔ اپنے مقامی پن بلکہ عوامی پن میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ "شرفاء" کے لکھے ہوئے تذکروں میں جگہ تک نہ پا سکے۔

یہاں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو شاعری میں فارسی شاعری کے نشانات و علامات، گل و بلبل، صیاد و قفس، شمع و پروانہ وغیرہ کے استعمال پر نہ جائیے اور نہ اس بنا پر کوئی حکم لگائیے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اردو شاعری محض فارسی شاعری کا چربہ نہیں فارسی شاعری کا اثر و نفوذ تو اس میں ضرور پایا جاتا ہے مگر میرؔ و سوداؔ اور ان کے بعد آنے والے شعراء کے ہاتھوں اردو شاعری نے اپنا ایک مزاج پا لیا تھا۔ یہ مزاج حافظؔ و سعدیؔ کی شاعری کے مزاج سے مختلف ہے۔ یہ مزاج ان فارسی شعراء کے مزاج سے بھی مختلف ہے جنہوں نے برصغیر کی فضا میں نغمہ سرائی کی۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں غالبؔ نے برصغیر کے انہی فارسی شعراء کی روایت کو اپنایا تھا۔ لیکن اردو شاعر ہوتے ہوئے یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہ اردو شاعری کی روایت سے یکسر بے تعلق رہتے۔ آخر وہ بہادر شاہ کی دلّی میں رہتے تھے اور آخری زمانے میں جب وہ دربار سے زیادہ قریب ہو گئے تو ان کی شاعری میں اردو شاعری کی روایت کا اثر بھی نمایاں طور پر نظر آنے لگا۔ بہرحال غالبؔ نے اردو شاعری میں بھی اپنی ذاتی اپج کی بدولت وہ کرشمے دکھائے ہیں کہ جن سے وہ اب تک ناآشنا تھی انھوں نے فکر و احساس کی نادیدہ سرزمینوں کو دریافت کیا اور ان تجربوں اور مختلف النوع تجربات سے اردو شاعری کو مالا مال کر دیا کہ جو ان کی باثروت شخصیت ہی سے ممکن تھا۔ اسی لیے تو اردو شاعری کی فضا میں غالبؔ کی آواز ایک نئے اُفق سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

سرسیّد سے ہماری سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان کی تحریک کا اصل مقصد تو مسلمان قوم کے حال و مستقبل سنوارنے کے لیے ایک نئی راہ متعین کرنا تھا مگر اس کے زیر اثر ہمارے ہاں جو ذہنی اور فکری فضا تیار ہوئی اور جس تاریخی شعور نے جنم لیا اس میں سلف کی یاد بھی ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ سلف کی یاد برصغیر میں عہد مغلیہ کے عروج و زوال کی یاد تھی۔ حالیؔ نے اپنی مختلف تحریروں میں عام طور پر اردو شاعری کی مذمت کی اور اپنی طبعی سلامت روی اور بردباری کے باوجود جوشِ اصلاح میں یہ فتوے تک دے گئے۔ ع جہنّم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے! مگر غالبؔ کی سوانح عمری لکھی۔ ان کی شاعری اور انشا پردازی کو مغلوں کے آخری دور کا مہتم بالشان واقعہ قرار دیا اور اس کی عظمت کے ترانے گائے۔ عام اردو شاعری اس لیے مذموم ٹھہری کہ سلطنت کے زوال کے زمانے کی نشانی تھی اور غالبؔ، اگرچہ

سلطنت کے زوال کے ہی دوران پیدا ہوئے تھے مگر چونکہ اپنی شان و شوکت، عز و جاہ، ذہنی و فکری وابستگیوں اور ثقافتی روابط کی بنا پر وہ سلطنت کے عروج کے زمانے کی یاد دلاتے تھے۔ لہٰذا محترم سمجھے گئے۔ یہی نہیں۔ کچھ عرصے کے بعد جب "الہلال" طلوع ہوا تو ابوالکلام آزاد کے قلم معجز رقم نے غالب کو کیا سے کیا بنا دیا، اور پھر ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے تو یہ انتہا کر دی کہ دیوان غالب کو ہندوؤں کے مقدس وید کے برابر لا کھڑا کیا۔ اس دعوے کے ساتھ کہ ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب عہد مغلیہ کے ایک برگزیدہ مسلمان پر اُتری تھی! خیر بجنوری تو بجنوری تھے ان کو کیا کہیے! اس دور میں غالب کی قدر شناسی اور مغلیہ سلطنت سے ہماری شیفتگی کا بلیغ ترین اظہار تو رشید احمد صدیقی کے اس جملے میں ہوا ہے: "مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل!" گویا اردو سے الگ غالب کی ایک اپنی مستقل حیثیت ہے جس میں اس مخصوص دور کے تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی امتیازات جھلکتے ہیں اور یہی وہ حیثیت ہے جس کو میں نے اس مضمون میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

انگریزی ادب و شعر کے اثرات کا دور دورہ ہوا تو غالب کی مقبولیت اور بڑھی۔ اردو کی روایتی شاعری سے ان کی روگردانی، ان کی انفرادی اپج، ان کی ندرتِ فکر و احساس اور ندرتِ بیان و اظہار، ان کی رومانیت، انانیت اور خود پسندی ان کی تشکک پرستی اور آزاد خیالی۔ غرض ہر چیز جدیدیت کے معیار پر پوری اُتری اور مقبول ٹھہری اور یوں اپنے بارے میں غالب کی یہ پیشگوئی پوری ہو گئی کہ ع

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

اور یہ کہ ؎

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

مختصر یہ کہ سرسید کے دور سے ہمارے ہاں غالب کی مقبولیت اور شہرت کا دور شروع ہوا اور جب اس دور کے قومی شعور نے اپنا شاعر یعنی اقبال پیدا کیا تو اس نے بھی اردو شعرا میں سے صرف غالب ہی کو درخورِ اعتنا سمجھا اور بانگ درا سے لیکر جاوید نامہ تک مختلف مقامات پر خراج تحسین ادا کیا۔ داغ کی وفات پر اقبال کا مرثیہ ایک شاگرد کے رسمی نذرانۂ عقیدت کے سوا کچھ نہیں۔

ہمارے زمانے میں غالب کی مقبولیت اور شہرت کے اسباب کچھ ہی رہے ہوں، غالب کی عظمت بہرحال اپنی جگہ قائم ہے۔ ذرا سوچیے تو کہ وہ اپنی ذات میں کیا کچھ سمیٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف تو وہ برصغیر میں فارسی شعر گوئی کی اس روایت کی جوت جگائے ہوئے تھے کہ جس کا سلسلہ مغلیہ عہد کے شاعروں سے لیکر خسرو کے واسطے سے مسعود سعد سلمان تک پہنچتا ہے۔ اس میدان میں انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود وہ کمال بہم پہنچایا کہ اپنے اکثر پیشروؤں سے سبقت لے گئے۔ دوسری طرف انہوں نے اردو شاعری کی روایت میں ایسے شاندار اضافے کئے کہ جن کے بغیر اردو شاعری وہ نہ ہوتی کہ جو وہ آج ہے۔ ماضی و حال سے اس گہرے شغف کے ساتھ ساتھ غالب نے اس عظیم انقلاب کے مضمرات کا اندازہ بھی کر لیا تھا جو مستقبل میں ہر لحاظ سے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرنے والا تھا۔ ذہنی طور پر وہ اسے قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ سرسید کی آئین اکبری کی تصحیح کی علمی کوشش کو انہوں نے اس خیال سے فضول سمجھا اور رد کر دیا کہ انگریزی عمل داری کے آئین کے مقابلے میں ایک عہد پارینہ کے آئین کی کیا حیثیت ہے۔ دراصل غالب نے ایسا زمانہ پایا تھا کہ جب برصغیر میں ماضی و حال اور مستقبل کے دھارے آپس میں مل بھی رہے تھے اور ایک دوسرے سے جدا بھی ہو رہے تھے۔ ان دھاروں کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کا عکس غالب کے آئینۂ ادراک و احساس پر صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کا "مہتم بالشان واقعہ" ہماری ادبی تاریخ میں ایک ہی دفعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔

روایت اور جدیدیت

محمد علی صدیقی

پروفیسر محمد حسن عسکری کی تصنیف "جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ" کی اشاعت کے بعد ان دنوں علمی حلقوں میں جدیدیت اور روایت کے موضوع پر خاصا گرما گرم بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ عسکری مرحوم کے تبحرِ علمی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ وہ بلا شک و شبہ جدید اردو ادب کی ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔ عسکری صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اُس موضوع کے موافق اور مخالف ادبا نے عسکری صاحب کے خیالات پر سنجیدگی کے ساتھ اپنا ردِ عمل پیش کیا ہے۔

اگر عسکری صاحب جدیدیت کے جملہ رجحانات کو بلا کسی واضح تخصیص اور استثنا کے قلم زد کرتے ہوئے محسوس نہ ہوتے اور ان رجحانات سے مرتب ہونے والے رجحانات کو گمراہیوں کی ذیل میں داخل نہ کرتے تو اُن کے خیالات سے سرسری طور پر بھی گذرا جا سکتا تھا لیکن عسکری صاحب نے اپنی "بعد از مرگ" کتاب میں انیسویں صدی کی متعین، محدود اور مادی کائنات کے ذکار کے ساتھ بیسویں صدی کے بیشتر بلکہ جملہ رجحانات کو بھی مادی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ خطرناک قرار دیا ہے اور اس لئے لامحالہ طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ علم کا وہ سارا سرمایہ بھی دریا برد کر دیئے جانے کا سزاوار ہے جو سائنس اور ٹکنالوجی میں مغربی سبقت کا سبب بنا۔

ڈاکٹر محمد اجمل "جدیدیت" کے مقدمہ میں رینے گینوں کی فکر کا لب لباب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"جدید انسان کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ جدید تہذیب کے بہاؤ کے ساتھ بہہ کر تباہی کی طرف چھپتے چلے جائیں اور سمجھیں کہ ہم آزاد اور خود مختار ہیں اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس تہذیب کے بنیادی تصورات کا خاتمہ کرکے نئے سرے سے دین کے بنیادی عقائد کا احیاء کیا جائے تاکہ لوگ صحیح معنوں میں روحانی زندگی بسر کر سکیں۔"

اور خود عسکری صاحب اپنی کتاب کے پہلے باب میں لکھتے ہیں کہ،

"پہلے گمراہیاں خود مسلمانوں کے اندر سے پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن کئی گمراہیاں مغرب سے آئی ہیں۔ پھر اُس کے پیچھے یورپ کی مالی اور فوجی طاقت بھی رہی ہے۔ علاوہ ازیں یہ گمراہیاں اپنے ساتھ سائنس کی ایسی ایجادات بھی لائی ہیں جو نفسانی خواہشات کو تسکین دینے والی ہیں اور عام لوگوں کو بھونچکا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ لوگ ذہن سے کام نہیں لیتے حسّی مشاہدات کو عقلی دلیل سمجھتے ہیں۔ اس لئے جب علماء اعتراض کا جواب دیتے ہیں تو قرار واقعی اثر نہیں ہوتا۔"

عسکری صاحب صفحہ ۷۸ پر مزید فرماتے ہیں کہ:

"اب لوگ مادہ کی قدامت کی بجائے "توانائی" کی قدامت کے قائل ہو چلے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "فطرت" یا "حیات" خود اپنی توانائی سے زندہ ہے اور اُس کی لازمی صفت ہے "عدم یقین"۔ سائنس کے ایسے اصول، دراصل فلسفے مشرقی لوگوں کے لئے دینی لحاظ سے بہت خطرناک ہیں کیونکہ مشرقی مذاہب کی بنیاد "لاتعین" کے عقیدہ پر ہے۔"

کیا یہ صریحی طور پر یک طرفہ فیصلہ نہیں؟

مندرجہ بالا دو اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ عسکری صاحب موجودہ سائنس کی بنیادی فکر ہی کے خلاف ہیں۔ وہ سائنس اور ٹکنالوجی پر اپنی مرضی اور اپنی فکر نافذ کرنا چاہتے ہیں اور یہ سائنس کے مزاج کے خلاف ہے کہ ایک فرد یا گروہ سائنسی تحقیق کی اسپرٹ کے خلاف بند باندھے۔

عسکری صاحب کے خیال میں "جدیدیت" کے سارے تانے بانے روایت شکنی کی ذیل میں آتے ہیں اور وہ رینے گینوں کے تتبع میں "روایت" کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں کہ احیائے مذہب کی ہر تحریک روایت کے ساتھ گہری وابستگی کا دوسرا نام بن کر رہ گئی ہے۔ اور اُس کی کامیابی یا ناکامیابی کا تمامتر دار و مدار اس نکتہ پر آن ٹھہرا ہے کہ ہر وہ سلسلۂ فکر جو "روایت" میں ضعف پیدا کرتا ہے اور خدا اور بندہ کے مابین روحانی رشتہ میں دراڑیں ڈالتا ہے، نامناسب اور قابلِ رد ہے۔

سب سے پہلے ہم مختصراً روایت کے اُس مفہوم کی جانب آتے ہیں جو حسن عسکری مرحوم کو عزیز ہے ـــــ اور اُن کے سلسلۂ فکر کے پیشوا شواں (SCHUON) اور رینے گینوں (RENE GUENON) کی فکر سے متحد ہے۔ عسکری صاحب "جدیدیت" (صفحہ ۱۸) میں فرماتے ہیں:

"صرف اسلام ہی نہیں بلکہ مشرق کے سارے ادیان کا انحصار زیادہ تر زبانی روایت پر ہے لکھی ہوئی کتابوں پر نہیں۔ ہمارے نزدیک کسی دین کے زندہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ روایت شروع سے لے کر آج تک کلی حیثیت سے سلسلہ بہ سلسلہ اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو۔ پچھلے چھ سو یا کم سے کم چار سو سال سے یورپ اس تصور کو بھول چکا ہے۔ آج یورپ میں کسی قسم کی بھی کوئی روایت ایسی باقی نہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہو۔"

عسکری صاحب رینے گینوں کے تتبع میں ساری جدیدیت اور اُس سے پیدا ہونے والی تمام گمراہیوں کی جڑ اور اصل الاصول انفرادیت پرستی ہی کو خیال کرتے ہیں یعنی جدیدیت ہی ابلیسیت ہے۔ شواں نے اپنی تصنیف "انڈر اسٹینڈنگ اسلام" میں دعویٰ کیا ہے کہ روایت میں صرف مکان (SPACE) ہوتا ہے، وقت (TIME) نہیں اور وہ اپنے خیال کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسانی تہذیب کی مادی ترقی کے پس پشت "وقت" کی کارفرمائی ہے اور زمانی اثرات زائل کئے بغیر روحانی ترقی ممکن نہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ وقت سے انکار کیا جائے چونکہ وقت ہی انفرادیت پسندی کو ہوا دے رہا ہے اور سب سے بڑا روایت دشمن ہے۔ حیرت ہے کہ شواں اس بحث میں اس حدیث کو یکسر فراموش کر بیٹھے جس کا لب لباب یہ ہے کہ "وقت کو بُرا نہ کہو کہ وقت ہی خدا ہے"۔ بلکہ وہ اپنی فکر کا تانا بانا اس ضعیف حدیث پر بنتے ہیں کہ مستقبل ماضی کے مقابلہ میں زیادہ خراب ہوتا ہے۔

عسکری صاحب رینے گینوں اور شواں کے تتبع میں جدیدیت کے جملہ مظاہر کو ریاکار، فاسق و فاجر، مادہ پرست، جدید علوم کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ عسکری صاحب کے خیال میں سائنس بذاتِ خود مادی ہے اور اس لئے ہر وہ چیز جس میں مادہ پرستی کی بو آ جائے خود بخود ناپاک ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال شاید اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ عسکری صاحب کے یہاں جدیدیت روایت کی حریف ہے۔ وہ اس سلسلہ میں رینے گینوں اور شواں کے خیال کے ہمنوا ہیں کہ روایت "مکان" کی مانند ہے "زماں" کی مانند نہیں ہے۔

شواں کے خیال میں روایت کے آغاز کے وقت جو خد و خال متعین ہوئے تھے انہیں ہیئت کی معمولی، غیر اہم تبدیلی کے سوا، دوام حاصل رہتا ہے۔ روایت امت کے گرد علامت کا ہالہ قائم رکھتی ہے۔ یہ ہالہ طبعی دنیا کی طرح نمو بخش ہے اور برگ و بار لاتا رہتا ہے۔ اور دنیا و انسانیت کے لئے مناسب اور نارمل بات یہی ہے کہ وہ علامت کے اندر زندگی گذارے چونکہ یہ علامت جنت کی جانب نشاندہی کرتی ہے اور "لامحدود" کی طرف کھلتی ہے۔ جہاں تک جدید سائنس کا تعلق ہے تو اُس نے علامت (مذہبی زندگی کی بنیادی شرط) کی محافظ سرحدوں میں دراڑیں ڈال دی ہیں اور اس طرح اُس نے خود امت ہی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے ۔۔۔۔

اگر اس نظریۂ روایت کی مزید انشراح مقصود ہے تو اسے شواں ہی کے الفاظ میں اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ:

"روایتی تہذیبوں کی عمومی تفہیم ـــــ اور اسلامی تہذیب کی بطورِ خاص تفہیم کے لئے ـــــ اس بات کا اثبات ضروری ہو جاتا ہے کہ اس تہذیب کا آئیڈیل عام آدمی نہیں ہوتا جو التباس (ILLUSION) میں گرفتار رہتا ہے بلکہ وہ ولی اللہ (SAINT) ہے جو دنیا سے الگ تھلگ، درجہ

رہتا ہے صرف وہی شخص نارمل ہے اور صرف اسی شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ زندہ رہے؛[۵]

آپ نے دیکھا کہ روایت کا یہ تصور انسانی تہذیب کی مادی ترقی سے کس درجہ بیزار ہے۔ اس تصورِ روایت نے انسانی تہذیب کو غیر متغیر مان کر تغیراتی قوانین سے ——— بلکہ وقت سے ——— آنکھیں موند لی ہیں اور ان سب کو وقت یعنی تبدیلی/ ترقی کے دائرۂ عمل میں دے کر غیر روحانی ثابت کر دیا ہے۔ "وقت" کے مقابلہ میں "زماں" پر زور میرے خیال میں جمود اور بنجرپن کی وکالت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رینے گینوں اور شوال جن تہذیبوں کو روایتی قرار دیتے ہیں ان میں سے کم سے کم بدھ مت اور ہندو مت کے زیرِ تحت علاقوں میں سائنسی ترقی پر روز بروز زور دیا جا رہا ہے۔ جاپان، چین، کوریا اور ہندوستان وغیرہ اسی دائرہ میں آتے ہیں۔ ہاں اسلامی ممالک (ماسوا تیل پیدا کرنے والے علاقے) روایت کے مکانی (SPACE) منظر کی سب سے عبرتناک دنیا ہے جہاں غربت اور افلاس کی حکمرانی ہے۔ اور سائنس اور ٹکنالوجی کے حصول کے لئے زبردست کوششیں کی جا رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غربت اور افلاس کے خلاف جہاد کرنے والوں نے رینے گینوں کے افکار پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے ورنہ وہ اپنی غربت اور افلاس پر قانع ہو جاتے۔ اس طرح غریب دنیا میں پائی جانے والی بے چینی سے خلف امیر دنیا کسی حد تک اطمینان کا سانس لے سکتی تھی ——— لیکن افسوس کہ عامۃ الناس اپنی غربت پر قانع نہیں ہو پا رہے ہیں اور ان کا ادب اور سیاست خوب سے خوب ترکی تلاش میں سرگرداں نظر آ رہا ہے۔ دنیا اس قدر سکڑ چکی ہے کہ اب سائنسی ترقی سے محض اس لئے دور نہیں رہا جا سکتا کہ چند علامت پسند ترقی دشمن مغرب نژاد صوفیا نے روایت، عقل، انسان دوستی اور حقیقت پسندی کی من مانی تعریفوں کا سہارا لے کر "غیر روایت" کو روایت، "جمود" کو حرکت، "ابنارمل" کو نارمل، "زمان" کو مکان پر ترجیح دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس قسم کے فیصلے پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ "سب مایا ہے" کا تصور ہمارے منطقہ میں نیا نہیں ہے لیکن آج ہندوستان نے "مایا" فلسفہ کا کرشمہ دیکھیے کہ وہاں کے لوگ اپنی ملکی صنعت کو اس حد تک ترقی دے چکے ہیں کہ گزشتہ چند سال میں ان کا ملک دنیا کا چھٹا بڑا صنعتی ملک بن چکا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا اور اس ملک کی آبادی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا تو واللہ اعلم کیا ہوتا۔ اس وقت نوعِ انسانی کی بقا کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ آیا بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں یا نہیں یہ کام سائنس اور ٹکنالوجی کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا اور خواہ جدید سائنس کی بنیاد "عدم تعین" ہی کا اصول ہو لیکن انسانی نسل کی بقا سائنسی ترقی ہی میں مضمر ہے۔

شاید مفلسی، بیماری اور جہالت کے وکلا "زمان" کے مقابلہ میں "مکان" کو اس غرض سے فوقیت دیتے ہوں کہ اس کے مد مقابل بہتر زندگی کی خواہشیں غیر حقیقی ہوں لیکن وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی منطق کی بنیاد ریت پر کھڑی ہوئی ہے۔

آخر "روایت" کی ایک ایسی تعریف سے کیا حاصل ہو سکتا ہے جس کا مثالی انسان ایک ایسا شخص ہو جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو ——— اور تپسیا میں مشغول ہو۔ کیا یہ نقطۂ نظر رہبانی نہیں ہے؟ کیا اس نظریے کو حقیقت پسندانہ نظریہ گردانا جا سکتا ہے؟

روایت کی غیر روایتی تعریف سے گذرتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تعریف کس درجہ غیر حقیقی اور غیر انسان دوست ہے؟

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے روایت کے جس قلعہ کی تعمیر میں حصہ لیا تھا وہ بھی ناقص بنیادوں پر استوار تھا لیکن اس میں "تخلیقی روایت" کا اثبات کیا گیا تھا۔ ایلیٹ کے یہاں روایت کا تصور ناقابلِ تغیر نہیں ہے لیکن رینے گینوں کے مقلدین کے نزدیک روایت کی وہ ساری تعریفیں بھی جو ایلیٹ اور پاؤنڈ کے حوالہ سے پیش کی گئی ہیں "جدیدیت زدہ" ہیں جیسا کہ "معاصر" لاہور کے پہلے شمارہ میں شائع شدہ ایک مضمون نگار کی پریشانی سے عیاں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ روایت کے جس تصور کو مذہبی فکر اور سماج کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے، وہ مذہبی سماج کو خارجی اثرات سے اس درجہ نابلد رکھنا چاہتا ہے کہ اس میں شمہ برابر تبدیلی پر بھی ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ ہر چند کہ بعض مسلم دانشوروں نے علم انسانی کے ارتقا پر زور دیا ہے جو بدلتے ہوئے ادوار میں انسانی زندگی کو درپیش چیلنج اور ان کے جوابی ردِ عمل کے گراف سے ہویدا ہے۔ مزید براں چونکہ انسانی علم کی ایک خطہ،

---

۵ P.30 UNDERSTANDING ISLAM FRITHGOF SCHUON LONDON 1979

مذہب، نسل یا زبان کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہو سکتا اس لیے ہر دور اور سماج مخصوص حالات میں اپنے نظریہ علم میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔ گذشتہ سو سال میں ہماری دانشگاہوں کے تعلیمی نصاب میں تبدیلیاں، اور تغیرات اس امر کا ثبوت ہیں کہ انسانی علم کے دائرہ کے پھیلاؤ اور اس کی مقدار میں اضافہ کے سبب نصاب تیار کرنے والے درسی کتب میں نئے اکتشافات اور ایجادات کو سموتے رہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک نیا سیارہ دریافت ہو جائے اور ہم اس حقیقت کا محض اس لئے اثبات نہ کریں کہ یہ حقیقت ہمارے بزرگوں کے علم میں نہیں آ سکی تھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ علم حیاتیات میں ڈی۔ این۔ اے "سیل" کا نظریہ پیش کیا جائے اور ہم وراثت سے متعلق مباحث میں اس نظریہ کے مضمرات سے پہلوتہی کریں۔ علم طبیعیات میں "بنیادی ذرات" اور کائنات کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں نئے خیالات کو استناد حاصل ہو چکا ہو اور ہم ان خیالات سے اجتناب برتتے رہیں۔ عناصر کی تعداد میں نئے نئے اضافے ہوتے رہیں اور ہم ایک ایسے چارٹ کو سینے سے لگائے بیٹھے رہیں جو بہر طور گزرے ہوئے وقت کا معتبر سچ تھا لیکن آج سائنسی تحقیق کے ہاتھوں نامکمل قرار دیا جا چکا ہے۔ جس رفتار سے سائنسی علوم میں اضافے ہو رہے ہیں۔ اور ان کے نتیجہ میں حیرت ناک ایجادات اور تکنیکی جدتیں ظہور پذیر ہو رہی ہیں اس سے انسانی ذہن پر کم از کم ایک تاثر مرتب ہوتا چلا جا رہا ہے کہ انسانی علم اس وقت تک ترقی کرتا رہے گا جب تک فطرت کے رازہائے سربستہ کھلتے رہیں گے۔ ہر تبدیلی ماضی کی کسی نظریے یا خیال کی تنسیخ یا اس میں ترمیم سے پیدا ہوتی ہے اور جدید ذہن کا سب سے محیر العقول اختصاص یہی ہے کہ وہ تبدیلیوں کے ساؤں میں، تبدیلیوں کے ذریعہ انجانی تبدیلیوں کی سمت گامزن ہے۔ انسانی ذہن اس سفر سے خوش ہے ہر چند کہ وہ کچھ تھک سا گیا ہے لیکن تبدیلی کی خواہش ہے کہ انسانی ذہن کے راستے سماجی تار و پود تک میں سرایت کر چکی ہے۔ وہ افراد بھی جو "تبدیلی" کے خیال ہی سے لرزہ براندام ہیں "تبدیلی" کے کاندھے پر بیٹھ کر تبدیلی لانے والے دماغ بردار کرنے کے لئے مجبور کر دیئے گئے ہیں لیکن تبدیلی اپنے مخالفین کے ہتھیاروں کی پہنچ سے اس قدر آگے نکل چکی ہے اور چھلانگیں مارتی ہوئی چل رہی ہے کہ وہ تبدیلی سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔ ہاں البتہ ڈان کیوتے DON QUIXOTE کے انداز میں ہوائی چکیوں پر حملوں کے مضحکہ خیز منظر تفریح و دل بستگی کا سستا ذریعہ بن کر رہ جائیں تو وہ الگ بات ہے۔

اصل قباحت یہ ہے کہ تبدیلی کے دشمن اس قدر ذہین نظر نہیں آتے کہ وہ اپنی جنگِ مغلوبہ کی مؤثر اسٹریٹجی (STRATEGY) بنا سکیں۔ شاید اسی وجہ سے وہ تبدیلی و تغیر کے ازلی و ابدی قانون کے ساتھ اپنی جنگ میں غیر متغیر "روایت" کا فرض محال نظریہ پیش کرنے سے نہیں چوکے۔ وہ مذہب اور روایت کو ہم معنی اور لازم و ملزوم قرار دے کر روایت کو اس درجہ جامد بنانے پر تلے ہوئے ہیں کہ روایت سے انحراف کے منطقی مظاہر کو بھی گمراہیوں کی ذیل میں لے آتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ بقول اقبال:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

کاش وہ اس حقیقت سے آنکھیں نہ چراتے کہ فطرت کے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی ہی سائنس کا سب سے بڑا وظیفہ ہے تو یہ عین عبادت ہے۔

اگر روایت سے مطلب مذہب کے بنیادی ارکان پر کامل اعتقاد ہو تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟ لیکن اگر روایت سے مراد سائنسی علوم اور مذہبی معاشرہ میں ایک طرح کا تصادم مقصود ہو تو یہ پہلو مذہب کی خدمت قرار نہیں پا سکتا۔

آیئے اب ہم ذرا "جدیدیت" کی مغربی تاریخ کا جائزہ لیں۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ جب ادب میں "جدیدیت" کا غلغلہ بلند ہوا تھا تو اس کے چند واضح نظریات سامنے آئے تھے لیکن شاید ہی ان سب مظاہر کو "بلیسیت" قرار دینے کی تن آسانی کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ لیکن "روایت" کے بعض مقلدین نے "جدیدیت" کے بارے میں اس درجہ اوٹ پٹانگ نظریات پیش کئے ہیں کہ اب ہم روایت کے ساتھ ساتھ کچھ جدیدیت کے بارے میں بھی معروضات پیش کریں گے۔

جدیدیت، کم از کم ادب، مصوری اور موسیقی میں روایت کے "ہم" کی بجائے انا پرستانہ "میں" کے ایک رجحان سے متصف ہوئی تھی

انیسویں صدی کے نصف آخر اور جنگ عظیم اول سے ذرا پہلے یا اُس کے دوران "جدیدیت" بطور ایک رجحان ہمارے سامنے آئی (عسکری صاحب کے نزدیک جدیدیت کی عمر چھ سو سال ہے، اور اگر اسے مذہبی اتھارٹی کی کمزوری کا نقطۂ آغاز فرض کر لیا جائے تو جدیدیت کلیسائے روم سے بغاوت سے عبارت ہے)۔

فرینک کرموڈ نے جدیدیت کے دو ادوار تجویز کئے ہیں — ایک PALAEO-MODERNISM اور دوسرا NEO-MODERNISM — اول الذکر شروع دور کی بے شکل جدیدیت ہے اور آخر الذکر ماورائے حقیقت SURREALIST یا اُس کے بعد کے رجحانات ہیں۔ امریکی نقاد احاب حسن اور لیسلی فیڈلر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بعد جدت پسندی (POST-MODERNIST) دور ہیئت پرستی کے خلاف ردعمل ہے اور اینٹی آرٹ، اینٹی لٹریچر، بلو ناول یا اینٹی ناول کی تحریکوں کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ ممکن ہے عسکری صاحب ہیئت پرستی کی مخالفت سے مذہب گریزی مراد لیں اور اسے علامت کے سایہ سے روگرداں ہونے والا رجحان قرار دیں لیکن اس امر پر بالکلیہ اتفاق رائے ہے کہ جدیدیت کی کوئی واحد تعریف ممکن نہیں ہے لیکن یہ درست ہے کہ جدیدیت "اتھارٹی" کے خلاف ہے۔ اور بسا اوقات وہ عقل پسندی اور حقیقت پسندی کی اتھارٹی کے خلاف بھی صف آرا ہو جاتی ہے لیکن بہت سی جدید تحریکیں عینیت پسندانہ فکر کے باب میں "ڈھال" کا کام کرتی رہی ہیں اور شاید اسی وجہ سے ترقی پسندوں پر شاق گذری ہیں لیکن عسکری صاحب نے جدیدیت کے اُن سارے رجحانات کے ساتھ بھی ظلم و تعدی کا رویہ اختیار کیا، جو خود انھیں ایک زمانہ میں اس لئے محبوب و مرغوب تھیں کہ وہ آدمی کی آدمیت کا تحفظ کرتی تھیں اور اسے فارمولا بننے کے خلاف تھیں۔

جدیدیت کی بہت سی شکلیں ہیں۔ اگر فطرت پرستی کی تکلیف دہ تفصیلات کے خلاف ردعمل کا مطالعہ کرنا ہو تو پھر جدیدیت اپنے جوہر میں ANTI-REPRESENTATIONAL رجحان کے طور پر سامنے آتی ہے اور ساری مندرجہ ذیل تحریکیں علامت پسندی، تاثریت اور زوال پسندی کی ذیل میں آتی ہیں۔

(۱) فاؤوازم (۲) کیوبزم (۳) پوسٹ امپریشنزم (۴) فیوچرازم (۵) کنسٹرکٹیوازم (۶) امیجزم (۷) وورٹیسزم (۸) ایکسپریشنزم (۹) دادازم (۱۰) سرریلزم۔

ان تحریکوں کے مابین تفصیلات کی حد تک خاصے اختلافات ہیں لیکن "اسٹائل" کی مماثلتیں اختلافات پر حاوی ہیں۔ جدیدیت نے ہیئتوں (FORMS) کے اختلاط باہمی کے ذریعہ جدا جدا ہیئتوں کی کٹ ملائیت ختم کر کے رکھ دی لیکن اس کے ساتھ — مواد کے مقابلہ میں (شاید یہ "روایت" کا دوسرا نام ہو!) ہیئت و اضافی جمالیت پسندی پر اس درجہ زور دیا کہ فنون کی قلمرو میں سماجی تاریخی اور عقلی میلانات کی تلاش اور ان کے تفاعل باہمی کو کار لایعنی — بلکہ خارج از منصب ادب — قرار دیا جانے لگا — کس قدر تعجب کی بات ہے کہ عسکری صاحب نے ادب میں سماجی، تاریخی اور عقلی عوامل کے خلاف آواز بلند کی تھی اور جب وہ مذہب کی طرف راجع ہوئے تو اُس سائنسی جدیدیت ہی کے منحرف ہو گئے جس کی بنیاد "عدم تعین" یعنی ارتقا پذیری کے امکان پر ہے — یہ درست ہے کہ "جدیدیت" کی تحریک کے اُن سارے رجحانات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا جو غیر عقلی، نراجی، اور غلو آمیز انا پرستی پر مشتمل ہیں لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی پر بھی وہی الزامات عائد کئے جا سکیں۔ جو "جدیدیت" کے غیر عقلی، نراجی اور انا پرستانہ رجحانات پر صادق آتے ہیں۔

میں جدیدیت کے بارے میں آل احمد سرور کے اس خیال سے متفق ہوں کہ "تبدیلی زندگی کا قانون ہے اس لئے میرے نزدیک جدیدیت ایک مستقل چیز ہے۔ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

مغرب کی ترقی کا راز یہ ہے کہ اُس نے فطرت کے اس راز کو سمجھ لیا ہے اور تبدیلی قبول کرنے کے لئے اپنے ذہن کو آمادہ اور اپنے قلب کو کشادہ رکھا ہے۔ مشرق میں ہم تبدیلی سے خائف رہے ہیں — اس لئے جدیدیت کے نام پر صرف سائنس اور ٹکنالوجی کا پرچار یا مارکسزم کا نسخہ کافی نہ ہوگا کہ حوادث فی کہ گرجی جائیں اور سارے امراض سے نجات مل جائے بلکہ سائنس اور اجتماع دوستی کی روح کو اپنانا ہوگا ہوگا۔۔۔۔۔" جدت پرستی اور جدیدیت کے مضمرات" ("نظر اور نظریے" آل احمد سرور صفحہ ۱۴۹ - ۱۹۷۹ء)

یہ آزادیٔ رائے ہی کا معاملہ ہے کہ عسکری صاحب "جدیدیت" کو گمراہی گردانتے ہیں، اور آل احمد سرور ترقی پسندی کی ادعائیت سے کسی حد تک بیزار ہوتے ہوئے سائنسی روح اپنانے کے حق میں ہیں لیکن یہ فرق بذاتِ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ جدیدیت کے بارے میں کیا کچھ کہا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں نے بھی روایت اور جدیدیت کے بارے میں واضح نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ اُن کے نزدیک "روایت" کے وہ سارے صحت مند اور تعمیری اجزا قابلِ احترام ہیں جو آج کی زندگی میں معنویت پیدا کریں —— جس طرح زندگی ہمہ دم ارتقاپذیر ہے، اس طرح روایت بھی اور دونوں میں سے کوئی ایک ساکت اور جامد نہیں رہ سکتا۔ اور "جدیدیت" کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کی ارتقاپذیری اُس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ودیعت کردہ جدت پسندی (MODERNISATION) کے ہم قدم نہیں رہا جاتا۔ سائنس مسلسل غور و فکر، تحقیق و جستجو کی روشنی میں نئے نتائج تک رسائی کا نام ہے اور وہ انسانی سماج جو اپنے معتقدات اور سائنسی نتائج کے باہم تصادم کے لئے اسٹیج تیار کرتے رہتے ہیں غیر حقیقت پسندی کی مسموم فضا میں سانس لیتے ہیں —— اور جذباتیت اور تنگ نظری بوتے ہیں اور غربت و فلاکت کی فصل کاٹتے ہیں۔

سائنس فطرت کے قوانین کے مابین کامل ہم آہنگی اور توازن تلاش کرنے کا شعبہ ہے —— اور اگر غور کیا جائے تو قدرت کے حضور اس سے بہتر اور کیا نذرانۂ عقیدت ہو سکتا ہے کہ ہم اُس کے رازہائے سربستہ کی گرہ کشائی کر سکیں تاکہ انسانی زندگی زیادہ وقیع، خوشتر اور معنی خیز بن سکے۔

ہر وہ معاشرہ جو ماضی کو ایک جامد اور غیر نامیاتی اکائی تصور کرتا ہے اور حال و مستقبل میں اسی کیفیت کا استمرار چاہتا ہے، وہ ترقی و تبدیلی کے قوانین کے ساتھ حالتِ جنگ میں رہنا پسند کرتا ہے اور وہ اس طرح اپنی ساری توانائیوں کا —— بڑے افسوسناک طریقہ پر —— ضیاع کرتا ہے۔ روایت میں مثبت اور منفی عناصر شامل ہوتے ہیں اور جس طرح ایلیٹ کے خیال میں شاعر پر لازم آتا ہے کہ وہ اُن عناصر کو الگ الگ کر کے دیکھے اور صرف مثبت اور لچکدار عناصر کو قبول کرے جب تک بقول ایلیٹ "فن کار اس لمحہ میں زندہ نہ ہو جسے حال نہیں بلکہ ماضی کا لمحہ موجود کہتے ہیں" روایت آگے نہیں بڑھ سکتی۔ دراصل روایت اور جدیدیت دو متضاد رویے نہیں ہیں بلکہ اول الذکر کی زندگی ہی اس مفروضہ پر قائم ہے کہ وہ تخلیقی قبولیت کا مظاہرہ کرے۔ فن کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف ماضی کی ماہیت سے آگاہ ہو بلکہ اس حقیقت کا بھی عرفان رکھتا ہو کہ کون کون سی چیزیں مردہ اور کون کون سی زندہ ہیں۔

یہ وہ نکتہ ہے جہاں ایلیٹ جیسا روایت پرست بھی کس حد تک سائنسی نقطۂ نظر کا حامل ہو چلا ہے یعنی شدہ روایت پرستوں کے لئے گمراہ ہو چکا ہے۔ روایت کے بارے میں ہر وہ رویہ جو اس حقیقت سے انحراف پر مبنی ہو کہ روایت کا سرچشمہ تہذیب و تمدن ہے اور یہ کہ روایت پر سماجی تحریکوں اور اُن کے عمل و ردِّ عمل کا گہرا اثر ہوتا ہے، غیر حقیقی رویہ ہونا چاہیئے

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ مذہب کے خشک، تنگ نظر اور جامد وکلا، اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ سائنسی روایت، نئے حقائق کی روشنی میں، تغیر پذیری پر مائل ہے۔ مذہب کے وکلا، پر لازم آتا ہے کہ وہ مذہبی فکر کی زبان اور لغت اور سائنسی فکر کی زبان و لغت کے فرق کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔ اگر وہ اس نکتہ کو سمجھ لیں کہ سائنس اپنے مؤقف میں تبدیلی کو اپنی شکست تصور کرنے کی بجائے اس نوع کی تبدیلی کو اپنی ترقی قرار دیتی ہے۔ نیوٹن اور آئن سٹائن کا فرق دو افراد کے نقطہ ہائے نظر میں سے کسی ایک کی ہزیمت ہو سکتی ہے لیکن یہ کسی طو. پر سائنس کی ہزیمت نہیں ہے جبکہ مذہبی مبلغ اسے اپنی ہزیمت قرار دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے دور کے سارے مسائل اُس عدم تطابق کی کوکھ سے پھوٹتے ہیں جو سائنسی ترقی اور مذہبی عقائد کے متوازی دھاروں سے عبارت ہو کر رہ گیا ہے۔

رینے گینوں اور عسکری صاحب کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس عدم تطابق کی خلیج کو پاٹنے کی بجائے اُسے جوں کا توں رکھنے پر مصر ہیں اور روایت کے "زندہ" اور "مردہ" عناصر میں امتیاز نہیں برتتے اور اس اصول کو عقیدہ کی ضرورت اور غایت خیال کرتے ہیں۔

کیا جدید تقاضوں کی تنقیص ہی روایت کی وہ خدمت ہے جس پر "واہ واہ" کا شور بلند ہو سکتا ہے؟ اگر یہ خدمت ہے تو پھر خودکشی کی خواہش کو کیا نام دیا جائے؟

تخلیق، تخلیقی عمل اور وجدان

ڈاکٹر سلیم اختر

تحلیل نفسی کے امریکی ماہر ڈاکٹر ایڈمنڈ برگلر نے اپنی پریکٹس کے دوران چھتیس ادیبوں اور فن کاروں کا مختلف اوقات میں تحلیل نفسی سے علاج کیا (افسوس کہ اس نے ان کے نام درج نہیں کیے)، ان تخلیقی فن کاروں کے نفسی معالجے سے اس نے کچھ عمومی نتائج اخذ کرتے ہوئے ادیب اور تحلیل نفسی کے موضوع پر ایک دلچسپ کتاب تحریر کی جس میں اس نے تخلیق سے وابستہ لاشعوری محرکات پر بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے بقول:

"بیس برس تک اس مسئلہ کا مطالعہ کرنے اور چھتیس ادیبوں کا تحلیل نفسی کی خوردبین میں سے جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ لاشعوری شعور کی عدالتِ عالیہ میں ادیب ہر دم بحیثیت ایک ملزم اپنا دفاع پیش کرتا رہتا ہے۔ اضطراری طور پر جو کچھ بھی تخلیق کرے لاشعور کی سطح پر وہ ایک نوع کے ثانوی دفاع سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔"[1]

اس ضمن میں ایڈمنڈ برگلر نے لاشعور کے کردار کی جو وضاحت پیش کی ہے اس کے بموجب دو امور کا بطورِ خاص ذہن نشین رکھنا لازم ہے ایک تو یہ کہ لاشعور ایک منفرد اکائی نہیں بلکہ اسے مختلف شعبوں کا مجموعہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ فن کارانہ تخلیق کا سرچشمہ لاشعور سے پھوٹتا ہے تو یہ اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا کہ نیویارک مغربی نصف کرۂ ارض پر واقع ہے۔ اس سلسلہ میں ماہرین نفسیات کے اس بیان سے بھی ایک بڑی غلط فہمی نے جنم لیا ہے کہ لاشعور جامد نہیں بلکہ متحرک ہے مگر اس اندازِ نظر کو اس کی ظاہری حیثیت میں تسلیم کر لینے میں جو خطرات مضمر ہیں ان سے بہرصورت آگاہ رہنا لازم ہے کیونکہ صرف اسی ایک بات سے کہ لوگ لاشعور کی حد کی نوعیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے اتنی غلط فہمیاں اور ان پر مبنی اتنے غلط نتائج پیدا کیے ہیں کہ تمام غلطیاں ایک طرف ہوں تو پھر بھی اس کا پلڑا جھکا رہے گا۔[2]

ایڈمنڈ برگلر نے اپنے اندازِ نظر کو اس مثال سے سمجھایا ہے کہ جب ہم ایک تیز رفتار ندی میں لکڑی کا پھینک دیں اور پھر چند گھنٹوں بعد واپس آ کر اسے وہاں نہ پا کر حیرت زدہ ہوں تو ہم نے اس بنا پر جامد سوچ کا مظاہرہ کیا ہوگا کہ ہم نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ ندی بہہ رہی ہے لیکن اس کے برعکس اگر ندی کے تیز بہاؤ اور دیگر امور کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے ہم لکڑی کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد اسے دوبارہ حاصل کرنے کیلئے باقاعدہ منصوبہ بندی کریں تو یہ حرکی سوچ ہوگی۔ چنانچہ اس کے بقول "اب ان دونوں امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے، کہ لاشعور مختلف "شعبوں" کا مجموعہ ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ علم کہ ان مختلف شعبوں کی "داخلی توانائی کا توازن" بھی ہر دم متغیر رہتا ہے —— تب اس مسئلہ کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ لاشعور کے ان مختلف شعبوں میں، جو ایک مسلسل رسہ کشی جیسی کیفیت ملتی ہے تو فن کارانہ تخلیق کا ان میں سے کس "دقوعہ" کے ساتھ رشتہ جوڑا جا سکتا ہے؟"[3]

وہ اس ضمن میں مزید رقم طراز ہے:

"دراصل فن کارانہ تخلیق سے وابستہ تخلیقی عمل واحد نہیں ہوتا بلکہ دو اعمال بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ دو مدارج پر مشتمل ہوتا ہے۔

---

[1] "THE WRITER AND PSYCHO ANALYSIS" P. XI

[2] ایضاً ص ۱۰

[3] ایضاً ص ۱۱

لاشعوری "ذرائع" تصور مہیا کرتے ہیں اور پھر شعور اسے بناتا اور سنوارتا ہے۔ تخلیق کے یہ دونوں اعمال تحلیل نفسی کے ذریعہ سے نفسی علاج گاہوں میں ثابت کئے جا چکے ہیں ...... لیکن یہ تصور صرف مخصوص حالات میں اور صرف مخصوص قسم کے افراد ہی سے مخصوص ہوتا ہے ہر ایک کے بس کا یہ روگ نہیں ...... اس سلسلہ میں یہ بھی واضح رہے کہ تحلیل نفسی کے ذریعہ سے اہل قلم کے تجزیاتی مطالعہ سے تخلیقی عمل کے صرف ایک ہی پہلو کے بارے میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں یعنی لاشعوری کا کردار۔ اور لاشعوری محرکات، ان سے وابستہ دفاعی، اعمال اور پھر ان سے متعلقہ ردعمل وغیرہ کا جائزہ ممکن ہوتا ہے۔ المختصر صرف لاشعور سے اس کی جنگ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن تخلیقی عمل کا دوسرا پہلو یعنی فنی رموز اور تکنیک میں مہارت اور اسی تصور کی عملی صورت پذیری کے مختلف مدارج تحلیل نفسی کی حدود سے باہر ہیں۔"[۵]

گو آج جدید نفسیاتی مباحث میں تخلیق سے وابستہ لاشعوری محرکات کا علمی سطح پر تجزیاتی مطالعہ کیا جا رہا ہے لیکن تخلیق کار ہمیشہ سے اس سے آشنا رہا ہے۔ آج شاعر نہ کشف نفسیات کا مسئلہ ہے جبکہ یونانی فلاسفروں کے خیال میں یہ فنون لطیفہ کی دیویوں (MUSES) کی کارکردگی تھی۔ اسی لئے افلاطون نے اسے "وجد دیوانگی" قرار دیتے ہوئے شاعر اور دیوانے میں یک سے زیادہ مماثلتیں دریافت کیں چنانچہ "PHAEDRUS" میں اس نے سقراط کی زبان سے یہ کہلوایا:

"...... تیسری قسم کی دیوانگی وہ ہے جس میں دیوی (یعنی میوز) کے قابو میں آجاتے ہیں یہ ایک حساس اور پاک روح میں حلول کرکے وحشت کا باعث بنتے ہوئے غنائیہ اور دیگر اصناف کو جنم دیتی ہے اور یوں آنے والی نسلوں کے لئے قدیم دور کی عظیم شخصیات کے کارناموں کا بیان ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر ایسا شخص جس کی روح میں میوز کی پیدا کردہ دیوانگی کا شائبہ تک نہ ہو اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ وہ فن کے معبد میں محض اپنی ہنرمندی کے بل بوتے پر داخل ہو جائے گا تو یہ غلط ہے کیونکہ نہ اسے اور نہ ہی اس کی شاعری کو یوں داخلہ مل سکتا ہے۔ اس ضمن میں فرزانہ اگر دیوانہ کے مقابل آیا تو کہیں کا نہ رہے گا۔"

افلاطون کے علاوہ اور بھی بہت سے لکھنے والوں نے تخلیق اور دیوانگی میں ربط باہم دیکھا ہے۔ چنانچہ ڈرایڈن کے بموجب "عظیم صنائع دیوانگی سے قریبی تعلق رکھتی ہیں" جبکہ شیکسپیئر کے بقول:

THE LUNATIC, THE LOVER AND THE POET

ARE OF IMAGINATION ALL COMPACT

اس نوع کے مزید حوالوں کی تلاش مشکل نہیں۔ اس انداز نظر کے حامی گویا آج کی نفسیاتی اصطلاحات میں یہ کہہ رہے ہیں کہ محض شعور کے دروازے پر دستک دینے سے در تخلیق وا نہ ہوگا۔

تخلیق پر لاشعور کی اثر اندازی اور پھر ان میں ایک محض اندازے سے رنگ آمیزی محض نفسیاتی تنقید کا ایک دلچسپ نظریہ ہی نہیں بلکہ عملی تجربات کے ذریعے سے نفسی شفاخانوں میں اسے ثابت بھی کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں خودکار تحریر (AUTOMATIC WRITING) اور خودکار تصویر (AUTOMATIC PAINTING) کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں نفسی معالجے میں آزمودہ ہیں۔ اور ان کی افادیت ذہنی امراض سے مشق کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہے۔

خودکار تحریر کی صورت میں مریض سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے لکھنا شروع کر دے اور قلم جو بھی لکھے اسے لکھنے دے چنانچہ ہر نوع کی شعوری رکاوٹوں سے آزاد قلم لکھنا شروع کر دیتا ہے اور لکھتا جاتا ہے، لکھتا جاتا ہے حتیٰ کہ ہاتھ شل ہو جاتے ہیں اور ذہن خالی ...! اس عمل میں

---

۵ ایضاً ص ۱۲

۵ "THE WRITER AND PSYCHOANALYSIS" P. XII

مریض محض لکھنے کے میکانکی کردار کی ادائگی کرتا ہے اور بس؛ خودکار تحریر کا مقصد دراصل شعور کے پردے درمیان میں سے ہٹا کر قلم اور لاشعور میں بلاواسطہ قسم کا رابطہ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ یہ رابطہ جیسے جیسے گہرا اور موثر بنتا جائے گا ویسے ویسے ہی مریض کے ضمن میں مخفی محرکات کی نشان دہی آسان ہوتی جائیگی ابتدا میں تو INHIBITIONS کی بنا پر مریض رکاوٹ محسوس کرتا ہے لیکن بتدریج یہ رکاوٹیں اور شعور کی مزاحمتیں کم ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے جب خود فراموشی کے عالم میں وہ لکھتا جاتا ہے اور اس صورت میں تحریر صحیح معنوں میں خودکار بنتی ہے۔ اب لاشعور نوک قلم سے اپنا اظہار آزادی سے کرتا ہے۔

یہ مثال دراصل دو نکات کی صراحت کے لئے پیش کی گئی۔ ایک تو لاشعور کی بلاواسطہ کارفرمائی کی وضاحت کے لیے اور دوسرے ـــــ اور تخلیقی ادب کے نقطۂ نظر سے یہ زیادہ اہم ہے ـــــ اس لئے کہ تخلیقی تحریر خودکار تحریر نہیں ہوتی؛ خودکار تحریر کا سرچشمہ بھی لاشعور بنتا ہے. اور تخلیقی تحریر کا بھی۔ خودکار تحریر کی صورت میں لاشعور ہانس ساش کی اصطلاح کے مطابق محض لاشعور نہیں رہتا بلکہ "تخلیقی لاشعور" کا روپ دھار لیتا ہے۔ چنانچہ "اسلوب" تخلیقی لاشعور کا وسیلہ اور "ابلاغ" اس کا افادہ ہوتا ہے۔

(۲)

تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوجاتا ہے لاشعوری عوامل ومحرکات تخلیق کو مخصوص رنگ دیتے ہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ مصوری میں بھی اس نوع کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں جہاں خودکار تحریر کی مانند خودکار مصوری سے مریضوں نے شفا حاصل کرکے انسانی ذہن اور اعصاب لاشعور کے گہرے اثرات کی توثیق کردی۔ تخلیق لاشعور کی مرہونِ منت ہی نہیں بلکہ تخلیق کار اظہار وابلاغ سے جو آسودگی حاصل کرتا ہے اس کے نفسیاتی فوائد بھی ہیں چنانچہ جدید نفسیاتی معالجات کی کتب میں ایسے واقعات مل جاتے ہیں جہاں ذہنی مریضوں نے مصوری سے شفا حاصل کرلی۔ اسی لئے نفسی معالجین میں آج ایسا گروہ بھی ملتا ہے جو اعصابی خلل اور ذہنی عوارض کے علاج کے لیے صرف فرائڈ کی تحلیل نفسی کو ناکافی سمجھتے ہوئے علاج کے لئے نت نئے تجربات میں مصروف رہتے ہیں اور علاج بالتصویر بھی ان ہی طریقوں میں سے ایک ہے۔ گوژنگ کو اس ضمن میں پیشروی کی حیثیت حاصل ہے لیکن اس کے بعد آنے والے اور اس سے متاثر ہونے والے بعض نفسیات دانوں نے اس سلسلے میں نظریاتی بحثوں اور عملی تجربات سے لاشعور اور مصوری کی تخلیق کے باہمی روابط کو بخوبی اجاگر کیا ہے۔ اسی طریق کار میں جوائنا فیلڈ کے پیش رو کام کی بھی بہت اہمیت ہے۔ اس ضمن میں غالباً قدیم ترین مثال مشہور انگریز مصور رچرڈ ڈاڈ (۸۶-۱۸۱۷ء) کی سرگزشت سے دی جاسکتی ہے۔ اس نے ذہنی جنون کے عالم میں دو قتل کئے تھے مقتولین میں سے ایک اس کا سگا باپ تھا (فرائڈین نقطۂ نظر کی رو سے پدرکشی بذات خود ایک اہم نفسیاتی نکتہ ہے) ۱۸۵۲ء میں اسے ذہنی امراض کے شفاخانے میں بھیج دیا گیا جہاں ڈاکٹر ولیم ہڈ سربراہ تھا۔ ڈاکٹر ہڈ مریضوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھنے کے علاوہ علاج کے جدید ترین طریقوں کی آزمائش کا بھی حامی تھا۔ اس نے جب رچرڈ ڈاڈ میں مصوری کا رجحان پایا تو اسے تصویرکشی کی طرف مائل کیا تاکہ اس سے اس کا اعصابی تناؤ کم ہوجائے یہ تجربہ کامیاب رہا۔ چنانچہ جنون میں افاقہ کے ساتھ ساتھ اسے مصوری میں مہارت حاصل ہوتی گئی۔ اس کی مشہور ترین تصویر "THE FAIRY FELLER'S MASTER STROKE" پاگل خانہ میں پینٹ کی گئی تھی۔ آج جدید مصوری کے نقاد اس تصویر میں سرئیلزم کے ابتدائی نقوش دیکھتے ہیں۔ فن کارانہ چابکدستی اور تحیر کی فضا کے لحاظ سے یہ تصویر لاجواب ہے۔ تمام منظر اسرار میں لپٹا کسی خاص واقعہ کا منتظر معلوم ہوتا ہے۔ خیر یہ تو پرانی بات تھی۔ مئی[1] ۱۹۶۹ء میں لندن میں ۴۶ سالہ میری بارنز کی تصاویر کی نمائش ہوئی۔ یہ نمائش اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ مہنگے داموں تصاویر ہی نہ فروخت ہوئیں بلکہ ناقدین فن نے بھی دل کھول کر داد تحسین دی۔ میری بارنز عام عورت نہ تھی کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ ذہنی شفاخانہ میں بسر ہوا تھا، بلکہ جنون اسے ورثہ میں ملا تھا، سو جلد ہی وہ نارمل زندگی بسر کرنے کے قابل نہ رہی، اور اسے جدید طرز کے ذہنی امراض کے شفاخانہ میں داخل

[1] نیوز ویک مئی ۱۹۶۹ء

کرا دیا گیا جہاں بلوغت کے باوجود وہ اپنے ایام، عہدِ طفلی کے انداز پر بسر کر رہی ہے۔ میری نے ڈاؤ کے برعکس زندگی میں کبھی پینٹ اور برش کو چھو کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ایک دن اس کے معالج نے اُسے کچھ لکھنے کو کہا تو اس نے تصویر بنا ڈالی۔ معالج نے تصویر کشی کی حوصلہ افزائی کی اور یوں جلد ہی وہ مصوری کی راہ پر چل نکلی۔ جیسے جیسے اس کا ہاتھ پختہ ہوتا گیا اور رنگوں کے انتخاب میں سلیقہ آتا گیا، ویسے ویسے ہی اس نے اپنے ذہن کو بے شعوری کی دھند اور پریشان واہموں کے جالوں سے پاک ہوتے محسوس کیا۔ اس کی تصاویر کے خاص موضوعات میں مذہبی واقعات اور فطرت کی عکاسی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے لیکن رنگوں کی بھڑک اور مسخ صورتوں سے اس کے اعصابی تناؤ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں بعض اوقات کسی خاص کیفیت کے زیرِ اثر وہ یوں محسوس کرتی گویا اس پر دورہ پڑ گیا ہے اور پھر —— وہ مسلسل تصویریں بناتی جاتی!

یہ تو پھر بھی ایک ذہنی مریضہ ہے اور اس کے فن نے ذہنی ہسپتال میں جنم لیا۔ نہ وہ پیشہ ور مصور تھی اور نہ مصوری کے اسلوب سے آگاہ —— بس لاشعور کی انگلی پکڑے اور ہاتھ میں برش تھامے چلتی گئی لیکن مشہور تجریدی مصور جیکسن پولک کی مثال اور نوع کی ہے۔ اسے تجریدیت کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے بالخصوص DRIPPAINTING اور کینوس پر رنگ انڈیلنے کی تکنیک میں تو اس کی حیثیت ایک پیش رو اور اولین تجربہ ساز کی ہے۔ جیکسن ۴۰-۱۹۳۹ء کے دوران نفسیاتی علاج کراتا رہا تھا۔ اس کا معالج ژونگ کے نظریات کا مقلد تھا۔ اس لئے وہ بطور علاج اس سے تصاویر بنواتا رہا چنانچہ دورانِ علاج جیکسن نے ۸۳ تصاویر بنائیں۔ بیشتر تصاویر رنگین ہیں اور ان کی علامات اس کی مخصوص ذہنی کیفیات کی غماز ہیں۔ علاج کے ابتدائی مہینوں کی تصاویر سے ذہنی انتشار اور اعصابی تناؤ کا احساس ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے وہ صحت کی طرف بڑھتا گیا اور اسے سکون حاصل ہوتا گیا اس کی تصاویر میں ہم آہنگی کی فضا بھی گہری ہوتی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں جب ان تصاویر میں سے ۷۵ تصاویر کی نمائش امریکہ میں ہوئی تو مصوری کے ساتھ ساتھ نفسیات کی دنیا میں بھی ایک دھماکا ثابت ہوئی۔ ان تصاویر نے جس بحث کو جنم دیا، اس میں مصوروں کے ساتھ ساتھ ماہرین نفسیات نے بھی حصہ لیا۔

اسی نوع کی ایک اور بہت اہم نفسی سرگزشت (کیس ہسٹری) ایچ ویسٹ مین کی کتاب "THE SPRINGS OF CREATIVITY" میں ملتی ہے۔ ویسٹ مین کا طریق کار بھی ژونگ کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اپنے موضوع کی وسعت کے لحاظ سے یہ کتاب بہت پُرمغز اور بصیرت افروز ہے۔ چنانچہ اس میں متذکرہ نفسی سرگزشت کے علاوہ عہد نامہ قدیم میں سے ہابیل اور قابیل، دخترانِ لوط، حضرت ابراہیم کی قربانی اور بنی اسرائیل کے طلائی بچھڑے ایسے موضوعات کی نفسیاتی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ اس ضمن میں اس نے مذہبی صحائف میں سے علامات اور نفسی معالجہ اور نفسیاتی پریشانیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے آج کے انسان کی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی مسائل کے تناظر میں عہد نامۂ قدیم کے انسان سے موازنہ کیا ہے اور یوں اس وسیع تناظر میں اس نے لاشعور کے تخلیقی سرچشموں کی تلاش کی ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ جون (فرضی نام) کی نفسی سرگزشت پر مشتمل ہے۔ جون نوجوان تھی اور ذہنی مریضہ بننے سے پہلے کمرشل آرٹسٹ کی تربیت حاصل کر رہی تھی۔ عام سا غریب گھرانا تھا اور گھر والے شریف اور ایماندار تھے۔ ادھر جون کی شخصیت دولخت ہو رہی تھی اور عدم توجہی کے باعث وہ مستقلاً پاگل بنتی جا رہی تھی حتیٰ کہ ایک دن وہ ذہنی ہسپتال آ پہنچی۔ مصوری سے جون کے لگاؤ کی بنا پر اس کے معالج نے تحلیل نفسی کے روایتی طریقہ کے برعکس مصوری پر زور دینا شروع کیا۔ شروع شروع میں تو اسے کچھ الجھن ہوئی لیکن بعد میں اس نے اس انداز کو بخوبی اپنا لیا۔ اس نے دو سال کے عرصۂ علاج میں بے شمار تصاویر بنائیں جن میں سے ۶۱ تصاویر کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں سے صرف چار رنگین ہیں۔ بقیہ تمام پنسل اسکیچ ہیں۔ اس طریقۂ علاج سے جون کو بہت فائدہ ہوا اور وہ ایک نارمل لڑکی کی مانند زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئی۔ اس کی تصاویر پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان کا محرک خوف و دہشت، نفرت و کراہت اور انتشار کے بھنور میں گھرے ذہن اور تناؤ سے ٹوٹتے اعصاب ہیں۔ تصویروں میں چہرے مسخ ہیں، اعضاء کا تناسب غیر متوازن ہے۔ چہروں پر ناخوشگوار تاثرات ہیں۔ یہ سب کنبہ

کے افراد ہیں کہیں والدین اور بھائی کی ایک ہی تصویر ہے تو کبھی تمام افراد کا یوں جمگھٹا گویا یہ سب بھنور میں گردش کر رہے ہیں۔ بعض چہروں پہ استہزا ہے تو بعض پر وحشت و دہشت۔ بعض کراہت سے بل کھاتے محسوس ہوتے ہیں تو بعض کو دیکھ کر خود کراہت کا احساس ابھرتا ہے۔ کچھ چہرے ہانٹڈ ہیں تو کچھ ہانٹ کرتے ہیں جبکہ بعض اپنی نفرت کے الاؤ پر جلتے بل کھاتے محسوس ہوتے ہیں۔ الغرض یہ چہرے آسیب زدوں کی سمفنی ہیں۔

اس نفسی سرگزشت کا تعارف کراتے ہوئے سر ہربرٹ ریڈ نے اس خیال افروز نظریہ کا اظہار کیا ہے:

"مصوری کی تاریخ کے مطالعہ سے اور بالخصوص آج کے دورِ انتشار میں مصوری اور اس سے وابستہ کارکردگی کا جائزہ لینے پر میں تو اس امر کا قائل ہوں کہ مصوری اور سماجی انحطاط میں گہرا رابطہ ہے۔ چنانچہ خارج کی دنیا سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے صرف مصوری ہی ایک ایسا ذریعہ ثابت ہوتی ہے جسے انسانی سائیکی بروئے کار لاتی ہے۔ اس سے میری یہ مراد ہے کہ مصوری کے ذریعہ (اور کسی حد تک مصوری کی تحسین سے بھی) فرد کی روح میں برپا حشر کو کم کر کے اس کے ذہن اور احساسات میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح خارج بینی[۵۱] اور دروں بینی[۵۲] پر مبنی محسوسات میں بھی اعتدال پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یوں تحسین، جمال اور پرستش جمیل کے مشترک مقاصد معاشرے میں انتشار کو وحدت اور منافرت کو یگانگت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منزل کا یہ تصور قدرے مبہم ہے۔ لیکن مصوری کی معالجاتی اہمیت سے انکار ممکن نہیں بلکہ تعجب تو اس پہ ہے کہ نفسی چارہ گروں نے اب تک مصوری سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کیوں نہ کی؟"[۵۳]

جون کی نفسی سرگزشت سے مصوری کے معالجاتی پہلو کے بارے میں سر ہربرٹ ریڈ نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے۔

"جہاں تک پیشہ ور مصوروں کا تعلق ہے تو یقیناً یہ بات باور کرنے کی ہے کہ تاثرانگیزی کے لئے وہ شعوری کاوش سے بھی کام لیتے ہوں گے لیکن جہاں تک جون کے اس کیس کا تعلق ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان تصاویر کی تنظیم اور توانائی کا منبع لاشعور کا ہیئت ساز اصول ہی ہو سکتا ہے۔"[۵۴]

(۳)

اردو میں نفسیات پر سائنٹفک کتابیں یا اوریجنل ریسرچ کی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پھر نفسی معالجین بھی نہیں اس لئے نفسی سرگزشتیں بھی عنقا ہیں اس لئے اتفاقاً اگر اس نوع کی تحریر ہاتھ آ جائے تو اس کی اہمیت مسلّم!

میجر رفیع الزماں خاں، ثریا حسین اور شیر محمد اختر کی ادارت میں لاہور سے ۱۹۵۰ء میں رسالہ "نفسیاتی جائزے" کا اجرا ہوا جس کے پہلے شمارے میں رفیع الزماں خاں کے مضمون "جنون اور ذہنی تخلیق" میں ابن مریم کی نفسی سرگزشت دی گئی ہے۔ ابنِ مریم کیونکہ ہمارے اپنے ماحول اور کلچر کا ہے۔ اس لئے اس نفسی سرگزشت کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی! اس سے جہاں تخلیق اور جنون کا رشتہ اجاگر ہوتا ہے وہاں عام عقیدہ کے برعکس یہ بھی عیاں ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ مغرب ہی میں نہیں ہے بلکہ ہمارے ہاں بھی ذہنی جنون اور اس سے وابستہ جملہ اعمال و افعال ملتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں ان کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا بلکہ سرے سے ان کی اہمیت اور ضرورت بھی تسلیم نہیں کی جاتی۔

ذیل میں متذکرہ مضمون سے متعلقہ اقتباسات پیش ہیں:

"ابنِ مریم ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۴۰ء گورنمنٹ کالج سے ایم اے کیا۔۔۔۔ ابن مریم بہت دیر سے داخلی کیفیات میں محو تھا جو

---

۵۱ EXTRA VERSION

۵۲ INTEROVERSION

۵۳ H. WESTMAN. "THE SPRINGS OF CREATIVITY" P-169.

۵۴ ایضاً ص ۱۷۰

بڑھتے بڑھتے اس کے لئے ایک بہت ہی سنجیدہ مسئلہ بن گیا۔ آخر اس نے ۱۹۳۸ء میں تحلیلِ نفسی میں پناہ لینے کی ٹھان لی۔ یہ تجربہ ۱۹۳۹ء تک جاری رہا۔ ممکن ہے، آزاد تلازم خیالات سے اسے کچھ آسودگی حاصل ہوئی ہو۔ اس کے معالج نے خدا جانے کیونکر کہہ دیا کہ اب اس کے ذہنی مسائل حل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اس کی ذہنی کشمکش اب بھی جاری تھی۔ اس سرٹیفکیٹ کے بعد وہ چین چلا گیا۔ ریسرچ کے دوران[۲] میں اس کی داخلی کشاکش نے زور پکڑا اور فروری ۱۹۴۷ء میں وہ شنگھائی کے ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ وہاں وی آنا کے ڈاکٹر نے "SCHIZOPHERNIA" تشخیص کیا۔ اس کے خیال میں مرض شدید صورت اختیار کر گیا تھا لہٰذا اس نے INSULIN SHOCKS دینے شروع کر دیئے۔ وہاں سے اسے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ابنِ مریم نے اپنے پرانے معالج کی طرف رجوع کیا اور تحلیلِ نفسی میں دوبارہ پناہ لی۔ ۱۹۴۸ء تک یہ سلسلہ قائم رہا اور اس دفعہ کچھ عرصہ کے بعد علاج چھوڑ دیا گیا۔ ناچار ابنِ مریم کو ۱۹۴۹ء میں لاہور ہسپتال میں داخل ہونا پڑا جہاں اس پر ELECTRIC THERAPY (علاج بذریعہ بجلی) آزمایا گیا..... ابنِ مریم کو بعض ایسے ذہنی تجربات سے دوچار ہونا پڑا جو مخفی قسم کے تھے اور جن کی نوعیت، اس کے خیال میں، ابھی سائنس متعین نہیں کر سکی۔ اسے بیماری کے دوران میں آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ یہ آوازیں اس کی کتاب "BREATH OF EARLY DAWN" میں موجود ہیں اور دوسری کتاب "IN QUEST OF SPRING TIME" میں بھی اس قسم کا بہت مواد موجود ہے۔ اس کے علاوہ اسے بہت سی شکلیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

ابنِ مریم کی تمام ادبی زندگی جو کئی سالوں پر پھیلی ہے، ۵۰۰ صفحات میں سمٹ جاتی ہے۔ اس عارضہ کے تین مہینوں میں اس کی تخلیقی توانائی انتہا پر تھی۔ ان تین مہینوں میں اس نے ہمیں تقریباً ۱۵۰ صفحات ادبی جواہر ریزوں کے دیئے ہیں۔ زندگی کی تخلیقی تحریک سے جب قیود اٹھتی ہیں تو وہ جس طرف بھی رخ پھیر لیتی ہے۔ اس فعل کو فوق البشر قوت مہیا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ابنِ مریم نے ان تین مہینوں میں ہمیں کافی مواد دے دیا ہے۔ ابنِ مریم کی دوسری کتاب "تلاشِ بہاراں" "IN QUEST OF SPRING TIME" میں سے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں:

(۱) محبت کے نغمے بہترین انقلابی گیت ہیں

(۲) کاش زندگی تمہاری ملاقات کے لئے دو چار لمحے دے سکتی۔

(۳) جو اپنے پر بیتیں وہی شعر یاد رہتے ہیں

(۴) نگاہیں اب بھی تمہاری راہ تکتی ہیں

(۵) تمہیں پاؤں تو دنیا کو بدل دوں

(۶) فن برائے فن بھی افادیت سے عاری نہیں

(۷) مجھے جلا کر وہ سرد ہو گئی

(۸) میرے سینے کا گداز تمہارا ہے لیکن مجھے وصال کے درد میں نہ الجھاؤ اوروں کو ہارا ہا بھٹکنا پسند نہیں

(۹) میں تاج محل میں دفن ہوں۔ مجھے باہر کی فضا گوارا نہیں

(۱۰) فطرت کے دل میں درد ہے

(۱۱) خزاں کے ساتھ تم گئیں خزاں کے ساتھ لوٹ بھی آؤ۔

(۱۲) چین کے پھول ہند میں نہیں کھلتے

---

[۲] ابنِ مریم نے اپنے ایک مضمون "ادبی سوت" میں اپنے اس علاج کے بارے میں یوں لکھا:
"تجزیہ نفس کے دو سال جن میں جذباتی کیفیتوں کے طوفان اٹھتے رہے اور اپنی روح کی حیران کر دینے والی خلوتوں سے آشنائی ہوئی۔" (ہمایوں، اگست ۱۹۴۳ء)

(۱۳) دلہن کی خوشبو ہونٹوں کی مٹھاس اب کسی اور کے ہیں"

ابنِ مریم کی دونوں کتابیں میرے سامنے نہیں ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اور کیا کچھ کہا لیکن ان مصرعوں سے کیا کچھ واضح نہیں ہو جاتا۔

"دیوارِ چین" کے عنوان سے ایک نظم درج ہے:

طویل دیوار
بے انتہا طویل
دیوار کے پرے میرا گھر ہے
کاؤلیاں کے دانے بھر گئے
سویابین کے پودے مہکنے لگے
ہر طرف کھیت گویا سونے سے لد گئے
تباہی و بربادی عورتوں کی بے حرمتی
کوئی سہہ نہ سکا
میں سہہ نہ سکا
وطن کو خیرباد کہہ آیا
میرے سارے عزیز بکھر گئے
میرے ماں باپ کو موت نے آلیا[۵۲]

آویزش

ابنِ مریم نے "زندگی" کے عنوان سے جو مختصر نظم لکھی وہ آج کی نثری نظم کی پیش رو محسوس ہوتی ہے:

"سحر
کائنات کے راز کا
اور نا تمام تلاش
ارضی کاہشیں
قہقہے
آنسو
اور ختم نہ ہونے والی نیند"[۵۳]

نثری نظم سے مشابہ ایک اور تحریر "محبت گرم گرم آنسو محبت سرد سرد آہیں" بھی ہمایوں (مارچ ۱۹۳۸ء) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ابنِ مریم کے فن کے مزید نمونوں کے لئے ملاحظہ ہوں:

ا۔ "ادبی موت" مطبوعہ ہمایوں، اگست ۱۹۴۳ء

ب۔ "خالہ اماں" مطبوعہ ہمایوں، اپریل ۱۹۳۵ء (اس میں ماں سے وابستگی کا نفسیاتی پس منظر تلاش کیا جا سکتا ہے ماں کا نام مریم تھا)

ج۔ "خالہ زاد بہن" مطبوعہ ہمایوں جون ۱۹۳۵ء

"ادبی موت" میں اس نے جس انداز سے اپنا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔ وہ قابلِ توجہ ہے:

"عرصہ ہوا میں نے حسن و عشق کی دو چار کہانیاں لکھی تھیں۔ ان کی تخلیق و اشاعت دونوں میں لطف تھا اور اس خیال سے کہ میری کہانیاں پڑھ کر بہت سے مردوں اور عورتوں کے دل کی دھڑکن ذرا تیز ہو جاتی ہو گی اور جانے بہچانے بغیر مجھے تھوڑا بہت چاہنے لگے ہوں گے، نشہ سا چھا جاتا ہے۔ سالہا سال سے میرے ذہن پر گویا موت طاری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میری زندگی نئے تجربوں سے محروم ہو گئی ہو۔ ان گنت، بے پناہ صدمے، شخصیت کا درہم برہم ہو جانا، تجزیۂ نفس کے دو سال جن میں ہیجانی کیفیتوں کے طوفان اٹھتے رہے اور اپنی روح کی حیران کر دینے والی خلوتوں سے آشنائی ہوئی۔ اوشا کی محبت پہلے دبی دبی، کچھ دنوں کے لئے سرخ آندھی کی طرح تند و تیز اور پھر جان بوجھ کر اسے ہاتھوں سے کھو دینا اس لئے کہ اوشا کی بھلائی اسی میں تھی، اور ایسی ہی بہت سی باتیں ہیں جنھوں نے میری نگاہ اور میرے جذبات میں بے اندازہ وسعت اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ نظروں کے سامنے بہت کچھ ہے مگر لفظوں میں اس کی تصویر

---

۵۲ "نفسیاتی جائزے" شمارہ I ۔ ۱۹۵۰ء

نہیں اترتی اور بھولے سے کوئی نقش بن جائے تو وہ اپنی زندگی کا اس قدر پھیکا اور نا تمام عکس نظر آتا ہے کہ اپنے آپ سے ترس آنے لگتی ہے۔"[51]

افسوس! تلاش بسیار کے باوجود ابن مریم کے بارے میں نہ تو ذاتی زیست کی مزید معلومات حاصل ہو سکیں اور نہ ہی اس کی محولہ بالا کتاب میں "ہمایوں" کے پرانے فائلوں سے جو چند تحریریں دستیاب ہو سکیں وہ اس کی الجھی ہوئی شخصیت کی تخلیقی فعالیت پر نا کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

اگر اس انداز کی مزید نفسی سرگزشتیں دریافت ہو سکیں تو اردو میں نفسیاتی تنقید کو سمجھنے کے لئے مثالوں کی تلاش میں مغرب کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے۔

(۴)

جہاں تک لاشعور کی تخلیقی فعالیت کی صراحت کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ ان اہل قلم کی کمی نہیں ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات اور ان سے وابستہ اعمال کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مختلف زمانوں اور زبانوں میں لکھنے والوں کا اس امر پر اتفاق بھی رہا ہے کہ یہ سب کچھ سمجھنے اور سمجھانے کا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ انھوں نے وقت تخلیق خود کو کسی اور ہی عالم میں پایا ہو بقول ایڈمنڈ برگلر:

"فن کار کے نہاں خانوں میں جو کچھ بھی صورت پذیر ہوتا ہے وہ شعور کا نہیں لاشعور کا عطیہ ہوتا ہے اور لکھنے والا ان دیکھی قوتوں کی راہنمائی میں "صریر خامہ" کو "نوائے سروش" سمجھ لیتا ہے۔ اس ضمن میں زیادہ سوجھ بوجھ رکھنے والے اہل قلم تخلیقی عمل کو بالعموم دو مدارج میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک تو باطن سے اچانک ہی کسی خیال کا ظہور اور دوسرے اس خیال کی مناسب صورت پذیری۔ ان میں سے اول الذکر (اسے الہام، وجدان یا عطیۂ ربانی کسی نام سے ہی کیوں نہ موسوم کریں) کا ظہور فن کار کی شعوری کاوش سے آزاد اور خود مختار ہوتا ہے جبکہ موخر الذکر کاوش بلکہ شدید کاوش سے عبارت ہے کیونکہ فن کار نے جو کچھ لاشعور کے ذریعہ سے حاصل کیا اس کی نشوونما اور اسے ایک مخصوص روپ بخشنے کے لئے اپنی تمام مہارت اور تجربہ کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ فن کار کیونکہ اپنے بنیادی تخلیقی عمل پر کسی طرح کا قابو نہیں رکھتا اس لئے وہ اس کے بارے میں کسی طرح کی وضاحت کرنے سے بھی قاصر ہوتا ہے وہ تو بس یہ کر سکتا ہے کہ اس حالت کو بیان کردے جس میں اس پر الہام ہوا یا پھر وہ دوسرے درجے کی وضاحت کر سکتا ہے کہ کیسے اس نے اس خیال کے لئے مناسب پیکر تلاش کیا۔ المختصر فن کار اس ضمن میں ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے لیکن وہ اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں کچھ نہیں سمجھا سکتا۔"[52]

ارنسٹ کرس نے بھی اپنے مقالہ بعنوان "ARPROACHES TO ART" میں اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"جہاں تک تحلیل نفسی پر مبنی مشاہدات کا تعلق ہے تو ان سے اس پیچیدہ مسئلہ پر کسی طرح کی بھی روشنی نہیں پڑتی کہ بعض افراد میں فنون لطیفہ کی ذہنی صلاحیتیں کیوں ہوتی ہیں جبکہ بعض میں مخصوص نوع کی ہنرمندی ملتی ہے یا یہ کہ بحیثیت مجموعی تخلیقی کاوشیں کیسے ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان سے وابستہ کارگزاریوں کے مدارج کی تفہیم کے ضمن میں تحلیل نفسی بلا واسطہ طور سے کسی قسم کی بھی امداد نہیں کر سکتی۔ یہ تو صرف اس سوال کا جزوی جواب مہیا کر سکتی ہے کہ ایک فرد نے کیوں فنون لطیفہ کو بطور پیشہ اپنایا یا اس سے خصوصی شغف کا کیوں اظہار کیا؟"[53]

ان ماہرین کے ان اعترافات کا یہ مطلب نہیں کہ تحلیل نفسی، ادب یا فنون لطیفہ کے خالقوں کے بارے میں کسی طرح سے بھی کچھ نہیں بتا سکتی اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ تحلیل نفسی کی کچھ حدود ہیں جن سے باہر صرف تخمینوں سے ہی کام لیا جا سکتا ہے لیکن اسے سائنسی صداقت نہ تسلیم

---

[51] ہمایوں اگست ۱۹۴۴ء

[52] "THE WRITER AND PSYCHOANALYSIS" P.2-3

[53] "SANDOR LONARD (ED.) "PSYCHOANALYSIS TODAY" P 357

کیا جائے۔ ایک شخص لکھتا ہے اور دوسرا کیوں نہیں؟ اس کا صحیح جواب لکھنے والے اور نہ لکھنے والے کی سائیکی کے نہاں خانوں میں مستور ہے۔ جہاں تک تحلیل نفسی کی بلا واسطہ رسائی نہیں۔ گو ذہن اس کے اعمال اور لاشعور کی فعالیت کو خوابوں اور ان کی علامات کے ذریعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہر فرد کے لئے جداگانہ ہے اس لئے نتائج کو عالمی اصول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اس ضمن میں چند راہنما صوبوں سے کام لیا جا سکتا ہے لیکن انھیں بھی ہر لکھنے والے پر منطبق نہیں کیا جا سکتا اور یہی لئے تحلیل نفسی نے اس ضمن میں دو ٹوک دعویٰ نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تحلیل نفسی دیگر امور میں بھی بے بس ثابت ہوئی ہے، ایسا نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تخلیقی عمل سے وابستہ بعض امور کے سلسلے میں تحلیل نفسی نے کارآمد تجزیے پیش کئے ہیں۔ اس ضمن میں شاعرانہ وجدان کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

قدیم یونانی فلاسفروں سے لے کر عربی، فارسی اور اردو کی شعری روایات میں شاعر کی اعلیٰ ترین تخلیقی کاوشوں کو ہمیشہ "اوپر" سے منسوب کرتے ہوئے اس کی وضاحت کے لئے الہام اور وجدان جیسے الفاظ وضع کئے گئے۔ یونانیوں کے لئے یہ MUSE کا کام تھا۔ مشرقی انتقاد میں شاعر "تلمیذ الرحمٰن" تھا جبکہ غالب نے واضح طور پر کہہ دیا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

افلاطون نے اس خیال کا اظہار ION میں کیا:

"تم میں جو خصوصیت ودیعت کی گئی ہے وہ ہنرمندی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں کہہ رہا تھا یہ الہام ہے، ایک ربانی قوت ہے جو تمہیں متحرک کرتی ہے..... سب سے پہلے فن کی دیوی (MUSE) خود لوگوں کو الہام کے زیر اثر لاتی ہے اور پھر ان لوگوں سے متاثر ہونے والوں کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے، مگر یہ سب اسی سے الہام حاصل کرتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے تمام شعراء خواہ وہ رزمیہ کہتے ہوں یا غنائیہ اپنی خوبصورت نظموں کی تخلیق فنی ہنرمندی سے نہیں کرتے بلکہ اس لئے کہ وہ میوز کے مسحور کردہ اور الہام کے زیر اثر ہوتے ہیں۔"

معاشرہ شاعر (یا دیگر تخلیق کاروں) سے جو متاثر ہوتا ہے یا ان کی بوالعجبیوں اور بعض صورتوں میں تو بدنا رملٹی یا اخلاق باختگی کو گوارا کرتا ہے تو اس کی ایک وجہ وجدانی اور الہامی صلاحیتوں کی بنا پر انھیں کسی حد تک اپنے مقابلہ میں "مافوق الفطرت" سمجھنے کا رجحان بھی ہے۔ ارنسٹ کرس نے محولہ بالا مقالہ میں (ص ۳۶۲) بیان کیا ہے اور بعض مشہور فن کاروں تے اپنے DELUSIONS میں یہ دعوے کئے کہ ان کی تخلیقات بھی خدا کی تخلیقات کی مانند ہیں جبکہ ایک کا یہ خیال تھا کہ اس کی تخلیقی صلاحیتوں سے جل کر تمام عمر دیوتا اس کے پیچھے پڑے رہے۔ ان شاعروں کے حوالے سے ارنسٹ کرس نے بھی تخلیقات سے وابستہ لاشعوری محرکات کی اہمیت تسلیم کی ہے بلکہ وہ تو اس حد تک جاتا ہے:

"قدیم فن کاروں کے بارے میں اساطیری قصص یا روایات کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں جس نفسیاتی عمل کی نشاندہی کی گئی ہے اس کا آج کے فن کار کے ذہن میں جنم لینے والے نفسیاتی عمل سے گہرا رابطہ ہے۔ اس عمل کا لاشعوری رجحانات کی روشنی میں مطالعہ کرنے پر یہ رابطہ اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔" (ص: ۳۶۲)

قدیم دور میں شاعروں سے جو اساطیری روایات وابستہ ملتی ہیں ان کی رو سے شاعری عطیۂ ربانی قرار پاتی ہے اس لئے عام افراد کے مقابلہ میں شاعر کی بصیرت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ عام لوگوں کے مقابلہ میں مستقبل کے بارے میں —— شاعرانہ سطح پر —— محسوس بھی کر سکتا ہے۔ اس میں شدت احساس ہے —— اور یہ سب کچھ وہ شاعرانہ وجدان یا الہام سے حاصل کرتا ہے۔ اس ضمن میں ارنسٹ کرس نے خاصا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے سو اس کے بقول:

"لفظ الہام (INSPIRATION) کے جدید استعمال میں ان مقبول عام تصورات کے علاوہ فن کار کے تجربات سے وابستہ پیچیدہ نفسیاتی

اعمال بھی شامل ہیں...... فن کار بالعموم اپنے خیالات و تصورات کو خارج کا عکس محسوس کرتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے گویا خارج سے ایک خیال آیا اور آ کر اس پر مسلط ہو گیا چنانچہ تمام ادوار کے شعراء اور دیگر فن کاروں نے مشاہدۂ ذات سے جب اس عمل کی وضاحت کی تو اس میں اپنے مفعول کردار پر بطورِ خاص زور دیتے ہوئے اس عمل سے وابستہ کرب و نشاط کو بطورِ خاص اجاگر کیا۔"

الہام یا وجدان کا نفسیاتی تجزیہ کرنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کیفیت دو طرح سے وجود میں آتی ہے یا تو بالکل ہی، اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر کوئی اچھوتا خیال اور نیا تصور ذہن میں در آتا ہے —— اسے بالعموم بجلی کی چمک سے تشبیہ دی گئی ہے جیسے اندھیری رات میں بجلی کی چمک مسافر کو گرد و پیش دکھا دیتی ہے، اسی طرح ذہن کا نہاں خانہ ایک لمحہ کے لئے جیسے ایک خیال کی جوت سے دمک اٹھتا ہے۔ صوفی، شاعر، فن کار حتیٰ کہ سائنس داں سبھی اس چمک سے واقف ہیں بعض شاہکار تخلیقات، سائنسی ایجادات اور فلسفیانہ تصورات اسی کے مرہونِ منت ہیں۔

اس کے علاوہ بھی ایک اور صورت ملتی ہے اور یہ نسبتاً عام بھی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ ایک ایسا وقوعہ ہے جس سے غیر تخلیقی ذہن والے بھی آگاہ ہیں۔ اسے نفسیات میں "باثمر فکر" (PRODUCTIVE THINKING) سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور اسے وجدان سے نچلے درجہ پر رکھا جاتا ہے لمبی چوڑی تفصیلات میں جائے بغیر عام زندگی میں اسے بھولا ہوا نام یا چہرہ یاد کرنے یا اس نوع کی دیگر مثالوں سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات خواب و بیداری کی درمیانی منزل میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بھولی یاد ذہن میں سرک آتی ہے یا کوئی نیا خیال ذہن کو جگمگا جاتا ہے۔ بیشتر لکھنے والے اور فن کار اس نوع کے وجدان سے ناواقف نہیں۔ تحلیلِ نفسی کی روشنی میں یہ EGO کے کنٹرول کی ایسی حالت ہے جس میں لاشعوری مواد کا بآسانی حصول ممکن ہے اور فرائڈ کے الفاظ میں یوں لاشعور قبل شعور کی سطح تک ابھر آتا ہے جس کے نتیجہ میں خیالات و تصورات کا تانتا سا بندھ جاتا ہے چنانچہ اس نوع کے وجدان کی وضاحت میں ارنسٹ کرس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وجدان کی حالت میں جب فن کار مائل تخلیق ہوتا ہے تو وہ اور اس کی تخلیق "من تو شدی تو من شدم" کے عالم میں ہوتے ہیں۔ اس عمل کے اختتام پر جب وہ اپنی تخلیق کا پہلی مرتبہ مشاہدہ کرتا ہے تو اس وقت وہ اس کے داخلی عمل کا ایک حصہ نہیں ہوتی بلکہ اب وہ خارج سے اس کا مطالعہ کرتا ہے اور یوں اپنی تخلیق کے اولین سامع یا ناظر کے روپ میں وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس نے اس عالمِ وجدان میں جو کچھ "سنا" وہ کیا تھا۔

فن کا مقصد ابلاغ ہے خواہ یہ شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔ نفسیاتی لحاظ سے ارنسٹ کرس نے اس کے دو مدارج مقرر کئے ہیں۔ پہلا بالکل لاشعوری ہے یعنی خود فن کار کو بھی اس کا شعور نہیں ہوتا۔ اس میں ID کا EGO تک ابلاغ ہوتا ہے جبکہ دوسرے درجہ میں متنوع نفسی واردات کا مجموعہ یعنی تخلیق دوسروں کے لئے ابلاغ کا باعث بنتی ہے۔ اس مسئلہ پر مزید تفصیلات کے لئے ارنسٹ کرس کی اس تالیف سے رجوع کیا جا سکتا ہے:

"PSYCHOANALYTIC EXPLORATIONS IN ART"

کیا انشائیہ ایک سنجیدہ صنفِ ادب ہے؟

مشکور حسین یاد

یوں ہم ادب کے بارے میں خواہ کسی قسم کے نظریات قائم کرتے رہیں، ادب کی بنیادی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن اگر سنجیدگی کو ادب سے علیحدہ کرلیں تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ ادب اور سنجیدگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سنجیدگی کے بغیر تو ادب معرضِ وجود میں "آ" ہی نہیں سکتا۔ ادب کی جان سنجیدگی ہے اور سنجیدگی کی جان ادب۔ گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ٹھہرے ـــ ایک دیب غیر سنجیدہ بھی ہونا چاہے تو کم از کم تخلیقِ ادب کے دوران میں غیر سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔ یہ الگ بحث ہے کہ کسی مسئلہ کے نئے پہلو کی دریافت کے ضمن میں ہمیں کوئی بات جدّت اور نئے پن کی وجہ سے غیر سنجیدہ نظر آنے لگے کیونکہ پرانی راہ پر چلتے چلتے یکایک نئی راہ پر قدم رکھے جائیں تو آدمی لمحے بھر کے لئے ٹھٹکتا ضرور ہے ویسے بھی سنجیدگی کوئی جامد چیز نہیں۔ یہ تو تخلیقِ معانی در تحفظِ معانی کا دوسرا نام ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ سنجیدگی کی بدولت ہم پہلے سے موجود معانی کو سنبھالتے ہی نہیں، نئے نئے معانی تخلیق بھی کرتے ہیں ـــ چنانچہ اس حقیقت کے پیشِ نظر ہمارا یہ سوال بے معنیٰ ہو جاتا ہے کہ کیا انشائیہ ایک سنجیدہ صنفِ ادب ہے؟

دراصل میں نے یہ سوال اس لئے اٹھایا ہے کہ اب ہمارے عام قاری ہی نہیں، نقد لکھنے والے بھی انشائیہ کو ایک غیر سنجیدہ صنفِ ادب سمجھنے لگے ہیں ـــ ویسے تو اس سوال کا جواب دینے سے قبل یہاں یہ سوال بھی اُٹھایا جا سکتا ہے کہ ابھی انشائیہ کو اردو میں جنم لئے کتنی مدت گزری ہے جو اس صنف کو غیر سنجیدہ کہنا شروع کر دیا ـــ پہلے کافی تعداد میں انشائیے لکھے جاتے اور پھر جب ہم دیکھتے کہ کام کے انشائیے نہیں لکھے جا رہے ہیں یا ان انشائیوں میں ادب بننے کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی، تب تو خیر اس طرح کی بات کرنے کا کوئی جواز بھی نکلتا تھا۔ لیکن ابھی انشائیہ نے اردو میں پوری طرح جنم بھی نہیں لیا۔ باقاعدہ انشائیہ لکھنے والوں کی تعداد ایک دو سے زیادہ نہیں، دو کی بات بھی میں نے انکسار میں کہی ہے۔ باقی جو لکھنے والے کبھی کبھار انشائیہ لکھتے ہیں اُن کے یہاں کبھی کبھار میں بھی باقاعدگی نہیں۔ ایسی صورتِ حال میں کسی صنفِ ادب کے بارے میں کوئی حکم لگانا درست معلوم نہیں ہوتا ـــ لیکن ذرا ٹھہریئے ہم اس طرح بھی تو سوچ سکتے ہیں کہ چونکہ کام کے انشائیے نہیں لکھے جا رہے ہیں اس لئے قارئین اور خصوصیت کے ساتھ معتبر قارئین حق بجانب ہیں اگر وہ اس صنف کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ اردو میں جن حضرات نے بزعمِ خود انشائیہ کی سرپرستی فرمائی، اول تو اُن سے کام کے انشائیے تخلیق نہ ہو سکے۔ دوسرے انھوں نے انشائیہ کی تعریف کے ضمن میں ایسی ایسی مضحکہ خیز باتیں کہہ ڈالیں جنھیں سُن کر صاحبانِ فہم نے اس صنف کو اپنی توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ اب آپ ہی غور فرمایئے، جن افراد کی نظر میں مرغا بن کر دو ٹانگوں کے درمیان سے کسی منظر کو دیکھنا انشائیہ ہے وہ اپنے قارئین کو اس صنفِ ادب کا احترام کرنا کیوں کر سکھا سکتے ہیں ـــ مجھے انشائیہ کی ایسی مضحکہ خیز تعریف کرنے والوں کی نیت پر ہرگز ہرگز شک نہیں۔ وہ یقیناً ذہنی استعداد کے مطابق خلوص کے ساتھ انشائیہ کی تعریف کرنا چاہتے ہوں گے ـــ "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست" ایسے مقولے کی صداقت اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہے ـــ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو انشائیہ ایسے افراد نے اپنے سایۂ عاطفت میں لینے کی سعی فرمائی جو صحیح معنوں میں اس کے

بل نہ تھے ـــــ مگر اس تلخ حقیقت کے باوجود سے تنگ نظری اور کم ظرفی خیال کروں گا، گر ان افراد کو انشائیہ نگار نہ مانوں۔ آخر یہ صاحبان انشائیے کا نام لے کر کچھ نہ کچھ لکھتے تو ہیں۔ مجھے ان حضرات کے اسمائے گرامی لینے میں کوئی باک نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ صاحبان ہر وقت گالی دینے اور گالی کھانے کے موڈ میں رہتے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ انھیں نہ سلیقے سے گالی دینا آتا ہے اور نہ گالی کھانا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نہ شائستہ انداز میں اختلاف رائے کر سکتے ہیں، ورنہ اختلاف رائے کو ٹھنڈے دل سے سننے کی ان میں ہمت ہے ـــــ مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی اس کم ہمتی سے صنفِ انشائیہ کو براہ راست نقصان پہنچ رہا ہے ـــــ ثقہ قسم کے لوگ اس صنف کے بارے میں بات کرنے کو ضیاعِ وقت سمجھتے ہیں۔

سچ پوچھیے تو اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر لکھنے لکھانے والوں کی محفل میں انشائیے کا ذکر آتا بھی ہے تو اس انداز میں جسے سن کر سوائے کوفت کے، اور کچھ حاصل نہ ہو ـــــ فرض کیجیے محفل میں جان کر یا انجانے طور پر کسی کے منہ سے کوئی بے تکی بات نکل جاتی ہے تو فوراً کہا جاتا ہے "لو بھئی انشائیے کے لئے ایک موضوع ہاتھ آ گیا" اور اگر اس محفل میں کوئی ایسا صاحبِ قلم بھی موجود ہے جس نے کبھی کوئی انشائیہ بھی لکھا ہے تو تمام حاضرین کا رُخ اُس کی طرف ہو جاتا ہے اور سب ایک زبان ہو کر اُس سے کہتے ہیں "میاں! انشائیے کا مواد ہم نے اکٹھا کر دیا، بس اب جلدی سے ایک انشائیہ ہو جائے" ـــــ انشائیہ کو مزاحیہ مضمون کے ساتھ کیسے گڈمڈ کر دیا گیا؟ اس کی بنیادی وجوہات تو وہی ہیں جو میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ مزید ایک دو باتیں اور سن لیجیے۔ انشائیے کے ساتھ "ہلکے پھلکے" کی صفات نے بڑی غلط فہمی پیدا کی ہے ادھر انشائیے کے ہلکے پھلکے ہونے پر اس قدر اصرار کیا گیا کہ قاری کا ذہن انشائیے سے متعلق کسی بات کو بھی وزن دینے کے لئے رضامند نہ رہا۔ اسی طرح انشائیہ کے لئے دلچسپ اور شگفتہ ہونے پر بھی بہت زور دیا گیا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ایک قاری انشائیہ کی عبارت سے کسی سنجیدہ بات کی کیا توقع رکھ سکتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انشائیہ کو دلچسپ اور شگفتہ نہ ہونا چاہیئے یا دلچسپی اور شگفتگی انشائیے کے لئے کوئی بُری چیزیں ہیں۔ میرے عرض کرنے کا صرف اتنا سا مطلب ہے کہ انشائیے کے ضمن میں، ان اوصافِ ادب کا ضرورت سے زیادہ ذکر کیا گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں، انشائیہ ہی پر کیا موقوف ہے تمام ادبی تحریروں کو دلچسپ اور شگفتہ ہونا چاہیئے لیکن اگر آپ کسی خاص صنف کے بارے میں ان اوصافِ ادب کا حد سے زیادہ ذکر کریں گے تو یہی اوصاف اپنی لطافتیں کھو کر مضحکہ خیزی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسا کہ انشائیہ کے ضمن میں ہوا ہے۔ میری رائے میں انشائیہ نہ ہلکا ہوتا ہے نہ پھلکا۔ اسی طرح نہ اس انداز کا دلچسپ ہوتا ہے کہ آپ اُسے بچوں کی طرح پڑھنے بیٹھ جائیں۔ اور نہ اس طور کا شگفتہ کہ آپ گدگدیاں محسوس کرنے لگیں۔ انشائیہ پڑھ کر قہقہے لگانے کا تو خیر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ مزیدار بات یہ ہے کہ جن حضرات نے انشائیہ کے دلچسپ اور شگفتہ ہونے پر اس قدر زور دیا ہے خود اُن کی تحریریں اس قدر غیر دلچسپ اور بور ہوتی ہیں کہ انھیں پڑھتے ہوئے بار بار جماہیاں آنے لگتی ہیں۔

وہی بات کہ پانی نشیب میں مرتا ہے۔ ساری ذمہ داری انشائیہ کے نام نہاد علمبرداروں پر آ کر پڑتی ہے۔ مجھے ان بے چاروں پر رحم بھی آتا ہے اور غصہ بھی۔ رحم اس لئے کہ یہ غریب اردو میں اس صنفِ ادب کے موجد اور راہنما بننا چاہتے تھے لیکن نہ بن سکے۔ غصہ اس لئے کہ جب آپ میں ایک کام کی اہلیت ہی نہیں ہے تو اُس کی تعمیل کا بیڑا کیوں اٹھاتے ہیں۔ اچھا انشائیہ نہ لکھنا ایسی کوئی بری بات نہیں۔ کوشش کرتے رہیے کبھی اچھا انشائیہ لکھنے میں بھی کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن انشائیہ کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں کر کے اس صنفِ ادب کا جنازہ تو نہ نکالیے۔ انشائیہ کو نقصان پہنچانے میں ایک اور بات کا ہاتھ بھی ہے۔ اگرچہ وہ بات اپنی جگہ کوئی زیادہ اہم نہیں لیکن انشائیہ کو بہرحال اُس سے اچھا خاصا نقصان پہنچا ـــــ اور وہ بات ہے، انشائیہ کے اِن نام نہاد سرپرستوں کے خالی مغز ہونے کے باعث ان بے چاروں کے پاس انشائیہ کے لئے ڈھنگ کے موضوعات کا نہ ہونا چنانچہ انھوں نے، اور کچھ نہ سہی تو اردو کے افعال کو بطور موضوعات گنوانا شروع کر دیا۔ اور یوں انشائیہ نگاری کو اچھا خاصا ورزش بنا کر رکھ دیا۔ کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، اُٹھنا بیٹھنا، لیٹنا لوٹنا وغیرہم۔

آخر میں معزز قارئین ادب اور محترم اہلِ قلم حضرات کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ انشائیہ کو ایک غیر سنجیدہ صنفِ ادب ہرگز خیال نہ فرمائیں میں سمجھتا ہوں یہ صنفِ ادب تو تمام نثری اصنافِ ادب کی ماں ہے۔ میرا خیال ہے ہر زبان کی نثر کا اسی صنف سے آغاز ہوا ہے ـــــــ کہانی، افسانہ، ناول، داستان، مقالہ، مضمون سبھی اصنافِ ادب، انشائیہ کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ لکھنے والے کے ذہن میں، انشائیہ لکھتے وقت کوئی صنفِ ادب پیش نظر نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر میں صنفِ انشائیہ کو ادب کی امکانی صنف کا نام دیا کرتا ہوں۔ میرے خیال میں آئندہ بھی اگر کوئی صنف ادب وجود میں آئی تو وہ انشائیہ کے بطن ہی سے وجود میں آئے گی ـــــــ آپ اس وقت تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جائیے کہ فرانسیسی مون تین (MONTINE) ہی اس صنفِ ادب کا بانی تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے ہی سب سے پہلے اس صنف ادب کو ESSAY کا نام دیا اور اس کی تعریف متعین کی ـــــــ لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ یہ صنفِ ادب ہر زبان کی نثر کے آغاز کے ساتھ معرض وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس صنفِ ادب کا نام ESSAY کب اور کس نے رکھا۔ یاد رکھئے پیدائش پہلے عمل میں آتی ہے اور نام بعد میں رکھے جاتے ہیں۔

آخر میں ایک اور گزارش کرتا چلوں کہ ہمیں اس بات سے قطعی مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں کہ انشائیہ مغرب میں مر رہا ہے ـــــــ اول تو ایسی صورت حال قطعی نہیں۔ اگر بفرض محال ہو بھی تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مغرب میں انشائیہ مر رہا ہے تو سمجھ لیجئے وہاں ادب بھی مر رہا ہے ـــــــ انشائیہ کی موت ادب کی موت ہے ـــــــ ممکن ہے آپ میری یہ بات سن کر دل ہی دل میں مسکرائیں کہ میں اس صنف کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دے رہا ہوں لیکن جناب میں تو یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ انشائیہ کی موت شاعری کی موت کی خبر بھی دیتی ہے ـــــــ لیکن اس ضمن میں آپ میری کسی بات پر اس وقت تک کیسے یقین کر سکتے ہیں جب تک میں آپ کو کوئی کام کا انشائیہ نہ لکھ کر دکھاؤں۔ آپ کو اس صنفِ ادب کا قائل بھی اسی وقت ہونا چاہیئے جب اس کے لکھنے والے صحیح معنوں میں انشائیہ نگار کہلانے کے مستحق قرار پائیں ـــــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کو اس کے لئے تھوڑا سا انتظاد کرنا ہوگا۔

غالب — ہمارا معاصر

سعادت سعید

رومن رولاں نے ایک مرتبہ استفسار کیا تھا کہ "وہ شاعر کہاں ہے جو اس مقدس اینگویش (ANGUISH) کو منعکس کرے گا"۔ غالب کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ اس نے اپنے عہد کی مقدس اینگویش کو اپنی تخلیقات میں سمیٹتے ہوئے عہد آئندہ کی صورتِ حال کا بھی احاطہ کیا ہے۔ ہمارے عہد میں شاعری اور ادب کی تنقید میں "لمحہ موجود" کا معیار بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی جس ادبی یا فنی تخلیق میں حال کو ارتکازی حیثیت حاصل نہیں ہوتی وہ نئے نقادوں کے لئے بے کار اور بے معنی ٹھہرتی ہے۔ غالب کے ضمن میں اس معیار کو مسلمہ مانتے ہوئے یہی کہا جا سکتا کہ انیسویں صدی کے نصفِ اول میں مقید یہ شاعر جہاں تاریخ کی مخصوص مکانی حدود میں سرگرم عمل تھا وہاں اس کی مخصوص زمانی حدیں تا حال طے نہیں ہوئیں۔ غالب کا "حال" ابھی تک موجود ہے یعنی نجی ملکیت اور زرعی قزاقیت کے بطن سے طلوع ہونے والا حال! لباس کی ظاہری تراش میں رد و بدل رہائشی پناہ گاہوں میں نئی ترامیم، سواری کے تغیرات اور تجارتی طریق ہائے کار کی خارجی تبدیلیاں مخصوص سیاسی اور انتظامی ڈھانچے کے معاشی، ثقافتی اور سماجی قواعد کے زیرِ اثر زندگی گزارتے انسانوں کی فطرتوں کی قلبِ ماہیت سے قاصر ہیں۔ فطرتِ انسانی کی کایا کلپ سیاسی، انتظامی اور معاشی ڈھانچے کی کایا کلپ کے بغیر ممکن نہیں۔ نجی ملکیتیں اور زرعی اجارہ داریاں فرنگیوں کے عہد میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں۔ ان کردار ساز مشینوں میں سے مخصوص ڈیزائن اور مخصوص میٹریل ہی کا مال حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے 'مکانی حال' کی تبدیلی سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس کا زمانی حال بھی معدوم ہو گیا ہے۔ آج بھی شاہد گل باغ سے بازار میں آتا ہے اور ہوسِ زر بھی غارتگر ناموس ہے۔ آج بھی منعم کا غرور اور گدا کی بے کسی دیدنی ہے۔ آج بھی عورت محکوم ہے۔ محکومِ خاندان نہ سہی محکومِ زر تو ہے سونا کام عاشق کی حرماں نصیبی قائم ہے۔ آج بھی انسان ہر تیز چلنے والے کو راہبر سمجھنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ تھوڑی دور چل کر کسی اور کے پیچھے ہو لیتا ہے۔ آج بھی ایمان اور کفر کی جنگ جاری ہے۔ آج بھی معاشی پسماندگی اور سماجی جبر کا شور ہے۔ محکومیاں بھی ہیں اور محرومیاں بھی، جذبات کشی بھی ہے اور نطق پر قفل بھی! (اظہارِ صداقت استعاروں میں ہے اور تنقید اشاروں میں! تہذیب جنگل کا نمونہ ہے اور اخلاق لہو آشامی کا) کوتوال بھی وہی، دربان بھی وہی، ناصح بھی وہی اور زاہد بھی وہی، قاضی بھی وہی اور منصف بھی وہی۔ ظلم بھی وہی اور صبر بھی وہی کاغذی پیرہن بھی وہی اور داد رس بھی وہی، قفس بھی وہی، اور طائر بھی وہی، معابد بھی وہی اور زائر بھی وہی، بت سازی بھی وہی اور بت پرستی بھی وہی! غالب کا زمانی حال سے جدا نہیں اس لئے غالب ہمارا معاصر ہے۔ یہاں یہ بھی سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا غالب کے دیگر معاصر بھی ہمارے معاصر ہیں؟ اس کا بڑا ہی سادہ سا جواب یہ ہے کہ اس عہد کے جس بھی شاعر نے اپنی سماجی تنظیم، معاشی اور انتظامی ڈھانچے اور انسانی جذبوں کی تہہ داریوں اور بھول بھلیوں کی شاعرانہ ویژن کے وسیلے سے تفتیش کی ہے اور ان کے جوہر کی گہرائیاں ٹٹولی ہیں وہ ہمارا معاصر ہے۔ شاعری میں اگر لمحہ موجود کی صرف ظاہری صورتوں کی تفصیل منتقل کی جائے گی تو وہ وقتی اور ہنگامی اہمیت کی چیز تو ہو گی استقلال اور پائیداری سے بے بہرہ رہے گی۔ لمحہ موجود کی ظاہری صورتوں کی باطنیت پر گرفت ہی سے شاعر اپنے زمانی حال کو وسعت آشنا کر سکتا ہے۔ غالب وجود کے بحران کا شکار تھا۔ اس بحران

نے اسے ترکِ دنیا پر مائل نہیں کیا، اثباتِ ذات کا وقوف دیا۔ اثباتِ ذات کی بدولت وہ دنیاوی عذابوں سے آنکھیں چار کر پایا۔ دنیاوی عذابوں سے آنکھیں چار کرنے کے نتیجے میں حقیقتوں کے طلسمی دروازے کھلتے ہیں۔ اثباتِ ذات کے عمل کو اگر کوئی نقاد انانیت اور کبر و غرور کا مترادف جانے تو یہ اس کی مرضی، میرے لئے اثباتِ ذات کا معاملہ ٹکراؤ اور تصادم کا معاملہ ہے۔ ذات کش سماجی اداروں سے کھلا مجادلہ ہے۔ انیسویں صدی میں فرنگی تہذیب و سیاست کی یلغار اور موجود سماجی ادارے جس انداز سے فرد کشی کر رہے تھے۔ اس کا توڑ اعترافِ ذات ہی سے ممکن تھا۔ اعترافِ ذات 'ہونے' کی شناخت ہے اور جو شخص اپنے ہونے کی شناخت کر لیتا ہے۔ وہ "اس ہونے" کا محافظ بننے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اثباتِ ذات اپنے ہونے اور رہونے کی حفاظت کی متحدہ کاوش کا نام ہے سو غالب کی شاعری میں 'میں'، کا استعمال مصالحت پسند نقادوں کیلئے معیوب ہو تو ہو میں اسے انسانی ذات کے معنی کی تلاش اور اس کا جرأت مندانہ استحکام جانتا ہوں۔ غیر ملکی تسلط ہمیشہ فرد کی 'میں' کو کچلنے پر آمادہ رہتا ہے کہ اگر اس کی 'میں' کو برقرار رکھا جائے تو سیاسی اور انتظامی استحکام میں کمزوری پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ غالب کی شاعری میں 'میں' کی بلند آہنگی انانیتی نہیں وجودی ہے۔ پال ٹلچ نے درست لکھا ہے۔

> EXISTENTIALISM AS A UNIVERSAL ELEMENT IN ALL THINKING IS THE ATTEMPT OF MAN TO DESCRIBE HIS EXISTENCE AND ITS CONFLICTS AND THE ANTICIPATION OF OVERCOMING THEM. WHERE EVER MAN'S PRE-DICAMENT IS DESCRIBED EITHER THEOLOGICALLY OR PHILOSOPHICALLY, EITHER POETICALLY OR ARTISTICALLY, THERE WE HAVE EXISTENTIALIST ELEMENTS.
>
> EXISTENTIALIST ASPECTS OF MODERN ART
>
> (BY PAUL TILLICH)

یوں وجودیت، وجودیت کی تحریک سے منسلک افراد کی ملکیت نہیں رہتی۔ جو کوئی بھی اپنے وجود کی تشریح کرتا ہے اس کے متحارب اور متصادم رویوں کو پہچانتا ہے، ان پر قابو پانے کے لئے کوشاں ہے یا انسانی ماحول کے قیام کے لئے کشٹ اٹھاتا ہے اس کے افکار وجودی عناصر سے معمور ہوتے ہیں۔ غالب اسی تناظر میں ایک وجودی شاعر تھا۔ عمر بھر قیدِ تنہائی میں کلپنے والا، بے معنویت کی زنداں گردی کرنے والا اسیری میں بھی آتش زیرپا رہتا ہے اور یہی فکری و جذباتی جہت اسے میکانکی زندگی گزارنے سے باز رکھتی ہے۔ میکانکی ذہن کے لئے اسیری میں آتش زیرپا ہونے کا مسئلہ ناقابلِ فہم ہے کہ وہ تو فقط مطلق آزادی کے گیت گا سکتا ہے یا اسیروں کے حق میں ائر کنڈیشنڈ شراب خانوں میں بیٹھ کر دعا گو ہوتا ہے میکانکی ذہن اس مقدس ناراضگی (ANGUISH) کا نہ تو بوجھ برداشت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا فکری احاطہ کر پاتا ہے، جس کی بدولت زندگی انسان، سماج اور کائنات کے باہمی رشتوں کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ فرد اپنے انسان ہونے کی شناخت کرتا ہے۔ مفاد پرستوں کے نافذ کردہ جبر کی متنوع صورتوں کو گرفت میں لیتا ہے۔ غالب کا کہنا تھا کہ مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا ــــ داغِ دل کی آبپاشی کرنا اور پھر سروِ چراغاں کا تماشا دکھانا غالب کے حصے میں تو آ سکتا تھا میکانکی منہ تکتے ہی رہ گئے کہ بقول غالب:۔

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا　　آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

غالب کی شاعری مفاد پرستوں کے تعمیر کردہ برفانی قید خانوں کو زنجیرِ وجود کے حلقوں کی آتش سے پگھلا دیتی ہے۔ ہمارے عہد میں اگر میکانکیت کا کوئی حقیقی توڑ ہے تو وہ وجودیت ہی ہے۔ غالب نے وجود کو جوہر پر فوقیت دی اور قدیم مابعد الطبیعاتی اور غاصبانہ فرنگی نظام کو اعلانیہ تنقیدی آئینہ دکھایا:۔

مدعا در پردہ یعنی جو کہوں باطل سمجھ   وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر   نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
نہ سبحہ سے علاقہ نے ساغر سے واسطہ   میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے   نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے
ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا   وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
صفحۂ گردابِ جوہر کو بنا ڈالے تنور   عکس، گر طوفانی آئینہ دریا کرے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز   داغوں کا نظر آنا خود چشم نمائی ہے
شیخ جی کعبے کا جانا معلوم   آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
ہوتے ہیں بے قدر در کنجِ وطن صاحب دلاں   عزلتِ آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں
بے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے   صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر   کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے
جہاں زندانِ موجستانِ دلہائے پریشاں ہے   ہمہ شش جہت یک حلقۂ گردابِ طوفاں ہے
مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک   کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

غالب کے لئے انسان بجائے خود ایک محشرِ خیال تھا۔ اس کی شاعری میں انسانی ہستی کو مرکزیت حاصل ہے۔ یعنی کائنات انسان میں مدغم اور اسی کی چشمِ ہمہ جہت سے منعکس اور انسان بھی عمومی نہیں، اس کی 'میں' میں موجود انسان:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو   آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اپنی ہستی یا وجود کا اتنا عظیم اور وسیع اظہار غالب سے قبل اُردو شعری روایت میں موجود نہ تھا۔ افلاطون کا نظریۂ عالم مثال ہو یا فلسفۂ تقدیر پرستی غالب نے ان ہر دو غلام ساز فلسفوں کو حیاتِ انسانی کے لئے خطرناک ہی سمجھا ہے۔ غالب کی شاعری میں واحد متکلم جہاں اس کے وجود کا اثبات ہے وہاں اردگرد کی لایعنیت میں انسانی وجود کی ٹھوس موجودگی کا اعلان بھی ہے۔ غالب میر نہیں تھا کہ مظلوم ہو کر کسی خارجی قوت کے پاس فریاد لے کر جائے اور انصاف چاہے۔ وہ دنیاوی آقاؤں کے مظالم کا بدلہ اسی دنیا میں چکانے کا قائل تھا:۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں   ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

اور جو بدلہ نہیں چکا سکتے ان کے بارے میں غالب کا مؤقف تھا کہ وہ اسیر ہو کر راہزن کے پاؤں دابتے ہیں۔
غالب دشمن کی پہچان رکھتا تھا۔ اس کے مصنوعی چہرے سے آگاہ تھا، وہ جس بھی روپ میں تھا اس کے لئے بے پردہ تھا۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب   آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

غالب کے لئے انسانی آزادی انسانی شخصیت کے حقیقی جوہر کی تزئین کرتی ہے اور سارتر کے نزدیک انسانی آزادی مستقل وجود میں آتے رہنے کا عمل ہے۔

بلا سے ہیں جو پیشِ نظر در و دیوار   نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج   میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں ۔۔۔ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۔۔۔ جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا ۔۔۔ جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ۔۔۔ ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ۔۔۔ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے ۔۔۔ عرش سے پرے ہوتا کاشکے مکاں اپنا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا ۔۔۔ حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا ۔۔۔ خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

شوقِ عناں گسل اگر درسِ جنوں ہوس کرے ۔۔۔ جادۂ سیرِ دو جہاں یک مژۂ خوابِ پا سمجھے

غالب عالمِ مثال کی بجائے عالمِ امکان کی جانب رجوع کرتا ہے چنانچہ اس کے لئے ماضی ورقِ خواندہ ہے، حال تخلیق کا خام مواد اور مستقبل تخلیق: عالمِ امکان کسی ساکت و جامد شے کا نام نہیں ہے، تخلیقی تحرک اور وجود کی استقبالی کیفیت ہے۔ یہ کوئی مطلق اور مجرد فلسفہ نہیں ہے اضافی اور ٹھوس عمل ہے۔ ہر وجود اپنا امکان خود تلاش کرتا ہے اور دھیرے دھیرے اسے اپنا حصہ بناتا رہتا ہے۔ ماضی پرستی، آرکی ٹیپیکل جبر، شعور کی غلامی، انسانی ہیچ مائیگی، مکمل محدودیت، تقدیر کی من مانی اور روایات کی کلی تقلید غالب کے شعری ویژن سے متضاد معاملے ہیں۔ وہ حال کے مسائل، شعور کی خود مختاری، انسانی قوتِ تسخیر، بقا، اختیاری عمل اور روایات سازی کے عمل سے وابستہ تھا۔ ارتقائے وجودِ انسانی کا قائل تھا۔ منتشر ہستی کی شیرازہ بندی اور اس کے امکان کی دریافت اس کے فکر کا بنیادی نقطہ تھا۔ تمنا کا دوسرا قدم تلاش کرنا مستقل آرائشِ جمال میں رہنا، عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہونا، درسِ دفترِ امکاں کا کھلنا نالے کا لب تک آنا، قطرے کا دریا ہونا، قطرے قطرے کا نئے ناسور کا ہیولیٰ ہونا اور سیرِ دو جہان کے جادے کو یک مژۂ خواب پا سمجھنا غالب کے مرغوب اور اہم موضوعات ہیں۔

اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ وجودیت نئے عہد کی میکانکی زندگی کے خلاف بغاوت کا فلسفہ ہے کہ صنعتی سماج میں انسان کموڈٹی ہو گیا ہے۔ لیکن اسے صرف میکانکی یا مشینی زندگی کے خلاف ردِ عمل یا اظہارِ نفرت تک محدود کرنا بے انصافی ہے۔ قدیم عہد کی قدیم مابعد الطبیعات اور سماجی جبر کی تخم کشی میں بھی وجودیت نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے قدیم عہد میں انسان زرعی آقاؤں کے لئے بھی کموڈٹی ہوتا تھا۔ جیسے آج کے صنعتی دور میں ممنوعہ علاقے کے چاروں جانب بجلی کے ننگے تار باندھ دیئے جاتے ہیں۔ عہدِ قدیم میں دربان اور چوبدار وغیرہ اسی طرح محل کے دروازوں پر اور رستوں میں محافظوں کا کام دیتے تھے۔ انسان ان آقاؤں کے لئے استعمال کی شے تھا۔ اس کی خرید فروخت کے لئے منڈیاں لگتی تھیں۔

اس نفسیات کو پنجابی کا عظیم شاعر وارث شاہ بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے:

ہیر کھیڑیاں نال نہ ٹرے مولے پیا پنڈ دے وچ ہے شور میاں ۔۔۔ کھیڑے ہیر نوں گھن کے رون مٹے جیویں مال نوں لے گئے چور میاں

غالب نے زرعی آقاؤں کی پیدا کردہ اس "اشیاتی نفسیات" کی شدید مذمت کی اور اپنے آپ کو انسان کے روپ میں دیکھا:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ۔۔۔ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

یا پھر تقدیر کی گردش کا فلسفہ نافذ کر کے انسان کو جس طرح بے بس اور مجبور کیا جاتا ہے یا اسے کموڈٹی بنایا جاتا تھا، غالب نے اس پر سخت ردِ عمل ظاہر کیا اور اپنے انسان ہونے، صاحبِ حواس اور صاحبِ شعور ہونے کا واضح ثبوت دیا۔

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ۔۔۔ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غالب پیالہ اور ساغر بننے کا منکر ہے۔ اشیا پرستوں کے سامنے غالب اپنے وجود کی اہمیت پر اصرار کرتا ہے۔ اگر کوئی دروازہ اس کے لئے وا نہ ہو تو یا وہ اسے توڑ دیتا ہے یا اُلٹا پھر آتا ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری کا ایک بہت بڑا روایاتی ہیرو جسے بہت سے شاعروں نے جدوجہد کی علامت بھی بنایا ہے، غالب کے باریک بین شعور میں ایک ہوس پرست، کشتۂ رسوم و رواج اور عاشق زدہ ہی ہے۔ یہ ہیرو شیریں کا عاشق کوہکن ہے۔ غالب اس کے عشق کو ہوس پرستی کہتا ہے اور مجنوں کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہے۔ مجنوں لاحاصلی کی علامت ہے اور بے سروسامانی کو اپنا ساسامان جانتا ہے۔ وہ کسی خسرو کی عشرتگہ میں نہیں گیا اور اس کی ملازمت قبول نہیں کی۔ اس نے اس کی طرب گہہ کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کوہکن یا فرہاد غالب کے لئے عشق، مقصدِ حیات اور جدوجہد کا استعارہ نہیں طمع کا سمبل ہے۔ اشیاء پرست ہے۔ اسے شیریں سے نہیں اس کے عالیشان ماحول سے لگاؤ ہے:

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد — سنگ سے سر مار کے ہووے نہ پیدا آشنا
عشق و مزدوریٔ عشرتگہِ خسرو کیا خوب — ہم کو منظور نکونامی فرہاد نہیں
کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب — بیستوں آئینہ خوابِ گرانِ شیریں
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

غالب اپنے ہیرو مجنوں کی لاحاصلیت اور بے سروسامانی کا مداح تھا۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا — گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

لاحاصلی یوں بھی غالب کی زندگی کا جزو تھی۔ وہ مغلیہ سلطنت کے دورِ آخر کا فرد تھا۔ یہ دور کسی بھی صورت میں خوشحالی کا دور نہیں تھا۔ خزانہ خالی، امرا اور جاگیردار دردر کے سوالی، سلطنت کی مرکزیت پارہ پارہ، بادشاہ کٹھ پتلیاں اور وظیفہ خوار، علم و ہنر بے قدری کے شکار، سماج کی معاشی و اخلاقی ابتری، فرد کے سفر کی راہ غیر متعین، افراتفری اور خودغرضی کا دور دورہ، اس دور کا آخری بڑا عذاب دہلی پر انگریزوں کا مکمل تسلط، گرفتاریاں، قتلِ عام، لوگوں کا شہر بدر ہونا، بستیوں اور آباد مکانوں کا اجڑنا، ذاتی تحفظ کے لئے جدوجہد، بے کاری اور بے روزگاری کا سیلاب غالب کے لئے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔

ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو — آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

غالب کا تعلق زوال یافتہ جاگیردار خاندان سے تھا، اور بقول خورشید الاسلام "یہ خاندان ریاست اور سیاست کے ہنگاموں میں محض تماشائی نہ تھا" غالب کے والد ریاست الور کے نوابوں میں سے تھے۔ چچا مرہٹوں کی جانب سے آگرہ کے صوبیدار تھے اور ان کے سسرال میں احمد بخش کا انگریزوں کے ساتھ بہت گہرا ربط تھا۔ سو جہاں مغلوں کی سرپرستی ختم ہو جاتی۔ مرہٹوں سے بھی تعلق ٹوٹ جاتے اور محض چڑھتا سورج انگریز رہ جائیں وہاں غالب کو یہی کہنا پڑتا ہے کہ میرے خاندان کے بزرگ ہر طاقت کے ساتھ ہیں لیکن سچ پوچھو تو کسی کے ساتھ نہیں۔ خورشید الاسلام کا کہنا ہے کہ ایسے لوگ جن کی ہمدردیاں کسی کے ساتھ بھی نہیں ہوں وہ زوالِ حکومت اور اخلاقی زوال کا سب سے پہلے نشانہ بنتے ہیں۔ غالب کے بچپن ہی میں اس خاندان کے جاگیردارانہ ٹھاٹ بھاٹ ختم ہو گئے تھے۔ یادیں رہ گئی تھیں۔

بے سروسامانی اور لاحاصلی اس کی تقدیر بن گئی تھی۔ غالب کے تجربات کو زوال پذیر خاندان اور زوال پذیر تہذیب کے تناظر ہی میں دیکھا جاسکتا ہے خورشید اسلام نے اس خاندان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب نے بچپن میں معرکے سے زیادہ سازش قومی جوش سے زیادہ خود پرستی حوصلہ سے زیادہ انفعالیت کا دور زیادہ تخریب اور زورِ بازو سے زیادہ نمائش کی کہانی سنی ہوگی۔ غالب کے عہد کے خارجی حالات نے بھی حرکت سے زیادہ انفعالیت کا دور دورہ تھا۔ ہندوستان کے حکمران اور نواب انگریز سوداگروں کے تابع ہو چکے تھے۔ آگرے کے نوابوں کی زندگی طوائفوں یا پھر صوفیوں کے ڈیروں تک محدود ہو چکی تھی "خورشید الاسلام کہتے ہیں ان کے ملاقاتی اور مرید وہی گنے چنے شرفاء تھے جو اپنی بیویوں اور لڑائی کے میدان سے بھاگ کر یہاں آتے تھے" غالب نے اس ماحول کے تجربات کو اپنی شاعری میں سمویا۔ اس کے استعارے، علامتیں اور الفاظ اپنے بطن میں تہذیب اور سماج کی بربادی اور فرد کی بے سروسامانی اور مظلومیت کی داستان رکھتے ہیں، کاغذی پیرہن، زندان، زنجیر، وحشتِ طاؤس، تیغ، قتل، چشمِ بسمل، کفن، برہنگی، باج خواہ، خوں بہا، نالہ، حسرت زدہ، نو آموزِ فنا، آتشکدہ، سوزِ دروں، ویرانی، عبرت، فکرِ تعمیر خرابی ہائے دل دمِ افعی، محرومیٔ قسمت، ضبطِ گریہ، ہجومِ فلک، ناتوانی، افسردگی، بے دلی، بخیۂ زخمِ جگر، سیہ پوشی، ماتم خانہ، فرعون، بندگی، کاغذِ آتش زدہ گرداب، شکست، وحشی، صیاد، برق، خرمن، شناور، جوئے خوں، لبِ افسوس، ستم زدگان، نمرود کی خدائی، ظلمت کدہ، دشتِ غم، مرگ کا کھٹکا، چراغِ مردہ، گورِ غریباں، بلاؤں کا نزول ان الفاظ اور تراکیب سے نمودار ہونے والی تصویریں غالب کے تجربات کی بھی غماز ہیں اور اپنی لپیٹ میں اس عہد کے آشوب کی روداد بھی رکھتی ہیں۔ اس صورتِ حال کی وضاحت کے لئے غالب کے خطوں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

(جنگ آزادی کے بعد) "امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولتمند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں"

"گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں"

"کسی دفتر شاہی میں میرا نام نہیں ہے کسی مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی"

"نظم کا صلہ مانگنے نہیں بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا سرکار سے ملتی ہے"

"ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار خلعت بند کر گئے۔ نا اُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس رہا"

"یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں"

"شہر کا حال میں کیا جانوں کیا ہے پول ڈیوٹی کوئی چیز ہے وہ جاری ہو گئی ہے سوائے اناج اور اپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر محصول نہ لگا ہو"

"ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔

"لال کنوئیں کے محلے میں خاک اُڑتی ہے آدمی کا نام نہیں"

ایک اچھے گاڑن کی آبادی تھی۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہے کہاں ہیں"

اب سعی منحصر اس میں ہے کہ قیدی دریائے شور میں نہ جاوے اور یہیں محبوس رہے یا یہ منظور ہے کہ جزیرہ کو بھی نہ جاوے اور یہاں کی قید سے بھی رہائی پا دے"

پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار لُٹا دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و

مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا اس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے چوتھا لشکر ہیضہ کا اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی اب تک اس شہر سے کوچ نہیں کیا:"

"جوانمرد ایک بار دونوں قید سے چھوٹ گیا نہ قیدِ حیات رہی نہ قیدِ فرنگ"

"بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے:"

"میں نے سکہ کہا نہیں اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں"!

"اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے:"

"آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں:"

"پوچھو کہ غم کیا ہے غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت"

سو غالبِ خستہ نے کھلی آنکھوں اور دردمند دل کے جھروکوں سے اجتماعی اور ذاتی غارت گری دیکھی۔ خارجی بدامنی اور بے سکونی اور داخلی انتشار ہر دو متحدہ صورتوں میں اس کے شعری تلازمات اور فکری مکاشفات میں رچے ہوئے ہیں۔ غالب نے بھیؔ کی تو آتشِ شکم کو سرد کرنے کے لئے، عشقیہ شعر کہے تو سماجی اداروں پر چوٹ کرنے کے لئے، مشکل پسندی چھوڑی تو شعری روایت کے جبر پر بھی ناراضگی کا اظہار کیا، غزل کہی تو اس تنگنائے کی شکایت بھی کی، بادہ و ساغر کا استعمال استعاراتی کیا، سوزِ نہاں سے آتشکدہ سینہ رہا اور اظہار کی حسرت بھی رہی!

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو دل بہ دل پیوستہ گویا اک لبِ افسوس تھا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

چنانچہ غالب نے اظہارِ ذات اور اظہارِ ماحول کے لئے بے سر و ساماں اور عریاں ہیرو کا انتخاب کیا ہے تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے وہ خود بے سر و سامان تھا اور اس کی پسندیدہ تہذیب بھی سر و سامان تھی ——

وہ شعر کے پردے میں خود بھی عریاں ہے اور اس کے تجربات لق و دق ویران صحرا کے ہیں۔ اس کی غزل اس کے وجود کے ویسٹ لینڈ کی عکاس ہے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ درندوں کے درمیان تنہا انسان غالب چیخا تو اس کی چیخ میں قید ہوتے

پنچھیوں کے نالے سنائی دیئے، غیر ملکی شکنجوں میں پھنستی بے چاری تہذیب کا نوحہ دکھائی دیا۔ اس کی بھرپور مقدس ناراضگی ظاہر ہوئی۔ اس کی روح کی بے چینی بے نقاب ہوئی اور تلاشِ منزل میں ناکامی کا دکھ جھلکا:؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا　　رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو
ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا　　عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
ڈرتا ہوں کوچہ گردیِ بازارِ عشق سے　　ہیں خارِ راہ جوہرِ تیغِ عسس تمام
پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی　　ہم کو جلدی ہے مگر تو نے قیامت ذمیں کی
کنجِ تاریک و کمیں گیریِ اختر شمری　　عینکِ چشم بنا روزنِ زنداں مجھ سے
بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر　　گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے
نالہ خونیں ورق و دل گلِ مضمونِ شفق　　چمن آرائے نفس وحشتِ تنہائی ہے

غالب کی تنہائی اور بے معنویت (ABSURDITY) کا حقیقی تناظر یہی ہے۔ شاعری داخلی تجربے سے جنم لیتی ہے۔ یہ داخلی تجربہ خالص داخلی نہیں ہوتا۔ اس کا خام مواد خارجی دنیا ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی شاعری زندگی کا ایسا خواب ہے جس کی تعبیر نہ تو لغت کے الفاظ میں مضمر ہے اور نہ ہی نثری منطق میں، لغت میں لفظ محدود ہے اور معانی کی کسی ایک جہت کا غماز ہے اور نثری منطق میں حقیقت کا جوہر اپنی کلی شکل، روپ اور تلازمے سے متعلق نہیں ہو پاتا۔ لغتِ محض کی شاعری میں لفظ محدود رہتے ہیں اور یک جہت بھی، معانی سادہ ہوتے ہیں اور منجمد بھی۔ نثری منطق کی شاعری میں حقیقت اپنے مکمل روپ ہمہ گیر شکل اور تخلیقی تلازمات سمیت ظاہر نہیں ہوتی۔ حقیقی شاعری میں الفاظ استعاروں میں بھی ڈھلتے ہیں اور شعری منطق سے بھی مزین ہوتے ہیں۔ استعارے اور شعری منطق متحد ہو کر شاعری میں خواب اور حقیقت کی اسطور ترتیب دیتے ہیں۔ شاعر اپنے وجود میں موجود خواب اور حقیقت کی اسطور کا تحفظ کرتے ہیں۔ ان کے داخلی تجربوں میں موجود تنہائیاں، المناکیاں، بے معنویتیں، آشوب اور سماجی دباؤ ان کی تخلیقات میں منعکس ہوتے ہیں۔ غالب کی شاعری بھی نہ تو لغت کی شاعری ہے اور نہ ہی نثری منطق کی، اس نے استعارہ اور شعری منطق کے وسیلے سے خواب اور حقیقت کی اسطور مرتب کی ہے۔ شاعر اور دانشور جہاں اپنے تجربوں اور ان کے اظہار سے خود شعوری میں اضافہ کرتے ہیں وہاں وہ قارئین کے لئے بھی علم اور تجربے کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔ شاعر انسانی صورتِ حال کا اس کی کلیت میں جائزہ لیتے ہیں اور اپنی مخصوص کلی صورتِ حال کو کلی کائناتی صورتِ حال سے متحد کرتے ہیں۔ سارتر کے نزدیک ادب قاری کو مخصوص صورتِ حال کی ایلیانیشن سے آزادی بخشنے کا ایک مؤثر معاملہ ہے۔ ادب اس وقت ایلیانیٹڈ ہوتا ہے جب وہ اپنی خود مختاری اور مقام کو فراموش کر کے عارضی قوت، عقیدہ پرستی اور پراسراریت کا مبلغ ہو جاتا ہے۔ غالب کی شاعری میں اس کی مخصوص کلی صورتِ حال کلی کائناتی صورتِ حال سے متحد ہوئی ہے۔ اس کا شعری وژن قارئین کو ایلیسانیشن سے آزاد کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ذوق اور رجب علی بیگ سرور کی تخلیقات میں خود مختاری اور مقام طاقِ نسیاں کی زینت ہیں۔ عارضی قوت، عقیدہ پرستی اور پراسراریت کے مبلغ ہیں۔ غالب کی انفرادی کلی صورتِ حال کلی کائناتی صورتِ حال سے کس طرح متحد ہوئی ہے اور اس کے ہاں خواب اور حقیقت کی اسطور کیا روپ اختیار کرتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بے خودی بے سبب نہیں غالب　　کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
گریہ ہے یک بیضۂ طاؤس آہنگِ دل　　ہے چمن سرمایۂ بالیدنِ صد رنگ دل

بس کہ ہے میخانہ ویراں جوں بیابانِ خراب　　عکسِ چشمِ آہوئے رم خوردہ ہے داغِ شراب

خلوتِ آبلۂ پا میں ہے جولاں میرا　　خوں ہے دل تنگیٔ وحشت سے بیاباں میرا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل　　کھیل بچوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے　　خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا　　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے　　چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر　　آئینہ دیکھ جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ

یک ذرہ زمیں نہیں بے کار باغ کا　　یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

غالب کی شعری تجربہ گاہ میں جو کچھ موجود ہے اس کا مکمل احاطہ ممکن نہیں کہ اس کی تہہ دار ذات اور پیچیدہ ماحول کی ہیولائی کیفیتیں گرفت میں لانے کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ ذاتی صورتِ حال کو اجتماعی صورتِ حال سے ہم آہنگ کرنا جدید ادب کا اہم انداز ہے۔ اسی انداز نے غالب کو ہمارے درمیان لا کھڑا کیا ہے۔ جدید ادب میں جادہ لالے کے داغ کا فتیلہ ہے اور شہود، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے۔ جدید شاعر کی چشمِ بینا قطرے میں دجلہ دیکھتی ہے اور جز میں کل! اس مجنونِ صحرا گرد کے لئے گھر میں مقید رہنا عذاب ہے اس کا گھر بے دروازہ ہے۔ غالب اس لئے بھی ہمارا معاصر ہے کہ وہ فرد اور معاشرے کے رشتوں کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتا ہے اس کے لئے قطرے کی عشرت دریا میں فنا ہو جانے میں ہے۔ وہ اس لئے بھی ہمارے عہد کا ساتھ دیتا ہے کہ اسے دامِ ہر موج میں حلقۂ صد کامِ نہنگ نظر آتا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح حسرتِ تعمیر رکھتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ/ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ/ غالب بے محلی (DISPLACEMENT) کے آشوب میں بھی مبتلا رہا۔ حافظ نے جب یہ لکھا کہ

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں　　طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

یا نظیر اکبر آبادی نے یہ کہا/ جو گونگا ہے سو کھڑا فارسی بگھارے ہے/ تو وہ بھی بے محلی کے آشوب کا شکار تھے۔ بیسویں صدی کے ادب میں بے محلی کا مسئلہ بڑے پیمانے پر زیرِ بحث آیا ہے۔ اس مسئلے کی بنیاد سماجی اور سیاسی بے انصافی میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ غالب کا یہ کہنا/ کہ جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں/ اسی مسئلے کا انتہائی مؤثر اظہار ہے۔ غالب اس لئے بھی ہمارا ہم سفر ہے کہ وہ وابستگی اور ایمان کی اہمیت پہچانتا تھا:۔

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اس کا داخل عذاب وہ زنداں خانہ تھا۔ وہ انسانی تعلقات کو خانوں میں نہیں بانٹتا تھا۔ رہینِ ستم ہائے روزگار رہ کر بھی خیالِ یار سے غافل نہیں رہ سکا۔ اس کے لئے عشق اور سماج باہم متعلق تھے انقلاب یا سماجی اصلاح کا کام اور محبت کا معاملہ اس کی شاعری میں ایک دوسرے سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں وہ/ مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ/ جیسے رویے کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ میکانکیت

پسندوں نے جلس اور سماجی تبدیلی کے امور کو اشتراکی نہیں جانا۔ غالب تحقیق اور جستجو کا بھی قائل تھا اور دہر کی تلاش میں سرگرداں رہنا اس کی غیر مطمئن سائیکی کی مجبوری تھی۔ وہ ماضی پرست نہیں تھا وادیٔ خیال کو مستانہ طے کرنے والا بازگشت طلب نہیں رکھتا اس کے ساتھ ہی وہ سماجی درجہ بندیوں کو بھی پہچانتا تھا اور امرا و غربا کی زندگیوں کے تفاوت کو بخوبی سمجھتا تھا:

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختنی کا باب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

اسد مت رکھ تعجب خرد ماغیہائے منعم کا
کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

غریبی بہر تسکینِ ہوس درکار ہے ورنہ
بہ وہمِ زر گرہ میں باندھتے ہیں برقِ جولاں

ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گل فروشِ شوخیٔ داغِ کہن ہنوز

اے اسد خود ہم اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

دورِ جدید کے ادب میں انسانوں کے باہمی رشتوں پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس ضمن میں ایک حتمی نتیجہ بھی برآمد ہوا ہے کہ کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے باطن سے مکمل طور پر آگاہی نہیں رکھتا۔ ایسا اس لیے ہے کہ ہر فرد کی داخلی کائنات اس کے مخصوص تجربوں، مشاہدوں اور سوچوں سے تشکیل پاتی ہے۔ فرد کا فرد سے مکمل ابلاغ بھی ممکن نہیں ہے اور مکمل ہم آہنگی اور اشتراک بھی۔ غالب تو اس امر کا جائزہ لیتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتا ہے کہ وصل کی حالت میں بھی دوری اور ہجر موجود رہتے ہیں

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

درجہ بند سماج میں انسانی رشتوں میں کھوٹ کی ملاوٹ ہوتی ہے وفا، محبت اور پیار کے تقاضے عدمِ تکمیل کی حالت میں رہتے ہیں۔

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ہر فرد کا باطن ایک دلدل ہے جس میں نہ تو وہ فرد ہی اور نہ ہی کوئی دوسرا فرد اترنے کا حوصلہ کرتا ہے۔ ہمارے پرانے فلسفیوں نے بھی جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ہے نفس کی شناخت: اپنے نفس کی مکمل شناخت ممکن نہیں کہ انسان اس سے بہت کچھ زیادہ ہوتا ہے جتنا کہ وہ اپنے بارے میں علم رکھتا ہے چنانچہ غالب کا یہ کہنا ایک بہت بڑی صداقت ہے کہ:

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

ان معروضات کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ غالب ہمارے عہد میں موجود جذبات و افکار کی نئی صورتِ حال میں اجنبی یا "گمس جمیا" نہیں ہے اس صورتِ حال کا حصہ ہے۔ جس عدمِ ابلاغ، تنہائی، کشمکش، لایعنیت، مجبوری، انفعالیت، انسان کشی، مغلوبیت اور خود ترحمی نے ہمارے دور کے انسان کو پریشان کر رکھا ہے غالب کی شاعری اس ماحول کی تا حال عکاس ہے چنانچہ آج بھی مسائل کے حوالے سے صبح سے شام تک جوئے شیر نکالنے کا جتن کیا جاتا ہے۔ غالب کی شاعری اپنے عہد کی کتھا کہتے ہوئے ہمارے عہد کی داستان سناتی ہے اس آئینے میں اترے نقوش اور عکس ابھی نہ تو غائب ہوئے ہیں اور نہ ہی کہنہ۔ غالب کے جذبات اور افکار کی گہرائیوں، تہہ داریوں اور وسعتوں سے ہم آج تک مستفیض ہو رہے ہیں؛

صداقتوں کی سفیر۔ "پیاسی چڑیا"

منصورہ احمد

کہانی کی تخلیق، انسان کی تخلیق کے بالکل ساتھ ہوئی۔ ہبوطِ آدم سے لے کر آج تک انسان کہانی کہتا اور سنتا رہا ہے، خواہ اس کی صورت نغمہ گری کی ہو یا سادہ داستان طرازی کی۔ بہرحال ایک بات طے ہے کہ کہانی میں کہانی پن ضرور ہوتا تھا۔ تاریخ کی گواہی یہ ہے کہ کہانی کا آغاز پتھر کے زمانے سے ہوا جب انسان غاروں میں رہتا تھا، ان دیکھی قوتوں سے ڈرتا تھا۔ اسی خوف کا عکس اس کی داستان میں جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ پھر اس خوف کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش میں انسان نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان دیکھی خوفناک قوتیں تو اس کے اپنے اندر اتر آئی ہیں۔ بیرونی عفریت سے اندرونی خوف تک کا سفر ہی ہماری کہانی کا اصل ارتقا ہے لیکن چند دنوں سے کچھ عجیب سی ریت پڑی ہے کہ داستان گو پھر ماضی کی طرف لوٹ رہا ہے تاہم فرق یہ ہے کہ داستانِ سادہ نہیں بلکہ بیرونی بلاؤں کے استعارے میں اپنے اندر کی دنیا کچھ ایسی پیچیدگی سے بیان کی جاتی ہے کہ بیحد مشکل سی پہیلی معلوم ہوتی ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ کیکڑا، چھپکلی، سانپ، گرد و غبار یا خون آلود آسمان دراصل کس کا استعارہ ہیں۔ ان کا انجام کیا ہے، آغاز کیا ہے اور کہنے والا کہنا کیا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اسے خود بھی پتہ نہیں ہوتا اور مدیرانِ جرائد کو بھی علم نہیں ہوتا کہ کہانی کے اندر کیا ہے۔ بس میری طرح سب نا اہلی کے لیبل سے بچنے کے لئے سر ہلائے جاتے ہیں۔ خیر، نتیجہ کیا نکلا کہ علامت سے مایوس ہو کر خواتین کے افسانوں، ناولوں میں پناہ ڈھونڈنا چاہی مگر وہاں بھی سر سے پاؤں تک دھوکا ہی دھوکا۔ فریب ہی فریب تھا۔ بھلا جس ملک میں راشن ڈپوؤں کے سامنے افلاس زدہ لوگوں کی قطاریں کھڑی ہوں، منی بسوں میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے پسینہ پسینہ ہو رہے ہوں۔ سورج کی مہربان ہمراہی میں پتھر اور بجری ڈھوتے ہوں اور نوکر شاہی بڑے پیمانے پر کردار کے قحط میں مبتلا ہو وہاں محلات، زیورات، نوکروں کی فوج ظفر موج اور پائیں باغ کے تذکرے کرنا کیا محض فریب اور دھوکا نہیں؟

اور ظاہر ہے کہ فریب لاکھ دلکش ہو بالآخر LETHARGIC مزدر ہوتا ہے۔ اس LETHARGY سے نبرد آزمائی کے دوران "پیاسی چڑیا"° کے صفحات پر تارِ عنکبوت سے ہیولے بُنتی ہوئی نگہت سے ملاقات ہو گئی۔ اس چپکے چپکے دھیمے لہجے میں مجھے کئی منہ زور طوفان گرجتے سنائی دیئے۔ حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے دیومالائی داستانوں سے بھرپور ڈائجسٹ رسالوں کے دور میں یہ لہجہ بہت اوپرا اور اجنبی سا لگنا چاہئے تھا لیکن یہ آواز تو بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جیسے کوئی ہمارے قریب بیٹھ کر بہت رازداری سے بتلانے لگے کہ:

"فضا میں اتنا حبس ہے، ہوا دم بخود ہے۔ سارے میں کسی سناٹے کی حکمرانی ہے۔ اور یہ سناٹا چیخ چیخ کر کسی شدید طوفان کی خبر دے رہا ہے۔ مگر لوگ کمروں میں جمع ہو کر کاک ٹیلز اور کاقی پارٹیوں اور ڈنرز میں ایسے سناٹے کو گم کر رہے ہیں۔ بلند آواز سے ریکارڈ لگا کر رات رات بھر ناچتے ہیں

° پیاسی چڑیا (افسانے) از نگہت مرزا قیمت: ۱۲ روپے۔ ناشر: دھنک پبلیکیشنز۔ گلبرگ۔ لاہور (ایجنٹس: مکتبہ شعاعِ ادب۔ مسلم مسجد۔ لاہور

وہ تاریکی اور تنہائی سے خوفزدہ ہیں اور تیز روشن قمقموں اور بجتی موسیقی سے اپنے سہمے دلوں کو سہارا دیتے، چاہتا ہے کہ میں سٹول پر سے چھلانگ لگاؤں، بھاگتا ہوا بائی گرین پردوں کو ہٹا کر ہال میں جا گھسوں اور ناچتے ہوئے اور ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے جوڑوں کو چیر کر علیحدہ کر دوں، اور چلا چلا کر انہیں طوفان کی خبر کر دوں ـــــ طوفان جو آنے والا ہے ـــــ مگر میں اپنی خواہش کو بیئر کے ایک بڑے سے گھونٹ میں دبا دیتا ہوں۔"

یہ سطور پڑھتے ہوئے بجلی کے کوندے کی طرح ذہن میں خیال آتا ہے کہ ارے یہ سب کچھ تو ہم بھی سوچ رہے تھے مگر شاید اس حسنِ ترتیب سے نہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم سب مفرور قیدی ہیں جو ESCAPISM سے اپنی جنتیں تعمیر کرتے ہیں۔ شاید ہم واقعی بے بس ہیں یا شاید بے حس اور بے عمل، کیونکہ اپنی بے عملی کو ہم بڑے خوبصورت نام دے کر، دوسرے کے ماتھے پر الزامات بنا کر چپاں کر دیتے ہیں اور خود اپنے لاروے میں واپس پلٹنے کے لئے تڑپنے لگتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا، ایسا ہو ہی نہیں سکتا اور نتیجے کے طور پر آہوں کی تندی سے فضا اس میں گھٹن اور بڑھ جاتی ہے۔ نگہت نے اس کشمکش کو اس کے پاتال تک اتر کر محسوس کیا ہے۔ جبھی تو تحریر کی لذت سے، بقول غالب، میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے یعنی نگہت کا اپنے قاری کے ساتھ نقطۂ اتصال ہے۔ اس کے اور قاری کے درمیان پن کے سُننے افہام و تفہیم کا اٹوٹ رشتہ قائم ہوتا ہے اور ابلاغ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ نگہت کا اعزاز ہے کہ وہ ہمیں انگلی پکڑ کر جہاں جی چاہے لے جاتی ہے، لیکن پل بھر کو بھی تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ اور یہ اعزاز بہت کم، بہت ہی کم لکھنے والوں کے مقدر میں ہوتا ہے۔

نگہت مرزا کی ذہانت بھلا اس سچائی کو کس طرح نظر انداز کر سکتی تھی کہ TRANSITIONAL PHASES کی یہ کشمکش اس وقت زیادہ سنگلاخ ہو جاتی ہے جب ہم عقیدہ کھو چکے ہوں۔ آخر زمین پر کھڑا ہونے کے لئے کوئی بنیاد تو ہونا چاہیئے نا، عقیدے اور یقین کے عدم وجود نے ہماری زندگیوں میں بنجر پن کا زہر گھول دیا ہے۔ ہم لمحہ لمحہ یہ زہر پی رہے ہیں۔ زمین ہمارے قدموں تلے سے سرک گئی ہے، اور ہم خلا میں تیرتے تیرتے تھک گئے ہیں۔ مقدس کتابیں، صحیفے، ہمارے دلوں میں ٹکی ہوئی بے عملی کی پھانس، خوشیوں کی تمنا اور پھر اس تمنا کے لایعنی ہونے کا احساس، سوچتی آنکھوں کے اَن ہونے سوالات، کمرشل ازم کی اندھی دوڑ میں دیوانی دنیا کا بے پناہ شور اور اندر کے سناٹے ...... خلا ..... خلا ....
مہیب خلا۔ یہ سبھی کچھ ہمارے شب و روز ہیں جبھی تو "مظفر مہدی" کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ سناٹا اور شور ایک دوسرے سے اس قدر گتھم گتھا ہو گئے ہیں کہ اب وہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ جبھی تو دن بھر روشنی کا پیام بانٹنے والا رات کو لیٹتے ہوئے سارے دن کا سفر دہرانا چاہتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے پچھلا کچھ بھی یاد نہیں:

"اور جب اس نے انتہائی زور دینے پر شام سے پرے دیکھنے کی کوشش کی تو اسے اندھیرے کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آیا۔ تب وہ دل میں بہت ڈرا اور اس آواز کو دل میں دہرانے لگا اور کہا، نہیں میں اب پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا کہ جو راستہ پیچھے جاتا ہے۔ وہ اندھیرے کے سمندر کا ہے۔"

اپنے حال سے ایسی بے تا آسودگی "ایک انسان ایک ساتھی" کے "فؤاد احمد" کو ایلیٹ کی WASTE LAND سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ کیونکہ بقول اس کے:

"میں خود بھی تو WASTE LAND ہوں عطیہ ـــــ بنجر سا شہر ـــــ اور ـــــ بانجھ۔ دراصل عطیہ بی بی میری روح بھی کبھی زرخیز اور شاداب ہوا کرتی تھی۔ میرے اندر بھی کبھی آگ بھڑکا کرتی تھی ـــــ لیکن کوئی یہاں سے آگ لینے نہیں آیا، کوئی نہیں عطیہ ـــــ کوئی بھی نہیں۔ اب یہ آگ بجھ کر راکھ بن چکی ہے۔"

اور پھر راکھ میں ڈھلا ہوا یہ شخص قبروں کے سامنے دو زانو ہو کر نروان کھوجنا چاہتا ہے:

"مجھے بھی موت کے متعلق کچھ بتاؤ دوستو: کیا اپنے وجود اور اپنی ذات کو ختم کرکے سکون کی دولت مل جاتی ہے۔ کیا اپنے وجود کے خول سے نکل کر تم خوش ہو؟"

لیکن اس پر اس قدر جمود طاری ہے کہ اتنا اہم سوال پوچھنے کی تمنا کے باوجود وہ قبرستان کے احاطے کی دیوار تک نہیں پھلانگ سکتا اور ایلیٹ کی LOVE SONG OF PRUFROCK کے ہراساں ہیرو کی طرح سارے خواب سینے میں دبائے فنا ہو جاتا ہے۔

اسی لئے تو ٹل من مزید کے سمان کو شانتی تلاش کرتے ہوئے دھرتی ماتا سے التجا کرنا پڑتی ہے کہ تو نے ایڈی پس اور سیتا کو اپنی کوکھ میں پناہ دی ——— "مجھے بھی اپنی پناہ میں لے لے!"

نگہت ایک باشعور قلمکار کی حیثیت سے اپنے حال سے کٹ کر نہیں بیٹھی بلکہ بیسویں صدی کے نصیب میں آنے والی مسلسل کشمکش کی بہت ہی ماہر عکس بند ہے۔ ایک سرسری سی نظر دوڑا کر تو یہ کہہ کے فارغ ہوا جا سکتا ہے کہ نگہت کی کہانی عورت کی محکومیت کے کرب کی کہانی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ نگہت کی کہانی یقیناً صدیوں سے پستی ہوئی اس محکوم عورت کی داستان بھی ہے، جو مرد کے معاشرے میں درجۂ دوم کے شہری کی حیثیت سے زندہ ہے۔ معاشی احتیاج کی تمازتوں میں سلگتی ہے مگر فریاد کا منصب دینا بھی کسی کو گوارا نہیں ہوتا۔ یہ بھی سچ ہے لیکن نگہت کے ہاں عورت کا کرب دو تہذیبوں کے دوراہے پر حیران کھڑی عورت کا دکھ ہے جس کے پاس ایک طرف تو ماضی کی اور رشتوں کی زنجیریں ہیں، اخلاقیات کے درس ہیں، جو اس پر نفسیاتی حملہ کر کر کے اسے یہ بتاتے ہیں کہ اصل زندگی تو فقط ماضی کی میراث تھی اور حال محض سایوں کا، ہیولوں کا جنگل ہے جس میں کچھ بھی تو درست نہیں، سب کچھ زیاں کاری ہے، بے حیائی ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھانے لگتی ہے تو مستقبل کی متوقع تباہیوں سے ڈرا ڈرا کر اس کے ذہن کو رستا ہوا ناسور بنا دیا جاتا ہے۔ اسے لاکھ نظر انداز کیا جائے پھر بھی اس سے یہی امید رکھی جاتی ہے کہ وہ اپنی نا آسودہ تمناؤں کی لاش کو زندگی کی علامت کہے اور اسے سینے سے لگائے لگائے پھرے۔ دوسری طرف اس کے سامنے وسیع اور پھیلا ہوا بوقلموں مستقبل ہے جو اسے اعتماد دینا چاہتا ہے، آزادی کی دلنواز فضا دینا چاہتا ہے، جہاں زندگی اس کی اپنی ہو، جسے وہ اپنے خوابوں کی تعبیر بنا سکے لیکن ابھی وہ اپنی سوچ کو عمل سے ہم آہنگ بھی نہیں کر پاتی کہ اسے مغرب کی عورت سے خوفزدہ کر دیا جاتا ہے کہ مغرب کی عورت نے کیا پایا جو تم بھی اسی راستے پر گامزن ہوئی ہو۔ تم دیکھتی نہیں کہ وہاں عورت کتنی بے سکون، بے امان اور خاک بسر ہے۔ یہ سب آزادی کا اعجاز ہے جس کی جستجو نے تمہیں دیوانہ کر دیا ہے۔ عورت شمعِ محفل بن کر بہت غیر محفوظ ہو جاتی ہے اس لئے تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ چپ چاپ، اسی حال میں زندگی گزارو اور مر جاؤ۔ اب بے چاری عورت کیا کرے؟ کدھر جائے؟ روایت شکنی بہت بڑا گناہ سہی لیکن وہ اپنے ماضی کو کسی صورت دہرانا نہیں چاہتی جہاں وہ زندگی بھر جلاوطن رہتی ہے۔ ماں باپ کے گھر ہوتی ہے تو گھر باپ اور بھائیوں کا ہوتا ہے اور شوہر کے ہاں پہلے شوہر اور پھر بیٹوں کا۔ اسے اپنا وطن چاہیئے، اپنا گھر چاہیئے۔ اسے یقین اور اعتماد چاہیئے جو بدقسمتی سے مرد اسے آفرینش سے لے کر آج تک نہیں دے سکا، کیونکہ اس نے معاشی سرپرستی کی بہت بڑی قیمت وصول کی ہے .... عورت کی انا اور عزتِ نفس کی قیمت، لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ آگے کیسے بڑھے؟ اس کے قدموں میں رشتوں کی زنجیریں اور ذہن پر خوف کی پرچھائیاں ہیں۔ اور وہ دوراہے پر حیران کھڑی سوچ رہی ہے کہ سچائی کدھر ہے؟

وہ "گھر" کی ایسی بہن اور بیٹی ہے جس کے وجود کو بھائی مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں اور ماں اسے ناسور سے بھی ناگوار بوجھ سمجھنے لگی ہے اسے تحفظ کی، سہارے کی، گھر کی ضرورت ہے، ایسے گھر کی جہاں اس کی انا کی دھجیاں نہ بکھرتی ہوں، لیکن گھر دینے والے تو بے خبر ہیں اور الٹا اسی پر الزام دیئے جاتے ہیں کہ کسی نے اسے پسند کر کے نہیں دیا۔ آخر.... ایک دن وہ جرأت سے کام لے کر اپنی بے بس بے روپ، اجاڑ زندگی کو ٹھوکر مار کر "علی اکبر" کے قدموں میں پناہ کے لئے جا گرتی ہے۔ اس کی خوش قسمتی سے وہاں اسے پناہ بھی ملتی ہے، عزت اور اعتماد بھی لیکن وہ پھر بھی اداس بیٹھی سوچ رہی ہے۔ خود کو ماضی کے حوالے سے جائز قرار دینے کی کوشش کر رہی ہے:

"مایوس ہو کر میں اپنے سائے کی شکل میں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی تھی حتیٰ کہ میں نے اسے پایا جسے دیکھ کر میری آنکھوں کی بینائی لوٹی جس کی دوسراتھ میں میں نے اپنا پن پایا اور زمین کو جاگتے دمکما اور آسمانوں پر پھیلتے روشنیوں کے سیلاب میں مجھے زندگی بڑی تندرست اور خوبصورت نظر آئی۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت بُرا ہے جو میں نے کیا ہے۔ اور میں نے اپنے خاندان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا ہے اور اپنے بھائیوں کی عزت مٹی میں ملا دی ہے اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ــــ مگر لوگ تو بہت کچھ کہتے ہیں اور میں اپنے خوبصورت امریکن سٹائل گھر کی بیرونی سیڑھی پر بیٹھی لوگوں کی باتوں پر ہنستی ہوں اور کبھی کبھار ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ چھپا کر سوچ لیتی ہوں کہ میرے اندر سے نکلنے والی روشنی سچائی نہیں تو سچائی کہاں ہے اور یہی بات میں تب بھی سوچا کرتی تھی جب میں اندرون شہر کے اس چھوٹے سے گھٹے ہوئے گھر میں رہتی تھی اور شام کو اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے سناٹے سے گھبرا کر خود سے کہتی تھی، وہ کہاں ہے کہ جس کی مجھے تلاش ہے۔ میں ازل سے سچائی کی تلاش میں تھی اور اب جبکہ میں نے اسے پا لیا ہے تب بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ میں نے بہت بُرا کیا ہے۔ کیا واقعی؟"

منزل پر پہنچ کر بھی وہ اس قدر بے چین اور نا آسودہ کیوں ہے؟ کشمکش نے اسے اذیت میں مبتلا کیوں کر رکھا ہے؟ اس لئے کہ وہ یادوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی جن کا خمیر محبت سے تیار ہوا ہے۔ آخر وہ خود ہی جواز ڈھونڈتی ہے کہ:

"جب میں چھوٹی سی تھی نا تو میری ماں نے مجھے مثالی لڑکی بنانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی میں پانچ برس کی عمر تک اس کے ساتھ سویا کی۔ وہ مجھے بستر پر لٹا کر اچھی اچھی سبق آموز کہانیاں سناتی اور بڑے پیار سے سمجھایا کرتی کہ اچھی لڑکیاں صرف ماں باپ کی اطاعت ہی نہیں کرتیں بلکہ بھائیوں سے محبت کرتی ہیں اور ان کی خدمت بھی۔ تب میرا معصوم ذہن ان کی باتوں کو بلا چون و چرا مان لیا کرتا اور میں اپنے بڑے بھائیوں کی مار پیٹ پر چپکے چپکے رو لیا کرتی۔"

وہ لڑکی اپنی ماں کے احکامات کے عین مطابق بہت سعادت مند اور خدمت گزار ہے لیکن ان محبتوں کے بدلے میں اسے کیا ملتا ہے؟ محرومی، دکھ اور ذلت۔ ماں اسے نامراد کہہ کہہ کر اس کی موت کی دعائیں مانگتی ہے اور وہ رات کی تاریکی میں آنسو بہاتے ہوئے سوچتی ہے کہ اس نے تو ہمیشہ بھائیوں کی خدمت اور عزت کی ہے، ماں کی اطاعت کی ہے، کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ پھر یہ سیاہ بختی اس کے مقدر میں کیوں لکھ دی گئی۔ آخر ایک روز نجانے کس لمحے وہ اپنے لاشعور کی سب بغاوتیں سمیٹ کر روایات کی لاش کو ٹھوکر سے ایک طرف کر کے "علی اکبر" تک پہنچ جاتی ہے۔ بڑی فیصلہ کن التجا کے ساتھ کہ:

"علی اکبر مجھے اپنی پناہ میں لے لو میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔"

لیکن اتنے طویل و عریض جواز کے باوجود وہ ابھی تک دوراہے پر کھڑی پوچھ رہی ہے:

"مگر تم ہی بتاؤ تم کہ مکمل سچائی ہو، ہم میں سے غلطی پر کون ہے؟"

پچھلی صدی کی بیمار عورت "بھی روایات کی اسیر ہے لیکن اس کے بالکل ساتھ ساتھ اسی کی ہم عصر نئی نسل کی نمائندہ بھی ہے جو بڑی قطعیت کے ساتھ اسے کہتی ہے:

"تم جانتی ہو تم کس قدر قابل نفرت ہو۔ مجھے اس قسم کی تمام عورتوں سے نفرت ہے جو ان بیمار خیالات کا پرچار کرتی ہیں۔ یہ ایثار، قربانی پرستش، یہ سب لغو باتیں ہیں۔ اگر اچھی، اور خوش باش زندگی گزارنا چاہو تو پہلے ان تمام کھوکھلے اور سطحی رشتوں سے اپنا دامن چھڑا لو۔ یہ زہر کی تھیلیاں، تمہارے کبھی نہ کبھی تمہیں ڈنک ضرور ماریں گے۔ ان سب سے لاتعلق ہو جاؤ، سب کے وجود سے انکاری، اپنی ذات اور صرف اپنی ذات کو اپنی نظروں کا محور بناؤ۔ ساری توجہ ــــ ساری محبت خود اپنے لئے وقف کر دو۔"

"پیاسی چڑیا" پڑھتے ہوئے اسی سلسلے میں میں نے ایک بہت دلچسپ بات محسوس کی کہ نگہت تمام وقت تذبذب میں مبتلا ہے۔ فیصلے کی تمنائی،

طرح بکھر چکی ہوئی لیکن ایک بات طے ہے کہ وہ اس معاشرے کی روندی ہوئی، مسلی ہوئی عورت سے بالآخر کوئی نہ کوئی بغاوت ضرور کرا دیتی ہے۔ بغاوت نہیں تو کوئی اور غیر معمولی فیصلہ۔ اس کا نفسیاتی پہلو یقیناً یہ ہے کہ نگہت عورت کو پامال نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اسے ہر حال میں فتحمند و سربلند دیکھنا چاہتی ہے اور کمال یہ ہے کہ وہ اس معاملے میں کوئی زیادتی نہیں کرتی۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ اسے مشرقی روایت کے ظلم کے خلاف اتنے بلند بانگ احتجاج پر مغرب پرست قرار دے دیں لیکن یہ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ وہ ہرگز مغرب پرست نہیں۔ وہ تو عورت کو ہر قیمت پر اس کی انا اور عزتِ نفس لوٹانا چاہتی ہے۔

نگہت روایت سے باغی ہے۔ معاشرے کے ساتھ ساتھ فن میں بھی۔ مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ نگہت کے ہاں ہوش ربا بے خود کر دینے والے حسن کی مالک کوئی ہیروئن نہیں ہے۔ نہ لمبی لمبی کاریں ہیں، نہ محلات، اور نہ ہی سدا بہار پلنگ پر گرے ہوئے فارغ البال بے فکرے۔ یہاں عورت محض خوبصورت محسوسات کا ہینگر نہیں بلکہ دل اور دماغ رکھنے والا وجود ہے۔ جو دکھوں پر روتا ہے، خوشیوں پر خوش ہوتا ہے اور اپنے ذہن سے معاشرے کی ناانصافیوں کا تجزیہ کر سکتا ہے۔

نگہت کا روایت سے دوسرا انحراف مرد کے سلسلے میں ہے۔ حقیقت اور تعصب کے آمیزے نے خواتین کے فکشن میں مرد کا ایک گھڑا گھڑایا تصور بنا چھوڑا ہے جس میں مرد انتہائی سفاک، دغاباز، مکار اور ہرجائی ہے۔ میں مرد کے استحصالی کردار سے انکار نہیں کرتی لیکن اس قانون کو غیر مشروط طور پر ہر ایک مرد پر فٹ کر دینا بہت بڑا جرم ہے۔ مرد ہمیشہ سنگ دل ہی نہیں ہوتا وہ بہت مہربان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ باپ بھی ہے اور بعض اوقات بہت شفیق بھائی بھی۔ لیکن اس سے محض ظلم منسوب کر دینا جانبدارانہ فیصلہ ہے اور میرے خیال میں اس کا زیادہ نقصان بے چاری عورت کو ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے ایک خوفناک بھوت بن جاتا ہے۔ اور وہ زندگی بھر نفسیاتی طور پر اسے آسیب بنائے رکھتی ہے مجھے خوشی ہے کہ نگہت نے تعصب کے اس سمندر سے ابھر کر حقیقت کو توازن کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس کے ہاں مرد ظالم شوہر اور فراموش کار بیٹا ہے تو بہت ہمدرد، محبت کرنے والا ساتھی اور جان چھڑکنے والا بھائی بھی ہے۔ وہ جو "مغضوب ہوئے" کے "صفدر" اور "ناصر علی" اگر کائنات میں محبت کی تجسیم اور خدا کا عکس نہیں تو اور کیا ہیں؟ "گھر" میں ایک محروم و بے امان لڑکی کو یادِ قارِ پناہ اور اعتماد دینے والا "علی اکبر" کیا اعجاز کا مسیحا نہیں؟

نگہت ORIGINAL ہے۔ یوں تو وہ کہیں بھی فرسودگی کا شکار نہیں ہوتی۔ لیکن "وہ جو مغضوب ہوئے" اور "پیاسی چڑیا" کو ہم بڑے اعتماد سے نگہت کی انفرادیت کے شاہکار کہہ سکتے ہیں۔ ایک پاگل بھائی کی بہن کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ جس کے ایک طرف بھائی سے محبت کا بندھن اور دوسری طرف آرزوؤں کے کارواں ہیں، نگہت نے جس فن کاری سے بیان کی ہے وہ ایک ذہین اور بے حد حساس قلم ہی کر سکتا تھا اور "پھر حادثہ" کا کمپلیکس۔ ہمارے اخبار اس روداد سے روزانہ ہی سیاہ ہوتے ہیں لیکن میرے محدود علم کے مطابق شاید پہلی بار کسی افسانہ نگار نے اس مسئلے کو سنجیدگی سے لیا ہے۔

اس انفرادیت کا ایک منفی پہلو بھی ہے کہ نگہت کہیں اپنے آپ کو فراموش نہیں کر پاتی۔ کردار اور واقعات سے اس کی اتنی INVOLVEMENT ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی زبان بولتے بولتے نگہت کی زبان میں بات کرنے لگتے ہیں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کردار مل کر اپنا اظہار کرنے کی بجائے نگہت کی PROJECT-ION میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ اب "پیاسی چڑیا" میں دیکھیے کہانیوں کے تقریباً بھی کردار MYTH کے حوالے سے بات کرتے ہیں اور عالمی کلاسیکی ادب کا بار بار تذکرہ کرتے ہیں، وہ تقریباً ایک طرح فلسفیانہ انداز میں سوچتے ہیں اور بڑی بات یہ کہ ان کے فلسفے میں اثبات ہوتا ہے۔ زندگی کے مسائل پر ان سب کی نظر بہت گہری ہے۔ یہ سب اس لئے نہیں کہ ہمارے ہاں عام زندگی میں ایسا ہوتا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ان کرداروں کی خالق بہت پڑھی لکھی، ذہین اور مفکرانہ ذہن کی مالک ہے اور کرداروں کو روح دیتے ہوئے وہ بہت INVOLVE ہو جاتی ہے اور ان سے محبت کرنے لگتی ہے اس صورت میں، نہیں یکسانیت سے بچانے کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ نگہت ان کے مقابلے میں ذرا معروضی (OBJECTIVE) ہو کر سوچیں۔

معروضیت کے ضمن میں میرا مطالبہ یقیناً شیکسپیر، برنارڈ شا، ندیم، بیدی اور ہاجرہ مسرور کی حد تک ہے تاکہ اس تبدیلی کے بعد یہ نایاب سکہ مزید صیقل ہو جائے۔

میری شکایت سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ نگہت کے کردار محض اس کا عکس ہوتے ہیں۔ ان سب کی اپنی زندگیاں بھی ہیں، اپنی نفسیات ہے۔ ہاں ان میں نگہت کا رنگ ضرور جھلکنے لگتا ہے۔ ماسوا اس بات کے، نگہت کی کردار نگاری نے مجھے بار بار جارج ایلیٹ کی یاد دلائی۔ جذبات اور محسوسات کا مہین اور نازک سا جال اتنی مہارت سے بنا گیا ہے کہ ایک تار بھی اوپر محسوس نہیں ہوتا۔ کرداروں کا ماضی ان کے حال کے ساتھ ساتھ اس قدر فطری انداز میں آگے بڑھتا ہے کہ ہر لفظ اپنی جگہ بہت اہم دکھائی دیتی ہے۔ انسانی نفسیات پر نگہت کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ خوشی ہیجان، غم و اندوہ، جھنجھلاہٹ وغیرہ کی سب کیفیات پوری صداقت سے کمپیوٹر کی سی مشاقی کے ساتھ کتاب کی سطر سطر میں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔ ماضی، حال، اور مستقبل کا یہ ربط باہم پلاٹ کو بھی بے حد منطقی اور رواں کر دیتا ہے کیونکہ نگہت کی دلچسپی خارج سے کہیں زیادہ داخل کے ساتھ ہے اس لئے خارج اکثر اوقات داخلی جذبوں کے لئے محض آلے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال نگہت بہت طویل افسانے میں بھی واقعات کا منطقی ربط یوں برقرار رکھتی ہے کہ اکتاہٹ نزدیک نہیں پھٹکتی۔

"پیاسی چڑیا" کے افسانے پڑھ کر ایک بات بہت کھٹکتی ہے کہ نگہت نے اپنا کینوس بہت محدود رکھا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا خارج اس کے ہاں عموماً وقتی طور پر ہی جھلک دکھاتا ہے اور یہ سا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات سکڑ کر محض ایک کمرے میں، بلکہ ایک بستر میں سما گئی ہے جہاں لیٹ کر اپنی خوشیاں، محرومیاں اور ماضی دہرایا جا سکے۔ میرے خیال میں اتنا انجماد باہر کی ہماہمی کے مقابل میں اکثر اوقات سکرات اور بیمار نیند کا تاثر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اس سکوت کو تھوڑا سا متحرک کر دیا جائے تو نگہت کا افسانہ زندگی کے اور قریب ہو جائے۔

کینوس محدود ہونے کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ کائنات اور ذات کے ہجوم میں وہ بنیادی طور پر صرف عورت کی ترجمان ہے اور اس میں بھی اس نے متوسط اور اعلیٰ طبقے کے جذباتی دکھوں اور ذہنی اذیتوں کا ہی انتخاب کیا ہے جبکہ "اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا" میرے خیال میں افلاس کا دکھ، معاش کا مسئلہ ہی ان جذباتی دکھوں کو شاخ در شاخ پھیلاتا ہے۔ افلاس کے دیو سے جنگ کرتی ہوئی نچلے طبقے کی عورت ہمارے معاشرے کی عظیم ترین اور تلخ ترین حقیقت ہے جسے ہاجرہ مسرور نے بہت مخلص، سنجیدگی سے لیا ہے۔ غربت کے ایک غار سے نکل کر دوسرے میں گرتی ہوئی مظلوم اور راندۂ درگاہ عورت کو ہاجرہ نے جس طرح ہمارے سامنے مجسم کیا ہے، میرا مشورہ ہے کہ نگہت اسے بھی اپنے سامنے رکھے اور اس عورت کو کبھی فراموش نہ کرے جو زندگی بھر لمحے لمحے کی جلاوطنی کا کسیلا ذائقہ چکھتی ہے اور خواہشات کا ہجوم رکھنے کے باوصف اکثر اپنے پھٹے ہوئے کھردرے ہاتھوں اور پیروں کی تھکن سمیت قبر میں جا سوتی ہے۔ نگہت کا ایسا کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ہم اسے اعتماد کے ساتھ ہمہ جہت اور ہفت رنگ نباض فطرت کہہ سکیں۔

میرا خیال ہے کہ موضوع سے انداز بیان کی طرف تھوڑا سا سفر کر لیا جائے۔ نگہت کا انداز بیان اور الفاظ کا انتخاب بہت موثر ہے۔ یہ بات میں رسمی انداز میں نہیں کر رہی ہوں۔ موثر عبارت وہی ہوتی ہے جو پڑھنے والے پر اپنے نقوش ثبت کرے، اور مجھے اعتراف ہے کہ نگہت کے ہاں خواہ غلطیاں بھی جا رہی ہوں لیکن وہ تاثیر ضرور رکھتی ہے۔ کہیں کہیں وہ الہامی کتابوں کے انداز میں خطیبانہ شان سے گفتگو کرتی ہے جس کی اپنی خوبصورتی ہے اور جو تحریر کے تاثر کو دو آتشہ کر دیتی ہے۔ مثلاً

"مانگو گے تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو گے تو پاؤ گے،
دروازہ کھٹکھٹاؤ گے تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔"

انداز بیان کے سلسلے میں ایک چیز جس سے مجھے الجھن ہوئی، وہ ہے نگہت کا "اور" کا وافر استعمال۔ کہیں کہیں تو یہ لفظ یقیناً تحریر کے حسن میں

اضافہ کرتا ہے لیکن اکثر یہ بیچ راستے کے پتھر کی طرح گراں گزرنے لگتا ہے۔ یہ محض میری عاجزانہ تجویز ہے کہ نگہت نظرثانی کرتے وقت اگر کہیں کہیں سے اسے کاٹ دے تو تحریر کی اپیل دوچند ہو جائے گی۔

میں اس باعث سے بہت متاثر ہوئی ہوں کہ علامتی افسانے کے اس دور میں نگہت نے بغیر کسی کمپلیکس کے انسانوں کی زبان میں بات کی ہے۔ اگر یہ سطور میں آج سے تیس برس پہلے لکھتی تو محاسن کے ضمن میں یقیناً یہ وصف بیان نہ ہوتا لیکن کیا کیا جائے۔ وقت ہی ایسا آگیا ہے کہ اب اگر فکشن میں اس قسم کی تحریر نظر آجائے تو حیرت سے آنکھیں ملنی پڑتی ہیں لیکن کاش کہ "پیاسی چڑیا" کے گردپوش پر علامت کو اتنے بھونڈے انداز میں استعمال نہ کیا جاتا۔ اگر کرنا ضروری تھا تو کاش کہ افسانے کا مفہوم ہی سمجھ لیا جاتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ گردپوش دیکھ کر منہ میں بہت ہی کثیف اور کڑوا ذائقہ محسوس ہوا۔ ایک گردپوش پر ہی کیا موقوف، ساری کی ساری کتاب ایسی مجرمانہ غلطیوں سے بھری پڑی ہے۔ سب سے پہلے تو کتاب کا سائز ہی حوصلہ شکن ہے۔ کتاب کھولی تو اندر سے فہرست غائب۔ افسانے پڑھنے شروع کئے تو کتابت کی غلطیوں سے اعصاب جھنجھنا اٹھے ("وہ جو مغضوب ہوئے" کو "وہ جو منصوب ہوئے" پڑھنا اچھا خاصا حوصلے کا کام ہے) اور پھر صفحات کی ترتیب! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی کے کنبے کی طرح! مصنفہ کو آئندہ اپنی کتاب کی اشاعت میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

اور آخر میں مجھے نگہت کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ میں اس کی احسان مند ہوں کہ اس کی وساطت سے جہاں میرے علم میں گوناگوں اضافہ ہوا، وہاں ایک نئی سچائی کا بھی پتہ چلا۔ اب تک تو یہی سمجھتے تھے کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ لیکن اب یہ سچ جھوٹ ثابت ہوگیا۔ اگر مشک پر ہی منحصر ہوتا تو نگہت کی کتاب اس بری طرح نظرانداز کر دی جاتی کہ کسی ماہنامے، روزنامے، ہفت روزے میں تبصرہ تو در کنار، تذکرہ تک نہ ہوتا! اب تو یہ شک یقین میں بدلا ہے کہ واقعی یہ کمرشل آرٹ کا دور ہے (جو سب سے زیادہ ادب پر وارد ہوا ہے) اور کتاب کی فروخت میں تعارفی تقریبات کا انجکشن بہت ضروری ہے جہاں سٹیج پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے داد و تحسین کے نعرے بلند کیے جاسکیں۔ ہاں تو نگہت، پھر کیا خیال ہے؟ کیا عطار کچھ بولے گا یا مشک کی گویائی کا ہی انتظار کیا جائے گا؟

عام فکری مغالطے

سید علی عباس جلالپوری

اپنی کتاب 'عام فکری مغالطے' پر محمد ارشاد صاحب کا تبصرہ نظر سے گذرا۔ میں نے اس کتاب میں اشتراکی معاشرے کا ذکر تحسین سے کیا ہے۔ یہ بات انھیں ناگوار گذری۔ غالباً اسی احساس ناگواری نے انھیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ میرے خیال میں فی زمانہ کوئی بھی منصف مزاج خردمند اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اشتراکیت کے نفوذ و قبول نے تاریخ عام کو ایک نیا موڑ دیا ہے، اور بنی نوع انسان کی ایک تہائی اس نظام فکر و عمل سے فیضان حاصل کر رہی ہے۔ کارل مارکس نے جدلیاتی مادیت میں نظریے اور عمل کے اتحاد پر زور دے کر نظریے کو انقلابیت کا رنگ دیا اور انقلابی تحریکوں کو پہلی بار فکری نہج عطا کی جس سے فیضیاب ہو کر لینن اور ماؤزے تنگ نے روس اور چین میں ایک ترقی پرور اشتراکی معاشرہ قائم کیا۔ اس نظریاتی تحریک (IDEOLOGICAL MOTIVATION) کے بغیر جو مارکسیت نے انھیں بہم پہنچائی، ان پسماندہ اقوام کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں صدیوں کا فاصلہ برسوں میں طے کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

(۱) محمد ارشاد صاحب نے روسی فلاسفہ اور سائنس دانوں پر طعن کیا ہے کہ وہ علمی مسائل کی جدلیاتی تعبیر و ترجمانی کر کے فلسفے کے بجائے علم کلام کی آبیاری کر رہے ہیں۔ فلسفے کے طلبہ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی فلسفی کے اخلاقی، عمرانی، اور سیاسی نصب العین اور قدریں اس کی کونیات اور مابعد الطبیعیات ہی سے متفرع ہوتی ہیں۔ یہاں میں، افلاطون اور اس کے متبعین کی مثال دینے پر اکتفا کروں گا جن کی اخلاقی، عمرانی، فنی اور سیاسی قدریں ان کے بنیادی نظریے یعنی مثالیت پسندی سے وابستہ ہیں۔ اس کے باوجود محمد ارشاد صاحب انھیں فلسفی ہی کہتے ہیں کیونکہ انھوں نے مدلل انداز میں اپنا نظام فکر پیش کیا ہے۔ اسی طرح کارل مارکس اور اس کے متبعین کی جملہ سیاسی، عمرانی اور فنی قدریں عضویاتی طور پر ان کے اساسی نظریے یعنی جدلیاتی مادیت سے وابستہ ہیں جس کی روشنی میں وہ جملہ افکار و مسائل کا جائزہ لیتے ہیں اور اس ضمن میں منطقی استدلال سے کام لیتے ہیں، انھیں متکلم ہونے کا طعنہ کیوں دیا جائے؟ محمد ارشاد صاحب نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں اشتراکی ممالک میں کتنے فلاسفہ کو ایسے ہی جانتا ہوں جیسے کہ مثلاً برٹرنڈ رسل، ہائیڈگر، سارتر، آئر وغیرہ کو جانتا ہوں۔ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سوویٹ روس اور دوسرے اشتراکی ممالک میں جید فلاسفہ کی کمی نہیں ہے۔ ان میں ایم روزنتھال، پی یودین، او یاخوت، وی ایڈورانسکی، جی ییگر زمان، جی کرسانوف، ڈی چیسا کوف، وائی وارگا، لوکاکش، خواجہ موم جان، وی پوڈوسیٹنک اور خاتون ایم ٹی سیتپا نائنتس ـــــ ان کی کتاب "پاکستان فلاسوفی اینڈ سوشیالوجی" واحد تصنیف ہے جس میں وطن عزیز کی فکری عطا کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے ـــــ قابل ذکر ہیں۔

آلڈس ہکسلے اور آشروڈ کی پیروی میں ہمارے بعض ادبا بھی جنھوں نے کبھی اشتراکی ادبا و شعرا کے فن پارے پڑھنے کی زحمت نہیں کی، یہ الزام لگاتے رہتے ہیں کہ انقلاب کے بعد روس، چین وغیرہ میں تخلیق فن و ادب کے سوتے خشک ہو گئے ہیں گویا تفکر و تدبر کی طرح تخلیق فن بھی بورژوا اہل قلم ہی کا خاصہ ہے۔ محمد ارشاد صاحب کے خیال میں سنکی، ہشنگ، متکلم، کلبی، لایعنیت پسند، لاادری، نوفلاطونی، اور نوفیثاغورسی تو فلسفی کہلانے کے مستحق ہیں لیکن جو شخص جدلیاتی مادیت جیسے حیات پرور اور سائنٹفک نظریے سے فکری وابستگی رکھے وہ فلسفی نہیں ہو سکتا۔ یہاں اس بات کا

ذکر ضروری ہے کہ کوئی بھی سچا جدلیاتی مادیت پسند کارل مارکس کے فلسفے کو ٹھس تحکم (DOGMA) سمجھ کر اس کی تقلید جامد نہیں کرتا۔ مارکس کی اندھی تقلید کرنے والوں کو حقارت سے DOGMATISTS کہا جاتا ہے۔

(۲) محمد ارشاد صاحب کا ارشاد ہے:

"اس سلسلے میں جو موضوعات انھوں نے قائم کیے ہیں ان پر فلسفی کی حیثیت سے بحث نہیں کی بلکہ وہ اپنے ہر مقالے کی ابتدا میں ایک پرکار مورخ، درمیان شعلہ بار خطیب، اور آخر میں ایک پرجوش مبلغ کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ فلسفیانہ مسائل پر بحث کا یہ طریقہ ناقص ضرور ہے لیکن فلسفے میں "غیر تربیت یافتہ" قاری تک بات پہنچانے کا ایک موثر ذریعہ ہے:"

بات یہ ہے کہ "عام فکری مغالطے" اوسط درجے کے پڑھے لکھے قارئین کے لئے عام فہم پیرائے میں لکھی گئی تھی یہ کوئی ACADEMIC تصنیف نہیں تھی کہ اس میں بے مصرف اور بانجھ موشگافیوں سے کام لیا جاتا۔ راقم الحروف فلسفے کے علاوہ عالمی تاریخ و تمدن، تقابلی مذہب اور علم الانسان کا طالب علم بھی ہے اور جملہ مسائل خواہ وہ فلسفیانہ ہوں یا ادبی، عمرانی ہوں یا معاشی انھیں عالمی تاریخ اور عالمی تہذیب و تمدن ہی کے تناظر میں مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں کسی بھی علمی عقدے کو اس کے تناظر سے ہٹا کر محض موشگافیوں سے سلجھانے کی کوشش کی جائے گی تو غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ کیونکہ موشگافیاں حقایق کا بدل نہیں بن سکتیں۔ "پرکار مورخ" والی بات سمجھ میں نہیں آتی (مورخ کا کام تاریخی حقائق کا بیان اور تجزیہ ہے پرکاری سے کام لینا نہیں ہے۔ اگر میرے بیان کردہ حقایق درست نہیں ہیں تو محمد ارشاد صاحب ان کی نشان دہی کر دیں۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ "شعلہ بار خطیب" "پرکار مورخ" اور "پرجوش مبلغ" کے LABEL متن کے حوالے سے لگائے جاتے اور میری کتاب سے اقتباسات دے کر ان کی توثیق کی جاتی۔

(۳) محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں:

"جدلیاتی مادیت محض ایک فلسفہ ہی نہیں "مت" بھی ہے ... یہ لوگ بھی جنت اور جہنم میں یقین رکھتے ہیں۔ جنت غیر طبقاتی، اور غیر ریاستی معاشرہ جو مستقبل کے پردوں میں نہاں ہے (جنت کے لغوی معنی بھی پوشیدہ چیز کے ہیں) اور جہنم سائبیریا کے بیگار کیمپ جو جہنم کے ایک طبقے زمہریر سے کم نہیں اسی دنیا میں موجود ہیں۔"

مغربی سامراجیوں اور ملکی سرمایہ داروں کے گماشتے "دانشوروں" کو مارکسیت اور اشتراکیت کے خلاف نظریاتی محاذ کھولنے کا کام سونپا گیا ہے۔ ان لوگوں کے عجیب و غریب ہتھکنڈوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مارکسیت کو بار بار مذہب کہا جائے حتیٰ کہ محنت کش عوام اسے محض ایک مذہب سمجھ کر نظرانداز کر دیں۔ چونکہ آج کل عام طور سے مذہب کو فرسودہ سمجھا جاتا ہے اس لئے انھیں توقع اس بات کی ہے کہ عوام مذہب کی طرح مارکسیت کو بھی فرسودہ خیال کرنے لگیں گے۔ محمد ارشاد صاحب نے جدلیاتی مادیت کو "مت" کہہ کر ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ فرماتے ہیں:

"مذہب کا لفظ میں نے اس لئے استعمال نہیں کیا کہ ایک تو اس کے خلاف جدلیاتی مادیت پسندوں میں جذباتی ردعمل پایا جاتا ہے۔ دوسرے اس کے مفہوم میں کسی مافوق الفطرت ہستی پر اعتقاد بھی شامل ہے جو مت کے مفہوم میں شامل نہیں۔"

انھوں نے ہندو مت، بدھ مت اور جین مت کی مثالیں دی ہیں اور کہا ہے کہ یہ مت اس لئے ہیں کہ ان میں مافوق الفطرت ہستی پر اعتقاد نہیں رکھا جاتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علمائے تقابلی مذہب نے انہیں مذاہب عالم ہی میں شمار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ ہندو ہمیشہ ایک یا ایک سے زیادہ مافوق الفطرت ہستیوں پر عقیدہ رکھتے آرہے ہیں۔ قدیم آریا اندر، اگنی، سوریہ وغیرہ کو پوجتے تھے۔ آج کل وشنو کے اوتاروں رام اور کرشن کی پوجا انھیں شخصی خدا سمجھ کر کی جا رہی ہے۔ شکتی مت، تنتر مت، اور لنگا مت میں بھی شیو، شکتی دیوی یا پرش اور پرکرتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ محمد ارشاد صاحب کو مت کے مفہوم میں اشتباہ ہوا ہے۔ مت مذہب سے جدا نہیں ہوتا بلکہ اس کی زوال پذیر صورت ہوتا ہے۔ مذاہب زوال پذیر ہو کر متوں میں بٹ جاتے ہیں جب کسی مذہب کا رشتہ اخلاق و عمل سے منقطع ہو جائے اور وہ محض RITUAL کی ادائیگی بن کر رہ جائے تو وہ مت بن جاتا ہے۔ دنیائے اسلام میں غالی فرقوں

مثلاً بکتاشیوں، نخجیوں، یزیدیہ کے ہاں چند خفیہ رسوم و اذکار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ گویا انھوں نے اسلام کو متوں میں منقسم کر رکھا ہے۔ آج کل بے شک گوتم اور جین کے پیروؤں نے اپنے عظیم مذاہب کو مت بنا کر رکھ دیا ہے۔ تاریخی پہلو سے ان مسالک کی عظمت اس بات میں تھی کہ ان میں اخلاق و عمل کو مذہبی توہمات سے جدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ محمد ارشاد صاحب کا جدلی مادیت کو مت کہنا ناانصافی ہے اور ان کے تعصب بے جا پر دلالت کرتا ہے۔ جدلیاتی مادیت کسی RITUAL کی، رسمی رواجی ادائیگی کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک حیات افروز نظامِ فکر و عمل ہے جس نے کروڑوں انسانوں کے اخلاق و کردار پر صالح اور مثبت اثرات ثبت کیے ہیں اور جس نے انھیں ترقی کا نیا ولولہ ارزانی کیا ہے۔ محمد ارشاد صاحب کا یہ ارشاد بھی درست نہیں ہے کہ لفظ مذہب کے خلاف جدلیاتی مادیت پسندوں میں جذباتی ردعمل پایا جاتا ہے۔ جدلیاتی مادیت پسند مذہب کو فرد کا ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں اور ہر شخص کو اس کے عقیدے کے مطابق عبادت کا حق دیتے ہیں۔ یہ رویہ جذباتی نہیں حقیقت پسندانہ ہے۔

محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں کہ جدلیاتی مادیت پسند بھی "جنت" اور "جہنم" کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں استحصال سے پاک معاشرہ "جنت" ہے اور "جہنم" انھوں نے سائبیریا میں بسا رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جس معاشرے میں ذاتی املاک اور استحصال کی لعنتیں نہیں ہوں گی اس میں انسان صحیح معنوں میں خوشی، سکھ اور چین کی زندگی بسر کر سکیں گے لیکن اصطلاحی معنوں میں اسے جنت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس میں ہر شخص کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشتراکیوں نے اپنا عدن اسی دنیا میں بسانا ہے رہی سائبیریا کے جہنم کی بات تو یہ جہنم ہر کہیں موجود ہے۔ جہاں کہیں بھی ریاست ہوگی وہاں یہ جہنم لازماً موجود ہوگا۔ محمد ارشاد صاحب کو تسلیم ہے کہ آزادی سرمایہ دار اور ترقی پذیر ممالک میں بھی مفقود ہے۔ اس لیے میں "آزاد دنیا" سے سائبیریا کی مثالیں نہیں دوں گا۔ اشتراکیوں اور سرمایہ داروں کے "جہنم" اور "جنت" میں ایک فرق ضرور ہے۔ اشتراکیوں کی غالب اکثریت غیر استحصالی اور عادلانہ معاشرے کی جنت میں بستی ہے جب کہ مغرب کے چند سو ارب پتیوں نے اپنی جنت بسانے کے لیے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کروڑوں عوام کو افلاس اور احتیاج کے جہنم میں جھونک رکھا ہے۔

(۴) ارشاد ہوتا ہے:

"دوسری خامی جو ان کی تحریروں میں موجود ہے یہ ہے کہ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ کسی اصطلاح کا جو مفہوم ان کے ذہن میں ہے پڑھنے والا اس سے پورے طور پر آگاہ ہے۔ "انسانی فطرت ناقابل تغییر ہے" کی پوری بحث میں انھوں نے یہ بات واضح نہیں کی کہ انسانی فطرت سے ان کی ٹھیک ٹھیک مراد کیا ہے۔"

یہ عجیب استدلال ہے کہ چونکہ میں نے ایک اصطلاح "فطرت انسانی" کی تعریف نہیں کی اس لیے یہ بات میری تحریروں کی خامی بن گئی ہے۔ محمد ارشاد صاحب نے خود بھی "نجی ضمیر" کی اصطلاح کی تعریف کیے بغیر اسے برتا ہے۔ بہرحال چاہیے تو یہ تھا کہ محمد ارشاد صاحب فطرت انسانی کے مفہوم کے بارے میں مجھ سے وضاحت طلب کرتے اور پھر اختلاف کا کوئی عنوان پیدا کرتے لیکن انھوں نے یہ زحمت گوارا نہیں کی اور ان تعصبات کی بنا پر جو میرے فکری رویے کے بارے میں ان کے ذہن میں راسخ ہو چکے تھے، تنقید شروع کر دی۔ فطرت انسانی کوئی ادق اصطلاح نہیں تھی کہ اس کی تعریف کی ضرورت پیش آتی۔ فطرت انسان عبارت ہے ان بالقوہ صلاحیتوں پر مشتمل ہے جو پیدائشی طور پر انسان کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ اپنے ارشادات میں انھوں نے کھانے کی جبلت اور جنسی جبلت کا حوالہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ انھیں تبدیل کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ جب میں کہتا ہوں کہ انسانی فطرت کو بدلنا ممکن ہے تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ میں کھانے کی جبلت اور جنسی جبلت کی بیخ کنی کرنا چاہتا ہوں۔ محمد ارشاد صاحب نے جان بوجھ کر سیدھی سی بات کو پیچیدہ بنا دیا ہے تاکہ انھیں موشگافی کے جوہر دکھانے کا موقع مل سکے۔ جس مغالطے کی نشان دہی کرنا مقصود تھا وہ اس بات میں ہے کہ انسان فطرتاً بدکن، خبیث، تخریب کار، خودغرض اور قنوطی ہے جیسا کہ ولی اگسٹائن، شپنگلر، نیٹشے، سیزر لومبروسو اور فرائڈ کا ادعا ہے۔

فطرت انسانی کے بارے میں تین نظریے ہیں:

۱۔ انسانی ذہن پیدائش کے وقت ایک سادہ و صاف لوح کی طرح ہوتا ہے نیکی اور بدی کے رجحانات ابتدائی تربیت، تعلیم، ماحول اور

معاشرے کے اثرات سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

۲۔ انسان پیدائشی نیک ہے اور وہ غلط ماحول میں پرورش پا کر بد ہو جاتا ہے۔

۳۔ انسان پیدائشی بد ہے، خود غرض ہے، تابوچی ہے سنگ دل ہے۔

میرے خیال میں تیسری شق ایک خطرناک فکری مغالطہ ہے جس کا رد ضروری ہے۔ اس مغالطے کو مغرب میں کلیسائے روم کے آبا نے اور مشرق میں کرم کے نظریے کی صورت میں رواج دیا گیا تھا۔ آبار کلیسا کہتے تھے کہ جناب آدم نے حکم خداوندی سے سرکشی کر کے سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا اور یہ بدی تمام بنی نوع انسان کو ورثے میں ملتی ہے لہذا انسان فطرتاً بد ہے۔ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے مسیح منجی کو اس دنیا میں بھیجا تا کہ لوگ اس پر ایمان لا کر ازلی گناہ کی پاداش سے نجات پا سکیں۔ ازلی گناہ، موروثی بدی اور فطرتی خباثت کے یہ تصورات صدیوں سے انسانی مسرت کے سرچشمے میں زہر گھولتے رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں انسان فطرتاً نیک ہے کیونکہ اُس کی سرشت میں پدری اور مادری جبلتیں موجود ہیں جن کے دامن میں محبت پیار، لطف و کرم، احسان و مروت، ایثار و عطا، بے نفسی اور بے غرضی کے جذبات پنپتے رہے ہیں۔ زرعی معاشرے میں، جو شخصی املاک اور جبر و استحصال پر مبنی تھا، ان تعمیری اور مثبت میلانات کو پورے طور پر بروئے کار نہ لایا جا سکا اور وہ سلب و نہب، تصرف و تغلب، ہوس املاک اور لوٹ کھسوٹ کے تخریبی جذبات تلے دب کر رہ گئے۔ انسانی معاشرے کی ابتدائی صورت اشتمالی تھی۔ انسان کے قدیم آبا گروہوں کی شکل میں مل کر شکار کھیلتے تھے اور مل بیٹھ کر کھا پی لیتے تھے۔ مارگن نے اپنی کتاب "معاشرۂ قدیم" میں اس قدیم اشتمالیت کا ذکر کیا ہے جسے کارل مارکس اور جے۔ بی فریزر نے قبول کر لیا۔ یہ معاشرہ مادری (MATRIARCHAL) تھا۔ اس اشتمالی معاشرے میں عورت قبیلے کا مرکز و محور تھی اور مرد پر اُسے کامل سیادت حاصل تھی۔ بچے اُسی کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ املاک مشترکہ تھی یعنی ہتھیار، اوزار، جھونپڑے، کھالیں، شکار کا گوشت سارے قبیلے کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ابھی "میرا تیرا" کے الفاظ گھڑے نہیں گئے تھے۔ جیسا کہ آج بھی بعض قبائل کی بولیوں میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔ زرعی انقلاب کے بعد انسان نے شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بجائے بستیاں بنا کر رہنا شروع کیا، اور فصلیں اُگا کر گذر بسر کرنے لگا۔ زرعی انقلاب کے ساتھ زرعی معاشرہ وجود میں آیا اور ابتدائی بستیاں شہری ریاستیں بن گئیں جن کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کئے گئے۔ جنگلی قبائل کی دست برد سے بچنے کے لئے دفاع کا کام تنومند سرداروں کے سپرد کیا گیا اور وہ حصولِ املاک کے لئے ایک دوسرے پر ترکتاز کرنے لگے۔ یہیں سے ہوسِ املاک کے بے پناہ جنوں کا آغاز ہوا جو آج بھی جاگیرداری اور سرمایہ داری معاشرے میں باقی و برقرار ہے اور جس نے انسانی فطرت کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ جو لوگ انسان کو فطرتاً بد اور خبیث کہتے ہیں وہ اس حقیقت سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں کہ انسان جو قدیم اشتمالی معاشرے میں صلح و آشتی سے مل جل کر رہتا تھا، زرعی انقلاب کے بعد ذاتی املاک کی ہوس نے اُسے بد بنا دیا۔ آج بھی جہاں کہیں ذاتی املاک کا خاتمہ کر دیا گیا ہے انسان صلح و آشتی سے مل جل کر رہتا ہے اور اُس کی فطرت کے تعمیری اور مثبت میلانات بروئے کار آ گئے ہیں۔ اس کے برعکس بورژوا معاشرے کی اخلاقی قدریں وہی ہیں جو زرعی معاشرے میں ذاتی املاک کے ساتھ وابستہ تھیں، چنانچہ اس معاشرے میں عوام کا بے رحمانہ استحصال کیا جا رہا ہے۔

داخلی جبریت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

"ہمارے زمانے کے بعض علمائے نفسیات جن کا سرخیل فرائڈ ہے جبرِ مطلق کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں انسان اپنی جبلتوں کے ہاتھوں مجبورِ محض ہے اور یہ خیال کہ اُسے اپنے کسی فعل پر اختیار حاصل ہے واہمہ بے بنیاد سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا جا سکتا۔"

میں نے اسی جبرِ مطلق کے رد میں دلائل دیئے تھے۔ سی ای ایم جوڈ نے فرائڈ کی جبریت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ فرائڈ کے خیال میں انسانی عقل و خرد اس دُم کی طرح ہے جو ایک بھوکے کتے کی ناک کے پیچھے پیچھے چلنے پر مجبور ہو۔ میں ایسا جبرِ مطلق کا قائل نہیں ہوں۔ میرے خیال میں عقل و فکر نے انسان کے بطون میں اُن جبلتوں کا تصرف باقی نہیں رہنے دیا جو ابھی تک حیوانات کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو انسان آج بھی درندوں کی طرح بھٹوں میں گذر بسر کر رہا ہوتا اور

تہذیب و تمدن کی طرف ایک قدم آگے نہ بڑھا سکتا۔ میں جبرِ مطلق کے ساتھ کامل قدر و اختیار کا بھی منکر ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ انسان نے عقل و خرد کے طفیل جبریت کے دائرے میں رہتے ہوئے اختیار کو پالیا ہے۔ یہ اختیار جبر ہی کی تفہیم سے پیدا ہوا ہے۔ جیسا کہ مثلاً ابتدا میں انسان قدرت کے قوانین کے ہاتھوں مجبورِ محض تھا کیونکہ وہ انھیں سمجھنے سے قاصر تھا لیکن مرورِ زمانہ سے عقل و خرد کی نشوونما کے ساتھ وہ ان قوانین کو سمجھنے کے قابل ہوگیا اور ان سے کام لینے لگا۔ اس طرح گویا اس نے جبر میں اختیار کو پایا۔ جب میں نے یہ لکھا تھا کہ عقل انسانی جبلتوں پر تصرف کر سکتی ہے تو میرا مطلب ظاہراً یہ تھا کہ وہ ان کی آہنی گرفت کو توڑ کر انھیں تعمیری راہوں کی طرف موڑ سکتی ہے۔ جس طرح حیات نے مادے کے جبر کو توڑا تھا اور جبلتوں نے حیات کے جبر سے نجات پائی تھی، اسی طرح عقلی قویٰ نے جبلتوں کے جبر کو توڑ دیا۔ حیات نے مادے کا جبر توڑتے ہوئے مادے کا یا جبلتوں نے حیات کا جبر توڑتے ہوئے حیات کا استیصال تو نہیں کر دیا تھا۔ اسی طرح عقل نے بھی جبلتوں کا استیصال نہیں کیا اور نہ وہ ان کا استیصال کر سکتی ہے بلکہ ان کے جبر کے دائرے میں رہ کر قدر و اختیار کو پالیا ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ حیوانات کو ارادے کی آزادی اسی لئے حاصل نہیں ہے کہ وہ عقل اور سوجھ سے محروم ہیں۔ محمد ارشاد صاحب میرے ایک "مغالطے" کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انھوں نے جبلتوں کے اظہار میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو خود جبلتوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں قیاس کر لیا ہے۔"

میرے الفاظ تھے:

"علم الانسان کے طلبہ ہمیں بتاتے ہیں کہ گزشتہ کم و بیش دس ہزار برسوں میں جبلتوں کے طرزِ اظہار میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں، مثلاً ترویجِ تمدن سے پہلے انسان اپنی جنسی جبلت کی تشفی کم و بیش وحوش ہی کی طرح کرتا تھا لیکن تہذیب و تمدن کی بدولت وہ عشق و محبت کے لطیف جذبات سے آشنا ہوا۔ اسی جذبے کی ترجمانی فنون لطیفہ اور تصوف و عرفان کی نشاۃ کا باعث ہوئی۔ عقل و شعور سے محروم ہونے کے باعث وحوش بدستور اپنی وضع پر قائم ہیں، جب کہ آج جو شخص ان کی طرح فاحش طریقے سے جنس کی تسکین کرتا ہے اُسے انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے۔"

یہاں میں نے جبلتوں کے اظہار ہی میں تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ محمد ارشاد صاحب نے متن کا غور سے مطالعہ نہیں کیا۔ اس غلط فہمی نے اس باب سے متعلق ان کے سارے استدلال کی نفی کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:

"عادت پذیری کی صلاحیت اگر انسانی فطرت میں تغیر پذیری کا ثبوت ہو سکتی ہے تو پھر یہی صلاحیت چونکہ حیوانوں میں بھی موجود ہے جس کا انھیں اقرار ہے حیوانی فطرت میں بھی تغیر پذیری کا ثبوت ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ حیوانوں کو جبلتوں کا محکوم ہونے کے باعث اور آزادیٔ ارادہ کے فقدان کی بنا پر داخلی طور پر مجبور سمجھتے ہیں، اور ان میں داخلی جبریت کے اثبات کی وجہ سے حیوانی فطرت کو قابلِ تغیر نہیں سمجھتے، حالانکہ عادت پذیری کی دلیل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی فطرت بھی قابلِ تغیر ہے۔"

میں لکھ چکا ہوں کہ انسان نے عقل و خرد کے طفیل جبلتوں کے آہنی تصرف کو توڑ کے رکھ دیا اور قدر و اختیار کی راہ نکالی تھی، اس لئے قدرۃً اس کی عادت پذیری کا دائرہ حیوانی فطرت کی عادت پذیری کی بہ نسبت کہیں زیادہ وسیع ہے۔ مثلاً پاولوف نے کتوں پر تجربے کرتے ہوئے ان کی بھوک کو گھنٹی کی آواز سے معتاد (CONDITIONED) کر دیا تھا کہ ایک غیر ذی شعور حیوان کے لئے یہی کچھ ممکن ہو سکتا تھا۔ انسان ذی عقل و ذی فکر ہے، اس لئے جیسا کہ بعض اہل نظر نے کہا ہے مناسب عادات رائج کر کے بچے کے کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ انسان ذی عقل ہے اس لئے اسے مناسب معاشی و عمرانی ماحول مہیا کر کے اس کے تخریبی میلانات کو جو صدیوں پر پھیلے ہوئے زرعی معاشرے کی باقیات، سیئات میں سے ہیں، تعمیری و مثبت پیرایۂ اظہار دیا جا سکتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جرائم ہوس، رشک، جلن، لالچ اور حسد کے پروردہ ہیں، اس لئے ہم شخصی املاک اور استحصال سے پاک عادلانہ معاشرہ قائم کر کے ان کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ جہاں طبقاتی تفریق ہو گی وہاں افلاس و احتیاج نہیں ہوں گے جن کے دامن میں اکثر

بداعمالیاں پرورش پاتی ہیں۔ جہاں تمام شہریوں کو خوراک، لباس، رہائش، علاج معالجے، تعلیم و تفریح کے یکساں مواقع میسر ہوں گے وہاں انسان کی تعمیری صلاحیتیں اُبھر آئیں گی۔ اس اجتماعی CONDITIONING سے گویا ایک نیا انسان جنم لے گا جس کے آثار ہمارے زمانے کے اشتراکی معاشرے میں ابھی سے دکھائی دینے لگے ہیں۔

(۵) محمد ارشاد صاحب "یہ کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"وقت کا دولابی تصور مابعد الطبیعیات میں بھی ہیئت سے آیا ہے۔ آج سے ٹھیک ایک سال بعد زمین سورج کے سامنے اسی پوزیشن میں ہوگی جس میں آج ہے۔ تاریخ کے اپنے آپ کو دہرانے یا نہ دہرانے کا وقت کے "حقیقی" یا دولابی تصور سے کوئی تعلق نہیں۔"

یہاں بھی محمد ارشاد صاحب نے HOME—WORK نہیں کیا۔ اُن کا یہ خیال درست نہیں کہ وقت کا دولابی تصور ہیئت سے مابعد الطبیعیات میں آیا تھا کیونکہ یہ تصور اُس وقت سے موجود ہے جب کہ کرۂ ارض کی سورج کے گرد سالانہ گردش کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ پارمے نائدیس کی وجودیت اور بادرائن کی ادویت واد میں زمان کو غیر حقیقی مانا گیا ہے۔ زمان کے غیر حقیقی ہونے کی تعبیر زمان کے دولابی ہونے کی صورت میں کی گئی اور اس کے بعد فلاسفۂ تاریخ نے یہ کہہ کر اس کی ترجمانی کی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ زمان کے غیر حقیقی ہونے کے عقیدے کے باعث اکابر وحدت الوجودی شنکر، سپینوزا، ابن العربی کائنات کے خاتمے کے منکر ہیں۔ زمان کے حقیقی ہونے کا تصور مجوسی WELTANSCHAUUNG کی دین ہے جسے ٹائن بی نے مغرب کے لئے مجوسیت کی شاندار عطا کہا ہے۔ کارل مارکس نے تاریخ کی حرکت کو SPIRAL کہا ہے۔ اس کی رو سے تاریخی عمل ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

"تاریخ کا خط مستقیم پر عمل بھی جبریت اور یاسیت پر اسی طرح منتج ہوتا ہے جس طرح دَوری عمل۔ اگر زمان کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی تو اس طرح شاندار ارتقاء جو تاریخ کی حرکتِ دولابی کے خلاف دلیل ہے بالآخر فنا سے دوچار ہو جائے گا اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یاسیت نہیں تو اور کیا ہے۔"

بات یہ ہے کہ زمان کے آغاز و انجام کو ہم اپنے محدود ذہن پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اسرائیلی مذاہب میں، جو زمان کی حرکتِ مستقیم کے قائل ہیں، یہ حرکت کرۂ ارض کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہے گی اور شقی و سعید ارواح حظ و مسرت یا عذاب و عتاب کی کیفیات سے گزرتی رہیں گی۔ جدلیاتی مادیت پسند سی عالم میں ترقی کے انتہا ممکنات کے قائل ہیں۔ یاسیت اور رجائیت کا تعلق بے شک مزاج سے ہے لیکن منفی و سلبی افکار قومی اور عمومی مزاج کو بھی متاثر کر سکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں جیسے کہ مثلاً گوتم کے قنوطی نظریے نے صدیوں تک اکثر مشرقی اقوام کے قوائے عمل کو مفلوج کئے رکھا اور اُن سے عملی جدوجہد کر کے اپنے معاشرے کو سنوارنے کا جذبہ چھین لیا تھا۔ یہی حال زمان کے دولابی تصور یا تاریخ کے اپنے آپ کو دہرانے کے خیال کا ہے۔ یہ تصور لوگوں کے ذہن میں نفوذ کر گیا تو اُن کی اقدام اور مبادرت کی قوتیں سلب ہو جائیں گی۔

میں نے زمان کی دولابی حرکت کو رد کرنے کے لئے "مابعد الطبیعیاتی موشگافیوں" سے کام نہیں لیا بلکہ محض تناظر کی خاطر اس کے مابعد الطبیعیاتی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مجھے اس نوع کی موشگافیوں کی ضرورت بھی نہیں تھی جیسے تاریخ نوعِ انسان کا مطالعہ کیا تو مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا نہیں رہی بلکہ ارتقاء پذیر ہے۔ یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کے اثبات کے لئے کسی قسم کی موشگافیوں سے رجوع لانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

ارشاد ہوتا ہے :

"اگر زمان کے حقیقی یا دولابی تصور پر مابعد الطبیعیات کی موشگافیوں سے ہٹ کر صرف امکانات کو پیشِ نظر رکھ کر بات کی جائے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آئندہ عالمی جنگ تہذیب و تمدن کے تمام مراکز کو نیست و نابود کر دے گی۔"

بے شک یہ امکان موجود ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تو ممکن ہو سکتا ہے کہ جرائم پیشہ سامراجی، عالمی جنگ چھیڑ کر اپنی کامل بربادی اور ہلاکت کو دعوت

نہ دیں، امکان غالب یہ ہے کہ ان کا تنزل پذیر معاشرہ عالمی تاریخ کے دوسرے تنزل پذیر معاشروں — سومیر، بابل، اشور، کنعان، کریٹ، مصر قدیم، یونان، روم، بغداد، چین وغیرہ کی طرح خود گل سڑ کر ختم ہو جائے گا۔ محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں:

"علی عباس صاحب کو غالباً اس وجہ سے مغالطہ ہوا کہ وہ ایسی تعامیم (GENERALIZATIONS) میں (۱) انسانی معاشرہ ارتقا پذیر ہے (۲) ہر تمدن عروج کے بعد تنزل کا شکار ہوتا ہے" جن میں ہر ایک کی بنیاد ہمارے مشاہدات پر ہے تطبیق کیوں کر ممکن ہے۔ انھوں نے ان کو ایک دوسرے کے متناقض پا کر دوسرے کو درست ماننے سے انکار کر دیا ہے .... ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر تمدن زوال سے دوچار ہوتا ہے اور عمل ارتقا میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ قدیم اقوام سمیری، مصری، فونیقی، اسوری، بابلی، ایرانی یکے بعد دیگرے آئیں اور اپنے پیچھے تہذیبی و علمی ورثہ چھوڑ گئیں۔ ان کے بعد یونانی آئے اور اس تہذیبی علمی ورثے کو آگے بڑھایا۔ یونانیوں کے بعد رومی آئے۔ یونانیوں نے جو کچھ چھوڑا تھا اسے کسی حد تک ترقی دی۔ رومی گئے تو عرب آئے۔ انھوں نے نوع انسانی کے اس ورثے میں اضافہ کیا۔ عرب بھی گئے۔ اب مغرب نے ان کے چھوڑے ہوئے تہذیبی اور علمی ورثے کو جہاں پہنچایا ہے سب کے سامنے ہے۔"

مجھے محمد ارشاد صاحب سے شکایت ہے کہ وہ متن کتاب کو غور سے نہیں پڑھتے۔ میرا باب ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

"تمدن دم توڑتے رہتے ہیں لیکن ان کی ترقی پرور روحیات (قوت روایات) ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ عمل ارتقا کی مزاحمت کی جا سکتی ہے، اس کی رفتار کو سست کیا جا سکتا ہے لیکن اسے کسی خاص مرحلہ پر روک دینا تو کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔"

محمد ارشاد صاحب نے محولہ بالا اقتباس میں میرے ہی خیال کی وضاحت کی ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے کہ انھوں نے مغالطہ مجھ سے منسوب کر دیا ہے اور اسے دور کرنے کا CREDIT خود لے لیا ہے۔

(۶) میری کتاب کے باب "یہ کہ بے راہ روی کا نام آزادی ہے" پر تنقید لکھتے ہوئے محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں کہ سوویٹ روس کا تنظیمی ڈھانچا کلیسائے یونان کے تنظیمی ڈھانچے کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے مغرب کے "بورژوا دانشوروں" کی ایک گھسی پٹی دلیل من و عن دہرا دی ہے۔ اگر بالشویکوں نے کلیسائے یونان کے تنظیمی ڈھانچے کے کچھ پہلو اخذ کیے ہیں تو اسے ان کی تنقیص کا عنوان نہیں بنایا جا سکتا۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں ایسا ہوا ہے۔ عباسیوں نے ساسانیوں کا تنظیمی ڈھانچا اپنا لیا تھا۔ انگریزوں نے مالگذاری نظام مغلوں سے لیا۔ کلیسائے روم کا تنظیمی ڈھانچا روما الکبریٰ سے ماخوذ ہے۔ اگر بالشویکوں نے کلیسائے یونان کی تنظیم کے کچھ پہلو اخذ کیے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ کیا چین، کیوبا، البانیا، شمالی کوریا، ویت نام، جنوبی یمن وغیرہ کے تنظیمی ڈھانچے بھی کلیسائے یونان ہی سے لیے گئے ہیں؟ دوسری علمی اور تہذیبی روایات کی طرح نظم و نسق کی روایات بھی انسانی میراث کا حصہ ہیں اور اپنی ملکی و سیاسی ضروریات کے مطابق ہر قوم کو ان سے استفادہ کرنے کا حق ہے۔ یاد رہے کہ کلیسائے یونان کا تنظیمی ڈھانچا روس ہی میں تشکل پذیر ہوا تھا کہیں باہر سے تو درآمد نہیں کیا گیا تھا۔

میں نے مغالطۂ زیر نظر کا تاریخی تناظر تفصیل سے پیش کیا ہے اور متعلقہ نظریات کا احاطہ کیا ہے جسے محمد ارشاد صاحب نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور حسب معمول اس مسئلے کو اس کے تناظر سے ہٹا کر موشگافیوں سے کام نکالنے کی کوشش کی ہے۔ نام نہاد مغربی جمہوریت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے برٹرینڈ رسل سے ایک اقتباس دیا تھا:

"جمہوریت میں تاجروں اور صنعت کاروں کو لوٹنے کی آزادی حاصل ہے اور محنت کشوں کو بھوکوں مرنے کی آزادی میسر ہے۔"

بس یہی فرق مغربی جمہوریت اور اشتراکی نظام میں ہے۔ اشتراکی ریاست میں نہ تاجروں اور صنعت کاروں کو لوٹ کھسوٹ کی آزادی دی جاتی ہے اور نہ محنت کشوں کو بھوکوں مرنے کی آزادی میسر ہے۔ تمام شہری معاشرے کی عمومی فلاح کے لیے محنت کرتے ہیں۔ اُن کی محنت کا ثمرہ چند طفیل خوار ارب پتیوں کی تجوریوں میں نہیں جاتا بلکہ تمام شہریوں پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ وہ محنت اس لیے نہیں کرتے کہ محنت بیگار ہے بلکہ اسے فطرت کا ایک تقاضا

اور معاشرے کا بنیادی فریضہ سمجھ کر کام کرتے ہیں۔ جہاں تک نظم و ضبط کا تعلق ہے، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے، کوئی بھی ریاست اس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ پھر ریاست میں نظم و ضبط کو قائم رکھنے کے لئے چند قوانین نافذ کئے جاتے ہیں جن کی پابندی ہر شہری پر لازم ہوتی ہے۔ ایک عام شہری اور ایک جرائم پیشہ میں یہی فرق ہے کہ ایک عام شہری ملکی قوانین کا پابند ہے، اس لئے آزادانہ چل پھر سکتا ہے جب کہ ایک مجرم قوانین کو توڑ کر من مانی کرنا چاہتا ہے اس لئے جیل میں پابند کر دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ سچی آزادی پابندی میں ہے، بے راہ روی میں نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں جبر کے حدود میں رہ کر ہی اختیار کو پایا جا سکتا ہے۔ اشتراکی معاشرے میں نظم و ضبط کی ضرورت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ وہ خطرناک اور مہم باز سامراجیوں کے حلقے میں گھرا ہوا ہے جو اسے تباہ و برباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مزید براں یہ نظم و ضبط ہی کا ثمرہ ہے کہ اشتراکی معاشرے کو کسبیوں، گداگروں، سود خواروں، دین فروشوں، اور عیاش امراء کے ناپاک وجود سے پاک کر دیا گیا ہے۔ نام نہاد "آزادیٔ فرد" کے نام پر کسبیوں کو عصمت فروشی، گداگروں کو بھیک مانگنے، سرمایہ داروں کو محنت کشوں کا استحصال کرنے، سود خواروں کو بیٹھے بٹھلائے دوسروں کا مال اینٹھنے، دین فروشوں کو مذہب کے نام پر ریکٹ چلانے، بیکار امراء کو عیش کوشی کی آزادی نہیں دی جا سکتی۔

محمد ارشاد صاحب کو اشتراکی معاشرے سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے "مجدّدین کو جو کسی نہ کسی حد تک نراجی (ANARCHIST) رہے ہیں "شوقِ فضول" اور "جرأتِ رندانہ" کے اظہار کی آزادی حاصل نہیں ہے جب کہ اُن کے خیال میں معاشرے کی ترقی کے لئے ان "نراجی مجددین" کا وجود ضروری ہے۔ کیا محمد ارشاد صاحب تاریخِ عالم میں کسی بھی ایسے معاشرے کی نشان دہی کر سکیں گے جس میں "نراجی مجددین" کو اس نوع کی آزادی حاصل رہی ہو؟ محمد ارشاد صاحب کو تسلیم ہے کہ سرمایہ دار ممالک میں بھی پابندیاں موجود ہیں اس لئے میں اُن کا تفصیلی تقابل اشتراکی معاشرے سے نہیں کروں گا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ ہائڈ پارک کے چند سر پھروں اور YIPPIES, HIPPIES, ROCKERS, BEATLES, MODS وغیرہ کو بے راہ روی کی اجازت اس لئے دی گئی ہے کہ ملک کا نوجوان طبقہ اپنے اپنے خبط (FAD) میں غلطاں رہے اور اپنے ملک کے سرمایہ دار سامراجی طبقے کی ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں سے غافل ہو جائے۔

(۷) "یہ کہ ماضی کتنا اچھا زمانہ تھا" کے بارے میں محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں:

"میں علی عباس صاحب کے نقطۂ نظر کی تردید تو نہیں کروں گا لیکن تائید بھی نہیں کر سکتا۔"

یہاں مجھے ایک حکایت یاد آ گئی۔ کہتے ہیں کہ فلسفۂ تشکک کا بانی پیرہو مر گیا تو اُس کے شاگرد کئی روز اُس کی نعش کے قریب بیٹھے منطقیانہ بحث کرتے رہے کہ اپنے فلسفے کی رو سے ہم کیسے یقین کریں کہ ہمارا استاد مر گیا ہے۔ کسی نے کہا اس کے کفن دفن کا سامان کرو بیکار بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو۔ ایک مشکک بڑی متانت سے کہنے لگا:— "ہمیں شک ہے کہ یہ مر گیا ہے، اور ہمیں یہ بھی شک ہے کہ یہ زندہ ہے۔ اسے دفن کیسے کریں!"

اپنی گومگو کیفیت کے اظہار کے بعد محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں:

"وہ خود پنجاب کے رہنے والے ہیں تقسیم کے وقت سرحد کے دونوں طرف جو کچھ ہوا اُس کی طرف اُن کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔"

تقسیمِ ہند کے موقع پر سرحد کے دونوں جانب خون کی جو ہولی کھیلی گئی تھی اُس کی کچھ بھیانک جھلکیاں میں نے بھی دیکھی تھیں۔ اُن کی یاد میرے ماضی کی نہایت تلخ یادوں میں سے ہے۔ یہ لکھتے ہوئے بھی میں اپنے حلقوم میں اس کڑواہٹ کو محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے "یہ کہ ماضی کتنا اچھا زمانہ تھا" میں لکھا ہے:

"تقسیمِ ہند کے موقع پر مذہب کے نام پر کم و بیش پندرہ لاکھ بے قصور انسان نہایت سفاکی سے تہہ تیغ کر دیئے گئے۔" (صفحہ ۴۲، سطر ۱۴)

معلوم ہوتا ہے کہ محمد ارشاد صاحب نے یہ باب روا روی میں پڑھا ہے۔ مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ اُنھوں نے میری ساری کتاب کا سرسری مطالعہ کیا ہے۔

محمد ارشاد صاحب نے اپنی تحریر کو جا بجا شعروں اور مصرعوں سے سجایا ہے۔ میں ان اشعار اور مصرعوں سے محظوظ تو ہوتا رہا لیکن قدرۃً انھیں محمد ارشاد صاحب کے استدلال کا حصہ سمجھنے سے گریز کرتا رہا۔ ایک شعر البتہ ایسا ہے جس میں ایک گمراہ کن مغالطہ مخفی ہے جس انداز میں اُنھوں نے اسے اپنے عقیدے کی توثیق کے لئے برتا ہے اُس پر گرفت کئے بغیر چارہ نہیں۔ شعر درج ذیل ہے:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

ہمارے خیال میں قدیم وجدید میں فرق روا نہ رکھنا انتہائی کم نظری کی دلیل ہے اور ایک ترقی دشمن ہی اس بیّن فرق کا منکر ہو سکتا ہے۔ ہم مختصراً ان عوامل کا ذکر کریں گے جو جدیدیت کی تشکیل کا باعث ہوئے ہیں۔

۱۔ سائنس کے فروغ کے ساتھ قیاس اور عقیدے کی جگہ مشاہدے اور تجربے کو ادراکِ حقیقت کا وسیلہ مان لیا گیا ہے جس سے انسان کو اُن توہمات سے نجات مل گئی ہے جنھوں نے زمانۂ ماقبل تاریخ سے بنی نوع انسان کو دہشت اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سائنس کے رواج و قبول کے باعث انسان کی ذہنی قوتیں اور صلاحیتیں جو قدیم زمانے سے بے مصرف الہیاتی اور مابعد الطبیعیاتی عقدوں کی تحلیل پر ضائع ہو رہی تھیں۔ اب ٹھوس عقدوں کو سلجھانے میں صرف ہو رہی ہیں۔

۲۔ زرعی معاشرے کی فردیت (INDIVIDUALISM) کی جگہ اجتماعیت (COLLECTIVISM) کا دور دورہ ہے۔ فردیت ذاتی املاک پر قائم تھی، اجتماعیت مشترکہ املاک پر مبنی ہے۔ اشتراکی معاشرے میں اجتماعیت کا یہ رجحان پنپ رہا ہے۔

۳۔ جدید سائنس کے انکشافات نے زرعی دور کی ازلی و ابدی قدروں کے بجائے اضافی قدروں کا تصور پیش کیا ہے۔

۴۔ زرعی معاشرے کا اخلاق شخصی املاک کے ساتھ وابستہ تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد شخصی املاک کے قدیم تصور کی جراحت ہوئی۔ مغرب کے سامراجی اور سرمایہ دار معاشرے میں زرعی معاشرے کی فرسودہ قدروں کو جو استحصال پر مبنی تھیں باقی و بحال رکھنے کی ناپاک کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اشتراکی ممالک میں جہاں شخصی املاک کا خاتمہ کرکے اجتماعی املاک کو معاشرے کی بنیاد سمجھ لیا گیا ہے۔ وہاں کی اخلاقی قدریں بھی بدلتی جا رہی ہیں۔ زرعی دور کے استحصالی معاشرے کی اخلاقی قدریں فردیت، شخصی مفاد و شخصی املاک پر مبنی تھیں چنانچہ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کے حصول میں کوشاں رہتا تھا اور اسے عین اخلاقی عمل سمجھتا تھا۔ اشتراکی صنعتی معاشرے کی اخلاقی قدریں اجتماعیت اور مشترکہ املاک کے تصورات پر مبنی ہیں اس لئے اس معاشرے کے افراد ذاتی مفاد یا ذاتی نجات کے حصول میں کوشاں نہیں ہوتے بلکہ عمومی فلاح کے لئے کام کرتے ہیں گویا زرعی معاشرہ اور حالیہ سرمایہ داری استحصالی معاشرہ انا پرستی (EGOTISM) پر مبنی ہے۔ جب کہ صنعتی اشتراکی معاشرہ عمومی فلاح کے احساس (ALTURISM) پر قائم ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ جدید اشتراکی معاشرے میں نئی معاشی اور اخلاقی قدریں رواج پا رہی ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ان قدروں کی اساس ذاتی املاک و فردیت نہیں رہی بلکہ مشترکہ املاک، اجتماعیت اور عمومی فلاح ان کا سنگِ بنیاد بن گئی ہے۔

۵۔ زرعی معاشرے میں عورت کو شخصی املاک میں شمار کرتے تھے۔ مرد کے سامنے اس کی حیثیت محض ضمنی اور ثانوی تھی، بردہ فروشی نے عورت کو قعرِ ذلت میں دھکیل دیا تھا۔ لونڈیاں بھیڑ بکریوں کی طرح بازاروں میں بکتی تھیں۔ بردہ فروشی کے انسداد کے ساتھ اور صنعتی معاشرے کی نئی سماجی قدروں کے رواج کے ساتھ مرد کی سیادت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مغرب کے سرمایہ دار معاشرے میں عورت نے آزادی کا مفہوم یہ لیا ہے کہ اُسے بھی مرد کی جیسی جنسی بے راہروی کی آزادی مل گئی ہے لیکن اشتراکی معاشرے میں عورت سچی آزادی سے ہمکنار ہو گئی ہے وہ بھی مرد کی طرح علمی و عملی کارنامے انجام دے رہی ہے۔

۶۔ سائنس کے انکشافات نے حقیقت پسندی کو فروغ دیا ہے۔ باطنیت کی تاریکیاں چھٹ گئی ہیں اور انسان نے اوہام و خرافات کے دھندلکوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

حاصل ان تشریحات کا یہ ہے کہ مشترکہ املاک، اجتماعیت، عمومی فلاح کے احساس، سائنسی طرزِ تحقیق، حقیقت پسندی اور عورت کے مقام کی بحالی نے جدیدیت کو جنم دیا ہے جس سے انکار کرنا کوتاہ بینی کی دلیل ہوگی۔

(۸) چوتھے باب "یہ کہ فلسفہ جاں بلب ہے" پر محمد ارشاد صاحب نے خصوصی توجہ فرمائی ہے۔ اس باب کے تجزیے میں اُن کی مشیخت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ بہر صورت محمد ارشاد صاحب کے اعتراضات کا جائزہ لینے سے پہلے یہ کہنا ضروری ہے کہ اس باب کے لکھنے کا مقصد پڑھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے سائنس اور فلسفہ کے قدیمی تعلق کے بارے میں ایک جائزانہ منظر پیش کرنا تھا تاکہ وہ جان سکیں کہ سائنس اور فلسفہ کا ابتدا ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔

اپنی دوسری کتابوں میں، البتہ میں نے تفصیل سے کام لیا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ محمد ارشاد صاحب نے راقم الحروف کے علم میں کتنا اضافہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"علی عباس صاحب نے تاریخ فلسفہ و سائنس من وعن اسی طرح بیان کی ہے جو اہل یورپ کا بالعموم معمول ہے۔ علمائے یورپ ان غیر یورپی علمی و فکری تحریکات کی طرف اشارہ تک نہیں کرتے[1] جن سے فلسفے اور سائنس نے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ علی عباس صاحب بھی اُن کی تقلید میں دائرے میں چکر لگا کر نکل گئے ... یونان کے ابتدائی عہد کے تمام فلسفی، ایشیائے کوچک کے رہنے والے تھے۔ انکسی مینیز، طالیس، انکسی منڈر ملیطس کے رہنے والے تھے۔ ہیرقلیطس افیسس کا رہنے والا تھا اور فیثا غورث سلاموس سے تعلق رکھتا تھا ... یونانیوں کا ایشیا اور مصر کے ساتھ جغرافیائی قرب اور اس بنا پر اس کے تہذیب و تمدن کے گہرے اور دور رس اثرات جن کو جنبشِ سر[2] کی حد تک اہل یورپ بھی تسلیم کرتے ہیں، انھیں اس نتیجے کی حد تک پہنچنے میں کوئی مدد نہیں دیتے کہ یہ معجزہ نہیں تھا ... یونانی فلسفیوں کو سائنس کا بانی قرار دینا اہل یورپ کے تعصب کا اعادہ ہے۔ یونانی ذہن فلسفے کے لئے جتنا موزوں تھا سائنس کے لئے اتنا غیر موزوں۔ سائنس یا طبعی علوم کا اصل وطن مشرقِ اوسط تھا۔ یونانی سرزمین میں یہ پودا بار آور نہ ہو سکا۔"

اب میری کتاب "روحِ عصر" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو بذاتِ خود اپنی تشریح بھی ہے:

"طالیس ملطی کو متفقہ طور پر فلسفے اور نظری سائنس کا موسس تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ یورپین نہیں تھا جیسا کہ عام طور سے مشہور ہے بلکہ فنیقی الاصل ایشیائی تھا۔ اُس نے مصر اور مشرقِ قریب کے دوسرے ممالک سے مختلف علوم کی تحصیل کی اور ریاضی اور ہندسہ میں کمال حاصل کیا۔ اُس نے سب سے اول ہندسہ کی اشکال مرتب کیں جن سے بعد میں اقلیدس نے استفادہ کیا تھا۔ اُس نے حساب لگا کر ۲۰ رمئی ۵۸۵ ق م کے دن سورج گرہن کی پیش گوئی کی جو اہل مغرب کے لئے بڑی حیرت کی بات تھی۔ طالیس ملیطس کا باشندہ تھا جو بحیرۂ روم کے ساحل پر ایشیا، میں واقع تھا۔ تاریخ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایرانیوں کی فاتحانہ یلغار سے خائف ہو کر ملیطس اور دوسرے ساحلی شہروں کے باشندے بھاگ کر یونان جا بسے اور اپنے ساتھ فلسفہ اور سائنس بھی لیتے گئے۔ نتیجۃً طالیس اور اُس کے شاگردوں کے افکار ایشیا کی سرزمین میں جڑ نہ پکڑ سکے۔" (پہلا ایڈیشن ص ۲۸)

ارشاد ہوتا ہے:

"یورپ کی فکری تاریخ میں دوسرا ڈرامہ قسطنطنیہ کی ترکوں کے ہاتھوں شکست سے شروع ہوتا ہے۔ یونانی علما بھاگ بھاگ کر اطالیہ پہنچے، یونانی مسودات کے ترجمے شروع ہوئے جو تحریک احیاء العلوم کی بنیاد بنے اور نتیجۃً یورپ دورِ جدید میں داخل ہو گیا۔ یہ افسانہ محض اس لئے گھڑا گیا کہ عہدِ جدید سے براہِ راست یونان سے تعلق قائم کر کے قرونِ مظلمہ کی وسیع خلیج پر پل باندھ دیا جائے، اور یہ شرمندگی نہ اٹھانی پڑے کہ غیر یورپی اقوام کے بھی ہم پر کچھ احسانات ہیں۔ یہاں بھی، اطالیہ اور فرانس کا مسلم سپین اور سسلی کے قُربِ مکانی اور یورپی علماء کی تحصیلِ علم کے لئے سپین میں موجودگی۔ عربی کتب کے لاطینی زبان میں تراجم (جو ۱۲ ویں صدی کے اوائل میں شروع ہو چکے تھے)، انھیں اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں دیتے کہ اس ڈرامے کا پہلا سین کسی اور طریقے سے پیش کیا جا سکتا تھا۔"

اس ضمن میں بھی "روحِ عصر" ہی سے ایک اقتباس درج ذیل ہے جو محتاجِ تشریح نہیں ہے:

"ابنِ رشد کے حقیقتِ دوگونہ کے نظریے نے خاص طور پر اہلِ مغرب کو متاثر کیا۔ اُس نے کہا کہ حقیقت کے دو رُخ ہیں ایک مذہبی اور دوسرا فلسفیانہ یا عقلی لہٰذا مذہبی عقاید میں فلسفے کو دخیل نہیں ہونا چاہیئے اور فلسفے کے مسلمات کو مذہبی عقاید کی روشنی میں نہیں جانچنا چاہیئے۔ اُس کا خیال تھا کہ قرآن مجید تصفیۂ اخلاق کے لئے نازل کیا گیا تھا، وہ فلسفے کی کتاب نہیں ہے جیسا کہ متکلمین سمجھے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ متکلمین کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآنی آیات کی فلسفیانہ تاویلیں کریں۔ حقیقتِ دوگونہ کا یہ نظریہ ابن رشدیت کی تحریک کے نام سے یورپ میں شائع ہوا۔ سائگر برے بانٹ اُس کا بڑا معتقد تھا اُس کی ہمنوائی میں پیرس اور پیڈوا کے ابنِ رشدیوں نے کلیسائے روم کے اس ادعا سے شدید اختلاف

۱؎ محمد ارشاد صاحب ایک ہی سواد تحریر میں فرماتے ہیں کہ علمائے مغرب غیر یورپی تحریکات کی طرف اشارہ نہیں کرتے اور پھر جنبشِ سر کی حد تک اہلِ یورپ بھی تسلیم کرتے ہیں یہ یعنی چہ؟ کیا جنبشِ سر کو اشارہ نہیں کہا جا سکتا؟

> کیا کہ فلسفہ مذہب کی کنیز ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فلسفیانہ افکار کا مطالعہ مذہبی عقاید سے قطع نظر کر کے کرنا چاہیئے۔ ابن رشد کے ان خیالات کی اشاعت سے مغرب کی عقلی تحریکوں کو بڑی تقویت ہوئی اور علمِ کلام کا زور ٹوٹ جانے سے نشاۃ الثانیہ اور سائنس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو گئی....
>
> ابن رشد کے یہ ترقی پرور افکار و نظریات اسلامی دنیا میں مقبول ہو جاتے تو ممکن تھا کہ مسلمان بھی آج سے صدیوں پہلے ذہنی تقلید و جمود کے طلسم سے آزاد ہو جاتے لیکن فقہا کی مخالفت نے اس امکان کا سدباب کر دیا۔" (پہلا ایڈیشن ص ۸۵/۸۶)

رُوحِ عصر ہی میں بکل، دورخائیم، میکیاویلی، بودان، ویچو اور کومت پر ابن خلدون کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے، چارلس اساوی نے یہاں تک کہا ہے کہ ابن خلدون نے کارل مارکس کی طرح سیاسی اور عمرانی زندگی پر اقتصادی عوامل کا گہرا اثر تسلیم کیا ہے۔ محمد ارشاد صاحب نے اقلیدس کی حکایت کو فیثاغورس سے منسوب کر دیا ہے۔ اُن کی ایک اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو:

> "ہیریقلیتس کے زمانے میں ایرانی ملیطس فتح کر چکے تھے اور کئی شہروں کو آگ لگا چکے تھے۔ ہیریقلیتس کو حقیقت اولیٰ آگ میں نظر آئی تو اس کا باعث بھی ایرانی تھے!"

کہاں چند مکانوں سے نکلتے ہوئے شعلے، اور کہاں ہیریقلیتس کی آفاقی آگ جو کائنات کا جوہر ہے۔ محمد ارشاد صاحب بہت دور کی کوڑی لائے ہیں۔ اگر میرے قلم سے یہ بات نکل جاتی کہ ایک دفعہ طالیس سیلاب میں ڈوب مرنے سے بال بال بچ گیا تھا اس لئے اُس نے پانی سے تکوین کائنات کی توجیہہ کی تھی تو محمد ارشاد صاحب کی رگِ تمسخر پھڑک اٹھتی لیکن میں یہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ یہ بات ایک کمزور لمحے میں اُن کی نوکِ قلم پر آ گئی ہے۔

سکندریہ کے علماء اور عرب اہلِ علم کی سائنس کے میدان میں قابلِ قدر عطا ایک مسلّمہ حقیقت ہے جس کا اعتراف اکابر علمائے مغرب نے دل کھول کر کیا ہے جب اہلِ مغرب عہدِ جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے عربوں نے سائنس اور فلسفے کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ ہمارے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ ہمارے بزرگوں کی سائنس کیمسٹری، علم المناظر، علم الابدان وغیرہ کے تجربوں میں محدود ہو کر رہ گئی اور ہمارے سائنس دان کٹھ ملّاؤں کے خوف سے کھل کر اپنے نظریات پیش نہ کر سکے۔

> "نظری سائنس کو تجربی سائنس سے جدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب سائنس داں محض ہنرور اور کاریگر بن کر رہ گئے۔ وہ وقت نظر اور جودتِ فکر رکھتے تھے لیکن ڈرتے تھے کہ اگر سائنس کا کوئی نظریہ پیش کیا تو کفر و زندقہ کے فتوے سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ اس طرح اشاعرہ اور حنابلہ کے ذہنی احتساب نے سائنس کی تحقیقات کو سخت صدمہ پہنچایا۔" (اقبال کا علم کلام ص ۳۰)

افسوس کہ یہ اندازِ نظر آج بھی باقی ہے آئے دن ہمارے "دانشور" کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں مغرب سے صرف ٹکنالوجی لینی چاہیئے اُن کی سائنس اور فلسفے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے گویا وہ نظری سائنس سے قطع نظر کر کے مسلم اقوام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مغرب کی تکنیکی غلامی میں دینا چاہتے ہیں۔

محمد ارشاد صاحب سائنس اور فلسفے کی نشاۃ کو ایشیائیوں سے منسوب کرتے ہیں لیکن جب میں ایک ایشیائی طالیس کو سائنس اور فلسفے کا بانی کہتا ہوں تو تردید پر کمربستہ ہو جاتے ہیں اور ارسطو کی ایک تحریر کا سہارا لیتے ہیں کہ طالیس کے پیش رو او قیانوس اور تیتھس کو تمام موجودات کے والدین قرار دیتے تھے اور دیوتا پانی ہی کی قسم کھاتے تھے لہٰذا وہ بھی طالیس کا نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پانی کے دیوتاؤں کو کائنات کا والدین قرار دینے سے کائنات کی سائنٹفک توجیہہ نہیں ہوتی جب کہ طالیس پانی سے کائنات کی توجیہہ دیومالا کے قصوں سے ہٹ کر خالص تحقیقی انداز میں کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> "کائنات کی ابتدا عہد نامہ عتیق کی کتاب پیدائش میں پانی ہی سے کی گئی ہے اور سمیری، سائرہ میں بھی ایسا ہی بیان ملتا ہے کہ دیوتاؤں نے اپنے رہنے کے لئے سب سے پہلے نرکل کی چٹائی بنائی جو پانی پر تیرتی پھرتی تھی۔"

محمد ارشاد صاحب کی حالت بقول سید محمد کاظم اُس وکیل جیسی ہے جو ایک کمزور مقدمہ لڑ رہا ہو۔ کتابِ پیدائش کے الفاظ ہیں:

> "خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور زمین ویران و سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی۔"

کیا ان الفاظ سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ کائنات پانی سے بنی ہے؟ سمیری دیوتاؤں کے چٹائی پر بیٹھ کر پانی پر تیرنے سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ ہندوؤں کا دیوتا نارائن (یہ نام نر یا پانی ہی سے مشتق ہے) محمد ارشاد صاحب سے خفا ہوگا۔ وہ لاکھوں برسوں سے ایک کنول کے پھول پر جو پانی میں اُگا ہے اس انتظار میں لیٹا ہے کہ کوئی "دانشور" مجھے بھی کائنات کا خالق قرار دے گا لیکن محمد ارشاد صاحب اس بے چارے کو غچہ دے گئے ہیں۔ میں اس بحث کو اپنی ایک کتاب "روایاتِ فلسفہ" سے اقتباس دے کر ختم کرتا ہوں:

"جب سائنس مذہب اور جادو کے تصرف سے آزاد ہوئی اور لوگوں نے مسائلِ فطرت پر آزادانہ غور و فکر کرنا شروع کیا تو سوال پیدا ہوا کہ جب کائنات کو بعل مردوخ یا آمن رع نے نہیں بنایا تو یہ آخر یہ کیسے عالمِ وجود میں آگئی اور اس کی اصل کیا ہے۔ طالیس نے اس سوال کا جواب علم الاصنام کے فسانہ ہائے تکوین و تخلیق سے قطعِ نظر کر کے طبیعی زبان میں دیا اور کہا کہ کائنات پانی سے بنی ہے۔ طالیس کا یہ "آبی فلسفہ" اس لئے اہم نہیں ہے کہ پانی کو کائنات کی اصل قرار دے کر طالیس نے کوئی بڑا علمی کارنامہ انجام دیا تھا بلکہ اس لئے عہد آفریں سمجھا جاتا ہے کہ اُس نے تاریخِ عالم میں پہلی مرتبہ تکوینِ عالم کی خالصتاً تحقیقی و علمی توجیہہ کی۔"

محمد ارشاد صاحب کا ارشاد ہے:

"علی عباس صاحب کا یہ خیال کہ سائنس کی دنیا میں کوپرنیکس نے ثابت کیا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے اور نہ ساکن ہے جیسا کہ اہلِ مذہب کا عقیدہ تھا بلکہ محض ایک حقیر سا سیارہ ہے جو سورج کے گرد گھوم رہا ہے درست معلومات پر مبنی نہیں ہے۔ آفتاب مرکزی نظریہ (HELIO-CENTRIC) اتنا ہی پرانا ہے جتنا زمین مرکزی (GEO - CENTRIC) نظریہ۔۔۔ عہد اسلامی میں الزرقالی، البتانی اور البیروجی نے اسے دوبارہ پیش کیا۔ کوپرنیکس نے انہی نظریات پر اپنے نظریات کی عمارت کھڑی کی جس کا ثبوت جگہ جگہ اُس کی کتاب میں حوالوں کی صورت میں موجود ہے۔ علی عباس صاحب کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ استقرائی طریق کار بیکن کا کارنامہ ہے۔ فرانسس بیکن بہت وسیع المطالعہ شخص تھا۔ استقرائی طریق کار کو اُس نے نمایاں طور پر بیان کیا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ استقرائی طریق کار اُس کی دریافت ہے مغالطہ سے خالی نہیں۔"

پھر فرماتے ہیں:

"علم خواہ کوئی بھی ہے نتیجہ ہے اجتماعی کاوشوں کا۔ کسی ایک شخص کو اس کا بانی قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ اُردو زبان میں سب سے پہلے فلاں شخص نے بات کی تھی۔"

علم بے شک اجتماعی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور شروع ہی سے چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے لیکن جو شخص کسی قدیم مفروضے یا قیاس کو سائنٹفک انداز میں ثابت کرتا ہے یعنی اس کے اثبات کے مشاہدے اور تجربے سے دلائل لاتا ہے تو اس شعبۂ تحقیق کو اُس کے نام سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ اسی معنی میں ہم منطق قیاسی کو ارسطو سے، آفتاب مرکزی نظریے کو کوپرنیکس سے، کششِ ثقل کو نیوٹن سے، نظریۂ ارتقا کو ڈارون سے، نظریۂ اضافیت کو آئن شٹائن سے، لاشعوری دباؤ کو فرائڈ سے، فلسفۂ عمران کو ابن خلدون سے منسوب کرتے ہیں، اور انہیں ان نظریات کا بانی قرار دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے اپنا اپنا نظریہ ایجاد کیا ہے بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے علمی و تجربی شواہد سے اپنے نظریے کا اثبات کیا ہے۔ میں یہاں نظریۂ ارتقا کی مثال دوں گا۔ یہ نظریہ بھی اپنی ابتدائی قیاسی صورت میں قدمائے یونان کے ہاں موجود تھا۔ اناکسی مینڈر نے ماحول سے موافقت اور بقائے اصلح کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ذی حیات مخلوق نم عنصر سے پیدا ہوئی جب کہ آفتاب نے اُسے بھاپ بنا کر اڑا دیا تھا۔ ابتدا میں انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح تھا یعنی مچھلی کی صورت میں۔ ابتدائی حیوانات نمی سے پیدا ہوئے۔ ان کی جلد خاردار تھی بعد میں زیادہ خشک جگہوں پر جا پہنچے۔"

اناکسی مینڈر نے انسان کو حیوان ہی کی ترقی یافتہ نوع کہا ہے۔ لیکن یہ محض قیاس آرائی تھی۔ ڈارون نے سیکڑوں علمی شواہد سے نظریۂ ارتقا کو ثابت کیا اس لئے یہ نظریہ اُسی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اناکسی مینڈر کو اس کا بانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ استقرائی منطق بیکن کے نام سے اس لئے منسوب ہوئی کہ

اُس نے محمد ارشاد صاحب کی زبان میں استقرائی طریق کار کی اہمیت کو نمایاں طور پر بیان کیا. فرانسس بیکن نے نشاۃ الثانیہ کا زمانہ پایا تھا جب یورپ جہالت کی تاریکیوں سے باہر نکل رہا تھا اور قیاسی موشگافیوں کی جگہ سائنٹفک طرزِ تحقیق کا رواج ہو رہا تھا. بیکن نے استقرا کی اہمیت واضح کی کیوں کہ وہ سائنٹفک طرزِ تحقیق کے موافق ہے. محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں کہ بیکن نے کوپرنیکس، کیپلر اور ٹائکو براہے کے انکشافات کو رد کر دیا تھا. اس لئے وہ سائنٹفک بصیرت سے بے بہرہ تھا. بات یہ ہے کہ بیکن عبوری دور میں پیدا ہوا تھا جب سائنس مذہب کے چنگل سے آزادی پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور پھر وہ کوئی سائنس داں نہیں تھا کہ کوپرنیکس وغیرہ سائنس دانوں کے علمی شواہد کا درست جائزہ لے سکتا. ان کے نظریات کو قبول نہ کرنے سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بیکن سائنٹفک یا استقرائی طرزِ تحقیق کا حامی نہیں تھا. اس دور کے سائنس داں بھی علمی کارنامے انجام دینے کے باوجود مذہبی توہمات سے محفوظ نہیں تھے. مثلاً کیپلر جادو پر عقیدہ رکھتا تھا. آئن شٹائن کو نظریۂ اضافیت کا بانی کہا جاتا ہے حالانکہ لیب نٹز نے اس کی پیش قیاسی کی تھی. فرائڈ نے خود تسلیم کیا ہے کہ لاشعوری دباؤ کا ذکر شوپنہائر نے اُس سے کہیں پہلے کیا تھا لیکن یہ نظریہ فرائڈ ہی کے نام سے جانا جاتا ہے. علم کو اجتماعی کوششوں کا حاصل سمجھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ کسی نظریہ کو کسی ایک سائنس داں سے منسوب کرنا غلط قرار پائے.

بابِ زیرِ نظر میں راقم نے تاریخِ فلسفہ میں مادیت اور مثالیت کی آویزش کا ذکر کیا ہے. مجھ سے اختلاف کرنے سے پہلے محمد ارشاد صاحب نے کسی مجہول الاسم مغربی مصنف آر جی جے باہم کی کتاب "فلسفہ۔ ایک تعارف" کا ذکر چھیڑ دیا ہے. باہم نے اس کتاب میں خدا اور مادے یا مادیت اور الٰہیت میں مشترکہ صفات ڈھونڈ نکالی ہیں یعنی خدا ازلی و ابدی ہے، مادہ بھی ازلی و ابدی ہے، خدا ہر جگہ موجود ہے، مادہ بھی ہر جگہ موجود ہے. خدا خالقِ کل اور ہر شے کا سبب ہے اور ہر شے مادے ہی سے پیدا ہوئی ہے. یہاں آ کر بات بگڑ گئی لیکن محمد ارشاد صاحب پر وہ تناقض واضح نہ ہو سکا. جو خدا اور مادے کی ان صفات میں موجود ہے. سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا "خالقِ کل" اور ہر شے کا سبب ہے تو وہ مادے کا خالق کیوں نہیں ہے؟ اس صورت میں مادہ ازلی و ابدی نہ رہا بلکہ اُسے حادث ماننا پڑے گا اور اگر مادہ حادث ہے تو وہ مخلوق ہے اُسے قدیم کیسے مانا جائے. محمد ارشاد صاحب غور کرتے تو یہ تناقض اُن سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا لیکن انہیں تو اس ایجاد بندہ اگرچہ گندہ کو اپنی تائید میں استعمال کرنے کی جلدی تھی. اہلِ مغرب آئے دن اس قسم کے شوشے چھوڑ کر مادیت پر "روحانیت" کے پردے ڈالنے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ عوام کے ذہنوں کو پراگندہ کرتے رہیں.

محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں:

"ان میں سے ایک (پلیخانوف) نے تو برن شٹائن کے ساتھ ایک مناظرے (بروایتِ خود) ثابت کر دیا تھا کہ مارکس، اینگلز کی جدلیاتی مادیت سپینوزا کے فلسفے ہی کی ایک قسم ہے اور کچھ نہیں."

سپینوزا تو ایک طرف رہا اہلِ تحقیق نے تو رواقیین سے لے کر ۱۸ویں صدی کے فرانسیسی قاموسیوں تک کے افکار میں جدلیاتی مادیت کا کھوج لگایا ہے کوئی بھی مارکسی بشمول مارکس یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مارکس نے جدلیات کا فلسفہ "ایجاد" کیا تھا. مارکس خود کہتا ہے کہ اُس نے ہیگل کے فلسفے کو جو سر کے بل کھڑا تھا پاؤں پر کھڑا کر دیا ہے. جدلیاتی مادیت مارکس کے نام سے اس لئے منسوب ہے کہ اس نے مادیت سے مابعد الطبیعیات کو خارج کر کے اس میں جدلیات کو شامل کیا تھا.

محمد ارشاد صاحب نے فرفوریوس کے حوالے سے یہ کہہ کر میرے معلومات میں اضافہ کیا ہے کہ مصری پروہت راتوں کو مشاہدۂ افلاک کیا کرتے تھے اور حساب و ہندسہ کے مطالعہ میں منہمک رہتے تھے. حقیقت یہ ہے کہ بابل کے صابئین اس معاملے میں مصریوں سے کہیں آگے تھے. میں نے لکھا ہے:

"عراق میں دیوتا بعل مردوخ کے معبد سات منزلہ مناروں کی صورت میں تعمیر کئے جاتے تھے جنہیں زغورط کہا جاتا تھا. ان مناروں کی چوٹیوں پر بیٹھ کر وہ اندھیری راتوں کو مشتری، زہرہ، مریخ وغیرہ سیاروں کی گردش کا مطالعہ کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں دیوتا سمجھتے تھے اور ان کے احوال سے باخبر رہنا چاہتے تھے. ان طویل مشاہدات نے علم ہیئت کی بنیاد رکھی. مرورِ زمانہ کے ساتھ پروہت سورج گرہن اور چاند گرہن کی پیشگوئیاں کرنے لگے. ان تحقیقات سے پروہتوں کا مقصد یہ تھا کہ عوام کے ذہن و قلب پر اپنا تسلط قائم کیا جائے چنانچہ سورج گرہن سے پہلے وہ اعلان کر دیتے

کہ سورج دیوتا خطرے میں ہے اسے تاریکی کا دیوتا نگل لینا چاہتا ہے۔ اس سے عوام خوف زدہ ہو جاتے اور پروہتوں کو نذرانے دیتے کہ منتر پڑھ کر انھیں خطرے سے نجات دلائیں۔"

اس بیسویں صدی میں بھی ہندوستان میں جو مذہبی توہمات اور خرافات کا ایک بہت بڑا میوزیم ہے پروہتوں نے یہ چکر چلا رکھا ہے۔

محمد ارشاد صاحب کا ارشاد ہے:

"علی عباس صاحب مزید لکھتے ہیں کہ "سائنٹفک رجحان کا ادعا یہ رہا ہے کہ تحصیلِ علم صرف حسیات کے واسطے سے ہو سکتی ہے۔ سقراط کے زمانے میں سوفسطائی سائنٹفک رجحان کے ترجمان تھے اور تحصیلِ علم میں حسیات کو واحد وسیلہ مانتے تھے۔"

"علی عباس صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مادیت پسند صرف اور صرف حسیات کو ذریعۂ علم سمجھتے ہیں اور یہ کہ سائنس کی بنیاد بھی حسیات پر ہے۔ معلوم نہیں علی عباس صاحب نے یہ نتائج کیوں کر اخذ کر لئے۔ اگر صرف حسیات کو ذریعہ علم تسلیم کر لیا جائے تو اس امر کی توضیح کیوں کر ہوگی کہ حسیات ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ زمین چپٹی ہے حالانکہ یہ گول ہے۔ اگر ان حقائق کا علم عقلِ استدلالی سے نہیں ہوتا تو حسیات کی وہ کون سی قسم ہے جو ہماری رہنمائی کرتی ہے۔"

"دیمقراطیس پہلا باقاعدہ مادیت پسند ہے لیکن وہ علم کی بنیاد حسیات کی بجائے عقلِ استدلالی پر رکھتا ہے بالکل افلاطون کی طرح۔۔۔۔ دیمقراطیس کی اس قائم کردہ تقسیم پر گلیلیو نے بھی صاد کیا اور حسیات کی بجائے عقلِ استدلالی کو راہنما بنایا۔"

میں حیران ہوں کہ محمد ارشاد صاحب حسیات اور عقلِ استدلالی کے تاریخی تقابل جیسے اہم مسئلے کے بارے میں کس قدر ناقص معلومات رکھتے ہیں۔ اس مسئلے کو مستحضر کرنے کے لئے مجھے قدرے تفصیل میں جانا پڑے گا۔

فیثاغورس اور اُس کے تلامذہ نے پہلے پہل ریاضی کے اصولوں پر مبنی یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ فکر (THOUGHT) حواس پر اور تعمق (CONTE-MPLATION) مشاہدے پر برتری رکھتا ہے۔ اس طرح فلسفے میں ریاضی کی قطعیت اور محکمیت شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی نقطۂ نظر بعد میں مابعد الطبیعیات میں بھی اختیار کیا گیا۔ مابعد الطبیعیات کا بانی پارمے نائدیس کو سمجھا جاتا ہے جو ابتدا میں فیثاغورسی ہی تھا۔ فلسفے میں ریاضی ہی ازلی و ابدی تجریدات پر عقیدہ رکھنے کا ماخذ تھی، اور اسی کے سبب یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک ایسا عالم بھی ہے جو عالمِ حواس سے ماورا مستقل بالذات حیثیت میں موجود ہے یا فکر (THOUGHT) کے موضوعات، محسوسات اور مدرکات سے زیادہ حقیقی ہیں یا فکر کو حواس پر برتری حاصل ہے۔ فیثاغورسی باطنیہ اعداد کو حقیقی سمجھتے تھے اور انھیں زماں سے ماورا خیال کرتے تھے۔ افلاطون نے اواخر عمر میں اپنے امثال (IDEAS) کو اعداد کہا تھا۔ افلاطون کے امثال اور فیثاغورسیوں کے اعداد دونوں ابدی ہیں۔ عقلیت پرست (RATIONALISTS) فیثاغورس کے زمانے ہی سے ریاضیات کے زیر اثر رہے ہیں۔ دنیائے فلسفہ میں سب سے پہلے پارمے نائدیس نے واضح طور پر حس (SENSE) اور عقلِ استدلالی (REASON) میں تفریق کی اور دعویٰ کیا کہ حقیقی وجود کو جو واحد ہے صرف عقلِ استدلالی ہی سے جانا جا سکتا ہے۔ عقلیت پرستوں اور مثالیت پسندوں کی ابدی صداقتیں اور قدریں پارمے نائدیس ہی کے زمانے سے یادگار ہیں۔ عقلیت پرستوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشاہدے اور حسی تجربے (SENSE-EXPERIENCE) کے بغیر بھی مجرد عقلِ استدلالی انکشافِ حقیقت پر قادر ہے۔ عقلِ آفاقی (UNIVERSAL REASON) وجودِ مطلق یا حقیقت کبریٰ ہے لہذا اس کی تفہیم کے لئے عقلِ استدلالی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے چنانچہ عقلیت پرست قیاسی منطق سے کام لے کر ہمیشہ پہلے سے قائم شدہ کلیات سے استدلال کرتے رہے ہیں کیونکہ اُن کے دعاوی کے مطابق عقلِ استدلالی مشاہدے اور حسی تجربے کے بغیر انکشافِ حقیقت پر قدرت رکھتی ہے۔ اُن کے ناقدین نے کہا کہ عقلِ استدلالی کے لئے مشاہدے یا حسی تجربے سے ماورا ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ علم کے دو پہلو ہیں (۱) ہیئت (۲) موضوع۔ عقلیت پرست صرف ہیئت سے اعتنا کرتے ہیں اور موضوع کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو حسی تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اُن کے خیال میں تجریدات و تعقلات (CONCEPTS) بہر صورت مدرکات (SENSE-PERCEPTIONS) پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ماورا نہیں ہو سکتے چنانچہ محسوسات اور مدرکات ہی علم

DATA کا بن سکتی ہیں۔ جاننے کے عمل کے لئے ایسا معروض (OBJECT) ضروری ہے جو جاننے والے (SUBJECT) سے خارج میں ہو۔ اسی بناء پر مادیت پسند اور سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ تحصیلِ علم صرف حسیات ہی کے واسطے سے ممکن ہو سکتی ہے۔ فرانسس بیکن کے بقول خارجی عالم کے ساتھ ہمارا رابطہ حسیات ہی کے واسطے سے قائم ہو سکتا ہے کیونکہ "ذہن حسیات کے دریچوں ہی سے دنیا کو دیکھتا ہے" حسی تجربے کے بغیر عقل استدلالی کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے۔ فرانسس بیکن نے جب کہا کہ پہلے سے قائم کئے ہوئے قیاسی کلیات کے حوالے سے جزئیات کا مطالعہ کرنے کے بجائے جزئیات کے مشاہدے سے کلیات کا استخراج ضروری ہے تو وہ سائنٹفک نقطۂ نظر ہی کی ترجمانی کر رہا تھا۔

مثالیت پسندی اور عقلیت پرستی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ دونوں میں یہ خیال مشترک ہے کہ فلسفیانہ نظام (SYSTEM) کی تدوین میں امثال یا تجریدات اولین اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ ثانوی (DERIVATIVE)۔ بارکلے کا قول ہے کہ "وجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مدرک (PERCEPT) ہے"۔ بوزنکوئے، براڈلے، رائس وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔ معروضی مثالیت پسندوں کے خیال میں تجریدات ذہن انسانی سے ماورا مستقل بالذات صورت میں موجود ہیں۔ مثالیت پسندوں کا کہنا ہے کہ جس طرح ذہن جسمِ انسانی کا جوہر ہے بعینہٖ کائنات کا جوہر بھی ذہن ہی ہے۔ یہاں آکر مذہب اور مثالیت کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس مادیت پسندوں اور سائنس دانوں کے خیال میں مشاہدے اور حسی تجربے کے بغیر کسی بھی نوع کا حصولِ علم ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ تجریدات بہرصورت محسوسات و مدرکات کی تعمیمی صورتیں ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں محمد ارشاد صاحب کا یہ ارشاد خاصا معصومانہ ہے کہ "حسیات ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ زمین چپٹی ہے حالانکہ یہ گول ہے"۔ کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں جانتے کہ زمین کے گول ہونے کا تصور مشاہدے اور حسی تجربے ہی کی تعمیم ہے عقلیت پرستوں اور مثالیت کے برعکس مادیت پسندوں اور سائنس دانوں کا ادعا ہے کہ ذہن انسانی کسی صورت میں مشاہدے اور حسی تجربے سے ماورا ہو کر مجرد عقلِ استدلالی سے انکشافِ حقیقت نہیں کر سکتا۔ دوسرے الفاظ میں ہم صرف حسیات کے واسطے ہی سے حقایق کا ادراک کر سکتے ہیں۔ علم کی اساس حسی تجربہ ہے اور عقلِ استدلالی کی تجریدات و تعمیمات بہرصورت حسی تجربات ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ گلیلیو نے جس عقلِ استدلالی کو راہنما بنایا وہ حسی تجربے سے ماورا کوئی شے نہیں ہے بلکہ حسی تجربے ہی سے عضویاتی طور پر وابستہ ہے۔

محمد ارشاد صاحب فرماتے ہیں کہ جدلیاتی مادیت پسندی کی رو سے:

"ہمارے علم کی بنیاد صرف حسیات پر ہے۔ حسیات عالم خارجی کا پرتو ہیں۔ ان میں اور خارجی حقیقت میں کوئی فرق نہیں، حسیات عالم خارجی کا عین ہیں اس لئے ہمارا علم معروضی ہے"۔

میں حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے یہی کہہ سکتا ہوں کہ محمد ارشاد صاحب نے جدلیاتی مادیت پسندی کے نظریۂ علم کا مطالعہ کیا ہو گا اور اسے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہو گی۔ ان کے بیان میں مجھے الجھاؤ کا احساس ہوا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ حسیات بیک وقت پرتو اور عین کیسے ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ عالم خارجی کا پرتو ہوں گی اور یا عین ہوں گی۔ مثلاً ذہنِ انسانی میں کتاب بذاتِ خود نہیں آتی بلکہ اس کا عکس آتا ہے۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ جدلیاتی مادیت پسندوں کے ہاں حسیات اور خارجی حقیقت میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔ روایتی مادیت پسندوں کے خیال میں ذہن میں خارجی اشیا کا فوٹوگرافک عکس پڑتا ہے۔ جب کہ جدلیاتی مادیت پسندوں کے ادعا کے مطابق ذہن انسانی میں یہ عکس فوٹوگرافک نہیں ہوتا بلکہ ذہن میں منعکس ہو کر بدل جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں موضوع (SUBJECT) اور معروض (OBJECT) ایک دوسرے کے ساتھ مطابقت پیدا کرتے رہتے ہیں اسی سبب جاننے کا عمل جدلیاتی کہلاتا ہے۔ جدلیاتی مادیت پسند عالم کو معروضی اس لئے سمجھتے ہیں کہ عالم اپنے وجود کے لئے کسی ذہن کا محتاج نہیں ہے جیسا کہ مثالیت پسندوں کا دعویٰ ہے۔ جدلیاتی مادیت پسند بے شک حسیات کو علم کی اساس مانتے ہیں۔ اُن کے خیال میں حسیات کے توسط کے بغیر تحصیلِ علم کی کوئی کوشش بار ور نہیں ہو سکتی۔ یہ نقطۂ نظر عین سائنٹفک ہے۔

محمد ارشاد صاحب نے CYBERNETICS کے حوالے سے جدلیاتی مادیت پسندوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ شروع شروع

میں مارکسیوں نے CYBERNETICS کی مخالفت کی لیکن بعد میں اسے قبول کر لیا۔ محمد ارشاد صاحب کے اپنے ارشاد کے مطابق فلسفے کی بنیاد تشکیک ہے۔ اگر مارکسیوں نے شروع میں اس نظریے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا تو یہ رویہ عین فلسفیانہ تھا۔ سائنس کی دنیا میں ایک بھی ایسا نظریہ نہیں ہے جسے شائع ہوتے ہی بلا چون و چرا قبول کر لیا گیا ہو۔ کوپرنیکس، گلیلیو، ڈارون، آئن شٹائن وغیرہ اکابر سائنس دانوں کے خلاف گرد اڑائی گئی، اور ان کی تضحیک کی گئی مگر جب انھوں نے قطعی شواہد سے اپنے اپنے نظریے کو ثابت کر دکھایا تو اسے قبول کر لیا گیا اور مخالفت اپنی موت آپ مر گئی۔ یہی حال CYBER-NETICS کا ہوا۔ ابتدا میں مغرب کے کئی سائنس دانوں کی طرح مارکسیوں نے بھی اس کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا لیکن جب عملاً اس کا اثبات ہو گیا تو اسے قبول کر لیا گیا۔ ابتدا میں انسانی دماغ کی ساخت کے نمونے پر مشینی دماغ بنانے کی کوشش سائنس دانوں کو عجیب اور ناممکن لگی لیکن جب کمپیوٹر اور AUTOMATION کی کلوں میں اس کے کچھ کامیاب تجربے کئے گئے تو مارکسیوں نے بھی سنجیدگی سے اس کے اصولوں پر کام شروع کیا۔ اگر مارکسی سائنس داں اس کے عملی اثبات کے باوجود اپنی ہٹ پر قائم رہتے تو البتہ انھیں ہدفِ تنقید بنانے کا کوئی جواز بھی تھا۔

آخر میں نظریاتِ اضافیت و مقادیرِ عنصری کی فلسفیانہ تعبیروں کے بارے میں بات ہوگی۔ محمد ارشاد صاحب نے خاصے مربیانہ انداز میں راقم کے معلومات میں اضافہ فرمانے کی کوشش کی ہے لیکن اُن کا اپنا بیان غیر مربوط اور انتشار آمیز ہو گیا ہے۔ اس میں ربط و ضبط پیدا کرنے کے لئے میں اپنے ایک مقالے سے اقتباس پیش کروں گا:

> "اضافیت کے نظریے نے زمان و مکان کے بارے میں ہمارے تصورات بدل کر رکھ دیئے ہیں جو گلیلیو اور نیوٹن سے یادگار تھے۔ منکوسکی، لورنز، اور آئن شٹائن کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ زمان مکان/زمان کی غیر منقسم اکائی کی چوتھی بُعد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی ایک آفاقی زمان نہیں رہا بلکہ زمان مکان/زمان اکائی کی چوتھی بُعد بن کر رہ گیا ہے۔ عالم چار ابعاد کی اکائی ہے۔ زمان/مکان ONTINUUM، کے تین ابعاد مکانی SPATIAL ہیں اور چوتھی بُعد زمانی (TEMPORAL) ہے۔ گویا اضافیت کی رُو سے زمان و مکان مستقل بالذات حیثیت میں موجود نہیں ہیں بلکہ اضافی حیثیت رکھتے ہیں۔ نظریۂ اضافیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ کششِ ثقل کا قانون باقی نہیں رہا۔ اس کی جگہ تفریقی قوانینِ تعلیل (DIFFERENTIAL CAUSAL LAWS) نے لے لی ہے۔
>
> دوسرے نظریے مقادیرِ عنصری (QUANTUM THEORY) نے مادے اور توانائی کو باہم متبادل قرار دیا ہے جس کی تصدیق آئن شٹائن نے بھی کی ہے۔ نظریۂ مقادیرِ عنصری کی شروعات ۱۹ ویں صدی کے نصف میں اس تجربے کے ساتھ ہوئی کہ جب ویکیوم ٹیوب میں سے بجلی کی رَو گزاری جائے تو ٹیوب میں عجیب سی شعاعیں نمودار ہوتی ہیں۔ انھیں کیتھوڈین کا نام دیا گیا۔ ایک سائنس داں جوسف تھامسن نے کہا کہ یہ PARTICLES کی لہریں ہیں جنھیں آج کل ہم الیکٹران کہتے ہیں اور جو توانائی کے ریزے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں لارڈ رتھر فورڈ نے نائٹروجن گیس میں ان PARTICLES سے دھماکا کیا جس سے نائٹروجن بھاری آکسیجن میں تبدیل ہو گئی یعنی ایک عنصر دوسرے عنصر میں بدل گیا۔ یہیں سے ایٹم کے تجربے کی بنیاد پڑ گئی اور اسی عمل سے بعد میں پلوٹونیم کا نیا عنصر دریافت کیا گیا جو ایٹم بم میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ لوئی وکر نے ثابت کیا کہ الیکٹران ایک ننھا منا PARTICLE ہی نہیں ہے بلکہ روشنی کی لہروں جیسی لہروں پر مشتمل ہے۔ بعد میں پروٹان اور نیوٹران کے PARTICLES دریافت کئے گئے۔ جیمز چیڈوک نے جس نے نیوٹران دریافت کیا یہ ثابت کیا کہ اس میں برقی چارج نہیں ہے۔ نیلز بوہر نے کہا کہ الیکٹران اپنے مرکزے کے گرد یوں گھومتے ہیں جیسے سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ان انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مادہ ٹھوس نہیں ہے بلکہ PARTICLES پر مشتمل ہے یعنی توانائی (ENERGY) ہی کی ایک صورت ہے جو نامعلوم قوانین کے تحت مربوط ہو کر ٹھوس مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ ایٹم کا مرکزہ (NUCLEUS) دو قسم کے PARTICLES سے مرکب ہے مثبت چارج والے الیکٹران اور بغیر چارج کے نیوٹران۔ اس مرکزے کے گرد منفی PARTICLES تیزی سے گردش کرتے ہیں۔ ہائزن برگ اور شروڈنگر نے ثابت کیا کہ مادہ کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ میزیں، کرسیاں، درخت، اینٹ پتھر، سورج،

> چاند وغیرہ تجریدات (ABSTRACTIONS) ہیں جنھیں "واقعات" کا سلسلہ کہا جا سکتا ہے اور جو چند قوانین کے تحت صورت پذیر ہوتے ہیں۔ شروڈنگر نے یہ انکشاف کیا کہ ایٹم کے اجزا یعنی توانائی کی لہروں میں آزادہ روی پائی جاتی ہے البتہ اس کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکی۔ ہائزن برگ نے اس پر صاد کیا ہے اور اصول آزادہ روی (INDETERMINACY) سے اس کی تصدیق کی ہے۔ اس دریافت سے کلاسیکی مادیت پسندی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ۱۹ویں صدی کی جبریت کو پلانک کے اس نظریے سے بھی ٹھیس لگی کہ نیچر ایک مسلسل عمل کی پابند نہیں ہے بلکہ جستوں (LEAPS) اور جھٹکوں سے کام لیتی ہے۔ قدیم فلاسفہ کا خیال تھا کہ نیچر خلا سے نفرت کرتی ہے اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ نیچر تسلسل و توازن سے بیزار ہے۔ ہمارے زمانے کے فلاسفہ اضافیت اور مقادیر عنصری کی فلسفیانہ تعبیروں میں مصروف ہیں۔ اہل مذہب اور مثالیت پسند بالخصوص ان سے اپنے عقائد و افکار کے اثبات کا کام لینا چاہتے ہیں۔"

ان نظریات کے جو نتائج فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اہم ہیں درج ذیل ہیں۔

(۱) مادہ اور توانائی متبادل ہیں۔ (۲) کلاسیکی مادیت کا خاتمہ ہو گیا ہے (۳) توانائی کی لہروں میں آزادہ روی پائی جاتی ہے (۴) زمان مکان/ زمان، کائنات کی چوتھی بُعد ہے (۵) توانائی کی لہروں میں قانونِ سبب و مسبب موجود نہیں ہے۔

ان نتائج سے جدلیاتی مادیت پسندوں کو انکار نہیں ہے نہ ان سے جدلیاتی مادیت کے بنیادی اصولوں کی نفی کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ کلاسیکی مادیت پسندی کو جدلیاتی مادیت پسند پہلے ہی رد کر چکے ہیں۔ مادے اور توانائی کے متبادل ہونے سے ان کا یہ نظریہ باطل نہیں ٹھہرتا کہ مادہ ایک معروضی حقیقت ہے یعنی وہ ذہنِ انسانی سے آزادانہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ اس پہلو سے مادہ ٹھوس تھا تو بھی معروضی تھا اور توانائی کی لہروں میں تحلیل ہو جانے کے باوجود معروضی ہی ہے کیوں کہ توانائی کی لہریں اپنے وجود کے لئے ذہنِ انسانی کی محتاج نہیں ہیں۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ توانائی کی لہروں میں آزادہ روی ہو تو ہو لیکن جب یہ لہریں مادی صورت اختیار کرتی ہیں تو مادہ قانونِ سبب و مسبب کی گرفت میں آجاتا ہے۔ یہاں ایک حکایت بے محل نہ ہوگی۔ ڈاکٹر جانسن ایک دن اپنے کسی دوست کے ساتھ گلی میں جا رہا تھا اور مادے کی ماہیت کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر جانسن کا دوست بارکلے کے انداز میں مادے کے وجود ہی سے انکار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر جانسن نے چلتے چلتے اپنے راستے میں پڑے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر مار کر پرے پھینک دیا اور بولا "میرے لئے مادے کے وجود کے لئے یہی ثبوت کافی ہے۔" یہ پتھر آج کل کی تحقیقات کی رُو سے توانائی کی آزادہ رَو لہروں ہی کی ٹھوس صورت تھی۔ وہ اس ٹھوس حالت میں قانونِ سبب و مسبب کی گرفت میں آگیا تھا چنانچہ ڈاکٹر جانسن نے ٹھوکر مار کر پرے پھینک دیا۔ اس مفہوم میں ہم کائنات کو مادی کہہ سکتے ہیں جس میں قانون سبب و مسبب کی کارفرمائی ہے۔ قدر و اختیار یا آزادہ روی توانائی کی لہروں کی حرکت میں ہے لیکن یہ لہریں ٹھوس مادے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں تو قانون سبب و مسبب کی گرفت میں آجاتی ہیں اور ان کی آزادہ رَوی جبریت میں بدل جاتی ہے۔ یہی ادعا جدلیاتی مادیت پسندوں کا ہے۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے کہ مادّے کی ماہیت کیا ہے کہ یہ معلوم کرنا سائنس دانوں کا کام ہے۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ مادے کی ماہیت کچھ بھی ہو وہ معروضی صورت میں موجود ہے اور عالمِ طبعی میں قانونِ سبب و مسبب کی کارفرمائی باقی و برقرار ہے۔ اڈنگٹن کہتا ہے کہ ایٹم کے اجزا کی حرکت آزادانہ ہے۔ ہائزن برگ کے خیال میں الیکٹران آزادہ رَو ہیں لیکن اس سے عالمِ طبعی میں قانونِ سبب و مسبب کی نفی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی تمام تر جبریت کے ساتھ باقی و بحال ہے۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر محمد ارشاد صاحب کا یہ ارشاد کہ "مادیت خواہ کلاسیکی ہے یا میکانکی یا جدلیاتی جدید سائنس کی رُو سے ایک قصّۂ پارینہ ہے" جدلیاتی مادیت کے بارے میں درست نہیں ہے۔ انھوں نے خواہ مخواہ جدلیاتی مادیت کو میکانکی مادیت اور کلاسیکی مادیت کے ساتھ نتھی کر دیا ہے کہ لگے ہاتھوں اسے بھی صاف کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ پلانک اور آئن شٹائن بھی کائنات کی معروضیت کے قائل ہیں۔ میکس پلانک کہتا ہے:

> "خارجی عالم کا انحصار ہم پر نہیں ہے بلکہ وہ مستقل بالذات حیثیت میں موجود ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ خارجی عالم پر حاوی

مطلق قوانین کا انکشاف ہی میرے خیال میں سائنس دانوں کی زندگی کا سب سے حیرت انگیز معمول رہا ہے۔"

ائن شٹائن کے الفاظ میں:

"تمام طبعی علوم کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ خارجی عالم ادراک کرنے والے موضوع سے آزاد اور بے نیاز ہے۔"

جدلیاتی مادیت پسند ہی عالم کو معروضی نہیں سمجھتے نو حقیقت (NEO-REALISTS) بھی اس کے معروضی و حقیقی ہونے کے قائل ہیں۔ ان کے خیال میں خارجی عالم حقیقی عالم ہے اور اسے جانا جا سکتا ہے۔ اشیاء اپنے وجود کے لئے کسی ذہن کی محتاج نہیں ہیں۔ برٹرنڈ رسل کہتے ہیں کہ یہ امر بدیہی ہے کہ اشیاء پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور بعد میں انھیں جانا جاتا ہے۔ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ ایسی اشیاء کو جانا جائے جو علم و شعور سے علاحدہ موجود ہوں۔ مثالیت پسند کہتے ہیں کہ ذہن اشیا کا خالق ہے حالانکہ ذہن اشیا کو پیدا نہیں کرتا بلکہ انھیں معلوم کرتا ہے۔

مادیت اور مثالیت کی قدیم آویزش بے شک سائنس اور مذہب کے محاربے کی طرح تاریخِ فلسفہ اور تاریخ تمدن دونوں کا اہم باب ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مادیت کا رشتہ سائنس سے اور مثالیت کا رشتہ مذہب سے قایم رہا ہے۔ آخر ولی آگسٹائن افلاطون کو "فلسفہ کا مسیحا" بلاوجہ تو نہیں کہا کرتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے متکلمین اپنے اپنے مذہبی عقائد توثیق افلاطونیت ہی سے کرتے رہے ہیں اور آج بھی مثالیت پسند اور اہل مذہب ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہیں۔ محمد ارشاد صاحب نے بشپ مینڈل کی مثال دی ہے جس نے قانونِ توریث دریافت کیا تھا۔ وہ کوپرنیکس کو بھول گئے جو پادری تھا اور چھپ چھپ کر سائنسی کام کرتا رہا۔ ان مستثنیات سے مذہب اور سائنس کے رشتے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کی دنیا میں بھی ایسے مستثنیات موجود ہیں جو سائنس میں پایہ رکھنے کے باوجود "روحانیت" کے چکر سے نجات نہ پا سکے مثلاً "آلیور لاج" سائنس داں ہونے کے باوجود "حاضراتِ ارواح" کے واہمے کا قائل تھا۔

(۹) جدلیاتی مادیت پسندوں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ سائنس داں ابتدائے تہذیب سے اپنی تحقیقات میں جدلیاتی مادیت کے اصول تحقیق سے کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا ادعا یہ ہے کہ جدید سائنس کے انکشافات اور جدلیاتی مادیت کے مُسلمات اصولوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

(۱۰) لینن نے ماخ اور اس کے پیرؤوں پر اس لئے گرفت کی تھی کہ اُن کا رویّہ SOLIPSISM کا تھا یعنی وہ کائنات کی معروضیت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ نیچر، انسان اور جملہ اشیاء صرف ہماری حسیات میں موجود ہیں۔ لینن نے ان سے وہ تاریخی استفسار کیا جس کا جواب آج تک کسی SOLIPSIST یا مثالیت پسند سے بن نہیں پڑا۔ سوال یہ تھا:

"کیا نیچر انسان سے پہلے موجود نہ تھی؟ اگر موجود تھی جیسا کہ سائنس داں ہمیں بتاتے ہیں تو کس کی حسیات یا شعور میں موجود تھی؟"

کیا بارکلے کے خدا کو بیچ میں لائے بغیر محمد ارشاد صاحب اس سوال کا تحقیقی جواب دے سکیں گے؟

(۱۱) اگر ہیگل اور کارل مارکس ایک ہی جدلیاتی طریق کار سے الگ الگ نتائج تک پہنچے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے نقطۂ نظر میں فرق تھا۔ اور یہ فرق وہی ہے جو سر کے بل کھڑے ہوئے شخص اور پاؤں پر کھڑے ہوئے شخص کے نقطۂ نظر میں ہوا کرتا ہے۔ (مسلسل)

عام فکری مغالطے ——— ایک تجزیہ (۳)

محمد ارشاد

کتاب کا بقیہ حصہ مندرجہ ذیل مقالات پر مشتمل ہے۔

'یہ کہ تصوف مذہب کا جزو ہے' ——— 'یہ کہ عشق ایک مرض ہے' ——— 'یہ کہ اخلاقی قدریں ازلی اور ابدی ہیں' ——— 'یہ کہ عورت مرد سے کمتر ہے' ——— 'یہ کہ فن برائے فن کار ہے' ——— 'یہ کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے' ——— 'یہ کہ ریاست اور مذہب لازم و ملزوم ہیں'۔

یہ کہ تصوف مذہب کا جزو ہے' اس مقالے پر بحث سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض ضروری امور کی تصریح کر دی جائے بصورت دیگر غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس خیال کے پیش نظر بحث کو چار علیحدہ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

(ا) تصوف کی ابتدا، ارتقا کی تاریخ، نظامِ فکر اور نظامِ فکر کے مآخذ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر درست ہے۔

(ب) یہ کہ تصوف اور مذہب ایک دوسرے سے الگ ہیں اس کا اقرار یا انکار اس بات پر منحصر ہے کہ اقرار یا انکار کرنے والا مذہب سے کیا مراد لیتا ہے۔

(ج) تصوف تزکیۂ نفس، زہد و اتقا اور پارسائی کے مفہوم میں اور تصوف مابعد الطبیعاتی نظامِ فکر کے مفہوم میں دو الگ الگ ڈسپلن ہیں۔

(د) یہ کہ تصوف مذہب کا جزو ہے، اس کے اقرار یا انکار کا انحصار اس بات پر ہے کہ اقرار یا انکار کرنے والا تصوف سے کیا مراد لیتا ہے۔

(ا) تصوف کی ابتدا، ارتقا کی تاریخ، نظامِ فکر اور نظامِ فکر کے مآخذ کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر درست ہے، لفظ صوفی کے اشتقاق کے سلسلے میں مختلف لوگوں نے مختلف روایتیں بیان کی ہیں بعض لوگ اسے صفہ سے مشتق خیال کرتے ہیں اور اس طرح صوفیا کا سلسلہ اصحابِ صفہ سے ملا دیتے ہیں لیکن یہ رائے درست نہیں ہے اگر یہ لفظ صفہ سے مشتق ہوتا تو بقول ابن تیمیہ عربی زبان کے قواعد کی رو سے اسے صفی ہونا چاہیئے تھا۔ بعض صوفیا اسے صفا (پاکیزگی) سے مشتق خیال کرتے ہیں اور صوفی کے معنی ان لوگوں کی رائے میں صاف باطن کے ہیں۔ ابو الفتح علی بن محمد البستی (وفات ۳۶۳ھ) نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔

تنازع الناس فی الصوفی واختلفوا
صوفی کے اشتقاق کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہے

فیہ وظنوہ مشتقا من الصوف
ان کا خیال ہے کہ یہ صوف سے مشتق ہے

ولست انحل ھذا الاسم غیر فتی
میں یہ نام کسی اور کو نہیں دے سکتا سوائے اس کے

صافی فصوفی حتی لقب صوفی
کہ جس نے صفائی اور پاکیزگی اختیار کی اسی کا لقب صوفی ہوا

لیکن یہ رائے بھی محلِ نظر ہے اس لئے صفا کا مشتق صفوی ہے صوفی نہیں۔ اسی طرح ابو ریحان البیرونی کا یہ خیال کہ یہ لفظ یونانی سوف (σοφ) سے مشتق ہے جس کی تائید شبلی نعمانی نے بھی کی ہے درست نہیں۔ یونانی لفظ سوف کے پہلے حرف سگمہ (σ) کا عربی میں مقابل صرف س ہے ص نہیں۔ سوف جس کے معنی دانش کے ہیں فلسفہ اور سفسطہ کے الفاظ میں بھی موجود ہے۔ عربی میں فلسفہ کو فلصفہ اور سفسطہ کو صفصطہ کبھی نہیں لکھا گیا۔ ابن خلدون، شہاب الدین سہروردی اور سید علی ہجویری کی یہ رائے کہ لفظ صوفی صوف (اونی کھادی) سے مشتق ہے۔

جس کی تائید پروفیسر صاحب بھی کرتے ہیں درست ہے۔ ابن سیرین نے بعض زہاد پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض لوگ حضرت عیسیٰؑ کی پیروی میں صوف (اونی کپڑا) پہنتے ہیں (میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو ترجیح دوں گا جنھوں نے سوت پہنا)، ابن سیرینؒ نے ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔ پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا ابو ہاشم محمد بن احمد الصوفی (د۔ ۱۵۰ھ) تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صوف پہننے کا رواج پہلی صدی ہجری کے اواخر یا دوسری صدی کے اوائل میں شروع ہو چلا تھا۔ صوف پہننے والے ابو ہاشم سے پہلے یا تو صوفی نہیں کہلاتے تھے یا پھر تاریخ ان میں سے کسی کا نام محفوظ نہ رکھ سکی اور اس طرح ابو ہاشم الصوفی کو اولیت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

تصوف کے ارتقا اور مابعد الطبیعاتی نظام فکر پر فیثا غورثیت، فلاطونیت، اشراقیت اور ویدانت کے سلسلے میں بھی پروفیسر صاحب کی رائے درست ہے اگرچہ بعض لوگوں کے نزدیک ان کی رائے بوجوہ قابل قبول نہیں ہو گی۔ اس کا باعث غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف بحیثیت تزکیہ نفس اور تصوف بحیثیت نظام فکر دونوں میں کسی قسم کا فرق و امتیاز روا نہیں رکھتے اور اس طرح ان لوگوں کو بھی صوفیا کی فہرست میں شامل کر دیتے ہیں جو اس مفہوم میں صوفی نہیں تھے جس مفہوم میں ابن عربی، ابن الفارض، تلمسانی، الجیلی، رومی وغیرہ صوفی ہیں جن کے افکار پر تو اشراقیت اور فیثا غورثیت کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(ب) یہ کہ تصوف اور مذہب ایک دوسرے سے الگ ہیں اس کا اقرار یا انکار اس بات پر ہے کہ اقرار یا انکار کرنے والا مذہب سے کیا مراد لیتا ہے۔

اگر مذہب سے مراد خدا کا شخصی اور ماورائی تصور اور کائنات کی عدم سے تخلیق، روح کو مخلوق ماننا اور موت کے بعد روح کے مستقل وجود پر اعتقاد اور اس سے ملحقہ اخلاقیات ہے تو یقیناً مذہب اور تصوف ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ دونوں میں بعد المشرقین ہے اور تصوف ایک مستقل نظام فکر ہے جسے مذہب کا جز نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن مذہب کی مذکورہ تعریف یا مفہوم پر تمام مذاہب کا اتفاق نہیں ہے اور نہ اس کی مذکورہ الہیات تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ جین مت اور بدھ مت میں خدا کے شخصی اور ماورائی یا غیر شخصی اور سریانی وجود پر کسی قسم کا اعتقاد موجود نہیں۔ یونانی مذہب میں کائنات کی عدم سے تخلیق کا عقیدہ موجود نہیں اور نہ یہ عقیدہ موجود ہے کہ خدا خالق کائنات ہے۔ یونانی مذہب کے یہ عقائد یونانی فلسفے اور یونانی تصوف دونوں میں نیزیں رد کے طور پر موجود ہیں۔ یونانی مذہب اور یونانی تصوف کی الہیات میں اس طرح کا بعد موجود نہیں جو اسلام میں مذہب اور تصوف کی الہیات میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مسیحیت جو دنیا کے ایک معتد بہ حصۂ آبادی کا مذہب رہا ہے اپنی متداول صورت میں اشراقیت اور رواقیت ہی کی بدلی ہوئی حالت ہے۔ اشراقیت اور تصوف کے باہمی تعلق سے انکار ممکن نہیں اس طرح مسیحیت میں بھی مذہب اور تصوف ایک دوسرے سے الگ نہیں۔

(ج) تصوف تزکیہ نفس کے مفہوم میں اور تصوف مابعد الطبیعاتی نظام فکر کے مفہوم میں جنھیں آسانی کی خاطر اخلاقی تصوف اور مابعد الطبیعاتی تصوف کہنا موزوں رہے گا دو الگ الگ ڈسپلن ہیں اگرچہ تاریخی اعتبار سے دونوں میں ربط و تسلسل موجود رہا ہے لیکن بہر حال ان میں فرق و امتیاز قائم کرنا مشکل نہیں۔ تزکیہ نفس اور زہد و اتقا ابتدا میں شریعت کی مکمل پیروی کا نام تھا۔ حسن بصریؒ (د۔ ۱۱۰ھ) اور حبیب العجمیؒ (د۔ ۱۲۱ھ) اسی قسم کے لوگ تھے۔ یہ لوگ ترک دنیا کے قائل نہیں تھے۔ لیکن جلد ہی عابدوں اور زاہدوں میں دنیا سے لاتعلقی کا رجحان نمایاں ہونے لگا۔ ابراہیم بن ادہمؒ (د۔ ۱۶۲ھ)، شعوانۃ العابدۃ الزاہدہؒ (د۔ ۱۷۵ھ) عفیرۃ العابدہؒ (د۔ ۱۸۰ھ) رابعۃ العدویہؒ (۱۸۵ھ) فضیل بن عیاضؒ (۱۸۷ھ) اور معروف کرخیؒ (۲۰۶ھ) اسی گروہ میں شامل ہیں۔ تصوف میں عشق و محبت کا عنصر انہی لوگوں کا شامل کردہ ہے۔ قصاص کا گروہ بھی اسی زمانے میں ظاہر ہوا جو زہاد اور عباد ہی تھے لیکن ان لوگوں کا بنیادی مقصد اشاعت اسلام تھا۔ جس میں ان کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے حصول کی خاطر انھوں نے احادیث وضع کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ باطل اور اسرائیلی روایات بھی تفسیر آیات قرآن کے سلسلہ میں انہی لوگوں نے متعارف کیں۔ انہی لوگوں کے وعظ و تبلیغ کے زیر اثر عام اسلام

میں جگہ جگہ خانقاہیں قائم ہوئیں - فقر، توکل، صبر، رضا، ترک جیسی اصطلاحیں اسی زمانے کی باقیات ہیں - حارث بن اسد محاسبی (۲۴۳ھ) ذوالنون مصری (۲۴۵ھ) سری سقطی (۲۵۹ھ) جنید بغدادی بایزید بسطامی (۲۶۱ھ) سہل بن عبداللہ تستری (۲۸۳ھ) ابوسعید الخراز (۲۸۶ھ) اور ابوبکر شبلی (۳۳۴ھ) نے جو تیسری اور چوتھی صدی کے لوگ تھے، سخت ریاضت، مجاہدات اور چلہ کشی کو رواج دیا۔ سالک سلوک، مقام، حال قبض و بسط، وجد، وجود و عدم، فنا و بقا، صحو و سکر، حضور و غیاب، اثبات و نفی، مکاشفہ و مشاہدہ، علم الیقین عین الیقین اور حق الیقین، وصل و فراق، ابدال، وتد، قطب اور غوث کی اصطلاحیں انہی لوگوں کی وضع کردہ ہیں۔ اخلاقی تصوف اور مابعد الطبیعاتی تصوف میں امتیاز کی بنیاد اسی دور میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ زہاد و عباد کی ایک شاخ جنید بغدادی، بایزید بسطامی اور منصور حلاج (۳۰۹ھ) کے واسطے سے ابن عربی، صدرالدین قونوی، عفیف الدین تلمسانی، ابن الفارض، عطار، رومی اور جامی پر منتج ہوتی جبکہ دوسری شاخ سہل بن عبداللہ تستری، ابوعمر عثمان مکی اور شفیق بلخی کے واسطے سے شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عدی بن مسافر، شیخ ابوالبیان، علی ہجویری اور شہاب الدین سہروردی صاحب عوارف المعارف پر مشتمل ہے۔ ان لوگوں کا تصوف اخلاقی تصوف تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی اتحادئین میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

(د) اگر تصوف سے مراد اخلاقی تصوف ہے تو پھر مذہب اور تصوف ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ اس طرح کے تصوف کے لئے کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ مذہب کے بطون میں موجود ہوتا ہے۔ اخلاقی تصوف کی الٰہیات اور اس سے متعلقہ اخلاقیات اور مذہب کی الہیات اور اس سے متعلقہ اخلاقیات میں چونکہ وہ بعد نہیں پایا جاتا جو مابعد الطبیعاتی تصوف کی الہیات و اخلاقیات اور مذہب کی الہیات و اخلاقیات میں موجود ہے اس لئے تصوف (اخلاقی) مذہب کا جز ہے، مغالطہ نہیں ہوگا۔ اگر تصوف سے مراد صرف اخلاقی تصوف ہی ہو۔

صوفیا اپنی سادہ زندگی، کشادہ ظرفی اور اعلیٰ اطوار کی بنا پر لوگوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی ان خوبیوں نے نہ صرف مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کیا بلکہ غیرمسلموں کو بھی متاثر کیا۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت انہی لوگوں کا کارنامہ ہے۔ اس کامیابی نے ان کی قدر و منزلت میں اور بھی اضافہ کردیا۔ یہ لوگ چونکہ حکومتی اور ریاستی عہدوں کے کبھی خواہشمند اور طلب گار نہیں رہے اس بنا پر انہیں سماجی اور معاشرتی عیوب پر تنقید اور ان کی پردہ دری کی آسانی اور حوصلہ ہمیشہ حاصل رہا جبکہ اس کے برعکس علما جو مفتیوں، قاضیوں اور دیگر مناصب جلیلہ کے خواہشمند اور ان پر فائز رہے اس آسانی اور حوصلے سے محروم رہے، زہاد اور صوفیا انہیں ہمیشہ علمائے دنیا کے نام سے یاد کرتے رہے۔ غزالی نے احیاء العلوم میں علمائے حق اور علمائے سو کی پہچان پر پورا ایک باب وقف کیا ہے علمائے سو سے غزالی کی مراد بھی علمائے دنیا ہیں۔ غزالی پر تکفیر و تفسیق کے فتوؤں کا باعث احیاء العلوم کا یہی باب تھا اور احیاء العلوم کے وسیع پیمانے پر جلائے جانے کے واقعات بھی اسی وجہ سے پیش آئے تھے۔ علمائے حق اور علمائے سو کی تفریق میں ہر عالم یقین رکھتا ہے لیکن کوئی بھی عالم اپنے آپ کو علمائے سو میں شمار نہیں کرتا۔

صوفیا کا حلقہ اثر علما کے حلقہ اثر کہیں زیادہ وسیع تھا۔ صوفیا کی اپنی ایک ریاست اور حکومت تھی۔ جس کا سربراہ صوفیا کے خیال میں قطب زمان یا غوث زمان تھا جس کا حکم تمام دنیا پر چلتا تھا اور دنیاوی عہدوں پر عزل و نصب بھی اسی کے اختیار میں تھا۔ ابتدائی عہد میں تصوف کی قیادت علما ہی کے ہاتھ میں تھی لیکن جب علمائے حق اور علمائے ظاہر کی تفریق پیدا ہوئی اور ایک دوسرے پر تنقید اور اپنے اپنے دفاع کا سلسلہ شروع ہوا تو اس باہمی کشمکش نے ایک ایسا رخ اختیار کرلیا جس کا نتیجہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بہر حال علمائے صوفیا سے اس وقت تک تعرض نہ کیا جب تک کہ حلول و اتحاد کے رجحانات ان میں داخل نہ ہوئے تھے۔ علماء کے رد عمل کا پہلا نشانہ ابو عبداللہ الحکیم ترمذی کو بننا پڑا اگرچہ وحدت الوجود کے قائل نہ تھے لیکن ان کی ایک کتاب ختم الولایہ جس کا ابن عربی نے فتوحات میں اکثر جگہوں میں حوالہ دیا ہے، رد و کد کا موضوع بن گئی۔ علمائے کفر کا فتویٰ صادر کردیا انہیں ترمذ سے بھاگ کر بلخ میں

پناہ لینی پڑی۔ دوسرا نشانہ منصور حلاج تھا جسے دار پر لٹکایا گیا لیکن یہ تحریک بجائے کمزور ہونے یا سرد پڑنے کے اور زیادہ پھیلتی گئی اور پانچویں چھٹی اور ساتویں صدی میں حاکمان وقت بھی اس کے حلقہ اثر میں آ گئے۔ ابن عربی، ابن الفارض، صدر الدین قونوی حتیٰ کہ عفیف الدین تلمسانی جو ابن تیمیہ کے نزدیک سب سے بڑھ کر زندیق تھا۔ ان میں سے کسی کو تختہ دار پر لٹکانے کا حوصلہ کسی کو نہ ہو سکا۔ اس صورتِ حال نے علما کو تلوار کی بجائے قلم کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا۔ عبدالرحمٰن ابن جوزی (۵۹۷ھ) نے 'تلبیس ابلیس' میں صوفیا کے عقائد کو قرآن اور حدیث کے خلاف ثابت کیا اور صوفیا کی کتابوں میں موضوع احادیث کی نشاندہی کی۔ تاج الدین السبکی نے 'طبقات الشافعیہ' میں ایک مستقل باب صرف غزالی کی احیاء العلوم میں بیان کی گئیں موضوع احادیث کے لیے وقف رکھا۔ علم الحدیث کے سلسلے میں اس دور کے علماء کی خدمات اس قدر وقیع ہیں کہ انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ علم الحدیث کو علمی سطح پر اسی دور کے علما نے پہنچایا۔ صحاح ستہ، موطا، مسند امام احمد بن حنبل اور ابتدائی عہد کی دیگر کتب کا زمانہ احادیث کی جمع و تدوین کا زمانہ کہلایا جبکہ چھٹی اور ساتویں صدی کا زمانہ جرح و تعدیل کا زمانہ کہلاتا ہے۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث، ابن جوزی، تاج الدین السبکی، ابن حجر عسقلانی، ابو زکریہ یحییٰ نودی، قاضی ابن الزملکانی، ابو عبداللہ ذہبی، برہان الدین الفزازی، جمال الدین المزی اور ابن تیمیہ وغیرہ اسی عہد میں گزرے ہیں۔

تاریخ سائنس کے مغربی مؤلفین نے اکثر اوقات اس حیرت کا اظہار کیا ہے کہ مسلمان جو نویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی کے وسط تک تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی بلندیوں کو چھو رہے تھے اور جن لوگوں میں الخوارزمی، ابو بکر رازی، مسعودی، ابن الہیثم ابوالقاسم الزہراوی، ابن زہر، ابن نفیس، ابن فرناس، فارابی، بوعلی سینا، البیرونی، ابوالوفا، عمر خیام، الخازنی، المجریطی، الزرقالی، البطروجی البتانی، غزالی، ابن طفیل، ابن حزم، ابن باجہ اور ابن رشد جیسے فلسفی، سائنسدان اور اطبا پیدا ہوئے۔ بارہویں صدی کے وسط ہی سے قحط الرجال سے دوچار ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور تیرہویں صدی عیسوی میں سوائے نصیر الدین طوسی کے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جسے اس فہرست میں شامل کیا جا سکے۔ جارج سارٹن اس کی یہ توجیہہ بیان کرتا ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت اور فطانت اس سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھی۔ لیبان اسے ترکوں کی سیاسی بالادستی کا نتیجہ خیال کرتا ہے اس کے خیال میں ترک وحشی اور اجڈ قوم تھے جنہیں علوم و فنون سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مسلمان محققین اسے تاتاریوں کے حملوں کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی توجیہہ قابل قبول نظر نہیں آتی۔ جہاں تک جارج سارٹن کی رائے کا تعلق ہے کہ مسلمان سائنسدانوں کی مثال ان بچوں کی سی ہے جو شروع شروع میں تو بڑے ذہین ہوتے ہیں لیکن آگے چل کر ان کی ذہانت جواب دے جاتی ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ بات یونانیوں کے بارے میں تو درست ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں نہیں، کسی بھی عہد میں سائنس کی ترقی ریاضی کی ترقی سے منسلک رہی ہے۔ آئن شائن کا نظریہ اضافیت تک پہنچنا کبھی ممکن نہ ہوتا اگر انیسویں صدی میں غیر اقلیدسی ہندسہ وجود میں نہ آ گیا ہوتا۔ یونانیوں کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ جس نے ریاضی کی مزید ترقی کو ناممکن بنا دیا ان کا ارقام لکھنے کا طریقہ تھا۔ ریاضی کی مزید ترقی اسی صورت میں ممکن تھی کہ اس طریق کار کو بدلا جاتا۔ جدید طریق کار یعنی کسی بھی رقم کو صفر اور ایک سے نو تک کے اعداد کے ذریعے ظاہر کرنے کی طرح مسلمانوں نے ڈالی، سائنس میں استقرائی اور تجرباتی طریق بھی انہی کا متعارف کردہ ہے محتاط رہتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر تک سائنس میں جتنی ترقی ہوئی ہے اس حد تک وہ ذہانت کفایت کرتی ہے جس نے جدید ریاضیاتی نوٹیشن کا استعمال شروع کیا۔ الجبرا اور ٹرگنومیٹری کی بنیاد رکھی اور استقرائی اور تجرباتی طریق کار کا استعمال شروع ہو گیا۔

جہاں تک گستاؤ لیبان کی رائے کا تعلق ہے اور گزشتہ صدی کے تمام مستشرقین کم و بیش اسی رائے کے حامل ہیں ایک دور از کار تاویل ہے جس کے پیچھے سیاسی اغراض پوشیدہ تھیں۔ جہاں تک ترکی اقوام کی سیاسی بالادستی کا تعلق ہے نویں صدی کے نصف ثانی ہی سے انہیں بالادستی حاصل ہو گئی تھی اور سائنس اور فلسفے کی ترویج اشاعت اور ترقی کا زمانہ بھی اسی صدی کے وسط سے لے کر بارہویں صدی

کے وسط تک ہے، اگر ترکوں سے مراد عثمانی ترک ہی لئے جائیں تو بھی اس مفروضے کو درست ثابت کرنا مشکل ہے، ایران وسطی ایشیا اور سپین عثمانیوں کے حلقۂ اثر سے باہر رہے وہاں ان علوم کا ارتقا کیوں رک گیا، زیر بحث زمانے میں تو عثمانیوں کی سلطنت یوں بھی ایشیائے کوچک تک ہی محدود تھی۔ جہاں تک تاتاریوں کی تاخت و تاراج کا تعلق ہے یہ درست ہے کہ ایشیا میں ان کے سبب بہت زیادہ تباہی مچی۔ لاکھوں کتابیں ضائع ہوئیں۔ لیکن مصر اور سپین ان کے حملوں سے محفوظ رہے۔ وہاں کے کتب خانے محفوظ رہے مصر اور سپین علم و حکمت کے مراکز تھے، وہاں ان علوم کا ارتقا کیوں رک گیا اور مزید یہ کہ تاتاری اس قدر علم دشمن بھی نہیں تھے۔ ہلاکو خان نے المراغہ میں رصدگاہ قائم کی جس میں تیرہویں صدی کے واحد مسلمان سائنسدان نصیرالدین طوسی نے نہایت وقیع تحقیقات کیں۔ فوری زوال کی وجہ فی الحقیقت کچھ اور رہی ہے۔ جس کی طرف کسی کی توجہ منتقل نہ ہوئی۔

صوفیا کا شروع سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ حقیقی علم جسے وہ معرفت کہتے ہیں صرف انہی کو حاصل ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ مکاشفہ یا وجدان ہے، عقل و حسیات کو اس میں کوئی دخل نہیں، عقل و حسیات پر مبنی علوم بے وقعت ہیں۔ وہ کشفِ حقیقت (وحدت الوجود) کا ذریعہ نہیں بن سکتے اس لئے ان کی تحصیل ضیاعِ عمر ہے (صوفیا کا وجدان یا مکاشفہ فی الحقیقت خود ترغیبی کا نتیجہ ہے اسے اس وجدان سے کوئی نسبت نہیں جس کی مثال حکیم ارشمیدس کے سلسلے میں آئی ہے) ایسا ہی رویہ وہ شرعی علوم کے بارے میں بھی رکھتے تھے۔ شریعت کو وہ علم ظاہر اور علمائے شریعت کو علمائے ظاہر کہا کرتے تھے۔ اس کے برعکس علمائے شریعت کا دعویٰ یہ تھا کہ حقیقی علم صرف شریعت تک محدود ہے جس علم کی بنیاد شریعت پر نہیں اس کی تحصیل غیر ضروری ہے۔ حقیقی علم صرف علما ہی کو حاصل ہے جس کی بنیاد نقل پر ہے، عقل نقل کی تابع ہے، نقل کو عقل پر ترجیح حاصل ہے، علوم عقلیہ کی تحصیل غیر اہم ہے، ابن تیمیہ کی 'درء تعارض العقل والنقل' میں اسی نقطۂ نظر کو زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ المختصر اہلِ مدرسہ اور اہلِ خانقاہ ہر دو کے شیوخ کا صد گونہ اختلافات کے باوصف اس بات پر مکمل اتفاق کہ علوم عقلیہ ناقابلِ اعتماد اور غیر ضروری ہیں، عقل گمراہی کا موجب ہے، علوم عقلیہ صوفیا کی نظروں میں اس لئے ناقابلِ اعتماد اور غیر ضروری ٹھہرے کہ ان کی بنیاد مکاشفہ پر نہیں اور علماء کی نظروں میں اس لئے ناقابلِ اعتماد اور غیر ضروری ٹھہرے کہ ان کی بنیاد مکاشفہ پر نہیں اور علماء کی نظروں میں اس لئے کہ ان کی بنیاد نقل پر نہ تھی۔ یہ رجحان ابوحامد غزالی ۱۱۱۱ء کے ساتھ نمایاں ہوا اور صدی کے وسط تک غالب رجحان کی حیثیت اختیار کرلی اور صدی کے اختتام تک اسے ازلی اور ابدی حقیقت کی حیثیت حاصل ہوگئی، اہلِ مدرسہ اور اہلِ خانقاہ دونوں میں غزالی کو اہم مقام حاصل ہے اہلِ مدرسہ میں تہافۃ الفلاسفہ کے مصنف ہونے کی وجہ سے اور اہلِ خانقاہ میں المنقذ من الضلال کے مصنف ہونے کی وجہ سے، غزالی نے اگرچہ بعض علوم عقلیہ مثلاً حساب، طب اور منطق کی مخالفت نہیں کی اور احیاء العلوم میں عقل کی فضیلت پر ایک باب بھی لکھا لیکن ان علوم کو فرض کفایہ قرار دے کر ان کی اہمیت گھٹا دی کہ اگر کسی بستی میں کوئی ایک شخص بھی بقدر ضرورت ان کی تعلیم حاصل کرلیتا ہے تو دوسروں پر سے یہ فرض ساقط ہوجاتا ہے اس طرح ان علوم کا درجہ خیاطی اور کفش دوزی کی سطح پر آرہا، حساب کی تحصیل البتہ اس حد تک جائز قرار دی گئی جس حد تک اوقاتِ نماز، سمت قبلہ کے تعین اور تقسیم وراثت میں اس کی ضرورت پڑتی ہے، ریاضی کا اس سے زیادہ جاننا تضیعِ اوقات تھا۔ علوم عقلیہ یعنی منطق، فلسفہ ریاضی، ہیئت، طبیعات وغیرہ کو یونانیات ملعونہ کہا جانے لگا، سرکاری اور نجی کتب خانوں کو یونانیات ملعونہ سے پاک کرنے کی ابتدا علما کی تحریک پر ۱۱۵۰ء میں خلیفہ مستنجد باللہ کے فرمان سے ہوئی جس پر وسیع پیمانے پر عملدرآمد ہوا۔ جلنے والی کتابوں میں بوعلی سینا کی تصنیفات کو بطورِ خاص شامل کیا گیا، ۱۱۹۱ء میں شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے، ۱۱۹۴ء میں سپین میں امیر ابو یوسف یعقوب نے یہ حکم جاری کیا کہ فلسفہ و حکمت کی تمام کتابیں جلادی جائیں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی گئیں، ابن حبیب کو فلسفہ پڑھنے کے جرم میں قتل کردیا گیا، ابن رشد کے خلاف قرطبہ کی جامع مسجد میں اجتماعِ عام ہوا جس میں ابن رشد اور ابو عبداللہ بن ابراہیم الاصولی ملزموں کی حیثیت میں پیش کئے گئے۔ قاضی ابو عبداللہ بن مروان اور خطیب ابو علی بن حجاج نے ان کے

الحاد اور بے دینی کی وضاحت کی، ان کی جلاوطنی کا فیصلہ ہوا، ابن رشد کو لیسانہ میں جو یہودیوں کی ایک بستی تھی قید کر دیا گیا، کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی، اسی دوران یہ بھی مشہور کیا گیا کہ ابن رشد فی الحقیقت یہودی تھا اس لئے قدرت نے اسے اپنے ہی لوگوں میں پہنچا دیا، کچھ عرصہ بعد اسے فاس (افریقہ) بھیج دیا گیا جہاں اسے "جامع مسجد کے دروازے پر کھڑا کر دیا گیا تاکہ جو لوگ مسجد کے اندر جائیں یا مسجد کے باہر نکلیں اس پر تھوکتے جائیں"۔ بارہویں صدی کے بعد سارا عالم اسلام فلسفیوں اور سائنسدانوں کے وجود سے پاک اور ان کے شر سے مامون و محفوظ ہو گیا۔

اب نہ وہ شور سلاسل ہے نہ آہوں کی صدا　　لے گیا ساتھ ہی سب رونقِ زنداں کوئی

ابن رشد سے اس بے اعتنائی کا ازالہ اہل یورپ کے اعتنا نے کر دیا۔ ابن رشد واحد شخص ہے جو مکمل چار صدیوں تک اہل یورپ کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ خوش قسمتی سے اس زمانے میں علوم عقلیہ کی بیشتر کتابیں عربی سے لاطینی میں منتقل ہو گئیں جن میں ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جن کے عربی متون ضائع ہو چکے ہیں لیکن لاطینی تراجم محفوظ ہیں، ان علوم پر جن کتابوں کے عربی نسخے محفوظ رہ گئے ہیں اس کے لئے اہل علم کو ہلاکو خان کا شکر گزار ہونا چاہیئے جس نے المراغہ میں نصیر الدین طوسی کے کہنے پر ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا جس میں پانچ لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود تھیں، وہی کتابیں جو کل تک گمراہی کا سرچشمہ تھیں آج فخر و مباہات کا ذریعہ ہیں، کل تک جو بات بدعت تھی آج جزو ایمان ہے اور کل تک جو ملحد تھے آج مرد مومن ہیں، تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی نشو و نما انہی لوگوں کے دم قدم سے تھی، اہل یورپ نے ان لوگوں کو پا کر سب کچھ پا لیا اور عالم اسلام نے ان کو کھو کر سب کچھ کھو دیا۔ ابن خلکان جب حلب پہنچا تو شہر کے باہر شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی کی قبر کے کتبے پر یہ اشعار اس نے لکھے ہوئے پائے۔

قد کان صاحب هذا القبر جوهرة　　مكتومة قد براها الله من شرف

فلم تكن تعرف الايام قيمته　　فردها غيرة منه الى الصدف

(ترجمہ:- اس قبر میں رہنے والا ایک چھپا ہوا موتی تھا، لیکن چونکہ زمانے نے اس کی قدر نہیں کی اس لئے خدا نے غیرت سے اس کو پھر سیپ میں بند کر دیا۔) کتبہ لکھنے والے کو کیا معلوم تھا کہ شیخ الاشراق کی قبر کا یہ کتبہ اس دور کے ہر فلسفی اور سائنسدان اور جملہ علوم عقلیہ کی قبر کا کتبہ ثابت ہو گا۔

اہل مدرسہ اور اہل خانقاہ کی علوم عقلیہ سے نفرت اور بے اعتنائی اور علم کی معرفت یا شریعت میں تحدید و تقیید پر اصرار و یقین اور اس کے حق میں دعوت و تبلیغ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیرہویں اور چودہویں صدی میں ہر ذہین و فطین آدمی کو مدرسہ اور خانقاہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔ چنانچہ اس عہد میں جتنے بھی نابغہ روزگار گزرے ہیں۔ یا اہل حال تھے۔ یا اہل قال لیکن تیرہویں اور چودھویں صدی کے بعد نہ اہل حال میں ابن عربی اور جلال الدین رومی کا مثیل پیدا ہوا اور نہ اہل قال، ذہبی، المزی اور ابن تیمیہ کا ہمسر پیدا کر سکے۔ یورپ میں یہی زمانہ احیاء العلوم اور نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا عالم اسلام سے جلا وطن علوم کو وہاں پناہ اور پذیرائی حاصل ہو چکی تھی۔ اسی زمانے (تیرہویں صدی) میں علوم عقلیہ کے جاننے والے بچے کچھے افراد کو بھی مسلم سپین سے بھاگ کر جنوبی فرانس میں پناہ لینی پڑی۔ جہاں مونٹ پیلیر یونیورسٹی میں انہیں ان کی شان کے مطابق اعلیٰ ترین عہدوں پر لگایا گیا۔ جلد ہی مونٹ پیلیر یونیورسٹی بالخصوص طب اور ہیئت میں یورپ کی اعلیٰ ترین درس گاہ شمار ہونے لگی۔ بعضوں نے پیرس اور شمالی اٹلی میں بولوگنا، پاڈوا اور وینس کی یونیورسٹیوں کا رخ کیا اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ انگلینڈ میں آکسفورڈ اور کیمبرج اور جرمنی، آسٹریا، ہالینڈ، ڈنمارک اور سوئٹزرلینڈ کی تمام یونیورسٹیوں کے اساتذہ فرانس اور شمالی اٹلی کی درسگاہوں کے فارغ التحصیل تھے۔ اسی زمانے میں عالم اسلام میں ایک مختصر لیکن ان تھک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جنہیں وقت نے حال و قال کی بحثوں سے بچا کر شاہراہ تہذیب و تمدن و علوم و فنون پر چھوڑے ہوئے نقوش

پا کے شمار کا فریضہ سپرد کر دیا تھا۔ ابن خلکان، طغری بردی، ابوالفدا، ابن ابی اصیبعہ، ابن خلدون، المقریزی اور لسان الدین الخطیب اسی گروہ میں شامل تھے، اس کے بعد متقدمین کی کتابوں پر اہل مدرسہ میں حاشیہ نویسی کا سلسلہ شروع ہوا، حاشیوں کے خلاصے تیار ہوئے، خلاصوں کی مزید تلخیص شروع ہوئی اس کے ساتھ ہی ساتھ جوں جوں علم گھٹتا گیا گنبد دستار کے گھیرے اور بلند آہنگ خطابات و القاب میں اضافہ ہوتا گیا، فخر العلماء، شمس العلماء، زبدۃ العلماء، سلطان العلما اور تاج العلما جیسے القاب و خطابات ہر نام کے ساتھ نظر آنے لگے اس پر بھی نخوت پسند طبیعتوں کو سیری نہ ہوئی تو نام کے ہم قافیہ القاب و خطابات کی تلاش شروع ہوئی شیخ الحدیث والقرآن، زبدۃ العصر والزمان، صاحب الاسرار المعانی والبیان جیسے القاب و خطابات ہر اس عالم کے لئے موزوں خیال کئے گئے جس کا نام ماں باپ نے عبدالرحمٰن یا عبدالمنان رکھ دیا تھا۔ یہی حال صوفیا کا بھی تھا ان میں بھی شمس العارفین، فخر العارفین ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ سلاطین و ملوک بھی ان سے پیچھے نہ رہے۔ ہر سلطان سلطان بحر و بر تھا اور ہر ملک "ملک عرب و عجم" ان القاب کو ان کی ریاستوں کے حدود اربعہ سے کچھ تعلق نہ تھا۔ امیر ابو یوسف یعقوب نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو صلیبیوں کے خلاف امداد دینے سے اس لئے انکار کر دیا تھا کہ صلاح الدین ایوبی نے اسے امیر المومنین نہیں لکھا تھا۔

گزشتہ صدی میں سر سید نے علی گڑھ کالج کے نصاب میں جدید علوم کو شامل کیا تو برصغیر کے طول و عرض میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور سب سے بڑا الزام جو اس پر عائد کیا گیا یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو کرسٹان بنانا چاہتا ہے۔ اگر سر سید جیسا ملحد، بدعتی اور گمراہ پیدا نہ ہوتا تو آج سائنس اور ٹیکنا لوجی میں ہمارا بھی وہی حال ہوتا جو افغانستان اور دیگر مسلم ممالک کا ہے جو لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کے "اثرات بد" سے بالفعل محفوظ ہیں، تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا ارتقا سر سید جیسے بدعتیوں ہی کا رہین منت ہے۔

کاش اس فرقۂ زہاد سے اٹھتا نہ کوئی   کچھ ہوتے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

سر سید کی تفسیر قرآن جو فی الحقیقت انیسویں صدی کے سائنسی انکشافات اور ان پر مبنی فلسفہ سائنس یعنی نیچرلزم اور قرآن میں مطابقت ثابت کرنے کی ایک کوشش تھی سب سے زیادہ رد و کد کا نشانہ بنی اور سر سید پر کفر کے فتوؤں کا سبب ثابت ہوئی یا تو یہ حال تھا اور یا اب یہ حال ہے کہ ہر عالم جسے بچوں کے لئے سائنس کی درسی کتب تک رسائی حاصل ہے ان پر مبنی معلومات کی حد تک سائنس کے ہر انکشاف کو قرآن سے ثابت کرنے میں کوشاں ہے۔ نقطۂ نظر کی اس اچانک اور حیرت انگیز تبدیلی کا باعث ٹیکنا لوجی کی معجز نما ترقی ہے اس کی وجہ خود (MENTAL SET UP) میں تبدیلی نہیں، فلسفے کے بارے میں بارھویں اور تیرھویں صدی کے تعصبات اب بھی اس کا حصہ اور بنیاد ہیں۔ فلسفہ ام العلوم ہے اور اس کی کوکھ میں یہ صلاحیت اب بھی موجود ہے کہ نئے علوم اس سے پیدا ہوتے رہیں۔ اٹھارویں صدی تک فلسفہ اور سائنس ایک دوسرے میں پیوست تھے، ہر فلسفی سائینسدان تھا اور ہر سائنسدان فلسفی، اٹھارویں صدی کے اواخر میں فلسفے کی ان شاخوں میں اس قدر وسعت اور پھیلاؤ ہوا کہ کسی ایک شخص کے لئے ان پر عبور حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ اور انیسویں صدی میں تو نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ خود سائنس کی تمام شاخوں پر حاوی ہونا ممکن نہ رہا۔ لیکن اس کے علی الرغم سائینسدانوں کے لئے فلسفے سے بے اعتنائی ممکن نہ تھی۔ سائنس کا دائرہ کار بہر حال محدود ہے اور سائنس میں پیدا ہونے والے بعض مسائل کا حل انہیں فلسفے سے رجوع کئے بغیر ممکن نظر نہ آیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے ممتاز ترین سائینسدان، ارنسٹ ہیکل، کلفورڈ، کرچھوف، ارنسٹ ماخ، ہکسلے اور پیرسن کو فلسفے میں آنا پڑا اور موجودہ صدی میں برٹرینڈ رسل، وہائٹ ہیڈ، آئن سٹائن، ڈ وہم، میئرسن، ہرٹز، اڈنگٹن، برجمین اور فلپ فرانک بنیادی طور پر ریاضی دان اور سائینسدان ہیں اور فلسفے میں بھی ان کا حصہ خاصا وسیع ہے، انیسویں صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے اوائل میں دیگر جن علوم کو فلسفے سے جدا ہونا پڑا نفسیات، معاشیات اور عمرانیات ہیں۔ ہر علم جب تک اپنے سہارے کھڑا ہونے

کے قابل نہیں ہو جاتا فلسفے میں شامل رہتا ہے اور کوئی علم اس وقت تک اپنے سہارے کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوتا جب تک کہ ان سوالات کا جواب جن سے وہ بحث کرتا ہے، اہلِ فلسفہ قطعیت سے نہیں دے چکے ہوتے۔ اس اعتبار سے فلسفے کا سائنس سے وہی تعلق ہے جو سفر مینا کا فوج سے ہے۔ فلسفے اور سائنس میں صرف یہی ایک تعلق نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سائنس میں اعلیٰ سطح پر پیدا ہونے والے بعض مسائل کا حل فلسفے سے رجوع کئے بغیر ممکن نہیں۔ امریکہ میں گزشتہ دو دہائیوں کے دوران ممتاز فلسفیوں اور سائنسدانوں کے متعدد مشترکہ اجتماعات اکثر یونیورسٹیوں میں انہی مسائل کے حل کے سلسلے میں منعقد ہو چکے ہیں اور ان میں پڑھے گئے مضامین و مقالات ہر میزبان یونیورسٹی کے اشاعت گھر سے پورے اہتمام کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

تصوف اور مذہب کے تعلق پر بحث کے سلسلے میں ان اشارات کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ان رجحانات کی نشاندہی ہو جائے جن کے غالب آجانے سے علوم کا ارتقا متاثر ہو جاتا ہے۔ اسی تناظر میں "عام فکری مغالطے" کی علمی قدر و قیمت متعین کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ ان اشارات کا مقصد علماء اور صوفیا کے مقام اور مرتبے میں تخفیف نہیں ہے۔ مذہب اگر آج بھی اپنی ابتدائی سادگی کے ساتھ موجود ہے تو اس کی وجہ علما ہی ہیں، اگر حضرت عیسیٰؑ یا پال کسی مسیحی عبادت گاہ میں جا بیٹھیں تو وہ یہ کبھی نہ جان سکیں گے کہ وہاں موجود لوگ کس مذہب کے پیرو ہیں۔ جہاں تک مابعد الطبیعاتی صوفیا کا تعلق ہے یہ درست ہے کہ انہوں نے تو اشراقیت، فلاطونیت وغیرہ کے اثرات قبول کئے لیکن وہ محض نقال نہیں تھے کہ جو کچھ پایا بغیر ترمیم و اضافہ کے قبول کر لیا، لیکن یہ موضوع علیحدہ بحث چاہتا ہے، یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ ملائے اعلیٰ کی سیر جو ابن عربی اور اس مکتب کے دیگر صوفیا کا محبوب موضوع رہا ہے، خالصتہً اسلامی چیز ہے جو اسریٰ اور معراج کے واقعات پر مبنی اور ان سے ماخوذ ہے، یا ان کی پیروی میں ہے، ابن عربی نے فتوحات مکیہ کی فصل موسوم بہ کیمیا السعادۃ اور ایک دوسرے رسالے الاسریٰ الیٰ مقام الاسریٰ میں اس سیر کا حال لکھا ہے۔ ابن عربی کا یورپی صوفیا پر اثر معلوم و معروف ہے، مسیحی تصوف قبل از اسلام اور بعد از اسلام کے تقابلی جائزے سے مسلمان صوفیا کے اثرات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، دانتے کا طربیہ خداوندی "ابن عربی کے افکار اور دیگر اسلامی روایات کا چربہ ہے۔ جسے مسیحی رنگ دیا گیا ہے، بطریچے کا رول وہی ہے جو اسلامی روایات میں جبریلؑ کا ہے۔ سپین کے فاضل محقق مگوئیل ایسن (ASIN) نے نہایت عمدگی اور خوبی سے اس موضوع پر لکھا ہے، جرمن صوفیا کے گل سرسبد مائیکل ایکھارٹ پر بھی مسلمان صوفیا کا اثر واضح اور نمایاں ہے البتہ اشراقی جرمن صوفیا (ILLUMINATIONISTS) پر منصور حلاج کا اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

"یہ کہ عشق ایک مرض ہے"، کی بحث میں پروفیسر صاحب کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ عشق ایک فطری تقاضا ہے جو بعض احوال و ظروف میں مریضانہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ تاریخی اور سماجی تناظر میں ان کے خیال میں عشق کی دو صورتیں ممکن ہیں، روایتی اور (غیر روایتی) روایتی عشق دو اقسام پر مشتمل ہے، عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ عشق مجازی میں روحانی اور افلاطونی دونوں عشق شامل ہیں عشق کی جملہ اقسام کا تعلق ان کے خیال میں معاشرتی اور سماجی حالات اور کوائف سے ہے، روایتی (غیر اشتراکی) معاشرے میں روایتی عشق اور اشتراکی معاشرے میں (غیر روایتی) عشق ہی ممکن ہے۔ جسے انہوں نے عشق کی صحت مندانہ صورت کا نام دیا ہے۔

جن احوال و ظروف (روایتی معاشرہ) میں عشق مریضانہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے ان کی حد تک آیا "یہ کہ عشق ایک مرض ہے"، فکری مغالطہ ہے یا نہیں، ان کی بحث سے مفہوم یہی ہوتا ہے کہ وہ اسے مغالطہ نہیں سمجھتے کیونکہ روایتی معاشرے میں عشق کا صحت مند صورت اختیار کر لینا ممکن نہیں۔ روایتی معاشرہ زوال پذیر ہے اور زوال پذیر معاشرے میں بقول ان کے صحت مند عشق کا پنپ سکنا محال ہے۔ اگر یہ درست ہے تو بو علی سینا نے عشق کو مرض قرار دے کر کسی مغالطے کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ امر واقعہ بیان کیا ہے، عشق سے ہر چند کہ اس کی مراد جنسی کشش کی ایک مخصوص حالت ہے اور اس سے کمتر حالتوں کو وہ مرض نہیں کہتا۔

بو علی سینا طبیب بھی تھا اور فلسفی بھی، عشق کی اصطلاح اس نے طب اور فلسفے میں دو مختلف معنوں میں استعمال کی ہے، طبیب کی حیثیت سے 'قانون' میں اور فلسفی کی حیثیت سے 'فلسفۂ مشرقیہ' میں۔ موخر الذکر میں عشق کی تعریف اس نے یہ کی ہے کہ عشق حسن کی تحسین ہے، حسن سے اس کی مراد کمال ہے اور عشق یا تحسین حسن کمال کی تحصیل کا عمل ہے، ہر چیز حصولِ کمال میں کوشاں ہے۔ نشو و نما، جد و جہد اور ترقی کا محرک یہی حصولِ کمال کا عمل ہے، فلسفۂ مشرقیہ میں بو علی سینا نے نظریہ ارتقاء سے بحث کی ہے اور عشق کو اس مخصوص مفہوم میں ارتقا کی توجیہ کے سلسلے میں بطور اصول استعمال کرتا ہے۔ تاریخ سائنس میں بو علی سینا پہلا شخص ہے جس نے (FOSSILS) کو ارتقا کے ثبوت کے طور پر پیش کیا، پہاڑوں اور چٹانوں کی ساخت کا مشاہدہ کیا اور ان سے حاصل ہونے والے نتائج کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ زمین جیسی کہ وہ موجود ہے ہمیشہ سے ایسی نہیں اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں، جہاں پہاڑ کھڑے ہیں کسی زمانے میں وہاں سمندر تھا، جہاں پانی ہے کسی زمانے میں خشک جگہ تھی۔ فلسفۂ مشرقیہ، میں عشق کا یہ تصور بادی النظر میں اس عشق سے ملتا جلتا ہے جسے پروفیسر صاحب نے عشق حقیقی کا نام دیا ہے لیکن بوجوہ اس سے مختلف ہے، جبکہ 'قانون' میں یہی لفظ مختلف مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں عشق سے مراد مالیخولیا سے مشابہ ایک نفسیاتی بیماری ہے، چنانچہ بو علی سینا نے علاماتِ مرض اور علاج دونوں بیان کر دئے، عشق اس کے نزدیک جنسی کشش کی وہ شدید کیفیت یا حالت ہے جو اس کے حامل کو اپنے ماحول سے یک قلم منقطع اور بیگانہ کر دے، جدید نفسیات میں بھی نفسیاتی مرض سے مراد یہ ہے کہ وہ طرزِ عمل جو ماحول سے مطابقت میں مانع ہو، عربی زبان میں جنسی کشش کی مختلف کیفیات کے اظہار کے لئے مختلف الفاظ مستعمل رہے ہیں، انس، اُلفت، محبت، عشق، ولہ۔ لاطینی میں یہ سہولت موجود نہ ہونے کے باعث 'قانون' کے لاطینی مترجمین کو حب العشق کیلئے متبادل لفظ نہ ملا تو اسے (ALNESQ) لکھ دیا۔ بعد کو آنے والوں کی نظر سے جب یہ عجیب و غریب لفظ گزرا تو ان میں سے کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ لفظ عربی کا ہے، اس بنا پر یہ لفظ طرح طرح کی مغز پاشیوں کا سبب بن گیا۔ پروفیسر صاحب کی اقسام عشق کے مطابق عشق کی یہ صورت عشق ناکام کہلائے گی۔

عشق کی ان روایتی صورتوں سے علیحدہ عشق کی ایک اور صورت جو انہوں نے بیان کی ہے وہ بقول ان کے اشتراکی معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ چونکہ عشق کی جملہ صورتوں کا تعلق معاشرتی ساخت سے وابستہ ہے اس لئے روایتی عشق کی مختلف صورتیں اشتراکی معاشرے میں ممکن نہیں ان کے الفاظ میں۔

"اشتراکی معاشرہ ترقی پذیر ہے اور تضادات سے بری ہے، اس میں معاشی عدل و انصاف قائم کر دیا گیا ہے۔ مرد عورت کی مساوات دکھائی دیتی ہے، دونوں ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، اس میں امرد پرستی یا رومانی عشق کی مریضانہ صورتیں جو حسرت و محرومی پر مبنی ہوتی ہیں۔ بارآور نہیں ہو سکتیں اس معاشرے کے مرد عورتیں جو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے تندرست و توانا ہوتے ہیں قدرتاً ایک دوسرے میں جنسی کشش محسوس کرتے ہیں۔ جو ذہنی اور ذوقی لگاؤ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ معاشرہ چاہنے والوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتا۔ باہمی احترام اور جنسی توافق میاں بیوی کو گہری محبت سے سرشار کر دیتے ہیں۔ یہ انس اور لگاؤ ہی اس معاشرے کا عشق ہے ..... اس نوع کا عشق روایتی محبت کی طرح رعد کی کڑک کی طرح نمودار نہیں ہوتا کہ چاہنے والے پہلی نظر میں عشق کر جاتے ہیں، بلکہ گل بہار کی بھینی بھینی خوشبو کی طرح دھیرے دھیرے حواس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور نامحسوس طور پر رگ و پے میں اتر جاتا ہے، اس نوع کا عشق صحت مند معاشرے ہی میں جنم لے سکتا ہے۔"

عشق کی یہ صورت یا نیاز فتحپوری کے الفاظ میں مرد عورت کے درمیان جائز کا تعلق جسے عشق بمشکل ہی کہا جا سکتا ہے، ہمارے ہاں شرعی عشق کے نام سے موسوم ہے۔ رشتۂ ازدواج سے پہلے اور حلقۂ ازدواج سے باہر لگاؤ کی جملہ صورتیں غیر شرعی کہلاتی ہیں اگرچہ

ان کے امکان کو رد نہیں کیا جاتا) اور جنہیں پروفیسر صاحب بھی فسق و فجور سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اشتراکی معاشرے میں ان کے امکان کو بھی رد کر دیتے ہیں، اگر اشتراکی معاشرے میں عشق کی وہی صورت پیش آتی ہے جس کا انہوں نے نقشہ بیان کیا ہے تو یہ نقشہ اس نقشے سے جو غالب نے جنت میں عشق کی ممکنہ صورت کا بیان کیا ہے کس قدر گہری مماثلت رکھتا ہے۔

درآں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائیِ شورشِ نائے و نوش
دمِ شبر دیہائے مستانہ کو — بہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
سیہ مستیِ ابر و باراں کجا — خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ — غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصلِ بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ انیش کجا — فریبد بہ سوگند دینش کجا
نظر بازی و ذوقِ دلدار کو — بفردوس روزنِ بدیوار کو
نہ چشم آرزو مندِ دلالہ — نہ دل تشنۂ ماہِ پرکالہ

آیا اس امکان کو سرے سے رد کیا جا سکتا ہے کہ اشتراکی معاشرے میں ایسی کوئی حالت پیش نہیں آتی کہ جس میں عشق روایتی صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لے، کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی مرد کسی ایسی عورت کے دامِ محبت میں گرفتار ہو جائے جو کسی اور کو چاہتی ہو اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو جائے، اس صورت میں مرد کا عشق ناکام یا رومانی عشق ان کی تصریح کے مطابق عشق کی مریضانہ صورت ہی کہلائے گا۔ اگر ایسا ممکن ہے تو پھر عشق کی دو اقسام ہی ممکن ہیں، کامیاب اور ناکام جو ہر دو قسم کے معاشروں میں پائی جا سکتی ہیں قطع نظر اس کے کہ عشق کا تعلق جذبے سے ہے نتائج کے حوالے سے اس کی اقسام کا تعین درست نہیں البتہ جذبے کی شدت میں کمی بیشی، جو ہر قسم کے معاشرے کے افراد میں ممکن ہے، کی بنیاد پر اسے مختلف نام دیئے جا سکتے ہیں اور اسی جذبے کے تسکین پا لینے یا عدمِ تسکین کی صورت کی بنیاد پر اس کے مرض ہونے نہ ہونے کا تعین بھی ممکن ہے۔

"عام فکری مغالطے" پر بحث کے دوران جو اصول پیش نظر رہا ہے یہ تھا کہ پروفیسر صاحب کے استدلال کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے دلائل اور اخذ کردہ نتائج کا آپس میں جو تعلق رہا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔ ان کے نقطۂ نظر کی تائید یا تردید کو ثانوی حیثیت دی گئی۔ زیرِ بحث نو مقالات میں سے بالخصوص آخری پانچ مقالات کے سلسلے میں یہ التزام زیادہ ملحوظ رہا۔ کتاب کے آخری پانچ مقالات کو معرضِ بحث میں نہیں لایا گیا۔ ان میں سے 'یہ کہ اخلاقی قدریں ازلی و ابدی ہیں' اور 'یہ کہ فن برائے فن کا رد ہے'، ہر دو مقالات پر اگرچہ بحث کی گنجائش موجود ہے لیکن اس بحث کی نوعیت محض اختلافی نوٹ کی سی ہوتی اور یہ اختلافی نوٹ بھی ان کے بنیادی موقف سے اختلاف پر مبنی نہ ہوتا۔ دیگر تین مقالات 'یہ کہ عورت مرد سے کہتر ہے'، 'یہ کہ انسان فطرتاً خود غرض ہے'، اور 'یہ کہ مذہب اور ریاست لازم ملزوم ہیں'، میں ان کا موقف، بحث اور نتائج سے اختلاف کی گنجائش نہ تھی، ان پر اگر کچھ لکھا بھی جاتا تو اس کی حیثیت تشریحی حواشی کی ہوتی۔

کسی کتاب کا اس ارادے سے مطالعہ کرنا کہ اس کا رد لکھا جائے، مطالعے کا علمی یا عالمانہ طریقہ نہیں، کوئی بھی لکھنے والا جوابات لکھتا ہے بالعموم اس کی اہمیت کو واضح طور پر محسوس کئے بغیر نہیں لکھتا، اس لئے ہر کتاب کا مواد پڑھنے والے سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے ہمدردی کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کے بعد اگر اختلاف ممکن ہو تو برملا اس کا اظہار کر دیا جائے لیکن اختلاف اگر کیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ کسی اعلیٰ درجے کی علمی کتاب اور اس میں پیش کیا گیا نقطۂ نظر کسی اہمیت کے حامل ہونے سے عاری ہو

جاتے ہیں اور ساری اہمیت اختلافات کو حاصل ہو جاتی ہے۔ کسی بھی علمی کارنامے کی اہمیت کا تعین اس بات سے نہیں ہو سکتا کہ اپنے موضوع پر اُسے کس حد تک حرفِ آخر کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ یہ خوبی بہ تمام و کمال کسی بھی علمی کارنامے میں نہیں پائی جاتی۔ اگر ایسا ہو تو علوم و فنون کی نشو و نما اور ارتقا رک جائے۔ کسی کتاب کی علمی اہمیت کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ اس سے فکر و نظر کے کون سے گوشے وا ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے "عام فکری مغالطے" ایک وقیع علمی کارنامہ ہے۔

جب بھی کسی عہد میں کسی کتاب یا مفکر کو حرفِ آخر قرار دینے کا رجحان غالب آیا، علوم کی نشو و نما اور ارتقا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ اور المنقذ من الضلال اعلیٰ ترین علمی کاوشیں ہیں۔ لیکن ان کو حرفِ آخر کی حیثیت ملتے ہی علوم کا ارتقا فوری طور پر متاثر ہوا۔ یہی بات ابن تیمیہ کی الرّد علی المنطق کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اگرچہ اس میں دیئے گئے دلائل ابو محمد الحسن النوبختی البغدادی اور قاضی افضل الدین المصری سے مستعار ہیں۔ یونانی فلسفے پر غزالی کی تنقیدات سے فلسفے کو ایک نیا رُخ ملا۔ عالمِ اسلام میں نہیں بلکہ یورپ میں۔ دیکارت جو جدید فلسفے کا بانی خیال کیا جاتا ہے، غزالی سے اس حد تک متاثر تھا کہ ہنری لوئیس کے خیال میں اگر غزالی کی احیاء العلوم کا ترجمہ دیکارت کے زمانے میں موجود ہوتا تو ہر شخص پکار اُٹھتا کہ دیکارت کی DISCOURSE SUR LA METHODE احیاء العلوم کا چربہ ہے۔ ہنری لوئیس کا یہ قول اقبال اور شبلی نعمانی دونوں نے نقل کیا ہے۔ اقبال نے "فلسفۂ عجم" میں اور شبلی نعمانی نے "الغزالی" میں یہاں یہ لطیفہ بے محل نہ ہوگا کہ پروفیسر تھاؤلیس نے اپنی ایک کتاب "نفسیاتِ مذہب" کے دیباچہ طبع اوّل میں دعویٰ کیا کہ غزالی کی "احیاء العلوم" فی الحقیقت دیکارت کی (DISCOURSE) کی نقل ہے۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ غزالی دیکارت سے کم و بیش پانچ صدیاں پہلے گزرا ہے تو دیباچہ طبع دوم میں اس کی تصحیح یوں کی کہ فی الاصل دیکارت نے غزالی سے کسی قسم کا استفادہ کئے بغیر آزادانہ طور پر اپنا نقطۂ نظر قائم کیا، غزالی کے نقطۂ نظر سے اس کے نقطۂ نظر کی حیرت انگیز مماثلت محض اتفاق ہے، حقیقت یہ ہے کہ نہ ہنری لوئیس کا خیال درست ہے اور نہ پروفیسر تھاؤلیس کا، دیکارت کی (DISCOURSE) احیاء العلوم کی نقل نہیں، المنقذ من الضلال کی نقل ہے۔ ہنری لوئیس کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ دیکارت کے زمانے میں غزالی کی تصانیف کے تراجم موجود نہیں تھے، یہ درست ہے کہ یہ تراجم فرانسیسی میں موجود نہ تھے۔ لیکن لاطینی میں موجود تھے اور دیکارت لاطینی زبان سے بخوبی واقف تھا اس لئے دیکارت کو یہ کہہ کر کہ اس کے زمانے میں فرانسیسی تراجم نہیں تھے، اس الزام سے بچایا نہیں جا سکتا کہ اس نے غزالی کی خوشہ چینی کی ہے، احیاء العلوم کے صرف ایک باب کا اثر دیکارت پر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے جو علم کی بحث میں ہے، پوری کتاب کا نہیں، آج دیکارت کے فلسفے سے شاید ہی کسی کو اتفاق ہو لیکن اس کی اہمیت مسلم ہے۔

"عام فکری مغالطے" اس لحاظ سے اہم حیثیت کی حامل ہے کہ اس کے ہر باب میں ان متوازی رجحانات سے بحث کی گئی ہے جن میں سے ایک علوم و فنون کے ارتقا میں ممد و معاون ہے اور دوسرا رکاوٹ، وہ رجحانات جن کے غالب آجانے سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی ترقی متاثر ہو سکتی ہے انہی کو فکری مغالطہ کہا گیا ہے اور ان کا رد کیا گیا ہے۔ جو رجحانات تہذیب و علوم کے ارتقا میں ممد و معاون ہیں، ان کا دفاع کیا گیا ہے۔ اس بات کو تو معرضِ بحث میں لایا جا سکتا ہے کہ وہ فکری مغالطے ہیں یا نہیں لیکن اس بات کو معرضِ بحث میں نہیں لایا جا سکتا کہ اس اندازِ فکر کا جسے پروفیسر صاحب مغالطہ کہتے ہیں، کسی عہد میں غالب آ جانا اور ہمہ گیر ہو جانا علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ رجحانات جنہیں وہ مغالطہ کہتے ہیں واضح طور پر تہذیب و علوم کے ارتقا میں رکاوٹ ہیں۔ اس لحاظ سے "عام فکری مغالطے" کی علمی حیثیت نمایاں ہے اور غالباً اس موضوع پر

پہلی کتاب ہے جو دنیا کی کسی زبان میں لکھی گئی ہے[لہ]۔ اگرچہ برٹرینڈرسل کے دو مقالات

(1) IDEAS THAT HAVE HELPED MANKIND. اور

(2) IDEAS THAT HAVE HARMED MANKIND

ایسے ہی موضوع پر موجود ہیں لیکن انہیں کتاب نہیں کہا جا سکتا۔ یوں اولیت کا درجہ اسی کتاب کو دیا جائے گا۔ وہ لوگ جو غور و فکر میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اس راہ پر چلنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا ہر باب ایک گائیڈ پوسٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر گائیڈ پوسٹ پر لغزش پا اور قطع منازل کی صورتوں کی واضح نشاندہی موجود ہے، یہاں تک تو بات افراد کے حوالے سے ہے، معاشرتی اور سماجی حوالے سے 'عام فکری مغالطے' کہیں زیادہ اہمیت کی حامل ہے، اس کا کوئی مقالہ خلا میں معلق نہیں بلکہ ایک واضح سماجی اور معاشی پس منظر میں پیش کیا گیا ہے، پروفیسر صاحب انسانی معاشرے، تہذیب اور علوم و فنون کے ارتقا کے داعی ہیں، انہیں اس بات سے قطعاً دلچسپی نہیں کہ فرشتے کس قسم کے معاشرے میں رہتے ہیں اور وہاں ارتقا کی کونسی صورتیں ممکن ہیں۔ وہ انسانی معاشرے کے فرد ہیں اور ان کی دلچسپیوں کا مرکز و محور یہی معاشرہ ہے اور وہ اسی کے ارتقا کے خواہاں ہیں۔ اسی لئے 'عام فکری مغالطے' کا کم و بیش ہر مقالہ اسی تناظر میں پیش کیا گیا ہے، یہ مقالات خلاؤں میں گھور گھور کر نہیں لکھے گئے وہ خلاؤں میں گھور کر سوچنے کے عادی نظر نہیں آتے، انہیں انسان اور نوع انسانی سے محبت ہے۔ یہ تعلق انہوں نے کہیں منقطع نہیں ہونے دیا۔ ان کا پسندیدہ معاشرہ مغرب کے تنزل پذیر اور بیمار معاشرے سے کہیں بہتر ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ وہ معاشرہ جس کی بنیاد معاشی عدل و انصاف اور مساوات پر ہو اس معاشرے سے بہتر ہے جس میں یہ خوبی مفقود ہے۔ اس حقیقت کو کسی دلیل سے رد نہیں کیا جا سکتا نہ اس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی حاجت ہے "عام فکری مغالطے" کی اس خوبی کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہوگی کہ اس کے مطالعے سے فکر کو تحریک ملتی ہے اس کا ثبوت یہ سطور ہیں جو ایک ایسے آدمی کے قلم سے ہیں جس نے یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد قلم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ جس نے سیدھے سادے اور آسان پیرائے میں اپنی سوچ کا اظہار کرنا اسی کتاب سے سیکھا۔ معلوم نہیں اس سلسلے میں اس کتاب کا قرض میری طرح اور کتنے لوگوں کے ذمے ہوگا ؏

ہاں بانگ بلند است ایں پوشیدہ نمی گویم

اگر یہ الفاظ دوسروں کے نقطۂ نظر کی بھی ترجمانی کرتے ہیں تو 'عام فکری مغالطے' کے پیش لفظ میں کئے گئے دعوے کا جواز کتاب کا ہر باب کامیابی سے فراہم کرتا ہے اور جس مقصد کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے اس سے انحراف کر کے علوم و تہذیب کا فروغ ممکن نہیں رہتا۔

"ہم ان عقائد کو جو ہمیں ورثے میں ملتے ہیں یا جنہیں ہم اپنے تہذیبی ماحول سے اخذ کرتے ہیں بغیر سوچے سمجھے قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انسان فکری لحاظ سے سہل پسند واقع ہوا ہے اور غور و فکر سے جی چراتا ہے دوسری یہ کہ جامد رسوم فکر ہمارے مزاج عقلی میں اس حد تک نفوذ کر جاتی ہیں کہ ان کی جانچ پرکھ کا عمل خاصا اذیت ناک ہوتا ہے عمر گزرنے کے ساتھ ہمارا ذہن اس دودکش کی طرح دھندلا ہو جاتا ہے جسے ایک مدت سے صاف نہ کیا گیا ہو۔ ہم اس کے جالوں سے مانوس ہو جاتے ہیں اور انہیں سینت سینت کر رکھتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ انہیں صاف کیا جائے ہم ڈرتے ہیں کہ انہیں جھاڑ پونچھ دیا گیا تو روشنی کی چمک دمک سے ہماری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور وہ شکوک و شبہات جو اہمال و ابہام کے پُراسرار دھندلکے میں لپٹے ہوئے تھے اجاگر ہو کر ہمیں پریشان کرنے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ تعصبات اور معتقدات کی تاریکی خواہ کتنی ہی پُرسکون ہو فکر و صداقت کی روشنی کا بدل نہیں بن سکتی"

لہ اگرچہ عدم علوم، علم عدم کے مترادف نہیں۔ لیکن حکم بہرحال علم کی بنیاد پر ہی لگایا جاتا ہے۔ لاعلمی کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا

غنی کاشمیری

محمد عبد اللہ قریشی

کشمیر اپنے جن جلیل القدر فرزندوں پر ناز کر سکتا ہے غنی ان میں سے ایک ہے۔ غنی کی ذات گوناگوں کمالات کا مجموعہ تھی۔ اس کی زندگی زہد اور تقویٰ کا ایک شاندار نمونہ تھی، وہ شاعر تھا اور اس کی شاعری نے ملکی اور غیر ملکی نقادانِ فن سے خراج تحسین حاصل کیا۔

نام و نسب ملا غنی کا نام محمد طاہر تھا وہ خواجہ طاہر رفیق کا بیٹا اور محمد زماں نافع کا بھائی تھا۔ کشمیر میں ایک مشہور قبیلہ، شائی کے نام سے آباد ہے غنی اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ نواب صدیق الحسن اپنے مشہور و معروف تذکرہ "شمع انجمن" میں لکھتے ہیں:

"غنی کشمیری از قبیلہ اشائی ست"

"سرو آزاد" کے مصنف مولانا آزاد بلگرامی اور صاحب "نشتر سخن" بھی اس بات میں متفق ہیں۔ اس قبیلہ کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف نادر روایات بیان کی جاتی ہیں، ریاست جموں و کشمیر کی رپورٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء میں لکھا ہے کہ "عشائی فرقہ موضع عشور واقع خراسان سے آیا ہے، اصل نام عشوری تھا۔ عشاوری سے عشائی ہو گیا"[1]۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان "تاریخ حسن" سے لیا گیا ہے جس میں مذکور ہے:

"گویند جد آنہا از مقام عیشاور کہ دیہہ است ممالک خراسان آمدہ۔ حالا مردم کشمیر عیشاوری را عشائی مخفف کردہ اند۔"

"روضۃ الابرار" میں لکھا ہے کہ اس طبقہ کا جدِ اعلیٰ خواجہ محمد سنگین امیر کبیر سید علی ہمدانی المعروف بہ شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ کشمیر آیا تھا۔ وہ اور اس کے بیٹے سب کے سب نیکو کار اور پاکباز تھے۔ تجارت ان کا مرغوب پیشہ تھا۔ اور وہ اشراق سے لے کر ظہر کی نماز تک دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ پھر نماز عصر تک کارخانہ کی دیکھ بھال کرتے اور نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد عشاء کی نماز تک مسجد میں بیٹھے اللہ اللہ کیا کرتے عشاء کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے۔ اس لئے لوگ انہیں عشائی کہا کرتے تھے، یہ طریقہ ایک مدت تک ان کے خاندان میں جاری رہا۔

کشمیر کا ایک اور مورخ بیان کرتا ہے کہ جب حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کا فیض کشمیر میں جاری تھا تو ایک شخص محمد سنگین نامی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوا، اور مراتب قرابت طے کرتا ہوا شاہ ہمدان کی بارگاہ میں اس قدر مقبول ہوا کہ رات کا کھانا بھی آپ ہی کے ساتھ کھانے لگا۔ ایک رات وہ آپ کی خدمت سے غیر حاضر تھا جب کھانے کا وقت آیا اور کھانا دستر خوان پر چنا گیا تو حضرت شاہ ہمدان نے فرمایا کہ "من عشائی کجا ست" چنانچہ اس روز سے اس کا لقب عشائی قرار پایا، اور اس کی اولاد بھی اسی نام سے پکاری جانے لگی۔

یہ بیان بظاہر جتنا وقیع معلوم ہوتا ہے اتنا ہی اصلیت سے دور ہے۔ ہمارے تذکرہ نگاروں کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ ہر چیز کو کسی نہ کسی بزرگ یا ولی سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، چونکہ کشمیر میں علی ثانی حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی سے بڑھ کر کوئی مقدس اور بزرگ ہستی نہیں ہوئی اس لئے اہلِ کشمیر نے کشمیر کے سب سے بڑے شاعر کے خاندان کو انہی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔

اگر اس روایت کو درست بھی مان لیا جائے تو اشائی اور عشائی کی کتابت صاف غمازی کر رہی ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان دونوں کا مادہ ایک نہیں ہو سکتا۔ لفظ اشائی دراصل ایک قبیلہ کا نام ہے جو شاہ ہمدان کی آمد سے بہت پہلے کشمیر میں آباد تھا، اور اسلام کی دولت

---

[1] رپورٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۵

سے مالا مال ہو چکا تھا اور اسے عشائی سے کوئی تعلق نہیں۔

سر والٹر لارنس اشائی قبیلہ کو مغلوں کا ایک فرقہ ظاہر کرتے ہیں، اس واسطے وہ اور دوسرے مورخ عشائی کو 'ع' کی بجائے 'الف' سے لکھتے ہیں۔ اس صورت میں اشائی کا تعلق نمازِ عشا، یا طعام عشا سے باقی نہیں رہتا۔

مشہور محقق و مورخ اور تاریخ کشمیر اور تاریخ بڈشاہی کے فاضل مصنف منشی محمد دین فوق مرحوم اپنی کتاب تاریخ اقوام کشمیر میں لفظ عشائی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "خواجہ محمد سنگین اگر امیر ہی کے ہمراہیوں میں تھے اور ان کے ساتھ ہی بخارا یا ترکستان کے کسی مقام سے کشمیر آئے تھے تو لازماً ان کا قیام بھی حضرت امیر کے ساتھ ہی ہوگا۔ اور سب یارانِ ہم صحبت ایک ہی جگہ کھانا کھاتے ہوں گے۔ پھر علیحدہ صرف انہی کو "عشائی کجاست" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ محمد سنگین کشمیری الاصل تھے، اور چونکہ وہ اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر عشا کے بعد بزمِ امیر میں شامل ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نہ گئے ہوں گے یا دیر سے گئے ہوں گے تو انہوں نے "عشائی کجاست" کہہ دیا ہوگا۔ اس تفصیل کے بعد یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا "عشائی کجاست" کے الفاظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خواجہ محمد سنگین کا عرف عشائی ان کے خراسانی وطنِ قدیم کے نام عشور پر حضرت امیر کے آنے سے پہلے ہی مشہورِ عام تھا، اور وہ خواجہ محمد سنگین کو جس طرح ہر روز عشائی کے نام سے پکارا کرتے تھے، ایک دن معمول کے موافق آپ نے ان کی عدم حاضری میں بھی ان کو عشائی کے نام سے پکار دیا۔"
>
> "ایک اور بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ خواجہ محمد سنگین سرینگر کے نامور رؤسا میں تھے، اور نہایت معزز اور فیاض تھے۔ ایسا جلیل القدر رئیس حضرت امیر کبیر کے دسترخوان پر جو باوجود اپنے علو مرتبت کے کشمیر میں ایک مہاجر و مہمان اور مبلغ کی حیثیت میں مقیم تھے بلاناغہ ہر رات کو کس طرح حاضر رہ سکتے تھے۔ بلکہ یہ بہت ممکن ہے کہ خواجہ محمد سنگین نے اپنی عزت افزائی کے لئے بارہا امیر کبیر کو اپنے ہاں مدعو کیا ہو۔[1]"

پس ثابت ہوا کہ عشائی فرقہ کے متعلق جو کچھ "تاریخ حسن" اور سر والٹر لارنس نے لکھا ہے وہی صحیح ہے۔ یہ مغلوں کا ایک فرقہ تھا جو خراسان سے ہجرت کر کے کشمیر میں آباد ہوا، اور عشائی سے اشائی کہلانے لگا۔

تاریخ ولادت

ملا غنی سرینگر کے مشہور محلہ عالی کدل میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت کسی قدیم تذکرہ سے نہیں ملتی، تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور دیگر کمالات کے متعلق تو دو چار رنگین فقرے ضرور لکھے ہیں مگر ان کی زندگی کے واقعات کے متعلق کچھ نہیں لکھا، اس لئے ملا غنی کی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں، مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی، مولوی محمد شاہ سعادت مورخ کشمیر اور دیگر تذکرہ نگار اس پر متفق ہیں کہ غنی سنہ ۱۰۴۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر اس بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جب غنی سنہ ۱۰۷۹ھ میں فوت ہوئے تو ان کی عمر انتالیس برس تھی، اور وہ عین عالم شباب تھا۔ مگر ان کا دیوان اس کے خلاف شہادت دیتا ہے کہ وہ بڑھاپے میں فوت ہوئے۔ کیونکہ اس میں جا بجا پیرانہ سری، کمزوری، رعشہ، ضعف اور لاغری کی شکایت پائی جاتی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غنی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ دانت گر چکے تھے۔ نقاہت اور کمزوری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ سہارے کے بغیر چلنا پھرنا ان کے لئے دوبھر تھا، یہ تمام عوارض جوانی میں پیدا نہیں ہوتے۔ غنی پیرانہ سری کے باعث بال سپید ہونے اور دانت گر جانے کی شکایت کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں:

موگشت سپید و ریخت دنداں — در صبح شود ستارہ پنہاں

ہر چند شد تہی ز سیاہی دوات سر — مشق گنہ ہنوز زچوں اطفال می کنم

پیریم نیست چہرۂ زرباف باب ما — دستار نقرہ باف زمو بستہ ایم

بگذشت عمر و موی سفیدی بجا گذاشت — خاکستری ز قافلۂ یادگار ما

---

[1] تاریخ اقوام کشمیر جلد اول ص ۲۳۲-۲۳۳

زپیری ریخت دندانم نہ دم تن بیادِ حق — بیازی آخرین تسبیح چو اطفال گم کردم
ریخت دندان بدہن رفت جوانی برباد — آہ ازیں ژالہ کہ در مزرع بختم افتاد
زپیری چناں گشتہ ام ناتواں — کہ دنداں بجنبند جاے زباں

رعشہ کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قوتِ رفتار دارم باوجودِ ضعفِ پا — چوں قدم در رہ گذارم می رود پایم زجا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۴۰ھ سے بہت پہلے عالم وجود میں آ چکے تھے۔

شاعر کا اپنا بیان تذکرہ نگاروں کی موشگافیوں سے زیادہ وقیع اور درست ہوتا ہے۔ اس لئے ان حالات میں کسی تذکرہ نگار کے بیان کو غنی کے ذاتی بیان پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اس کا دیوان ہر تذکرہ سے زیادہ اہم اور اس کا بیان ہر تاریخ سے زیادہ قابل قبول ہے۔

ابتدائی حالات

غنی کے ابتدائی حالات جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں بھی ہمیں اس کے دیوان کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

غنی کی ابتدائی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی۔ شاہانِ اسلام کی فیاضیوں سے جا بجا مدرسے جاری ہو چکے تھے۔ جہاں ہر شخص خاطر خواہ تعلیم حاصل کر سکتا تھا، اور اسے کسی قسم کے اخراجات کا متحمل نہیں ہونا پڑتا تھا، ان ایام میں ملا محسن فانی کی شہرت دور و نزدیک پہنچ چکی تھی اور ہر مقام سے طالب علم خود بخود ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، ملا محسن فانی کا حلقۂ درس محلہ قطب الدین پورہ میں واقع تھا۔ غنی بھی ابتدائی تعلیم کے بعد اس درس میں شامل ہوئے، طبیعت نہایت تیز اور دماغ نہایت صاف تھا، اس خداداد ذہانت کی بدولت وہ قلیل مدت میں اپنے ہمسروں سے بازی لے گئے اور استاد کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ استاد نے انھیں جوہرِ قابل سمجھ کر اپنی آغوشِ تربیت میں لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث، تصوف اور دیگر علوم متداولہ میں ماہر کر دیا۔ یہاں تک کہ جب کبھی ملا محسن فانی کو کوئی مشکل علمی مسئلہ پیش آتا تو شفیق استاد اس کا حل بھی غنی سے کرتا۔ چنانچہ شیر خاں لودھی "مراۃ الخیال" میں لکھتا ہے:

"ہرگاہ شیخ را مسئلہ مشکل شدے از وے استفسار نمودے"[1]

غنی نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ کتب بینی کو وظیفۂ حیات اور جزوِ زندگی بنایا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ اپنے زمانہ کی فقید المثال ہستی بن گئے۔ شیر خاں لودھی لکھتا ہے: "بمدد طبع دراک در فنون و علوم بر استاد چیرہ دستی می نمود"[2]

شاعری کی ابتدا

عام روایت ہے کہ غنی نے ۱۰۴۰ھ میں شاعری شروع کی اور لفظ "غنی" سے اس کی تاریخ شعر گوئی برآمد ہوتی ہے۔ چنانچہ محمد افضل سرخوش کا بیان ہے: "تاریخ شعر گفتن او از لفظ غنی بر می آید"[3]

یہ بیان نہایت عجیب و غریب ہے۔ شاعری ایک دہبی چیز ہے۔ شاعر پیدا ہوا کرتے ہیں بنائے نہیں جاتے، شاعر بننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان شاعری کالجوں میں تعلیم پائے یا کسی مشہور شاعر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرے۔ مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ کسی شاعر کو عروض و قوافی کے مطالعہ سے بے نیاز ہو جانا چاہیئے، یا وہ کسی فاضل کی تربیت سے مستغنی ہو جائے۔ یہ سب باتیں شاعر کے جذبات و خیالات کے اظہار میں پختگی پیدا کرتی ہیں، اس کی طبیعت کو جلا دے کر اس کے کلام کو سحر حلال بنا دیتی ہیں۔ شاعری درحقیقت فطری چیز ہے۔ اس لئے کسی شاعر کے متعلق یہ کہنا کہ فلاں سن تک وہ شاعری کے عطیے سے محروم تھا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔

غنی کے دیوان میں اس قسم کی کئی مثالیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۴۰ھ سے پہلے مشق سخن جاری کر چکا تھا۔ غنی کی ایک مشہور غزل ہے جس کے چند شعر حسب ذیل ہیں:

---

[1] مراۃ الخیال مطبوعہ بمبئی ص ۲۴۲
[2] ایضاً
[3] کلمات الشعراء از سرخوش قلمی نسخہ

درنمک زارِ سوادِ ہند شادابی کم است	گر در آنجا سبزۂ باشد ز تخم آدم است
گلشن کشمیر را امسال شادابی کم است	گر گلی ابر نمایان است آنہم بے نم است
از بدنہا در ہوائے گرم می جوشد عرق	گر بود خاک رطوبت خیز خاک آدم است
در جہان نتوان نشان از سیر چشمی یافتن	چشمۂ خورشید ہم محتاج آب شبنم است

ان اشعار کے مطالعہ سے سراغ ملتا ہے کہ ان دنوں ہندوستان میں سخت خشک سالی تھی۔ اسی سال کشمیر بھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ امساکِ باراں، اور تمازتِ آفتاب نے اسے خوفناک قحط کی صورت میں بدل دیا۔

ہندوستان کی تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ۱۰۴۱ھ میں ہندوستان ایک خوفناک قحط کی لپیٹ میں آیا، بارش نہ ہونے سے فصلیں تباہ ہوگئیں کھیتیاں جل گئیں، انسان اور حیوان بھوک مرنے لگے۔ غریبوں کی آہ وزاری اور بنی نوع انسان کی بے قراری اور فاقہ مستی نے ملک کے ملک کو مبتلائے آلام و مصائب کر دیا، چنانچہ ملا عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے[۱] کہ پنجاب میں قحط کی شدت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی اولاد تک کو بیچ بیچ کر کھا رہے تھے، بادشاہ نے حکم دیا کہ سرکاری خزانے سے غریبوں کو مدد دی جائے۔ جا بجا لنگر کھولے جائیں، اور جو لوگ اولاد بیچ چکے ہیں۔ ان کی قیمت سرکاری خزانے سے ادا کرکے اولاد انھیں واپس دلائی جائے"

کشمیر میں قحط کی شدت اس سے بھی زیادہ تھی، ہزاروں لوگ فاقہ کشی کا شکار ہوگئے، اور سینکڑوں ہجرت کرکے دوسرے مقامات پر چلے گئے۔ شاہجہان نے اس موقع پر بڑی دریا دلی سے کام لیا اور قحط زدوں کی بے حد امداد کی، پنجاب اور دوسرے علاقوں سے کشمیر میں غلہ بھجوایا۔ محلات کی شاہی بیگمات اور درباری امراء سے رقم کثیر بطور خیرات وہاں ارسال کی۔ تربیت خاں ناظم کشمیر نے قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لئے جان تک لڑادی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا، چنانچہ اس کی جگہ حسن بیگ کو کشمیر کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اس نے سرکاری امداد کے علاوہ نوشہرہ میں ایک باغ تعمیر کرایا جس کی تعمیر کا مقصد محض قحط زدہ لوگوں کو روزگار مہیا کرنا تھا، مگر یہ قحط ۱۰۵۰ھ تک کشمیر کو پریشان کرتا رہا۔[۲]

غنی کی مندرجہ بالا غزل اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ ۱۰۵۰ھ سے بہت پہلے مشق سخن جاری کر چکے تھے۔

علاوہ ازیں غنی کے دیوان میں ملک الشعراء کلیم ہمدانی کا مرثیہ موجود ہے جو ۱۰۶۱ھ میں فوت ہوا، اس میں مولانا غنی لکھتے ہیں:

حیف گر دیوار ایں گلشن پرید	طائر آں بلبل باغ نعیم
رفت آخر خامہ را از دست او	بے عصا طے کرد ایں رہ را کلیم
اشک حسرت چوں نمی ریزد قلم	شد سخن از مردن طالب یتیم
ہر دم از شوق ِ دلِ اہلِ سخن	چوں زبانِ خامہ می گردد دو نیم
عمرہا در یاد او زیرِ زمیں	خاک بر سر کرد قدسی و سلیم
عاقبت از اشتیاق یک دگر	گشتہ اند ایں ہر سہ در یکجا مقیم

گفت تاریخ وفات او غنی

طور معنی بود روشن از کلیم

یہ مرثیہ غنی کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور قدسی، سلیم اور کلیم کے باہمی روابط کی نشان دہی کرتا ہے۔ پہلے دو شاعر سلیم اور قدسی ۱۰۵۶ھ سے پیشتر فوت ہو چکے تھے، اور کلیم ہمدانی ۱۰۵۵ھ میں وارد کشمیر ہوا۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ:

"یہ تینوں شاعر یعنی کلیم، صائب اور غنی مدت تک کشمیر میں ہمدم اور ہم قلم رہے اور باہم مشاعرے رہتے تھے"[۳]

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۴۸۹ [۲] تاریخ اعظمی ص ۱۳۰ [۳] شعر العجم جلد سوم ص

نشترِ سخن[1] کا فاضل مصنف لکھتا ہے:۔

"وقتے کہ میرزا صائب طالبائے کلیم نزد ظفر خان احسن ناظم کشمیر تشریف داشتند ملا غنی ہم صحبت ایشان بود و فیض ہا بردہ"

یہ بات واضح ہے کہ صائب ۱۰۴۲ھ کے آغاز میں ظفر خاں احسن کے ہمراہ کشمیر آیا اور اس جنتِ ارضی کی سیر سے لطف اندوز ہوا، اور اس کے بعد وہ اپنے باپ کے ساتھ ایران چلا گیا، علامہ شبلی کا بیان ہے[2]:

"میرزا (صائب) نے اگرچہ اخیر زندگی ایران سے قدم باہر نہیں نکالا، تاہم ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں۔"

ان واقعات اور حالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ غنی میرزا صائب کے اسی سفرِ کشمیر میں روشناس ہوا تھا، اور آخر ان کی دوستی بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اس ملاقات کے دوران میں غنی نے اپنا دیوان میرزا کی خدمت میں پیش کیا۔ خان آرزو لکھتے ہیں کہ میرزا صائب نے غنی کے دو سو شعر انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو خان آرزو کے زمانہ تک موجود تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ غنی ۱۰۴۲ھ سے پیشتر بھی شعر کہتا تھا اور اس کی شہرت دور و نزدیک پہنچ چکی تھی، چنانچہ میر حسین دوست سنبھلی تذکرہ حسینی میں لکھتے ہیں کہ[3]:

"جب صائب غنی کی ملاقات کے لئے کشمیر آیا تو غنی کا کلام ایک لاکھ اشعار سے زیادہ تھا جس کا انتخاب غنی نے صائب کی خدمت میں پیش کیا

جب صائب نے یہ شعر پڑھا: حسن سبزے بہ خطِ سبز مرا کرد اسیر — دام ہم رنگ زمیں بود گرفتار شدم

تو بے اختیار بول اٹھا کہ کاش! ایں ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام بایں کشمیری می دادم و ایں یک بیت او بہ من حوالہ می کرد۔"

اسی تذکرہ میں ایک اور مقام پر مذکور ہے:

"ایک مرتبہ میرزا صائب کہیں سیر کو گیا ہوا تھا۔ اس کی بیاض غنی کے پاس پڑی تھی، ایک عقیدت مند غنی کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیاض اٹھا دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ایک شعر کا پہلا مصرع چاقو سے چھلا ہوا ہے اور دوسرا مصرع اس طرح ہے۔ ع

کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

اس نے مولانا غنی کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کا پہلا مصرع کیا ہو سکتا ہے۔ غنی نے بے تامل فرمایا:

کدام سوختہ جاں دست زد بداماں نت — کہ از لباس تو بوئے کباب می آید

اس شخص نے یہ مصرع بیاض میں لکھ دیا، جب میرزا صائب واپس آیا اور مصرع دیکھ کر اصل حال سے واقف ہوا تو کہنے لگا، "کاش کہ صائب دیوانِ یک مصرع می نگاشتے و تضمینش ملا غنی کردے۔"

ان واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ غنی، صائب، کلیم اور قدسی کے تعلقات باہم دوستانہ تھے، اور ان شعراء کی آمد و رفت کشمیر میں ۱۰۶۰ھ سے پہلے شروع ہو چکی تھی، اس لئے غنی کی شاعری کا آغاز ۱۰۶۰ھ سے پہلے ہوا۔ سب سے بڑھ کر جو بات ہمارے بیان کو استوار کرتی ہے وہ یہ ہے کہ غنی کے معاصرین اور قریب العہد مورخین کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ غنی نے ۱۰۶۰ھ سے پہلے شعر نہیں کہے، شیر خاں لودھی اس کا ہمعصر ہے وہ فقط اتنا لکھ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ "ملا طاہر غنی تخلص داشت۔"

سفر و سیاحت

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے نواب صدیق الحسن کے ہمنوا ہو کر یہ ثابت کیا ہے کہ غنی نے کشمیر سے باہر قدم نہیں نکالا، چنانچہ نواب صاحب فرماتے ہیں: "مدت العمر در شہر خود گذرانید۔"

مگر غنی کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غنی نے خوب سیر و سیاحت کی، ایک جگہ کہتے ہیں:

پیوستہ بکنج انزوا در سفرم — با آنکہ نشستہ ام ز پا در سفرم
ہر چند مسافتم بود یک کف دست — عمریست کہ ہمچو آسیا در سفرم

---

[1] نشترِ سخن ورق ۲۹۵ الف　[2] شعر العجم جلد سوم ص۱۹۵　[3] تذکرہ حسینی

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

کرد است ہوائے ہند دلگیر مرا — اے بخت رساں بہ باغ کشمیر مرا

گشتم ز حرارتِ غریبی بیتاب — از صبحِ وطن بدہ طباشیر مرا

اس رباعی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غنی کسی وقت کشمیر سے نکل کر ہندوستان کے کسی علاقے میں گئے۔ وہاں کی گرم آب وہوا نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنے ملک کی سرد آب وہوا کو یاد کریں۔ ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

برنگ آبلۂ پائے در سفر ما را — ز شوقِ صبحِ وطن چشم تر سفید شدہ است

ایک سفر انھیں عالمِ طفلی میں بھی اختیار کرنا پڑا۔ یہ غالباً تحصیلِ علوم کے لئے ہوگا:

معذورم ار ز خانہ نباشد خبر مرا — آمد چو اشک پیش بہ طفلی سفر مرا

سفر و سیاحت میں کشمیر کی یاد رہ رہ کر ان کے دل میں چٹکیاں لیتی تھی۔ اس لئے وہ کشمیر اور اپنے خویش و اقارب کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہر وقت چشم براہ رہتے تھے:

بس کہ شد زنجیرِ پایم رشتۂ حب الوطن — در سفر دائم چو سوزن چشم دارد در قفا

رفت عمرم در غریبی بر بساطِ روزگار — گرچہ ہمچوں مہرۂ شطرنج دارم خانہا

ایک مقام پر وہ اپنے مخصوص انداز میں سفر کے فوائد اس طرح بیان کرتے ہیں:

موئے چوں از سر جدا گردد نمی گردد سپید — عیشِ غربت مرد را پیوستہ می دارد جواں

غنی کے ایک شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سفر سے واپس آنے کے بعد ان کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ وہ دوبارہ سیر و سیاحت کے لیے روانہ ہوں:

ز شوقِ ہرزہ گردی ہمچوں ریگِ شیشۂ ساعت — بہ منزل تا نہادم پائے انداز سفر دارم

پھر کہتے ہیں:

پائے من یک لحظہ جا در گوشۂ داماں نکرد — گشت عمرم در سفر چوں رشتۂ سوزن تمام

دیگر

در سفر ہم ہم غمِ وطن است — گل باخار چیدہ را مانم

ان اشعار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غنی نے اکثر سفر اختیار کئے۔ ممکن ہے کہ ان تمام سفروں کی غرض و غایت حصولِ علم ہو یا کسی بزرگ سے روحانی فیض حاصل کرنا مطلوب ہو۔

تاریخ وفات

مولانا غنی بقول مراۃ الخیال ۱۰۷۹ھ میں فوت ہوئے۔ محمد علی ماہر متبنائے میرزا جعفر معمائی نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ لکھا ہے:

چو داد ش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی — غنی سر حلقۂ اصحاب او و نکتہ دانی شد

تہی چوں کرد بزم شیخ را گفتند تاریخش — کہ آگہی سوئے دار البقا از دار فانی شد

مولانا غنی کے ایک عقیدت مند شاگرد نے آپ کی تاریخ وفات اس طرح کہی ہے:

از فوتِ غنی گشت کہ و مہ غمگین
ہرکس شدہ در ماتم او خاک نشیں
تاریخ وفاتش از پے سند بگو
پنہاں شدہ گنج ہنرے زیر زمیں

۱۰۷۹ھ

دیگر:

دوشش بمن گفت قائلے کہ غنی مرد	قلت اسکت انت لیس ذکیاً
اہلِ دل اے بے خبر، مرگ نمیرند	کیف یموت الذی یکون تقیاً
نیست وفاتش جز انتقال مکانی	کان تقیاً و طاهراً و نقیاً
زندگی دیگرست مرگ عزیزاں	مرد ولی عند من یکون عمیاً
دل زخرد سال رحلتش چو طلب کرد	قال لنا ان تقول حتی غنیاً

۱۰۷۹ھ

دو تاریخیں تعمیہ کے ساتھ اس طرح بھی ملتی ہیں:

بے سخن داد سخن داد غنی
۱۷۸۸ − ۱۰۷۸ = ۱۰۷۹ھ

نیز:

افتاد بر زمیں سخن از رفتن غنی
۱۷۹۰ − ۱۰۷۸ = ۱۰۸۰ھ

ڈاکٹر چارلس ریو غنی کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوا لکھتا ہے: "غنی نے عین عنفوانِ شباب میں انتقال کیا"[۵]
فاضل مستشرق کا یہ بیان غالباً سرخوش کے اس بیان پر مبنی ہے؟
"اما مرغ روحش در عین شباب بہ سرپنجۂ شاہینِ اجل گرفتار گردید"
مگر یہ بیان درست نہیں، واقعات کے سراسر خلاف ہے کیونکہ غنی نے متعدد مقامات پر اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے۔ چند اشعار ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا غنی بیحد کمزور اور نحیف الجثہ ہو کر فوت ہوئے۔ آپ کے دانت گر چکے تھے، بال سفید ہو گئے تھے، جوڑوں میں درد رہتا تھا۔ انہی تکلیفوں سے تنگ آکر آپ نے فرمایا تھا: ؎

باشد اے کاش عمر کوتاہ مرا

نقاہت کا یہ عالم تھا: "از پیکر ہیولاتش پوستے و استخواں ماندہ بود"
ذیل میں دیوان غنی سے چند شعر اور پیش کیے جاتے ہیں۔

امروز منم شہرۂ عالم نہ نحیفی	عمریست کہ از ضعف فتادم بزبانہا
از بس کہ ضعیفیم بہیادِ کمر او	جز مور کسی نیست غنی کور کن ما
پشت ماگر دید خم افزود ضعفِ تن مرا	گرچہ محکم می شود چوں رشتہ می گردد دوتا

بڑھاپے کے دیگر عوارض کے متعلق بائیس شعروں کی ایک مسلسل غزل دیوان میں موجود ہے جس کا مطلع یہ ہے:

گرچنیں از درد اعضا خشک گردد پیکرم	می شود انگشت پایم رفتہ رفتہ خارپا

اس قسم کے تمام اشعار ہمارے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

حلقۂ احباب

مسلم مقدمہ دیوان غنی میں لکھتا ہے کہ "بجز معنی یگانہ بہیچ کس آشنائی نمی کرد"
مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ مولانا نے تمام عمر عزلت گزینی میں بسر کی اور آپ کا کوئی دوست نہ تھا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ صائب، کلیم، قدسی اور سلیم مولانا کے خاص الخاص دوست تھے۔ کلیم کی وفات پر آپ نے ایک پرسوز مرثیہ لکھا جس کے لفظ لفظ سے درد ٹپکتا ہے۔ امیر الامرا اسلام خاں ناظم کشمیر سے بھی آپ کو دلی انس تھا اور جب وہ ۱۰۷۴ھ میں فوت ہوا تو غنی نے ایک نہایت پُر درد مرثیہ لکھا۔ قلندر نامی شاعر بھی غنی کے حلقۂ احباب میں شامل تھا، چنانچہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

از اہل سخن کس بہ قلندر نرسد	در شعر باو عرفی و سنجر نرسد
ہر مصرع او بس کہ بلند افتادست	ترسم کہ باو مصرع دیگر نرسد

---

۵. فہرست کتب قلمیہ فارسی جلد دوم ۶۹۴

۶. کلمات الشعرا خطی

طغرا سے آپ ناراض تھے چنانچہ اس کی ہجو میں ایک رباعی بھی کہی تھی:

طغرا کہ بود روح کثیفش چو جسد ۔۔۔ با صاف ضمیران شده دشمن ز حسد
گوید کہ برند شعرش ارباب سخن ۔۔۔ نامش بزند تا بشعرش چه رسد

میر الہٰی ہمدانی بھی آپ کے دوستوں میں تھا، دیوان میں اس کی تاریخ وفات موجود ہے۔ عنایت خاں آشنا پسر ظفر خاں احسن بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھا۔ اسے اپنی شعر فہمی پر بہت ناز تھا۔ ایک دفعہ اس نے دعویٰ کیا کہ جو شعر ایک دفعہ پڑھنے یا سننے سے میری سمجھ میں نہیں آتا بے معنی ہوتا ہے۔ مولانا غنی نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ:

"تا حال اعتماد بر شعر فہمی عنایت خاں داشتی امروز آں برخاست[1]"

اس کے بعد آپ نے اس سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ مولانا کو اپنے عزیزوں سے دلی لگاؤ تھا، بڑھاپے میں جب اکثر عزیز آپ کو داغ مفارقت دے گئے تو آپ نے ان کی جدائی میں یوں آنسو بہائے:

زنده در گورم اگر گردش افلاک کند ۔۔۔ به که در مرگ عزیزان بسرم خاک کند
گشتیم زنده در گور از بس درین غم آباد ۔۔۔ کردیم خاک بر سر در ماتم عزیزان

مولانا غنی نے جہاں اپنے دوستوں کی مدح سرائی کی ہے اور ان کی مختلف خوبیوں کا اعتراف کیا ہے وہاں آپ نے بڑے زور سے اس بات کی شکایت بھی کی ہے کہ چور شاعروں نے ان کے اشعار اور مضامین چرا لئے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

طبع آں شاعر کہ شد با طرز دزدی آشنا ۔۔۔ معنی بیگانہ دارند معنی بیگانہ را
بہ بزم نکتہ سنجاں سرخ روئی از سخن دارم ۔۔۔ بہ در نظم اگر دزدے برد مضمون رنگینم
ز مضمون دزدی یاراں نمی باشد غمے مارا ۔۔۔ چناں بستیم مضموں را کہ نتواند کسے بردن

اخلاق و عادات

مولانا غنی ایک با صفا بزرگ تھے، آپ کا فیض عام تھا، حاجی محی الدین مسکین اپنی کتاب "تحائف الابرار فی ذکر الاخیار" میں غنی کے بھائی محمد زماں نافع کی نسبت لکھتے ہیں:

"آداب طریقت باطنی از برادر خود ملا طاہر غنی حاصل نمودہ بود۔"

مولانا غنی نے اپنے تخلص کی رعایت سے استغنا کو اپنا مسلک قرار دے رکھا تھا چنانچہ نشتر سخن کا فاضل مصنف لکھتا ہے:

"اگرچہ از تنعم دنیوی بے نصیب بود اما در حقائق معنوی از بس غنی[2]"

مراۃ الخیال کا فاضل مصنف جو غنی کا معاصر تھا مولانا کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے:

"و ایں اسم را صفت ذات خود ساختہ در عین بے دستگاہی بکمال جمعیت می گذرانید، ہموارہ چوں زمرد بآب خود سرسبز بود و از شان آبرو و شوکت دریا فراغت داشتے۔"

بدیع الزماں نصیر آبادی تذکرۂ شعرائے ہند میں لکھتے ہیں کہ:

"در کمال بے تعلقی بود، چشم بر زخارف دنیا کہ در نظر عارف قدر برگ کاہے ندارد نگشودہ بعلت آں غنی معنوی بودہ۔"

نواب صدیق الحسن لکھتے ہیں:

"بنائے طبعی مجبول بود، با وصف بے دستگاہی بحضور خاطر بسر می برد، ازیں جاست کہ غنی تخلص می کند۔"

مرزا محمد افضل سرخوش کا بیان ہے کہ:

---

[1] مراۃ الخیال ص ۱۴۲
[2] نشتر سخن قلمی ورق ۲۹۵ الف

"میگویند تخلص خود را صنعتِ ذاتِ خویش ساختہ بنی دسے دستگاہی بکمال جمعیت می گذرد ند"

منشی محمد الدین صاحب فوق مشاہیر کشمیر میں لکھتے ہیں کہ:

"مولانا نے اپنے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ منتخب کر رکھا تھا، مگر جب اندر ہوتے تو دروازہ بند کر دیا کرتے اور جب باہر تشریف لے جاتے تو کواڑ کھلے چھوڑ جاتے۔ ایک دوست نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ متاع دوکان تو میں ہوں، جب میں نہ ہوں تو دروازہ بند کرنا بے سود ہے"

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے اس واقعہ کو یوں نظم فرمایا ہے:

غنیؔ آں سخن گوئے بلبل صفیر — نواسنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشت — چو رفت از سرا تختہ را واگذاشت
یکے گفتش اے شاعرِ دل رسے — عجب دارد از کار تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر — فقیر و با قلیم معنی امیر
ز من آنچہ دیدند یاراں رواست — دریں خانہ جز من متاع کجاست
غنیؔ تا نشیند بہ کاشانہ اش — متاع گرانے است در خانہ اش
چو آں محفل افروز در خانہ نیست — تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

غنیؔ نے جابجا اپنے اشعار میں استغنا پر زور دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کلبہ ام را طاقت بار گرانِ بام نیست — چوں کماں بیروں کنم از خانہ چوب تیر را
تا فقر شدہ مقیم کاشانۂ ما — از گردِ مال تہی ست ویرانۂ ما
رفتن بہ در خانۂ مردم عیب است — امروز کہ فاقہ ہست در خانۂ ما
دائم جوانم از مددِ ہمتِ بلند — یعنی ز بارِ منتِ کس خم نہ گشتہ ایم
ہر کہ چوں من زد قدم در راہِ استغنا غنیؔ — اطلسِ گردوں بپائے ہمتش پا تابہ ایست

غنیؔ کے مذہب میں سب سے بڑا گناہ دوسرے کے آگے دستِ سوال دراز کرنا ہے:

غنیؔ اگرچہ فقیر است ہمتے دارد — فشاندہ است بکونین دست خالی را
غنیؔ از نیکنامی زر نہ گیرد — کہ نام زر گرفتن ہم گدائی
لبِ سوال غنیؔ پیشِ ممسکاں مکشا — کہ ترسم از دہنت لقمہ زباں گیرند

ایک اور مقام پر اس سے زیادہ پُر زور الفاظ میں اپنے استغنار کا ذکر کرتے ہیں:

خانۂ ما زیر بارِ منتِ نقاش نیست — نیست نقش پیش ما خوشتر ز نقش بوریا

غنیؔ کی نظروں میں وہ انسان جو امیروں سے انعامات قبول کرتا ہے یا جو شاعر اشعار کا صلہ طلب کرتا ہے۔ وہ پست ہمت ہے:

غنیؔ چرا صلۂ شعر از کسے گیرد — ہمیں بس است کہ شعرش گرفتہ عالم را

تاریخ جدولیہ کا مصنف ۲۵ھ جلوس شاہجہانی کے واقعات کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے کہ غنیؔ نے شاہجہاں کی خدمت میں قصیدہ پیش کیا جس کے صلہ میں اسے ایک ہزار روپیہ انعام ملا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے یہ بات یقین کے درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ غنیؔ نے کسی بادشاہ، امیر یا وزیر کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا، بلکہ یہ بات اس کی تعلیمات کے سراسر خلاف اور زندگی کی روش کے بالکل برعکس تھی۔ وہ اس حد تک متوکل

تھا کہ قوت لایموت کے لئے کسی کا احسان اٹھانا یا پریشان ہونا بھی گوارا نہیں کرتا تھا، چنانچہ کہتا ہے:

می شود پیمانہ پُر از کثرتِ نعمت غنیؔ خضرِ وقت است آنکہ قانع شد بہ قوت لایموت

پھر کہتا ہے:

صاحبِ سخن نہ جنبد از بہر قوت از جا دائم بخانۂ خود روزی رسد زباں را

جو شخص اس قسم کی تعلیم دوسروں کو دیتا ہے اس کی اپنی زندگی یقیناً بہت پاک اور ہر قسم کے حرص و ہوا سے مبرا ہوگی، اس لئے غنیؔ کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے شاہجہاں کی مدح میں قصیدہ لکھا قرینِ قیاس نہیں۔ اگر اس نے کوئی قصیدہ لکھا ہوتا تو وہ اُس کے دیوان میں موجود ہوتا، مگر اس کا دیوان بھی اس قسم کی آلودگی سے پاک ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کسی اور شاعر کے متعلق ہوگا اور وہ غلطی سے غنیؔ کے نام جڑ دیا گیا ہے۔ تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۱ھ میں جب شاہجہاں سیاسی ضرورتوں کے تحت کشمیر گیا تو اکثر شعرا نے قصائد پیش کئے اور وہاں کے حالات کو مختلف طریقوں سے بادشاہ کے کانوں تک پہنچایا۔ ان شعرا میں ملّا فروغیؔ کشمیری بھی تھا جس نے ایک زبردست قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اس قصیدہ میں فروغیؔ نے اہل کشمیر کی مصیبتوں کو نہایت موزوں الفاظ میں بیان کیا، اس کے ساتھ ساتھ سلطنت کے کارندوں اور عاملوں کے ظلم و ستم کا رونا رویا۔ شاہجہاں اس قصیدے سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے ملّا فروغیؔ کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا، اور بارہ روپیہ یومیہ روزینہ مقرر کر دیا۔ نیک دل بادشاہ نے اپنے کارندوں کے ظلم و ستم سے واقف ہو کر ان تمام بدعتوں اور بُری رسموں کو ختم کرنے کا حکم دیا جو عاملوں کی غلط روی کی وجہ سے کشمیر میں پیدا ہو چکی تھیں، اس کا ثبوت آج بھی بادشاہ کے اس فرمان سے مل سکتا ہے جو سرینگر کی جامع سکندری کے جنوبی دروازے پر سنگ موسیٰ کی ایک بہت بڑی تختی پر کندہ ہے۔

مذہب مولانا غنیؔ کے مذہب کے متعلق بھی نہایت متضاد روایات مشہور ہیں۔ ایک جماعت آپ کو امامیہ بتاتی ہے اور اس کے جواز میں مولانا کا یہ شعر پیش کرتی ہے:

کسے بروزِ جزا سرخرو تواند شد کہ خاک پائے شہیدانِ کربلا باشد

مگر حقیقت یہ ہے کہ شہیدِ کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف امامیہ جماعت ہی محبوب و مطلوب نہیں بلکہ ہر کلمہ گو کے روحانی پیشوا ہیں۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر آپ کا نام نہایت عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے اس میں شیعہ اور سُنی کی کوئی تخصیص نہیں۔ مولانا غنیؔ ایک صوفی اور صاحبِ دل بزرگ تھے، آپ کا سارا دیوان صوفیانہ خیالات سے بھرا پڑا ہے اور اربابِ حقیقت جانتے ہیں کہ تصوف اور شیعیت دو متضاد کیفیتیں ہیں جو ایک ہی ہستی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ مولانا حنفی المذہب تھے اور اس کا ثبوت اس شعر سے ملتا ہے:

دفع شد وسواس خاطر از نماز باحضور ما بدست بستہ وا کردیم قفل بستہ را

دست بستہ کا اشارہ اہل سنت والجماعت کے طریق نماز کی طرف ہے۔ شیعہ اس طرح نماز نہیں پڑھتے، بلکہ ہاتھ کھلے چھوڑ دیتے ہیں:

کتب بینی مولانا غنیؔ کو مطالعہ کا خاص شوق تھا، اور اکثر کتب بینی کا مشغلہ رہتا تھا، بڑھاپے میں تو آپ کا یہ شغل عادت ثانیہ بن گیا تھا، دیوان میں آپ کنایۃً اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

در پیری انتخاب کتب نیست باب چشم عینک بود کنوں ورقِ انتخاب چشم

فضل و کمال غنیؔ کی شاعری کے معترف نہ صرف ان کے ہم وطن ہی ہیں بلکہ ایرانی اساتذہ بھی ان کی شیریں بیانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ والہؔ داغستانی کہتا ہے:

"درستیٔ زبان و روانیٔ الفاظ و لطافتِ معانیٔ او مقبول ہمہ بود۔ الحق از خطۂ کشمیر مثل او کسے برنخاستہ"[1]

شیر خاں لودھی مراۃ الخیال میں لکھتا ہے:

---

[1] ریاض الشعرا ورق ۱۳۱ الف

"اشعارش مانند گلہای کشمیر ہموارہ باطراوت، معنی و طرز کلامش چوں کلام خوبان بہ پیوستہ با حلاوت وارادت، اورا معنی خاص بسیار است و مضامین تازۂ بے قیاس ..... باین ضیق فرصت آنچہ از طبع وقادش سر زدہ بود، امروز در ایران و توران و سواد ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری است۔ و این بیت از غیب دانی ہائی اوست:

نگردد شعر من مشہور تا جان در تنم باشد   کہ بعد از مرگ آہو نافہ بیروں می دہد بورا

نشتر سخن کا فاضل مصنف لکھتا ہے:

"مثل او شاعرے معنی یاب و محاورہ دان از خطۂ کشمیر برنخاستہ، باین خوبی و فصاحت تکلم ناساختہ، کلام او فی الحقیقت بہار کشمیر است۔ دیوان آں مرحوم در ایران و توران و ہند مشہور۔"

محمد افضل سرخوش کلمات الشعراء میں لکھتا ہے:

"ملا طاہر غنی صاحب طبع عالی بود، پایۂ سخنوری را بدرجۂ کمال رسانیدہ، از خطۂ کشمیر بلکہ از اقلیم ہند ہیچو خوش خیال، نازک بند برنخاستہ اکثر معاصرین و متاخرین قائل بہ خوش کلامی او بودہ اند۔"

حسان الہند مولانا آزاد بلگرامی نے بھی اپنی مشہور تصنیف "سرو آزاد" میں تقریباً انہی الفاظ میں غنی کی تعریف کی ہے۔ خان آرزو نے اپنے مشہور و معروف تذکرہ "مجمع النفائس" میں غنی کے کلام پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"می گویند چہ کسے از ہند وارد ایران می شد میرزا صائب می فرمود برائے ما تحفہ از ہند آوردہ۔ و آں عبارت است اشعار غنی نواب وحید الزمانی طاہر وحید دیوان او را ہیکل بازوئے خیال خود ساختہ مثل او از کشمیر چہ کہ از ملک دیگر نیز در متاخرین کم برخاستہ و در بستن مضامین تازہ و بند و بست معانی و در صفائی عبارات از ہمسران بلکہ از اکثر گذشتگاں پیش قدم است۔"

میر حسین دوست سنبھلی مصنف تذکرہ حسینی اسے شاعر ماہر یک فنی قرار دیتا ہے مسلم کا بیان ہے کہ:

"عالم رانقاب عرفان ساختہ شعرش پردۂ داری ہر دو می نمود، و معارف حقیقی در لباس علوم رسمی روپوش می ساخت۔"

غنی خود ایک مقام پر نہایت جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کا تمام فضل و کمال شاعری میں گم ہوکر رہ گیا ہے

ز شعر من شدہ پوشیدہ فضل و دانش من   چو میوہ کہ بماند بہ زیر برگ نہاں

ان اقتباسات سے یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہوجاتی ہے کہ مولانا غنی ایک زبردست فاضل، جید عالم اور بے مثال شاعر تھے، یہ علوم و فنون اور کمالات انھوں نے کیسے حاصل کئے کن کن بزرگوں سے فیض پایا۔ ان کے متعلق ان کا اپنا دیوان سارے تذکرے اور تاریخ کی کتابیں خاموش ہیں۔

غنی کی عالمگیر شہرت کے سبب ان کی شخصیت کے گرد بہت سے افسانے منڈلا رہے ہیں۔ اکثر تذکروں میں لکھا ہے کہ میرزا صائب نے جب اصفہان میں غنی کا کلام سنا تو بے اختیار اس کی ملاقات کے لئے اصفہان سے چلا اور دوبارہ کشمیر آیا، مگر یہ واقعہ سراسر غلط ہے، صائب ایک ہی مرتبہ ہندوستان آیا تھا اور جب وہ یہاں سے چلا گیا تو اس نے بقیہ عمر اصفہان ہی میں گذاری۔

ایک تذکرہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ صائب نے جب غنی کا یہ شعر سنا:

موئے میان تو شدہ کرالین   کرد جدا کاسۂ سر از تن

تو لفظ کرالین کے معنی دریافت کرنے کے لئے غنی کے پاس کشمیر آیا۔ کرالین کشمیری زبان میں اُس تاگے کو کہتے ہیں جس سے کمہار چرخ سے پیالہ کاٹ کر علیحدہ کرتے ہیں چنانچہ غنی نے صائب کو بتایا کہ کرالین بہ تمام رشتہ ایست کہ کوزہ گراں از آں کاسہ را از چرخ جدا می سازند" مگر یہ واقعہ بھی بالکل بے سروپا ہے کیونکہ میرزا صائب نے ۱۰۴۲ھ کے بعد ایران سے باہر قدم نہیں نکالا۔ پبلک لائبریری بانکی پور (پٹنہ) کی فہرست کتب

لہ مقدمہ دیوان غنی ص ۳

کا فاضل مؤلف کہتا ہے کہ شاہِ ہند نے سیف خاں حاکمِ کشمیر کو لکھا کہ غنی کو ہمارے حضور میں بھیج دو۔ سیف خاں نے بادشاہ کا یہ پیغام مولانا غنی کو پہنچایا۔ مگر غنی نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ آپ لکھ دیں کہ وہ پاگل اور دیوانہ ہو گیا ہے۔ سیف خاں نے کہا کہ میں ایک فرزانہ کو دیوانہ کیسے لکھ سکتا ہوں۔ یہ سُن کر غنی نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور دیوانہ وار وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور تین دن کے بعد معشوقِ حقیقی سے واصل ہو گیا۔

سیف خاں ۱۰۷۵ھ میں کشمیر کا حاکم مقرر ہوا۔ غنی نے ۱۰۷۹ھ میں انتقال کیا۔ اس واقعہ میں بس اتنی صداقت ہے کہ سیف خاں ناظمِ کشمیر تھا۔ جب غنی خناق یا اسہال کے مرض سے موت ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے تخت پر عالمگیر سریر آرا تھا جو خود بھی ایک زبردست انشا پرداز تھا اور شعر کا ذوق رکھتا تھا۔ ممکن ہے عالمگیر نے ان کے زہد و تقویٰ اور فضل و کمال کی شہرت سن کر قدر افزائی کے لئے دربار میں طلب کیا ہو مگر غنی کا استغنا آڑے آیا اور اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

مرقد

بعض تذکرہ نویس اس بات کے مدعی ہیں کہ غنی اپنے رفقا یعنی کلیم، قدسی اور سلیم طہرانی کے پہلو میں تخت سلیمان کے نیچے مزار الشعراء میں مدفون ہے[5]۔ مزار الشعراء سرینگر کے مشرق کی طرف محلہ درگجن میں ڈل گیٹ کے متصل ایک بلند ٹیلے پر واقع ہے۔ مگر اس میں کوئی صداقت نہیں۔ مفتی محمد شاہ سعادت مورخ کشمیر نے تاریخ اعظمی کے حاشیے میں لکھا ہے کہ وہ محسن فانی کے مقبرہ میں دفن ہیں مگر یہ بھی درست نہیں۔ پارسی[6] سرایانِ کشمیر اور سوانح غنی (از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی) کی اطلاع صحیح ہے کہ غنی کی قبر عالی کدل کے محلہ راجوری کدل میں، احاطہ مزار حضرت شاہ حسین بالا دوری میں واقع ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جب ہم نے پروفیسر علم الدین سالک کی معیت میں اس کی تحقیق کی تو ہمیں ایک ٹوٹا پھوٹا مزار ملا۔ اسی جگہ ایک سنگ مزار بھی تھا جو نہایت خستہ حالت میں تھا مگر اس سے لفظ غنی صاف پڑھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے اس کا ایک فوٹو بھی لیا۔ جو ان کی کتاب "کشیر" میں شامل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ غنی کی قبر عالی کدل کے محلہ دباغان یا محلہ راہ بابا میں ہے مگر وہاں نہ تو کسی قبر کا نشان ملتا ہے اور نہ کوئی تعویذ۔ افسوس کہ کشمیر کے اس فرزندِ جلیل کی قبر تک کا نشان اچھی حالت میں محفوظ نہیں۔

دیوان

غنی کی زندہ جاوید یادگار اس کا مختصر سا دیوان ہے جو غزلیات، قطعات، مفردات، رباعیات اور ایک مختصر سی مثنوی پر مشتمل ہے، کہا جاتا ہے کہ غنی کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، مگر آج فقط دو ہزار اشعار باقی ہیں۔ والہ داغستانی بھی یہی کہتا ہے:

"دیوانش تخمیناً دو ہزار بیت است"

اس دیوان کی تدوین میں مولانا غنی کے تین شاگردوں نے حصہ لیا اور کافی محنت کی سب سے اول میرزا محمد علی ماہر نے یہ کام اپنے ذمہ لیا[7]۔ اس کے بعد ملک شہید نے یہ خدمت سرانجام دی، اور آخر میں مسلم نے ایک گوشوارہ لگا کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ دیوان کئی مرتبہ چھپ چکا ہے، اور اس کے خطی نسخے کثرت سے ملتے ہیں، جو اس کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

غنی کی شاعری

غنی کی شاعری کی خصوصیات پر بحث کرنے سے پہلے اس وقت کے عام اندازِ شعر گوئی پر بحث کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ غنی کی شاعری نے جب آنکھ کھولی تو اس وقت ہندوستان میں بالعموم اور کشمیر میں بالخصوص کونسا رنگ سخن غالب تھا۔ اسی ضمن ان اربابِ سخن کا تذکرہ بھی آجائے گا جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ غنی کی شاعری کو متاثر کیا یا خود ان کا اثر قبول کیا۔

فارسی شاعری کی ایک خاص روش سولھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی جسے ایرانی نقادانِ سخن "سبک ہندی" کہتے ہیں۔ شاعری کا یہ انداز خراسان کے ذریعے ایران میں وارد ہوا۔ مگر شاہانِ صفویہ کے مذہبی جوش نے شاعری کا چراغ ہی بے فروغ کر دیا، اس لئے وہاں بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جنھیں نظیری، عرفی اور فیضی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہو، البتہ ہندوستان میں شاہانِ تیموریہ کی سرپرستی، داد و دہش اور فیاضی نے ایران کے بڑے بڑے شعرا کو اپنے دربار میں کھینچ لیا، اور چونکہ یہ سب کے سب اعلیٰ پایہ کے نقاد اور نکتہ سنج تھے، اس لئے ان کی

---

[5] تحفۂ ابراہیم

[6] پارسی سرایانِ کشمیر، سوانح غنی از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

[7] تاریخ حسن جلد سوم ورق ۲۵۹ - تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ علامہ محمد خلیل مرجانپوری ورق ۲۲۳

مربیانہ سرپرستی میں فارسی شاعری کہیں سے کہیں جا پہنچی، علامہ شبلی فرماتے ہیں:

"شاعری ابتدا سے جس انداز پر چلی آتی تھی، اکبری اور صفوی دور نے دفعتہً اس کی روش بدل دی۔ عرفی، نظیری، وحشی یزدی، اور حکیم شفائی نے ہزاروں گوناگوں خیالات پیدا کر کے شاعری کے میدان کو نہایت وسیع کر دیا، بالخصوص عشق و عاشقی کے رموز و اسرار اور فلسفۂ زندگی کے ایسے سیکڑوں ہزاروں نکتے بیان کئے جو قدما کے خواب و خیال میں بھی نہ آتے تھے لیکن یہ جو کچھ تھا اکبر و عباس صفوی کا فیض تھا، جہانگیر اور شاہجہاں نے شاہانہ فیاضیاں اکبر سے بھی زیادہ دکھائیں، لیکن تمام پرزور قوتیں کام میں آ چکی تھیں۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے لئے فطرت کی فیاضی کا بہت کم سرمایہ رہ گیا تھا، اس عہد میں بھی جو کچھ ہوا وہ اکبری کی تحریک اور قوت کا اثر تھا۔ قدسی، طالب آملی، کلیم گو جہانگیری اور شاہجہانی شعرا ہیں یہ بھی اکبر کے نہال فیض کے برگ و بار ہیں[۱]"

مولانا شبلی کا یہ تبصرہ اس وقت کی شاعری کا صحیح صحیح نقشہ ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری نے جو اسلوب اختیار کیا اس کے متعلق مولانا شبلی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"فارسی شاعری نے ہندوستان میں آ کر جو لطافت پیدا کی ایران میں اس کو نصیب نہیں ہوئی ..... ایران کے وہ شعرا جو ہندوستان میں آئے اور یہاں کی آب و ہوا اور خیالات سے متاثر ہوئے ان کا کلام ان شعرائے ایران سے ملاؤ جو ایران میں رہے دونوں کے کلام میں صاف یہ فرق نظر آئے گا۔ عرفی، نظیری، طالب آملی، کلیم، قدسی اور غزالی کے کلام میں جو لطافت، نزاکت ادا، باریک خیالی اور رنگین آرائی ہے، وہ شفائی اور محتشم کاشی میں کہاں پائی جا سکتی ہے حالانکہ یہ دونوں اسی زمانہ کے شاعر اور شعرائے ایران کے سرتاج اور دربار شاہی کے انتخاب ہیں[۲]"

شاعری کی یہ روش جسے قدیم تذکرہ نگار تازہ گوئی کہتے ہیں اور دور جدید کے ایران پرست نقاد "سبک ہندی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اڑھائی صدی تک ایران اور ہندوستان میں مقبول رہی۔ بڑے سے بڑا شاعر اسی انداز میں شعر کہتا اور اس طرز پر فخر کرتا تھا گو ایران میں صفویوں کی مذہب پرستی کی بدولت شاعری کا چراغ گل ہو گیا مگر پھر بھی اس تازہ روش کی بدولت تغزل، معاملہ بندی، وقوعہ گوئی حتیٰ کہ واسوخت تک ایران میں متداول ہوئی اور غزل کا درجہ اتنا بلند ہو گیا کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آ سکتا، البتہ ہندوستان میں ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایرانی اور ہندوستانی شاعروں نے غزل میں فلسفہ کی آمیزش شروع کی، اور زندگی کے اہم ترین مسائل کا حل اپنی شاعرانہ جدت آفرینیوں میں پیش کیا، فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ساتھ غزل کی سادگی جو قدما کا عام شیوہ تھی ختم ہو گئی۔ اس کے بجائے غزل میں ایچ پیچ شروع ہوا جس سے وہ خیال جو کئی کئی شعروں میں بھی نہ سما سکتا تھا ایک ہی شعر میں ادا ہونے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں دقت آفرینی اور مشکل پسندی شامل ہو گئی چنانچہ اس عہد میں جب غنی نے اپنی شاعری شروع کی تو خیال بندی اور دقت آفرینی غزل کے لازمی جز بن چکے تھے اور اقلیم سخن جلالؔ، اسیر، میرزا بیدل، ناصر علی سرہندی، میرزا صائب، کلیم ہمدانی کے زیر اثر تھی۔

خیال بندی اور مضمون آفرینی نے شاعری کو ایک نئی صورت عطا کی جسے مثالیہ کہتے ہیں، مثالیہ شاعری میں شاعر پہلے کوئی دعویٰ کرتا ہے پھر اس کے ثبوت میں کوئی شاعرانہ دلیل لاتا ہے۔ یہ طرز بہت مقبول ہوئی اور دیر تک قائم رہی۔

خیال بندوں کی جماعت نے جو روش اختیار کی تھی اس میں رفتہ رفتہ اس قدر بے اعتدالیاں ہونے لگیں کہ شعر دور از کار تخیل بن کر رہ گیا مگر اس دور میں ظفر خاں احسن کے صحیح مذاق سخن نے شعرا کو بہت حد تک گمراہی سے بچا لیا، وہ کشمیر کا صوبہ دار تھا، شعر و شاعری سے طبعی لگاؤ رکھتا تھا اور شاعروں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کرتا تھا، صاحب "مآثر الامرا" لکھتا ہے:

"زر ہا بہ مردم ایران می داد خصوصاً در حق شعرا طرفہ بذل و کرم می نمود سخنوران صاحب استعداد دل از اوطان برداشتہ روے امید

---

[۱] شعر العجم جلد سوم صفحہ ۱۹۰-۱۸۹، مطبوعہ معارف پریس

[۲] شعر العجم جلد چہارم صفحہ ۱۸۳-۱۸۲

بدرگاہش می گذاشتند و منت ہائے تمنا می رسیدند۔"

صائب اصفہانی اور کلیم ہمدانی جیسے شعرا اس کی استادی کے معترف تھے۔ میرزا صائب ایک مدت تک اس کے دربار سے وابستہ رہا، اور ظفر خاں احسن موقع بہ موقع اس کے کلام میں دخل دیتا اور تصرف کرتا رہا، صائب نے اس احسان مندی کا اعتراف جا بجا کیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک مقام پر کہتا ہے:

حقوق تربیتت را کہ در ترقی باد — زباں کجاست کہ در حضرتت فرو خوانم
تو پائے تخت سخن را بدست من دادی — تو تاج مدح نہادی بفرق دیوانم
تو جاں ز دخل بجا مصرع مرا دادی — تو در فصاحتے دادی خطاب سحبانم
ز وقت تو بمعنی شدم چناں باریک — کہ می تواں بدلِ مور کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود — نداشت طرۂ شیرازہ روے دیوانم

تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من
وگرنہ خار نمی ماند از گلستانم

ظفر خاں نے ایک عجیب و غریب مرقع تیار کیا تھا جس میں شاعر اپنا منتخب کلام اپنے ہاتھ سے درج کرتا تھا اور اس کے دوسری طرف شاعر کی تصویر ہوتی تھی۔[۵۵]

ایک ایرانی نقاد فن ظفر خاں کی شاعرانہ قابلیت اور شعرا نوازی کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے:

"بعد از عبدالرحیم خان خاناں سپہ سالار امیر و سرداری مانند وے در ہندوستان پیدا نہ شد کہ از ہنر و ہنرمنداں ترویج و تشویق کند و دل سخنوراں را بدست آرد، وجوائز و صلات بسیار بہ فضلا و شعرا و ہنرمنداں بخشید۔ ظفر خاں در آمدن شعرا ہندوستان کمک و تشویق زیاد می کرد، مخصوصاً نسبت بہ صائب، چنانکہ صائب بہ خواہش او و ہمراہی ہائے وے بہ ہندوستان مسافرت کرد، و او را مدح گفتہ است و در زمانی وزارت و امارت وے شعرا و فضلائے بسیاری از ایران بہ ہندوستان رفتند، شعر و انی مخصوص ذات مبارک بود، در شعر فہمی و شاعر نوازی دست عظیم داشتہ، چنانچہ طاہر نصرآبادی نوشتہ کہ حضرت میرزا صائب مدتے کہ در ہند بودند مصاحبت خان مشارٌالیہ داشتند و ہمراہ او تا دکن سیر می فرمودند و از او صفات حسنہ بسیار نقل می فرمایند، و شعر میرزا نیز از ایں معنی خبر می دہد:

خان خاناں را بہ بزم و رزم صائب دیدہ اند — در سخا و در شجاعت چوں ظفر خانِ تو نیست

و نیز: من و دل چو فریاد و افغاں کنیم — ظفر خاں ظفر خاں ظفر خاں کنیم

باری ظفر خاں نیکی بزرگ و بزرگ منش بود و طبع بس بلند داشت۔"[۵۶]

ظفر خاں احسن نے بھی جا بجا صائب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر کہتا ہے:

طرزِ یاراں پیشِ احسن بعد ازیں مقبول نیست — تازہ گوئی ہائے او از فیض طبع صائب است

ظفر خاں کا دیوان نہایت مختصر ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کے مذاقِ سخن کا پتہ چل سکتا ہے:

دلم بہ کوئے تو امیدوار می آید — نگاہ دار کہ روزے بکار می آید
در گوشہ سرے خانہ ہمیں گفت و شنید است — یاراں برسانید دماغ شب عید است
در بتانِ ہند چوں او دلبر خودکام نیست — رام رامم گرچہ می گوید و لیکن رام نیست
شادم بہ دل شکستگیٔ خود کہ پیش من — قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است

---

۵۵ مآثر الامرا جلد دوم ص۷۶۲

۵۶ روابط ایران و ہند از علی اکبر شہابی خراسانی ص۵۰

گوشۂ چشمے اگر ساقی بما دارد بجاست   عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ام

ظفرخاں کی بیوی بزرگ خانم تھی جو ممتاز محل کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی ظفر خاں کا لڑکا میرزا احمد جو ملقب بہ عنایت خاں آشنا اسی کے بطن سے تھا۔ وہ بھی باپ کی طرح شاعری اور شعرا کا مربی تھا اور نہایت سلجھا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ اس کا دیوان جو قصاید، غزلیات اور مثنویات پر مشتمل ہے ہندوستان کے اکثر کتب خانوں میں ملتا ہے غنی کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔

کشمیر ان ایام میں علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ سلیم، قدسی، کلیم، صغر، اور صائب کی وجہ سے وہ ایران کا ایک خطہ بنا ہوا تھا۔ کشمیر کو قدرت نے اتنا حسین و جمیل بنایا ہے کہ ہر شخص اس کے مناظر سے متاثر ہو کر اس کا دلدادہ بن جاتا ہے۔ ان شعرا میں سے اکثر نے کشمیر میں مستقل اقامت اختیار کی اور مر کر بھی یہیں دفن ہوئے۔ البتہ میرزا صائب کشمیر کے قدرتی مناظر اور شاعرانہ محیط سے یک دائمی اثر لے کر واپس ایران چلا گیا چنانچہ خوشگو کہتا ہے:

"در سال ۱۰۴۲ھ کہ ظفرخان بہ حکومت کشمیر منسوب شد، ہنگام حرکت صائب را نیز ہمراہ خود برد، شاعر بلند طبع ایرانی زبان در کشور خوش آب و ہوا بسر برده از مناظر دلکش و ہوائے روح افزائے آں جا استفادہ کرد و از فیض ہوائے آں گل زمین نضارت با پچمن طبع رنگینش عارض گردید[۱]۔"

خود کشمیر میں ملا ذہنی، ملا اوجی، ملا محسن فانی میرانی، ملا محمد صالح ندیم، محمد زمان نافع، اور ملا فروغی اپنے اپنے مقام پر داد سخن دے رہے تھے۔ غنی اس تمام گروہ کا سرخیل تھا۔

غنی فطرتاً شاعر تھا اور قدرت نے سے شاعری کے لئے پیدا کیا تھا۔ اس لئے اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی شاعری ہے جس پر آج نہ صرف کشمیر بلکہ تمام برعظیم پاک و ہند ناز کر سکتا ہے۔ اس کے دیوان میں غزلیات، رباعیات، قطعات، مفردات اور ایک مختصر سی مثنوی بھی ہے۔ مثنوی غنی سے بہت پہلے اپنے درجے سے گر چکی تھی، اس لئے اس دور میں کوئی اچھی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ کلیم ہمدانی نے اپنی تمام شاعرانہ قوت شاہجہاں نامہ لکھنے میں صرف کی، مگر اسے پڑھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط میں گانا ہو رہا ہے۔ وہ متانت اور پختگی جو مثنوی کے لئے ضروری ہیں، اس میں مفقود ہیں۔ غنی کی مثنویاں بھی اسی قبیل سے ہیں۔

قصیدہ اس دور میں اگرچہ آخر وقت تک قائم رہا اور ہر شاعر اس میں زور طبع دکھانے کی کوشش کرتا رہا، مگر غنی چونکہ کسی دربار سے وابستہ نہ تھا، طبیعت میں استغنا زیادہ تھا اس لئے اس نے کوئی قصیدہ نہ کہا۔ اس کا دیوان اس صنف سے خالی ہے۔

غنی غزل کا مرد میدان تھا اور اس میدان میں اس نے اپنی جودت طبع کے وہ جوہر دکھلائے ہیں کہ تمام ہندوستانی اور ایرانی تذکرہ نگار اس کی استادی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس کی غزلیات میں مضمون آفرینی، تخیل، فلسفہ، مثالیہ، جدت استعارہ، ندرت تشبیہ، حسن بیان، زبان، اخلاق اور تصوف سب پائے جاتے ہیں۔ مگر جو چیز اسے اپنے ہمعصر شعرا میں ممتاز کرتی ہے وہ اس کے تخیل کی بلند پروازی ہے۔ اکثر ارباب فن اور نقادان سخن اس بات پر متفق ہیں کہ تخیل کا دوسرا نام شاعری ہے اور اس کے ساتھ حسن بیان بھی مل جائے تو شاعر کا کلام نورٌ علیٰ نور ہو جاتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے غنی سرتاپا شاعر ہے۔ وہ قدرت کے ہر منظر پر گہری نظر ڈالتا ہے، اور اس سے جو اثر قبول کرتا ہے اس کو شعر کے قالب میں کچھ ایسے انداز سے ڈھالتا ہے کہ اس کا بیان جادو بن کر دل میں اتر جاتا ہے۔ مثلاً وہ مردہ کو سطح آب پر تیرتا دیکھتا ہے تو بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

خرق عادت کے بکار آید دل افسردہ را   گر رود بر آب نتواں معتقد شد مردہ را

یعنی خرق عادت چیزیں دکھانے سے کوئی شخص اپنا سکہ اہل دل پر نہیں بٹھا سکتا اس کے لئے خود صاحب دل ہونا ضروری ہے۔ مردہ جسم پانی کی سطح پر تیرتا ہے مگر یہ اس کا کوئی اعجاز نہیں۔ فخر المتاخرین میرزا غالب نے اسی منظر سے توحید باری تعالیٰ ثابت کرنے کے لئے ایک اچھوتا مضمون اخذ کیا ہے:

باچنیں ہنگامہ در وحدت نمی گنجد دوئی   مردہ را از خویش دریا برکراں انداختہ

غنی زاہد ظاہر پرست کو دیکھتا ہے اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر ایک غائر نظر ڈالتا ہے تو اسے قوت تخیل کی بدولت زاہد کی ہر حرکت موج سراب

---

[۱] سفینۂ خوشگو قلمی

نظر آتی ہے۔ خاص کر اس کا عمامۂ بزرگ، اس کی شاعری کے لئے ایک نیا مضمون پیدا کرتا ہے:

تا شود قبرش زیارت گاہِ اربابِ وفا　　　　خویش را زاہد بزیرِ گنبدِ دستار کشت

موسم بہار میں ہر چیز اپنے اندر ایک نئی زندگی پاتی ہے۔ بید کا درخت خزاں کے موسم میں بالکل لنڈ منڈ ہو جاتا ہے۔ بہار کے شروع ہوتے ہی اس میں کونپلیں پھوٹتی ہیں جو چند ہی دنوں میں خنجر نما پتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں غنی انھیں دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

مجنوں شدست بید کہ در موسمِ بہار　　　　خونش بجوش آمد و خنجر بخود کشد

ابر نیساں کا قطرہ سیپی میں گرتا ہے تو دُرِ شہوار بن جاتا ہے۔ اس کی پرورش کرنا اور اسے درِ شہوار بنانا سیپی کا کام ہے۔ ابر نیساں برستا ہے اور برس کر کھل جاتا ہے۔ غنیؔ اس سے عجیب و غریب مضمون اخذ کرتا ہے:

با شفقت پدر دل منہ کہ قطرۂ آب　　　　ز چشمِ ابر چو افتد دُرِ یتیم شود

بہار کے موسم میں ہری ہری گھاس بہت دلربا ہوتی ہے۔ ہر شخص ان ایام میں سبزہ زاروں کی سیر کرتا ہے غنی قوت تخیل کی بدولت اس سے عجیب مضمون پیدا کرتا ہے:　　　　سبزۂ دشت اگر ہوش ربا نیست چرا　　　　ہر کہ دیوانہ شود دامنِ صحرا گیرد

بہار کی سرمستیاں ایرانی شعرا کا عام موضوع ہے۔ وہ بہار میں ایسے گم ہوتے ہیں کہ بالکل آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، جس کا اثر اکثر اوقات وقائع نگاری پر ختم ہوتا ہے۔ غنی جنتِ ارضی کی بہار دیکھتا ہے مگر اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا ہے، اور نہایت دھیمے سروں میں بہار کے گیت گاتا ہے:

در موسمِ بہار چو نرگس ز شوقِ مے　　　　سر می کشد ز گردنِ مینا پیالہا

بہار اور شراب فارسی شاعری میں لازم و ملزوم ہیں، ہندی شعرا میں مرزا غالبؔ اس قسم کی باتیں مزے لے لے کر کرتے ہیں، چنانچہ وہ بھی غنی کی طرح بہار کو دیکھتے ہیں اور انھیں اپنا افلاس یاد آتا ہے، اور یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں:

مرا کہ بادہ ندارم ز روزگار چہ حظ　　　　ترا کہ ہست و نیا شامی از بہار چہ حظ

غنی ایک خوبصورت پھول دیکھتا ہے۔ اس کا بلند پرواز تخیل سے نئی دلآویزی کے ساتھ اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ پھول کی رعنائی ہے جو اسے زمین سے اوپر اٹھا رہی ہے مگر فطرت کا زبردست ہاتھ اسے قابو میں رکھے ہے تاکہ اس کی بلند پروازی رک جائے غنیؔ اس منظر کو کتنے دلکش الفاظ میں پیش کرتا ہے:

ز شوخی بس کہ در پرواز بینم ہر نفس گل را　　　　چو بلبل می تواں کردن مقید در قفس گل را

وہ اسی قسم کا ایک اور منظر نہایت لطیف الفاظ میں اس طرح پیش کرتا۔ پھول اپنی لطافت و نزاکت پر نازاں ہے، اتنے میں معشوق حسن و جمال کی رعنائیوں میں گھرا ہوا چمن میں آنکلتا ہے تو شرم کے مارے اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے:

چوں بہ سیرِ چمن آن دلبرِ طناز آید　　　　رنگِ گل بیشتر از بوئے بہ پرواز آید

میرزا غالبؔ نے اپنے مخصوص انداز میں یہی مضمون اس طرح باندھا ہے:

چوں بہ پوئی بہ زمیں چرخ زمینِ تو شود　　　　خوش بہشتے ست کہ کس راہ نشین تو شود

قوس قزح ایک عام چیز ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے، مگر غنیؔ کی نکتہ رس طبیعت اس سے ایک عجیب و غریب مضمون اخذ کرتی ہے:

قوس قزح اگرچہ بگردوں کشیدہ سر　　　　ابروئے یار دیدہ و رنگش پریدہ است

غنیؔ فرہاد کی کوہ کنی اور مجنوں کی صحرا نوردی پر نظر ڈالتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے سامانِ تفریح بہم پہنچا رہے ہیں۔ گویا وہ راہِ محبت میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں:

در محبت عشق بازاں می کنند امداد ہم — سنگِ طفلاں بہر مجنوں می تراشد کوہکن

مگر غنی اس سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے:

راہ مجنونی و فرہادیم آمد در پیش — رفتم ایں راہ ولیکن نہ چو ایشاں رفتم
ناخن تیشہ نہ راندم بہ رگ و ریشۂ سنگ — کوہِ غم در تہ پا سودہ بہ جوئے رفتم
آشیانِ زغن و زاغ نچیدم بر سر — سر قدم ساختہ در خارِ مغیلاں رفتم

غنی عاشق اور معشوق کے تعلقات کو نہایت پایۂ و اشارہ میں بیان کرتا ہوا کشش عشق کو کتنے موثر انداز میں پیش کرتا ہے:

عاشق بہ فنا سیر ز معشوق نہ گردد — ماہی طلبِ آب کند گرچہ غذا شد

اسی مضمون کو سالک یزدی اس طرح باندھتا ہے:

ہست کار عاشقاں بعد از فنا ہم جذبِ دوست — تشنگی بسیار دارد ہر کہ ماہی خوردہ است

کشمیر میں برفباری ایک عجیب منظر پیدا کرتی ہے۔ برفباری سے پہاڑ، درخت اور زمین سب سفید ہو جاتے ہیں، اور جب سورج نکلتا ہے تو یہ منظر اور بھی دلفریب بن جاتا ہے۔ غنی کے دیوان میں دو نظمیں موسمِ زمستاں کے متعلق ہیں۔ یہ دونوں کی دونوں نظمیں اس کے بلند پرواز تخیّل کی بہترین مثالیں ہیں۔ پہلی نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

موسم سردی شد و سر گرم یخ بندیست آب — بط اسیران بیضۂ فولاد گردید از حباب

دوسری نظم کا مطلع ہے:

از دمِ سرد زمستاں بستہ شد در آشیاں — بیضہ ہائے عندلیباں ہم چو دنداں در دہاں

غنی کی شاعری کا دوسرا اہم وصف مثالیہ ہے، اور اگر سچ پوچھا جائے تو مثالیہ میں بہت کم شاعر غنی کے مقام کو پہنچ سکے ہیں۔ مثالیہ شاعری کی ابتدا حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے کی، آپ کی کلیات میں ایک نہایت سیر حاصل قصیدہ موجود ہے جو تمام کا تمام مثالیہ ہے۔ اس کے بعد اور شعرا نے بھی آپ کی تقلید کی مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مثالیہ کو خاطر خواہ ترقی حاصل ہوئی۔ اور اس کو ترقی دینے والے کلیم ہمدانی، سلیم طہرانی، قدسی مشہدی اور میرزا صائب اصفہانی ہیں۔ سلیم اور قدسی کے دیوان میں خال خال مثالیہ اشعار ملتے ہیں۔ البتہ صائب اس صنف میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ غنی کی مثالیہ شاعری اپنے تمام معاصرین سے مختلف ہے۔ کشمیر اور اس کے حسین و جمیل ماحول نے اس کے دل کو ایسا گھیرا ہے کہ اس کو ہر شے قدرت اور فطرت کے اصلی رنگ روپ میں نظر آتی ہے، وہ اپنے دعاوی پر اگر کوئی استدلال پیش کرتا ہے تو وہ بھی کشمیر کے مناظر سے ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی طبیعت میں مضمون آفرینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا فلک پیما تخیّل اتنی بلندیوں پر پہنچتا ہے کہ عام شعرا اس کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے اس لئے ایک ایک چیز اس کی شاعری کے لئے سیکڑوں مضامین پیدا کرتی ہے۔ وہ ایک بات کو بیسیوں مرتبہ کہتا ہے مگر ہر بار اس میں کوئی نہ کوئی جدت ہوتی ہے۔ کشمیر اور بالخصوص سرینگر دریا کے دونوں طرف آباد ہے۔ ڈل سے نکل کر کئی نالے اس میں گرتے ہیں۔ آس پاس کئی چشمے بھی ہیں اس لئے وہاں پن چکیوں کی کثرت تھی۔ گو اب نئی تہذیب اور نئی نئی ایجادات کی بدولت سرینگر اور دوسرے شہروں میں پن چکی کا رواج کم ہو گیا ہے۔ تاہم آج سے نصف صدی پیشتر کشمیر کی اچھی خاصی تعداد سری نگر اور اس کے مضافات میں موجود تھی تیموریوں کے وقت میں تو ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہوگی۔ غنی نے فقط ایک پن چکی سے ہزارہا مضامین اخذ کئے ہیں جن میں ہر ایک اپنی جگہ نہایت نادر اور اچھوتا ہے۔

غنی کا تعلق کسی دربار سے نہ تھا، اس لئے درباری شاعری کی نفاستیں اس کے کلام میں کہیں نہیں ملیں گی، اس کے معاصرین میں کلیم اور صائب مختلف درباروں سے وابستہ رہے اور ان کی شاعری کا بیشتر حصہ درباری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اگر غنی کی مثالیہ شاعری کا مقابلہ کلیم اور

صائب سے کیا جائے تو ہمیں ایک نمایا فرق نظر آئے گا، کلیم اور صائب اپنے کلام میں ہر قسم کی نفاست، اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان کے اشعار اثر سے خالی رہ جاتے ہیں اور ان کا تخیل دور از کار چیزوں میں کھو کر شعر کو معما بنا دیتا ہے۔ اس کے خلاف غنی کا دعویٰ فی نفسہ درست ہوتا ہے اور وہ اس کا ثبوت بھی انہی چیزوں سے دیتا ہے جو اس کے عام ماحول سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے امیر اور غریب سب آشنا ہوتے ہیں، اس لئے اس کا اثر پڑھنے والوں کے دل پر خاطر خواہ ہوتا ہے۔ پن چکی غنی کے تخیلات کا مرکز ہے۔ اس نے اس عام چیز سے نہایت عجیب و غریب مضامین اخذ کئے ہیں مثلاً دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ زبردست ہمیشہ کمزور کو ستاتا ہے لیکن ظلم و ستم کے باوجود جو سکون خاطر اور طمانیت قلب کمزور کو نصیب ہوتا ہے اس سے زبردست کا دل ہمیشہ نا آشنا ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت پریشان اور مضطرب رہتا ہے، غنی کہتا ہے:

زبردست اضطراب و زیر دست آسودگی دارد ... دو شاہد بر کلامِ من دو سنگ آسیا باشد

یعنی زبردست ہمیشہ مضطرب، اور کمزور ہمیشہ مطمئن رہتا ہے میرے اس دعویٰ پر چکی کے دونوں پاٹ گواہ ہیں۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک مقام پر حرص و قناعت کا موازنہ کرتے ہوئے فرمایا ہے ع

آناں کہ غنی تراند محتاج تراند

غنی اس خیال کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ فقیر کو جب اس کی روزی مل جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو سلیمان وقت سمجھنے لگتا ہے، کیونکہ چیونٹی کیلئے چکی کا پاٹ تخت رواں سے کم نہیں ہوتا، شعر ملاحظہ ہو:

گدا چوں یافت روزی خویش را داند سلیمانے ... برائے مور سنگِ آسیا تخت رواں باشد

مور اور سلیمان کا تقابل قابل داد ہے۔

غنی سوال کرنے کو بہت برا گناہ سمجھتا ہے اور ایک متوکل اور غیور انسان کی طرح دوسروں کو سمجھاتا ہے کہ ہر شخص کو اس کی روزی ضرور ملے گی، اس لئے یہ گداگری کیسی اور اضطراب کیوں:

تا رزق خود رسد بدہانت چو آسیا ... دائم خموش دار زبانِ سوال را

اس حقیقت کبریٰ کے جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کا روزی رساں ہے۔ پھر بھی لوگ پریشان اور مضطرب نظر آتے ہیں غنی ان کی روش پر غور کرتا ہے اور کہتا ہے:

خلق سرگرداں ہمہ از قحط آب و دانہ اند ... ہر کرا دیدیم غیر از آسیا در گردش است

استعداد کے بغیر تربیت اکارت جاتی ہے غنی اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

تربیت را چہ اثر گر نہ بود استعداد ... آسیا صاف چو آئینہ نہ گردد ز غبار

روزی کے لئے بیہودہ جستجو شرمندگی کا باعث بنتی ہے۔ غنی کہتا ہے:

جستجو از بہر روزی باعث شرمندگیست ... زیں خجالت آسیا انگشت دارد در دہاں

غرض اس قسم کے بے شمار اشعار غنی کے دیوان میں ملتے ہیں، جن سے اس کی قادر الکلامی اور شاعرانہ استعداد کا پتہ چلتا ہے۔

غنی کے مثالیہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے اخلاقی مسائل کو اس کے ذریعہ حل کرتا ہے، دوسرے لفظوں میں غنی کی مثالیہ شاعری اس کے فلسفۂ اخلاقیات کی ترجمان ہے۔ ہم ذیل میں اس کی اخلاقی تعلیمات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

توکل پیشہ روزی کے لئے کبھی مضطرب نہیں ہوتا، وہ جہاں ہوگا اس کی روزی اسے مل جائے گی:

توکل پیشہ را روزی بدستِ خویش می باشد ۔۔۔ مکد انگشت خود کودک چو نبود شیر پستاں را

یعنی توکل پیشہ لوگوں کی روزی ان کی اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے جب ماں کے پستان میں دودھ نہیں ہوتا تو بچہ اپنا انگوٹھا چوسنے لگتا ہے

دنیا کی دولت انسان کے عیوب کو چھپا نہیں سکتی:

غنیؔ از دولت دنیا نگردد عیب کس زائل ۔۔۔ کہ زر نتواند از روئے محک بردن سیاہی را

ذوقؔ نے اسی مضمون کو اپنے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے:

عیب ذاتی کو چھپائے گا نہ حسن عارضی ۔۔۔ زیب بد اندام کو کیا ذوقؔ ہو پوشاک سے

غنیؔ سمجھتا ہے کہ گوشہ نشینی بھی انسان کی شہرت کا باعث بن جاتی ہے:

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو ۔۔۔ کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

وہ ایک مقام پر اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے:

ہر چند غنیؔ ہمچو نگیں خانہ نشیں است ۔۔۔ نامش ز در بستہ بر آید چہ تواں کرد

غنیؔ ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے:

سعی بہر راحت ہمسایگاں کردن خوش است ۔۔۔ بشنود گوش از برائے خواب چشم افسانہا

یعنی ہمسایوں کو خوش رکھنے کی کوشش بھلی ہوتی ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ کان آنکھوں کو سلانے کے لئے قصے کہانیاں سنتے ہیں۔

غنیؔ کپاس کے اندر بنولہ دیکھ کر کہتا ہے کہ لوگوں کی ظاہرداری پر نہیں جانا چاہیئے۔ جو لوگ ظاہر میں بھولے بھالے ہوتے ہیں ان کا دل پتھر سے بھی سخت ہوتا ہے:

سنگین دل است ہر کہ بظاہر ملائم است ۔۔۔ پنہاں درونِ پنبہ نگر پنبہ دانہ را

بزرگوں کا ارشاد ہے کہ یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کہنے والا کیا کہتا ہے، اسی لیے شیخ شیرازؔ نے فرمایا کہ نصیحت اگر دیوار پر بھی لکھی ہو تو اسے قبول کر۔ غنیؔ اسی کی تائید کرتا ہوا کہتا ہے:

سزد گر زاہد خشک است رہبر بے تمیزاں را ۔۔۔ نہ نابینا عصا را رہنمائے خویش می سازد

کامیابی کے لیے کوشش لازمی چیز ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ کوشش کے بغیر کامیاب ہو سکتا ہے وہ خوفناک غلطی میں مبتلا ہے:

ہر کسے گوہر مقصود نہ یابد بے سعی ۔۔۔ پائے من بس کہ دوید آبلہ را پیدا کرد

سختی اور تشدد سے کوئی شخص اپنا مقصد نہیں پا سکتا:

سخت دل کے می رساند پیر و خود را بکام ۔۔۔ آب پیکاں تر نمی سازد لب سوفار را

کامیابی دنیا میں سب سے مشکل چیز ہے اسے حاصل کرنے کے لئے سخت جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کبھی بیستوں کاٹ کر جوئے شیر لائی جاتی ہے کبھی سر دے کر منزل مقصود پائی جاتی ہے۔ اولوالعزم انسان یہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کے مقصد کا نشان بھی دوسرے کے دل میں ہو، وہ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی اور ایثار کر گزرتے ہیں، غنیؔ کہتا ہے:

کوہکن گر جنگ با خارہ کند بے وجہ نیست ۔۔۔ در دلِ اغیار نتواں دید نقشِ یار را

غنیؔ تمام عمر دنیا کے مال و اسباب سے بے نیاز رہا، اس لئے وہ دوسروں کو بھی یہی کہتا ہے کہ اگر مصیبتوں اور بلاؤں سے بچنا ہے تو دنیوی الجھیڑوں میں نہ پڑو اور مال و اسباب سے بے نیاز ہو جاؤ:

خانہ خالی کن ز اسباب تعلق چوں حباب ۔۔۔ تا نیاید در رہ در کاشانہ ات سیل بلا

علامہ اقبال اسی مضمون کو اپنے فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

بجلی کی زد میں آتے ہیں پہلے وہی طیور — جو اس چمن سرا میں بلند آشیاں رہے

بُرا ہمسایہ ہمیشہ تکلیف دیتا ہے:

بجز آزار از ہمسایۂ بد کس نمی بیند — غنیؔ استادگی در لب گزیدن نیست دنداں را

حریص اور کم ظرف سے کوئی چیز طلب نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ اس کی حرص و آز اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کو کچھ دے:

مشکل بود گرفتن چیزے ز تنگ چشم — نگرفتہ است بخیہ ز سوزن قبائے ما

درد جب حد سے گزر جاتا ہے تو وہ خود دوا بن جاتا ہے غنیؔ کہتا ہے:

حاجت از حد چو رود دست دہد استغنا — قدِ خم حلقہ چو شد کار ندارد بہ عصا

مرزا غالبؔ اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے:

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل — کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

غنیؔ اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے:

نصیبے نیست از اہلِ کرم برگشتہ بختاں را — کہ ہرگز پُر نہ سازد کاسۂ گرداب دریا را

اسی مضمون کو وہ ایک شعر میں اس طرح ادا کرتا ہے:

مفلس نہ برد بہرہ ز پہلوئے توانگر — کے تیر پرِ خویش دہد زاغ کماں را

وطن میں پڑے رہنا اور تحصیلِ کمال کے لئے حبِ وطن کا بہانہ کرنا درست نہیں، جب تک انسان مادرِ وطن کو خیر باد نہ کہے، ادھر ادھر نہ جائے، اس کے جوہر نہیں کھلتے، اور وہ ترقی نہیں کر سکتا بلکہ اُلٹا مصیبتوں اور بلاؤں میں پھنسا رہتا ہے:

ہر کہ پابندِ وطن شد می کشند آزار ہا — پائے گُل اندر چمن دائم پُر است از خار ہا

دشمن کی چکنی چپڑی باتوں پر دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے:

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست — پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

دشمن کی چاپلوسی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیئے سیل پاؤں چومتے چومتے نیچے سے مٹی کھینچ لیتا ہے۔

غنیؔ دوسروں کی منت کشی کو بہت بڑا گناہ سمجھتا ہے اور کہتا ہے:

کاسۂ خود پُر مکن زنہار از خوانِ کسے — داغ از احسانِ خورشید ست بر دل ماہ را

عشق شاہ و گدا میں تمیز نہیں کرتا مولانا جامیؔ کا مشہور شعر ہے:

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامیؔ — کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

عرفیؔ نے اسی مضمون کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا:

مجو بہ تجملِ شاہی کہ در ولایتِ عشق — گدا بہ تخت نشانند و پادشاہ گیرند

غنیؔ کہتا ہے:

عشق بر یک فرش بنشاند گدا و شاہ را — سیل یکساں می کند پست و بلندِ راہ را

جو لوگ دوسروں کی حاجت روائی کرتے اور غیروں کے کام آتے ہیں، ان کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا موقع آیا ہوگا کہ وہ کسی کے محتاج ہوئے ہوں:

نیفتد کار سازاں را بکس در کار خود حاجت — بخاریدن نباشد احتیاجی پشت ناخن را

دولت تباہی کا باعث ہوتی ہے:

می کند ویراں تمول خانۂ معمور را — انگبیں سیلاب باشد خانۂ زنبور را

صاحب کمال کی پہچان اس کی نرم اور ملائم گفتگو سے ہوتی ہے جس سے وہ ہر ایک کا دل موہ لیتا ہے:

ملائم می شود در گفتگو ہر کس کہ کامل شد — کہ دائم پنبہ باشد بر دہن مینائے پر مے را

بلاؤں سے بچنے کے لئے بلاؤں سے الجھنا پڑتا ہے۔ جو ڈرتا ہے وہ مرتا ہے۔ جو خطرت کو نظر میں نہیں لاتا وہ بچ جاتا ہے:

ہر کس کہ داد تن بہ بلا ایمن از بلاست — ویراں کجا ز موج شود خانۂ حباب

عرفی اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتا ہے:

بے تکلف در بلا بودن بہ از خوف بلاست — قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

دنیا میں آسودگی کی تلاش بے سود ہے۔ یہ مرنے کے بعد قبر کے گوشے ہی میں حاصل ہوسکتی ہے:

بر روئے زمیں ہیچ کس آسودہ نباشد — گنجے بود آرام کہ در زیرِ زمین است

اسی حقیقت کو وہ دوسرے شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے:

در زندگی بخواب نبیند کسے غنیؔ — آسائشے کہ در زپسِ مرگ دیدہ است

مگر اردو زبان کے مشہور شاعر حضرت ذوقؔ کو اس میں بھی شبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

محبت اور شفقت میں تکلف جائز نہیں۔ غنی کہتا ہے کہ ماں کے دودھ کو حلاوت کے لئے شکر کی ضرورت نہیں:

گر محبت در میاں آمد تکلف گو مباش — شیرِ مادر در حلاوت بے نیاز از شکر است

پہلوانی سے جسم میں طاقت ضرور پیدا ہوتی ہے اور بازوؤں میں قوت بھی آجاتی ہے۔ یہ قوت صفائی دل کے بغیر بے مصرف اور فضول ہوتی ہے۔ حکیم شیراز نے گلستاں میں اسی حقیقت کو ایک لطیف حکایت کے پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ ایک بہت بڑے تن و توش کا آدمی ایک بہت بڑا پتھر اٹھائے بڑی تیزی سے کہیں جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ ایک دانا نے یہ تماشا دیکھا، پوچھا اسے کیا ہوا ہے، اور یہ کہاں جا رہا ہے۔ ایک آدمی نے کہا کہ اسے فلاں شخص نے گالی دی ہے، اور وہ اسے سزا دینے جا رہا ہے۔ دانا مسکرایا اور اس نے کہا کہ یہ بے وقوف دس من کا پتھر تو اٹھا سکتا ہے مگر دو بول برداشت نہیں کر سکا۔ طاقت دراصل تحمل اور بردباری کا نام ہے اور وہ صفائی قلب کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ غنی اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے:

قوت بازو نہ آید بے صفائی دل بکار — تیغ نادر زنگ باشد برگ بیدے بیش نیست

غنی عروج و زوال کے فلسفہ کو کتنے حکیمانہ انداز میں پیش کرتا ہے کہ بنسری سے سانس خارج ہوتی ہے تو آواز بلند ہوتی ہے:

تواں ز شاخ تنزل گل ترقی چید — نفس بہ نے چو فرو شد بلندی گردد

پست فطرت انسان کی نظر میں عزت و ذلت یکساں ہوتی ہے۔ اس لئے وہ عزت کو عزت اور ذلت کو ذلت نہیں سمجھتا۔ غنیؔ

اسے کتنے پیارے انداز میں بیان کرتا ہے:

از تنزل پست فطرت را نباشد ہیچ باک ‎ ‎ ‎ ‎ ہیم افتادن نباشد ہر کہ باشد نے سوار

انسان میں اگر ذاتی جوہر ہو تو اسے زوال کا ڈر نہیں ہوتا وہ جہاں ہوگا اور جس حالت میں بھی ہوگا، عزت کرائے گا:

حسن ذاتی را نباشد ہیچ بیمے از زوال ‎ ‎ ‎ ‎ کے بشوید آب بحر از پنجۂ مرجاں نگار

شاعری کے فیض سے شاعر سے زیادہ دوسرے لطف اٹھاتے ہیں:

فیضِ سخن بہ مرد سخن گو نمی رسد ‎ ‎ ‎ ‎ از نافہ بوئے مشک بہ آہو نمی رسد

اہل کمال شہرت سے دور بھاگتے ہیں:

نیست شہرت طلب آں کس کہ کمالے دارد ‎ ‎ ‎ ‎ ہرگز انگشت نما بدر نہ باشد چو ہلال

جو شخص دلیلوں سے الجھتا ہے وہ مطلب سے دور جا پڑتا ہے:

دل بہ استدلال بستم ماندم از مقصود دور ‎ ‎ ‎ ‎ نردباں کردم تصور راہ ناہموار را

اسی مضمون کو حضرت مولانا روم نے اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

گر بہ استدلال کارِ دیں بدے ‎ ‎ ‎ ‎ فخرِ رازی رازدارِ دیں بدے

پائے استدلالیاں چوبیں بود ‎ ‎ ‎ ‎ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس سے صاف اور واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے:

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ‎ ‎ ‎ ‎ ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

زندگی ایک معما ہے جسے اب تک کوئی شخص حل نہیں کر سکا، ہر شخص نے اپنے اپنے قیاس کی بنا پر اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس لئے یہ خواب کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ مولانا غنیؔ نے شمع کے شعلے کو سامنے رکھ کر زندگی کی حقیقت سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش کی ہے یعنی شمع بجھ جائے گی یا ہم چپ ہوں گے تو مر جائیں گے:

مارا چو شمع مرگ بود خامشی غنیؔ ‎ ‎ ‎ ‎ اظہارِ زندگی بزباں می کنیم ما

اسی حقیقت کو حضرت جوشؔ نے اس طرح بیان کیا ہے:

زندگی اک کشمکش ہے موت اک کامل سکوت ‎ ‎ ‎ ‎ شہر میں غل ہو رہا ہے مقبرہ خاموش ہے

حضرت فانی بدایونی نے سچ کہا ہے:

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا ‎ ‎ ‎ ‎ زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ ‎ ‎ ‎ ‎ زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

صوفیائے کبار کامیابی کا راز خود شناسی میں بتاتے ہیں فلسفی بھی اس کو کامیابی کا گر جانتے ہیں، علامہ اقبالؔ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو ‎ ‎ ‎ ‎ قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

شیخ سعدی نے اس حقیقت کو زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

نگارہائے حرم تا کہ خیالِ طبع بیروں کن ‎ ‎ ‎ ‎ کہ محرم گر شوی ذاتت حقائق را حرم گردد

حضرت مولانا روم فرماتے ہیں:

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
دل گذرگاہ جلیل اکبر است — کعبہ بنگاہ خلیل آذر است

خواجہ عبداللہ انصاری اس نغمہ کو اس طرح الاپتے ہیں:

در راہ خدا دو کعبہ آمد منزل — یک کعبۂ دل باشد و یک کعبہ گِل
تا بتوانی زیارتِ دلہا کن — کافزوں ز ہزار کعبہ آمد یک دل

مولانا غنی اس واشگاف حقیقت کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

گرد خود گرد غنی چند کنی طوف حرم — رہبرے نیست دریں راہ بہ از قبلہ نما

یعنی دل ایک قبلہ نما ہے جو تیری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے، اس لئے تو اپنے دل کا طواف کر اور جس طرف وہ تجھے لے جائے اسی طرف جا۔ کسی صاحب دل بزرگ کا مقولہ ہے: مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فَقَد عَرَفَ رَبَّہٗ
جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اُس نے اپنے رب کو جان لیا، توحید کا پہلا مرحلہ یہی خود شناسی ہے۔ علامہ اقبالؔ اور مولانا رومؔ کے کلام کا بیشتر حصہ اسی اہم نکتے کی تفسیر ہے۔

غنیؔ کی شاعری کی تیسری امتیازی خصوصیت طرزِ ادا کی جدت اور مضمون آفرینی ہے۔ وہ ایک بات کو بار بار کہتے ہیں۔ ہر بار اسے نئے رنگ اور نئے طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ اور فرسودہ مضامین کو بھی اپنے مخصوص انداز میں ادا کرتے ہیں تو پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اسے ایک نیا مضمون خیال کرتا ہے۔ گویا کہ عام شراب اس کے شیشے میں ڈھل کر دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ ایک حجام کی تعریف میں کہتے ہیں:

ز نقدِ بے نیازی کیسۂ او آں چناں پُر شد — کہ از دست کسے چیزے بجز ناخن نمی گیرد

اس مضمون آفرینی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر مضامین کی بنیاد الفاظ یا صنعت ایہام پر رکھی جاتی تھی۔ جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ لفظ کے لغوی معنی کو ایک حقیقی بات تصور کر لیا جاتا تھا اور اس پر مضمون آفرینی کی عمارت کھڑی کر دی جاتی تھی۔ اوپر کا شعر اس کی بہترین مثال ہے۔ غنیؔ کے دیوان میں اکثر اسی قسم کے شعر ملیں گے۔ مثلاً:

امروز نیستم شہرۂ عالم ز نحیفی — عمریست کہ از ضعف فتادم بزبان ہا

بہ زبان فتادن کے اصطلاحی معنی مشہور ہونا ہے مگر لغوی معنی زبان سے گرنا اور رسوا ہونا ہے۔ مضمون کی بنیاد اسی لغوی معنی پر ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں کمزوری اور نحیفی میں کچھ آج ہی مشہور نہیں، ایک مدت سے رسوا ہو چکا ہوں۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:-

ہر کہ چوں گور زند خندہ بہ ماتم زدگاں — چشم دارم کہ فلک در دہنش خاک کند

قبر منہ کھول کر ماتم کرنے والوں پر ہنستی ہے مگر وہ دفن کرنے کے بعد اس کے منہ میں خاک ڈال دیتے ہیں۔ یہاں خاک دُہن کردن سے کتنا لطیف مضمون پیدا کیا گیا ہے:

غنی کا یہ شعر زبان زدِ خلائق ہے اور بڑے بڑے اساتذہ سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے:

حسن سبزے بہ خط سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

صائبؔ نے اس مضمون کی نقل اتارنے کے لئے بہتیرا زور مارا مگر وہ بات پیدا نہیں کر سکا جو غنی کے شعر میں ہے:

خطِ سبز آفتِ جاں بود نمی دانستم　　　دام در سبزہ نہاں بود نمی دانستم

یعنی: خطِ سبز آفتِ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا　　　دام سبزے میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

آخر اُسے کہنا پڑا کہ "کاش ! ایں ہمہ کہ در تمام عمر خود گفتہ ام بایں کشمیری می دادم و ایں یک بیت او بہ من حوالہ می کرد"۔ مرزا عبدالقادر بیدل کہتے تھے کہ اگر یہ شعر جلال اسیر کا ہوتا تو میں شعر کہنا ترک کر دیتا۔

سرخوش نے بھی اس مضمون کو باندھنے کی کوشش کی ہے" مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی":

خوردم ز خطِ فریب جمال عذار او　　　ہمرنگ سبزہ بود لباسِ شکار او

کشمیر چنار اور سرو کا گھر ہے۔ چنار کا درخت جس کثرت سے کشمیر میں ہوتا ہے اتنا ہندوستان کے کسی اور مقام پر نہیں ہوتا، خزاں کے موسم میں چنار کے پتے بالکل سرخ ہو جاتے ہیں اور اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے آگ کے انگارے دہک رہے ہوں۔ سرو کے درخت کو انسان کے قد سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ بلبل کا گھونسلہ پیالہ سے مشابہت رکھتا ہے، غنیؔ ان تمام چیزوں سے ایک اچھوتا مضمون اخذ کرتا ہے:

تا کند دریوزۂ آتش بہ گلشن از چنار　　　کاسہ بر کف ہست سرو از آشیان بلبلاں

یعنی سرو کے درخت پر بلبل کا گھونسلہ گویا بھیک کا پیالہ ہے جو چنار سے آگ کی بھیک مانگنے کے لئے اونچا کر دیا گیا ہے۔

"چار چشم شدن" کے معنی ملاقات ہونا، کمال اشتیاق کی وجہ سے انتظار کرنا ہے۔ اکثر کتوں کی دونوں آنکھوں کے اوپر دو نشان ہوتے ہیں، ایسے کتے کو بھی سگ چار چشم کہتے ہیں۔ اس مفہوم کو ذہن میں رکھ اس شعر کو ملاحظہ فرمایئے:

شدہ چشم سگانِ کوئے جاناں چار از شوقش　　　بچشم کم نہ بیند اے رفیقاں استخوانم را

بخت ناموافق کی شکایت ہر شاعر نے کی ہے، مگر غنیؔ کا انداز ہی نرالا ہے:

فلک در گردش است از بہرِ خواب بخت ناسازم　　　بود در جنبش گہوارہ راحت طفل بدخو را

اسی مضمون کو وہ اس سے زیادہ اچھوتے رنگ میں یوں ادا کرتا ہے:

غنیؔ از سستیِ طالع شکست افتد بہ بازارم　　　پئے سودا بکف گیرم اگر سنگ ترازو را

سنگ اور شکست کا تلازمہ شعر کی جان ہے:

معشوق کی چشم دلفریب عاشقوں کے ساتھ جو فسوں کاری کرتی ہے اس کو ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

می کشد پنہاں و می پوشد کبود　　　از فریبِ نرگس شہلا بترس

رندی اور شراب کی تعریف فارسی شاعری کا ایک عام وصف ہے۔ غنیؔ نے تقدس کے باوجود اس مضمون کو باندھا ہے مگر اس صفائی سے کہ یہ مضمون خاص اسی کا ہو گیا ہے:

ساقی بجام ریز مۓ پرتگال را　　　ماہ تمام ساز بیک شب ہلال را

غنیؔ نے اسی قسم کا رندانہ مضمون ایک اور شعر میں باندھا ہے:

غنی ساغر بکف جمشید پیش مے فروش آمد　　　کہ شاید در بہائے بادہ گیرد ملک دنیا را

یعنی جمشید اپنا مشہور قیمتی پیالہ ہاتھ میں لئے مے فروش کے پاس آیا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اس پیالہ کو لے لے اور شراب کا ایک پیالہ دے دے کیونکہ یہ پیالہ یعنی جام جمشید دنیا کی بادشاہت کے برابر قیمت رکھتا ہے۔ جمشید کو اس پر بھی شک ہے کہ مے فروش اس سودے پر رضامند نہ ہو گا، کیونکہ جام شراب کے مقابلے میں دنیا جہاں کی سلطنت بھی کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ یہ مضمون بابا فغانی کے اس شعر کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے!

اے کہ می گوئی چرا جانے بہ جامے می دہی — یں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

شراب کے متعلق غنیؔ کا ایک اور شعر بھی خاص توجہ کا مستحق ہے :

بیا ساقی شبستان مرا امشب منور کن — زروزن تا در آید آفتابم مے بساغر کن

یہ شعر رئیس المتغزلین مولانا نظیریؔ نیشاپوری کے اس شعر کا جواب معلوم ہوتا ہے ۔

میم در جام و ماہم تا سحر بر روزن است امشب — دو دستم تا بوقت صبح طوق گردن است امشب

غرض کہاں تک انتخاب کیا جائے۔ غنیؔ کا سارا دیوان اس قسم کے منتخب اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ غنیؔ اگرچہ ہندی نژاد تھے، کشمیر میں پیدا ہوئے تھے، مگر ان کی زبان اس قدر پختہ، صاف اور شستہ ہے کہ ان کے دیوان پر اہلِ زبان کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ان کا کلام زبان کی خوبی، بندش کی چستی خیالات کی تازگی، محاورات کے صحیح استعمال اور بے ساختہ پن کی وجہ سے اپنے تمام ہمعصروں میں ممتاز ہے۔ ان کی غزلیں ہموار، متین اور ہر قسم کی سوقیانہ باتوں اور مبتذل خیالات سے پاک ہیں۔ کہیں سے اٹھا کر پڑھیے مزہ دیں گی۔ صائبؔ اصفہانی ان کی ایک غزل پر غزل کہتے ہوئے کہتا ہے :

در جواب آں غزل صائبؔ کہ می گوید غنیؔ
یاد ایامی کہ دیگ شوق ما سر پوش داشت

افسوس اس بات کا ہے کہ مولانا شبلیؔ نے شعر العجم میں جہاں اس دور کے دیگر شعرا کلیمؔ، سلیمؔ، طالبؔ اور صائب وغیرہ کا ذکر کیا ہے وہاں غنیؔ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ غنیؔ کی شاعری کا مقام ان شعرا کی بلند پروازیوں سے کسی طرح کم نہیں۔

گجدار و مریز

عبدالعزیز خالد

"جناب عبدالعزیز خالد کا یہ مقالہ اُردو میں تحقیق کا ایک نیا در وا کر رہا ہے، مسئلہ بے حد نازک ہے، مگر عبدالعزیز خالد نے اسے نہایت سلیقے اور ثقاہت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ توقع ہے کہ وہ اہلِ علم جو ان مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اس مقالے کو غور اور بے تعصبی سے پڑھیں گے اور اگر وہ علمی سطح پر کچھ کہنا چاہیں گے تو ان کی نگارشات کے لئے "فنون" کے صفحات حاضر ہیں ——— ادارہ"

میں اکثر اپنے کلام میں آیاتِ بیّنہ اور جوامعُ الکَلِم سے استشہاد و استناد کرتا رہتا ہوں لہٰذا کہ

ع ثریا کی قدیم ہوں نورِ چراغ کا

ان پاک حروف کو عروضی سانچوں میں ڈھالتے وقت ان میں بسا اوقات ناگزیر طور پر "قانونِ ضرورت" کے تحت کہ یَجُوْزُ لِلشَّاعِرِ مَا لَا یَجُوْزُ لِغَیْرِہٖ (یعنی جو دوسروں کو منع ہے جائز ہے شاعر کے لیے) خفیف سا ردّ و بدل کرنا پڑتا ہے اور وہ بھی اس صراحت و دعویٰ کے بغیر کہ یہ قولِ رسولؐ یا گفتۂ رب ہے، محض عربی زبان کے ایک جملے کی حیثیت سے۔ وگرنہ بصورتِ دیگر قرآن و حدیث کے حوالے کے اعلان کے بعد قرآن میں حک و اضافہ یا تغیر و تزمیر کا سوال ہی نہیں اُٹھتا، میں ان الہامی الفاظ کے ایک شوشے کو بھی ادھر ادھر کر دوں !

ہوں تو آزاد مگر اتنا بیباک کہاں! ذرۂ خاک کہاں رب الافلاک کہاں!

ا۔ جیسے زُیِّنَ لَهُمْ سُوْءُ اَعْمَالِهِمْ کو ع لَهُمْ زُیِّنَ سُوْءُ اَعْمَالِهِمْ کر دیا جائے۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ کو ع بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ فَضَّلْنَا وغیرہ۔

ب۔ موقع محل کی مناسبت سے وزن کی میزانِ قسط میں تول کر کلمے کا جتنا جزو درکار ہو، لے لیا جائے اور محذوف یا تو مقدر رہے یا بالفعل مقصود نہ ہو۔

ویسے بھی نثر کے مقابلے میں نظم میں ان تصرفات کی اجازت ہے، جسے شاعرانہ رخصت و استحقاق کہہ سکتے ہیں:

تصرف ۱۔ هُمْ، كُمْ، اَنْتُمْ کے میم ساکن کو متحرک کر کے اُنھیں هُمُ، كُمُ، اَنْتُمُ پڑھنا۔

مثلاً ع اِنِّیْ اُوْصِیْكُمْ بِتَقْوَی اللهِ

ع سَلَامٌ عَلَیْكُمْ هَلْ عَلَی الْعَهْدِ اَنْتُمُ؟ اَمِ الدَّهْرُ اَنْسَاكُمْ عُهُوْدِیْ فَخُنْتُمُ؟

تصرف ۲۔ اِنَّ، اَنَّ اور اِلّا کا ہمزہ تلفظ میں حذف کر دینا۔

جیسے فَخُذْ بِحَقِّكَ وَاِلَّا فَاصْفَحْ بِحِلْمِكَ عَنْهُ

تصرف ۳۔ غیر منصرف پر تنوین پڑھنا

تصرف ۴۔ آخر کے جزم کی جگہ ی یا واؤ کی آواز نکالنا جیسے لَمْ يَقُلْ ۔ لَمْ يَقُلِ ۔ اِفْتَحْ ۔ اِفْتَحِ ع اِفْتَحْ يَا مُفَتِّحَ الْاَبْوَابِ، حافظ

تصرف ۵۔ فَہُوَ، وَھُوَ کو فَھْوَ، وَھْوَ پڑھنا ع۔ مَنْ قَالَ انا عالِمٌ فَھْوَ جَاھِلٌ یا ھُوَ کو ھُوْ پڑھنا

ے سر کشد گوش محمدؐ در سخن کش بگوید در نبی حق ھُوْ اُذُن (د ۱ ش ۱۰۲)

ے جیلہا شاں جملہ حال آمد لطیف کُلُّ شَیٍٔ مِنْ ظَرِیفٍ ھُوْ ظَرِیف (د ۱ ش ۹۴۳)

تصرف ۶۔ لفظ کے آخری متحرک حرف کو ساکن کر دینا یا منون و مشدد کو مخفف کر دینا عَالِمٌ ۔ عالِمْ

تصرف ۷۔ کسرہ، فتحہ اور ضمہ یعنی زیر، زبر اور پیش کی آواز بڑھا کر (بہ طریق اشباع) انھیں الف، واؤ اور ی پڑھنا ——— اور مکسور، مفتوح اور مضموم حرف کو ایک سبب خفیف محسوب کرنا ——— عربی شاعری میں یہ رواج عام ہے۔ فحول شعرا کے چند شعر مثالاً پیش ہیں:

امرؤالقیس تَرَی بَعَرَ الْآرَامِ فِی عَرَصَاتِہَا وَقِیعَانِہَا کَأَنَّہُ حَبُّ فُلْفُلِ
کَدَأْبِکَ مِنْ أُمِّ الْحُوَیْرِثِ قَبْلَہَا وَجَارَتِہَا أُمِّ الرَّبَابِ بِمَأْسَلِ
فَمِثْلِکِ حُبْلٰی قَدْ طَرَقْتُ وَمُرْضِعٍ فَأَلْھَیْتُہَا عَنْ ذِی تَمَائِمَ مُحْوِلِ
أَغَرَّکِ مِنِّی أَنَّ حُبَّکِ قَاتِلِی؟ وَأَنَّکِ مَہْمَا تَأْمُرِی الْقَلْبَ یَفْعَلِ!
طرفہ بن العبد لِخَوْلَةَ أَطْلَالٌ بِبُرْقَةِ ثَھْمَدِ تَلُوحُ کَبَاقِی الْوَشْمِ فِی ظَاھِرِ الْیَدِ
وَتَبْسِمُ عَنْ أَلْمٰی کَأَنَّ مُنَوَّرًا تَخَلَّلَ حُرَّ الرَّمْلِ دِعْصٌ لَہُ نَدِی
إِذَا رَجَّعَتْ فِی صَوْتِہَا خِلْتَ صَوْتَہَا تَجَاوُبَ أَظْآرٍ عَلٰی رُبَعٍ رَدِی
أَرَی الْمَوْتَ یَعْتَامُ الْکِرَامَ وَیَصْطَفِی عَقِیلَةَ مَالِ الْفَاحِشِ الْمُتَشَدِّدِ
زہیر بن ابی سلمیٰ وَدَارٌ لَہَا بِالرَّقْمَتَیْنِ کَأَنَّہَا مَرَاجِیعُ وَشْمٍ فِی نَوَاشِرِ مِعْصَمِ
فَأَصْبَحَ یَجْرِی فِیہِمُ مِنْ تِلَادِکُمْ مَغَانِمُ شَتّٰی مِنْ إِفَالٍ مُزَنَّمِ
لبید بن ربیعہ عَفَتِ الدِّیَارُ مَحَلُّہَا فَمُقَامُہَا بِمِنًی تَأَبَّدَ غَوْلُہَا فَرِجَامُہَا
یَعْلُو طَرِیقَةَ مَتْنِہَا مُتَوَاتِرٌ فِی لَیْلَةٍ کَفَرَ النُّجُومَ غَمَامُہَا
فَاقْنَعْ بِمَا قَسَمَ الْمَلِیکُ فَإِنَّمَا قَسَمَ الْخَلَائِقَ بَیْنَنَا عَلَّامُہَا
عنترہ بن شداد ہَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمِ؟ أَمْ ہَلْ عَرَفْتَ الدَّارَ بَعْدَ تَوَہُّمِ؟
نابغہ ذبیانی أَحَادِیثُ نَفْسٍ تَشْتَکِی مَا یَرِیبُہَا وَوِرْدُ ہُمُومٍ لَمْ یَجِدْنَ مَصَادِرَا
أُسَائِلُ عَنْ سُعْدٰی وَقَدْ مَرَّ بَعْدَنَا عَلٰی عَرَصَاتِ الدَّارِ سَبْعٌ کَوَامِلُ
اعشیٰ میمون مُبَتَّلَةٌ ہَیْفَاءُ رُوْدٌ شَبَابُہَا لَہَا مُقْلَتَا رِئْمٍ وَأَسْوَدُ فَاحِمُ
وَتَضْحَکُ عَنْ غُرِّ الثَّنَایَا کَأَنَّہُ ذُرَی أُقْحُوَانٍ نَبْتُہُ مُتَنَاعِمُ
ابوالطیب متنبی إِذَا کَسَبَ النَّاسُ الْمَعَالِیَ بِالنَّدٰی فَإِنَّکَ تُعْطِی فِی نَدَاکَ الْمَعَالِیَا
فَأَحْسَنُ وَجْہٍ فِی الْوَرٰی وَجْہُ مُحْسِنٍ وَأَیْمَنُ کَفٍّ فِیہِمُ کَفُّ مُنْعِمِ

د = دفتر مثنوی معنوی ش = شعر

تواصدُ کافورٍ توارکُ عنبرٍ ہ — وَمَن تَصَدّ البحرَ اسْتَقَلَّ السَّواقیا

حسّان بن ثابت الثالث وَتُوفّ اتذرِفُ العینُ جُهدَهَا — عَلی طَلَلِ القبرِ الَّذِی فیه احمدُ

وَمَا فقد الماضُون مِثلَ مُحمّدٍ — وَلَا مِثلُهُ حتّی القیامةِ یُفقَدُ

فَانزَلَ ربّی للنّبیّ جُنودَہٗ — وَاَیّدَہٗ بِالنّصرِ فی کلِّ مَشهَدِ

مجنون بنی عامر اتَانی هَواهَا قبلَ ان اعرِفَ الهَوا — فَصَادفَ قلبی فَارِغًا فَتَمکّنَ

(پیر مہر علی شاہ گولڑوی کے دو تین شعر ہیں :-

شب ز روز و روز از شب شد عیاں — فَمَحَوْنا آیَۃَ اللَّیلِ بیاں

قُل لَّهُم توْلاً بلیغًا لیّنًا — وَلَهُم مُبِین بیانًا هیّنا

دوست دارد ہر کسی کہ او محبوبِ ماست — وَرَفَعنا لَکَ ذِکرَکَ اعزاست)

یہ سارے عمل مجتمعاً و فرادیٰ" اُن کلماتِ مبارکہ پر بھی ہوتے ہیں جو کلام البشر میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ عالمِ لاہوت کی لطافت پر عالمِ ناسوت کی کثافت کی ہلکی سی چھائیں پڑ جاتی ہے۔ اس میں سوءِ ادب کا کوئی پہلو نہیں کہ ع

عمل کا ہے نیّت پہ دارومدار اور ع یُبعَثُ النَّاسُ عَلی نیّاتِهِم۔

مگر اعتراض کنندوں کے منہ کون بند کرسکتا ہے ؟ وہ اُسے تحریف و تصحیف لفظی و معنوی سے تعبیر کرتے ہیں اور شاعر کی رخصت کو تو بالکل ماذون و مباح نہیں سمجھتے بلکہ اسے تصرفِ ناروا گردانتے اور متعلقہ مصرعوں کے خارج از آہنگ ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔ غیر شاعر کو شاعر کی مشکلوں کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ع اندوہِ دلِ سوختہ، دل سوختہ جانے

بقول رومی : لَمهُیّئ لَم یَدذ ہر کس کہ نخورد کے بہم آرد و جَعَلَ النّاسِ دَرد ؟ (د۳ ش ۴۳ ۲۹)

یا ع در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام (د۱ ش ۱۸)

غالب کے قصیدے کا ایک شعر ہے ~ دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وَقِنَا رَبَّنَا عذابَ النّار

قرآن حکیم میں " وَقِنَا عذابَ النّار" سورۃ البقرہ کی آیت ۲۰۱ اور سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۶ میں آیا ہے۔ آلِ عمران کی آیت ۱۹۱ میں وَقِنَا کی جگہ فَقِنَا ہے۔ تینوں میں کہیں " رَبَّنَا " کا لفظ نہیں۔ یہ اضافہ غالب بندۂ علی ابن ابی طالب کی طبعِ جدت پسند نے کیا ہے۔ جس پر کسی نے گرفت نہیں کی۔ کیونکہ سوءِ ظن کا کوئی قرینہ و کنایہ نہیں۔ غالباً غالب نے یہ مصرع گلستانِ سعدی سے لیا ہے۔

حافظ کا شعر ہے : ~ شبِ قدر است و طے شُد نامۂ ہجر — سَلامٌ فِیهِ حَتّی مطلعِ الفَجر

قرآن کے الفاظ یہ ہیں : سَلامٌ هِیَ حَتّی مَطْلَعِ الفَجْرِ (۹۷ : ۵)

حافظ کے تصرف پر بھی کوئی چیں بر جبیں نہیں ہوا۔ حالانکہ هِیَ کو فِیهِ سے بدلنے کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی۔ دونوں کا وزن ایک ہے۔ فیہ = هِیَ (هِ = هی ـ فت ے)

(قاضی سجاد حسین اور عباد اللہ اختر کے نسخوں میں البتہ فِیهِ کی جگہ هِیَ چھپا نظر آیا)

ارشادِ خداوندی ہے : صَلُّوا عَلَیهِ وَسَلِّمُوا تَسلِیمًا (۵۶ ـ ۳۳) سعدی نے اسے یوں باندھا : صَلُّوا عَلَیهِ وَآلِهٖ۔

بحر (ضرب) کے الفاظ قرآن میں نہیں لیکن اُسے کسی نے تحریف نہیں کہا۔

اقبالؒ اور رُومیؒ ہمارے دو عبقری شاعر ہیں اور ہماری روایت اور شعور کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس حد تک کہ بعض غالی عقیدت مند انھیں "خاتم الشعراء" کا درجہ دینے میں بھی تامّل نہیں کرتے۔ بالخصوص اقبالؒ کو ــــــ اقبالؒ نے کم کم لیکن رُومیؒ نے اکثر و بیشتر اقوالِ الٰہی اور ارشاداتِ نبوی صلعم کا استعمال کیا ہے۔

رُومیؒ کی مثنوی کے بارے میں جامیؒ نے کہا ہے:

گر زسرِ معرفت آگہ شوی   لفظ بگذاری سوئے معنی روی   از نئے کلک ایں حکایت بشنوی   ہست قرآں در زبانِ پہلوی

من چہ گویم وصفِ آں عالی جناب   نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

آخری مصرع اقبالؒ نے بادنیٰ تصرّف اپنا کر کارل مارکس پر چسپاں کیا ہے:

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب ــــــ ارمغانِ حجاز

دوسرے شعر کا مصرع اولیٰ اس طرح زبان زد ہے: ؏ مثنویٔ مولویٔ معنوی

اقبالؒ بھی فرطِ ارادت سے اپنے آپ کو پیرِ رُومیؒ کا مرید ہندی کہتا ہے۔

خود رُومیؒ سے ایک شعر منسوب ہے ؎ من زقرآں مغز را برداشتم   استخواں پیشِ سگاں انداختم

مجھے مثنوی میں یہ شعر نہیں ملا۔ رُومیؒ جیسا عارفِ ربانی، رہ شناس و مقام آگاہ، کتاب اللہ کے بارے میں ایسی دریدہ دہنی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ وہ رمز آشنا تو خود کہتا ہے:

از خدا جوئیم توفیقِ ادب   بے ادب محروم شد از لطفِ ربّ   (د ۱ ش ۹)

قرآں کا حرف حرف الہامی ہے   ؏ ہے کیا بحث اس میں مغز و استخواں کی؟

؏ کیا تفرقہ ہے اس میں قشور و لُباب کا؟

اگرچہ لِلْقُرْآنِ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ وَلِبَطْنِهِ بَطْنٌ إِلَى سَبْعَةِ أَبْطُنٍ

ظاہرِ قرآں چو شخصِ آدمی ست   کہ نقوشش ظاہر و جانش خفی ست   (د ۳ ش ۴۲۴۸)

لیکن اگر بفرضِ محال یہ اسی نے کہا ہے تو اُسے صوفیا کے طامات و تُرّہات اور شطحیات و شطط میں شمار کرنا چاہیے۔ وہ صاحبِ حال، عالمِ سُکر میں جو کہتے ہیں حالتِ صحو میں قابلِ اعتنا نہیں رہتا۔ سچ ہے: ؏ اَلْعِشْقُ جُنُوْنٌ وَهُوَ اَلْوَانٌ

؎ نیست از عاشق کسے دیوانہ تر   عقل از سودائے او کور است و کر   (د ۶ ش ۱۹۷۹)

آئندہ سطور میں، میں نے ان دونوں باکمالوں کے صرف و تصریف و تصرف آیات و احادیث سے بحث کی ہے۔ استشناداً و استدلالاً اپنے موقف کی تائید اور نقطۂ نگاہ کی توثیق و توضیح کے لیے۔ اگر کسی جگہ میری کسی عبارت سے بادیٔ النظر میں اُن کی شان میں کسی بے ادبی کا احتمال ہوتا ہو تو اُسے تمام تر میری مجبوری پر محمول کیا جائے کہ یہ وفاداریوں کی تقدیم و ترجیح کا سوال ہے۔

؏ لَا طَاعَةَ لِلْخَلْقِ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ

شارعؐ کے الفاظ یہ ہیں: لَا طَاعَةَ لِأَحَدٍ فِي مَعْصِيَةِ اللهِ إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔

ت = تصرف

یعنی : ؏ وہ اطاعت خلق کی

جس میں ہو نافرمانیٔ خالق

ہے شرک و معصیت

میرا بنیادی مقصد اپنا دفاع اور برأت اور ایک اہم علمی استدراک کی تنقیح و تحقیق ہے :

غلطی ہائے مضامیں کا یہ مضمون نہیں ۔۔۔ کسی تخفیف کی تحریک کا مرہون نہیں
میں سمجھتا ہوں بخوبی اہمیت اس کی ۔۔۔ کہ یہ افسانۂ لیلہ و سمنون نہیں
بیش و کم ہر متنفس ہے خطا کا مبتلا ۔۔۔ کوئی انسان بھی نسیان سے مصئون نہیں
کیا بنیٔ نوعِ بشر کی بشریت کا گواہ ۔۔۔ قصۂ سامری و موسیٰ و ھارون نہیں؟
جو ہو نقد و نظر و بحث و بیاں سے مانع ۔۔۔ فن کی اقلیم میں ایسا کوئی قانون نہیں
ہر طرح مجھ کو بزرگوں کا ادب ہے ملحوظ ۔۔۔ صاحبِ دانش و ادراک ہوں، مجنون نہیں
کون کہتا ہے میں ان دو کا خصوصاً، اپنے ۔۔۔ ذہن کی نشو و نما کے لیے ممنون نہیں؟
کیا میں واقف نہیں تخلیق کی جانکاہی سے؟ ۔۔۔ کیا مجھے محرمیٔ معنیٔ "وَالنُّون" نہیں؟
فحل چند بند ہوں میں شاعرِ مفلق، ہر چند ۔۔۔ امرؤ القیس نہیں اعشیٔ میمون نہیں
میرا احوال، براہیمؑ و محمدؐ کی طرح اول آل ۔۔۔ ایسا شاعر ہوں جو منجملۂ "غاوٗون" نہیں
میرا مسلک ہے فروغِ ادب و علم و ہنر ۔۔۔ کسی عالم میں بھی میں، "مانعِ ماعون" نہیں
طالبِ علم جو رہتا ہے گرسنہ دایم ۔۔۔ اُسے منہوم تو کہتے ہیں پہ مبطون نہیں

متعلم بھی ہوں خالد میں معلم بھی ہوں

گو مرا نام ارسطوئے فلاطون نہیں!

یہ توصیف هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۲۷ : ۶۴ کی تعمیل کی کوشش ہے۔

السنّہ : نوائی کہ دراں خضر را عصا خفت است ۔۔۔ بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

میں نے ان دونوں جلیل القدر شاعروں سے کسبِ فیض کیا ہے۔

حکمتِ حق در قضا و در قدر ۔۔۔ کرد ما را عاشقانِ سیم گر (دا ش ۲۴۰)

اقبال کی شاعرانہ عظمت کو میں اپنی دو نظموں میں خراجِ پیش کر چکا ہوں۔ رومی کی بے پناہ تخلیقی قوت کا میں بیحد معترف ہوں۔

؏ شعر اس کے مُترقص و مُضطرب خالد!

کلیاتِ شمس تبریز کو میں فارسی شاعری کا گلِ سر سبد سمجھتا ہوں۔ "اس کے سرور، اس کے گداز، اس کے سوز و ساز" اُس کے وفورِ عشق و مستی، اس کے سیلِ الفاظ اور سطوتِ معانی کے آگے مجھے تو حافظِ لسان الغیب تک پریدہ رنگ و بیذلہ" نظر آتا ہے۔

ادب : دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ شور افزا ۔۔۔ دل افگندیم بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖيهَا وَمُرْسٰهَا!

رموزِ بیخودی کا ایک شعر ہے (ص : ۹۱)

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است　　　　در اٰتِی الرَّحمٰنِ عَبْدًا مضمر است

دوسرا مصرع اس آیت کا حصہ ہے :- اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (۱۹: ۹۳)
مصرع بداہتہً وزن سے خارج ہے۔ اسے ناموزونی کے الزام سے بچانے کے لیے اٰتی کو آتی کے وزن پر پڑھنا پڑے گا۔ یہ ایسی ہی ہے جیسے آل کو اُل، آدم کو اَدم اور عادی کو عَدی پڑھا جائے۔

غالب کی رُباعی کا ایک مصرع ہے :-　　دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالب!

اس میں ایک سببِ خفیف یعنی ایک "رُک" زائد ہے، جس سے مصرع ساقط الوزن ہو گیا ہے۔ غالب کے طرف داروں نے اُسے موزوں ثابت کرنے کے لیے بہت زور مارا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے جو غالب کو عَلیٰ کُلِّ غالب سمجھتے تھے، بڑی عجیب تاویل پیش کی کہ بند ہو کو افاعلن (سببِ خفیف + وتد مجموع) کے وزن پر نہیں بلکہ بَندھو — فعلُن (صرف وتد مقرون) کے وزن پر پڑھا جائے تو رفع اشکال ہو جاتا ہے اور عزتِ سادات بچ جاتی ہے۔ لیکن بند ہو، بندھو کس عملِ تسخیر سے ہو جائے گا؟ میں نے ان سے کہا کہ غلط بات کی ایسی بھی کیا پچ! عقیدت میں ایسا بھی کیا اغراق و غلو! اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ - ۲: ۲۰۶

ع کسی مرد خدا کی شان نہیں!　　ع لغزش تو ہے حضرتِ بشریت کا تقاضا

ع توسن خامہ سے اگر ناطق　　تو یہ چابک سوار کی ہے خطا؟　　ع اور — اِنَّ الْجَوَادَ قَدْ یَعْثُرُ

اِنَّ الْجَوَادَ قَدْ یَکْبُوْ　　اِنَّ الزِّنَادَ قَدْ تَخْبُوْ　　قول رسولؐ ہے : لَا حَلِیْمَ اِلَّا ذُوْ عَثْرَةٍ

ع لِکُلِّ صَارِمٍ نَبْوَةٌ　　لِکُلِّ عَالِمٍ هَفْوَةٌ

خود اقبال کا قول ہے :　　ع می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے

اسی مثنوی کا ایک اور شعر ہے۔ (ص ۱۹۳)

ہر کہ پا در بندِ اقلیم وجد است　　بے خبر از لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ است

قرآنی واؤ علت غائب ہے۔ (۱۱۲: ۳)

یہ غالباً مرید نے پیر کے تتبع میں کیا ہے۔ رُومی کہتا ہے :

لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ او را لائق است　　والد و مولود را او خالق است　　(۲ ش ۱۷۴۵)

لَمْ یَلِدْ لَمْ یُوْلَدْ است او از قدم　　نے پدر دارد نہ فرزند و نہ عم　　(۳ ش ۱۳۱۹)

(پیر مہر علی شاہ کا شعر ہے :

مَالِکُ الْمُلْکِ وَاللّٰهُ اَحَدْ　　لَمْ یَلِدْ - لَمْ یُوْلَدْ اَللّٰهُ الصَّمَدْ)

جناب نظیر لدھیانوی نے "ترجمانِ اقبال" میں اس شعر کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

جو کوئی بھی ہے اسیرِ ملک و حد　　وہ نہ سمجھا لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ.

واؤ تو آ گئی مگر مصرع وزن سے گر گیا۔

رموز ہی کا ایک اور شعر ہے (ص ۱۰۰) ـ جوئے اشک از چشم بے خوابش چکید　　تا پیامِ طَهِّرَا بَیْتِیْ شنید

ص ۔ صفحہ

قرآنی لفظ مَبِیتِیَ ہے (۲ : ۱۲۵) تعجب ہے کہ حاشیے میں بھی آیۂ شریفہ سکونِ ی ہی کے ساتھ درج ہے۔
اقبال نے رُومی کی تقلید میں یَ کو ساکن کیا ہے (ت ۶)

طَہِّرَا بَیتِیَ بیان پاکیست گنجِ نوراست ار طلسمش خاکیست (ر ش ۴۲۳)

اس طرح "پس چہ باید کرد" میں ہے (ص ۸۴۵) ؏ در دلش لاغالب الا اللہ نیست

غالب سکونِ ب کے ساتھ (ت ۶) اصل میں غالبَ ہے کہ لا کے بعد نکرۂ مفردہ مبنی بر فتحہ ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:

لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ (۸ : ۴۸)

ویسے یہاں ت ۲ کے مطابق اِلَّا کا ہمزہ حذف بھی ہو سکتا تھا اور قراءت یوں بھی ہو سکتی تھی۔

؏ در دلش لا غَالِبَ اِلَّا اللہ نیست۔

"پس چہ باید کرد" ہی کا مصرع ہے (ص ۸۲۶) چشمِ او یُنْظُر بنورِ اللہ نیست

رُومی نے بھی مجزوم (ت ۶) کے ساتھ ہی استعمال کیا ہے۔

مومن ار ینظر بنور اللہ بود عَیب (عیب) مومن را برہنہ چوں بود (داش ۱۳۳۱)

مومنا ینظر بنورِ اللہ شدی از خطا و سہو ایمن آمدی (دم ش ۱۸۵۵)

اصل حدیث کے الفاظ ہیں: اِتَّقُوْا فِرَاسَۃَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللہِ (عَزَّوَجَلَّ)
ینظر کی ظ مضموم ہے (ن)۔ مکسور نہیں۔ جیسا کہ اقبال کے مطبوعہ مصرع میں ہے۔

رموز کا ایک اور شعر ہے (ص ۱۰۴) ؎ کُلُّ مومن اِخْوَۃٌ اندر دلش حریت سرمایۂ آبِ گِلش

قرآنی آیت ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (۴۹ : ۱۰)

حدیث میں یہ لفظ ملتے ہیں: اَلْمُؤْمِنُ اَخُو الْمُؤْمِنِ لِاَبِیْہِ وَاُمِّہٖ
اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ (مسلم)

یا حجۃ الوداع کے موقع پر یہ ارشاد ہوا: اَیُّھَا النَّاسُ اِسْمَعُوْا قَوْلِیْ وَاعْقِلُوْہُ، تَعْلَمُنَّ اَنَّ کُلَّ مُسْلِمٍ اَخٌ لِلْمُسْلِمِ وَاَنَّ الْمُسْلِمِیْنَ اِخْوَۃٌ۔

اِخْوَۃٌ اَخٌ کی جمع ہے۔ اور مومن واحد۔ جملہ اسمیہ خبریہ میں مسند الیہ اور مسند یعنی مبتدا اور خبر کی مطابقت لازم ہے۔
جو اس مصرع میں نہیں

"جاوید نامہ" کا شعر ہے (ص ۶۴۴)

صرصرے دہ یا ہوائے بادیہ اَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَہ

قرآن میں: کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ ہے (۶۹ : ۷)

اَنَّ مفتوحہ صدرِ کلام میں نہیں آ سکتا۔ صرف جملے کے درمیان میں ہی آ سکتا ہے۔ ت ۲ کی رُو سے مصرع یوں ہو سکتا تھا۔

؏ کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَہ۔

جاوید نامہ ہی کا شعر ہے (ص ۷۲۳) گفتمش بگذر ز آئینِ فراق اَبْغَضُ الْاَشْیَاءِ عِنْدِیَ الطَّلَاقُ

ت ۶ = باب نَصَرَ یَنْصُرُ (ثلاثی مجرد)

حاشیے میں درج ہے :- اَبْغَضُ الْاَشْیَاءِ عِنْدِی الطَّلَاق : حدیث مشہور
رُومیؒ نے بھی اسے استعمال کیا ہے ؎

"ناتوانی بامت اندر فراق اَبْغَضُ الاشیاءِ عندی الطّلاق (د۲ ش ۱۷۵۲)

حدیث کے الفاظ ہیں :- یامعاذ! مَا خَلَقَ اللّٰہُ شَیئًا عَلٰی وَجْہِ الْاَرْضِ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنَ الْعِتَاقِ و مَا خَلَقَ اللّٰہُ علی وجہ الْاَرْضِ اَبْغَضَ اِلَیْہِ مِنَ الطَّلَاقِ -

: اَبْغَضُ الْحَقِّ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاق

: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُبْغِضُ الطَّلَاقَ

ابنِ ماجہ میں یہ الفاظ ہیں :- اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقِ -

ابوداؤد میں یہ عبارت ہے :- "عَنْ مُحَارِب قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : مَا اَحَلَّ اللّٰہُ شَیْئاً اَبْغَضَ اِلَیْہِ مِنَ الطَّلَاقِ۔"

عَنْ مُحَارِبِ عَنْ اِبنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ الطَّلَاق۔ "

مصرع میں ضمیر متکلم کا مرجع مبہم ہے۔ اس لیے جملہ ناقص ہے۔ اگر اس کی جگہ یہ مصرع ہوتا ؏ اَبْغَضُ الْحَقِّ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاق (یا اَبْغَضُ الشَّیْئِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاق) تو مفہوم بھی پورا ہو جاتا اور الفاظ بھی (بروایتِ بعض) شارعؐ ہی کے رہتے۔ اقبال کے مصرع میں اسم تفضیل منصوب ہے، اسے قواعد کی رُو سے مرفوع ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ حاشیے کی عبارت میں ہے۔

"پس چہ باید کرد" کا ایک مصرع ہے (ص ۸۲۷) ؏ از شریعت احسن التقویم شو یہ بھی رُومی ہی کی پیروی معلوم ہوتی ہے۔

می دہد رنگ احسن التقویم را تا بہ اسفل می برد این نیم را ! (د۳ ش ۳۵۲۲)

احسن التقویم در وَالتّین بخواں کہ گرامی گوہر است اے دوست جاں

احسن التقویم از عرشش او فزوں احسن التقویم از فکرت بروں (د۶ ش ۱۱۰۵، ۱۱۰۶)

حاشیے میں لکھا ہے :- تلمیح ہے آیۂ قرآنی کی طرف . لیکن قرآن کے الفاظ تو اَحْسَنِ تَقْوِیْم ہیں ۹۵ : ۴ لام تعریف کے بغیر معلوم نہیں ان دونوں رمز شناسوں نے اصل سے صرفِ نظر کیوں کیا اور ترکیب میں بلاوجہ ثقالت کیوں پیدا کی۔ احسنِ تقویم کی سبک ترکیب بڑی آسانی سے استعمال ہو سکتی تھی۔!

"اسرارِ خودی" کا شعر ہے (ص ۴۴) تا جہاں باشد جہان آرا شوی تاجدارِ مُلک لا یبلیٰ شوی

قرآن میں مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى کے الفاظ ہیں ۲۰ : ۱۲۰ کی متون ل مشدد۔ اگرچہ ل حرفِ شمسی میں مدغم ہونے کے باعث تنوین مخفف ہو کر صرف زیر رہ جائے گی لیکن ل کی تشدید بہر حال قائم رہے گی اور مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى کا وزن مفعول فعلن ہو گا نہ کہ فاعلن فعلن (فاعلاتن فا) جیسا کہ شعر میں باندھا گیا ہے تشدید لام کی تخفیف کی وجہ سے۔

اسی مثنوی میں آگے چل کر ہے (ص ۶۲) خیمہ در میدانِ اِلَّا اللّٰہ زد است در جہاں شاہد علی النّاس آمد است

قرآن کے الفاظ ہیں : شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲ : ۱۴۳)
یعنی شاہد کی بجائے شُہَدَآء ہے۔

اسی مثنوی میں ہے (ص ۲۹) بے خبر از یوم نَحسٍ مُستمِر ۔ قرآن میں نحسٍ ہے (۵۴ : ۱۹) (خود حاشیے میں یونہی درج ہے ۔)

رموزِ بیخودی میں ہے (ص ۱۱۰) معنیٔ ذَبحٍ عَظِیم آمد پسر ۔ قرآن میں ہے :۔ بِذِبحٍ عَظِیمٍ (۳۷ : ۱۰۷)

ذبح کا ذ مکسور ہے مفتوح نہیں ۔

ذِبح بکسرۂ ذال بمعنی مذبوح : ذبیح ۔ ذبیحہ ، مقتول ، قربانی ۔ وہ جانور جس کو ذبح کیا جائے اور بہ فتحۂ ذال مصدر ہے ۔ یعنی گلا کاٹنا ۔ ذبح کرنا ۔ جیسے حدیث میں ہے :۔ اِیَّاکُم وَالمَدحَ فَاِنَّہُ ذَبحٌ ۔ رموز (ص ۱۰۸) آیہ بالعدل والاحسان خواندن منصوب نہیں بلکہ مجرور ہے ۔ قرآن ۱۶ : ۹۰

اسی مثنوی میں آگے چل کر ہے (ص ۱۱۵) تا اَحَلُّوا قَومَھُم دارُ البوار ۔

دارُ ــــــــ (مرفوع کے ساتھ ۔ حاشیے میں آیتِ قرآنی لکھی ہے وہاں بھی یہ رفع سے لکھا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ مفعول فیہ (ظرف مکان) ہے اور منصوب ہے ۔ یعنی دارَ قرآن ۱۴ : ۲۸

رموز (ص ۱۶۰) کے حاشیے پر درج ہے : مَازَاغَ البَصَرُ وَمَا طَغیٰ (آیہ شریفہ) صحیح لفظ بَصَرُ ہے بَصَرَ نہیں ۔ یعنی حالتِ رفعی میں ہے ۔ قرآن ۵۳ : ۱۷ ۔

رموز میں ہے (ص ۱۵۶) آں اَمَنَّ النَّاس بر مولائے ما آں کلیم طورِ سینائے ما

حاشیے میں درج ہے : اَمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِی صُحبَتِہٖ وَمَالِہٖ اَبُوبَکر (حدیث) اصل میں یہ مسلم کی حدیث ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِی مَالِہٖ وَصُحبَتِہٖ اَبُوبَکر (اِنَّ ناصبِ مبتدا ہے (اِنَّ اَنَّ کَاَنَّ لَیتَ لٰکِنَّ لَعَلَّ ناصبِ اسم اند و رافع در خبر ضدِّ ما و لا)

اس لیے حدیث میں مضاف اسمِ تفضیل اَمَنَّ منصوب ہے ۔ مصرع میں چونکہ حرفِ عاملہ موجود نہیں ۔ اس لیے اسے مرفوع ہونا چاہیے تھا ۔ (یا اگر وادیں میں مقولے کے طور پر ہوتا تو شاید جواز نکل آتا ۔)

بخاری میں : اِنَّ مِن اَمَنِّ النَّاس کے الفاظ ہیں ۔ ن یہاں مجرور ہے ۔ مِن جارّہ کی وجہ سے

نوع اول ہفدہ حرف جر بود میداں یقیں کاں دریک بیت آید جملہ بیچوں و چرا
باؤ و تاؤ و کاف و لام و واؤ مُنذُ و مُذ خلا
رُبَّ حَاشَا مِن عَدا فِی عَن عَلیٰ حَتّیٰ اِلیٰ

اسی مثنوی میں ص ۱۲۳ پہ یہ مصرع درج ہے ؏ قطع کر دی امرِ خود را در زُبُر ۔ قرآنی آیت ہے :۔
فَتَقَطَّعُوا اَمرَھُم بَینَھُم زُبُرًا ۲۳ : ۵۳

پس چہ باید کرد میں اقبالؒ نے رُومی کا یہ شعر نقل کیا ہے : (ص ۸۲۵)

مال را گر بہرِ دیں باشی حمول نِعمَ مالٌ صالحٌ گوید رسول

(یہ شعر دفتر اول میں ہے ش ۹۸۴ ۔ گوید کی جگہ مثنوی میں گفتہ ، گفتش یا خوانش کے لفظ بھی ملتے ہیں ۔ اور رگر کی جگہ کزاد ، ز ، حاشیے میں اندراج ہے :۔ نعم مالٌ صالحٌ حدیثِ نبوی ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مال دینی امور پر خرچ کرنے کے جمع کیا جائے تو وہ مال صالح ہے ۔

لیکن حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔ نِعمَ المَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ ۔

ــــــــ حلال مال جو نیک شخص کے پاس ہو کیا اچھی چیز ہے ۔

________ لغات الحدیث

________ علامہ وحید الزمان

ذکر ابو عُبَیدہ حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال عمرو بن العاص : نِعْمَا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ ۔

قَالَ ابْنُ الْاَثِیْر :۔ أَصْلُهُ نِعْمَ مَا فَأَدْغَمَ وَشَدَّدَ كَأَنَّهُ قَالَ نِعْمَ شَيْئًا الْمَالُ والباء زائدة

ومنه الحديث :۔ نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ ۔

________ لسانُ العرب

"یعنی صالح آدمی کے لیے حلال مال بہت ہی اچھا ہے کیونکہ وُہ اس میں سے عزیز و اقارب کو دے گا، ضروریات دین پر خرچ کرے گا اور ضرورت مندوں کی مدد کرے گا۔"[4]

نِعْمَ کا مابعد فاعل اسم (۱) معرّف باللّام ہوتا ہے : نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ، نِعْمَ الْمُعِيْنُ

(۲) یا مضاف ہوتا ہے معرّف باللام ہوتا ہے : نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ، نِعْمَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ

(۳) یا ضمیرِ مستتر ممیّز بنکرۂ منصوبہ : نِعْمَ شَاعِرًا اقبالؒ

(رافعِ اسمائے جنس افعالِ مدح و ذم بود ہست آنہا نِعْمَ بِئْسَ، ساءَ، حَبَّذَا

فاعلِ ایں ہر دو باشد یا کہ ذواللّام اسمِ جنس یا مضاف سوئے ذواللّام است فاعل ایں دو را

یا ضمیرِ مبہم مفرد کہ تمیزش بود نزد اکثر نکرۂ منصوبہ مفسر و مطلقا)

مصرع یوں ہو سکتا تھا ؏ مالِ صالح را حَسَنْ گوید رسُول

حَسَنْ یوں بھی رُومی کا مرغوب لفظ ہے۔

رموز کا ایک شعر ہے (ص ۱۴۳) : تو کہ مقصودِ خطابِ اُنظری پس چرا ایں راہ چوں کوراں روی ؟

معلوم نہیں فعل امر کا ہمزہ مکسور کیوں ہے۔ اوّل تو اسے مضموم ہونا چاہیے (ن) اور پھر ضمیر مذکر کے ساتھ فعل مؤنث کیوں؟

قرآن میں یہ الفاظ ملتے ہیں : وَالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ (۲۷ : ۳۳)

؏ یہ بلقیسِ سبا کے نام نامہ ہے سلیماں کا

جاوید نامہ (ص ۲۴۴) کا شعر ہے : اے ترا اندر دو چشمِ ما وثاق مہلًا اِنْ کُنْتَ اَزْمَعْتِ الْفِرَاق

حاشیے میں درج ہے : پارۂ از شعرِ امراءالقیس یعنی مہلت بدہ اگر قصد جدائی کردۂ

امرؤالقیس کا شعر یوں ہے :

اَفَاطِمَ مَهْلًا بَعْضَ هٰذَا التَّدَلُّلِ وَاِنْ كُنْتِ قَدْ اَزْمَعْتِ صَرْمِيْ فَاَجْمِلِي

(ابوعبیدہ کے واسطے سے تبریزی نے صَرمی کی جگہ قَتْلی روایت کیا ہے۔

— وَيَقُولُ ابْنُ هِشَام فِي مُغْنِي اللَّبِيبِ : وَمِيْلِيْ صَوْمًا)

الفاظ بھی اور ہیں اور مطلب بھی وہ نہیں جو اقبال نے نکالا ہے۔ دوسرے مصرع کا مفہوم آرزو لکھنوی کی زبان میں کچھ یوں بنتا ہے۔

؏ اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

یا قرآن کی زبان میں هَجْرًا جَمِيلًا ۷۳ : ۱۰
یعنی ع کر ترکِ تعلق تو با اندازِ مبارات
اقبال کو مَهْلًا کے معنی میں سہو ہوا ہے اور اسی کا اس نے مطلب پہلے بدو لکھا ہے۔ اس کے معنی ہیں رِفْقًا۔ شعر کے معنی زوزنی کے الفاظ میں یہ ہیں: يَا فَاطِمَةُ! دَعِي بَعْضَ دَلَالِكِ وَإِنْ كُنْتِ وَطَنْتِ نَفْسَكِ عَلَى فِرَاقِي فَأَجْمِلِي فِي الْهِجْرَانِ۔
أَفَاطِمُ منادیٰ مرخّم ہے یعنی یہ ترخیم ہے افاطِمَةُ کی ـــ اور فاطمہ مُعرب غیر منصرف ہے، مراد شاعر کی بنتِ عم، عُنَيْزَہ بنت شَرَحْبِيل ہے۔ یا بروایتِ اصمعی: فاطمة بنت العبيد بن ثعلبه: مِنْ عُذْرَہ
محمد کاظم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: اب بس کرو فاطمہ! یہ ناز و ادا کم کرو۔ اگر تم نے مجھ سے قطعِ تعلق ہی کی ٹھانی ہے تو جو کچھ کرنا ہے۔ بھلے انداز میں کرو!
قاضی سجاد حسین کا ترجمہ یہ ہے۔ اے فاطمہ! اس ناز و انداز کو ذرا چھوڑ۔ اور اگر تو نے مجھ سے قطعِ تعلق کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو بھلمنسی (بھلائی) کے ساتھ کر!
ڈاکٹر پیر محمد حسن: (ترجمہ بلوغ الارب ج ۳)
اے فاطمہ! یہ ناز و ادا ذرا ٹھہر ٹھہر کے دکھا اور اگر تو نے مجھ سے قطع تعلق کر لینے کا پختہ ارادہ کر ہی لیا ہے تو اچھے طریقے سے کر!
عبدالرحمٰن طاہر سورتی: (ترجمہ تاریخ ادب عربی)
اے فاطمہ! ذرا اپنی کج ادائیاں اور اس قسم کے ناز و انداز کو کم کر دے۔ اور اگر تو نے مجھ سے جدا ہونے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا ہے تو اس کے لیے بھی کوئی خوشگوار و موزوں طریقہ اختیار کر!
مولانا ذوالفقار علی دیوبندی: اے فاطمہ! یہ ناز کسی قدر چھوڑ دے اور اگر تو نے مجھ سے الفظ کا پکا ارادہ کیا ہے تو نکوئی سے کر!
مولانا فیض الحسن سہارنپوری: اے فاطمہ! قدرے ایں خلاف نمائی بگذار کہ من خوب می دانم و اگر ہمیں می
خواہی کہ تو از من بریدہ شوی باید کہ بطرز معقول از من بری
اے فاطمہ! یہ جھوٹی دکھائیاں چھوڑ اور اگر توڑنا ہی منظور ہے تو سیدھے طریقے سے توڑ!
قاضی ظفر الدین: او فاطمہ! اس خلاف نمائی (ناز و ادا) کا کچھ حصہ چھوڑ دے اور اگر تو نے فراق کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو ذرا خوبصورتی اور نرمی سے اس ارادے کو پورا کرنا۔ دوستوں سے ایسے الگ نہیں ہونا چاہیے کہ پھر متفق ہونے کا موقع ہی نہ رہے!
مولانا محمد اسمٰعیل سلفی: اے فاطمہ! یہ ناز اور مچلنا چھوڑ دے اور اگر تم نے محبت توڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اچھی طرح کرو تاکہ بدمزگی نہ ہو!
(فَقُلْتُ لَهَا) يَا فَاطِمَةُ! دَعِي هٰذَا الْغُنْجَ وَالدَّلَالَ فَإِنْ كُنْتِ عَازِمَةً عَلَى الصَّرْمِ وَالْقَطْعِ فَأَحْسِنِي فِي ذٰلِكَ (فَإِنَّ سَبِيلَ الْجَوْرِ سَبِيلٌ وَعْرٌ)
عَبْدُ الرَّحِيم: يَا فَاطِمَةُ! دَعِي بَعْضَ دَلَالِكِ وَإِنْ كُنْتِ قَصَدْتِ فِرَاقِي وَأَجْمَعْتِ عَلَيْهِ فَأَجْمِلِي فِي الْهِجْرَانِ۔
اَلتَّبْرِيزِي: إِنْ كَانَ هٰذَا مِنْكِ تَدَلُّلًا فَاقْصُرِي وَإِنْ كَانَ عَنْ بُغْضَةٍ فَأَجْمِلِي
أَيْ أَحْسِنِي

R. A. Nicholson :

Soft ! if farewell is planted in thy mind
Yet spare me, Fatima, disdain unkind !

A. G. Arberry :

Gently now, Fatima, A little less disdainful,
Eeven if you intend to break with me, do it kindly.

Captain F. E. Johnson :

Oh, Fatima, gently put aside some of this coquetry and if you have, indeed, made up
your mind to cut off friendship with me, then do it kindly or (and) gently.

Ludwig Abel : (فاجملی) Gut und Zufrieden sein.
so sei gut

(مهلاً بعض هذا) Lass doch ein wenig nach
mit diesem

(تدلل) Kokettieren. Sich Zeieren

مصرع اگر یوں ہوتا تو معناً اصل کے قریب تر ہوتا۔

ع فَاجْمِلِی اِنْ کُنْتِ اَزْمَعْتِ الفِراق

فَاجْمِلی کی جگہ اَجْمِلِی یا اَحْسِنِی بھی آسکتا ہے۔

اگر "ہلکے بدہ" ہی کہنا مقصود ہو تو اس کے لئے لفظ

(امر حاضر معروف) مَہِّلْ یا اَمْہِلْ ہے

فَمَہِّلِ الْکٰفِرِیْنَ اَمْہِلْہُمْ رُوَیْدًا قرآن : الطارق ۸۶ : ۱۷

صیغۂ تانیث کی رعایت سے مصرع میں مَہِّلی یا اَمْہِلی آئے گا:

ع مَہِّلی / اَمْہِلی، اِنْ کُنْتِ اَزْمَعْتِ الْفِراق ۱

جناب نظیر لدھیانوی نے "ترجمان اقبال" میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ان کی ایک نظم "نذرِ اقبال" جس میں یہ شعر تھا ؎

اے کہ سینا ذرۂ از تاب تو نعرۂ ارنی زنم بر باب تو

(ایسے ہی ع چاپلوس و لفظِ شیرین و فریب (د ۲ ش ۲۵۸۴) کے بارے میں غالباً شارح نے کہا تھا:

اُحْثُوا التُّرَابَ فِی وُجُوہِ الْمَدَّاحِیْنَ (یعنی اُحْثُوا التُّرَابَ فِی وُجُوہِ الْمَادِحِیْن) خود اپنے بارے میں اس کی یہ تنبیہ ہے: لَاتُطْرُوْنِی فَوْقَ قَدْرِی!

ہیں اہلِ دل اس بات پر خالد بصد — مَنْ حَفِظَنَا اَوْرَقَنَا فَلْیَقْتَصِدْ ـــــ یعنی جو ہماری تعریف کرے یا ہم سے محبت رکھے، معتدل رہے ـــــ

ہمارے بارے میں کوئی غلو سے کام نہ لے
کرے جو مدح ہماری ہے لازم اس کو بڑھے
نہ زینہار حدِ اعتدال سے آگے!

(۱۲ منہ)

۲۴ ستمبر ۱۹۲۷ء کے روزنامہ انقلاب میں شائع کرتے ہوئے مدیرِ انقلاب مولانا عبدالمجید سالک نے لکھا:

"ارنی کی ر متحرک ہوتی ہے۔ خدا جانے نظیر صاحب نے ساکن کیوں باندھی؟"

اقبال نے اس کے جواب میں مدیرِ انقلاب کو لکھا ...... ٹیک چند بہار نے "الطالِ ضرورت" میں حدیثِ ارنی پر مفصل بحث کی ہے ...... بہر حال یہ صحیح ہے کہ اساتذۂ عجم نے ربّ ارنی کی رائے ثانی کو بسکون را بھی استعمال کیا ہے ...... اصغر حسین صاحب کے شعر میں کوئی غلطی نہیں!"

تسکینِ اوسط کا اصول اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن خدائی الفاظ میں ترمیم کا حق اساتذۂ عجم کو کس نے دیا؟ معرّب الفاظ میں البتہ انھیں اس کا اختیار ہے۔ چار حرفی اسماء کہ جن کے پہلے تین حرف متحرک ہوں (فاصلہ صغریٰ) صولت، غالباً سہولتِ تلفظ کے لیے درمیان میں ساکن کیا جا سکتا ہے لیکن افعال میں یہ عمل کیسے ہو سکتا ہے۔ عربی میں اَرْنی کوئی کلمہ نہیں۔ نظامی یا سالک یزدی کے کہنے سے کیا ہوتا ہے!

نظامی: موسیٰ زمیں جام تہی دید دست — شیشہ کہ پایۂ اَرْنی شکست
سالک یزدی: مرغ اَرْنی گو زِ شوقِ لن ترانی پر زند — پیش موسیٰ خارِ خارِ وادیٔ ایمن گل است

ویسے سلطان باہو بھی ان حضرات کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں:

ہمچو موسیٰ مست شو بر طورِ خویش — ربّ اَرْنی گو تجلّیِ حق نگر!
طورِ سینا چیست دانی بے خبر — طورِ سینا سینۂ خود را نگر

(اقبال کے اشعار کلیاتِ اقبال مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے لیے گئے ہیں۔ یہ دیدہ زیب نسخہ فروری ۱۹۷۳ء میں علّامہ کے خلف الصدق کی ذاتی نگرانی میں "تصحیح کے لیے خاصی سرگردانی" کے بعد علّامہ کی حیات میں مطبوعہ نسخوں کے مطابق شائع کیا گیا ہے)

مثنوی

دفتر اوّل

۱- عشق جانِ طُور آمد عاشقا — طُور مست و خرّ موسیٰ صَعِقا / صاعقا (ش ۲۶)

قرآن : وَخَرَّ مُوسىٰ صَعِقًا ۷ : ۱۴۳

ص = صا (ت ۷)

۲- بے خبر بودند از حالِ دروں — استعیذُ اللّٰهَ مِمَّا يَفْتَرُوْن (ش ۱۰۵)

قرآن : وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۶ : ۱۱۲ ، ۶ : ۱۳۷

قرآن میں استعیذُ اللّٰہ کہیں نہیں۔ اَعُوذُ بِاللّٰهِ ہے۔ حدیث میں البتہ استعیذُ باللّٰہ ملتا ہے

۳- سایہ خواب آرد ترا ہمچوں سمر — چوں برآید شمس اِنْشَقَّ الْقَمَرْ (ش ۱۱۸)

زورِ جانِ کوہکن شقِّ حجر — زورِ جانِ جاں در اِنْشَقَّ الْقَمَر (ش ۱۴۷۸)

قرآن : وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۵۴ : ۱

وَ کی بجائے مصرع میں اِنْ ہے۔

۴- گر خبر خواہی ازیں دیگر خروج — سورہ برخواں والسّما ذاتِ البُروج (ش ۷۴۳)

قرآن : وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۸۵ : ۱)

ء محذوف (ت : ۲)

۵- آنکہ بود است اُمُّهُ الهاویه — هاویه آمد مر اورا زاویه (ش ۸۷۷)

قرآن : فَاُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۱۰۱ : ۹

ال اضافہ رُومی سے ہے۔ غالب کا ہاویہ زاویہ سے اور سقر مقر سے غالباً یہیں سے لیا گیا ہے)

۶- تا اِلَيْهِ يَصْعَدُ اَطْيَابُ الْكَلِم — صاعداً مِنَّا اِلیٰ حَيْثُ عَلِم (ش ۸۸۲)

قرآن : اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ ۳۵ : ۱۰

مصرع میں یصعدُ کا د ساکن ہے (ت ۶) اور الکلم الطیب کی جگہ اَطیابُ الکَلِم ہے۔

۷۔ کرد وصف مکرہاشان ذُوالجلال لِیتزول مِنہُ اقلالُ الجبال (ش ۹۵۲)

قرآن : وَاِنْ کَانَ مَکْرُھُمْ لِتَزُوْلَ مِنْہُ الْجِبَالُ (۱۴ : ۴۶)

اَقلالُ کا اضافہ شاعر نے کیا ہے۔ لِتَزُوْل کا لِ بروزن لی ہے۔ (ت : ۷)

۸۔ لاجرم اَبصارُنا لا تدرِکہ وَھُوَ یُدرِک بین تو از موسیٰ وکُہ (ش : ۱۱۳۵)

قرآن : لاتُدرِکُہُ الاَبصَارُ ۶ : ۱۰۳

وَھُوَ = وَھْوَ (ت ۷،۵)

۹۔ ربّنا اِنّا ظلمنا گفت و آہ یعنی آمد ظلمت و گم گشت راہ (ش : ۱۲۵۴)

گفت آدم کہ ظلمنا نفسنا او ز فعل حق نبد غافل چو ما (ش : ۱۴۸۹)

ورنہ آدم کے بگفتے با خدا ربّنا اِنّا ظلمنا نفسنا (د ۶ ش ۴۰۴۱)

قرآن : قالا ربّنا ظلمنا انفسنا۔ ۷ : ۲۳

تینوں شعروں میں اَنفُسنا کی جگہ نَفسَنا ہے پہلے اور تیسرے شعر میں بیچ میں اِنّا دھانس دیا گیا ہے۔

۱۰۔ مرضعیفاں را تو بے خصمی مداں از نُبی ذا جاءِ نصر اللہ خواں (ش : ۱۳۱۳)

قرآن : اِذا جاءَ نصرُ اللہِ ۱۱۰ : ۱

اِذا کو ذا باندھا گیا ہے۔ نُبی غالباً نَبِیٔ = نبا، کتاب ہے۔ جاءَ، جاءِ چھپا ہے۔

۱۱۔ سوئے نخجیراں دوید آں شیرگیر کابشروا یا قوم اِذ جاءَ البشیر (ش : ۱۳۵۳)

قرآن : فَقَدْ جَاءَکُمْ بَشِیْرٌ ۵ : ۱۹

فَلَمَّا اَنْ جَاءَ الْبَشِیْرُ ۱۲ : ۹۶

۱۲۔ چوں رفیقی وسوسۂ بدخواہ را کے بدانی ثم وجہ اللہ را (ش : ۱۳۹۸)

بہرایں فرمود با آں اسپہ او حیث ولّیتم فثم وجہہٗ (د ۶ ش : ۳۶۴۲)

قرآن : فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللہِ ۲ : ۱۱۵

۱۳۔ نوح را گفتند امت کو ثواب گفت او ز آں سوی واستغشوا ثیاب (ش : ۱۴۰۴)

قرآن : وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَھُمْ ۷۱ : ۷

۱۴۔ اُدخلوا الابیات مِن ابوابہا واطلبوا الاغراض فی اسبابہا (ش : ۱۴۲۸)

اُطلبوا الارزاق فی اسبابہا اُدخلوا الاوطان مِن ابوابہا (د ۳ ش ۱۴۲۶)

گوھمی جوید دُر بے بہا اُدخلوا الابیات مِن ابوابہا (د ۳ ش : ۳۳۲۷)

قرآن : وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا ۲ : ۱۸۹

فرق ظاہر ہے۔

۱۵- آیتِ النسوکمُ ذکری بخوں — قدرت فسبانِ نہاو نشاں بداں — (ش ۱۶۴۲،)
خِلتم سخریۃً اہلَ السّمو — ازنبی برخواں متا انسوکم — (ش ۱۶۷۷،)
قرآن : فَاتَّخَذتُمُوهُم سِخرِيًّا حَتّى اَنسَوكُم ذِكرِى وَكُنتُم مِّنهُم
تَضحَكُونَ - (۲۳:۱۱۰)
فرق واضح ہے۔ کُم تُم کوت اکے مطابق کُمُ اور تُمُ باندھا گیا ہے۔

۱۶- ہمراہ ایں فرمود رحمان اے پسر — کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فی شان لے پسر — (ش ۱۸۲۱،)
کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فی شانٍ بخواں — مرد را بے کار و بے شغل مداں — (ش ۳۰۷۱،)
قرآن : کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فی شانٍ (۵۵ : ۲۹)
ھُوَ کا ھ ـ ھُو (مت ۵)
پہلے شعر میں تنوینِ ن غائب (رت ۲)

۱۷- معشر الجن سورۂ رحمان بخواں — تستطیعوا تنفذوا را بازواں — (ش ۱۹۲۴)
ورنبی اِن استطعتم تنفذوا — ایں سخن با جنس و انس آمد ز ہو — (دو ۶ ش ۴۵۱۳)
قرآن : یٰمَعشَرَ الجِنِّ وَالاِنسِ اِنِ استَطَعتُم اَن تَنفُذُوا مِن اَقطَارِ السَّمٰوٰتِ
وَالاَرضِ فَانفُذُوا (۵۵:۳۳)
اختلاف متن عیاں ہے۔

۱۸- خود زہیم ایں دم بے منتہٰی — باز خواں فابین ان یحملنہا — (ش ۱۹۵۸،)
قرآن : فَاَبَینَ اَن یَّحمِلنَهَا (۳۳: ۷۲)
فَاَبَینَ بروزن نِعِلاتن کو ماہینُ کی طرح فا بین بروزن مفعول باندھا گیا ہے۔

۱۹ نابداں الّا کہ برخاصاں پدید — باتیاں فی لَبسٍ مِن خلقٍ جدید — (ش ۲۰۳۲)
قرآن : بَل ھُم فی لَبسٍ مِن خَلقٍ جَدِیدٍ ۵۰ : ۱۵
لَبسٍ کی تنوین غائب (رت ۲)

۲۰- ہمراہ ایں مومن ہمی گوید ز بیم — در نماز اھد صراط المستقیم — (ش ۲۲۳۴،)
قرآن : اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ ۱:۵
اِھدِنَا کو اِھد اور الصّراط کا ال اُڑا کر مرکب توصیفی کو مرکب اضافی بنا دیا گیا۔ حالانکہ اسے اُڑانے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ ص حرف شمسی کی وجہ سے یہ ویسے بھی تقطیع میں نہ آتا۔

۲۱ گفت اُدخل فی عبادی تلتقی — جنۃً مِن رؤیتی یا مُتقی — (ش ۲۶۵۶،)
اُدخلی توفی عبادی بافتی — ادخلی فی جنتی دریا فتی! — (دو۴ ش ۳۴۱۸)
قرآن: فَادخُلِی فِی عِبٰدِی وَادخُلِی جَنَّتِی ۸۹ : ۲۹، ۳۰
پہلے شعر میں تائے تانیث اڑا دی۔ دوسرے شعر میں تو اور فی کو درمیان میں گھسیڑ دیا۔

۲۲۔ راست خواں کیں خوانی مارا مبیں — کیف آسیٰ عَلٰی لِقَومٍ ظالمین (ش ۲۵۵۸)

قرآن : فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۷ : ۹۳

۲۳۔ اولیا پر بندد پردارش زخم — گفت غُضُّوا عَنْ هَوًا اَبصارکم (ش ۲۷۱۳)

امرِ غُضُّوا غُضَّةً ابصارکُم — ہم شنیدی راست ننہادی توسم (د۳ ش ۲۱۰۱)

قرآن : قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ ۲۴ : ۳۰

حدیث : اُصْدُقُوْا اِذَا حَدَّثْتُمْ وَاَوْفُوْا اِذَا وَعَدْتُمْ وَاَدُّوْا اِذَا اؤْتُمِنْتُمْ وَاحْفَظُوْا فُرُوْجَكُمْ وَغُضُّوْا اَبْصَارَكُمْ وَكُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ!

۲۴۔ ہم عرب ما ہم سبو ما ہم ملک — جملہ ما یُؤفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (ش ۲۹۰۲)

قرآن : يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ۵۱ : ۹

یُؤفَکُ کی تقطیع یفاک ہے فَ = فا (ت ۷)

اور پھر اُفِكَ کی مکسور فَ کو مفتوح باندھا گیا ہے۔ اگر ملك کو مَلَك پڑھا جائے (مِلك پڑھا جائے تو پھر ٹھیک ہے۔

۲۵۔ با ہوا و آرزو کم باش دوست — چو یُضِلُّكَ عن سبیل اللّٰہ اوست (ش ۲۹۵۷)

قرآن : فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۳۸ : ۲۶

كَ = كے (ت ۶) ہِ = ہ

۲۶۔ دست او را حق چو دست خویش خواند — تا یدُ اللّٰہ فوقَ ایدیهم براند (ش ۲۹۷۲)

چوں یدُ اللّٰہ فوقَ ایدیهم بود — دست ما را دست خود فرمود احد (د۲ ش ۱۹۱۸)

قرآن : يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۴۸ : ۱۰

اَللّٰہِ کی ہِ ساکن متعدد اور مقامات کی طرح (ت ۲)

۲۷۔ گفت حق در آفتابِ منتجم — ذکر تزاور کذیٰ عَنْ كَهْفِهِمْ (ش ۳۰۰۶)

قرآن : وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ۱۸ : ۱۷

تَزَاوَرُ کو تَزَاوُر باندھا گیا ہے۔ کذیٰ زائد

۲۸۔ ظانین باللّٰہ ظَنَّ السَّوءِ را — چوں منافق سر بینداز جدا (ش ۳۰۳۸)

قرآن : اَلظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۴۸ : ۶

اَلظَّا کا ال غائب۔ ظانّینَ بروزن فاعلاتن کو فاعلن کے وزن پر باندھا گیا ہے۔

یعنی دوسرے نون اعرابی کو غُنّہ کر دیا گیا ہے۔

۲۹۔ کُلُّ شَیْءٍ هالِكٌ جز وجہِ او — چوں نہ در وجہِ او ہستی مجو (ش ۳۰۵۳)

پیش بے حد ہر چہ محدود است لاست — کُلُّ شَیْءٍ غیرِ وجہ اللّٰہ فناست (د۲ ش ۳۳۲۱)

عقل کے ماند چو باشد سردہ او — کُلُّ شَیْءٍ هالِكٌ اِلّا وجہہ (د۲ ش ۳۶۶۲)

قرآن : كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۲۸ : ۸۸

۳۰- جئتمونا فرادیٰ بے ژا — ہم بداں ساں کہ خلقناکم کذا! (ش ۳۱۷۳)

قرآن : وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۶ : ۹۴

مصرع کی واو قرآن میں نہیں۔ مزید اس کو بے وزن باندھا گیا ہے (ت)

۳۱- شو قلیل النوم مما یہجعون — باش در اسحار از یستغفرون (ش ۳۱۷۹)

قرآن : كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ - ۵۱ : ۱۷

۳۲- انک ارض اللہ واسع گفتہ اند — عرصۂ دال کاولیا در رفتہ اند (ش ۳۱۹۲)

قرآن : قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً ۴ : ۹۷

واسعۃً کی تائے تانیث کو حذف کرکے ارض کو مذکر بنا دیا۔

۳۳ گفت اغلالاً فہم بہ مقمحون — نیست آں اغلال بر ما از برون! (ش ۳۲۴۲)

خلفہم سداً فاغشینا ھُم — پیش و پس سد را نمی بیند عُو (ش ۳۲۴۳)

بین ایدی خلفہم سداً مباش — کہ نبینی خصم را وآں خصم فاش (د ۵ ش ۵۱)

قرآن : اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ - (۳۶: ۸، ۹)

اختلاف واضح ہے۔

۳۴- یوم دین کہ زلزلت زلزالھا — ایں زمیں باشد گواہ حالہا (ش ۳۲۷۶)

کو تحدث جہرۃً اخبارھا — در سخن آید زمین و خارہا (ش ۳۲۷۷)

کو تحدث حالھا واخبارھا — تظہر الارض لنا اسرارھا (د ۴ ش ۲۴۲۲)

تو بکن مردانہ سر آور برہ — کہ فمن یعمل بمثقال یرہ (د ۶ ش ۲۳۱)

قرآن : اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ...... يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ..... فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ - ۹۹،

۳۵- پس چو عز تند بلند سند لے نادرہ زادرہ — چوں شدی تو حمر مستنفرہ (ش ۳۳۱۴)

قرآن : كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۷۴ : ۵۰

حُ = حو (مت ۷)

۳۶- فاتقوا النار التی اوقدتموا — اشکوا فی المعصیۃ ازدتموا (ش ۳۳۸۹)

قرآن :- فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۲ : ۲۴

المعصیۃِ کی تائے مجرور مجزوم = =

۳۷ تعرج الروح الیہ والملک — من عروج الروح یہتز الفلک (ش ۳۴۲۰)

قرآن : تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ۷۰ : ۴

۳۸ گفت ایزد یحمل اسفارہُ — بار باشد علم کاں نبود ز ھُو (ش ۳۴۴۸)

قرآن : کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا - ۶۲ : ۵)

گفت ایزد کو کر بھی گفتۂ ایزد کو بدل دیا۔

۳۹- روز زادن روم و زنگ و ہر گروہ یوم تبیض و تسود وجوہ (ش ۳۵۱۱)

یوم تبیض و تسود وجوہ ترک و ہندو راز کے ماندہ شکوہ (ش ۳۵۲۲)

قرآن : یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۳ : ۱۰۶

۴۰- یوم تبلی السرائر کتہا بان منکم کامن لا یشتہی (ش : ۳۵۹۶)

قرآن : یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۸۶ : ۹

تُبْلَیٰ بروزن فعلن کو تُبْلَیٰ بروزن مفعولن تسود کی د کو ساکن اور یشتھی کو یشتھی باندھا گیا ہے۔

۴۱- گر کشایم روزنش چون روز صور چون بگرییم ھل تری فیہا فطور؟ (ش ۳۶۲۹)

یک نظرت نیع مشو زیں سقف نور بارہا بنگر بہ مبیں ھل من فطور ؟ (د ۲ ش، ۲۹۴)

قرآن : فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ؟ ۶۷ : ۳

پہلے شعر میں مِن کی جگہ فیہا اور دوسرے میں تری غائب

۴۲- ماہ می گرید نجاک در ابروی من بشر من مثلکم یوحیٰ الی (ش ۳۶۵۹)

تا بظاہر مثلکم باشد بشر با دلِ یُوحیٰ الیہ دمیدہ ور (د ۲ ش ۳۰۷۷)

قرآن : قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (۱۸ : ۳)

۴۳- تخت دل معمور شد پاک از ہوا بروئے الرحمن علی العرش استوی (ش ۳۶۶۵)

قرآن : اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۲۰ : ۵

الرَّحمٰنُ = الرَّحمان

۴۴- نار شہوت را چہ چارہ نور دیں نورکم اِطفاءَ نار الکافرین (ش ۳۷۰۰)

کلما اوقدوا نارا لوغی اَطفاءَ اللہ نارھم حتی انطفا (د ۶ ش ۳۵۴۳)

قرآن : كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۵ : ۶۴

حدیث : اِنَّ الْمُومِنَ اِذَا وَضَعَ قَدَمَہٗ عَلَی الصِّرَاطِ یَقُولُ النَّارُ (تَقُوْلُ النَّارُ لِلْمُومِنِ) جُزْ یا مومن۔ فَاِنَّ (فَقَدْ) نُوْرُكَ اَطْفَا نَارِي (لَهَبِي)

۴۵- باز باش اے باب رحمت تا ابد بارگاہ مالہ کفوًا احد (ش ۳۷۶۵)

رو کزیں جو برنیائی تا ابد! لم یکن حقا لہ کفوًا احد (د ۶ ش ۶۲۶)

قرآن : وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۱۱۲ : ۴

کُفُوًا بروزن فعِلن (زحافِ صغریٰ) کو کُفْوًا بروزن فَعْلن باندھا گیا ہے (تسکین اوسط)

۴۶- ما ننسخ آیۃ ننسہا نأت خیرا در عقب می دان مہا (ش ۳۸۵۹)

قرآن : مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (۲ : ۱۰۶)

مِنْ حذف کرکے آسِنٍ کو آسِنٌ کردیا۔

۴۷۔ چوں بریدہ گشت حلق رزق خوار ‌ ‌ یُرزقون فَرِحِین شد گوار (ش ۳۸۷۲)

قرآن: یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ ۳: ۱۶۹، ۱۷۰

فَرِح = فارِح (ت ۷)

۴۸۔ لاتُزِغْ قلبًا ھدیت بالکرم ‌ ‌ واصرف السوء الذی خطّ القلم (ش ۳۹۰۰)

قرآن: رَبَّنا لاتُزِغْ قُلُوْبَنا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا ۳: ۸

فرق واضح

۴۹۔ بشنواز اخبارِ آں صدرِ صدور ‌ ‌ لاصلوٰۃ تمّ الّا بالحضور (ش ۳۸)

حدیث: لاصلوٰۃ الّا بحضور القلب

: لایَنْظُرُ اللّٰہُ اِلٰی صلاۃ لا یُحْضِرُ الرَّجُلُ فِیْھَا قَلْبَہٗ مَعَ بَدَنِہٖ

۵۰۔ خواست تا او سجدہ آرد پیش بُت ‌ ‌ بانگ زد آں طفل کانّی لم امت (ش ۸۵)

کَانِّیْ = کَنِّیْ (ت ۲)

۵۱۔ رمز الکاسب حبیب اللہ شنو ‌ ‌ از توکل در سبب کاہل مشو (ش: ۹۱۴)

حدیث: اَلْکاسِبُ حبیبُ اللّٰہِ

بُ اور ہِ دونوں ساکن

۵۲۔ ماعیال حضرتیم و شیرخواہ ‌ ‌ گفت الخلقُ عیالٌ للالٰہ (ش ۹۲۷)

حدیث: اَلْخَلْقُ عِیالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیالِہٖ

——— اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ عِیالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّھُمْ اِلَی اللّٰہِ اَنْفَعُھُمْ لِعِیالِہٖ وَاَبْغَضُھُمْ اِلَی اللّٰہِ

اَذاھُمْ بِعِیالِہٖ۔

۵۳۔ گفت پیغمبر بہ تمیز کساں ‌ ‌ مرءٌ مخفیٌّ لدی طیِّ اللساں (ش ۱۲۶۰)

حدیث: تکلّموا تعرفوا فانّ المرءَ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ (آدمی ہے تہ زبان پنہاں)

(قَالَ الْاَحْنَفُ: حَتْفُ الرَّجُلِ مَخْبُوْءٌ تَحْتَ لِسَانِہٖ) (تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد — سعدی)

۵۴۔ قد رجعنا من جہاد الاصغریم ‌ ‌ با نبی اندر جہادِ اکبریم (ش ۱۳۸۷)

حدیث: قَدْ رَجَعْنَا (قَدِمْتُمْ) مِنَ الْجِھَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِھَادِ الْاَکْبَرِ ———

مُجَاھَدَۃُ الْعَبْدِ ھَوَاہُ فَقِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا الْجِھَادُ الْاَکْبَرُ؟ قَالَ جِھَادُ النَّفْسِ

: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ: اَفْضَلُ الْجِھَادِ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہُ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْہِ — اَلْمُجَاھِدُ

مَنْ جَاھَدَ ھَوَاہُ ——— اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَہٗ فِی اللّٰہِ

۵۵۔ در وجود تو شوم من منعدم ‌ ‌ چوں محبّم حُبّ یُعمی و یُصم (ش ۲۶۴۵)

حُبُّکَ الاشیاءَ یُعْمِیْ وَیُصِمّ ‌ ‌ نَفْسُکَ السوداءُ جنت لا تختصم (۲ ش ۲۷۲۳)

پس نبیند جدرا باطم ودم | حُبّكَ الاشياءَ يعمى ويُصِم | (د ۶ ش ۲۸۷۴)

حدیث: حُبُّكَ الشَّيءَ يُعمي وَيُصِمُّ | إنّ الهوىٰ شريكُ العمىٰ

: حُبُّكَ لِلشَّيءِ يُعمي وَيُصِمُّ

ـــــ حُبُّ الغِنَاءِ مِنَ النَّاسِ يُعمي وَ يُصِمُّ

: إيّاكُم وَالهوىٰ فَإنَّ الهوىٰ يُعمي وَ يُصِمُّ

۵۶ - شاوِروُا هُنَّ پس آنگہ خالِفوا | إنَّ مَن لم يَعصِهِنَّ تالفٌ | (ش ۲۹۵۷)

حدیث: شاوِرُوا هُنَّ ثُمَّ (وَ) خالِفُوا هُنَّ

(: مشورہ ان سے کرو لیکن کرو اس کے خلاف

: رائے تو اُن کی عمل لیکن کرو اس کے خلاف)

۵۷ - الشقی من شقی فی بطن الأمّ | مَن سمات الله يُعرف كُلّهم | (ش ۳۵۱۳)

حدیث: الشَّقِيُّ شَقِيٌّ (مَن شَقِيَ) فِي بَطنِ أُمِّهِ وَالسَّعِيدُ سَعِيدٌ (مَن سعد)
فِي بَطنِ أُمِّهِ (وَالسَّعِيدُ من اتّعظ بِغَيرِهِ -)

۵۸ - كُلُّ شيءٍ ما خلا الله باطِلُ | إنَّ فضل الله غيمٌ هاطِلُ | (ش ۳۹۲۳)

دید روئے جز تو شد غلّ گلو | كلُّ شيءٍ ماسوى الله باطِلُ | (د ۶ ش ۲۸۹۸)

ـــــ الا كُلُّ شيءٍ مَا خلا اللهَ باطلُ | وَكُلُّ نَعِيمٍ لا مَحالةَ زائِلُ

ـــــ لبید بن ربیعہ

مصرعِ اُولیٰ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ كَلِمَةُ لَبِيدٍ
(البخاری، مسلم، ابن ماجہ)

: أشعرُ كلمةٍ تكلّمت بِهَا العربُ كَلِمَةُ لَبِيد:

مصرع ثانی پر بروایت بعض کہا: إلّا نَعِيمَ الجَنَّةِ

۵۹ - لا يسع فينا نبي مُرسَلُ | والملك والروح أيضاً فاعقلوا | (ش ۳۹۵۳)

لی مع الله وقت بود آں دم مرا | لا يسع فيه نبيٌّ مُجتبىٰ | (د ۳ ش ۲۹۶۰)

حدیث: لِي مَعَ اللهِ وَقتٌ لا يَسَعُنِي فِيهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَلَا (او) نَبِيٌّ مُرسَلٌ -

دفتر دوم

۶۰ - خوب خوبی را کند جذب ایں بداں | طيّبات الطيّبين بروے بخواں | (ش ۲۷۲)

طیبات آمد برائے طیّبین | الخبیثین الخبیثا تست ہیں | (ش ۸۰)

بر دروغاں جمع می آید دروغ | الخبيثات الخبيثين زد فروغ | (ش ۳۶۳۹)

قرآن: اَلْخَبِيثَٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَٰتِ وَالطَّيِّبَٰتُ لِلطَّيِّبِينَ
وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَٰتِ (۲۴: ۲۶) فرق واضح ہے -

۶۱ - چوں کنی از خلد در دوزخ قرار　　غافل از لا یستوی اصحاب نار　　(ش ۳۳۲)

قرآن:- لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (۵۹: ۲۰)

لام تعریف غائب

۶۲ - کہ لو انزلنا کتابًا للجبل　　لانصدع ثم انقطع ثم ارتحل　　(ش ۵۹)

قرآن: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ - (۵۹ : ۲۱)

۶۳ - شرط من جاء بالحسن نہ کردن است　　این حسن را سوئے حضرت بردن است　　(ش ۹۴۴)

ہر یکے جاں را ستاند دہ بہا　　از نبی خواں عشرة امثالها　　(ش ۳۸۳۶)

قرآن: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا - ۶ : ۱۶۰

دوسرے شعر میں عَشْرُ عَشْرَةً ہو گیا۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع محل نظر ہے

۶۴ - ہمچو ابلیسے کہ می گفت اے سلام　　رب انظرنی الی یوم القیام　　(ش ۶۳۰)

گفت انظرنی الی یوم الجزا　　کاشکے گفتے کہ تبنا ربنا　　(د ۵ ش ۷۶۹)

قرآن: قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (۷ : ۱۴)

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۔ (۱۵ : ۳۶)

(۳۸ : ۷۹)

۶۵ - استعیذ الله من شیطانه　　قد هلکنا آه من طغیانه　　(ش ۶۳۷)

قرآن: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

۶۶ - ہیچ وازر وزر غیرے برنداشت　　ہیچ کس ندرود تا چیزے نکاشت　　(ش ۷۳۱)

قرآن: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى　　۱۷ : ۱۵

۳۵ : ۱۸

۳۹ : ۷

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى　　۵۳ : ۳۸

۶۷ - گفت صحاً لک نعیمٌ دایمٌ　　بس لطیفی و ظریف و خوب رو　　(ش ۱۰۰۶)

لَکَ = لک　　دایمٌ = دایمُ

۶۸ - رشتہ زر دوپائے سست و دل شبک　　کو غذائے والسما ذات الحبک　　(ش ۱۰۸۵)

قرآن: وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ　۵۱ : ۷

ء حذف (ت ۲)

۶۹ - زخم کرد این گرگ وز عذر لبق　　آمده کانا ذهبنا نستبق　　(ش ۱۴۱۰)

قرآن: رَبَّنَا اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ ۱۲: ۱۷ — اِنَّا سے پہلے ک زاید
اور کَاِنَّا = کُنَّا (مت ۲)

۷۰- بسر نقصان بدن آمد فرج — در نبی کہ ما علی الاعمیٰ حرج (ش ۴/ ۱۵)
گفت یزداں ما علی الاعمیٰ حرج — کے نہد بر کس حرج رب الفرج (د ۵ ش ۲۹۷۰)
قرآن: لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ ۲۴: ۶۱
لَیْسَ کی بجائے ما ۴۸: ۱۷

۷۱- برق را چو یخطف الابصار داں — نور باقی را ہمہ انصار داں (ش ۵/ ۱۵۴)
قرآن: یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۲: ۲۰
مصرع کا یخطف غالباً یخطفُ ہے۔ اَبْصَارَهُمْ کی جگہ اَلْاَبْصَار ہے۔

۷۲- السّما انشقّت آخر از چہ بود — از یکے چشمے کہ خاکی کشود (ش ۱۶۱۵)
قرآن: فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ (۵۵: ۳۷)

۷۳- حاکم است ویفعل اللہ ما یشا — او زعین درد انگیزد دوا (ش ۱۶۱۹)
قرآن: کَذٰلِکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (۳: ۴۰)

۷۴- گفت والیس رفتہ ام من در ذہاب — حسرتا یا لیتنی کنت تراب (ش ۱۸۰۷)
بافراغت کافراں زانیست تاب — می گو یا لیتنی کنت تراب (د ۲ ش ۴۰۸)
قرآن: وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا ۷۸: ۴۰
تُ = ب دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں اسم جمع اور دوسرے میں ضمیر واحد متکلم؟

۷۵- در گوں سازی سرت سوئے زمیں — آفل حق لا یحب الآفلین (ش ۱۸۱۵)
قرآن: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۶: ۷۶
اُحِبُّ کی جگہ یُحِبُّ

۷۶- حکم خذها لا تخف دادت خدا — تا بدستت اژدہا گردد عصا (ش ۴/ ۲۲۸)
قرآن: قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۲۰: ۲۱
واو عطف غائب

۷۷- اٰتنا فی دار دنیا ما حسن — اٰتنا فی دار عقبانا حسن (ن ۲۵۵۲)
قرآن: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ۲: ۲۰۱

۷۸- گر تو بر تمیز طفلت مولعی — ایں زماں یا ام موسیٰ ارضعی (ش ۲۹۷۱)
قرآن: وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۲۸: ۷

۷۹- نیہ آیاتٌ بقاتٌ بیّنات — ایں براقی باشد و قدر نجات (ش ۲۹۸۴)
قرآن: فِیْهِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ ۳: ۹۷ — بُقاتٌ اضافہ شاعر

٨٠- چون ملائک گو کہ لا علم لنا   یا الٰہی غیر ما علّمتنا   (ر ش ٣١٧٥)
قرآن : لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا   ٢ : ٣٢

٨١- گفت یوسف ابن یعقوب نبی   بہر لو اَلقُوا علی وجہِ ابی   (ر ش ٣٢٣٤)
قرآن : اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هٰذَا فَاَلْقُوهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِي   ١٢ : ٩٣
ضمیرِ غائب

٨٢- آدم انبئهم باسما درس گو   شرح کن اسرار حق را مو بمو   (ر ش ٣٢٦٩)
قرآن : قَالَ يَا آدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاَسْمَائِهِمْ   ٢ : ٣٣
یا آدم = آدم
باسمائِهم = باسما۔

٨٣- اول و آخر نشانش کس نداد   گفت لو کان لہ البحر مداد   (ر ش ٣٥٤٣)
قرآن : قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمٰتِ رَبِّي   ١٨ : ١٠٩

٨٤- آن غریب از ذوق آواز غریب   از زبان حق شنود انی قریب   (ر ش ٣٦٠١)
قرآن : وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَاِنِّي قَرِيبٌ   ٢ : ١٨٦

٨٥- وزدم المومنون اخوة بپند   در شکستند و تن واحد شدند   (ر ش ٣٧١٢)
قرآن : اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ   ٤٩ : ١٠
ن = نَ   ةٌ = ہ

٨٦- گرچہ دوری دور می جنبان تو دم   حیث ما کنتم فولوا وجهکم   (ر ش ٣٣٥٤)
حیث ما کنتم فولوا وجهکم   نحوه هذا الذی لم ینهکم   (ر ش ٣٧٤٥)
قرآن : وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ   ٢ : ١٤٤، ١٥٠

٨٧- او جمیل است و محبّ للجمال   کے جوان نو گزیند پیر زال   (ر ش ٧٩)

او جمال است و یحبّ للجمال
حدیث : اَللّٰهُ جَمِيلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ
اِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ
اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ وَيُحِبُّ اَنْ يَرٰى اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰى عَبْدِهٖ
اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَنْعَمَ عَلٰى عَبْدٍ اَحَبَّ اَنْ يَرٰى عَلَيْهِ
وَيُبْغِضُ الْبُؤْسَ وَالتَّبَاؤُسَ
اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اِذَا اَنْعَمَ عَلٰى عَبْدٍ نِعْمَةً يُحِبُّ اَنْ يَرٰى اَثَرَ النِّعْمَةِ عَلَيْهِ
وَيَكْرَهُ الْبُؤْسَ وَالتَّبَاؤُسَ وَيُبْغِضُ السَّائِلَ الْمُلْحِفَ وَيُحِبُّ الْحَيِيَّ الْعَفِيفَ الْمُتَعَفِّفَ

٨٨- آدمی خوارند اغلب مردمان   از سلام علیک شان کم جو امان (ر ش ٢٥١) علیک بروزن لیک

۸۹ - کُنتُ کَنزاً رحمۃ مخفیۃً ناگہ بعثت اُمَّۃ مُھدیۃ (ش ۲۶۲)

حدیث قدسی : کُنْتُ کَنزاً مَخفیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الخَلقَ

: قَال داوٗد عَلَیہِ السَّلام : یارَبِّ لِمَاذا خَلَقْتَ الخَلْقَ ؛ قالَ : کُنْتُ کَنزاً مَخفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الخَلْقَ لِکَیْ اُعْرَفَ ۔

۹۰ - صوفیان تقصیر بودند و فقیر کادَ الفَقرُ اَن یجی کفراً بُیر (ش ۵۱۷)
یجئ کبیر

حدیث : کادَ الْفَقْرُ اَنْ یَکُوْنَ کُفْراً

۹۱ - صبر از ایمان بیابد سرکُلہ حیث لا صبر فلا ایمان لہ (ش ۶۰۰)

حدیث : مَنْ لاصَبْرَ لَہٗ لا ایمانَ لَہٗ

: وَعَلَیکُمْ بِالصَّبْرِ فَاِنَّ الصَّبْرَ مِنَ الْاِیْمانِ کالرَّاْسِ فِی الجَسَدِ وَلاخَیرَ فی جَسَدٍ لارأسَ مَعَہٗ وَلا فی ایمانٍ لاصَبْرَ مَعَہٗ ۔

۹۲ - حُفَّتِ الجَنّۃ بمکروہاتنا حُفَّتِ النیران من شھوتنا (ش ۱۸۳۷)

حدیث : حُفَّتِ (حُجِبَتِ) النَّارُ بِالشَّھَوٰتِ وَحُفَّتِ (حُجِبَتِ) الجَنَّۃُ بِالمَکارِہِ

شَھَو = شَھْو

۹۳ - چون ابوالحکم از محمد بُرد بو گفت ھذا لیس وجہٗ کاذبٗ (ش ۲۰۵۹)

مقولہ : لَیْسَ ھٰذا الوَجْہِ کاذِب (کہ نباید دروغ ازیں روئے)

۹۴ - بگذرد این صحبت از بصرہ و تبوک زانکہ النّاسُ علی دین الملوک (ش ۲۰۷۳)

حدیث : اَلنّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوکِھِمْ (مَا یَکُوْ)

۹۵ - یاد النّاسُ معادن ہیں بسیار معدنی باشد فزون از صد ہزار (ش ۲۰۷۸)

حدیث : النّاسُ معادِنُ کَمَعَادِنِ الذَّھَبِ وَالفِضَّۃِ

: تَجِدُوْنَ النّاسَ معادِنَ

اَلنّاسُ معادِنُ فِی الخَیْرِ وَالشَّرِّ

اَلنّاسُ معادِنُ وَالعِرْقُ دَسَّاسٌ وَاَدَبُ السُّوْءِ کَعِرْقِ السُّوْءِ

دَنٌ = دَنْ

۹۶ - عَجِّلُوا الطَّاعات قبل الفوت گفت مصطفیٰ چون دُرّ معنی می بسفت (ش ۲۶۱۳)

حدیث : عَجِّلُوا الصَّلوٰۃَ قَبْلَ الفَوْتِ وَعَجِّلُوا التَّوبَۃَ قَبْلَ المَوتِ

۹۷ - گفت است الکذب ریب فی القلوب گفت الصّدقُ طمانینٌ طروب (۲۷۳۴)

حدیث : دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلیٰ مالا یُرِیْبُکَ فَاِنَّ الصِّدْقَ طُمَأنِیْنَۃٌ وَاِنَّ
الکذبَ رِیْبَۃٌ (الاِرْتِیابُ مِنَ الشَّکِّ)

۹۸- حکمت قرآں چو ضالہ مومن است　　ہر کسے در ضالۂ خود موقن است　　(ش ۱۰ ۲۹)

حدیث : اَلْحِکْمَۃُ (کَلِمَۃُ الْحِکْمَۃِ) ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ حَیْثُ وَجَدَھَا اَخَذَھَا فَھُوَ اَحَقُّ

بھا۔　　: اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ یَاْخُذُھَا مِمَّنْ سَمِعَھَا وَلَا یُبَالِی فِی رِمْنِ اَیِّ وِعَآءٍ خَرَجَتْ۔

ضَالَّۃٌ کو ضالہ باندھا گیا ہے اور پھر حکمت قرآن ضالّۂ مومن نہیں۔ یہ تو اس کی دولت بیدار و حاضر

ہے۔ بلکہ ضالّہ کافر ہے جو اُسے پہچاننے اور ماننے سے انکار کرتا ہے۔

۹۹- لفظ در معنی ہمیشہ نارساں　　زاں پیمبر گفت قد کلّ لساں　　(ش ۳۰۱۳)

حدیث : مَنْ عَرَفَ (اللّٰہَ / نَفْسَہٗ) کَلَّ لِسَانُہٗ

را بر لبش قفل است و در دل رازہا　　لب خموش و دل پُر از آوازہا

عارفاں کز جام حق نوشیدہ اند　　رازہا دانستہ و پوشیدہ اند

ہر کرا اسرار کار آموختند　　مہر کردند و دہانش دوختند)

(د ش ۲۲۳۸، ۳۹، ۴۰)

۱۰۰- گفت پیغمبر کہ عینای تنام　　لا ینام قلبی عن رب الانام　　(ش ۳۵، ۴۹)

حدیث : عینایَ تَنَامَانِ وَلا یَنَامُ قلبی

: تنامُ عَیْنَایَ (عَیْنِی) وَلَا یَنَامُ قَلْبِی۔ : عینی تنام ولا… عن قول دودی

———— بنہ ھتیرمیہ

(غزل الغزلات)

: اِنَّا مَعْشَرَ الاَنْبِیَاءِ تَنَامُ اَعْیُنُنَا وَلَا تَنَامُ قُلُوبُنَا

اِنَّ عَیْنَیَّ نَائِمَۃٌ وَالْقَلْبُ یَقْظَانُ : یَا عَائِشَۃُ : اِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَلَا یَنَامُ قَلْبِی

: نائِمَۃ عیناہ ولا ینام قلبہ وکذلک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم

ع　اِنَّ عَیْنَیَّ تَنَامَانِ وَقَلْبِی لَا یَنَام

عَیْنَایَ

ع　آنکھیں مری سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتا　　ع　مری آنکھیں سوتی ہیں دل جاگتا ہے

نَبِیٌّ اِذَا مَا غَضَّ جَفْنًا لِنَوْمِہٖ　　تَیَقَّظَ قَلْبٌ لَیْسَ یَنْفَکُّ مِنْھُمَا

ع　آنکھیں ہیں محوِ خواب مگر دل ہے ہوشیار

دفتر سوم

۱۰۱- نعط من اعرض ھُنا عن ذکرنا　　عیشۃً ضنکًا ونحشر بالعمیٰ　　(ش ۳۵۴)

قرآن : وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِی فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی　۲۰ : ۱۲۴

ضَ ۔ ضَنْ　　باقی فرق بیّن

۱۰۲۔ پس بگفتند باعد بینشا شیئنا خیرنا خذ بیننا (ش ۳۶۸)

قرآن: رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا ۳۴: ۱۹

۱۰۳۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَہٗ کُلَّمَا نَالَ ھُدًی اَنْکَرَہٗ (ش ۳۷۳)

قرآن: قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَہٗ ۸۰: ۱۷

قُ = قُو ۔ تَ = فَا کَ = کا (مت ۷)

۱۰۴۔ نفس زیں سانست زاں شد کشتنی اقتلوا انفسکم گفت آں سنی (ش ۳۷۴)

قرآن: اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ۴: ۶۶

تُ = قُو (مت ۷)

۱۰۵۔ ہم ازاینجا کو دکانش در پسند نرتع و نلعب بشادی می زدند (ش ۴۱۶)

قرآن: اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا یَّرْتَعْ وَیَلْعَبْ ۱۲: ۱۲

صیغہ واحد غائب کو جمع متکلم بنا دیا اور رو کو د

۱۰۶۔ من رباح اللہ کو نو ارا بحین اِنَّ رَبِّیْ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْن (ش ۵۰۵)

قرآن: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ۲۸: ۷۶

مَ = نَا (مت ۷) اَللّٰہَ کی بجائے رَبِّیْ

۱۰۷۔ اصل تن راجملہ عَلَّمَ بالقلم واسطہ افراشت در بذلِ کرم (ش ۵۹۴)

قرآن: اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶: ۴)

مَ = مْ

۱۰۸۔ درچناں روئے خبیثِ عاصیہ گفت یزداں نسفعن بالناصیہ (ش ۶۰۳)

قرآن: لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَۃِ ۹۶: ۱۵

لَ غائب ۃِ = ہ

۱۰۹۔ گفت ایں دم با قیامت شد شبیہ تا براو رشد یفر من اخیہ (ش ۶۱۳)

قرآن: یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ۸۰: ۳۴

۱۱۰۔ اشکش گفتی جواب بے طنین کر آباد اللہ کید الکاذبین (ش ۷۳۶)

بازاز یادش رود توبہ وامین کاوھن الرحمٰن کید الکاذبین (د ۶ ش ۳۵۳)

قرآن: وَاَنَّ اللّٰہَ مُوْھِنُ کَیْدِ الْکٰفِرِیْنَ ۸: ۱۸

۱۱۱۔ گفت حق کی کثر مجنباں گوش و دم ینفعن الصادقین صدقہم (ش ۷۴۰)

قرآن: یَوْمَ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (۵: ۱۱۹)

یَنْفَعَنَّ کی جگہ یَنْفَعَنْ آئی ـــــ یَنْفَعَنْ کی ضرورت نہیں تھی یَنْفَعُ آ سکتا تھا۔

۱۱۲- گفت یزداں از ولادت تابعین   یُفْتَنُوْنَ کُلَّ عامٍ مرّتین   (ش ۵۰۲۰)

قرآن: اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْ مَرَّتَیْنِ ۹: ۱۲۶

فرق واضح

۱۱۳- عصمت یا نار کونی باردًا   لاتکون النار حرًّا شاردًا   (ش ۹۵۴)

قرآن: قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا ۲۱: ۶۹

بَرْدًا کی جگہ باردًا

۱۱۴- گوشۂ بے گوشۂ دل شہ رہ بیست   تاب لاشرقی ولا غربی از مہیست   (ش ۱۱۳۸)

قرآن: لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرْبِیَّۃٍ ۲۴: ۳۵

۱۱۵- بعد ازاں یمشی سویًّا مستقیم   نے علیٰ وجہٍ مکبًّا او سقیم   (ش ۱۵۱۵)

قرآن: اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْھِہٖ اَھْدٰی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

۱۱۶- دید بر پشتِ عیال بولہب   تنگ ہیزم گفت حمّالۃ حطب   ۶۷: ۲۲

(ش ۱۶۶۴)

قرآن: حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ۱۱۱: ۴

۱۱۷- یستوی الاعمیٰ لدیکم والبصیر   فی المقام والنزول والمسیر   (ش ۱۷۵۵)

قرآن: قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ۶: ۵۰

لَدَیکُم اضافۂ شاعر

۱۱۸- حتیٰ اذا ما استیأس الرُّسُل بگو   تا یظنّوا انّھم قد کُذِبوا   (ش ۲۰۳۳)

قرآن: حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا اَنَّھُمْ قَدْ کُذِبُوْا ۱۲: ۱۱۰

پہلے مصرع میں پہلے تو ما زائد ہے۔ دوسرے رُسُل کو رُسْل پڑھنا پڑے گا۔ دوسرے مصرع میں ظنّوا کی بجائے یظنّوا ہے۔ ک ۔ کو (مت ۷)

۱۱۹- گفت ان عدتم کذا عدنا کذا   نحن زوّجنا الفعال بالجزا   (ش ۲۸۶۷)

داد حق ماں از مکافات آگہی   گفت ان عدتم بہ عدنا مہ   (د۵ ش ۳۰۰۸)

قرآن: وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۔

فَسَأَلْنَا فَاَعْطَیْتُمْ وَعُدْنَا فَعُدْتُمْ   وَمَنْ اَکْثَرَ التَّسْاٰلَ یَوْمًا سَیُحْرَمِ

(—— زُہیر بن ابی سُلمیٰ)

۱۲۰- گفت لا تأسوا علیٰ مافاتکم   ان اتی السرحان وارْدی شاتکم   (ش ۳۲۶۳)

شاہ لاتأسوا علیٰ مافاتہٗ   کے شود از قدرتش مطلوب گم   (د۶ ش ۵۵۶)

قرآن: لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ ۵۷: ۲۳

لِکَیْ ندارد

۱۲۱۔ ز تو لا تلقوا بایدیکم الی　　تہلکہ خواندی ز پیغام خدا　　(ش ۳۴۲۲)

بعد ازاں گفتش بداں در مسلک　　نہی لا تلقوا بایدی تہلکہ　　(د۵ ش ۲۴۲۸)

قرآن : وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ　۲ : ۱۹۵

۱۲۲۔ اِبلعی یا ارضُ دَمعی قد کفیٰ　　اشربی یا نفس ورد اُقد صفا　　(ش ۳۸۰۲)

قرآن : وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ　۱۱ : ۴۴

۱۲۳۔ یا کِرامی اذبحوا ھذا البقر　　ان اردتم حشر ارواح النظر　　(ش ۳۹۰۱)

قرآن : أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً　۲ : ۶۷

۱۲۴۔ چوں تمنوا موت گفت اے صادقین　　صادقم جاں را برافشانم بریں　　(ش ۳۹۳۷)

قرآن : فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ　۲ : ۹۴

۱۲۵۔ گفت حق زاہل نفاق ناسدید　　باسُهُمْ مابَینَهُمْ باسٌ شدید　　(ش ۴۰۰۲)

قرآن : بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ　۵۹ : ۱۴

ما اور باسٌ کا اضافہ

۱۲۶۔ زانک زادُوکُم خبالا گفت حق　　کز رفاقِ سست برگرداں ورق　　(ش ۴۰۲۱)

قرآن : مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا　۹ : ۴۷

الفاظ بدل کر پھر بھی انھیں حق کی طرف منسوب کیا!

۱۲۷۔ ہمچو شیطاں در سپہ شد صد یکم　　خواند افسوں کہ انّی جارٌ لکم　　(ش ۴۰۳۶)

قرآن : وَإِنِّي جَارٌ لَكُمْ　۸ : ۴۸

مصرع میں اِنّی کی جگہ اِنّنِی ہے۔ (یہ قرآیت کا معاملہ ہے۔ ویسے اِنّی کو اِنّنی اور اِنَّا کو اِنّنا بھی پڑھتے لکھتے ہیں۔)

۱۲۸۔ بر فلک پرہاست زاشجار وفا　　اَصلها ثابت و فرعُہ فی السّما　　(ش ۴۳۸۸)

شد درخت کژ مقوّم حق نما　　اصله ثابت و فرعه فی السّما　　(د۴ ش ۳۵۷۴)

قرآن : كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ　۱۴ : ۲۴

پہلے شعر میں اختلاف ضمائر یعنی پہلے ھا پھر ہ ۔ ـــــ شتر گربہ

دوسرے مصرع میں دونوں جگہ ھا کی جگہ ہ

ثابتٌ = ثابت　　فرعُهُ = فرعہ

۱۲۹۔ اِئتیا کرھًا مھار عاقلاں　　اِئتیا طوعًا بہار بے دلاں　　(ش ۴۴۷۲)

اِئتیا کرھًا مقلد گشتہ را　　اِئتیا طوعًا صفا بسرشتہ را　　(ش ۴۵۹۰)

قرآن : فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا　۴۱ : ۱۱

۱۳۰۔ قصۂ عہد حدیبیہ بخواں　　کفّ ایدیکم تمامست زاں بداں　　(ش ۴۵۷۵)

قرآن : كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ　۴۸ : ۲۴

۱۳۱- ورنہ قادر بود کہ کُن فیکُون   صد زمین و چرخ آوردے بروں

قرآن : کُنْ فَيَكُونُ   ۲ : ۱۱۷

۴۰ : ۱۱۶

۳۵ : ۱۹

۸۲ : ۳۶

۶۸ : ۴۰

ت ۔ فا (ت ۷)

۱۳۲- گفت حقست ایں ولے اے سیبویہ   اِتَّقِ مِن شَرِّ من اَحْسَنْتَ اِلَيه   (ش ۲۶۳)

حدیث : اِتَّقِ شَرَّ مَنْ اَحْسَنْتَ اِلَيْهِ   (جس پر احسان کرو اُس کے شر سے ڈرو!)

(ھٰذا قريبٌ مِنْ قولِهِمْ : سَمِّنْ كَلْبَكَ يا كُلُكَ)

۱۳۳- شادمانہ سُوئے صحرا راندند   سافِروا کی تَغْنَمُو خواندند   (ش ۵۳۳)

حدیث : سافِروا تَصِحُّوا وَتَغْنَمُوا!

۱۳۴- چونک پایانی ندارد رو الیک   زانك لا احصی ثناء ماعلیك   (ش ۱۹۹۶)

لاتُكَلِّفنی فانّی فی الفنا   كلّت انهامی فلا اُحصی ثنا   (دا ش ۱۲۸)

حدیث : اَللّٰهُمَّ اِنّی اَعُوذُ بِرِضاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَاَعُوذُ بِمُعافاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ وَاَعُوذُ بِكَ مِنْكَ لااُحْصی ثناءً عليكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰی نَفْسِكَ ۔

۱۳۵- گفت پیغمبر سپہدار غیوب   لاشجاعة یافتیٰ قبل الحروب   (ش ۴۰۰۴)

حدیث : لاشُجاعَةَ قَبْلَ الْحَرْبِ

: لاتُعْرَفُ ثلاثَةٌ اِلّا عِنْدَ ثلاثَةٍ اَلْحَلِيمُ عِنْدَ الْغَضَبِ وَالشُّجَاعُ عِنْدَ الْحَرْبِ وَالْاَخُ عِنْدَ الْحاجَةِ ۔

۱۳۶- در خبر بشنو تو ایں پند نکو   بین جَنْبیكم لكم اَعْدیٰ عدو   (ش ۴۰۶۶)

حدیث : اَعْدیٰ عَدُوِّكَ (لكَ) نَفْسُكَ الَّتی بَيْنَ جَنْبَيْكَ ۔

۱۳۷- گفت پیغمبر کہ انّ فی البیان   سِحْراً وحق گفت آں خوش پہلواں   (ش ۴۰۷۹)

حدیث : اِنَّ مِنَ الْبَيانِ لَسِحْرًا (سِحْرًا ۔۔۔ اِنَّ بَعْضَ الْبَيانِ سِحْرًا) وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً (لَحِكَمًا، حِكْمَةً ۔ حِكَمًا) وَاِنَّ مِنَ الْقَوْلِ عِيًّا (عِيالاً) وَاِنَّ مِنْ طَلَبِ الْعِلْمِ جَهْلًا ۔

دفتر چہارم

۱۳۸- گر ز قرآں نقل خواہی اے حرون   خواں جمیع ھم لدینا محضرون   (ش ۳۳۴)

جمع و پای علم ماوی القرون   ہست حق کُلٌّ لدینا محضرون   (د۶ ش ۳۳۳۱)

قرآن : وَاِنْ کُلٌّ لَّمَّا جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ ۳۶ : ۳۲

۱۳۹- یَوْمَ لَا یُخْزِی النَّبِیَّ راست داں — نور یسعیٰ بین ایدیہم بخواں (ش ۶۱۱)

قرآن : یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ ۵۷ : ۱۲

۱۴۰- پس بگو بیدش بیا ایجبا تمام — زود کہ اِنَّ اللّٰہ یدعو بالسلام (ش ۷۲۳)

قرآن : واللّٰہُ یدعُو الیٰ دار السّلٰم ۱۰ : ۲۵

یا تو مصرع ثانی میں کہ زائد ہے یا پھر کہ اِنَّ کو کِنَّ پڑھنا پڑے گا۔ کہ فارسی کو کہ عربی بنانے کا کوئی جواز نہیں۔ اختلاف الفاظ اس پر مستزاد۔

۱۴۱- می کشد شاں سوئے نیک و سوئے بد — گفت حق فی جیدھا حبل المسد (ش ۱۱۱۹)

ان ھمزفی جید ناحبل مسد — روز مردن نیست زاں فنھا مدد (د ۶ ش ۲۹۱۲)

قرآن : فِیْ جِیْدِھَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۱۱۱ : ۵

۱۴۲- لَیْسَ مِنْ مُّسْتَعْصَدٍ مُّسْتَنْقِہٖ — نُطُّ اِلّا طائرہٗ فی عنقہٖ (ش ۱۱۲۱)

قرآن : وَکُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰہُ طٰٓئِرَہٗ فِیْ عُنُقِہٖ ۱۷ : ۱۳

ہٗ = ہٗ عُنُقِہٖ = عُنْقِہٖ

۱۴۳- ہر نبی زو بر آوردہ برات — استعینوا منہ صبراً اَوْ صلاۃ (ش ۱۱۸۱)

قرآن : وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ۲ : ۴۵

۱۴۴- گفت مستانہ عیاں آں ذوفنون — لا الٰہ الّا انا ھا فاعبدون (ش ۲۱۰۳)

قرآن : لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۲۱ : ۲۵

ھا اضافۂ شاعر اِلٰہَ = اِلٰہْ

۱۴۵- او ہمی جوشید از نفث سعیر — عقل می گفتش الم یأتک نذیر؟ (ش ۲۲۸۲)

قرآن : اَلَمْ یَاْتِکُمْ نَذِیْرٌ ۶۷ : ۸

کُمْ کو کَ سے بدل کر جمع حاضر کو واحد حاضر کر دیا۔

۱۴۶- ہست ایں ایّاکَ نعبدُ حصر را — در لغت واں از پئے نفی ریا (ش ۲۹۳۰)

ہست ایّاک نستعیں ہم بہر حصر — حصر کردہ استعانت را و قصر (ش ۲۹۳۱)

قرآن : اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۱ : ۴

پہلے شعر میں نَعْبُدُ = نَعْبُدْ

دوسرے مصرع میں اِیّاکَ کو اِیَّکْ پڑھنا پڑے گا اور نستعینُ کو نَسْتَعِیْن

۱۴۷- فارسی اندر نفوسٌ زُوِّجت — کای شہ مسعود ایںک مخرجت (ش ۳۲۰۶)

قرآن : وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۸۱ : ۷

النُّفُوْسُ = نُفُوْسٌ

۱۴۸- خفتہ می بیند عطشہائے شدید — اب اقرب منہ من حبل الورید (ش ۳۲۴۱)

قرآن : وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۵۰ : ۱۶

۱۴۹- مرغ مضطر مردہ اندر وصل و بین — خواندہ القلب بین اصبعین (ش ۱۰۵۶)

گرحق سرچشمۂ این کر است — قلب بین اصبعین کبریاست (د۶ ش ۳۵۱۶)

حدیث : قَلْبُ الْمومِنِ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهٗ كَيْفَ يَشَاءُ

: قَلْبُ الْمومِنِ بَيْنَ الْاِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ اِنْ شَاءَ لَاَثْبَتَهٗ وَاِنْ شَاءَ لَاَزَاغَهٗ -

: اِنَّ قُلُوْبَ بَنِى اٰدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصَرِّفُهٗ حَيْثُ يَشَاءُ -

۱۵۰- اکثر اهل الجنّة البلہ اے پدر — بہر این گفت است سلطان البشر (ش ۱۴۲۰)

حدیث : اَكْثَرُ اَهْلِ الْجَنَّةِ بُلْهٌ (اَلْبُلْهُ) اِنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ

: دَخَلْتُ الْجَنَّةَ فَاِذَا اَكْثَرُ اَهْلِهَا الْبُلْهُ

(البله سلامة القلب وقلّت الفطنةِ فی اُمور الدّنیا)

اَكْثَرُ - اَكْثَرَ - ۃ ـ ہ

دفتر پنجم

۱۵۱- تا تو بستیزی ستیزہ اے حرون — فانتظرهم انهم منتظرون (ش ۲۶۱)

قرآن : وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُنْتَظِرُوْنَ ۳۲ : ۳۰

ھُمْ زائد اور ت = تا (ت ۷)

۱۵۲- جز طلب آسیب او اے ذوفنون — لایمسّ ذالک الّا المطهرون (ش ۳۷۹)

قرآن : لَا يَمَسُّهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۵۶ : ۷۹

مُطَهَّرُوْنَ کو مُطْهَرُوْنَ باندھا گیا ہے۔ يَمَسُّهٗ کی جگہ يَمَسُّ ذاک ہے۔

۱۵۳- وَهُوَ يطعمكم ولا يطعم چراست — نیست حق ماکول و آکل لحم و پوست (ش ۷۲۹)

قرآن : وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۶ : ۱۴

۱۵۴- خوش کند دلشان کہ اصلح بالهم — ردّ من بعد التوی انزالهم (ش ۱۰۰۵)

اُمّة الكفران اَضَلَّ اعمالهم — اُمّة الایمان اصلح بالهم (د۵ ش ۹۹۷)

قرآن : اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۴۷ : ۱، ۲

اَصْلَحَ - اَصْلَحْ — اَضَلَّ - اَضَلْ

۱۵۵- از دعائے حق تو بستہ دیدۂ — اذکروا اذکرکم نشنیدۂ (ش ۱۱۸۲)

قرآن: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ۲: ۱۵۲

فَاذْكُرُوْنِيْ = اذكروا كُمْ = كُمْ

۱۵۶- گوش تہ اُوفوا بعہدی گوش دار — تاکہ اُوفِ عہدکم آید زیار (ش ۱۱۸۳)

قرآن: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۲: ۴۰

دوسرے مصرع میں بِ غائب

۱۵۷- چونکہ اوحی الرب الی النحل آمدست — خانۂ وحیش پر از حلوا شد است (ش ۱۲۳۹)

قرآن: وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ ۱۶: ۶۸

رَبُّكَ = اَلرَّبُّ

۱۵۸- تو بمانی با فغان اندر لحد — لا تذرنی فرد خواہی از احد (ش ۱۵۲۴)

قرآن: رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا ۲۱: ۸۹

فَرْدًا = فَرْد

۱۵۹- وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰه است امر — تا نباید غصب کردن ہمچو نمر (ش ۳۳۸۴)

قرآن: اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۲: ۱۹۸

لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۱۷: ۱۲

لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۱۶: ۱۴

۱۷: ۶۶

۱۶۰- لَيْسَ بِاَلِفٍ ليس يُولف جسمه — ليسَ اِلّا شُحّ لفس قسمه (ش ۳۴۳۵)

قرآن: وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۴: ۱۲۸

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ ۵۹: ۹

۶۴: ۱۶

حدیث: اَلْمُؤْمِنُ مَاْلِفٌ يالفُ وَيُؤْلَفُ بِهٖ وَالْمُنَافِقُ (وَلَا خَيْرَ فِيْمَنْ) لا يالفُ ولا يُؤْلَفُ بِهٖ وَخَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔

۱۶۱- رَبِّ اَوْزِعْنِىْ لشكرِ ما أرىٰ — لا تعقّب حَسْرَةً لِي آن مَضىٰ (ش ۳۶۹۵)

قرآن: رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ ۲۷: ۱۹

۱۶۲- منتقلانِ خاک برحسب ماندند — سابقون السابقون دررا ندند (ش ۳۷۳۹)

قرآن: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۵۶: ۱۰

واو، لام تعریف حذف

۱۶۳- صدق جان دادن بود ہیں سابقوا — از نبی برخوان رِجالٌ صَدَقُوا ۳۳: ۲۳

قرآن: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا ۳۳: ۲۳

اگر صَدَ قُوا پڑھیں تو صَ = صادت ے) اور اگر صَدَّ قُوا پڑھیں جیسا کہ متن میں ہے تو اختلاف لفظ و معنی ظاہر و باہر

۱۶۴- ہر کرا فرج و گو آئین و خوست ان لکم دینٌ ولی دیں بہر اوست (ش ۴۰ ۳۹)
این ترا و آں ترا بردیم سود بی لکم دینٌ ولی دیں اے جہود (۶ ش ۱۰۵۲)
قرآن: لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۱۰۹ : ۶
دِیْنُکُمْ = دِیْنٌ دِیْنِ = دِیں

۱۶۵- لاتواخذ اِنْ نسینا شد گواہ کر بود نسیاں بوجہے ہم گناہ (ش ۲۱۰۱)
قرآن: لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۲ : ۲۸۶
نا غائب

۱۶۶- گفت المرءُ معَ محبوبہٖ لایفات القلبُ مِن مطلوبہٖ (ش ۴۷ے)
حدیث: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَلَهُ مَا اكْتَسَبَ
اَنْتَ (اِنَّکَ) مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلَکَ ما احْتَسَبْتَ (اکْتَسَبْتَ)

۱۶۷- علم ارنجات وسحر و فلسفہ گرچہ نشناسد حق المعرفہ (ش ۲۷۶۳)
حدیث: ما عَرَفْنَاهُ حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ

۱۶۸- باشد آنگہ از دوا جاتِ دگر لاسمیعَ اذن ولا عینٌ بصر (۳۴۲۹)
سَمِعَ عَ = عا (ت ے) اُذُنٌ = اُذُن دَ = و
عَیْنٌ = عَیْنُ = عَیْنو (ت ے)

دفتر ششم

۱۶۹- پس له الخلق وله الامرش بداں خلق صورت امر جاں راکب براں (ش ۷۸)
قرآن: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۷ : ۵۴

۱۷۰- منکرے ایں را کہ شمسٌ کوّرت شمس پیشش تست اعلیٰ مرتبت (ش ۹۷)
قرآن: اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۸۱ : ۱

۱۷۱- از ستارہ دید تعریفِ ہوا ناخوشت آید اذا النَّجْمُ ہویٰ (ش ۹۸)
قرآن: وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۵۳ : ۱

۱۷۲- معنیٔ نختم علیٰ افواہھم ایں شناس ایںست رہرو راہم (ش ۱۶۳)
قرآن: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ ۳۶ : ۶۵
نَخْتِمُ = نَخْتِمْ

۱۷۳- نے شنیدی اِنَّمَا الدُّنیا لعب باد دادی رخت وگشتی مرتعب (ش ۴۵۷)
قرآن: اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۴۷ : ۳۶

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ ۵۷ : ۲۰

اَلْحَیٰوۃُ حذف

۱۷۴- پس چرا شش روز آنرا در کشید کُل یومٍ الفُ عامٍ اے مستفید (ش ۱۲۱۴)

قرآن : وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۲۲ : ۴۷

۱۷۵- ایں چنیں رنجور را گفت اے عمو! حق تعالیٰ اعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ (ش ۱۳۲۶)

قرآن : اِعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ ۴۱ : ۴۰

تُمْ = تُمْ

۱۷۶- زانکہ مامنطق رسول بالهویٰ کے ہوا زاید ز معصوم خدا (ش ۱۶۰۳)

تاکہ ماینطق محمّد از هویٰ اَنْ هُوَ اِلَّا بوحیٍ احتویٰ (ش ۴۶۷۰)

قرآن ، وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۵۳ : ۳، ۴

۱۷۷- تاکہ یهلک من هلك عن بیّنه تاکہ یحیو من نجا واستیقنه (ش ۱۸۷۸)

قرآن ، لِّیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ ۸ : ۴۲

۱۷۸- اسجدوا لآدم ندا آمد ہمے کا دمید و خویشش بندش دمے (ش ۲۲۶۴)

قرآن : قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۲ : ۳۴ ۷ : ۱۱

۱۷ : ۶۱

۱۸ : ۵

لِاٰدَمَ کو لادم باندھا گیا ہے۔ ۲۰ : ۱۱۶

۱۷۹- بهر ایں آورد ماں یزداں بروں ماخلقت الانس اِلَّا یعبدوں (ش ۲۵۰۱)

قرآن : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۵۱ : ۵۶

۱۸۰- گفت حق سیماهم فی وجههم زانکہ غمّاز است سیما و منم (ش ۲۵۶۵)

قرآن : سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۴۸ : ۲۹

۱۸۱- اِنّ بعض الظن اثم است اے وزیر نیست اثم راست خاصه بر فقیر (ش ۲۵۶۹)

قرآن : اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ ۴۹ : ۱۲

مٌ = م

۱۸۲- تن مبیں و آں مکن کاں بکم صم کذّبوا بالحق لمّا جاءهم (ش ۳۱۹۶)

قرآن : صُمٌّ بُكْمٌ ۲ : ۱۸

۲ : ۱۷۱

كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۶ : ۵

مصرع میں بُکم صم

۱۸۳ ہمچو آں اصحاب کہف اے خواجہ زود   رو بالیقاظاً کہ تحسبہم رقود   (ش ۲۲۶۴)

قرآن : وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ   ۱۸ : ۱۸

تَحْسَبُهُمْ ۔ تَحْسَبُهُمْ   دیگر اختلاف لفظی کے علاوہ

۱۸۴- پس پیمبر گفت استفتوا القلوب   گرچہ مفتی تاں بروں گوید خطوب   (ش ۳۸۰)

حدیث : اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ

۱۸۵- خیر ناس ان ینفع الناس اے پدر   گر نہ سنگی چہ حریفی با مدر   (ش ۲۸۲)

حدیث : خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاسَ

: خَيْرُ النَّاسِ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ

: خَيْرُ النَّاسِ مَنْ اِنْتَفَعَ بِهِ النَّاسُ   خَيْرُ النَّاسِ مَنْ فَرَحَ لِلنَّاسِ بِالْخَيْرِ ۔

۱۸۶- بہر ایں گفت آں رسول خوش پیام   رمز موتوا قبل موت یا کرام   (ش ۷۵۴)

گفت موتوا کلکم من قبل اَن   یاتی الموت تموتوا بالفتن   (د ۴ ش ۲۲۷۳)

حدیث : مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا

۱۸۷- گفت الصدقة مردٌ للبلاءْ (تردّ)   داو مرضاک بصدقة یا فتیٰ   (ش ۲۵۹۱)

حدیث : اَلصَّدَقَةُ   تَرُدُّ الْبَلَاءَ   صَدَّ ۔ صَدْ

ال ۔ لِلْ

(القول فی صدقہ رد بلا ہے)

اَلصَّدَقَةُ تَمْنَعُ سَبْعِيْنَ نَوْعًا مِنْ اَنْوَاعِ الْبَلَاءِ ۔ دَاوُوْا مَرْضَاكُمْ بِالصَّدَقَةِ فَاِنَّهَا تَدْفَعُ عَنْكُمُ الْاَمْرَاضَ وَالْاَعْرَاضَ ۔

۱۸۸- مَا نقص المال من الصدقات قط   اِنما الخیراتُ نعم المرتبط   (ش ۳۵۷۴)

حدیث : مانقصت صدقة من مالٍ (مسلم)

۱۸۹- اسلم الشیطان آنجا شد پدید   کہ یزیدی شد زفضلش بایزید   (ش ۳۶۴۹)

حدیث : مامِنْ اٰدَمِيٍّ اِلَّا وَمَعَهُ شَيْطَانٌ قِيْلَ وَمَعَكَ ، قَالَ نَعَمْ! وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِي عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ ۔

: اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنْ اَحَدِكُمْ مَجْرَى الدَّمِ قُلْنَا : وَمِنْكَ ؟ قَالَ وَمِنِّيْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِيْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ   (احیاء علوم الدین ج ۲)

ع اپنے شیطاں کو محمد نے مسلماں کر لیا ۔

ع مرا شیطاں مسلماں ہے مگر آدمؑ کا کافر تھا ۔

۱۹۰- عکس آں اینجاست ذلّ من قنع   اندر ایں طور است عزّ من قنع   (ش ۹۵۲)

حدیث : عَزَّ مَنْ قَنِعَ وَذَلَّ مَنْ طَمِعَ

: وَالَّذِی نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَا یَنْقُصُ الْمَالُ مِنْ صَدَقَةٍ (ترمذی)

: اَلْعَفْوُ لَا یَزِیدُ الْعَبْدَ اِلَّا عِزًّا وَالتَّوَاضُعُ لَا یَزِیدُہٗ اِلَّا رِفْعَةً وَمَا نَقَصَ مَالٌ مِنْ صَدَقَةٍ۔

: اِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَزِیدُ الْمَالَ اِلَّا کَثْرَةً۔

مِنَ الصَّدَقَاتِ = مِنْ صَدَقَاتٍ

(مثنوی کا جو نسخہ پیشِ نظر ہے وہ انتشارات امیر کبیر تہران کا دی ماہ ۱۳۴۱ کا چاپ شدہ ہے۔ از روئے نسخۂ طبع ۱۹۲۵-۱۹۳۳ در لیدن از بلادِ ہالند بسعی و اہتمام و تصحیح رینولد الین نیکلسون ——

ناشر مقدمے میں کہتا ہے: رسم الخطِ نسخۂ چاپ لیدن مطابقِ نسخ معتبر قدیمہ است و در نسخۂ حاضر ہماں رسم الخط کاملاً رعایت شدہ است۔ اگر معتبر کا معیار اور نمونہ یہی ہے جو اس نسخے میں ہے تو ع اہلِ ایران کا خدا حافظ

املا غلط - اعراب ندارد ہیں تو سراسر گمراہ کُن —— معلوم نہیں عربی رسم الخط کی زبانوں - جن میں فارسی، اُردو اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانیں شامل ہیں - کے بولنے والوں میں یہ سُستت الوجودی یہ بے توفیقی یہ بے ذوقی وکم کوشی، یہ محنت سے کنیانے کی روش، یہ فرض سے جی چرانے کی عادت کیوں پائی جاتی ہے۔ ہر زبان میں تلفظ کے ضبط کا اہتمام ہے۔ ابجد کے لاینفک جزو کی حیثیت سے بجز ان زبانوں کے - نتیجۃً قاری کی ساری کوشش صرف متن پڑھنے پر ہی صرف ہو جاتی ہے معانی تک پہنچتے پہنچتے اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ ہماری ساری علمیت (اِلّا ماشاءَ اللہ) بس متنوں کی صحیح خواندگی اور اُن پر حاشیہ آرائی تک محدود ہے۔ ہمارے ہاں نام نہاد ڈاکٹروں، علاموں، مولاناؤں، علماء اور فضلاء کی بھرمار کا سبب بھی یہی ہے —— آنکھوں کے اندھے نام نین سُکھ۔

دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، لیکن ہم وہی زمیں جنبد نہ جنبد........

اہلِ افرنگ نے جنھیں ہم کافر، لادین اور گمراہ کہتے نہیں تھکتے —— جن کے زوال و انحطاط کی پیشگوئیاں ہم بڑے پیغمبرانہ لہجے میں، بڑی رعونت و نخوت سے، بڑے بلند بانگ انداز میں کرتے رہتے ہیں۔ علم کی ایسی خدمت کی ہے کہ باید و شاید —— ہیں تو بے ساختہ ان کے شوق، اُن کی لگن، اُن کی محنت، اُن کے اخلاق اور عشقِ علم کو سلام کرتا ہوں۔

ع رحمتِ حق باد بر اہلِ فرنگ

سچ تو یہ ہے ع مسلماں کی نِری باتیں ہیں کافر کام کرتا ہے

علم میں وہ تبتّل و فنا کے درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ صحیح معنوں میں اُنھوں نے احیاءُ العلوم کا کام کیا ہے۔ زمین کی رگوں کو چیر کر بفحوائے ع اُطْلُبُوا الرِّزْقَ فِی خَبَایَا الْاَرْضِ، دفینوں کو برآمد کیا ہے۔

اور کیوں نہ ہو ع وَفِی الْاَرْضِ لِلْحُرِّ الْکَرِیمِ مَنَادِحُ

خزینوں کے دروازے ہر کس و ناقص پر کھول دیے ہیں ع ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا

ع درِ فیضان و احسان وا ہے آئے جس کا جی چاہے

ہماری طرح علم سینہ نہیں کہ جس کو دو اکثر آتے ہیں۔ خداوند کرس و علم بنا بیٹھا ہے —— عَبْدُ الدِّرْھَمِ، عَبْدُ الشَّھْوَةِ، عَبْدُ الْبُطُونِ، عَبْدُ الْمَطَامِعِ۔

خدا ان پر پہلے ہی مہربان ہے۔ ہم سوختہ بخت اُن کے لیے اور کیا دُعا مانگیں اور پھر ہماری دُعاؤں میں اثر بھی کیا ہے!

؎ اگر اسلام ہمین است کہ مسلم دارد چہ، بہ خوش فہمی او کفر اگر خندہ زند؟

ہمارے ہاں شور و غوغا کے سوا کیا ہے ؏ قرآن پڑھا حلق سے آگے نہ بڑھا

الفاظ آواز ستیز و نزاع ایک شورِ قیامت ایک آشوبِ محشر

پیغمبرِ آخر زماںؐ نے تو کہا تھا: مَنْ صَمَتَ نَجَا، اور مَنْ عَرَفَ فَكَلَّ لِسَانُهُ اِذَا تَمَّ الْعَقْلُ نَقَصَ الْكَلَامُ۔

لیکن یہاں یہ عالم ہے کہ ہم قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا کرنے کی فکر میں ہیں۔

ہمارے علوم و معارف وہی ہیں جن کے بارے میں عارفِ قونیہ نے کہا تھا:

؏ علم ہائے اہلِ تن احمالِ شاں

دوسرا مصرع ؏ علم ہائے اہلِ دل حمالِ شاں غالباً اہلِ مغرب کے لیے ہے

ہمارے ہاں نجی اور سرکاری ادارے برابر کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں لیکن بجائے نُورٌ عَلٰى نُورٍ کے ان کا حاصل ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۲۴ : ۴۰ ——— ضعیف للاستناد، ساقط الاعتبار، علمی لحاظ سے بے وقار، حوالے کی رُو سے بیکار ——— بے اعراب (لغات و فرہنگ تک بھی) ذہنی انتشار، رُوحانی خلفشار اور خون کے فشار کا باعث۔ معلوم نہیں اتنا کاغذ سیاہ کرنے کا فائدہ کیا ہے؟ ———

اَلْحَقُّ اَبْلَجُ وَالْبَاطِلُ لَجْلَجٌ ———

سوائے ہماری زبانوں کے کسی اور زبان میں یہ افراتفری کا عالم نہیں۔ کہیں علم کے ساتھ یہ مسخرہ پن نہیں کیا جاتا۔ کتاب کا مقصد روشنی پھیلانا ہے نہ کہ جہل میں اضافہ کرنا، شکوک کو جنم دینا، ذہنوں کو وسوسوں میں ڈالنا، دلوں کو خلجان میں مبتلا کرنا۔

خود کلیاتِ اقبالؒ (فارسی) جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے آفسٹ پر صرفِ کثیر سے شائع ہوئی ہے۔ چھ کتابیں یکجا ہیں، لیکن بالائی حاشیے میں کہیں کسی کتاب کا نام درج نہیں۔ اتنی طویل مثنویاں ہیں، کہیں شعروں کا شمار نہیں۔ آخر حوالے کی صورت کیا ہو۔ حرکات و سکنات کا کوئی اہتمام نہیں اور ہے تو اکثر و بیشتر نادرست۔ آیات و احادیث جہاں آئی ہیں۔ ان کے ضبط و استخراج کی کوئی شکل نہیں ——— ہم میں تقلید کا بھی سلیقہ نہیں۔ اس کے لیے بھی خوش ذوقی کی ضرورت ہے۔ حاطبِ لیل اور خبطِ عشواء کی مثل ہم پر ٹھیک بیٹھتی ہے۔ ؏ یہ گردشِ دوراں ہے کہ طالع کی نحوست؟

ہادیٔ برحقؐ نے عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ سے لوحِ محفوظ کی پناہ مانگی تھی۔ غالباً یہ وُہی عقیم و سقیم و لئیم علم ہے جس کے ہم دعویدار ہیں اور جسے ہم اپنی کتابوں کی کج مج کو رد کرنے بلکہ مضطرب و مبہم عبارتوں کے ذریعے پھیلانے میں رات دن لگے ہوئے ہیں اور پھر اپنے علم و فضل پر، اپنی خدمات جلیلہ پر، اپنے مقاماتِ بلند پر فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ ہمیں یہی خوش فہمی ہے کہ ہم "خَيْرَ اُمَّةٍ" اور "شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" ہیں کبھی ہم نے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھا کہ آیا ہم میں اس اعزاز و خطاب کے سزاوار ہونے کی ادنیٰ سی بھی صلاحیت ہے؟

خدا نہ کردہ کہیں قرآن کی وہ وعید ہمارے ہی لیے نہ ہو۔

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۱۱ : ۵۷

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۴۷ : ۳۸

کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو غالباً یہی ہوتا ہے کہ اُن کی آنکھیں دیکھنے سے، کان سُننے سے اور دل سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

؏ اے خاصۂ خاصانِ رُسُل! وقتِ دُعا ہے!)

———

ظہور نظر

اب قابو میں دل کیوں آئے، اب آنکھوں میں دم کیوں ٹھہرے
جس بستی میں وہ رہتا تھا، اُس بستی میں ہم کیوں ٹھہرے

جو رس اور بُو سے عاری ہو، جس پھُول کی دھُوپ سے یاری ہو
اُس پھُول پہ بھنوّرا کیوں ڈولے، اُس پھُول پہ شبنم کیوں ٹھہرے

کیوں وید حکیم بدلتے ہو، کیوں کڑھتے ہو، کیوں جلتے ہو
رِسنا ہی مقدّر ہو جس کا، اُس زخم پہ مرہم کیوں ٹھہرے

اے شہرِ طلب کے سردارو! اے دشتِ طرب کے بنجارو!
جس روز ہمیں خوش ہونا ہو، اُس روز ہی ماتم کیوں ٹھہرے

ساغر کے نہ مجھ تک آنے پر، میرے پیاسا رہ جانے پر
ہاں شورِ قیامت کیوں اُٹھّے، ہاں گردشِ عالم کیوں ٹھہرے

ہم رنج پسندوں، غم خواہوں، شوریدہ سروں کے کہنے پر
آتی ہوئی رُت کیوں رُک جائے، جاتا ہوا موسم کیوں ٹھہرے

جو موتی اُس کی پلکوں پر جھلکیں، وہ کیوں انمول بنیں!
جو میری آنکھوں سے چھلکیں، قیمت اُن کی کم کیوں ٹھہرے

پت جھڑ میں بھی، موسمِ گُل میں بھی، رونے پر بھی، ہنسنے پر بھی
ہم لوگ ہی کیوں زنجیر ہوئے، ہم لوگ ہی ملزم کیوں ٹھہرے

جب شہر میں مجھ جیسے خوش گو، غم پرور اور بھی ہیں، اُس کو
کیوں آئے نظر در میرا ہی، گھر میرے ہی غم کیوں ٹھہرے

ظہور نظر

○

کبھی تو اس سے ملاقات کا بہانہ بنے
ہُوا ہے ایک زمانہ کوئی فسانہ بنے

گئے دنوں میں بھی ہم تھے تراشکارؔ اے وقت
نئے دنوں میں بھی ہم ہی ترا نشانہ بنے

جنوں کے شہر میں پھیلی ہے بے حسی کی وبا
کوئی خبر بھی نہ وحشت کا شاخسانہ بنے

یہ جبرِ خوف ہے یا قحطِ جذبۂ اظہار
کہ لفظ لب پہ تو آئے مگر صدا نہ بنے

کوئی ثواب تو یاد آئے دل گرفتوں کو
کوئی عذاب تو لوگوں کو تازیانہ بنے

بجا ہے دعوئ طائر، عبث ہے طعنۂ برق
شجر پہ شاخ کوئی ہو تو آشیانہ بنے

خدا وہ دن نہ دکھائے نظرؔ کہ مشکل میں
مرا مربّی و محسن کبھی زمانہ بنے

ضیا جالندھری

○

دل میں جو کچھ ہے ابھی اس کی پذیرائی نہیں
ہمہ خوشبو ہوں پہ کھلنے کی گھڑی آئی نہیں

اَن کہی بات کے سو رُوپ، کہی بات کا ایک
کبھی سُن وہ بھی جو منّت کشِ گویائی نہیں

میری نظروں میں ہے کھلتے ہوئے پھولوں کی طرح
وہ نمی جو ابھی شاخوں میں بھی لہرائی نہیں

کیا مناظر تھے کہ جو دیکھتی آنکھوں دیکھے
خواب بُنتا ہوں کہ آسودہ بینائی نہیں

سبھی دانا، سبھی سر ڈال کے چُپ بیٹھ رہے
کیا یہاں کوئی بھی شائستۂ رُسوائی نہیں

دل بُجھا ہو تو گُلِ نغمہ بھی نشتر ہے ضیاؔ
شدّتِ غم کا علاج انجمن آرائی نہیں

سلیم احمد

○

دُکھ دے یا رسوائی دے
غم کو مرے، گہرائی دے

اپنے لمس کو زندہ کر
ہاتھوں کو بینائی دے

مجھ سے کوئی ایسی بات
بِن بولے جو سنائی دے

جتنا آنکھ سے کم دیکھوں
اتنی دُور دکھائی دے

اس شدّت سے ظاہر ہو
اندھوں کو بھی سجھائی دے

اُفق اُفق گھر آنگن ہے
آنگن پار رسائی دے

میری قطرہ ہستی کو
دریا کی پہنائی دے

تُو بولے تو تجھ میں سلیم
حق کی گونج سنائی دے

○

نقشِ دیوار وہ صورت بھی گئی
میری آنکھوں کی وہ وحشت بھی گئی

وہ دیا بجھ گیا میرے اندر
وہ ہواؤں سے رقابت بھی گئی

جاں سپاری کے بہت دعوے تھے
اب تو جینے کی ندامت بھی گئی

سہی آسودگیِ وصل تو کیا
گریۂ شب کی وہ فرصت بھی گئی

دن کو سائے سے تو کچھ ساتھ بھی تھے
رات کو پھر یہ رفاقت بھی گئی

جن سے زندہ تھے ضمیر و احساس
اب وہ اندر کی ملامت بھی گئی

سر بھی رُسوا ہیں کہ سودا نہ رہا
سنگِ دیوار کی عزت بھی گئی

قتیل شفائی

○

دُھوپ ہے، رنگ ہے یا صدا ہے
رات کی بند مٹھی میں کیا ہے

چھُپ گیا جب سے وہ پھول چہرہ
شہر کا شہر مُرجھا گیا ہے

کِس نے دی یہ درِ دل پہ دستک
خود بخود گھر مِرا سج رہا ہے

پوچھتا ہے وہ اپنے بدن سے
چاند کھڑکی سے کیوں جھانکتا ہے

کیوں بُرا میں کہوں دوسروں کو
وہ تو مجھ کو بھی اچھا لگا ہے

قحط بستی میں ہے نغمگی کا
مور جنگل میں جھنکارتا ہے

وہ جو گُم سُم سا اِک شخص ہے نا
اُس کے کرب میں مبتلا ہے

عاشقی پر لگی جب سے قدغن
درد کا ارتقاء رُک گیا ہے

دن چڑھے دھوپ میں سونے والا
ہو نہ ہو، رات بھر جاگتا ہے

اس قدر خوش ہوں میں اس سے مِل کر
آج رونے کو جی چاہتا ہے

میرے چاروں طرف مسئلوں کا
ایک جنگل سا پھیلا ہوا ہے

دب کے بے رنگ جسموں کے نیچے
حرف کا بانکپن مر گیا ہے

بے سبب اس سے میں لڑ رہا ہوں
یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے

گنگنایا قتیلؔ اس کو میں نے
اس میں اب بھی غزل کا مزا ہے

قتیل شفائی

نئے اک شہر کو صبح سفر کیا لے چلی مجھ کو
صدائیں دے رہی ہے ایک چھوٹی سی گلی مجھ کو

میں اپنی عمر بھر کا چین جب اُس در پہ چھوڑ آیا
ملی ہے تب کہیں جا کر ذرا سی بے کلی مجھ کو

میں قطرے گن کے انسانوں کی تقدیریں بتاتا ہوں
ذرا سی تشنہ کامی نے بنا ڈالا ولی مجھ کو

میں وہ گلشن گزیدہ ہوں کہ تنہائی کے موسم میں
نہیں ہوتے اگر کانٹے تو ڈستی ہے کلی مجھ کو

محبّت تھی اسے لیکن مرا افلاس جب دیکھا
پریشاں سی نظر آئی وہ نازوں کی پلی مجھ کو

قتیلؔ آباد جب گھر تھا تو کیوں مجھ پر کہیں غزلیں
یہ طعنہ جاتے جاتے دے گئی اک دل جلی مجھ کو

اس کو ملے جام و سبو، مجھ کو پیالا چائے کا
پیسے کی ساری بات ہے، سب کھیل ہے سرمائے کا

پیاسا رہے وہ کب تلک، جو سابقہ مے خوار ہے
اس کو بہانہ چاہیے، کچھ بادلوں کے سائے کا

لُقمہ اُٹھاؤں جب بھی میں، وہ آ کھڑا ہو سامنے
روتا بلکتا بھوک سے، بچہّ مرے ہمسائے کا

اے زندگی کی لذّتو! میں کیا کروں، یہ محتسب
یوں راہ میں حائل رہے، کوٹھے پہ جیسے نائیکہ

کرنے لگے ہیں شاعری دلدار میرے عہد کے
چاہت نئے اسلوب کی، دھوکا نئے پیرائے کا

خود اُس پہ جو مرتے رہے، بدظن مجھے کرتے رہے
مارا ہوا ہوں میں قتیلؔ اُن دوستوں کی رائے کا

قتیل شفائی

وفا کے جنگلوں میں کھو گیا تو ؟
میرے دل کو اگر کچھ ہو گیا تو ؟

بہت الزام آئے دھوپ کے سر
جو سایوں میں مسافر کھو گیا تو ؟

مؤذن کی اذاں برحق ہے لیکن
نمازی جاگ کر پھر سو گیا تو ؟

جہاں درکار ہیں لفظوں کی فصلیں
وہاں کوئی خموشی بو گیا تو ؟

پڑھی جو فاتحہ ساغر پہ ہم نے
ثواب اس کا بھی زاہد کو گیا تو ؟

قتیلؔ اِک داغ ہے توبہ کا مجھ پر
کوئی بادل اُسے بھی دھو گیا تو ؟

مجھ کو دیکھنے والے، تو کس دھیان میں ہے
آخر کیا مشکل میری پہچان میں ہے

اپنے ہجر کے پس منظر میں جھانک مجھے
میری سب روداد اسی عنوان میں ہے

تنکوں کی یہ کشتی آگ کے دریا میں
کر گزروں گا جو میرے امکان میں ہے

کب سننے دیتی ہے شور سمندر کا
پانی کی اِک بوند جو میرے کان میں ہے

بن سوچے سمجھے توثیق نہیں کرتا
کفر وہ شامل جو میرے ایمان میں ہے

ٹانک دو اس میں اک مصنوعی تتلی بھی
کاغذ کا جو گلدستہ گلدان میں ہے

حجرے میں گر کوئی بات ہوئی تو کیا
تھوڑا سا شیطان تو ہر انسان میں ہے

شوق تو یہ ہے، آج کے فاتح کہلائیں
جنگ ابھی تک ماضی کے میدان میں ہے

پچھلی تحریروں کو بھُول کے لئے شاعر
تیرا نیا قصیدہ کس کی شان میں ہے

جن کے لیے میں غزلیں کہتا رہا قتیلؔ
ان کا سارا حُسن مرے دیوان میں ہے

محشر بدایونی

○

اپنی قیمتِ شامِ سفر دوں، یہ نہیں ہوگا
اپنے چراغ کو خود گُل کر دوں، یہ نہیں ہوگا

اب تو میری کُل توقیرِ شجر ہے آدھا
برق کو یہ آدھا بھی شجر دوں، یہ نہیں ہوگا

ہجر کو پس انداز کیا ہے موسم موسم
عمر کی محنت غارت کر دوں، یہ نہیں ہوگا

جاؤں جو اُس کے در پہ دامنِ جاں پھیلائے
وہ پتھر دے اور میں سر دوں، یہ نہیں ہوگا

منطقِ عصر سلیقۂ حرفِ حق کیا جانے
وحشی کے قبضے میں تبر دوں، یہ نہیں ہوگا

میری ایک اک شاخ ہے فصلِ عدل کی میزاں
چھاؤں اِدھر دُوں، دھوپ اُدھر دُوں، یہ نہیں ہوگا

کم ضَو لفظ کو صورت بھی دُوں، معنی بھی دُوں
خود رو لفظ کو زیر و زبر دوں، یہ نہیں ہوگا

دُور نشیں! دیکھ آ کر، یاد کرے گا تُو بھی
تیری زمیں پر قصّۂ گر دوں، یہ نہیں ہوگا

حسن عابدی

○

کون اُٹھے گا حریفوں کے مقابل اب کے
شہر کا شہر ہے پابندِ سلاسل اب کے

زہر کی بوند میں داروئے شفا رکھتا ہے
ایک ہے میرا مسیحا، مرا قاتل اب کے

کون آیا مرے سینے میں صدا کی صورت
کس کی آہٹ پہ دھڑکتا ہے مرا دل اب کے

موج دریا سے اُٹھی، کوہ سے آواز آئی
نہ رہے گا کوئی آسودۂ ساحل اب کے

لیلیٰ عصرِ رواں، جلوۂ فردا تو دکھا
ورنہ کچھ دُور نہیں پردۂ محمل اب کے

لوگ تاریخ زمانوں کی رقم کرتے ہیں
ایک اک پل ہے زمانوں کے مقابل اب کے

ایسی آشفتہ سری ہو تو غزل کیا ہوگی
رہ گئے سب قد و گیسو کے مسائل اب کے

حسن عابدی

O

جو بات دل نہیں کہتا، زبان کہتی ہے
اسی کو خلق فصیح البیان کہتی ہے

وہ پڑھ رہا ہوں جو اخبار میں چھپا ہی نہیں
سطر جو مٹ گئی، اک داستان کہتی ہے

خوشا ہمارے زمانے کی صُلح جُو دانش
کہ سر کی دھوپ کو بھی سائبان کہتی ہے

زمیں سے اُٹھ نہ سکا سجدۂ نفاق کا بوجھ
اذاں سُنی تو قضا الامان کہتی ہے

بچا گیا مجھے اپنا ہی چاکِ پیراہن
ہوائے تُند اِسے بادبان کہتی ہے

عدُو نے مجھ پہ ترس کھا کے رکھ دیے ترکش
"یہ ایک تیر تو لے جا" کمان کہتی ہے

بس اب گلے سے لگا لے تو چین آ جائے
یہی زمیں جو مجھے آسمان کہتی ہے

O

رفاقتوں کے زمانے اب اپنے بس ہیں کہاں
شفق کے رنگ ہیں سائے کی دسترس میں کہاں

مجھے تو خوار و زبوں اس طرح بھی ہونا تھا
مگر یہ عشق کی رسوائیاں ہوس میں کہاں

نہ پُوچھ غیبد سے تعبیر میرے خوابوں کی
خزاں کے پھول بھی ملتے ہیں خار و خس میں کہاں

اسیر اپنے ہی گھر میں ہُوئے تو یاد آیا
کہ عمر بھر کی اسیری کا ڈر قفس میں کہاں

برہنہ شاخِ چمن بادلوں کو تکتی ہے
کِھلیں گے پھُول مگر ایک دو برس میں کہاں

بہت ہے سلسلۂ وارداتِ غم ورنہ
یہ موتیوں کی لڑی تارِ یک نفس میں کہاں

فارغ بخاری

○

ہم اُن کے نقشِ قدم ہی کو جادہ کرتے رہے
جو گمرہی کے سفر کا اعادہ کرتے رہے

کئی ثواب تو نسیاں میں ہوگئے ہم سے
گناہ کتنے ہی ہم بے ارادہ کرتے رہے

نہ صرف اہلِ خرد ہی کا ہم پہ احساں ہے
کہ احمقوں سے بھی ہم استفادہ کرتے رہے

کچھ اس ہنر سے گزاری ہے زندگی اپنی
ہر ایک تیر پہ ہم دل کشادہ کرتے رہے

مرے گروہ کا رشتہ ہے ان قبیلوں سے
جو زندگی کا سفر پا پیادہ کرتے رہے

ہُوا ہے ایسا کہ فارغ ارادتاً بھی کبھی
ہم اپنی راہ میں کانٹے زیادہ کرتے رہے

○

یوں لگتا ہے جیسے ہم دریا کے رُخ پر رہتے ہیں
اس کی اندھی لہروں کے قاتل دھارے پر بہتے ہیں

صدیوں کی تاریخ یہاں قرطاسِ ہوا پر لکھی ہے
قرنوں کے افسانے ہم سے کوہ و بیاباں کہتے ہیں

وقت سے پہلے بچوّں نے چہروں پہ بڑھاپا اوڑھ لیا
تتلی بن کر اُڑنے والے، سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں

جب سے اندھی ظُلمت نے سُورج پر شبخوں مارا ہے
سب فرزانے اپنا اپنا چہرہ ڈھونڈتے رہتے ہیں

فارغ کیسے دَور میں یہ تاریخ ہمیں لے آئی ہے
اپنے دُکھ بھی سہتے ہیں، تاریخ کے دُکھ بھی سہتے ہیں

احمد ظفر

○

وہ کوئی بات الگ سارے زمانے سے رہا
ذکر کیوں اس کا مگر میرے فسانے سے رہا

آشنا غیر کا وہ دوست ندامت میری
یوں ہوا دُور تصوّر میں بھی آنے سے رہا

اب تو ہر بات پہ دل ٹوٹ رہا ہے میرا
آئینہ ایسا زمانے کو دکھانے سے رہا

اس کے چہرے پہ نئے پھُول کھلے ہیں کیسے
عمر بھر کام کبھی جس کا رُلانے سے رہا

دل، فصیلوں پہ چراغوں کی طرح جلتے ہیں
پردۂ شب بھی ترے داغ چھپانے سے رہا

کوہکن عزم کی صورت میں مرے ساتھ رہا
جُوئے خُوں بہتی ہے میں اشک بہانے سے رہا

دل اسی آگ میں چُپ چاپ سُلگتا ہے ظفرؔ
عشق وہ روگ کہ جلنے سے جلانے سے رہا

○

دیرینہ خواہشوں سے سجایا گیا مجھے
مقتل میں کس فریب سے لایا گیا مجھے

بادِ ثمر سے شاخِ شجر جھک گئی تو کیا
میں بے ثمر تھا، پھر بھی جھکایا گیا مجھے

سیارۂ زمیں ہے کہاں سوچتا ہوں میں
پاتال میں فلک سے گرایا گیا مجھے

میں نقشِ ہجرِ یار ہوں شب کی فصیل پر
جلتا ہوا چراغ بنایا گیا مجھے

لائے ہیں ریزہ ریزہ کسی آئینے کے پاس
میرا ہی جسم جیسے دکھایا گیا مجھے

پتھر میں جب گلاب مہکتے دکھا دیے
یہ معجزہ نہیں ہے، بتایا گیا مجھے

چشموں کے آس پاس بھی پیاسا ہوں میں ظفرؔ
ریگِ رواں کا رقص دکھایا گیا مجھے

جمیل ملک

○

جرم تیرا نہ سہی، میری سزا خوب سہی
آئینۂ خانۂ ہستی کی ادا خوب سہی

پاس سے تو تری آنکھوں کے بھنور لے ڈوبے
دُور سے جلوۂ گرداب بلا خوب سہی

کیسا ساون ہے کہ جو کھُل کے برستا ہی نہیں
دیکھنے میں تری زُلفوں کی گھٹا خوب سہی

گھر میں جو بات ہے وہ تیرے شبستاں میں کہاں
جانِ یاراں، ترے کوچے کی ہوا خوب سہی

ذوقِ جلوت میں تبِ تابِ حقیقت بھی تو ہے
شوقِ خلوت کدۂ سازِ وصدا خوب سہی

دن کو صحرا میں بگولوں کا سفر بھی دیکھو
صبح دم باغ میں یہ رقصِ صبا خوب سہی

سرزمینیں ہیں بہت روح کے پاتال میں بھی
ماہ و مریخ پہ آوازِ درا خوب سہی

دوست، زندانِ عناصر سے رہائی معلوم
دشتِ امکانِ تخیّل کی فضا خوب سہی

وسعتیں اور بہت ہیں غمِ دوراں کے لیے
قبلۂ جاں کے لیے قبلہ نما خوب سہی

خوب تر ہے مری تزئین سے ہر پیکرِ جاں
تیری تخلیق کا ہر نقشِ بقا خوب سہی

پاؤں میں اپنا ہی سایہ ہے پریشان جمیلؔ
سر پہ دستار پرِ و بالِ ہما خوب سہی

○

دُور سے روشن تھا کتنا، دلنشیں منظر کا چاند
جب مرے پاؤں میں آیا، بجُھ گیا پتھّر کا چاند

روشنی بکھرا رہا ہے کب سے یہ باہر کا چاند
روشنی کیسے ہو جب تک تو نہ دے اندر کا چاند

چودھویں کا چاند اپنے آپ سے شرما گیا
سامنے جب آ گیا وہ مرمریں پیکر کا چاند

چاند کتنے ریشم و کمخواب میں گہنا گئے
مسکراتا ہے مگر کیا کیا پھٹی چادر کا چاند

بستیوں میں گھُپ اندھیرا، آنگنوں میں خامشی
کس پرائے شہر میں اُترا ہے، اپنے گھر کا چاند

اُس نے تو شدّاد کی جنت بسا لی دوستو
تم بھی لے آؤ کسی نخشب، کسی آزر کا چاند

اے خداوندِ تجلّی! اب تو کوئی انقلاب
دیکھتے گزری ہیں عمریں ایک ہی محور کا چاند

ہے وہاں سُرخی ہی سُرخی، روشنی ہی روشنی
کل جہاں کٹ کٹ گیا تھا تیرے میرے سر کا چاند

مجھ کو بہلاتے ہیں وہ کن کن کھلونوں سے جمیلؔ
لائے ہیں شیشے کا سورج اور یہ مرمر کا چاند

منظور عارف

○

مری غزل میں تھیں اس کی نزاکتیں ساری
اُسی کے رُوئے حسیں کی صباحتیں ساری

وہ بولتا تھا تو ہر اک تھا گوشِ برآواز
وہ چُپ ہُوا تو ہیں بہری سماعتیں ساری

وہ کیا گیا کہ ہر اک شخص رہ گیا تنہا
اُسی کے دم سے تھیں باہم رفاقتیں ساری

ڈبو گیا وہ مرا لفظ لفظ دریا میں
وہ غرق کر گیا میری علامتیں ساری

وہ ایک لمحہ سرِ دار جو چمک اُٹھا
اس ایک لمحے پہ قربان ساعتیں ساری

جہاں پہ دفن ہے اُس کے بدن کا تاج محل
اُدھر دریچے رکھیں گی عمارتیں ساری

○

تصویر سی ہے دیدۂ حیراں کے سامنے
اک ہاتھ سوچ میں ہے گریباں کے سامنے

گھبرا کے حسرتیں درِ دل سے نکل گئیں
خالی پڑا ہے گھر مرے ساماں کے سامنے

کیا جانے اُس کے سامنے کیا اُن کا حشر ہو
حیرت زدہ کھڑے ہیں جو درباں کے سامنے

سر ہے وہی جو مسجدِ تن کا امام ہو
بے خوف ہو کے بولے جو سلطاں کے سامنے

اُس پر کسی دلیل کا ہوتا نہیں اثر
عقل اِک فضول چیز ہے ناداں کے سامنے

شان الحق حقیؔ

○

پھینک اِسے کیا ترے دامن میں ہے
حاصلِ ہستی تو فقط من میں ہے

چاکِ جگر تک نہ گئی کوئی آنکھ
وائے وہ اک چاک جو دامن میں ہے

اس کو ہی بس دولتِ ایماں سمجھ
یہ جو اچنبھا سا مرے من میں ہے

ہے شبِ زنداں سے بھی تاریک تر
رات جو چھائی مرے آنگن میں ہے

فن سے نہیں فکر کا مشرب الگ
پیاس مگر اُس سے سوا فن میں ہے

جائے گی بے اشک نہ زہرہ تک آنکھ
زور تو سارا اسی ایندھن میں ہے

کان لگاؤ تو ذرا دل کے پاس
دیکھو یہ کیا گونج سی دھڑکن میں ہے

○

رہ گئے رازِ این و آں کہتے
دل کا کیا بھید نکتہ داں کہتے

جب نہ پہنچے کسی کنارے بھی
کیوں نہ دریا کو بے کراں کہتے

وحشتِ دل کا زاویہ آباد
ہم ہیں صحرا کو خانماں کہتے

رہ گئی شرمِ دوستی بارے
راز ہوتا تو راز داں کہتے

کاش ہم عرضِ مدعا کرتے
اور تم مسکرا کے ہاں کہتے

رہ گئی دل کی داستاں حقیؔ
عمر گزری کہانیاں کہتے

رضا ہمدانی

○

ہے غنیمت یہ فریبِ شبِ وعدہ، اے دل
کیا کوئی دے گا تجھے اس سے زیادہ، اے دل

مدّتوں جان چھڑکتے رہے جس لمس پہ وہ
اوڑھ کر آگیا، خوشبو کا لبادہ، اے دل

سوچ زنجیر بپا، فکر ہے پابندِ رسن
کیا یہی صبحِ تمنّا کا ہے جادہ، اے دل

اب بھی روشن کیے بیٹھا ہے امیدوں کے چراغ
کتنا معصوم ہے تو کتنا ہے سادہ، اے دل

خوں میں لتھڑے ہوئے لاشے ہیں نقوشِ کفِ پا
اور کر منزلِ جاناں کا ارادہ، اے دل

خود فریبی کا فسوں تجھ پہ ہے طاری ورنہ
کم نہیں ہے شبِ غم سے شبِ وعدہ، اے دل

صہبا اختر

○

نہ رنجِ شب، نہ ملالِ صباح رکھتے ہیں
جو ہر گناہِ حسیں کو مباح رکھتے ہیں

کسی سے عشق کے بارے میں گفتگو کیا ہو
کہ لوگ دل نہیں رکھتے، صلاح رکھتے ہیں

اذان دیتے ہیں صحرائے بے سماعت میں
جو آدمی سے اُمیدِ فلاح رکھتے ہیں

کبھی ملو تو سہی دُور کے مکینوں سے
کہ دل کے شہر بھی گرد و نواح رکھتے ہیں

ہمیں خبر ہے، زنِ فاحشہ ہے یہ دُنیا
سو ہم بھی ساتھ اسے بے نکاح رکھتے ہیں

غریبِ شب سہی صہبا، پر اپنے بارے میں
بہ پاسنامۂ شہرِ صباح رکھتے ہیں

گوہر ھوشیار پوری

○

چلو یہ دن بھی گوارا، اذیتوں والے
مگر یہ لوگ — یہ وحشی طبیعتوں والے

ترے کرم کی شہادت قدم قدم نکلی
بکھر بکھر گئے کیا کیا جمعیتوں والے

کہو تو کہہ کے مُکر جاؤ۔ کون پوچھتا ہے
حمیتیں ہیں — کہ اب وہ حمیتوں والے

ہمارا اپنا مُصلّٰی — ہماری اپنی نماز
شریعتوں کو مبارک شریعتوں والے

گلِ مراد اِدھر نیتوں سے کِھلتا ہے
اِدھر یہ ہم کہ ہیں بے رنگ نیتوں والے

تری نظر بھی کسی کی مشیتوں میں سے ہے
نہیں تو۔ یوں نہ ترستے مشیتوں والے

کھُلا ہُوا ہے درِ عفو و در گزر گوہر
اٹھو کہ دن یہ کہاں پھر برہنتوں والے

○

اے نام و نسب کی شان والو
آباد رہو — جہان والو

اپنی بھی کوئی نظیر ایسی
سقراط کی داستان والو

باطل سے جہاد فرض ٹھہرا
آواز تو دو اذان والو

یہ خیر، یہ شر، یہ دل، یہ دُنیا
تم کون ہو، درمیان والو

اچھے ہو۔ کہ دن نہ رات، بھاری
دن رات اُسی کے دھیان والو

کیا ہے، پسِ آسماں، وہ کیا ہے
بتلاؤ تو آسمان والو

اپنا تو خدا، خدا ہے گوہر
تم کچھ بھی کہو گمان والو

گوہر ہوشیار پوری

○

جلتی ہیں اُس کے حُسن کی ساری نہائیتیں
اپنی روائیتیں ہوں کہ اپنی حکائیتیں

سینوں میں دل، گلاب سے مہتاب سے یہ دل
آ دیکھ اہلِ درد پہ اپنی عنائیتیں

اے آفتابِ صبحِ ہدایت! طلوع ہو
گم کردگانِ شب کے لیے کچھ ہدائیتیں

جانکاہ تر، سفر سے بھی نکلا سفر کا عزم
اُٹھے نہ تھے قدم کہ تھکن کی شکائیتیں

یارو! خدا نہیں تو پھر آخر وہ کون ہے
کرتا ہے اپنے ساتھ جو اتنی رعائیتیں

نیتِ طلب میں ہو کہ طریقِ طلب میں ہو
اِس قلزمِ کرم کو نہ آئیں کفائیتیں

گوہر بھلے کو ہم نے خدائی نہ مانگ لی
آشفتگانِ حال کی اپنی ولائیتیں!

○

اب کے تو خواب خواب اشارہ ہی اور ہے
سوچیں تو کیا۔ کہ وقت کا دھارا ہی اور ہے

اے دل، نہ چھیڑ مہر و وفا کی حکائیتیں
بات اب طبیعتوں کو گوارا ہی اور ہے

لطف و عطا کہ ناز و ادا کے حساب سے
آوارگانِ شوق، وہ پیارا ہی اور ہے

آگے نکل گیا ہے، طلب کے مدار سے
اپنا تو آسماں پہ ستارا ہی اور ہے

یا اب، وہ آشنائے کرم ہی نہیں رہے
یا پھر، کچھ آج بخت ہمارا ہی اور ہے

کیسی بھی آندھیاں ہوں، قدم ڈولتے نہیں
اپنا یقین، اپنا سہارا ہی اور ہے

گوہر کہاں وہ معجزۂ فن کہیں جسے
اس انجمن میں انجمن آرا ہی اور ہے

احمد شمیم

○

سوچ سمندر، من کے اندر، موتی بھی ہیں کنکر بھی
ہیں اپنے قد سے چھوٹا بھی، اپنے قد کے برابر بھی

اِک سرحد پر بیٹھے بیٹھے اس خواہش میں عُمر کٹی
جو صورت دل کے شیشے میں ہو، وہ منظر ہو باہر بھی

اپنے گونگے لفظوں کے انبار کو دیکھ کے سوچتا ہوں
وہ کیا لوگ تھے جن کو دیکھ کے بول اُٹھے تھے کنکر بھی

تیس برس سے ہجر کی چادر اوڑھ کے ایک سفر میں ہوں
چار قدم کا رستہ طے ہو تو آ جائے میرا گھر بھی

خالی دریا کا کیا بہنا، خالی دریا بہہ جائے گی
دریا مانگے اِک پیاسا بھی، گوری بھی اور گاگر بھی

○

ابھی رنج سفر کی ابتداء ہے
ابھی سے جی بہت گھبرا رہا ہے

دیے بجھنے لگے ہیں طاقچوں میں
ہر اک شے پر اندھیرا چھا رہا ہے

ہوا شاخوں میں چھُپ کر رو رہی ہے
نہ جانے کیسا موسم آ رہا ہے

ٹھٹھرتی رُت میں زخمی اُنگلیوں سے
ہمیں دریا میں سونا ڈھونڈنا ہے

اسی امید پہ بن باس کاٹیں
ہمیں بھی ایک دن گھر لوٹنا ہے

بہت چاہوں کہ میں بھی ہاتھ اُٹھاؤں
مرے ہونٹوں پہ لیکن بد دعا ہے

شہزاد احمد

○

سیاہ دن تھا، زمیں بادلوں میں لپٹی تھی
مگر نگاہ ستارے تلاش کرتی تھی

کھلی فضا میں فروزاں نہ تھا کوئی جگنو
بجھے ہوئے تھے دیے، تیرگی چمکتی تھی

رہا مرا ہی سفر اک مقام تک محدود
زمیں بھی گھوم رہی تھی، ہوا بھی چلتی تھی

وہاں وہاں بھی سنائی دیے مرے نوحے
جہاں جہاں مری آواز بھی نہ پہنچی تھی

یہ اور بات کہ بے آب و بے گیاہ تھا میں
بہار میں نے بھی دیکھی تھی، مجھ پہ گزری تھی

اُڑے جو ابر تو چھونے لگے ستاروں کو
گھٹا جھکی تو منڈیروں کو چوم سکتی تھی

دلوں کا حال کوئی جانتا نہ تھا لیکن
وہ خال و خد تھے کہ صورت اُداس لگتی تھی

نہ جس کا نام تھا کوئی نہ جس کی کوئی طلب
عجب مٹی ہوئی صورت دلوں میں رہتی تھی

شمار میں نہ کروں گا فراق کے شب و روز
وہیں سے بات چلے گی جہاں سے ٹوٹی تھی

تری اُمید تھی دریا کے راہ کی دیوار
کبھی نہ ٹوٹ سکی، پائیدار ایسی تھی

اسی میں دونوں جہاں میں نے پا لیے شہزاد
وہ ہونٹ پھول سے تھے، شکل چاند جیسی تھی

○

ہری بھری تھی زمیں اور دن سُنہرے تھے
کہاں گئی وہ ہوا جس میں رنگ ہوتے تھے

یہ سوچ کر کہ اکیلا ہے سر رات کا چاند
مری طرح کئی سائے گھروں سے نکلے تھے

ابھی تلک وہی راتیں ہیں اور وہی دن ہیں
بہت کیا تھا سفر اور کہیں نہ پہنچے تھے

یہ آگہی نہیں، اک فاصلوں کی دُنیا ہے
خبر نہ تھی تو ستارے قریب لگتے تھے

دکھائی دی تھی اندھیرے میں روشنی کی لکیر
ہم اس چراغ کو بھی آفتاب سمجھے تھے

جدا ہوئے تھے بہار و خزاں کے موڑ پہ ہم
ابھی تمام درختوں پہ سبز پتے تھے

نظر میں رہتا تھا دونوں جہان کا نقشہ
ستارے کتنے ہیں، ہم انگلیوں پہ گنتے تھے

سنائی دیتی تھیں تنہائیوں کی آوازیں
بجھی ہوئی تھی وہ محفل، چراغ جلتے تھے

رہائی ملتی نہ تھی قیدِ آرزو سے مجھے
مری طرح در و دیوار بھی تو چلتے تھے

تم اہلِ دل ہو تو پھر کوہکن مجھے بھی کہو
وہ دن جو کاٹ چکا ہوں، پہاڑ جیسے تھے

یہ اور بات، ہمیں خاک کر گئے شہزاد
مگر وہ خواب سے دن دیکھنے میں کیسے تھے

مسعود قریشی

○

میری ہر سوچ کا عنواں تم ہو
مرکزِ ذہن و دل و جاں تم ہو

کون اسرارِ تعلق سمجھے
راز میرے کھُلیں، عُریاں تم ہو

شعر تصویر ہیں میرے دِل کی
نقش در نقش نمایاں تم ہو

تم ہو محفل میں خداؤں جیسے
ہم جو تنہا ہوں تو انساں تم ہو

نہ اُٹھا بارِ محبّت ہم سے
اور سُنتے ہیں، پشیماں تم ہو

دل بہر طور تعلق مانگے
درد سے پیار کہ درماں تم ہو

کیا غضب ہے کہ مہینوں نہ ملو
اور نزدیک رگِ جاں تم ہو

○

آگ ظُلمت میں لگا تو دیکھو
سچ کی قندیل جلا تو دیکھو

زورِ طوفان کا تو اندازہ ہو
مُشتِ خاک اپنی اُڑا تو دیکھو

میں نے طوفان اُٹھائے جیسے
سانس لینے کی سزا تو دیکھو

شورِ تحسین ہے اور بارشِ گُل
یہ نئی طرزِ جفا تو دیکھو

ڈوب کر، چاند میں چمکے سورج
طبعِ روشن کی بقا تو دیکھو

دو نہ الزام فقط بھنورے کو
کوئی کردارِ صبا تو دیکھو

خیر، وہ تھا ہی جفاجُو، چھوڑو
یا وفاؤں کی وفا تو دیکھو

رضی اختر شوق

○

ہزار ماتمِ جاں رہ گزر میں رہتا ہے
مگر یہ وقت کا دریا سفر میں رہتا ہے

اِک آئینہ کفِ اہلِ ہُنر میں رہتا ہے
ہر آنے والا زمانہ نظر میں رہتا ہے

گزر رہی تھی ہوا، رات ہم سے کہتی ہُوئی
یہ دیکھنا ہے، دِیا کس کے گھر میں رہتا ہے

ہماری کج کلہی نے کبھی خبر ہی نہ لی
امیرِ شہر بھی اس رہ گزر میں رہتا ہے

یہ گھر کو میں نے تو ویرانیاں نہیں دی تھیں
یہ کون میرے سوا میرے گھر میں رہتا ہے

کہاں وہ چھاؤں کہ میں جس کے ساتھ ساتھ چلوں
ہجوم یوں تو بہت رہ گزر میں رہتا ہے

یہ تیرا نشۂ پندار کچھ غلط نہیں شوقؔ
جو لکھ رہا ہے وہ زعمِ ہُنر میں رہتا ہے

○

کیسے روشن ہے مری شمعِ ہُنر، دیکھے گا کون
یہ مرے بجُھ بجھ کے جلنے کا سفر دیکھے گا کون

بے نوا ہو کر سخن کی پاسداری کے لیے
لے بھی آیا میں جو حرفِ تازہ تر، دیکھے گا کون

گھر کا ہنگامہ کسی کی نغمہ پیرائی سے تھا
اب دَر و دیوارِ گھر کے نام پر دیکھے گا کون

لَوٹ جائے گی کِرن چھُو کر مری دہلیز کو
کل بھی نکلے گا یہی سُورج مگر دیکھے گا کون

اس ہجومِ سنگِ طفلاں سے بچاؤ خود کو شوقؔ
اِس فضا میں معتبر نامعتبر دیکھے گا کون

محسن احسان

○

پتھروں کی جن پہ تھی بوچھار وہ سر اور تھے
جو سخی داتا بنے تھے، وہ قلندر اور تھے

جو تری آنکھوں میں تھے اُن کی چبھن کچھ اور تھی
جو مرے سینے میں اُترے تھے وہ خنجر اور تھے

سازشیں اب کے ہواؤں کی بھی تھیں کچھ مختلف
بادبانوں کے بھی لیکن اب کے تیور اور تھے

یوں تو سب گلزار تھا ممنونِ احسانِ بہار
جن کے سر خم تھے ہوا سے وہ گلِ تر اور تھے

ہم برونِ آب تھے اور پانیوں میں عکس تھا
جو نہاں کنجِ صدف میں تھے وہ گوہر اور تھے

بستیوں میں رونقیں تھیں، راستوں میں جشن تھا
رُخ مگر دریاؤں نے بدلا تو منظر اور تھے

ہم کو اپنی ذات کی تہ تک پہنچنا ہے محال
خود شناسی کے سمندر کے شناور اور تھے

لکھ سکے محسن نہ ہم اِک کلمۂ توصیف تک
وہ جو لکھتے تھے قصیدے، وہ سخنور اور تھے

○

اپنے اندر سے جو باہر نکلے
خود ستائی میں سمندر نکلے

اب سزائیں ہی مقدر ٹھہریں
تازیانوں کے ثناگر نکلے

ہاتھ جب قبضۂ شمشیر پہ ہو
کیوں نہ مقتل میں دلاور نکلے

فاختاؤں کا تمسخر توبہ
چیونٹیوں کے بھی عجب پر نکلے

ایسے بھی لوگ ہیں اس شہر میں جو
دھوپ میں برف پہن کر نکلے

کھینچ دو دار پہ دلداروں کو
شہریاروں کا ذرا ڈر نکلے

کشتیاں چھوڑ کے دریاؤں میں
ریگزاروں سے شناور نکلے

جس بھی دیوار میں در کرتا ہوں
وہی دیوار پسِ در نکلے

بھیک اس شہر میں ہم کیا مانگیں
جس میں حاتم بھی گداگر نکلے

آندھیوں میں بھی کھڑے ہیں اب تک
ہم درختوں سے قدآور نکلے

پاؤں میں باندھ کے گھنگھرو محسن
چند قبروں کے مجاور نکلے

محسن احسان

○

خاکداں کو ماورائے آسماں لے جائے گا
جو پرندہ سر پہ رکھ کر آشیاں لے جائے گا

میں فقط پیاسا رہوں گا ساحلوں کی تشنگی
وہ سمندر کی سبھی طغیانیاں لے جائے گا

کارواں کے سب مسافر سوچتے ہیں شام سے
صبحدم کس سمت میرِ کارواں لے جائے گا

کیا خبر ہے، کس کی پہلے پتلیاں پھر جائیں گی
کون اپنے ساتھ کیا سُود و زیاں لے جائے گا

جب اُتر جائیں گی تہہ میں خواہشوں کی کشتیاں
ناخدا اُس وقت اپنے بادباں لے جائے گا

ہم کناروں پر کھڑے گنتے رہیں گے موج موج
اور سفینے کو کہیں آبِ رواں لے جائے گا

اب تو خطرے میں ہے محسنؔ فرقۂ درویش بھی
تو بچا کر شملۂ عزت کہاں لے جائے گا

○

(نذرِ غالب)

قبائے اہلِ محبت، ردائے دلبر کھینچ
برہنہ سر ہوں سبھی، سب کے سر سے چادر کھینچ

چمن میں سر نہ اُٹھائے کوئی گُلِ نورس
بہار آنے سے پہلے فصیلِ صرصر کھینچ

برونِ حلقۂ گرداب کوئی فرد نہ ہو
مکینِ ساحلِ آبِ رواں کو اندر کھینچ

زمیں پر تو بہت سے ہیں ٹیڑھے میڑھے خطوط
کوئی لکیر کبھی صفحۂ ہوا پر کھینچ

اُتر چکا ہے گلوئے گلاب میں خنجر
خدا کے واسطے اب ہاتھ اے ستمگر کھینچ

سمیٹنی ہے اگر دولتِ جمال تو پھر
حریمِ حُسن سے اہلِ ہوس کو باہر کھینچ

تلاشِ رزق میں نکلے اگر کوئی محسنؔ
تو ایسے طائرِ دیدہ دریدہ کے پر کھینچ

خورشید رضوی

○

وہی بہار، وہی شغلِ باد پیمائی
وہی خیال، وہی اُس کی بے سرو پائی

کھُلے ہوئے ہیں دریچے ہر ایک سمت مگر
کسی طرف سے کچھ اپنی خبر نہیں آئی

محبّتیں بھی کیں، اور نفرتیں بھی کیں
نہ آدمی نے مگر آدمی کی تہ پائی

یہ اعتماد تو دیکھو، بھرے سمندر میں
حباب کھینچ کے بیٹھا حصارِ تنہائی

تم اپنے آپ میں گم تھے تو ایک عالم تھا
بُرے کو دھیان پڑا، ذوقِ عالم آرائی

زمانے کا مرے خوابوں پہ کچھ اثر نہ ہوا
وہی نکھار، وہی تازگی و رعنائی

خدا بھی خلق میں چاہے کہ آئنہ دیکھے
اُسے بھی راس نہ آیا سرورِ یکتائی

○

خوب و ناخوب کی جاں سوز یہ کاہش کیوں ہے
دل جسے ترک کرے، دل میں وہ خواہش کیوں ہے

پار کیوں میری نظر کو نہیں جانے دیتے
آنکھ پر حلقۂ آفاق کی بندش کیوں ہے

خُوں ہے جن کا جگر، خود کو چھپاتے کیوں ہیں
جو ہیں بے رنگ اُنھیں ذوقِ نمائش کیوں ہے

دل سے تصدیقِ زباں کیوں نہیں ہونے پاتی
خُوں ہے خاموش تو پھر حرف کو جنبش کیوں ہے

زخم در زخم ترے دستِ جفا سے ہے مگر
دل ترے نام پہ مجبورِ ستائش کیوں ہے

انور مسعود

○

کھیتیوں کا دامنِ اُمید پھیلا رہ گیا
دشتِ بے توفیق پر بادل برستا رہ گیا

اب کہاں باقی ہے عبرت سے نظر کا رابطہ
اب تو ہر منظر یہاں صرف اِک تماشا رہ گیا

دشتِ دشمن میں ہے میرا خنجرِ خود ساختہ
اسلحہ ایجاد کر کے میں نہتا رہ گیا

مختلف تحریر نکلی خامۂ تقدیر کی
تم نے جو دیوار پر لکھا تھا، لکھا رہ گیا

آسماں پر چاند باقی ہے نہ اب تارا کوئی
آفتاب اتنا درخشاں ہے کہ تنہا رہ گیا

جیسے پتھر سے تراشی ہوں کسی نے حیرتیں
میں تو اُس کے دیکھنے والوں کو تکتا رہ گیا

اِک خلش باقی ہے انورؔ، اب تھکن باقی نہیں
نیند پوری ہو گئی اور خواب ادھورا رہ گیا

○

جھانکا ہے دلوں میں تو یہ محسوس ہوا ہے
یہ دَور تو پتھر کے زمانے پہ گیا ہے

اُکتا کے ہوسناک نگاہوں کے ستم سے
اک پیڑ نے شعلوں سے بدن ڈھانپ لیا ہے

ہونٹوں پہ ترے پھول کھلے اور طرح کے
لیکن تری آنکھوں نے تو کچھ اور کہا ہے

ہے یاد ابھی تک وہ سُریلی سی اُداسی
اُس گیت کا مُکھڑا تو مجھے بھول رہا ہے

آتے نہیں انداز مجھے حُسنِ طلب کے
اے رحمتِ یزداں، یہ مرا دستِ دُعا ہے

جاری ہے وہاں رقص چراغوں کی لووں کا
مانا کہ سرِ بام بڑی تیز ہوا ہے

حاصل یہی جاگیر ہے بے شرکتِ غیرے
انورؔ جو مرا غم ہے، وہی صرف مرا ہے

حزیں لدھیانوی

○

رُت کیا سُوکھی، دیدے سُوکھ گئے
یارو، بہتے چشمے سُوکھ گئے

کل تک جو امرت کے پیالے تھے
وہ کُندن سے سینے سُوکھ گئے

پھولوں جیسی مائیں ڈھول بنیں
کلیوں جیسے بچے سُوکھ گئے

گھر گھر پھیلی ایسی گرم ہوا
رنگ بجھے، گلدستے سوکھ گئے

نگروں جیسی کاہکشاں اُجڑی
غنچوں جیسے تارے سُوکھ گئے

دل دریا میں ہلچل ختم ہوئی
لہروں جیسے جذبے سُوکھ گئے

برف پڑی تو ٹھٹھرے سب کہسار
شور مچاتے جھرنے سُوکھ گئے

○

نئے اُفق کی طرف باندھ کر ارادہ چلو
چلو — زیادہ چلو — اور بھی زیادہ چلو

ہوا ہو، لہر ہو، خوشبو ہو، روشنی ہو تم
رہو نہ سرو کی مانند ایستادہ، چلو

کسی بھی دَور میں انصاف یوں نہیں ملتا
کبھی پہن کے نہ تم کاغذی لبادہ چلو

سمجھ کے بھی کہ یہ زُلفوں کی چھاؤں ہے، نہ رُکو
یہ جان کر بھی، کہ یہ سانپ کا ہے جادہ، چلو

گھروں میں بادہ کشوں کے، پیا ہیو! کیا ہے
ملے گی محتسبوں میں نگارِ بادہ، چلو

نظر کے سامنے ہے حسنِ عصرِ پیچیدہ
کسی بھی رنگ نہ اب سوئے دورِ سادہ چلو

گزرنا کھیل نہیں عرصۂ شہادت سے
حزیں، کریں کسی قاتل سے استفادہ چلو

سحر انصاری

کیوں آنکھوں میں بیداری ہے
کس وحشت کی تیاری ہے

خوابوں سے خواب بدل لینا
تعبیروں کی عیاری ہے

تعمیر کی حسرت کا حاصل
بے دری ہے، بے دیواری ہے

تائیدِ تمنا کون کرے
وہ آنکھ اگر انکاری ہے

سوچا نہ سبب بیزاری کا
بیزاری سی بیزاری ہے

اس شہر کی رسمیں اُلٹی ہیں
یاں دُکھ دینا دلداری ہے

اک چہرہ دن بھر ساتھ رہا
اِک جگنو شب پر بھاری ہے

اِک یاد ہے دل کے آنگن میں
یا دامن میں چنگاری ہے

جیتے جیتے مر جانے کا
اک خوف سا دل پر طاری ہے

اس سود و زیاں کی بستی میں
کوئی نوری ہے، کوئی ناری ہے

سنتے ہیں کہ اس بستی میں کہیں
اِک شخص سحر انصاری ہے

دل خود کو سمجھتا ہے کہ یہ دل ہے ابھی تک
اِس خاک کا رُخ جانبِ محمل ہے ابھی تک

کیا قرب میں آسودگیٔ جاں کا زیاں ہے
منزل سے مجھے خواہشِ منزل ہے ابھی تک

رنگِ لبِ رنگِ سرِ ناخن کی تجلی
ظلمت کدۂ زیست کو حاصل ہے ابھی تک

گزرا تھا رگ و پے سے کوئی نشے کی صورت
اِک نیند مرے خون میں شامل ہے ابھی تک

ٹھہری ہے نگاہوں میں عجب ساعتِ دیدار
وہ پیکرِ گلرنگ مقابل ہے ابھی تک

یہ کیف کے لمحات بھی ہو جائیں گے معدوم
دل اس صلۂ شوق سے غافل ہے ابھی تک

کٹتی ہی چلی جاتی ہیں ہستی کی طنابیں
کیا دل میں کوئی لمحۂ قاتل ہے ابھی تک

کیا فرق پڑا ہونے نہ ہونے سے کسی کے
دیکھو تو وہی رونقِ محفل ہے ابھی تک

اب کون سحر بہرِ تماشا نہیں آیا
رقصاں سرِ بازار جو بسمل ہے ابھی تک

عالمتاب تشنہ

○

سفر میں راہ کے آشوب سے نہ ڈر جانا — پڑے جو آگ کا دریا تو پار کر جانا
یہ اک اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا — کسی مقام سے چڑیوں کا کوچ کر جانا
یہ انتقام ہے دشتِ بلا سے بادل کا — سمندروں پہ برستے ہوئے گزر جانا
تمہارا قرب بھی دُوری کا استعارہ ہے — کہ جیسے چاند کا تالاب میں اُتر جانا
طلوعِ مہرِ درخشاں کی اک علامت ہے — اُٹھائے شمعِ یقیں اُس کا دار پر جانا
تھے رزم گاہِ محبت کے بھی عجب انداز — اُسی نے وار کیا جس نے بے سپر جانا
ہر اک نفس یہ گزرتا ہے یہ گماں جیسے — چراغ لے کے ہواؤں سے جنگ پر جانا
ہم اپنے عشق کی اب اور کیا شہادت دیں — ہمیں ہمارے رقیبوں نے معتبر جانا
مرے یقیں کو بڑا بدگمان کر کے گیا — دعائے نیم شبی! تیرا بے اثر جانا
ہر ایک شاخ کو پہنا گیا نمو کا لباس — سفیرِ موسمِ گُل کا شجر شجر جانا
ہم اپنی سادہ دلی میں بھی بے مثال رہے — جو ہم سفر بھی نہ تھا اس کو راہ بر جانا
ہمارے دم سے ہی آوارگیِ شب تھی، ہمیں — عجیب لگتا ہے اب شام ہی سے گھر جانا

زمانہ بیت گیا ترکِ عشق کو تشنہ
مگر گیا نہ ہمارا اِدھر اُدھر جانا

صمد انصاری

○

یہ موسموں کی طرح رنگ کیوں بدلتا ہے
شجر کے سائے کا کچھ دھوپ سے بھی رشتہ ہے

رگوں میں اُس کی، لہو ہے اِسی خرابے کا
تری نگاہ میں جو آدمی فرشتہ ہے

تلاش کرتا ہے موجوں میں ریگِ ساحل کو
کنارہ اپنی تمنّا میں آپ کٹتا ہے

سجا گیا ہے جسے وہ مرے چراغوں میں
سحر کے نام پہ شعلہ وہی بھڑکتا ہے

مرے لبوں پہ ہے میرے بدن کا سناٹا
جو گھر میں ہے وہی دیوار پر نوشتہ ہے

سمٹ گیا ہے کہیں دھوپ کی چٹانوں میں
وہ آفتاب کہ سائے سے اپنے ڈرتا ہے

نہیں ہے بُعد کچھ ایسا بھی نور و ظلمت میں
کہ وقت روز خطِ شام سے گزرتا ہے

ہیں دل کو یاد ابھی لذتیں جراحت کی
یہ صید وہ ہے کہ صیاد کو ترستا ہے

اُسی کے رنگ گھُلے ہیں صمد بہاروں میں
جو ابر دھوپ کے میدان میں برستا ہے

○

رہ گزر ہے کہ کفِ پا میں اُترنا چاہے
جسم ایسا کہ ہر گام بکھرنا چاہے

گرچہ پہنچی نہیں اُس تک مرے احساس کی لو
ذکر اس کا مرے لہجے سے نکھرنا چاہے

لوگ آئیں بھی اگر زحمتِ غم خواری کو
زلفِ غم اپنے ہی شانے پہ بکھرنا چاہے

بام و در میرے مکانوں کے زمیں بوس رہیں
شہر میرا کہ فصیلوں سے اُبھرنا چاہے

میں تو دے دوں اسے گم گشتہ بہاروں کے سراغ
مجھ میں لیکن وہ کوئی رنگ نہ بھرنا چاہے

راہ موسم کی کھُلے اُس کی حنائے پا سے
وہ ہواؤں پہ مگر پاؤں نہ دھرنا چاہے

ابر آجائے جو کہسار کی پیشانی تک
دامنِ کوہ سمندر میں اُترنا چاہے

صمد آنکھیں مری انکارِ بصارت کر دیں
وہ اگر اپنی شباہت سے مکرنا چاہے

رشید قیصرانی

مجھے جو شہرِ رگِ جاں کے راستے نہ ملے
گلہ کروں بھی تو کیسے، کہ وہ مجھے نہ ملے

وہ سامنے تھا مگر یوں کہ جیسے عید کا چاند
کرن کرن سے پکارے مگر گلے نہ ملے

میں سوچتا تھا اُسے اور وہ سوچتا تھا کسے
تلاش پر بھی مثلث کے زاویے نہ ملے

بس ایک بار ملے لوگ کرچیوں والے
کبھی بھی زخم پھر اپنے ہمیں سِلے نہ ملے

یہ کیسی بانجھ زمیں ہیں کہ تجھ سے مل کر بھی
وہ رتجگے نہ ملے، وہ مراقبے نہ ملے

پڑے نہ آئینہ رُو پر کسی نظر کی خراش
ہمارا کیا ہے، ہمیں وہ ملے ملے نہ ملے

تمام عمر گزاری ہے کہکشاؤں میں
یہ کیا کہ انجمِ جاں! ہم کبھی تجھے نہ ملے

رشید یوں تو بیاباں نورد کتنے تھے
ہمیں کسی کے بھی پاؤں پہ آبلے نہ ملے

وہ کارِ دید بھی کارِ ثواب ایسا تھا
وہ چہرہ بھی تو مقدس کتاب ایسا تھا

نظر وہ حرف لکھے لب جنہیں ادا نہ کریں
محبتوں کا ازل سے نصاب ایسا تھا

اڑان میں تھی دھنک رنگ تتلیوں کی قطار
وصالِ یار کا لمحہ بھی خواب ایسا تھا

اُٹھی تو ایک تلاطم، جھکی تو بجھ بھی گئی
تری نظر کا قرینہ حباب ایسا تھا

اُلٹتے رہتے تھے دونوں خوشبوؤں کے ورق
کتابِ عشق کا وہ ایک باب ایسا تھا

مری خطا کو خود اپنی قبا سے ڈھانپ لیا
مرے کریم کا دارالحساب ایسا تھا

سلیٹ عمر کی سب بھر گئی پہ حل نہ ہوا
ترا سوال ہی کچھ لاجواب ایسا تھا

رشید وہ تو مجھے آج چھو کے گزرا ہے
جو شخص دشتِ طلب میں سراب ایسا تھا

اختر امام رضوی

ہم اگر سایوں کے پیچھے بھاگتے رہ جائیں گے
راستے کٹ بھی گئے تو فاصلے رہ جائیں گے

کوئی پتا گر کے پت جھڑ کی کہانی کہہ گیا
اب جلی شاخوں پہ اُجڑے گھونسلے رہ جائیں گے

اپنی خاموشی پہ نادم تھے ، مگر سوچا نہ تھا
حرف بولیں گے تو سب مطلب دھرے رہ جائیں گے

گر یونہی پلکوں سے تارے ٹوٹ کر گرتے رہے
صبح تک منظر میں سارے رت جگے رہ جائیں گے

لکھ نئے انسان کی تاریخ، ورنہ دہر میں
کاغذوں پر دائرے ہی دائرے رہ جائیں گے

کر گئے ہجرت پرندے ، پیڑ خالی رہ گئے
ان رُتوں بھی ہاتھ شاخوں کے، سوالی رہ گئے

رنگ سارے اب کے بھی بھرنے سے پہلے اُڑ گئے
اب کے بھی نقشے تھے جتنے بھی، خیالی رہ گئے

آئنوں میں نقش ہے بچھڑا ہوا ایک ایک پل
زخم سارے موسموں کے ، ڈالی ڈالی رہ گئے

زہر ہریاول کی رگ رگ میں سرایت کر گیا
پت جھڑوں، سرسبز پتے بن کے جالی رہ گئے

درد کے صحرا ، سمندر آنسوؤں کے پی گئے
اب کے آنکھوں کے صدف گوہر سے خالی رہ گئے

اختر امام رضوی

○

ڈھونڈتے ہو جسے دفینوں میں
وہی وحشی ہے سب کے سینوں میں

بھوک بوئی گئی ہے اب کے برس
دانت اُگ آئے ہیں زمینوں میں

میرے قابیل کی روایت ہیں
پُرزے جتنے بھی ہیں مشینوں میں

زندگی، گاؤں کی حسین لڑکی
گھر گئی ہے تماش بینوں میں

صبحدم پھر سے بانٹ دی کس نے
تیرگی شہر کے مکینوں میں

کس مسافر کی بات کرتے ہو
اب تو، طوفان ہیں سفینوں میں

کس مشقت سے سانس لیتا ہوں
یہ غزل بھی ہوئی مہینوں میں

○

ہم نہیں کھُل سکے زمانے پر
سانپ بیٹھے رہے خزانے پر

ایک آتش فشاں پہاڑ سی رات
اور نیند آ گئی دہانے پر

سانس لینے کی آرزو نے مجھے
رکھ لیا جیسے تازیانے پر

کوئی آزاد ہو گیا شاید
چیلیں اُڑتی ہیں قید خانے پر

روح چیخوں میں بٹ گئی اختر
تیر بیٹھا ہے کس نشانے پر

خاقان خاور

○

دیا بجھے گا جہاں بھی، یہی فضا ہوگی
غموں کی ایک ہی لے، ایک ہی صدا ہوگی

اُتر رہی ہے منڈیروں سے آنگنوں کی طرف
چھتوں سے دھوپ کوئی دم میں اب جدا ہوگی

جہاں میں اہلِ نظر کا پڑے گا کال ایسا
دِیے کی روشنی اس کے لیے سزا ہوگی

ہزار داؤں اندھیرے بھی آزما دیکھیں
کرن ذرا سی بھی ہوگی تو خود نما ہوگی

جب اس کے ہاتھ میں ہے ڈور سب پتنگوں کی
ہم آج جیسے ہیں، اس کی یہی رضا ہوگی

یہ اپنے جامے سے باہر یونہی نہیں خاورؔ
اُچھلتی لہر کے پیچھے کہیں ہوا ہوگی

○

ہر ایک لمحہ ہے مجھ پہ طاری، خیال تیرا
میں اک پرندہ، محیط جس پر ہے جال تیرا

بچھڑ کے کُونج اپنی ڈار سے، بین کر رہی ہے
جُدا ہے تُو ہم سے، جانے کیا ہوگا حال تیرا

یہ ایک ٹہنی ہے میرا مسکن، نہ چھین مجھ سے
ہوائے سرکش! جنوب تیرا شمال تیرا

جو سبز پتّے تھے ڈھال تیری، وہ جھڑ گئے ہیں
صلیب شاخوں پہ جھُولتا ہے زوال تیرا

لہو کی کرنوں سے شب کو چھلنی کیا ہے تُو نے
رہے گا سُورج کی طرح روشن کمال تیرا

اقبال کوثر

○

اندر سے منتشر ہوں کہ باہر شکستہ ہے
میں خود شکستہ ہوں کہ مرا گھر شکستہ ہے

کس زلزلے کی رو سے جھنجھوڑا ہوا ہے گھر
دیوار ہے شکن بہ شکن، در شکستہ ہے

ہر شے کے خال و خد ہیں مرے خوں میں منتشر
ہر جسم میرے جسم کے اندر شکستہ ہے

نکلا تھا کس کی ناؤ میں، ساحل کے چاؤ میں
اب تک ہوں میں بہاؤ میں، لنگر شکستہ ہے

اِک سنگ سے ہے فکرِ ارسطو سَر رنُما
اِک آئنے میں عکسِ سکندر شکستہ ہے

اِک محویت کہ حیرتِ ساحل ہے ہر طرف
اِک کیفیت کہ سارا سمندر شکستہ ہے

یا شیشۂ نگہ ہی ملا مجھ کو چُور چور
یا شش جہت میں ایک ہی منظر شکستہ ہے

کوثرؔ بدل گئے ہیں پرستش کے ذائقے
محراب سر خمیدہ ہے، منبر شکستہ ہے

○

صورتِ کوثرؔ میں کوئی اور ہے
میں کہاں ہوں، گھر میں کوئی اور ہے

ایسا لگتا ہے کہ میں ہوں سامنے
اور پس منظر میں کوئی اور ہے

یا مرا خود سے تعارف ہی نہیں
یا مرے پیکر میں کوئی اور ہے

کل کے شیشے میں اُترتا ہے مجھے
آج کے پتھر میں کوئی اور ہے

ذہن کی رو میں ہیں کتنی صورتیں
آنکھ کے منظر میں کوئی اور ہے

تُو نہیں اس وقت اپنے رُو برو
آئنے کے گھر میں کوئی اور ہے

کربلا کا سلسلہ ٹوٹا نہیں
اب کے اس محشر میں کوئی اور ہے

خلیل رامپوری

○

رہے گی کب تلک سیلاب کی ہیبت مکانوں پر
سفیدی پھیر دی جائے گی پانی کے نشانوں پر

ہنسی آتی ہے اپنے دوستوں پر، نکتہ دانوں پر
گرجتے ہیں جو بادل کی طرح میری اُڑانوں پر

میں کیسے مان لوں کھڑکی ہوا نے کھول دی ہوگی
ابھی تک اوس کے قطرے ہیں پتوں کی زبانوں پر

ستاروں کے بجھانے کا سماں دیکھا نہیں جاتا
اُچھالی جا رہی ہے آج کل کیچڑ جوانوں پر

وہ بولے گا تو ذوق و شوق کا بازار چمکے گا
کہ ہر اخبار کی بنیاد ہے اس کے بیانوں پر

کبھی بہتے ہوئے پانی میں دیواریں نہیں اُٹھتیں
کبھی پہرے نہیں لگتے پرندوں کی اُڑانوں پر

مناظر سے کبھی انسان دھوکا کھا ہی جاتا ہے
حقیقت کا گماں ہوتا ہے اکثر داستانوں پر

کھُلا کرتے ہیں میری چھاپ پر دفتر معانی کے
اُگا کرتے ہیں میری دھول سے جنگل چٹانوں پر

بھنور پڑتے ہوئے پانی میں رستہ چھوڑ دیتے ہیں
کنارے ناز کرتے ہیں ہمارے بادبانوں پر

ہمارے مورچوں سے عزم کے سورج اُبھرتے ہیں
سحر انگڑائیاں لیتی ہے توپوں کے دہانوں پر

قلم فن کار کا یارو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑتا
کبھی کائی نہیں جمتی ہے شعلوں کی زبانوں پر

مری تخلیق سے جدت کا اِک دروازہ کھُلتا ہے
مری تخلیق نے گاڑے ہیں جھنڈے آسمانوں پر

کہ جیسے میں خلیل ہر شخص کے دُکھ کا مداوا ہوں
چلا جاتا ہے اپنا بوجھ رکھ کر میرے شانوں پر

○

جلا کے چھوڑ دیا ہے چراغ پانی میں
بھرے گا رنگ کوئی اور اب کہانی میں

میں جی رہا ہوں ابھی تک تری نشانی میں
وہ پیڑ سوکھ گئے جو کھڑے تھے پانی میں

ہٹانا پڑتے ہیں بھائی پہاڑ رستے سے
کنارا کھینچنا پڑتا ہے بادبانی میں

اُڑے گی ریت بھی دریاؤں کے دہانوں پر
پڑے گی برف بھی سورج کی راجدھانی میں

یہ لوگ سادہ ورق کی طرح ہیں، کیا کہیے
سمجھ لیا ہے کہ پتھر پڑے ہیں پانی میں

اِدھر اُدھر کے پرندے بھی چونچ مارتے ہیں
نہ جانے کونسی خوشبو ہے چائے دانی میں

ہوائیں توڑتی رہتی ہیں شاخ سے پتے
ستارے گھومتے رہتے ہیں پاسبانی میں

وہ بھیڑ میں بھی اکیلا دکھائی دیتا ہے
کہ جیسے مرکزی کردار ہو کہانی میں

جو کہہ دیا ہے، اُسی کا چراغ روشن رکھ
نہ زہر ڈال میاں اپنی مہربانی میں

پھلوں کے باغ میں رہ کر کبھی نہ کھایا پھل
ہم اپنے آپ کو ڈھالتے رہے جوانی میں

یہ دُھوپ روز نکلتی ہے روز ڈھلتی ہے
یہ سلسلے ہیں عجب تیری حکمرانی میں

چمک رہے ہو جو آٹو گراف دے کے خلیل
تمہارا نام بھی لے گا وہ ترجمانی میں

لیث قریشی

○

عمر بھر خوابِ محبت سے نہ بیدار ہُوئے
اسی کردار سے ہم صاحبِ کردار ہوئے

کبھی کانٹوں کی جراحت سے بھی آرام ملا
لالہ و گُل بھی کبھی باعثِ آزار ہوئے

آدمیّت کے خد و خال کو زینت نہ ملی
سارے آئین فقط نقش بہ دیوار ہوئے

کتنے دشمن تھے زمانے میں ہمارے، لیکن
اپنی ہستی ہی سے ہم برسرِ پیکار ہوئے

دوستو! ایک تمہاری بھی ریاکاری سے
ہم کو ہونا تھا خبردار، خبردار ہوئے

نوحۂ ذات کا یہ بھی تو اِک انداز ہُوا
اشک آنکھوں میں نہیں آئے تو اشعار ہوئے

بات کچھ یوں ہے کہ ہمت ہی نہ ہاری میں نے
میرے پندارِ خودی پر تو بہت وار ہوئے

رنگ و بو پاؤں کی زنجیر ہوئے جاتے ہیں
جا نسیمِ سحری! ہم تو گرفتار ہوئے

ہم کہ سرگرمِ سفر تھے، رہے سرگرمِ سفر
مرحلے تو کبھی آساں، کبھی دشوار ہوئے

اب تو ناقدریٔ اربابِ ہُنر ہے اے لیثؔ
آپ کیا سوچ کے اس عہد میں فن کار ہوئے

○

نہیں یہ بات کہ پرواز کا ارادہ نہیں
فضائے گلشنِ ہستی مگر کشادہ نہیں

مزاجِ عشق تو اپنا ہے اعتدال پسند
یہی روش ہے، کبھی کم نہیں زیادہ نہیں

خزاں میں بھی مرا نشّہ اُتر نہیں سکتا
کہ یہ ہے جوشِ جنوں، کوئی جوشِ بادہ نہیں

شعور و فکر میں آزاد ہے مزاج مرا
مرے بدن پہ کسی اور کا لبادہ نہیں

نگاہ چاہیے، تحریر ہو خفی کہ جلی
کتابِ زیست کا کوئی ورق بھی سادہ نہیں

رہِ حیات میں دانستہ مثلِ شمع جلے
ہماری ذات کا ایثار بے ارادہ نہیں

نہ زادِ راہ کی خواہش، نہ راہبر کی طلب
ہمارے واسطے دشوار کوئی جادہ نہیں

پڑا جو وقت تو غیروں نے میرا ساتھ دیا
مرے شریک مرے اہلِ خانوادہ نہیں

بساطِ دہر پہ کیا چال کامیاب چلے
تری نظر میں اگر عظمتِ پیادہ نہیں

جہاں میں ملنے کو ملتے ہیں یوں تو سب سے لیثؔ
مگر کسی سے بھی مقصود استفادہ نہیں

لیث قریشی

کئی پیام برائے سکونِ جاں تو ملے
مگر تمام ہوئی اپنی داستاں، تو ملے

کوئی تو سمجھے مرے کرب کا لب و لہجہ
یہ آرزو ہے، مجھے کوئی ہم زباں تو ملے

کوئی فضا، کوئی موسم ہو، ہم سے ہو منسوب
بہار اگر نہیں ملتی، ہمیں خزاں تو ملے

مقامِ شکر ہے میرے لیے کہ آخرِ کار
مرے حریفوں میں کچھ اہلِ خانداں تو ملے

یہی بہت ہے، خزاں کو خزاں جو کہتے ہیں
کچھ ایسے پھول ہمیں زیبِ گلستاں تو ملے

حکایتِ دلِ دردآشنا سناؤں گا
تری نظر سے مجھے جرأتِ بیاں تو ملے

یہ زندگی کے بیاباں ہیں دھوپ کا صحرا
کہاں قیام کروں، کوئی سائباں تو ملے

یہ روز و شب بھی ہمارے بدل تو سکتے ہیں
کبھی زمین سے آ کر یہ آسماں تو ملے

رہا ہوئے ہیں مگر لیثؔ یہ رہائی کیا
قفس سے چھوٹنے والوں کو آشیاں تو ملے

کرم نہ کیجیے ہم پر بڑا کرم ہوگا
متاعِ فکر و نظر چھن گئی تو غم ہوگا

یہ بات طرّہ و دستار تک نہیں محدود
مزاجِ وقت جو بدلا تو سر قلم ہوگا

تو شاخِ گُل ہے تو پھر تیرا یہ مقدر ہے
کہ تجھ پہ جب بھی بہار آئے گی، ستم ہوگا

جلا سکے جو نہ اپنے لہو سے کوئی چراغ
وہ قد میں اپنی ہی پرچھائیوں سے کم ہوگا

متاعِ دردِ بشر جس کو ہوگئی حاصل
اس ایک شخص میں عالم تمام ضم ہوگا

کسی لقب سے نوازو، کوئی خطاب بھی دو
جو محترم ہے، وہی شخص محترم ہوگا

رہِ وفا تجھے دوں گا نفس نفس کا حساب
اگرچہ جاں کا زیاں تو قدم قدم ہوگا

ہے ایک لیثؔ بھی شعر و سخن کی دنیا میں
یہ نام بھی کبھی تاریخ میں رقم ہوگا

ظفر ابن متین

○

کم اس طرح بھی سچ کا اثر کر دیا گیا
دیوانہ کہہ کے شہر بدر کر دیا گیا

سامانِ ذوقِ اہلِ بصر کر دیا گیا
تھوڑا سا کچھ اِدھر سے اُدھر کر دیا گیا

اس جرم پر کہ شہر میں ہے بدنما یہ داغ
مسمار اِک غریب کا گھر کر دیا گیا

دیکھو تو عہدِ نو کی ترقی پذیریاں
ہر بے ہنر کو اہلِ ہنر کر دیا گیا

یہ بات ماننے کو میں تیار ہی نہیں
ایسے کہاں تھے آپ، مگر کر دیا گیا

"پوچھا نہ جیتے جی کبھی دل کا معاملہ"
اِک جشن بعدِ مرگ ظفرؔ کر دیا گیا

○

پھینکوں کب تک تیر ہوا میں
بانجھ ہے ہر تدبیر ہوا میں

لپٹی ہیں بے مقصد سوچیں
اُلجھی ہے زنجیر ہوا میں

قوسِ قزح ہر بات ہے اس کی
اُڑتی ہے تصویر ہوا میں

پَر کھولوں ؟ پر کیسے کھولوں!
چلتی ہے شمشیر ہوا میں

بُوٹا بُوٹا جھلسا جھلسا
زہر کی ہے تاثیر ہوا میں

آنے والی نسل کی خاطر
لکھ جاؤں تحریر ہوا میں

حلیم قریشی

○

تُو قفس میں مرا اُجڑا ہوا گھر لے آیا
دوست، یہ کیسی رہائی کی خبر لے آیا

اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کا پتہ دینے کو
خود وہ زخمی تھا، یہ ٹوٹے ہوئے پر لے آیا

نہ ترے ہونٹ ہی لرزاں، نہ زباں ہے گویا
گھر میں تُو کون سی گلیوں کا اثر لے آیا

اور بھی تیز ہو پرواز جو نیچے دیکھوں
کس بلندی پہ یہ گر جانے کا ڈر لے آیا

جس پہ کھلتے تھے مرے صبر و شکیبائی کے پھُول
غم کا سیلاب بہا کر وہ شجر لے آیا

خُوں کی جلتی ہوئی اِک بوند بجھانے کو حلیمؔ
ایک سیلاب مرا دیدۂ تر لے آیا

○

اے دستِ ستم اور بہ کہ سر اور بھی ہوں گے
سجّے ہیں مکیں جن کے، وہ گھر اور بھی ہوں گے

منزل پہ پہنچ کر بھی محبّت کا مسافر
سہما ہُوا بیٹھا ہے تو ڈر اور بھی ہوں گے

یہ ہجر کی شب ہے، شبِ آخر تو نہیں ہے
زندہ ہیں تو پھر شام و سحر اور بھی ہوں گے

کچھ اور بھی چمکیں گے شبِ ہجر کے تارے
جو بیت چکے ہیں، وہ سفر اور بھی ہوں گے

جاں دینا تو اک رسم پرانی ہے مری جاں
میدانِ محبّت کے ہُنر اور بھی ہوں گے

آصف ثاقب

○

ہوں گُلِ خاک نشیں، سر پہ سجا لے مجھ کو
اپنا پندار بنا، سامنے والے! مجھ کو

میں نے یاروں کو سُجھایا ہے چلن جینے کو
اس محبّت میں پڑے جان کے لالے مجھ کو

لفظِ تابندہ ہوں، اظہار کو رونق بخشوں
تُو اگر ذہن کی کالک سے چھُڑا لے مجھ کو

اس تھکاوٹ نے دکھائے ہیں جزیرے کتنے
لے گئے کون نگر پاؤں کے چھالے مجھ کو

تن بہ تقدیر میں دریاؤں میں اُتروں ثاقب
سر پھری موج کوئی سر پہ اُٹھا لے مجھ کو

○

نشاں غبار ہُوا شہرِ گُل کے باسی کا
مزارِ رنگ پہ کتبہ لگا اُداسی کا

ملالِ برگ بہاروں میں بھی نہیں اُس کو
درختِ جاں کا تو خُوگر ہے بے لباسی کا

بلا رہے ہیں رفیقو چنار کے سائے
کوئی تو چارہ کرو گاؤں کی اُداسی کا

مرے لہو کی ردا تیرے جسم سے لپٹی
وقار بڑھ ہی گیا تیری خوش لباسی کا

شعورِ حرف نہیں، بس میں شرحِ کرب نہیں
ضرور پھر بھی ہے دعویٰ سخن شناسی کا

صوفی عبدالرشید

○

بہاروں کے پروردہ، پت جھڑ کا موسم بھی دیکھیں
جہاں بیش دیکھا تھا پھولوں کا، اب کم بھی دیکھیں

ستم ڈھا گئی ہے ہواؤں کی مشاطگی بھی
مرے یار اب زُلفِ دوراں کو برہم بھی دیکھیں

مگر اس کے تاریک رستوں میں بھی روشنی ہو
چلو آج ہم اپنے جلنے کا عالم بھی دیکھیں

وہی جس کے شعلوں نے ہر خرمنِ جاں جلایا
اُسی آنکھ کو اب سبھی لوگ پُرنم بھی دیکھیں

وہی جس سے انسان تھا جاں بلب، جاں دریدہ
اُسی سر کو ہم پیشِ انساں کبھی خم بھی دیکھیں

مٹاتی رہی ہے ہمیں بادِ تندِ زمانہ
کبھی اپنی اِس بے ثباتی کا ماتم بھی دیکھیں

○

جسے ہو خوفِ خزاں، میرا گلستاں تو نہیں
یہ شاخِ خشک مرے سر پہ آسماں تو نہیں

بشر ہوں، معصیتِ عشق میری فطرت ہے
مرا جہان جہانِ فرشتگاں تو نہیں

میں اعترافِ گنہ بھی کروں تو کیسے کروں
یہ تیرا قول ہے ہمدم، مری زباں تو نہیں

تری نگاہ میں کیوں خوف سا جھلکنے لگا
چھپی ہوئی مرے خرمن میں بجلیاں تو نہیں

تو میرا دوست، مرا یار، میرا محرم ہے
رگِ گلو پہ کہیں تیری انگلیاں تو نہیں

برس پڑے ہیں جو سنگِ ملامتِ اغیار
رشیدؔ یہ بھی کہیں لطفِ دوستاں تو نہیں

احسان اکبر

○

کس طرح دل ترے آجانے کو آنا جانے
تُو جو ملنے کو فقط ہاتھ ملانا جانے

اِک نہ مٹتی ہوئی تہذیب مری لوح میں ہے
وقت چاہے بھی تو مجھ کو نہ مٹانا جانے

خواب، جس کی نہیں تعبیر، نگاہوں میں بسا
حرف جو ہم نہیں کہہ پاتے، زمانہ جانے

جیسے سایہ ہے نہ دیوار کوئی اس کے سوا
دل نہ جانے ہی کی سنتا ہے نہ جانا جانے

رُوح کے سارے اندھیرے ہیں مرے لہجے میں
غم مرے، تو بھی کبھی اے غمِ جاناں! جانے

حرف تو لوٹ کے آسکتا ہے گزرے کل میں
رات کا خواب جو تعبیر میں لانا جانے

جو ترے دل میں بسے ہیں وہ نہ جانے کیا ہوں
تُو جنھیں بھولا ہے جب اُن کو زمانہ جانے

○

کبھی ساعتوں کے وصال میں مجھے دیکھتے
تو حریف میرے زوال میں مجھے دیکھتے

کوئی لڑکھڑاتا ثبات میرا یقین تھا
کبھی معتقد مرے حال میں مجھے دیکھتے

سبھی جن کو تجھ سے ہیں فاصلے غمِ دہر کے
تجھے دیکھنے کے خیال میں مجھے دیکھتے

یہی دیکھتے کہ اِک اور عہد گزر گیا
وہ جو فرصتِ مہ و سال میں مجھے دیکھتے

مرے راستے کے نقوش چہرے سے پوچھتے
مری حیرتوں کے سوال میں مجھے دیکھتے

میں اِک آئینہ جسے توڑتے کبھی جوڑتے
کہ سب اپنی صورتِ حال میں مجھے دیکھتے

سیّد محسن نقوی

○

ڈھلے گی وحشی جدائیوں کی یہ رات آخر
چلے گی اپنے وصال سُورج کی بات آخر

ہماری تشنہ لبی کے تیور یہ کہہ رہے تھے
ہمارے پاؤں پڑے گی موجِ فرات آخر

وہ پھینکتا جا رہا تھا شعلوں میں خط کسی کے
جلا دیے اُس نے اپنے نازک سے ہات آخر

مجھے تو کب سے اَنا کے سونے کی جستجو تھی
گرا دیا میں نے ذات کا سومنات آخر

میں منتظر ہوں کچھ اس طرح کی خبر کا محسنؔ
کہ چھا گئی موت پر بشر کی حیات آخر

○

بنامِ طاقت کوئی اشارہ نہیں چلے گا
اُداس نسلوں پہ اب اجارہ نہیں چلے گا

ہم اپنی دھرتی سے اپنی ہر سمت خود تلاشیں
ہماری خاطر کوئی ستارہ نہیں چلے گا

حیات اب شامِ غم کی تشبیہہ خود بنے گی
تمھاری زُلفوں کا استعارہ نہیں چلے گا

چلو سروں کا خراج نوکِ سناں کو بخشیں
کہ جاں بچانے کو استخارہ نہیں چلے گا

ازل سے قائم ہیں دونوں اپنی ضدوں پہ محسنؔ
چلے گا پانی مگر کنارہ نہیں چلے گا

نکہت بریلوی

○

بے حرف وصوت کوئی سخن ہو تو کیجیے
حاصل جو یہ مہارتِ فن ہو تو کیجیے

یونہی لٹائیے نہ متاعِ سخنوری
دُور اس سے زندگی کی گھٹن ہو تو کیجیے

باقی نہ رہ سکے کوئی ظُلمت کا سلسلہ
روشن دلوں میں ایسی کرن ہو تو کیجیے

بادِ خزاں نے خاک اُڑا دی ہے باغ میں
کچھ اہتمامِ سرو وسمن ہو تو کیجیے

دستور کوئی سا بھی بنا لیجیے مگر
رائج محبتوں کا چلن ہو تو کیجیے

پھر کھِل اُٹھیں وفورِ جنوں میں سروں کے پھول
پھر تازہ فصلِ دار و رسن ہو تو کیجیے

نکہت بس اب تو جاں سے گزرنا ہی رہ گیا
یہ بھی پئے وقارِ وطن ہو تو کیجیے

○

پلٹ آتے ہیں تھوڑی دُور چل کر قافلے اپنے
کہ جیسے کم نہ ہو جائیں، سفر میں فاصلے اپنے

ہماری خواہشوں پر تو نہیں چلتا رواں پانی
جدھر چاہیں، بنا لیتے ہیں دریا راستے اپنے

کسے آواز دے کر اپنی تنہائی کا غم کاٹیں
کہاں گمُ ہو گئے جو لوگ اب تک ساتھ تھے اپنے

نہ اب وہ دن ہی باقی ہیں، نہ ان جیسی کوئی صورت
مگر زنجیر ہیں اب تک وہی سب سلسلے اپنے

ہمارے ساتھ آئے بھی تو کیا لینے کوئی نکہت
کڑی ہے دھوپ سر پر اور کٹھن ہیں مرحلے اپنے

کاوش بٹ

○

ستم کے چار سو خیمے گڑے ہیں
طنابیں روک کر دل کی کھڑے ہیں

پھلوں سے کر دیا محروم، لیکن
شجر پھر بھی قطاروں میں کھڑے ہیں

پرندے کر گئے پیڑوں کو تنہا
اب ان کے گھونسلے خالی پڑے ہیں

وفا دشمن ہوا جب بھی چلی ہے
تری خاطر ہوا سے لڑ پڑے ہیں

سنائی کچھ نہیں دیتا، مگر ہم
پسِ دیوار مدت سے کھڑے ہیں

○

ثمر اب کھوکھلے ہونے لگے ہیں
قد و قامت شجر کھونے لگے ہیں

جو دعوے دار تھے آسودگی کے
وہ لمبی تان کر سونے لگے ہیں

گلی، کوچوں، محلّوں، ہوٹلوں میں
خُدا پر تبصرے ہونے لگے ہیں

صدی کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے
زمانے آشنا ہونے لگے ہیں

زمینیں کس طرح اُگلیں گی سونا
دُکھی دل حسرتیں بونے لگے ہیں

مختار جاوید

○

سوال تھا کہ تُو ذرّوں کو بے زمیں کرتا
یہ آندھیوں کا تسلسل مزا نہیں کرتا

زباں زباں پہ ہیں زہراب خصلتیں جس کی
سُنا گیا ہے وہی وردِ انگبیں کرتا

لہو کا کھیل نہ ہولی کے نام سے کھیلیں
یہ داغ کوئی نہیں زیبِ آستیں کرتا

فضا میں لُو کے الاؤ نہ تیرتے پھرتے
اگر وہ شخص ہوا کو نہ آتشیں کرتا

میں چاہتا ہوں کہ نفرت کا زہر مر جائے
وگرنہ پیار کوئی سانپ سے نہیں کرتا

ذرا سا اور اُجالوں کا انتظار کرو
ہر ایک شب تو نہیں چاند چودھویں کرتا

○

کون کہتا ہے کہ اِس پار تک آ پہنچا ہوں
میں تو اُس پار سے منجدھار تک آ پہنچا ہوں

خود فروشی کا یہ عالم ہے کہ فن پاروں سے
بڑھ گئی بات تو کردار تک آ پہنچا ہوں

اے مری راہ میں کہسار اُٹھانے والے
میں تری ریت کی دیوار تک آ پہنچا ہوں

اس قدر شور اُٹھا گھر میں خریداری کا
جیب میں کچھ نہیں، بازار تک آ پہنچا ہوں

زخم لگتے ہی اُڑانوں میں وہ تیزی آئی
جس سے بچھڑا تھا اُسی ڈار تک آ پہنچا ہوں

شب گرفتہ وہ سمجھتے رہے جاوید مجھے
اور میں صبح کے آثار تک آ پہنچا ہوں

روحی کنجاہی

○

ہر غم کو گلے لگا رہے ہو — یارو، بہت اچھے جا رہے ہو
کل تک تو چھپا رہے تھے خود کو — اب مجھ سے مجھے چھپا رہے ہو
جیسے مجھے تم مٹا ہی دو گے — یوں میرے قریب آ رہے ہو
خوش ہوں بہت اپنی بے بسی پر — کس شان سے مسکرا رہے ہو
ہر زخم مہک اٹھا ہے، یعنی — ہر وار پہ داد پا رہے ہو
ہر بات پہ ٹوک ٹوک کے تم — آداب عجب سکھا رہے ہو
ہر راستہ بند کر کے مجھ پر — خود راہ نئی سجھا رہے ہو
ہر روز بدل بدل کے عنواں — باتیں وہی پھر سُنا رہے ہو
ہونے لگا حبس میں اضافہ — تم کیسی ہوا چلا رہے ہو
کالک کی لپیٹ میں ہے بستی — تم کیسے دیے جلا رہے ہو
سیلاب کا زور توڑنے کو — پستی میں نگر بسا رہے ہو
اس شوق پہ کیوں نہ مر مٹوں میں — کمرے میں پتنگ اُڑا رہے ہو
جیسا ہوں میں اپنے سامنے ہوں — تم آئینہ کیا دکھا رہے ہو
ٹوٹا ہے کوئی نیا ستم کیا — کیوں شور بہت مچا رہے ہو

چھوڑو مری بات، میرا کیا ہے
روحی کہو، کیسے جا رہے ہو!

○

حساب اِک روز لمحے لمحے کا دینا پڑے گا — خبر کیا تھی کہ دورِ عشق یوں مہنگا پڑے گا
زمانہ صورتِ حالات کر دے گا کچھ ایسی — قدم سیدھا اٹھاؤ گے تو وہ اُلٹا پڑے گا
تم اتنے کیوں ہو رنجیدہ، ابھی کس سے ملے ہو — نگر میں جانے کس کس سے ابھی پالا پڑے گا
سلوکِ دہر تو جیسا ہے سب کے سامنے ہے — خیال اب اپنے دل کا آپ ہی رکھنا پڑے گا
سرِ میداں بڑھانا ہوگا اپنا حوصلہ آپ — یہ اپنا کام ہے اور آپ ہی کرنا پڑے گا
مسائل سے مسائل حل کیے جاؤ بصد شوق — مگر اک روز یہ سودا بہت مہنگا پڑے گا

اُسے سمجھانے تو نکلے ہو روحی، پر خبر ہے
اثر اُس پر تمھاری بات کا کیسا پڑے گا

رشک خلیلی

○

ہر کرن جیسے زمیں پر بے سہارا ہوگئی
روشنی سورج سے گر کر پارہ پارہ ہوگئی

رفتہ رفتہ پھر غبار آلود آئینہ ہُوا
رفتہ رفتہ پھر وہی صُورت دوبارہ ہوگئی

کتنا عبرت ناک تھا دریا اُترنے کا سماں
جو بھی موج آئی، کنارے تک کنارا ہوگئی

اہلِ نظارہ کو ہے پھولوں کو مرجھانے کا غم
مجھ کو یہ صدمہ ہے، خوشبو بے سہارا ہوگئی

گھر کے جلنے سے چلو اِتنا تو اندازہ ہُوا
آگ کیوں شعلہ بنی، کیسے شرارہ ہوگئی

تو کسی کے زیرِ سایہ رہنے والا تو نہ تھا
تیرگیِ شب تجھے کیسے گوارہ ہوگئی

دیکھیے شاید کسی کے شعر میں آئے نظر
رشک اب تو زندگی اِک استعارہ ہوگئی

○

فلک سے ٹوٹنے والے شہاب کتنے ہیں
ابھی زمیں کا مقدّر عذاب کتنے ہیں

عمارتوں سے تو ہوتا نہیں یہ اندازہ
ہمارے شہر میں خانہ خراب کتنے ہیں

پلک جھپکنے سے پہلے بتاؤ تو جانیں
ابھی ابھی جو بنے ہیں حباب، کتنے ہیں

ستم زدہ ہیں بہت لوگ اے خدا لیکن
حقیقتاً ترے زیرِ عتاب کتنے ہیں

گلی گلی ہوئیں رسوائیاں تو ہم سمجھے
ہمارے شہر میں عزّت مآب کتنے ہیں

مری طرح کبھی دُنیا کی خاک چھان کے دیکھ
کہ ذرّے کتنے ہیں اور آفتاب کتنے ہیں

ابھی گزرنا ہے اے رشک کتنی راتوں سے
ابھی ہمارے مقدّر میں خواب کتنے ہیں

خاور رضوی

○

پہنچ گیا ہوں دیارِ مہ تک، خلا کی تسخیر کر رہا ہوں
مگر یہاں اپنے بھائیوں کی نمو کو زنجیر کر رہا ہوں

وہ میری سرگشتگیٔ دل کو جنون کہہ کر پکارتے ہیں
میں اپنے زخموں کو آگہی کی ضیا سے تعبیر کر رہا ہوں

یہ کربِ دل کا، یہ ناصبوری، یہ دورِ غم دُور ہے عبوری
مجھے یہ تعمیر کر رہا ہے، اسے میں تعمیر کر رہا ہوں

یہ تیری آنکھوں میں قہر کیسا، تری جبیں پر یہ کیوں شکن ہے
کچھ اپنی حالت سدھارنے کی اگر میں تدبیر کر رہا ہوں

یہ زور و زر کے پرانے سکّے نہ ہوں گے معیارِ سرفرازی
میں کل کے دستور کی عبارت لہو سے تحریر کر رہا ہوں

رہِ تعلق میں آج کیسا عجیب یہ موڑ آ گیا ہے
نہ تیری تکریم کر رہا ہوں، نہ تیری تحقیر کر رہا ہوں

نہ شعر سے آشنا ہوں خاور نہ واقفِ لہجۂ غزل ہوں
جو دل پہ آیاتِ زخم اُتری ہیں، اُن کی تفسیر کر رہا ہوں

○

تنہا نہیں، یقیں کی کمک میرے ساتھ ہے
کل آنے والی رُت کی مہک میرے ساتھ ہے

اُس کو ہے اپنی گفتگوئے پُرفسوں پہ ناز
لہجے کی پُر وقار کھنک میرے ساتھ ہے

بس اتنی برتری سے مجھے اپنے عدو پہ ہے
کوئی نہ وسوسہ ہے، نہ شک میرے ساتھ ہے

کیا نام اس اساسِ تعلق کو دیجیے
بادل ہیں اس کے ساتھ، دھنک میرے ساتھ ہے

کیا کیا زمیں نے کھائے ہیں تیرہ شبی کے زخم
کیا کیا نہ جگنوؤں کی چمک میرے ساتھ ہے

جیسا بھی میں ہوں، سامنے دُنیائے دوں کے ہوں
کوئی نہ معذرت نہ جھجک میرے ساتھ ہے

اِک جیسے صبح و شام ہیں خاور کہوں میں کیا
میرے خلاف ہے کہ فلک میرے ساتھ ہے

امداد ہمدانی

○

کسی کے واسطے کیا کیا ہمیں دُکھ جھیلنے ہوں گے
شبوں کو جاگنا ہوگا، کڑے دن کاٹنے ہوں گے

خزاں کا زہر اہلِ شہر کی رگ رگ میں اُترا ہے
بہاروں میں بھی اب تو زرد چہرے دیکھنے ہوں گے

ہمیں دُنیا کی گردش یہ تماشا بھی دکھائے گی
گھروں میں تیرگی ہوگی، منڈیروں پر دیے ہوں گے

فصیلِ قصر کے گرنے کا خدشہ بے محل سا ہے
ہوائیں لے اُڑیں جن کو وہ اپنے جھونپڑے ہوں گے

بھنور کی سمت دیکھا تک نہیں احباب نے، لیکن
میں بچ نکلا تو ساحل پر کئی بازو کھُلے ہوں گے

کوئی دولت نہیں امداد اپنے دست و دامن میں
فقط یادوں کے سِکے دل تجوری میں رکھے ہوں گے

○

راستے دشوار ہیں، سر پر کھڑی ہے رات، چل
پاؤں سے پاؤں ملا، ہاتھوں میں لے کر ہات چل

یہ صدائیں تو ہوائیں ہیں، بدل ہی جائیں گی
منزلوں کی جستجو ہے تو ہمارے سات چل

کھو نہ جائیں ہم کہیں تاریکیوں کے دشت میں
منتظر ہے تیرا میرا شہرِ امکانات، چل

سارے باشندے یہاں کے مصلحت اندیش ہیں
اس نگر میں کون سُنتا ہے کسی کی بات، چل

ٹوٹ ہی جائے گا تیرا کاسۂ دل بھی کہیں
پتھروں سے کیا ملے گی پیار کی خیرات، چل

دیکھ لے امداد آنکھوں کے دریچے کھول کر
ابر بکھرا، دھوپ نکلی، ہو چکی برسات، چل

سیّد یٰسین قدرت

○

کسے خبر ہے ، بدل ہی جائے ، ہوا پہ کیا اعتبار رکھنا
تم آنے والے سمے کی دھن میں ، نگارِ فن کو نکھار رکھنا

سحر کا فانوس بجھ کے کتنے چراغ شب جگمگا گیا ہے
دمکتے ذرّو ! اُداس سورج سے رابطے استوار رکھنا

خیال رکھنا ، کہ بھر نہ جائیں خزاؤں میں زخم آرزو کے
کہ پھول موسم کی چاہتوں میں مدام سینے فگار رکھنا

سُنا ہے جب انقلاب ہوگا تو درد کا بھی حساب ہوگا
دیے ہیں جتنے بھی زخم اس نے دلوں میں ان کا شمار رکھنا

صداؤں کے گل کھلیں تو کیسے جو نکہتِ حرف عام ہوتی
چمن کو احکام مل چکے ہیں۔ سکوت اپنا شعار رکھنا

اُترنے والا ہے اس کی خوددار روح کا مشک آسماں سے
فضائیں ہوجائیں گی معطر۔ مشامِ جاں کو سنوار رکھنا

بشیر اسیر زیدی

○

اے قسیمِ جاں ، مجھ کو جودتِ طبیعت دے
حُسن بے عنایت کا عشق بے نہایت دے

صورتیں ہیں انجانی ، خون ہو گئے پانی
وحشتِ ہراسانی ، مژدۂ قیامت دے

اس کی تلخیٔ خو کا ، کیا بھلا گلہ کرتے
تشنگی کے ماروں کو زہر بھی حلاوت دے

جی میں ہے کہ جا کہیے ، جو بھی جی میں ہے لیکن
کون اُس جفا جُو کو ، دعوتِ عداوت دے

زخم زخم دل میرا ، لخت لخت جاں میری
دیدۂ فسوں گر کو ، رخصتِ عیادت دے

تیری چشم و ابرو کا ، سب کو فیصلہ معلوم
میری بے گناہی کی کون کیا شہادت دے

تو کہ مالک و قادر ، ایک التجا سُن لے
دل شکستہ دے جس کو ، دل اسے سلامت دے

اِک اسیرِ کم جاں تھا ، سنگ تھے ملامت کے
سب شریکِ مقتل تھے ، کون کس کو تہمت دے

اکبر حمیدی

○

سبب ہو کوئی بھی ، یہ حادثہ تو ہونا تھا
ہمیں بس آخری منظر میں اس کو کھونا تھا

عجیب لوگ تھے ، جو چاہتے سو کر دیتے
کوئی نہ پوچھتا ان سے، یہی تو رونا تھا

تمام لوگ تھے سوئے سکون کی نیندیں
وہ جاگتے رہے ، پانی جنھیں بلونا تھا

نہ کوئی ہجر کا دن تھا ، نہ کوئی وصل کی رات
گلوں کے خواب تھے اور پتھروں پہ سونا تھا

سمندروں کے سفر پر کمر ہی کیوں باندھی
جو پانیوں میں نہ دامن تمھیں بھگونا تھا

تمھارا رشتۂ زر پائیدار ثابت ہو
ہمیں تو رشتۂ جاں میں تمھیں پرونا تھا

اب اس کے شہر میں رہنے سے کچھ نہ تھا حاصل
جب اس کو دیکھتے اکبرؔ ملال ہونا تھا

○

اتنا احسان بھی مجھ پر کر دے
اے خدا! اب مجھے پتھر کر دے

یا مجھے رنج فراغت دے دے
یا مجھے رنج سے خوگر کر دے

پیش منظر ہوں ، عطا ہو منظر
یا یہ منظر پسِ منظر کر دے

یا بجھا دے مرے سینے کا چراغ
یا مجھے ماہِ منوّر کر دے

سیلِ غم یا مرے سر سے گزرے
یا مجھے اس کا شناور کر دے

یا ملے اذنِ تکلّم اکبرؔ
یا مجھے بزم سے باہر کر دے

دل نواز دل

گم ہوا شہرِ طلب اپنی صدا کی راہ میں
آ گیا دشتِ سماعت بے نوا کی راہ میں

ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھائے قناعت کا جہاں
ایک دُنیا ہے رواں حرص و ہوا کی راہ میں

سُر کی منزل پر، بنا ٹھہرے، گزر ممکن نہیں
راگنی کے رُوپ ہیں نغمہ سرا کی راہ میں

جرم ثابت ہو گیا تھا اُس کا، لیکن کیا کروں
اِک سفارش ہو گئی حائل سزا کی راہ میں

کُن فکاں کی گُونج سے دھڑکیں زمین و آسماں
جب ستائے جان دیتے ہیں خُدا کی راہ میں

قبلۂ کونین کو دیکھے گی دُنیا ایک دن
وقت کی دیوار ہے قبلہ نُما کی راہ میں

ساحل ہوں، سمندر مری باہوں میں رہے گا
دل، تشنۂ دیدار، نگاہوں میں رہے گا

پائے گی زمیں، خاک نشیں، منزلِ ہستی
سورج وہ مسافر ہے جو راہوں میں رہے گا

دل تیرا کہیں اور، نظر تیری کہیں اور
کیا خاک مزا دُور کی چاہوں میں رہے گا

اب جسم کی حدّت میں نہیں سوز کی لذّت
اب ایسے میں کیا لُطف گناہوں میں رہے گا

توحید کا جس دل نے کیا دل سے اعادہ
وہ دل تو سدا تیری پناہوں میں رہے گا

پروین اختر شیرانی

سپہرِ قلب پہ ابرِ ستم کا ڈیرا تھا
چہار سمت سے تنہائیوں نے گھیرا تھا

جمالِ دوست کی رعنائیوں کی چھوٹ پڑی
وگرنہ دشتِ وفا میں بڑا اندھیرا تھا

ہزار حیف! کہ آخر نصیبِ غیر ہوا
وہ ایک شخص، جو میرا تھا، صرف میرا تھا

ازل سے لے کے ابد تک رہی فراق کی رات
ہوئی جو ختم، تو پھر حشر کا سویرا تھا

ہمیں تو کچھ بھی کڑی دھوپ کی خبر نہ ہوئی
کہ نخلِ عشق کا سایہ بہت گھنیرا تھا

نیازِ عشق سلامت پہ اب نہ آئیں گے
یہ آخری ترے کوچے میں اپنا پھیرا تھا

شہد ہونٹوں سے پلا، آنکھ سے صہبا، جاناں
زندہ رہنے کا سلیقہ مجھے سکھلا، جاناں

میرا دل کعبۂ صاحب نظراں ہوتا تھا
کر دیا تُو نے عبادت گہِ ترسا، جاناں

شمعِ اُمید تو جلتی ہے کئی برسوں سے
کاش چمکے مری قسمت کا ستارا، جاناں

دل یہ کہتا ہے، سمٹ جاؤں تری بانہوں میں
جب بھی دیکھوں سرِ محفل تجھے تنہا، جاناں

داغ سینے میں چھپائے گُلِ لالہ کی طرح
کتنی صدیوں سے کھڑی ہوں سرِ صحرا، جاناں

شبِ فرقت کے اندھیروں میں ہُوا جاتا ہے
تیرے چہرے کے تصوّر سے اُجالا، جاناں

یوسف علی لائق

مشعل تو صحرا میں ہے روشن اور اُجالا شہر میں ہے
آدھا قبیلہ شہر سے باہر، آدھا قبیلہ شہر میں ہے

کوئی کسی سے کیسے ملے؟ آسیب کا پہرا شہر میں ہے
قافلہ بن کر کل جو اُبھرا، آج اکیلا شہر میں ہے

مقتل میں ہے جشنِ خموشاں، جلتے ہوئے خیموں سے اُدھر
آوازوں میں گھرا ہوا اِک سناٹا سا شہر میں ہے

گھر تو ہمارا جل کر کب کا ہو بھی چکا خاکستر، لیکن
آگ لگانے والو دیکھو! اب بھی دھواں سا شہر میں ہے

کون سی ہو پہچان اپنی اور کون سا اپنا گھر ٹھہرے
گاؤں کا رہنے والا ہوں اور سارا اثاثہ شہر میں ہے

کشتیاں کیوں بنوا نہیں لیتے جو پانی سے ڈرتے ہیں
گھر سے نکلنا بھی ہے ضروری اور جزیرا شہر میں ہے

لائق جو مجھ سے مل جل کر میرے قتل میں شامل ہو
ایسا بھی دل والا کو [illegible] شہر میں ہے

رات جب اندھیروں کے دائرے بناتی ہے
روشنی چراغوں کی اور پھیل جاتی ہے

ایک بوند پانی بھی وقت پر سمندر ہے
چاہتا ہوں جب رونا، آنکھ سوکھ جاتی ہے

راہرو، سفر، رستے، سب تپیدہ، سب تنہا
سایہ دار پیڑوں پر دھوپ مسکراتی ہے

کیوں خراج لیتا ہے یوں زمین سے دریا
بارہا کناروں پر ناؤ ڈوب جاتی ہے

میں ترے حوالے سے ہو گیا ہوں بے چہرہ
شکل بعض شیشوں میں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے

لوگ بارہا لائق راہ بھول جاتے ہیں
اور بارہا مجھ کو راہ بھول جاتی ہے

احمد ندیم قاسمی

مداوا درد کا ہونے لگا آہستہ آہستہ
چلی آتی ہے وہ موجِ صبا آہستہ آہستہ

ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر
کہ سورج بھی تو مغرب میں چھپا آہستہ آہستہ

کوئی سنتا تو اک کہرام برپا تھا ہواؤں میں
شجر سے ایک پتا جب گرا آہستہ آہستہ

تعجب میرے جل بجھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو
میں اپنی آنچ میں تپتا رہا آہستہ آہستہ

ابھی سے حرفِ رخصت کیوں، جب آدھی رات باقی ہے
گل و شبنم تو ہوتے ہیں جدا آہستہ آہستہ

مجھے منظور، گر ترکِ تعلق ہے رضا تیری
مگر ٹوٹے گا رشتہ درد کا، آہستہ آہستہ

غرورِ مدعا، شرمندۂ الفاظ کیوں ہوتا
میں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ

پھر اس کے بعد شب ہے جس کی حد صبحِ ابد تک ہے
مغنی! شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے
اترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

میں شہرِ دل سے نکلا ہوں سب آوازوں کو دفنا کر
ندیم اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ

زیست آزار ہوئی جاتی ہے
سانس تلوار ہوئی جاتی ہے

جسم بیکار ہوا جاتا ہے
روح بیدار ہوئی جاتی ہے

کان سے دل میں اترتی نہیں بات
اور گفتار ہوئی جاتی ہے

ڈھل کے نکلی ہے حقیقت جب سے
کچھ پُراسرار ہوئی جاتی ہے

اب تو ہر زخم کی منہ بند کلی
لبِ اظہار ہوئی جاتی ہے

پھول ہی پھول ہیں ہر سمت ندیم
راہ دشوار ہوئی جاتی ہے

سندرتا کاراکشس

ممتاز مفتی

شام دبے پاؤں رینگ رہی تھی۔

ٹیلے پر درختوں کے سائے پھیلتے جا رہے تھے لیکن چوٹی کی چھولی سورج کی تھکی ماندی کرنوں سے ابھی تک بھری ہوئی تھی۔

سوامی جی کی کٹیا کا دروازہ صبح سے بند تھا۔ بالکا اور داس دونوں درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ہر چند ساعت بعد وہ سر اُٹھا کر سوامی جی کی کٹیا کے دروازے کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھتے کہ کب دروازہ کھلے اور درشن کے بھاگ جاگیں لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا۔

صبح داس نے تھالی میں بھوجن پروس کر سوامی جی کے دروازے پر رکھ دیا تھا لیکن دوپہر سے اب تک تھالی جوں کی توں دھری تھی۔ نہ دو، کھلانہ سوامی جی نے بھوجن اٹھایا۔ اب وہ رات کے بھوجن کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔

پاس ہی بالکا مُنہ کے پھٹے ہوئے جوتے کی مرمت کر رہا تھا۔

دور ٹیلے کے مغربی کونے کے پرے شہر کے مکانات صاف دکھائی دے رہے تھے جیسے ماچس کی روغنی ڈبیاں نیچے اوپر دھری ہوں۔ شہر کے لوبھی بھنورے کی مدھم بھن بھن صاف سنائی دے رہی تھی۔

دفعتہً داس کے منہ سے اک چیخ سی نکلی۔ "ہے رام!" اور چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"ہات کٹ گیا کیا؟" بالکے نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"ناہیں مہاراج، وہ دیکھو ——— اُدھر۔"

بالکے نے اُدھر دیکھا، اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ٹیلے کے مغربی کنارے پر دو لڑکیاں ان کی طرف آ رہی تھیں، چست لباس پہنے، بال پھیلائے، مکھ سجائے، پرس جھلاتی ہوئی، یوں جیسے وہ سوامی جی کا آشرم نہیں بلکہ پک نک سپاٹ ہو۔

"یہ تو کالج کی دکھتی ہیں مہاراج۔" داس نے کہا۔

"آج کل تو سبھی کالج کی دکھتی ہیں۔" بالکے نے جواب دیا۔ "کیا ماتا کیا بیٹری۔" بالکا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گھبراہٹ میں ٹہلنے لگا۔

داس چھلے ہوئے آلوؤں کو پھر سے چھیلنے میں لگ گیا۔ ٹیلے پر گھبراہٹ بھری خاموشی کے ڈھیر لگ گئے۔

وقت تھم گیا۔

پھر ایک لوچدار آواز نے تتلی کی طرح پر پھڑپھڑائے "ہمیں سوامی جی سے ملنا ہے۔"

بالکے نے سر اُٹھایا۔

شیلا اور بملا کی کٹوراسی کھلی کھلی آنکھیں دیکھ کر بالکے نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور بولا "سوامی جی کی کٹیا کے دوار کے پٹ کل سے بند ہیں دیوی انھوں نے صبح کا بھوجن بھی نہیں اُٹھایا۔"

"تو دوار کے پٹ کھول دو۔" شیلا بولی

"ہمیں اس کی آگیا نہیں دیوی۔"

"سوامی جی کو بھی تو دوار بند کرنے کی آگیا نہیں۔" بملا غصے میں چلائی۔

"اگر پرماتما کا دوار بھی بند ہو گیا تو منگتوں کا کیا ہوگا؟"

یہ سن کر بالکے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ سدھ بدھ ماری گئی۔ اب کیا جواب دے۔ کوئی ہو تو دے۔

ٹیلے پر خاموشی طاری ہو گئی۔

پھر داس اٹھا، اس نے ایک کرچٹائی اُٹھائی اور کنیاؤں کے سامنے بچھا کر نیچی نگاہوں سے بولا "بیٹھو شریمتی بیٹھو۔"

"ہمارے پاس بیٹھنے کا ٹائم نہیں۔" شیلا نے کہا۔

"سوامی جی سے کوئی مانگ کرنا ہے یا پوچھنا ہے؟" داس نے پوچھا۔

"مانگ بھی، پوچھنا بھی" شیلا نے کہا۔

"ہم تمہارا سندیس پہنچا دیں گے دیوی۔" بالکا بولا۔

"اونہوں"، شیلا نے تیوری چڑھا کر کہا "ہم خود سوامی جی سے بات کریں گے۔"

"پر دیوی جی، سوامی جی استریوں سے نہیں ملتے۔" بالکے نے کہا۔

"کیا کہا؟" شیلا اور بملا دونوں چلائیں۔

"کیا وہ پرش اور استری کو برابر نہیں جانتے؟" شیلا نے تلخی سے پوچھا۔

بالکے نے سر لٹکا لیا اور چپ سادھ لی، اب وہ کیا کہے کیا جواب دے۔

ٹیلے پر پھر خاموشی چھا گئی۔ گہری لمبی خاموشی۔

آخر شیلا زیر لب بولی، جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ اس کی آواز میں مایوسی کی جھلک تھی "بیکار ہے بملا، استری کے لئے پرماتما کا دوار بھی بند ہے۔ یہاں بھی اندھیر نگری ہے۔ یہ دیش بھی پرش کا دیش نکلا۔"

بملا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ چلا کر بولی "سوامی جی پرش سے ملتے ہیں استری سے نہیں۔ کیا سوامی جی استری سے ڈرتے ہیں؟"

بالکے نے جواب دیا "استری سے سوامی جی نہیں ان کے اندر کا پرش ڈرتا ہے اور پُرش استری سے نہیں خود سے ڈرتا ہے، اس میں اتنی شکتی نہیں دیوی کہ وہ اندر کے مرد کو روک میں رکھ سکے۔"

یہ سن کر کنیائیں سوچ میں پڑ گئیں۔

اس سمے داس نے دو پیالے چائے کے تھالی میں دھرے اور کنیاؤں کے سامنے رکھ کر بولا "دیوی جی جا رہو تم تھک گئی ہوگی، بڑی کٹھن چڑھائی ہے اس ٹیلے کی۔"

"مجھے دیوی نہ کہو" شیلا غصے میں بولی "میں دیوی نہیں استری ہوں۔ استری۔"

"بی بی یہ تو ہمارا اندر کا کھوٹ ہے۔" بالکے نے کہا "کہ استری سے بچنے کے لئے ہم اسے دیوی بنا لیتے ہیں۔"

"تمہارے اندر بھی کھوٹ ہے کیا؟ تم جو دن رات رام نام کی دُھنکی سے دل کو پوتر کرنے میں وقت گزارتے ہو"۔ بملا نے پوچھا۔

"دیوی" بالکا بولا۔ "من کا کھوٹ کنویں کے پانی کی طرح ہوتا ہے جتنا نکالو اُتنا ہی بھیتر سے رِس کر باہر آجاتا ہے"۔

یہ سُن کر وہ دونوں چپ ہوگئیں۔ دفعتہً انھوں نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہیں۔ اس لئے چٹائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔

"ہاں" شیلا سوچ میں گم بڑبڑائی "میرے پتی نے بھی مجھے دیوی بنا رکھا تھا۔ اتنا پیار کرتا تھا کہ وہ پوجا لگتی تھی۔ میں کہتی پر کاش مجھے دیوی نہ بناؤ، متر بناؤ۔ ساتھی جانو۔ برابر کا ساتھی ــــــ"

"اونہوں"۔ بملا نے آہ بھری "وہ برابر کا نہیں جانتے، ساتھی نہیں مانتے۔ یا تو دیوی بنا کر پوجا کرتے ہیں اور یا باندی سمجھ کر حکم چلاتے ہیں"۔

"ایسا کیوں ہے بالکا جی"۔ بملا نے پوچھا۔

"کیا سوامی جی سے یہی پوچھنے آئی ہو دیوی" بالکے نے کہا۔

"ہاں" شیلا بولی "جب پرش اور استری ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں تو پھر بڑا چھوٹا کیوں"۔

"سچ کہتی ہو شریمتی سچ کہتی ہو" بالکے نے آہ بھری "یہ تو استری کی جنم جنم کی پکار ہے۔ اس دن سے استری برابری کی بھیک مانگتی پھرے ہے جس دن رانی وجے ونتی نے راج پاٹ کو تیاگ کر برابری کے کھوج میں راج بھون سے پاؤں باہر دھرا تھا"۔ یہ کہہ کر بالکا چپ ہوگیا۔

"وجے ونتی کون تھی بالکے جی"۔ بملا نے پوچھا۔

"تمہیں نہیں پتہ کیا" بالکا بولا۔ "آج بھی راج گڑھی کی ڈھیری میں آدھی رات کے وقت رانی وجے ونتی کی آواجیں سنائی دیتی ہیں"۔

"آج بھی" بملا نے پوچھا۔

"ہاں آج بھی۔ اس کی ڈھونڈ آج بھی جاری ہے"۔

یہ سن کر شیلا بملا کو چپ لگ گئی۔

سائے اور بھی لمبے ہو گئے۔

درختوں کی ٹہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ سورج کے لہو کی ندی نے رِس رِس کر بادلوں کو رنگ دیا۔

وقت رک گیا۔

پھر شیلا کی مدھم آواز آئی "بالکا جی، وجے ونتی کون تھی؟"

اور پھر بالکے نے وجے ونتی کی کہانی سنانی شروع کی۔ بالکا بولا، وجے ونتی راج گڑھی کے مہاراج ماتری راج کی رانی تھی۔ مہاراج کا سنگھاسن اس کے چرنوں میں دھرا تھا۔ مہاراج اسے آنکھوں پر بٹھاتے۔ وارے نیارے جاتے ــــــ اس کی کوئی بات نہ ٹالتے۔ اُٹھ پلّے باندھ لیتے۔ انھیں وجے سب رانیوں سے پیاری تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ سندرتا میں وہ سب سے اتم تھی۔ صرف ناک نکشہ ہی نہیں۔ اس کی چال ڈھال، رنگ روپ بھاؤ سبھی کچھ سندرتا میں بھیگا ہوا تھا۔ پلکیں اٹھاتی تو دیئے جل جاتے۔ ہونٹ کھولتی تو پھول کھل اُٹھتے۔ بانہہ ہلاتی تو ناگ جھولتے۔ بھرپور نظر سے دیکھتی تو رنگ پچکاری بھگو کر رکھ دیتی۔

مہارانی راج بھون میں بڑے آنند سے جیون گجار رہی تھی۔

بالکا رک گیا پھر کچھ دیر کے بعد بولا: پھر ایک روز آدھی رات کے سمے مہارانی کا دوار بجا۔ وہ سمجھی مہاراج آئے ہیں۔ اُٹھ کر دوار کھولا تو کیا دیکھتی ہیں کہ مہاراج نہیں بلکہ ایک بڑھی کھوسٹ استری کھڑی ہے۔

کون ہے تو؟ وہ غصے سے چلائی۔

س کی آواج سن کر مہارانی کی باندی شوشی جاگ اٹھی، اور دوڑ کر دروازے پر آگئی۔

اس کی اتنی جان کہ آدھی رات کو مہارانی کا دوار کھٹکھٹائے۔ رانی نے شوشی سے کہا۔

کون ہے تو؟ شوشی بڑھیا کی طرف جھپٹی۔

میں شو بالا ہوں۔ بڑھیا نے جواب دیا۔ میرا دارو ختم ہو گیا ہے۔ دارو بنا میری رات نہیں کٹے گی۔ میں نے سوچا کہ رانی کے آگے جھولی پھیلاؤں جو کرپا کریں تو میری رات کٹ جائے۔

تو استری ہو کے دارو پیتی ہے۔ رانی نے گھن کھا کر جھرجھری لی۔

نہ مہارانی، جو میں استری ہوتی تو دارو پینے کی کیا جرورت تھی۔ جب میں استری تھی تو دارو پیتی نہیں تھی، پلایا کرتی تھی۔ لیکن اب۔ اب میں وہ دن بھولنے کے لئے دارو پیتی ہوں۔

یہ کیا بول رہی ہے شوشی۔ وجے نے کہا۔ کہتی ہے میں استری نہیں۔

شو بالا بولی استری ایک سوگندھ ہوتی ہے جو کچھ دناں رہتی ہے پھر اڑ جاتی ہے، اور پھر پھول کی جگوں ڈنٹھل رہ جاتا ہے۔

تو راج بھون کی باندی ہے کیا؟ شوشی نے پوچھا۔

نہیں۔ شو بالا نے کہا۔ میں باندی نہیں ہوں۔ آج سے تیس ورش پہلے میں بھی اسی رنگ بھون میں رہتی تھی۔ اسی دالان میں جس میں تو رہتی ہے۔ اسی سیج پر سوتی تھی۔ جب مہاراج ماتری راج کے پتا راج سنگھاسن پر براجمان تھے۔ مہاراج مجھے آنکھوں پر بٹھاتے تھے جیسے تجھے آج بٹھاتے ہیں۔ بات منہ سے نکلتی تو پورن ہو جاتی۔ یہ سب چونچلے سندرتا کے کارن تھے جیسے آج تیرے چاؤ چونچلے ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب تو بھی ان دنوں کو بھولنے کے لئے دارو کا سہارا لے گی۔

یہ سن کر وجے کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ تو کیا یہ ساری چاننی روپ کی ہے؟ میں کچھ بھی نہیں؟

کچھ بھی نہیں۔ شو بالا نے جواب دیا۔ جب تک دکان سجی ہے گاہکوں کی بھیڑ ہے۔ جب دکان لٹ جائے تو استری کو کون جانے ہے مہارانی۔

تو بکتی ہے یہ سب جھوٹ ہے۔ وجے نے چیخ کر کہا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔

بالکا رک گیا۔

داس نے چونک کر دیکھا توے پر پڑا ہوا پھلکا جل کر کالا ہو گیا تھا۔

بملا سر جھکائے چٹائی کو کرید رہی تھی۔

شیلا کی نگاہیں چلتے بادلوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

"پھر کیا ہوا بالک مہاراج؟" داس کی آواز سن کر وہ سب چونک پڑے۔

بالکے نے بات چلا دی۔ بولا:

شو بالا کے جانے کے بعد وجے رانی بے کل ہو گئی۔ کیا یہ سچ ہے کہ سندرتا کا گن ہی سبھی کچھ ہے؟ استری کسی گنتی میں نہیں؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جھوٹ ہے۔ شوشی نے اسے بہت سمجھایا۔ مہارانی سچ کے کھوج کی لگن نہ لگا۔ سچ کوئی میٹھا پھل نہیں۔ وہ جھوٹ جو شانت کر دے، اس سچ سے اچھا ہے جو اندر بھٹی سلگا دے۔ پرنتو مہارانی کو سچ کی ڈھونڈ کا تاپ چڑھا تھا۔ بولی منش کی رتھ میں دو پہیئے لگے ہیں پرش اور استری۔ رتھ کیسے چل سکتی ہے جد تک دونوں پہیئے برابر نہ ہوں۔

نہیں رانی، شوشی نے کہا۔ یہ پہیئے برابر نہیں۔ کارن یہ کہ پرش کا پہیہ چلے ہے۔ استری کا کھالی سجاوٹ کے لئے ہے چلتا نہیں۔

باندھی نے وجے کو بہت سمجھایا پر وہ نہ مانی۔

بالکا رک گیا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر کملا شیلا کی طرف دیکھا۔ بولا "کنیاؤ! جس کے من میں سچ کی ڈھونڈ کا کیڑا لگ جائے پھر جیون بھر اسے سکھ ملتا ہے نہ شانتی۔"

"یہ کیا کہہ دیا بالک مہاراج" داس بولا۔

دو دکا داس بالک نے کہا "سچ بولو سچ کو اپنا ؤ سچ جیو پر تو سچ کی ڈھونڈ میں نہ نکلنا۔ سدا چلتے رہو گے۔ چلنے کے پھیر میں آجاؤ گے۔ نہ رستہ ہوگا۔ نہ ڈنڈی نہ اور۔ نہ کہیں پہنچو گے۔ صرف چلنا چلنا چلتے رہنا" بالکے نے آہ بھری۔ بولا:

لاکھ سمجھانے پر بھی وجے رانی سچ کی ڈھونڈ میں چل نکلی۔ سب سے پہلے اس نے مہاراج کو پرکھنے کی ٹھانی کہ وہ مجھے برابر کا جانیں ہیں کہ نہیں۔ اس کے من میں چنتا کا نشا لگ گیا۔ جوں جوں اس کی چنتا بڑھتی گئی توں توں مہاراج اسے اپنے دھیان کی گود میں جھلاتے گئے۔ اس کے سامنے یوں سیس نواتے گئے جیسے وہ سچ مچ کی دیوی ہو۔ جوں جوں وہ دیوی کو مناتے گئے توں توں رانی کی کلپنا بڑھتی گئی۔ مہاراج مجھے مورتی نہ بنایئے، مندر میں نہ بٹھایئے۔ اپنے پاس بٹھلایئے، اپنے برابر جانیئے۔

مہاراج کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ برابر کیسے جانیں۔ جسے دھیان دیا جائے، من دیا جائے، اونچا بٹھایا جائے، وہ برابری کیوں چاہے، جسے سارا دیا جائے وہ آدھا کیوں مانگے۔

وجے رانی کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ مہاراج اسے دیوی کے سمان بنا سکتے ہیں، مہارانی بنا سکتے ہیں جہیتی سمجھ سکتے ہیں، ساتھی نہیں بنا سکتے۔

یہ جان کر وجے نے ٹھان لی کہ وہ راج بھون کو چھوڑ دے گی۔ رانی نہیں بلکہ استری بن کر جیئے گی۔ سندرتا کے جور پہ نہیں، جیو کے جور پہ بھبھوت مل کر سندرتا چھپائے رکھے گی اور کسی کے ساتھ بیاہ نہ کرے گی جب تک وہ اسے برابر کی نہ سمجھے۔ ساتھی نہ جانے۔

پھر ایک رات جب گرج چمک جوروں پر تھی اور راج بھون کے چوکیدار کونوں میں سہمے بیٹھے تھے تو وجے نے بھیس بدلا اور شوشی کو ساتھ لے چور دروازے سے باہر نکل گئی۔

چلتے چلتے وہ راج نگری سے دور ایک شہر میں رکیں۔ وجے گجارے کے لئے پھلکاریاں کاڑھنے لگی۔ وہ پھلکاریاں بناتی، شوشی انہیں بازار جا کر بیچ دیتی۔

کچھ دنوں میں وجے کی پھلکاریوں کی مانگ بڑھ گئی۔ اتنی صاف ستھری پھلکاریاں کون بنا دے ہے منڈی میں باتیں ہونے لگیں۔ پھر بدیش سے ایک گبھرو بیوپاری آنند آ نکلا۔ پھلکاریاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس نے شوشی کو ڈھونڈ نکالا۔ بولا یہ پھلکاریاں کون کاڑھتی ہے مجھے اس کے پاس لے چل۔ شوشی اسے گھر لے آئی۔ وجے کو دیکھ کر وہ پھلکاریاں بھول گیا۔ وجے پھلکاریاں دکھاتی رہی۔ آنند وجے کو دیکھتا رہا۔ وجے سمجھتی تھی کہ بھبھوت سندرتا کو ڈھانپ لیتی ہے۔ آنند سوچتا رہا کہ جس گن کو استری اچھالتی ہے یہ شرمیتی اسے چھپا رہی ہے۔ اوش کوئی بھید ہے۔

آنند بہت سیانا تھا۔ اس نے شہر شہر کا پانی پی رکھا تھا۔ اس نے سوچا پاؤں دھیرے دھیرے دھرو۔ بڑی پھسلن ہے اور جو گرا تو یہاں سہارا دے کر اٹھانے والا کوئی نہیں۔ پہلے تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔ پھر پاؤں دھرنا۔ تو وہ تیل کی دھار جانچنے کے لئے پھلکاریوں کے بہانے وجے کے گھر آنے جانے لگا۔

دو چار پھیروں میں اسے پتہ چل گیا کہ سندرتا کی بات نہیں چلے گی۔ پریم کی بات نہیں چلے گی۔ کومل ملائم بات نہیں چلے گی۔ لگاوٹ کی نہیں۔ بے لاگ۔ کھردری۔ گنوار۔

وہ بولا۔ بی کا زمن تو تو چیونٹی کی چال چلے ہے پر مجھے تو بہت سی پھلکاریاں چاہئیں تاکہ انہیں بیچ کر اپنا پیٹ پال سکوں۔

پھر چار ایک دن کے بعد آنند، وجے سے بہت بگڑا۔ سب جھوٹ موٹ بولا۔ تو کام چھوڑ دے ری۔ میں تیرے سر پر بیٹھ کر کام کراؤں گا۔ اس بہانے وہ سارا سارا دن وجے کے گھر رہنے لگا۔ جوں جوں وہ اس کے نیڑے ہوتا گیا، اس کا من ہاتھوں سے نکلتا گیا۔

پھر ایک دن آنند نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ بولا۔ بی کاڑھن میرا دھندا نہیں چلتا۔ اتنی کمائی بھی نہیں ہوتی کہ سوکھا گجارہ کر سکوں۔ جو تو مجھ سے بیاہ کر لے تو جیون سکھی ہو جائے۔ تو پھلکاریاں کاڑھے میں انھیں بیچوں۔ کام تیرا، دوڑ دھوپ میری۔

وجے اس کی چال میں آگئی۔ اس کی ممتا جاگ اٹھی۔ بولی، میں تو اس سے بیاہ کروں گی جو تینی کو برابر کا سمجھے، نہ اُسے دیوی بنائے نہ باندی۔ اپنا ساتھی جانے۔ دکھ سکھ کا ساتھی۔

ٹھیک ہے، آنند بولا۔ تو میری ساتھن ہے۔ ساتھن رہے گی۔

جب وجے دولہن بنی تو بھبھوت کا پردہ بھی اُٹھ گیا۔ اندر سے رانی نکل آئی۔ آنند تو دھک سے رہ گیا۔ ہے پربھو ایسی مورتی!

بالکا رُک گیا۔

داس منہ کھولے بیٹھا تھا۔ چولہا جل رہا تھا۔ توا جو کھالی پڑا تھا، تپ تپ کر کالا ہو گیا تھا۔ پیڑا ہاتھ میں یوں دھرا تھا جیسے بالک کے ہاتھ کا کھدو ہو۔

شیلا کی نگاہیں گھاس پر بچھی ہوئی تھیں جیسے ڈھونڈیں لگی ہوں۔ بملا کی آنکھیں ڈبدبا رہی تھیں۔ اب روئی کہ اب روئی۔

ٹیلے پر سایے منڈلا رہے تھے۔ بادلوں میں آگ جل رہی تھی۔

شام دبے پاؤں جا رہی تھی۔ رات اپنے پر پھڑپھڑا رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا بالک جی؟" داس نے جیسے ہچکی لی۔

بالک بولا:

آنند بہت بڑا سوداگر تھا۔ حویلیاں تھیں، نوکر چاکر تھے۔ دھن دولت تھی۔ کس بات کی کمی تھی اسے۔ وہ تو وجے کو رام کرنے کے لئے اس نے نردھن کا سوانگ رچایا تھا۔ بس ایک بات سچ تھی۔ وہ تن من دھن سے وجے کا ہو چکا تھا۔

اس کا باہر جانے کو جی نہ چاہتا تھا پر کیا کرتا۔ اتنا بڑا بیوپار تھا۔ اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہی تھی۔ اسے جانا ہی پڑتا۔ پھلکاریاں بیچنے کے بہانے چلا جاتا۔ دنوں باہر رہتا۔ چلا جاتا تو جیسے گھر کا دھیان ہی نہ ہو۔ آ جاتا تو جیسے جانے سے بھول کھاتا ہو۔

پھر یہ بھی تھا کہ اس نے وجے کو پھلکاریاں کاڑھنے سے روک دیا تھا۔ بولا۔ تینی تُو سال میں ایک ٹھاٹھ کی پھلکاری بنا دیا کر۔ ایسی جو راجا رانی جوگی ہو۔ ایسی جو ایک بیچ لی تو گھر میں لہر بہر ہو گئی۔

اس پر وجے سوچ میں پڑ گئی۔ سوچتی رہی سوچتی رہی۔ جب وہ آیا تو اسے کہنے لگی۔ رے تو مجھ سے اپنے بیوپار کی بات کیوں نہیں کرتا۔

آنند نے جواب دیا۔ ساتھن بیوپار میں اونچ نیچ ہوتی ہے۔ بپھن پھریب ہوتا ہے۔ چھل بنے ہوتے ہیں تو بیوپار کی بات سن کر کیا کرے گی۔

وجے بولی دیکھ میں تیری ساتھن ہوں۔ برابر کی ساتھن۔ اور ساتھی کھالی سکھ کا نہیں ہوتا۔ دکھ کا بھی ہوتا ہے۔ اونچ کا نہیں نیچ کا بھی ہوتا ہے۔ تو مجھے اپنے بیوپار کی ساری بات بتا۔ اپنے دکھ گنوا۔

اس پر آنند نے اسے ایک لمبی چوڑی طوطا مینا کی کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ نگر نگر پھرا۔ راجاؤں رانیوں سے ملا۔ انھیں پھلکاری دکھائی۔ اور انت میں اک راج نرتکی پھلکاری کو دیکھ کر اس پر لٹو ہو گئی۔ بولی۔ بول بیوپاری منہ مانگے دام دوں گی۔

اس رات وجے کو یوں لگا جیسے آنند اس کا جی بہلانے کے لئے کہانی سنا رہا ہو۔ سلانے کے لئے لوری دے رہا ہو۔ اس پر وہ

سوچ میں کھو گئی۔ من میں گھنڈی پڑ گئی۔ بولی شوشو یہ تو وہ نہیں۔ جو یہ کہے ہے۔ جو بھید ہی نہ دے وہ ساتھی کیا بنے گا۔

دیکھ رانی، شوشی بولی۔ وہ اوش بھید رکھے ہے پر اس کے من میں دوج نہیں کھوٹ نہیں۔ پرش پتنی کو اپنے بیوپار کا بھید کبھی نہیں دیتا وہ اسے ساری بات کبھی نہیں بتاتا۔ جر در ڈنڈی مارے ہے یہی جگ کی ریت ہے۔

تو کیا وہ استری کو اس جوگا نہیں جانتا کہ ساری بات جانے یہ تو ساتھ نہ ہوا، برابری نہ ہوئی: جا شوشو منڈی میں جا کر پوچھ گچھ کر۔ اس کے بھید کا پتہ لگا۔

شوشی نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ آنند تو ایک راج بیوپاری ہے اس نے بیجا نگر کی مہارانی کے لئے شیش بھون بنوانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

جب وجے نے یہ سنا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ تو پھلکاریاں بیچ کر گجارہ کرنے کی بات اک بہانہ تھی۔ کیوں شوشی، تو کیا کہتی ہے؟'

شوشی نے وجے کو بہت سمجھایا بجھایا کہ دیکھ دنیا اس سے اچھا جیون ساتھی تجھے نہیں ملے گا۔ اس سے جیادہ برابری کوئی نہ دے گا۔ لیکن وجے نہ مانی۔ شوشو اتنے پردے! اوپر کچھ، بھیتر کچھ۔ نہ شوشی جہاں پردے ہوں، جھوٹ ہو، دکھاوا ہو وہاں برابری کیسی چل شوشی کسی ایسی جگھوں چلیں جہاں پردہ نہ ہو، جھوٹ نہ ہو۔ اب یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔

بالکا رُک گیا۔

"تو کیا وجے آنند کو چھوڑ کر چلی گئی؟" شیلا نے پوچھا۔

"ہاں، چلی گئی۔" بالکا بولا۔

بملا نے ایک لمبی آہ بھری۔

"پھر وہ کہاں گئی؟" داس نے پوچھا۔

پہلے وہ ایک پجاری کے پھندے میں پھنس گئی۔ پجاری نے اسے داسی بنا لیا۔ پربھو کی داسی۔ پھر آپ پربھو بن بیٹھا۔

وہاں سے بھاگی تو ایک نرتکی کے جال میں جا پھنسی۔ اس نے اسے اپنے چوبارے میں سجا لیا۔ چوبارے سے اسے ایک راج گاہک لے اڑا وہاں بھی اسے برابری نہ ملی۔ گاہک سارا دن ستار سینے سے لگائے رکھتا۔ پھر تھک کر ماندگی اتارنے کے لئے وہ وجے سے دل بہلاتا۔

چل شوشی، ایک دن وجے نے کہا۔ یہاں تو راگ ودھیا کا راج ہے۔

شوشی بولی۔ دنیا جو تو چاہے ہے وہ ادھر نہیں ملے گا جہاں دھنوان بستے ہیں۔ وہ ادھر ملے گا۔ جہاں نردھن بستے ہیں۔ کامی بستے ہیں۔ جہاں پرش پتنی کے سہارا لئے بغیر کچھ کر نہیں سکتا۔ جہاں پتنی نہ مرد ہوتی ہے نہ مایا بس اک باجو ہوتی ہے۔ پہلے سہارا ہوتی ہے پھر کچھ اور۔ جہاں وہ وجے باجو کے بنا گجارا نہیں ہوتا۔ وہاں استری کو برابری مل جائے تو مل جائے۔

وہ کون سی جگھوں ہے، کہاں ہے شوشی۔ وجے نے پوچھا۔

وہ جگہ وہاں ہے جہاں دھن کا جور نہیں ہوتا کام کا ہوتا ہے۔ دیکھ دنیا تو مان نہ مان پر نتو استری جیو کی دھرتی ہے جس کے دم سے جیو دھنبل ہری رہتی ہے۔ استری کی سار وہی جانے ہے جو دھرتی کی سار جانے ہے۔ جو بوٹا لگانا جانے ہے۔ جو کھیتی اگائے ہے۔ جس کا گجارا دھرتی کی پیدا پر ہے بس وہی استری کو باجو سمجھے ہے۔ اپنے سا جانے ہے۔

وجے کے دل میں بات اتر گئی۔

اک بار پھر وہ گھر چھوڑ کر نکل گئیں۔ شہر سے دور گاؤں کی اور۔

شوشی نے وجے کو موٹے کپڑے پہنا دئے۔ منہ پر ہلدی، کالک کا ابٹن مل دیا۔ بولی یہاں استری، استری ہوتی ہے۔ گن کے جور پر نہیں۔ جیو کے

جمد پر۔ یہاں سندرتا شوبھا نہیں، رستے کی روک ہے۔ تو اپنی سندرتا کو چھپا رکھنا۔ جو نجر آ گئی تو گڑبڑ ہوگی۔

شوشی وجے۔ بولی۔ میں اس سندرتا کے کارن بڑی دکھی ہوں۔ کوئی بس بھری بوٹی ڈھونڈ ڈالے کہ میں مکھ پر مل لوں جو سندرتا کی کاٹ کر دے۔

شوشی ہنسی۔ بولی بھولی رانی سندرتا مکھ پر نہیں ہوتی۔ سارے روپ میں ہوتی ہے۔ انگ انگ سے پھوٹتی ہے۔ ہات ہلانے میں ہوتی ہے پگ دھرنے میں ہوتی ہے۔ آنکھ اٹھانے میں ہوتی ہے۔ ہونٹ کھولنے میں ہوتی ہے۔ تو اسے اپنے سبھاؤ سے کیسے نچوڑ پھینکے گی۔

گاؤں میں پہنچ کر انھوں نے ایک جھگی میں ڈیرا کر لیا۔ اور کھیت میں کپاہ کے پھول چننے لگیں۔

ایک دن دکھا کسان نے وجے سے کہا تو کیسی جناتی ہے ری۔ تیری انگلیاں تو قینچی سی چلتی ہیں۔ اس نے وجے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انگلیاں دیکھیں تو سپٹ گیا۔ ری یہ کیسی انگلیاں ہیں۔ انگلیاں ہیں پھلیاں۔ اتنی لمبی اتنی پتلی۔

پھر وہ روز اس کی چلتی چنتی انگلیاں دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ایک دن انگلیاں پکڑ کر بولا۔ ری تو میرے گھر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ میں اکیلا ہوں۔ پتا جی پرماتما کو پیارے ہو گئے۔ ماتا بہت بوڑھی ہے میرا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ بھائی بہن میں نہیں۔ اکیلا ہوں تو میرا کاج بن جا ری۔ میں ہل چلاؤں تو بیج ڈال۔ میں پانی دوں تو کھیت کی رکھوالی کر۔ میں گیہوں کاٹوں تو دانے نکال۔ پھر ہم کسی سے ہیٹے نہیں رہیں گے۔ میں جو آدھا ہوں پورن ہو جاؤں گا۔

اس کی بات میں نہ موہ تھی نہ کامنا۔ نہ لوبھ۔

وجے کو اپنی سرت بھی بھول گئی۔ اس نے ہاں کر دی۔ پھر وہ دونوں کھیت پر کام میں جت گئے۔ لاکھا نہ اسے نرمل سمجھتا تھا نہ ماڑی۔ نہ سندر نہ ڈیری۔ وہ تو اس کا کاج تھی۔ پھر کوئی بات اس سے چھپاتا کیوں۔ کوئی تو نہ تھا۔ کیسے چھپاتا۔ ہر سمے وہ دونوں اکٹھے رہتے۔ کھیت میں۔ گھر میں۔ ہر بات میں اس کی مرضی پوچھتا۔ کام میں اسے ذرا چھوٹ نہ دیتا۔

وجے نہال ہو گئی۔ سمجھی جیسے جل گگڑی جو ہڑ میں آ گئی ہو۔

لاکھے کسان کو وجے کی ایک بات پر بڑی چڑ تھی۔ کہتا۔ ری تو گندی کیوں رہتی ہے۔ نہاتی دھوتی کیوں نہیں۔ منہ پر جردی چھائے رہتی ہے۔ ایسی بلیاں سی رہتی ہیں بال چکٹ۔ آنکھوں میں کیچ۔ وجے یہ سن کر گردن لٹکا لیتی۔

ایک دن جب وہ دونوں ندی کے کنارے کھڑے تھے تو لاکھے نے تاؤ کھا کر بالٹی اٹھائی اور وجے پر انڈھیل دی۔ پھر بالٹی پر بالٹی گرانے لگا۔ وجے بھاگی تو اس نے اسے پکڑ کر ندی میں چھلانگ لگا دی اور اسے یوں دھونے اور مانجھنے لگا جیسے وہ رسوئی کی گڈوی ہو۔ پھر جب وہ اسے کھینچ کر پانی سے باہر لایا تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے سامنے استری نہیں رانی کھڑی تھی۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر سے دیکھا۔ سنہرے لمبے بال۔ مور سی گردن۔ کٹورہ سی آنکھیں۔ دھار سی ناک۔ پھول سے ہونٹ۔ چوئی موئی سا بدن۔

تو کون ہے ری۔ وہ گھگھیا کر بولا۔ تو استری نہیں تو تو پری ہے ری پری۔

لاکھا کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ سبھی چپ ہو گئے تھے۔ کسی کو بات کرنے کی سدھ نہ رہی تھی۔

لاکھا دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا!

بس اس دن سے لاکھے کے من میں جھجھک بیٹھ گئی۔ اور وہ وجے سے دور ہوتا گیا۔

وجے نے بار بار اسے سمجھایا۔ دیکھ لاکھے میں پری نہیں استری ہوں۔ استری۔

پر اس کی جھجھک نہ گئی۔ بولا۔ تو پری نہیں تو استری بھی نہیں۔ تو مورتی ہے۔ میں کاگ ہوں تیرا میرا کیا سمبندھ۔ کارن یہ کہ تو کامیوں میں سے نا ہیں۔

کچھ دن وجے اس کا منہ دیکھتی رہی۔ پھر نراش ہو گئی۔ پھر ایک دن وہ شوشی سے بولی چل شوشی یہاں ہمارا دانا پانی ختم ہو گیا۔

شوشی نے سر جھکا لیا۔ اور چپ کی چپ بیٹھی رہی جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

شوشی اب لاکھے کی ہو چکی تھی۔
وجے کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ چپ چاپ اکیلی باہر نکل گئی۔
بالکا چپ ہو گیا۔ سبھی چپ ہو گئے تھے۔
کسی کو، پھر کیا ہوا پوچھنے کا دھیان نہ رہا تھا۔
پھر بالکے نے کہا:
پھر پتہ نہیں —— کہتے ہیں وہ آج تک برابری کی ڈھونڈ میں بھٹکتی پھرتی ہے
آج بھی آدھی رات کے سمے راج گڑھی سے آواجیں آتی ہیں —— پربھو باہر کی سندرتا کو بھیتر میں رچا دے کہ استری، استری بن جائے —— پرش کی کامنا کے ہاتھ کا کھلونا نہ رہے۔
بالکا چپ ہو گیا۔ ٹیلے پر گہری خاموشی چھا گئی۔
پھر کوئی دور سے بولا۔ وجے رانی نے سچ کو پا لیا۔ جو اپنی سندرتا کو اچھالتی ہیں۔ بناؤ سنگھار کا راکشس کھڑا کر لیتی ہیں انھیں برابری مانگنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔
انھوں نے مڑ کر دیکھا، سوامی جی دوار کے باہر کھڑے تھے۔

پرہیا

سجاد حیدر

جناب دریا کے پل سے اُترتے ہی نئی بائی پاس[1] روڈ پر پہلا گاؤں موہلہ پڑتا ہے جس وہیں کا جم پل[2] ہوں۔ ساٹھ گھروں کے اس چھوٹے سے گاؤں میں صرف پانچ مکان پکے ہیں جن میں پچھے جاٹ بستے ہیں پچھیے۔ اس گاؤں کے مالک زمیندار ہیں۔ باقی کچے گھر مزارعوں اور کمیوں[3] کے ہیں۔ گاؤں کا پرائمری سکول اور چوہدری پرویز ارشاد کی بیٹھک بھی پختہ ہے۔

پچھلے مہینے جب ہم سرِ شام گاؤں کی جوہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مجھے بارہ وفات کا نیا چاند اپنے مکان کی ممٹی پر نظر آیا۔ ہم نے رُک کر امن سلامتی، بندہ بشر، ڈھور ڈنگر، فصل پٹھے اور بیمار لاچار کے لئے دعا مانگی اور پھر پگڈنڈی پر ایک قطار میں چلتے ہوئے موہلے کے اندر جا پہنچے۔ میرا بھتیجا پرویز ارشاد مجھے گھر کے دروازے پر جھک کر ملا اور میں نے اُسے تھاپی دی۔ پھر میں نے اُس کا تعارف اپنے دونو دوستوں سے کرایا۔ شیخ حفیظ الرحمٰن، حکومت پنجاب کے بہت بڑے افسر اور سید امجد حسین، لاہور کے واحد انگریزی روزنامے کے ایڈیٹر۔ اس نے ان بزرگوں کے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگانے چاہے لیکن انھوں نے پرجوش مصافحے میں اُس کے ہاتھ جکڑ لئے۔ تھوڑی دیر بعد پرویز یہ اطلاع دے کر کہ رات کو کھانا ہم اُس کے ہاں کھائیں گے اور کھانے کے بعد بیٹھک میں پرہیا ہوگی، ہم سے رخصت ہوا۔ اور ہم سفر کی تھکن اتارنے اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔

کھانے کے بعد ہم بیٹھک کی طرف جا رہے تھے تو میں سوچنے لگا کہ گاؤں کے کچے گھروں کا رقبہ اور نقشہ اب بھی وہی ہے جیسا میں نے سات سال پہلے دیکھا تھا۔ وہی وگھن جیسے اندر دو کوٹھڑیاں ایک دالان، باہر صحن میں رسوئی اور ڈنگروں کے لئے ڈھارا[6]۔ البتہ اب بیشتر گھروں میں طاق پر دیئے کی بجائے تار سے بجلی کا بلب لٹک رہا تھا۔ گویا یوں گاؤں پر بیسویں صدی کا چمکارا پڑ رہا تھا۔

جب ہم بیٹھک میں پہنچے تو وہاں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی چارپائیوں پر گاؤں کی GENTRY بیٹھی ہوئی تھی، اور غریب غربے درمیان میں دری پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کی تین چارپائیاں ہمارے لئے خالی رکھی گئی تھیں۔ شیخ صاحب اور شاہ صاحب کو ایک ایک چارپائی پر بٹھا کر میں سب چارپائی نشینوں کے پاس گیا اور ہر ایک سے حسب حیثیت معانقہ یا مصافحہ کیا۔ پھر جملہ حاضرین میرے مہمانوں کے پاس آئے اور اُن سے مصافحہ کیا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو صادق وڑائچ نے گاؤں کے روایتی انداز میں شہری مہمانوں سے پوچھا "کیوں جی شیخ صاب / شاہ صاب، بال بچہ، ڈیرہ ڈنڈا، ڈنگر وچھا، پیلی بنّا سب خیریت نا؟"

جواب میں شیخ صاحب نے کہا "یہ سب کچھ تو ہماری ملکیت میں نہیں، البتہ آپ پوچھ سکتے ہیں کیوں جی کوٹھی بنگلہ، موٹر تیل، تنخواہ، الاؤنس اور راشن کارڈ خیریت سے ہیں نا؟" اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔

شاہ صاحب ازراہ اخلاق اپنے قریب بیٹھے ہوئے میاں خاں موچی اور صدیق کمہار کو اپنی چارپائی پر سیٹ آفر[7] کر رہے تھے لیکن وہ دونو دری پر اور پرے کھسک رہے تھے۔ منشی دگیر لے اپنے کونے والی چارپائی سے جب یہ صورت حال دیکھی تو بولے "شاہ جی! یہاں ہر ایک کی سیٹ RESERVE ہے جو جہاں بیٹھا ہے وہ اُسی لائق ہے۔ میری بھی سیٹ تو فرش پر ہے مگر ایک تو میں اس گاؤں کا باشندہ نہیں، اور دوسرے اس گاؤں کے بچوں کا استاد ہوں۔ اس لئے میرا مرتبہ بلند کر دیا گیا ہے"

---

۱ BY PASS ROAD ۲ پروردہ ۳ کمی کی جمع یعنی غیر زراعت پیشہ اہل حرفہ ۴ حد
۵ چاندماری ۶ چھپر ۷ SEAT OFFER

دلیے میں ذات کا ترکھان ہوں اور ترکھان بھی کیں ہوتے ہیں۔"

چارپائیوں پر بیٹھے جاٹ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور صادق نے منشی دگیر کو زبردستی اٹھا کر سید امجد حسین کے ساتھ بٹھایا۔

ایک درویش صفت بوڑھا جب حقہ تازہ کر کے شاہ صاحب کے سامنے لایا تو انھوں نے نڑی گھما دی مگر اُس کا ہاتھ تھامے رکھا اور پوچھا "بابا جی! آپ تو اس علاقے کے معلوم نہیں ہوتے۔ آپ کا دیس کہاں ہے؟"

وہ بھی لکی والا تھا۔ اُس نے جواب میں وارث شاہ کا یہ ٹکڑا سنا دیا:

"شیہنہ، سپ، فقیر دا دیس کیہا"

یہ سنتے ہی منشی دگیر پر کیفیت طاری ہو گئی اور اُس نے عجب بے خودی میں یہ شعر پڑھے:

"کونجاں وانگ مویاں دیس چھڈ دے، ساں ذات صفات تے بھیس کیہا
وطن دماں دے نال تے ذات جوگی، ساڈا دیس قبیلڑا خویش کیہا
جہڑا وطن تے ذات دا دھیان رکھے دنیادار ہے او دہ درویش کیہا"

محفل اثر کی آہنچ سے سلفے کی طرح سلگنے لگی۔ حقہ بردار بھی وہیں شاہ صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب نے پھر اُس کی خلوت میں سیندھ لگانے کی کوشش کی "بابا جی! آپ کا نام؟"

اُس نے پھر وار خالی دیا "دھوئیں کا فقیر ہوں سخیا۔ میرا نام نسب کیا؟"

شاہ صاحب نے مایوس ہو کر منشی دگیر کی طرف دیکھا تو وہ بولا "یہ سائیں ستاں سے جی۔ بڑا دکھی بندہ ہے۔ اکیلا ہے بے چارہ۔"

"کیوں ان کے گھر والے کیا ہوئے؟" شاہ صاحب نے پوچھا۔

اس بار منشی دگیر نے جواب میں شاہ داؤد کی وار کا یہ ٹکڑا سنا دیا:

"پنچھی اڈ گئے مار اڈاری، تے خالی رہ گئیاں بتھاں دے وچ ڈوراں"

"جلو جی چرچا کاہے کا، جو گھڑیا سو بھجنا" سائیں ستاں نے بات پر مہر لگا دی اور حقہ لے کر آگے چلا گیا۔

علی ہجرانے سخن ابتدا کیا۔ "چوہدری سجاد، تم میں اور صادق ہانی ہیں۔ گاؤں کے مدرسے میں اکٹھے پڑھتے رہے اور چاندنی راتوں میں لیندے والی رڑی پر کبڈی کھیلتے رہے۔ آج تم پنشن پر آ گئے ہو۔ گویا ساٹھ سال عمر پوری ہو گئی؟"

"ہاں علی، عمر کے ساٹھ سال پورے ہو گئے۔ کل کو ہم بھی پورے ہو جائیں گے۔"

صادق نے اداسی کا موگھا بند کرتے ہوئے کہا: "یاد ہے سجاد حیدر، جب منشی فیض رسول نے فتے ڈھول کو غصے میں گالی دی تو اس نے منشی کو فرش پر لٹا کر خوب تاڑی لگائی تھی!"

"ہاں" میں نے کہا "اس نے بوہتی ہی کی تھی، غصہ تو ساری جماعت نے نکالا تھا بے چارے منشی پر۔"

اس پر سب قہقہہ مار کے ہنسے اور سب سے اونچا منشی دگیر ہنسا۔

بابا نور جواب تک خاموش تھا بولا "تمہارے والد چوہدری نور حسین جب پشاور سے پنشن لیکر آئے تھے تو انھوں نے سب سے پہلے مجھے اور محمد خاں گوندل کو بلا کر ہم سے خود کاشت کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ ہم سب نے اس بات کی ہامی بھری اور انھوں نے چار جوگوں کی واہی کی۔ بار سے دو بھینسیں بھی خریدیں۔ اب تم بھی پنشن پر آ گئے ہو اپنی واہی جوتی کرو۔"

میں نے بات سمیٹنے کے لئے کہہ دیا: "اچھا سوچ تو رہا ہوں۔"

صادق نے چھیڑتے ہوئے پوچھا "کیوں بھئی چوہدری ہل تو چلا لو گے نا؟"

بابا نور نے دفاعی حملہ کیا: "انہیں ہل چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ٹریکٹر خرید کر اپنی زمینوں پر چلائیں گے۔"

۱؎ نال ۲؎ بجولی ۳؎ مغرب کی جانب میدان ۴؎ ناکہ ۵؎ پٹائی کرنا ۶؎ بیلوں کی چار جوڑیوں سے کاشت

صادق بات کے پیچھے ہی پڑ گیا "سرکار کتنی پنشن دیتی ہے؟ ٹریکٹر تو آ ہی جائے گا ان پیسوں میں؟"

"ہاں" میں نے کہا "اگر بیٹی بیٹے کی شادی نہ کروں، اپنا جدی مکان مرمت نہ کراؤں اور اسلام آباد کے مکان کا قرض ادا نہ کروں۔"

سب لوگ میری بات کو مذاق سمجھ کر ہنسنے لگے۔

پرویز نے غالباً بات کا رخ بدلنے کے لئے پوچھا "کتنی نوکری کی آپ نے چاچا جی؟"

"چھتیس سال" میں نے جواب دیا "دس سال محکمہ اطلاعات پنجاب میں ملازمت کی اور چھبیس سال کے قریب ریڈیو کے محکمے میں۔"

"تب تو بہت پیسہ جمع کیا ہوگا" صادق سر عام میرے کپڑے اتارنے پر تُلا ہوا تھا۔

میں نے بھی کپڑے اتارنے شروع کر دیئے "جس دن راولپنڈی میں دفتر چھوڑا ہے، بینک میں میرے چار سو روپے تھے اور جیب میں اس مہینے کی تنخواہ۔ باقی پنشن کا حساب سرکار کے کھاتے میں ہے۔"

کہنے کو تو میں یہ کہہ گیا لیکن مجھے اہل مجلس کی صورتیں بتا رہی تھیں کہ میرا بھاؤ بہت گر گیا ہے چنانچہ اکاؤنٹ بیلنس[۱] کرنے کے لئے میں نے اپنا منصوبہ بندی کا پٹارہ کھولا اور خوش رنگ خواب کھول کھول کر جملہ حاضرین کو دکھانے شروع کر دیئے۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے نئی سڑک پر ایک پٹرول پمپ لگ گیا جس کے تمام اخراجات تیل کمپنی نے برداشت کئے۔ ایک کاروباری دوست کے پُرخلوص تعاون سے مرغی خانے کا ڈھانچہ بھی مکمل ہو گیا اور گاؤں میں محکمہ صنعت کی مدد سے ایک قالین سازی کا تربیتی مرکز بھی قائم ہو گیا، جو بعد میں قالین بنانے کے لئے باقاعدہ فیکٹری کی صورت اختیار کرنے والا تھا اور گاؤں کے بچوں کو روزگار مہیا کرنے والا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے رفاہ عامہ کے میدان میں ایک RURAL HEALTH CENTRE بھی قائم کرنے کے روشن امکانات کی طرف بھی اشارے کئے۔ اب میں نے جائزہ لیا تو میری نظروں کے سامنے رائے عامہ کا گراف تنگ بانا تھا جس پر میری ہر دلعزیزی کا CURVE آسمان گیر نظر آ رہا تھا چنانچہ مجھے یقین ہو گیا کہ میری رفت سے آئندہ آمد تک یہ گراف اسی حالت میں وہاں لٹکا رہے گا مزید برآں مجھے اللہ کی ذات سے امید تھی کہ کل پیچھے بقائے اگراہنے[۲] کے بعد مجھے اگلی فصل کی کٹائی تک پھر گاؤں آنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔

اسی وقت بیٹھک میں ایک لڑکا داخل ہوا جس کے سر پر چنگیر تھی اور ہاتھ میں کچھ کٹورے تھے۔ اس نے چنگیر فرش پر رکھ دی اور کٹوروں میں دودھ ڈال ڈال کر سب کو پلانے لگا۔ جب سارے دودھ پی چکے تو مولوی غلام رسول نے فرش پر بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے دعائے خیر پڑھی اور سب نے ہاتھ اٹھا کر آمین کہی۔

بابا نور کے پاس بیٹھے علی سنجرانے اس کے کان میں کچھ کہا، اور گاؤں کے اس معمر ترین بزرگ نے حقے کی نڑی منہ سے نکال کر طے شدہ پروگرام کے مطابق قرارداد پیش کی "موہلہ گاؤں کی یہ پریا جس میں مزارع جاٹوں کے سارے گھروں کے بڑے شامل ہیں اور سارے کمیوں کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ موہلہ کے ڈراٹچوں، تارڑوں، سنجراؤں، میکنوں اور چیمہ برادری کی طرف سے چوہدری سجاد حیدر کو دلی دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں آ کر آباد ہوں۔ انہیں یاد رکھنا چاہئیے کہ یہ گاؤں ان کے پردادا میاں نبی بخش نے بسایا تھا اور محکمہ مال کے پرانے کاغذوں میں اس کا نام موہلہ میاں نبی بخش ہی ہے۔ چوہدری سجاد کے دادا چوہدری سلطان احمد چیمہ اور ان کے خاندان کے باقی بزرگ اسی موہلہ کے قبرستان میں دفن ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ یہ اپنی اخیر عمر یہیں اپنی دھرتی پر، اپنے پُرکھوں[۳] کی نشانیوں میں اپنی برادری کے ساتھ گزاریں۔ اسی میں ان کی اپنی اور ہم سب کی بھلائی ہے۔"

یہ کہہ بابا نور نے ماہنو نائی کو پرویز کے پاس بھیجا۔ ماہنو کی سرگوشی سنتے ہی پرویز بھاگا گیا اور وہاں سے سرسوں کے پھولوں سے بھری ہوئی ایک بید کی چھوٹی سی ٹوکری لا کر میری جھولی میں رکھ دی۔ بابا نور نے مسکرا کر کہا "بیٹا، یہ مو ـــ ی کی سوغات ہے۔"

میں نے جھک کر وہ پھول سونگھے، ان کی خوشبو میرے نتھنوں سے سیدھی میرے دل میں اتر گئی مجھے عطر بہت پسند ہیں مگر یہ صرف خوشبو نہیں مشامِ جاں تھی۔ اس میں موہلے کی مٹی کی خوشبو تھی، میرے پُرکھوں کی خاک کی مہک تھی اور ان سادہ محبت کے امرت سے لبریز کسانوں اور کمیوں کی محنت کے پسینے کی باس تھی۔ میں مغلوب ہو گیا۔ میں پُرنم آنکھوں سے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھنے لگا ـــ میں نے سوچا میرے پاس تو دینے کو کچھ بھی نہیں۔ میں ان دریادلوں کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں سوچتا رہا ـــ اور وہ محفل اٹھ گئی۔

۱ـ ACCOUNT BALANCE ۲ـ وصول کرنا ۳ـ اجداد

سکائی لیب

اختر جمال

نام ہوتے ہوئے بھی وہ ایک بے نام و نشان گاؤں تھا۔ ایک بنجر پہاڑی علاقے کا گاؤں۔ اس کے بسنے والے دھرتی کے بنجرپن سے تنگ آ کر دھیرے دھیرے نشیب کے سرسبز علاقے کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ علاقے جہاں سرسبز کھیت ہیں، پانی ہے، کارخانے ہیں، روزگار اور محنت کے مواقع ہیں، جہاں دن کی طرح رات بھی روشن رہتی ہے!

پہاڑی ڈھلوان کا دشوار گذار راستہ طے کر کے وہ دھیرے دھیرے نشیب کی وادی میں جاتے اور پھر اپنے گاؤں کو بھول جاتے۔ گاؤں میں بس بچے کھچے تھوڑے سے گھر رہ گئے تھے جن کا بنجر زمینوں سے کچے دھاگے سے نہیں بلکہ زندگی کی مضبوط ڈور سے رشتہ بندھا ہوا تھا۔ سانس کی وہ ڈور جو موت کے ساتھ ٹوٹتی ہے۔ اور وہ تو مر کر بھی اس پتھریلی زمین میں سونے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جہاں انہوں نے موسموں کی سختی سہی بھوک، بیماری اور پریشانی کی عمر گذاری۔ اس دھرتی کا اور ان کا بڑے دنوں کا ساتھ تھا۔ بُری تھی یا اچھی تھی وہ ان کی اپنی دھرتی تھی۔ وہ یہ آرزو ساتھ لئے مر گئے تھے کہ ان کی قسمت ان کی دھرتی کی قسمت ہے۔ اور کسی دن ان کے اچھے دن ضرور آئیں گے۔ وہ دھرتی کی اور اپنی قسمت لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ وہ سب۔ مرد اور عورتیں۔ پینے کے پانی کے لئے میلوں سفر کرتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی صراحیاں، گھڑے اور ٹھلیاں بھر بھر کر لاتے تھے۔ پہاڑ کی دوسری جانب سے جو چشمہ بہہ کر آ رہا تھا وہ اس گاؤں کے قریب نشیب میں ایک گندے نالے کی صورت میں بہہ رہا تھا اور یہ گندا نالا پانی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ جو لوگ صاف ستھرا پانی پینا چاہتے تھے، انہیں ایک پہاڑی چشمے تک چڑھائی چڑھ کر دور جانا پڑتا تھا۔ پہاڑی چڑھ کر صاف اور ٹھنڈا پانی صرف ان ہی کا مقدر تھا جنہیں پیروں کے آبلوں کی پروا نہ ہو۔ تھکے تھکائے لوگ نالے کے کیچڑ ملے پانی سے ہی پیاس بجھا لیتے تھے۔ عورتیں، بچے لڑکیاں اور کمزور و ناتواں مرد سب کی قطاریں صبح سویرے نالے کے پاس نظر آتی تھیں۔ مرد تو کام پر چلے جاتے تھے، عورتیں اپنے کپڑے بھی وہیں دھونے لے جاتی تھیں۔ اور کپڑے سوکھنے تک وہاں بیٹھی رہتی تھیں۔ ہری ہری گھاس اور پتھروں پر جگہ جگہ کپڑے نظر آتے تھے کام سے فارغ ہو کر وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتیں۔ گیت گاتیں اور جب جی خوش ہوتا اور موسم اچھا ہوتا تو پھر لڈی ڈالتیں بہتے ہوئے پانی کے پاس ایک چھوٹا سا بازار بھی بن گیا تھا۔ یہاں پکوڑے بیچنے والے، موسمی پھل فروش، صابن، تیل اور ضرورت کی چھوٹی موٹی سب چیزوں کی ایک دکان بھی تھی۔ کپڑے دھو کر اور پانی بھر کر جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوتیں تو ان کے دوپٹوں میں ضرورت کی چیزیں بھی بندھی ہوتی تھیں۔ ذرا سی دیر کو وہ دکان کے پاس ضرور ٹھہرتی تھیں۔ سب کا حساب کھلا ہوا تھا۔ بس گھر والے کا نام بتا کر جو چیز چاہتیں لکھوا کر لے جاتیں۔ لیکن جب دو دو مہینے دکاندار کو پیسے نہ ملتے تو وہ سودا دینا بند کر دیتا۔ ان سب کو ایک دوسرے کا حال معلوم تھا۔ جب انہیں پتہ چلتا کہ امیر دین کی بیوی دکان سے سودا نہیں لائی تو اس روز محلہ کے کتنے ہی گھروں سے اس کے ہاں ساگ اور ترکاری آ جاتی۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے اور صبر و شکر سے زندگی گذار رہے تھے۔ شہر جا کر جو نوجوان لڑکے شادی کرنے اپنے گاؤں آتے وہ انہیں شہر کی باتیں جب سناتے تو گاؤں والے آنکھیں پھاڑ کے

حسرت سے سنتے جیسے کسی پرستان کا قصہ ہو اور وہ سوچتے کہ تربیلا اور منگلا پانی کی پریاں ہوں گی۔! اس علاقے کی عورتوں کے سرخ و سفید رنگ پانی کی تلاش میں کڑی دھوپ میں چل چل کر جھلس گئے تھے۔ وہ موٹی موٹی چادریں اوڑھ کر اپنی شلوار کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک کے اوپر ایک گھڑے سر پر رکھے اتنی پھرتی سے اونچی نیچی پہاڑی پر اترتیں کہ ایک گھڑا بھی نیچے نہ گرتا۔ اور جب نالے سے کیچڑ ملا پانی لے کر گھر آتیں تو پھولی نہ سماتیں۔ ایسے لگتا کہ دنیا جہان کا انمول خزانہ کچے گھڑے میں اٹھائے ہیں۔

جب گاؤں میں کسی کے گھر شادی یا غمی ہوتی تو اس روز سب اپنے اپنے پانی کے گھڑے لے کر اس کے گھر پہنچ جاتیں۔ اس روز گھر والی پانی بھرنے نہ جاتی تھی۔ صاف پانی چھان کر مہمانوں کو پلایا جاتا تھا اور کیچڑ ملا برتن دھونے کو الگ کر لیا جاتا تھا گاؤں میں ایک چھوٹا سا پرائمری سکول تھا جو شہر سے آٹھ جماعتیں پڑھنے والے ایک شخص نے خدمت خلق کے لئے کھولا تھا اس سکول میں بس وہی شخص واحد ماسٹر تھا۔ البتہ قرآن شریف مولوی صاحب پڑھا دیا کرتے تھے۔ سکول میں بیس پچیس بچے پڑھتے تھے۔ اب سرکار نے اس سکول کو منظور کر کے کچھ امداد بھی دینی شروع کر دی تھی۔ تین چار جماعتوں سے آگے پڑھنے کا رواج ابھی نہ تھا پانچ جماعتیں پاس کرنے والے گنے چنے تھے۔ باقی سب اپنے دھندوں میں لگ جاتے تھے اور ذرا سمجھ دار ہوتے تو پھر شہر چلے جاتے تھے

اس گاؤں میں کوئی اخبار نہ آتا تھا۔ اگر آتا تو کئی دن بعد پہنچتا اور پرانا ہو کر آتا۔ لیکن اس گاؤں کا باہر کا رشتہ بیٹری کے سیل سے قائم رہتا۔ کئی گھروں میں ٹرانسسٹر تھے جو شہر سے آنے والے نوجوان اپنے گھر والوں کو دے گئے تھے۔ چوپال میں ہر روز کوئی نہ کوئی ٹرانسسٹر لے آتا۔ وہ حیرت سے چھوٹی سی سوئی کو دیکھتے جو دور دراز کے انجان دیسوں کی آوازیں ان تک لاتی۔ ! لڑکیاں جب کسی ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھتیں تو ان میں بھی کوئی منچلی ٹرانسسٹر کی آواز تیز کر دیتی اور وہ سب آواز میں آواز ملا کر گاتیں۔ ! ہمالہ کی ترائی کی پہاڑی پر رہنے والی لڑکیاں لتا منگیشکر، نور جہاں سے لے کر سب ہی مشہور نام جانتی تھیں۔ ان میں کوئی بھی ٹرانسسٹر تنہا نہ سنتا تھا۔ ! وہ ہر چیز بانٹنے کے عادی تھے۔ جس گھر میں بھی ٹرانسسٹر ہوتا چند لوگ ضرور اکٹھے ہو جاتے۔ دن بھر کی محنت مشقت کے بعد تھکے ہارے وہ ایک چھوٹی سی سوئی کی مدد سے دنیا کے دور دراز سفر طے کر لیتے۔ انجانی آوازیں، خوبصورت آوازیں، ساز سر، نئی نئی عجیب باتیں۔ اور تازہ خبریں۔ اور آج کی تازہ خبر اسے ضرور معلوم ہوتی جو شام کو چوپال پر جا تا۔

ایک بار گاؤں کے ماسٹر سے ایک لڑکے نے سوال کیا کہ جب ذرا سی سوئی کی مدد سے دور دور سے دنیا کے ہر کونے سے آواز آ سکتی ہے تو اس طریقے سے پانی کیوں نہیں آ سکتا۔ آواز کی لہر کی طرح کیا پانی کی لہر سفر نہیں کر سکتی۔! اور ماسٹر اسے سمجھاتا رہا کہ کسی دن ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ سوئی کی نوک کے سہارے آسمان سے بادل اتر آئیں۔ اس لئے کہ وہ سب باتیں جو ہمارے دماغ میں آتی ہیں ممکن ہیں۔! اور اگر ایسا ہوا تو اس گاؤں کی قسمت بدل جائے گی۔ اور خدا کے فضل سے یہ مشکل بھی تو نہیں۔ ہمیں دعا کرنی چاہیئے۔!

گاؤں میں کوئی ہسپتال نہ تھا۔ محمد زمان جب پانچ جماعتیں پڑھ کر شہر گیا تو وہاں نوکری کرنے کے کچھ ہی دن بعد وہ طرح طرح کی گولیاں اور دوائیں ساتھ لے کر گاؤں لوٹ آیا۔ اس نے پہلے تو ہومیو پیتھی کا ایک چھوٹا موٹا کورس کیا پھر شہر میں دوا سازی کی دکانوں سے دواؤں کی پرچیاں حاصل کر کے پڑھنا شروع کیں۔ ایک دوائیوں کے ایجنٹ سے بھی دوستی ہو گئی تھی۔ بہت سے پرچے اور دواؤں کے نمونے اس نے دے دیئے۔ اور جب وہ گاؤں آیا تو کھانسی نزلہ زکام وغیرہ کا اتنا اچھا علاج کیا کہ گاؤں والوں نے اسے ڈاکٹر مان لیا۔ سب کو یقین تھا کہ اس کے ہاتھ میں خدا نے شفا دی ہے۔ اس لئے کہ اس کی گولیوں اور پڑیوں سے

انہیں آرام آجاتا تھا۔ پہلے آنکھیں دکھنے، بخار آنے اور چھوٹی موٹی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے بعد وہ دور دراز پہاڑیوں پر جاکر منتیں مانتے، چڑھاوے چڑھاتے، ہر بیماری کا کوئی نہ کوئی پیر تھا اور اس کے مزار پر جانے سے انہیں آرام آجاتا تھا۔ دراصل ان کے اپنے اندر کی روشنی انہیں مایوس نہ کرتی تھی۔ اور وہ بیماری سے جنگ کرنے کے قابل ہوجاتے تھے۔ لیکن جب سے زمان خاں شہر سے ڈاکٹر بن کر آیا تھا دھیرے دھیرے ان سب نے پیروں کے پاس جانا کم کردیا تھا اور زمان خاں کے ہاتھ کی شفا بخشی کے سب قائل ہوگئے تھے۔ زماں خاں بس اتنے ہی پیسے لیتا تھا جن سے وہ شہر جاکر دوائیں لاسکے۔

وہ ہر مہینے شہر جاکر نئی دوائیں لاتا تھا۔ جب گاؤں میں آنکھیں دکھنے یا ملیریا اور ہیضہ جیسی بیماریاں پھیلتیں تو وہ بہت زیادہ مصروف ہوجاتا۔ دوائیں، ٹیکے، مکھیوں اور مچھروں پر چھڑکنے کی دوائیں بھی انہیں دیتا تھا۔ اس کی شہرت قریب اور دور کے دیہات تک پہنچ گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر سے اس کا مقابلہ ہوسکتا ہے اس نے خواہ ڈاکٹری نہ پڑھی ہو مگر خدا نے اس کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ گاؤں کے سر پھرے ڈاکٹر کے دل میں درد تھا۔ اور وہ سچے دل سے ان کا دکھ دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ رات کو چراغ کی روشنی میں دوائیوں کی پرچیاں پڑھتا اور اپنی نوٹ بک میں لکھتا جاتا۔ اگر اس کو ڈاکٹری پڑھنے کا موقع ملتا تو وہ اس پیشے کی آبرو بنتا۔ مگر اسے تو پانچویں کلاس کے بعد پڑھنے کا موقع ہی نہ ملا اس نے جو کچھ حاصل کیا بس اپنی کوشش اور محنت سے ملا۔ اس نے اتنی انگریزی بھی سیکھ لی تھی کہ وہ ڈکشنری کی مدد سے دوائی کا پرچہ سمجھ لیتا۔ اس کے پاس علم نہ تھا بس نیت ہی تھی اور عمل تھا۔ اور نیت اور عمل بس یہ دو چیزیں ہی تو آخرت کا توشہ ہیں اور گاؤں کے ڈاکٹر کے پاس یہ توشہ تھا۔

زمان خاں کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی طرح پہاڑوں کا اجاڑپن دور کردے۔ صحت زندگی اور مسرت سے ہر طرف بہار آجائے کھانستے ہوئے بوڑھے اور نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جب اس کے پاس آتے تو وہ شہر سے لائی ہوئی دواؤں کو مایوسی سے دیکھتا۔ اس لیے کہ بہت سی نئی نئی دوائیوں کی پرچیاں اس کے پاس نہ تھیں۔ اسے ان کا علم ہی نہ تھا۔ تپ دق کی دوا کی پرچی اس تک نہ پہنچی تھی۔ وہ تو بس ملیریا بخار اور ٹائیفائڈ کا علاج کرلیتا تھا۔

پھر ایک دن جب سنار کی بیٹی شاداں جو سونے کے زیوروں سے زیادہ پیلی اور گیندے کے پھول سے زیادہ خوبصورت تھی۔ سب دواؤں کے بعد بھی دم توڑ گئی تو وہ بھی سب کے ساتھ آنسو بہاتا رہا۔ گاؤں والے اسے سمجھانے لگے۔ "تم نے تو بہت کوشش کی مگر موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔" اس کی بیٹی سنار کی بیٹی کی ہم عمر اور سہیلی تھی۔ جب اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر باپ سے کہا "ابا آپ بھی اسے نہ بچا سکے۔" تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ ان میں شفا بخشی کی تاثیر شاید ختم ہوچکی تھی۔

چند دنوں بعد جب اسے اپنی بیٹی بھی گیندے کے پھول کی طرح نظر آئی تو اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سوچا شہر کی بڑی دکانوں سے جاکر وہ نئی دوائیوں کی پرچیاں لائے گا۔ شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر سے پوچھے گا کہ تپ دق کی دوا کی پرچی کونسی ہے۔ وہ اکثر سوچتا کہ کتنا اچھا ہوتا کہ بڑے بڑے ڈاکٹری کے کالجوں میں ایک کلاس ایسی بھی ہوتی جہاں دور دراز دیس جاکر کمانے والے ڈاکٹروں کے علاوہ گاؤں کی چوتھی اور پانچویں جماعت کے لڑکوں کو داخل کرکے انہیں فرسٹ ایڈ اور کچھ نہیں تو نئی نئی اور ضروری دواؤں کی پرچیاں بتائی جائیں۔ آخر دواؤں کے نام اور ترکیب استعمال سے ہی سارا کاروبار چل رہا ہے۔ ورنہ امتحان اور پڑھائی تو جوڑ توڑ، سر پھٹول اور سیاست کی نذر ہوگئی ہے۔

ایک بار وہ شہر گیا اور ایک بڑے ڈاکٹر سے ملاقات کی آرزو میں سارے دن بیٹھ کر لوٹ آیا۔ لمبی لمبی قطاروں میں مریض پرچیاں لئے آ جا رہے تھے۔ ایک بے پرچی کے آدمی کو جو ڈاکٹر سے ملنا چاہتا تھا کہتا تھا۔ "بیمار نہیں ہوں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے ایک دوائی پوچھنا ہے۔" سب نے بے وقوف اور پاگل سمجھا اور دربان نے کسی طرح اندر نہ جانے دیا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ "گاؤں کا آدمی ہے، سنکا ہوا لگتا ہے۔ بیمار بھی نہیں اور دوائی کی بات کرے گا۔ ڈاکٹروں کے پاس فضول باتوں کا ٹائم نہیں ہوتا۔" زمان خاں مایوس ہو کر ڈاکٹر کے کلینک سے نکل آیا۔ دکانوں پہ جا کر چند نئی پرچیاں لیں اور گاؤں لوٹ آیا۔ اگر دربان اندر جانے دیتا تو شاید شہر کا ڈاکٹر اسے تپ دق کی دوائیں بتا ہی دیتا۔ وہ خلش سی ساتھ لے آیا۔!

گاؤں کے ڈاکٹر نے ایک دن ٹرانسسٹر پر تازہ خبر سنی تھی۔ اس کا چہرہ امید اور یقین سے جگمگا اٹھا۔ وہ مریضوں کو بتانے لگا۔ "دیکھو جس طرح انسانوں کے دن بدل جاتے ہیں ویسے ہی گاؤں اور شہروں کے دن بھی بدل جاتے ہیں۔ اب ہمارے گاؤں میں ہسپتال نہیں ہے۔ بجلی نہیں ہے، پانی نہیں ہے، تو یہ سب اس وجہ سے ہے کہ ہم بڑے بڑے پہاڑوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے دور دراز گاؤں کو کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔ ہم ایک ملک کا حصہ ہیں۔ ایک بڑے صوبے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ہمارے اپنے لوگ شہر جا کر روشنیوں کی چکاچوند میں گھر کا راستہ بھول جاتے ہیں اور کھو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سب کو بھی اپنے اندر کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ پرائے اجالے میں پناہ لیتے ہیں مگر اب ہماری قسمت بدلنے والی ہے۔ اب ایک روشن ستارہ ہماری بنجر پہاڑیوں پر طلوع ہوگا کہ سب ہمیں جان لیں گے ساری دنیا ہمارے بے نام گاؤں کو جان لے گی۔ ہماری ان پہاڑیوں کی تصویریں اتاری جائیں گی۔ ساری دنیا کے بڑے بڑے ملک ہماری مدد کو آئیں گے۔ ہمارے لئے خیمے اور طرح طرح کی دوائیں، دودھ کے ڈبے۔ کمبل اور ضرورت کی چیزیں لے کر آئیں گے۔ اب گاؤں کی کوئی بھی بیٹی سونے کی طرح پیلی ہو کر نہ مرے گی۔! روشن ستارہ ضرور طلوع ہوگا۔"

جب وہ یہ باتیں کرتا تو گاؤں کے لوگ حیران ہو کر پوچھتے کہ یہ سب کیسے ہوگا۔ تو وہ سمجھاتا۔ "روشن ستارہ آسمان پر سفر کر رہا ہے وہ تیر کی طرح سیدھا ہمارے گاؤں میں اترے گا۔ اونچی پہاڑی پر خاموشی سے۔! اور تم سب اس تارے سے خوف زدہ نہ ہونا۔ خدا سے دعا کرنا کہ وہ اس گاؤں میں ضرور اترے۔ اگر وہ تارہ روٹھ گیا تو قسمت روٹھ جائے گی۔"

مولوی صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اس روز تو سب کو اپنے اپنے گھروں میں چھپ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیئے۔ وہ روشن ستارہ نہیں ایک آسمانی آفت ہے جو گناہگاروں پر نازل ہو رہی ہے۔ شاید اس کے گرتے ہی قیامت آ جائے۔!"

وہ سب سر جوڑ کر سوچنے لگے کہ کس کی بات مانیں۔ پھر انہوں نے سوچا کہ تباہ تو وہ پہلے ہی ہیں اب انہیں اور کیا چیز تباہ کرے گی اب تو کوئی چیز تباہی سے نکالنے والی ہی آئے گی۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتا ہے۔ دنیا والوں کو ہمارے گاؤں کے متعلق تب ہی معلوم ہوگا جب کوئی آسمانی اشارہ ہوگا۔ لڑکیاں خوشی خوشی لڈی ڈالنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ جیسے بسنت کا تہوار آنے والا ہو۔ وہ سب زرد اوڑھنیاں رنگین اور پیلے پیلے دوپٹے ہوا میں لہراتی روشن ستارے کے لئے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھائے کھڑی تھیں ڈاکٹر صاحب کے پاس گاؤں کے بچے جمع تھے۔ وہ انہیں مٹھائی کی گولیاں دے رہے تھے۔ اگر دوائی نہ بھی دیتے تو گولیاں ضرور دیتے۔ اس لئے بچے شہر کی میٹھی گولیوں کی خاطر ڈاکٹر صاحب کے پاس ضرور جاتے تھے۔ ڈاکٹر نے بچوں سے کہا کہ وہ مسجد میں جائیں۔ قرآن شریف پڑھیں اور پھر دعا کریں کہ اللہ ہماری پیاسی زمین، بنجر زمین کی پیاس بجھا دے، اس کے

دکھ دور کر دے۔ نیکوں اور اچھوں کے ہاتھ میں حکومت دے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جو بہادر ہوں، ایماندار ہوں انصاف کرنے والے ہوں۔ جنہیں دولت کی بجائے اللہ کے بندوں سے پیار ہو۔ اور تب اللہ کی رحمت کا روشن ستارہ ضرور ہمارے گاؤں میں چمکے گا۔

گاؤں کا ڈاکٹر مقدر سے تھک کر اب یہ سوچ رہا تھا کہ نجات کی ایک ہی صورت ہے۔ ہر تخریب میں تعمیر ہوتی ہے۔ وہ گاؤں جس میں زلزلہ آتا ہے سیلاب آتا ہے ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے دنیا والے اسے زمین کے نقشے پر دریافت کر لیتے ہیں۔ اس جگہ کا نام بچے بچے کی زبان پر ہوتا ہے۔ دور دراز دیسوں کی نیک اور خوبصورت پریاں اپنے ہاتھوں سے سوئیٹر اور جرابیں بُن بُن کر بھیجتی ہیں۔ کمبل، رضائیں خیمے، کھانے پینے کی چیزیں۔ عمارتی ساز و سامان سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ فاقہ زدہ بچوں کو دودھ کے ڈبے بٹتے ہیں اور مفت دوائیں۔ ہر مرض کی دوائیں۔ تپ دق کی دوائیں بھی آسکتی ہیں۔!

وہ سوچتا تھا کہ ہمارے گاؤں میں زلزلہ نہیں آسکتا۔ طوفان نہیں آسکتا مگر آسمان پر چکر لگانے والا تارہ ضرور اُتر سکتا ہے اور پھر ساری دنیا ہمارے گاؤں کو جان لے گی۔! ستارہ ڈاکٹر کی آس بن گیا تھا۔

گاؤں کی لڑکیاں کھلے آسمان کے نیچے رات بھر بیٹھی دعائیں کرتی رہیں۔ سکول کا ماسٹر البتہ بالکل چپ تھا۔ گاؤں والے پوچھتے کہ ڈاکٹر کچھ کہتے ہیں۔ مولوی صاحب کچھ کہتے ہیں ایک ہی ٹرانسسٹر سب کو الگ الگ خبریں دے رہا ہے۔ تم بتاؤ کہ روشن ستارہ کیسا ہے۔!

ماسٹر نے بچوں اور بڑوں سے کہا کہ دیکھو ڈاکٹر صاحب اپنی بیٹی کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اس لئے انہیں بس ایک ہی امید رہ گئی ہے، روشن ستارے کی امید۔! مگر مولوی صاحب بھی غلط کہتے ہیں۔ تباہی اور بربادی ہمارے گاؤں پر نہیں آسکتی۔ انہوں نے ایک بچے سے کہا کہ جب تو تصویر بناتا ہے تو کس قدر سنبھال کر رکھتا ہے۔ یہ ساری خوبصورت دنیا۔ یہ رنگ برنگی تصویر اس میں بسنے والے نیک لوگ۔ جیسے ڈاکٹر چاچا۔! خدا اس تصویر کو مٹائے گا نہیں۔ قیامت ابھی نہیں آئے گی۔ ہمارے گاؤں پر اللہ کی رحمت کا سایہ رہے گا۔

پھر ان سب کو پتہ چلا کہ روشن ستارہ تو ان کے گاؤں سے گذر کر دور بہت دور آسٹریلیا کے قریب سمندر میں اُتر گیا ہے۔ انہوں نے مایوسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ عذاب ان کی عبادت سے ٹلا ہے ورنہ بستی ختم ہو جاتی۔ اب لوگوں کو چاہیئے کہ نذر نیاز کا انتظام کریں۔

ڈاکٹر صاحب کسی سے کچھ نہ بولے۔ وہ صبح سے ہی بالکل خاموش تھے۔ گاؤں کی سب لڑکیاں اپنے اپنے پانی کے گھڑے لیکر صبح سے ان کے ہاں پہنچ گئی تھیں ڈاکٹر کی سرسوں جیسی پیلی رنگت والی لڑکی کا اس روز بیاہ تھا اور وہ بیاہ کر دور دیس جانے والی تھی۔ اپنی سہیلی شاداں کے دیس، جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ گاؤں کی لڑکیاں جب مہمانوں کیلئے دھلے ہوئے آنچل میں سے پانی چھان رہی تھیں تو ان کی اپنی آنکھوں سے پانی کے دھارے بہہ رہے تھے۔

سب مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے گاؤں کے ڈاکٹر کے گرد جمع تھے وہ جو ان کا دکھ درد دور کرتا تھا اس کا دکھ کوئی نہ بانٹ سکتا تھا۔ پھر بھی وہ اس کا دکھ بانٹنے آئے تھے اور مجبور بیٹھے تھے کہ اس کا دکھ تو پتھر کا پہاڑ تھا۔ اور اتنا بڑا پہاڑ کندھے پر اٹھائے ڈاکٹر چپ کھڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ روشن ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو چکا تھا۔

جب آسٹریلیا میں گرنے والے روشن ستارے کی بات چھڑی تو ماسٹر نے کہا وہ ہماری قسمت کا تارہ نہ تھا۔ ہماری قسمت کا روشن ستارہ تو اس وقت طلوع ہو گا جب گاؤں کے لڑکے پرائے اُجالے میں راستہ نہ ٹٹولیں اور سب ڈاکٹر چاچا کی طرح پرچیاں پڑھ پڑھ کر ننگے پیر چلنے والے ڈاکٹروں کا ایک ایسا قافلہ بنائیں جو ان دشوار گذار راستوں میں کانٹے دار جھاڑیوں میں سے گذر کر دور دراز لوگوں تک پہنچ جائیں۔ اجالا کہیں سے مانگا نہیں جاتا۔ وہ تو رات کی کالی چادر پھاڑنے سے پھوٹتا ہے۔

گاؤں کے نوجوان سوچ رہے تھے کہ اب ہم آسمان کی کالی چادر میں سے اپنی سونے جیسی پیلی رنگت والی لڑکیوں کے نصیب کے چاند اور ستارے نوچ لیں گے۔!

ماسٹر بچوں سے پوچھ رہا تھا کہ لوگ آسمان پر جا سکتے ہیں کیا تم اپنی دھرتی کی قسمت بھی نہیں بدل سکتے۔؟

پابند

بانو قدسیہ

ڈی سی ٹن بیگانہ وار اڑتا جا رہا ہے۔ اس وہیل مچھلی کو کیا معلوم کہ اس کے سفید پیٹ کے اندر حضرت یونسؑ کی طرح کئی ذی روح رہائی کی آرزو میں تڑپ رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں کسی اور ساحل پر اگلے جانے کی آرزو ہے اور وہ کسی اور سمت میں اس پکھال کے اندر سوار چلے جا رہے ہیں، چلے جا رہے ہیں۔ کوئی نکل نہیں سکتا، اتر نہیں سکتا، سمت بدل نہیں سکتا!

مصیبت اس ہوائی جہاز کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی۔ ہوائی جہاز کا تو محض اتنا قصور ہے کہ وہ مجھے ایک ایسی سمت اڑائے لئے جا رہا ہے جدھر میں جانا نہیں چاہتی۔ اصلی خرخشہ تو کسی اور بات سے پیدا ہوا، ساری تباہی تو اس وقت آئی جب میں نے اپنے اندر جہاز دیکھ کر اگربتیاں سلگائیں، عرق گلاب چھڑکا۔ پھر کسی پوست پوش فقیر کی طرح زانو ٹیک آسن میں بیٹھی اور اپنے آپ سے قسم کھائی....

قسم انسانی دل کو عجیب طور پر شکنجے میں کس دیتی ہے قسم چھوٹی بھی ہو تو بھی بیگار میں پکڑ لیتی ہے۔ وعدہ چاہے توڑنے کی آرزو سے ہی کیوں نہ کیا جائے آخر کو بے تقصیر اسی آدمی پکڑا جاتا ہے۔ قسم چاہے اندر کھائی جائے چاہے کسی کے روبرو، یہ ہمیشہ جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ آدمی بوتل میں بند ہو جاتا ہے۔

قصور اس سفید وہیل مچھلی کا نہیں جو مجھے کراچی کی طرف اڑائے لئے جا رہی تھی.... بلکہ سارا ٹنٹا اسی قسم کا ہے۔ اس گھر کے بھیدی نے مجھے ایسے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جیسے بڑا اژدہا سرخ بندر کو اپنے بلوں میں بلوتا ہے جس وقت میں نے اپنے آپ سے قسم کھائی تھی بارہ بارہ کلومیٹر پر کوئی انسان گواہی کے طور پر موجود نہ تھا۔ کوئی ثبوت، سٹام، کاغذ ایسا نہ تھا جو مجھ پر میری قسم کا دعویٰ کر سکتا۔ لیکن کسی انہونی قوت نے مجھے پوری طرح دبوچ رکھا ہے اور میں اس بھنور جال سے نکل نہیں سکتی۔

پتہ نہیں کیوں قسم سے آدمی تعویذا جاتا ہے؟ —— وہ لوگ بھی جو بار بار قسم کھا کر توڑنے کے عادی ہیں، وہ بھی قسم توڑتے وقت اپنے ثقل سے ضرور ہل جاتے ہیں۔ قسم میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس میں دعویٰ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس دعویٰ میں آدمی نظر ثانی تخفیف و اضافہ، کسی قسم کی تحریف و تصرف کا مجاز نہیں رہتا، یا یوں سمجھ لیجئے کہ انسان جو متحرک پیدا ہوا ہے یکدم مینخا جاتا ہے۔ جو چیز طبعاً سیال ہے ٹھوس میں بدل جاتی ہے۔ ثقل سے آزاد رہنے کی خاصیت ختم ہو جاتی ہے اور آدمی دعویٰ کی سمت کا پابند ہو جاتا ہے۔ قسم کھاتے ہی وعدے کی متوازی پٹڑیاں بچھ جاتی ہیں، اور ان پر قسم کا سیاہ ڈیزل انجن بڑے تکدر سے ان مانے جی سے رُک رُک کر چلنے لگتا ہے۔ قسم کھاتے ہی وعدے کا حصار خود بخود راہ کھوٹی کرنے کو کھڑا ہو جاتا ہے جس طرح ماڈرن چھوٹا بچہ اپنے بیبی واکر میں چلتا تو ضرور ہے لیکن وہ دائرے سے آزاد نہیں ہو پاتا۔ ایسے ہی قسم کھاتے ہی وعدے کا ہالہ کہیں سے آ کر گھیرا ڈال لیتا ہے۔ چاند کے گرد بھی ایسا ہی ہالہ ہوا کرتا ہے جہاں کہیں بھی چاند خوش خرامی کرتا چلا جائے ہالہ رسی ناپتا ساتھ ہی پہنچ جاتا ہے۔

چھوٹے موٹے وعدے، چھوٹی چھوٹی قسمیں —— سب ریگمال کی طرح دل کے ہونٹوں پر پھرتی رہتی ہیں، اور جب تک زندگی دل کے اوپر ہاتھی کے چمڑے کا کیس نہیں چڑھا دیتی تکلیف دیتی ہیں۔

ہوائی جہاز نیلے آسمانوں کو چیرتا آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے وہ دعائیں یاد نہیں جو اس موقع پر پڑھنی چاہئیں ور میرے اندر کی قسم مجھے اپنے گھسیٹے لئے جا رہی ہے جیسے میں ایک بادپا رہوار کی کاٹھی سے گر کر صرف ایک پاؤں اُس کی رکاب میں پھنسائے گھسٹتی جا رہی ہوں۔

جب میں نے قسم کھائی تھی تو مجھے معلوم نہ تھا کہ حصولِ وعدہ دنیا کی مشکل ترین شے ہے۔ حاسد اور بدخواہ حالات ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ وعدہ کرنے والے اپنے ضابطے سے اپنی راہ ریت سے ہٹ جائیں۔ آپ آزمائش کے طور پر کسی سے وعدہ کر لیں اور پھر وعدے کو پختہ کرنے کے لئے کوئی اوٹ پٹی سی قسم بھی کھا لیں کہ آپ پورے آٹھ بجے اُسے یونیورسٹی کے بس سٹاپ کے سامنے ملیں گے۔ اس کے بعد آپ تجربہ کریں گے ہر نوعیت کی رکاوٹ بددیانتی، منہ زوری اپنی حالات کا جزو بن جائے گا۔ اس روز جب آپ آٹھ بجے کا وقت دینے کے مرتکب ہوئے ہیں، عین اس روز صبح آپ کا الارم دغا دے جائے گا۔ آپ ازل سے نماز پڑھنے کے عادی ہوں گے لیکن اس روز نہ سورج آپ کو جگا سکے گا نہ مکھیاں اور آپ پونے آٹھ بجے تک سوتے رہ جائیں گے۔ پھر آپ بھاگم بھاگ غسل خانے جائیں گے، وجس وقت آپ کا سارا جسم جھاگوں جھاگ ہو جائے گا کمیٹی کے نلکے سے پانی آنا بند ہو جائے گا ہمسائے کے ہینڈ پمپ سے بالٹی پانی کی لانے تک کئی اور مزاحمات در پیش ہوں گی پھر آپ ایک پیالی چائے کی خاطر جب میز کے کنارے بیٹھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ نہ گجر آج صبح آیا ہے نہ گھر پر چینی ہے ـــــ آپ خالی قہوہ پی کر جس وقت بس سٹاپ پر پہنچیں گے تو اردگرد کی تمام گھڑیوں میں پونے نو کا وقت ہو گا اور جن صاحب سے آپ نے وعدہ فرمایا ہو گا وہ آپ پر وعدہ فراموش کا لیبل لگا کر رخصت ہو چکے ہوں گے۔

جس طرح شیشے کے اندر ایک اندرونی سٹرین ہوتا ہے بظاہر بہت مضبوط اور ثابت نظر آتا ہے لیکن ذرا ٹھنڈے گرم کا تحمل نہ پا کر اپنے ہی انجر پنجر ڈھیلے کر لیتا ہے، ایسے ہی وعدے کے اندر بھی ایک انٹرل سٹرین ہوتا ہے۔ قسم کے اندر بھی ایک خاص قسم کا سدِ باب موجود ہوتا ہے جو ناکامی کو ہر وقت ماحول سے یوں اخذ کرتا ہے جیسے بہتے پانیوں کے اردگرد خود بخود روڑے پتھر جمع ہو جاتے ہیں۔

یہ سچی بات ہے کہ جس وقت میں عامر سے ملی میرا آسمان بالکل صاف تھا۔ جون کے تپتے مہینے میں اس پر کوئی بدلی نہ تھی۔ بی۔ اے کئے مجھے چار سال ہو چکے تھے۔ شادی ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ نوکری سے خوف آتا تھا۔ میری زندگی مکمل طور پر روزمرہ کی پابند ہو چکی تھی۔ اور جیسے گویئے لوگ ریاض کے چکر سے نہیں نکل سکتے میں بھی ہر دن اکتاہٹ، بدمزگی، لاپروائی کے دائرے سے نہ نکل سکتی تھی۔ میں گھر کے پھاٹک کو اپنا اُفق سمجھتی تھی۔ میں اگر آپ کو بتا سکوں کہ میں نیوٹن کے قانون کی بہترین تفسیر تھی۔ بقول نیوٹن میں INERTIA تھی۔ بیرونی طاقت کے بغیر کوئی چیز میری سپیڈ یا مومینٹم توڑ نہ سکتی تھی ـــــ اور اگر عامر میری زندگی میں قوت بن کر نہ آتا تو میں بغیر کسی چیخ چنگھاڑ کے اپنی زندگی کے بقیہ دن ایسے ہی گزار دیتی جیسے انجن کا کرینک شافٹ۔ آگے پیچھے ـــ آگے پیچھے ـــــ

لیکن جمالِ خدا نما بن کر عامر آیا اور پھر ہر کونہ ہر سمت منور ہو گئی۔ اندھیرے میں یہ وصف ہے کہ آنکھ اُس میں کچھ نہیں دیکھتی اور اجالے میں یہ خوبی ہے کہ جس چیز پر پڑے اُس کے تمام زاویے، رنگ، شیپ واضح ہو جاتے ہیں۔ جونہی عامر کی گوہر دار کرنیں مجھ پر پڑیں۔ میں سب کو نظر آنے لگی۔ اس سے پہلے میرا مسئلہ یہ تھا کہ کاش میں کسی کو دکھائی دے جاؤں۔ کسی شادی پر، کسی ماتم کی گھڑی، سینما گھر میں، چاٹ کھاتے ہوئے، کپڑا خریدتے سمے، کار سے اُترتے ہوئے، ٹرین پر چڑھتے ہوئے ـــــ پر میں تو اندھیرا تھی اور انسانی آنکھ کے راڈ اور کونز اندھیرے کے آگے معذور تھیں۔ مجھ پر عامر کی روشنی پڑی تو میں سب کو نظر آئی۔

میرا رنگ پکا سانولا اور قد چھوٹا تھا۔ جسم میں اُن جگہوں پر گوشت نہیں تھا جہاں ہونا چاہیئے اور وہاں وافر تھیں جہاں لوگ عموماً نشیبوں کے آرزومند ہوتے تھے۔ اس پر آواز میں قدرتی بھٹا پن تھا۔ بوتل سے پانی نکلنے کی آواز سے کوسوں دور ـــــ ناک چھدی ہوئی تھی پر لوگوں کے تمسخر کی وجہ سے ناک میں کچھ ڈالنے کی ہمت نہ تھی۔ چوڑیاں، انگوٹھیاں، نیکلس سب مجھ پر بیکار تھے۔ کاسنی، سبز، گلابی، نیلا ـــــ لڑکیوں والے یہ تمام رنگ مجھ پر آتے ہی بارِ حیات ہو جاتے ...... مجھے کالج میں تمام لڑکیاں کچھ نہ کچھ مشورے دیتی رہتی تھیں۔

"ہائے ثمن بازوؤں پر ویکس ہی کر لیا کرو— اتنے بھاری بال تم کیسے برداشت کرتی ہو —"

"ثمن ہلکے رنگ پہنا کرو— تمہارے جیسی رنگت پر ہلکے پھلکے رنگ جچتے ہیں"

"ثمن جی گہرے رنگ پہنا کریں۔ ڈارک براؤن، میرون، نیوی بلو، ان گلابی نیلے پیلے رنگوں کو چھوڑ دیں۔ یہ شفاف رنگتوں کے لئے رہنے دیں ....."

اپنے آپ کو سجانے بنانے کے مرحلے سے میں جلدی فارغ ہو کر بادامی، اودے اور سفید کپڑے پہننے لگی تھی۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ کانوں میں سفید موتیا کی کلیاں پہن کر کالج جاؤں لیکن دونوں بالے پرو کر میں فریج میں رکھ دیتی اور نہیں پہن کر کالج نہ جا سکتی۔ شروع سے مجھے چھیدنا آسان تھا۔ میں بڑھیا نہ تھی کہ باتوں کا بوجھ اٹھا لیتی۔ یہ سن کر لوگ مجھ سے جو کچھ کہتے تھے وہ جھوٹ تھا بلکہ میری مشکل صرف یہ تھی کہ میری آرزو تھی کہ میری سہیلیاں، گھر والے کم از کم اس قدر سچ کہنے کے مرتکب نہ ہوں لیکن عامر نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ پھر میری ذات کے سارے کیچڑ میں پشکلا کے پھول اگ آئے اور میں شفاف تال کی طرح نظر فریب ہو گئی۔ یہی نظر کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اگر نظر میں سرزنش ہو تو یہ دھنیے کی طرح دھنک کر دھر دیتی ہے۔ اگر نگاہ میں محبت ہو تو پس کے پٹنے ہی تہذیب ہونے لگتی ہے اور گدھے کی کھال اتر کر گھوڑے کی پشم اگنے لگتی ہے۔ شاید اسلام میں اسی لئے نظر نیچی رکھنے کا حکم ہے کہ لوگ اس کی باڑ سے محفوظ رہیں ورنہ توڑے کو آگ نہ دکھائیں کہ بھر انسان کمزور ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ معجزے پر ہی مرتا ہے۔

عامر سے میری ملاقات ڈاکٹر قاسم کے کلینک پر ہوئی۔ میں بائیس برس کی عمر میں دو داڑھیں نکلوا چکی تھی۔ میں ڈینٹل سرجن کے ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ میرے چہرے کے عین سامنے غسل خانے کا دروازہ تھا جس پر موٹے موٹے بلاک لیٹرز میں لکھا تھا— "یوزی"— ہر بار جب میری نگاہ دروازے پر پڑتی تجھے لگتا جیسے دروازے پر کسی نے میری ضرورت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ میں سیاہ پلکوں کو سیاہ گالوں پر چسپاں رکھنا چاہتی تھی جب عامر اندر سرجن کے کمرے سے نکلا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی زحمت نہیں کی اس لئے سنک پر جھکے ہوئے اس اپالو کو میں بخوبی دیکھ سکتی تھی جو سنک پر کھڑا کلیاں کرنے میں مشغول تھا۔ میں نے ٹائم رسالہ پڑھنے کی کوشش کی۔ گردآلود پلاسٹک کے پھولوں کو دیکھنے میں چت لگانا چاہا دیوار میں لگے ہوئے اگزاسٹ فین کو کئی بار دیکھا۔ صوفے سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے پھونسڑوں کو کھینچا لیکن سفید بینٹ قمیص اور کالی بلٹ میں کسی ہوئی چیتے کی کمر پر لوٹ لوٹ کر نگاہ گئی۔ جیسے بچے سکول سے لوٹتے ہوئے پولس چوکی سے ڈرتے ہوئے بھی بار بار اسی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں ایسے ہی تمام خوف کے باوجود اس جادو کا توڑ میرے پاس نہ تھا۔

وہ کچھ دیر کے بعد میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ بہت سرخ ہو رہا تھا۔ پی آئی اے کی ایئر ہوسٹس جیسی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر جیب سے سفید رومال نکال کر منہ پونچھنے لگا۔ "میں ٹیکہ نہیں لگوا سکتا۔ سرنج دیکھ کر ہی نروس ہو جاتا ہوں —"

پتہ نہیں یہ بات اس نے مجھ سے کہی تھی کہ اپنے آپ سے کیونکہ ہم دونوں کے علاوہ ویٹنگ روم میں اور کوئی نہ تھا۔

اکلوتی مریضہ جو ہم دونوں کے علاوہ موجود تھیں اس وقت اندر جا چکی تھیں۔

"بچپن میں تو ٹیکہ دیکھ کر میں بیہوش ہو جایا کرتا تھا—"

میں نے اس کی طرف دیکھا مجھے یوں لگا جیسے چھ فٹے قد کے باوجود وہ اب بھی بچپن کی منزل میں تھا۔

"ڈاکٹر قاسم نے کہا ہے میں کچھ دیر بیٹھا رہوں شاید ری ایکشن نہ ہو کہیں —"

کاش وہ مجھے بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہ دیتا یا پھر اٹھ کر چلا جاتا چپ چاپ۔

"مجھے دانت کی فلنگ کرانی ہے۔ میں تو کہتا ہوں دانت نکال دیں پر وہ مانتے ہی نہیں ڈاکٹر قاسم— اور درد اس قدر ہو رہا ہے!"

ابھی تک میں نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا تھا مجھے ڈر تھا کہ میری آواز سے ڈر کر کہیں وہ بھاگ نہ جائے۔

"یہ جو لیڈی ابھی اندر گئی ہے آپ کی ممی ہے نا؟" —— اُس نے سوال کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی وقت کلنک کا دروازہ کھلا اور ڈینٹل سرجن کے اسسٹنٹ نے آواز لگائی "مس ثمن شیخ؟ ——"

میں نے جلدی سے اُٹھ کر سرجن کے کمرے کا رُخ کیا۔ اندر سے دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے ایک نگاہ بھر عامر پر ڈال لی۔ وہ بچوں کی طرح حیران بیٹھا اپنے گال پر رومال رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

عشق مہر گزیدہ سے میرا تن بدن جلنے لگا..... جتنی دیر ڈاکٹر فلنگ کرتا رہا میرے دل سے ایک ہی صدا بلند ہوتی رہی کہ میرے باہر نکلنے تک وہ وہاں موجود ہو۔ مجھے جتنے وظیفے آتے تھے تمام کے تمام میں نے پڑھ ڈالے۔ مجھے خوف تھا کہ جب میں باہر نکلوں گی وہ جا چکا ہوگا۔

کہتے ہیں، بڑے سے بڑا بند بھی جب ٹوٹتا ہے تو سب سے پہلے اُس میں اُنگلی بھر شگاف پڑتا ہے اور پھر پانی کی چھوٹی سی پنسل برابر موری سے پانی رِستا ہے۔ غالباً جب انسان کی ذات کے حصار میں سب سے پہلے محبت کی سرنگ لگتی ہے تو یک نظر سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی آدمی صرف ایک نظر اور دیکھنے کا آرزو مند ہوتا ہے۔ اسے یہ علم نہیں ہوتا کہ نظروں کی آرزو وہ ڈائنامائٹ ہے جو ایک بار اکٹھی ہو کر ذات کے سارے حصار کو بلاسٹ کر سکتی ہے۔ میں نے پوری منت کے ساتھ اللہ کی درگاہ میں عرض کی کہ اگر میں عامر کو ایک نگاہ پھر دیکھ پاؤں گی تو پھر میں ساری عمر..... کبھی کسی مرد کی آرزو نہ کروں گی میری شادی چاہے کسی سے ہو..... مجھ پر سوائے عامر کے ہر مرد کی محبت حرام ہوگی ... اگر میں کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں تو جو چور کی سزا وہ میری....

اس لمحے جب میں ڈاکٹر کے سامنے منہ کھولے نیم دراز تھی اور وہ لونگ کی خوشبو بھرا مسالہ میری داڑھ میں بھر رہا تھا، میں نے اپنے دل کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا، اگربتیاں سلگائیں اور اپنے آپ سے قسم کھائی —— اپنے اوپر تمام مردوں کی محبت کو حرام قرار دیا۔

جب میں کلنک کا دروازہ کھول کر ویٹنگ روم میں آئی تو وہ ابھی ویسے ہی بیٹھا تھا —— ناچار —— تنہا۔ لیکن اوس چاٹے پیاس نہیں بجھتی۔ کسی کو دیکھ لینا ایک عرصے تک تسکین دیتا ہے پھر کچھ قدم آگے بڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ بڑھنے کی منزلیں اور حدیں بڑھتی جاتی ہیں حتّیٰ کہ پھر پسپائی کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اور آخر میں کھلا چاقو اپنے ہی دستے کے ساتھ لگ کر پھر بند ہو جاتا ہے۔

عامر کی محبت اُن واقعات سے عبارت نہیں جو اس کی اور میری ملاقاتوں میں پنہاں تھے بلکہ اس کی محبت میں ایک گپت چھپا ہوا راستہ ایسا تھا جس نے میرے جسم، روح، دل و دماغ کی ہیئت کو بدل دیا۔ یوں سمجھئے اُس کی ذات نے نہ صرف میری شخصیت کو بدل دیا بلکہ میری ساری باڈی کیمسٹری ہی مختلف کر دی۔

اس کی محبت ایسی حرف ساز تھی کہ میری ساری عبارت، جو بے معنی تھی، دلآویز غزل بن گئی کہ جو پڑھتا سوز و گداز سے بھر جاتا۔

عامر کی عنایتوں کے پہلے اثرات میرے جسم پر مرتب ہوئے۔ جسم جو بے ڈھنگا تھا زنبورِ سرخ کی طرح سڈول ہو گیا۔ اس سے پہلے میں بے تحاشا کھایا کرتی تھی۔ جیسے میری COMPULSIVE EATING مجھ پر حاوی تھی مرغن کھانے کاربوہائیڈریٹ مجھے مرغوب تھے خود بخود میں کھیروں پر گذر کرنے لگی۔ جوس اور دودھ میری غذا بن گیا۔ عامر مجھے بال کٹوانے لے گیا۔ اس سے پہلے مجھے اپنی لمبی لیکن پتلی چوٹی سے بڑا پیار تھا۔ لیکن جب چوٹی کاٹ کر ہیئر ڈریسر نے میرے پاس آئینے کے سامنے رکھی تو مجھے آئینے میں نظر آیا کہ چٹیا تو ایسی نہ تھی جس کا افسوس کیا جاتا۔ میں نے بالوں کو پرم کروایا۔ بازو اور ٹانگوں پر ویکسنگ کروائی، چہرے پر اُگے ہوئے سیاہ روئیں کو تھریڈنگ سے صاف کروایا، ناخن مینی کیور کروائے، پیروں کے گٹوں پر مالش کروائی۔ پیٹ کی ورزشیں معلوم کیں۔ کمرے میں سائیکل چلائی، میک اپ کرایا اور جب میں بیوٹی کلنک سے باہر نکلی تو عامر نے میرا سواگت بڑی مدھم سی گنگناتی سیٹی سے کیا۔

آپ نے وہ کہانی ضرور سنی ہوگی جس میں ایک شہزادی کی شادی ایک مینڈک سے ہو گئی تھی۔ شہزادی کی محبت کے لمس سے یہی مینڈک ایک خوبصورت دلآویز شہزادے میں بدل گیا۔ محبت میں یہ قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ گدھے کو گھوڑا، کیچوے کو سانپ، بلی کو چیتا اور جھینگر کو گھڑی میں بدل دے

ہر مینڈک محبت کی ان کرنوں میں شہزادہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہر انسان جس پر پیر کامل کی توجہ پڑ جاتی ہے اُس کا قلب روشن ہو جاتا ہے ——— ایسے ہی میرے جسم، روح، ذات کی ڈالی ڈالی میں سیب کے شگوفے لگ گئے ——— میں لڑکیوں میں نمایاں نظر آنے لگی یوں سمجھیئے کہ میں لڑکیوں میں سینڈرڈ ڈیمپر اور پلشر کی لڑکی شمار ہونے لگی۔ یہی وہ دن تھے جب عامر ایم فل کرنے کے لئے لندن روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا، اور مجھے پکڑ دھکڑ اُس نے بینک کی نوکری دلوا دی۔

دراصل مجھے نوکری کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ مجھے نوکری کا کوئی ایسا شوق بھی نہ تھا لیکن عامر کے بڑے فلسفے تھے جس روز اماں جی سے اُس نے نوکری کا ذکر کیا، اُس روز باہر خوب بارش ہو رہی تھی۔ ہماری چھ کنال کی کوٹھی کے برآمدوں میں اولے تھے۔ باہر لان پر درخت کے تھال چھوڑ کر سارے میں فینائل کی گولیوں اتنے اولے بکھرے ہوئے تھے۔

"آپ اسے نوکری کرنے دیں اماں جی پلیز ——— ایک دو سال کے لئے ———"

اماں اندر ہی اندر میری شادی کے پروگرام سیٹ کر رہی تھیں، فٹ بولیں "ناں عامر اسے کیا ضرورت ہے نوکری کرنے کی۔ اس کے دونوں بھائی سلامت رہیں۔ اچھا بھلا خرچ بھیجتے ہیں ٹورانٹو سے ———"

"تو کیا کرے گی یہ پورا سال ———؟"

"تم چاہو تو یہ تمہارے ساتھ چلی جائے ———"

"نہیں اماں جی ——— ایک تو میں نہیں پڑھ سکوں گا۔ ایک یہ اچھی طرح فیصلہ کرے کہ یہ کیا چاہتی ہے ———"

اماں کو بیوہ ہوئے دس سال ہو چکے تھے وہ اپنے دو ڈاکٹر بیٹوں کی کمائی پر تال کی کائی جیسی منجمد زندگی بسر کر رہی تھیں۔ انہیں نئے عہد کی باتیں، ارادے، خیال، سوچ، فیصلے بالکل سمجھ نہیں آتے تھے ..... میں کھڑکی میں کھڑی باہر گرتے ہوئے تڑاک کے وار اولے دیکھ رہی تھی۔ اماں چلی گئیں تو عامر اٹھ کر میرے پاس آ گیا "کیا ہوا ہے ———"

"تم مجھے ساتھ لے جانا نہیں چاہتے ———" بڑی دیر بعد میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عامر نے محبت سے میرے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو اوپر اٹھایا اور بولا ——— "دیکھو ہمن! تم نے بہت جلدی میں بہت سے فیصلے کر لئے ہیں۔ تم اتنی دیر تک لیڈی آف شیلاٹ کی طرح اس کوٹھی میں بند رہی ہو کہ تم واقف نہیں ہو کہ باہر کیا ہو رہا ہے ——— میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، لیکن یہ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیئے ——— میرا نہیں ———"

"لو یہ فیصلہ میرا ہی تو ہے ———"

"یہ فیصلہ تمہارا نہیں ہے ———"

"کیوں؟ ——— یہ تم نے کیسے اندازہ کر لیا ———"

"کیونکہ تم ابھی میچیور نہیں، ابھی تم محض اپنی IMPULSES کی وجہ سے بچوں کی طرح فیصلے کرتی ہو۔ آئس کریم کھانا چاہی کھالی، نہ ملی تو رو دیئے، زیادہ ضدی ہوئے تو رو دھو گئے ——— تمہیں میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ ایسے کرنا چاہیئے جیسے ایک انسان کرتا ہے ——— بچہ نہیں ———"

باہر گراؤنڈ میں اولے گرنا بند ہو گئے تھے اور بڑی بڑی بوندوں والی بارش پڑ رہی تھی۔ جامن، آم اور امرودوں کے درخت ان بوندوں میں سُردوں کی طرح نچ رہے تھے۔ میں نے مڑ کر پہلی بار عامر کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے میں نے عامر کو نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں ایک ایسے شخص کو دیکھتی آئی تھی جو فلموں میں، ناولوں میں، ڈراموں میں، مشاعروں میں، کرکٹ میچوں میں نظر آ جاتا ہے۔ اب مجھے محسوس ہوا جیسے وہ مجھے تراش خراش کر میری محبت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ غالباً اُس کے اندر بھی کہیں کوئی مونو میٹر ایسا لگا تھا جو اُسے بتا رہا تھا کہ پیچھے سے وہ ٹیچ درست نہیں آ رہی.....

میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُس کے کندھے پر رکھا اور آہستہ سے بولی ــــ "سنو عامر! ــــ مجھے آج کل..... ہمیشہ تم سے محبت رہے گی..... میں کبھی نہیں بدلوں گی ــــ کبھی نہیں"۔

"یہ بڑا مشکل سا دعویٰ ہے ثمن ــــ"

"مجھے تمہاری قسم..... مجھے..... مجھے اپنے ایمان کی قسم میں تمہارے سوائے اور کسی مرد سے کبھی محبت نہ کروں گی: میں کر ہی نہیں سکتی ایسے ــــ یہ ناممکن ہے"

کاغذ پر دستخط ہو گئے، میں نے اپنی مہر لگا دی ــــ اب تک میں کلنک میں کھائی ہوئی قسم ہی کی پابند تھی۔ اب میں نے اُس قسم کا اعلان بھی کر دیا ــــ اپنے آپ کو امتحان میں ڈال دیا۔

ساری مصیبت اِس اعلان سے شروع ہوئی، یا یوں سمجھیے کہ سارا منظا اُس قسم سے شروع ہوا جو میں نے اپنے آپ سے کھائی تھی۔ اگر میں عامر کے چلے جانے کے بعد گھر پر آرام سے بیٹھ کر اُس کا انتظار کرتی، کسی میوزک ماسٹر سے شدھ راگ سیکھتی رہتی، فرصت کے اوقات میں عورتوں کے رسالے سے نمونے نکال کر کشیدہ کاری کرتی، ایسی غزلیں لکھتی جو کسی رسالے کی زینت نہ بنتیں۔ ریڈیو کے پروگرام سن کر ریڈیو سٹیشن خط لکھتی۔ آدھی رات گئے تک عامر کی واپسی کے لئے دعا مانگتی رہتی، اور اپنے آپ کو مالدیپ کے جزیرے میں جلاوطن رکھتی تو اور بات تھی لیکن میں تو بنک کی آفیسر تھی۔ کُلی کبوتری کی طرح میری اُڑانیں دور دور کی تھیں۔ صبح بنک پہنچتی، شام تک رنگ رنگ کے لوگوں سے واسطہ پڑتا۔ اوور ڈرافٹ لینے والے، دوبئی، مسقط، دمام کا پیسہ جمع کرانے والے، کرنٹ اکاؤنٹ سے دن میں کئی چیک بھنوانے والے، سیونگ اکاؤنٹ کی کاپی بنوانے والے، روز کے گاہک سرکاری دفتروں کے ماہوار آنے والے سرکاری کلرک جن کو پورے پورے دفتر کی تنخواہیں لے جانی ہوتیں، بزنس مین اور اُن کے بنک ڈرافٹ، امیر عورتیں اور اُن کے لاکر.. لاتعداد سکیمیں اور اُن کے مشورے..... اوورسیز کاروبار اور اُس کی گُتھیاں اُلجھنیں..... اس ماحول میں جہاں روپیہ دن میں سارا وقت نظر آتا ہو آدمی بہت جلد اپنے آپ کو مشین سمجھنے لگتا ہے۔ سائن کرنے، دستخط کرنے، نوٹ گننے، اندراج کرنے، ٹوکن دینے، اور لینے کا جو سلسلہ ہے اس میں رہ کر ہاتھ اور دماغ ڈی جی ٹل گراج کی طرح بغیر پیچ پرزوں کے کام کرنے لگتا ہے۔

یسے میں ہی ایک دن جب میں، اندر باہر خالی کرسی کی طرح محسوس کر رہی تھی کہ وہ آ گیا۔ بنک میں داخل ہونے سے پہلے اُس کے پی اے نے اس کے لئے دروازہ کھولا، پھر اُس کا چپراسی خوبصورت بیگ اٹھائے اُس کے پیچھے وارد ہوا۔ بنک کے شیشے والے دروازے کے عین سامنے اُس کی سبز مرسڈیز کے دائرے میں سٹیل کا تین پر انشان نظر آ رہا تھا...

ساری مصیبت نہ مرسڈیز کی تھی نہ اُس کی ــــ ساری مشکل میری ذات سے پیدا ہوئی۔ مجھ میں، میرے ہاتھوں میں، آنکھوں میں کوئی ایسی بات پیدا ہو گئی تھی، جو ایک خوبصورت چمکدار WELL RUN مشین میں ہوتی ہے، فریج، ایئر کنڈیشنر، خوبصورت کار، اوپر نیچے آنے والی لفٹ، رنگین ٹیلی ویژن میں ایک معجزے کی کشش ہوتی ہے ــــ میں بھی، ایک معجزہ تھی ــــ مینڈک سے نکلا ہوا شہزادہ ــــ اسی لئے نجیب صاحب جو اپنا تمام روپیہ ہمارے بنک سے نکلوا کر کسی دوسرے بنک میں رکھنا چاہتے تھے، مینجر کے کمرے کی طرف جلتے ہوئے رُکے، میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور پھر آگے چلے گئے ــــ

تھوڑی دیر کے بعد آفتاب گل صاحب نے مجھے اندر بلایا۔ آفتاب گل صاحب ہمیشہ مجھے توصیفی نگاہوں سے دیکھتے لیکن اُس روز جب میری آمد پر نجیب صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے تو آفتاب صاحب نہ صرف اُٹھ کھڑے ہوئے بلکہ میرے بیٹھنے تک کھڑے رہے۔

"یہ ہماری جونیئر آفیسر مس ثمن شیخ ہیں اور یہ نجیب صاحب ہیں۔ کول ایئر، ایئر کنڈیشنرز کے مالک ــــ"

ہم دونوں ایک دوسرے سے ایک فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان میں صرف کرسیوں کے بازو حائل تھے جن پر نجیب صاحب نے اپنا لمبا ہاتھ بے پروائی سے پھینک رکھا تھا۔

آفتاب گل نے ایک بینکر کی ریاکارانہ مسکراہٹ سے مجھے دیکھ کر کہا ــــ "اب یہ ان کا ظلم دیکھیں۔ یہ اپنا اکاؤنٹ یہاں سے نکلوانا چاہتے ہیں۔ جب اِن کا بائیس لاکھ نکل گیا تو ہماری برانچ کا تو بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ کیوں مس شیخ ــــ؟"

میں نے پروفیشنل EFFICIENCY کے تحت نجیب صاحب کو ایک بھرپور مسکراہٹ پیش کی۔ میرا بس چلتا تو میں اُن کا بے پروائی سے دھرا ہوا ہاتھ چوم کر کہتی ــــ پلیز ایسے نہ کریں، لیکن میں نے میز پر اُن کی رکھی ہوئی سیاہ عینکوں کو صرف چھو کر کہا ــــ "آپ ایسا نہیں کر سکتے ــــ!"

"کیوں ــــ؟"

"دیکھئے ناں اگر آپ ہمیں ہیڈ آفس میں ذلیل کرنا چاہتے ہیں تو اور بات ہے لیکن ہم نے آپ کو بڑا اچھا سروس دیا ہے۔ کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا ــــ پھر آپ کیسے اتنا بڑا اکاؤنٹ بند کر سکتے ہیں؟"

اب نجیب صاحب اپنی مجبوری بیان کرنے لگے کہ وہ ہمارے حریف بنک میں پیسہ جمع کرانے کا وعدہ کر چکے تھے، اور اُس مینیجر کے ساتھ اُن کے بہنوئی کے کچھ ایسے مراسم ہیں کہ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

آفتاب گل کی شہ پر میں نے اپنا پورا زور نجیب صاحب پر لگا دیا۔ مسکراہٹیں، گفتگو، زبردستی، چائے، کافی، خدمت، چاپلوسی تعریف ــــ کوئی پونے گھنٹے کی مارا مار کے بعد اس قدر ہوا کہ نجیب صاحب نے اپنا فیصلہ تو تبدیل نہ کیا لیکن کچھ عرصہ تک روپیہ ہمارے بنک میں رکھنے کا حکم صادر فرما کر چلے گئے۔

اُس کے جاتے ہی آفتاب گل کو پتو پڑ گیے ــــ "بس اب ایک مہینے کے بعد کلوزنگ ہے سال کی اور ہمارا بیلنس یکدم بائیس لاکھ گر جائے گا۔"

ہم دونوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہے جیسے ڈکیتی سے پہلے رہزن گم سم رہتے ہیں۔

"تم ایسے کرو مس شیخ ان کی وائف سے ملو..... کچھ منت سماجت کرو۔ یہ بڑا ضروری ہے ورنہ میری تو پروموشن کا سوال ہے۔ میں تو زونل مینیجر بنتے بنتے رہ جاؤں گا۔"

آفتاب گل بے چارہ ایک منزل کا آدمی ہے۔ اس کے سامنے صرف ایک گول تھا کہ وہ کسی طرح زونل مینیجر ہو جائے۔ راستے میں کیا کیا پڑتا ہے، کون کون سی چیزیں کیسی کیسی قدر قربان کرنی پڑتی ہیں، کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اس کی اُسے کوئی پروا نہ تھی۔ وہ ہر قیمت پر زونل مینیجر ہونا چاہتا تھا اُس کی اس لگن، اس مجبوری کو دیکھ کر میں نے مسز نجیب آف گول ایریا سے ملنے کا ارادہ کیا۔

یہ میری بدقسمتی تھی کہ جب میں اُن کے سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ بنگلے میں پہنچی تو صرف نجیب صاحب گھر پر تھے ــــ گھر کسی قبر کی طرح خاموش تھا۔ سرو کے درختوں سے لے کر ڈرائینگ روم کے جاپانی درختوں تک ایک خواب کی فضا تھی۔ سنگ مرمر، ساگوان ..... اور سٹیل ..... ہر جگہ موجود تھا .....

اس ملاقات میں نجیب صاحب نے کچا پکا وعدہ کیا کہ وہ اکاؤنٹ نہیں نکالیں گے۔ کم از کم ہمارے سال کے کلوزنگ تک وہ اپنی رقم ہمارے ہی بنک میں جمع رکھیں گے۔

آفتاب گل کو تو اختلاج قلب کے دورے پڑنے بند ہو گئے لیکن میرے لئے جیسے آدھی رات کے وقت کوئی دروازہ آہستہ آہستہ دھکیل کر اندر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ آفتاب گل نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری ترقی کے لئے ضرور کوشش کرے گا لیکن یہاں ترقی کی خواہش کس کو تھی؟ پہلے نجیب صاحب کو کئی فون اسی سلسلے میں کرنے پڑے۔ جب کلوزنگ کی تاریخ گزر گئی تو پھر اُن کے فون اہم ہو گئے۔ پھر وہ اپنے بزنس لنچوں میں مجھے اور آفتاب گل کو مدعو کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ آفتاب گل کا پتہ کٹ گیا۔ اب دن کے بجائے رات کے ڈنروں میں میری موجودگی نمایاں ہو گئی۔ پہلے میں اکاؤنٹ کے لئے چپ رہی پھر نجیب صاحب ایسی باتیں کرنے لگے کہ اُن کی کسی بات کا جواب میرے بس میں نہ رہا۔ سلسلہ جو خالص بزنس کی وجہ سے شروع ہوا تھا پرائیویٹ شکل اختیار کرنے لگا۔

عامر کے خط باقاعدگی سے آ رہے تھے۔ میں اُسے خط پر خط بھیجتی تھی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں نجیب صاحب کا ذکر کنی بچا کر بھاگ جاتا۔ سرسری طور پر میں نے اُسے یہ بات لکھ دی تھی کہ کول ایئرواے نجیب صاحب سے اکاؤنٹ کے سلسلے میں بزنس میٹنگز ہوتی ہیں لیکن یہ لکھنا محال ہوتا جا رہا تھا کہ یہ بزنس میٹنگز اب سرسری نہیں رہیں۔ دفتر میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ آفتاب گل اب میری پہلے سے زیادہ عزت کرنے لگے۔ اخفائے راز سے میرا دل پتے کی طرح لرزنے لگا لیکن میں عامر کی طرف یہ اطلاع کیسے بھجواتی کہ ایک لکھ پتی مجھ جیسی کوڑھ کرلی پر بُری طرح فریفتہ ہو گیا ہے ——— بھلا میں اُسے کیسے مجروح کر سکتی تھی۔

نجیب عامر کی طرح خوش رنگ خوش آواز نہیں تھا۔ لیکن اُس میں کچھ اور ایسی خوبیاں تھیں جو متاثر کئے بغیر نہ رہتی تھیں۔ وہ عورتوں کے تمام مُچلے میسے موڈوں کا متحمل تھا۔ وہ اتنی ساری دولت کے باوجود عجز و انکساری سے گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ اُسے روپیہ پیسہ گرہ چننے کی عادت نہ تھی لیکن اُس نے مجھے تحفوں سے لاد رکھا تھا۔ اماں کو جب بھی سلام کرنے آتا اتنے تحفے ساتھ ہوتے کہ ماں کی سٹی گم ہو جاتی۔

میرا ابھی گویا لینڈ سلائیڈ جاری تھا..... عامر کو گئے ابھی سات مہینے ہی ہوئے تھے کہ میری قسم پر ہاتی ویٹو گری۔ اُس روز بڑی بارش ہو رہی تھی۔ ہمارے باغ میں تمام پتے بارش میں ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ نجیب آ گیا اور پڑتے ہی اُس نے اماں کو اپنے مدعا سے روشن کرایا۔ فوراً اماں کے لئے عامر ایک کبڑا عاشق بن گیا اور وہ فوراً رضامند ہو گئیں۔

اماں کے جانے کے بعد ہم دونوں اور بارش اکیلے رہ گئے۔

"تمہیں مجھ سے شادی کرنا ہو گی سمن ——"

"دیکھئے میں آپ کو کئی بار بتا چکی ہوں کہ میں نے عامر ——"

"کیا آپ کی منگنی ہو چکی ہے ——؟"

"جی نہیں ——"

"پھر یہ کیسی COMMITMENT ہے جس کا آپ اس قدر پاس کر رہی ہیں؟"

میں اُسے کیسے سمجھاتی کہ اپنے اندر کھائی ہوئی قسمیں اتنی آسانی سے توڑی نہیں جا سکتیں، اور وہ جیسا شکنجہ کستی ہیں کوئی کس نہیں سکتا۔

"آپ کو عامر سے محبت ہے ——" کچھ دیر بعد نجیب نے سوال کیا۔

"پتہ نہیں ——"

"کیا آپ SURE نہیں ہیں ——"

میں نے منہ پھیر لیا۔ پتہ نہیں کیوں اپنی FEELINGS کے متعلق پہلی سی قطعیت اب مجھ میں نہیں تھی۔

"اگر آپ SURE ہونے کے لئے کچھ مدت ہفتہ، مہینہ، سال دس سال چاہیں تو انتظار کر سکتا ہوں ——"

مجھے معلوم نہ تھا کہ مرد کا اعتراف محبت اس قدر بلاسٹ کر سکتا ہے۔

"جی نہیں ..... میں اگر SURE بھی ہو جاؤں کہ ..... کہ مجھے اُس سے محبت نہیں تو بھی .... میں آپ سے کبھی شادی نہیں کر سکتی ——"

میری آنکھوں سے خود بخود آنسو رواں ہو گئے۔

"کیوں آخر کیوں؟" نجیب نے میرے کانپتے ہوئے ہاتھ پکڑ لئے۔ بھلا میں اُسے کیا بتاتی کہ میں پابندِ قسم تھی..... پابند نَے تھی۔

بڑی دیر ہم دونوں خاموشی سے بیٹھے رہے۔ باہر بارش کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور لجاجت سے بولا ——"ہم امیر لوگوں کی انا عجیب ہوتی ہے۔ ہمیں اتنی مراعات، اتنی اشیاء، اتنے فائدے پیسے کی وجہ سے حاصل ہونے لگتے ہیں کہ ہمیں یہ واقعی بھول جاتا ہے کہ کچھ چیزیں

ضرور ایسی بھی ہوں گی جو دولت کے بدل میں نہیں مل سکتیں۔ ہم تفریحاً ایسی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دل میں ہمیں اس بات پر اعتماد نہیں ہوتا —— میں نے بھی —— اسی لئے اپنی بیوی کو طلاق دے دی —— میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ انکار کر دیں گی ——"

وہ دبے پاؤں کمرے سے نکلا بارش میں بھیگتا اپنی کار تک پہنچا اور پھر میرے کمرے کی طرف دیکھتا ہوا پھاٹک کی طرف کار لے گیا...

اس دن کے بعد نجیب کا اکاؤنٹ تو ہمارے ہی بنک میں رہا لیکن پھر وہ کبھی بنک نہیں آیا۔ آفتاب گل زونل مینجر بن کر ہیڈ آفس چلا گیا اور میں پہلے زلزلے کے بعد اینٹ گارا سمیٹنے میں مشغول ہو گئی۔

دراصل ہر کام کرنے سے پہلے ایک جھجک کا ہوتا ہے۔ پہلی شرم، پہلا حجاب، بندش، روک، جو کچھ بھی کہہ لیجئے۔ پہلا جھجک کا ایبنارمل حد تک آدمی کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے —— شراب کا پہلا پیالہ —— پہلا بوسہ، پہلی چوری، پہلی بار گھر سے فرار...... چھوٹی باڑھ کو الانگتے وقت دل بہت زور سے دھڑکتا ہے۔ پھر جیسے آلو بخارے سے اُس کی موم اُتر جاتی ہے۔ اگر انسان اپنے نفس سے مجبور ہو جائے تو وہی واقعہ بار بار ہونے لگتا ہے اور آخر میں انسان کو کڑوی طرح نہ گلنے والا شخص بن جاتا ہے۔

میں بھی پہلے شاک سے شفایاب ہونے کے بعد اپنی قوت سے آشنا ہو گئی تھی۔ کسی شخص کو بے دست و پا کرنے میں اپنے سامنے گھٹنے ٹیکے دیکھنے میں بڑی لذت ہے۔ آدمی سکندر بادشاہ کی طرح، ہلاکو اور چنگیز خاں کی طرح بڑا قوی محسوس کرنے لگتا ہے۔

اب مجھ میں پہلے سے زیادہ خوش اعتمادی آگئی تھی۔ میں نے اس واقعے کو عامر تک ایسے پہنچایا تھا کہ اس کے سارے کنارے بھر گئے۔ اس کی اصلیت کو بے اصلیت بنا کر پیش کیا، اور معاملے کو اہم نہیں ہونے دیا تھا۔

لیکن نجیب کے بعد مجھے پتہ چل گیا کہ نہتے مرد پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اُس پر نظروں کا نپام بم کس وقت گرانا آسان ہے۔ یہ مت سمجھیے کہ میں کچھ چانکیہ کی طرح بندھے ٹکے اصولوں کو استعمال میں لا رہی تھی بلکہ کہیں اندر ہی اندر مجھے اپنی قوت کا احساس ہو گیا تھا، اور میں سوپر پاورز کی طرح اپنی قوت کو ایڈ کی شکل میں پیش کرنے لگی تھی۔

کچھ عرصہ ثنا خواں ملتے رہے لیکن میں ان کے اور اپنے درمیان حدود قائم رکھنے میں کامیاب رہی۔ مجھے جس قدر تحسین و تعریف درکار تھی وصول کرتی اور باقی سب کچھ لوٹا دیتی۔ سنا ہے کرسمس کے روز کمپنی بہادر کے افسروں کو دیسی لوگ ڈالیاں بھیجا کرتے تھے کمپنی بہادر ڈالی میں سے جو کچھ پسند ہوتا رکھ لیتے باقی تھینک یو کہہ کر لوٹا دیتے —— چاندی کی تھالی، سلیم شاہی جوتے کے پتاوے تلے چھپے ہوئے نوٹ، چینی کے بنے ہوئے کھلونے جن میں سونے کے زیورات ہوتے —— تمام تر لیڈی بہادر رکھ لیتیں اور باقی ساری ڈالی لوٹا دیتیں ..... پھول پھل، مٹھائی.....

مجھے معلوم نہ تھا کہ توصیف اور تحسین کا کھیل دراصل پہاڑ تلے ڈائنا مائیٹ بچھانا ہے۔ جب کافی بارود بھر جائے گا تو آخر میں فلیتے کو آگ لگانے والے کو محض چھوٹی سی ماچس کی تیلی درکار ہو گی اور سارا پہاڑ یوں اُڑ جائے گا جیسے ہوائی جہاز کے پنکھے کے آگے کاغذ کی کترنیں .....

جی تیلی دکھانے والا اس قدر معصوم آدمی تھا کہ عرصے تک پتہ ہی نہ چلا کہ وہ بارود کا کھیل بھی جانتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی خرگوش جیسی آنکھیں چھوٹی چھوٹی بے ضرر سی مونچھیں، چھوٹی چھوٹی بے کار باتیں، چھوٹی چھوٹی خراب عادتیں، چھوٹے چھوٹے عیب، چھوٹی چھوٹی خوبیاں، چھوٹا سا گھرانا۔ چھوٹی سی تنخواہ —— وہ تمام تر پاکٹ سائز فتنہ تھا۔ پہلی دوسری پانچویں بارھویں ملاقات تک اُس کا اثر بالکل نہ ہوا لیکن پھر ہومیوپیتھک دوا کی طرح اُس نے جسم کے اندر سارے سسٹم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اُس کے ساتھ اتنے فری ہو جانے کی فقط ایک ہی وجہ تھی کہ میں اُسے مکمل طور پر بے اثر اور معمولی سمجھتی تھی۔ مجھے اُس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔

آج سے پورے ایک مہینے پہلے جب عامر نے مجھے خط لکھا کہ وہ ایم فل کے بجائے پی ایچ ڈی کی ڈگری لینا چاہتا ہے اور وہ اتنی دیر میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو میں کتنی خوش تھی۔ پاسپورٹ بنوانے، ہیلتھ کارڈ لینے، ٹکٹ خریدنے کے تمام مراحل میں واصف میرے ساتھ ساتھ رہا۔ ٹریول

ایجنسی کے ہر پھیرے پر میں اُس کی موٹر سائیکل سے اُتر کر اُس کا شکریہ ادا کرتی تو مجھے لگتا جیسے وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ میں جلد از جلد یہاں سے دفع ہو جاؤں میرے ساتھ تمام شاپنگ اُس نے کروائی لیکن پرسوں شام جب میرا ٹکٹ بن گیا۔ بیگ پیک ہو گئے تو مجھے عجیب خبر ملی۔

یوسی ایچ ہسپتال سے اس کی ماں کا فون ملا۔ "آپ کا نام مس ثمن شیخ ہے ــــ"

"جی ــــ"

"کیا آپ ہسپتال آ سکتی ہیں ہم ــــ"

میرے پاؤں تلے سے زمین ہلنے لگی جیسے ایس کلیٹر اپنی سطح چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ "کیوں؟ ــــ کیا ہوا ــــ"

"میں واصف کی امی بول رہی ہوں۔ آج شام .... واصف نے پانچویں منزل سے چھلانگ لگا دی۔ تمہاری خاطر .... اس وقت اسے آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں۔" اس کے سوا وہ اور کچھ نہ بول سکی۔

میرا دل، دماغ، اعصاب تمام سُن ہو گئے۔ وہ اتنا بہادر تو نہ تھا کہ چھلانگ لگا دیتا کسی کی خاطر ــــ وہ اتنے جذبے کا مالک بھی نہ لگتا تھا کہ کسی سے اتنی شدید محبت کرتا .... پھر .... میں نے تو اُس کے ہر اعتراف محبت کو ایسی خبر سمجھا جو دو دن پرانی ہوتی ہے۔

جب میں ہسپتال پہنچی تو وہ تھیٹر سے واپس کانسٹنٹ کیئر میں بے سدھ پڑا تھا۔ اُس کا سارا جسم پٹیوں سے یوں لپٹا ہوا تھا جیسے پرانے زمانے میں ملائی کی برف کو گرم پٹیوں میں لپیٹ لیا کرتے تھے .... اُس کی ماں فرش پر بیٹھی نفل پڑھنے میں مشغول تھی .... اُس نے ایک بار بھی پلٹ کر میری طرف نہ دیکھا۔

ڈاکٹر مجھے تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں لے گیا ــــ "دیکھئے مس ثمن، واصف کی جیب سے یہ خط نکلا ہے۔"

میں دیر تک آدھا صفحہ پڑھنے میں مشغول رہی جس میں اُس نے اپنی ماں سے معافی مانگی تھی اور اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

"آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں ــــ" ڈاکٹر نے مجھے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا ــــ "شاید واصف کی جان بچ جائے ــــ شاید وہ دوبارہ نارمل زندگی بسر کرنے کے قابل ہو لیکن نفسیاتی طور پر ہمیں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس کا اعتبار بحال کر سکے .... ایسا معجزہ چاہیئے ہمیں جس کی وجہ سے وہ زندہ رہنا چاہے۔"

"لیکن میں تو صبح کی فلائیٹ سے لندن جا رہی ہوں ــــ"

"یہ آپ کیسے کر سکتی ہیں ثمن .... وہ اس بوڑھی بیوہ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ یہ قتل ہے قتل .... آپ کو اپنی فلائٹ کینسل کرنی ہو گی ــــ"

"میں اگر فلائیٹ کینسل کر بھی دوں ڈاکٹر صاحب تو بھی .... میں ان ماں بیٹے کو وہ خوشی نہیں دے سکتی جس کے وہ آرزو مند ہیں .... کیا یہ بہتر نہیں کہ میں آج انہیں اس CRISIS میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں بہ نسبت اس کے کہ ــــ یہ CRISIS بار بار ہو ــــ"

ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر چپ ہو گیا۔ وہ غالباً مجھ پر اُن لڑکیوں کا لیبل لگا رہا تھا جو لڑکوں کو خراب کرتی ہیں۔ منہ پھٹ، گستاخ پیسے کی پیر، موقع شناس۔ ڈاکٹر کی خشخشی ڈاڑھی، ماتھے کی محراب، بند بند ہونٹوں سے ظاہر تھا کہ وہ مجھے اُن لڑکیوں میں شمار کر رہے تھے جو فتنہ و فساد کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ کچھ دیر وہ مجھے سمجھاتے رہے پھر چپ ہو گئے ....

میں کانسٹنٹ کیئر میں گئے بغیر گھر لوٹ آئی اور ساری رات ایک ہی کرسی پر بیٹھی رہی ....

اس وقت میں ہوائی جہاز کی تیسری قطار میں بیٹھی ہوں نیچے لاہور شہر پیچھے چھوٹ رہا ہے۔ ایچی سن کی سرخی مائل عمارت، نہر کے کنارے کنارے چلنے والی سڑک، جہانگیر کا مقبرہ .... لاہور کے سنگ میل پیچھے چھوٹ رہے ہیں۔ ایئر ہوسٹس میٹھی گولیاں، ٹافیاں پھلبے میں رکھے،

جھوٹی مسکراہٹ چہرے پر سجائے پھر رہی ہے .....

میرا دل نیچے کی طرف اتر رہا ہے ..... بھاگ رہا ہے ..... کانسٹنٹ کیرُ کی طرف ..... کیا میں عامر کو یہ سب کچھ بتا سکوں گی؟ ویسے نہیں جیسے کوئی لاتعلق بات بنائی جاتی ہے بلکہ ایسے جیسا کہ اس بات کا مجھ سے تعلق ہے ——؛ میری انتڑیاں، دل، جگر تمام جیسے مدھانی سے چکر کھا رہے ہیں۔

میں لوٹ جانا چاہتی ہوں —— پٹیوں میں بندھے سپیس مین کی طرف ..... لیکن میری قسم نے مجھے اُس بیلٹ کی طرح باندھ رکھا ہے جو میری کمر کے گرد بندھی ہے ——

مجھے عامر سے بڑی محبت ہے لیکن میں جانتی ہوں اب میں ساری زندگی عامر کے ساتھ وہ خوشی حاصل نہیں کر سکتی جس کی مجھے آرزو تھی —— اور اگر میں لوٹ جاؤں —— کسی اگلے سٹیشن سے اور واپس واصف کے پاس چلی جاؤں تو بھی میں ساری عمر اُس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی ..

کیا ساری مصیبت اُس قسم کی ہے جو میں نے کلنک میں کھڑے ہو کر کھائی تھی کہ اس سے پرے بھی کچھ اور ہے ہے —— انجن کے پردوں سے پیچھے بھی کیا کوئی طاقت اسے اُڑائے لئے جا رہی ہے ....

مجھے یوں لگتا ہے جیسے فسٹ کلاس کے مسافروں کی سائیڈ پہ عامر سفید قمیص پینٹ پر سیاہ بیلٹ لگائے مجھے چوری چوری دیکھ رہا ہے مجھے آزمانا چاہتا ہے —— وہ بھی مجھ سے کوئی ایسی قربانی چاہتا ہے جو میری محبت کا سچیور فیصلہ ہو —— کچھ لوگ آزمائے بغیر رہ نہیں سکتے۔ مجھے لگتا ہے عامر بھی ساری عمر مجھے آزماتا رہے گا۔

اور نیچے اُس چھوڑی ہوئی دھرتی پر ایک چھوٹے سے کمرے میں واصف کی ماں کسی معجزے کا انتظار کرتی رہے گی۔ پٹیوں میں لپٹے ہوئے چھوٹے سے فتنے کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ اُس نے میری قسم کی کیسے دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

اب میری قسم کا کاغذ تو باقی رہ گیا ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اس پر رقم کئے ہوئے تمام حروف خود بخود مٹ چکے ہیں۔ میں پابند تو ہوں لیکن کس کی؟ .. .. مجھے چور کی سزا تو مل رہی ہے لیکن کیوں۔ یہاں وہاں —— اب میرے لئے کچھ باقی نہیں۔

میں آپ کو بتا رہی تھی ناں کہ سارا مُنتا ہی اس قسم نبھانے کا ہے یا شاید قسم کے ٹوٹ جانے کا ——

سفرنامہ

مسعود اشعر

صرف ہوا کے قدموں کی چاپ ہے جو پیڑوں سے دور، کہیں چل رہی ہے۔ کسی پیڑ کا ایک پتہ بھی ہلتا نظر نہیں آتا۔ مگر چاپ ہے۔ دھیرے دھیرے، ہولے ہولے پاؤں بڑھانے کا احساس۔ قدم قدم، پاؤں پاؤں۔

پیڑوں کی پھننگوں پر نظریں جمائے جمائے آنکھوں میں سیلاب آجاتا ہے۔ آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئی ہیں۔

تاریک راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا بڑ کا پیڑ اور اُس کی گزوں چوڑی جڑ جس کے غار جیسے کھکھ سے سیال خوف جھینگروں کی آواز میں بہہ رہا ہے ــــ اور عشا کی نماز کا وقت ہے۔

تو کیا میں سو رہا تھا؟ ــ سو نہیں رہا تھا تو آنکھ کیسے کھلی! وہ سب کہتے ہیں تم بڑے لوگوں کی بیماری میں مبتلا ہو۔ میری آنکھیں دن رات کھلی رہتی ہیں۔ میں کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا ہوں ــــ مگر وہ سب کچھ کیا ہے؟ ــــ اس گھڑی میں نے سچ مچ کچھ دیکھا تھا؟ ــــ یا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔!!

میرے اوپر انکشاف ہو گیا اس حقیقت کا جس کا مجھے علم نہیں ہونا چاہیئے تھا ــــ میرے اوپر وہ راز منکشف ہو گیا جسے میں عمر بھر جاننا نہیں چاہتا تھا۔

اور اب ــــ ؟

میں صدیوں پرانے پیڑ کے گزوں چوڑے بھائیں بھائیں کرتے کھکھ میں کھڑا ہوں۔ صرف ہوا ہے جو کھوکھلے سوراخوں میں راستہ بناتے ہوئے چیختی ہے۔ شور مچاتی ہے۔

ہماری مسجد کے ساتھ قبرستان تھا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک قبرستان چلا، پھر مسجد آتی۔ پانچوں نمازوں کے لئے آتے جاتے اس قبرستان سے گزرنا پڑتا۔ عشا کی نماز کے بعد یہ راستہ بہت طویل اور بہت کٹھن ہو جاتا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش اور گردن ٹیڑھی ہو جانے کا خوف گھر تک پیچھا کرتے اور گھر کا دروازہ بند ہو جانے تک مڑ کر دیکھ لینے کا خطرہ کندھوں پر سوار رہتا۔

مسجد سے نکلتے ہی کوئی انجانی چاپ تعاقب شروع کر دیتی اور ہر چار قدم کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش اس زور سے ہلہ بولتی کہ گردن خود بخود اکڑ جاتی اور قدم تیز ہو جاتے۔

"جنت کیسی ہوگی؟" وہ آنکھوں میں مستقبل کے اندھیرے کاٹنے والی چمک لئے مجھ سے سوال کرتے۔ میں پورے سکون اور اعتماد کے ساتھ جنت کے بارے میں انھیں بتاتا۔ جنت کی ایک ایک چیز کا ذکر کرتا۔ ان نعمتوں کی تفصیل بیان کرتا جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنت میں عطا کرے گا۔ وہ سب حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سنتے اور ان پر یقین کرتے۔ ان کا یہ یقین مجھے مزید حوصلہ دیتا کہ میں جنت کے ایک ایک طبقے اور ایک ایک گوشے کے احوال اس طرح بیان کرتا جیسے وہ سب میری آنکھوں دیکھے ہوں۔ ان کا اعتماد مجھے

اپنے اوپر اعتماد کرنے کی ہمت بخشتا اور میں ان سب نعمتوں کو سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ ساری رات میری آنکھیں کھلی رہتیں۔

تو گویا کوئی انجانی چاپ ان سب کا تعاقب بھی کرتی تھی؟ ــــ اگر کوئی چاپ ان کا پیچھا نہیں کرتی تھی تو پھر وہ ایسے سوالات کیوں کرتے تھے! جی چاہتا میں بھی ان سے سوال کروں۔ ان سے ان کی خواہشات اور ان کے خوف معلوم کروں لیکن ڈر لگتا کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی نہیں، کہہ دیا تو میں کیا کروں گا۔

اور پھر اس وقت تک وہ سوال کرنے والے لوگ تھے۔ میں تو جواب دینے والا تھا۔ یقین، ایمان اور اعتماد کے ساتھ۔

تراویح کی بیس رکعتیں اور قرآن کے تین رکوع لقمے کے بغیر سنانا ہیں۔ اور لقمہ بھی حافظ جی کا جن کی آنکھوں کی بینائی بھی ان کے تیز و تند حافظے میں محفوظ ہو گئی ہے۔ حافظ جی سامع بنے پیچھے کھڑے ہیں۔ بالکل میرے پیچھے۔ بیس کی بیس رکعتوں میں ان کی سانس اجنبی خوف کی طرح میری گردن پر سرسراتی رہتی ہے۔ میری آنکھیں سجدہ گاہ پر ہیں، ذہن قرآنی آیات پر اور کان حافظ جی کے لقمے پر ــــ میرے پیچھے دور تک صف در صف کوئی کھڑا ہے۔

میں وضو کرتا ہوں، ٹوپی سیدھی کرتا ہوں اور حافظ جمال میاں کے مزار میں داخل ہو جاتا ہوں۔ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت ہے۔ مزاروں پر حاضری کے لئے بہتر وقت یہی ہوتا ہے۔ اتنا اندھیرا بھی نہیں ہوتا کہ کسی انجانی چاپ کا خوف رہے۔ اور اتنا اجالا بھی نہیں کہ ساری آہٹیں روشنی میں تحلیل ہو جائیں۔

اگر بتیوں اور لوبان کے دھوئیں میں لپٹے اور تازہ اور باسی پھولوں کی خوشبو میں بسے مزار کی اندر داخل ہوتے ہی سر بھاری ہو جاتا ہے اور آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ کاندھوں، گردن اور پیٹھ پر انسانی آہٹ کا گرم گرم بوجھ پھر پگھلنا شروع ہو جاتا ہے اور میں جلدی سے فاتحہ ختم کر کے اُلٹے پاؤں باہر نکلتا ہوں۔

تاریک راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا برگد کا پیڑ اور اس کی گزوں چوڑی جڑ جس کے غار جیسے کھکھ سے سیال خوف جھینگروں کی آواز میں بہہ رہا ہے ــــ اور عشا کی نماز کا وقت ہے۔

انقلاب کے زمانے میں انقلابیوں نے ان سب کی گردنیں اتاری تھیں۔

میں نے گھبرا کر گائیڈ کی طرف دیکھا۔ وہ نوترے ڈیم کیتھیڈرل کے بلند و بالا دروازے کے سامنے کھڑی بہت اوپر گنبد کے قریب ایک قطار میں کھڑے بہت سے مجسموں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"کس کی گردنیں اتاری تھیں؟" میں بلندی پر پہنچ کر کتھیڈرل کے بجائے پیرس کی عمارتیں اور دور بہتے دریائے سین کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

"SAINTS کی۔" اس نے غصے سے میری طرف دیکھا "انقلابیوں نے تمام SAINTS کی گردنیں اتار دی تھیں۔"

ٹورسٹ بس بے شمار سڑکوں اور گلیوں کے چکر لگاتی جب نوترے ڈیم پہنچی تھی تو مجھے یقین تھا کہ کتھیڈرل کی دل کشی اور خوبصورتی میرے اوپر ہیبت طاری نہیں کرے گی۔ میں جانی اور انجانی تمام آہٹوں سے دور نکل آیا ہوں۔ کوئی چاپ اس مقدس خاموشی کو پارہ پارہ نہیں کرے گی اور میری گردن میرے ہی اختیار میں رہے گی۔

راستہ میں نے لیڈو میں گزاری تھی اور وہ دوپہر کا وقت تھا۔ پھر بس کی گائیڈ نے بھی میرے منہ کا مزہ خراب کر دیا تھا۔

اس کے بال سنہرے اور بلاؤز سلیولیس تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ دائیں جانب ایک چھوٹی سی سیٹ پر ہماری طرف رُخ کئے

بیٹھی تھی۔ ہماری طرف نہیں صرف میری جانب۔ اس کے سامنے صرف میں ہی بیٹھا تھا۔ اس کی کہنی سے بازو بغلوں تک ننگے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ مائکروفون کے ساتھ اوپر اُٹھتے تو سرخ بالوں کے گچھے میرے حلق میں گھسنے لگتے۔

"پھر؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا کیونکہ وہاں SAINTS کے سر تو اپنی جگہ موجود تھے۔

"انقلاب ناکام ہوا تو وہ گردنیں دوبارہ لگا دی گئیں"——اب اس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا۔ یہ بات باقی لوگوں سے کہی جیسے وہ سوال بھی ان لوگوں نے ہی کیا ہو، وہ سب ہنس دیئے۔

"اچھا؟!——دوبارہ گردنیں لگا دی گئیں؟"—— مجھے ہنسی نہیں آئی۔

"ہاں نئے سر بنا کر لگا دیئے گئے۔"

وہ کتھیڈرل کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا اور میرے پیچھے——!؟

وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح انگریزی اور فرانسیسی میں کچھ کہہ رہی تھی اور اس کے ساتھ کھڑے لوگ اوپر ان مخروطی دریچوں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جن سے ہری لال، پیلی اور نیلی روشنیاں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ میں نے اپنی گردن کا بوجھ ایک بہت بھاری ستون پر ڈالا اور پورے جسم کا زور لگا کر پلکیں کھول دیں۔

تمام دریچوں میں SAINTS کھڑے تھے جو باہر سے آنے والی روشنیوں میں مختلف رنگوں سے نہ جانے کون کون سی کہانیاں سن رہے تھے میری پیٹھ پر پگھلتی برف کی ٹھنڈی لکیر سی بنتی چلی گئی اور ایک جھرجھری کے ساتھ سارا جسم اس زور سے لرزا کہ ساتھ کھڑی ننھی سی بچی کے ہاتھ سے ٹیلی فون نما ریسیور گر گیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور میں اس باریک آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا جو ستون کے ساتھ لٹکتے ریسیور سے آ رہی تھی—— ریکارڈ ڈ آواز کتھیڈرل کی تاریخ بیان کر رہی تھی۔

میں نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ کر قربان گاہ کے سامنے ایک موم بتی اور روشن کر دی۔

فرض کر لو وہ خواب تھا اور خواب بھی ایسا جو میں نے نہیں کسی اور نے دیکھا۔ میرے خواب ہمیشہ دوسرے لوگ ہی دیکھتے آئے ہیں۔ میں تو ان خوابوں کی تعبیر کا خمیازہ بھگتنے والوں میں سے ہوں۔

میں بلغراد کے "انقلاب اکتوبر چوک" پر کھڑا ہوں میرے دونوں طرف دور تک سرسبز اور گھنے درختوں کی قطاریں ہیں اور میرے ساتھ اُجلی شکل والی وہ خاتون ہے جس کے بالوں میں چمکتی چاندی نے بھی اس کی خوبصورتی کو ماند نہیں کیا۔ میں بس سے اترتے ہی اس کے ساتھ ہو لیا ہوں۔

"اتنے بہت سے درختوں میں اندھیرا بالکل نہیں ہے؟"

"کیا کہا تم نے؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"اتنے بہت سے درختوں میں تو اندھیرا ہونا چاہیئے——سائے بھی تو اندھیرا کرتے ہیں نا۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ جلدی جلدی میرے ساتھ چلتی رہی۔

"ذرا آہستہ چلو مجھے جلدی چلنے کی عادت نہیں ہے۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

وہ ہنس دی اس نے اپنا بھاری تھیلا دائیں کاندھے سے اتار کر بائیں کاندھے پر لٹکایا۔

"بہت پرانی بات کر رہے ہو۔"

"جی؟"

"اندھیرے اور سائے والی بات۔"

میری آنکھیں چھوٹی ہو گئیں، اور ماتھے پر بے شمار اُلٹے سیدھے راستے اُبھر آئے۔

"ہم نے بالکل نیا بیوگراڈ آباد کیا ہے۔"

"بیوگراڈ——؟"

"وہی تمہارا بلغراد۔"

میرا بلغراد اور تمہارا بیوگراڈ! میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنے سائے سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ سایہ جو مجھے خوفزدہ بھی کرتا ہے اور میرا سہارا بھی بنتا ہے۔

"سایہ بھی تو ہمارے وجود کا ہی حصہ ہے۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ سامنے رُکتی بس کو دیکھا اور مجھے گھسیٹتی اس میں سوار ہو گئی۔

"ہم ہوٹل سلاویہ جا رہے ہیں۔"

پھر ہم کونج والی بہت چوڑی سڑک پر بہت بڑے چوک کے قریب اتر گئے۔ وہ ہوٹل کے اندر نہیں گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اس بلندی کی طرف لے گئی جہاں پھول بیچنے والیوں کی دوکانیں تھیں۔

"کسی انجانی شے کا خوف دراصل اس کی چاہت ہوتی ہے—— اس انہونی شے کو جیتا جاگتا وجود عطا کرنے کی خواہش ——" اس نے کارونیشن کا ایک گچھا خرید کر میرے آگے کر دیا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بکتی ہے! بہت خوبصورت سمجھتی ہے اپنے آپ کو——

میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا پارلیمنٹ کی قدیم عمارت کی طرف چلا گیا—— سامنے قدیم تاریخی عمارتوں کے ہر کونے پر کسی سینٹ کا مجسمہ کھڑا تھا۔ ہر علاقے اور ہر ملک کا اپنا پیٹرن سینٹ——

وہ کیا کہہ رہی تھی؟ میرے لئے تو کوئی چیز بھی نئی نہیں ہے۔ وہ آہٹ، وہ چاپ انجانی تو نہیں ہے۔ وہ تو اتنی ہی حقیقی ہے جتنا میرا اپنا وجود اور وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔ میرے بدن کا رواں رواں اس کی گواہی دیتا ہے۔ اس کے ہونے کا اقرار کرتا ہے میں اسے پہچانتا ہوں۔ اچھی طرح پہچانتا ہوں کہ وہ بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ چونکہ میں اسے جانتا ہوں اس لئے وہ ہے۔ میری پہچان ہی اس کا وجود ہے۔ میرے خوف یا میری خواہش نے تو اس کی تخلیق نہیں کی۔

ایسی تیسی اس کی۔ مجھے چھیننا چاہتی ہے مجھ سے۔ مجھے نوچنا چاہتی ہے۔ ننگا کرنا چاہتی ہے میرے وجود کو۔

میں قاہرہ سے آنے والی سڑک پر کھڑا سنگلاخ صحراؤں اور پتھریلے راستوں میں گھرے ابوالہول کو دیکھ رہا ہوں۔ بڑا اہرام پیچھے رہ گیا ہے اور نیچے چھوٹے موٹے اہراموں اور مقبروں کے سامنے ایک بہت وسیع اسٹیج بنا ہے جہاں دور دراز سے آنے والے سیاحوں کو بٹھا کر روشنیوں اور آوازوں کے ذریعہ ہزاروں سال پرانی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ میری توجہ کا مرکز حسبِ معمول ابوالہول کی ٹوٹی ناک ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے میرے پیچھے ہزاروں لاکھوں ابوالہول قطار در قطار کھڑے ہیں۔

میں نے شارع جیزہ سے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا جامع مسجد علی پہنچا۔ جمعہ کا دن تھا مگر دوپہر کے ابھی بارہ بجے تھے جمعہ کی نماز میں بہت وقت تھا۔ اور زوال کے وقت نفل بھی نہیں پڑھے جا سکتے۔

کسی بھی مسجد میں داخل ہونے کے بعد دو نفل پڑھنا سنت ہے۔
زوال کا وقت گزارنے کے لئے پہلے جوتے اکٹھا کرنے والے کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر صحن کے بیچوں بیچ کھڑے سقایہ کے گرم پانی سے وضو کیا ہاتھ پاؤں سے وہ تمام گرد اُتاری جو بلغراد، بوڈاپسٹ اور بخارسٹ سے چڑھتی چلی آ رہی تھی۔ پھر بے شمار گنبدوں سے مزین وسیع و عریض ہال میں دو نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
سلام پھیرا تو کندھوں اور پیٹھ پر جانی پہچانی آہٹ کا بوجھ موجود تھا گھبرا کر سامنے دیکھا۔ ایک جاپانی سیاح کیمرہ ہاتھ میں لئے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اوپر انگنت فانوس تھے اور نیچے لاتعداد کیمرے۔ نیم تاریک ہال میں چاروں طرف فلیش گن کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔
میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سارا ہال سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔
میں نے جلدی سے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔
"یہاں دو منبر کیوں ہیں؟" میرے پیچھے کھڑے کسی سیاح نے شاید گائیڈ سے پوچھا۔
"ایک خطیب کے لئے اور دوسرا شاہِ وقت کے لئے۔"
"اچھا؟!!" یکلخت میری گردن خود بخود پیچھے مڑ گئی۔ مجھے نہیں معلوم کس نے سوال کیا اور کس نے جواب دیا۔ مگر میں گردن گھما کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔
تاریک راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا بڑ کا پیڑ اور اس کی گزوں چوڑی جڑ جس کے کھکھ سے سیالِ خوف جھینگروں کی آوازیں بن کر بہہ رہا ہے۔
موسم سرد ہے کہ اس موسم میں رات جلدی آ جاتی ہے اور اندھیرا بھی بہت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ دن رات آندھی چلتی ہے اور بڑے بڑے تنومند درختوں کی شاخیں اور پتے زہرناک ہوا کے جھکڑوں میں سڑکوں پر لڑھکتے پھر رہے ہیں۔
عشا کی نماز کا وقت ہے۔
عشا کی نماز ہو چکی ہے۔ اور شبینہ شروع ہونے والا ہے۔ اب امام میں نہیں ہوں۔ سارا قرآن ایک رات میں ختم کرنا ہے اس لئے امام بھی کئی ہیں۔

امام بہت سے ہیں۔ شبینہ جاری ہے سارا قرآن ایک رات میں ختم کرنا ہے۔
میں صدیوں پرانے بڑ کی گزوں چوڑی جڑ کے تاریک کھکھ کی طرف پیٹھ کئے قبرستان کی پختہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہوں۔ آگے چلنے کی کوشش اس لئے نہیں کرتا کہ وہ جانی پہچانی چاپ بھی میرے ساتھ ہو جائے گی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی کہ اندھیرے کھکھ سے نکلنے والی جھینگروں کی آوازیں اور بھی تیز ہو گئی ہیں۔
کسی انجانی شے کا خوف دراصل اس کی چاہت اور اس کی خواہش ہوتا ہے۔ اس کا انتظار ——!
اب میرے اندر کا خوف مجھے طاقت بخشتا ہے۔ اور میرے پاؤں خود بخود اٹھنے لگتے ہیں اپنے گھر کی طرف۔ آنکھیں آگے دیکھ رہی ہیں اور کان اس چاپ کے قدم گن رہے ہیں جو رفتہ رفتہ نزدیک آتی جا رہی ہے۔ جوں جوں گھر قریب آ رہا ہے، وہ چاپ بھی قریب آتی جا رہی ہے۔
گھر قریب آ گیا ہے، اور گرم گرم سانسیں میری گردن پر دھواں چھوڑ رہی ہیں۔
گھر نزدیک آ گیا ہے اور میرے کاندھے بوجھ سے جھکے جا رہے ہیں۔

گھر سامنے آگیا ہے اور میری آنکھوں کی طاقت بھی میرے کانوں نے حاصل کر لی ہے۔
گھر دو قدم رہ گیا ہے اور ——
اب میں برداشت نہیں کر سکتا ——
میں بجلی کی تیزی سے ایڑیوں پر گھوم کر اپنا سارا جسم صدیوں پرانے اندھیرے کھکھ کے سامنے لا کھڑا کرتا ہوں۔
اب میں چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔
راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا بڑ کا پیڑ اور اس کی گزوں چوڑی جڑ جس کے بھائیں بھائیں کرتے کھکھ کے اندر ....
میں کھڑا ہوں۔
صرف ہوا ہے جو کھوکھلے سوراخوں میں راستہ بناتے ہوئے شور مچاتی ہے اور سیال خوف بن کر سڑکوں پر بکھرے پتوں میں مل جاتی ہے۔ اور جھینگروں کا شور ہے جو صرف تاریکی میں چیختے ہیں۔

آنکھ کھُلی تو ـــــ

اکرام اللہ

آنکھ کھلی تو سفید براق چھت سے بجلی کا پنکھا چپ لٹکا اسے گھور رہا تھا۔ اس کے اوپر سرخ کمبل تھا۔ پلنگ کی پائنتی، لوہے کے اسٹینڈ کے ساتھ سرخ بوتل الٹی ٹنگی اسے چھت اور سامنے کی دیوار کے مقامِ اتصال کے برابر اونچی دکھائی پڑتی تھی۔ اس میں سے ایک ربڑ کی پتلی، لمبی ٹیوب نکل کر نیچے آتے آتے اس کی پائنتی کی طرف سے اس کے کمبل میں گھُسی تھی۔ کیا خبر کہ کمبل اس سے سرخ تھا یا کمبل کی سرخی چوس چوس کر بوتل سرخ ہو رہی تھی۔

"یا اللہ! میں کہاں ہوں؟ میری چھت پر تو ٹیڑھی میڑھی سیاہ کڑیاں اور اُن میں سے جھانکتا ہوا، بھونسلا، بھونسلا سا دھواں زدہ گھاس پھونس ہوتا تھا۔ اتنی اجلی چھت اور پھر بجلی کا پنکھا! میلے چیکٹ لحاف کی جگہ صاف ستھرا سرخ کمبل! یہ سب کیا ہے؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بائیں طرف لوہے کے سیاہ پلنگوں کی ایک لمبی قطار تھی اور ان میں سے ہر ایک پر سرخ کمبل کے پھیلے ہوئے ڈھیر میں پھنسا ہوا ایک سر تھا۔ دائیں طرف چھت سے فرش تک پہنچتی شیشے کی کھڑکی تھی۔ باہر گدلے گدلے آسمان کا الٹا پیالہ اور ویسی ہی میلی دھوپ تاحدِ نظر پھیلتے چلے گئے تھے اور درمیان میں دو سرخ پتھر کے مینار، ایک دوسرے سے اچھے خاصے فاصلے پر معلق تھے۔ ان کی اوپر کی چھتریاں اور کلس سفید تھے۔ اُوپر ہی اُوپر اُٹھتے چلے جاتے دونوں مینار جو ایک دوسرے سے الگ اور کٹے ہوئے تھے، ان میں ہم شکلی اور ہم جنسی کے علاوہ بھی کوئی ربط باہم تھا۔ شاید اس مٹیالے ماحول سے نکل کر بلند ہوتے ہوتے آسمانوں سے پار نکل کر نورانی فضاؤں میں ضم ہو جانے کی ایک بے جگری سے کی جانے والی آخری کوشش ان میں مشترک تھی۔ اس نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ساتھ بھی بائیں طرف کو سیاہ پلنگوں پر سرخ کمبلوں میں پھنسے ہوئے سروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کھلے رہنے کی سکت نہ رہی، پھر بند ہو گئیں۔ اسے پتہ تھا کہ اس کا منہ کھلا ہے لیکن بند کرنے کی تاب کہاں تھی۔ اس نے فیصلہ دیا "چلو! کھلا ہے"۔

پھر وہی خیال گزرا "میں کہاں ہوں؟"

"میں کہیں بھی ہوں لیکن تا حال میں وہی "میں" ہوں اور میرے اندر کے سینکڑوں 'میں' رسی میں بندھے لکڑیوں کے گٹھے کی طرح یکجا ہیں اور ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ گٹھا بکھر جائے اور ان میں سے ہر ایک 'میں' الگ الگ جا کھڑا ہو اور اصلی "میں" کہیں ڈھونڈے سے نہ ملے"۔

پھر آنکھ کھلی تو سامنے الٹی ٹنگی سرخ بوتل تقریباً خالی تھی۔ صرف پیندے میں ابھی کچھ سرخ مائع اٹکا تھا۔ منہ ایسے کڑوا تھا جیسے پتہ نہیں زہر کے کتنے مٹکے پی گیا ہو۔ وہ ایک زمانے سے بیمار چلا آ رہا تھا مگر جیسا اب کے بیمار ہوا ویسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ بدن کے ریشے ریشے اور رؤئیں رؤئیں سے کسی نے جان سونت لی تھی۔ آٹھ، نو سال پہلے فالج کا حملہ ہوا اور اس کا آدھا جسم مر گیا۔ وہ نیم مردہ بازو کو جھلاتے اور بے کار ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے گھومتا رہا۔ اب اُن اعضا میں قدرے سہار پیدا ہوئی تھی تو لرزے سے باری کا بخار آنے لگا۔ بیس پچیس دن تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ پیٹ بھر کھانا تو ملتا نہیں تھا، کون ڈاکٹروں حکیموں کو پیسے دیتا۔ اور پھر وہ دیتا بھی تو کہاں سے دیتا۔ اُس نے سوچا تھا کہ ملیریا ہی تو ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ شہر کا کونسا گلی کوچہ ایسا ہے کہ جہاں مچھروں کی فوجوں کی فوجیں دندناتی نہیں پھرتیں اور کمیٹی والے ایسے بے خبر پڑے سوتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ یہاں ملیریا نہیں پھیلے گا تو اور کیا ہوگا۔ لوگ بخار میں پڑے پھنکتے ہیں تو پھنکتے

رہیں۔ان کی بلا سے۔ انہیں تو بس اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہوتی ہے۔ البتہ امیروں کی بستیوں کی بات دوسری ہے۔ ہر طرح کی مچھر مار دوائیں موجود ہوتی ہیں۔ کیا مجال کہ وہ موذی پتنگا اتنا پھل پھول سکے کہ فوجیں بنا کر یلغار کرنے لگے۔ پھر وہاں کسی کو ملیریا ہو بھی جائے تو علاج کی تمام سہولتیں میسّر ہوتی ہیں ——— اور ایک دو روز ہی میں بیماری سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ غریبوں کی طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ مہینوں پڑے ایڑیاں رگڑتے رہیں۔ اسے دو دن سے پیشاب نہیں آیا تھا اور نہ اس نے ہی کچھ خیال کیا تھا۔ رات بھر نہایت بے چین رہا۔ صبح کو بھی محض عادتاً بلا حاجت گلی میں پیشاب کے لئے بیٹھا تو بمشکل چلو بھر خون خارج ہوا اور بس۔ اٹھا تو چکرا کے گر گیا۔ آنکھ کھلی تو یہاں تھا۔

دکھ اس پر اس طرح چھا گیا تھا جیسے زندگی میں ایک دن بھی صحت مند نہ رہا ہو اور صدیوں سے بیمار چلا آ رہا ہو اور صدیوں تک یونہی پڑے رہ کر مر جائے گا۔ اس کا جی متلانے لگا۔ معدے میں یوں جلن مچی تھی جیسے کسی نے منہ تک انگارے بھر دیئے ہوں۔

"یا الٰہی! گناہوں کی سزا تو آئندہ زندگی میں ملنی ہے۔ وہ کونسا ایسا گناہ ہے جس کی اتنی کڑی سزا مجھے یہیں دی جا رہی ہے"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ مینار صاف طور پر اُسے بلند ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اُس نے سوچا "اگر میں دوڑ کے جاؤں اور ان کے دامن سے لپٹ سکوں تو میں بھی ان کے ساتھ ہی سفلی کائنات سے نکل کر ان فضاؤں میں پہنچ جاؤں جہاں نور ہی نور ہوتا ہے"

کسی بستر پر کوئی زور زور سے ایہہ ایہہ کی آوازیں لگاتے ہوئے قے کر رہا تھا۔

"اگر مجھے بھی قے آ جاتی تو میرے اندر کا زہر کچھ تو کم ہوتا اور شاید یوں متلی اور جلن سے کچھ دیر ہی کے لئے سہی، جان چھوٹ جاتی"

دفعتاً اسے خیال آیا "ہاں! ایک گناہ ایسا ضرور ہے جس کی سزا یہاں بھی دی جاتی ہے اور آئندہ بھی۔ اور وہ ہے کسی ایسی چڑیا کی گردن پر چھری پھیر دینا جو اتنی مانوس ہو گئی ہو کہ ہتھیلی پر سے بے دھڑک آ کر دانہ چگتی ہو۔ کھانڈ کی بنی ہوئی گڑیا جیسی سفید، نازک اور میٹھی حرہ جو مجھے اپنا مقدر بنا کے، باپ کے سائے کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں اور محفوظ چار دیواری تج کے، تیز تیکھی دھوپ میں، صرف ایک چادر لئے، راستوں کی دھول پھانکتی، میرے پیچھے پیچھے، منزل در منزل، نظریں نیچی کئے چلی آئی تھی اس کو میں نے بھرے بازار میں لا کر کھڑا کر دیا اور اس کی چادر نوچ لی۔ بچپن میں کھانڈ کی گڑیا جونہی میرے ہاتھوں میں پہنچتی تو پتہ نہیں کیسے ہر بار اس کی گردن کٹک سے ٹوٹ جایا کرتی تھی اور میں ہر بار اپنے آپ کو ملامت کرتا۔ تاسف کرتا، روتا، لیکن جب اس گڑیا کی گردن میرے ہاتھوں میں آ کر مروڑی گئی تو نہ تو میں نے اپنے آپ کو ملامت کی، نہ متاسف ہوا، نہ رویا۔ شاید دل پتھر ہو چکا تھا۔ اور یقیناً دل کا پتھر ہو جانا ہی وہ گناہ ہے جس کی سزا یہاں بھی اور وہاں بھی مل کے رہتی ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ نہ خوف نہ مایوسی، نہ انتقام کی آگ نہ رحم کی اپیل، صرف ایک نیستی کی راکھ تھی جو اُن میں اُفق تا بہ اُفق اُڑتی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے بولی دینے والوں میں سے کسی ایک کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھا۔ اس کا خاموش چہرہ، پھٹی پڑتی کالی سیاہ آنکھوں سے صرف مجھے دیکھے جا رہا تھا، مسلسل ——— لگاتار ——— میں جو اُچھل اُچھل کر ایک وارفتگی کے عالم میں ہر نئی بولی کو بلند سے بلند تر آواز میں دہرائے جا رہا تھا۔ میں پاگلوں والے جوش میں پکار رہا تھا ——— اور بڑھو، اور بڑھاؤ ——— اتنے اچھے مال کی یہ کوئی قیمت نہیں۔

اس کے لب بند تھے، ذہن گویا ماؤف تھا اور آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ اُن کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے یہ سب کچھ کرتے دیکھے جا رہی تھی۔ بولی ختم ہوئی تو نیستی بھی ان آنکھوں سے چھلک کر مٹی میں جذب ہو گئی۔ اب وہ خالی تھیں، قطعی خالی، کسی مردے کی آنکھوں کی طرح یا میرے ضمیر کی طرح۔ جاتے ہوئے اس نے صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ میں وہی تھا نا! ہاں وہی، جس نے ہتھیلی پر سے دانہ چگنے والی چڑیا کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ میں سیدھی سڑک پر اُسے جہاں تک نظر آتی رہی جاتے دیکھتا رہا۔ پھر چوک میں لگے فوارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ لیکن اس نے پھر پلٹ کر نہ دیکھا۔ کیا دیکھتی؟ حرہ چلی گئی، نوٹ آ گئے۔ نوٹوں کو گھوڑوں نے کھایا، شراب نے پیا، رنڈیوں نے نوچا یوں پھر نوٹ بھی چلے گئے لیکن حرہ واپس نہ آئی۔

"وہ خوش قسمت قے کئے جا رہے تھا۔ مجھے بھی آجائے تو بدن میں جمع زہر کچھ تو خارج ہو۔ شراب سے بے حال کو کسی نے مشورہ دیا قے کرو، سنبھل جاؤ گے۔ اس نے کہا کوشش کر چکا، نہیں ہوتی۔ مشورہ دینے والے نے کہا آئینہ دیکھو فوراً ہو جائے گی۔ میں نے بھی تو ابھی دل کے آئینے میں اپنی کریہہ صورت دیکھی لیکن عذاب ہے کہ ٹلنے میں نہیں آتا۔"

اس کا اتنا سوچنا تھا کہ ایک زور کی ابکائی اُٹھی، بدن کی رگ رگ اینٹھ گئی۔ ہرا ہرا کف آلود، نہایت کڑوا مائع اس کے منہ سے نکل کر تکیے پر پھیل گیا اور وہ نقاہت سے آنکھیں کھلی نہ رکھ سکا۔

آنکھ کھلی تو اب سامنے اسٹینڈ پہ سرخ کی بجائے پیازی رنگ کی بوتل ٹنگی تھی۔ اس نے سوچا "اب کوئی سی بھی بوتل ہو کیا فرق پڑتا ہے" اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ کوئی اس کے سرہانے کھڑا کسی کو سمجھانے کے انداز میں بتا رہا تھا "جب ملیریا پُرانا ہو جائے تو بگڑ کر بلیک واٹر فیور بن جاتا ہے۔ گردے اپنا فعل چھوڑ دیتے ہیں اور پیشاب میں خون آنے لگتا ہے۔ ہم اس مریض کو فلاں فلاں دوائیاں دے رہے ہیں۔ موجودہ حالت میں اگر اس کی قسمت یاوری کرے تو بچ بھی سکتا ہے۔"

"میں جب تک آنکھیں کھول سکتا وہ چار پانچ سفید کوٹوں والے میری طرف پیٹھ کئے لوٹنے جا رہے تھے۔ جیسے مردہ دفن کرنے کے بعد لوگ قبر سے ہٹ کر واپس جا رہے ہوتے ہیں۔ میرا جی چاہا کہ آواز دے کر انہیں بتاؤں کہ جب غربت بگڑ جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ پہلے ہی بہت بگڑی ہوئی ہوتی ہے اور جب مچھر گندے پانیوں پر پتا پلتا پرانا ہو جائے تو اپنے لشکر تیار کر لیتا ہے۔ پھر غربت اور لشکر مل کر وہ اودھم مچاتے ہیں کہ کچھ محفوظ نہیں رہتا۔ اس کھیل میں تو قسمت کے لئے یاوری کرنے کا بھی کوئی موقعہ نہیں ہوتا۔"

اس کے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ "کاش! اس دم میرا کوئی اپنا یہاں ہوتا تو میرے خشک حلق میں پانی ٹپکاتا۔ مگر ہوتا کون؟ جو بھی قریب آیا اس کو بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ آخر ہر کوئی تھک کے الگ ہو گیا۔ جن کو اپنا بنایا تھا وہ کبھی کے کھاپی کے چلتے بنے تھے۔ اس وقت حُرّہ ہوتی تو سر گود میں رکھ کر قے سے لتھڑے منہ کو صاف کرتی۔ مگر اسے تو میں نے خود گندی نگلی ہوئی چیز کی طرح برسوں پہلے قے کر کے اگل دیا تھا اور وہ معاشرے کی ہر دھتکاری ہوئی عورت کی طرح دوسروں کے گناہوں کی پاداش میں مرنے سے پہلے جہنم میں پہنچ چکی تھی اور اب تک تو وہاں سے بھی فارغ ہو کر آگے نکل گئی ہو گی۔ اگرچہ اتنی بہت سی عمر یہاں گزار چکا ہوں مگر لگتا یوں ہے جیسے آج پیدا ہوا تھا یا زیادہ سے زیادہ کل چاہتا ہوں کہ زندہ رہنے کا صرف ایک موقعہ اور مل سکے تو جو حماقتیں اور بیوقوفیاں کر کے پہلے زندگی تباہ کی تھی، اب کے ان سے صاف بچ کر نکل جاؤں گا۔ دوسرا جنم مل جائے تو کیسا ہے؟ نہیں۔ اس طریقے میں جون کا جھنجھٹ ہوتا ہے۔ میں اگر کبھی کتے کی جون میں ہوں، تو وہ انسان ہے اور میں انسان ہوں تو وہ تتلی بنی اُڑتی پھر رہی ہے۔ پھر پتہ نہیں میں چین، جاپان میں جا جنم لوں اور وہ کہیں امریکہ، یورپ میں جا پیدا ہو۔ اس طرح ملاپ ہونے میں نہ جانے کتنے یُگ لگ جائیں اور مجھے ایک لمحے کی جدائی کی تاب نہیں۔"

اس کی آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ کندھے پہ گٹھڑی اٹھائے گلی میں اپنے کمرے کی طرف جا رہا ہے اور حُرّہ کے باپ نے رخصتی کے وقت جس چادر سے اس کا سر ڈھانپا تھا وہ اُسی میں لپٹی اس کے پیچھے پیچھے چلی آرہی ہے۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے کیسہ ٹٹول کر چابی نکالی اور اسے دیتے ہوئے کہا "لے گھر کی مالکن! تالہ کھول تاکہ تیرے گھر کی چھت تلے پہنچ کر کچھ آرام پائیں۔"

اس نے چابی لے کر اُلٹ پلٹ کے دیکھی۔ پھر سر پہ ہاتھ لگا کر گھونگھٹ ذرا سا اونچا کیا اور گلابی ہونٹوں سے سفید دانت چمکاتے ہوئے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "مجھے نہیں پتہ کیسے کھولتے ہیں۔ میں نے کبھی اپنے گھر میں تالہ دیکھا ہی نہیں۔"

اس نے چابی لے کر تالہ کھولا۔ اندر پہنچ کر حُرّہ نے چادر اُتار کر چارپائی پر ڈالتے ہوئے کہا "گاڑی نے تو مجھے چکر چڑھا دیئے۔ یہ ہوتی ہے گاڑی؟ ابھی تک سر میں کھٹ کھٹ کی آواز رچی ہوئی ہے۔ پانی کہاں ہے؟" اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں گھڑے پر اٹا پیالہ پڑا تھا۔ حرّہ نے ایک قدم اٹھایا تو ارد گرد سے مچھروں کے دَل کے دَل اُڑ پڑے۔ "اوئی اللہ! اتنے مچھر؟ یہاں کیسے رہیں گے؟ یہ تو ہمیں کھا جائیں گے۔"

اس نے پانی پی کر، چادر اٹھائی اور کمرے کا دروازے کھول کر صحن میں مچھر نکالنے شروع کر دیئے۔

وہ کہنے لگا "تم مچھروں کی فکر نہ کرو، ان سے نپٹ لیں گے۔ پمپ اور چھڑکنے کی دوا لا کر سب کو مار دیں گے۔ اور ہاں! ایک مچھر دانی بھی لے آئیں گے۔ اسے چارپائی کے اردگرد لگا لیں تو اندر ایک دانہ نہیں آسکتا۔ بڑے مزے سے سوؤ۔"

وہ حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی جیسے اسے ان باتوں کا یقین نہ ہو پھر ہنستے ہوئے کہنے لگی "اچھا! وہ سب تو لاتے لاؤ گے لیکن ایک چارپائی تو اور لاؤ۔ کوئی آنے جانے والا دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ دو جنے! اور ایک اکیلی چارپائی"

پھر کیا دیکھتا ہے کہ ایک سہ پہر وہ گھر آیا تو حرّہ صحن میں منہ پر دوپٹہ ڈالے پڑی تھی۔ کوئی آٹھ دس دانے مچھروں کے اس کے اوپر ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔ اس نے دو تین مرتبہ انہیں اُڑایا مگر وہ اپنے پر سمیٹے اسی طرح اپنی اونچی اونچی بیڈھب ٹانگوں پر بیٹھے رہے اتنے میں چاروں طرف سے مچھروں کے پرے کے پرے حرّہ کے اوپر آ کر بیٹھنے شروع ہو گئے۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں گھبرایا ہو زور زور سے ہاتھ جھلا جھلا کر اڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن مچھر اپنی جگہ سے سرِ مو نہ ہٹتے۔ حُرّہ کو چیخ چیخ کر آوازیں دیتا ہے، جھنجھوڑتا ہے مگر وہ اسی طرح بے ہوش پڑی سوتی رہتی ہے۔ وہ آٹے کا خالی کنستر لا کر پیٹتا ہے، اخباروں کے کاغذ جلا جلا کر انہیں دھواں دیتا ہے، حُرّہ کی پردہ کی چادر سے اڑاتا ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عجیب بات تھی کہ مچھر کا ایک دانہ تک اس کی طرف رُخ نہیں کرتا لیکن ان کے لشکروں کے لشکر حُرّہ پہ اترتے جا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ وقت پر پمپ اور دوا لے آتا تو اب یہ وقت دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اسے یہ خیال بھی گزرا کہ کہیں مچھروں نے اس کی اور حُرّہ کی اپنے بارے میں گفتگو تو نہ سن لی تھی اور اب انتقامی جذبے کے تحت ان کے کسی قدم اٹھانے سے پہلے ہی حملہ کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے حرّہ کا لباس نظر آنا بند ہو گیا۔ پھر اس کے جسم کا خاکہ بھی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ جہاں حُرّہ تھی وہاں اب لے صرف ایک مٹیالی، موٹی دُل دار تہ بچھی نظر آ رہی تھی۔

اتنے میں ان کی بھنبھناہٹ کا شور یوں اُٹھا جیسے کوئی ہوائی جہاز اڑنے لگا ہو۔ دفعتاً کیا دیکھتا ہے کہ مچھروں نے حُرّہ کو چارپائی سے بلند کر لیا۔ پھر آہستہ آہستہ اُسے کوٹھے اور اردگرد کے سب مکانوں سے کہیں زیادہ اُونچا اُٹھا لیا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح لاش کی لاش لیٹی حرّہ کو شہر کے مرکز کی طرف اڑائے لئے جانے لگے۔ وہ گلیوں بازاروں میں پاگلوں کی طرح گرتا پڑتا اس کے پیچھے پیچھے دوڑا جا رہا تھا لوگ اس کی طرف اشارے کر کر کے ہنس رہے تھے۔ ٹھٹھے کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ مچھروں نے حرّہ کو لے جا کر مینار کی چھتری میں رکھ دیا۔ اسے کچھ اطمینان سا ہوا کیونکہ اسے یقین تھا کہ مینار جو نور کی منزل کا مسافر ہے، انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے گا۔ لیکن جب وہ ہانپتا ہوا مینار کے نیچے پہنچا تو حیران رہ گیا کیونکہ اس کے چاروں طرف ہر ناکہ مضبوطی سے بند تھا۔ "آخر کیوں؟" دفعتاً اس پہ منکشف ہوا کہ پتھر کا مینار جو پتہ نہیں کتنی صدیوں سے وہاں کھڑا تھا اور آج تک اپنی جگہ سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہو سکا تھا، وہ انصاف کرنے کیلئے کیا حرکت میں آئے گا۔ اسی زمین کی کوکھ سے نکلے پتھروں سے بنا مینار نور کی منزل کا مسافر کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ جب بھی ہلے گا تو نیچے ہی کی طرف گرے گا، اوپر کہاں جا سکتا ہے۔ وہ نیچے کھڑا ہو کر چیخ پکار کرنے لگا مگر وہاں اس کا واویلا سننے والا کون تھا؟ البتہ تماشہ دیکھنے والوں کے چاروں طرف ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ تل دھرنے کو کہیں جگہ نہ رہی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ مینار کی چھتری سے حُرّہ کی شلوار تیز ہوا میں پھڑپھڑاتی ہوئی اڑتی جا رہی تھی۔ جونہی شلوار اُڑی تو دیکھنے والوں نے بوکاٹا، بوکاٹا کے آسمان تک پہنچنے والے نعرے بلند کئے۔ خوشی سے ناچتے اس جمِ غفیر اور اچھل اچھل کر نعرے لگاتے اس انبوہِ کثیر میں وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے، زمین پر اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رونے لگا۔

آنکھ کھلی تو اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ باہر دیکھا تو مینار کہیں اندھیرے میں غرق تھے۔ اس نے سوچا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ پہلے بھی کہاں روشن تھے۔ ایک مرتبہ تو کیا اگر ہزار مرتبہ بھی زندگی پھر سے گزارنے کا موقعہ فراہم ہو تو بھی حُرّہ کسی یک مرتبہ بھی میرے پاس نہ رہ سکے گی۔ بزدل اور حُرّہ اکٹھے ہوں تو دونوں ہی برباد ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ سے بچ کر بھلا کہاں جا سکتا ہوں؟"

الاؤ

خالدہ حسین

چنانچہ ہم چاروں نے یکے بعد دیگرے سلیمہ کو گلے سے لگایا۔ حسب توفیق آنسو بہائے اور اپنی اپنی دانست میں اس کو دنیا کے احوالِ واقعی اور اسی قسم کے پیش آنے والے بے شمار حادثات و واقعات سے آگاہ کیا۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔" رفعت نے حسب معمول مت بتایا۔ "ہاں بھائی وہ تو شکل ہی سے ایسا لگتا تھا۔ لعنت بھیجو۔" ذکیہ نے جیبی آئینہ میں اپنی صورت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی۔ تین حرف بھیجو اس کی ذات پر۔ لاحول ولا یعنی کہ تم خواہ مخواہ اپنا اچھا خاصا رنگ روپ بگاڑ رہی ہو۔ ویسے آج کل تم وہ آئل آف اولے استعمال کر رہی ہو کہ نہیں۔ تمہاری جلد ذرا مرجھا —"

"تم بکواس بند کرو جی۔" رابعہ نے جھلا کے کہا "سوال یہ ہے کہ اب ہمارا — وہ — ہاں۔ ردِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ ردِ عمل۔"

"ردِ عمل! واہ یہ بھی اچھی رہی یعنی یہ ردِ عمل بھی کوئی سوچنے کی بات ہے۔ بھائی وہ تو ہو چکا۔ ہو رہا ہے — ہوتا رہے گا۔ شاید ازل سے ہوتا آرہا ہے اور ابد تک ہوتا جائے گا۔ تف ہے تمہاری عقل پر۔ میں نے بولنے کی تکلیف تو گوارا نہ کی کیونکہ سلیمہ کے مسلسل بہتے آنسو دیکھ کر اس کی خوش نصیبی پر رشک کرنے میں مصروف تھی۔ کیا واقعی اس کو اس حادثہ کا اس قدر رنج ہے۔ کیا واقعی دکھ کا اظہار آج بھی اتنا سہل، اتنا سیدھا سادا ہو سکتا ہے۔ کیا آج بھی لوگ ان آنسوؤں کی دولت سے مالا مال ہیں۔ میرے سر میں پھر ایک گرم گرم، نیلی پیلی روشنیوں والا تیز چکر گھوما، جوش کھاتا، دہاڑتا لاوا۔ جیسے سرکس میں جلنے والا وہ آگ کا چکر جس میں سے کبھی انسان، اور کبھی کتے کودتے ہیں اور تماشائی بے تحاشا تالیاں بجاتے ہیں۔ اور کچھ میرے جیسے ناکارہ حوصلہ شکن، بد دیانت یہی سوچتے رہتے ہیں کہ انھوں نے کیا محسوس کیا۔ ایک کراہت، گلے میں پڑتا ایک پھندا — بس — میں نے سلیمہ کو اس کے آنسوؤں کی دولت پر مبارکباد دینے کی سوچی۔ مگر پھر خاموش رہی۔ تو کیا واقعی اس کو اس شخص کی جدائی کا اس درجہ غم ہے۔ تو کیا اب وہ اس دنیا کے تماشا گھر میں آگ کے اس چکر میں کودے گی — کود چاہے گی۔ اور مجھ جیسے بد دیانت محض یہی سوچتے رہ جائیں گے کہ اس نے واقعی کیا محسوس کیا۔

"بھائی تم اس کو نہیں جانتیں اپنی فریدہ کو، اس کے ساتھ کیا ہوا — سالہا سال کے بعد وہ موصوف پھر آن وارد ہوئے۔ کہنے لگے ذہنی رفاقت تو میری اس کائنات میں محض تمہاری ذات کے ساتھ ہے۔ یوں گھر میں نصف درجن بچے موجود ہیں رونق کے لئے۔ ذرا غم غلط کرنے کو۔ اور پھر بیوی ان کی بریانی کی ماہر ہیں۔" ذکیہ نے پھر دلاسہ دیا۔

"ہاں۔ اور پھر معلوم ہے فریدہ نے ایک ایسوسی ایشن بنائی ہے۔" رابعہ نے اطلاع دی۔

"ارے ہاں۔ وہ مجھ سے بھی دستخط کرنے کو کہتی تھی۔"

"ایسوسی ایشن؟" بالآخر میں نے ہما ہی روکتے روکتے پوچھ ہی لیا۔

"ہاں اس معاشرے سے سمجھ دار، ذی ہوش عورتوں کے خاتمے کی یعنی کہ جب کسی بچی میں ذہانت کے ایسے اُلٹے سیدھے جراثیم دیکھے، بہ سن بلوغت اس کی شادی کر دی تاکہ وہ صحیح وقت پر تندرست بچے پیدا کر سکے۔ کائنات میں اپنی تخلیق کا مقصد پورا کرے، اور تمام زندگی خوبصورت غرارے پہن کر میلاد شریف کی محفلیں سجائے۔"

سلیمہ کچھ تھوڑا سا مسکرا دی۔ اس نے اپنے خوبصورت ہینڈ بیگ میں سے خوبصورت مہکتا نازک سا رومال نکال کر آنکھیں خشک کیں۔

"زندہ باد۔" رفعت اس کو مسکراتا دیکھ کر خوش ہو گئی "بھئی بات یہ ہے کہ میری دو بیٹیاں ہیں، ان کو سولھواں سال لگنے سے پہلے ہی نہ بیاہ دیا تو نام نہیں۔ اور اس کے لئے میں نے تو منت بھی مان لی ہے۔"

"ہائیں ——— تم اور منت؟" رابعہ خوفزدہ ہو گئی۔

آرے ہاں ——— تو کیا حرج ہے بھئی منت ماننے میں ایسا کونسا نقصان ہے۔ اگر پوری ہو گئی ویل اینڈ گڈ۔ نہ ہوئی تو پروا نہیں۔ سو واٹ؟"

"بھئی تم لوگ کیسے مزے سے میٹھی باتیں بنا رہی ہو۔ اس لئے کہ تمہارا گھر ہے شوہر ہے۔ بچے ہیں۔ تمہارے پاس زندگی کا اتنا ٹھوس۔ اتنا بڑا مقصد ہے ——— مگر مجھے دیکھو مجھے اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ایک تنہا اجاڑ کمرے میں خاموش تصویروں کے درمیان وقت گذارنا ہے۔ بلکہ وقت کو مارنا ہے۔ زندگی کو مارنا ہے۔ قتل کرنا ہے۔" سلیمہ نے یکدم غصے میں آ کر ہینڈ بیگ بند کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو ——— سلیمہ رکو ——— دیکھو ——— یہ بھی محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ وہ تم نے سنا ہے نا کہ دور کے ڈھول ...... تو بھائی یہ میرڈ لائف بھی ایسی جنت نہیں۔ جب دو انسان ساتھ میں رہتے ہیں نا تو ——— تو ———"

اب اس موقع پر رابعہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "ہاں بھئی تو پھر ڈی او ڈی رینٹس کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ وقت بے وقت۔ دانت ہر وقت صاف۔ منہ مہکتا چمکتا۔ آنکھیں روشن۔ اور ہوتا یوں ہے کہ چند ہفتوں کے بعد ———" اب کے پھر وہ کھلکھلا دی۔

"خدا کے لئے رابعہ کبھی تو ———"

"تو ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہوتا یوں ہے کہ چند ہی ہفتوں کے بعد ایک عفریت ہے جس کا نام ہے اکتاہٹ ——— تو وہ آن دبوچتا ہے ——— جناب نام پوچھتا ہے۔ پھر اکثر رات کو سوتے وقت جراثیم کش ٹوتھ پیسٹ سے دانت صاف کرنا یاد نہیں رہتا۔ اور پرفیوم پر پیسہ خرچ کرنا محض حماقت نظر آتا ہے ——— اور بھائی وہ جو دوسرا شخص ہوتا ہے نا تو انکشاف یہ ہوتا ہے کہ اس کو پسینہ بہت آتا ہے ——— اور ———"

"ونٹ اپ ——— رابعہ!" رفعت نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"مگر ان سب کے باوجود ——— ان سب کے باوجود ——— تمہیں خاموش بے جان تصویروں کے ساتھ وقت قتل نہیں کرنا پڑتا ——— اور ——— اور ———" سلیمہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پھر ہم سب نے اپنی اپنی ادھوری چائے کی پیالیاں ختم کیں، اور اٹھ کر اپنے اپنے راستوں پر چل دیں۔ پہلے میں نے سوچا سلیمہ کو روک لوں۔ اپنے ساتھ لے چلوں۔ مگر پھر خاموش رہی۔ اس لئے کہ اس دنیا میں چاروں طرف اتنا شور، اتنا انتشار تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اور دے بھی جائے تو اس کو سمجھے کون۔ اور اس وقت یہ سلیمہ جس مقام پر کھڑی تھی تو میں اس مقام کو خوب پہچانتی تھی۔ تو سلیمہ یوں سمجھو کہ دراصل آج اس لمحے کی قید سے چھوٹ کر میرا ایک وجود تم ہو۔ اور تم جس تنہائی کا ذکر کرتی ہو اس میں تو پناہ بھی لی جا سکتی ہے۔ تم نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیئے۔ تنہائی بہت محفوظ، بہت امان دینے والی ہے۔ آغوشِ مادر۔ مگر اس کے بعد جو تنہائی ہے ——— وہ ——— لامحدود ہے ——— وہ خود وقت ہے۔ العصر۔ لاانتہا ——— پھیلتا ——— سب کو سمیٹتا ——— اور اس کا سامنا ہر ایک کو تنہا کرنا ہے۔ ہر ایک ذات کو ——— خواہ وہ خاموش بے جان تصویروں کے درمیان زندہ رہے یا زندہ محبت کرنے والے خوش بختوں کے سائے میں ——— اس اس مقام کے بعد کی تنہائی بے امان ہے

اس لئے کہ تم کو پہلی بار یہ بتاتی ہے کہ تمہاری ذات تمہاری اس لئے ہے کہ تم دوسروں سے علیحدہ ہو۔ تم تم اس لئے ہو کہ دوسرے تم سے علیحدہ ہیں۔ اس لئے تم ہر دم — ہر آن اپنے اور دوسروں کے فاصلے کم کرنے — بلکہ ان کے ساتھ ایک ہو جانے کی دھن میں رہتی ہو اور یہ قطعی لاحاصل ہے یہ دھن — یہ لگن — اور جس نے یہ جان لیا اس نے گویا اپنی خوش بختی سے منہ پھیر لیا۔

میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور چل دی — "اٹھ فریدا سُتیا تیں توں بازی لے گئے کتے — تیں توں اُتے — شاید ہم سب یہاں اپنے کفارے ادا کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ اور مسلسل کفارے ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی جانتے ہیں کہ ابھی اپنی خوش بختیوں یا کرتا ہیوں کی قیمت نہیں چکا پائے مسلسل تاب ہے۔ لاحول ولا — میرے سر میں پھر وہ آگ کا دہکتا الاؤ گول گول — چکر کھاتا۔ اوپر اٹھتا — بھڑکنے پھیلنے لگا۔ مجھے اس میں سے کودنا ہے — اس میں سے کودنا ہے اور یہ وہ تماشا گھر ہے جو تماشائیوں سے خالی ہے — مجھے یہ کرتب تنہا کرنا ہے — جس کا دیکھنے دکھانے والا۔ داد دینے والا — شہادت دینے والا کوئی نہیں — مگر اس دہکتے الاؤ کے بغیر میری ذات موجود نہیں — میں موجود نہیں — کل داستان یہ ہے کہ اس دھڑکتے بھڑکتے گھومتے الاؤ سے میں نے یہ جانا کہ میں ہوں۔ میں ہوں کہ اس آتش فشاں پر میرا نام کندہ ہے۔

اب میں اس گھنے سفید بالوں — نرم لہجے، پاکیزہ ہاتھوں والے ڈاکٹر کے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی — میز پر ایکسرے فوٹو، رپورٹیں۔ جانے کیا کچھ کھلا پڑا تھا۔

"جی تو مسز — یہ تو سب ٹھیک ٹھاک ہے — پھر —"

"جی — یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے —"

"تو پھر — آپ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں —" اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا — جی پڑھی لکھی جاہل خاتون (جی ترنت تون — اگر زندہ ہیں تو کیا ان کے انتقال کو سو سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے ؟) جی پڑھی لکھی جاہل خاتون جس کا اس معاشرے میں دن رات اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے — یہ مشورہ مجھے میرے چارہ گر کا ہے۔

"دیکھئے اگر آپ کو اپنا کوئی غم نہیں تو کم از کم قوم کا غم کھائیے۔ کوئی سوشل کام کیجئے — اپنے بچوں کو سدھانا بڑھانا چھوڑ کر کسی فلاحی ادارے میں کام شروع کر دیجئے۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے متعلق سوچنا چھوڑ دیجئے — دیکھئے دنیا میں کتنے دکھی لوگ ہیں — آپ ایسا کیجئے — آپ کسی تبلیغی جماعت میں شریک ہو جائیے — کسی صاحبِ کرامات کے ہاتھ پر بیعت کر لیجئے —"

"جی شکریہ — شکریہ —" میں نے تمام کاغذات سمیٹے اٹھ کر چل دی — "صاحبِ کرامات —" مجھے ہنسی آ گئی — "وہ تو میں خود ہوں۔"

تب مجھے تحسینہ بہت یاد آئی۔ جب برسوں پہلے وہ مجھ سے ملی تھی تو ہمیشہ کی طرح اس نے گویا میرے آر پار دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے — روٹی — کپڑا — مکان ؟"

کیسے تندرست مسائل ہیں — میں نے سوچا تھا — انسان کو واقعی انسان بنانے والے — ان کو زندہ گوشت پوست کا جی دار وجود بنا کر زمین پر زندہ رکھنے والے — خالی کھوکھلے ہیولے سے بدل کر وزن دار شے میں ڈھالنے والے — دنیا کا نقشہ بدلنے والے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

"آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے ؟ وجود ؟" تحسینہ نے اصرار کیا تھا۔

اب یہ تمہارے ادراک سے آگے کی بات ہے۔ شکر ہے کہ ایک بات ایسی ہے جو تمہارے ادراک سے آگے کی ہے — یہ تو بے وجودی در بے وجودی ہے — شاید یہ ہیلیوسی نیشن ہے۔ جو اپنے سب محبوب لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر میں تنہا دیکھتی ہوں — اور چاہنے کے باوجود ان کو اس دید میں شامل نہیں کر سکتی۔ کیونکہ یہ ہیلیوسی نیشن اپنی تنہائی خود لے کر آتا ہے۔ ہر انسان کے مقدر کی تنہائی۔

وہ جو میرے ماں باپ کو اپنے ماں باپ اور ان کو ان کے بزرگوں اور ازل سے پہلے آدمی کو ودیعت ہوئی۔ لہٰذا ہمیں اس کا سامنا کرنا ہے ——ضرور کرنا ہے —— تنہا —— یار فریدا او ہدی، وہ جانے ساہنوں اپنی توڑ نبھاون دے

"بس اسی لئے میں نے سچ سنا اور سمجھا ہے۔" میری خاموشی سے اکتا کر تحسینہ نے کہا تھا "کہ تمہاری تحریر زوال پذیر ہے —— کیونکہ تم رجعت پسند —— توہم پرست ہو چکی ہو —— میرا خیال ہے کہ تمہیں تیسری دنیا کے متعلق سوچنا چاہیئے۔ اور تمام پسماندہ مفلوک الحال بیمار قوموں کے ساتھ تعلق استوار کرنا چاہیئے —— اسی میں تمہاری نجات ہے۔"

وہ اپنا کتابوں کا بنڈل اٹھا کر چلتی بنی تھی۔

تیسری دنیا —— تیسری دنیا سے بڑھ کر ایک دنیا میرے اندر موجود ہے۔ —— کیا میں اس کے سامنے جواب دہ نہیں —— میں اس دشتِ کرب و بلا میں جواب دہ ہوں کہ اب تک لبیک کی صدا میرے سینے میں گھٹی ہے —— مجھے اس دہکتے الاؤ میں کودنا ہے باوجود اس کے کہ میرا دیکھنے دکھانے والا کوئی نہیں —— یار فریدا او ہدی او وہ جانے ...

پس آج کی رات بھی جب وہ سب کچھ میرے سامنے تھا —— میں لیٹے لیٹے اُٹھ کر بیٹھ گئی —— ہاں وہ سب کچھ میرے سامنے تھا۔

"کیا ہے —— ؟ کیا ہے!" عارف نے میرا سر دبا تھ دباتے ہوئے کہا —— "کچھ نہیں —— یہ کچھ نہیں۔ یہ ہیلیوسی نیشن ہے —— صرف —— تمہارا وہم —— وسواس ——"

"نہیں —— یہ ہیلیوسی نیشن نہیں —— صرف تم میرے پاس رہو —— مجھے اس میں کودنا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا —— تب پہاڑ دھنکی روئی کی مانند اُڑنے لگے —— اور زمین نے اپنے اندر کے بوجھ اُگل دیئے —— اور ساتوں آسمانوں کے طبق وا کر دیئے گئے —— پھر وہ جلتے رنگوں کا آتشیں دائرہ نمودار ہوا —— بڑھتا —— پھیلتا —— سنسناتا —— شعلے اڑاتا —— تب میں ایک پتنگا بنی اور اس کے گرد گھومنے لگی —— اس آتش فشاں کے گرد گھومتی جاتی تھی کہ اب میں اپنے مدار میں داخل ہو چکی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے —— کیوں اسے آتشِ سوزاں میں لئے جاتی ہے —— مگر یہ میرا مقدر ہے۔ اور میں اس سے خوفزدہ نہیں —— دیکھو میں اس کے گرد رقصاں ہوں —— امید اور خوف کے ساتھ —— خوف اور امید کے ساتھ منتظر ہوں اس لمحے کی کہ جب اس آگ پر سلامتی بن جانے کا حکم آئے۔

گھیراؤ

انور سجاد

جب ان کی نظریں اس کی اور نہیں ہوتیں
اس کے دونوں بازوؤں، ٹانگوں، ہاتھوں پیروں میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں
اور پھر سب کچھ بے جان سا ہونے لگتا ہے تو
یہ محسوس کرنے کے لئے کہ جو اشیا اسے گھیرے میں لئے ہیں
زندہ ہیں، زندگی کی حدت لئے
وہ مزار کی دہلیز کو چومنے کے بعد سب کی نظروں سے چوری
اگرچہ اسے نظریں چرانے کی ضرورت نہیں
سنگ مرمر کی بنی محراب کے ستون پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا ہے
سب ہی اسی طرح اپنے ایقان کو سہلاتے ہیں
بے ضرر حرکت
سنگ مرمر سے بنی محراب کے اندر قبر، تعویذ، اچھاڑ، گنبد کی چھت میں جڑے لاتعداد چھوٹے چھوٹے آئینے۔
درون کے لاتعداد عکس
وسط سے لٹکتا فانوس
دہلیز کے پار جانے کی اجازت نہیں، محراب میں شیشہ لگا ہے
سب کچھ شوکیس کے اندر

ایک عرصہ ہوا ہر شے اس سے اکتا چکی ہے، اس کی شاعرانہ یاد بننے تک سے انکار کر چکی ہے۔ بچپن ہی سے وہ ان کی رفاقت کے لئے کوشاں رہا ہے، ترستا رہا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے اندر جذب کر سکے۔ زندگی۔ جوں ہی وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے ہاتھ سے سہلاتا اس پر گرفت مضبوط کر کے اپنے سینے میں اتارنا چاہتا ہے تو جیسے کوئی اس شے کو وہاں باندھ کر اس کے ہاتھ کو بے جان کر دیتا ہے اب وہ اپنی اس کیفیت کا ذکر کسی سے نہیں کرتا حتیٰ کہ ڈاکٹر سے بھی نہیں، سب کہتے ہیں، یہ اس کا وہم ہے۔ اس کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا وہم کیا ہوتا ہے اور حقیقت کیا۔

سو اس کے اور کھلونوں کے درمیان سہولتوں، ضرورتوں، اس کے اور اس کی محبوبہ کے درمیان، اس کے اور زندگی کے

درمیان شیشے کی دیوار حائل

سب کچھ شوکیس میں
دو شیشے کے ساتھ آنکھیں چپکائے، ناک چپٹی

رسل، رسائل،
سوئیوں کی چبھن، بے حسی اس کے بازوؤں، ٹانگوں، ہاتھوں پیروں میں رقم
شوکیسوں میں ڈمیاں
گنبد کی چھت سے منعکس ان گنت خواب
تاآنکہ کوئی ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دے
—— خواہشوں کی تجسیم کو اپنے میں کیسے جذب کروں

دہلیز پر پہرے
وہ سر، بازو، ٹانگیں سمیٹ کر خول کے اندر سمٹ جاتا ہے
ایک ایک کرکے اس کی سب خواہشیں مٹ چکی ہیں، مٹادی گئی ہیں۔ وہ اس کی خواہشوں کو یا وہ اپنی خواہشوں کو مٹانے میں کامیاب ہو چکا ہے جیسے ٹائپ کرتے میں غلط لفظ کو اس مہارت سے مٹادے کہ لفظ کا نشان رہے نہ مہین کا غذ پھٹے، صرف ایک خواہش، ہاتھوں، نظروں کے لمس سے اشیاء کو محسوس کرنے کی کہ جس گھیرے میں ہے، زندہ ہے؟ زندگی کی حدت لئے؟ جذب نہ سہی، زندگی نہ سہی، احساس ہی سہی۔
اس کی اتنی معمولی سی خواہش کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے؟
وہ جو اسے جانتے ہیں اور وہ جو اسے نہیں جانتے اور وہ جو اسے جانتے ہیں پر نہیں جانتے، اس سے نالاں نہیں، وہ بے حد بے ضرر ہے، پر بعض اوقات وہ اس کی اتنی امن پسندی، فرمانبرداری، بے نیازی سے بولا جاتے ہیں۔ اس کی یہ بے حسی ان کے رونگٹوں میں گھبراہٹ، انجانے خوف کی لہریں جاتی ہے۔
کون جانے، شوکیس میں شیشے ہی لگے ہیں۔ اور پہرے دار؟ کیا معلوم وہ کس ہتھیار سے انھیں مغلوب کر لے

بہت سی سرد راتوں میں ایک رات
حسب معمول وہ مزار سے باہر آتا ہے
ویران سڑکیں، شوکیسوں اور بجلی کے کھمبوں سے نکلتے، دھند کو چیرتے تیز نوکیلے نشتر
وہ شوکیسوں میں زرق برق پوشاک پہنے، مصنوعی زیورات سے لدی پھندی ڈمیاں دیکھتا ہے
کھلونے، محراب کے مرمریں ستون، شیشہ، خواہشیں
زندگی ہے، حدت ہے۔ نظروں سے چھو۔ دہلیز پار کرنے کی اجازت نہیں۔
گنبد کی چھت میں ان گنت دعائیں منعکس، وسط سے لٹکتے فانوس میں ایقان روشن
ڈمیوں کے جسمانی زاویوں میں خوابوں کا رقص وحشت

آنکھیں شیشے کے ساتھ چپکی ناک چپٹی
باہر آنے کی کوشش نہ کرنا، حوالۂ پولیس کردیئے جاؤ گے
دور سے قریب آتی گشت کے سپاہیوں کی للکار، سیٹیاں
وہ انتہائی خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ بھاگنے لگتا ہے کہ اتنی سرد راتوں میں سڑک پر سنے والا ہر شہری ان کی نظروں میں مشکوک ہے۔
وہ بھاگتا ہے۔ بھاگتا ہے
کسی شریف شہری کو کیا پڑی ہے کہ اتنی سرد، اندھیری رات میں سڑکوں پر مارا مارا پھرے۔ آوارہ کتے بھی ایسے تاریک موسم میں تھڑوں کے نیچے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔
وہ بھاگتا ہے۔ بھاگتا ہے۔ خوف زدہ کتے کی طرح
بازو پر گرفت، کمر پر ڈنڈا۔ ہر سوال کا جواب ان کے نزدیک جھوٹ۔ تھانہ، چھتروں سے تواضع تا آنکہ ناکردہ جرم کا اقرار یا سرکار کو غیر سرکاری جرمانے کی ادائیگی۔
بھاگتے بھاگتے، پسینہ، حدت، زندگی، کسی بھی شے کو نظروں سے چھوئے بنا ہی اس کے سارے وجود میں لبالب بھر جاتی ہے۔
اس کا مثانہ پیشاب سے پھٹنے لگتا ہے
وہ پھولے سانسوں سے ایک دیوار کی اوٹ میں رک کر جلدی جلدی اپنی بوسیدہ خاکی زین کی پتلون کے سامنے کے بٹن کھولتا ہے
کھلے بٹنوں سے بنا چاک بیکار ہے۔
وہ حیران پریشان رہ جاتا ہے
پیشاب رکنے نہیں پاتا
سپاہیوں کی سیٹیاں، للکار قریب، اور قریب
چاک ——؟ وہاں کچھ نہیں
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اشیا، جو موسموں کے تغیر و تبدل کے وار سہتی ہیں، استعمال میں نہ آنے کے باعث رفتہ رفتہ بالآخر مسٹ جاتی ہیں۔ اپنے آپ کو فراموش کر دیتی ہیں۔ یادوں سے حذف۔
بھاگتے فل بوٹوں کی گونج
وہ اسے اپنے حصار میں لے لیتے ہیں
اس کی ٹانگوں پیروں، بازوؤں ہاتھوں میں جیسے نشتر چبھتے ہیں۔ سب کچھ سُن، بے جان ہو جاتا ہے
عجیب بات ہے۔ لمحہ بھر کے لئے۔ صرف لمحہ بھر کے لئے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی تمام حیات کے بکھرنے پر آخری خیال اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کیا ہوا اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں، اس کے ہاتھ تو ہیں، پیر تو ہیں، وہ اپنے گھونسوں، ٹھوکروں سے شوکیس توڑ سکتا تھا۔
وہ جھکا کے گر پڑتا ہے اپنے پیشاب کے تالاب میں
مسکراہٹ اس کے مفلوج ہونٹوں پر نہیں آتی
وہ بند ہوتی آنکھوں سے دیکھتا ہے

چاروں اور دھند ہی دھند جس میں
گنبد کی چھت میں جڑے چھوٹے چھوٹے لاتعداد آئینوں سے منعکس ان گنت قمقمے شمعیں
وسط سے لٹکتے فانوس میں روشن اپقان
سنگِ مرمر کے ستونوں سے بنی محراب میں لگے شیشے کے اس پار
لوبان کے دھوئیں میں پھیلتی دعائیں
شوکیسوں میں زرق برق پوشاکیں پہنے مصنوعی زیوروں سے لدی پھندی ڈمیاں
۳۵¾″-۲۴″-۳۶″
ناپ تول کا آئیڈیل نظام
شیشے کی دیوار کے پار
موسموں کی دستبرد سے محفوظ؟

بے جان

پیشاب میں تیرتی لاش

تماشا

محمّد منشایاد

اندھیرے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد وہ سورج طلوع ہونے تک دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔

کنارے پر جگہ جگہ اَدھ کھائی اور مری ہوئی مچھلیاں بکھری پڑی ہیں۔ چھوٹا کہتا ہے "یہ لُدھروں کی کارستانی لگتی ہے ابا!"

"ہاں پتر!" بڑا کہتا ہے "یہ ایسا ہی کرتے ہیں، ضرورت سے زیادہ مچھلیاں مار مار کر جمع کرتے رہتے ہیں مگر کھاتے وقت آپس میں لڑ پڑتے ہیں اور شکار کو بھی بھول کر ایک دوسرے کو لہو لہان کر دیتے ہیں۔"

"یہ اتنی ساری مچھلیاں!" چھوٹا کہتا ہے "ایک رات میں اتنی مچھلیاں مارتے ہیں—— تو دریا مچھلیوں سے خالی نہ ہو جائے گا؟"

"اگر لُدھروں کی تعداد بڑھتی رہی تو ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ سامان رکھ کر کنارے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس پار دیکھتے ہیں بستی۔ جہاں انھیں پہنچنا ہے اس کی مسجد کے مینار صاف نظر آتے ہیں مگر اس تک پہنچنے کے لئے نہ پُل ہے نہ کشتی—— وہ پریشان ہو کر دریا کی طرف دیکھتے ہیں۔ دریا ہر جگہ سے ایک جیسا گہرا اور چوڑا ہے۔ بڑا کچھ دیر تامل کرتا ہے پھر کہتا ہے "اللہ کا نام لے کر چل پڑتے ہیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی ابا!"

"اگر ڈوب گئے تو؟"

"تو آئندہ ایسی غلطی نہیں کریں گے۔"

"تو کافی ہوشیار ہو گیا ہے جمورے۔" بڑا ہنستے ہوئے کہتا ہے۔

"تمہارا بیٹا جو ہوا ابا!"

"ضرور چل پڑتے پتر،" بڑا کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتا ہے "مگر مجھے رات والا خواب یاد آ رہا ہے۔"

"کیسا خواب—— ابا؟"

"بہت ڈراؤنا خواب تھا پتر!"

"کیا دیکھا تھا ابا؟"

"میں نے دیکھا جمورے کہ بہت بڑا مجمع ہے۔ میں تماشائیوں کے درمیان کوڈیوں والے کو گلے میں ڈالے کھڑا ہوں۔ بچے تالیاں بجاتے اور بڑے زمین پر بچھی چادر پر سکے پھینک رہے ہیں کہ اچانک کوڈیوں والا جسے میں نے تمہاری طرح لاڈ پیار سے پالا ہے میری گردن میں دانت گاڑ دیتا اور اپنا زہر انڈیل دیتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا ابا؟"

"پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ لوگوں کے چہرے دھندلا جاتے اور آوازیں ڈوب جاتی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں موت ایسی نیند کے اندھے کنوئیں میں نیچے ہی نیچے گرتا چلا جا رہا ہوں۔ ڈوبتے ڈوبتے رہی سہی طاقت جمع کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں

آواز کا تیر پھینکتا اور تمہیں پکارتا ہوں۔"

"پھر؟"

"پھر میں اپنی ہی چیخ کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آدھی رات کا وقت ہے۔ چاند ڈوب چکا ہے۔ کتے رو رہے ہیں اور اداس سے بوجھل ہوا اداس اداس سی پھر رہی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر میں نے دیکھا کہ تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو۔ میں نے تمہارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمہارے گلے پر چھری چلاتے اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ڈالا کرتا ہوں مگر رات کے اس اداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اڑ گئی۔"

"بس" چھوٹا کہتا ہے۔ "اس سے تم نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ ہمیں دریا میں نہیں اترنا چاہیئے۔"

"ہاں پتر آج کا دن ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔"

دونوں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا اور سستانے لگتا ہے۔ چھوٹا ابھی تک تازہ دم ہے۔ دوڑ دوڑ کر ٹیلوں پر اترتا چڑھتا ہے اور اچانک پکارتا ہے۔ "ابا پل ——— مجھے پل دکھائی دے رہا ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔"

پل کا نام سن کر بڑے کے بڑھے جسم میں زندگی کی تازہ لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ اٹھ کر بھاگتا ہوا ٹیلے پر آتا ہے اور اس طرف کو دیکھتا ہے جدھر پانی بہتا ہے۔ پھر خوش ہو کر کہتا ہے۔ "ہاں پل زیادہ دور نہیں ——— مگر راستہ دشوار گزار ہے۔"

"کوئی بات نہیں ابا۔"

دونوں اپنا اپنا سامان اٹھا لیتے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ راستہ مشکل ہے۔ بہت سے نشیب و فراز۔ ٹیلے اور گھاٹیاں۔ ندی نالے ——— گھنا جنگل۔ خاردار جھاڑیاں، اور پاؤں لہولہان کر دینے والی دوب ——— مگر وہ چلتے رہتے ہیں۔ چلتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے کنارے پر بستی کی مسجد کے اونچے مینار بھی چلتے رہتے ہیں۔ چلتے چلتے وہ تھک جاتے ہیں۔ صبح سے دوپہر ہو جاتی ہے مگر پل اب بھی اتنا ہی دور نظر آتا ہے جتنا اس وقت نظر آتا تھا جب وہ چلے تھے۔

بڑا کہتا ہے "عجیب بات ہے جمورے ——— پل آگے ہی آگے چلتا جاتا ہے۔"

"اور بستی بھی ابا۔" چھوٹا کہتا ہے "مینار ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔"

"عجیب بات ہے جمورے۔"

"بہت ہی عجیب ابا"

"یہ کوئی اسرار ہے پتر۔"

"میرا خیال ہے ابا،" چھوٹا کہتا ہے "ہم ہر روز لوگوں سے مخول کرتے ہیں۔ آج ہمارے ساتھ مخول ہو رہا ہے۔"

چلتے چلتے دوپہر ڈھلنے لگتی ہے۔ وہ تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں دریا کا گدلا پانی پی پی کر ان کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں، خاردار جھاڑیوں سے الجھ الجھ کر لباس تار تار ہو جاتا ہے۔ ور پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں مگر پل اور بستی کے مینار اب بھی اتنے ہی فاصلے پر نظر آتے ہیں۔

"رک جا پتر،" بڑا کہتا ہے "اس پار والی بستی تک پہنچنا شاید ہمارے مقدر میں نہیں ہے۔ ہم اس آگے ہی آگے چلتے ہوئے پل تک کبھی نہ پہنچ پائیں گے۔"

"پھر کیا کریں ابا؟"

"واپس چلتے ہیں پتر۔"

"نہیں ابا۔ واپس جا کر کیا کریں گے — ہماری منزل تو اس پار کی بستی ہے اور پھر ابا — واپس پلٹ جانا مردوں کا کام نہیں ہے۔"

"ہاں پتر تم ٹھیک کہتے ہو — ہماری تو زنانیاں بھی دریا کی بپھری ہوئی لہروں سے نہیں ڈرتیں — کچے گھڑوں پر چل پڑتی ہیں۔"

"واہ ابا — کیا بات کہی ہے — چلو چل پڑتے ہیں۔"

"نہیں پتر — تم تھک جاؤ گے — اور پھر ہمارے پاس سامان ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو ابا — اور سامان کا کیا ہے وہاں جا کر نیا بنا لیں گے۔"

بڑا کوئی جواب نہیں دیتا — سامان نیچے رکھ کر دریا کی طرف دیکھتا رہتا ہے پھر گانے لگتا ہے "نیں وی ڈونگھی تلہ پرانا شینہاں تاں پتن ملے — چھوٹا لقمہ دیتا ہے "میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے۔"

اچانک کتوں کے بھونکنے اور مویشیوں کے ڈکرانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

"یہ آوازیں" چھوٹا کہتا ہے "اس جنگل بیابان میں؟"

"میرا خیال ہے یہاں قریب ہی کوئی آبادی ہے، کوئی دوسری بستی۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"پتر کیوں نہ آج کی رات یہیں اس بستی میں گزار لیں۔ صبح سویرے تازہ دم چلیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی ابا۔"

بڑا کچھ دیر سوچتا رہتا ہے اور آوازوں کے تعاقب میں چلنے لگتا ہے۔ چھوٹا پلٹ پلٹ کر دریا کے اس پار والی بستی کی طرف دیکھتا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہے۔ دریا کا کنارہ لحظہ لحظہ دور ہوتا جاتا ہے اور وہ چھوٹی سی ایک بستی کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔

اچانک بڑا ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بیری کے درخت کی طرف دیکھ کر کہتا ہے "یہ کیا تماشا ہے جمورا؟"

جمورا بیری کی طرف دیکھتا ہے۔ زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر مارتا ہے پھر زمین سے بیر اٹھا کر چکھتا اور تھوک دیتا ہے۔

"ہاں ابا — دھرکونے ہی ہیں کڑوے زہر۔"

"رب خیر کرے۔ بیری کے ساتھ دھرکونے۔" بڑا کہتا ہے "کوئی اسرار ہے پتر۔"

چھوٹا کوئی جواب نہیں دیتا۔ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا ہے۔

بڑا کہتا ہے "ابابیلیں ہیں پتر۔"

"ہاں ابا — پورا لشکر ہے۔"

"دانہ دنکا ڈھونڈ رہی ہوں گی پتر۔"

"کیا پتہ کچھ اور ڈھونڈ رہی ہوں ابا"

"اور کیا پتر؟"

"ہاتھیوں کو ابا"

"نہیں پتر — یہ وہ ابابیلیں نہیں ہیں۔ یہ تو ہاتھیوں پر بیٹھ کر چہچہانے اور چوگ بدلنے والی ابابیلیں ہیں۔"

"یہاں سے نکل چلیں ابا — یہ ٹھیک جگہ نہیں ہے۔"

"رب خیر کرے گا پتر" — بڑا کہتا ہے "کچھ دھندا کریں۔ رات بسر کر کے صبح سویرے نکل چلیں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی ابا۔"

بستی میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کھلی جگہ پر سامان رکھ کر آس پاس کا جائزہ لیتے ہیں پھر چھوٹا زمین پر چادر بچھا کر اس کے ایک کونے پر بیٹھ جاتا ہے اور بڑا بانسری اور ڈگڈگی نکال کر بجانے لگتا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ بڑا چھوٹے کی طرف دیکھ کر سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "اب رات بسر کرنے کا اچھا بندوبست ہو جائے گا۔"

بڑا بانسری اور ڈگڈگی بجاتا رہتا ہے جب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے "پتر جمورا —— یہ بستی بھی عجیب ہے۔ ڈگڈگی بجاتے بجاتے میرا بازو شل ہو گیا ہے اور بانسری میں پھونکیں مارتے مارتے میرا اندر سکھناں ہو گیا ہے مگر ابھی تک کسی بالغ مرد عورت نے جس کے کیسے میں پیسہ دھیلا ہو ادھر کا رخ نہیں کیا۔"

"کیا پتہ ابا"، چھوٹا کہتا ہے "یہاں کے مرد عورتیں بہرے ہوں یا انھوں نے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہو۔"

"وہ کیوں پتر؟"

"وہ اس لئے ابا —— کہ جب بندہ کبھی بھی خیر کی خبر نہ سنے تو آہستہ آہستہ اس کا دل کچھ سننے ہی سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔"

"واہ جمورے تو نے سبق خوب پکایا ہوا ہے۔ اچھا یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ان لوگوں نے کبھی خیر کی خبر نہیں سنی۔"

"میں نے ان نیانوں کی صورتوں سے اندازہ لگایا ہے ابا۔"

"تو بہت ہوشیار ہو گیا ہے جمورے۔"

"تمہارا چیلا جو ہوا ابا۔"

"واقعی پتر —— ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے یتیم ہیں۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے ابا جیسے انھوں نے اپنے باپوں کو خود شہر بدر کر دیا ہے۔"

"شاید ہم غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔"

"ہاں ابا۔"

"دیکھ نا پتر —— ساری بستی میں کوئی ایک بھی بالغ مرد عورت نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ سب بھی ہماری طرح دوسری بستیوں میں تماشا دکھانے گئے ہوئے ہوں۔"

"پھر تو ان کی واپسی کا انتظار ضرور کرنا چاہیئے ابا۔"

"کیوں پتر؟"

"یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ بڑے مداری ہیں یا تم؟"

"نہیں جمورے مجھے تو ان بچوں سے خوف آنے لگا ہے۔ عجیب بچے ہیں۔"

"تو پھر یہاں سے چلتے ہیں ابا۔"

"ہاں پتر —— چلے جانا ہی بہتر ہے مگر تو ذرا ان چھوٹوں سے یہ تو پوچھ ان کے بڑے کہاں ہیں۔"

"ہم خود بڑے ہیں۔" مجمع میں سے ایک بچے کی آواز آتی ہے "کیا ہم تمہیں چھوٹے نظر آتے ہیں۔"

بڑا اور چھوٹا چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور ابھی اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں کہ چھوٹی عمر کا ایک اور بچہ نہایت پختہ لہجے میں کہتا ہے "منشی ٹھیک کہتا ہے —— تم لوگ جلدی جلدی کھیل دکھاؤ اور اپنی راہ لو —— ہم ایسے لوگوں کو جو خود کو ہم سے بڑا سمجھتے ہوں بستی میں زیادہ دیر رکنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

"تو کیا اس بستی میں پورے قد کا کوئی آدمی نہیں رہتا؟"

"ہم رہنے ہی نہیں دیتے" ——— ایک بچہ ہنس کر کہتا ہے "ٹھکانے لگا دیتے ہیں"

"تو یہ بستی؟" بڑا ہکلا جاتا ہے۔

"ہاں یہ بستی ——— یہ ہماری بستی ہے اور میں یہاں کا سردار ہوں لیکن تم وقت ضائع نہ کرو ——— اگر تم نے کوئی اچھا کرتب دکھایا تو ہم تمہیں مزید انعام دیں گے ——— چلو تماشا دکھاؤ"

"ابھی تو ہم خود دیکھ رہے ہیں" چھوٹا کہتا ہے۔

"تمیز سے بات کرو لڑکے" سردار غصے سے کہتا ہے "ورنہ!"

"ارے" چھوٹا ہنستا ہے "تم تو واقعی سردار کے بیٹے لگتے ہو"

"سردار کا بیٹا نہیں ——— میں خود سردار ہوں"

"ہاں ہاں ——— یہ سردار ہے" بہت سی آوازیں آتی ہیں۔ چھوٹا ہنستا چلا جاتا ہے۔ پھر بڑے کے قریب آ کر کہتا ہے "میرا خیال ہے ہم بونوں کی بستی میں آ گئے ہیں"

"مداری ——— یہ کیا بکواس ہے" سردار چلا کر کہتا ہے "یہ ہمیں بونے کہتا ہے۔ اس بدتمیز بچے کو چپ کراؤ ورنہ بستی سے نکل جاؤ"

بڑا ششدر رہ کر چاروں طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے "چھوڑو ——— یہ کوئی اسرار ہے"

"کیا اسرار ہے ابا ——— یہ بچے"

"یہ بچے نہیں ہیں پتر" بڑا اس کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

"پھر کیا ہیں ابا؟"

"غور سے دیکھو مورکھ ——— ان کے بال سفید ہیں اور ان کے چہروں پر جھریاں ہیں۔ ان کی عمریں زیادہ ہو گئی ہیں مگر ان کے ذہن نابالغ رہ گئے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں"

"عجیب بات ہے"

"بہت ہی عجیب پتر ——— رب خیر کرے"

اچانک چند بچے بہت سی چارپائیاں اور مونڈھے اٹھائے آتے ہیں اور سردار بچے سمیت بہت سے دوسرے تماشائی بچے بھی ان چارپائیوں اور مونڈھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردار تحکمانہ لہجے میں کہتا ہے "کھیل شروع کیا جائے"

سب سے پہلے وہ تین گولے نکال کر زمین پر رکھتا ہے پھر انہیں تین پیالوں سے ڈھانپ دیتا ہے۔ کچھ پڑھ کر پھونک مارتا اور باری باری پیالے اٹھا کر دکھاتا ہے۔ گولے غائب ہو چکے ہیں۔

وہ تماشائیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا ہے مگر وہ تالیاں نہیں بجاتے، داد نہیں دیتے۔ چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وہ پیالوں کو اوندھا کرکے باری باری اوپر اٹھاتا ہے۔ اب ہر پیالے کے نیچے ایک گولہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ دوبارہ سردار اور دوسرے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ اب بھی خاموش رہتے ہیں۔

پھر وہ بہت سے روئی کے گالے تھیلے سے نکال کر چبانے لگتا ہے۔ چباتا اور نگلتا ہے پھر منہ سے کاغذ کے گولے نکالتا ہے۔ گولوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے وہ داد طلب نظروں سے تماشائیوں کی طرف دیکھتا ہے مگر وہ نہایت بے دلی سے دیکھتے رہتے ہیں۔

پھر وہ جیب سے ایک روپے کا سکہ نکالتا اور ایک کے دو اور دو کے چار بناتا ہے اور کہتا ہے "مہربان۔ قدردان۔ میں جادوگر نہیں ہوں۔

یہ محض ہاتھ کی صفائی ہے جادوگر ہوتا تو یہاں نہ ہوتا۔ گھر میں بیٹھا سکے بنا رہا ہوتا۔"

"ہمیں معلوم ہے تم کھیل دکھاؤ" سردار اسے ٹوکتا ہے۔

"تو پھر تم خود ہی میدان میں آجاؤ" جمورا کہتا ہے۔

"مداری ــــ یہ لڑکا" سردار غضبناک ہو جاتا ہے۔

"میں معافی چاہتا ہوں سردار" بڑا کہتا ہے اور اشارے سے جمورے کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے اور باری باری بہت سے کھیل دکھاتا ہے خالی گلاس پانی سے بھر جاتا ہے اور بھرا ہوا گلاس اوندھا کرنے سے پانی نہیں گرتا۔

مٹھی میں بند کر کے نکالنے سے رومال کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔

جلتا ہوا سگریٹ نگل کر کانوں کی طرف سے دھواں نکالتا ہے۔

کوڈیوں والے سے ڈسواتا اور اُسے گردن میں ڈال لیتا ہے۔

منہ کے راستے پیٹ میں خنجر اتار کر نکال لیتا ہے۔

مگر سردار سمیت کوئی تماشائی تالی نہیں بجاتا، داد نہیں دیتا۔ وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ پھر اعلان کرتا ہے "اب آخر میں میں جمورے کے گلے پر چھری چلاؤں گا اور اسے ذبح کر کے دکھاؤں گا۔ کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے ــــ ورنہ میرے بیٹے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

سردار سمیت سارے تماشائی زور زور سے تالیاں پیٹتے ہیں۔ وہ بے حد حیران ہوتا ہے۔ عام طور پر جب تماشے کے آخر میں وہ اس کھیل کا اعلان کیا کرتا ہے تو بہت سے تماشائی اس کھیل کو ناپسند کرتے اور اسے منع کر دیتے ہیں مگر پتہ نہیں یہ کیسے سفاک تماشائی ہیں کہ چھری چلانے کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ہیں۔

وہ جمورے کو زمین پر لٹاتا ہے اس کے اوپر اسی طرح چادر ڈالتا ہے جیسے ہمیشہ ڈالا کرتا ہے۔ پھر تھیلے میں سے چھری نکال کر اس کی دھار پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے "صاحبان۔ قدردان ــــ کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا ــــ نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہو سکتا ہے ــــ یہ سب کچھ ایک کھیل ہے ــــ نظر کا دھوکا ــــ اس پاپی پیٹ کی خاطر۔"

"باتوں میں وقت ضائع نہ کرو" سردار کہتا ہے۔

کوئی شخص اپنی جگہ نہ چھوڑے ــــ بڑا اعلان کرتا ہے۔

"چھری چلاؤ" ــــ ایک طرف سے آواز آئی۔

"چھری چلاؤ ــــ چھری چلاؤ" تماشائی شور مچاتے ہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا اور جمورے کے قریب آکر چھری چلاتا ہے۔

تماشائی زور زور سے تالیاں اور سیٹیاں بجاتے، سکے پھینکتے اور نعرے لگاتے ہیں اور جمورے کے زندہ ہونے کا کھیل دیکھے بغیر کھسکنے لگتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارا پڑ خالی ہو جاتا ہے۔

وہ جمورے کو آواز دیتا ہے "اٹھو پتر ــــ پیسے جمع کر۔"

مگر جمورا کوئی جواب نہیں دیتا۔

وہ گھبرا کر چادر ہٹاتا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ جمورا خون میں لت پت ہے اور اس کی گردن سچ مچ کٹی پڑی ہے۔

اس کی چیخیں ساری بستی میں گونجنے لگتی ہیں۔

پنجرے میں پالی ہوئی بات

مظہر الاسلام

وہ اب بوڑھا ہوگیا ہے اور اپنی بندوق بیچنا چاہتا ہے۔ بندوق کے لئے وہ زیادہ پیسوں کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنی بندوق کسی ایسے شخص کے ہاتھ بیچے جو اس کی بندوق سے اتنی محبت کرے، جتنی وہ خود کرتا ہے۔ پچھلی جمعرات کو جب وہ پورے اسی سال کا ہوگیا تو اس کی بے چینی میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کی ملکیت میں سب سے قیمتی چیز اس کی بندوق ہے جسے وہ جتنی جلدی ہو سکے بیچ دینا چاہتا ہے۔ بندوق کی فکر اسے یوں چاٹتی رہتی ہے کہ اس کی کیفیت اس بوڑھے جیسی ہوجاتی ہے۔ جس کی بیٹی بن بیاہی بیٹھی ہو اور کوئی مناسب رشتہ نہ مل رہا ہو۔ وہ اپنی بندوق مفت میں نہیں دینا چاہتا مگر بھاری قیمت کا مطالبہ بھی نہیں کرتا۔ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہے جو اس کی بندوق سے محبت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت بھی کر سکے۔ کتنے ہی لوگ بوڑھے کے پاس آئے ہیں۔ لیکن بندوق کا سودا نہیں ہوا اس لئے کہ بوڑھے کو اپنی بندوق کے نئے مالک کے طور پر کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ وہ ہر کسی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا ہے۔

اس دن جو شخص بندوق خریدنے کیلئے آیا اس کی عمر کوئی پچاس کے لگ بھگ تھی۔ بوڑھے نے اس کے ہاتھ اپنی بندوق بیچنے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ اس کے خیال میں جو شخص پچاس برس کا ہو اس کی عمر زیادہ دیر تک اس کی بندوق کا ساتھ نہ دے سکے گی اور بندوق لمبی عمر والا شخص مانگتی ہے۔

پھر ایک خوبصورت، لمبا تڑنگا اور مضبوط جسم کا نوجوان بندوق خریدنے کے لئے آیا تو بوڑھے نے اس سے پوچھا۔ "تم بندوق کیوں خریدنا چاہتے ہو؟"

"حفاظت کے لئے" نوجوان نے بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کس کی حفاظت؟ اپنی اپنے مال کی یا ــــ؟" بوڑھا۔ "یا" تک آ کر رک گیا جیسے اس سے آگے کی بات نوجوان کی سمجھ میں آگئی ہو۔

"اپنی حفاظت اپنے مال کی اور ہر اس چیز کی ــــ" نوجوان بھی جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گیا جیسے آگے کی بات بوڑھے کی سمجھ میں آگئی ہو۔

"لیکن بندوق کی حفاظت کون کرے گا؟" بوڑھے نے کہا اور پھر اس کی بات لمبی ہو گئی۔ "سنو بیٹا۔ بندوق صرف اس کی حفاظت کرتی ہے جو اس کی حفاظت کرنا جانتا ہو۔ اسلحہ ہر کسی کے ہاتھ میں کارآمد نہیں ہوتا۔ بندوق ایک طاقت ہے اور اس کے لئے ایک بے پناہ طاقتور شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔" پھر اس نے وہی بات کہی جو پہلے بھی سب سے کر چکا تھا۔ "دیکھو بیٹا، یہ بندوق میں نے بیس سال کی عمر میں صرف شکار کھیلنے کے لئے خریدی تھی، لیکن پھر بعد میں مجھے اپنے لائسنس پر سیلف پروٹیکشن کا اندراج بھی کروانا پڑا۔ پچھلے ساٹھ برسوں میں یہ بندوق میری ساتھی اور غمگسار رہی ہے۔ میں اس کا مزاج سمجھتا ہوں۔ تم نوجوان ضرور ہو اور مضبوط اعصاب کے مالک بھی ہو لیکن بندوق رکھنے کے لیے اس کے علاوہ بہت کچھ چاہیئے ہوتا ہے۔"

کچھ دنوں بعد ایک اور نوجوان بندوق خریدنے کی غرض سے بوڑھے کے پاس آیا تو بوڑھے نے اس سے کہا "مجھے احساس ہے کہ تمہیں بندوق رکھنے کا شوق ہے لیکن میرے بچے! صرف شوق سے خریدی ہوئی بندوق کا نشانہ کبھی ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ جو پیسے تم اس بندوق پر خرچ کرنا چاہتے ہو بہتر ہے ان سے نیا سوٹ سلوا لو۔ پہنو گے تو تمہاری خوبصورتی چمک اٹھے گی اور تمہارے قیمتی کپڑے دیکھ کر معاشرہ خود تمہاری حفاظت کرے گا۔"

پھر ایک ایسا شخص بندوق خریدنے بوڑھے کے پاس آیا جس کے پاس پہلے بھی ایک بندوق تھی۔ وہ مانا ہوا شکاری تھا اور اس کا نشانہ بھی اچھا تھا۔ لیکن بوڑھے نے اسے یہ کہہ کر بندوق دینے سے انکار کر دیا کہ دو بندوقیں رکھنے والے کی ایک بندوق ہمیشہ اس کے دشمن کے کام آتی ہے۔ بوڑھے کی بات سن کر اس شخص نے بتایا کہ اس کی پہلی بندوق بارہ بور کی ہے۔ وہ زیادہ دور تک مار نہیں کر سکتی اور چونکہ بوڑھے کی بندوق ست ڈزی یعنی سیون ایم ایم کی ہے اور دور تک مار کرتی ہے، اس کی گولی بھی پکی ہے اس لئے اسے اس قسم کی بندوق کی سخت ضرورت ہے۔ اس کی بات سن کر بوڑھے کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا اور بندوق خریدنے کی غرض سے آیا ہوا شخص اور قریب بیٹھے لوگ بوڑھے کے چہرے کی طرف تک رہے تھے۔ بوڑھا گفتگو کے دوران میں اٹکتا اور پھر تیزی سے بات شروع کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی بار بار خالی بندوق کا ٹریگر دبا رہا ہو۔ معاً بوڑھے کی باتوں سے ابھی ابھی چلے ہوئے کارتوس جیسی مہک آنے لگی۔ وہ بندوق خریدنے کے لئے آئے ہوئے شخص سے کہہ رہا تھا ”دور تک مار کرنے والی بندوق ہر کوئی نہیں چلا سکتا۔ تم بارہ بور کی کچی گولی۔ میرا مطلب ہے کارتوس والی بندوق چلانے کے عادی ہو اس لئے شاید تمہیں یہ علم نہیں کہ دور تک مار کرنے والی بندوق دور تک مار کرنے والے ہاتھوں میں ہی اچھی لگتی ہے لیکن میں سفارشی ہاتھوں کی بات نہیں کر رہا۔ میں اُن ہاتھوں کی بات کر رہا ہوں جن کی شکل جوان اور تجربہ بوڑھا ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر بوڑھا کچھ دیر کے لئے چپ ہو گیا۔ سب نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو بالکل لوڈڈ بندوق کی طرف لگ رہا تھا۔ ناک ٹریگر کی طرح اکڑی ہوئی تھی اور آنکھیں کسی دو نالی بندوق کی طرح نشانہ باندھے بیٹھی تھیں۔ یکدم بوڑھا پھر بولا تو یوں لگا جیسے کسی نے بندوق میں گولی رکھ کر اسے سیدھا کیا ہو۔ وہ کہہ رہا تھا ”میں اپنی یہ بندوق تمہیں کیسے بیچ دوں جس کے منہ کو لہو لگا ہوا ہے۔ یہ وہ بندوق نہیں جو ظالم کے ہاتھوں میں کھیلتی ہے۔ یہ میری بندوق ہے اور اس کے دستے سے شیر کی دہاڑ بندھی ہوئی ہے۔ اس شیر کی دہاڑ نہیں جو جنگل کا بادشاہ ہے بلکہ اس شیر کی جو چھوٹے جانوروں کے ساتھ مل کر ایک ہی جگہ سے پانی پی لیتا ہے اور اُن کی حفاظت کرتا ہے۔“ بوڑھے کی باتوں سے بارود کی بو پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا ”میری بندوق کی نالی پر اس بجوم کے نعرے چپکے ہوئے ہیں جو دوسروں کی گولیوں سے تار تار ہو گیا۔ پھر تم ہی بتاؤ میں اپنی بندوق تمہارے ہاتھ کیسے بیچ سکتا ہوں؟“

اس بات کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک اور شخص بوڑھے کی بندوق خریدنے آیا۔ تو بوڑھے نے اس سے سب سے پہلا سوال کیا ”کیا تمہارے پاس لائسنس ہے؟“

اس شخص نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ”اگر بندوق کا سودا ہو گیا تو لائسنس کی بات بھی ہو جائے گی۔ آپ اپنی بندوق ــــ“

وہ شخص اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ بوڑھے نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا ”میرے پاس وہ بندوق ہے جو تم نے ویسے تو کیا خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ وہ ایک تجربہ کار بندوق ہے اور تم ــــ دیکھو سنو۔ ایک بندوق انسان کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو ایک اس کے ذہن میں نصب ہوتی ہے اور نشانہ اسی وقت ٹھیک بیٹھتا ہے جب ذہن میں نصب اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق ایک ساتھ چلے اور اگر ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق ذہن میں نصب بندوق سے پہلے چل جائے تو بزدلی کا طعنہ موصول ہوتا ہے۔ ایسے میں کوئی بھی ہتھیار بے کار اور بے سود ہے۔ مجھے لگتا ہے تم ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق ذہن میں نصب بندوق سے پہلے ہی چلا دیتے ہو۔ اس لیے تم میری بندوق کی قیمت تو ادا کر دو گے مگر اس کے حوصلے کی شتہ کو نہ نبھا سکو گے؟“

پھر کتنے ہی لوگ آئے مگر بوڑھے کی بندوق نہ خرید سکے۔ بڑے بڑے شکاریوں اور بندوق کے ماہروں نے بھی کوشش کی مگر کوئی بھی بوڑھے کے معیار پر پورا نہ اترا۔ شہر میں ہر طرف بوڑھے کی بندوق کا چرچا تھا اور بوڑھا اسے بیچنے کے لئے پہلے سے زیادہ مضطرب اور بے چین نظر آ رہا تھا۔

پھر ایک دن اطلاع ملی کہ بوڑھا مر گیا ہے۔ شہر کے کونے کونے سے لوگ اس کے جنازے میں شریک ہوئے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو بوڑھے کی زندگی میں اس کے پاس بندوق خریدنے آ چکے تھے۔ اور وہ بھی جنہوں نے صرف بوڑھے کی باتیں سن رکھی تھیں۔ کوئی بوڑھے کی بندوق پر قبضہ جمانے کی سوچ رہا تھا اور کسی کے دل اور ذہن پر افسوس کی دھند چھا رہی تھی۔

اسی شام بہت سے لوگ بوڑھے کے گھر "پھوڑی" پر بیٹھے تھے کہ بوڑھے کے ایک پرانے دوست نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "بوڑھے کی خواہش تھی کہ اس کی بندوق اس کی زندگی ہی میں محفوظ ہاتھوں میں چلی جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ زندگی نے اسے مہلت نہ دی۔ موت سے چند گھنٹے پہلے اس نے جو وصیت لکھی وہ میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں۔" پھر اس نے کاغذ کی تہیں کھولیں اور پڑھنے لگا۔

وصیّت

میں نے ورثے میں ایک بندوق اور ایک پنجرہ چھوڑا ہے۔ اگرچہ یہ پنجرہ خالی نظر آتا ہے لیکن یہ خالی نہیں بلکہ اس میں ایک پرندہ بھی ہے۔ ہر کوئی اس پنجرے کو دیکھ کر کہے گا کہ پنجرہ خالی ہے لیکن جس شخص کو اس پنجرے میں پرندہ نظر آئے پنجرہ اسے دے دیا جائے۔ میری موت کے بعد میری بندوق شہر کے ان دانشوروں کو دے دی جائے جن کی آنکھوں میں سچی گواہیاں بال کھولے بیٹھی ہیں تاکہ وہ میری یہ بندوق شہر کے ان لوگوں کو دے دیں جن کے پلو سے بندھی ہوئی بات کوئی کھول کر لے گیا ہے۔ اور اب ان کے انگ انگ سے بندوق کی طلب کی مہک آتی ہے۔

وصیت پڑھ کر بوڑھے کا دوست کاغذ تہہ کر کے بغلی جیب میں رکھتے ہوئے اٹھا اور گھر کے اندرونی دروازے پر جا کر دستک دی۔ بوڑھے کی بیوی دروازے کے پیچھے آئی تو بوڑھے کے دوست نے اپنا تعارف کروایا اور کہا "بوڑھے کی بندوق دے دیں تاکہ وصیت کے مطابق شہر کے لوگوں کو دے دی جائے۔"

بوڑھے کی بیوی حیرت زدہ لہجے میں بولی "کونسی بندوق؟ کیسی بندوق؟ اس کے پاس تو کوئی بندوق نہ تھی۔ وہ تو خود ساری زندگی بندوق خریدنے کے لئے ترستا رہا۔"

گھر

اسد محمد خاں

میں اپنی سلامتی کے خوف سے گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ میں گھر ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔

اس لئے کہ باہر میلے چیکٹ تہبندوں والے دلاوروں کے رتھ دوڑ رہے ہیں۔

اُن کے ہاتھوں میں شوخ رنگوں والے ایبونائٹ کے نیزے ہیں جو دور سے پلاسٹک کے کھلونے دکھائی پڑتے ہیں اور بظاہر بے ضرر لگتے ہیں مگر میں ان کی ضرر رسانی کا عینی شاہد ہوں۔ انھوں نے ایک نیزہ میرے بھائی کی بائیں آنکھ میں اتار دیا ہے جو اس کے کاسۂ سر کو توڑ کر سر کی پشت پر نکل آیا ہے، اور بہت بدصورت دکھائی دیتا ہے۔ سروں میں اس طرح نیزے کھب جائیں تو لوگ ٹوپیاں کس طرح اوڑھ سکتے ہیں، اور لوگ سو کس طرح سکتے ہیں۔ سو اُس دن کے بعد سے میرا بھائی ننگے سر گھومنے پر مجبور ہے۔

میں نے اُس سے کہا بھی تھا کہ باہر مت نکلنا۔ مگر نوجوانوں کو گھروں میں بند نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ اس کنبا زندگی کو چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں اور نیزوں کی زد پر آجاتے ہیں اور ننگے سر ہو جاتے ہیں۔

میں تو ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی اس لئے کہ میرا یہ گھر ایک مکمل گھر ہے۔ میں چاہوں تو اس گھر کی خودکفالت میں کئی سو برس رہ سکتا ہوں اور مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

میرا یہ گھر پہلے پہل برگد کے ایک چھتنار درخت کے سائے میں بنایا گیا ہوگا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ گھر پھیل کر پہلے برگد کے گرداگرد بنتا رہا پھر برگد سے اونچا نکل گیا اور اب برگد کی سب سے اونچی ٹہنیوں سے، جہاں دوپہروں میں ہریل اور مینائیں پناہ لیتی ہیں، میرے گھر کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ دراصل برگد کا یہ درخت مکان کے فرش میں دفن ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک زندہ چیز کو اپنی مسہریوں، چارپائیوں، تپائیوں اور سلفچیوں کے نیچے دفن کر رکھا ہے اور ہم اس پر چل پھر رہے ہیں، تہبند بدل رہے ہیں، کھانس رہے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔

میں اپنی نوعمری اور ناتجربہ کاری میں اس زندہ برگد کو پتھر سے تراشا ہوا یا پیتل میں ڈھالا ہوا برگد سمجھتا تھا اور کبھی کبھی اُنسائی دوپہروں میں جب دور سے چکی کی گُھمر گُھمر اور مرغوں کی جیسے جمائیاں لے لے کر بانگیں دینے کی آوازیں آتی تھیں اور میں انھیں سُن سُن کر اونگھنے لگتا تھا تو بڑی کاہلی کے ساتھ سوچتا تھا کہ یہ جو فرش سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے اور یہ جو کوئی ہتھیار ڈالتی ہوئی آوازیں تا آآآ، نا نا ہو ہو کہہ کر چپ ہو جاتا ہے یہ برگد کی آواز نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ برگد کی آواز ہے تو وہ برگد ایک گونجتا ہوا کھوکھلا ٹیوب ہے جو فرش کے نیچے دور تک اترا ہوا ہے۔ خوب چمچاتے ہوئے پیتل کے اس کھوکھلے تنے میں سے یہ چار ماترائیں تا آآآ، نا نا ہو ہو ایسے گزر رہی ہیں جیسے ایرکنڈیشننگ کے نمدہ لپٹے ہوئے ڈکٹس سے ٹھنڈی خوشبودار ہوا گزرتی ہو۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ ایک ٹھوس، گیلے اور زندہ برگد کی آواز بھی ہو سکتی ہے جس نے اپنی ننھی جڑیں زمین میں گاڑ رکھی ہیں اور جس نے بے شمار ہریلوں اور میناؤں کو پناہ دے رکھی ہے اور جسے میرے گھر کی تعمیرات نے ہوا اور دھوپ سے محروم کر دیا ہے۔

بہت دنوں تک مجھے یہ بھی وہم رہا کہ ہوا اور دھوپ تہبندوں کو سکھانے کے لئے فراہم کی جاتی ہے اور برگدوں اور ہریلوں اور میناؤں کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مجھے بعد دن سے یہی بتایا گیا تھا کہ میں دلاوروں میں سے ہوں اور نیزے اور تہبند میری بنیادی ضرورتیں ہیں اور ہوا اور دھوپ اور ندی ہمارے تہبند اور نیزے دھونے اور انھیں سکھانے میں کام آتی ہیں۔ اور ہمارے پاس نہ خدا ندی کی طرح سبک رفتار رتھ ہیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اور میں ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا ہوں، میں کس سے نکلوں؟ میرے گھر میں، گھر کے گرداگرد بڑی دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔ گھر کے پچھواڑے کی باڑ سے سٹے ہوئے بانسوں اور سرکنڈوں کے جھرمٹ ہیں۔ جھنڈ ہیں جن سے کچھ بچی پاترا ندی بہتی ہے، نقشہ نویسوں نے اسے کوئی نمبر دے رکھا ہے اور وہ اسے نالہ بارانی شمالاً جنوباً نمبری فلاں فلاں کہتے ہیں، اور اپنی بے خبری میں اسے بہت مسکین جانتے ہیں۔ مگر چار پانچ دن لگاتار ایک ہی رفتار سے ننھی ننھی سوئیوں جیسی پھوار پڑتی رہے تو یہ پاترا ندی اپنی بانہیں اور جانگھیں پھیلا دیتی ہے اور آس پاس کے کھیتوں کو اپنی خواہش کا نشانہ بناتی ہے۔ اور انھیں اپنی کاہل تیل چیزیں آہستہ آہستہ شہوت میں تبدیل دیتی ہے اور مجھے بڑی شرم آتی ہے جب میں اس کی بغلوں سے اور پیڑو سے جھلکتے ہوئے سرکنڈوں اور بانسوں کے گیلے جھنڈ دیکھتا ہوں یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی محرم کو جس سے کوئی جنسی رابطہ ممکن نہ ہو، برہنہ ستر دیکھ لیا ہو۔ تب میں، جو اس کا ستر، اس کا ستر پوش ہوں، میں اپنی پلکیں گرا کر اس کی ستر پوشی کرنا چاہتا ہوں ــــ اسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر ساون بھادوں میں جہاں تک نظر جا لو یہ بھاری، تینوں والی، کالی ہنی پر بنی کا پاکا بوجھ ڈالے آلس کے ساتھ کروٹ بدلتی دکھائی دیتی ہے اور بڑی غیر محفوظ لگتی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اسے کون سمیٹ سکتا ہے، کہاں تک سمیٹ سکتا ہے۔ ننھی سوئیوں جیسی بوندیں پھر کی دبیز چادر کی طرح دوسرے کنارے کے جانے پہچانے نشانوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور ندی کا پاٹ کئی میل کا دکھائی پڑتا ہے۔ گہری دھندیں ندی پار سے آوازیں کچھ اس طرح آتی ہیں جیسے یگوں کے پار سے آرہی ہوں۔ تب ایسے میں، میں ندی میں اترتا ہوں اور کندھوں تک پانی میں ڈوبا ان آوازوں میں لپٹی ہوئی ایک خاص آواز کو ڈھونڈتا ہوں جو پکار کر کہتی ہے کہ "ہے پاترا، ہے پتریا، ہے ویشیا، ہے کلنکنی" پھر یہی آواز ہچکیاں لے لے کر روتی بھی ہے۔

پتہ نہیں کون بوڑھا بدمعاش ہے جو ننھی ننھی سوئیوں کی ٹھنڈی دھند کے پاس کھڑا ہوا ندی کو برے برے نام دے رہا ہے۔ میں کسی روز اسے گدی سے پکڑ کر اس کا منہ کیچڑ میں دے دوں گا۔

ایک روز میں نے چیخ کر کہا بھی تھا کہ "بڈھے سور، بکواس بند کر!" اور مارے غصے کے پانی میں ہی کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ ایسی پریشانی کی بات تھی کہ میں ندی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر بھاگ آیا اور بہت دنوں تک پانی کے پاس نہیں گیا۔ بس گھر میں بیٹھا رہا اور برگد کی چار ماترائیں سنتا رہا کہ "تا آآآآ نا نا، ہوُ ووُ"

میں نے شاید ابھی تک نہیں بتایا کہ یہ آخری ماترا "ہو" ہووووم م م کی طرح گونجتی ہے اور اس میں کسی اچھی کمپوزیشن میں گتھے ہوئے وائیولن کے کاؤنٹر تک سنائی دیتے ہیں کبھی کبھی بین کی ایک ٹھنٹی بھی ٹائم دیتی ہے۔ اس ہُو وووم م م کے آخری نوٹس، نوٹس نہیں ہوتے، وہ جھٹپٹے کے وقت کی طرح غیر یقینی سرحدوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ شاید ایکو کی وجہ سے ہو مگر مجموعی تاثر ایکو سے زیادہ گمشدگی کا تاثر ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک دفن کیا ہوا برگد اپنی ایک ماترا میں اتنی بہت سی باتیں رکھتا ہے۔ مگر ان باتوں کا پتہ مجھے رفتہ رفتہ ہوا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ شروع میں تو میں اس زندہ برگد کو پتھر میں تراشا ہوا یا پیتل میں ڈھالا ہوا ایک ڈمب برگد سمجھتا تھا اور اپنی ندی کو نقشہ نویسوں کی طرح نالہ بارانی شمالاً جنوباً کہتا تھا اور باڑے کے ورے سے ملحق پرانی گھاس کے ڈھیر پر اکڑوں بیٹھی ہوئی، بنا بیلوں کی بیل گاڑی کو محض لکڑی اور بانسوں سے بنایا ہوا ڈیگ ڈمبر سمجھتا تھا۔ دراصل چیزیں اِدھر سے اُدھر پہنچنے کا عمل بڑی آہستگی سے پورا کرتی ہیں۔ اکثر اوقات تو ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا جب کھال کے نیچے، پلکوں کے پیچھے آنکھوں کے ڈھیلوں پر یا پسلیوں میں یا میڈولا اوبلانگیٹا کے آس پاس گرے میٹر میں یا متروک ہو جانے والی دم کی ہڈی میں دھنستی ہیں تو ان کی موجودگی کا یقین آجاتا ہے۔ اور بڑی حیرت ہوتی ہے! اب اس اکڑوں بیٹھی ہوئی بیل گاڑی ہی کو لو۔ پتہ نہیں کب سے وہاں تھی پر میں نے اس کی موجودگی کو اپنی بائیں آنکھ کے ڈھیلے پر اس دن محسوس کیا جس دن لوگوں نے آکر بتایا کہ گھر سے دور میلے چیکٹ تہبندوں والے دلاوروں نے میرے بھائی کی آنکھ میں ایبونائٹ کا شوخ رنگ نیزہ اتار دیا ہے اور وہ

اب ننگے سر گھوم رہا ہے۔ یوں کہ تیز سے کھب جائیں تو لوگ ٹوپیاں کس طرح اوڑھ سکتے ہیں۔

اور لوگ سو کس طرح سکتے ہیں۔

اور کوئی رو بھی تو نہیں سکتا کہ رونے کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے کہ تہبند پہن کر اور شطرنجیاں بچھا کر اور اگر دانوں میں عود و لوبان جلا کر رویا جاتا ہے جس کے لئے کافی اور وافر منطقی جواز کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ لوگ گدی سے پکڑ کر کیچڑ میں منہ دے دیتے ہیں۔ اس لئے ندی کے لئے نہیں رویا جا سکتا، اور گھاس کے ڈھیر پر اکڑوں بیٹھی بنا بیلوں کی بیل گاڑی کے لئے نہیں رویا جا سکتا، اور برگد کے لئے دکھنے کا کوئی جواز نہیں اور مینائیں اور ہریل وہ ڈمب پرندے ہیں جنہیں سب دھیں اور بائیں ہلاک کرتے ہیں اور خدا کی سب خوبصورت اور کمزور چیزوں کے لئے تمام تہبند کھلے ہوئے ہیں اور ڈائنامائٹ کے نیزے تلے ہوئے ہیں، اور قہر خداوندی کے برق رفتار رتھوں پر دلاوروں کے دل عقاب ہیں۔

پر میں تو رونا بھی چاہتا ہوں کہ میں اپنے خدا کا ایک سہما ہوا کبوتر ہوں اسی لئے میں نے اپنے گھر کے عین وسط میں صندل کا ایک بھاری صندوق رکھوا دیا ہے جس کے پٹ پر خوبصورت خطِ کوفی میں خدا کا اسمِ ذاتی اور اس کے تمام اسمائے حُسنیٰ کھدے ہوئے ہیں اور جب میں رتھوں کے پہیوں کی دلوں کو دو نیم کر دینے والی چراہٹیں سنتا ہوں اور ہوا کو کاٹتے ہوئے ڈائنامائٹ کی تیز سیٹیاں سنتا ہوں اور تہبندوں کی پھڑپھڑاہٹ میرے گھر اور ہاڑے کے باہر گدھوں کے پروں کی طرح تالیاں بجاتی ہوئی اترتی ہے تو میں اس صندوق میں جا بیٹھتا ہوں اور اپنے اوپر اسمائے حُسنیٰ کا پٹ ڈھک لیتا ہوں اور خدا کی تمام خوبصورت، اور کمزور چیزوں کے لئے اور پورسلین کی چھوٹی چھوٹی طشتریوں اور پیالیوں کے لئے اور تمام پیڑوں اور بہت سی کتابوں کے لئے جن کے نسخے ناپید ہیں اور فاختاؤں، میناؤں اور ہریلوں کے لئے اور رُکے ہوئے پانی پر دائرے کی ہنگ کرتی ہوئی جل کڑیوں کے لئے اور سفید نیلے اور گلابی کنول کے لئے اور گوری شنکر شرما کے لئے جو ہسپتال کی عمارت تعمیر کراتے ہوئے کھڑے کھڑے گر کر مر گیا تھا اور پیتل کے برگد کے لئے اور پاترا ندی کے لئے اور بنا بیلوں کی بیل گاڑی کے لئے اور اپنی بیٹیوں کی تمام گڑیوں کے لئے اور ایک بوسیدہ کمبل اور تیونگ کا سامان رکھنے والی مراد آبادی ڈبیا کے لئے اور تین ریڈی میڈ فراکوں کے لئے اور محمود ہاشمی کے لئے اور گہرے سرخ رنگ کی ایک کشمیری شال کے لئے اور لوہے کی ایک گھڑونچی کے لئے اور بہت سے ناتواں لوگوں کے لئے اپنے خدا سے مہلت طلب کرتا ہوں اور میرا خدا مجھے یہ مہلت دے دیتا ہے اور میں صندوق سے باہر آ جاتا ہوں اور رتھوں کی چراہٹوں اور ڈائنامائٹ کی سیٹیوں اور تہبندوں کی پھڑپھڑاہٹوں کو دم توڑتے ہوئے سنتا ہوں۔ پھر فرش سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے، اور پہلی بار ایک ملک ایک ترنگ کے ساتھ جیسے فرش کو توڑتی ہوئی چار ماترائیں اُگتی ہیں کہ "تا آآآآ" نا نا، ہو وو اور آخری ماترا ہو وو وم م م کہتی ہوئی اپنے کاؤنٹر اور اپنی پیتل والی گھنٹی کے ٹائم کے ساتھ وائبریشن کی ایک واضح سرحد بناتی ہوئی پتہ نہیں کب اپنا سفر مکمل کرتی ہے کہ شاید کبھی نہیں کرتی ـــــ لرزش کا ایک نہ ایک ریشمی دھاگا سماعت سے الجھا ہوا رہ ہی جاتا ہے کہ "سا" کے سر میں پھر ایک بار پہلی ماترا پھر دوسری، تیسری اور چوتھی ماترائیں فرش سے پھوٹتی ہیں اور پھوٹتی رہتی ہیں اور میں شرابور ہو جاتا ہوں۔

اور اب میں کسی کتیا زندگی کو چھو کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس اپنے گھر میں رہنا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

افسانہ

ضیاء بٹ

میرے افسانے کا ہیرو زندگی کے اس موڑ پر کھڑا ہے۔ جہاں وہ ایک اہم فیصلہ لیں کیا ہی چاہتا ہے۔ کیئے جانے والے فیصلے کا جواز پیدا کرنے کے لئے میں ماحول کو مزید پینٹ کرنے اور کردار نگاری میں پوری طرح منہمک ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے میری ذات ہیرو میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔

"میرے اپنے ان دیکھے زخم اور عجیب دکھ لوگوں کی نظروں سے اوجھل اور سمجھ سے باہر ہیں۔ میں ان کے اظہار میں اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہوں اور میرے گرد و پیش والوں کو میرے دل میں جھانکنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی فرصت۔ ضبط نے مجھے اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے اور میری ذات، جسے خود میری نظروں نے اپنے عزیز و اقارب سے ممیز کر رکھا ہے، بکھرنے ہی والی ہے۔ جب میں حالات اور واقعات کا تجزیہ کرتا ہوں تو اس کی صرف ایک وجہ نظر آتی ہے اور وہ ہے پرخلوص بے وقوفی جس کے تحت وسیع تر خاندانی مفاد کے پیش نظر میں نے شادی کر لینے کا دباؤ قبول کیا۔ پھر ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری بچی کی پیدائش نے مجھے خاوند کی بجائے ایک ذمہ دار باپ میں تبدیل کر دیا۔ دو بیٹیوں کی شادی کر چکا ہوں اور یہ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ کس طرح ــــ اب تیسری تلوار بن کر میرے سر پہ لٹک رہی ہے۔"

"بس افسانے ہی لکھتے رہو گے یا کوئی فکر بھی ہے؟ بچی کی شادی میں صرف ایک ماہ باقی ہے اور تیاری ابھی شروع کرنی ہے۔" میرے کمرے کے دروازہ کی طرف سے آنے والے الفاظ مجھے بری طرح ڈسٹرب کرتے ہیں۔

میری غصہ بھری نگاہیں دروازے کی طرف اٹھتی ہیں۔ مجھے اپنی بیوی نظر آتی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ وہ میرا جواب سنے بغیر وہاں سے چلی جائے گی۔ مگر وہ کھڑی رہتی ہے۔

"تیس سال گذر جانے کے باوجود تم میری مزاج کو آج تک نہیں سمجھ سکیں۔ تمہیں کئی دفعہ بتا چکا ہوں کہ مجھے کسی کام میں یاددہانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تمہارا کوئی کام آج تک رکا بھی ہے؟"

"یہ میرا کام نہیں۔ آپ کی اپنی اولاد کا ہے۔ اگر ان کی خاطر میرا دم گھٹنے لگے تو اس کا اظہار کیا گھر کے در و دیوار سے کروں؟" وہ جواب دیتی ہے۔

"اظہار کرنے یا نہ کرنے سے کبھی کوئی فرق پڑا؟ جاؤ اپنا کام کرو۔" میرا رویہ سخت ہو جاتا ہے۔

"اتنے آدم بیزار تھے تو شادی کیوں کی تھی؟" وہ پھر بولتی ہے۔

"شادی جن حالات میں ہوئی تم جانتی ہو۔"

"بچے کیوں پیدا کیئے؟"

"یہ ایک بائیولاجیکل پراسیس تھا۔" میں جواب دیتا ہوں۔

میری بیوی مجھے اس طرح گھورتے ہوئے دروازہ خالی کر دیتی ہے۔ جس طرح ایک کانی بھینس قصاب کو دیکھتی ہے۔

"بدبخت نہیں جانتی کہ تیسری بیٹی کی شادی کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر میں پیش از وقت ریٹائرمنٹ لے چکا ہوں۔ جی پی فنڈ کی رقم مجھے ایک آدھ دن میں ملنے والی ہے اور پینشن اور گریچوٹی کے کاغذات تیار ہو رہے ہیں"۔

میں بیس ہزار روپے بیوی کے حوالے کر دیتا ہوں۔ رقم تھامنے کے بعد وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوتی ہے "اگر اس دن تحمل سے جواب دیتے اور بتا دیتے تو آپ کا کیا جاتا"

"تم ہی ایک دن صبر کر لیتیں تو تمہارا کیا بگڑ جاتا؟" میں بیزار ہو کر بولتا ہوں۔

"صبر تو میں نے تیس سال سے کر رکھا ہے"

"تو کس کے باپ دادا پر احسان کر رہی ہو؟"

"ابو آپ خواہ مخواہ بات بات پر امی کو جھڑک کیوں دیتے ہیں؟" میرا بڑا بیٹا مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ چھوٹا بیٹا خاموش اور سہما بیٹھا ہے۔

"صبر اس نے کر رکھا ہے یا میں نے ۔۔۔۔ اپنے جمالیاتی ذوق کے باوجود میں نے ایک عام صورت بیوی کو قبول کئے رکھا۔ اولاد کی پرورش میں اپنی ہر خوشی اور خواہش کو قربان کر چکا ہوں۔ تیسری بچی کی خاطر ملازمت اس عہدہ سے پیش از وقت چھوڑ چکا ہوں جہاں سالہا سال کی جدوجہد کے بعد پہنچا تھا ۔۔۔ زندگی کا ہر حصہ سو میٹر دوڑ کی مانند ہے۔ برا اسٹارٹ لے کر اپنی تمام تر تگ و دو اور خواہش کے باوجود دوڑ جیتی نہیں جا سکتی۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے ایک بھی سانس اپنی مرضی کے مطابق نہیں لی۔ ہر صبح ایک نئی مصیبت کا پیغام لے کر آئی اور ہر شام ایک نیا دکھ دے گئی ۔۔۔ آج بڑے بیٹے نے جوابی شعور کی حدود کو چھو رہا ہے، پہلی گستاخی کی ہے"

اب تیسری بیٹی کو رخصت کرتے دیکھ رہا ہوں۔ بیوی زار و قطار رو رہی ہے۔ عورتیں اسے تسلی دیتے ہوئے کہتی ہیں "تم تو خوش قسمت ہو۔ تینوں بیٹیوں سے فارغ ہو گئی ہو۔ اب تمہارے بیٹے ماشاء اللہ جوان ہو رہے ہیں۔ بہوئیں آئیں گی۔ اور گھر میں نئی چہل پہل اور رونق آ جائے گی"

باری باری سب عزیز اور رشتہ دار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے ہیں۔ سارے سب عین وقت پر آئے تھے۔ کوئی جہیز میں کسی کمی کی نشاندہی کرنے اور کوئی بندوبست اور کھانے میں نقص نکالنے حسب معمول میں نے کسی سے کوئی تحفہ نہیں لیا۔ پھر بھی یہ لوگ مجھے اپنی آگ میں بھی نہیں جلنے دیتے سالہا سال سے زندگی کی صلیب پر لٹکا خود اسے اٹھائے پھر رہا ہوں بہن بھائیوں اور رشتہ داروں کو میرے غموں میں اضافہ کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ سب رشتے جھوٹے ہیں اور جسمانی، مالی اور جذباتی مفاد ہی تعلقات کی حدود متعین کرتا ہے۔ مجھے کسی اور سے کیا گلہ۔ خود میری بیوی مجھ سے بول چال چھوڑ چکی ہے۔ بڑے بیٹے سے میں خود احتیاط برتنے پر مجبور ہوں۔ ایسے معاشرے میں جہاں ہمدردی مفقود، خون سفید، عزت غیر محفوظ، اچھے برے کی تمیز ختم اور قانون دم توڑ چکا ہو، زندگی بسر کرنا برداشت سے باہر ہے"

پنشن کی یکمشت لی ہوئی چھیانوے ہزار کی رقم میں سے دس ہزار قرض ادا کرنا ہے۔ چھ ہزار اپنے پاس رکھوں گا اور بقایا اسی ہزار دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوی کی گزر اوقات کے لئے کافی ہے۔ مجھے یہاں سے ہجرت کرنا ہو گی تا کہ باقی ماندہ زندگی وہاں گزار سکوں جہاں دن رات پورے چوبیس گھٹن کے ہوں۔

ہاتھ میں بریف کیس تھامے، جس میں چھ اور اسی ہزار کی رقم علیحدہ علیحدہ رکھی ہے، گھر میں داخل ہوتا ہوں ۔۔ دونوں بیٹے خاموش بیٹھے ہیں۔ بیوی کہیں نظر نہیں آتی۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟" میں پوچھتا ہوں "ماموں کے ہاں گئی ہے اور یہ لفافہ آپ کو دینے کے لئے کہہ گئی تھی" بڑا بیٹا جواب دیتا ہے۔

میں خط پڑھتا ہوں لکھا ہے "بیٹے منظر، میں نے آپ لوگوں کی پرورش اور تربیت اپنی بساط کے مطابق کی۔ اب میں تھک چکی ہوں بلکہ ہمت ہار چکی ہوں۔ تمہارے ماموں کے پاس جا رہی ہوں جہاں میرے بوڑھے والدین کسی نرم آواز کے ترستے ہیں۔ چھوٹے بھائی کا خیال رکھنا اور کبھی کبھار دونوں مجھے ملنے آ جایا کرنا"

میں بڑے بیٹے کی طرف دیکھتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔ چھوٹا رونا شروع کر دیتا ہے۔ لاشعوری طور پر میں دونوں کو سینے سے لگا لیتا ہوں۔ پیار کرنے اور دلاسہ دینے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر دراز ہو جاتا ہوں

میرے ذہن کی سکرین پر زندگی کی فلم منعکس ہو رہی ہے۔ سامنے میز پر میرا نامکمل افسانہ اسی طرح پڑا ہے جس کا ہیرو برابر پل صراط پر سے گزر رہا ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر کھڑا ہے جہاں وہ ایک اہم فیصلہ لیا ہی چاہتا ہے۔ مگر کئے جانے والے فیصلے کا جواز پیدا کرنے کے لئے میں ماحول کو مزید جینئٹ اور کردار نگاری کو مزید نکھارنے سے قاصر ہوں۔

چارہ گروں کا معجزہ

منصور قیصر

جب تیسرے روز بھی مغربی پہاڑی کے اُدھر والے جنگل سے شیر کے دھاڑنے کی آوازیں سنائی دیں تو بستی والوں کو پہلی بار فکر لاحق ہوئی۔ وہ اپنے اپنے سوالیہ چہرے اٹھائے سنگترے کی پھانکوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ ننھے منے رنگ برنگے پرندوں والے رش رش کرتے سبز ریشمیں جنگل میں درندے کہاں سے گھس آئے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں باتوں، سوچوں اور اندیشوں کے بلبلے بن رہے تھے اور ٹوٹ رہے تھے۔ انہیں اپنی زندگیوں سے بھی زیادہ ان بھیڑوں کی فکر کھائے جا رہی تھی جو ان کی زندگیوں کا سب کچھ تھیں۔ وہی سرمایہ تھیں اور وہی اثاثہ تھیں۔

جب ان کے ہونٹوں پر خاموشی کے پتھر بھاری ہونے لگے تو اُس چوکڑی میں بیٹھا ایک نوجوان جھنجھلا کر بولا "صاحبو! کچھ تو بولو۔ ہماری زنگ آلود چپ سے شیر تو دھاڑنا بند نہیں کر دے گا۔ اگر ہم یونہی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو نہ ہماری بھیڑیں محفوظ رہیں گی اور نہ ہم۔"

پہلے تو بوڑھوں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا پھر اپنے ہونٹوں پر مصلحت کا دندانہ جما کر بڑبڑانے لگے۔ یک بولا "تمہاری طرح ہمیں بھی تشویش ہے۔ ہماری رگوں میں بھی خوف کا اندھیرا رینگنے لگا ہے مگر سب سے پہلے ہمیں جنگل میں جا کر دیکھنا ہوگا کہ شیر کس علاقے میں زیادہ گھومتا ہے۔ اور اس کی گپھا کہاں ہے؟"

اس پر فوراً ایک اور نوجوان بولا "بابا کمال کرتے ہو۔ ہم وہاں نہتے کیسے جا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں۔ ہم نے تو کبھی اپنے پاس ہتھیار نہیں رکھے؟"

"ہتھیار!" سب کے سب یک زبان ہو کر بولے مگر پھر خاموشی کے بوجھ تلے دب گئے جیسے ان کی سوچوں کی کشتی کسی تیز رفتار گرداب کی زد میں آ گئی ہو۔ ایک اور نوجوان کھڑے ہو کر کہنے لگا "واقعی اس میں کیا شک ہے کہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں اور جو ہیں وہ اتنے پرانے ہو چکے ہیں کہ اب ان سے ہم صرف کھیتوں کی نالیاں ہی ٹھیک کر سکتے ہیں۔ اب یہ تو ہمارے لئے ممکن نہیں کہ خالی ہاتھوں سے شیر کا گلا گھونٹ دیں۔"

ایک شخص جو بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا اس نوجوان سے مخاطب ہوا "کیا تم معجزوں پر یقین نہیں رکھتے؟"

"رکھتا ہوں" نوجوان نے تنک کر جواب دیا "مگر چاچا! معجزے آسمان سے نہیں برسا کرتے، ہمارے اندر سے پھوٹا کرتے ہیں۔ مگر ہم کونسی برگزیدہ بستی کے باسی ہیں کہ معجزے ہمیں بچا لیں گے؟"

اس شخص نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا "بکو مت: منہ پھٹ کہیں کا۔ تمہیں کیا خبر کہ ہم ایک برگزیدہ بستی کے لوگ ہیں۔ کبھی ہم پر من و سلویٰ بھی اُترا تھا؟"

ایک اور شخص نے دونوں کو ٹوکتے ہوئے کہا "کچھ عقل کے ناخن لو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں اگر ہم یونہی آپس میں اُلجھتے رہے تو ہم اس شیر کو ہلاک نہیں کر سکیں گے جو ہماری بھیڑوں کو کھا جائے گا؟"

ایک بوڑھا جو کافی دیر سے چپ کا روزہ رکھے ہوئے تھا پہلی بار گویا ہوا "یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیں آپس میں نہیں اُلجھنا چاہیے

آپس میں الجھنے کا نتیجہ تم نے دیکھ نہیں لیا۔ جب ہمارا قبیلہ بہت بڑا تھا۔ پھر ہم معمولی معمولی باتوں پر آپس میں لڑ پڑے۔ مرنے مارنے سے بھی گریز نہ کیا۔ جس پر ہمارے قبیلے کا ایک حصہ ہم سے روٹھ کر دوسری بستی میں جا کر آباد ہو گیا۔ آخر اس جدائی سے ہمیں کونسا ثواب ملا۔ میرا سینہ چاک کر کے تو دیکھو، اپنوں کے بچھڑنے کا ناسور ابھی تک رس رہا ہے۔"

"اب کیا مردہ دنوں کی قبریں کھودنے بیٹھ گئے ہو بابا۔" دوسرا نوجوان پھر بولا "اس وقت کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے بچاؤ کے لئے شیر کا خاتمہ کیسے کیا جائے۔"

اس پر کسی نے تجویز پیش کی کہ پہاڑی پر آگ روشن کر دی جائے۔ یوں شیر بستی کی طرف رخ ہی نہیں کرے گا۔ بعضوں کو تو یہ تجویز پسند آئی مگر ایک اور بولا "بات تو اپنی جگہ دل کو لگتی ہے مگر کیا یہ بھی سوچا ہے کہ ہمہ وقت آگ روشن رکھنے کے لئے ہم میں سے ایک نہ ایک کو پہاڑی کی چوٹی پر رہنا پڑے گا۔ کیا اس کام کے لئے ہم میں سے کوئی تیار ہے؟"

سوالیہ چہرے پھر ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ ایک نوجوان نے بولنے میں پہل کی "چاچا! میں اس کے لئے تیار ہوں مگر اندیشہ یہ ہے کہ شمال سے چلنے والی تیز ہوا کے ساتھ آگ جنگل میں پھیل گئی تو ننھے منے پرندے اور خوبصورت درخت جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو بہت بڑا انقلاب آ جائے گا۔ اور اس عذاب میں ہم بھی تنکے کی طرح بہہ جائیں گے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" سب یک زبان ہو کر بولے۔ مگر پھر سب چپ ہو گئے جیسے تمام سوالیہ چہروں نے اپنے ہونٹوں پر مصلحت کے بھاری قفل لٹکا دیئے ہوں۔ اتنے میں پہاڑی سے اُدھر جنگل میں سے شیر کے دھاڑنے کی آوازیں آنے لگیں اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ آوازیں پہاڑ پر سے پھسل کر قریب آ رہی ہوں۔ سب ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سوالیہ چہروں پر تشویش کی سیاہ لکیریں گہری ہو گئیں۔ اپنے گھروں کی جانب تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے سب ایک دوسرے سے کہنے لگے "بھیڑوں کو باڑوں میں بند کر کے کواڑوں کو کنڈیاں چڑھا دو۔ بھالے اور برچھیاں لے کر چھتوں پر چڑھ کر دیکھو کہ شیر کس طرف سے آ رہا ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے کواڑوں کی آنکھیں بند ہو گئیں اور بستی کی گلیوں میں ویرانی کا خوف رینگنے لگا۔ سورج کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی اندھیرے کے سیاہ سانپ پھنکارنے لگے۔ جس سے بھیڑیں بھی سہم گئیں۔ بند کواڑوں کے پیچھے دبکے ہوئے لوگوں نے سانس روک رکھے تھے مگر ان کے کان شیر کی دھاڑ پر لگے ہوئے تھے۔

جاں گسل رات کا ایک ایک لمحہ سسک سسک کر گزرا۔ فجر کی اذان ہوتے ہی شیر کی آواز خاموش ہو گئی جیسے یا تو وہ کہیں دور نکل گیا ہو یا اسے نیند آ گئی ہو۔ سورج کے آنکھ کھولتے ہی بستی والوں کے سوالیہ چہرے ایک بار پھر سنگترے کی پھانکوں کی طرح سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اپنی اپنی زبانوں پر تجویزوں کے صحیفے کھول کر رکھ دیئے۔ ایک نوجوان نے بے قرار ہو کر پوچھا "آخر ہمارے پاس ہتھیار کیوں نہیں کہ ہم اپنے آپ کو درندوں سے محفوظ رکھ سکیں۔"

ایک بوڑھے نے اس کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے آہ بھر کر کہا "اس لئے برخوردار کہ ہم نے ہتھیاروں سے غلط فائدے اور جائز نقصان اُٹھائے ہیں۔"

ایک اور شخص نے اس نوجوان کو سمجھاتے ہوئے کہا "عزیزم! ہم بھیڑیں پالنے والے امن پسند لوگ ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ اگر ہتھیار گھر میں ہوں اور ان کی طرف سے لاپروائی برتی جائے تو ان ہتھیاروں کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ اپنے مالک کا ہی گریبان پکڑ لیتے ہیں۔"

"تو پھر شیر کا خاتمہ کیسے کیا جائے۔" ایک اور نوجوان جھنجھلا کر بولا۔

"یہی تو ہم سوچ رہے ہیں۔" وہ شخص پھر بولا اور سوچ کے عمیق کنوئیں میں اتر گیا۔ ابھی وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ انہیں پہاڑی کے دامن سے

دھول اڑتی ہوئی نظر آئی۔ وہ سب کے سب چوکنے ہو گئے۔ پھر انہیں دھول کے پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں جسے سن کر وہ لرز گئے۔ چراگاہ میں پھرتی ہوئی بھیڑیں ایک دوسرے پر گرتی پڑتی اپنے اپنے باڑوں میں گھس گئیں۔ دھول کے پردوں میں سے نکلتے ہوئے بہت سے گھڑ سواروں کو دیکھ کر بستی والے شش و پنج میں پڑ گئے اور آنکھوں پر ہاتھوں سے چھاؤں کر کے انہیں اپنی طرف آتا دیکھنے لگے۔ پہلے انہوں نے سمجھا کہ شاید کسی دوسرے قبیلے نے ان پر حملہ کر دیا ہے مگر پھر ایک تجربہ کار آواز نے یہ کہہ کر انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا کہ

"مسافر ہیں غالباً راستہ بھول گئے ہیں!"

قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ تمام گھڑ سوار ہتھیاروں اور دیگر ساز و سامان سے لیس ہیں۔ گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے بڑے مشفقانہ لہجے میں بستی والوں کو سلام کیا اور کہا۔ "ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ اصل میں ہم شکاری ہیں اور اس وادی میں شکار کھیلنے آئے ہیں۔"

شکاریوں کا نام سن کر سوالیہ چہروں پر پھیلی ہوئی زردی میں سرخی تحلیل ہونے لگی۔ ان کے خشک حلقوم میں تشنگی کا شہد ٹپکنے لگا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر گھوڑوں کو تھپتھپایا اور گھڑ سواروں کو خوش آمدید کہا۔ اس پر پکی عمر کے اس شخص نے جو بار بار آسمان کی طرف دیکھتا تھا اپنے نوجوان بھتیجے کے کان میں کہا "کیا تم اب بھی معجزوں پہ یقین نہیں رکھتے!"

اس نے پھر اپنا جواب دہرایا۔ رکھتا ہوں! مگر چاچا معجزے آسمان سے نہیں برسا کرتے ہمارے اندر سے پھوٹا کرتے ہیں!"

بستی والوں کے مشورے سے شکاریوں نے بستی سے باہر سب سے اچھی چراگاہ میں اپنے خیمے نصب کر دیئے اور قریب گھوڑوں کو باندھ دیا۔ انہیں دیکھ کر بستی کے بزرگ لوگ اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے شکاریوں کے اعزاز میں ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا جس کے بعد محفل رقص و موسیقی بھی سجی کچھ بستی والے ان کے گھوڑوں کے لئے چارہ بھی کاٹ لائے۔ بعد میں جب آپس میں باتیں شروع ہوئیں تو شیر کا ذکر بھی آیا اور بستی والوں نے اپنے اندیشوں کا بھی اظہار کیا۔ شکاری چونکہ مہمان نوازی سے بے حد خوش ہوئے تھے لہٰذا انہوں نے بستی والوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا "تم آج کے بعد شیر کے معاملے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ ہم تو خود اسی شیر کے شکار کیلئے آئے ہیں۔ جب تک ہم اس شیر کا خاتمہ نہیں کر لیتے ہم یہاں سے نہیں جائیں گے!"

ایک شکاری بولا۔ "ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ یہ شیر انتہائی غیر معمولی نسل کا ہے۔ بہت ہی چوکنا رہتا ہے۔ سامنے سے آ کر حملہ نہیں کرتا۔ اگر کہیں گھبر جائے تو جھاڑیوں میں یوں چھپ جاتا ہے کہ قریب سے گزرنے والے کو گمان تک نہیں ہوتا!"

چار روز بعد وہ پہلی رات تھی جو بستی والوں نے سکون اور بے فکری کے بستر پر گزاری۔ اور تو اور بھیڑیں بھی باڑوں میں سانس روکے بے سدھ پڑی رہیں۔ دوسرے روز بستی والے دھوپ چڑھے تک سوئے رہے اور نہ معلوم کب تک سوئے رہتے کہ شکاریوں نے خود ان کے کواڑوں پہ دستک دے کر انہیں بتایا کہ وہ شیر کی تلاش میں پہاڑی کے اُس پار جا رہے ہیں۔ تمام بستی والوں کی آنکھوں میں تشکر کے سورج چمکنے لگے۔ بعضوں نے فرطِ مسرت سے آگے بڑھ کر ان کے گھوڑوں کے منہ چوم لئے۔ بعضوں نے ان سے کہا کہ وہ فکر نہ کریں۔ وہ خود ان کے خیموں کی حفاظت کریں گے۔ اس پر ایک شکاری نے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔

"ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے لئے دوپہر کا کھانا تیار رکھیں!"

شکاریوں کی روانگی کے بعد بستی والوں نے اپنے اپنے گھروں سے خورد و نوش کا سامان جمع کیا۔ بہت سی مرغیاں ذبح کیں اور کھانا تیار کر کے مہمانوں کے لئے چشم براہ ہو گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے تمام مہمان بار بار ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے "ہم شیر کے ممکنہ اڈوں پر نشان لگا آئے ہیں۔ کھانا کھا کر ہم پھر اس کی تلاش میں نکلیں گے!"

رات کو بستی والوں نے پھر ایک بے تکلف ضیافت کا اہتمام کیا جس کے لئے کچھ بھیڑیں بھی ذبح کیں۔ کھانے کے بعد وہ رات

گئے تک اپنے مہمانوں کے ساتھ اپنے بچھڑے ہوئے قبیلے کی باتیں کرتے رہے اور شیر کے بارے میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے رہے تاہم شکاریوں نے ان کی جھولیوں کو یقین دہانی کے پھولوں سے بھر کر رخصت کیا۔ اس رات بھی شیر بہت دھاڑا مگر بستی والوں نے کوئی کان نہ دھرے کہ انہیں اس امر کا یقین تھا کہ دہاڑ سن کر شکاریوں نے اپنے ہتھیاروں کے رُخ پہاڑی کی طرف کر لئے ہوں گے۔

شکاری ہر روز شیر کی تلاش میں پہاڑی کی ورلی جانب جاتے اور خالی ہاتھ لوٹتے۔ انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر بستی والوں کے چہروں پر مایوسی کی گرد جم جاتی جسے وہ شکاری اُمید کے پلّو سے پونچھ ڈالتے۔ بستی والوں نے اپنے محسنوں کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی وہ صبح شام ان کی ضیافت کے لئے بھیڑیں ذبح کرتے، ان کے گھوڑوں کے لئے چارہ کاٹتے، دیگر چھوٹی موٹی مطلوبہ چیزیں فراہم کرتے اور اس گھڑی کا انتظار کرتے جب وہ اپنے سامنے پڑی گٹھڑی بنی شیر کی لاش کو چھو سکیں گے۔

اس انتظار میں انہیں نئی فصل کی بوائی، جوان بچوں کی شادی اور بھیڑوں کی نسل کشی کا بھی ہوش نہ رہا۔ وہ سارا دن یا تو شکاریوں کی ضیافت کا اہتمام کرتے یا پھر پہاڑی کے دامن سے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی ہوئی دھول کو دیکھتے رہتے مگر شیر کے دھاڑنے میں کوئی فرق نہ آیا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا جیسے اس کی خونخوار آوازیں پہاڑی کو پھلانگ کر بستی کی گلیوں میں بکھر گئی ہیں۔ کبھی کبھی وہ مایوس بھی ہو جاتے مگر ہر وقت آسمان کی طرف دیکھنے والا بڑی عمر کا شخص انہیں تسلی دے کر کہتا "فکر مت کرو۔ معجزہ ضرور ہوگا!"

آخر ایک روز جب بستی والے ضیافت کا اہتمام مکمل کرنے کے بعد شکاریوں کی آمد اور ان سے کسی خوشخبری سننے کے منتظر بیٹھے تھے کہ معجزے کے انتظار کرنے والے بڑی عمر کے شخص کا بھتیجا سیاہ بوجھل بادل کی طرح پھٹ پڑا اور شیر کی طرح بپھر کر بولا "ہمیں کچھ اپنی بھی ہوش کرنی چاہیئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم شیر کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں"

تمام سوالیہ چہروں پر ناگواری کی گہری شکنیں اُبھر آئیں۔ ایک بوڑھا بولا "کیا بکتے ہو؟"

"ٹھیک بکتا ہوں" نوجوان کی نیلی رگیں پھول کر سرخ ہو گئیں "آخر ہم خوامخواہ بے وقوفی کی دلدل میں کیوں دھنستے جا رہے ہیں کیا ہم میں سے کسی کو بشارت ہوئی ہے کہ اجنبی لوگ ہمیں شیر کے حملے سے بچا لیں گے؟ آپ یقین مانیں جنہیں ہم اپنا دوست سمجھ رہے ہیں حقیقت میں وہ ہمارے دشمن ہیں"

"بکواس" ایک اور بوڑھا بولا "جن کے منہ سے ابھی دودھ کی بو نہیں گئی وہ ہمیں دانش سکھانے آئے ہیں۔ ہم نے زندگی کے تپتے ہوئے صحراؤں سے تجربات کے سنہری ذرات چنے ہیں۔ ہمارے بالوں کو وقت کے کھردرے ہاتھوں نے سفید کیا ہے دھوپ نے نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے مہمان واقعی شکاری ہیں اور وہ شیر کا شکار کھیلنا خوب جانتے ہیں"

اس پر پہلا نوجوان پھر تنک کر بولا "مگر بابا! شاید آپ لوگوں کی تجربہ کار بصارتوں اور بصیرتوں کی روشنی مدھم پڑ گئی ہے۔ آپ کو یہ کیوں نظر نہیں آتا کہ جن بھیڑوں کے بچاؤ کے لئے آپ شیر کا خاتمہ چاہتے ہیں وہ بھیڑیں پہلے ہی دسترخوانوں کی زینت بن چکی ہیں۔ اب خالی باڑوں میں صرف شیر کی صدائے بازگشت ہی سنائی دیتی ہے"

نوجوان کی یہ تیکھی بات سب پر بجلی بن کر گری۔ ان کی زبانیں تالوؤں سے چپک گئیں اور وہ ندامت کے کیچڑ میں گڑ گئے۔ ان کی موچھوں کے پچونوں پر احساس کی نیم گرم چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ وہ اندر ہی اندر سے اس بات کا اعتراف کرنے لگے کہ ان کے کان اپنی بھیڑوں کی معصوم آوازیں سننے کے لئے ترس گئے ہیں۔ ان کی چراگاہیں ویران ہو گئی ہیں اور ان کے کھیتوں میں بنجر پن اگ آیا ہے۔ مگر وہ ایک دوسرے کے سامنے حقیقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے۔ آخر ایک بوڑھا بولا "لیکن جب تک شیر ہلاک نہیں ہو جاتا شکاری بھی تو ہماری بستی میں سے نہیں جائیں گے۔" آخر جانبین نے ایک دوسرے

کو قول دے رکھا ہے۔"

"تو کیا آپ اپنے قول کو نبھانے کے لئے مہمانوں کے دسترخوانوں کو ہمارے جسموں سے سجائیں گے؟ اب تو ہمارے پاس اپنے لئے بھی اناج نہیں رہا" ایک اور نوجوان اُٹھ کر بولا۔

"تو تم چاہتے کیا ہو؟" ایک اور تجربہ کار آدمی نے استفسار کیا۔

"اپنا کھویا ہوا سکون، شیر کی دہاڑ کے دوش پر بیٹھ کر آنے والی نیند" نوجوان نے جواب دیا۔

"یہ پھر دے نوجوان بوکھلے گئے ہیں" ایک بوڑھے نے بستی والوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو آؤ اپنے اپنے گھروں کو چلیں ان پتھروں سے خوشبو کی کشید عبث ہے۔"

سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے لیکن ایک نوجوان وہاں کھڑا رہا۔ ابھی شکاری واپس نہیں آئے تھے۔ وہ ایک خیمے میں گھسا۔ وہاں مٹی کے تیل کا ایک لیمپ پڑا تھا۔ اس نے وہ لیمپ اُٹھا کر سارا تیل خیموں پر چھڑک دیا اور پھر آگ دکھا دی۔ اتنے میں گھڑ سوار نمودار ہوئے مگر ان کے گھوڑے آگ کو دیکھ کر بدکنے لگے۔ یہ غیر متوقع منظر دیکھ کر خود وہ شکاری بھی حواس باختہ ہو گئے۔ وہ نوجوان اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا بلکہ اپنی آنکھوں سے نفرت کا زہر اگلنے لگا۔ ایک شکاری کی اس پر نظر پڑی

تو وہ چیخ کر بولا "یہ سب کیا ہے؟ بستی والے کہاں ہیں؟ تم یہ آگ کیوں نہیں بجھاتے ہو؟ کھڑے تماشہ کیوں دیکھ رہے ہو؟"

نوجوان نے بڑی استقامت سے جواب دیا "جس شیر کی تلاش تم کر رہے تھے وہ پہاڑی سے اتر کر ان خیموں میں گھس آیا تھا۔ میں نے اسے بھسم کرنے کے لئے آگ لگا دی ہے۔"

"بکواس بند کرو" ایک شکاری بدکتے ہوئے گھوڑے پر گنبد کی طرح اچھلا اور پھر اُس کے منہ سے اچانک نکل گیا "کوئی شیر نہیں ہے۔ تمہیں کس نے کہا ہے کہ پہاڑی کے اُدھر شیر ہے۔ کم بخت نے ہمارا کتنا قیمتی سامان جلا دیا۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ تم آج تک ہمیں دھوکا دیتے رہے ہو۔ تم اجنبی لوگ ہمارے ہمدرد کیسے ہو سکتے ہو" اس کی یہ بات سن کر تمام شکاری گھوڑوں سمیت اس کی طرف بڑھے۔

لیکن نوجوان نے جھٹ ایک جلتے ہوئے خیمے میں سے بانس نکال کر انہیں للکارا اور خبردار کیا کہ "اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو اس بستی کو فوراً چھوڑ دو، وہ سارے بستی والے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ادھر آ رہے ہیں۔"

ایک نامعلوم خوف نے گھوڑوں کی باگیں پیچھے کھینچ لیں۔ خیموں میں سے شعلوں کی زبانیں لپکتی دیکھ بستی والے بھی اُدھر دوڑے۔ انہیں دیکھ کر شکاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ انہوں نے فائرنگ بھی کی لیکن کوئی نشانہ ٹھکانے پر نہ بیٹھا۔ بستی والوں کے پہنچنے سے پہلے ہی شکاریوں کو اپنی حواس باختگی میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان کے ہتھیار کانچ کے بن گئے ہوں، گھوڑے سمٹ کر نقطوں میں تبدیل ہو گئے ہوں، وہ خود اپنے آپ میں تحلیل ہو گئے ہوں اور اس نوجوان کی آنکھوں سے بھسم کر دینے والی شعاعیں پھوٹ رہی ہوں۔

جب بستی والے قریب پہنچے تو شکاری وہاں سے جا چکے تھے۔ ایک بوڑھے نے ہانپتے ہوئے پوچھا "کیا شیر ہلاک ہو گیا؟" نوجوان نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر ہمہ وقت آسمان کی طرف دیکھنے والے پکی عمر کے شخص نے کہا "کیا تم اب بھی معجزوں پر یقین نہیں رکھتے؟"

"نوجوان بولا" رکھتا ہوں! مگر معجزے آسمان سے نہیں برستے، اندر سے پھوٹتے ہیں۔" پھر وہ سب کے سب دھول کے بادل میں جلتے ہوئے خیموں کو دیکھنے لگے۔ اس کے بعد پہاڑی کے اس طرف واقع سرسبز ریشمیں جنگل سے پھر کسی شیر کی آواز سنائی نہ دی۔ بستی کے بوڑھے لوگ اُسے آج تک شکاریوں کا معجزہ ہی سمجھتے ہیں۔

تیس پارے

مسرت لغاری

و نے جب بات شروع کی تو ب ج د بھی سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ کسی کو یاد نہ رہا کہ رات کے بارہ بج رہے ہیں اور انہیں گھروں کو واپس جانا ہے اور یہ کہ وہ سب یوں ایک جگہ بیٹھ کر ایک دم سے دنیا کا کوئی مسئلہ آسانی سے حل نہ کر سکیں گے۔

و کہنے لگا "دیکھو دوستو کل میرے دفتر میں میرا ایک نیا Boss آیا ہے، یعنی ایک دیوتا پرانا ہو گیا ہے تو دوسرا آ گیا ہے۔ لیکن میرا پرابلم تم جانتے ہو کہ میں دیوتاؤں کو نہ ماننے کے سلسلے میں خاصا بولڈ واقع ہوا ہوں۔ مجھے اگر اپنا کوئی نامعلوم اندرونی خوف مجبور نہ کرے تو شاید میں ـــــ خیر چھوڑو۔ مجھے بتاؤ اس دفتر میں اب میرا کیا بنے گا؟"

"بھئی تم تو بالکل ہی کافر ہو گئے ہو اور کافر ہونا کسی مسئلے یا پریشانی کا حل نہیں ہے۔" د نے جھنجلا کر اسے نرم سی بے معنی گالی دی۔

"کم از کم اپنی ذات کے ساتھ ایمانداری تو ہے اور میرے لئے یہ سکون بھی بہت ہے۔" و نے جوش سے کہا۔

"کفر کی کھڈ بد کے ساتھ دل کس طرح پُرسکون ہو سکتا ہے؟ یہ تم ہی جانتے ہو ـــــ" ج زور زور سے بولنے لگا۔

"ہاں میں بتاتا ہوں ـــــ" و نے بڑے اعتماد کے ساتھ سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

اَب ب سے نہ رہا گیا۔ وہ چیخ پڑا ـــــ "کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ساری ذمہ داری قدرت پر نہ ڈال دیا کرو۔ کچھ ذمہ داری کچھ جرم تمہارا بھی ہوگا۔ زندگی کی ناکامیوں میں، ذلتوں میں، دکھوں میں، ہم سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کیلئے مسئلے بناتے ہیں۔ پریشانیاں تخلیق کرتے ہیں اور پھر قدرت سے گلہ کرتے ہیں۔ آخر خوفِ خدا بھی کوئی چیز ہے۔ خوف کرو خوف ـــ"

"لو اور سنو ـــــ خوف کروں؟ وہی تو تمہیں بتانے لگا ہوں کہ پہلے میری پوری بکواس سن لو۔ پھر لوچھنا۔ پچی بات تو یہ ہے کہ میں گھر میں، دفتر میں، بازار میں، جذبوں میں، عبادت میں، ہر عمل میں بےخوف ہوتا ہوں۔ اب تم چار آدمیوں میں بیٹھ کر زبانی کلامی خوف اور ڈر اور وہم ظاہر کروں، یہ نہ مجھ سے کبھی ہوا ہے نہ ہو سکے گا۔ مذہب کے ساتھ یہ غداری میں کبھی نہیں کر سکتا اور پھر تم جانتے ہو۔ میرا مسئلہ تو ـــ!"

"چھوڑو یار، کوئی ایک مسئلہ ہے؟" ج نے مسئلے کے لفظ کو کھینچتے ہوئے کہا۔

"کوئی ایک مسئلہ ہو ـــــ ایک مصیبت ہو ـــ ایک دکھ ہو ـــــ میرے پاگل شخص! اس دنیا کے کروڑہا مسائل دراصل نوکس کے مسائل ہیں۔ جب تک انہیں ذہن سے طلاق نہیں دوگے معاملہ نہ بنے گا اور تم اندر خانے جانتے ہو کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ مرد ہو کر بھی اپنے مسائل کو تین لفظ نہیں دے سکتے۔ اس سلسلے میں ہم سب نامرد ہیں یعنی کوئی تیسری مخلوق ہیں۔ پتہ نہیں کونسی طاقت ہمیں ایسا کرنے سے روکتی ہے اور وہ طاقت کبھی ہماری ہمدرد نہیں ہو سکتی۔ کم از کم یہ طے ہے ـــ؟"

اس دوران ب بولا۔ "خدا کے لئے جگر آ امت کرو۔ کوئی آسمانی کتاب ہی دیکھ لو۔ آخر اس سلسلے میں شہ رگ والے بابا بھی کچھ کہتے ہوں گے ـــــ"

اب ر کے چیخنے کی باری آگئی۔ "سب دیکھ لیا ہے ـــــ سب پڑھ لیا ہے یار ـــــ ساری باتیں عملی زندگی میں قطعی طور پر ناقابلِ عمل ہیں ـــــ اب تک صرف ایک بات میری سمجھ میں آسکی ہے کہ یا تو وہ ہمارے ہر نیک وبد کی ذمہ داری قبول کرلے کیونکہ وہ قادرِ کل ہے۔ یا پھر بات قطعاً ہم پر ڈال دے۔ بھئی یہ فردا کے وعدے وغیرہ وغیرہ تو بہت طول طویل ہیں جن پر نہ میرا اعتبار ہے نہ ایمان ـــــ"

"میری مانو ر صاحب۔ مذہب پر اندھا دھند اعتبار کرلو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔"

"وہ کیوں؟ ـــــ یعنی ہم اپنی ذات کے ساتھ بھی بہادر نہیں ہو سکتے ـــــ؟ میرا دل کہتا ہے کہ جو لوگ زندگی کا صحیح لطف اُٹھا رہے ہیں، وہ مذہب نام کی کسی چیز سے واقف نہیں ہیں اور پھر بھی خوش ہیں۔ موت کے بعد کی تو بعد میں دیکھی جائے گی ـــــ"

"چھوڑو یار تم تو بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہو گئے ہو۔ مذہب کو بھی غلط کہنے لگ گئے ہو۔"

ب ج د ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں تو سچی سچی باتیں کروں گا۔ تم لوگ سننے کی بھی ہمت نہیں رکھتے ہو۔ بزدل اور غیر ایماندار۔" ر نے تینوں کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صاف بات ہے، بھلا آج کی اتنی مصروف زندگی میں شدید عبادت کا وقت کس کے پاس ہے۔ میں تو کہتا ہوں جو ایسا کرتے ہیں وہ یقیناً زندگی کا کوئی دوسرا اہم اصول نظر انداز کرتے ہوں گے۔ کسی مشکل نیکی سے پیچھا چھڑاتے ہوں گے۔ دوسری کئی اچھی اقدار کو چھوڑتے ہوں گے۔ بخدا میرا بس چلے تو ساری دنیا کے دل و دماغ اس ڈھب پر ڈھال دوں کہ لوگ کھل کر اور بے خوف ہو کر نیکیاں اور برائیاں کر سکیں۔ تم نہیں جانتے گناہ کا اپنا ایک سکون اور حسن اور لذت ہوتی ہے۔"

"لیکن بے خوف نیکیوں سے تمہاری مراد کیا ہے ـــــ؟" ب نے تقریباً جھگڑ کر پوچھا۔

ر پھر بلا رُکے بولنے لگا۔ "نیکی میں نڈر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ساتھ عوض معاوضے کی بات ختم کر کے یہ عمل کیا جائے کیونکہ جنت کی اُمید پر نیکی کرنا بجائے خود ایک گناہ ہے بلکہ اس نظریے سے دیکھا جائے تو خدا کی نظر میں ساری دنیا گناہ گار ہے ـــــ میں چاہتا ہوں میرا یہ انقلابی نظریہ، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے بلکہ آخری سرے تک جانا چاہیئے۔ جیسے سمندر میں ایک لہر یہاں سے اٹھتی ہے تو وہاں تک کروٹ بدلتی جاتی ہے ـــــ ہماری ذاتی سوچیں خود ہماری قائد ہیں۔ ہمیں گائیڈ کرتی ہیں اور ہم سے اچھا بُرا عمل سرزد کراتی ہیں ورنہ کسی کے کہے لکھے پر کسی کو اعتبار ہوتا تو کیا ہماری رہنمائی کے لئے آسمانی کتابیں کافی نہ تھیں؟ ساری دنیا سنور جاتی لیکن تم دیکھ رہے ہو گناہ تو اب بھی ہوتے ہیں۔ جنگیں اب بھی لگتی ہیں۔ حادثے اب بھی رونما ہوتے ہیں بلکہ آج کی دنیا زیادہ وحشی اور اجڈ ہے بہ نسبت اس وحشی دنیا کے جب کتابیں نازل کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پتھر کے دور کا انسان اپنی فطرت کے اندر شاید زیادہ مہذب اور شریف تھا۔ وہ جانور مارتا تھا اور کھاتا تھا۔ آج کا انسان، انسان کو مارتا ہے اور اس کی نسلوں کو کھا گیا ہے ـــــ انسان کو توپوں سے لڑایا جاتا ہے۔ گولہ بارود پر اسے بھونا جاتا ہے ـــــ کل کا وحشی انسان جانوروں کو اور پرندوں کو سلاخوں میں پروتا تھا۔ آج کا مہذب انسان معصوم بچوں کو اور عورتوں کو نیزوں میں پروتا ہے ـــــ یوں سمجھو دوست صاحبان: ہم قدرت کی ایک غلطی کی سزا بھگت رہے ہیں ـــــ یہ دنیا ایک بہت بڑی مسلسل غلطی ہے۔ اس نے کسی کو اتنا دیا کہ وہ چاہے تو جلا دے یا پھینک دے اور کسی کو کتوں کی طرح خوراک کی گندی اروڑیوں پر چرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے ـــ جب لوگ اس تضاد پر چیختے ہیں، بغاوت کرتے ہیں تو بتایا جاتا ہے کہ سب برابر ہیں۔ نعمتیں کلفتیں دنیا میں آدھوں آدھ ہیں۔ ساتھ ہی کہا جاتا ہے کہ امیرو رحم کرو، زکوٰۃ دو، اپنی دولت کو تقسیم کرو گویا قدرت نے

اپنے کام کی ذمہ داری انسانوں پر ڈال دی۔ اب انسان بے چارہ اگر یہ ذمہ داری نبھانا بھی چاہے تو درمیان میں تقدیر کی پخ ہے۔ میں کہتا ہوں ساری دنیا کی اونچی عمارتوں پر رولر پھروا دیئے جائیں —— ہر جگہ خیمے لگے ہوں —— ہر جگہ سکون ہو۔ تسکین ہو۔ چاروں طرف بے ریا قہقہے ہوں —— دو دن کی اس بے یقین اور بے وفا زندگی میں سب خوش ہوں اور اپنے انجام کو پہنچیں۔ ایڑیاں نہ رگڑیں —— کسک کسک کر نہ مریں —— موت جو ہمارا ایک یقینی انجام اور حتمی دکھ ہے اُسے یوں بھلایا اور بہلایا جا سکتا ہے کہ غموں کی جڑ مار دی جائے۔ یہ ہماری زندگی اور موت کے درمیان عارضی سمجھوتے اور تعاون کی ایک صورت ہو گی —— ہمیں سکون ملے یا نہ ملے، ہم خود سکون کی تخلیق کر ڈالیں اور بس" وہ تھک کر چپ ہو گیا۔ ب ج د نے بھی اُٹھ جانے میں عافیت سمجھی اور یوں یہ مختصر سا بے سکون قافلہ پھر زندگی کی راہ پر بکھر گیا ——

وہ ساری راہ بڑبڑاتا گیا۔ وہ خود کلامی کے اس مقام پر آ گیا جہاں سے دیوانگی کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ مارے جوش کے میں دو کام ایک ساتھ نہیں کر سکتا۔ احکام اور اپنی ذات کے ساتھ ایمانداری کی دو دو ذمہ داریاں مجھ سے نہیں نبا ہی جا سکتیں —— میرے دل میں خوفِ خدا ہوتا تو میں رضیہ کو یوں تباہ نہ کر ڈالتا —— وہ جو پچھلے پندرہ سال سے میرے نام کے سہارے جی رہی ہے —— مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ پندرہ سال کی تھی تو مجھے اچھی لگی تھی۔ بے پناہ پیاری لگی تھی۔ تب سے میں نے اس کے ساتھ میٹھے میٹھے وعدے کرنا شروع کئے —— اس کے ہر لمحے پر میں نے پہرہ دیا۔ وہ تصور کی اور حقیقت کی دونوں دنیاؤں میں میری تھی۔ پھر ایک وقت وہ آیا جب میں نے سوچا میری سوچوں میں جدت آنی چاہیئے۔ عشق میں کوئی نیا پن ہونا چاہیئے۔ رضیہ میری ہے اور میری رہے گی۔ یہ وفا کی پتلی میری کسی دھاندلی کو محسوس نہیں کرے گی۔ یوں بھی محبوباؤں کی وفاؤں اور خوبصورتیوں کا استحصال ہمارا حق بنتا ہے —— یہ سوچ سوچ کر میں اس سے ہٹتا گیا۔ وہ رو رو کر رکا ہوا چھالا بنتی گئی۔ اس کے پیپھڑے اور ذہن متاثر ہوتے گئے۔ لیکن میں رحم کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ آوارہ دل و دماغ کو وفاؤں میں سکون نہیں ملتا۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ پاکیزہ ہے، معصوم ہے اور اس کی زندگی کے یہ تیس سال میرے لئے تیس سپپارے ہیں پر دل کا کیا کروں کہ کمینہ ہے اور بے حیا ہے۔ میں اب تک عبادت بھی کرتا رہا ہوں۔ نمازیں پڑھتا رہا ہوں اور ساتھ ساتھ کمینگیاں بھی کرتا رہا ہوں۔

اُدھر ب ج د بھی محسوس کر رہے تھے کہ الف کے خیالات میں پچھلے دو ہفتوں سے انقلابِ عظیم آیا ہوا ہے۔ عجیب قسم کی تبدیلی اس میں آ گئی تھی۔ وہ کہتا تھا اسے ایک دم سے یہ احساس ستانے لگا ہے کہ وہ عبادت گزار بدمعاش ہے۔ کاش وہ شریف ہوتا اور عبادت گذار نہ ہوتا۔ وہ بات بے بات دوستوں سے جھگڑا کرنے لگا۔ فلسفہ لڑانے لگا پچھلے دو ہفتوں سے اس نے مسجد جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لگتا تھا وہ کوئی مشکل اخلاق اپنانا چاہتا ہے۔ ساری دنیا کو سنوارنے کی دیوانگی اس پر چھا رہی تھی۔ ہر وقت وہ خود سے جنگ کرتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا اب جو بھی اس کی مرضی میں آئے گا وہ کرے گا۔ دنیا کا کوئی قانون کوئی ضابطہ اس کے اندر کی مرضیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ دوست یار اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے لیکن وہ نہیں مانتا تھا کہ وہ غلط ہے۔ آج بھی جب تینوں دوست اُٹھ کر گئے تو اس پر ایسے ہی عجیب و غریب خیالات نے یلغار کر دی۔

اچانک اس نے محسوس کیا اس کے قدم بے ترتیبی سے مگر تیزی کے ساتھ اپنی بیوہ پھوپھی کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے ہیں۔ دراصل آج وہ رضیہ کو منانا چاہتا تھا۔ اپنی زیادتیوں کی معافی مانگنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اسے اس کی پاکیزگی پر اعتبار ہے، یقین ہے اور یہ کہ اُس کی زندگی کے یہ تیس سال اس کیلئے تیس سپپاروں کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جب وہ رضیہ کے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو اس کی بارات جا رہی تھی۔ وہ بھی باراتیوں میں شامل ہو گیا جیسے کوئی بن بلائے کسی جنازے میں شامل ہو جائے۔

نقشہ

علی تنہا

دونوں چاہتے تھے ایک مستول پر لٹک جائیں اور دیں آوازیں کہ ہوا مخالف سمت میں ہے لیکن اس وقت پانی کا بڑا زور دار ریلا گر رہا تھا۔ ایک تو ہوا ساکت اور اس پر حبس بہت زیادہ۔ دریا کے کنارے جہاں زعفرانی نقطوں کے پست و بلند نقشے ایک دھوکے سے مٹ گئے تھے۔ وہاں نہ تو مستول تھے اور نہ ہی ہوا۔ ایک عمر رسیدہ کشتی تھی جس کی کوئی چول سلامت نہیں، اور اس پر بے سمت ہواؤں کا زور الگ۔

"مڈگاور میں ایک قصبہ ہے۔" جھگ کے ایک نسبتاً بڑے پہاڑ کی سمت اشارہ کر کے وہ چلایا۔

"یہ مڈگاور کہاں ہے؟"

"کہیں بھی ہو۔" وہ چپو پر جھک کر بولا

"ہے ہے..."

"عبدے" وہ متوازی ہو کر چلایا۔

"پانی ادھر آرہا ہے۔"

"اسے!"

"ہاں ہاں"

دونوں نے کندھوں پر سے مڑ کے دیکھا اب زمین اور آسمان کے درمیان صرف دریا تھا یا ان کے نیم مردہ جسموں کے سائے۔ آگے اس سے بڑھی ہوئی سرمئی پہاڑی کا کوہان اور پھر وہی روز کا نہیں، لاکھ مرتبہ دیکھا ہوا دریا۔

"مڈگاور میں ایک قصبہ ہے۔"

عبدے کی آواز تو لہروں پر تیر گئی لیکن جشنے نے آنکھیں میچ لیں

"یہ عبدو ہے نا؟" اس سے آگے اس نے سوچنا تج دیا۔ ایک بہت بڑے بادل کا ٹکڑا اس کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ بادل ڈوبتے سورج کی نرم زرد کرنوں میں بھورے ریچھ کی طرح پھدکا۔ اس کا ایک کنگرا تو ترچھے سورج کی اوٹ میں، اور دوسرا حصہ پانی کے گدرے لاوے میں بھاگم بھاگ جا رہا تھا۔ مگر کشتی سے دور ہی دور۔ سورج اب کانکھ سا رہا تھا یا عبدے کی طرح افراتفری میں کہہ رہا تھا۔

"سنا نہیں تم نے۔"

جشنے نے دق ہو کر کہا "سناؤ۔"

"ہاں تو" اس کے چتیوں والے چہرے میں جبڑا بہت خوفناک طرح سے کھلتا اور بند ہوتا رہا۔ اس شخص کو دیکھ کر اس نے سوچا۔ اس کی دوستی گنٹھی تو کس شیطان سے پہلے تو اس نے بتیرا اپچ مچ سے کام لیا۔ ایک دم سے جیسے وہ اس کی باتیں موس لے گیا۔ بولا: "کیا کہا؟"

"قصبے میں ولان ہیں اور..."

"ولان کہاں سے آگئے؟"

"او ہو" وہ بولا۔

"ولانوں میں بندے تھوڑے ہیں وہاں تو....."

"ہائیں"

"ہاں عجیب لوگ ہیں وہ۔ ولانوں میں ان کے دن کو کتے نوٹیں مارتے ہیں۔ کتے دیکھے تم نے؟"

"کیوں وہ الگ سے ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا"

حسنے نے مسکرا کے سوچا حضرت کی یہ نز بہت بُری ہے۔

"تو جناب آگئے"

"ہاں تو ولانوں میں، وہ خود تو لاپتہ اور کتے حاضر"

"خود لاپتہ کیسے ہو گئے"

"پھر وہی بات؟"

دونوں کی پشت پر چھوٹے چھوٹے مکان اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ پانی کی نیم تاریک سطح پر تھکے ہارے پرندے کی مثل کشتی کی رفتار بہت مدھم پڑ گئی۔

"ہاں تو عبدو نے ہاتھ اُٹھا کے خدا معلوم کیا کہا۔ کشتی پھر گہری خاموشی کی چادر میں لپٹ کے رہ گئی۔ حسنے نے مونڈھے کی بیڑ سے دھیان ہٹا کے پوچھا

"عبدو"

"ہاں"

"مدگارو میں جو قصبہ ہے"

"ہاں ہاں"

"کتنا بڑا ہے؟"

"ہائیں"

"پوچھتا ہوں بڑا کتنا ہے؟"

"حسنے" اس نے چلا کے کہا "تال نہیں کٹی تمہاری"

عبدو کو بڑی نرمی سے تک کر حسنے نے پوچھا "یار"

"یار وار نہیں چلے گا۔ تو میں نے جھوٹ بولا تم سے؟"

"نہیں"

تو پھر میرے ایمان کا گلا کیوں گھونٹ رہے ہو تم"

حسنا اس کی اسی ادا پر لوٹ تھا۔ مگر وہ عین اسی وقت سوچنے لگا کہ میں اسے عقل مندی کی بات سمجھوں یا بے وقوفی کی۔

"اچھا تو جناب"

"اب" عبدو نے غرا کے اپنی ہڈیالی ٹانگیں پانی میں پھیلا کے کہا۔

"میں جناب کی قسم کھا کے کہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"شادی سے بہت سال پہلے کا ذکر ہے۔"

حسنے نے آہ کھینچ کے کہا "اس شخص سے اپنی باتیں سہاری نہیں جاتیں۔"

"ہاں"

"اب تو لوگ ذرا ذرا دور رنگا لیں تو نانت نہیں ٹرتی نا۔ لیکن یہ بہت سال پہلے کا ذکر ہے۔"

آسمان پر ان کے برابر میں ستارہ چمکا۔ ان کے ماتھے کے اوپر جنوب میں، عبدو کی آنکھیں ستارے کو دیکھ کر چمک اٹھیں لیکن اس کا جسم اذیت ناکی کی حد تک ڈھیلا پڑ گیا۔ جیسے بہت سارے ہاتھیوں نے اس کا جسم کھوند ڈالا ہو۔

"اب بک بھی چکو۔"

"ان سالوں کا اب ذکر کیا حسنے۔ وہ زمانے اب نہیں آنے کے۔"

"ہاں۔"

"تمہاری ہڈیوں میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے؟"

"طاقت" اس نے اپنے مدقوق جسم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم بات پوری کرنے نہیں دیتے۔"

"بات پوری نہ کرنے سے مجھے یاد آیا۔ مڈگار دمیں کوئی اپنی بات کر ہی نہیں سکتا۔"

"صاف جھوٹ۔"

"حسنے تم نہیں مانتے نا" عبدو نے کشتی کے سرخ پھٹے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"سنتا ہوں۔"

"بس حسنے زبانوں میں ان کے سوئیاں چبھی رہتی ہیں۔"

"پھر"

"پھر حسنے ....."

"........" عبدو نے اونی ٹوپی ذرا کھینچ کے نیچی کر لی۔ دو تین کشتیاں ان کے دائیں بائیں پانی اڑاتی گزر گئیں۔ اس کا دل چاہا، ان سے کہہ دے۔ ہوا مخالف سمت میں ہے لیکن کس سے کہہ دے۔

"پوچھ کیسے لوگ ہیں وہ؟"

حسنے نے سن کی رسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ایسے لوگ۔"

"ہاں سن کی رسی کی طرح۔ گود میں ڈھیر ساری چیزیں لے کر خود ....."

"اور پتہ ہے حسنے، عبدو قصبے کی دور دراز کی بگھوں، بڑے بڑے آتش دانوں میں مردہ آگ اور پھر رنگین شیشوں والی کھڑکیوں تک آتے آتے لکڑیوں کے اس پرانے ٹال کا ذکر لے بیٹھا جہاں آگ لگی تھی عبدو کی آواز پانی کی پھڑ پھڑاہٹ پر تیرتی رہی۔ آواز کے درمیان وہ انگوٹھی ہاتھ کی لکیر چہرے کے برابر بناتا رہا اور بیان کرتا رہا کہ کیسے دلانوں اور مکانوں میں آگ پاگل ہو کے پھرتی رہی۔ آگ کے ذکر سے شاید گھبرا کے وہ سیدھا بیٹھ گیا۔

"عجیب قصبہ ہے حسنے"، اس نے خشک تالو میں دور تک خشکی اڑتی چھوڑ کر کہا۔

"ایک بات ہو تو سمجھیے۔ بے شمار باتیں ہیں۔ ایک لمبی قطار ہے باتوں کی لیکن ان باتوں سے اس کا رنگ زرد کیوں ہو گیا ہے؟"

"گھاٹ پر لوگ آگئے ہیں"

"کیا؟"

"لوگ ....." ایک ہذیانی خوشی کے عالم میں انگلیوں کے دو شاخے میں سگریٹ دبا کر اس نے پوچھا۔

"عبدو"

ستارے کھو کھلے آسمان میں ننھے منے سوراخ کر کے چمک اٹھے۔ ان کے سامنے جہاں آوازیں اونچی تھیں۔ بے سر و پا قسم کے شور میں تپی ہوئیں۔ پھر پانی کا وسیع پہاڑ تھا جس سے کشتیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھیڑ کی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ساکت، اور استغراق میں۔

"عبدو"

ہاں۔

"لوگوں کے ہاتھ پاؤں؟"

کمزور لالٹینوں کی روشنی میں لوگوں کے جتنے کہیں زیادہ پھیلے ہوئے، اور ان کے سروں پر ایک بیزار خاموشی کا پھندنا جھول رہا تھا۔

"ڈنگارو میں جو قصبہ ہے"

"ہاں" اس نے چمڑے کا تھیلا کھنکھناتے ہوئے پوچھا۔

"کتنا دور ہے؟"

"دور؟ بھئی ایسا دور تو نہیں"

"دور نہیں تو پھر کہاں ہے؟"

کہیں بھی ہو حسنے۔ ہے وہ عجیب قصبہ"

"اچھا ....."

عبدو نے آنکھ اٹھا کے یوں دیکھا جیسے اس کی آنکھ شاہ بلوط کا وہ مردہ درخت ہو جس کے سوراخوں میں چیلوں نے بے شمار گھونسلے بنا لئے ہوں۔ کچھ دیر تو دونوں پر ایک بیزار خاموشی چھائی رہی ایسی چپ جو دریاؤں میں سیکار پھرنے کے بعد اکثر لوگوں کے بشروں پر چھائی رہتی ہے۔

"کیا پوچھا تھا تم نے؟"

"قصبہ کتنا دور ہے؟"

"بس وہ قصبہ عجیب ہے"

"عجیب نہیں۔ دور کتنا ہے"

"دور تو جتنا ہے، لیکن تمنے ایک رات طوفان آیا تھا۔ درخت، مکان، لوگ سب اکھڑ گئے"

اس نے چڑ کر کہا "طوفان کا دوری سے کیا واسطہ؟"

"طوفان دور سے نہیں آتا کیا۔ خیر تم کبھی وہاں نہیں گئے نا" عبدے نے افسردہ لہجے میں خود ہی کہنا شروع کیا۔

"اگر تم وہاں جاتے تو......"

"مر جاتا؟"

"شاباش۔ اسی کا نام مسلمانی ہے"

"خانی باپ تم پاگل ہوگئے"

"ارے پانیوں میں کون پاگل ہوتا ہے۔ پاگل تو زمین پر ڈھونگ لگائے لوگ......" وہ ایک لمحے ڈھکیلی کرتا، تھا اور ہاتھ ہوا کی بلندی میں اچھال، چھال کر کہنے لگا "میں اگر چپ کر جاؤں تو قصبے کے لوگوں کی زبانوں سے سوئیاں تم نکالو گے"

"ہاہا" حسنا دھاڑ دھاڑ ہنسنے لگا "تمہیں ہوا لگ گئی ہے۔ لیکن بُرے وقتوں میں"

"یک لخت وہ سہم کر بیٹھ گیا" عبدو" اس کی آواز جیسے پرانی قبروں سے ابھری ہو۔

"عبدو یہ قصبہ تو ___"

"ہاں حسنے ہاں"

اس کا ہوا میں بلند ہاتھ زبردست تیزی کے ساتھ نیچے گرا جسنے کے تشنج زدہ جسم کو ہلا کر کشتی اس طرف کھینے لگا جہاں قصبے کا نقشہ ایک دھوکے کے ساتھ مٹ جاتا تھا۔

کانچ کا شہر

احمد جاوید

شیشے کا مرتبان اُن قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو میری ماں کو بہت عزیز تھا۔ پانی سے بھرا ہوا جس میں پھولوں کی پتیاں ہمہ وقت مہکتی رہتیں۔ ہم ایک چھوٹے سے بوسیدہ سے گھر میں رہتے تھے۔ وہ میرا بچپن تھا۔ جب مَیں کوئی خواہش کرتا تو میرا باپ کڑھنے لگتا مگر میری ماں مسکراتی اور مجھے کہتی جب تم کوئی خواہش کرو اور جب تم کوئی خواب دیکھو، کوئی پھُول کہیں سے توڑ کے لاؤ اور اس میں ڈال دو پھر اس کے شیشے سے آنکھ لگا کر دیکھو اندر ایک ایسا شہر سا بنتا دکھائی دے گا جیسا تم نے نہ کبھی دیکھا نہ سُنا، بالکل اُن کھلونوں جیسا کہ جن کی تم خواہش کرتے ہو۔ ہم نے عمر بھر یہی کیا۔ نسل در نسل اس کی حفاظت کی یہ پھول صدیوں سے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ کچھ تم بھی ڈالو۔

نسل در نسل پھول مہکتے کیسے رہتے ہیں۔ تعفن کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اَب سوچتا ہوں۔ تب اندر اک شہر دیکھتا تھا بالکل اپنی ماں کے خوابوں جیسا۔!
صبح ہوتی اور جب سارے لوگ کام کاج کو نکل جاتے، تب میری ماں اپنی گود میں کچھ تازہ پھول بھرتی اور رات کا دیکھا خواب بیان کرتی ـــ وہ روز ایک ہی خواب دیکھا کرتی تھی ـــ ایک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے، لوگ پھولوں کی مانند کہ مہکتے تھے، دریاؤں میں شہد اور دُودھ بہتا تھا۔ بادل روئی کے گالے ـــ بس کچھ ایسا ہی تھا، ایسا ہی رہا ہوگا۔ اَب پورا کسے یاد ـــ!

وہ پھول تھے کہ خواب ـــ خواب تھے کہ خواہشیں ـــ اِک شہر کہ میری نگاہوں میں رہتا۔ مگر اُن دِنوں وہ میرے خوابوں میں نہیں جاگتا تھا۔ اور رات بیت جاتی۔ اس کے سوا معلوم نہیں اور کیا کیا آنکھوں کے پیچھے پرچھائیں کی طرح گزر جاتا، عمر ہی ایسی تھی ـــ البتہ دِن میں اُس مرتبان کے پھول وہی ایک خواب بن کر مہکتے رہتے ـــ پھر یوں ہوا کہ صرف مہک رہ گئی ـــ مہک بھی کیا مرجھائے ہوئے پھولوں کی باس کہ میری عمر آگے کو سفر کرتی تھی اور میری ماں کی پیچھے کی طرف ـــ

برس بیت گئے اب نہ وہ گھر رہا، نہ وہ افراد، سب تتر بتر ہو گیا۔ مَیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لفظ چُنتا، چہرے دیکھتا بدلتے موسموں کے ساتھ اپنے اندر باہر مختلف صورتیں دھارتا اِدھر سے اُدھر ہو گیا ـــ کہ درمیان میں ایسی عمر پڑی کہ جب راتیں اور دِن آپس میں گڈمڈ ہو جایا کرتے ہیں۔ خواب اور حقیقت میں فرق نہیں رہتا ـــ کبھی خواب حقیقت لگتا ہے اور کبھی حقیقت خواب ـــ عمر کی اس راہداری میں اپنی آواز کی بازگشت میں بھی بڑی گونج اور دبدبہ ہوتا ہے ـــ یہ لڑکپن کے دِن ہوتے ہیں ـــ مَیں جوانی کی دہلیز پر تھا۔
جوانی کی دہلیز پہ جب کبھی کبھار گئے دِنوں کے نقوش سے گرد اُڑتی تو خیال پیدا ہوتا کہ شاید مجھے کسی شہر کی طرف سفر کرنا تھا ـــ مگر کدھر؟ کس سمت؟ اور انہی دِنوں مَیں نے ایک روز گلیوں اور سڑکوں پر ہجوم دیکھے کہ جو اسی حیرت میں تھے ـــ
اُس رات مَیں نے اِک خواب دیکھا ـــ اک شہر کہ جس کے زمین و آسمان کانچ کے بنے تھے ـــ اور اک خوف کہ سب کچھ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔
اگلے روز مَیں نے وہ خواب جس سے بیان کیا وہ پریشان ہوا اور اپنی راہ لی ـــ اُس دِن مجھے گئے دِن یاد آئے اور مَیں نے گھر میں اُس شیشے کے مرتبان کو تلاش کیا کہ جس میں کائی جمی تھی اور وہ متعفن ہوا تھا ـــ مَیں نے اُسے صاف کیا۔ اندر تازہ پھولوں کی پتیاں بکھیریں اور اُسے پانی سے بھر دیا۔
اَب سوچتا ہوں ایسا کیوں کیا۔

اُس کی خواہشیں خواب تھیں سو وہ پھول ڈالتی تھی اور پانی بھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور چمکتے رہیں ــــ میرے خدشے خوب ہیں ــــ مجھے خواہشوں کے خواب کیوں نہیں آتے میں ہر رات تمنا سے سوتا رہا مگر وہی ایک خواب وہی ایک خدشہ ــــ

پھر ایک رات دیکھا ــــــ

وہی ایک شہر کہ زمین و آسمان جس کے کانچ ایسے، پھر دیکھا کہ کچھ نوعمر ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھاتے آسمان کو نشانہ کرتے ہیں۔ پتھر نشانے پہ جاتے ہیں چھناکے کی آواز آتی ہے ــــ جیسے کرچی کرچی ــــ پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہاتھوں میں بڑے بڑے ستون، اٹھائے بھاگے آتے ہیں اور انہیں آسمان کے نیچے کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ گرنے سے بچا رہے ــــ

مَیں اپنی بیوی سے اپنا خواب بیان کرتا ہوں ــــ وہ اپنی خواہش مجھ سے کہتی ہے ــ مَیں اپنے بیٹے کی انگلی تھامے گلی میں آتا ہوں ــ گلی میں ہجوم ہے ہاتھوں میں کنکر پتھر اٹھائے ــــ مَیں آسمان کی سمت دیکھتا ہوں۔ اِک خوف کہ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

وہی دِن بھلے تھے جب صرف خواہشیں تھیں خدشے نہ تھے ــ میری بیوی کہتی ہے "تمہارے وہ دِن بھی بھلے نہ تھے، تمہارے یہ دِن بھی بھلے نہیں"۔

مَیں شیشے کے مرتبان میں دیکھتا ہوں۔ وہ شہر کہیں بھی نہیں جو میری ماں کی آنکھوں سے آشکار تھا اور جسے اُس نے نسل در نسل دیکھا۔

ہم کس شہر میں بستے ہیں اور وہ شہر کہاں ہے ــــ؟ میرا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے۔ مَیں اُس سے کہتا ہوں اِک پھول لاؤ اور اس شیشے کے مرتبان میں ڈالو ــ مگر اُسے وہاں کوئی شہر دکھائی نہیں دیتا۔

وہ دِن اچھے تھے جب مَیں خوابوں کی خواہش کرتا تھا مگر وہ مجھ سے دور رہتے ــ اَب خوابوں کا تانتا بندھا ہے مگر یہ خدشے کہاں سے در آتے ہیں۔ مَیں اس آسیب کا کیا کروں کہ میرا بیٹا مجھ سے مختلف ہوتا جاتا ہے۔ وہ خواہشوں کو خواب نہیں بناتا ــ وہ شیشے کے مرتبان میں نہیں جھانکتا۔ وہ کھڑکی سے باہر کود جاتا ہے ــ کنکر پتھر اُٹھا کر ــــ تب مجھے اپنا گھر شیشے کا لگتا ہے اور شہر اور اُس کی گلیاں اور سارے گھر۔

مگر جب وہ لوٹتا ہے تو مٹی دھول ہوتا پریشان اور خستہ حال کہ اَب تو وہ ہجوم بھی اُسے دکھائی نہیں دیتے کہ جو اس کے ہمراہ تھے۔ کنکر پتھر اٹھائے۔ ایک صبح اُس نے مجھے کہا کہ آج رات مَیں نے شہر کے تمام گھروں پر تالے دیکھے ــ گلیوں میں سناٹا تھا ــ مَیں نے بہت صدائیں دیں مگر کچھ بھی نہ تھا ــــ یہ لوگ کیا ہوئے ــ

مَیں ہنسا کہ خدشے تمہاری آنکھوں میں بھی در آئے ــــ مَیں نے بھی رات اسی طور بسر کی ہے۔

اِک شہر کہ کانچ کے در و دیوار اور کچھ لوگ کہ بھاری قدموں سے زمین پر دندناتے آتے ہیں ــــ چھناکا ہوتا ہے ــــ زمین شق ہوتی چلی جاتی ہے۔ نیچے ایک دلدل اور شہر کہ دھنستا جاتا ہے ــــ نیچے بہت نیچے ــــ لوگ ڈوبتے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ مگر بے سود کہ آسمان بھی کرچی کرچی ــــ کانچ کی بارش ــ پھر ــ آنکھ کھُل جاتی ہے ــــ مَیں تمہیں آواز دیتا ہوں۔

سفر پہ نکلے ہوئے مسافر اپنے گھروں کے خواب دیکھتے ہیں ــ پھول ایسے چہرے، ستاروں کی طرح چمکتے ہوں تو اندھیری راتوں میں آنکھ کھُل جاتی ہے اور پھر اندھیرا کروٹیں لیتا ہے مگر خواب کا منظر دوبارہ نہیں کھُلتا۔ مَیں گھر سے دور اپنے ننھے بیٹے کو یاد کرتا ہوں جو اس وقت بے سدھ سوتا ہوگا۔ کیا معلوم مَیں اَب اُس کی یادوں میں شامل ہوں بھی یا نہیں مگر شروع کے دِنوں میں وہ مچلتا ہوگا۔ سوتے میں کسی ویرانی کا احساس بھی کرتا ہوگا۔ ہم میں یارانہ بھی تو بلا کا تھا۔

شام ہوتے ہم اپنے گھر سے نکلتے، کھُلے سبزہ زاروں پر ٹہلتے، سوال و جواب کرتے، سورج چھپنے، چاند نکلنے کا اسرار جانتے۔ ننھی منی نظمیں لہک لہک کر گاتے اور واپسی کے راستے سڑکوں کے کنارے دوکانوں پر جلتی بجھتی رنگین روشنیوں کا نظارہ کرتے واپس لوٹتے اور باغیچوں سے چُنے ہوئے پھول اُس شیشے کے مرتبان میں ڈال دیتے کہ جو پانی سے بھرا ہم اپنے گھر میں رکھتے تھے۔

شیشے کا یہ مرتبان اُن قدیم چیزوں میں سے ایک ہے جو میری ماں کو بہت عزیز تھا۔

راؤنڈ دی کلاک

محمود احمد قاضی

ریکارڈ کے مطابق وہ آدمی مشکوک ہے اور روزنامچے میں اس کے نام کے آگے "ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث ـــــ لکھا ہے۔ میں اس آدمی کی نگرانی پر مامور ہوں۔ مجھے اس کے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہو چکا ہے اور یہ تمام باتیں میں نے روزنامچے میں درج کر دی ہیں مگر مجھے ابھی اس کے متعلق بہت کچھ جاننا ہے اور یہ سب کچھ جاننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا میرا اس کی نگرانی کرنا ـــــ میں جب بھی اس کا روزنامچہ کھولتا ہوں تو "رپورٹ نامکمل ہے" کے الفاظ میرا منہ چڑانے لگتے ہیں اور میں پھر اسی مستعدی کے ساتھ اس کی نگرانی میں لگ جاتا ہوں۔

ریکارڈ کے مطابق وہ آدمی مشکوک ہے۔ روزنامچے میں اس کے نام کے آگے "ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث" ـــــ لکھا ہے کیونکہ وہ ہر صبح ٹھیک آٹھ بجے اُٹھتا ہے اور اپنے فلیٹ کے اکلوتے کمرے کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول کر جھانکتا ہے جیسے یہ اطمینان کرنا چاہتا ہو کہ صبح ہوئی بھی ہے یا نہیں ـــــ پھر حسبِ معمول بازو پھیلا کر زور زور سے سانس لیتا ہے اور ہوا سے اپنے حصے کی آکسیجن کشید کرتا ہے (روزنامچے میں لفظ آکسیجن کے نیچے موٹی سی لکیر کھنچی ہے جو اپنی جگہ خود ایک وضاحت ہے) تھوڑی ہی دیر بعد اس آدمی کے پیچھے ایک عورت نمودار ہوتی ہے عورت کی آنکھوں میں نیند کا باسی خمار تیرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ عورت کبھی ضرور خوبصورت رہی ہو گی مگر اب اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے سیاہ حلقے اسے ڈھلتی عمر کی بدصورتی کی طرف مائل عورت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ عورت آدمی کو شیو کا سامان پکڑا کر اپنے بکھرے بالوں کو جلدی جلدی بے ترتیبی سے سمیٹتی ہوئی کمرے کے اندر کہیں غائب ہو جاتی ہے ـــــ وہ چھوٹا سا چوکور آئینہ کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ کر استرے کی تیز دھار کو ہاتھ کی ایک انگلی پر آزماتا اور نہایت عجلت کے ساتھ شیو کرنے لگتا ہے۔

روزنامچے پر میرا قلم تیزی سے چلتا رہتا ہے۔ سفید کاغذ پر نیلے حروف بھی سیاہی مائل رنگت اختیار نہیں کر پاتے کہ وہ کپڑے بدل کر پھر کھڑکی میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ اب وہ عورت جو بظاہر اس کی بیوی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی پکڑے، دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کو تھپتھپاتی ہے تو وہ چونک کر اس کی جانب دیکھتا ہے اور خاموشی سے چائے سپ کرنے لگتا ہے۔ عورت پھر کمرے میں کہیں غائب ہو جاتی ہے اور دیر تک کھڑکی کی طرف نہیں آتی۔ چائے پی کر وہ آدمی ایک دو مرتبہ کمرے کے اندر کہیں، دھر اُدھر دیکھتا ہے اور پھر کھڑکی سے ہٹ جاتا ہے۔

وہ جب کھڑکی سے ہٹتا ہے تو ٹھیک اسی وقت میرے قلم کی نب کاغذ میں دھنسنے لگتی ہے اور میں اسے عادتاً دو تین بار جھٹکے دیتا ہوں۔ شاید سیاہی ختم ہو گئی ہے۔ اگر سیاہی ختم ہو گئی تو ـــــ رپورٹ؟ لیکن نہیں، قلم پھر رواں ہو جاتا ہے۔ وہی نیلی سیاہی ـــــ نیلے حروف اور نیلے حروف ابھی سیاہی مائل نہیں ہو پاتے کہ وہ اس بلڈنگ کی سیڑھیوں سے جس کی چوتھی منزل پر اس کا فلیٹ ہے، اترتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اسی راستے پر چل پڑتا ہے جس پر وہ ایک عرصے سے چل رہا ہے۔ چلتے ہوئے وہ اپنے پاؤں یوں دھرتا ہے کہ آواز تک پیدا نہیں ہوتی ـــــ وہ چلا جا رہا ہے مسلسل، چل رہا ہے اور وہ یوں ہی چلتا رہے گا اسی لئے میں اس کا پیچھا نہیں کرتا۔ پیچھا کرنے کی ضرورت بھی نہیں

کیونکہ میں جانتا ہوں وہ کہاں جاتا ہے اور وہاں کیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے روزنامچے میں اس جگہ بریکٹ میں "غیر ضروری" لکھ چھوڑا ہے۔

کھڑکی بدستور کھلی ہے۔ سورج اب عین سر پر آگیا ہے۔ اس کی تمازت سے بچنے کے لئے میرے پاس کوئی انتظام نہیں مجھے تو بس یہیں موجود رہ کر اس کی نگرانی کرنا ہے۔ وہ اب اس فلیٹ میں موجود نہیں ہے لیکن روزنامچے کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے اس لئے مجھے اس کھلی کھڑکی کے نیچے اس وقت تک کھڑے رہنا ہے جب تک کہ اس کی واپسی نہیں ہو پاتی اور پھر......... مگر اس کی واپسی سے پیشتر کچھ واقعات روزانہ ایک ہی جیسی ترتیب کے ساتھ رونما ہوتے ہیں جو میں محض اپنی دلچسپی کے لئے نوٹ کئے جاتا ہوں۔ یہ واقعات بھی غیر ضروری کے زمرے میں آتے ہیں لیکن اب یہ میری عادت بن چکی ہے کہ میں ان واقعات کو بھی لکھتا جاؤں اور ویسے بھی روزنامچے کا پیٹ بھرنے کے لئے بعض اوقات غیر ضروری باتوں کا درج ہونا بہت لازمی ہوتا ہے۔

سورج اب عین سر پر آگیا ہے اور عورت ایک بار پھر کھڑکی میں نمودار ہوتی ہے۔ اس نے اب بالوں کو سادگی کے ساتھ جوڑے کی شکل میں لپیٹ کر اپنی لمبی گردن پر ڈال دیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے سیاہ حلقے اب کچھ پھیکے پڑ گئے ہیں۔ اس کے چہرے کے پژمردہ اور موٹے موٹے نقوش اب کسی قدر تیکھے دکھائی دیتے ہیں سستی قسم کی لپ اسٹک سے اس نے اپنے ہونٹ رنگ لئے ہیں (نوٹ کیا جائے کہ اس عورت کے پاس صرف ایک ہی رنگ کی لپ اسٹک ہے) عورت روزانہ اسی وقت نجانے کیوں مسکراتی ہے۔ وہ بار بار مسکراتی ہے اور سہ پہر تک بار بار کمرے کے اندر غائب ہو جاتی ہے لیکن پھر کھڑکی میں آکھڑی ہوتی ہے اور جب بھی وہ کھڑکی کی طرف آتی ہے مسکرائے چلی جاتی ہے۔ ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ اتنا مسکراتی کیوں ہے۔

ٹھیک شام چار بجے اس کی مسکراہٹ باسی ہو جاتی ہے، مرجھا جاتی ہے تو وہ مسکرانا بند کر دیتی ہے اور اپنی کلائی کے گرد لپٹا گجرا بھی اتار کر کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دیتی ہے کہ اب وہ بھی مرجھا چکا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے سیاہ حلقے ایک بار پھر سیاہ ہو جاتے ہیں بال ویسے ہی بے ترتیب ہو جاتے ہیں، اُلجھ جاتے ہیں۔ ان اُلجھے بالوں کی ایک آدھ لٹ وہ یوں ہی اپنی انگلی کے گرد لپیٹتے لپیٹتے تھک جاتی ہے تو اس کے سر کے پیچھے سامنے والی دیوار پر آویزاں کلاک رات کے آٹھ بج جانے کا اعلان کر دیتا ہے، اور میں اپنی جگہ چوکنا ہو جاتا ہوں کیونکہ اب وہ آدمی واپس آرہا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کہاں جاتا ہے اور وہاں کیا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے روزنامچے میں اس جگہ بریکٹ میں "غیر ضروری" لکھ چھوڑا ہے۔

وہ آدمی اپنی مخصوص چال کے ساتھ، آواز پیدا کئے بغیر، اس بلڈنگ کی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اسی کی طرح آواز پیدا کئے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتا ہوں۔ یہ چوتھی منزل ہے اور یہ اس کا فلیٹ —— عورت دروازہ کھولتی ہے —— مسکراتی ہے۔ میں بھی مسکراتا ہوں اور کمرے میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اب ہم دونوں ایک ساتھ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر جھانکتے ہیں اور ہوا سے اپنے اپنے حصے کی آکسیجن کشید کرتے ہیں اور کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں —— اس کے ساتھ ہی کھڑکی بند ہو جاتی ہے۔

"رپورٹ نامکمل ہے" لکھ کر میں روزنامچہ بند کر دیتا ہوں۔ یہ رپورٹ پتہ نہیں کب مکمل ہوگی لیکن بہر حال مجھے یہ رپورٹ مکمل کرنی ہے کیونکہ میں اس آدمی کی نگرانی پر مامور ہوں، اور ریکارڈ کے مطابق وہ آدمی مشکوک ہے۔ روزنامچے میں اس کے نام کے آگے "ناپسندیدہ سرگرمیوں میں ملوث" —— لکھا ہے —— !!!

چاندنی

شفقت ضیاء

سردیوں کا زمانہ تھا۔ مَیں دُھوپ میں بیٹھی اُونگھ رہی تھی کہ گہرے سانولے رنگ کی ایک لاغر اور ادھیڑ عمر عورت نے آکر مجھ سے کہا۔ "جی سُنا ہے آپ کو بچوں کے لیے آیا کی ضرورت ہے۔" اس کی صورت، حُلیے اور اُجڈ لہجے کے زیرِ اثر جی میں آئی کہ کہہ دوں "تم نے غلط سُنا ہے"۔ مگر میری ضرورت شدید تھی اس لیے چُپ رہی۔ پھر سوچا چلو اس دفعہ غیر سمارٹ عورت کو آزما دیکھتی ہوں۔ شاید یہ دیرپا ثابت ہو چنانچہ مَیں نے بادلِ ناخواستہ اُس سے بات چیت شروع کر دی۔ اُس نے کوئی لمبی چوڑی شرائط بھی نہ لگائیں اس لیے جلد ہی فیصلہ ہو گیا۔ جب مَیں نے اُس کا نام پوچھا، تو کہنے لگی۔ "چاندنی!" مَیں یہ نام سُن کر چونکی۔ وہ بھی شاید میرے تیور بھانپ گئی۔ ہنس کر کہنے لگی۔ "جی نذیر، میرا گھر والا بھی یہی کہتا ہے کہ تمہاری ماں کمبخت نے یہ نام جانے کیا سوچ کر رکھا تھا۔ تمہارا نام تو اندھیرا ہونا چاہیئے تھا!"

"تمہارا میاں زندہ ہے؟ کہاں ہے؟ کام کیا کرتا ہے؟" مَیں نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

"جی ہے۔ اللہ اُسے میری زندگی بھی دے دے۔ آج کل کراچی مزدوری کی تلاش میں گیا ہوا ہے۔" پھر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہنے لگی۔ "آپ مجھ سے اندازہ نہ لگائیں جی۔ وہ تو جی بڑا خوبصورت اور شوقین آدمی ہے۔" شوہر کے ذکر سے چاندنی کا سانولا چہرہ دمکنے لگا۔ مجھے اُس پر بڑا ترس آیا۔ بیچارے مالی مجبوریوں کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ الگ رہنے پر مجبور ہیں۔

چند ہی دِنوں میں مجھے چاندنی کی عادت سی ہو گئی۔ مَیں اُس کی صورت، اُس کے لہجے، اُس کی سُست روی، سب سے مانوس سی ہو گئی۔ مانوس کیا، اِس سیدھی سادی دیہاتی عورت کی بعض چھوٹی چھوٹی باتوں نے تو مجھے ایک طرح سے متاثر کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے اُسے ہمارے ہاں آئے چند ہی دِن ہوئے تھے کہ ایک شام باہر جاتے وقت مَیں نے اُس سے کہا۔ "چاندنی تم بچوں کے پاس بیٹھو۔ ہم رات کے کھانے سے پہلے واپس آجائیں گے۔" پھر ہم شطرنج کی بازیوں میں یوں اُلجھے کہ رات کے دو ڈھائی بجے گھر لوٹے۔

چاندنی کا سامنا کرنے کی مجھے تو ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ مَیں سوچ رہی تھی کہ ابھی استعفا دے دیا جائے گا۔ اور کل سے پھر کسی نئی عورت کی تلاش کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ جی کڑا کر کے آگے بڑھی۔ وہ ہاتھ میں تسبیح لیے کرسی پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ ہمیں دیکھ کر فراخ دلی سے مسکرائی۔ اور کہنے لگی۔ "خیر نال آئے او؟ کھانا گرم کروں؟"

یہ سُن کر میری ہمت بڑھی۔ میں نے کہا۔ "بہت دیر ہو گئی ہے نا چاندنی۔ مگر تم کیوں جاگ رہی ہو؟ بچے سو گئے تھے تو تم بھی جا کر سو جاتیں۔" کہنے لگی۔ "جی کوئی بات نہیں۔ اچھا ہے، اِس طرح اللہ کو بھی یاد کر لیا ہے۔ دِن کو تو وقت ہی نہیں ملتا۔"

مجھے اپنی پہلی تُند خو آیا کے بعد چاندنی واقعی چاندنی جیسی ٹھنڈی اور خوشگوار لگی۔

چاندنی کو اپنی تنخواہ کے علاوہ کسی قسم کی مدد لینا گوارا نہ تھا۔ اُسے ملنے کے لیے اس کے عزیز رشتے دار اکثر گاؤں سے آتے رہتے۔ لیکن وہ ان کے لیے کھانا تک لے جانے کے لیے تیار نہ ہوتی۔ اُس نے اپنے کوارٹر میں مختصر سا الگ بندوبست کر رکھا تھا۔ البتہ جب کوئی چیز کم پڑ جاتی تو خانساماں سے اُدھار لے جاتی اور پھر اُسی طرح ناپ کر واپس کر جاتی۔ مَیں نے جب اُسے روکنا چاہا کہ بھئی اچھا نہیں لگتا، معمولی سی چیز ہے۔ اِسے واپس

کرنے کی ایسی کیا ضرورت ہے، تو وہ یوں بولی جیسے مجھے ڈانٹ رہی ہے۔ "واہ بیگم صاحب آپ کی ذرا سی چیز کے لیے میں اپنا ایمان خراب کروں! مجھے آپ کو نہیں، اپنے اللہ کو حساب دینا ہے۔"

دن میں کئی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتیں جن سے اس کی راست گوئی اور ایمانداری کا تاثر پختہ تر ہوتا رہتا۔ اُن دنوں ہم نے ایک چھوٹا سا کُتّا منگوایا۔ سردی زوروں پر تھی لہذا میں نے رات کے وقت اُسے ایک خالی کوارٹر میں بند کروا دیا۔ صبح ہوتے ہی خانساماں اور ڈرائیور دونوں نے باری باری شکایت کی۔ "جی کیا مصیبت ہے ساری رات کُتّے نے سونے نہیں دیا۔ وہ نئی جگہ سے گھبرا رہا تھا مگر بھونک بھونک کر ہمیں تو جان سے بیزار کر دیا۔"

میں چاندنی کا سوچ کر اور پریشان ہوئی۔ کُتّا جس کوارٹر میں بند تھا وہ چاندنی کے کوارٹر کے زیادہ قریب تھا۔ چاندنی نے آتے ہی اسپرو مانگی۔ میں نے چپکے سے اسپرو کی ٹکیا اس کے ہاتھ پر رکھ دی تو وہ کہنے لگی۔ "لیکن بیگم صاحب اُسے کھلاؤں کیسے؟"

میں نے پوچھا۔ "کِسے؟"۔

کہنے لگی۔ "جی کُتّے کو اور کِسے!"

میں نے کہا "بھلا کُتّے کو اسپرو کی کیا ضرورت ہے۔"

چاندنی بولی "کمال کرتی ہیں بیگم صاحب۔ آواز سُن سُن کر ہمارا سَر دکھنے لگا ہے۔ تو وہ بیچارا جو اتنا زور لگا کر ساری رات بھونکتا رہا ہے تو اس کا سَر نہ دکھا ہوگا!"۔

چاندنی نے یہ بات طنز سے نہیں نہایت نیک نیتی سے کہی تھی۔ اس کی سوچ کا انداز ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسرے کی تکلیف کا خیال کچھ اِس طرح کرتی جیسے عام انسان اپنی ذات کے لیے کرتے ہیں۔ اِس بات کا اندازہ مجھے چاندنی کی صُحبت میں رہتے جلد ہی ہو گیا تھا۔ وہ ابھی بچّی ہی تھی جب یتیم ہو گئی۔ در در کی ٹھوکریں کھا کر بڑی ہوئی۔ شادی کے بعد بھی محنت مزدوری کر کے گزر بسر کرتی رہتی۔ اس سادی روکھی پھیکی بے کیف زندگی کے باوجود اُس میں خوش رہنے کی صلاحیت دیکھ کر مجھے بے حد حیرت ہوتی۔ بچّوں کو کھیلتے اور شرارتیں کرتے دیکھ کر ہنسی سے بے حال ہو جاتی۔ گوبھی کے پودے میں پھُول نکلنے پر اُسے یوں خوشی ہوتی کہ کوئی خزانہ پا کر بھی کیا ایسا خوش ہوتا ہوگا۔ پر سب سے زیادہ وہ اُس دن خوش نظر آئی جس دن نذیر اس کا شوہر آیا۔

میں کسی کام کے لیے اُسے بلانے اس کے کوارٹر کی طرف گئی تو دیکھا کہ صحن میں بیٹھا نذیر گرم گرم پراٹھے کھا رہا ہے۔ چاندنی پاس کھڑی اُسے پنکھا جھل رہی تھی اُس کی صورت کا وہ رُخ شاید میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گی۔ نذیر کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر ایک ایسی طمانیت اور آسودگی کا تاثر تھا جو مکمل ذہنی اور روحانی تسکین کے بعد ہی شاید لاکھوں میں کسی ایک خوش نصیب ہی کو میسر آ سکتی ہوگی۔ مجھے دیکھ کر نذیر سلام کر کے چلا گیا۔ اتنے میں کسی ننھے سے بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ چاندنی لپک کر ایک پوٹلی سی اُٹھا کر میرے پاس لے آئی۔

میں نے پوچھا کہ "یہ کس کا بچہ ہے۔"

اُس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ "جی نذیر کا۔"

میری سمجھ میں بات بالکل نہیں آ رہی تھی۔ "کیا نذیر نے دوسری شادی کر رکھی ہے؟" میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

"جی شادی تو نہیں کی" چاندنی نے کہا اور میں سٹ پٹا سی گئی۔ نذیر نے دوسری شادی بھی نہیں کی تو پھر یہ بچّہ کہاں سے آیا ہے۔ چاندنی مسکرا کر آہستہ سے یوں بولی۔ جیسے جاگتے میں کوئی بہت خوبصورت سا خواب دیکھ رہی ہو، اور ڈر ہو کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ "ہمارے محلے میں بلقیس کشمیرن رہتی تھی۔ جی بڑی خوبصورت تھی وہ۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں اور گلابی رنگ۔ نذیر ہمیشہ سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ آخر دو ڈھائی سال

پہلے اُسے بھگا کر کراچی لے گیا۔ بلقیس کے شوہر نے اُس پر مقدمہ کر دیا۔ اب نذیر مقدمہ ہار گیا ہے اور بلقیس تین چار مہینے کا بچہ چھوڑ کر اپنے پہلے شوہر کے پاس چلی گئی ہے۔

اِس گفتگو کے دوران چاندنی روتے ہوئے بچے کو چُوم چُوم کر چپ بھی کرا رہی تھی۔

مَیں سکتے کے عالم میں چاندنی کو دیکھتی رہی۔ جب حواس ذرا درست ہوئے تو مَیں نے سختی سے کہا۔ "تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو چاندنی؟ وہ کمبخت دوسری عورت کے لیے تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ تم نوکریاں کر کے اور در در کی ٹھوکریں کھا کر اپنا پیٹ پالتی رہیں۔ تمہیں تو چاہیئے تھا کہ اس سے بات تک نہ کرتیں۔ مگر تم تو اُلٹا اسے کھانے پکا پکا کر کھلا رہی ہو۔ اب وہ ایک اور مصیبت تمہارے گلے ڈال کر چلا گیا ہے۔ اُس سے کہو، لے جائے بچے کو جہاں اس کا جی چاہے۔"

"کیوں کہوں، جی! اِس بیچارے کا دُنیا میں کون ہے۔ ماں اس کی چلی گئی۔ باپ کو سزا ہو گئی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ نذیر کے لیے بھی بڑا دل دُکھتا ہے۔ بلقیس بھی چلی گئی۔ بیچارے نے مقدمے لڑنے کے لیے اپنی گھڑی بھی بیچ دی۔ بڑا شوق تھا اس کو گھڑی کا۔ مَیں نے اپنے کئی مہینوں کی تنخواہیں جوڑ کر وہ گھڑی لے کر دی تھی۔ وہ بھی نہ رہی۔ اب آپ کہتی ہیں کہ مَیں اُس سے بات بھی نہ کروں۔ کیوں نہ کروں۔ اس کا تو سب کچھ چلا گیا ہے۔ میرا کیا گیا ہے جی؟"

مَیں حیران پریشان چاندنی کو دیکھتی رہ گئی۔ میرے ذہن میں کئی سوال اُبھرے۔

ہم ساری زندگی کسی کو حاصل کرنے کی کوشش میں، حاصل کر کے اُسے مکمل طور پر POSSESS کرنے کی خواہش میں، اُس کے ——— COMPLETE SURRENDER کے شوق میں اپنی پوری صلاحیتیں خرچ کر دیتے ہیں مگر جتنا پاتے ہیں، اُتنا ہی تشنہ رہتے ہیں۔ میری ساری سوچیں آپس میں بُری طرح سے گڈ مڈ ہو گئیں۔ اب میں نہیں جانتی کہ ہار کسے کہتے ہیں اور جیت کے کیا معنے ہیں۔ کھونا کسے کہتے ہیں اور پانا کیا ہوتا ہے۔ کیا ہم سب کچھ پا کر بھی وہ ذہنی آسودگی اور طمانیت جس کی ہماری روح کو تلاش ہوتی ہے، واقعی پا لیتے ہیں؟

کاش یہ سب کچھ چاندنی سے پوچھ سکتی۔

مگر چاندنی نے تو میرے سوال سے پہلے ہی اس کا جواب دے دیا تھا!

بروکن ہوم

خورشید احمد شمسی

وہ ایک مختصر سا کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ برآمدے میں اور دوسرا ایک اور کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں پلنگ بچھا تھا۔ پلنگ کے قریب درمیانہ سائز کی ایک میز پڑی تھی جس پر چند کتابیں رکھی تھیں۔ میز کے قریب ایک کرسی تھی اور کمرے کے دوسرے دروازے کے قریب دیوار میں ایک الماری تھی جس میں مختلف برتن رکھے تھے۔ دونوں دروازے کھلے تھے جن میں سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ پلنگ پر لیٹا ہوا، سانولے رنگ، زرد اور بجھے بجھے چہرے والا، بکھرے بالوں اور دبلے پتلے جسم کا سلیم کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ دوسرے کمرے سے بار بار چوڑیوں کی کھنک آرہی تھی۔ شاید سلیم کی بیوی صوفیہ کمرہ صاف کر رہی تھی۔ پھر وہ اس کمرے میں داخل ہوئی اور الماری میں سے برتن اُٹھانے لگی۔ برتنوں کی آواز سے سلیم کو اپنی بیوی کی آمد کا احساس ہوا۔ اس نے کتاب میز پر رکھ دی اور صوفیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کی طرف پُشت کیئے کھڑی تھی۔ وہ بھدے نقوش سیاہ رنگ اور غیر متناسب جسم کی عورت تھی۔ وہ برتن اٹھا کر پہلے کمرے میں جانے لگی تو سلیم نے آہستہ سے آواز دی "صوفیہ!"

"کیا ہے؟" صوفیہ نے رُک کر اور روکھے لہجے میں جواب دیا!

"میرے قریب آؤ!" سلیم نے پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پیار سے کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو!" صوفیہ نے قریب آکر روکھائی سے پوچھا!

"مَیں تم سے یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ اس وقت تم اپنا ہر کام چھوڑ کر میرے پاس آجاؤ! میرا جی بہلاؤ! تاکہ مجھے اپنے وجود کا احساس ہو! کتنے دِن گزر گئے تم نے مجھ سے محبّت کا اظہار نہیں کیا! مجھ سے اپنی ذات کا احساس کھویا جا رہا ہے" سلیم نے پلنگ سے اُٹھ کر صوفیہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔

صوفیہ نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں سے جھٹک دیئے! "تمہیں پھر پاگل پن کا دورہ پڑ رہا ہے!" صوفیہ منہ بنا کر بولی! وہ یہ کہہ کر مڑی اور دوسرے کمرہ میں جانا چاہا۔

سلیم نے ایک بار پھر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا ہے۔ "صوفیہ! تم میری بیوی ہو اور یہ میرا حق ہے کہ تم مجھ سے پیار کرو۔ میرا کہنا مانو۔ لیکن مَیں جب بھی تم سے یہ کہتا ہوں، جب بھی اپنا حق مانگتا ہوں، تم مجھے پاگل کہہ دیتی ہو۔ میرا چچا، میرا باپ، میری سوتیلی ماں اور تمہاری طرح ان کے اشاروں پر ناچنے والے بستی کے سب لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں۔ مَیں جانتا ہوں کہ وہ سب مجھے پاگل کیوں کہتے ہیں؛ وہ میرے حقوق غصب کرنا چاہتے ہیں!"

"تو کیا تمہارے پاگل ہونے میں کوئی شک ہے؟ کیا تم نے اپنی زندگی کے دو تین سال پاگل خانے میں نہیں گزارے؟" صوفیہ نے سلیم کے ہاتھ اپنے کندھوں سے دوبارہ جھٹک دیئے۔

"ہاں ہاں گزارے ہیں لیکن مَیں اَب ٹھیک ہو چکا ہُوں!" سلیم کو غصّہ آگیا تھا اس نے صوفیہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس دوران ان کا

نوجوان بیٹا کلیم ہاتھ میں کتابیں لیے کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ ماں باپ کو اُلجھتے ہوئے دیکھ کر جیسے خود بھی اُلجھ گیا۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے ماں باپ کو اسی طرح لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ چُپ چاپ دروازے پر ہی کھڑا رہ گیا۔

"بھلا پاگل پن کا بھی کبھی علاج مکمل ہوا؟" صوفیہ نے طنزیہ کہا اور سلیم کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف یوں دھکا دیا کہ وہ پلنگ پر جا پڑا اور خود دوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سلیم غصّہ کے عالم میں صوفیہ کے پیچھے لپکا ــــ دروازے سے ٹکرا کر رہ گیا لیکن صوفیہ نے زور سے دروازہ بند کر دیا اور سلیم دروازے سے ٹکرا کر رہ گیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں بند دروازہ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس کا سارا چہرہ کھنچ گیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے!

"کاش! مَیں پاگل نہ ہوا ہوتا اور پاگل ہوا تھا تو پاگل ہی رہتا! یہ لوگ مجھے پاگل ہونے کا طعنہ اس طرح دیتے ہیں جیسے مَیں نے مرد ہو کر اپنا ذہنی توازن نہیں کھویا تھا بلکہ مَیں ایک عورت تھا اور میں نے اپنی عصمت کھو دی تھی۔ ذہنی توازن کھو دینے والے مرد اور عصمت کھو دینے والی عورت میں جیسے کوئی فرق ہی نہیں!" سلیم بڑبڑا رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک دروازے کے ساتھ کھڑا نہ رہ سکا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا پلنگ پر آن گرا۔ تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کلیم بھی دروازے کی اوٹ میں کھڑا رو رہا تھا اور شاید صوفیہ بھی دوسرے کمرے میں رو رہی تھی۔ روتے روتے سلیم کی آنکھ لگ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں بدستور سسکیاں گونج رہی تھیں وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ کلیم پلنگ کی پٹی پر سر ٹکائے بیٹھا رو رہا تھا۔ سلیم تڑپ اُٹھا۔ اس نے جلدی سے اپنے بیٹے کا سر گود میں لے لیا۔ اور اسے پیار کرنے لگا۔ پھر اس نے کلیم سے رونے کا سبب پوچھا۔

کلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ "ابا جان! جب کالج سے چھٹی ہوئی تو مَیں حنیف کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا لیکن وہاں اس کی ماں نے مجھے "پاگل کا بیٹا" کہہ کر گھر سے بھگا دیا۔ ابا جان! جب بھی اس بستی کا کوئی آدمی مجھے جھڑکتا ہے تو یہی طعنہ دیتا ہے۔ واپسی پر جب آپ اور امی آپس میں اُلجھ رہے تھے تو وہ بھی آپ کو پاگل کہہ رہی تھیں۔ کیا یہ سچ ہے؟ کیا آپ واقعی پاگل ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہاں کے لوگ مجھے اور آپ کو ہمیشہ یہی طعنہ کیوں دیتے ہیں؟ یا پھر آپ ان لوگوں کا منہ بند کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ مجھے تو قطعی پاگل نظر نہیں آتے!"

"نہیں بیٹے! مَیں ان لوگوں کے منہ بند نہیں کر سکتا!" سلیم کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تیرنے لگے۔

"تو گویا آپ واقعی پاگل ہیں! اور بستی کے لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔ مگر آج سے پہلے تو جب بھی مَیں نے اس سلسلے میں آپ سے پوچھا آپ نے ہمیشہ اس بات کی تردید کی۔ پھر ــــ؟"

"ہاں بیٹے! اس ڈر کے مارے کہ کہیں تم بھی بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح مجھ سے منہ نہ پھیر لو! مَیں تم سے یہ حقیقت چھپاتا رہا!" سلیم نے اعتراف حقیقت کر لیا۔ کلیم اپنے باپ کے منہ سے یہ انکشاف سن کر آبدیدہ ہو گیا۔ یہ انکشاف کہ وہ واقعی ایک پاگل کا بیٹا ہے اس کا دل چیر گیا۔ اور وہ بلبلا کر رو دیا۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اور زار و قطار رونے لگا۔ سلیم نے روتے ہوئے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے بے تحاشہ چومتے ہوئے کہنے لگا۔ "کلیم! یہ درست ہے کہ مَیں ایک بار پاگل ہو گیا تھا لیکن اب تو مَیں ٹھیک ہو چکا ہوں۔ بستی کے لوگ ان پڑھ ہیں نا۔ اس لیے وہ اب بھی مجھے پاگل خیال کرتے ہیں۔ بیٹے! تم تو ان لوگوں کی طرح ان پڑھ نہیں نا ــــ پڑھے لکھے اور سمجھدار ہو۔ کیا تم نے بھی اپنی ماں اور بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح یہ یقین کر کے مجھ سے منہ پھیر لیا ہے کہ مَیں اب بھی پاگل ہوں؟ دیکھو! بستی کے سب لوگ مجھ سے منہ پھیر لیں، مجھے کچھ پروا نہیں۔ مجھے میرے ماں باپ نے جیتے جی یتیم بنا دیا، کچھ پروا نہیں۔ مجھے گر تمہاری ماں بھی چھوڑ کر چلی جائے تو بھی مجھے کوئی پروا نہیں ہو گی۔ لیکن اگر ــــ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا تو مَیں زندہ نہیں رہوں گا۔ بیٹے! مَیں مر جاؤں گا۔" سلیم کی آواز بھرا گئی۔ اپنے باپ کی یہ حالت دیکھ کر کلیم پر رقت طاری ہو گئی! اس نے معصومیت سے اپنی باہیں باپ کے

گلے میں ڈال دیں اور بولا "نہیں ابا جان نہیں! آپ ہرگز پاگل نہیں اور میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا!"

باپ اور بیٹا دیر تک ایک دوسرے کو بھینچتے رہے۔ پیار کرتے رہے اور چومتے رہے! سلیم نے جذبات کے اعتدال پر آنے کے بعد اپنی آنکھوں اور کلیم کی آنکھوں سے آنسو پونچھے! "بیٹے! میں پاگل ہوا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا میں خود پاگل نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے پاگل کر دیا گیا تھا۔ آج میں تم کو وہ تمام حالات بتائے دیتا ہوں جن کی وجہ سے میں وقتی طور پر ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا!"

کلیم سنبھل کر پلنگ کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور باپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں تک سلیم بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"اگر مختصر طور پر بتانا مقصود ہو تو میں یہ کہوں گا کہ میرا ذہنی توازن ایک ایسے گھر میں رہنے کی وجہ سے خراب ہوا جسے نفسیات کی اصطلاح میں "بروکن ہوم" کہتے ہیں۔ ایک ایسا گھر جس کے دونوں سربراہ شوہر اور بیوی یعنی اس گھر میں پیدا ہونے والے بچوں کے ماں اور باپ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں لیکن تم کو میں اپنے ماں باپ کے وہ حالات تفصیل سے بتاتا ہوں جو میرے لیے اس قدر نقصان دہ ثابت ہوئے کہ میں پاگل ہو گیا" سلیم نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا!

"بیٹے! سب سے پہلے میں تم کو اپنی پیدائش کے وقت کے حالات بتاتا ہوں۔ یہ واقعات میں نے اپنی دادی سے سنے تھے۔ میری دادی نے مجھے بتایا تھا کہ میرے والد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف میری ماں سے کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے میری ماں کو میرے والد کی وہ توجہ حاصل نہ ہو سکی جو میری ماں کو ایک بیوی کی حیثیت سے حاصل ہونی چاہیے تھی۔ چنانچہ جب میں پیدا ہوا تو میری ماں نے اس موقع کو میرے باپ کی توجہ حاصل کرنے کے لیے غنیمت جانا۔ انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا کہ وہ مصنوعی طور پر بیمار پڑ گئیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ان کی یہ مصنوعی بیماری حقیقی بیماری میں تبدیل ہو گئی۔ ان کے سینے پر دونوں طرف بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے۔ اب وہ اپنی دانست میں میرے والد کی پوری توجہ حاصل کر سکتی تھیں لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ میرے والد نے شدید ترین حالات میں بھی ان کی دلجوئی نہ کی۔ البتہ ماں کے اس لاشعوری حربے کی وجہ سے میں ان کے دودھ سے محروم ہو گیا۔ شدید بیماری کی وجہ سے مجھ پر توجہ بھی نہ دے سکیں! شوہر کی توجہ حاصل کرنے کے حربے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ میرے والد کی توجہ تو حاصل نہ کر سکیں البتہ میں ان کی توجہ سے ضرور محروم ہو گیا نہ صرف یہ بلکہ میرے والد میری پیدائش کے بعد میری ماں سے پہلے کی نسبت اور زیادہ بیگانگی برتنے لگے۔ اب وہ اکثر اوقات گھر سے بھی باہر رہنے لگے تھے۔ میرے والد کی بڑھتی ہوئی سخت روی اور اپنی بیماری کو یکجا کر کے جب میری ماں نے حالات کا تجزیہ کیا تو انہیں حالات کی یہ سنگ دلی میری پیدائش کے اثرات کا نتیجہ نظر آئی۔ وہ کوئی پڑھی لکھی عورت نہیں تھیں اس لیے وہ مجھے منحوس خیال کر کے مجھ سے دور دور رہنے لگیں۔ اب وہ میرے ساتھ زیادتی کرنے لگی تھیں۔ بلاوجہ مارتی پیٹتی رہتیں! ماں کی مار کا یہ عمل نفسیاتی طور پر میرے والد کی بے رخی کا ردِ عمل تھا۔ کلیم بیٹا! انہی حالات میں میں نے بچپن سے نکل کر لڑکپن کی حدود میں قدم رکھا تھا!"

سلیم چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر بولا۔ کلیم غور سے سب باتیں سن رہا تھا۔ "بیٹے! یہ تو وہ باتیں تھیں جو میں نے اپنی دادی سے سنی تھیں۔ اب جو باتیں میں تمہیں بتاؤں گا وہ میں اپنی یادداشت سے بتاؤں گا۔ میں نے جونہی بچپن سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھا تو اکثر اپنے ماں باپ کو آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ میری والدہ گزشتہ محرومیوں کے سبب ضد کے طور پر میرے والد کی حکم عدولی کرتی تھیں۔ میرے والد اس وجہ سے ان پر جبر و تشدد کرتے تھے۔ ہر ایسے موقع پر میرا ذہن انتشار کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس وقت میری سوچ ایک معصوم کی سوچ تھی۔ میں ماں کا ساتھ دینے کی سوچتا تو باپ کو اپنا حریف پاتا تھا۔ اور ان سے ڈر کر رہ جاتا تھا۔ والد کے ساتھ ہونے کی سوچتا تو ماں کو مدِ مقابل پاتا تھا اور ان سے خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ ان دنوں وہ نہ صرف آپس میں لڑتے تھے بلکہ ایک دوسرے کا غصہ نکالنے کے لیے مجھے ہی نشانہ بناتے تھے۔ دونوں

مجھے مارتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ شدید ترین انتشار کے انہی دنوں سے میرا ذہنی توازن بگڑنا شروع ہو گیا تھا!"

"ابا جان! آپ کے ماں اور باپ دونوں بہت ظالم تھے!" کلیم نے رائے زنی کی۔

"تم نے درست کہا بیٹے! میرے ماں باپ دونوں ظالم تھے خاص طور پر میرے والد! انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے میری ماں کی مامتا کے اظہار کے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ لیکن برخوردار! حقیقت تو یہ ہے کہ اس دُنیا میں کوئی عورت کسی کی ماں نہیں اور کوئی مرد کسی کا باپ نہیں! بچہ تو مرد اور عورت کی جسمانی مجبوری کی پیداوار ہوتا ہے۔ لیکن وہی مرد اور عورت یہ تصور کر لیتے ہیں کہ ان کے اس عمل نے ایک غلام کے طور پر انہیں بچہ عطا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مرد اور عورت والدین کا معاشرتی لبادہ اوڑھ کر بچے کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ بیگار لیتے ہیں!"

"نہیں ابا جی! شاید یہ بات درست نہیں ہے اگر بچہ محض حادثے کی پیداوار ہوتا تو ماں باپ کو اپنی اولاد سے محبت کیوں ہوتی؟" کلیم نے سوال کیا کیونکہ وہ خود نفسیات کا طالب علم تھا!

"کلیم بیٹے! یہ ایک معاشرتی اصول ہے کہ جو فرد کسی معاشرتی اکائی میں جس قدر اور جتنے عرصہ چاہے دوسرے افراد کے ساتھ رہتا ہے، اتنا ہی وہ ان افراد سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اسی نسبت سے وہ افراد بھی اس فرد سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ یہ تو تم نے اپنے معاشرے میں دیکھا ہو گا کہ ہمارے ہاں معاشرتی اکائیوں میں سب سے زیادہ بچہ ماں باپ کے قریب رہتا ہے۔ اور ماں باپ بچے کے قریب رہتے ہیں اس لیے معاشرے کے دوسرے افراد کی نسبت یہ ایک دوسرے سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ تاہم معاشرے میں ایسے افراد بھی، قلیل تعداد میں سہی، موجود ہیں جو اپنی اولاد سے حقیقی محبت کرتے ہیں۔ یہ وہ شریف النفس لوگ ہیں جو جذب و انجذاب کے مراحل سے گزرتے ہی صرف بچہ پیدا کرنے کے لیے نہیں!" سلیم نے جواب دیا۔

"بہت اچھا ابا جان! اس کے بعد آپ کے ماں باپ یعنی میرے دادا اور دادی نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا!" کلیم نے باپ کو اصل موضوع کی طرف متوجہ کیا۔

"معاملہ اگر میرے باپ اور ماں کی لڑائی تک محدود رہتا تو میں شاید پاگل نہ ہوتا مگر میرے والد نے میری ماں کے ساتھ کسی اور وجہ سے نہ سہی میری تربیت ہی کے لیے سہی، صلح کرنے کی بجائے دو ہزار روپے میں ایک عورت خریدی اور اسے اپنی بیوی بنا کر گھر لے آئے۔ انہوں نے نہ صرف میری تربیت سے پہلو تہی کی بلکہ محض ذاتی ہوس کی تکمیل کے لیے میرا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیا اور پورے گھر کو آئندہ نسلوں کے لیے بھوک اور جہالت کا جہنم بنا دیا۔ بیٹے! میرے والد حقیقتاً ایک ظالم آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی دو ہزار روپے کے عوض خریدی ہوئی عورت کی خاطر میری ماں پر اس قدر ظلم اور تشدد کیا کہ وہ گھر میں عضوِ معطل بن کر رہ گئیں۔ میری سوتیلی ماں نے گھر میں اپنی چودھراہٹ جتانے کے لیے میرے والد کے ہاتھوں میری ماں پر ہی نہیں، مجھ پر بھی تشدد کرایا۔ وہ جب بھی چاہتی باپ کے ہاتھوں مجھے پٹوا دیتی۔ ایسے میں میں رو رو کر اپنی حقیقی ماں کی طرف جاتا تو وہ بھی مجھے گلے نہ لگاتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ میری نحوست کی وجہ سے ہوا ہے۔ کلیم بیٹے! چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح سے ذہنی توازن کو بگاڑ دینے والے گھریلو حالات اب تک اپنی شدت کی انتہا کو پہنچ چکے تھے میرے ذہنی توازن کے بگڑنے کا عمل بھی پورا ہو جاتا لیکن ان حالات میں بھی میں قدرے ٹھیک رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماں باپ کی توجہ کی محرومی اور ان کے ظلم کے اثرات مجھ پر پوری طرح مرتب نہیں ہو سکے تھے کیونکہ مجھے ان حالات میں بھی محبت مل رہی تھی۔ میرے باپ کے مزارعوں کی ایک لڑکی ثریا مجھ سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ مجھے ماں باپ کی محبت کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا لیکن بیٹے! وہ لڑکی زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہ دے سکی۔ میری سوتیلی ماں کو اس بات کا علم ہو گیا۔ اس نے میرے والد سے کہہ کر مزارعوں کو زمین سے بیدخل کر دیا۔ اور بستی سے

نکال دیا اور مجھے اس قدر پیٹا گیا کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ ماں باپ کی محبت کے بغیر میرا گزارہ ہوتا رہا۔ مگر صرف اس لڑکی وجہ سے ـــ وہ لڑکی جب اپنے ماں باپ کے ساتھ بستی سے نکال دی گئی تو میں نے کئی بار اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن ہر بار مجھے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دیا گیا اور کپڑے دھونے والے موٹے ڈنڈے سے مجھے پیٹا گیا۔ اس موقعہ پر میری سوتیلی ماں نے ایک اور چکر چلایا اور میرے والد سے کہہ کر ایک اور جگہ میری منگنی طے کرا دی۔ میں نے شادی سے انکار کیا تو بیٹے! میرے والد کے ساتھ مل کر میرے چچا نے بھی مجھے ایکبار پھر رسیوں سے باندھ کر الٹا لٹکا دیا اور زدوکوب کیا۔ مجبوری کے اس احساس نے میرا رہا سہا ذہنی توازن بھی چھین لیا۔ چند دنوں کے لیے ایک ماہر نفسیات نے میرا علاج کیا۔ ابھی میں ٹھیک ہو ہی رہا تھا کہ میری شادی کر دی گئی۔ قصہ مختصر یہ کہ میرا ذہنی توازن محض اس لیے خراب ہوا کہ میں نے ایک منتشر گھرانے میں جنم لیا۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ایسے گھر میں بچپن گزارنے والے بچے کی تربیت بہتر نہیں ہو سکتی اور اس بچے کا ذہنی ارتقاء ممنوپذیر نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے پاگل ہو جانے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ میرے ذہنی توازن کے بگڑنے کی ابتدا میرے ماں باپ کے آپس میں لڑتے رہنے سے ہوئی اور میری سوتیلی ماں کی شاطرانہ چالوں نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب اگرچہ میں ٹھیک ہو چکا ہوں لیکن تمہاری ماں مجھے اب بھی پاگل سمجھتی ہے۔ وہ مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہے تو محض مجھے میرا حق نہ دینے کے لیے! اسی طرح میری سوتیلی ماں کے اشاروں پر ناچنے والے میرے والد مجھے پاگل کہتے ہیں تو موروثی جائداد میں سے میرا حق مارنے کے لیے۔ انہوں نے مجھے عملاً عاق کر رکھا ہے ورنہ اس وقت تم ڈربے کی طرح بنے ہوئے اس تنگ و تاریک کمرے کی بجائے ایک عمدہ مکان میں بیٹھے ہوتے۔ ان پھٹے پرانے کپڑوں کی بجائے اچھے اور قیمتی لباس میں ملبوس ہوتے اور روکھی سوکھی دال روٹی کی بجائے تم کو بہترین غذا ملتی!"

سلیم نے کلیم کو سینے سے چمٹا لیا اور بولا "کلیم بیٹے! کیا یہ سب باتیں جان لینے کے بعد بھی تم مجھے اپنی ماں اور دوسرے لوگوں کی طرح پاگل تصور کرتے رہو گے؟"

"نہیں ابا جان نہیں!" کلیم نے جذبات سے بھرپور آواز میں جواب دیا۔

اسی لمحے بغلی کمرے کا دروازہ کھلا اور صوفیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ باپ بیٹے کو اس طرح باتیں کرتے دیکھ کر جھنجھلا سی گئی اور چپ نہ رہ سکی۔ "خود تو تم پاگل ہو ہی چکے ہو اب اس نامراد کو بھی پاگل کرنے کے ارادے ہیں کیا؟ میں سب کچھ سن رہی تھی۔ گھنٹہ بھر ہو گیا ہے جب سے تم اس کے ذہن کو چکرا دینے والی باتیں کر رہے ہو!"

"میں کہتا ہوں بکواس بند کرو اور اپنے کمرے میں چلی جاؤ ورنہ مار مار کر ہڈی پسلی ایک کر دوں گا!" سلیم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ کلیم کبھی ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی باپ کی طرف! اس کے چہرے پر بوڑھے لوگوں کی سی سلوٹیں نمودار ہو ہو کر غائب ہو رہی تھی۔

صوفیہ سلیم کا پارہ چڑھا ہوا دیکھ کر بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں لوٹ گئی۔ اور وہاں سے آواز دی! "کلیم بیٹے! کھانا لے جاؤ!"

اس آواز پر کلیم نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پا کر ماں کے پاس آ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ سادہ سے برتنوں میں ماحضر کھانا لئے باپ کے قریب آیا۔ دونوں باپ بیٹا کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران تقریباً تمام وقت کلیم خاموش رہا اور کسی گہری سوچ میں غرق رہا۔ اس اثناء میں سلیم کوئی بات کرتا تو وہ چونک سا جاتا۔

کھانا کھانے کے بعد دونوں باپ بیٹا باہر آئے اور بستی سے نکل کر سرسبز و شاداب کھیتوں کی روشوں پر چلنے لگے! شام کا وقت تھا اور یہ سیر ان کے لیے روز کا ایک معمول تھی۔ لیکن آج صورتِ حال ذرا مختلف تھی۔ کلیم بالکل خاموش اور بجھا بجھا سا تھا ورنہ عام طور پر وہ شام کی سیر کے دوران کسی خوش الحان پرندہ کی طرح چہچہاتا رہتا تھا لیکن آج وہ نہایت خاموشی کے ساتھ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے راستے پر چل رہا

تھا۔ آخر اس سے سلیم نے پوچھ ہی لیا۔ "کیوں بیٹے ؟ کیا بات ہے آج تم کچھ اُداس دکھائی دے رہے ہو !"

" نہیں تو!" کلیم نے چہرہ پر مصنوعی بشاشت لاتے ہوئے کہا !

"بیٹے ! تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو ؟"

" نہیں ابا جان !" کلیم نے بات ٹال دی !

اسی طرح شام گزر گئی اور باپ بیٹا باتیں کرتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔ دونوں نے اکٹھے رات کا کھانا کھایا اور پھر معمولی سی چہل قدمی کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں بچھے ہوئے بستروں میں گھس گئے۔ ایک طرف سلیم کا بستر تھا اور اس سے پرے صوفیہ کا۔ کلیم نے کچھ دیر کیلئے کتابیں اور کاپیاں کھول کر لالٹین کی روشنی میں کالج کا کام کیا۔ جس قدر وقت گزرتا جاتا تھا اس کی توجہ کالج کے کام سے ہٹ کر یہ جاننے کی طرف مرتکز ہوتی جا رہی تھی کہ آیا اس کے ماں باپ کو نیند آگئی ہے یا نہیں ! وہ یہی جاننے کے لیے معمول سے بہت زیادہ دیر تک کتابوں اور کاپیوں کے اوراق پلٹتا رہا۔ آخر جب اسے یقین آگیا کہ دونوں سو چکے ہیں تو اس نے کاپی میں سے ایک لکھا ہوا ورق پھاڑا۔ چند ہی لمحے پہلے اس نے اس کاغذ پر کچھ لکھا تھا۔ وہ یہ کاغذ تہہ کر کے بستر پر چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سردی سے بچنے کے لیے ہلکی سی چادر اوڑھی ایک نظر باپ پر اور دوسری ماں پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ کمرے سے نکلا اور رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا ــــ !

سلیم اور صوفیہ گہری نیند سو رہے تھے۔ سلیم ایک ہی پہلو پر لیٹے ہوئے تھک گیا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور یہ جاننے کے لیے کہ آیا کلیم سو چکا ہے یا ابھی تک پڑھ لکھ رہا ہے، آنکھ کھول کر اس کے بستر پر نظر ڈالی تو کلیم اپنے بستر پر موجود نہیں تھا۔ بستر کے وسط میں ایک کھلا خط پڑا تھا سلیم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور نہایت عجلت سے کلیم کا لکھا ہوا خط اُٹھا کر لالٹین کی روشنی میں پڑھنے لگا !

"پیارے ابا جان !

آپ نے آج اپنے پاگل ہو جانے کی جو وجوہات بتائی تھیں ان میں سب سے بڑی وجہ آپ کے کہنے کے مطابق یہ تھی کہ آپ نے ایک ایسے گھر میں جنم لیا جسے نفسیات کی اصلاح میں بروکن ہوم کہتے ہیں آپ کے ماں باپ آپس میں لڑتے رہتے تھے جس کی وجہ سے آپ جذباتی انتشار کا شکار ہوتے۔ یہی بات آگے چل کر آپ کے لیے ذہنی عارضے کا سبب بنی۔ ابا جان! جس گھر میں مَیں نے جنم لیا ہے وہ بھی تو ایک بروکن ہوم ہی ہے۔ آپ اور امی بھی تو اکثر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور پھر مَیں بھی تو بچہ ہی ہوں ! مَیں بھی تو آپ دونوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر جذباتی انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی جذباتی انتشار آپ کی طرح میرے لیے بھی پاگل پن کا سبب بن جائے اور لوگ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کریں جو وہ آپ کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ مَیں یہ گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں کیونکہ مَیں پاگل ہونا نہیں چاہتا ــــ !

آپ کا فرزند

کلیم !"

روم میٹ

محمد عبدالحی

جونہی مَیں بس سے اُترا، میری نظر اویس پر پڑی۔ آدھے چہرے پر شوخی، ایک چوتھائی پر سنجیدگی اور ایک چوتھائی پر بوریت لیے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اُس کے چہرے پر شوخی، سنجیدگی اور بوریت کی روایتی شرح دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔ چونکہ مَیں بس کے دروازے کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا، اِس لیے سب سے پہلے مَیں اُترا۔

"روم میٹ! بڑے بااَمان ہو۔ اپنی عادت کے مطابق ڈیڑھ ہفتہ لیٹ آئے۔" اویس نے مجھے گلے ملتے ہوئے اِس زور سے بھینچا کہ میرا دم گھٹنے لگا۔

"مگر اویس تمہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہوئی؟ نہ تو مَیں نے کوئی خط لکھا تھا کہ مَیں کالج پہنچ رہا ہوں اور نہ ہی مَیں نے کسی اور طریقے سے اطلاع دی تھی، اس لیے میری حیرت بجا تھی۔

"بھئی وہ تم خود ہی تو کہا کرتے ہو کہ جو اونٹ رکھتے ہیں، وہ گھر کے دروازے بھی بڑے رکھتے ہیں۔" اویس نے تقریباً میرا سارا سامان اُٹھاتے ہوئے کہا۔

ہاسٹل کی زندگی بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ گھر سے دور، گھر والوں سے دور، یار دوستوں سے دور۔ ہر لمحہ ایک مقصد لیے ہوتے۔ ایک بے لوث مقصد۔ محدود زندگی۔ محدود اختیارات۔ پھر گوناگوں مقاصد۔ ایک ترازو ہوتا ہے کہ جس میں کبھی ایک پلڑے میں وزن زیادہ کیا جاتا ہے اور کبھی دوسرے میں۔ کبھی پلڑوں سے نظر ہٹا کر سامنے کے منظر میں گُم ہو جانا۔ ایک خامی کو کسی اچھائی سے پُر کر لیا یا کسی اچھائی کو بُرائی سے برابر کر دیا۔ بات صرف عقیدوں کی ہوتی ہے۔ معیار معیار میں فرق ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دِل اور چھوٹی بڑی خوشیاں۔ تھوڑی سی ہمت اور غم جو نہ بڑا ہوتا ہے اور نہ چھوٹا۔ بس صرف غم ہوتا ہے۔ کبھی چھوٹی خوشی سے پہلے اور کبھی بڑی خوشی کے بعد۔

کبھی ہاسٹل میں دل ایسے لگا کہ گھر جانے کو جی نہ چاہا اور کبھی گھر میں ہاسٹل ایسا بھولا کہ چھٹیوں کے کئی ہفتے بعد بھی یاد نہ آیا۔ ایک رُوحانی زندگی ہوتی ہے جس میں ایک طرف تو غم اور اُمید کی لکیریں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو سیدھی ترچھی جا رہی ہوتی ہیں اور سورج کی شعاعیں بادلوں پر پڑ رہی ہوتی ہیں۔ پھر ہر لڑکے کی اپنی ایک تصویر ہوتی ہے۔ ہر تصویر میں دو لکیریں، بادل اور سورج کی ہوتی ہیں۔ کسی تصویر میں سورج نکل رہا ہوتا ہے اور کسی میں نکل چکا ہوتا ہے۔ کسی میں ڈوب رہا ہوتا ہے۔ ہر تصویر میں دو لکیروں کی بے شمار آنکھیں ہوتی ہیں جو ڈری ڈری بادلوں کو تکتی ہیں مگر آنکھیں تو صرف بھیگ اور سُکڑ سکتی ہیں۔

تانگہ ہاسٹل کی طرف جا رہا تھا۔ آگے اویس بیٹھا تھا، پیچھے مَیں۔ ذہن میں فلم سی چلنے لگی۔ گھر، اپنے گلی کوچے اور دوست یاد آنے لگے۔ کل جو حال تھا، آج وہ ماضی ہے۔ انسان کی زندگی بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ کبھی ایک سانچے میں اور کبھی دوسرے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔

"بیٹے ماں کے! اَب گھر کو بھُلانا ہو گا۔" اویس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! اَب تمہارے ساتھ بیٹھ کر ادبی جوڑ لگانے ہوں گے۔" مَیں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اویس نے سچ کہا تھا اَب گھر کو بھُلانا ہو گا۔ اَب ٹائم ٹیبل بنانا ہو گا۔ صبح سویرے اِتنے بجے اُٹھوں گا پھر ہلکا سا ناشتہ ہو گا۔ اِتنے سے اِتنے تک

کالج۔ پھر تھوڑا سا آرام۔ اتنے سے اتنے تک کام۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے انٹی روم میں حاضری۔ صرف فریش ہونے کے لیے۔ کھانے کے بعد اتنے سے اتنے تک متواتر کام۔ بیچ میں صرف ایک بار چائے اور وہ بھی فقط نیند اُڑانے کے لیے۔ فلم پورے مہینے میں صرف ایک ہوگی۔ کچھ روز بعد یہ ٹائم ٹیبل منسوخ۔ نیا ٹائم ٹیبل۔ پھر اس میں کچھ ترامیم۔ اَب مہینے میں دو فلمیں۔ پھر ہفتے میں ایک فلم۔ پھر ضرورت کے تحت ہفتے میں دو یا تین فلمیں۔ بس یہ اتوار گزر جائے پھر سنجیدگی سے پڑھائی پہ لگ جاؤں گا۔ آج فلم دیکھ لیں کل تو ویسے بھی پڑھائی پر لگ جانا ہے۔ کبھی اللہ میاں نے ڈرایا تو پانچ وقت نماز اور ایک آدھ رکوع کلامِ پاک بھی روزانہ۔ ہفتے ڈیڑھ بعد اللہ میاں کا خوف گیا۔ بے چینی میں آرام یا پھر سکون میں تجسس۔ کبھی دن رات عشق کے چکر۔ دوسروں کے بکھیڑے اپنے بکھیڑے۔

"اویس! تم زبردستی چائے پلا رہے ہو۔ ساری رات نیند نہیں آئے گی۔" میں نے ایک بار پھر چائے سے انکار کیا۔

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔" اویس نے دودھ کا ڈبہ کھولتے ہوئے کہا۔

اویس اُونی مفلر لپیٹے بہت تنہا لگ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے کسی کے نفع نقصان سے کوئی غرض نہیں۔ اُسے اپنی خوشی سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ لوگ اُسے نقصان نہ پہنچائیں۔ مگر کسی کا اندازہ دوسرے کی سوچ کے متوازی تو چل سکتا ہے، مطابق نہیں چل سکتا۔ کبھی کسی کی صحیح بات کو غلط کر دیا جاتا ہے اور کبھی کسی کی غلط بات میں لوگ اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ انسان ایک چیز ہے اور فطرت دوسری چیز۔ جیسے چڑیا ایک چیز ہے اور گھونسلہ دوسری چیز۔ مگر پھر بھی چڑیا اور گھونسلہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ انسان اُس حد تک آزاد ہے جہاں تک اُس کی ذات سے دوسروں کو کم سے کم نقصان پہنچے۔ کم سے کم نقصان صفر نقصان ہے۔ پھر کم سے کم نقصان فائدہ ہے۔ پھر کم سے کم نقصان زیادہ سے زیادہ فائدہ ہے۔ اس لیے تو مساوات موت ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ بات صرف عقیدوں کی ہوتی ہے۔ معیار معیار میں فرق ہوتا ہے۔ پھر فطرت ہے۔ میں تو فطرت کی تعریف اِن الفاظ میں کروں گا کہ یہ اُن خصوصیات کا مجموعہ ہے جو ازل سے انسان کا دفاع کرتی آرہی ہیں۔ یعنی انسان کمزور ہے۔

"اچھا تو یہ باتیں ہیں۔" اویس نے چائے سے بھرا ہوا گلاس میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

میں نے خاموشی سے چائے کا گلاس لے لیا۔ دو تین گھنٹے سونے اور گرم پانی سے نہانے سے سفر کی تھکاوٹ تو دور ہو گئی تھی مگر نیند ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

اویس اور میرا کالج میں تیسرا سال تھا۔ اِن تین سالوں نے ہمیں ایک دوسرے کے کافی قریب کر دیا۔ آج کے دور میں قرب کا ایک خاص مطلب ہے۔ دو چیزیں ہیں۔ ایک محبت اور دوسری حفاظت (اپنی حفاظت) تحفظ بنیادی چیز ہے۔ کسی کا تحفظ محبت ہے اور اپنا تحفظ صرف حفاظت۔ انا، وقار اور شخصیت حفاظت کے مختلف پہلو ہیں۔ محبت صرف محبت ہے۔ ایک محفوظ اور الگ تھلگ بنی ہوئی جھونپڑی سا ہے ــــ کالج میں مجھے ایک دوست کی ضرورت تھی جو میرے ہاسٹل میں بھی ہو۔ شرط یہ تھی کہ جب میں دُکھی ہوں تو وہ یہ بات جان سکے یعنی ہر وقت اپنی نہ ہانکے۔ پھر میری خود عادت یا تجربہ ہو گیا ہے کہ کسی سے زیادہ توقعات وابستہ نہیں رکھتا۔ اپنے آپ کو تاریک پہلو کے لیے تیار رکھا۔ پھر اگر روشن پہلو نکلا تو دُگنی خوشی ہوئی اور اگر نتیجہ سوچ کے عین اوپر بیٹھا تو اتنا غم نہ ہوا۔ انسان خواہ خود کو کتنا دھوکا دے مگر نتیجہ ہمیشہ حساب کے قاعدوں سے نکلتا ہے۔ اگرچہ اویس مکمل طور پر میرے شیشے میں نہ اُتر سکا مگر کچھ میں نے اپنے آپ کو اویس کی طبیعت کے مطابق ڈھالا اور کچھ اویس نے گنجائش نکالی۔ پھر بعد میں تو ہم ایک دوسرے کی عادتوں سے واقف ہو گئے۔

"یار تم نے باتیں تو بہت سُنائیں مگر کوئی خاص نئی تازی نہ سُنائی" اویس نے چائے کا لمبا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی اچھی رہی کہ باتیں تو بہت سُنائیں مگر کوئی خاص نئی تازی نہیں سنائی۔ اویس تم نے کبھی اونٹوں کی قطار دیکھی ہے؟" میں نے سوچا کر

اویس کا موڈ خراب کرنے کا اچھا موقع ہے۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ بچپن میں جب میں سائیکل سیکھ رہا تھا تو سب سے پہلے مَیں نے سائیکل ایک اونٹ میں دے مارا تھا۔"

"مَیں اونٹ کی بات نہیں کر رہا، اونٹوں کی قطار کی بات کر رہا ہوں" مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یار اونٹوں کی قطار بھی کہیں دیکھی ہو گی مگر تم کیوں خشک اور کھردرا موضوع لے بیٹھے۔" اویس نے اکتاہٹ سے کہا۔

شروع میں مَیں اونٹوں کی قطار کا ذکر ویسے ہی کر رہا تھا۔ غالباً بات سے مزاح کا پہلو نکالنا مقصود تھا مگر جب اویس نے اسے خشک اور کھردرا موضوع کہا تو مجھے یہ بات ذرا محسوس ہوئی۔ بات مذاق سے سنجیدگی کی طرف نکل گئی۔

"ایسا نہ کہو اویس ایسا نہ کہو" مَیں نے سر ہلاتے ہوئے اویس کو سمجھایا۔ "جب ہم چھوٹے ہوتے تھے اور اونٹوں کی قطار کو دیکھتے تھے تو یہ گیت گاتے تھے۔

اونٹوں کی قطار

میرے ماموں کو نہ مار

میرا ماموں تھانیدار۔"

"کوئی بات تو نہیں بنی۔" اویس نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

ایک بات پر بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اگر انسان کا لہجہ صدمہ پہنچانے والا ہو اور لوگ اُسے نہ سمجھیں۔ بعد میں اُس کا لہجہ شفقت سے بھرپور ہو اور لوگ اسے نہ سمجھیں اور نیت بھی دونوں صورتوں میں نیک ہو۔

"اویس ایک تہذیب آتی ہے۔ پھر دوسری۔ پھر تیسری۔ اسی طرح کئی قومیں آئیں اور چلی گئیں۔ اپنے پیچھے سوچ کے نشان چھوڑ گئیں۔ صرف نشان۔ آج دیکھو سائنس کی حکومت ہے۔ مَیں سائنس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ اگر میرے ہاتھ وہی مسالہ لگ جاتے جس سے اہرامِ مصر بنے ہوئے ہیں تو میں اس سائنسی دور کی نشانی کے طور پر ایک بہت بڑی خمدار نلی بناؤں گا۔ پھر اُس کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔ ہزاروں بلکہ کروڑوں سال بیت جائیں گے۔ مَیں بیٹھا رہوں گا۔ بیٹھا رہوں گا یہاں تک کہ اُس خمدار نلی کے نیچے سے ایک اونٹوں کی قطار گزرے گی۔ اونٹوں کی قطار تو انسان کے سفر کی تاریخ ہے۔"

"تم نے تو بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے مگر میری ایک بات سُن لو کہ مغل دیکھ کر فارسیاں بھول جاتی ہیں۔" اویس نے بڑے تلخی سے کہا۔

مغل دیکھ کر فارسیاں بھول جاتی ہیں والی بات اویس کے منہ سے بڑی عجیب لگی مجھے ہنسی آ گئی مگر اویس بدستور سنجیدہ رہا۔

اویس کی ایک عادت اتنی مدت کے ساتھ کے باوجود میری سمجھ میں نہ آئی۔ یوں تو اویس بڑی سے بڑی گپ بھی برداشت کر لیتا مگر کبھی بہت ہی چھوٹی بات پر منہ بنا لیتا۔ اگر اس بات سے اُس کے منہ کا ذائقہ ذرا زیادہ کڑوا ہو جاتا تو وہ ڈانٹ پلانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ٹھیک ہو جاتا مگر یہ کبھی نہیں ہُوا کہ اُس نے اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگی ہو۔

کافی عرصہ مَیں نے اویس کی اس عادت کا مشاہدہ کیا مگر مجھے صرف اشارہ مل سکا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ہمیشہ کسی ذاتی گپ پر خفا ہوا یا اُس بات پر جس سے اُس کے دل میں موجود کسی چیز کی قدر کم کی جا رہی ہو۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اویس ہر ذاتی گپ پر خفا ہوا۔ مَیں اکثر اُس کے باپ کے سنگیوں کو فحش گالیاں دیتا بلکہ اُس کے والد کے سنگیوں کو ایک بات میں یا ایک بات سے پہلے ایک مزیدار سی گالی دینا تو میرا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ باقی میں موقع موقع کو دیکھ اُس کی باتوں کی مخالفت بھی کرتا۔ شاید اویس کی چھٹی حس کافی بیدار ہو۔

"اویس! تم نے میرا وہ کام کر دیا۔ اِن چھٹیوں میں" مَیں نے ایک ہاتھ سے لحاف کو کھینچتے ہوئے کہا۔

اویس چپ رہا ــــ تھوڑی دیر بعد اُس کے تمام چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اویس کو مسکراتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کبھی کبھی کتنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

"وہ تِلّے کے کام اور رنگ برنگی پھندنوں والی جوتی" اویس نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اُس نے میرا کوئی راز پکڑ لیا ہو۔

"ہاں" مَیں ذرا جھینپ سا گیا۔

"کیا کرو گے تِلّے کے کام اور رنگ برنگی پھندنوں والی جوتی؟" اویس نے 'تِلّے کے کام' اور 'رنگ برنگی پھندنوں' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"لایا تو نہیں ہوں۔ تیار نہیں تھی۔ بس ہفتے ڈیڑھ تک گھر سے کوئی لے آئے گا" اویس نے مزید چھیڑا۔

"بس، بس، زندگی میں تمہیں ایک ہی کام کہا تھا اور وہ بھی تم نے نہیں کیا" مَیں نے خفگی سے کہا۔

"تم اور باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہیں ایسی جوتیاں کیوں پسند آنے لگیں"۔

"بتاؤں؟" مَیں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اویس نے ہنستے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

"ہمارے ہاں ایسی جوتیاں جت پہنتے ہیں" مَیں نے اویس کے دل پر ہاتھ ڈالا۔

"جت ـــــ یعنی کیا مطلب؟" اویس بولا۔

"جت یعنی اونٹ والا"۔

"پھر وہی اونٹوں کی قطار والا معاملہ" اویس نے خوش دلی سے کہا۔ اِس بار وہ خفا نہیں ہوا تھا کیونکہ بات کی نوعیت ہی ایسی تھی۔ "اچھا اگر تمہارے ہاں جت ایسی جوتیاں پہنتے ہیں تو تم نے یہ کام میرے سر کیوں ڈال دیا" اویس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"اویس تم جو بھی کہو مگر یہ بات میری تم سُن لو۔ تم اونٹوں کی قطار سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہو۔ اویس کبھی تم نے سہیل تارے کے بارے میں سُنا ہے؟"

"جت صاحب! آپ ہی کچھ بتائیں تو پتہ چلے کہ یہ سہیل کیا چیز ہے۔ ویسے سیدھی ایک بات ہے کبھی کبھی تم باتیں بہت دلچسپ سُناتے ہو"۔

لفظ 'دلچسپ' مجھے بُرا تو بہت لگا مگر اُس سرد رات میں روایات کی شراب پیے ہوئے تھا۔ اُس رات تو میں بڑے سے بڑے دشمن کو بھی معاف کر دیتا۔ انتقام نہ لینے کے لیے تو شراب پی جاتی ہے۔

"اویس! سہیل ایک ستارا ہے جو کچھ مدتوں غائب رہنے کے بعد بھادوں کی بائیس۲۲ تاریخ کو رات کے ایک بجے کے بعد نظر آتا ہے۔ ہمارے اُدھر تو یہ جنوب مشرق کی سمت نظر آتا ہے۔ یہ بہت افسانوی تارا ہے۔ یہ سردیوں کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ لوگوں نے اس تارے کے ساتھ بہت باتیں منسوب کر رکھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ اِس تارے کو دیکھنے کے بعد بھینس پانی سے نکل آتی ہے اور اگر گابھن بھینس اِس تارے کا عکس پانی میں دیکھ لے تو اُس کا بچہ گر جاتا ہے"۔

"اچھا!" اویس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا "مگر وہ تمہارے ـــ اونٹ کو کچھ نہیں کہتا۔ یہ سہیل"

"اونٹ کا تو جی اس تارے کو دیکھنے کے بعد خانہ ہی خراب ہو جاتا ہے۔ اِس تارے کو دیکھ کر کمزور اونٹ اور کمزور گھوڑے سردی کی آمد سے گھبرا کر اِس خود غرض دنیا سے ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں مگر ہٹے کٹے اونٹ اور گھوڑے اس تارے کو دیکھ کر بہت زیادہ مست ہو جاتے ہیں۔ باقی تو چھوڑ، اپنے مالک کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ جب یہ تارا ڈوبتا ہے تو جت اپنے اونٹوں کو ایک میدان میں آمنے سامنے بٹھا دیتے ہیں اور ان کے درمیان اور اِردگرد دھوآں کر دیتے ہیں۔ دھوآں تو خیر رات ہوتے ہی پھیلا دیا جاتا ہے مگر جونہی یہ تارا نظر آتا ہے تو ہر طرف آگ

کی لپیٹیں ہی لپیٹیں ہوتی ہیں تاکہ اونٹ یہ نظارہ نہ دیکھ سکے۔ جونہی کمزور اونٹ نے یہ نظارہ دیکھا اُسی وقت اُس کا دل بیٹھ گیا۔ میری وضاحت میں گنواری رنگ کی آمیزش تھی۔

"بھئی یہ جٹ لوگ بھی بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اونٹوں کی آنکھوں پر پٹی کیوں نہیں باندھ دیتے۔"

"پٹی بھی باندھتے ہیں" میرے لہجے میں طنز تھا۔

"اچھا یار اور باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کہ ہم اس بہیل سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں یا نہیں"۔ اویس نے ہنستے ہوئے کہا —— ہم دونوں ہنسنے لگے۔

مَیں نے اویس کی طرف دیکھا۔ اُس کی سادگی میں بے ساختگی اور پھر بے ساختگی کے ساتھ باقاعدگی تھی۔ ویسے بھی اویس جب تک میرے ساتھ رہا میرے لیے معمّہ ہی بنا رہا۔ ایک آدمی اگر نہایت جلدی میں ہو اور اُسے بہت سی سیڑھیاں اُترنی ہوں تو اُس کے اُترنے میں تیزی اور گھبراہٹ شانہ بشانہ ہوتی ہے۔ گھبراہٹ تیزی میں اضافہ کرتی ہے۔ پھر خود زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد تیزی میں اور اضافہ کر دیتی ہے۔ مگر یہ سراسر جُوا ہے۔ اویس نے ایسے موقعوں پر اپنی طرف سے کبھی جوا نہیں کھیلا۔

"اویس تم نے وجہ تو بتائی نہیں کہ تم میرا کام وقت پر کیوں نہیں کر سکے" میں نے مصنوعی طور پر چونکتے ہوئے کہا۔

"یار ان چھٹیوں میں مَیں اپنے چکروں میں گرفتار رہا" اویس نے دھیمے اور اُلجھے لہجے میں کہا۔

اویس نے اپنی طرف سے کوشش تو بہی کی کہ جُوا نہ کھیلے مگر لڑکیوں کے چکر اُسے مار گئے۔ جنسِ مخالف اویس کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ دس چھٹیوں سے ایک دن پہلے میرے ساتھ باضابطہ طور پر بیٹھ جاتا۔ مجھے اپنے علاقے کی ایک ایک لڑکی کے قصّے سُناتا۔ فلاں لڑکی اتنی خو[بصو]رت ہے۔ اُسے دس میں سے اتنے نمبر دیئے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ خود ہی اِن باتوں پر ہنستا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پہلے وہ لڑکیو[ں] کی تعداد گِنتا پھر اِس تعداد کو وہ چھٹیوں کے دِنوں پر تقسیم کر دیتا۔ اِس طرح اُس کے پاس ہر لڑکی کے ساتھ گزارنے کا وقت نکل آتا۔ کبھی کسی نئی یا مغرور لڑکی کے ساتھ مراسم بڑھانے ہوتے تو وہ اسے دو (یا تین اگر معاملہ مشکل نظر آتا) لڑکیوں کے برابر گنتا۔ میرے ساتھ بیٹھ کر وہ بڑی بڑی باتیں کرتا۔ بھئی یہ کروں گا۔ وہ کروں گا۔ مگر جب چھٹیوں سے لوٹتے تو اُسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی۔ اور اکثر بالکل کامیابی نہ ہوتی مگر اویس پھر بھی ہر بات میں اپنی خوشی کے پہلو نکال لیتا۔

اِن بڑے دِنوں کی چھٹیوں پر جانے سے پہلے اویس نے پندرہ ۱۵ کو تین پر تقسیم کیا۔ اِس طرح تین لڑکیوں کے حصّے میں پانچ پانچ دِن آتے مگر چند مصلحتوں کی بنا پر اویس نے فریدہ کو سات دِن دیئے اور باقی دو کو چار چار دن۔ مَیں سمجھ گیا کہ فریدہ قدرے مضبوط قلعہ ہو گا۔

"کیوں اویس! تمہارا پرنالا ابھی وہیں کھڑا ہوا ہے۔" مَیں نے چائے کا گلاس خالی کرتے ہوئے چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔

"یہی سمجھو یار —— اِس بار تو ایک ہی لڑکی سارا ٹائم کھا گئی۔" اویس نے مسکراتے ہوئے کہا —— مجھے یوں لگا جیسے کوئی بکری سارا چارا کھا گئی ہو۔

"کون؟ —— فریدہ!"

"ہاں یار یہی" اویس نے ہنستے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ مَیں نے ہنسی چھپاتے ہوئے کہا "یعنی ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ بھئی مَیں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ فریدہ کوئی موٹی اسامی ہے۔ اسے گرمیوں کی چھٹیوں پر چھوڑ دو۔"

"ہاں! ہاں! تم تو ہر بات مجھ سے پہلے ہی کہہ دیتے ہو" اویس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میری یہ عادت سی بن گئی ہے کہ جب کسی سے غلطی ہو جائے یا کسی کا کوئی کام نہ ہو سکے تو مَیں اُس سے ضرور کہتا ہوں کہ بھئی مَیں نے تمہیں پہلے بھی

کہا تھا کہ یوں نہ کرنا۔ حالانکہ مجھے اُس بات کا صحیح علم بھی نہیں ہوتا۔ اِس سے صرف مزاح کا پہلو نکالنا مقصود ہوتا ہے، اور کچھ نہیں۔ مگر اویس ہمیشہ میری اس عادت پر خفا ہوا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ مَیں مذاق کر رہا ہوں۔

"اچھا! اچھا، اَب موڈ کو ٹھیک کرو اور یہ بتاؤ کہ کیا بنا۔" مَیں نے مصنوعی غُصّے سے کہا۔

اویس نے اپنے غصّے کو جھاڑا اور پھر کہنے لگا "چلو میں تمہیں تفصیلاً بات سناتا ہوں۔ ہوا یوں . . . .

"تفصیلاً بات تو تم سُناتے رہنا، پہلے یہ بتا دو کہ فریدہ ان چھٹیوں میں تمہارے ہاتھ لگی یا نہیں۔" مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اویس اَب ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہے گا۔

"نہیں لگی نا یار — یہی تو تمہیں بتا رہا تھا" اویس نے ایک بار پھر اپنا موڈ خراب کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا آگے۔"

اویس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا "ہُوا یوں کہ جب اِن چھٹیوں میں گھر پہنچا تو مجھے باخبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ محلّے کا ایک اور لڑکا فاروق بھی فریدہ کی تاڑ میں ہے۔ مَیں سمجھ گیا کہ بیٹے ماں کے فاروق کی رقابت بڑی مہنگی پڑے گی۔ مگر اُمید پر جہان قائم ہے، مَیں نے بھی اپنی ڈوری پھینک دی۔ کچھ روز بعد مجھے ذرا زیادہ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ فاروق کا کہا تا پورا ہو گیا ہے۔ اَب مجھے خیریت اِسی میں نظر آئی کہ بزرگوں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے فاروق کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دوں۔"

"اویس! بزرگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہیئے۔" مَیں نے آہستگی سے کہا۔ ٹھنڈ کافی بڑھ گئی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو اچھی طرح سے لحاف میں لپیٹ لیا۔

"چلو یار نزدیک کے راستے سے چلتے ہیں۔ مَیں فاروق کے پیچھے پڑ گیا۔ خُدا اُس کا بھلا کرے وہ بہت مہربان ثابت ہوا۔ شروع میں وہ میرا رقیب تھا مگر جان پہچان کے بعد وہ میرا غم گسار بن گیا۔ غالباً اُسے میری بے چینی پر پیار آ گیا تھا۔ اُس بے چارے کو میری خاطر کئی جتن کرنے پڑے مگر اب کی بار تو فریدہ خود اُس سے بھی کترا رہی تھی، میری بات تو تم چھوڑ دو۔ آخر خُدا خُدا کر کے فاروق نے اُسے راضی کیا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میری بے چینی اُن دِنوں دیکھنے کے لائق تھی۔ جب فریدہ راضی ہو گئی تو جگہ کا مسئلہ درپیش ہوا۔ کسی ہوٹل کے کمرے میں آنے پر فریدہ راضی نہیں ہو رہی تھی۔ فاروق کے ساتھ تو چانس اس طرح برابر ہو گیا تھا کہ فاروق کی امّی اور بہنیں کہیں گئی ہوئی تھیں۔ اَب صرف گلزار کی بیٹھک رہ جاتی تھی مگر ہمیں معلوم تھا کہ فریدہ گلزار کی بیٹھک میں نہیں آئے گی اور سچ تو یہ ہے کہ ہم خود بھی گلزار کو اِس معاملے میں شامل نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"تریجا راٹلاتے جُھنگا گلا" مَیں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

اویس کہنے لگا "ہاں یار کچھ اسی طرح کی بات تھی۔ اتفاقاً ان دِنوں ہمارا بوڑھا نوکر چھُٹّی لے کر گاؤں جا رہا تھا۔ نوکر کا کمرہ گھر کے دوسرے کمروں سے الگ تھلگ ہے، گنجائش تھی۔ مَیں نے فاروق سے کہا کہ نوکر کا کمرہ حاضر ہے۔ فریدہ بھی . . مان گئی۔"

"گدھے مگر تم تو کہتے ہو کہ فریدہ تمہارے ہاتھ نہ لگ سکی۔" مَیں نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

"بتاتا ہوں" اویس نے اطمینان سے کہا "ہُوا یوں کہ مَیں نے سوچا کہ آج تو نوکر گاؤں جا رہا ہے اور اُس کا کمرہ خالی ہے۔ پھر اگر اس طرح کا چانس بن گیا تو فاروق ضرور موقع سے فائدہ اٹھائے گا۔ اَب تم خود سوچو میرا گھر تو نہ ہوا چکلہ ہوا۔ اس لیے جب اُس دِن فاروق مجھ سے ملا تو مَیں نے اُس سے کہہ دیا۔" اویس چپ ہو گیا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی جو اُس کے چہرے کے ساتھ سجتی نہ تھی۔

"کیا کہا؟" مَیں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

"یہی کہ فاروق میں تمہیں ایک بات بتانا بھول گیا تھا وہ یہ کہ ہمارا نوکر اپنے کمرے کو لنڈی کوتل والا تالا لگا کر گیا ہے۔"

ایلس ــــ عجائبستان میں

ترجمہ : محمد خالد اختر

خرگوش کے بھٹ میں سے نیچے

ایلس کنارے پر اپنی بہن کی بغل میں بیکار بیٹھے بیٹھے بے حد اکتانے لگی تھی۔ اس کے کرنے کے لیے بھی تو کچھ نہ تھا۔ ایک دو بار اس نے اس کتاب میں جھانکا تھا جسے اس کی بہن پڑھ رہی تھی لیکن اس میں نہ تو تصویریں تھیں اور نہ ہی سوال وجواب "اس کتاب بھی بھلا کس کام کی" ایلس نے جس میں نہ تصویریں ہوں اور نہ سوال وجواب"۔

سو وہ اپنے دل میں اس بات پر غور کر رہی تھی جس حد تک وہ غور کر سکتی تھی۔ کیونکہ دن کی تمازت سے اس کی آنکھیں نیند کے مارے بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ خود کو احمق لگنے لگی تھی۔ کہ آیا ایک ڈیزی کے پھولوں کا ہار پرونے کی مسرت ایسی ہے کہ اس کی خاطر اٹھ کر ڈیزیوں کو چننے کی مصیبت مول لی جائے۔ اتنے میں اچانک ایک گلابی آنکھوں والا سفید خرگوش اس کے قریب سے بھاگا بھاگا گزرا۔

اس میں کوئی حیران ہونے والی بات نہ تھی۔ نہ ہی ایلس کو یہ بات کچھ معمول سے ہٹ کر لگی کہ خرگوش اپنے آپ سے کہتا جاتا تھا "اف میری ماں! اف میری ماں مجھ کو بڑی دیر ہو جائے گی!" (جب ایلس نے بعد میں سوچا تو اسے سوجھا کہ اسے اس بات پر حیران ہونا چاہیے تھا مگر اس وقت اسے سب بالکل قدرتی معلوم ہوا) لیکن جب خرگوش نے سچ مچ اپنی واسکٹ کی جیب سے ایک گھڑی نکالی اور اس کو دیکھا اور پھر آگے قدم چلانے کی کی تو ایلس چونک کر اچھل کھڑی ہوئی کیونکہ اس کے ذہن میں اچانک یہ بات آئی کہ اس نے پہلے کبھی بھی کسی خرگوش کو واسکٹ پہنے یا جیب سے گھڑی نکالتے نہیں دیکھا۔ اور تجسس سے بے حال وہ کھیت میں سے اس کے پیچھے بھاگی اور اس کو بس ٹھیک اس موقع پر جا لیا جب اس نے باڑ تلے ایک بڑے خرگوش کے بھٹ میں ڈبکی لگائی ہی تھی۔

اگلے لمحے کچھ سوچے دیکھے بغیر ایلس بھی خرگوش کے پیچھے بھٹ میں جا اتری۔ اسے ایک دفعہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ اس میں سے دوبارہ پھر نکلے گی کیوں کر!

خرگوش کا بھٹ کچھ راستہ تو ایک سرنگ کی سیدھ میں گیا اور پھر یکلخت جھکا تو ایلس کو اپنے آپ کو روکنے اور سوچنے کا وقت ہی نہ ملا اور اتنے میں ایلس نے خود کو گویا ایک بڑے ہی گہرے کنوئیں میں گرتے ہوئے پایا۔

اب یا تو کنواں بہت گہرا تھا یا وہ سست رفتاری سے گرتی چلی جا رہی تھی کیونکہ گرتے ہوئے اس کے پاس اپنے گرداگرد دیکھنے کو ڈھیروں وقت تھا اور اس پر حیران ہونے کا بھی کہ اب آگے کیا ہوگا۔ پہلے پہل تو اس نے نیچے کو دیکھنے اور اپنی منزل کی سوجھ لگانے کی کوشش کی مگر وہاں اندھیرا اس قدر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ پھر اس نے کنوئیں کی دیواروں کو جو گھورا تو یہ دیکھتی ہے کہ وہ الماریوں اور کتابوں کے طاقچوں سے اٹی ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں اسے کھونٹیوں سے آویزاں نقشے اور تصویریں بھی نظر آئیں۔ اس نے نیچے کو گزرتے گزرتے ایک طاقچے پر سے ایک مرتبان اچک لیا۔ مرتبان پر "مربہ نارنگی" کا لیبل چسپاں تھا۔ لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ اندر سے خالی تھا۔ مرتبان کو ہاتھ سے چھوڑ کر نیچے گرا دینے کو اس کا دل نہ مانا کیونکہ اس کو یہ ڈر تھا کہ نیچے کوئی ہوا تو اس کا سر پھٹ جائے گا۔ اس لئے جب وہ ایک الماری کے پاس سے

گرتی ہوئی گزری تو اس نے کسی نہ کسی طرح مرتبان کو اس میں دھر دیا۔

"خیر بھئی" ایلس دل میں سوچنے لگی "اس طرح کے گرنے کے بعد تو میں گھر کی سیڑھیوں پر سے لڑھکنیاں کھانے کو کوئی بات ہی نہیں جانوں گی۔ گھر میں سب لوگ کہیں گے دیکھو یہ کتنی بہادر نڈر لڑکی ہے۔ بلکہ میں گھر کی چھت پر سے بھی نیچے آن گروں تو اس کا ذکر تک نہ کروں گی" (اور یہ غالباً سچ تھا)۔

نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ کیا یہ گرنا کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گا! وہ اونچا بولنے لگی "اللہ جانے میں اب تک کتنے میل گر چکی ہوں گی۔ ہو نہ ہو میں زمین کے مرکز کے نزدیک ہی کہیں پہنچنے والی ہوں گی۔ دیکھوں تو یہ فاصلہ کوئی چار ہزار میل نیچے ہوگا..... میرا خیال ہے'.... (کیونکہ تم جانو ایلس نے اس قسم کی بہت سی باتیں سکول میں پڑھے اپنے سبقوں سے سیکھی تھیں اور گو یہ اپنی علمیت کو بگھارنے کا کوئی بہت اچھا موقع تو نہ تھا کہ وہاں اسے سننے والا کوئی نہ تھا، پھر بھی اس کا یہ سب کچھ دوہرانا سبق کی اچھی خاصی مشق تو تھی)۔ "ہاں تقریباً اتنا ہی فاصلہ ہے۔ چار ہزار میل لیکن پھر سوچوں تو بھلا میں کس عرض بلد اور طول بلد میں آ پہنچی ہوں گی" (ایلس کی جانے بلا کہ عرض بلد یا طول بلد کیا ہوتے ہیں۔ مگر اس نے سوچا کہ یہ بولنے میں خوب مزے کے شاندار الفاظ ہیں۔)

تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر شروع ہو گئی "کیوں بھئی کہیں میں گرتی ہوئی زمین کے بیچوں بیچ میں سے دوسری طرف تو نہیں جا نکلوں گی! اہا۔ یہ بھی کیا مزے کی بات ہوگی کہ وہاں لوگ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر چلتے ہوں گے! ___ مخالف العادات، میرا خیال ہے ___" (وہ ایک طرح خوش تھی کہ کوئی اس کی باتیں سن نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ یہ صحیح لفظ معلوم نہیں ہوتا تھا) ___ "لیکن پھر تم جانو مجھے ان سے ملک کا نام پوچھنا پڑے گا۔ اری خالہ جی۔ کیا یہ نیوزی لینڈ ہے؟ یا آسٹریلیا ہے؟" (اور یہ الفاظ بولتے ہوئے اس نے تعظیماً جھکنے کی کوشش کی ___ ذرا ہوا میں سے گرتے ہوئے تعظیماً جھکنے کا سوچو تو! تم کر سکتی ہو ایسا کرتب؟) ___ "اور وہ خالہ جی میرے پوچھنے پر مجھے کتنی نالائق، جاہل، چھوٹی لڑکی سمجھیں گی کہ یہ اتنا بھی نہیں جانتی۔ نہیں یوں پوچھنا درست نہیں ہوگا ___ اور شاید ملک کا نام کہیں لکھا ہوا ہی ہو اور میری نظر وہاں پڑ جائے۔"

نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ اور تو کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ اس لئے ایلس پھر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی "میرا خیال ہے۔ ڈینا آج رات مجھے نہ پا کر بڑی اداس ہوگی۔ (ڈینا گھر کی بلی کا نام تھا) ___ "خدا کرے چائے پر ان کو اس کی دودھ کی پرچ یاد رہ جائے۔ اری ڈینا میری پیاری۔ میرا جی کرتا ہے تم اس وقت یہاں میرے ساتھ نیچے ہوتیں۔ کیا لطف آتا۔ نہیں بھئی۔ ہوا میں چوہے تو ہوں گے نہیں۔ نہ سہی لیکن تم شاید کوئی چمگادڑ دبوچ سکتیں۔ اور وہ بھی تو تم جانو ہو بہو چوہے کی طرح ہوتی ہے۔ ارے کیا بلیاں چمگادڑیں کھاتی ہیں!" اور یہاں ایلس کو کچھ کچھ نیند سی آنے لگی اور وہ خواب آلود کیفیت میں خود سے یوں بولتی چلی گئی "کیا بلیاں چمگادڑیں کھاتی ہیں؟ کیا بلیاں چمگادڑیں کھاتی ہیں" اور کبھی "کیا چمگادڑیں بلیاں کھاتی ہیں" کیونکہ تم جانتے ہو چونکہ کسی سوال کا جواب اس کو نہیں آتا تھا، اس لئے سوال کو الٹا سیدھا کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا، یوں کہہ لو یا دوں کہہ لو۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ سوتی جا رہی ہے۔ اور اس نے ایک خواب بھی دیکھنا شروع کر دیا جس میں وہ ڈینا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی اور بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھ رہی تھی "ڈینا۔ سچ سچ بتا۔ کیا تم نے کبھی چمگادڑ کا نوالہ کیا ہے؟" اتنے میں اچانک بھد! بھد! بھد! وہ شاخوں اور خشک پتوں کی ایک ڈھیری میں آن دھنسی اور گرنے کا قصہ ختم ہو گیا۔

ایلس کو ذرہ برابر بھی چوٹ نہ لگی اور جھٹ سے اچھل کھڑی ہوئی۔ اس نے اوپر نگاہ ڈالی لیکن اوپر اندھیرا ہی اندھیرا چھایا تھا۔ اس کے سامنے ایک لمبی رہ گزر تھی اور سفید خرگوش اس میں جلدی جلدی قدم مارتا ہوا ابھی تک نظروں میں تھا۔ ایک لمحہ بھی تو گنوانے کا نہ تھا۔ اور ایلس خرگوش کے پیچھے ہوا کی طرح لپکی اور عین اس موقع پر جا پہنچی جہاں خرگوش ایک موڑ مڑتے ہوئے یہ کہتا جاتا تھا "اوہ۔ میرے کان! اوہ۔ میری مونچھیں۔ کتنی دیر ہوتی جاتی ہے!" ایلس تھی تو خرگوش سے بس چار قدم پیچھے ہی لیکن جب اس نے موڑ گھوما تو خرگوش کا کہیں پتہ تک نہ تھا۔ اس نے خود کو ایک لمبے سے نیچی چھت کے ہال کمرے میں پایا۔ چھت سے لٹکی ہوئی لالٹینوں کی قطار اس ہال کو روشن کئے تھی۔

ہال کے چاروں طرف دروازے تھے مگر سارے کے سارے بند مقفل، چابی تالے سے بند۔ ایلس نے ایک طرف ایک کونے سے دوسرے کونے اور دوسری طرف اُلٹے رخ چل پھر کر ہر ایک دروازے کو باری باری کھولنے کی کوشش کی۔ پھر وہ یہ سوچتی ہوئی کہ یہاں سے باہر کیونکر جا سکوں گی، ہال کے درمیان میں چلنے لگی۔

اچانک وہ ایک چھوٹی سی تین پایوں کی میز کے پاس سے گزری۔ جو ساری کی ساری ٹھوس بلور کی بنی تھی۔ اس کے اوپر کچھ بھی نہ تھا ماسوائے ایک ننھی سی سنہری چابی کے، اور ایلس کو سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ ہو نہ ہو یہ ہال کے کسی ایک دروازے کے تالے کو لگتی ہوگی۔ لیکن ہائے رے مصیبت! یا تو تالے بہت بڑے نکلے یا چابی بہت چھوٹی تھی، ایک دروازہ بھی تو اس چابی سے نہ کھل سکا۔ دوسری بار اس نے جو ہال کا چکر کاٹا تو دیکھتی کیا ہے کہ ایک جگہ ایک چھوٹا سا پردہ لٹکا ہے اور اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا دروازہ ہے، بس کوئی پندرہ انچ اونچا۔ اس نے ننھی سنہری چابی کو تالے کے سوراخ میں جو آزما کر دیکھا تو واہ رے واہ، وہ اس کو لگ گئی۔

ایلس نے دروازہ کھولا، اس نے دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے سے کوچے میں کھلتا ہے۔ کوچہ بھی اتنا جتنا ایک خرگوش کا بھٹ۔ اس نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر جو نگاہ ڈالی تو کوچے میں آگے جا کر ایک خوبصورت ترین باغ کھڑا تھا۔ جیسا اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

کتنا ہی اس کا دل چاہا کہ کاش وہ کسی طرح اس اندھیرے ہال کمرے سے نکل سکے اور ان چمکیلے پھولوں کے تختوں اور ان ٹھنڈے پھوار برساتے فواروں میں سیر سپاٹا کرے، لیکن وہ تو دروازے میں سے اپنا سر تک نہیں گھسیڑ سکتی تھی۔

اور اگر میرا سر دروازے میں سے نکل بھی جائے غریب ایلس نے سوچا "میرے کندھے تو پیچھے رہ جائیں گے۔ اور کندھوں کے بغیر سر کا کیا فائدہ۔ اوہ کاش میں ایک دوربین کی طرح پچک سکتی۔ میرا خیال ہے میں شاید پچک تو جاؤں گر مجھے پچکنے کی ابتدا کرنی آجائے۔" تم جانو اتنی غیر معمولی عجیب و غریب چیزیں حال میں اس کے ساتھ واقع ہوئی تھیں کہ ایلس سوچنے لگی کہ بہت سی کم چیزیں ایسی ہوں گی جن کا ہونا بالکل ناممکن ہو۔

چھوٹے دروازے کے پاس انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس لئے وہ میز کی طرف پلٹ گئی۔ اسے کچھ کچھ امید تھی کہ اس پر ایک اور چابی رکھی ہوگی یا چابی نہیں تو ایک ایسی کتاب ہی جس میں لوگوں کو دوربین کی طرح پچکانے کی ترکیبیں درج ہوں گی۔ اس بار ایلس کو اس پر ایک چھوٹی سی بوتل دھری ہوئی ملی (ایلس نے سوچا "یقیناً یہ پہلے تو یہاں نہیں تھی")۔ بوتل کے تنگ حصے کے گرد اگرد ایک کاغذ کا لیبل چسپاں تھا۔ اس لیبل پر جلی حروف میں یہ الفاظ بڑے خوبصورت چھپے تھے۔

"مجھ کو پی جاؤ"

"مجھ کو پی جاؤ" کہنا تو خیر ٹھیک تھا مگر سیانی چھوٹی ایلس ایسا الٹ پلٹ کام کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ "نہ بھئی نہ" ایلس نے کہا "میں پہلے اچھی طرح پتہ لگاؤں گی اور دیکھوں گی کہ اس پر "زہر" کا نشان چھپا ہوا ہے یا نہیں"۔ بات یہ تھی کہ ایلس نے بچوں کے متعلق بہت سی مزے کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں جن میں بچے یا تو آگ میں جل جاتے تھے یا جنگلی جانور ان کو لقمہ بنا لیتے تھے یا اور گڑبڑ باتیں ہوتی تھیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ وہ اپنے دوستوں کے سکھائے ہوئے عام اصول یاد نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً ایک سرخ دہکتے چمٹے کو زیادہ دیر پکڑے رکھو تو تمہارا ہاتھ جل جائے گا۔ اور اگر تم اپنی انگلی کو خوب زور سے چاقو سے تراشو تو اس میں سے خون نکل آئے گا۔ اور اسی طرح ایلس یہ نہیں بھولی تھی کہ اگر تم "زہر" کا نشان لگی بوتل سے زیادہ خوراک پی لوگے تو جلد یا بدیر تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

خیر اس بوتل پر "زہر" کا نشان نہیں لگا تھا اس لئے ایلس نے ہمت کر کے اس کی دوائی کو چکھا۔ وہ تھی بڑی مزیدار (ذائقہ ایسا تھا کہ تھوڑی ہی دیر میں) ایلس اسے دو تین گھونٹ میں چٹم کر گئی)

"کتنی اوٹ پٹانگ سی بات ہے" ایلس نے کہا "میں ضرور ایک دوربین کی طرح پچک رہی ہوں۔"

اور تھی بھی یہی بات۔ وہ اب صرف نو انچ اونچی تھی اور اس کا چہرہ اس خیال سے چمک اٹھا کہ وہ چھوٹے دروازے میں داخل ہو کر خوبصورت باغ میں جانے کے لئے بس ٹھیک قد کی ہو گئی ہے۔ پہلے تو اس نے چند منٹ انتظار کیا کہ دیکھوں کہ اس سے زیادہ اور پچک سکتی ہوں یا نہیں سچی بات یہ ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ پریشان بھی تھی۔

"تم جانو" ایلس نے اپنے آپ سے کہا "اگر تم یونہی پچکتی گئیں تو عین ممکن ہے کہ موم بتی کی طرح بالکل ہی گم ہو جاؤ۔ اللہ جانے اس وقت میں کیسی ہوں گی۔" اور اس نے تصور باندھنے کی کوشش کی کہ موم بتی کے بجھائے جانے پر اس کا شعلہ کیسا دِکھتا ہوگا۔ اسے کبھی ایسے شعلے کو دیکھنا یاد نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ دیکھ کر کہ مزید کچھ نہیں ہو رہا اور وہ پچک کر جتنی ہو گئی تھی اتنی ہی تھی، اس نے فی الفور باغ میں جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہائے رے غریب ایلس! جونہی وہ دروازے تک پہنچی سے یاد آیا کہ ننھی سنہری چابی کو تو وہ میز پر بھول آئی ہے۔ اور جب وہ اس کو لینے کی خاطر پلٹ کر میز کی طرف گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ اس تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ بھلا نو انچ قد والی میں سے کیسے ممکن تھا۔ وہ چابی کو بلور میں سے صاف دیکھ سکتی تھی۔ اس نے میز کے ایک پائے سے اوپر چڑھنے کے سب جتن کیے مگر بالکل بیکار۔ یہ بڑا پھسلنا تھا۔ جب وہ کوشش کر کر کے تھک ہار گئی تو بے چاری چھوٹی ہاتھ بھر کی لڑکی بیٹھ گئی اور رونے لگی۔

"بھئی اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا" ایلس نے قدرے تندی سے خود کو تنبیہ کا۔ "میں تمہیں نصیحت کرتی ہوں کہ اسی منٹ یہ رونا بند کرو۔"

وہ بالعموم اپنے آپ کو بڑی اچھی نصیحت کیا کرتی تھی (اگرچہ اس پر عمل کبھی کبھار ہی کیا کرتی تھی)۔ اور بعض اوقات تو وہ اپنے آپ کو اتنی سختی سے کوسنے دیا کرتی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور ایک دفعہ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے کانوں پر چپت لگانے کی کوشش کی تھی ——— اس قصور پر کہ اس نے "کروکے" کے کھیل میں جو وہ اپنے ساتھ کھیل رہی تھی، خود کو جھانسا دیا تھا۔ یہ سن لو کہ یہ عجیب بچی اپنے آپ کو جھوٹ موٹ دو ہستیاں سمجھنے کی بڑی شوقین تھی۔ "مگر بھئی اب دو ایلس بننے کا کوئی فائدہ نہیں۔" غریب ایلس سوچنے لگی "میرا تو اب اتنا کچھ بھی نہیں بچا۔ پچکنے سے، جو ایک بھی معقول لڑکی بن سکوں۔"

جلد ہی اس کی نظر ایک چھوٹی سی بلور کی صندوقچی پر پڑی جو میز کے تلے پڑی رکھی تھی۔ اس کو جو کھولا تو اس میں سے ایک بہت ننھا سا کیک نکلا جس پر "مجھے کھا لو" کے الفاظ کشمش کے دانوں سے بڑے خوبصورت نقش تھے۔

"اچھا تو میں اسے کھا لیتی ہوں" ایلس نے کہا۔ "اور اگر اس کے کھانے سے بڑی ہو جاؤں تو میں چابی تک پہنچ جاؤں گی۔ اور اگر اور زیادہ پچک جاؤں تو آسانی سے دروازے کے نیچے سے گھسٹ کر رینگ سکوں گی یعنی میں دونوں صورتوں میں باغ میں جا پہنچوں گی۔ جو ہو سو ہو مجھے اس کی پروا نہیں۔"

اس نے تھوڑا سا کیک کھایا اور فکر کرتی ہوئی اپنے آپ سے کہنے لگی "کس طرف کو؟ کس طرف کو؟" یہ کہتے وقت اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر کی چوٹی پر رکھ دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ پتہ لگے کہ وہ کس طرف کو جا رہی ہے (یعنی بڑھ رہی ہے یا سکڑ رہی ہے) وہ یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ وہ اتنی کی اتنی ہی رہی اور اس کا قد نہ بڑھا نہ گھٹا۔ ویسے جب کوئی کیک کھاتا ہے تو عموماً یہی کچھ ہوتا ہے۔ اب ایلس خلاف معمول الٹ پلٹ باتوں کے ہو گزرنے کی اس قدر توقع کرنے لگ گئی تھی کہ زندگی کا اس طرح عام طریقے سے چلنا اسے بڑا غیر دلچسپ اور بیہودہ معلوم ہوا۔

اس لئے وہ کیک کی طرف متوجہ ہو گئی اور دو تین منٹ کے بعد بے چارے کیک کا پتہ تک نہ تھا۔

آنسوؤں کا جوہڑ

"عجیب تر اور عجیب ترین!" ایلس چلائی (وہ اس حد تک حیران تھی کہ وقتی طور پر صحیح زبان بولنا بھی بھول گئی) "اب میں ایک ایسی بڑی دوربین کی طرح جو کبھی کسی نے بنائی ہوگی کھلتی چلی جا رہی ہوں۔ پاؤں تمہارا خدا حافظ!" (وہ اس لئے کہ جب اس نے نیچے کو نگاہ ڈال کر دیکھا تو وہ اتنے دور جا چکے تھے کہ تقریباً اوجھل ہو رہے تھے)

"اف میرے غریب چھوٹے سے پاؤں۔ ہائے میرے پیارو، اب تمہاری خاطر سے تمہارے جوتے اور جرابیں تم کو کون پہنائے گا۔ مجھ کو یقین

ہے کہ اب میں یہ نہیں کر سکوں گی میں تم سے اتنی بڑی دور ہوں گی کہ کیوں تمہارا تردد کرنے لگی۔ اب بھئی خود ہی جیسے تیسے اپنا بندوبست کرو۔"

"لیکن مجھ کو ان سے شفقت کا برتاؤ کرنا ہوگا" ایلس کہتی گئی "ورنہ وہ اس سمت نہیں اٹھیں گے جدھر کو میں جانا چاہوں گی۔ ایسا کیوں نہ کروں! میں ہر کرسمس پر ان کو جوتوں کا ایک نیا جوڑا دے دیا کروں گی۔ پھر تو وہ ناراض نہیں ہوں گے"

اور وہ اپنے دل میں منصوبے تیار کرنے لگی کہ کیونکر جوتوں کو پاؤں تک پہنچاؤں گی۔

"جوتوں کو قاصدوں کے ذریعے ارسال کرنا پڑے گا" اس نے سوچا "اور اپنے ہی پاؤں کو تحفہ بھیجنا کتنا مضحکہ خیز ہوگا۔ اور ہدایات بھی کتنی عجیب لگیں گی۔

ایلس کے دائیں پاؤں صاحب بہادر
بمقام۔ آتش دان کا نمدا نزد جنگلہ
(ایلس کا بہت بہت پیار)

اوہ! ایلس تم بھی حد ہو! کیسی انٹ شنٹ باتیں سوچتی ہو۔"

عین اسی وقت اس کا سر ہال کمرے کی چھت سے جا ٹکرایا۔ اصل میں وہ اب نو فٹ سے کچھ اوپر ہی ہو گئی تھی۔ اور اس نے جھٹ پٹ ننھی سنہری چابی کو اٹھایا اور بھاگی باغیچے کے دروازے کو۔

بے چاری ایلس! اس سے زیادہ اور وہ کیا کر سکتی تھی کہ کروٹ کے بل لیٹ کر ایک آنکھ سے دروازے کے سوراخ میں سے باغیچے کا لطف اٹھائے نو فٹ کی بڑھتی ہوئی ایلس دروازے میں سے گزر کر نکلے تو کیونکر! اور وہ بیٹھ گئی اور پھر رونے لگی۔

"اری کچھ شرم کرو" میں نے کہا "تمہارے جتنی بڑی لڑکی، (اب وہ یہ یقیناً کہہ سکتی تھی) اور اس طرح روتی چلی جائے! میں تمہیں حکم دیتی ہوں فوراً یہ رونا بند کرو۔"

لیکن وہ کسی طرح روتی رہی۔ آنسوؤں کے گھڑے کے گھڑے بہاتی ہوئی حتیٰ کہ اس کے گرداگرد کوئی چار انچ گہرا اور ہال کمرے کے نصف تک پھیلا ایک بڑا سا جوہڑ بن گیا۔ (اس طرح متواتر بے تحاشا روتے رہنے سے جوہڑ تو کیا ایک اچھی خاصی جھیل بھی بن سکتی ہے۔)

تھوڑے وقفے کے بعد اس نے کچھ فاصلے سے آتی ہوئی پاؤں کی ہلکی تھپ تھپ کی آواز سنی۔ اور اس نے یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا چیز آ رہی ہے جلدی سے آنسو پونچھے اور آنکھوں کو خشک کیا۔ یہ تو وہی سفید خرگوش نکلا۔ لیکن وہ دوسری سج دھج سے وہ چھیل چھبیلا بنا، بھڑکدار وردی پہنے، ایک ہاتھ میں سپید میمنے کے چمڑے کے دستانوں کا جوڑا اور دوسرے میں ایک بڑا پنکھا لئے چلا آ رہا تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا اپنے آپ سے بڑبڑاتا جاتا تھا۔ "اوہ، نواب زادی! اوہ، نواب زادی! اگر اس کو میری راہ دیکھنی پڑی ہے تو وہ مجھ کو کچا کھا جائے گی!"

ایلس کی جان پر اتنی بنی تھی کہ وہ ہر کسی سے مدد چاہنے کو تیار تھی۔ اس لئے جب خرگوش اس کے نزدیک آیا تو وہ دھیمی دبی ہوئی آواز میں یوں شروع ہوئی "جناب، اگر تکلیف نہ ہو تو ......" خرگوش یکلخت بدکا، دستانے اور پنکھا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر گئے۔ اور اس نے اندھیرے میں اتنی تیزی سے بھاگنے کی کی جتنی تیزی سے اس کے قدم اسے لے جا سکتے تھے۔

ایلس نے پنکھا اٹھا لیا، اور چونکہ ہال کمرہ بڑا گرم تھا، اس لئے جتنی دیر وہ باتیں کرتی رہی وہ اپنے آپ کو پنکھا جھلتی رہی "ڈیئر، ڈیئر! آج ہر ایک چیز کیسی عجیب ہے اور کل سب چیزیں معمول کے مطابق ہوتی رہیں تھیں۔ میں خود ہی تو رات کو نہیں بدل گئی؟ ذرا سوچوں تو! کیا میں وہی تھی جب میں اس صبح بستر سے اٹھی۔ مجھے کچھ کچھ خیال ہوتا ہے کہ میں قدرے مختلف محسوس کر رہی تھی لیکن اگر میں وہی نہیں ہوں تو اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر میں ہوں کون؟ دراصل یہی تو بڑی الجھن ہے کہ اگر میں کل والی ایلس نہیں ہوں تو پھر کون لڑکی ہوں اور میرا نام کیا ہے" اور وہ ان سب بچوں کے متعلق سوچنے لگی جن کو وہ جانتی تھی اور جو اس کے ہم عمر تھے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ ان میں سے کسی کے ساتھ تو نہیں بدل گئی۔

"یہ تو مجھے یقین ہے کہ ادا میں نہیں ہوں" اس نے کہا "کیونکہ اس کے بال تنی گھونگھریالی لٹوں میں اڑتے رہتے ہیں اور میرے تو گھونگھریالے ہیں ہی نہیں..... اور میبل کو کچھ بھی نہیں آتا۔ اس کے علاوہ وہ وہ ہے اور میں میں..... اور —— بھئی یہ سب کچھ کتنا چکرا دینے والا ہے۔ میں دیکھوں تو کیا اب میں وہ سب چیزیں جانتی ہوں جو میں پہلے جانتی تھی۔ ہاں، چار ضرب پانچ بارہ ہوتے ہیں اور چار ضرب چھ ہوئے تیرہ۔ اور چار ضرب سات یہ بنے —— اوہ اس رفتار سے تو میں کبھی بیس تک نہ پہنچ سکوں گی۔ خیر ضرب کا پہاڑا کچھ ظاہر نہیں کرتا..... اب جغرافیے کو آزما کر دیکھیں۔ لندن پیرس کا دارالحکومت ہے اور پیرس روم کا دارالحکومت ہے۔ اور روم —— نہیں نہیں۔ یہ سارے کے سارے جواب غلط ہیں۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میں ضرور میبل میں بدل گئی ہوں۔ تبھی تو مجھے کچھ نہیں آرہا۔ اچھا اب میں وہ کتاب کا گیت تو دوہرا کر دیکھوں۔ مجھے یاد ہے یا نہیں...

"کرتا ہے وہ کیسے چھوٹا....."

اور اس نے اپنے ہاتھوں کو اپنی گود میں ڈال لیا جیسے وہ اپنا سبق پڑھ رہی ہو۔ اور اس گیت کو دوہرانے لگی۔ مگر اس کی آواز بھاری اور اکھڑی ہوئی نکلی اور الفاظ بھی جو آئے تو الٹ سلٹ۔ ویسے نہیں جیسے پہلے اس کی زبان پر آتے تھے:

کرتا ہے وہ کیسے چھوٹا مگرمچھ — اور نیچے کیسے پھیلاتا ہے
ننھا منا گل گوتھنا مگرمچھ — کتنے ستھرے پیارے پنجے
اپنی چمکیلی دم کو پالش — چھوٹی ننھی منی مچھلیاں
نیل کے پانی کو کیسے — ان کو پاس بلاتا ہے
زرین کھپروں پر پھینکے — اور جبڑوں میں لے جاتا ہے
کیا دانت نکالے ہنستا ہے وہ! — گل گوتھنا مگرمچھ
کتنا اچھا لگتا ہے وہ! — ننھا منا مگرمچھ

"مجھے یقین ہے کہ یہ گیت کے صحیح الفاظ نہیں ہیں" بے چاری ایلس نے کہا اور آگے جاری رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے "ہو نہ ہو میں ضرور ضرور میبل ہی ہوں۔ اور مجھ کو اب جا کر اس گندے چھوٹے سے گھر میں رہنا پڑے گا اور میرے کھیلنے کو بس پورے سو سے کھلونے ہوں گے۔ اتنے سارے سبق بھی تو مجھے یاد کرنے پڑیں گے نہیں بھئی۔ میں نے اب اس بارے میں پنا دل پکا کر لیا ہے۔ اگر میں میبل ہوں تو یہیں نیچے ٹھیر جاؤں گی۔ اور یہاں سے جلنے کا نام نہ لوں گی بے شک وہ اپنے سر نیچے کر کے پکارتے رہیں "پیاری پھر اوپر آجاؤ۔ میں نہیں جاؤں گی توبہ! توبہ! میں محض اوپر دیکھوں گی اور پوچھوں گی 'بھلا میں کون ہوں۔ پہلے مجھے یہ تو بتایئے' اور پھر اگر مجھے وہ لڑکی ہونا پسند ہوا تو میں اوپر چلی آتی ہوں اگر نہیں تو میں یہیں ٹھیروں گی اور جب تک میں کوئی اور نہیں ہو جاتی ادھر سے ہلوں گی نہیں....."

پھر اچانک ایلس پھوٹ پھوٹ کر جو رونے لگی تو اس کے آنسو ختم ہونے میں نہ آئے "ہائے کاش وہ سر نیچے کر کے سوراخ میں سے جھانکیں تو..... اُف! میں یہاں اکیلی ہونے سے کتنی بہت سی اکتا گئی ہوں!"

یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں نیچی کر کے اپنے ہاتھوں کو جو دیکھا تو بڑی حیران ہوئی کہ یوں باتیں کرنے کے دوران میں اس نے خرگوش کے سفید مینے کی کھال کے دستانے اپنے ایک ہاتھ پر چڑھا لئے تھے۔

"لو بھئی خوب رہی!" اس نے سوچا "میرا ہاتھ اس دستانے میں کیوں کر گھس گیا۔ میں ضرور پھر سکڑ رہی ہوں۔"

وہ اٹھی اور اپنے قد کو میز کے ساتھ ماپنے کے لئے میز کے پاس گئی۔ اس نے دیکھا کہ جہاں تک وہ اندازہ لگا سکتی تھی وہ اب تقریباً دو فٹ اونچی رہ گئی تھی اور تیزی سے مزید سکڑتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے فوراً جان لیا کہ اس کا سبب وہ پنکھا ہے جسے وہ ہاتھ میں لئے تھی۔ اس نے پنکھے کو پھینکنے میں دیر نہ کی اور یوں سمجھو عین وقت پر اپنے کو بالکل ہی سکڑ کر غائب ہونے سے بچا لیا۔

"یہ تو میں بال بال بچی" ایلس اس اچانک تغیر پر بے حد سہم گئی تھی مگر ساتھ ہی خود کو "موجود" پاکر بے حد خوش بھی ہوئی۔

"دیکھئے اب بھاگوں باغیچے میں" اس نے کہا، اور وہ بگٹٹ چھوٹے دروازے کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ پر افسوس۔ چھوٹا دروازہ پھر بند ہو چکا تھا اور ننھی سنہری چابی پہلے کی طرح بلوریں میز پر دھری تھی۔ غریب ایلس سوچنے لگی "اب تو معاملہ اور بھی چوپٹ ہو گیا۔ کیونکہ اتنی چھوٹی تو میں پہلے کبھی نہیں تھی، کبھی بھی نہیں۔ اور میں اس بات کا اعلان کئے دیتی ہوں کہ یہ بہت ہی برا ہوا ہے۔"

یہ الفاظ کہتے وقت اس کے پاؤں جو پھسلے تو شڑاپ! وہ تھوڑی تک نون کے پانی میں تھی۔ پہلے پہل وہ سمجھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح سمندر میں جا پڑی ہے۔ "جو سمندر میں جا پڑی ہوں" اپنے آپ سے کہنے لگی "تو اتنی خاص بات نہیں۔ اس صورت میں میں ریلوے سے گھر واپس جا سکتی ہوں۔"

(ایلس اپنی زندگی میں فقط ایک دفعہ ساحل سمندر پر گئی تھی اور اس عام نتیجے پر پہنچی تھی کہ انگلستان کے ساحل پر جہاں بھی جاؤ۔ وہاں کنارے کے ساتھ کچھ غسل کرنے کی مشینیں بھی ہوتی ہیں ..... اور لکڑی سے بنے پھاوڑوں سے ریت کو کھودتے ہوئے چند بچے ... اور پھر رہنے کے مکانوں کی قطار اور ان کے پیچھے ریلوے سٹیشن۔) خیر اس نے جلد ہی بھانپ لیا کہ وہ ان آنسوؤں کے جوہڑ میں پڑی ہے جو اس نے نو فٹ ہو جانے پر بڑی فراخ دلی سے بہائے تھے۔

"کاش میں اتنی زیادہ نہ روتی" ایلس نے جوہڑ میں سے نکلنے کی راہ پانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال اب اپنے ہی آنسوؤں میں ڈوب مرنے کی سزا پاؤں گی۔ ہوگی یقیناً یہ بڑی عجیب و غریب بات۔ خیر ویسے آج تو ہر ایک بات عجیب و غریب ہو رہی ہے۔"

اسی وقت اس نے جوہڑ میں تھوڑی دور کسی چیز کی چھپ، چھپ کی آواز سنی اور وہ اس کے قریب تیرتی ہوئی گئی کہ دیکھوں یہ ہے کیا۔ پہلے تو اس کو خیال گزرا کہ یہ کوئی والرس یا دریائی گھوڑا وغیرہ ہوگا۔ مگر پھر اسے یاد آ گیا کہ وہ تو بچک کر بہت چھوٹی سی رہ گئی تھی اور جلد ہی اسے پتہ چل گیا کہ یہ تو محض ایک چوہا تھا جو اس کی طرح پھسل کر جوہڑ میں آن پڑا تھا۔

"اب اس چوہے سے بات چیت کا کچھ فائدہ ہوگا؟" ایلس نے سوچا "ہر ایک چیز یہاں نیچے اتنی الٹ پلٹ ہے کہ میرے خیال میں اغلباً یہ بول سکتا ہوگا۔ چلو اس سے بات کر دیکھنے میں تو کوئی ہرج نہیں۔" سو اس نے آغاز کیا

"میاں چوہے! کیا آپ کو اس جوہڑ سے باہر نکلنے کا پتہ ہے۔ چوہے جی، میں یہاں تیرتے تیرتے تھک کر چور ہو گئی ہوں۔"

(ایلس نے سوچا کہ چوہے سے بات کرنے کا یہ مناسب طریقہ ہے۔ اس نے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ مگر اسے اپنے بھائی کی لاطینی گرامر کی یہ گردان یاد آ گئی تھی۔

ایک چوہا

چوہے کا

چوہے کو

ایک چوہا

او چوہے۔)

چوہے نے اسے قدرے راز جو نظروں سے تاکا۔ ایلس کو یوں لگا جیسے چوہے نے اسے آنکھ ماری ہو لیکن اس نے کہا کہوا یا کچھ بھی نہیں۔

"شاید اسے انگریزی نہیں آتی" ایلس نے سوچا "یقیناً یہ فرانسیسی چوہا ہے جو ولیم فاتح کے ساتھ انگلستان میں آیا ہے۔" (تاریخ کی ساری معلومات کے باوجود ایلس کو کوئی واضح پتہ نہ تھا کہ کس واقعے کو ہوئے کتنی مدت ہو چکی ہے) اس لئے اس نے اب چوہے پر فرانسیسی زبان آزمائی "واشٹ میا چاٹ"۔ جو اس کی فرانسیسی پڑھائی کی کتاب کا پہلا پہلا فقرہ تھا۔ چوہے نے پانی میں سے اچانک ایک جست لگائی اور ڈر کے مارے سرتاسر تھر تھر کانپنے لگا۔ "او، میں معافی چاہتی ہوں" ایلس جلدی سے چلائی۔ وہ اس بات پر پریشان ہو گئی کہ شاید اس نے بے چارے چوہے کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ "میں بھول ہی گئی تھی کہ تمہیں بلیاں اچھی نہیں لگتیں۔"

"بلیاں اچھی نہیں لگتیں!" "واہ رے واہ" چوہا ایک چیختی ہوئی جذبات بھری آواز میں چلایا۔ "یہ بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا بلیاں تمہیں اچھی لگتیں؟"

"ہاں شاید مجھے بھی نہ لگتیں۔" ایلس نے ایک تسلی آمیز لہجے میں کہا "بھئی خفا مت ہو...... اور پھر میں چاہتی ہوں تم ہماری بلی ڈینا سے ملے ہوتے۔ اگر تم اس کو دیکھ ہی لو تو سچ مچ دنیا جہاں کی سب بلیاں تمہیں اچھی لگنے لگیں...... ڈینا اتنی پیاری خاموش سی بلی ہے۔"

ایلس اسی طرح آرام سے جوہڑ میں تیرتے ہوئے آدھی خود کو اور آدھی چوہے کو مخاطب کرکے بولتی چلی گئی "اور چوہے۔ ہماری ڈینا آگ کے پاس بڑی ناز سے خرخراتی ہوئی بیٹھی رہتی ہے۔ ہائے اپنے پنجے چاٹتی اور منہ دھوتی ہوئی بڑی ہی اچھی لگتی ہے...... اور وہ تھپکنے کے لئے اتنی گدگدی گدری ہے... اور چوہے پکڑنے میں تو وہ اتنی مہارت رکھتی ہے...... اوہ بھئی مجھے معاف کرنا"...... (وہ چوہے کو بھول گئی تھی) "اوہ بھئی مجھے معاف کرنا" ایلس پھر چلا اٹھی۔

اس بار چوہے کا بال بال کھڑا تھا اور ایلس کو یقین تھا کہ وہ بڑا سخت ناراض ہو رہا ہوگا۔

"اچھا ہم اب ڈینا کی بات نہیں کریں گے۔" ایلس نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا "اگر تمہیں پسند نہیں ہے تو......"

"ہم خوب کہا" چوہا چیخا۔ وہ اب اپنی دم کی پھننگ تک لرز رہا تھا "جیسے میں اس موضوع پر بات کرنا پسند کروں گا۔ ہمارے خاندان میں بلیوں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ابا، امی، چچے، خالائیں، پھوپھے، پھوپھیاں سب کو بلیوں سے نفرت تھی...... اخ تھو۔ کیا بدخو، نیچ اور چھچھوری مخلوق ہے...... بس اس کا نام دوبارہ نہ لینا!"

"میں بالکل نہیں لوں گی" ایلس گفتگو کے موضوع کو تبدیل کرنے کی خاطر بڑی جلدی جلدی بولی "کیا تم۔ کیا تم۔ کتوں کو پسند کرتے ہو؟"

چوہے نے اس سوال کا جواب نہ دیا اس لئے ایلس نے بڑے اشتیاق سے اپنی بات جاری رکھی "ہمارے گھر کے پاس ہی ایک بڑا پیارا چھوٹا کتا رہتا ہے۔ تم چلو تو تمہاری اس سے ملاقات کراؤں۔ تم جانو۔ ایک چھوٹا، چمکدار دیدوں والا ٹیریر! اور بال اس کے خوب لمبے گھونگھریالے اور بھورے...... اور تم کوئی چیز مثلاً گیند وغیرہ پھینکو تو وہ اس کو اٹھا کر تمہارے پاؤں میں لا رکھے گا اور وہ اپنے کولھوں پر بیٹھ کر کھانا مانگے گا۔ اور بھی اس کی بہت سی باتیں ہیں۔ مجھ کو تو آدھی بھی یاد نہیں۔ اور تم جانو وہ ایک دہقان کا کتا ہے۔ اور وہ دہقان کہتا ہے کہ وہ اتنے کام کا ہے کہ سو پاؤنڈ اس کی قیمت ہونی چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کتا سب چوہوں کا صفایا کر ڈالتا ہے...... اوہ میں کیا کہہ گئی!"

"یہ میرے منہ سے کیا نکل گیا" ایلس ایک غمناک لہجے میں چلائی "مجھے ڈر ہے کہ میں نے پھر چوہے کو ناراض کر دیا ہے۔"

کیونکہ چوہا اس کے پاس سے تیرتا ہوا پرے جا رہا تھا، اتنی تیز رفتاری سے جتنی ممکن تھی۔ اور جاتے ہوئے جوہڑ میں اچھی خاصی ہلچل مچا رہا تھا، اس لئے اس نے بڑی ملائمت سے اسے آواز دی "پیارے چوہے۔ چوہے جی۔ واپس آجاؤ۔ اور ہم بلیوں اور کتوں کسی کے بارے میں بات نہیں کریں گے اگر تم ان کو پسند نہیں کرتے۔"

چوہے نے یہ سنا تو پلٹا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف تیر کر آنے لگا۔ اس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا (شدتِ جذبات سے، ایلس نے سوچا) اور اس نے ایک دھیمی کپکپاتی آواز میں کہا "آؤ۔ ساحل کو چلیں۔ اور پھر میں تمہیں اپنی آپ بیتی سناؤں گا۔ اور تم سمجھ جاؤ گی کہ میں بلیوں اور کتوں کو کیوں ناپسند کرتا ہوں۔"

اور اب وقت بھی تھا کہ یہاں سے چل دیا جائے۔ کیوں کہ جوہڑ ان پرندوں اور جانوروں سے جو اس میں آن گرتے تھے، پُر ہجوم ہو رہا تھا اور اس میں بڑی بھیڑ ہو رہی تھی۔ ایک بطخ۔ ایک ڈوڈو۔ ایک لوری اور ایک عقاب بچے کے علاوہ اور بھی بہت سے عجیب و غریب جانور جوہڑ میں تیرتے پھرتے تھے۔

ایلس اس مجمع کے آگے آگے تیرتی چلی اور اس کی رہنمائی میں یہ کل قبیلہ سلامتی سے ساحل پر جا اترا۔

راون

پنجابی: چندن نیگی   ترجمہ: شریف کنجاہی

وہ ہانپتی ہوئی کمرے سے باہر دوڑ آئی۔ موٹی سی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے کالے سیاہ سنورے سنورے سے بال اور موٹی گندھی ہوئی گت ڈھیلی ہو گئی تھی — گت جسے وہ اکثر دُلار کے ساتھ شانوں پر ڈال لیا کرتی تھی اور پھر کتنی کتنی دیر اپنے بھرے بھرے سے گورے گورے ہاتھوں کے ساتھ اسے پیار تی رہتی تھی۔ وہ ایک ہی جست کے ساتھ برآمدے میں آ گئی اور برآمدے سے سیڑھیوں میں۔ اس کے سارے جسم میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں جیسے بھٹی میں دانے بھُننے جا رہے ہوں۔ اسے لگا جیسے اس کی ہڈیاں دہک رہی ہیں، کوئلوں کی طرح۔ اور روئیں روئیں میں سے چنگاریاں اُبل رہی ہیں۔ اس کے کان گرم ہو چکے تھے۔ وہ دگڑ دگڑ کرتی ہوئی سیڑھیوں سے اُتر آئی۔ پریشان و پشیمان۔ "آخر وہ کیوں آئی تھی۔ کیوں آئی تھی۔ کوئی مرتا تھا تو مرتا۔ کوئی بیمار تھا تو ہوتا۔ اسے کیا تھا۔" کل اُس نے پیغام بھیجا تھا کہ "میں کتنے دنوں سے بیمار ہوں۔ پر تم دو منٹ کے لیے بھی فرصت نہیں نکال سکیں"! — اور اس نے وہاں بہت کٹھن وقت کاٹا۔

وہ اسے پیار کرنے لگ گئی تھی۔ ہاں پیار۔ جس لفظ سے اسے ساری عمر چڑ رہی تھی — ساری عمر وہ دُور دُور بھاگتی رہی اور اب زندگی کے اُدھر اپے پر پہنچ کر اسے کچھ پہچان سی ہونے لگی تھی۔ کئی بار وہ آپ سوچتی تو اسے اپنی گالوں پر پھُول کھِلتے سے محسوس ہونے لگتے۔ پہلی بار زندگی کے ایک خاص پڑاؤ پر وہ اسے چنگا چنگا سا لگنے لگا تھا۔ جیسے وہ اسے جنم جنم سے جانتی ہو۔ صدیوں سے ایک مدت سے۔ اب اس نے آپ بھُوک کو محسوس کیا تھا۔ کوئی اس کے اندر جھانکے اور اس کی رُوکھی رُوکھی سی زندگی کو پیار میں ڈبو دے۔ اس کی روح کو جانے پہچانے۔ اس نے اس کا کہا بھی مان لیا تھا کہ "پیار کے بغیر تو جیون مارُوتھل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کیا ہوا کہ تھل کی ریت ہی آنکھوں میں چبھتی رہے اور آپ چلتے جائیں۔ محض جیون سفر کاٹنے کے لیے۔" اس نے ان آنکھوں کی جھیلوں میں ڈبکی لگائی تو ساری کی ساری بھیگ گئی۔

اور اُس دوپہر — اُف — کتنی گرمی تھی۔ جون کا دن۔ کوّے کی بھی آنکھ نکل نکل جاتی۔ سورج سر پہ تھا اور دھُوپ بھی قہر وں کی تھی۔ سڑک اور بازار میں کوئی کوئی ہی کہیں کہیں نظر پڑتا اور ایسے ہی وہ اس کی عیادت کو گئی تھی۔

وہ ادھ لیٹا سا تھا۔ ایک ہاتھ میں سلگتی سگرٹ تھی۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے بالوں کو سہلاتا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

"اوہ — ہ — آئیے۔ اب پتہ چلا کہ مجھے بھی کوئی ۔۔۔۔۔ دفتر میں تو بات کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ مجھے آپ سے ڈھیروں باتیں کرنی ہیں۔ سچ مچ — جب آپ سامنے آ جاتی ہیں تو سب بھول جاتا ہوں۔" وہ بولتا جا رہا تھا۔ "آپ میری زندگی کا پہلا پیار ہیں ۔۔۔ میں نے پہلے کبھی بھی ۔۔۔ کبھی کسی کے ساتھ پیار نہیں کیا۔" اور وہ سوچ رہی تھی "یہ سوچتا ہے کہ مجھے اس بارے میں کسی قسم کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اسی طرح شہزادہ سلیم نے جب نور جہاں کو کہا ہوگا۔ "مہرو میں نے صرف تجھے ہی پیار کیا ہے۔ مہر میرا سچا پیار تمہیں ہو۔ تم نہ ملیں تو خدائے پاک کی قسم میں مر جاؤں گا۔ تو مجھے کیوں تڑپا رہی ہے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ پیار میں اتنی تڑپ بھی ہے اور توانائی بھی۔ تو انار کلی ہاں دیوار میں چُنی جانے والی انار کلی بھی ہوتی انار کلی پیار کی سسکتی روح ضرور پھڑک اٹھی ہوگی کہ مہرو ایسا نہیں ہے۔ یہ بڑے لوگ — پیار کے بہانے ۔۔۔ مہرو میری اس حالت کو دیکھ۔"

آپ ابھی تک کھڑی ہیں۔ بیٹھ ۔۔ ج ۔۔۔ دیکھیے میں کتنا فراموش مزاج ہوں۔ اور آپ کے سامنے تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں بیٹھ جاتی ہوں۔ کہئے آپ کا حال کیسا ہے؟"

"بس اَب تو ٹھیک ہی سمجھئے۔"

"ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟"

"کچھ نہیں — اَب کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔"

"دیکھیں کتنا بخار ہے۔" اَور اس نے اس کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھتے ہی اسے اپنی تلی سے دبا لیا۔

"مَیں کوئی تھرمامیٹر تو نہیں۔" اور اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھسکا لیا۔

"یہاں بیٹھیں۔ میرے پاس۔ سَر بہت درد کرتا ہے۔"

اس نے اپنی پتلی لانبی گوری انگلیوں سے اس کے ماتھے پر بام لگائی۔ بخار کافی تیز تھا۔ انگلیوں کی گرم و نرم چھوہ سے پہلے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر ایک دم اسے اپنی باہنوں میں جکڑ لیا — زور کے ساتھ۔ وہ چھٹپٹائی — نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے چھوڑ دیں۔" اس نے اپنے سلگتے ہونٹ اس کے گال پر رکھ دیئے ۔ ۔ ۔ گردن پر ۔ ۔ اس سے اُوپر نیچے ۔ اور جب ۔ ۔ ۔ جب ۔ ۔ ۔ وہ ایک ہی جھٹکے کے ساتھ اس کی باہنوں سے دور نکل گئی ۔ ۔ ۔

"نہیں نہیں ۔ ۔ ۔ مجھے یہ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ یہ کچھ نہیں چاہیئے ۔ ۔ ۔ نہیں چاہیئے۔"

جنالوی میں تو وہ بہت دفعہ اس کے شانے پر ساری رات سَر رکھے سوئی رہی اور وہ اپنی سخت۔ لانبی لانبی۔ کھردری انگلیوں کے ساتھ اس کا سر سہلا سہلا کر نرم نرم بالوں کے گچھے بناتا اسے سلاتا رہا اور پَو پھٹتے ہی اسے لگتا جیسے کوئی اس کے کانوں میں گنگنا رہا ہو کہ 'سویر جاگ پڑی ہے ۔ سورج کی لالی دیکھو اندھیرے میں نکل آئی ہے۔ کوئل بھی تو کُو ۔ ۔ ۔ ہُو ۔ ۔ ۔ کُو ۔ ۔ ۔ ہُو۔ کا گیت گانے لگی ہے۔ ہاں سچ مچ۔ یہ تو وہی بات ہوئی۔ بیچاری آموں کو بُور پڑنے پر گانا شروع کرتی ہے اور جب وہ آم پک جاتے ہیں تو ایک بھی نہیں کھا سکتی۔ تو نے میری بھی یہی حالت کر دی ہے" اور اس کی آنکھ کھل جاتی۔

آج کڑکتی دوپہر میں انہیں ہاتھوں نے۔ انہیں باہنوں نے اس کے جسم کے گرد ۔ ۔ ۔ اس کے سینے کی بھینچ میں ۔ ۔ ۔ اور وہ "نہیں ۔ ۔ نہیں" کہہ کر بھاگ آئی۔ وہ سیڑھیاں اُتر آئی تھی جن پر وہ چاہ کے ساتھ اسے ملنے کو چڑھی تھی۔ اسے راون یاد آ گیا۔ لوگ راون کو بُرا کہتے ہیں۔ راکھشس جانتے ہیں۔ ہر سال صدیوں سے اس کا پُتلا بنا کر جلاتے ہیں۔ پشت در پشت اس سے نفرت کی جا رہی ہے۔ لیکن سیڑھیاں اُترتے ہوئے اسے راون اچھا لگا اور اس نے سیتا کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی تھی۔ وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن راون سیتا کو مناتا رہا۔ منتیں کرتا رہا۔ سونے کی لنکا کا راجہ راون اور اس کے قبضہ میں آئی ہوئی سیتا۔ پھر سیتا آگ آزمائش میں بھی پوتر ہی نکلی — اور اس نے راون کو نمسکار کرتے ہوئے آنکھیں جھکا لیں۔

پسینہ پسینہ۔ لال سُرخ گال۔ سُوجی سوجی آنکھیں۔ کڑکتی دوپہر۔ اور وہ تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ اس نے اس کی کتاب کو ورق ورق کر دیا اور گندے نالہ میں پھینک دیا۔ اور خود اپنے گھر ۔ ۔ ۔ گھر آ کر اس نے رام سیتا کی فوٹو کے آگے ایک بار پھر راون کو ماتھا ٹیکا۔

انقلابِ فرانس سے پہلے

تاریخی ناول "شاہ فرانس کی محبوبہ" کا ایک باب

ڈاکٹر آغا افتخار حسین

یہ ایک فرانسیسی لڑکی ژین کی کہانی ہے جو اٹھارہویں صدی میں ایک اوسط درجے کے گھرانے میں پیدا ہوئی اور اپنے حسن و جمال اور ذوق و ذہانت کی وجہ سے شاہ فرانس لوئی پانزدہم کی منظورِ نظر ہوگئی۔ اس نے بیس سال شاہی محل میں رہ کر بادشاہ کے دل و دماغ پر حکومت کی اور اس دوران فرانس کے دانشوروں، ادیبوں فلسفیوں اور شاعروں کی مدد کی اور اس طرح اس فکری تحریک کو تقویت پہنچائی جو فرانسیسی عوام کو ظلم و استبداد سے نجات دلانے کا باعث ہوئی۔

ژین جوان ہوچکی ہے اور ایک متموّل تاجر سے شادی کرکے مادام دیتیول بن چکی ہے۔ بادشاہ سے شاہی شکارگاہ میں سرسری سی ملاقات ہوئی ہے۔ لیکن ابھی ملاقات نے محبت کی شکل اختیار نہیں کی۔ زیرِ نظر باب میں فرانس کے چند ممتاز دانشوروں کی ایک محفل یا مذاکرے کی مختصر روداد بیان کی گئی ہے۔ یہ محفل ژین کے دیوان خانے میں منعقد ہوئی اور اس میں ایک کتاب تحریر کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ ایک کتاب جو فکر آفریں ثابت ہوئی اور انقلاب آفریں بھی۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانس میں فکر و تہذیب کے فروغ کے چار اہم مراکز تھے۔ پہلا اہم مرکز بادشاہ کا محل قصرِ ورسائی تھا جسے شاہ لوئی چہاردہم نے سترھویں صدی میں بنوایا تھا۔ یہ بادشاہ مطلق العنان اور جابر ہونے کے باوجود علم و فن کا قدردان تھا۔ امرا سلطنت میں سے بیشتر صاحب ذوق تھے۔ دربار شاہی کی علم دوستی کی وجہ سے ملک کے دانشور، ادیب، شاعر، موسیقار، مصور وغیرہ پیرس ہی کا رُخ کرتے اور وہیں آباد ہو جاتے اور بادشاہ اور امرا کی نوازشوں سے فیضیاب ہوتے قصرِ ورسائی کے ایوان ہمیشہ اہل علم و فن کی محفلوں سے گرم رہے۔ چنانچہ شاہی محل میں علم و فن تہذیب و تمدن، حسن گفتار، اندازِ نشست و برخواست وغیرہ کا ایک معیار قائم ہوگیا جو اہل فرانس کے لئے ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ روایت لوئی چہاردہم کے انتقال کے بعد ریجنسی اور لوئی پانزدہم اور اس کے بعد انقلابِ فرانس تک قائم رہی۔

فکر و تہذیب کا دوسرا مرکز پیرس کی قدیم اور مشہورِ عالم یونیورسٹی "سوربون" تھی جس کے پروفیسر دربار شاہی میں بھی نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے علم و فضل کی شہرت تمام مہذب دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ تیسرا مرکز فرانس کی "اکادمی" تھی۔ جس کے مختلف شعبے قدیم اور جدید علوم و فنون کی ترویج و ترقی میں اہم کردار کر رہے تھے۔ اکادمی کے ارکان کو ان کے علم و فضل کے اعتبار سے "غیر فانی" افراد قرار دیا جاتا تھا یہ اعزاز فرانس کی اکادمی کے ارکان کو اب بھی حاصل ہے۔

فکر و تہذیب کا چوتھا اہم اور دلچسپ مرکز پیرس کے دیوان خانے (SALON) تھے۔ پیرس کی بعض ذہین، صاحبِ ذوق، حسین اور متموّل خواتین اپنے دیوان خانوں میں دانشوروں، فنکاروں اور مشاہیر کو مدعو کرتی تھیں اور اپنے حسنِ گفتار و اخلاق سے ایک ایسی پرسکون اور فکر انگیز فضا پیدا کر دیتی تھیں کہ اہل محفل کی بہترین صلاحیتیں جاگ جاتی تھیں۔ حسنِ گفتار ہمیشہ سے اہلِ فرانس کا امتیاز رہا ہے۔ ان دیوان خانوں نے اس

ذوق کو اور نکھارا۔ دیوان خانوں کی محفلیں اکثر علمی مذاکروں کی شکل اختیار کر لیتیں۔ مختلف موضوعات پر نہایت خوبصورت الفاظ میں اظہارِ خیال ہوتا، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی خاطر خواہ داد ملتی۔ خواتین مردوں کے تعریفی جملوں کا لطف اٹھاتیں اور بعض اوقات کسی خاتون کی محض ایک معنی خیز مسکراہٹ ہی کسی مفکر کو بے چین کر دینے کے لیے کافی ہوتی اور افکارِ نو کی تخلیق میں معاون ہوتی۔

صاحب خانہ خاتون گرمیِ محفل قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی اور فضا میں بے کیفی پیدا نہ ہونے دیتی۔ گفتگو کے موضوعات دورانِ محفل خود بخود متعین ہوتے چلے جاتے۔ عموماً علمی، فنی، تہذیبی اور سیاسی موضوع زیرِ بحث آتے اور ایک آزاد ماحول ہونے کی وجہ سے ہر موضوع پر آزادانہ اظہارِ خیال ہوتا۔ بعض دانشوروں اور اہلِ ذوق کو ان محفلوں میں ایسے موضوعات پر تبادلۂ خیال کا موقع مل جاتا تھا۔ جن کے بارے میں کہیں اور گفتگو نہیں کی جا سکتی تھی۔ شاہ لوئی چہاردہم کے زمانے سے ملک میں سخت قسم کا سنسر نافذ تھا۔ کوئی کتاب حکومت کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکتی تھی لیکن حکومت کے سنسر سے زیادہ سخت سنسر اہلِ کلیسا کا تھا جو ہر قسم کی علمی بحث کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اگر انہیں ذرا بھی شبہ ہو جاتا تھا کہ کسی شخص کی گفتار یا تحریر میں جدت یا آزاد خیالی کی رمق موجود ہے جو کلیسا کے اقتدار سے متصادم ہو سکتی ہے تو وہ فوراً اربابِ حکومت پر اثر انداز ہو کر شخص متعلقہ کے خلاف کارروائی شروع کرا دیتے تھے۔ اس لیے پیرس کی اہلِ ذوق خواتین کے یہ دیوان خانے اس ذہنی گھٹن سے نجات کا ایک ذریعہ تھے جو اظہارِ خیال پر قدغن عائد کرنے سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس طرح ان محفلوں نے افکارِ تازہ کی نمود و بقا کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کیا اور فکر و فن، تہذیب و شائستگی کے اقدار اور وہ معیار قائم ہوتے جن کے اثرات عوام الناس ہی پر نہیں بلکہ قصر و رسائی اور اربابِ حکومت پر بھی مرتب ہوئے۔

ان انجمن آرا خواتین میں سترھویں صدی کی مارکوئش دو رامبوئیے (RAMBOUILLET) اور اٹھارویں صدی کی مادام جیوفراں (GEOFFRIN) اور مادام دوفاں (DEFFAND) بہت مشہور ہوئیں۔ ان کے علاوہ پیرس کی متعدد خواتین کے دیوان خانے فرانس کی تہذیبی تاریخ میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں ان دیوان خانوں میں علم و فن کی بعض ایسی تحریکیں ابھریں جن کے نہایت دور رس معاشرتی اور سیاسی اثرات نمایاں ہوتے۔ ان محفلوں میں فرانس کے فلسفیوں کی ذہنی تربیت ہوئی۔ یہ "فلسفی" وہ دانشور، فنکار، ادیب، شاعر، مصور وغیرہ تھے جو اپنی زندگی اور ماحول کی گھٹن کے شکار تھے۔ دستور زبان بندی نے ان کو زندگی سے مایوس کر دیا تھا۔ اس مایوسی کے عالم میں ان دیوان خانوں نے انہیں نئی ذہنی زندگی عطا کی۔ یہ نئے افکار اور عزائم لے کر اٹھے۔ انہوں نے جبر و استبداد، تنگ دلی و تاریک جوئی، استحصال و استعمار کے خلاف آواز اٹھائی جو بلاکشانِ فرانس کے ظلمت کدوں میں گونجتی ہوئی آخر کار قصر و رسائی کے ایوانوں تک پہنچی۔

ان دیوان خانوں میں ایک دیوان خانہ ژین (JEANNE) کا بھی تھا جو شادی کے بعد مادام دیتیول (DETIOLES) ہو چکی تھی۔ مادام دیتیول اپنے دیوان خانے کی محفلوں میں امرا۔ اور رؤسا کو بہت کم اور اہلِ علم و فن کو زیادہ مدعو کرتی تھیں۔ پیرس کے دیگر دیوان خانوں کے مقابلے میں دیتیول کم محفلیں منعقد کرتی تھیں۔ لیکن ان محفلوں کا خاص امتیاز یہ تھا کہ ان میں نوجوانوں اور مفلوک الحال مگر ذہین اہلِ فکر کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔

آج ۱۷۴۴ء کے موسم سرما کی ایک شام ہے۔ مادام دیتیول کے دیوان خانے میں محفل منعقد ہوئی ہے۔ شروع میں مادام نغمہ سرائی سے اہلِ محفل کی سامعہ نوازی کر چکی ہیں۔ اب گفتگو کا دور ہے۔ مہمان آتشدان کے گرد جمع ہیں۔ مادام کبھی ایک مہمان کے پاس بیٹھتی ہیں کبھی دوسرے کے پاس تاکہ کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ میزبان کی طرف سے کسی کو زیادہ کسی کو کم اہمیت دی جا رہی ہے۔ میز پر مشروبات رکھے ہیں۔ مہمان خود حسبِ ضرورت جام بھر لیتے ہیں۔ ملازمین کو دیوان خانے میں آنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ گفتگو کی فضا "تخلیہ" چاہتی ہے۔ محفل میں موسیو دیتیول موجود نہیں کیونکہ وہ ان موضوعات سے دلچسپی نہیں رکھتے جن پر دیوان خانے میں گفتگو ہوتی ہے۔ موسیو آج کسی دوسری جگہ مدعو ہیں۔ آئیے ذرا دیکھ لیں کہ محفل میں کون کون شامل ہیں۔

یہ مانتسکیو (MONTESQUIEU) ہیں۔ فرانس کے معروف فلسفی اور ادیب پچاس سے کچھ زیادہ کا سن ہے۔ شروع میں اپنی کتاب "فارسی خطوط" کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ یہ کتاب تاریخی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس دورِ زبان بندی میں یہ پہلی کتاب تھی جس میں فرانس کے معاشرہ پر طنز کرنے کی جرأت کی گئی۔ لیکن

طنز و تنقید کے باوجود سزا سے بچنے کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس کتاب میں رضا اور ازبک دو ایرانی سیاحوں کے خطوط ہیں جو انہوں نے فرانس پہنچ کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھے۔ ان میں فرانس کے معاشرے کا ایران کے معاشرے سے مقابلہ کیا گیا ہے اور اکثر مقامات پر ایرانی معاشرے پر تنقید کی گئی ہے لیکن اس طرح کہ پڑھنے والے سمجھ جائیں کہ تنقید ایرانی نہیں بلکہ فرانسیسی معاشرے پر ہو رہی ہے۔ مانتسکیو فرانس کی اکادمی کے رکن منتخب ہو کر "لافانی" افراد میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور کتاب حکمت روما کی عظمت اور زوال کے اسباب پر لکھ چکے ہیں جس سے بعد میں مشہور انگریز مورخ "گبن" (GIBBON) متاثر ہوا۔ اس کتاب میں مانتسکیو نے فلسفۂ تاریخ اور سیاسیات سے متعلق چند اہم افکار کی بنیاد رکھی۔ آج کل ان افکار پر مزید غور کر رہے ہیں۔

مانتسکیو کے پاس کریبیوں (CREBILLON) بیٹھے ہیں۔ ممتاز ڈرامہ نگار اور مادام دیتیول کے زمانۂ طالب علمی کے استاد۔ جنہیں مادام دیتیول استاد کریبیوں کہتی ہیں اور یہ اسے ڈیئی کہتے ہیں۔ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن جوانوں کا ذہن پایا ہے۔ ان کے ساتھ پروفیسر مالرو MALRAU ہیں۔ سوربون میں فلسفے کے استاد۔ مانتسکیو کے ہم عمر ہیں۔ ان کے ساتھ دو نوجوان ہیں۔ تقریباً ہم عمر پچیس چھبیس سال کے ہوں گے۔ ایک خوش رو اور خوش مذاق ہلویتیس (HELVETUES) ہے۔ تعلیم ختم کر کے ایک ٹیکس کلکٹر کے ہاں ملازم ہو گیا اور بہت دولت کمائی۔ لیکن اس کے بعد نہ جانے دل میں کیا آئی کہ اس دولت سے ساری عمر عیش کرنے کی بجائے علم و حکمت، تصنیف و تالیف کی طرف اس طرح متوجہ ہوا کہ پھر اور کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ اور یہ اس کے ساتھ اس کا دوست دیدرو (DIDEROT) ہے۔ مفلوک الحال بلکہ بیمار سا معلوم ہوتا ہے۔ تعلیم سخت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ ڈگری تو حاصل کر لی لیکن اساتذہ کی سختی کی وجہ سے مذہب سے برگشتہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ ایک وکیل کے پاس کام کرتا رہا۔ اس کے بعد لڑکوں کو ٹیوشن پڑھا کر اور ناشروں کے ہاں کرائے پر مضامین وغیرہ لکھ کر گزارہ کرتا رہا۔ اعلیٰ تعلیم کے باوجود کوئی معقول اور مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں۔ مطالعے کا شوق بے انتہا ہے لیکن طبیعت لاابالی ہے۔

یہ مہمان آ چکے ہیں لیکن ایک مہمان کا انتظار ہے۔ یہ مہمان اٹھارویں صدی کی ہنگامہ پرور شخصیت والتیر (VOLTAIRE) ہے۔ عمر کوئی چھیالیس سال ہو گی۔ ڈرامہ نویس، افسانہ نگار، شاعر، مضمون نگار کی حیثیت سے مشہور ہو چکا ہے۔ اپنے باغیانہ مزاج کی وجہ سے طبقۂ امراء میں بہت بدنام ہے۔ رئیس زادوں سے لڑائی کرنے کی پاداش میں دو مرتبہ گرفتار ہو کر زندان باستیل (BASTILLE) جا چکا ہے لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ اکثر ملک سے باہر رہتا ہے۔ عرصے سے ایک متمول اور صاحبِ ذوق خاتون مادام شاتلے (CHATELET) سے خصوصی دوستی چلی آ رہی ہے۔ مادام دیتیول کے ہاں اکثر آتا جاتا تھا۔ آج بھی مدعو ہے لیکن ابھی تک نہیں پہنچا۔

محفل میں گفتگو کچھ اس طرح ہو رہی ہے ——— "...... لیکن سوال یہ ہے مادام کہ ہم کس فرانس کے مسائل کا ذکر کر رہے ہیں۔" ہلویتیس نے کہا۔ "اُس فرانس کا جو قصرِ ورسائی میں آباد ہے؟ جسمیں رہنے والے انسان ایک آسمانی مخلوق معلوم ہوتے ہیں۔ جو عالمِ بالا سے اُتر کر اس دُنیا میں آ گئی ہے۔ ان کے پاس وہ سب کچھ ہے جو یہ دنیا انسان کو دے سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں دوسری دنیا میں بھی تمام مراعات ملنے کے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ کیونکہ وہاں دنیا کا عظیم بادشاہ بھی رہتا ہے اور کلیسا کے حکمران بھی زیادہ وقت وہیں گزارتے ہیں۔ اس فرانس کے باسیوں کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ دنیاوی اور رُوحانی اقتدار کو کیسے قائم رکھا جائے۔ قصرِ ورسائی کے قریب دوسرا فرانس پیرس اور چند بڑے شہروں میں آباد ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو قصرِ ورسائی کی جود و جبروت سے متاثر و مستفیض ہوتے رہتے ہیں اور اِس کے عوض بادشاہت اور کلیسا کو قائم رکھنے کے لیے کل پرزوں کا کام کرتے ہیں۔ یہاں افراط و تفریط کی کیفیت ہے۔ یہاں امراء اور اہلِ کلیسا کے محل ہیں۔ جن کی شان و شوکت میں قصرِ ورسائی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور اسی پیرس کے تنگ و تاریک گلی کوچوں میں بلاکشان و تہی دامان انسانوں کے بسیرے بھی ہیں۔ جن میں عموماً شب تاریک ہی رہتی ہے۔ روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ اس فرانس کے مسائل زیادہ بھی ہیں اور پیچیدہ بھی۔"

"اور مادام" ہلویتیس نے پسینہ پونچھ کر کہا "ایک تیسرا فرانس بھی ہے جو دیہاتوں میں آباد یا برباد ہے۔ جہاں ایک وحشی بدہیئت اور بدقسمت مخلوق

رہتی ہے۔ یہ مخلوق سارے دن کھیتوں میں رینگتی رہتی ہے۔ زمین سے اناج پیدا کرتی ہے لیکن پیٹ بھر کر کھا نہیں سکتی اور جب یہ رینگتے ہوئے جانور دو پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں یا غمزدہ ہو کر رو دیتے ہیں تو انسان معلوم ہوتے ہیں!!!"

"ہیلویتیس! آج تو بہت جذباتی ہو رہے ہو" مادام دیتیول نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میں جذبات سے متاثر ہوں مادام! لیکن جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ غلط نہیں۔ ہمارے دیہات میں لوگ گھاس کھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے" پروفیسر مالرو نے کہا۔ "یہ یقیناً مبالغہ ہے۔ دیہات کے لوگ غریب ہی سہی لیکن ان کے لیے غذا کی کمی تو نہیں ـــ"

"پروفیسر صاحب" ہیلویتیس نے کہا۔ "جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ مقامی حکام کی ان رپورٹوں پر مبنی ہے جو سرکار عظمت مدار تک پہنچتی رہتی ہیں اور اس کا میرے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہے۔[1] یہ اور بات ہے کہ بلاکسان فرانس کی زبوں حالی کی اطلاع ابھی یونیورسٹی کے ایوانوں تک نہیں پہنچی۔"

"یہ نوجوان صحیح کہہ رہا ہے پروفیسر مالرو!" مانیسکیو نے کہا "میں خود سرکاری افسر کی حیثیت سے دیہات میں رہا ہوں اور اس قسم کی اطلاعیں مجھے ملتی رہی ہیں ـــ"

"تو میں یہ عرض کر رہا تھا" ہیلویتیس نے سلسلہ کلام جاری رکھا "کہ یہ تیسرا فرانس ہم میں سے اکثر کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اس کی حیثیت جداگانہ ہے لیکن اس کے مسائل زیادہ نہیں۔ متمول ورسائی کی طرح اس کا بھی صرف ایک ہی مسئلہ ہے۔ اہل ورسائی صرف صاحب اقتدار رہنا جانتے ہیں۔ دیہات کے عوام صرف زندہ رہنا چاہتے ہیں۔"

"لیکن اس سے آپ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں" مانسکیو نے سوال کیا۔

"میں صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری قوم کے مختلف طبقوں کے مسائل مختلف ہیں اور ان کے حل ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ ایک طبقے کے مسئلے کا حل دوسرے طبقے کے لیے مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ طبقاتی کشمکش پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس معاشرے کی ناہمواری اور اس کے طبقات پر نئے سرے سے غور کرنا ہو گا۔"

"استاد کریبیوں!" مادام دیتیول ستر سالہ ڈرامہ نگار سے مخاطب ہوئیں جو ان کا استاد بھی رہ چکا تھا۔ "آپ خاموش ہیں۔ ذرا نئی نسل کی رہنمائی کیجیے ـــ!"

"نئی نسل ذہین ہے اور وہ بہت سے ایسے مسائل اٹھا رہی ہے جو ہمارے خیال میں صدیوں سے طے ہو چکے ہیں۔" کریبیوں نے آہستہ آہستہ نحیف آواز میں کہنا شروع کیا۔ "لیکن ان مسائل پر از سر نو غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہم معاشرے کے مسائل حل کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں لیکن نئی نسل یہ سوال اٹھا سکتی ہے کہ اس معاشرے کی موجودہ شکل کا جواز کیا ہے۔ یعنی وہ کون سی قوتیں ہیں جو معاشرے کی موجودہ شکل کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور پھر یہ خطرناک سوال پیدا ہو گا کہ کیا اس معاشرے کو ایسا ہی رہنا چاہیے؟ میں نے چند اشارے کیے ہیں۔ ذہین تم اس کا جواب نئی نسل سے ہی طلب کرو۔"

"استاد کریبیوں! اس پیرانہ سالی میں آپ کی فکر جوان ہے۔" مادام دیتیول اب نوجوان دیدیرو سے مخاطب ہوئیں "دیدیرو! تم نے اس کم عمری میں تاریخ کو پڑھا بھی ہے سوچا بھی ہے اور کچھ لکھا بھی ہے۔ استاد نے کچھ بنیادی سوال اٹھائے ہیں۔ تم کیا کہو گے؟"

"مادام! یہ بنیادی سوال ہیں جن کا جواب انسان کی چار ہزار سالہ تاریخ پر محیط ہے۔ مناسب یہی ہے کہ والتیر اس موضوع پر گفتگو کریں ـــ"

---

[1] سترھویں اور اٹھارویں صدی کے فرانسیسی عوام کی زبوں حالی کے بارے میں دیکھیے۔ TAINE, L'ANCIEN REGIME ـــ کتاب پنجم

"ہاں۔ والتیر کو آنے میں دیر ہو گئی۔ وہ آئیں گے تو ان سے بھی کہیں گے۔ تم اپنے خیالات کا اظہار کرو۔"

"مادام! مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے موجودہ معاشرے کی تین بنیادیں ہیں۔ اوّل چند مسلّمہ قوانین، روایات، رسم و رواج، طبقاتی ناہمواری وغیرہ۔ دوئم اقتدارِ اعلیٰ یعنی بادشاہت اور سوئم مذہبی عقائد اور احکام۔ استاد کریبیوں نے سوال اٹھایا ہے کہ وہ کون سی قوتیں ہیں جو اس معاشرے کو موجودہ شکل میں قائم رکھے ہوئے ہیں۔ میں جواب میں عرض کروں گا کہ ہمارے موجودہ قوانین، روایات، رسم و رواج، طبقاتی ناہمواری کو سختی کے ساتھ قائم رکھنے والی قوت صرف ہماری ماضی پرستی ہے۔ چونکہ ایسا ہوتا چلا آیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو۔ چونکہ صدیوں سے ایک طبقہ حاکم اور دوسرا محکوم رہا ہے۔ اس لیے اسے قانونِ قدرت سمجھ لیا گیا ہے۔ دوسری بنیاد بادشاہت کی ہے۔ کوئی آٹھ سو سال سے ایک خاندان یا ایک طبقہ نسلاً بعد نسلٍ بادشاہت کرتا چلا آ رہا ہے۔ لہٰذا شاہی کو ایک تقدس حاصل ہو گیا ہے۔ یہاں بھی ماضی پرستی کی قوت کارفرما ہے۔ تیسری بنیاد مذہب ہے۔ یہاں بھی ماضی ہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ اٹھارہ سو سال کے ماضی کی طرف۔ یسوع مسیح نے ایک مذہب کی تبلیغ کی تھی اور اپنے حواریوں سے خواہش کی تھی کہ ان کے پیغام کو دنیا میں پھیلائیں۔ مسیحیت کے نام پر ایک پیغام ضرور پھیلایا گیا لیکن ان اٹھارہ سو سال میں اس پیغام کی شکل کیا سے کیا ہو گئی۔ یسوع مسیح نے فقر و فاقہ اور تزکیہ نفس کی تعلیم دی تھی لیکن آج اُن کے پیغام کے مبلغ اہلِ کلیسا فرانس کی دو تہائی دولت پر قابض ہیں۔ سنا ہے کہ یسوع مسیح پھر زندہ ہوں گے۔ اگر وہ آج زندہ ہو جائیں تو وہ سخت پریشان ہو جائیں گے۔ یقین جانیے وہ اہلِ کلیسا کی موجودہ روش کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے۔ اور اس کے جواب میں اہلِ کلیسا حضرت یسوع مسیح کو مسیحیت سے خارج کر دیں گے!!"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پروفیسر مالرو نے کچھ تامل کے بعد کہا۔ "موجودہ معاشرہ جیسا بھی کچھ ہے، ایک حقیقت ہے۔ ایک تلخ حقیقت لیکن بہرحال ایک ناقابلِ انکار حقیقت۔ اور جیسا کہ دیدیرو نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس کی بنیادیں صدیوں پرانی ہیں اور اس لیے غالباً خاصی مستحکم بھی۔ اب رہا ماضی پرستی کا الزام، تو ماضی سے رشتہ منقطع تو نہیں کیا جا سکتا۔ انسانیت اپنا حافظہ یکایک نہیں کھو سکتی۔ صدیوں کے ارتقا نے معاشرے کو موجودہ شکل دی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک منطقی عمل ہے۔ ہم تاریخ کی منطق کو غلط قرار نہیں دے سکتے۔"

"پروفیسر صاحب نے صحیح ارشاد فرمایا۔ ہم تاریخ کی منطق کو غلط قرار نہیں دے سکتے۔" دیدیرو نے کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ تاریخ کس طرح بنتی ہے۔ تاریخ کوئی آسمانی چیز نہیں۔ تاریخ کو انسان ہی بناتے ہیں۔ تاریخ انسانوں کے فکر و عمل۔ خوش اندیشی و بداندیشی، کامیابی و ناکامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان ہر شے پر قادر نہیں۔ اس کے عزائم کبھی پورے ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔ حالات و واقعات تاریخ کی حرکت پر اثرانداز ہوتے ہیں لیکن اپنی حالت تبدیل کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر خود اُس قوم پر ہوتی ہے۔"

"مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن مجید میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔" مانتسکیو کے اس ریمارک سے محفل پر خاموشی چھا گئی۔ اہلِ محفل ان الفاظ کی معنویت پر غور کر رہے تھے۔ دیدیرو نے سکوت کو توڑا اور کہا "مسلمانوں کی الہامی کتاب کی اس آیت میں یہ عظیم تصوّر پیش کیا گیا ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا انحصار دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی یا برہمی پر نہیں جیسا کہ صدیوں سے مذہبی پروہت بیان کرتے چلے آ رہے تھے، بلکہ انسانوں کی وسیع النظری یا کوتاہ اندیشی پر ہے۔ اگر قوم کے افراد جبر و استبداد، تاریک جوئی، معاشی بے انصافی اور بے راہ روی کو قبول کر لیتے ہیں اور معاشرے میں تبدیلی پیدا نہیں کرنا چاہتے تو معاشرہ جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور قوم آخرکار موت کا شکار۔"

"اور ہم یہ تبدیلی پیدا کر کے رہیں گے۔" جوشیلے ہلویتیس نے چیخ کر کہا۔ "میں اس معاشرے کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں ان فرسودہ قوانین رسم و رواج کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس جابر اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس مسیحیت کو تسلیم نہیں کرتا۔۔۔"

"ہلویتیس!" مادام دیفیول بولیں۔ "کیا تم مسیحیت سے خارج ہو گئے ہو؟"

"مادام میں مسیحیت سے خارج ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں اُس یسوع مسیح کا ایک ادنےٰ مداح ہوں جس نے ساری عمر غریبوں اور ناداروں کی خدمت میں بسر کی اور تسلیم و رضا کا پیغام دیا اور جسے انسان دوستی کی پاداش میں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ میں اس مسیح کی پیروی کرنا چاہتا تھا اور صلیب بردوش انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مَیں نے اہل کلیسا کی منافقت کو برداشت نہیں کیا۔ مَیں نے خدا کے سامنے سر جھکایا لیکن اہلِ کلیسا کی خدائی تسلیم نہیں کی۔ اس جرم میں اہلِ کلیسا نے مجھے مسیحیت سے خارج کر دیا۔ سُنا ہے یسوع مسیح کے زمانے میں اہلِ کلیسا بے دینوں کو مسیحی بناتے تھے۔ آج کل اہل کلیسا مسیحیوں کو بے دین بناتے ہیں۔"

"یہ کون کس کو بے دین بنا رہا ہے۔" دفعتاً والتیر کی ہنگامہ پرور شخصیت دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ اہلِ محفل تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ استاد کریبیوں بہ تقاضائے عمر بیٹھے رہے۔ مادام دینتول دوڑ کر گئیں اور والتیر کا ہاتھ پکڑے اٹھلاتی ہوئی محفل کی طرف لائیں۔ والتیر نے سب سے پہلے کریبیوں سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد دیگر افراد سے علیک سلیک کی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مادام نے جام پیش کیا۔ والتیر ایک گھونٹ پینے کے بعد مادام سے مخاطب ہوا۔

"ژین! (والتیر۔ استاد کریبیوں۔ مانسکیو وغیرہ مادام دینتول کو بے تکلفی سے اس کے اصلی نام ژین ہی سے مخاطب کرتے تھے) آج تم سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"پہلے آپ یہ بتلایئے کہ آپ کو آنے میں اتنی دیر کیسے ہوگئی۔ محفل میں آپ کی کمی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔"

"مَیں معذرت خواہ ہوں ژین" والتیر نے کہا "کیا بتاؤں وہی لونڈیا کا چکر...... اب پھر کسی نے....."

"لونڈیا، کونسی لونڈیا؟ والتیر کیا تم لونڈیوں کے چکر سے باہر نہیں آؤ گے"۔ استاد کریبیوں نے والتیر کو چھیڑا۔

"استاد کریبیوں میں تو باہر آنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن بعض چکروں سے نکلنے میں انسان چکرا جاتا ہے...."

"آخر وہ خوش قسمت ہے کون؟" مادام بولیں "مادام سنا تھے تو اب خاصی پکی عمر کی ہوگئیں۔ کیا آپ انہیں لونڈیا کہتے ہیں؟"

"اب تم تو بھولی بن رہی ہو...... کیا تم نے میری نظم "لونڈیا" نہیں پڑھی؟" والتیر نے کہا۔

(والتیر نے ایک طویل نظم LA PUCCELLE (لونڈیا) لکھی تھی۔ موضوع جون آف آرک تھا۔ لیکن نظم میں والتیر نے جون کو ایک گاؤں کی الھڑ لڑکی کی شکل میں پیش کر کے اسے نفسیاتی اور جنسیاتی الجھنوں کا شکار دکھایا تھا۔ متعدد اشعار خاصے عُریاں تھے۔ نقادوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ کتاب کی اشاعت پر پابندی لگ گئی اور غالباً اسی لیے یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔

"وہ نظم! ہاں وہ نظم میرے ہاتھ لگی تھی۔ جب میں کانونٹ میں تھی۔ لیکن ابھی مَیں نے چند بند ہی پڑھے تھے کہ ایک نن استانی کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے چھین لی۔ اس کے بعد سے میں نے اسے اکثر تلاش کیا لیکن نہیں ملی۔" مادام کو اپنی محرومی کا احساس تھا۔

"لیکن اس نظم کا ہنگامہ تو غالباً ختم ہو چکا تھا۔" مانسکیو نے یاد لانے کی کوشش کی۔ "ظاہر ہے اس کے شائع ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس کی بہت سے نقلیں ضرور ہوئی تھیں جو تقسیم ہوتی رہیں۔ اور چھپ چھپ کر پڑھی جاتی رہیں۔ آخر کار اس کے مخالف بھی تھک ہار کر بیٹھ رہے۔"

"لیکن اب اس نظم کے کچھ اور شعر بازار میں آ گئے ہیں۔ میرا مطلب ہے خفیہ بازار میں۔ اب ان پر پھر ہنگامہ شروع ہو گیا ہے۔" والتیر نے جام خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اس تازہ کلام میں تم نے کیا گل افشانی فرمائی ہے۔ والتیر" کریبیوں نے سوال کیا۔

"لیکن میں نے یہ کب کہا کہ یہ شعر میں نے لکھے ہیں؟ میں ابھی پولیس کو بیان دے کر آ رہا ہوں کہ ان اشعار کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اسی لیے آنے میں دیر ہوئی۔"

"لیکن معلوم تو ہو کہ ان اشعار میں ہے کیا؟" مادام کا اشتیاق بڑھ رہا تھا۔ "پولیس کو کیسے بُھلا دیا جائے؟"

"میں نے وہ اشعار پڑھے ہیں۔" دیدیرو نے انکشاف کیا۔

"کیسے؟ کہاں؟ کیا لکھا ہے؟" محفل میں کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"میں جس کتب فروش کے ہاں کام کرتا ہوں اس نے مجھے وہ اشعار نقل کرنے کے لیے دیے تھے۔ میں نے کئی نقلیں تیار کی ہیں جو اچھی خاصی قیمت میں فروخت ہو رہی ہیں۔ اگر آپ حضرات کو اتنا ہی اشتیاق ہے تو میں ایک نقل پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال اتنا عرض کردوں کہ ان اشعار میں وہ "لونڈیا" خاصی سمجھ دار نظر آتی ہے۔ اب وہ معاشرے اور خصوصاً اہلِ کلیسا پر بھرپور طنز کرنے لگی ہے بلکہ اس کی کمان کے بعض تیروں کا رُخ قصرِ ورسائی کی طرف بھی ہے۔"

"بہرحال موسیو والتیر اپنی صفائی میں پولیس کو بیان دے چکے ہیں جسے رد کرنا آسان نہیں۔" مانسکیو نے مسئلہ کے قانونی پہلو پر دادی۔ "اور ہمیں امید ہے کہ یہ اشعار والتیر کو ایک بار پھر زندان باستیل نہیں لے جائیں گے یہ اور بات ہے کہ شوخیٔ تحریر خود فریادی بن کر دربارِ شاہی تک پہنچ جائے۔"

"مجھے اس کی چنداں پروا نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ژین یہ تو بتاؤ وہ دینداروں کو بے دین بنانے کا کیا قصہ تھا" والتیر نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"ہلویتیس کہہ رہے تھے کہ اہلِ کلیسا نے انہیں مسیحیت سے خارج کر دیا۔"

"یہ اچھا ہی ہوا۔"

"موسیو والتیر آپ خوش ہیں کہ کوئی مسیحیت سے خارج ہو گیا؟"

"ژین میں اس پر خوش ہوں کہ اب اہلِ کلیسا لوگوں کو مسیحیت سے خارج کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔ انہیں یہ کام انجام دینے دو۔ جب ہزاروں لاکھوں عیسائی مسیحیت سے خارج کر دیے جائیں گے تو اہلِ کلیسا کا زور خود بخود کم ہوتا جائے گا۔ مذہب کے ان ٹھیکیداروں کے ماننے والے بھی کم ہو جائیں گے اور ملک کے معاشرے پر ان کا اقتدار بھی کم ہو جائے گا۔ غریب کا استحصال بھی کم ہو جائے گا۔"

"لیکن ہم اہلِ کلیسا کو ختم کیوں نہ کر دیں؟" ہلویتیس کو پھر جوش آیا۔ "انہوں نے قوم پر بے انتہا مظالم کیے ہیں۔ سپین، اٹلی اور فرانس میں مذہبی عدالتوں کے تشدد کے واقعات سُننے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں دانشور شہیدوں کا خون ان کی گردن پر ہے۔ ہم ان سے انتقام لیں گے۔ ہم ان کو چُن چُن کر نیست و نابود کر دیں گے۔"

"اگر تم نے ایسا کیا تو تم وہی غلطی کرو گے جو اہلِ کلیسا نے کی تھی۔" والتیر نے کہا۔ "انہوں نے ظلم و تشدد سے اپنا اقتدار قائم کیا تھا۔ جو لوگ ان کے استبداد کے شکار ہوئے وہ ہمارے لیے شہید ہوتے ہیں۔ اگر آج تم نے اہلِ کلیسا کا خون بہایا تو یہ تاریخ میں شہدا کی حیثیت حاصل کر لیں گے۔ ظالم کا سب سے بڑا دشمن وہ خود ہوتا ہے۔ ظلم خود اپنی نفی کر لیتا ہے۔"

"لیکن کیا آپ اس معاشرے میں تبدیلی نہیں چاہتے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ دیہات میں لوگ جاہل رہ کر گھاس کھاتے رہیں اور پیرس میں لوگ تعلیم حاصل کر کے میری طرح مہاجنوں اور منافع خوروں کے رحم و کرم کے محتاج رہ کر زندگی گزار دیں۔" دیدیرو کو اپنی غربت اور بے بسی کا شدید احساس تھا۔ "موسیو والتیر کیا ہم قدیم ہندو معاشرے کے شودر رہیں جن کے لیے دیوتاؤں کا بھی حکم ہے کہ برہمنوں کے محکوم رہیں؟ زمانہ ترقی کر چکا ہے۔ ہم قبل مسیح کے کسی پسماندہ معاشرے کے غلام نہیں۔ ہم اٹھارویں صدی کے آزاد انسان ہیں۔"

"موسیو والتیر آپ چاہیں یا نہ چاہیں اس معاشرے کی بساط ضرور اُلٹے گی" ہلویتیس نے کہا "ہم نوجوانوں نے آپ کی نسل سے بہت کچھ

سیکھا ہے۔ میں اور دیدیرو تو آپ کے شاگرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی نسل نے اپنا فرض ادا کیا۔ یورپ قرونِ وسطیٰ کی ایک ہزار سالہ تاریک رات کے خواب سے بیدار ہوا تھا۔ آپ کی نسل اور آپ کے بزرگوں نے اسے خرد افروزی کی روشنی عطا کی۔ لیکن اب ہمیں اپنا فرض ادا کرنے دیجیے۔ ہماری نسل اس معاشرے کو قائم رکھنا نہیں چاہتی جس میں انسان انسان کا اس حد تک استحصال کر رہا ہے۔ ہم اس ظلم و استبداد اور معاشی ناہموار کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کے لیے جدوجہد کریں گے اور اس کے لیے اپنا خون بہائیں گے۔ ہمارے غریب عوام ہمارا ساتھ دیں گے۔ عوام کی طاقت فرانس پر چھا جائے گی۔ امراء اور اہلِ کلیسا کا اقتدار سرنگوں ہو جائے گا۔ قصر و رسائی کے در و دیوار ہل جائیں گے۔ انقلاب کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا!!!"

"یہ صحیح ہے پیارے ہلویتیس کہ جب انقلاب آتا ہے تو اس کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔" والتیر نے کہا "لیکن انقلاب آنے سے پہلے چند عوامل کا ظہور پذیر ہونا ضروری ہے۔ تم نے صحیح کہا کہ ذہین نوجوان نسل جدوجہد کرے گی۔ اپنا خون بہائے گی۔ عوام اس کا ساتھ دیں گے۔ سائنس فتح ہو گی اور ایک دن عوام ہی اس ملک کے حاکم ہوں گے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو گا کہ واقعات کا یہ تسلسل واقعی قائم رہے۔ مثلاً اگر نوجوان نسل نے اپنا خون بہایا اور عوام نے ساتھ نہیں دیا تو یہ خون بڑی حد تک رائیگاں جائے گا۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے" ہلویتیس جھنجلا اٹھا "عوام ہمارا ساتھ کیوں نہ دیں گے؟ کیا وہ اپنی زبوں حالی سے خوش ہیں؟ کیا وہ جانوروں جیسی زندگی سے مطمئن ہیں؟ کیا وہ انسان بننا نہیں چاہتے؟ کیا ان میں خودداری اور عزتِ نفس یکسر مفقود ہے؟ موسیو والتیر مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ عوام کو اس قدر ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے" والتیر نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اپنے ملک کے عوام کو ذلیل اور حقیر نہیں سمجھتا۔ تم تو زیادہ تر پیرس ہی میں رہے ہو لیکن میں عوام کے ساتھ دیہات میں بھی رہا ہوں۔ ان کے دکھ درد میں شریک بھی رہا ہوں۔ ان کے حقوق کی مدافعت کے لیے کچھ جدوجہد بھی کی ہے۔ میں ان کے طرزِ زندگی اور اندازِ فکر سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کن مصائب و آلام کا شکار ہیں۔ لیکن ہم شہر کے لوگ اور اہلِ فکر و قلم ان سے بہت دور ہیں۔ ہمارے خیالات اور نظریات ان تک نہیں پہنچتے۔ ان کے بہت زیادہ قریب اہلِ کلیسا ہیں جو ان کے خوشی اور غم، جینے مرنے میں ہر وقت اُن کے ساتھ ہیں۔ اہلِ کلیسا چاہے گاؤں میں ہوں یا شہر میں وہ ایک ہی رشتہ ہدایت میں منسلک ہیں۔ ان کی تنظیم نہایت مضبوط اور موثر ہے۔ پاپائے روم جو پالیسی مرتب کرتے ہیں وہی پالیسی، وہی ہدایات بلکہ تقریباً وہی الفاظ آرک بشپ اور کارڈینل سے لے کر گاؤں کے پادری کے ذریعے عوام تک پہنچائے جاتے ہیں۔ حضرت یسوع مسیح کی تعلیمات کو ایک خاص رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس کا ایک اہم پہلو یہ ہوتا ہے کہ یہ دنیا، یہ زندگی عارضی ہے، محض دھوکہ ہے، فریب ہے، مایا ہے۔ اصل چیز دوسری دنیا ہے، آخرت ہے۔ عوام کو باور کرایا جاتا ہے کہ یسوع مسیح خود مفلسی کی زندگی بسر کرتے تھے اور زیادہ تر جنگلوں میں رہتے تھے۔ اس لیے جو لوگ مفلس ہیں اور بے سر و سامانی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ دراصل حضرت یسوع مسیح کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں مفلسی کو عین مسیحیت سمجھ کر نہ صرف قبول کر لینا چاہیے بلکہ اس پر فخر کرنا چاہیے اور اس دنیا کی بجائے دوسری کی فکر کرنی چاہیے۔ اور اس کی صورت یہی ہے کہ عبادت اور مذہبی رسومات ادا کرنے کے سلسلے میں اہلِ کلیسا کو ہر طرح دامے درمے سخنے، خوش رکھا جائے کیونکہ ان کے ذریعے آخرت میں عیش و عشرت کے تمام سامان فراہم ہوں گے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ اس دُنیا میں مفلسی کی زندگی گزار کر جلد از جلد دوسری دُنیا کا رُخ کیا جائے تاکہ وہ سب کچھ مل جائے جس کی اس زندگی میں آرزو تھی۔ غور کرو پیارے ہلویتیس اگر عوام کے ذہنوں میں اس قسم کی سوچ پیدا کر دی جائے تو کسی قسم کے معاشی انقلاب کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟"

ہلویتیس کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن مانسکیو نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہی نہیں۔ عوام میں جو بہت کم افراد لکھ پڑھ سکتے ہیں ان کو

مشورہ دیا جاتا ہے کہ سوائے انجیل مقدس کے اور کچھ نہ پڑھیں۔ انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ تمام علوم انجیل مقدس میں موجود ہیں اور اس کے باہر جو کچھ ہے وہ مسیحی تعلیمات کے خلاف ہے۔ چنانچہ سائنس، ریاضی، فلسفہ وغیرہ کو یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ علوم مسلمانوں کے نظریات پر مبنی ہیں اور حوالہ کے لیے ابن سینا، نصیر الدین طوسی، ابن ہیثم، ابن رشد وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سائنسی تجربہ کرتا ہوا پکڑا جاتا ہے تو اسے "مسلمان جادوگر" قرار دے دیا جاتا ہے۔"

ہیلوتیس اب سوچ میں پڑ کر کہنے لگا۔ "لیکن تاریخ شاہد ہے کہ عرصے تک ظلم وستم سہنے کے بعد عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہوا اور وہ جابر اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔"

"یہ صحیح ہے۔ اکثر قوموں میں ایسا ہی ہوا۔" والتیر نے کہا "لیکن ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب قوم میں اپنی حالت بدلنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہو جاتے۔ یعنی جب قوم کے افراد کے اندازِ فکر میں تبدیلی آجائے۔ فکر کی تبدیلی سے عمل میں تبدیلی آتی ہے۔ ہر عمل کسی فکر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر عوام کو یہ سمجھا دیا جائے کہ مفلسی ہی ان کے لیے راہ نجات ہے تو وہ مفلسی پر قانع رہیں گے اور کسی قسم کی تبدیلی کو دیوتاؤں کی مرضی کے منافی خیال کریں گے۔ معاشرے خود بخود تبدیل نہیں ہو جاتے۔ محکومی اور غلامی خود بخود ختم نہیں ہو جاتی۔ مثلاً افریقہ کے کئی ممالک کے عوام صدیوں سے غلام رہے ہیں اور ان میں سے بعض اب بھی ہمارے ملک کے امرا کی حویلیوں میں ملازمین کی حیثیت سے نیم غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ صدیوں کے ظلم و استبداد کے باوجود ان افریقی عوام نے استحصال کے خلاف بغاوت کیوں نہیں کی؟ اس قسم کے استحصال زدہ معاشرے کیوں نہ بدلے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان قوموں کے افراد صدیوں سے ایک نیم مذہبی دیومالائی تعلیمات کے زیرِ اثر رہے۔ جدید علوم و فنون کی روشنی ان تک نہیں پہنچی۔ ان کا اندازِ فکر نہیں بدلا اس لیے طرزِ عمل بھی نہیں بدلا۔ وہ صدیوں سے غلام ہیں اور شاید عرصے تک غلام رہیں گے۔ ہیلوتیس کیا تمہیں کسی حد تک تمہارے سوال کا جواب مل گیا؟"

"جی ہاں کسی حد تک۔ لیکن اس کے ساتھ آپ نے میرے بیان کی تائید کر دی کہ عوام کی پسماندگی کی ذمہ داری زیادہ تر اہلِ کلیسا ہی پر ہے جو اُن میں احساسِ زیاں پیدا نہیں ہونے دیتے اور ان کے ذہنوں کو اس طرح ڈھال لیتے ہیں کہ یہ سادہ لوح اپنی زبوں حالی، پسماندگی، محکومی اور کسی حد تک تحقیر کو بھی نہ صرف قبول کر لیتے ہیں بلکہ اسے یسوع مسیح کی خوشنودی کا باعث سمجھنے لگتے ہیں۔ کیا بھولے عوام پر یہ سحرکاری انسانیت کا استحصال نہیں ہے؟ اور کیا یہ فریب کاری قابلِ تعزیر نہیں؟ موسیو والتیر آپ نے تو اہلِ کلیسا پر مکمل فردِ جرم عائد کر دی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس طبقے کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد نہ کی جائے۔"

"مَیں یقیناً اہلِ کلیسا کی منافقت اور فریب کاری کا دشمن ہوں۔ اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ اس طرزِ فکر کے لیے بدنام ہوں۔ اہلِ کلیسا کی سازشوں کی وجہ سے حکومت کا معتوب بھی ہوں۔ عرصے سے ایک قسم کی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لیکن اہلِ کلیسا کو بحیثیت ایک طبقے کے ختم کرنے کی جدوجہد میرے خیال میں غلط ہو گی۔ اس کی ایک وجہ تو میں بیان کر چکا ہوں۔ جبر و استبداد کے ذریعے کسی طبقے کو ختم کرنے کی کوشش عموماً اُلٹا اثر دکھاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اہلِ کلیسا بھولے عوام کو گمراہ ضرور کرتے ہیں لیکن ان کی خدمت بھی کرتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی اور روح کی طمانیت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ وہ ان کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں ایک خلا کو پُر کرتے ہیں جبکہ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کوئی اور ذریعہ موجود نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ جدید علوم و فنون کی روشنی ابھی تک عوام تک نہیں پہنچی۔ مذہب انسانی ذہن اور جذبات کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عظیم مذاہب نے انسانیت اور تہذیب و تمدن پر بے پایاں احسان کیا ہے۔ ہماری جدوجہد مذہب کے خلاف نہیں۔ اہلِ کلیسا کے خلاف بھی نہیں بلکہ ان کے گمراہ کُن افکار کے خلاف ہے جن کے ذریعے اہلِ کلیسا اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ ابھی عوام کو اہلِ کلیسا کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت پوری ہونی چاہیے۔ میرے جوشیلے ہیلوتیس! ایک اور

اہم وجہ بھی ہے جس کی بنا پر اہلِ کلیسا کو طبقے کی حیثیت سے ختم کرنا ظلم ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ گاؤں کے کلیساؤں میں کام کرنے والے پادریوں کی حیثیت وہ نہیں جو پیرس اور دیگر بڑے شہروں میں رہنے والے بشپ اور کارڈینل وغیرہ کی ہے۔ گاؤں کے پادری نہ صاحبِ دولت ہیں نہ شریکِ اقتدار۔ یہ بے چارے خاصی مفلسی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اپنے گاؤں کے رہنے والوں کی طرح یہ بھی اعلیٰ طبقے کے استحصال کا شکار ہیں۔ اعلیٰ طبقہ چاہے وہ امرا کا ہو یا اہلِ کلیسا کا، نچلے طبقے کا استحصال کرتا رہا ہے۔ اس طرح عوام اور نچلے طبقے کے اہلِ کلیسا زبوں حالی اور مظلومی کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی سطح پر ہیں اور دونوں بہت حد تک مساوی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ یہ غریب اہلِ کلیسا خود ایک جابر نظام میں جکڑے ہوتے ہیں۔ یہ مجبور رہیں واجب القتل نہیں۔"

مادام دیتیول بہت دیر سے خاموش اس بحث کو سُن رہی تھیں۔ اب ان سے نہ رہا گیا اور بولیں "موسیو والتیر یہ بحث خاصی اُلجھ گئی ہے۔ شاید ہم نئی نسل کے لوگ آپ کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ آپ اس معاشرے سے مطمئن نہیں۔ اس کے شاکی ہیں۔ لیکن اس کو بدلنا نہیں چاہتے۔ آپ اہلِ کلیسا کی فریب کاری اور جبر و استبداد سے سخت بیزار ہیں لیکن اس طبقے کو ختم نہیں کرنا چاہتے۔ آخر یہ کیا تضاد ہے؟ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"ژرین، میں اس معاشرے سے غیر مطمئن ہی نہیں اس کا شکار بھی ہوں۔ اس کو بدلنا بھی چاہتا ہوں اور اس کوشش میں دو مرتبہ زندان باستیل میں قید و سلاسل کی سختیاں جھیل چکا ہوں۔ اہلِ کلیسا میرے دشمن ہیں۔ میری اچھی تحریریں بھی انہیں بُری لگتی ہیں۔ یہ ان ہی کی سازشوں کا نتیجہ ہے کہ میں آج اپنے وطن میں ایک جلا وطن خانہ بدوش ہو کر رہ گیا ہوں۔ حکومت کو فرانس میں میری رہائش پسند نہیں۔ میں ملک سے باہر تھا۔ چند ہفتوں کے لیے آیا ہوں۔ جلد پھر باہر چلا جاؤں گا۔ میں اس نظام اور اس کے سب سے بڑے ناسور یعنی اہلِ کلیسا کی تاریک جوئی کے خلاف بچپن سے جدوجہد کر رہا ہوں۔ لیکن میں نئی نسل کو وہی مشورہ دوں گا جو میرے فہم اور تجربے نے مجھے سکھایا ہے۔ نئی نسل کو اختیار ہے کہ وہ مجھ سے مشورہ طلب نہ کرے یا اسے نظر انداز کر دے"

"وہ مشورہ کیا ہے" ژرین نے پوچھا

"وہ مشورہ یہ ہے کہ افکار کا مقابلہ افکار سے کیا جانا چاہیے، خنجر و شمشیر سے نہیں۔ افکار کے مقابلے میں جب بھی تلوار اٹھائی گئی۔ افکار کو نئی زندگی ملی۔ تلوار انسان کو قتل کر سکتی ہے، افکار کو قتل نہیں کر سکتی۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے جابر حکومتیں اکثر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ جو فعل ظالم حکمرانوں کے لیے مناسب اور موثر نہیں ہو سکتا وہ اہلِ فکر و دانش کے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ اہلِ کلیسا اُن افکار کو فروغ دے رہے ہیں جنہیں وہ اپنی بقا اور فلاح کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ ہم ان افکار میں سے بعض کو انسانیت اور معاشرے کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ ہم ایسے افکار کو فروغ دیں جو ان مضر افکار کے اثر کو زائل کر سکیں۔ ہم علم و دانش کو فروغ دیں۔ افکارِ تازہ کی نمو سے جہانِ نو کی بنیادیں رکھیں۔ ...."

"لیکن علم و دانش میں تو بہت ترقی ہوئی ہے" پروفیسر مالروئے نے کہا "مسلمان مفکرین کے علمی سرمایہ کے زیرِ اثر سہی۔ مسیحی دُنیا نے اس ڈیڑھ سو سال میں بہت ترقی کی ہے۔ کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور فرانس میں دیکارت، سپنوزا، بیل (BAYLE) پیدا ہو چکے ہیں۔ پیرس کی سوربون یونیورسٹی جس میں مجھے استاد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جدید علوم، تعلیم و تحقیق کا مرکز ہے۔ ہم نے علمی معاملات میں اہلِ کلیسا کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ ہم نے مسلمان مفکروں سے استفادہ کیا ہے۔ ابھی کچھ عرصے پہلے تک سوربون میں ایک روایت یہ تھی کہ طلبا کو فارغ التحصیل ہونے اور درس و تدریس کی اجازت دیتے وقت ہدایت دی جاتی تھی کہ وہ ارسطو کے افکار کی تعلیم دینے کے لیے صرف ابن رشد کی شرح کو قبول کریں۔ باقی شارحین کو نظر انداز کر دیں۔"[1]

---

[1] حوالہ کیلئے دیکھیے۔ RASHDALE HISTORY OF UNIVESITIES IN EUROPE

مانسکیو ایک ممتاز مفکر اور ماہرِ قانون ہونے کے علاوہ اسلامی افکار پر نظر رکھتا تھا۔ کہنے لگا "پروفیسر مالرد یہ صحیح ہے کہ بہت عرصے تک اٹلی، سسلی اور سوربون کی یونیورسٹی میں مسلمان مفکرین کے افکار شمعِ رُشد و ہدایت بنے رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انتہا پسند مسیحی علماء نے ان دانش گاہوں کی علمی فضا کو عصبیت سے متاثر کیا۔ ابنِ رشد کی آزاد خیالی اور تعقل پسندی اہلِ کلیسا پر گراں گزری جس کے نتیجے میں "ابن رشدیت" کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی جس کے اثرات ابھی تک قائم ہیں۔ لیکن میں اس موضوع پر اس وقت آپ کو بحث کی زحمت نہیں دوں گا۔۔۔"

"میں عرض کر رہا تھا" والتیر نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "یہ ضروری ہے کہ جدید افکار و علوم کو فروغ دیا جائے۔ پروفیسر مالرد صحیح فرماتے ہیں کہ نئے افکار پیدا ہو رہے ہیں۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ یہ افکار زیادہ تر یونیورسٹیوں اور دانشوروں کی محفلوں تک محدود ہیں۔ عام لوگ ابھی تک ان علوم کی روشنی سے محروم ہیں۔ اس لیے عوام ابھی تک توہمات کا شکار ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ نئے افکار کو عوام تک پہنچایا جائے۔ اس کے لیے ایک منظم کوشش کی جائے۔ انتہا پسند اہلِ کلیسا سے براہِ راست محاذ آرائی کی ضرورت نہیں۔ کم از کم فی الحال ضرورت نہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ ہم جدید علوم کی روشنی کو پھیلائیں۔ جب علم کی روشنی پھیلے گی تو توہمات کی تاریکی خود بخود کم ہوتی چلی جائے گی۔"

"اس منظم کوشش کے لیے آپ کے پاس کیا تجویز ہے موسیو والتیر" دیدیرو نے دریافت کیا۔

"میری تجویز یہ ہے کہ جدید افکار اور علوم و فنون کی ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جائے۔ ایک کتاب جس میں عام لوگوں کے لیے سائنسی ایجادات، فلسفہ، تاریخ، سیاسیات وغیرہ سے متعلق افکارِ تازہ آسان زبان میں پیش کیے جائیں۔ اس کتاب کو پڑھنے سے عام لوگوں کے معلومات میں اضافہ ہوگا۔ بعض غلط اور فرسودہ تصورات اور توہمات سے نجات حاصل ہوگی۔ انسان کو اپنی مجبوری اور بے چارگی کا احساس کم اور اُن بے پناہ صلاحیتوں کا احساس زیادہ ہوگا جو بقول مسلمانوں کے اسے اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے عطا کی گئی ہیں۔ اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے کئی افراد کے تعاون اور مشترکہ مساعی کی ضرورت ہوگی۔ مختلف علوم کے ماہرین اپنے اپنے موضوعات پر مضامین لکھیں اور اُن کو مناسب ادارت کے بعد شائع کیا جائے۔ مانسکیو آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"والتیر مسلمانوں کی فکری تاریخ سے بہت متاثر ہیں۔ انہوں نے جس کتاب کی تجویز پیش کی ہے یہ تقریباً وہی منصوبہ ہے جس پر آج سے کوئی آٹھ سو سال قبل دسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں نے عمل کیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب بعض انتہا پسند علماء نے فلسفیوں اور سائنسدانوں کی مخالفت شروع کر دی تھی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ مسلمان کئی فرقوں میں بٹ گئے تھے اور ہر فرقے کا یہ دعوےٰ تھا کہ صرف وہی صحیح راستے پر ہے اور باقی مسلمان گمراہ ہیں۔ مسلمانوں میں رواداری، اخوت اور حریتِ فکر پیدا کرنے کے لیے چند اہلِ فکر نے بصرہ میں ایک جماعت قائم کی جسے "اخوان الصفا" کا نام دیا گیا۔ اس جماعت نے علوم و فنون کی ترقی کے لیے کئی اقدامات کیے۔ ان میں ایک اہم کام انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنا تھا۔ چونکہ فلسفی اور سائنسدانوں کو گمراہ قرار دیا جاتا تھا اور ان کی نقل و حرکت پر پابندی تھی۔ اس لیے اخوان الصفا کے ارکان اپنی علمی سرگرمیاں خفیہ طور پر جاری رکھتے تھے۔ یہ مختلف مقامات پر ہر بارہ روز کے بعد ملتے تھے اور باہمی تبادلہ خیال کے بعد مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے تھے۔ جماعت میں نوجوان بھی تھے اور عمر رسیدہ افراد بھی۔ نئے ارکان کو شامل کرنے میں نوجوانوں کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ بوڑھوں کے ذہن میں عموماً لچک کی کمی ہوتی ہے اور وہ نئے افکار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اخوان الصفا کے کوئی سیاسی عزائم نہ تھے۔ وہ صرف علم کی روشنی پھیلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مختلف علوم مثلاً فلسفہ، ریاضی، فلکیات، نفسیات، سیاسیات، اخلاقیات، فنِ تعلیم، مذہب وغیرہ پر بچاس رسائل لکھے اور اس طرح غالباً تاریخ میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا مرتب کی تھی۔"

"موسیو مانسکیو نے درست فرمایا" والتیر نے کہا "مجھے اعتراف ہے کہ میں مسلمانوں کی علمی خدمات سے متاثر ہوں۔ اور میں نے مسلمانوں کے فیضان کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے جو میں تاریخ تمدن پر لکھ رہا ہوں۔ افسوس ہے کہ بعض مغربی اہل قلم نے مسلمانوں کے احسان کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کا خیال میرے ذہن میں اخوان الصفا کی مثال سے پیدا ہوا۔ بہر حال اگر اس تجویز کو قبول کر لیا جائے تو میں اس منصوبہ میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوں۔ مانسکیو بھی ضرور تیار ہوں گے۔ لیکن اس میں زیادہ کام نوجوانوں کو کرنا ہوگا۔ اس کے لیے جوان فکر و عمل کی ضرورت ہے۔ ہلوتیس اور دیدیرو دونوں کو اس منصوبہ میں شامل ہونا چاہیئے۔ ژین تمہارا کیا خیال ہے؟"

"موسیو والتیر مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں نوجوان اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں نہایت گرمجوشی سے حصہ لیں گے۔ استاد کریبیوں اور پروفیسر مالرد بھی انکار نہیں کریں گے۔ میں دوسرے اہل علم و فن کو بھی اس کام میں شریک کروں گی۔ دیدیرو تم آج کل ایک ناشر کی ملازمت کر رہے ہو۔ انسائیکلوپیڈیا کے منصوبہ کا ابتدائی کام تمہیں شروع کرنا ہے۔ بلکہ اس کتاب کی ادارت بھی شاید تمہارے حصے میں آئے۔ کہو منظور ہے؟"

"مادام آپ کا اور موسیو والتیر کا ہر حکم میرے سر آنکھوں پر اور اس تجویز میں تو میرے لیے بے انتہا کشش ہے۔ بلکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس تجویز نے میری بے معنی زندگی کو معنویت بخشی ہے۔"

"ہلوتیس تم متفق ہو نا! تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں موسیو والتیر کی تجویز سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں"۔ ہلوتیس نے کہا۔ "لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ انسائیکلوپیڈیا کے ذریعے نئے افکار عام لوگوں تک تو پہنچ جائیں گے۔ کچھ مخالفت ہو گی لیکن شاید ہم اس پر قابو پا لیں گے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ یہ افکار، یہ پیغام، یہ نیا انداز فکر ارباب اقتدار تک بھی پہنچے۔ جو طاقتیں ہماری مخالف ہیں وہ ان افکار کو وہاں نہیں پہنچنے دیں گی۔ قصر ورسائی میں وزراء، امراء، اعلیٰ حکام، صاحبان دولت و ثروت مکمل طور پر اہل کلیسا کے زیر اثر ہیں۔ وہ دیوار بن جائیں گے۔ یہ ضروری ہے کہ ہماری آواز کو ان عرش نشینوں تک پہنچایا جائے ورنہ ممکن ہے یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہو۔"

"ہلوتیس صحیح سوچ رہے ہیں" والتیر نے کہا "افکار نو کی تحریک کو ارباب اقتدار تک پہنچانا ضروری ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری لیکن مشکل کام یہ ہے کہ افکار کو سرچشمۂ اقتدار یعنی بادشاہ کے دل و دماغ میں اُتارا جائے۔ جی ہاں پہلے دل میں اس کے بعد دماغ میں۔"

"یہ کیسے ممکن ہوگا" مانسکیو نے سر جھکا کر غور کرتے ہوئے کہا "ہم بادشاہ کے دماغ سے اس قدر قربت کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ بادشاہ کے مقربین اسے کیسے برداشت کریں گے؟ بادشاہ کی تربیت بالکل روایتی انداز پر ہوئی ہے۔ اس کے ذہن کو کیسے متاثر کیا جا سکتا ہے۔ والتیر آپ کے ذہن میں کیا تجویز ہے؟"

"اس کے لیے کوئی سیدھا سادہ مجرب نسخہ میرے پاس نہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا بادشاہ کے دماغ تک پہنچنے کے لیے دل کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ کسی کو جرأت کر کے بادشاہ کے دل تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

"آپ کے خیال میں یہ کوشش کون کر سکتا ہے۔"

"ژین" والتیر نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔

"میں؟" مادام دیتیول نے سراپا حیرت بن کر کہا۔

"ہاں! ژین تم یہ جرأت کر سکتی ہو۔ تاریخ میں بڑے کام اکثر غیر معمولی اور غیر متوقع جرأت نے انجام دیے ہیں"۔

"لیکن میں! قصر ورسائی! موسیو والتیر آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں۔"

"نہیں ژین۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم یہ کوشش کر سکتی ہو۔"

"لیکن کیسے ! ...... میں ...... یہاں ...... میرے شوہر ...... بادشاہ .... موسیو والتیر ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں"۔

"میں سمجھتا ہوں۔ اور ان دشواریوں کا اندازہ کر سکتا ہوں جن کا شاید تم بھی اندازہ نہ کر سکو۔ یہ ایک نہایت اہم اور نازک مشن ہے۔ یہ کیسے انجام پاتے اس کے بارے میں کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہوں۔ مجھے اپنی تجویز پر اصرار بھی نہیں۔ میں نے تمہارے سازِ دل کو چھیڑا ہے۔ اس سے کون سا نغمہ بلند ہوگا یہ تم جانو۔ لیکن اگر تم فرانس کے ستم رسیدہ عوام اور ان کے ہمدردوں کی آواز بادشاہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئیں تو تاریخ تمہارے احسان کو فراموش نہیں کرے گی"۔

محفل میں کچھ دیر کے لیے مکمل سکوت طاری ہوگیا۔ نزین نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ "دیدیرو! انسائیکلوپیڈیا کا کام کب شروع ہوگا؟"

"مادام" دیدیرو نے جواب دیا "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے "اخوان الصفا" نے کام شروع کر دیا ہے"۔

اور اس طرح انسائیکلوپیڈیا مرتب کی جانے لگی۔ اس کتاب کا مقصد معاشرے میں اصلاح تھا، انقلاب نہیں۔ لیکن اصلاح کا راستہ روک دیا گیا۔ اور یہی فرانس کے ارباب حل و عقد کی غلطی تھی۔ انہوں نے یہ حقیقت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ارتقا اور اصلاح قانونِ فطرت ہے اور زندہ قوموں میں جب اصلاح کی راہیں محدود کر دی جاتی ہیں تو انقلاب کا راستہ کھل جاتا ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا جو محض جہالت کی تاریکی دور کرنے کے لیے تحریر کی گئی تھی زبان بندی اور جبر و استبداد کی وجہ سے اس بحران اور طوفان کا پیشِ خیمہ بنی جو کوئی نصف صدی بعد انقلابِ فرانس کی شکل میں نمودار ہوا۔

ہپرنگ کور

روبینہ قزلباش

ضلع دیعامر[1] میں یک پہاڑ ہے جس کا نام ہے "ہپرنگ کور" — "ہپرنگ" نام ہے اور "کور" چیلاسی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ قریبا ۱۶۰۰۰ فٹ بلند ہے۔ اس پر چڑھنے کا راستہ دشوار گذار اور بیکار ہے۔ نہ خوبصورت مناظر، نہ ٹھنڈے چشمے، نہ سایہ دار درخت، نہ تو[2] پانی بس پتھر ہیں۔ بھربھری مٹی اور کنکروں سے اَٹی پگ ڈنڈیاں ہیں اور پھسلتے راستے ہیں۔ چوٹی تک پہنچتے پہنچتے آدمی بے دم سا ہو جاتا ہے۔

میں نے دَم لیا۔ پھر اُٹھی کہ گرد و نواح کا نظارہ کر سکوں۔ میرے سامنے ایک سحرانگیز منظر تھا۔ اتنا انوکھا، اتنا نرالا کہ میں اسے دم بخود دیکھتی رہ گئی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں ہندوکش، ہمالیہ اور قراقرم کے تین عظیم سلسلے ایک دوسرے سے ملتے اور بچھڑتے ہیں۔ سمٹا ہوا ہپرنگ کور ذرا ہٹ کر الگ کھڑا ہے شاید اس لئے کہ یہاں سے اس منظر کا نظارہ کیا جا سکے۔

دور حدِ نگاہ تک بادلوں اور دھند کا ایک وسیع اور ساکت سمندر ہے، اس میں جابجا ابھری ہوئیں پہاڑوں کی چوٹیاں ہیں۔ کوئی چھوٹی، کوئی بڑی۔ انہی میں "ہراموش"، "دوبانی"، "رَاکاپوشی"، "چیغولیزا" اور "کے ٹو" جیسی مانوس اور نامور بلندیاں ہیں۔ چوٹیوں کے اس لامتناہی سلسلے میں ان کی نشان دہی ممکن نہیں۔ وہ انہی میں گم کہیں موجود ہیں۔

میں بہت دیر تک اس منظر کو دیکھتی رہی۔ سفید دھند اور بادلوں میں معلق چوٹیوں کے اس بے کنار سمندر نے میرے ذہن پر ایک عجیب تاثر مرتب کیا۔

تھک کر میری نگاہ لوٹ آئی۔ اب کے جو اُٹھی تو سامنے کھڑی فصیل سے جا ٹکرائی۔ میرے سامنے "دیعامر[3]" تنا کھڑا تھا۔ ۲۶۰۰۰ فٹ بلند یہ پہاڑ چوٹی سے دامن تک صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے دامن میں بے آب و گیاہ تنگ سی وادی تھی۔ اس کی ناف پر سرسبز جنگل تھے۔ اس کے کندھوں پر سنگلاخ چٹانیں تھیں اور اوپر برفیلی نوکدار چوٹی جو سدا سفید رہتی ہے۔

دیعامر، ہپرنگ کور سے چند میل کے فاصلے پہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان کچھ بھی نہ تھا۔ بس اتھاہ گہرائی اور گہرے کھڈ۔ ہپرنگ کور کی دیعامر والی سمت کچھ یوں ہے جیسے دیوتا نے، دیوتائی تیشے سے اُسے یکدم کاٹ دیا ہو۔ چند ہزار فٹ تک سپاٹ گہری چٹانیں، پھر بڑے بڑے پتھر، بھربھری ریت اور کنکروں سے مزین عمیق کھڈ۔ کسی بھی کوہ پیما کے لئے ہپرنگ کور والی سمت سے اُترنا ممکن نہ تھا۔

ہپرنگ کور کے دامن میں "گور" کا گاؤں ہے۔ اہلِ گور سے وابستہ ایک عجیب محاورہ ہے جو وادی چیلاس میں اکثر استعمال ہوتا ہے۔

"اہلِ گور کو اپنے بزرگوں کی کیا فکر۔ وہ تو انہیں ضعیف ہوتے ہی، ہپرنگ کور سے نیچے دھکیل دیتے ہیں۔"

اس محاورے سے وابستہ یہ ایک عجیب داستان ہے۔

شنو رجان جب پاؤں آگے بڑھاتی تو پاؤں کے پہناوے کے تلوں سے کنکریاں پھسل پھسل کر نیچے گرتیں اور پیچھے آنے والوں کے پاؤں سے

ٹکرا جاتیں۔ وہ سر جھکائے چلتی چلی جا رہی تھی۔ زندگی کا آخری دن بھی کتنا عجیب ہوتا ہے جب موت سامنے ہو تو ذہن خالی سا ہو جاتا ہے۔ نہ خوف کا احساس رہتا ہے نہ خواہش کا جوش جیسے ذہن ساکت ہو گیا ہو اور جسم و روح خود بخود کام کر رہے ہوں۔

سازندوں کے نغمے اور نوبتوں کی ڈف ڈف لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ بچوں کی چیخ پکار اور گاؤں والوں کے شور کا تاثر ابھی فضا میں موجود تھا۔ نادر جان ماں کے قریب ہو گیا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گہرے سانس لیتا جیسے ماں کے جسم کی خوشبو کو جی بھر کے اپنے اندر بھر لینا چاہتا ہو۔ آخری بلندی سب نے مشکل سے پار کی بہت جگہوں پر ماں کو سہارا دینا پڑا کئی جگہوں پر اسے کندھوں پر بھی اٹھانا پڑا۔ چوٹی پر پہنچتے ہی سب بے دم ہو کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے شنور جان اٹھی۔ اس نے لباس سیدھا کیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ اوڑھنی درست کی اور نادر جان کو دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔ اس کی آنکھیں جیسے کہہ رہی ہوں "اداس نہ ہو بیٹا"۔

نادر جان نے بے بسی سے منہ موڑ لیا۔

شنور جان چلتی چلتی پہاڑ کی نکڑ تک آ گئی۔ اس نے دائیں بائیں پھیلے پہاڑوں کے لامتناہی سلسلوں کو دیکھا۔ دھند اور بادلوں کے سمندر میں جابجا ابھری ہوئی، چھوٹی، بڑی بے شمار چوٹیوں کو دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ سامنے کھڑے، اونچے بلند و بالا دیعامر سے جا ٹکرائی۔ اس کا بے حس ذہن جیسے جاگ اٹھا۔ آنکھوں میں حیرت کا تاثر ابھرا۔ وہ دیعامر کو گھورتی چلی گئی۔ نظریں اس کی بلندی ناپتی اوپر اٹھتی گئیں اور گردن پیچھے کو جھکتی گئی۔ ۲۶۰۰۰ فٹ دیعامر سیدھا تنا کھڑا تھا انتہائی گہرائی میں دھند اور بادلوں کی جھیل سے شروع ہوتی ہوئی اس کی پستی تھی۔ پھر یہ بلندی اپنے اوپر چیل کے گھنے درخت لئے، اور وہ ننگے کندھے جن کی سنگلاخ چٹانیں ہیرنگ کور سے صاف نظر آ رہی تھیں اور اوپر یہ برف کی چوٹی جس پر سدا برف جمی رہتی تھی۔

شنور جان نے گردن سیدھی کی۔ وہ کافی دیر سامنے تنے دیعامر کی ناف کو گھورتی رہی۔ اس کی عظمت جیسے اسے حوصلہ دے رہی ہو۔

ہیرنگ کور اور دیعامر کے درمیان کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں کور تین میل بھر سنگلاخ چٹانوں کے بعد کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ بس دھند اور سفید بادلوں کی خاموش جھیل تھی۔

باری باری سب آگے ہوئے۔ انھوں نے جھک کر شنور جان کے ہاتھ چومے۔ دعا لی۔ نادر جان نے بھی ماں کا ہاتھ چوما۔ اسے چھوڑا پلٹا ہوا تیز چل رہی تھی۔ شنور جان کی اوڑھنی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ تھپیڑے کھاتی وہ پیچھے بھاگی اور مڑتے ہوئے نادر جان کے چہرے سے ٹکرائی۔ نادر جان نے بے اختیار اوڑھنی کا کونا پکڑ لیا۔ بھینچ کر جیسے وہ بچپن میں پکڑا کرتا تھا۔ ماں کاموں میں لگی رہتی اور وہ کونا پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ کبھی دانتوں سے اسے کتر بھی لیا کرتا۔ شنور جان کی اوڑھنی کے کونے اکثر پھٹے ہوتے ——— "نیک بخت جان" وہ اسے مسکراتے ہوئے جھاڑتی۔

شنور جان نے پہاڑ کی چوٹی سے ایک بار پھر نیچے دیکھا اور سوچا۔

"بادلوں میں گروں گی تو چوٹ بھی نہ آئے گی"۔ اس نے آنکھیں موندیں، دیوتا کو یاد کیا اور کود گئی۔

"کھنک" نادر جان کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ اوڑھنی کا کونا چھوٹا۔ ماں پستی میں کبھی کی گم ہو چکی تھی۔ اس کی اوڑھنی پھولے ہوئے زرد، زرد تنبو کی طرح آہستہ آہستہ ہوا کے گدیلے پر سوار اڑتی رہی، دور ہوتی رہی، سمٹتی گئی، اور پھر ایک چھوٹی سی پتنگ کی طرح گرتی دھند کی وادی میں گم ہو گئی۔ زرد رنگ کا ایک ذرہ نادر جان کی آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں موندیں دو آنسو گرائے۔ پھر پلکیں جھپکیں اور آنکھیں کھولیں تو دور حد نگاہ تک کچھ بھی نہ تھا۔ شاندار برفیلی چوٹیاں، نیچے دھند کے بادل، اور ان کی تہہ میں کھوئی ہوئی عجیب دنیا جس کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ صرف اہل گور کے بزرگوں کی لاشیں یہاں تک پہنچ سکتی تھیں۔ آج تک کوئی زندہ ہیرنگ کور سے اتر کر نیچے وادی میں نہ گیا تھا۔

۱۶ ہزار فٹ بلند ہیرنگ کور کے دامن میں یہ چھوٹا سا گاؤں تھا "گور" مختصر سی آبادی تھی۔ محدود سے وسائل تھے۔ کچھ لوگ، کچھ کھیت، کچھ پھلدار درخت اور بس۔ ان کا مالک تھا گور کا راجہ جس کے احکام سخت تھے۔ ان کی تائید کے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا یہاں کی آب و ہوا صحت مند تھی۔ طرز زندگی

سادہ تھا۔ پھلوں اور سبزیوں کی فراوانی کے باعث لوگوں کی عمریں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ ۱۰۰ یا ۱۵۰ سال جی لینا عام بات تھی۔ ۸۰ برس کے بعد لوگ زندہ تو رہتے مگر علاقائی آمدنی میں اضافہ اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ اُن کا وجود گور کے محدود ذرائع پر ایک بوجھ بن کر رہ جاتا۔

"انھیں کھلاتے جاؤ اور ان کی موت کا انتظار کرتے رہو۔ بیکار کے یہ بڈھے مرنے کا نام نہیں لیتے" راجہ نے سوچا۔ پھر ایک دن اُس نے حکم صادر کر دیا۔ "۸۰ سال کے بعد کسی کو جینے کا حق نہیں۔ ۸۰ سال کا ہر فرد ہیرنگ کور کی چوٹی پر لے جایا جائے اور اسے نیچے دھکا دے کر ختم کر دیا جائے۔"

۱۶ سالہ راجہ کا یہ حکم سارے گور کو ماننا پڑا۔ گھر گھر صفِ ماتم بچھی۔ کچھ لوگوں نے اپنے بزرگوں کو چھپانے کی کوشش بھی کی۔ پھر آخر سب کو اس ناگہانی حکم کے آگے جھکنا پڑا۔ اُس سال آٹھ بوڑھے اور سات بوڑھیاں ہیرنگ کور پر لے جائی گئیں اور انھیں نیچے دھکیل دیا گیا۔

ان کے بچوں اور ان کے پوتے پوتیوں نے یہ منظر دیکھا۔ وہ کرب سے تڑپ اُٹھے، دکھ دلوں میں اُبلا، ہونٹوں تک آیا مگر آہ تک نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آنسو آنکھوں میں بھرے رہے مگر قطرہ بن کر باہر نہ ٹپکے۔ پھر وہاں یہ دستور ہی بن گیا۔ ۸۰ سالہ بڈھی یا بڈھا ہیرنگ کور لے جایا جاتا اور چوٹی پر سے نیچے دھکیل دیا جاتا۔

آج مدتوں بعد نادر جان کی ماں کی باری تھی۔ دستور کے مطابق شنور جان کو تیار کیا گیا۔ ڈھول ڈھما کے سمیت سارا گاؤں ہیرنگ کور کے وسط تک آیا۔ پھر دوست، عزیز دکھ بانٹنے چوٹی تک ساتھ رہے۔ شنور جان کے گرنے کے بعد سب نے نادر جان کے گھر کا رخ کیا۔ راستے میں نادر جان نے چپکے سے پگڈنڈی پکڑ لی اور کھیتوں سے ہوتا ہوا دور جھرنے پر جا بیٹھا ——— جھرنا جس پر سے صبح ہی اُس کی ماں سب گھر والوں کے لئے پانی لے کر گئی تھی۔ وہ اکیلا، اداس، سوچ میں گم بیٹھا رہا۔ گھر نہ گیا۔

گھر لوگوں سے بھرا ہو گا۔ صفِ ماتم بچھی ہو گی۔ مرنے والی کو یاد کیا جا رہا ہو گا۔ جن بڈھوں کی اگلے سال باری آنی ہے وہ سراسیمہ قطار باندھے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے عزیز و اقارب سب سے زیادہ رو رہے ہوں گے۔ میرا دکھ تو اتنا گہرا ہے، چوٹ اتنی سخت ہے کہ تنہا ہی سہنی پڑے گی زندگی دیوتا کا تحفہ ہے۔ اُس نے دیا۔ اُسی نے مدت مقرر کی، زندہ رہنے کی اور مرنے کی بھی۔ روزی کا بندوبست بھی اُسی کے سپرد ہے۔ پھر راجہ کو کیا اختیار ہے کہ یہ دیوتائی تحفہ ہم سے یوں چھین لے ——— محض راجائی زور کے بل پر" نادر جان نے سوچا۔ اُس کی کمر کے گرد، لباس کے نیچے چمڑے کا ایک موٹا تسمہ بندھا تھا جس پر اُس کی عمر کی گرہیں لگی تھیں۔ ہر سال جب نیا چاند چڑھتا وہ ایک گرہ اور لگا لیتا۔ اُس نے تسمے کو کھولا، گرہیں گننی شروع کیں۔ چالیس . . . کے چالیس سال اور رہ گئے ہیں۔ پھر ہم نہ ہوں گے۔ ہمارے لئے ہیرنگ کور ہو گا اور اس کی اتھاہ گہرائی۔ راجہ بھی تو ۸۰ برس کا ہو جائے گا۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ کیا ہماری موت اور زندگی پر یونہی راج کرتا رہے گا؟" نادر جان نے سوچا۔ آہ بھری۔ غم آلود آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے صاف کیا۔ تسمے کو کمر سے باندھا۔ چونہ نیچے کیا اور سر اٹھایا۔ اُس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔ اُس کا سترہ سالہ بیٹا محبوب جان نجانے کب کا کھڑا اپنے باپ کو دیکھے جا رہا تھا اُس کے چہرے پر محبت اور غم کا ملا جلا تاثر تھا۔

"میں تمہیں یوں نہ مرنے دوں گا۔ مجھے دیوتا کی قسم۔ راجہ کا حکم رہے اپنی جگہ۔ جیسے چپکے سے تم نے اپنی ماں جانے دی، میں تمہیں کبھی نہ جانے دوں گا۔" محبوب جان نے کہا۔

نادر جان نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کے اداس چہرے پر عزم کی جھلک تھی اور آنکھوں میں دلیری کی چمک۔ ہونٹوں کے گرد چھوٹی لکیریں اور جبڑوں کی بھنچی ہوئی ہڈیاں اٹل فیصلے کا تاثر لئے تھیں۔

نادر جان مسکرایا۔ اُس نے پیار سے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور واپس ہو لیا۔ اس ایک جملے نے ہی اس کا غم آدھا کر دیا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ نادر جان کی کمر سے بندھے تسمے پر گرہیں زیادہ ہوتی گئیں۔ آج راجہ کے محل کی چھت سے برف ہٹاتے، پھاوڑا سمیٹتے اس کی

ٹانگیں ہلکے ہلکے لرز رہی تھیں۔ ہاتھوں اور پاؤں میں خفیف لرزہ تھا۔ اس نے بمشکل کام ختم کیا۔ تھکاوٹ کی آہ کو اندر ہی اندر دبایا۔ چہرے پر مسکراہٹ طاری کی اور راجہ کے حواری سے پوچھا۔ "اور بھی کچھ حکم ہو تو فرمائیے۔ جھتیں تو صاف ہو گئیں۔"

"تم تھکے نہیں کیا؟؟ ان نوجوانوں سے بھی زیادہ پھرتیلے ہو!! کمال ہے!!!" حواری نے نادر جان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو تھوڑی ہمت باقی ہے۔" نادر جان نے منجمد مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

واپسی پر اس کا دل اُداس تھا۔ وہ سیدھا گھر کے اندر نہ گیا۔ برف سے اَٹے خرمانی کے درخت کے نیچے کھڑا سوچنے لگا۔ کمر سے چمڑے کے تسمے کو کھولا۔ گرہوں کو گنا۔ "۹۰ سال اور ۱۱ مہینے۔ بس ایک ماہ اور رہ گیا ہے۔ اس ایک ماہ اور بھی کیا جینا۔ گوز کا کچھ عجب ماحول ہے۔ باہر نکلتا ہوں تو نوجوانوں سے زیادہ چہرے پر شگفتگی، کمر میں تناؤ اور بازوؤں میں زور دکھانا پڑتا ہے۔ پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے سب میرے چہرے کو جانچ رہے ہیں۔ ساری جوانی یہاں گذار دی۔ گوز اور اہل گوز کے لیئے لاتعداد کام کئے۔ راجہ کی زندگی آرام دہ بنانے کے لئے بے حد تگ و دو کی۔ پھر بھی مجھے اپنے بڑھاپے کے چند سال کا بھی آرام نصیب نہیں۔ میرے گرد و نواح بسنے والوں سے سرد مہری کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ 'جاؤ تمہاری ضرورت نہیں۔' جیسے سارا ماحول ہی کہہ رہا ہو۔ اب تو زندگی خود بھی مشورہ دینے لگی ہے۔ 'آؤ موت کے پاس چلیں۔ اب اور جینا مناسب نہیں۔'"

"دیر ہو گئی۔ بابا واپس نہیں آئے۔" کھڑکی سے پوتے کی ہلکی آواز سنائی دی۔ پھر اہل خانہ کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ اُسی کا ذکر ہو رہا تھا۔ نادر ہلکے سے مسکرا پڑا۔ دل میں محبت کی لہر اُٹھی۔ "گاؤں کی فضا خراب سہی۔ گھر کے اندر تو پیار ہی پیار ہے۔" نادر جان نے سوچا۔ "لگتا ہے، میرے بنا یہ لوگ جی بھی نہ سکیں گے۔ کتنی شدید ضرورت ہے ان کو میری۔" اُس نے چوغا اونچا کر کے تسمے کو کمر سے باندھا۔ لباس درست کیا، اور اندر داخل ہو گیا۔

اس رات نادر کو نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے رات کا ایک پہر گزر گیا۔ کمرے کے اندر کا سکوت بہو، بچوں اور کونے میں بندھے چند مویشیوں کی سانسوں سے مرتعش ہو رہا تھا۔ نمدے پر بچھے بستروں میں لیٹا محبوب جان بھی جاگ رہا تھا۔ کچھ ساعت کے بعد وہ ہلکے سے اٹھا باپ کے سرہانے آیا۔ نادر جان اٹھا۔ دونوں نے آہستہ سے پہناوے پہنے ہلکے سے کواڑ کھولے اور گرتی برف میں، رات کی خاموشی میں، چپکے چپکے ہیرنگ کر بامسی کی جانب روانہ ہو گئے۔

"گھس ساش گھس ساش گھس ساش" نادر اور محبوب جان کے برف میں دھنستے پاؤں سے ہلکی آواز آ رہی تھی۔ سیاہی مائل فضا اور سفید زمین بغیر دیکھے ٹٹولے چلنا مشکل نہ تھا۔ راستہ کی نشان دہی کے لیئے مختلف جھاڑیوں اور درختوں پر محبوب جان نے سرخ کپڑے کے ٹکڑے باندھ رکھے تھے۔ وہ کہیں کہیں رُکتا۔ ٹہنیوں پر ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولتا۔ جب سرخ رنگ کا بندھا کپڑے کا ٹکڑا مل جاتا تو وہ اپنی راہ متعین کر کے چل پڑتا۔ چند گھنٹے کی مسافت کے بعد برف سے اَٹی ہوئی فصیل جیسی بلند سفید چٹان سامنے دکھائی دی۔ اس چٹان کے متوازی دونوں نے چلنا شروع کر دیا۔ کبھی پاؤں برف میں پھنس جاتے تو دونوں اسی کا سہارا لیتے۔ ایڑی پر دباؤ ڈالتے، پاؤں کے پنجوں کو بھینچتے تاکہ پہناوے اتر نہ جائیں اور اس طرح قدم چھڑا کر اونچا کرتے اور پاؤں آگے رکھتے۔ "گھس ساش" کی آواز آتی۔ پاؤں پھر دھنستے، پھر نکلتے اور اس طرح راستہ طے ہوتا گیا۔ چٹان ختم ہو گئی۔ نکڑ پر جھاڑیوں کا جھرمٹ تھا۔ یہ بھی برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان کے بیچ چند ٹہنیاں کاٹ کر گذرنے کا معدوم سا راستہ بنا ہوا تھا۔ محبوب جان نے باپ کو پیچھے کر کے خود قدم آگے بڑھایا۔ دونوں اس راستے پر ہو لئے۔ جھاڑیوں کے جھرمٹ سے بمشکل گذرنے کے بعد راستہ دشوار گذار نہ تھا۔ وہ جلد ہی ایک غار کے آگے جا رُکے۔ اُس کا دہانہ برف سے اَٹا پڑا تھا۔ اندر جانے کا راستہ جیسے مسدود ہو گیا ہو۔ محبوب جان نے کندھے پر سے کلہاڑی اتاری۔ برف پھرتی سے ہٹائی۔ برف پھسل کر نیچے ڈھیر ہو گئی۔ یہ ڈھیر سیڑھی کا کام دے گیا۔ دونوں اس پر پاؤں جماتے اوپر چڑھے اور غار کے اندر داخل ہو گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی محبوب جان نے دنبیوں کا گچھا اُٹھایا۔ اُسے چقماق سے آگ دکھائی اور غار کے بیچوں بیچ ایک چولہا نما جگہ پر آراستہ لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی۔ جب آگ بھڑک اُٹھی تو محبوب جان نے دنبیاں کھینچ نکالیں۔ انھیں بجھایا اور پھر سے کونے میں رکھ دیا۔

نادر جان خاموش غار کا جائزہ لے رہا تھا۔ لگتا تھا اس کو قابلِ رہائش بنانے میں محبوب جان نے مہینوں صرف کیے ہیں۔ لاتعداد پھیرے لگائے ہیں۔ کونے میں تھڑا بنا تھا۔ اس پر تازہ اور نرم پٹوؤں کا بستر آراستہ تھا۔ فرش کو ہموار کیا گیا تھا۔ اس پر جگہ بجگہ سوکھی گھاس بچھائی گئی تھی۔ بیٹھنے کے لئے سوکھی گھاس سے بھری پرانے پٹوؤں کی دو بڑی بڑی گدیاں آگ کے پاس زمین پر دھری تھیں۔ ایک طرف چھتی نصب تھی۔ اس پر ضرورت کی اشیا، اور چند برتن رکھے نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف غار کی دیوار میں کھونٹا گڑا تھا۔ اس پر دو مشکیزے ٹنگے تھے۔ ان میں پنیر اور خشک پھل تھا۔ کونے میں کلھاڑا رکھا تھا۔ دوسرے کونے میں لکڑیوں کا بڑا سا ڈھیر کاٹ چھانٹ کر تیار پڑا تھا۔ انھیں کے پاس دینیوں کا چھوٹا سا ذخیرہ تھا۔ سونے کی جگہ، سرہانے کی طرف۔ ایک نفیس چمڑے کا چھوٹا مشکیزہ پڑا تھا۔ اس میں انگوروں کی عمدہ شراب تھی۔ نادر جان نے ہر چیز کا بغور جائزہ لیا۔ اس کا دل محبت سے بھر آیا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا، ماتھا چوما اور کہا "میرے لئے تم نے کتنی محنت کی ہے بیٹا۔ اور اپنی ضد منوا کر اپنی جان کتنے خطرے میں ڈال رہے ہو۔ خیر چلو یہ بھی سہی۔"

محبوب جان نے بھرپور نظروں سے باپ کو دیکھا۔ "اگر تم نے غار سے بھاگنے کی کبھی کوشش کی یا اپنے آپ کو راجہ کے حوالے کرنے کا کبھی سوچا بھی تو دیوتا کی قسم میں خود تمہارے ساتھ ہی ہیزنگ کورسے کو د جاؤں گا۔" محبوب جان کی نگاہوں سے التجا اور عزم دونوں جھلک رہے تھے۔

نادر جان نے سر ہلایا جیسے سوچ رہا ہو "مزید کچھ کہنا بیکار ہے۔ بات نبھانی ہی پڑے گی۔"

اُس نے سوٹی دیوار سے ٹکائی۔ پٹوؤں کو کندھے سے اتار کر غار کے دہانے کے قریب لے جا کر جھٹکا اور آگ کے سامنے پڑی گدی پر ڈال دیا۔ پہناوے اتارے۔ اُن پر سے برف جھاڑی۔ شراب کا مشکیزہ کھولا۔ دو گھونٹ پیالے میں انڈیلے۔ خود پئے۔ تھوڑی محبوب جان کو پلائی اور کہا "اب تم جاؤ۔ روشنی تیز ہونے سے پہلے تمہارا واپس پہنچ جانا ضروری ہے۔ اس سرما کے لئے میری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ تم چند ماہ میرے پیچھے مت آنا۔"

محبوب جان نے پٹوؤں کو اپنے گرد لپیٹا۔ اپنی کلھاڑی کندھے سے لگائی اور بولا "غار کے دہانے کے دائیں طرف درخت کی ایک موٹی شاخ برف میں بچھی گڑی ہے۔ اس شاخ کے نیچے گوشت کے چند بڑے ٹکڑے برف میں دفن یخ بستہ محفوظ رکھے ہیں۔ تمہاری وقتاً فوقتاً ضرورت کے لئے کافی ہوں گے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو خیر باد کہا، بوسے لئے اور محبوب جان گھر کو روانہ ہو گیا۔ وہ جب گاؤں پہنچا تو روشنی تیز ہو چکی تھی۔ گھروں کی چمنیوں سے دھوئیں اُٹھ رہے تھے۔ اُس نے اپنے گھر کے کواڑ ہٹائے اور اندر داخل ہو گیا۔

بل گور نے نادر جان کی گمشدگی کو اس کی موت سمجھ کر تسلیم کر لیا۔

"وہ خود ہی، قبل از وقت ہیزنگ کورسے جا کودا۔ اُس نے بصد اہتمام لے جایا جانا گوارا نہ کیا۔ نادر جان ہم سب سے جدا تھا۔ اُس نے موت کو بھی اپنے ہی انداز سے گلے لگایا۔" سب نے یہی اندازہ لگایا۔ محبوب جان کے گھر اظہارِ افسوس کے لئے سب آئے۔ گرتی برف میں بھی اس کے گھر ماتم گساروں کا تانتا بندھا رہا۔

دن گذرتے رہے۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ نادر جان غار میں مقید زندگی گذارتا رہا۔ محبوب جان چھپ چھپ کر اس کی دیکھ بھال کرتا رہا اور اُس کی ضرورت کی اشیاء اُسے پہنچاتا رہا۔

غار کے اندر بیٹھے بیٹھے نادر جان، کتا گیا۔ برف باری ابھی ابھی بند ہوئی تھی۔ اُس نے سرد آگ کو ٹٹولا، کچھ چنگاریاں اُٹھیں، آگ بھڑکی،

چند ڈنٹھیاں نیچے ڈال کر، درخت کا موٹا سا منڈھ اوپر رکھ کر وہ پرے ہٹ گیا۔ آگ آہستہ آہستہ بھڑکنے لگی "اب باقی کے دن کے لئے بھی یہی آگ کافی ہوگی، منڈھ تو بہت دیر تک سلگتا رہتا ہے" اُس نے سوچا۔

غار کے کونے میں رکھے ہوئے پہناوے پہنے۔ برجیک... درخت کی چھال سے بنی لمبی سی رسّی سے کر نیس باندھا۔ ٹوپی پہنی۔ پٹوؤں کو اوپر، گرد لپیٹا اور غار کے دہانے پر جا کھڑا ہوا۔ باہر ہوا بند تھی۔ سورج سفید بادلوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ برف کی خاموش دنیا میں آج چندھیا دینے والی چمک نہ تھی۔ نادر جان نے منٹ بھر ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر سوٹی تھامی اور باہر نکل کھڑا ہوا۔ اُس کا رُخ ہیرنگ کور کی جانب تھا۔

سوٹی سے راستہ ٹٹولتا، وہ آخر چوٹی تک پہنچ گیا۔ چوٹی ایک میز کی سطح کی طرح سپاٹ تھی۔ اُس کے کناروں پر ابھری ہوئی چٹانیں برف سے ڈھکی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے چھوٹے سے میدان کی اونچی نیچی فصیل ہو۔ اسی فصیل سے ٹیک لگا کر نادر جان بیٹھ گیا۔ کچھ دیر سستا کر وہ اُٹھا۔ اس نے دور افق تک پھیلے پہاڑوں کے وسیع سلسلوں کو دیکھا۔ ہمالیہ، قراقرم، ہندوکش ——— ہندوکش کا بادشاہ "دیعامر" سامنے تنا کھڑا تھا۔ مگر آج اس پر قدرت جوش میں تھی۔ چوٹی پر سے پھسلتا برف کا ایک دریا تیز رفتاری سے نیچے بہہ رہا تھا۔ نوکیلی چوٹی کی تیز نوک آہستہ آہستہ ٹوٹ کر اس دریا کی نذر ہو رہی تھی۔ دریا تندی سے رواں اپنے اندر برف کے بڑے بڑے تودے سمیٹتا، سنگلاخ چٹانوں کو کاٹتا، اپنی لپیٹ میں لیتا بہتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی برف کے یہ تودے ایک دوسرے سے ٹکراتے، کچھ لمحے کے لئے ہوا میں اُڑتے، پھر دھپ سے نیچے بہتی مسلسل رواں برف کے دھارے میں کھو جاتے۔ ان میں سے نیلی چنگاریاں بلند ہوتیں۔ سرخ شعلے لپکتے اور پھر ٹھنڈی برف میں گم ہو جاتے۔ بہتا ہوا یہ دریا دیعامر کی ناف تک پہنچا۔ بڑے بڑے سالہا سال پرانے درختوں کو اُن کی جڑوں سے اکھاڑتا، اپنی لپیٹ میں لیتا، ایسے جیسے ماچس کی تیلیاں ہوں، اور توڑتا گراتا، بہتا، نیچے پستی میں جا کر خشک و ویران تنگ سی وادی میں ——— جو سوکھی، بھربھری زمین اور بڑے بڑے پتھروں سے اٹی پڑی تھی ——— آہستہ ہوتا ہوا رینگنے لگا۔ "آج دیوتا دیعامر پر کیا غضب ڈھا رہا ہے۔ اُس کے جوش نے تو برف میں بھی آگ لگا دی" نادر جان نے سوچا۔

کچھ دیر کے بعد برف رینگتے رینگتے رُک گئی۔ دیعامر پھر ویسے ہی پرسکون کھڑا اپنی عظمت کی داد لینے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے چند ساعت قبل اس پر کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ برف کا سیلاب، وہ ٹوٹتے گرتے درخت، وہ ٹکراتے، چنگاریاں اُڑاتے۔ برف کے چھوٹے بڑے تودے، بس ساکت سے ہو گئے۔

نادر جان دم بخود اس نظارے کو دیکھتا رہا۔ اُس نے لمبی سانس بھری اور مڑ کر بیٹھنے کی ٹھانی مُنہ سے نیچے سے کسی کے اوپر آنے کی آہٹ سنائی دی۔ "محبوب جان؟" اُس نے ہلکے سے آواز دی۔

"ہاں بابا" وہ محبوب ہی تھا۔ اُسے اپنے باپ کے معمول کا علم تھا۔ غار سے اکتا جاتا تو ہیرنگ کور کی چوٹی کا ہی رُخ کرتا۔ یہاں گور سے کوئی نہ آتا تھا۔ اس جگہ کو اچھا نہ سمجھا جاتا تھا۔ اہلِ گور صرف اپنے بزرگوں کو دھکیلنے یہاں آیا کرتے تھے۔

نادر جان کے لئے چہل قدمی کو اس سے محفوظ اور کوئی جگہ نہ تھی۔

محبوب جان نے کندھے سے ٹوکری اتاری۔ بھنا گوشت، تازہ دودھ اور تازہ پنیر کے ٹکڑے نکالے۔ روٹی رکھی، دودھ کو پیالے میں ڈال کر نادر جان کو پلایا۔ بھنا ہوا گوشت محبت سے کھلایا۔ پنیر اور خشک پھل دونوں نے مل کر کھایا۔ پھر دونوں باپ بیٹا ساتھ بیٹھ کر گھر اور گاؤں کی باتیں کرنے لگے۔ نادر جان اپنے پوتے اور پوتی کا ذکر سن کر مسکراتا رہا۔ بکری کی بیماری کا سُن کر اُسے تشویش ہوئی۔ اُس کا علاج تجویز کیا۔ گرما کی حاصل کی گئی شراب کو احتیاط سے رکھنے کے متعلق ہدایات دیں۔ بہو کی صحت کا پوچھا۔ اگلے سال کی فصل سے متعلق گفتگو کی۔ گاؤں کے آپس کے چند تنازعات کا سن کر محبوب جان کو مشورے دیئے۔ محبوب اپنے بابا کی باتوں کو بہت غور سے سنتا رہا۔

سورج سفید بادلوں کے پیچھے سفر کرتا مغرب تک پہنچ چکا تھا۔ فضا میں روشنی بجھنے سی لگی تھی۔ محبوب جان نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا۔ اُس کے پاؤں کے پہناوؤں کی رسیاں درست کیں۔ سوٹی ہاتھ میں تھمائی، برتن سمیٹے اور دونوں باپ بیٹا غار کو روانہ ہو گئے۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر نادر نے محبوب کو

چوما اور کہا — "میں تمہاری خوشی پوری کر رہا ہوں جان۔ زندگی کی خواہش تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔"

"ایسے مت سوچو بابا۔ تمہاری موجودگی میرے لئے بہت ضروری ہے۔ میں تمہاری رائے کے بغیر کسی مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ گور میں میری ہمیت تمہاری سانسوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ تم نہ رہے تو محبوب جان کی تنی پشت میں وہ بات نہ رہے گی۔ کیا بیٹے کا سہارا بننا زندگی کا مناسب جواز نہیں؟"

محبوب کا جواب سن کر نادر مسکرا پڑا اور مڑ کر غار کے اندر چلا گیا۔

بیٹا باپ کی اوجھل ہوتی ہوئی پشت کو دیکھتا رہا۔ پھر چہرے پر اداسی کا تاثر لئے گور کو واپس ہو لیا۔

وہ ایک گرما کی ٹھنڈی رات تھی۔ صاف آسمان پر چاند کھلا تھا۔ فضا منور تھی۔ سارا گور چمک رہا تھا۔ چاندنی میں نہلائے درختوں اور پتھروں کے ساتھ بیٹھے ان کے سیاہ وجود ایک پراسرار تضاد پیدا کر رہے تھے۔ آج راجہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے گھر کے والان میں ٹہل رہا تھا۔ درخت سیبوں سے لدے تھے۔ فضا میں ان کی مہک رچی تھی۔ راجہ کچھ سوچتا، ٹہلتا چلا جا رہا تھا۔ آج اس کی زندگی کے ایک سو سال پورے ہو چکے تھے۔ نوجوانوں کی بستی میں وہ اکیلا بوڑھا، فرسودہ سوچوں کو ذہن سے لگائے حکومت کر رہا تھا۔ تنہائی جینے کی تمنا چھین رہی تھی۔ اس نے اپنے جھریوں بھرے ہاتھ کو چہرے پر پھیرا اور والان سے نکل کر پگڈنڈی پر ہو لیا۔ اس کا رخ ہیرنگ کور کی جانب تھا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک سوٹی تھی۔ چاندنی اس کی راہ روشن کئے تھی۔ ساتھ میں کوئی حواری نہ تھا —— تنہا —— سوچ میں گم —— وہ اس بلندی کی جانب رواں تھا جہاں سے گذشتہ کتنے برسوں سے اس کی رعایا میں سے اس کے ہم عمر نیچے دھکیلے جاتے رہے۔ رانی نے محل کی کھڑکی سے اس کی جھکی گردن کو دیکھا، ٹھنڈی سانس بھری اور بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کا دل اپنی بھولی فیروزاں کے لئے ویراں تھا جو عنقریب ہیرنگ کور لے جائی جانے والی تھی۔ مگر وہ راجہ کو کچھ بھی نہ کہہ سکتی تھی۔

راہ روشن تو تھی مگر راجہ کے آگے کا چند فٹ کا راستہ تاریک تھا۔ اسے کبھی ٹھوکر لگتی، اور کبھی نشیب میں پاؤں دھپ سے جا گرتے جس کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی ہل سی جاتی۔ جھٹکا کافی سخت محسوس ہوتا۔ اس کا اپنا سایہ بھی اس کی راہ میں ٹھوکروں کا باعث بن رہا تھا۔ راجہ محتاط ہو گیا، اور سوٹی سے ٹٹول کر چلنے لگا۔

گھنٹوں گذر گئے ہیرنگ کور کی چوٹی اب دور نہ تھی۔ وہ بہت تھک چکا تھا۔ دم لینے کے لئے اس نے مانوس راستہ چھوڑا اور دائیں طرف مڑتی ہوئی مبہم سی پگ ڈنڈی پکڑ لی۔ رخ بدلنے سے اس کا سایہ بھی ایک طرف ہو گیا۔ قدم ہمواری سے اٹھنے لگے۔ چٹان کے ساتھ ساتھ چلتی یہ سجری پگڈنڈی جھاڑیوں کے جھرمٹ میں گم ہو گئی۔ راجہ نے سوٹی سے جھاڑیاں ہٹائیں تو آگے آسان راستہ اور ایک چھوٹا سا ہموار میدان سا نظر آیا۔ راجہ اسی میدان میں سستانے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ وہ ایک چھوٹا سا کھیت تھا چند ایک کیاریوں پر مشتمل جن کے بنے بندھے تھے۔ بیچ میں سلیقے سے جڑی بوٹیاں لگی تھیں "یہ قدرت کا نہیں کسی انسان کا کام ہے۔ مگر یہاں ویرانے میں، چند جڑی بوٹیاں اگانے کون آ سکتا ہے" راجہ نے سوچا وہ گرد و نواح کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اسے دور اونچے بڑے پتھروں کی اوٹ سے کسی کی آمد کا احساس ہوا۔

"بے پناہ وسعتوں کا مالک انسان اپنے وجود کو اپنے ہی بنائے ہوئے قانونوں میں مقید کر لیتا ہے۔ پھر اس قید کا اتنا قائل ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی زندگی کا انداز سمجھ کر، اپنی سوچ اور امنگ تک کو محدود کر لیتا ہے۔ دل سے ولولے اٹھتے ہیں۔ ذہن سے خیالات ابھرتے ہیں۔ ان کی گہرائی بلندی اسی احاطہ کی دیواروں سے ٹکرا کر اس محدود سے والان میں گھومتی رہتی ہے جسے ہم لوگ زندگی کہتے ہیں۔ فطرت نے جن وسعتوں سے ہمیں نوازا۔ ان بلندیوں سے ہماری آشنائی رہی۔ جن گہرائیوں سے ہم ابھرے، ہم ان کی یادداشت تک کھو بیٹھے ہیں۔ گور اور اس کے قوانین سے علیحدہ رہ کر تنہا جبکہ ہر دم ساتھی موت رہی، خود سے ہمکنار ہو کر میں نے کیا کچھ نہ سمجھا۔ مگر صدیوں پرانی عادات کا پھندا ابھی توڑ نہیں سکا۔ میں چند میل پیچھے جا کر اپنے گاؤں والوں

کو کیا کچھ نہیں سمجھا سکتا۔ جرأت ہے کہ دل سے اٹھتی ہے، ذہن سے ٹکراتی ہے۔ مگر ہاتھ پاؤں اس ارادے کی تائید میں متحرک نہیں ہو پاتے۔" نادر جان سوچ میں گم غار کے دہانے پر کھڑا تھا۔ اُس کے سامنے نشیب سے کسی کا سر ابھرا اور بتدریج اونچا ہوتا ہوا ایک وجود کھیت میں آن کھڑا ہوا۔ چاندنی اس پہ چمکی تو نادر جان نے دیکھا کہ سامنے راجہ کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سوئی تھی۔ وہ کھیت میں اُگی جڑی بوٹیوں کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے سر اٹھا کر گردونواح پر نظر دوڑائی۔ نادر جان کا ہم عمر ہونے کے باوجود راجہ زیادہ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر خستگی کے آثار تھے۔ نادر جان کو بالکل خوف محسوس نہ ہوا، نہ ہی اُس نے غار کے اندھیرے میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ وہ آگے بڑھا۔ راجہ کے سامنے جا کر آہستہ سے جھکا اور اسے سلام کیا۔ راجہ چونک پڑا۔ نادر جان پر نظر پڑتے ہی چہرہ خوف سے زرد ہو گیا۔ سوئی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ نادر جان نے لپک کر سہارا دیا۔

"میں بھوت نہیں ہوں۔ خود نادر جان ہوں۔ ابھی تک زندہ ہوں جیسے میرے متعلق مشہور ہو گیا تھا۔ میں نہ پہرنگ کو ٹک بھاگا۔ نہ ہی وہاں سے کودمرا۔ میں یہاں آ گیا تھا۔ برسوں سے یہاں غار میں تنہا زندگی گذار رہا ہوں۔ بہت مدت کے بعد آپ کو دیکھ تو مارے خوشی کے رہ نہ سکا۔ میرے ہم عمروں میں سے تو صرف آپ ہی زندہ رہ گئے ہیں۔ باقی سارے ساتھی یکے بعد دیگرے یہاں سے اوپرے چلے گئے اور پھر کبھی نہ لوٹے۔ یہ بھی اچھا ہے کہ آپ سلامت ہیں ورنہ میں تو سوچا کرتا تھا کہ اگر مجھے گورو واپس جا کر رہنا نصیب ہو بھی جائے تو اب وہاں میرا ساتھی کون ہو گا۔"

راجہ خاموش نادر جان کو دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کے چہرے پہ سکون تھا۔ اُس کے الفاظ سے ٹپکتی محبت نے راجہ پر عجیب اثر کیا۔ اُس نے اردگرد دیکھا اور نزدیک ہی پڑے پتھر پہ بیٹھ گیا جیسے نڈھال ہو گیا ہو۔

"آپ کی صحت ٹھیک نہیں۔ رنگ مرجھا چکا ہے۔ اعصاب کی کمزوری معدے پہ اثر انداز ہوتی ہے۔ معدے کی خرابی سارے جسم کو کمزور کر دیتی ہے۔ میرے پاس اس کے لئے موزوں دوا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو تیار کر کے محبوب جان کے ہاتھ روانہ کر دوں۔"

راجہ نے کچھ جواب نہ دیا، اپنا سر جھکا لیا۔ نادر پُر سکون ہلکی مسکراہٹ لئے باادب کھڑا رہا۔

بہت دیر کے بعد راجہ نے سر اُٹھایا۔ نادر کو دیکھا۔ جی بھر کر دیکھا۔ اور ایک بار پھر سر جھکا لیا۔ اب کے جو سر اُٹھایا تو یوں لگتا تھا جیسے اس ایک گھڑی میں اُس کی عمر کے چند سال اور گزر گئے ہوں۔

اس کا جسم ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ ایک طرف اپنی صریح حکم عدولی پر راجائی غصہ اور اس سے پیدا ہونے والی غضب کی لہریں اس کے وجود کو گھیرے تھیں۔ دوسری طرف اس کے دل میں نادر جان کو سینے سے لگا کر اسے "میرے ساتھی" کہنے کی امنگ بیدار ہو چکی تھی۔

راجہ نے بمشکل اُٹھا۔ بھیگے ہاتھوں سے اُس نے سوئی تھامی۔ ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ لمبی سانس بھری، کندھوں کو ڈھیلا چھوڑا۔ قبا سیدھی کی اور مڑ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ اُس کے ذہن میں خیالات کا سلسلہ اپنا انداز بدل رہا تھا۔ واپسی پر اُسے ٹھوکریں کم لگیں۔ اُس کا سایہ پیچھے تھا۔ چاندنی اُس کی آگے کی راہ منور کئے تھی۔ وہ جلد ہی گھر پہنچ گیا۔

راجہ اور رانی دونوں رات بھر جاگتے رہے۔ ایک ہی بستر پر دراز دونوں نے رات بسر کی۔ اپنی اپنی دنیا کی سوچوں میں گم الگ تھلگ کروٹیں بدلتے رہے۔ رانی فیروزاں کے لئے متفکر رہی۔ راجہ نادر جان سے ملاقات کے بعد اُٹھنے والے خیالات کے ہجوم میں سرگرداں رہا۔

محبوب جان نے دروازے کے کواڑوں کو ہٹا کر ایک طرف دیوار کے ساتھ رکھا۔ کھڑکیوں کو کھول کر ان کے در دیوار کے ساتھ گڑے لکڑی کے کلّے سے باندھ دیئے اور مطمئن ہو کر گھر کے اکلوتے کمرے کا جائزہ لیا۔ دھوپ اندر آ رہی تھی۔ اس کی بیوی فرش کو تازہ تازہ لیپ کر نیچے چشمے پر ہنڈو دھونے گئی ہوئی تھی۔ بچے کھیتوں میں کھیل کود رہے تھے اور بکریوں کے لئے تازہ پتے اکٹھے کرنے میں لگے تھے۔ محبوب جان نے چھت کے قریب دیوار سے نصب کھونٹی پر سے چمڑے کے دو ٹکڑے اُٹھائے۔ بکری کی خشک آنتوں سے بنے ڈورے کا گولہ اُٹھایا۔ ایک برتن میں تھوڑا پانی لیا۔ ایک لکڑی کا چھوٹا ہتھوڑا اٹھایا اور صحن

میں پڑے چوڑے پتھر کے پاس جا بیٹھا۔ اُس نے چمڑے کے ٹکڑوں کو پتھر پر پھیلایا۔ ان پر تھوڑا سا پانی چھڑکا اور لکڑی کے ہتھوڑے سے انھیں آہستہ آہستہ کوٹنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنا پٹوؤں میں لپٹا پاؤں آگے بڑھایا۔ چمڑے کے ٹکڑے پر رکھا۔ چمڑے کے اس ٹکڑے کو مخصوص انداز سے پاؤں کے گرد ذرا ڈھیلا چھوڑ کر لپیٹ دیا۔ ساتھ میں پڑے آنتوں سے بنے ڈورے کے گولے کو کھولا۔ اسے کس کر بہت سے پھیرے دے کر، پاؤں کے اوپر لپٹے چمڑے کے ٹکڑے کو مہارت سے باندھ دیا۔ ڈورے کے سرے پر مضبوط گرہیں لگائیں۔ پھر رک کر پاؤں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ مطمئن ہو کر اُس نے اپنا ایک ہاتھ پاؤں کے پنجے پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے ایڑی نیچے سے پکڑی اور پھر پاؤں کو دھیرے سے چمڑے کے اس خول سے نکال لیا۔ اس کا ننگا پاؤں باہر آیا۔ چمڑے کا یہ خول جس کے اندر پٹوؤں کی تہہ لگی ہوئی تھی سامنے پڑا برف پہ چلنے کے انگریزی بوٹ سے مشابہ تھا۔ محبوب جان نے چمڑے کے دوسرے ٹکڑے سے اسی طرح کا ایک اور خول تیار کیا۔ پھر دونوں کو دیکھ کر سوچا "ان سردیوں بابا کے پاس پاؤں کے لیے اور گرم تر پہناوے ہوں گے اور پہر نگ کی چوٹی تک جاتے ہوئے اس کے پاؤں کو ٹھنڈ کم لگے گی۔"

اس کی بیوی چشمے سے واپس آئی۔ پہناووں کو دیکھا۔ معنی خیز نظروں سے شوہر کو دیکھ کر مسکرائی۔ محبوب جان بھی ہلکے سے مسکرایا۔ دونوں گھر کے اندر اور گاؤں کے گرد و نواح میں نادر جان سے متعلق کبھی کوئی گفتگو نہ کرتے تھے۔ وہ خاموشی سے اندر گئی۔ سبز پتوں میں لپٹے پنیر اور مٹی کے ایک کٹورے کو جس میں گوشت سے حاصل کی گئی لاشہ جمع تھی، اٹھا لائی "یہ بھی تیار ہے" وہ ہلکے سے بولی۔

"ابھی نہیں۔ ابھی انھیں چھتی پر ہی رہنے دو اور یہ پہناوے بھی وہاں رکھ دو" محبوب جان نے آہستہ سے جواب دیا۔

اس کی بیوی پہناووں کو اٹھا کر اندر لے گئی۔ محبوب اوزار سنبھالنے لگا۔ سامنے پگڈنڈی پر کوئی آرہا تھا۔ راجہ کا حواری جس کی زندگی کا بیشتر حصہ راجہ کی خوشامد اور اہل گور کو استعمال کر کے راجہ کی زندگی سہل تر بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کی کسی کے گھر میں آمد کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ راجہ کی طرف سے کوئی حکم لا رہا ہے۔

"اور بیگار کیا مصیبت ہے۔ خدا خیر کرے۔ اب کے کتنے دنوں کا کام کرنا ہوگا" محبوب جان نے سوچا۔ ناگواری کا تاثر چھپایا۔ آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا۔

"محبوب جان تمہیں راجہ نے فوراً بلایا ہے" حواری نے پیغام دیا۔

"کیوں خیر تو ہے؟" محبوب جان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"بس چلے آؤ خود ہی معلوم کر لینا" حواری نے مختصر سا جواب دیا۔

محبوب جان نے کندھے پر چادر رکھی۔ سر کی ٹوپی سیدھی کی۔ سوٹی ہاتھ میں تھامی۔ بیوی کو مطلع کیا اور حواری کے پیچھے محل کی جانب روانہ ہو گیا۔

راجہ کے محل کے دالان میں اہل گور کی ایک مختصر سی بھیڑ تھی۔ ہر گھر سے ایک یا دو معتبر افراد کو بلایا گیا تھا۔ محبوب جان بھی جا کھڑا ہوا۔ اس اجتماع کی وجہ کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ پاچھ کر خاموش ہو گئے اور صبر سے راجہ کا انتظار کرنے لگے۔ محل کا دروازہ کھلا۔ راجہ اپنے متعدد بیٹوں کے ہمراہ باہر آیا۔ اور سامنے پڑی اکلوتی کرسی پہ جا بیٹھا۔ سب لوگ دست بستہ کھڑے تھے۔ ایک کے بعد ایک۔ سب آگے بڑھے۔ راجہ کا ہاتھ چوما۔ سلام کیا اور پھر اپنی جگہوں پر جا کھڑے ہو گئے۔ راجہ بغور اُن کے متجسس چہرے دیکھتا رہا۔ ان میں نوجوان تھے۔ ادھیڑ عمر کے تھے۔ چند ایک بوڑھے بھی تھے۔ جن میں سے کچھ اسی برس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ سب کی کمریں سیدھی تھیں۔ چہرے پر صحت کی سرخی تھی۔ نظروں میں راجہ کے لئے اطاعت اور ادب کا تاثر تھا۔

اپنی مختصر سی رعایا کا جائزہ لینے کے بعد راجہ نے اپنا بوڑھا سر جھکا لیا۔ "ان کو ہم خود ہی ختم کر کے اپنی رعایا کی تعداد گھٹاتے رہتے۔ افراد کی تعداد تو راجاؤں کے لئے طاقت کا باعث ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے بازو جہاں محنت اور طاقت کا جوش لئے ہوتے ہیں وہاں بوڑھوں کے دماغ عقلی

تجاویز سے مزین ہوتے ہیں۔ جو جوان بازوؤں کے مناسب استعمال کا طریقہ سوچ سکتے ہیں۔ میرے آباؤ اجداد نے بن سوچے یہ حکم صادر کیا۔ اور پھر ہمارا یہ قانون ہی بن گیا۔ میں خود بھی اتنے برس تک اس پر عمل کرتا رہا۔ عقل بھی آئی تو اب جبکہ میں خود بوڑھا ہو چکا ہوں۔" راجہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ لوگ متذبذب منتظر کھڑے رہے۔

پھر اُس نے سر اُٹھایا۔ محبوب جان کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور کہا "تمہارے متعلق ایک عجیب اطلاع ملی ہے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کیا وہ سچ ہے؟"

محبوب جان نے چونک کر چند ساعت کے لئے راجہ کو دیکھا۔ راجہ کی آنکھوں میں شفقت تھی۔ ہونٹوں کے کونے خفیف مسکراہٹ کا انداز لئے تھے۔ محبوب جان کو اُس کے چہرے پر چڑھا رعب کا ملمع خوفزدہ نہ کر سکا۔ اُس نے اطمینان سے کہا "فرمائیے میرے محترم"۔

"ہمیں علم ہوا ہے کہ نادر جان زندہ ہے۔ تم نے اُسے ہیرنگ کور پر ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟"

محبوب جانتا تھا کہ وہ اپنے بابا کو ہمیشہ نہیں چھپا سکے گا۔ کبھی نہ کبھی تو بات کھلے گی۔ پیشی ہوگی۔ گور کا راجائی دستور توڑنے والوں کی سزا سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اب جبکہ یہ لمحہ آ چکا تھا، اُس نے کچھ بھی خوف محسوس نہ کیا۔ اُس نے اپنے اندر اطمینان اور اعتماد کی لہریں اُٹھتی محسوس کیں۔ اُس کے پیچھے کھڑے ہجوم میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔ سب چونکے۔ سب نے سہم کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ہراساں چہرے لئے کبھی راجہ اور کبھی محبوب جان کو دیکھنے لگے محبوب جان سے سب کو رغبت تھی۔ اُس نے ہر ایک کی کبھی نہ کبھی مدد کی تھی۔ گاہے دوا، گاہے ہمدردی و رغبت، گاہے تجویز اور دعا کی صورت میں۔ اگر کوئی بہت لاچار ہو جاتا تو وہ سردیوں میں اپنے یخ بستہ گوشت کا کچھ حصہ، اپنی سوکھی گھاس اور جمع کردہ لکڑیوں میں سے کچھ نہ کچھ دے دیا کرتا تھا۔ آپس کے تنازعوں میں اس کا وجود ثالث کا سا ہوتا اور چھوٹے موٹے جھگڑے اہلِ گور آپس میں ہی طے کر لیتے۔ راجہ تک پہنچنے کی نوبت کم ہی آتی۔ محبوب جان کو وہ اپنے درمیان زندہ اور سلامت دیکھنا چاہتے تھے۔

"اب کیا ہوگا؟" سب کو تشویش تھی۔

راجہ نے ہجوم کے ردِعمل کو وضاحت سے محسوس کیا۔ محبوب جان کی مقبولیت سے وہ خوب واقف تھا۔ راجہ کے اپنے مویشیوں کی صحت کا ذمہ اُس کی متعدد ذمہ داریوں میں سے ایک تھا جسے وہ بخوبی انجام دیا کرتا۔ راجہ خود بھی اُس کے متعلق ہمدردانہ جذبات رکھتا تھا اور آج تو اُس کے دل و دماغ کی کیفیت ہی کچھ اور تھی۔

محبوب جان کافی دیر خاموش رہا۔ راجہ کے چہرے کو بغور دیکھتا رہا۔ پھر رُک رُک کر ایک ایک لفظ پہ ہلکا سا زور دے کر اُس نے چار لفظوں میں جواب دیا "درست ہے میرے محترم۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" راجہ نے پوچھا۔

"میرا بابا نادر جان، بہت عقلمند ہے۔ اُس کا زندہ رہنا اہلِ گور، میرے اور آپ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اس حکم کو نہ مانا اور اپنے باپ کو اب تک زندہ رکھا۔ پچھلے چند برسوں میں جتنے بھی علیل لوگوں کو میری دواؤں سے فائدہ پہنچا، جتنے بھی بیمار جانور بچے اور اس طرح ہمارے پورے گلّے وبا سے محفوظ رہے، آپس کے تنازعات میں جو مناسب تجاویز میں نے دیں یہ سب میرے بابا کی عقل تھی جو میں استعمال کرتا رہا۔" یہ کہہ کر محبوب جان کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر نرمی سے بولا۔ اس کی آواز میں ٹھہراو اور جرأت تھی۔ "آپ جو مناسب سمجھیں سزا دیں۔"

راجہ نے بغور ہجوم کا جائزہ لیا۔ محبوب جان کو دیکھا اور کہا "اگر تمہارا بابا اتنا ہی عقلمند ہے جتنا تم کہتے ہو تو اُسے میری طرف سے حکم دو کہ مجھے ریت کی رسی بنا دے۔"

یہ بات ناممکن تھی۔ سب جانتے تھے کہ نادر جان اور اُس کے بعد محبوب جان کا کیا انجام ہوگا۔ سب افسردہ گھروں کو لوٹ آئے۔

محبوب جان نے سیدھا ہرنگ کو رکا رخ کیا۔ اُس کے اندر ایک اطمینان سا تھا۔ "میرا باپ اس مسئلے کو بھی کسی نہ کسی طرح حل کرے گا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔

نادر جان نے غار کے دہانے سے یوں سوچ میں گم کھلے بندوں، اپنے بیٹے کو آتے دیکھا تو ٹھنڈی سانس بھری کل رات راجہ سے ملاقات کے بعد اُسے اُسی لمحہ کا انتظار تھا۔ محبوب کے قریب پہنچتے ہی نادر جان نے پوچھا "کیا کہتا ہے راجہ؟"

"تو راجہ آپ کو مل چکا ہے؟" محبوب نے سوال کیا۔

"ہاں کل رات اسی غار سے باہر ہماری ملاقات ہوئی تھی"۔ نادر جان نے جواب دیا۔

"پھر تو مزید بہانہ بنانا فضول ہے"۔ محبوب جان نے مایوسی سے سوچا اور بے دلی سے ایک کونے میں پڑے پتھر پر جا بیٹھا۔

باپ نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر دلاسے کی تھپکی دی۔ سر کے بالوں کو محبت سے چھیڑا۔ "بتا بیٹا۔ جلدی بتا۔ میں پیغام سننا چاہتا ہوں"۔ نادر نے اصرار کیا۔

"راجہ کہتا ہے اگر آپ اتنے ہی عقلمند ہیں تو اسے ریت کی رسّی بنا کر بھیج دیں"۔

نادر ہلکے سے ہنس پڑا بیٹے کے پاس جا بیٹھا۔ پھر اُٹھا۔ چھوٹے مشکیزے سے شراب نکالی۔ تھوڑی بیٹے کو دی۔ پیالہ صاف کر کے رکھا اور محبوب جان سے کہا۔ "راجہ سے کہو مجھے اس رسّی کا ایک نمونہ بھیج دے۔ اُسے دیکھ کر میں بخوبی ریت کی رسّی بنا سکوں گا"۔

دوسرے دن اسی وقت سب راجہ کے محل کے احاطے میں اکٹھے ہوئے۔ اُن کے چہرے پژمردہ تھے۔ وہ اپنے دوست، اپنے ہمدرد کے انجام پر رنجیدہ تھے۔ محبوب جان آیا تو اس کا انداز دیکھ کر انہیں چپ سی لگ گئی۔ ہمدردی کی وہ سب تقاریر جو وہ تیار کرتے چلے آئے تھے اُن کے سینوں میں گم ہو گئیں۔ وہ باادب، خاموش، سٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ وہ جو صدیوں سے اس حکم کو مانتے چلے آئے تھے۔ وہ جو اپنے بزرگوں کو ہرنگ کو رسے دھکیل کر راجاؤں کی اطاعت کا دم بھرتے رہے تھے جن میں سے کسی میں بھی اپنے پیاروں کی جان بچا لینے کی جرأت پیدا نہ ہوئی تھی۔ محبوب جان کے مطمئن چہرے سے آنکھ نہ ملا سکے۔ اُس کی دلیری اُن میں احساس کمتری پیدا کر رہی تھی۔

سب نے محبوب جان کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ تنہا، سب سے آگے، راجہ کا منتظر کھڑا تھا۔ راجہ اپنے بیٹوں کے ہمراہ آیا۔ اکلوتی کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس نے پھر سب لوگوں کا جائزہ لیا۔ لوگوں نے باری باری سلام کیا۔ وہ جب دست بوسی کے لئے آگے بڑھنے لگے تو راجہ نے اشارہ سے منع کر دیا۔ اور محبوب جان کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ محبوب جان نے آگے بڑھ کر راجہ کا ہاتھ چوما اور باادب کھڑا ہو گیا۔

"جواب لائے ہو؟" راجہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرے محترم!" محبوب جان نے جواب دیا۔

"کیا کہتا ہے نادر جان؟" راجہ نے پوچھا۔

"میرا بابا کہتا ہے، آپ اُسے نمونہ بھیج دیں۔ اُسے دیکھ کر وہ بخوبی ریت کی رسی بنا لے گا"۔

راجہ جواب سُن کر کافی دیر خاموش رہا۔ پھر ہنس پڑا۔ لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ محبوب جان لاتعلق راجہ کے چہرے کو دیکھتا رہا اور جواب کا منتظر رہا۔

راجہ نے کچھ نہ کہا بس کرسی سے اُٹھا اور محل کے اندر چل دیا۔ اُس کے بیٹوں نے اہل گور کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

باقی کا دن سب کے لئے تذبذب کا دن تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ کیا ہو گا۔ سب اپنی بے چینی چھپائے کاموں میں مصروف رہے۔ سب محبوب و نادرجان کے لئے دعا گو تھے۔ محبوب جان نے گھر پہنچ کر کسی قسم کی تشویش کو ظاہر نہ کیا۔ اپنے وجود میں اطمینان کی حاقت سے کام کاج میں مصروف رہا۔

دوسرے دن راجہ کے پیغامبر راجہ کی طرف سے ایک عظیم دعوت کا پیغام لے ہر گھر پہنچے۔ سب مردوں، عورتوں کو بلایا گیا۔ سارا گور مدعو تھا۔ ڈھولکوں، نوبتوں کی "دف دف" پر جھومتے یہ پیغامبر پر وسنگ لیتے کھیتوں میں مصروف لوگوں کو آوازے کرجاتے۔ درختوں پر چڑھے کمسن لڑکوں کو پکارتے۔ دعوت کا پیغام دیتے اور سازوں کی لے پر چلتے دوسرے گھر روانہ ہو جاتے۔ نوبتوں کی "دف دف" سے بکریاں چونک چونک جاتیں۔ بتوں پر اگی جھاڑیوں کے سبز پتے چنتے چنتے کان کھڑے کرتیں۔ پھر قلانچیں بھرتی بھاگ جاتیں۔ گاؤں میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دعوت کا پیغام انوکھا تھا۔

"نادرجان اور محبوب جان شاید بچ ہی جائیں"۔ اہل گور نے سوچا۔

وہ اپنے صاف ترین لباس میں ملبوس ہو کر اپنے عیال سمیت راجہ کے محل کے آگے بڑے دالان میں شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے جمع ہو گئے۔ درختوں کے نیچے لکڑی کے کشادہ تختوں کو پتھروں پر رکھ کر بڑے بڑے میز بنائے گئے تھے۔ یہ میز وادی میں پیدا ہونے والے ہر قسم کے خشک اور تازہ پھلوں سے آراستہ تھے۔ ہر میز کے وسط میں ایک سالم بھنی ہوئی بھیڑ رکھی تھی۔ ابلے ہوئے چاولوں سے پُر مٹی کی بڑی بڑی طشتریاں تھیں۔ پینے کے لئے انگوروں کی شراب کے مشکیزے جابجا سجے تھے۔ ان کے ساتھ مٹی اور لکڑی کے کٹورے پڑے تھے۔ دالان کے ایک کونے میں سازندوں کی ٹولی شادیانے بجانے میں مصروف تھی۔ راجہ انتہائی مسرور چہرہ لئے، اپنے بیٹوں کی ٹولی ساتھ لگائے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ لوگوں سے محبت آمیز خوشگوار گفتگو کر رہا تھا۔ راجہ نے محبوب جان سے بھی خوش مزاجی کا برتاؤ کیا۔ کل کے جرگے سے متعلق کچھ بھی نہ کہا۔ نادرجان کا ذکر تک نہ ہوا۔ راجہ کے شفیق رویئے سے اہل گور میں اطمینان کی سرد دوڑ گئی۔ لوگ کھانے پینے اور پلانے میں مصروف ہو گئے۔ جو متذبذب اور متفکر اس دعوت میں شریک ہوئے تھے، اب اطمینان اور خوشی سے اس کے مزے لینے لگے۔ محبوب جان خاموش رہا۔ اس نے نہ تو زیادہ پی، نہ زیادہ کھایا۔ وہ بغور راجہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اس کے رویئے سے کچھ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش میں محو تھا۔

جب شام رات میں ڈھل گئی۔ دیلیوں کے گچھوں سے تیار شدہ مشعلیں بھڑک اٹھیں، لوگ سیر ہو گئے۔ شراب کے مشکیزے قریباً ختم ہو گئے سازندوں کے ساز خاموش ہو گئے تو راجہ کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے بیٹے پیچھے قطار باندھ کر باادب کھڑے ہو گئے۔ اس کے حواری اپنی مخصوص جگہوں پر متعین ہو گئے۔ ہجوم پر خاموشی چھا گئی۔ سوتے ہوئے بچوں کو ماؤں نے اپنی گود میں لے لیا، اور زمین پر بیٹھی رہیں۔ مرد سب متوجہ کھڑے ہو گئے۔ راجہ نے اپنے سامنے بکھرے لوگوں کو لحظہ بھر دیکھا اور کہنا شروع کیا "میں نے نادرجان کو معاف کیا۔ محبوب جان کو بھی معاف کیا۔ نادرجان کو باعزت واپس لایا جائے گا اور وہ اپنی باقی ماندہ زندگی ہمارے درمیان رہ کر گزارے گا"۔

یہ کہہ کر راجہ رک گیا۔ اہل گور خاموش، دم سادھے کھڑے رہے۔ وہ مزید کچھ سننے کے منتظر تھے۔ راجہ نے پھر کہنا شروع کیا "آج کے بعد یہ دستور ہمیشہ کے لئے ختم۔ تمہارے بزرگ تا زندگی تمہارے ساتھ رہیں گے۔ اب بہرنگ کور سے نیچے کوئی نہیں دھکیلا جائے گا"۔

راجہ کے خاموش ہوتے ہی ہجوم پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کے چہرے انتہائی سنجیدگی سے جیسے کھنچ سے گئے۔ شراب کا نشہ ان کے وجود سے اٹھنے والے جذبات کی نذر ہو گیا۔ وہ کافی دیر خاموش کھڑے رہے۔ راجہ کی توقع کے برعکس کسی نے خوشی کا نعرہ نہ لگایا۔ "عنایت"، "مہربانی"، "تشکر" کی صدائیں نہ بلند ہوئیں۔ اور نہ ہی آگے بڑھ کر راجہ کے ہاتھ چومے گئے۔ راجہ حیرت زدہ اس سنگین خاموشی کو دیکھتا گیا۔ تمام اہل گور سے جیسے ناپسندیدگی کی لہریں اٹھ اٹھ کر اس کے اعصاب کو منتشر کئے دے رہی تھیں، وہ گھبرا سا گیا۔ زیادہ دیر کرسی پر بیٹھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ وہ اٹھا اور اپنے بیٹوں اور حواریوں کو لئے محل کے اندر چلا گیا۔

اہل گور نے اپنے بچوں کو سنبھالا بزرگوں کو ساتھ لیا اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

اُن کے ذہنوں پر محبوب جان کی بغاوت، نادر جان کی جرأت اور راجہ کے فیصلے کا عجیب ردِ عمل ہوا۔ وہ سوچنے لگے "اگر اس ناگہانی حکم کو ختم کرنے کے لئے بس اتنی سی جرأت چاہیے تھی تو ہم میں سے کسی نے پہلے یہ جرأت کیوں نہ کی۔ اتنے برسوں سے ہم اپنے بزرگوں کو ہپرنگ کورسے نیچے دھکیلتے رہے اور یہ المیہ سہتے رہے۔ اگر یہ حکم اتنی آسانی سے بدلا جا سکتا تھا تو پھر اس راجہ اور اس سے قبل کے راجاؤں کو اس کا خیال کیوں نہ آیا۔ یہ راجہ لوگ کیسے جانور نما انسان ہیں۔ ان جانور نما انسانوں کی ساری طاقت ہماری اطاعت کے بل بوتے پر ہے۔ محبوب جان کی جرأت نے ان کی دیوتائی اہمیت کا پردہ چاک کر دیا۔ اگر ہم سب مل کر جرأت کریں تو ان سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ سکتی ہے۔ نہ یہ رہیں گے اور نہ ہی ان کے ناگہانی احکامات سہنے ہوں گے۔"

اس واقعہ کے بعد اہل گور کا رویّہ ہی بدل گیا۔ وہ راجہ کا کوئی کام نہ کرتے۔ کوئی بھی بیگار پر راضی نہ ہوتا۔ راجہ کا کوئی حواری اگر کسی کو دھمکانے کی کوشش کرتا تو سب اس کی حفاظت کے لئے اکٹھے ہو جاتے اور اُس حواری کو ہپرنگ کور سے نیچے دھکیلنے کی دھمکی دیتے۔ آہستہ آہستہ راجہ کے حواری بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ راجہ کے متعدد بیٹے خود اپنے کھیتوں میں کام کرتے۔ اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے۔ وہ اب اہل گور سے کچھ ڈرے ڈرے سے رہتے تھے۔ انھوں نے راجہ کو پڑوسی راجاؤں سے مدد مانگنے کو کہا۔ ان سب کی آپس کی رشتہ داریاں تھیں۔ مگر راجہ نہ مانا۔ وہ جانتا تھا کہ رشتہ دار راجے حالات پر قابو پاتے ہی راج گدی کے خود مالک بن بیٹھیں گے، اور وہ اپنی موجودہ حیثیت بھی کھو بیٹھے گا۔

پھر حالات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ راجہ نے اپنی اولاد کو پڑوسی ریاستوں میں جہاں ان کے رشتے طے ہو چکے تھے، شادی کر کے وہاں کے راجاؤں کی زیرِ نگرانی بھیج دیا۔ عزیز و اقارب کا بھی کچھ ایسا ہی بندوبست کیا اور خود اپنے محل میں تنہا مقید سا ہو کر موت کے انتظار میں زندگی کے باقی دن گذارنے لگا۔

اس واقعہ کے صدیوں بعد ۱۸۶۶ء میں ایک ETHNOCOLOGIST جس کا نام تھا DR. GOTTLIEB WILHELM LEITNER اور جس کی ڈگریاں تھیں M.A. PH.D. LL.D., D.O.L.، گور پہنچا۔ ڈاکٹر لیٹنر غالباً بیس زبانیں بول سکتے تھے۔ چیلاسی زبان سمجھتے تھے۔ اس علاقے کے قبائل کی نسل، رسم و رواج، اور تاریخ سے متعلق چھان بین کرنے آئے تھے۔ وہ یہاں کچھ عرصہ مقیم رہے۔ انھیں یہ جان کر بہت تعجب ہوا کہ ان دور دراز پہاڑوں کے مابین یہ پس ماندہ علاقہ جو باہر کی مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا سے الگ تھلگ ہے، سیاسی طور پر کتنا ترقی یافتہ ہے۔ یہاں کا طرزِ حکومت جمہوری ہے۔ "گور" میں باقاعدہ انتخاب ہوتے ہیں۔ چند افراد پر مشتمل ایک گروہ کو کچھ مدت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس میں عورتیں بھی منتخب ہو سکتی ہیں۔ اور وہ گروہ علاقائی نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ جمہوری طرزِ حکومت وادی چیلاس کے تمام گاؤں میں رائج تھا۔

ڈاکٹر لیٹنر کا کہنا ہے کہ وادی چیلاس کے ان چھوٹے چھوٹے گاؤں کو ۱۸۶۶ء میں جو سیاسی حقوق حاصل تھے وہ تمام ہندوستان کے لندن میں مرکزی دفتر کو برطانوی راج میں نصیب نہ تھے۔

حوالے: ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لیٹنر ان کے متعلق کتاب THE GILGIT GAME میں پڑھا ہے۔ یہ کتاب JOHN KEAY کی لکھی ہوئی ہے JOHN MURRAY اس کے شائع کرنے والے ہیں۔

۱ ضلع دیامر: دیامر پہاڑ کے گرد و نواح سارے گاؤں کو ایک ڈسٹرکٹ یا ضلع کی شکل دے دی گئی ہے۔ یہاں ایک ڈپٹی کمشنر تعینات ہوتا ہے جو چھ ماہ چیلاس اور چھ ماہ استور میں رہتا ہے۔

۲ تتہ پانی: مقامی زبان میں گرم پانی کے چشمے کو کہتے ہیں۔

۳ دیامر: نانگا پربت کا پرانا اور اصلی نام ہے۔ مہاراجہ کشمیر نے اسے یہ ہندو نام دے دیا تھا۔ اب حکومت پاکستان نے دوبارہ اس پہاڑ کو دیامر کہنا شروع کر دیا ہے۔

۴ دینی۔ دنیون۔ دینیاں: چیل کی لکڑی کی گندھے بروزے سے بھرپور بالیاں جنھیں یکدم آگ لگ جاتی ہے، اور ماچس کی تیلی کی طرح بھڑک اٹھتی ہیں۔

۵ چوڑ: بکرے کی اون سے تیار کردہ مقامی کمبل۔ خوب بھاری اور گرم ہوتا ہے۔

۶ رت: گوشت کی چربی کو پگھلا کر رکھ لیا جاتا ہے۔ سرد ملکوں میں اس کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے۔

ظہور نظر

آج کے دن کو زندہ رکھنا

میرے وطن میں،
پیارے وطن میں،
بسنے والے پیارے لوگو!
رونے والے ہنسنے والے سارے لوگو!!
خندہ لبوں پر ــــــ،
دیدۂ نم میں
عہدِ عنایت ــــــ،
دَورِ ستم میں
بزمِ طرب میں
محفلِ غم میں
سُود و زیاں کے
بیش میں کم میں
ہر صورت میں
ہر موسم میں
آج کے دن کو زندہ رکھنا ــــــ!!!
جب تک آج کا دن زندہ ہے، ہم زندہ ہیں
آنے والے سبھی زمانے سارے خواب درخشندہ ہیں

۲۳ مارچ ۱۹۸۰ء

اختر حسین جعفری

پھر بہار آئی

پھر بہار آئی، پھر آئے مقتلوں میں فاتحہ خوانی کے دن
درد کس کا پرفشاں ہے؟
سرنگوں کس کا عَلم؟
آبِ جُو کی سطحِ خوابیدہ پہ کس باغِ جناں کا پھُول ہے ــ خُوں میں ڈوبا ہُوا
عشقِ پیچاں کیسا نکلا ہے درونِ سنگ سے
(جو کسی مقراض سے کٹتا نہیں)

پھر بہار آئی پھر آئے مقتلوں میں فاتحہ خوانی کے دن
بے صدا قبروں کی نوحیں
مرثیے لکھنے کے دن
پھر وہی پوروں میں خارِ آگہی کی پرورش
پھر درِ صبحِ مقفّل پر شبانہ دستکیں
اور چمن آرائیوں میں، تازہ تر صف بندیوں میں اُس کا لشکر ڈھونڈنا
اُس کا چہرہ، اُس کا پرچم ڈھونڈنا ــ خوُں میں ڈوبا ہُوا

اختر حسین جعفری

شکستہ ساعتوں کے معمار

جیسے ہم نابود زمانوں، پہچانوں کے وصف گزار ہیں
جہاں جہاں کوئی وعدہ دفن ہے
اُن قبروں کے رکھوالے ہیں
جس ساعت کی زُلف سے اب تک سُرخ ربن کا کوئی تار لٹکتا ہے
اُس ساعت کی مُویانی پر
ہجر و وصال کی خُوشبوؤں سے کیا کچھ نذر گزارتے ہیں
جیسے ہم خود معبد ساز ہیں
اُس معبد کے خدمت گار ہیں

——— اور یہ خود سامانی کیا ہے
پربت کاٹنا، پرویزوں کی بیعت کرنا
جُوئے شیر ہیں، قلزمِ دل کے تلابے ہیں
خوابِ معطّل، عکسِ چہرۂ شیریں ڈھونڈنا

زندہ رہنا، یا مرجانا

دیواریں جتنی اُونچی ہیں
شیشہ و سنگ پہ چہروں، تیشوں کی ضربیں اتنی جھُوٹی ہیں
جیسے ہم بے حلف پسر ہیں
اپنے اپنے آئینے، حدیثِ زمانے کی جنگاہ میں ہاتھ سے چھُوٹتے تیشوں،
دُودھ سے خالی نہروں، بیکر مانگتی تصویروں کے تعزیہ دار ہیں
پتّھر پتّھر ٹوٹتے لمحوں کے معمار ہیں
جیسے ہم خود معبد ساز ہیں
اُس معبد کے خدمت گار ہیں

اختر حسین جعفری

آئینہ خانہ

(ا)

وہ سُن رہا تھا زمیں کا خروش، دزد کی چاپ
وہ گِن رہا تھا ستارے، شجر، تبر کے نشاں
وہ چُن رہا تھا رسن، سوختہ سفال چراغ
جلا جو خیمۂ ابرِ بہار، اس کا تھا
سمٹ رہا تھا وہ موتی سا اندرونِ صدف
کہ بُزدلوں کے تصرّف میں بحر و بر آئے
کہ پانیوں میں اُترنے کی رسم جاتی رہی
لرز رہا تھا سرِ شاخِ عدل اس کا گلاب
کہ ابر و باد سے تھی صحبتِ دمِ افعی
بُریدہ صدق تھے اور تیز دھوپ کی مقراض
کہیں زباں کہیں اوراقِ گُل کترتی ہے

(ب)

اسی کے نام کڑی دوپہر میں جلتے بدن
اسی کی نذر بجھے حوصلوں کی مزدوری
اسی کی نذر قلم، حاشیے، سیاق و سباق
وہ جس کے ذکر سے خالی بھرا ہُوا اخبار
اسی کے نام یہ تعویذِ نافرستادہ
جسے لحد میں اُترتے ہوئے نہیں دیکھا
اسی کی نذر فرورفتۂ زمیں باغات
بچے ہوئے قفسِ عندلیب سے آنسو
اُگے ہُوئے غمِ تشنہ زباں میں کانٹے
اسی کی نذر، رُکی آبِ جُو، تہی دریا
جہاں طیور کو آبِ وضو نہیں مِلتا

ساقی فاروقی

نغمہ گروں کا نوحہ

جن اکھووں نے
پھوٹ پھوٹ کر
موسم کی تبدیلی کا احساس دلایا تھا
شاخ شاخ پر
عہدِ سبز کا نغمہ گایا تھا
تیز ہوا میں
ٹوٹ ٹوٹ کر
گرتے جاتے ہیں

جن سے دل میں
دھنک کھلی رہتی تھی

جن کی خوشبو
سانسوں میں آہستہ آہستہ بہتی تھی
وہ مولسری کے پھول بکھرتے ــــ
ــــ منظر کو آزردہ کرتے جاتے ہیں

یہ ان خواب فروشوں کا ماتم ہے
جن کے خواب ہماری آنکھوں سے چھلکیں گے
جو ہم میں ظاہر ہوں گے؛
اس امید میں
ہر آہٹ پر دل دھڑکے گا
ہم بیدار رہیں گے
یاد کی فصد کھُلی رکھیں گے

قتیل شفائی

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں
جو میں نے تجھ سے بچھڑ کے لکھیں
انھیں کوئی چھاپتا نہیں ہے

میں جب بھی تیرے فراق کا نوحہ لکھ کے لاؤں
سخن شناسوں کو میرا طرزِ عمل نہ بھائے
تری محبت کا درد ہو جس غزل میں شامل
کسی کو ایسی غزل نہ بھائے
جواب آئے
کہ جانے والوں کو یاد کرنے سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہے

میں تیری یادوں کو گوندھ کر اپنی حسرتوں میں
تراشتا ہوں اگر ترا دلنواز پیکر
وہ لوگ دیتے ہیں بُت پرستی کا مجھ کو طعنہ
پڑے ہیں جن کے دلوں میں پتھر
وہی صنم گر
کریں نصیحت، بتوں پہ مرنے سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہے

میں ذکر کرتا ہوں جب کبھی وصل کی رُتوں کا
تو شہر کے سارے پارسا مجھ کو ٹوکتے ہیں
خلافِ تہذیب جن کے نزدیک ہے محبت
وفاؤں سے مجھ کو روکتے ہیں
یہ کہتے ہیں
کہ اپنی عزّت پہ نام دھرنے سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہے

اگر کبھی میں جدائیوں کا سبب بتاؤں
تو میری نظموں سے خوف کھانے لگیں جریدے
سماج پر احتجاج کرنے کا حق جو مانگوں
کوئی یہ کہہ کر زباں سی دے
لکھو قصیدے
کہ خود کو یوں بے لگام کرنے سے کوئی بھی فائدہ نہیں ہے

اسی لیے تو حبیب میرے
یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
جو میں نے تجھ سے بچھڑ کے لکھیں
انھیں کوئی چھاپتا نہیں ہے

قتیل شفائی

جہانگیرِ عادل

جہانگیرِ عادل — !
ترے عدل کی دھوم ہے شہر در شہر، کوچہ بہ کوچہ
جہانگیرِ عادل — !
ترے عدل کا یہ گجر تا قیامت سلامت
کہ فریادیوں کی پکاریں اکارت نہ جائیں
جہانگیرِ عادل — !
ترے عدل کے اس گجر کی جو زنجیر کھینچی ہے میں نے
تو میری توقع یقیں بن گئی ہے
مری آس کو آسرا مل گیا ہے
کہ پوری کرے گا مری آرزو عدل تیرا
جہانگیرِ عادل — !
بصد احترام و ادب عرض کرنی ہے مجھ کو
تری سلطنت میں ہے اِک اور بھی شیر افگن
جو اِک اور نورِ جہاں کا مجازی خدا ہے
یہ اِک اور نورِ جہاں — ! کیا بتاؤں ؟
تری سلطنت میں کوئی اس کا ثانی نہیں ہے
خلل اس کی نیت میں آجائے جو اُس کو دیکھے
حقیقت میں ہے وہ محبت کے قابل

جہانگیرِ عادل — !
اگر تو کرے جاں بخشی کا وعدہ
تو میں آج دربارِ عالی میں اعلان کر دوں
کہ میں بھی ہوں مجبور دل سے، جہانگیر میرا بھی ہے نام نامی
مجھے بھی ہے نورِ جہاں سے محبت
خلل میری نیت میں بھی آگیا ہے
مگر شیر افگن کہ اُس کا مجازی خدا ہے
مرے راستے میں ابھی تک رکاوٹ بنا ہے
جہانگیرِ عادل — !
اگر عدل تیرا، مرا ساتھ دینے کا اقرار کر لے
تو میں اک بچارہ، محبت کا مارا
تری ہی طرح شیر افگن کا ٹنٹا چکا کر
محبت کے رستے پہ لے آؤں نورِ جہاں کو
بناؤں اسے اپنے خوابوں کی ملکہ
دعائیں تجھے دوں
کہ یہ رسمِ عدل و محبت تجھی سے چلی ہے
جہانگیرِ عادل — !

اجنبیت کا ذائقہ

فارغ بخاری

نگر نگر گھومتا ہوں
مغرب کے بیکراں شہر مجھ کو حیرت سے دیکھتے ہیں
میں ان دیاروں کی اجنبی وسعتوں میں بہتا ہوا رواں ہوں
یہ اجنبیت کا ذائقہ بھی عجیب شے ہے

یہ ایسا عالم ہے
رشتوں ناتوں کی پل میں زنجیر توڑتا ہے
طلسم نام و نمود کے کوہِ طور سے یہ اُتارتا ہے
مہکتے ماحول کے دریچوں سے نام لے کر پکارتا ہے
جو سر اُٹھاتی ہے وحشتِ دل
تو سب فصیلوں کو توڑ کر چاہتا ہے انساں
اک اپنی دُنیا الگ بسا لے
جہاں کوئی بھی نہ ہم زباں ہو
نہ آشنا ہو
کچھ ایسی انجانی سی فضا ہو
کہ ہر بنِ مو میں رقصِ شعلہ کا ماجرا ہو
جو تجربہ بھی طلوع ہو دل پہ — کیمیا ہو
نہ کوئی جانے کہاں سے آیا ہوں
کون ہوں میں
نہ آشنا میرے فن سے کوئی
نہ میرے دل کی لگن سے کوئی
نہ میرے فکر و خیال کی انجمن سے کوئی
جو کوئی جانے
نہ مجھ کو سرخیلِ کارواں وہ سمجھ کے جانے
نہ علم و فن کا وہ مردِ میداں سمجھ کے جانے
نہ اہلِ ایماں سمجھ کے جانے
بس ایک انساں سمجھ کے جانے

پیاسے ہاتھ

میں پیاسے ہاتھوں کو کب تلک ذائقے سکھاؤں
جنھیں سمندر کی تشنگی ہے
ندی سے سیراب ہوں وہ کیونکر
میں اپنی شکوہ گزار آنکھوں سے چھپتا پھرتا ہوں
سوچتا ہوں، انھیں میں یہ کس طرح بتاؤں
کہ زندگی میں کچھ اور بھی ایسے مسئلے ہیں
تمھاری انگشتری کے ہی جو نگیں نہیں ہیں
محبتوں میں اسیر رہ کر علاج ان کا میں کیسے پاؤں
وفا کا ہے جو عذاب ہم پر، کہیں نہیں ہے
میں پیاسے ہاتھوں کو کب تلک ذائقے سکھاؤں
کچھ ایسے یہ تیری خوشبوؤں کے اسیر ہیں جو
کہیں بھی تسکیں نہ پا سکیں گے
میں دل میں احساسِ جرم لے کر
تمام دُنیا کے آنگنوں میں بھٹکتا پھرتا ہوں
اور میرا یہ المیہ ہے
کہ میرے پاؤں تلے مری اب زمیں نہیں ہے
یہ المیہ میں کسے سناؤں
میں کیسے ان دہرے حادثوں سے نجات پاؤں
میں پیاسے ہاتھوں کو کب تلک ذائقے سکھاؤں

احمد ظفر

کوہِ قاف

کسی خوشبو کے جادو نے
سکوتِ آبِ جُو میں سنگ پھینکے ہیں
تو کتنے دائرے سے نقش بنتے جا رہے ہیں تیری یادوں کے
میں اپنے آپ میں گُم ہوں
کہ تو کہسار ہے، کہسار کے اس سمت کیا ہے، سوچتا ہوں میں

وہاں پریاں ہیں شاید وادیوں میں، رقص کرتی ہیں
کہ وہ آسیب ہیں جو شام ہوتے ہی
کسی بستی میں شب خوں کے لیے تیار ہوتے ہیں
سمندر چشمِ پُرنم کا کوئی گوشہ ہے جس میں تو سفینہ ہے
شجر کی شاخ پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ
زرد پھولوں کی عبادت کر رہا ہو گا
نہ جانے کون سا لمحہ مجھے آواز دیتا ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ میری انگلیاں کٹ کر زمیں پر گر چکی ہیں
اور زباں مصلوب کی مانند ہونٹوں پر تڑپتی ہے
تو آنکھیں سنگِ مرمر کی سِلوں کے حرف ہیں جن کو
ستم کی بارشوں نے روند ڈالا ہے

مری اطراف میں پھیلا ہوا کہسار میرا واہمہ ہے یا حقیقت ہے
کہ جس کی دھند میں لپٹا ہوا میرا تجسس ہے
مری آواز ہی شاید کسی بے نام لمحے میں اُترنے کے لیے بیتاب رہتی ہے
جدائی زندگی کے پھول پر لمحے کی شبنم ہے
گئے گزرے ہوئے موسم کا ماتم ہے
مری پہچان کا اندھا حوالہ نقشِ مبہم ہے
تو میں گم گشتۂ ادراک، سر پر تاجِ گمنامی سجائے ایک دیوانہ
جسے تو اس جزیرے میں ملے گی وہ جزیرہ مملکت میری
تلاشِ فہم میں جو بار ہا چھینی گئی مجھ سے

شجرِ ممنوع کے مسافر

ہم جو آسودۂ ہجرت بھی نہیں
اور کسی چہرے کے چپ چاپ دریچے میں وہ پیغامِ محبت بھی نہیں
اپنا آغازِ سفر جس سے کیا تھا ہم نے
برف آزار ہے سینے کا
تو یخ بستہ ہیں سانسیں کتنی
ابتدا یہ کہ سرِ شام مہکتے تھے گلاب
انتہا یہ ہے، کسی وادیٔ بے نام میں لے آئی مسافت ہم کو

اب کسی راحتِ جاں میں کوئی راحت بھی نہیں
پھول کھلنے کی تمنا کسی دلدل میں سسکتی کیوں ہے
کونپلیں شاخ پہ شبنم میں سُلگتے چہرے
اور مہتاب وہی شعلۂ جاں
سامنے رہتا ہے جیسے کسی دُوری کا عذاب

خودکشی اپنا ارادہ تو نہیں ہے، پھر بھی
ہم جو زندہ ہیں تو کیوں جینے کی چاہت بھی نہیں
دیدۂ کور کسی غم کا وہ پتھر جس نے
ایک بے نام عبارت کی دہائی دی ہے
ہمسفر کوئی مگر دیدۂ حسرت بھی نہیں

جلیل حشمی

لوری کا جہنم

یہ میں ہوں
یہ میری کڑی دوپہر، یہ سُلگتی فضا ہے
یہ تانبے کے تھال ایسا سُورج، جسے اُونچے تنہ ور پیڑوں کی
مضبوط شاخوں نے روکا ہوا ہے
کہ یہ طشتِ آتش گرا سینۂ خاک پر تو جُھلس دے گا اک ایک
ذرّے کو یکسر،
یہ جاں سوختہ فاختہ کی جگر دوز، اشکوں میں ڈوبی صدا ہے
صدا ہے جھلملاتے ہوئے سُرخ تانبے پہ ایچنگ کی پتلی لکیروں کی مانند
کندہ ہوئی جا رہی ہے
یہ ویران خاموشیاں، یہ کڑی دوپہر، یہ گھنے پیڑ، یہ آتش افروز سورج
یہ جاں سوختہ فاختہ، یہ جگر دوز آواز، یہ میں!
مرا شہر تو سرد خانوں میں سویا ہوا ہے
مجھے کیا ہُوا ہے
کہ سناٹے کی اُنگلی پکڑ کر یہاں آگیا ہوں
اُدھر شہر والوں کی آنکھیں ہیں بند اور دروازے بھیڑے
ہوئے ہیں گھروں سب کے
اِدھر دوپہر کے مسافر کے سینے میں دل کا درِ ہفتمیں تک بھی وا ہے
یہاں مہرباں پیڑ ہیں سنگِ رہ بولتا ہے
ہتھیلی پہ ٹھوڑی دھرے اِک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں سوچتا ہوں
میں تنہائیوں کے جہنم کا باسی
میں لب دوختہ ہوں
میں جاں سوختہ ہوں
یہ خونیں جگر فاختہ کیا ہے، یہ میری عمروں کی ساتھی ہے
میری نوا ہے
تو پھر لوگ کیوں مجھ پہ حیراں ہیں، کیوں سوچتے ہیں
مجھے کیا ہوا ہے؟
کہ گھر سے کڑکتی ہوئی دوپہر میں نکل کر یہاں آگیا ہوں
میں شاید کہ جنگل میں کوئی جڑی کھا گیا ہوں
مجھے یاد ہے، میرے بوجَم نے بھی مجھ سے یہ بات پوچھی تھی
معصومیت سے

تو میں نے کہا تھا
کہ بیٹے! تمھارے لیے میں ملائم پروں والی اک پیاری سی
فاختہ کے پکڑنے کو جاتا ہوں
تو میں تمھیں فاختہ کے پروں ایسی نرم اور نازک سی اِک
میٹھی لوری سناتا ہوں
اب چین کے ساتھ سو جاؤ بیٹے
سو جاؤ بیٹے
سو جاؤ بیٹے!!

آفتاب اقبال شمیم

بند دروازے میں کرن کی درز

ظلمت کا ہر عضو ہے بیج سیاہی کا
کٹ کر پھر اُگ آتا ہے
دھوپ میں اتنی کاٹ نہیں کہ میں اس کو
اندر سے مسمار کروں
کل وہ چہرہ مسخ تھا اِتنا، آج جسے
میں تصویر سمجھتا ہوں
کیا میں رات کے جادوگر کے شہر میں ہوں ؟
جامد آنکھ کے روزن سے
دیکھ رہا ہوں جو مجھ کو دکھلاتا ہے
یا میں بے معنی دُنیا میں
زندہ رہنا سیکھ رہا ہوں
شاید میں پہچان کی بھُول بھلیوں میں
گم ہوں
لیکن کیا یہ کم ہے
خواب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتا ہوں

میں کیا کرتا !

آرا کش نے
الف انا کو کاٹ دیا
اپنے سائے پر اوندھا گرنے والا
میں تھا ۔ لیکن کیا کرتا
میرے شہر کی ساری گلیاں
بند بھی تھیں متوازی بھی
تختیاں ہر ہر دروازے پر
ایک ہی نام کی لٹکی تھیں
میں کیا کرتا
شہر کے گرداگرد سدھائے فتووں کی دیواریں تھیں
کوہ شمائل دیواریں
جن سے باہر صرف جنازوں کے جانے کا رستہ تھا

آفتاب اقبال شمیم

میبرِ نابلس

کہا اُس نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں
لہو میں لتھڑے سے ڈالتی بے لفظ سرگوشی کے لہجے میں
گواہ رہنا
میں اتنی دور سے چل کر تمہارے پاس آ[illegible]ں
اگرچہ وُہ مری ٹانگیں
دھماکے سے اُڑا کر مطمئن ہوں گے
انھوں نے سچ کے شاہد کو اپاہج کر دیا ہے
تم گواہ رہنا — کہ میں چل کر تمہارے پاس آیا ہوں

ذرا دیکھو!
علامت دستکیں دیتی ہے سینوں میں
گلابی روشنی بیدار آنکھوں کے اُفق پر رونما ہو کر
ضمیروں کی فضا میں رچ رہی ہے
اور مقناطیس کے حلقے میں یک رُخ ہو رہی ہیں
سچ کی آوازیں
گواہ رہنا — گواہ رہنا

نیم اجنبیت کے پل پر ایک شام

یہ کم کم رنگ، یہ برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے سے
مری آنکھوں کے خالی آسماں پر
کتنے برسوں سے معلّق ہیں
یہ کیسی خوشبوئیں ہیں جو کہ جینے کی گلابی
چسکیوں میں مجھ کو رُک رُک کے پلاتی ہیں
یہ رشتے کیا ہیں؟
کیوں پتا شجر سے ٹوٹ جاتا ہے؟
یہ چاہت کی ہوس
جہدِ بقا کے سیپ میں پلتی ہے
یا کہ سچ کا موتی ہے
مری آنکھیں کھُلی ہیں لیکن اتنی کیوں نہیں کھُلتیں
کہ ظرفِ لفظ میں جھانکوں
خداوندا! یہ کوتہ دستیاں تیری
مجھے جینے نہیں دیتیں، مجھے مرنے نہیں دیتیں

ادیب سہیل

کلا

میری تمھاری ازل ابد کی سنگت ہے
میں نے تمھارا ساتھ دیا اُس ساعت بھی
پہلے پہل جب تم دھرتی پر آئے تھے
آوازیں ہی آوازیں تھیں، اُن کی مگر پہچان نہ تھی
منظر تھے ہر سمت مگر منظر کا کوئی نام نہ تھا
ہر شے کا مفہوم تھا لیکن سلسلۂ افہام نہ تھا

میں نے بقا کی مہملیت کا تالا توڑا
واتاورن[۲۴] کا انترگت[۲۵] سے ناتا جوڑا
میں نے تمھارے جنگل لمحوں کو تہذیب کی صورت بخشی
اکھڑپن کو معتبری دی
پتھر میں چنگاری بھر دی
میں نے تمھیں اظہار کے پیرائے بخشے اس عالم میں
جبکہ تمھارے ہونٹوں کی جھولی میں کوئی لفظ نہ تھا
مجھ سے اُس ساعت بھی تمھارے انگوں کے ہر خال و خط، ہر زیر و بم، ہر رقصِ رم کو
معنویت کے پھول کھلاتے رہنے کے انداز ملے
جب کہ بیاں کا کاغذ یکسر سادہ تھا

کوئی فضا ہو
کوئی زمانہ
کوئی دھرتی
جس میں میرا مان نہیں ہے
اُس دھرتی کو اپنا پورا گیان نہیں ہے
اُس دھرتی میں لہو جلتا ہے
سوتے جاگتے اُس کے باسی کے خوابوں میں سانپ آتے ہیں
کھُلی فضا میں اُڑنے والے پنکھ پکھیرو اپنے ہی سائے سے
ڈرنے لگ جاتے ہیں

میں جوالا ہوں
میں خوشبو ہوں
سُکھ سپنوں کی آشرواد ہوں
میں ایشور کی بھاشا ہوں
میرا کیا ہے
میں نے تمھارا ہر صورت میں ساتھ دیا ہے
پھر بھی ساتھ نبھاؤں گی
مجھ سے اگر تم دُور ہوئے تو ورجت[۲۶] رنگ اپناؤ گے
بے سمتی کے اندھے غار میں خود کو لڑھکتا پاؤ گے
بنجر ہوتے جاؤ گے
میری تمھاری ازل ابد کی سنگت ہے
چھُوٹی یہ سنگت تو پرتتے[۲۷] آئے گی

---

۲۴ یہاں ظاہر و باطن سے مراد ہے ۔ ۲۵ ورجت و وادی سُر کا دوسرا نام ہے، کسی راگ میں یہ سُر لگ جائے تو اس کی صورت بگڑ جاتی ہے ۔
۲۶ پرتتے دو مفہوم میں استعمال ہوا ہے ۔ ایک قیامت دوسرا عبرت ۔

ادیب سہیل

قصرِ ہوا کا فرد

مرا اُس سے خون کا رشتہ نہ تھا
پر لگتے تھے ہم ایک لہو کے پروردہ
اس رشتے میں سب تازہ دمی
سب رنگ، دمک
۔ گہما گہمی
تھی فکر کی ہم آہنگی سے

اس منزل میں
پلکوں سے کانٹے چُننے تھے
رستے کا درد اپنانا تھا
کچھ دُور تلک ہم منزل منزل ساتھ چلے
پھر اُس نے کانٹے چُننے پر
پھولوں سے دامن بھرنے کو ترجیح دیا
وہ روشنی تھا سائے میں گیا
اور قصرِ ہوا کا فرد ہوا
وہ آئینہ جو دونوں کا تھا مشترکہ اک سرمایہ
وہ اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ گیا یا شاید اُس نے چھوڑ دیا
مری ہمسفری مجروح ہوئی
اور رستے لہولہان ہوئے

میں سوچتا ہوں
جو ایک نظر کا رشتہ تھا
وہ بھی تو اب مابین نہیں
پھر رخشِ ہوا پر اُڑتے ہوئے
سائے کے پیچھے جانا کیا !

چاند کا مسافر

میں چاند پر ہوں
میں چاند کو ڈھونڈتا ہوں ۔ لیکن
۔ کہیں نہیں ہے

یہ چاندنی کا دیار :
نہ کوئی بڑھیا
نہ کوئی چرخا
عجیب بے چہرگی کا منظر ہے
بے صدا ہے
وہ چاند سے لفظ اور چندن سے استعارے
جو صدیوں، قرنوں تمھارے اور چاند کے تقابل کے واسطے سے
گھڑے گئے تھے

اب اپنا مفہوم کھو چکے ہیں
وہ جھُوٹ کی طرح منظروں میں گڑے ہوئے ہیں
تمھاری یادیں زمیں کی ہم رنگ ہو گئی ہیں
تمھارے چہرے کا ہر حوالہ چمکتی مٹی میں ڈھل گیا ہے
زمیں کی کرنوں میں، میں تمھارے وجود کا لمس پا رہا ہوں

سحر انصاری

بود و نبود

امتحاں گاہِ زیاں ہو کہ سرا پردۂ سود
ساتھ رہتی ہو کوئی کش مکشِ بود و نبود

لمس یک لمحہ کبھی مجھ کو جلا دیتا ہے
اور کبھی کوئی نیا زہر کھلا دیتا ہے

میں کبھی خود کو سمجھتا ہوں نسیمِ گزراں
اور کبھی خارِ مغیلاں میں پریشاں حیراں

ایک فصل آتی ہے مانندِ سحابِ تازہ
ایک رُت مجھ پہ کسا کرتی ہے یوں آوازہ:

کون سے لفظ اُٹھا لائے ہو بازار میں آج
کیا تجلّی سی ملی چشمِ خریدار میں آج

اس سے پہلے بھی بہت مشقِ وفا کرتے رہے
معبدِ زیست کے ذرّوں کو خدا کرتے رہے

ہر نئے غم کے لیے ایک نیا تیشہ ہے
بیستوں مزد ہے اور کوہکنی پیشہ ہے

سفرِ زیست طلب گارِ رگ و ریشہ ہے
رہروِ شک کے لیے منزلِ اندیشہ ہے

لاکھ محصور کرے شب کو ستاروں کی سپاہ
ایک ہونے کے نہیں اب یہ سفید اور سیاہ

آج تو دل ہے خود اپنی ہی صدا پر مغموم
آج تو خود کفِ گل میں ہے نہاں موجِ سموم

تیسری جنگ چلی آئی ہے دروازے تک
تم لیے بیٹھے ہو لفظوں کی نئی نوک پلک

اِک طرف حافظِ شیراز کی گلگوں زمیں
اِک طرف پیکِ بہاراں کہ ہے خود چیں بجبیں

کس کو اب موسمِ گُل، کس کو خزاں سمجھا جائے
کس کو اب سود کہیں، کس کو زیاں سمجھا جائے

ہر نئے دَور کے انساں کی یہ میراث رہی
اِک طرف دستِ گدا، ایک طرف تاجِ شہی

دیکھ کر دیدۂ بیدار کو کیوں نیند ہے دنگ
ہات آتے ہیں کہاں کشتِ ہُنر کے سب رنگ

دن گزر جاتا ہے اور رات گزر جاتی ہے
یونہی ہر فصلِ خیالات گزر جاتی ہے

کبھی کیچڑ میں بھی شاداب کنول کھلتے ہیں
کبھی صدیوں میں بھی لمحات نہیں ملتے ہیں

کبھی تاروں کا تصوّر بھی دُھواں ہوتا ہے
کبھی اشکوں پہ چراغوں کا گماں ہوتا ہے

خود بخود زیست کے آداب نہیں آتے ہیں
نیند آتی ہے مگر خواب نہیں آتے ہیں

اب جیئے جاؤ کہ مرنے کا صِلہ کوئی نہیں
وحشتِ غم سے گزرنے کا صِلہ کوئی نہیں

ہر طرف صحن میں بارود کی بُو پھیلی ہے
ایک نادیدہ رسن تا بہ گلُو پھیلی ہے

ایسے عالم میں تمھیں فکر ہے پھلواری کی
پَر پہ تتلی کے اُبھرتی ہوئی اِک دھاری کی

ہیملٹ پر بھی رہی کش مکشِ بود و نبود
اس کی دُنیا میں نہ تھے اتنے مگر غیب و شہود

آج انسان ہے اِک ایسے دوراہے کا اسیر
جس کے پیرامیں نظر آتی ہے پنہاں کی لکیر

اس اندھیرے میں کہاں ڈھونڈ رہے ہو جگنو
کیوں یہ آنکھوں میں بھٹکتے ہیں اکیلے آنسو

اِک نظر اُس نے اِدھر دیکھ لیا تو کیا ہے
لبِ انکار نے ہاں کہہ بھی دیا تو کیا ہے

ایوب صابر

پشتونولیؒ

ہماری رسمیں
ہماری راہیں
ہماری قسمیں
ہماری چاہیں
عظیم بھی ہیں
قدیم بھی ہیں
ہماری پشتو زباں تو ہے ہی
یہ عہد بھی ہے
یہ ایک آئین بھی ہے
قول و قرار بھی ہے
یہ ایک تاریخ بھی ہے جس میں
شجاعتوں کی
امانتوں کی
شرافتوں کی کہانیاں ہیں
وفا بھی ہے یہ
حیا بھی ہے یہ
وفا کسی میں نہ ہو تو اُس بے حیا کے حق میں
سزا بھی ہے یہ
ہر ایک پشتون مردِ مومن ہے
بحرِ ظلمات میں بھی گھوڑے کی پیٹھ پر ہے

ہر ایک پشتون ہے سپاہی
ہر ایک پشتون ہے اسی راستے کا راہی
کہ جس پہ آلِ نبیؐ کے بازو کٹے ہوئے تھے
کہ جس پہ کرب و بلا کے نقشے سجے ہوئے تھے
ہر ایک پشتون ہے نمازی
ہر ایک پشتون قبلہ رو ہے
ہر ایک پشتون ایک غازی
ہر ایک پشتون کو شہادت کی آرزو ہے
ہر ایک پشتون ہے علامت اُسی خودی کی
کہ جس کی تبلیغ پہلے خوشحال خاں نے کی تھی
کہ جس کو اقبال نے بھی "ضربِ کلیم" و "بانگِ درا" بنایا
ہماری پشتو جہاد بھی ہے
یہی حقوق العباد بھی ہے
یہ عزم بھی ہے ثبات بھی ہے
یہ ایک طرزِ حیات بھی ہے
کوئی ہمیں قتل کر کے ہم سے پناہ مانگے
تو ہم اُسے بھی پناہ دے دیں
ہماری پشتو سخا تو ہے ہی
زکوٰۃ بھی ہے
ہمارے حجروں میں جب کوئی راہ گیر ٹھہرے

ؒ پشتونولی پشتو کا ایک کثیر المعانی لفظ ہے جس کے لفظی معنی "افغانیت" ہیں۔ لیکن جب ہم اس کو پھیلاتے ہیں تو پشتونوں کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، عادات و خصائل، عقائد و اخلاق اور ثقافت و کلچر، غرض سب کچھ اس میں سما جاتا ہے۔

تو ہم ضیافت میں دل کے ٹکڑے بھی پیش کر دیں
ہماری خو سے ہر ایک واقف ہے
سب کو معلوم ہے کہ ہم میں سے کوئی حاتم سے کم نہیں ہے
ہم اپنے حجروں میں مہمانوں کو اپنے تکّے کِھلا کے اپنی انا کی
تسکین چاہتے ہیں
ہم اپنا سب کچھ لُٹا کے بھی شرمسار ہوتے ہیں
اور کہتے ہیں ــ"مہمانو!
تمھاری خدمت میں ہم نے جو بھی کیا ہے حاضر
بہت ہی کم ہے
بہت ہی کمتر ہے
لیکن اللہ کو خبر ہے
وہ عالم الغیب ہے
وہ اندر کا اور باہر کا سارا احوال جانتا ہے
اُسے پتہ ہے
کہ اس سے بہتر طعام ہم کو نہیں میسّر
اگر میسّر ہے اور ہم نے تمھارے آگے نہیں بچھایا
تو وہ ہمیں اس جہاں میں اور آخرت میں بھی شرمسار رکھے

ہماری نفرت
ہماری جنگیں
ہماری چاہت
ہماری صلحیں
ہماری ہر چیز ہے مثالی
ہمارا ہر فعل ہے جلالی

لڑیں تو ایسے کہ مورچوں میں ہی زندگانی گزار دیں ہم
مریں تو ایسے کہ مر کے بھی سُرخرو ہی ٹھہریں
جو زخم سینے پہ کھائے وہ سُرخرو نہ ہو گا
تو کون ہو گا
غنیم کمزور ہو تو اُس کو معاف کر دیں
کہیں کہ جاؤ میاں لڑائی سے باز آؤ
تمھاری بندوق کا نشانہ
ہزار پختہ سہی، مگر تم نہ لڑ سکو گے
تمھارے بازو قوی نہیں ہیں
تمھارا لشکر بڑا نہیں ہے
عظیم لشکر بنا کے لاؤ
تو پھر لڑیں گے

ہماری رسمیں
ہماری راہیں
ہماری قسمیں
ہماری چاہیں
ہماری نفرت
ہماری جنگیں
ہماری چاہت
ہماری صلحیں
عظیم بھی ہیں
قدیم بھی ہیں

پروین فنا سیّد

بصارت اور آگہی

تیرے ہاتھوں میں پیوست میخوں سے بہتا لہو
کور آنکھوں پہ چھڑکا
تو پلکوں کی چلمن سے
تا حدِ امکاں
بصارت کے ہر زاویے پر
عجب نُور کی دھاریاں
تہہ بہ تہہ تیرگی کی ردا چیرتی
ان گنت مشعلیں
آگہی کے دریچوں میں
عرفان کے آئنوں میں
دمکنے لگیں!

تجدیدِ عہدِ وفا

آکے دیکھو ذرا
آج بھی میں
وہ احساس کی لَو
جو میرے لہو میں رواں ہے
وہ جذبے کی قندیل
تھامے ہوئے ہوں
جو تم نے کبھی
اپنی ہستی کے نروان کی روشنی بانٹتے بانٹتے
ایک پل رُک کے
میرے دُعا کے لیے پھیلے ہاتھوں میں رکھدی!

خالد احمد

روپہلے سوار اور چمکیلی ٹاپ

مرے لب، مری خامشی کے خزانے پہ قفلِ شہی تھے
مری خامشی، نسل در نسل جیسی سیہ رات کے تن پہ اُجلا ساتِل تھی
مرا تن، مری نسل پر حُسن کا داغ ٹھہرا
مری نسل، سو پشت سے اک نئی صبح کی منتظر تھی

مرا قافلہ، مرحلہ مرحلہ، فاصلوں کی تہوں میں اُترتا گیا
زینہ زینہ، مرے قاتلوں کے بدنوں میں اُترتا گیا
پھر
مرے بعد کیا تھا؛ یتیموں کا لشکر! یتیموں کا ورثہ! یتیموں کا لشکر؛

مرے رہبروں نے یتیموں کے ورثوں پہ اپنے محلّوں کی بنیاد رکھی
مرے رہزنوں نے مرے رہبروں سے مری بات پوچھی، مری صبح بھی
مری صبح، قصرِ شہی کے لرزتے ہوئے آہنی باب کے چرچراتے کواڑوں پہ،
پہلے رُوپہلے سواروں کی چمکیلی ٹاپوں سے آراستہ ایک دستے کی دستک
کے مانند اُتری

خدانے ابھی مجھ کو چھوڑا نہ تھا۔ کاہنوں نے خداوند کے گھر کے
حجروں سے میری خطا کاریوں کے عوض میری بخشش کی بھکشا طلب
کی، کہ میری خطا کاریاں آسمانوں کو چھونے لگی تھیں

خداوند کے گھر کے حجروں میں کاہن مری بخششوں کے عوض، میری
بخشش فقط میری بخشش کی خاطر، دعاؤں کے دامن بکھیرے کھڑے
تھے کہ میرے گنہ بڑھتے بڑھتے مرے اور اُن کے سروں سے
بھی اُونچے ہوئے جا رہے تھے

خداوند ابھی مجھ کو بھولا نہیں تھا
خداوند کے کاہنوں نے نئی مرمریں سل بچھا کر مری بھینٹ دے دی،
کہ میرا وطن بس مری بدنگاہی سے پُر تھا۔ کہ میرا لہو، تازہ تازہ لہو
اپنی خوں ناکہ پاکیزگی پر بھی ناپاک جانا گیا تھا، کہ میری خطا کاریاں
عشق کے آسمانوں کو چھوتی رہی تھیں
خداوند ابھی مجھ کو بھولا نہیں تھا

خدانے ابھی مجھ کو چھوڑا نہیں تھا
مرا شہر معمورۂ عدل تھا اور میرا لہو، تازہ تازہ لہو، رنگ لانے لگا تھا
مرا شہر معمورۂ رنگ تھا اور ہر رنگ گھل کر نئے ڈھنگ لانے
لگا تھا

یتیموں کا ورثہ، یتیموں کے لشکر کے سر پر دھرا تھا
خداوند ابھی مجھ کو بھولا نہیں تھا، کہ آخر خدا تھا

خالد احمد

ہائیکو ــــــ ۱ تا ۶

(جاپانی صنفِ سخن "ہائیکو" کے روایتی وزن ۵ ـــ ۷ ـــ ۵ میں)

بات سے بات چلی
صبحِ فراق بھی ابر رہا
دن بھر رات چلی

آگ بھرے گہنے
شام کی شاخ میں گوندھ دیے
ہجر کی دیوی نے

ایک گمان شباب
اب تک دل دہلا جائیں
کچی نیند کے خواب

کجلائی آنکھیں
حزن کی دھوپ میں دل کی طرح
سنولائی آنکھیں

جلتی راتیں ہیں
چھوٹی چھوٹی باتوں بس
کتنی باتیں ہیں

میں بیراگن تھی
چاند نے بھی جی بھر کے ڈسا
صبح بھی ناگن تھی

سرمد صہبائی

جاتک کہانی

مایا کا خواب

مایا نے سپنے میں دیکھا
اس کی کوکھ میں ست رنگی دریا چڑھتا تھا
دریا کے اجلے پانی میں
پورن ماشی کا سایا تھا
"چاند بدن کے اندر اُترا
لے کر اِک دیو مالا
مایا کے سُندر چہرے پر
کن بھیدوں کا ہالا؟"
"سُن ری مایا
تیرا سپنا سچا ہوگا
تیری گود میں اِک دن چاند سا بیٹا ہوگا
وہ جگ کا اَن داتا ہوگا
لیکن اس کے اپنے تن پر
گیروا چولا
اور ہاتھوں میں کاسا ہوگا"
"دریا کی سیپی کے اندر
لعل چھپا انمول
مایا رانی سمجھ نہ پائے
ان شبدوں کے بول"

گوتم کا جنم

جیٹھ وساکھ کی رُت میں مایا
گھر سے نکلی
رستے میں اک باغ کِھلا تھا
ہرے بھرے پیڑوں کے اندر
اِک انجانا بھید چھپا تھا
مایا پیڑ کے نیچے بیٹھی
اپنا سپنا دُہراتی تھی
اس کی کوکھ میں جیسے ندیا
بل کھاتی تھی
یکدم اُس نے
ندی کو دریا بنتے دیکھا
کمر کے گھاٹ سے پورے چاند کو چڑھتے دیکھا
"ہری بھری جھولی میں اُترا
دیکھو اک مہ ویر
اس دُکھیارے جگ کی ڈھارس
اس خلقت کی دِھیر"

گوتم کے روپ

اِک دن گوتم
کپل وستو کے محلوں سے
باہر نکلا
اس کے قدموں میں پھولوں کے

ہار بچھے تھے
پانچوں موسم
اس کی سنگت میں چلتے تھے
یکدم گوتم نے رستے میں
اِک بوڑھے کو آتے دیکھا
"رستے میں یہ کون کھڑا ہے؟"
کُھلی ہوئی آنکھوں سے جیسے
ایک ڈراؤنا سپنا دیکھا
گوتم نے رتھ بان سے پوچھا
"گوتم یہ تیرا چہرہ ہے
اک دن تیرا پھول سا جسم مسل جائے گا
تیرا جیون اس بوڑھے میں ڈھل جائے گا"
"شہزادے کے اندر ٹوٹی
جیسے اک تلوار
پلک جھپک میں دیکھا اس نے
دُکھیا سب سنسار!"
شام ہوئی گھر واپس آتے
شہزادے نے ایک جنازہ اُٹھتے دیکھا
اس کے پیچھے
اک خلقت کو روتے دیکھا
"گوتم یہ تیری میّت ہے
اک دن تجھ کو موت بیاہ کے لے جائے گی
تو مٹّی میں مٹّی جیسا ہو جائے گا"
"اک اک کر کے ٹوٹ گیا سب
شہزادے کا مان
گوتم نے اِک پل میں دیکھے
جنم جنم کے پران"

تیاگ

آدھی رات اور پورن ماشی
محلوں کی بے نور اُداسی
دور کہیں دریا چڑھتا تھا
شہزادے کو اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا
اِک اِک کر کے اس کے سامنے
چہرے اُبھرے
"کون ہوں میں؟" گوتم نے سوچا
یکدم سب چہروں کو اُس نے
اِک چہرے میں ڈھلتے دیکھا
اپنے آپ کو سب بھیسوں میں چلتے دیکھا
اِک غیبی مستی کی دُھن میں
دریا کے ساحل پر اُس نے
تن پر گیروا چولا اوڑھا
اور ہاتھوں میں کاسا لے کر
دریا کی لہروں میں اُترا
"مرن جیون کے بیچ کھڑی تھی
خواہش کی منجدھار
ایک جنم دریا کا ساحل
ایک جنم دریا کے پار"

امجد اسلام امجد

خوشحال خاں خٹک کے لیے ایک نظم

زمیں دلہن ہے
اور افلاک کی ان بے ٹھکانہ وسعتوں میں
جس قدر تارے ہیں
اُس کی اوڑھنی کی جھلملاہٹ سے بنے ہیں!

یہ ستارے، استعارے ہیں
ہماری آپ کی اِس زندگی کے
(جس کے ہونے اور نہ ہونے کے تذبذب میں
ازل سے تا ابد تاریخ کے جالے تنے ہیں)

ستارے سانس لیتے ہیں
ستارے بھی ہماری آپ کی صورت
فضا میں سانس لیتے ہیں
ہماری ہی طرح یہ بھی فنا کی کوکھ میں تخلیق ہوتے ہیں
چمکتے ہیں، دمکتے ہیں، خلا کا رزق بنتے ہیں
ہماری آپ کی یہ داستاں تو
ٹوٹتے تاروں کی اس وحشی چمک کے
استعارے میں سمٹ جاتی ہے لیکن
سب ستارے، اتنے بے مایہ نہیں ہوتے!!

کئی مہتاب خُو، سورج بکف، ایسے بھی ہوتے ہیں
کہ جو خود ٹوٹ بھی جائیں تو اُن کی روشنی موجود رہتی ہے
صدائے بازگشت اُن کی
ہوا کے ساتھ بہتی ہے!
وہ اپنی موت سے لوحِ ابد پر زندگی تحریر کرتے ہیں
فنا تسخیر کرتے ہیں

مرے خوشحال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے کی ضیا ہیں
مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں
اِنہی نغموں کے پرتو سے اُمنگیں جگمگاتی ہیں
انہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دُلہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
اِسی تارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن
کرن اندر کرن روشن
مرے خوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن

امجد اسلام امجد

تاریخ

سُورج نکلا!
اور سوُرج کے ساتھ درختوں کی شاخوں سے
آوازوں کے پھُول کھلاتے طائر نکلے!
حسنِ ازل کے شاعر نکلے!
سُورج کا رتھ اپنا چکر پورا کر کے نکل گیا ہے
لیکن طائر
اُس کے سفر کی جھلملتا میں
اپنی سمت گنوا بیٹھے ہیں!
اپنے خواب لُٹا بیٹھے ہیں
شام درختوں کے آنگن میں اُتر رہی ہے
لیکن اُن سے دُور نہ جانے کتنی دُور
وہ گُم کردہ راہ پرندے
[رُکی ہوئی ہے جن کے لبوں پر ایک سُلگتی چیخ
جمی ہوئی ہے جن کے پَروں پر سُورج رتھ کی دھول]
تھک کر گرنے کے لمحے میں سوچ رہے ہیں
کل سُورج پھر
اُن کے گھروں پر دستک دے گا!
اور درختوں کی شاخوں سے اُن کے بچّے
آوازوں کے پھُول کھِلاتے نکلیں گے!

حسن ناصر

ایک نظم

میں درختوں سے اُتری ہوئی نسل کا
آخری شخص ہوں
اور ابھی تو
مرے واسطے ارتقا کی سبھی منزلیں
اجنبی ہیں
ابھی میری پہچان
اُس کے حوالے سے جو سب سے پہلے
درختوں سے اُترا تھا
ممکن نہیں!!

حسن ناصر

سلوموشن

ست رو بادل ـــــ
ڈر اپر سے دُکھی آنکھوں میں گرتے گولڈن لوشن کے قطرے ـــ بارشیں
خوابوں میں اُڑتی تتلیاں ـــ
اپنے پروں کے چپوؤں سے
آگے بڑھنے کی تمنا میں
ہوا کا بیکراں ٹھہرا سمندر پاٹنے کی بے ثمر کوشش ـــــ سلوموشن

زرد سُورج ـــــ
اپنی گم گشتہ تمازت ڈھونڈنے کی جستجو میں
آسماں کی ٹوٹتی محراب سے
آہستہ آہستہ
اندھیری رات کے اندھے کنوئیں میں آگرا

خزاں کے پیڑ سے
اُس آخری پتے کے گرنے کی مفصّل داستاں
جس نے ہوا کے بیکراں ٹھہرے سمندر پر لکیریں کھینچ کر لکھا
کہ ہر پتّے کی خواہش ہے
زمیں کی گود میں سونا ـــــ امر ہونا

کانچ کی آنکھوں میں روشن
روشنی کا انعکاس ـــــ
میرے اندر خوف کی ہلکی سی لہر
ڈوبتا دل ـــــ ڈوبتا

کوئی دم توڑتے لمحوں کی کھڑکی سے
پرے ہوتا ہُوا چہرہ ـــــ
صدائیں منجمد ـــــ اور سارے سنے دلدلی ـــ
اور بھاگتے بچّے بظاہر تیز تر ـــــ
اور بے صدا صدیاں ـــــ مسافت دائرے

میں کہاں پر آگیا ؟ ؟ ـــــ
اَن کہے لفظو، بتاؤ میں کہاں پر آگیا ـــــ

اقبال کوثر

سردی کی برکھا

سردی کی وہ برکھا برسی
شہر کے چاروں کھونٹ
چہرہ میرا سُرخ ہوا ہے
نیلے میرے ہونٹ
میرے نیلے ہونٹوں میں
یخ بستہ سارے حرف
میرے سارے دُکھ پتھر ہیں
سارے جذبے برف
جامد تیرگیوں کا کمرہ
کالی کنکر آنکھ
بجھی — بجھا کر آپ بھی سارے
روشن منظر آنکھ
ٹھنڈی ٹھنڈی روح ہے میری
سُن سُن سارا جسم
کون مسیحا اسم پڑھے اب
کون مسیحا اسم
چھیڑے کوئی ماچس کی تیلی
شعلہ اک لہرائے
شمع جلے اور اُس کے غم کی
مجھ تک آنچ بھی آئے
بوندی بوندی آپ بھی پگھلے
مجھ کو بھی پگھلائے

آہ روزِ آفتاب

آہ روزِ آفتاب
گھن دھوؤں کے چور بادل
سایہ سایہ دائروں کے کور جال
اور بدروحوں کی سرگوشی خموشی کی طرح
ایک شبخوں کی طرح آشوب خوں
ایک لرزہ — سارے معموروں کی ویرانی —
وجودوں کی شکست
سب کھُلے موسم، دھلی دھوپوں کے کھِلتے رنگ —
اُبھرتا حُسن بام و در، نکھرتے خال و خد برہم
فقط مٹّی میں لتھڑے خشت ریزوں
ٹوٹی چوبوں پر سلگتا خوں
مہکتا خوں
جھلکتا عکس
عکسِ آفتاب

حلیم قریشی

ناتمام

سوچیں دریاؤں کی صورت
اپنا رستہ آپ بنائیں
وہم و گماں
ایثار و محبت
نفرت
نیکی اور بدی کا سارا پانی
گا ہے میٹھا، گا ہے کھارا پانی
سوچوں کے ان دریاؤں میں
ہر دم شامل ہوتا جائے
نفرت اور بدی کا کھارا پانی
نیکی اور محبت کے میٹھے پانی سے
پیاس بجھائے
پھر جب یہ کڑوا اور کھارا پانی
رحم و کرم کے میٹھے صاف سمندر میں گر جائے
اس کا پہلا نام یہیں رہ جائے

ایک نظم

ا

قدم رُکتے ہوئے
نظر بس ہرے ساون کے جادو میں کہیں گُم
کھُلی بانہیں
پہاڑوں سے اُترتے منظروں کو
بھینچ لینے کے لیے لرزاں
چناروں اور دیاروں میں
عجب سرگوشیاں
خاموشیاں جن کا مقدر تھیں
ہوا ہر پیڑ پر دستک کرے
پیغام دے جائے
یہی پیہم تماشا
زندگی کو اِک انوکھا نام دے جائے

حلیم قریشی

یہ لوگ

یہ بھی کیسے لوگ ہیں
اپنے گھر کے آنگن میں جو
پیڑ لگانا جرم سمجھتے ہیں
اور باہر کی پھٹی پرانی چھاؤں، دیکھ کے
ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں
یہ بھی کیسے لوگ ہیں
ان لوگوں کے کاندھوں پر گوتم کے بت ہیں
اور ہاتھوں میں
خون میں ڈوبی تلواریں ہیں
ان کے قول
ہمیشہ ان کے فعل سے شرمندہ ہیں
بے ہوشی سے
ہوش میں آنا جرم سمجھتے ہیں
یہ بھی کیسے لوگ ہیں
اپنے گھر کے آنگن میں جو
پیڑ لگانا جرم سمجھتے ہیں

امتحان

چُپ رہنا بھی ایک ندامت ہے
بات کہیں تو گرہیں کھولنے والے
جانے کیا کیا سمجھیں گے
بات کہیں تو پھر بھی ایک ندامت ہے
یہ لمحہ
جو اہلِ ہُنر پر آیا ہے
ایک سمندر ہے جو سر پر آیا ہے
دیکھیں کون اُبھرتا ہے

احسان اکبر

وہ زندہ لفظ خوشبو ہیں

تمنا ایک دیوانی کہ جو صدیوں کے ویرانے اُٹھائے
آنگنوں، صحنوں، گھروں میں جھانکتی پھرتی ہے
زندہ پھول کس نگری میں کھلتے ہیں ؟
(وہ سب کچے کنوارے پھول
جو میٹھی فضاؤں میں نہائیں گے)

تمنا، رابطے، رشتے
بکھرنے کے نشاں سارے
بکھرنے کے نشاں
گو مرکزے چھوٹے بنائیں گے
بکھر جائیں گے

ہر مرکز، نئی دُنیا
نیا جغرافیہ
جینے کے تازہ حوصلے
اِک وہم، مفروضہ جہاں سارا
جو دن کی دوپہر میں کڑوی سچائی میں ڈھلتا ہے
تھکے ہارے بدن اب یہ درج پہ ہی بوجھ سہہ سکتے ہیں
روحیں بھی . . . . . .

تواریخ ان کی لکھنے پر جھُکی صدیاں
وہ کوڑھی بانجھ نسلیں
حافظے نامعتبر جن کے
بصارت (اور بصیرت) سے تہی
عدسوں کے پیچھے
نیم مُردہ مُردُمک
برفائے تہ خانوں کو پُورا ایک پس منظر عطا کرتی ہوئی
پیشین بین آنکھیں
قوی لیکن فقط اعصاب سے محروم ڈائی مینشن

لُغت لفظوں کا اِک قاموس
ہائے لفظ
زندہ حرف جو مرتے نہیں
مرنے سے پہلے اسم بنتے ہیں
جو ہر لمحے کے فاتح ہیں
(جو میرے جانشیں کل ہوں گے)
کن نیلے جزیروں کی عبارت ہیں ؟
کوئی دُنیا تھی وہ
جس کے کولمبس اب نہیں ملتے

پروین شاکر

کائنات کے خالق!

دیکھ تو مرا چہرہ!
آج میرے ہونٹوں پر
کیسی مسکراہٹ ہے
آج میری آنکھوں میں
کیسی جگمگاہٹ ہے
میری بھیگی آنکھوں میں
تجھ کو کچھ نظر آیا؟
میری مسکراہٹ سے
تجھ کو یاد کیا آیا ؟
اس حسین لمحے کو
تُو تو جانتا ہوگا
اس سمے کی عظمت کو
تُو تو مانتا ہوگا
ہاں ـــــ ترا گماں سچ ہے
ہاں ـــــ کہ آج میں نے بھی
زندگی جنم دی ہے!

میرا لال

میرے زرد آنگن میں
سُرخ پھُول کی خُوشبو
نقرئی کرن بن کر
کاسنی دنوں کی یاد
سبز کرتی جاتی ہے

نثار ناسک

اب زمیں لپیٹ دو

اُٹھو اور آج
اپنے اپنے رنگ کے علَم کو سرنگوں کرو
مرا کوئی علَم نہیں
میں پانیوں کا رنگ ہوں
میں پیاس کی اُداس بستیوں کے
سنگ سنگ ہوں
تم اپنے اپنے رنگ کے
علَم کو سرنگوں کرو

زمیں کے خاک آئینے میں
اب خراش آگئی
سِنازگاہِ دید میں
سحر کی لاش آگئی
نہ دستِ فاتحہ اُٹھا
نہ مغفرت کے واسطے
کوئی دعا
کوئی صدا
کہ ماتمی سروں کی سانس رُک گئی

مری غزل کی چیخ
جیسے میرے لب پہ جم گئی
تری عظیم آیتوں کی ہر سبیل تھم گئی
مرے دہن میں
مکڑیوں نے جیسے جال بُن دیے
عقیدتوں نے
تیرے ہر طرف حصار چُن دیے
صدا سقوط ہوگئی
ہوا حنوط ہوگئی

سجاد بابر

یرغمال

خلا سے آواز آنے والی ہے
"سننے والو!
سماعتیں اب لگان سمجھو
کسی بھی جذبے
کسی بھی احساس کو دُلار الھو نہ دینا
یہاں جو سناٹے گونجتے ہیں
اُنھیں حیات آشنا کریں گے
زمین ہم کو خراج دے گی"

یہ گونج ٹھہری
تو شور اُٹھے گا
عجیب سے ہو گئے ہیں ہم بھی!
ہمیں کہانی ہی سوجھتی ہے
گمان ہشیار ہو چکے ہیں
حواس نادار ہو چکے ہیں

بانجھ بہار

رگوں کی آواز کا دریچہ
خیال کی وادیوں کی جانب
کسی توقع پہ پھر سے کھولا ہے
ناچتی بدلیوں سے لپٹا ہوں
ساری بوندوں
کے رنگ چکھے ہیں
پھر بھی سب کچھ الگ سا لگتا ہے
آنکھ پتھر کی ہو چکی ہے
عجیب شے مجھ سے کھو چکی ہے

پیاس

سوالوں،
خیالوں کے دُکھ جاننے کی لگن ہیں
ہر اک سوچتی آنکھ کے اَن چھوئے عکس ڈھونڈوں
مگر کب یہ سوچوں
جوابوں
کے سُکھ بھی تو محرومیاں ہیں!

(دوبئی)

جلیل عالی

ایک دُعا

گھٹائیں فضا سے نہ ہجرت کریں
میرے مولا
کبھی تو
نفیِ ذات کی
بارشوں کی دھنک سیڑھیوں سے
زمیں پر اُتر کر
ہری لہلہاتی سجل شوق فصلوں کا
اثبات ہو

پسند کا محاذ

رن پڑا تو وفا کے متوالے
توڑ کر کل کی سوچ زنجیریں
پھاند کر ذات کی فصیلوں کو
آگ اور خون کے سمندر میں
کیسے دیوانہ وار کُود گئے
اور مجھ کو یہ انتظار کہ کب
معرکہ ختم ہو تو میرا قلم
فاتحوں کے لیے قصیدے لکھے
مرنے والوں کے مرثیے لکھے

زرد پتے کی سوچ

اور کچھ دیر ذرا
شاخ کو تھامے رکھوں
ورنہ
بے مہر ہوا کی خواہش
لوحِ تقدیر پہ
لکھی ہوئی تحریر تو ہے

غلام محمد قاصر

ڈرانے والی بشارت

تم اس کو بھول بیٹھے ہو
جو ناآسودگی کا بوجھ اُٹھائے
پانیوں سے منحرف تھا
اور گیا واپس نہ آنے کو
اگر وہ چاہتا تو اپنی کشتی کے دریدہ بادباں کو
دامنِ الیاس تک اس طرح پھیلاتا
کہ موجیں اس کی خدمت میں سلامی
اور طوفانِ بلا اس کی طرف سوغاتِ ساحل پیش کرنے کے لیے آتے
تم اس کو بھول بیٹھے ہو
تمھیں تو وہ سفینہ یاد آتا ہے
جو غرقابی کے منظر پر
اُبھرتے ڈوبتے لمحے معلق چھوڑ کر گرداب میں اُترا
اور اک بہتے ہوئے تختے پہ چھوٹی سی نشانی رکھ گیا
جس پر فرشتہ موت کا بھی رحم کھاتا ہے
تمھیں بھی رحم آتا ہے
مگر کل دیکھ لینا
تم جہنم میں جلو گے اور یہ اپنے لیے جنت بنائے گا
یہی سارے سفینوں کے لیے طوفان لکھے گا
تمھارے ساحلوں پر ریت کے فرمان لکھے گا
خدا اس کو کہو گے تب تمھیں انسان لکھے گا

وہی روز و شب

سیاحت کے دوران
نادیدہ و بیکراں ذات کے بحرِ اعظم میں جتنی کشش تھی
وہ دامن پسارے ہوئے دُور کی منظر کا سناتوں میں کب تھی
مگر کل اچانک
نظر کو بہت دُور اک اجنبی
جان پہچان کی آخری حد پہ بیٹھا، ملا
جس کے چہرے کے زخمِ کہن پر نئے زخم سایہ فگن تھے
جبیں پر کئی جھریاں اپنی اپنی دکانیں سجائے ہوئے تھیں
اور آنکھوں میں پھر وہ سفینے رواں تھے
کہ جن کو ڈبو کر کئی بار جشنِ مسرت منائے گئے تھے
یہ سب رنگ مجھ کو دکھائے گئے تھے
نئے سال میں خود سے میری یہ پہلی ملاقات تھی

حسن اختر جلیل

بدن کی خزاں

زرد کلیاں، زرد پتے، زرد پھول
زرد شاخوں کے
طلسمی جال میں لپٹی ہوئی
بے تاب رُوح،

جسم کے سُوکھے تنے سے،
دھیرے دھیرے
کٹ کے گرتی چھال
دیوانی ہوا کی سیٹیوں میں
چار سُو اُڑتی ہوئی
کڑکڑاتے شاخچوں میں
ناتواں سانسوں کے مدھم سرد بَین
دُور گہرے زرد، بے صورت سرابوں پر
ہوا کی قمچیوں سے
پھیلتے، گرتے، بکھرتے
ماتمی پتّوں کے ڈھلتے مرگ بَین

تاثیر وجدان

یہ ایک لمحہ کہ جو اَبد ہے

یہ ایک لمحہ
سکوت کے قلزموں کی تہ میں
تڑختے ایام کی چٹختی ہوئی چٹانوں کا ایک ریزہ
یہ ایک چھینٹا
صدف کے بطنِ بہار زا میں نکھرنے والا
یمِ زماں کا اُچھال جس کو
وجود کے جلوہ خیز و شاداب ساحلوں پر گرا گیا ہے
نہ پوچھ کتنا طرب فزا ہے
جزیرۂ جاں کی سبز مٹّی جو اَب کہ اُبھری
اُترتے طوفاں کی موجِ مُردہ نے قرضِ کہنہ چکا دیا ہے
الوہی مٹّی پسے ہوئے ماہ ریزے جیسے
بہار کے رائیگاں گلابوں کی راکھ جو تہ بہ تہ جمی ہے
بڑی ہی زرخیز و پُر نمو ہے
میں اس کی لپٹی تہوں میں جیسے لہو کا رم ہوں
میں برتنگاوں کا نارسا، ناصبور نم ہوں
جو اپنی تشکیل اپنی صورت گری کی دھن میں
جڑوں کے تاریک محبسوں سے کھُلی ہواؤں کے برگ زاروں کی منزلوں تک
رواں دواں ہو
فرازِ جاں کی لچکتی ٹہنی پہ ایک صد رنگ زندگی کی نمود سی ہے
اُبھر رہے ہیں ہزار نا آفریدہ سُورج
حریمِ جاں میں
وجود کے کس نئے سفر کی چمکتی حد ہے
یہ ایک لمحہ کہ جو اَبد ہے

شورش ملک

عراق ایران جنگ کے پس منظر میں پانچ نظمیں

سلام اے دانشِ سلیماں

مجھے بچاؤ
جلا رہا ہوں میں اپنے اندر
حریف جذبوں کا اک الاؤ
مجھے بچاؤ

یہ خود شناسی کہ خود فریبی
عجیب صحرائے آرزو ہے
ہر ایک خواہش لہو لہو ہے

وہ ننھی منّی سی فاختائیں
مرے خیالوں کے آسماں پر
نہ چہچہائیں، نہ پھڑ پھڑائیں
کفن بنا کے پروں کے اپنے
ہوس کی دلدل میں گرتی جائیں

سلام اے دانشِ سلیماں
مرے قبیلے کو بھی عطا کر
وہ علم جس سے وہ جان پائیں
کہ چیونٹیوں کے دہن میں کیا ہے ؟

عجوبہ

لہو کی دیوار چل رہی ہے
مری گلی سے تری گلی تک

یہ شعبدہ کیا ہے، ابنِ مریم!
کہ آشنا پانیوں کی لہریں
مری محبت، تری وفا کو
نگل رہی ہیں، بپھر رہی ہیں

ہوائے دشتِ جنوں کے نیزے
پرو رہے ہیں رفیق چہرے
بسا گئی خاک بے کرم بھی
کدورتوں کے کئی جزیرے

نظر کرن ناکراں مسافر
نہ التجا ہے نہ داد خواہی

خط

سمیرا یاد ہے بغداد تیرا
جہاں تہذیب کی باہوں سے لپٹی
کئی مظلوم یادیں سو رہی ہیں
ہماری بے کسی پر رو رہی ہیں

مرے تہران کی گلیوں کا عالم
ہراساں بھاگتے بچّوں کی چیخیں
مرے رستے کی دیواریں بنی ہیں
کمانیں موت کی ہر سُو تنی ہیں

ادھر انگور کی بیلوں کا ماتم
ادھر اُجڑے گلابوں کے جنازے
عجب تدبیر کی عقدہ کشائی
خدا خاموش ہے، سرکش خدائی

تو پھر کیا

اگر آنکھیں مری پتھرا گئی ہوں
اگر کانوں میں گُم حرفِ سماعت
اگر بازو مرے شل ہو چُکے ہوں
اگر پاؤں میں زنجیریں پڑی ہوں
تو پھر کیا

اگر میری چھتوں پر آگ برسے
ہلاکت بار ہو جائے ہوا بھی
اگر وحشت نما ہوں میری گلیاں
اگر موجِ فنا بھی ہو تنک رو

تو میں مسجد کے میناروں پہ لکھتا
انھی ویرانیوں میں میرا گھر ہے
محبّت کا وسیلہ معتبر ہے

سوال

خدایا خدائی ہے کس کے حوالے
یہ اندھی فضاؤں کا شورِ مسلسل
یہ جلتی ہوئی شاخساروں کی چیخیں

یہ سرکش گلابوں کی بے خواب آنکھیں
وفا کیش چہروں پہ زردی کے چھالے
خدایا، خدائی ہے کس کے حوالے

عطاء الحق قاسمی

تمہارے لیے ایک نظم

میرے دل میں تم اس شہر کی صورت بستے ہو
جس کی گلیاں دھوپ سے روشن ہیں اور
جس کے بام، دریچے — چاند روپہلی کرنوں
کی آہٹ سُنتے ہیں

میرے دل میں تم اُس شہر کی صورت بستے ہو
جس میں گھنے درختوں، گہری چھاؤں، سبز ہواؤں کی ریکھائیں
روشن ہیں
جس کے دونوں جانب اُبھرے سفید گلابوں کے سائے ہیں، ریشم ریشم ساحل والی ایک ندی بہے
میں اس شہر کے پھولوں، ریشمی ساحل، گھنے درختوں، گہری چھاؤں، سبز ہواؤں میں
میں رہتا ہوں!
میں اس شہر کے سارے رستوں سے واقف ہوں!

میرے دل میں تم اس شہر کی صورت بستے ہو
جس میں وہ سب کچھ ہے
جس کا وعدہ، میرے سچے رب نے مجھ سے کیا ہے!

ناھید قاسمی

تعاقب

رقص میں مست دنوں کی رونق
چاہے مٹا دو
آنکھوں کی بھولی بھالی چڑیوں کو
اُڑا دو
کٹے پھٹے ہونٹوں کی گونجتی چیخ کو
گنبد میں دفنا دو
پھر بھی ہم سناٹا بن کر
تیرے پیچھے آئیں گے!

قطرہ قطرہ دریا

میری زخمی آنکھ کی سیپ سے
ننھے ننھے موتی لڑھک رہے ہیں
ہر موتی میں بجھنے والی روشن کرنیں
لہریں لیتی جاتی ہیں
اب یہ ٹوٹی ٹوٹی کرنیں
نئے چاند کا اُفق بنانے
میرے ماتھے اُتری ہیں
کون ہے ایسا جو اَب مجھ سے آنکھ ملانے آئے
میرے روشن ماتھے سے اِک کرن چُرا کے دکھائے!

اے ہوا

بے شک زخمی پاؤں ہیں تیرے
گرد سے اَٹا ہُوا ہے چہرہ
لیکن پھر بھی تیرا ماتھا کبھی نہیں چُوموں گی
تُو نے اپنے پاؤں تلے کانٹوں کو روندا
ٹھیک کیا
لیکن پھُولوں سے کیوں بھر لی جھولی
اُن کو شاخوں پر ہی کِھلا رہنے دیتیں
تو کتنا اچھا ہوتا!

صفدر سلیم سیال

تحفہ

سالِ رواں کا آخری لمحہ
سالِ نو کی پہلی گھڑی کو
اپنی جان کا تحفہ دے کر
رخصت ہونے والا ہے
لان کے سارے پیڑوں کے بادامی پتے
جان کی بازی ہار چکے ہیں
جن کے پیچھے چکنے چکنے پات کھڑے ہیں
اِن آنکھوں نے ایسے کتنے زمانے دیکھے ہیں
کتنی صبحیں، کتنی شامیں
ہر موسم کی زد میں آئیں
ہر موسم نے صبحوں، شاموں کے رخساروں پر
اِک زخمِ سفر تحریر کیا ہے
سرد ہوا یا آگ بگولا لُو کے جھکڑ
سمتِ سفر جب طے کرتے ہیں
زخمی آنکھیں ٹکر ٹکر ہر موڑ کو دیکھتی رہ جاتی ہیں
ایسے زمانے نوکِ زباں پر لا نہیں سکتا
زخمِ سفر بھی دکھا نہیں سکتا
میں نے آج یہ سوچ لیا ہے اپنی آنکھیں
ارضِ وطن کو
نئی صدی کی آمد پر تقدیم کروں
لیکن میری شرط یہی ہے
میری آنکھیں ایسے اندھے شخص کو دینا
جس کے جسم پہ میرے سر کا سایہ نہ ہو
میری سوچ کا عکس نہ ہو
اب تک جو کچھ میں نے سوچا ہے
وہ کیوں سوچے!
جو کچھ میں نے دیکھا ہے
وہ کیوں دیکھے!!

اعتبار ساجد

اَمر سمے کی خواہش

حرف لکھوں یا حمد کروں میں
چڑیوں کی چہکار سے پہلے
یہ اُجلاتی رات کی چادر اس لمحے کی مٹھی میں ہے
یہ لمحہ جو بڑے سے پیپے بجھتے چاند اور ٹوٹتے تاروں
کالے، سبز درختوں اور پُروا کے رس میں رچا ہوا ہے
یہ جھونکا جو انگنائی میں رُکا ہُوا ہے
ساری رات کا تھکا ہوا ہے

سوچتا ہوں میں
نوکِ قلم کاغذ پہ رکھ دُوں
اور اک سحر زدہ ساعت کے خواب نگر میں
بیتنے والی راتوں کی رُوداد لکھوں یا کھڑکی کھول کے
اس معصوم، دُکھی لمحے کی حمد کروں میں ؟

عشرت آفریں

اسیر لوگو!

اُٹھو
اور اُٹھ کر پہاڑ کاٹو
پہاڑ۔ مُردہ روایتوں کے
پہاڑ۔ اندھی عقیدتوں کے
پہاڑ۔ ظالم عداوتوں کے
ہمارے جسموں کے قید خانوں میں
سینکڑوں بے قرار جسم اور اُداس روحیں
بسک رہی ہیں
وہ زینہ زینہ بھٹک رہی ہیں
ہم ان کو آزاد کب کریں گے
ہمارا ہونا ہمارے اگلوں کے واسطے ہے
ہم ان کے مقروض ہیں
جو اگلے دنوں میں ہم سے وجود لیں گے
نمود لیں گے
کٹے ہوئے ایک سر سے لاکھوں سروں کی تخلیق
اب کہانی نہیں رہی ہے!
لہو میں جو شے دھڑک رہی ہے، گمک رہی ہے
ہزاروں آنکھیں
بدن کے خلیوں سے جھانکتی بے قرار آنکھیں
یہ رنگ آنکھیں، یہ خواب آنکھیں، گلاب آنکھیں
یہ کہہ رہی ہیں
اسیر لوگو!
جو زرد پتھر کے گھر میں یوں بے حسی کی چادر لپیٹ کر
سو رہے ہیں
ان سے کہو، کہ اُٹھ کر پہاڑ کاٹیں
ہمیں رہائی کی سوچنا ہے

گھاؤ

رات کے پچھلے پہر
دور وہ قطرہ قطرہ پانی گرنے کی آواز
پتھر میں اِک گھاؤ بناتی
پانی کی آواز

جیسے میری رُوح میں ننھے آبی کنکر برس رہے ہوں
۔ آنکھوں کے سنسان رہٹ پر
خوابوں کے بھولے چوپایوں کی گردش
کورے تنے مکان میں دیوالی کی پہلی رسم
مولسری کے جھنڈ میں روشنیوں کے بچے
یا دہقان کی بیٹی کی مٹھی میں جگنو

رات کے پچھلے پہر
آگ لگاتی پانی کی آواز
کتنی اچھی لگتی ہے
پتھر میں اک گھاؤ بناتی پانی کی آواز

عشرت آفریں

ریسٹ ہاؤس

سنو اے اجنبی ساتھی
ابھی کچھ رات باقی ہے
ابھی سب خواب اپنے ہیں
ہمارے واسطے مہتاب
آنکھوں کے سنہرے جنگلوں میں
راستہ ہموار کرتا ہے

یہاں کی لڑکیاں تکیوں پہ بس —
سورج مُکھی کے پھول ہی تو کاڑھ سکتی ہیں!

ذرا سی دیر کو بارش ہوئی تھی
شہر تاریکی میں ڈوبا ہے
دیئے میں تیل
اور چھت پر بہت تھوڑا سا پانی بچ رہا ہے

اُدھر دیکھو!
وہاں دہلیز پر پانی کے قطرے گھر بناتے ہیں
ہمارا بھی کوئی گھر ہے ؟
مگر تم نے کسی لڑکی کو
اندھی رات کے سینے میں مُنہ دے کر
کبھی روتے نہیں دیکھا

چلو چھوڑو —
تمہاری جیب میں کچھ لفظ تو ہوں گے
مجھے یہ نظم پوری کر کے اُٹھنا ہے

زہر

کنوئیں کی چکنی سُرخ منڈیر سے
رسّی کھینچتے کھینچتے اس کے بازو شل ہو جاتے تھے
مرد کے پاؤں دھونے کو یہ پانی پھر بھی ناکافی تھا
ڈلیا بُنتے بُنتے اس کے ہاتھ لہو میں بھیگ گئے
لیکن روٹی پورے پیٹ کبھی نہ ملی
چھپر لیپتے لیپتے اس پر ڈھیروں موسم بیت گئے
لیکن چھاؤں نہیں دیکھی
اوڑھنی سیتے سیتے اس کی پوریں بھی پکنے سی لگیں
لیکن اسے کپاس کی فصل سے حصّہ نہیں ملا
اب کے فصل اُٹھنے کے بعد
نئی دھوپ میں بیٹھی وہ یہ سوچ رہی ہے
پکتے پکتے پوروں کا یہ زہر
کسی دن سر تک بھی آ جائے گا!

منصورہ احمد

ورائے بدن

مرے عظیم خدا! یہ عجیب دُنیا ہے
جہاں تنے ہوئے، ہاتھوں کا ایک محشر ہے

جہاں نگاہوں سے بھی ہاتھ ہی نکلتے ہیں
جو جسم اور فقط جسم ناپ سکتے ہیں

یہ ہاتھ یوں تو بہت مختصر سے لگتے ہیں
مگر اٹھیں تو اُفق تا اُفق، کراں بہ کراں
شبِ فراق کی طوالتوں سے بڑھ جائیں

یہ وہ نہیں ہیں جنھیں دستِ آشنا کہیے!
یہ وہ نہیں ہیں جنھیں لمسِ دلربا کہیے!

مرے عظیم خدا! یہ عجیب دنیا ہے
جہاں تنے ہوئے ہاتھوں کا ایک محشر ہے

مگر اِک اور بھی دُنیا ورائے دُنیا ہے
جہاں گرفت کی حدت سے پھُول کھِلتے ہیں
جہاں پہ کشف میں اپنے سراغ ملتے ہیں

یہ بات سچ ہے مگر سچ کو کون مانتا ہے
مرے ورائے بدن کیا ہے، کون جانتا ہے!

نارسا

ایک کرن، شاخوں کی اوٹ سے
آج مرے سُونے آنگن میں
جھلمل جھلمل کرتی اُتری!
میں نے اِسے جب چھُو کر دیکھا
تیرے خواب اُمڈ کر آئے
ننھی سی اس شوخ کرن نے
تیرے کتنے رُوپ دکھائے

کاش اسی انداز سے اِک دن
تُو بھی مرے آنگن میں اُترے
خواب تو ہے سرمایہ میرے
دُور ہی دُور سے من پر چھائیں
ہاتھ مرے پھیلے رہ جائیں
سوچ میں لاکھوں پھُول کھلائیں
لیکن میرے پاس نہ آئیں

ننھی سی یہ شوخ کرن بھی
کاش انھی خوابوں کی ہوگی
میری سوچ کو لوری دینے
پل دو پل کو اُتری ہوگی!

منصورہ احمد

ایسا کیوں ہے ؟

میں حیران کھڑی ہوں کب سے
اپنے نجد کے صحراؤں میں
سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے
جتنے نخلِ گلاب لگاتی ہوں میں
ان پر لاشیں اُگ آتی ہیں
سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے
میں جنت سے اور زمیں سے
خوشبوئیں سانسوں میں چُرا کے
اپنے نخلِ گلاب پہ چھڑکوں
لیکن صبح کو
اِک طوفانِ عفونت
جب میرے سانسوں میں چلتا ہے
تو خوشبو کہاں بچھڑ جاتی ہے!

سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے
مکتی کے اوتاروں سے
اور سُورج چاند ستاروں سے
میں کرنیں مانگ کے لاتی ہوں
اور سب چہروں پہ سجاتی ہوں
پھر ایسا کیوں ہوتا ہے
روشن چہرے بجھ کر
میری بصارت کو سہماتے ہیں
خال و خد دُھندلا کر
راکھ کے مرغولے بن جاتے ہیں!

سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے
جب اپنی باہوں میں بھر کر
کتنی ممتا، کتنی محبّت
جس جس کو بھی گلے لگاؤں
برف میں کیوں ڈھلنے لگتا ہے!
پتھر کیوں بننے لگتا ہے!!

سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے
ہر سُو پتھر، برف ہے اور گلوں کے لاشے
بُجھتے ٹُٹتے چہرے اور دُھندلاتی کرنیں
ایک مسافت جو بے سمت بھی اور طویل بھی ہے

صرف یہی میرے ہمراہی کیوں ہیں !
اندھی اور سونی گلیوں کے یہ ہمراہی
لاشوں سے بوجھل شاخوں کے یہ ہمراہی
پتھر آنکھوں کے ہمراہی
بجھتے چہروں کے ہمراہی

سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے
میں ان سے بیزار نہیں ہوں
میں تو اب بھی اپنے معیاروں کے طواف میں گم ہوں
اب بھی گلاب اُگاتی ہوں
اور خوشبو بینت کے لاتی ہوں
اور پھولوں کے مدفن کی بھینٹ چڑھاتی ہوں
کیا میں بھی تودۂ برف ہوں
یا پھر نور کی کوکھ سے نور اُگانے کی وحشت میں
تن من بھول کے
اِک بحرِ ظلمات کے آخری روشن نقطے کی جانب
میں کب سے لپکتی جاتی ہوں !
سوچ رہی ہوں، ایسا کیوں ہے !!

عذابِ شعور

سب ضعیفوں نے، سب بزرگوں نے
میرے بچپن کی چاند راتوں میں
خوف کا زہر گھول رکھا تھا!
—— ایک سچائیوں کا رستہ ہے
جس سے پل بھر بھی تم اگر بھٹکیں
ہونکتی آتشِ جہنم کے
آسماں تک بلند شعلوں میں
جل بجھے گا تمھارا پھول بدن

آج بچپن کو یاد کرتے ہوئے
محوِ حیرت ہوں اور سوچتی ہوں
کیا عذابِ شعور سے بھی سوا
میرے مولا! عذاب ہوتے ہیں؟
کیا تری آگہی کے رستوں میں
صرف دوزخ کے باب ہوتے ہیں؟؟

شاہین مفتی

میں موسم کے معنی نہیں جانتی ہوں

میں موسم کے معنی نہیں جانتی ہوں
مگر جانتی ہوں
کہ اُس کی گلی کا
کوئی نرم جھونکا
مجھے چھُو کے گزرے
تو یہ فصلِ گُل ہے ۔
اگر اُس فلک کا
کوئی شوخ بادل
مرے گھر کی چھت پر
ذرا کھُل کے برسے
تو یہ موجۂ آب
ساون کی رُت ہے ۔
تصوّر میں بھی
اُس کے چہرے کا سُورج
اگر ڈوب جائے
تو یہ زندگی بھر
مرے واسطے
اِک زمستاں کا دن ہے ۔
میں تپتی ہوئی
عُمر کی رہگذر پر
اگر اُس سے کٹ کر
چلوں بھی تو کیا ہے
کہ لُو کے تھپیڑے مجھے گھیر لیں گے
فضا سنگ ریزے نچھاور کرے گی
کہیں دُور تک کوئی سایہ نہ ہو گا
(بیاباں میں مرنے کی خواہش کسے ہے)
میں موسم کے معنی نہیں جانتی ہوں

حسن عباس رضا

تیسری آنکھ

. . . . تو پھر یوں ہُوا
ہم شکستہ دلوں نے سپر ڈال دی
جتنے ناوک بدست اپنے احباب
کوہِ وفا پر کھڑے تھے
ہمیں اُن سبھی کی جگر داریوں
بے غرض جراتوں پر مکمل یقیں تھا
مگر، جاں نثاری کے اس معرکے میں
(اُلم سانحے میں)
صفِ ہمرہاں کو پلٹ کر جو دیکھا
تو کوئی نہیں تھا
سبھی نرغۂ دشمناں میں گھرے تھے
ہجومِ کشیدہ سراں پا بہ زنجیر
زیرِ نگیں تھا

سو پھر یوں ہُوا
مقتلوں کی طرف جب روانہ ہوئے ہم
تو ساری جبینوں پہ
ننگی خجالت
برہنہ ندامت کے قطرے جڑے تھے
ہم اندھے سفر یوں کے لاانتہا سلسلوں میں کھڑے تھے
حذر ساعتوں
تھر تھراتے لبوں پر
فقط خامشی تھی
ستم تازیانوں کے قاتل پھریرے
فصیلِ زبان و دہن پر گڑے تھے
وہ موسم کڑے تھے

تو پھر یوں ہُوا . . . . . .

ہم دریدہ بدن
دشنۂ قاتلاں کا ہدف بن گئے
قطرہ قطرہ ہمارا چمکتا لہو
شہرِ نامہرباں کے در و بام پر
جگمگانے لگا
تیسری آنکھ کا نامہ بر ہم کو مژدہ سنانے لگا

نئے نینوا کا المیہ

وہ شہر
جس کی کنواریوں کے گلاب پنڈے
اصیل خواجہ سراؤں کے بے صفات جسموں سے منسلک ہوں!

وہ شہر
جس میں بدن کا سونا
رفاقتوں کی بجائے
سُورج کی حدّتوں سے پگھل رہا ہو!

وہ شہر جس میں
صداقتوں کو شہید کرنے
قدم قدم پر
ستم کی صلیبیں گڑی ہوئی ہوں

جہاں، جہالت
ذکاوتوں سے خراج مانگے،
تو ایسے شہرِ غنیمِ جاں کو
تباہ ہونے سے
کوئی، کیونکر بچا سکے گا؟؟

انور زاہدی

اجنبی بستیوں کا فسوں مجھ سے گویائی بھی لے گیا

اجنبی بستیوں کا فسُوں
جاننے کا تجسس، مجھے اپنے گھر سے بہت دُور ویران رستوں
فلک چھُونے والے پہاڑوں حسیں وادیوں پُرسکوں سلسلوں
خوشنما اُجلے شہروں میں لے کر گیا

میں نے جنگل میں روتی ہوا کو سُنا، پتھروں سے گلے مل کے گاتے ہوئے
بہتے جھرنوں کے نغمے سُنے، برف پر جھلملاتی ہوئی دُھوپ کا نقرئی
رقص آنکھوں میں میری اُترتا گیا

وقت کے ہاتھوں بکھرائے چہرے مجھے اجنبی بستیوں میں
بھی اکثر ملے
دِلرُبا لڑکیوں کی حسیں ساعتوں کی رفاقت ملی، شوخ دل
نوجوانوں کے ہمراہ مل بیٹھ کر قہقہوں کی سعادت ملی

سارے جذبے وہی
مسکراتے ہوئے آتشیں لب وہی، تمتماتے ہوئے سُرخ چہروں
پہ جذبات کی دھوپ بھی قہقہے بھی وہی
شورِ محفل بھی ویسا ہی اکثر رہا اور بچھڑتے ہوئے آنسوؤں سے بھری
چشمِ پُرنم وہی

اجنبی بستیوں سے میں گھر آ گیا
مجھ سے جو بھی ملا، اُس نے یہ ہی کہا
تم کہاں رہ گئے، کون سے دشت میں جا کے گُم ہو گئے،
سر کے بالوں میں یہ چاندی سجائے ہوئے کتنی جلدی بڑھاپے
میں تم کھو گئے
تم نہیں تھے یہاں، شہر میں کتنے طوفان آئے گھروں
سے گزرتے گئے
ہم تمہیں ڈھونڈتے چاند تاروں سے، سُورج سے پوچھا کیے ،
راہ تکتے رہے
تم بھی کب آئے ہو، جب قیامت سروں سے گزر بھی گئی
شہر میں اِک ہری کیِن آ کر گیا، شہر کا سب سے اُونچا جو چھتنار
برگد کو بھی کھا گیا
شاہراہوں پہ ہے سیل اب بھی رواں
چمنیوں سے نکلتا ہے اب بھی دھواں
اجنبی بستیوں کا فسوں، جاننے کا تجسّس مگر مجھ سے گویائی
بھی لے گیا

قمر جاوید

شکستِ خواب

بہت سے لوگ سوچ کے خلاؤں میں بھٹک گئے
بہت سے لوگ آنکھ میں سمٹ کر شکستگی کے سلسلے
گھروں میں جا کے سو گئے

تو خواب میں اُنھیں حیات بے حجاب سی ملی
وہ دیکھتے رہے کہاں سے زندگی کو ضو ملی
شکستہ ہو کے شہر میں کب اک مکان گر گیا
کہاں پہ شوق کی زمین بے حجابیاں لیے
جنوں کے آسماں کے گرم بازوؤں میں آ گئی

وہ کون تھا
جو اُن کی گرم جوشیوں کی گود میں چمک اُٹھا
تو روشنی کی تابناکیوں نے سارے شہر کو

سفید پھول کر دیا
وہ دیکھتے رہے گھروں میں اُن کے موت آ گئی
وہ جسم و جاں سمیٹ کر
بقا کے راستوں پہ بے دریغ بھاگنے لگے
تو رابطوں میں کشمکش کا زہر پھیلتا گیا
کہ شہر کے عظیم پُل کی چُوں چُوں ہِل گئی
سفید پانیوں میں اُن کے جسم دفن ہو گئے
وہ خوف ناک حادثے
جو آسماں کی نیلی وسعتوں پہ رونما ہوئے
اب اُن کی پتلیوں میں تھے

شدید کپکپاہٹوں نے ان کی آنکھ کھول دی
اُنھیں یقین آ گیا
وہ اُن کے خواب تھے جنھیں
مصوّروں نے کاغذوں پہ نقش بند کر دیا

گلاب کونپلیں

ہوا وصال پانیوں پہ تیرتا گلاب تھی
جسے وفورِ شوق میں ہر ایک موجِ آب نے
بدن پہ یوں سجا لیا
ندی میں رنگ گھُل گیا
مگر گلاب کونپلیں تو ایک عکسِ خواب تھیں
جو شب کی تیرگی سے جب بھی لمس آشنا ہوئیں
بہار بانٹتی ندی فراق جھیل بن گئی
اُبھرتا ڈوبتا گلاب
آنکھ میں سمٹ کے گہرے پانیوں میں کھو گیا
جسے میں ڈھونڈتا رہا مگر کبھی نہ پا سکا

افتخار بخاری

چودھویں صدی کی آخری نظم

نئی کتابوں میں یہ بھی لکھنا
کہ پچھلا سارا سفر تو ریت اور دھوپ کا تھا
ہوا سے ریت اور خاک سے بھوک
ہم کو میراث میں ملی تھی
ہم اپنے اُجڑے گھروں کی کچھ راکھ
اپنی بے چہرگی پہ مَلتے
کہ یونہی شاید کوئی ہماری شناختوں کی
سبیل بنتی
کوئی ہمارا جواز ہوتا، کوئی ہماری
دلیل بنتی
نئے زمانوں کے نام لکھنا
کہ پچھلے قصّوں کے ہر ورق میں لہو کی بُو تھی
سطورِ حرفِ وفا سے خالی تھیں
صدق غائب تھا
یہ بھی لکھنا کہ چودہ صدیوں سے ہانڈیوں میں
اُبلتے پتھر گلے نہیں تھے
ہماری ماؤں نے اپنے بچّوں کو دہشتوں میں
حنوط کر کے جنم دیا تھا
نئی کتابوں میں یہ بھی لکھنا

کرن بابر

دُعا

اِک آنسو مری آنکھ سے نکلا
ہونٹوں کے گوشے میں چھُپ کر
دُعا بنا
پھر دل میں اُترا
رگوں میں چل کر
ہاتھوں کی پوروں میں چھُپ کر
تیری طرف بڑھا
خدایا!
تیری طرف بڑھا

احمد ندیم قاسمی

بدستور

جھٹپٹے کے غرفے ہیں
وقت اب بھی ٹلتے ہیں
صبح کے دھندلکے ہیں
پھول اب بھی کھلتے ہیں

سلسلے اب بھی چلتے ہیں
سورج اب بھی ڈھلتا ہے
صبحیں اب بھی روشن ہیں
راتیں اب بھی کالی ہیں

اب بھی کوہساروں پر
سرکشیدہ ہریالی
پتھروں کی دیواریں
توڑ کر نکلتی ہے

ذہن اب بھی چٹیل ہیں
روحیں اب بھی بنجر ہیں
جسم اب بھی ننگے ہیں
ہاتھ اب بھی خالی ہیں

اب بھی آبشاروں پر
کشتیوں کی صورت میں
زیست کی توانائی
زاویے بدلتی ہے

اب بھی سبز فصلوں میں
زرد زرد چہروں پر
زندگی کے رکھوالے
خاک اوڑھے رہتے ہیں

اب بھی گھاس کے میداں
شبنمی ستاروں سے
میرے خاکداں پر بھی
آسماں سجاتے ہیں

اب بھی ان کی تقدیریں
منقلب نہیں ہوتیں
منقلب نہیں ہوں گی
کہنے والے کہتے ہیں

اب بھی کھیت گندم کے
تیز دھوپ میں تپ کر
اس غریب دھرتی کو
زرفشاں بناتے ہیں

گردشوں کی رعنائی
عام ہی نہیں ہوتی
اپنے روزِ اوّل کی
شام ہی نہیں ہوتی

احمد ندیم قاسمی

زندگی کے لیے ایک نظم

زندگی! میں کہاں تک ترے اِک چراغِ گریزاں کا پیچھا کروں!
زندگی! میرے تلووں میں اتنے پھپھولے ہیں
جتنے ترے گزرے لمحات ہیں!
زندگی! میرے اندر جو تنہائیوں کے خلا ہیں
وہ تیری عطا ہیں!
میں زندہ رہا تو ترے نام کی لاج رکھنے کو زندہ رہا
ورنہ مرنا تو — اے زندگی! — اِتنا آساں ہے
جتنا دشوار ہے زندہ رہنا!

زندگی! اب میں تھک سا گیا ہوں
مجھے حُسنِ انساں بھی
اور حُسنِ فطرت بھی
اور حُسنِ تخیّل بھی
کچھ ادھورے سے لگتے ہیں
جھومر میں جیسے فقط ایک نگ کی کمی
پورے جھومر کی تکمیل پر حرف لاتی ہے!

ہر چیز پژمردہ ہے
اب نیا پھول بھی اپنی خوشبو کو زنجیر کہتا ہے
اور ایسی زنجیر میں قید ہونے سے افسردہ ہے
آج میں رات بھر صبح کی راہ تکتا رہا
اور جب صبح آئی
تو جیسے وہ مریم ہے
جو رات بھر اپنی پاکیزگی کے حصار میں روتی رہی ہے!

میں اب ڈر کے مارے نگاہیں جُھکا کر ہی چلتا ہوں
اب سامنے دیکھنا اِک بڑا کرب ہے
سامنے ایک ملبہ ہے
ٹوٹے ہوئے در ہیں
(یعنی مرے خواب ہیں)
اور کُچلے ہوئے سر ہیں
(جو تیرے برتاؤ ہیں)
اور ان سب پہ بکھری ہوئی
آسمانوں کے بلّور کی کرچیاں ہیں

زندگی! تو بہت خوبصورت سہی
تجھ سے میری محبت بھی کم خوبصورت نہ تھی
میں نے ہر جسم میں
اور ہر عکس میں
اور ہر سلسلے میں
تیرے پرتو اُجاگر کیے
میں نے انسان کو تجھ سے اک والہانہ محبت کی تلقین کی
مرنے والوں کے حق میں دُعا کی تو یہ کی
کہ وہ دوسری زندگی — دائمی زندگی میں
سلیقے سے زندہ رہیں
موت کے خوف کے ختم ہونے پہ بھی
حُسن و خیر ان کا کردار ہو
ان کا اپنا ضمیر ان کا معیار ہو!

زندگی! اب تو میرے قریب آ
مجھے لمس کی حدّتیں بخش
میرے لہو میں اُتر
اور میری تھکن کو سمیٹ اس طرح
جیسے جاتا ہوا آفتاب جہاں تاب
اپنی شعاعیں سمیٹے!

احمد ندیم قاسمی

ڈر

ہم بھی کیا لوگ ہیں!
جو زیست سی نعمت کو بھی ڈر ڈر کے بسر کرتے ہیں

ہم یہ کہتے ہیں کہ جو پھول کھلا ہے، اسے مرجھانا ہے
لیکن اس پھول کو کھلنے کی تو کچھ داد ملے
اس کا یہ عزم تو دیکھو
کہ وہ اس علم کے باوصف کھلا ہے
کہ بالآخر اسے مرجھانا ہے

رنگ و بو کا یہ صحیفہ ہے
اسے ڈر سے نہیں، چشمِ محبت سے پڑھو
اور ڈرنا ہی ضروری ہے
تو پھر مردنیِ حسنِ لطافت سے ڈرو!

غیر ملکی شاعری کے تراجم

محمد کاظم، ساقی فاروقی، اسد محمد خاں
امجد اسلام امجد

محمود درویش کی تین نظمیں

ترجمہ: محمد کاظم

محمود درویش کی یہ تین نظمیں بھی اُس کے پہلے دیوان "اوراق الزیتون" سے لی گئی ہیں، جو اَب سے سولہ برس پہلے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ یہ شاعر کا ابتدائی کلام ہے اور محمود درویش کے فن کا نقطۂ عروج اُس کے بعد کے مجموعوں میں ہی سامنے آتا ہے لیکن شروع کی ان نظموں کا مطالعہ ہمارے لئے اس اعتبار سے مفید اور اہم ہے کہ ان میں ہم شاعر کے جذباتی و فکری ارتقاء کی ابتدائی کڑیوں سے آگاہ ہوتے ہیں، اور اس کی بدولت یہ امید کر سکتے ہیں کہ آگے چل کر جب شاعر ہمیں اپنے فن کے گہرے پانیوں میں لے جائے گا تو ہمیں اُس کا ساتھ دینے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اور اس کا نظامِ علامات بھی ہمارے لئے کوئی زیادہ ناقابلِ فہم چیز نہیں رہے گی: (م۔ک۔)

وفا

تمہاری آواز میرے دل میں، میری رگِ جاں میں گونجتی ہے
اگر تم اس معرکے میں میرے ہم رکاب نہیں بھی ہو تو کیا ہے
یہ ساری کہانی جو اَب میرے لہو میں شامل ہو چکی ہے
اس نے میرے رگ و پے میں نفرت بھر دی ہے
اور میرے ہونٹوں پر آگ کا فیصلہ رکھ دیا ہے
میں اپنے شعروں کو اور اُن کے حسنِ بیان کو ہوا میں بکھیر دوں گا
اگر میرے اوزان اور قافیے شعلہ اُگلتی ہوئی تلواریں ثابت
نہ ہوئے!

'لفظ' کی حرمت پر میرا ایمان ہے
چاہے اس کی خاطر میں مر کر خاک ہو جاؤں، یا زندہ رہوں
اور دشمن کی گھات میں بیٹھوں!
لفظ کی ناریت[1] پر میرا ایمان ہے
چاہے اس آگ میں خود میں جل کر راکھ ہو جاؤں —— یا میرا
دشمن اس میں بھسم ہو!
اگر میں عَلم ہاتھ میں تھامے کھیت بھی رہوں گا
تو لوگ میرے کتبے پر تحریر کریں گے "وہ شخص جو مرا نہیں تھا!"

ایک طرح کا گیت

تمہارے لب شہد ہیں، اور تمہارے ہاتھ
صہبا کے دو جام ہیں
دوسروں کے لئے!

گھنا درخت بادکش ہے، شاہ بلوط کا سوکھا جھاڑ
چھوٹی کنگھی ہے
دوسروں کے لئے!

---

[1] ناریت: آگ ہونا

تمہارے سینے کا نخل، اوشبنم، ورڈیزی کے گرے پھول
ایک زرِش لائٹ ہے
دوسروں کے لئے!

اور میں جو تمہاری اندھیری فصیلوں پر بے خواب راتیں کاٹتا ہوں
میں صحرائی ریتوں کی پیاس ہوں ــــ وراپنے اعصاب میں
ایک سلگتا ہوا آتش دان ہوں!

وہ کون ہے جس نے مجھ پر تمہارے دروازے بند کئے ہیں؟
وہ سرکش و جابر کون ہے؟؟

مجھے تمہارے شہد کی چاہ رہے گی
کیا ہوا اگر یہ شہداب اغیار کے پیالوں میں ٹپکتا ہے
اسے مدماکھی!
جس نے سوائے لبِ یاسمن کے اور کسی شے کا رس نہیں چوسا!

ایک انسان کے بارے میں

اُس کے منہ پر اُنھوں نے زنجیر ڈال دی
اُس کے ہاتھ انھوں نے مقبرے کی چٹان کے ساتھ باندھ دیئے
اور کہا: تو قاتل ہے!

اس کی غذا، اُس کے ملبوسات، اُس کے علَم ــــ سب
انھوں نے چھین لئے
اور اُسے مُردوں کے زنداں میں پھینک دیا۔
اور کہا: تو چور ہے!

سب ٹھکانوں اور ساحلوں سے اُسے مار بھگایا
اُس کی کمسن محبوبہ کو گرفتار کیا
اور کہا: تو اب ایک پناہ گزیں ہے!

اے وہ، جس کی آنکھوں اور ہتھیلیوں سے لہو رستا ہے!
رات اب کٹنے ہی والی ہے
نہ یہ حجرۂ تفتیش رہے گا، اور نہ زنجیروں کے حلقے!
نیرو مر گیا، لیکن روم نہیں مرا تھا
وہ اپنی بجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہا تھا:

کٹ کر گرنے والے خوشے کے دانے
مٹی میں مل کر
ایک دفعہ پھر ساری وادی کو خوشوں سے بھر دیں گے!

بیٹے کی موت
(وہ جو ایک سال کی عمر میں چلا گیا)

جان سلکن ترجمہ: ساقی فارُوقی

جیسے کوئی ساعت چلتے چلتے ٹھہر جائے
کوئی متنفس ــــ بہت متنفس شے ــــ
کوئی شے ــــ جیسے ایک سال پرانا مکان
پتھر کی طرح ساکت
ایسے مکانوں کے درمیان
جو چڑیوں کی طرح نغمہ سنج ہوں
اور خاموشی سے مصالحت

کے امکان پر خندہ زن ــــ
مگر وہ نغمہ سنج ہوا نہ خندہ زن
اس نے اپنے لفظوں سے خاموشی کی تطہیر نہ کی
اس نے خاموشی سے قطعِ تعلق نہ کیا
بلکہ کسی نوحہ گر مکان کی طرح
ان مکانوں کی طرف نظر پھیر کر تکتا رہا
جو چڑیوں کی طرح نغمہ سنج تھے ــــ

اور سانس لیتا سکوت
نہ منجمد تھا نہ حرکت پذیر ـــــ
میں نے پتھر دیکھے ہیں اور اینٹ بھی
مگر یہ مکان نہ پتھر کا تھا، نہ اینٹ کا
اس کی نیو گوشت اور خون سے اٹھی تھی
گوشت کے پتھروں اور خون کی اینٹوں سے ـــــ
خون اور پتھر کا یہ مکان
سانس لیتے سکوت میں استادہ تھا
اور اس کی چمنیوں پر
آس پاس کی چڑیاں
ایک دیوانگی کے عالم میں نغمہ سرا تھیں
مگر یہ خاموش تھا ـــــ
یہ تو کچھ اور طرح کی خاموشی تھی
اس میں ایک راہبانہ بانکپن تھا
ایک چمک تھی
یہ تمام خاموشیوں سے جدا تھی
یہ تو کچھ عجب چیز تھی
اس نے بات نہ کی
تو اس کا سبب موت کی کشش ہوئی ـــــ
پھر آہستہ آہستہ اس کی نظر باطن کے سفر سے لوٹ آئی
خاموشی ابھری اور منجمد ہو گئی
اس کی نظر ظاہر کی طرف مڑ کر ٹھہر گئی
اور چڑیاں اس کے ارد گرد شور مچاتی رہیں ـــــ
اپنے ایک سال کے ساتھ
اس نے پہلو بدل لیا
وہ زخم کی طرح سرخ تھا۔
اس نے پہلو بدل لیا
جیسے اسے افسوس ہو
اور اس کی آنکھوں سے
دو موٹے موٹے قطرے ڈھلک پڑے
پتھروں کی طرح
اور وہ مر گیا

شہرزاد

جیسیکا ڈسٹے ترجمہ: ساقی فاروقی

یوں جیسے
پہاڑوں کی طرف آؤ
اگر آ سکو
منصفی کا حوصلہ ہو تو
مجھے پیار کرو
جاناں
میری کچی فصلوں کے ساتھ
اپنے بسیروں میں رہی
اب
جلتے سورج کے نیچے
کھلے میدانوں میں
پک رہی ہوں
کیوں ثبوت کے لئے پاگل ہوتے ہو
حجت نہ کرو
میری راہوں پر بھروسا کرو
ویرانہ گزر جاؤ ـــــ
(یوں ہوں جیسے)
شہرزاد کے ذہن میں
اس کے دل کی دھڑکن
فسانوں سے لدی پھندی
بیج کی طرح
فضاؤں میں سرشار

آٹھ ہندی نظمیں

سروشور دیال سکسینہ، تعاون: اسد محمد خاں

ایک ہندی شاعر سروشور دیال سکسینہ کا مجموعۂ جنگل کا درد" پڑھنے کو ملا۔ سکسینہ صاحب نے از راہِ نوازش ۸۵ء میں دلی سے یہ کتاب بھیجی تھی۔ سرسری نظر ڈال کر رکھ دی تھی۔ اب جو بار بار پڑھنے کو ملا تو بڑا خوشگوار تاثر قائم ہوا۔ پچھلے چند برسوں میں کچھ یوں ہوا ہے کہ ہماری اُردو نے ہندی جیسی اَن گھڑ اور ہماری اُردو ہی کی طرح نوعمر زبان پر بڑے اچھے اثرات ڈالے ہیں۔ سینکڑوں اردو الفاظ بلا تکلف ہندی شاعری میں استعمال ہو رہے ہیں اور اپنے فطری انداز سے جگہ بناتے جا رہے ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ آپ کے پاس بیٹھ کر یہ نظمیں بلند آواز سے پڑھوں سو کتاب کھولتا ہوں اور ہندی میں لکھی ان نظموں کو TRANSCRIBE کرتا جاتا ہوں۔ بخدا سراسر اردو لکھی جا رہی ہے۔ سروشور دیال سکسینہ کی بعض نظمیں تو ایسی ہیں کہ صرف SCRIPT کا فرق ہے ورنہ زبان وہی ہے جو ہم آپ لکھ رہے ہیں۔ بعض نظموں میں ۴-۶ ایسے الفاظ نظر پڑے جنہیں لغت سے دیکھنا پڑا۔ (مدیرِ "فنون" کے نام ایک خط کا اقتباس)

الگ ہونے کا خیال

سڑک کی اندھیری پٹری پر ہم کھڑے تھے
برف گر رہی تھی
الگ ہونے کے خیال کی

تم نے اپنے سندر چہرے کو لپیٹ رکھا تھا
میرے بال اُڑ رہے تھے
بہت چھوٹا انتر (فرق) ——
یہی کہ لوٹنے پر
تمہیں اپنے گھر میں روشنی ملے گی
مجھے اندھیرا،
تمہارا بستر گرم ہوگا
اور میرے بستر پر
کتابوں کا غذوں کے بیچ
اک مری ہوئی ٹھنڈی سیلن
میری پرتیکھا (انتظار) کر رہی ہوگی
تمہارے سرہانے کی روشنی
کوئی ہاتھ بڑھا بجھائے گا

اور میرے سرہانے
وہ رات بھر جلتی رہے گی

کتنا آسان تھا
تمہارے لئے یہ کہہ چلے جانا —— "الوداع"
جیسے گلاب کی پنکھڑیوں میں سے
ایک سنہرا کیڑا اُڑا ہو

اور میرا......
محسوس کرنا، بھرا ہوا
اُس خالی پن کو
جہاں تم کھڑی تھیں
سڑک کی اندھیری پٹری پر
پھر کچھ نہ کہہ پانا
کیول (صرف) گھٹنوں تک
برف محسوس کرنا
الگ ہو جانے کے خیال کی

تمہارے ہاتھوں میں

اک رنگ بھری کوچی کی طرح
میں نے خود کو تمہارے ہاتھوں میں دے دیا
تم اس سے اپنی ایڑیاں رنگ سکتی ہو
اور ایسی بھیانک آکرتی (نقش) بھی
بنا سکتی ہو جسے دیکھ کر خود کانپ جاؤ
ضروری نہیں کہ رنگوں کا ایک وِشال (بڑا)
سرووَر ہو
جس میں اس سارے دُرشئے جگت (جہانِ نظارہ)
کے ساتھ ہم کود پڑیں
یدی (اگر) ہم رچنا چاہتے ہیں
تو تُلیکا کا اک رنگا گھات (تو قلم کی
جنبش سے چھوڑا ہوا ایک زخم رنگ)
اک ڈبڈبایا چھنڑ (لمحہ)
اک گندھ سے بھری سانس سے
کچھ بھی رَچ سکتے ہیں
ہاں یدی ہم رَچنا چاہتے ہیں
بڑے سے بڑے فلک پر
اک بوند چیخ سکتی ہے
ہرش (خوشی) سے یا اکیلے پن سے
اور اپنے سے بہت بڑے کو جنم دے سکتی ہے
ارتھ (مفہوم) ہم اپنے لئے رچتے ہیں
مانگتے نہیں
ایسا کچھ بھی نہیں جو ہم سے بڑا ہو
یدی ہم کچھ بھی چھوٹا کرنا نہ چاہتے ہوں
مجھے تم اس وراٹ (بڑے) جنگل کے کنارے
گھاس کے اس ٹکڑے پر اونچے پیڑوں کے مقابل
مٹی میں دھنسا چھوڑ جا سکتی ہو
پھر بھی میں اتراتا رہوں گا
کیونکہ ہو سکتا ہے کل تیز ہوا چلے
اور میں تمام تنکوں کے ساتھ کسی بارش میں بہہ کر
اس نرجھر (جھرنے) سے جا ملوں
جو نئی واستیوں (بستیوں) کے بیچ سے بہتا ہے
سمبھاونائیں نرانتر ہیں، (مستقبل کے امکانات مسلسل ہیں)
زندگی کی کھوج، جو رَچنا ہے
رَچنا۔ جو سارتھک (با مقصد) کرتی ہے
مہتو کانکش نہیں (بڑی خواہشیں پیدا نہیں کرتی)
جو دوسروں کو چھوٹا کرنے سے ہی بنتی ہے
میں نے خود کو تمہارے ہاتھوں میں
اس جنگل کو چھوٹا کرنے نہیں سونپا۔ کلہاڑی کی طرح
اک رنگ بھری کوچی کی طرح
میں نے خود کو تمہارے ہاتھوں میں دے دیا

چپ چاپ

اک کھڑکھڑاہٹ پتوں میں
کوئی چل رہا ہے
ہو سکتا ہے وہ گرگٹ ہو
یا کوئی پرندہ
یا ہوا ہو —!

سنو چپ چاپ سانس روک کر
کہیں تمہاری کوئی آواز
اُسے بے سری نہ بنا دے
بکھرے پیلے پتوں پر یہ چاپ
نرُودّیشئے (بے مقصد) ایکانت (تنہائی) کی بھی
اس جنگل کے درد کو
ہلکا کر دیتی ہے!

پتا یہ اُٹھا ٹھنٹھ کا پیر
- سوکھے پتوں پر سرکتے کے پُھدکتے پیلے
یہ جو تم سن رہے ہو
وہی ہے جو تمہاری یاترا کو بڑا کرتا ہے
پیڑوں کو اور اونچا ہونے دو
روشنی کو اور جھینا (TRANSPARENT)
تم اپنے کو پا لوگے
سونے پن کے سنگیت میں گونجتے اس سر کی طرح
جس کے دونوں اَور مَون (خاموشی) ہے
جو اُسے دھڑکتا چھوڑ دیتا ہے
جیسے بہت اونچائی سے اٹکتا ہوا کچھ گر رہا ہو
یا تیزی سے اوپر ابھیلیہ (ناشکستنی ناقابل عبور) کو چیرتا چلا جا رہا ہو
یہ کچھ نہیں ہے سوا اُس احساس کے
کہ اک ہماری دھڑکن
جو اس جنگل کی دھڑکن میں
اس قدر لئے (مدغم) ہو گئی ہے
کہ اُسے الگ سے سننا بے سرا ہوتا ہے

اس سے بہتر ہے
کہ ہمیں دھرتی چھوڑ کر رستے پانی سے
بھیگے سوکھے پتوں پر
جن کی کراہ مر گئی ہے
ہم اک جوتے سے پڑے رہ جائیں
جس میں خاموشی سے پیر ڈالے
اک عمر بھر کے لئے کھڑی ہو

یدی ایشور ہے
تو وہ سنگیت رہے گا ہی
بھلے ہی وہ مینڈک کی طرح
ان سوکھے پتوں پر
دور تک
اُچھلتا
چلا
جائے!

آدھے راستے

ہم سب
آدھے راستے کی زندگی جی رہے ہیں.
ہم سمپورن (مکمل)، آویگوں (جذبوں کی شدت) کے ساتھ
نہ تو گھرنا (نفرت) کر پاتے ہیں
نہ پیار
نہ تو کرودھ (غصہ) کر پاتے ہیں
نہ چھما (درگزر)
ادھوری کامنائیں (آرزوئیں)
ادھوری اچھائیں (خواہشیں)
ادھورے سپنے
ادھوری باتیں

سب کچھ اپنے میں چھپائے
ادھورے راستوں پر گھومتے ہیں
ہم جیون کو سمپورن (پورا) جینے سے
ڈرتے ہیں، کتراتے ہیں
ادھوری درشٹی (نظر)
ادھورے وچار (خیال)
ادھورے سمبندھ (رشتوں) کو
اپناتے ہیں
اور انھیں جو پورنتا (تکمیل) کی کھوج میں
لاوارث گھومتے مل جاتے ہیں
آدھے راستے سے لوٹا دیتے ہیں

پرپکھا (انتظار)

کھلی کسی پنڈلیاں
چاندی کے پھولدان،
ہوں گے کہیں پھول بھی
سنگیت کے اندھیرے میں

تتلی نے کہا

تتلی نے کہا پھول سے
میں تمہارے ساتھ
کتنی بھری پُری لگتی ہوں
اور اُڑ گئی

اکیلاپن

سوکھی راہ میں دیکھی
ایک اکیلی ٹہنی
میں نے اُسے دو ٹکڑے کر
پاس پاس رکھ دیا!

رشتے کی کھوج

میں نے تمہارے دکھ سے
اپنے کو جوڑا
اور ——
اور اکیلا ہو گیا

میں نے تمہارے سکھ سے
اپنے کو جوڑا
اور ——
اور چھوٹا ہو گیا

میں نے دکھ سکھ سے پرے
اپنے کو تم سے جوڑا
اور ——
اور ارتھ ہین (بے معنی) ہو گیا

اپنی بٹیا کے لئے دو کویتائیں

سرویشور دیال سکسینہ، ترجمہ: اسد محمد خاں

(۱)

پیڑوں کے جھنجھنے بجنے لگے؛
لڑھکتی آرہی ہے
سورج کی لال گیند
اُٹھ میری بیٹی، صبح ہو گئی

تونے جو چھوڑے تھے
گیس کے غبارے:
تارے اب دکھائی نہیں دیتے؛
(جانے کتنے اوپر چلے گئے)
تونے جو نچائی تھی پھرکی
چاند دیکھ اب گرا، اب گرا۔

اُٹھ میری بیٹی صبح ہو گئی

تونے تھپکیاں دے کر
جن گڈے گڑیوں کو سلا دیا تھا،
ٹیلے، منہ رنگے، آنکھ ملتے ہوئے بیٹھے ہیں؛
گڈے کی زرتاری ٹوپی
اُلٹی نیچے پڑی ہے، چھوٹی تلیا؛
وہ دیکھو اُڑی جا رہی ہے چُنر
تیری گڑیا کی جھلمل ندی
اُٹھ میری بیٹی، صبح ہو گئی

تیرے ساتھ تھک کر
سوئی تھی جو تیری سہیلی ہوا،
جانے کس جھرنے میں نہا کر آ گئی ہے
گیلے ہاتھوں سے چھو رہی ہے تیری تصویروں کی کتاب
دیکھ تو کتنا رنگ پھیل گیا
اُٹھ، گھنٹیوں کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی ہے
دوسری گلی میں مڑنے لگ گیا ہے بوڑھا آسمان،
ابھی بھی دکھائی دے رہے ہیں اُس کی لاٹھی میں بندھے

رنگ برنگے غبارے، کاغذ پنّی کی ہوا چرخیاں،
لال ہری عینکیں، دفتی کے رنگین بھونپو،
اُٹھ میری بیٹی آواز دے، صبح ہو گئی

اُٹھ دیکھ ——
بندر بسکٹ کا تیرا ڈبا لئے
چھت کی منڈیر بیٹھا ہے
دھوپ آ گئی۔

(۲)

دیکھ یہ ربڑ کی چڑیا
پیٹ دبانے پر گاتی ہے
یہ خرگوش اچھلتا ہے
بھوک سے کیں رو تا ہے کوئی ——
دودھ ہے دودھ یہ دھوپ
جو چاروں طرف پھیلی ہے

اُٹھ بھر لے اپنا کٹورا

آخر چندا ماما بھی تو یہی دودھ پیتا ہے

آسمان کے پار بہت دور اک بہت بڑی گائے ہے،
جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی،
وہ گائے تیرے پتا کی ہے
وہ ہر بھوکے بچے کے پتا کی ہوتی ہے،
رو مت، نہیں تو وہ بھاگ جاتی ہے،
پھر پتا کھو جنے جاتا ہے تو لوٹتا نہیں

تادیوش روزیے وچ (پولینڈ) کی چار نظمیں

ترجمہ: اسد محمد خاں

(۱) خوف

تمہارا خوف بڑا ہے
مابعد الطبیعیاتی ہے
میرا خوف چھوٹا ہے
بریف کیس اٹھائے ہوئے کلرک کی طرح
جس کے پاس ریکارڈ کارڈز ہوں، سوالنامے ہوں
کہ میں کب پیدا ہوا تھا

میری آمدنی کیا ہے
میں نے کیا کچھ نہیں کیا
میرا کس چیز پر ایمان نہیں ہے
میں یہاں کیا کر رہا ہوں
یہ ناٹک کب بند کروں گا
کیا کہیں اور جلنے کا ناٹک بعد میں رچاؤں گا

(۲) دور دور

اس کی پھیلی ہوئی بانہیں اتنی دور تک پھیل گئیں
کہ اُس کا بایاں ہاتھ

اُفق پر ٹکے ہوئے ایک مردہ درخت سے جا لگا
چھوٹا سا دایاں ہاتھ

سختی سے مٹھی بھینچے بھینچے ماں کے ہاتھ میں گم ہوگیا
اُس کا سر گُل گُلا کر
وائیولن کے ڈبے جیسی سیاہ لمبوتری شکل میں ڈھل گیا
اور دانت اپنی جگہ چھوڑ کر
آنکھ اور کان کے درمیان ایک عمودی قطار بن گئے

وہ جنوری کے بلوریں تابوت میں پڑا تھا
اس کا بھائی جسے کبھی اسی کوکھ نے جنم دیا تھا
دھماکے سے پہلے یورپ چھوڑ چکا تھا
اور سمندر کے دوسرے کنارے پر بیٹھا پائپ پی رہا تھا

---

(۳) گمشدہ انجیل

لیکن یسوع جھکے
اُنھوں نے ریت پر لکھا

ماں، وہ اتنے کند ذہن اور سادہ ہیں
کہ مجھے معجزے دکھانے پڑتے ہیں
میں ایسے بے مقصد اور
فضول کام کرتا ہوں
لیکن تو سمجھتی ہے
اور اپنے بیٹے کو معاف کر دیتی ہے
میں پانی کو مے میں تبدیل کرتا ہوں
مُردوں کو جلاتا ہوں
سمندروں پر چلتا ہوں

وہ بچوں کی طرح ہیں
ذرا سوچ تو
کسی کو ہمیشہ
کوئی نا کوئی نئی چیز دکھانی پڑتی ہے

جب مَتّی، مَرقُس، لوقا اور یوحنّا
قریب پہنچ گئے
تو یسوع نے ہاتھ پھیرا
اور ان حروف کو
ہمیشہ کے لئے
مٹا دیا

---

(۴) زندگی کے درمیان

دنیا کے خاتمے کے بعد
اور موت کے بعد
میں نے خود کو زندگی کے درمیان پایا
سو میں نے اپنی تخلیق کی
اور زندگی تعمیر کی
اور لوگ بنائے اور جانور بنائے اور مناظر تخلیق کئے

لوگ روٹی کھا کے زندہ رہتے ہیں

آدمی سے محبت کی جانی چاہیئے
میں نے رات کے وقت اور دن کے وقت
دُہرایا اور یاد کیا
کس سے محبت کی جانی چاہیئے — آدمی سے
میں نے جواب دیا — آدمی سے

یہ میز ہے، میں نے کہا
یہ میز ہے
میز پر ایک روٹی اور ایک چھری ہے
چھری، روٹی کاٹنے کے کام آتی ہے

یہ کھڑکی ہے، میں نے کہا
یہ کھڑکی ہے
کھڑکی کے اُدھر باغ ہے

میں باغ میں سیب کا ایک درخت دیکھتا ہوں
پھولوں سے لدا ہوا سیب کا درخت
پھول گرتے ہیں
پھل بننا شروع ہوتے ہیں
پکتے ہیں
میرا باپ ایک سیب توڑتا ہے
یہ آدمی جو سیب توڑ رہا ہے
میرا باپ ہے
میں ایک مکان کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہوں
یہ بوڑھی عورت
جو بکری کی رسّی تھامے گزر رہی ہے
دنیا کے ساتوں عجائبات سے زیادہ ضروری ہے ——
اُن سے کہیں زیادہ قیمتی ہے
جو کوئی بھی یہ سوچتا اور محسوس کرتا ہے کہ یہ بڑھیا ضروری نہیں ہے
وہ مجرم ہے
بنی نوع انسان کا قاتل ہے

یہ آدمی ہے
یہ درخت ہے، یہ روٹی ہے

لوگ کماتے اس لئے ہیں کہ زندہ رہیں
میں دل ہی دل میں دہراتا رہتا ہوں
انسانی زندگی بہت اہم ہے
انسانی زندگی کی اہمیت بہت زیادہ ہے
زندگی کی قیمت
آدمی کے ہاتھوں بنائی ہوئی ہر ایک چیز سے زیادہ ہے
آدمی ایک بے بدل خزانہ ہے
میں بڑے ضدی پن سے دہراتا ہوں
آدمی ایک بے بدل خزانہ ہے

یہ پانی ہے میں نے کہا
یہ پانی ہے
میں نے ہاتھ بڑھا کر لہروں کو چھو لیا
اور دریا سے باتیں کیں
پانی سے کہا
مہربان پانی
یہ میں ہوں
تو آدمی نے پانی سے کلام کیا
چاند سے کلام کیا
اور پھولوں سے اور بارش سے
اور اس نے زمین سے کلام کیا
اور چڑیوں سے
اور آسمان سے باتیں کیں

آسمان چپ تھا
زمین چپ تھی
(بڑی خاموشی تھی)

اور اگر اُس نے آواز سُنی
جو زمین سے اور پانی سے اُٹھ رہی تھی
اور آسمان سے اُتر رہی تھی
تو خبر ہو
کہ وہ
دوسرے انسان کی آواز تھی

خدا کو بتاؤ

ہیسٹنگز، ڈبلیو۔ اکوتھو جینڈو (تنزانیہ)

ترجمہ: امجد اسلام امجد

خدا کو بتاؤ
کہ ہر روز دوپہر کے کھانے پر میں اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کو
اپنے اپنے کوڑے کے ڈبے سے گندگی کھاتے دیکھتا ہوں
(کچلے ہوئے آلوؤں کے ٹکڑے اور سڑا گلا جسم)
اسے بتاؤ کہ میں اپنے دل میں اُن کے لئے آنسو بہاتا اور روتا ہوں
کیونکہ میں اُن محتاجوں اور مفلسوں سے محبت کرتا ہوں
میں اُن کی بوسیدگی، گندگی اور غلاظت سے
اُن کی شرمناک حالت سے
اُن کی تمام تر مفلسی اور شقاوت سمیت اُن سے محبت کرتا ہوں!

خدا کو بتاؤ
کہ میں نے اُس کے اِن مندروں کو گرجا گھر میں جلتے دیکھا ہے
اُسے بتاؤ کہ میں نے اُس کے پادری کو انہیں
نجات اور بخشش کی دعائیں دیتے دیکھا ہے!
لیکن یہ پادری اُن میں سے نہیں ہے،
کیونکہ وہ اُس جہنم میں کبھی نہیں آئے گا
جہاں یہ مفلس نادار اور کنگلے لوگ رہتے ہیں
یہ لوگ کبھی اُس کے دوست نہیں ہو سکتے!!
"مفلس لوگ بخشی ہوئی روحیں ہیں"
وہ تمہاری کتاب میں سے بغیر کسی ایقان کے انہیں پڑھ کر سناتا۔
مگر یہ لوگ ہر امید سے ہاتھ اٹھا چکے ہیں
اور جنت کے حسین خوابوں پر انہیں کوئی یقین نہیں رہا

خدا کو بتاؤ
کہ اُس کا پادری کانٹے دار درختوں کی سینتیں مارتی ہوئی شاخوں کے
نیچے سے گزر کر امیروں کے محلّے کی طرف روانہ ہو چکا ہے

امیروں کا محلّہ
جہاں امن آرام اور جنت
انسانی محبت کے دکھ اور گناہ سے ماورا ہیں
اُسے بتاؤ کہ میں انسان کی روحانی تکلیف کے شدید احساس سے
گذرا ہوں اور میں نے بارہا اُسے پکارا ہے
اُسے بتاؤ
کہ میں نے اُسے بہت تلاش کیا ہے لیکن وہ کہیں نہیں ملا
میں نے چلا چلا کر اُسے آوازیں دی ہیں مگر اُس نے کوئی جواب نہیں دیا
اُسے بتاؤ!

کہ میں نے عبادت گاہ میں خون رو رو کر التجائیں کی ہیں
لیکن اُس نے ہماری طرف نگاہ تک نہیں کی
خدا کو بتاؤ — اُسے بتاؤ
کہ وہ اپنے آسمانوں کے ابدی سکوت سے نکلے اور اس جہنم میں آئے
اُن کے لئے — جو بیمار اور بے یار و مددگار ہیں
یہ اُجڑے اور جھلائے ہوئے لوگ اُسے پکار رہے ہیں
اُسے بتاؤ کہ یہ غریب و محتاج لوگ اُس کے مبارک ظہور [illegible]
اُسے بتاؤ کہ یتیم معذور، عاشق اور خبطی سب اُس کی چاہ میں سلگ رہے ہیں

خدا کو بتاؤ — خدارا اُسے بتاؤ
کہ اُسے اِن گرجا گھروں اور نئے طرزِ تعمیر کی شاندار عبادت گاہوں
میں رہتے ہوئے بہت وقت ہو گیا ہے
اُسے بتاؤ کہ اِن پاک اور مقدس قربان گاہوں میں وہ بہت رہ چکا ہے
اے خدا — اب وہاں کوئی نہیں ہے
اب وہاں تیرے اُس "مقدس" پادری کے سوا اور کوئی نہیں ہے!
خدا کو بتاؤ کہ وہ غریبوں کے اِن گندے محلوں کی طرف آئے!
اُسے بتاؤ کہ اب دیر کی گنجائش نہیں ہے!!

اپنی زمین کے گیت گاؤ

(انی اسمو سلو یرا (ساؤ ٹوم پرتگیزی کالونی)

ترجمہ: امجد اسلام امجد

رات کے حصار میں میرا باپ
مجھے دور دراز کے پُرہجوم شہروں کے قصے سناتا ہے
یہ کہانی وہ مجھے ہر اُس رات کو سناتا ہے
جب گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا
اور یہ راتیں سال میں اُسی قدر ہوتی ہیں جتنے کہ دن

رات کے حصار میں میری ماں
مجھ سے نئی قمیص کا وعدہ کرتی ہے
قمیص جو مئی کے تہوار پر مجھے دی جائے گی
میری ماں مجھ سے ہر بار یہ وعدہ کرتی ہے
مگر آج تک وہ ایک بھی وعدہ پورا نہیں کر سکی

رات کے حصار میں جب بھوکے پیٹ
کلبلاتے ہوئے کیڑوں سے بھر جاتے ہیں
تو ہم دائرے کی شکل میں رقص کرتے ہوئے گاتے ہیں
"اے چاند ۔ ہمیں کچھ گوشت اور دودھ اُدھار دے دے
ہم تجھے واپس کر دیں گے"
آہ، غلام لوگوں کے خواب جو خود کو آزاد تصور کرتے ہیں
آؤ اُن بچوں کے خواب جو سمجھتے ہیں کہ چاند اُن کے دھوکے میں آجائے گا!!

غلاموں کا جہاز آپہنچا ہے
غلاموں کا جہاز ایک اور پھیرا لگانے کے لئے آپہنچا ہے
ہر صبح یہ جزیرہ قحط سے مرتا ہے اور ہر رات یہ اپنی زندگی
کے بطن سے دوبارہ وہی جنم لیتا ہے!

اے گٹار سے ابھرتے ہوئے غم آلود نغمو!
اے بھٹکی ہوئی بے ٹھکانہ آوازو!!
تم ستاروں سے کیا کہنا چاہتے ہو!
ماؤں کی چھاتیاں سوکھ چکی ہیں
مردوں کے جسم تشنج اور تکلیف میں مبتلا ہیں
اور خوراک کے گودام اُن کی دسترس سے دور ہیں
اے سیاہ فام لوگوں کی دکھ بھری آوازو
(جن کے چہروں کے خول تکلیف کی شدت سے ترخ رہے ہیں)
زندگی تمہیں زمین کے لئے نغمے گانے پر اُکسا رہی ہے ۔ گاؤ
زمین کے لئے ۔۔۔ اپنی زمین کے لئے گاؤ
اپنی زمین کے لئے گیت گاؤ

آؤ اپنے ہونے پر فخر کریں

اُستاج پروڈینکیو (دوہامی)

ترجمہ: امجد اسلام امجد

مغرب کی طرف سے
طاقتور، غضب ناک اور بے رحم ہوائیں چلتی ہیں
ان کی زد سے کوئی بھی شے محفوظ نہیں
یہ ایک جارحانہ تیزی اور مجنونانہ دھن کے ساتھ افریقہ پر
اپنا تہذیبی تسلط جمانے کے لئے بڑھ رہی ہیں!

ہم اتحاد کی برکتوں کے منکر نہیں ہیں
لیکن ہمیں اپنی تہذیب کی حفاظت یک جہتی کے ساتھ کرنی چاہیئے
ہمیں جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ اپنے تہذیبی نقوش کی حفاظت کرنی چاہیے
کیونکہ ہمیں اپنی اُن شاندار روایات کی عظمت کو آگے بڑھانا ہے
جو ہمارے جسم و جاں میں خون کی طرح موجزن ہیں

اپنے ماضی، اَس کی قوت، اور انفرادی تشخص سے انکار کرکے
تم افریقہ کو ایسے آشوب میں مبتلا کردو گے
جہاں ناکسی، کمزوری، اور روحانی بحران کے سوا کچھ نہیں
اپنے موسم گرما اور بہاروں سے منہ نہ موڑو
جن کے ماتھے پر سورج کی مہربان روشنی افشاں لگاتی ہے۔!
اپنے گیتوں اور رقصوں کو پاؤں تلے مت روندو!
اپنے افریقی جوگوں اور بکسوؤں کو مغرب کی نام نہاد سبک روی
کی خاطر مٹی میں مت ملاؤ۔
یہ تمہارے لوگوں کی خوشیوں اور مسکراہٹوں کے امین ہیں
اِن پر فخر کرنا سیکھو
اپنے اس خوبصورت ملک کی حفاظت کرو
جسے غلام صدیوں کی مسلسل تضحیک کے طرزِ عمل نے بے وقار کر رکھا ہے

تاریخ کی اِس رات میں
آؤ ہم سب نیگرو بن کر جینا سیکھیں
میرے دوستو، میرے تمام افریقی دوستو،
آؤ ہم سب اپنی تہذیب کے سرچشمے سے سیراب ہوں
کیونکہ اسی میں ہمارے تمام پائدار رشتوں کی بقا ہے!!

تمہارے قریب

ڈیوڈ۔ایم۔ڈیوپ (سینیگال)
ترجمہ: امجد اسلام امجد

تمہارے قریب آکر میں نے اپنے نام کی بازیافت کی ہے!
میرا نام جو مدت سے فاصلوں کی
دل گداز تلخی کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔
میں نے اپنی کھوئی ہوئی آنکھیں دوبارہ پالی ہیں
اور اب اُن میں بخار کی وحشت زدگی نہیں ہے۔
تمہاری ہنسی نے شعلے کی طرح
تاریکی کی دیواروں میں رخنے ڈال دیئے ہیں
اور ماضی کی بے اَنت برف ہٹا کر میرا افریقہ مجھے لوٹا دیا ہے

میری جان!
گذشتہ دس برسوں کی تمام صبحیں واہموں سے پُر
اور شکستِ خواب کے ایک مسلسل عمل کی منظر تھیں
میری نیندیں،
شراب کی بدمستی سے آلودہ تھیں
اور ان دس برسوں میں دنیا نے قطرہ قطرہ درد میرے
وجود میں انڈیلا ہے
لمحۂ موجود کا درد
جس میں آنے والے کل کی مہکار لہریں لے رہی تھی
اور جس نے محبت کو ایک دریائے ناپیدا کنار بنا دیا تھا
تمہارے قرب میں
میں نے اپنے لہو کے گیت کی بازیافت کی ہے
اور وقت کے گلے میں خوشبوؤں کے ہار ڈالے ہیں
وقت۔جس کا چہرہ
آنے والی زندہ مسرتوں سے دمک رہا ہے۔

مغربی جرمنی میں ایک برس (۱۴)

زالٹس برگ، مغربی کلاسیکی موسیقی اور موتسارٹ

محمد کاظم

برخٹس گاڈن سے چل کر ہماری بسوں نے ٹنزبرگ کے کوہستانی علاقے کے کچھ موڑ کاٹے، اور پھر ایک گیلی، بل کھاتی ہوئی، ڈھلوان سڑک پر سے سہج سہج نیچے اُتر کر ایک ہموار میدانی سڑک پر دوڑنے لگیں۔ اس راستے پر وہ زیادہ دور نہ گئی تھیں کہ ایک مقام پر پہنچ کر رک گئیں۔ معلوم ہوا کہ آسٹریا کی سرحد آگئی ہے اور ہم ایک دوسرے ملک میں داخل ہونے لگے ہیں۔ سرحد پر ضابطہ کی کارروائی ضرور ہوئی لیکن ایسے جیسے آپس کا کوئی گھریلو معاملہ ہو۔ آسٹریا کی چوکی والوں نے پہلے ہمارے پاسپورٹ گنے، اور پھر ہم مسافروں کے سروں کی گنتی کی ــــ بھورے، سنہری، سرخ، کالے اور روپہلی سر ــــ اور تالی بجاتے ہوئے ہمارے ہر ڈرائیور کو آگے جانے کا اشارہ دے دیا۔ یہ ساری کارروائی تپاک اور گرم جوشی کی ایک اُجلی فضا میں یوں ترت پھرت عمل میں آئی کہ ہم میں سے جو لڑکے اور لڑکیاں اپنے مزاج کی بے کلی اور اچپلاہٹ میں بسوں سے نیچے اتر گئے تھے، وہ ابھی اپنی ٹانگیں بھی سیدھی نہ کر پائے تھے کہ ہارن کی آواز پر انہیں بھاگم بھاگ اپنی نشستوں پر واپس آنا پڑا! ــــ یہ ۱۹۷۰ء کا زمانہ تھا، اور قطع نظر اس کے کہ ہم لوگ ایک جرمن درس گاہ کے سیاحتی ٹولے کی صورت میں سفر کر رہے تھے، سرحدوں پر اُن دنوں عام حالات میں بھی اتنے کڑے پہرے نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ باہر سے آنے والے مسافروں اور سیاحوں کو ہمیشہ امکانی مجرم جان کران سے زیادہ پوچھ گچھ کی جاتی تھی۔ یہ عالمی سیر و سیاحت کے شعبے میں ہم انسانوں کی شائستگی اور وقار کا غالباً آخری دور تھا۔ اس لئے کہ اس کے بعد کے برسوں میں بین الاقوامی سفر و نقل میں مکر و فریب، لاقانونیت اور تخریب کاری کی ایسی ہوا چلی کہ انسانی تہذیب و شرافت نے شرم سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا، اور اس کے نتیجے میں ملکوں اور قوموں کے درمیان حائل دیواریں روز بروز اونچی اُٹھتی چلی گئیں۔ آج کے حالات میں مَیں جب اُن اچھے دنوں کا خیال کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے وہ بہت دور کا کوئی ماضی تھا، کسی اور ہی صدی کا زمانہ، جو اب شاید کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا!)

آسٹریا میں داخل ہو کر بھی وہی سیدھی اور ہموار سڑک ہمارے نیچے تھی، اور ہمارے دائیں بائیں بارش میں بھیگے ہوئے کھلے اور وسیع میدان تھے، جہاں سبزہ اور روئیدگی کم کم دکھائی دیتے تھے اور ایک بے رنگ، اور غیر دلچسپ منظر ہمارے دونوں جانب حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ اتنے خوبصورت اور رومانی شہر کا راستہ اتنا سپاٹ، اور غیر رومانی؟ بات کچھ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ زالٹس برگ کا شہر کب اور کہاں شروع ہوا؛ اس کا ہمیں ٹھیک سے پتہ نہ چل سکا۔ ہم شاید باہر کے مناظر سے بیزار ہو کر بس کے اندر آپس میں گپ شپ کرنے لگ گئے تھے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بس کے بڑے بڑے شیشوں کے فریموں میں بجائے اُن بھیگے اور بے کیف میدانوں کے، اٹھارویں صدی کے کسی شہر کی سرخ اور نارنجی پتھر سے بنی ہوئی عمارتیں اور گرجے، خانقاہیں اور بازار اور چوراہے اور مجسمے پل بھر کے لئے اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور پھر اوجھل ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم شہر کے وسطی اور گنجان علاقے میں تھے، اور ہماری بسیں اس کے تنگ کوچوں میں کیڑوں کی طرح رینگتی ہوئی دھیرے دھیرے اپنا راستہ بناتی جاتی تھیں۔ شہر کی عمارتوں کے درمیان ہم ایک جگہ ایک ایسے کھلے مربع چوک (SQUARE) سے بھی گذرے جس میں تھیٹر کی طرح کی نشستیں ایک زینے کی صورت میں ایک طرف بلندی سے شروع ہو کر نیچے تک چلی گئی تھیں۔ یہ ایک عجوبہ تھیٹر تھا جس کی چھت آسمان تھی، اور جس کا سٹیج سامنے کسی کیتھڈرل کا اونچا چبوترہ تھا، یہاں خدا

ہوئے کس طرح کا کھیل رچایا جاتا ہوگا اور وہ کون تماشائی ہوں گے جو ستاروں کی چھاؤں میں اُڑتے ہوئے سیاہ رنگ کی ان چوبی نشستوں پر بیٹھ کر اس کا تماشا کرتے ہوں گے! یہ تھیٹر آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے بعد بھی دیر تک میرے خیالوں میں موجود رہا، رفتہ رفتہ آسیبی اور پُراسرار ہوتا ہوا جیسے وہاں اس لمحے بھی کوئی کھیل ہو رہا تھا جب ہم وہاں سے گزر رہے تھے، اور ان بھیگی ہوئی نشستوں پر اس وقت بھی تماشائی موجود تھے، اگرچہ وہ ہماری مادی آنکھوں کو دکھائی نہ دیتے تھے!

اس کے بعد ہم اونچی گلیوں، اور محرابوں اور خوبصورت کلیساؤں اور خزانی دروازوں کے نیچے سے گزرتی ہوئی ایک کھلے میدان — کاپیٹل پیازہ — میں آ پہنچے ہیں، جو شہر کے مشہور تاریخی قلعے "ہوہن زالسبرگ" کے قدموں میں واقع تھا۔ یہاں ہمیں دو ڈھائی گھنٹوں کے لئے شہر میں آزادانہ گھومنے پھرنے اور کھانا کھانے کے لئے چھوڑ دیا گیا، اس ہدایت کے ساتھ کہ دن کے دو بجے سب لوگ اپنے اپنے کھدروں سے برآمد ہو کر اس میدان میں پھر جمع ہوں گے، اور اس کے بعد سب مل کر شہر کے اس پرانے قلعے کی سیاحت کے لئے اوپر جائیں گے۔

[illegible] شہر میں [illegible] طرح بسر کیے وہ سب ایک ایسے خواب کی طرح یاد ہے جس کے واقعات اور مناظر میں کوئی منطقی ربط اور زمانی ترتیب نہیں ہوتی، اور وقت کا بہاؤ کبھی سیدھا اور کبھی اُلٹا چلتا ہے۔ بس اتنا یاد ہے کہ ہم تینوں ساتھی — شہزادہ، شیخ اور میں — اونٹوں کی طرح منہ اٹھائے ایسے کوچوں اور بازاروں میں گھومتے پھرتے ہیں جن کے راستوں کا ہمیں کوئی علم نہیں، اور جہاں شہر کا ہر نیا موڑ ہمیں ایک نئے منظر اور نئی حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ پتھر کے فرشوں والے بازار اور کوچے نہایت صاف ستھرے ہیں اور اُن سے اُنس اور اپنائیت کی وہی مہک آتی ہے جو صرف چھوٹے اور قدیم شہروں کی گلیوں میں آیا کرتی ہے۔ ہمارے آس پاس بڑے بڑے شیشوں والی خوبصورت دکانیں ہیں جن کی پیشانی پر پیتل، جستی اور لال دھاریوں والے ٹاٹ کے جھالر دار چھتر جھک کر سایہ کرتے ہیں۔ چلتے چلتے ہم ایک چھوٹے سے کافے میں آ نکلتے ہیں، اور یہاں کچھ دیر بیٹھنے اور سستانے کی خاطر ایک ایک پیالی کافی کی فرمائش کرتے ہیں۔ یہ ایک گھریلو قسم کی فضا والا قہوہ خانہ ہے جس میں دیواروں پر روغنی رنگوں کی مصوری کے کچھ نمونے آویزاں ہیں، اور طاقچوں اور محرابوں میں چھوٹے چھوٹے مجسمے اور نوادر سجا رکھے ہیں، جن کی وجہ سے یہ قہوہ خانہ ایک عجائب خانے کا سا تاثر دیتا ہے۔ فضا میں دھیمے سروں میں موسیقی کا کوئی ٹکڑا بج رہا ہے (موتسارت کے اس شہر میں موسیقی سے زیادہ اور کیا چیز قدرتی اور برمحل ہو گی؟) ذرا دم لینے کے بعد ہم اپنے ارد گرد نظر ڈالتے ہیں اور ہماری نگاہیں ایک ہی جگہ اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے ایک کونے والی میز پر ایک نوجوان جوڑا اپنے گرد و پیش سے بے پروا، باہم اظہارِ جذبات میں مصروف ہے۔ محبت کا اظہار تمام تر لڑکی کی جانب سے ہو رہا ہے جو اپنا منہ لڑکے کے منہ کے بالکل قریب لے جا کر اس سے سرگوشی میں کچھ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لڑکا کسی ٹریجڈی کے ہیرو کی طرح کچھ سوچتا ہوا اور لب بستہ سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس کے بھنچے ہوئے سرخ ہونٹوں میں ایک ایسی دلآویز المناکی ہے کہ لڑکی اس پر مٹی جاتی ہے اور اس بت کو موم کرنے کے لئے اپنے سارے نسوانی حربے آزما رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نوجوان کو اپنی لڑکی کے کسی رویے سے مایوسی ہوئی ہے اور وہ اس کے ساتھ اپنا جذباتی رشتہ استوار رکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر یہ نظارہ کرنے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارا اُن لوگوں کو اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا ٹھیک نہیں، اور میں اپنے ساتھیوں کو اس طرف دیکھنے سے باز رکھتا ہوں۔ یہاں دوسروں کے معاملات میں اس طرح دخل دینے کی بالکل ریت نہیں ہے، جبھی تو یہ جوڑا اتنے اطمینان سے یہاں بیٹھا تصفیۂ معاملاتِ قلبی میں مشغول ہے۔ میرے ساتھی اپنے 'لیڈر' کی بات مان کر اس طرف سے نظریں ہٹا لیتے ہیں، اور مجھے اس موقع پر فرانس کا اثر پذیرت (IMPRESSIONIST) مصور ڈیگا (DEGAS) یاد آتا ہے، جو روزمرہ زندگی میں اپنے سامنے گزرنے والے لمحات میں سے کسی ایک قدرتی اور بے ساختہ لمحے کو مقید کر کے اپنے کینوس پر اتار لیتا، اور اُسے جاوداں کر دیتا تھا! —— فرولائن بہت خوبصورت ہے اور میری دور کی ایک عزیزہ کی ہم شکل! یہاں تک کہ اس کا جسم، اس کے سفید مرمریں ہاتھ اور اُن کی پتلی پتلی مخروطی انگلیاں بھی بالکل اسی عزیزہ کی طرح

ہیں۔ ایک عجیب بات میں نے اس سفر کے دوران میں یہ دیکھی ہے کہ یہاں جو انسان بھی مجھے اپنے وطن کے کسی انسان کا ہم شکل نظر آیا ہے، اپنی خصلت اور مزاج میں بھی مجھے وہ حیرت انگیز طور پر اُس کا ہو بہو نمونہ دکھائی دیا ہے۔ اب میری وہ عزیزہ بھی اپنے مرد کے معاملے میں سراپا التفات اور مجسم توجہ و نگہداشت واقع ہوئی ہے۔ اور شادی کے بعد اُس نے اپنے سرتاج کو — جو میرا ایک عم زاد ہے — ادھر اُدھر دیکھنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ اپنی ساری شخصیت کے ساتھ اپنے خاوند پر ایک چھتنار کی طرح تن گئی ہے، یہاں تک کہ ایک آزاد مرد کی حیثیت سے اُس کی اپنی کوئی مرضی اور اپنا کوئی ارادہ و اختیار باقی نہیں رہا! — کچھ اسی طرح کا رویہ اب زالٹس برگ کے اس چھوٹے سے خوبصورت قہوہ خانے میں یہ خوبصورت لڑکی اپنے اس گریزاں دوست کے ساتھ برت رہی ہے۔ مکڑی کا عمل میری آنکھوں کے سامنے ہے اور میں اس کا انجام اچھی طرح جانتا ہوں، اس لئے کہ خود سر اور تسلط پسند لڑکیوں کی یہ قسم اپنے ارادوں میں ناکام ہونے کے لئے اس دنیا میں نہیں آتی!

کریم ملی کافی بہت لذیذ اور زندگی بخش ہے اور ریستوران کی ادھیڑ عمر مالکن کی دوستانہ مسکراہٹ اس کا لطف دوبالا کئے دیتی ہے۔ پھر سامنے کے کونے میں ہونے والا رومیو اور جولیٹ کا یہ زندہ تماشا! (جسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد کنکھیوں سے دیکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں) زالٹس برگ کے شہر کا یہ روپ، جو اس چھوٹے سے قہوہ خانے میں سمٹ آیا ہے بالکل خیالی اور افسانوی ہے۔ موسیقی، مسکراہٹ اور محبت: یہ ترکیبی عناصر کسی زمینی اور حقیقی شہر کے کب ہوئے ہیں؟ اور جب شہزادہ کہتا ہے کہ کافی زالٹس برگ دیکھ لیا ہے، اب باقی وقت یہیں گذارنا چاہیئے تو میری سمجھ میں نہیں آتا میں اس کی بات کیسے رد کروں!

ہم تینوں ایک مرتبہ پھر شہر کی گلیوں میں موٹر گشت کرنے لگتے ہیں — یہ منظر غالباً بعد کا ہے، لیکن ٹھیک سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے یہ پہلے کا ہو — چلتے چلتے ہم شہر کے کاروباری علاقے کے ایک کوچے "گیترائیدے گاسے" میں آنکلتے ہیں، یہاں نو نمبر کی عمارت میں وہ تاریخی مکان ہے جس میں موسیقار موتسارت پیدا ہوا تھا۔ اس عمارت کی تیسری منزل پر اب ایک عجائب گھر ہے جس میں موتسارت کے وائلن، اس کا ایک چھوٹا سا ہارپسی کارڈ، اس کے تخلیق کئے ہوئے نغمہ ہائے ساز (SCORES) اس کی تصویریں اور اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط اپنی اصل حالت میں محفوظ ہیں۔ یہ عجائب گھر زیارت گاہِ عشاقِ موسیقی ہے اور یہاں ہر وقت زائرین کا ایک جمگھٹا رہتا ہے۔ خصوصاً تمثیلی میلے کے موسم میں جو ہر سال جولائی اگست میں یہاں منعقد ہوتا ہے، اور جس میں موسیقی کا بھی ایک بڑا جشن اس شہر میں منایا جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں یہاں کچھ وقت گذاروں لیکن میرے ساتھیوں کو جو دیکھنا تھا وہ دیکھ چکے ہیں اور باہر دروازے پر میرا انتظار کر رہے ہیں، پھر کافی دیر سے چلتے رہنے کے باعث اب ہمیں بھوک بھی لگ چلی ہے۔ چنانچہ ہم اپنے سیاحتی مقاصد کو کچھ دیر کے لئے بھول کر ایک ایسی جگہ کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں، جہاں بیٹھ کر ہم اطمینان سے اپنا وہ کھانا کھا سکیں جو ہمارے لئے شہزادے نے اپنے ہاتھ سے تیار کر کے اس سفر پر ساتھ لیا ہے۔ اس کھانے کا بڑا اور واحد آئیٹم ایک بھنا ہوا سالم مرغ ہے جو ایک پتیلے میں بند ہے، اور پتیلہ ایک موٹے کھردرے کپڑے، غالباً میز پوش، میں بندھا ہے۔ اور یہ بدوضع گٹھڑی شہزادے نے اٹھانے کے لئے مجھے اور شیخ کو دے دی ہے، اور خود ایک "ہیڈ گگ" کے سے انداز برتری کے ساتھ اس طرح لاتعلق پھرتا ہے جیسے وہ اپنا فرض پورا کر چکا ہو، اور یہ گٹھڑی اٹھانا اس کے لئے ایک ہیچ کام ہو! اس حالت میں چلتے چلتے میں ایک موقع پر جھنجلا اٹھتا ہوں۔

"یار، یہ تمہیں کیا سوجھی، مرغ پکا کر ساتھ لے چلنے کی؟" میں شہزادے سے پوچھتا ہوں "کھانا ہی تو کھانا تھا، شہر میں چلتے پھرتے کہیں بھی کھا لیتے۔"

شہزادہ رک کر مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا ہے "بس، یہ چھوٹی سی گٹھڑی اٹھانی پڑ گئی تو مصیبت آ گئی۔" وہ ملامت کے لہجے میں کہتا ہے "اور میں نے جو تم لوگوں کے لئے صبح سویرے اٹھ کر اتنی جان ماری ہے ......؟"

وہ ایک چھوٹی سی گٹھڑی نہیں تھی، شرم کی پوٹ تھی، جسے ہاتھ میں لٹکا کر چلتے ہوئے ایک اچھا بھلا انسان بھی صورت سے خواہ مخواہ بوقّق دکھائی دیتا تھا۔

"بات یہ ہے" تھوڑی دیر بعد شہزادہ کچھ دھیما پڑ کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا "آج میری طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں ہے۔ اب بھی میں خاصی کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے سوچا نئے شہر میں جا رہے ہیں، اچھا کھانا ملے نہ ملے، بہتر ہے اپنے گھر کی بنی ہوئی چیز ساتھ ہونی چاہیئے۔" ہو سکتا ہے اُس دن شہزادے کا یہ عذر درست ہو لیکن وہ ہمیشہ یہی کچھ کیا کرتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو سفر کو ایک پکنک سمجھتے ہیں اور مسافرت میں بھی گھر کی آسائشیں اور ساز و سامان ساتھ لے کر نکلتے ہیں۔ اس طرح کے سفر کی صعوبتوں کا خیال اُن کے اعصاب کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتا۔

اپنی گھر کی بنی ہوئی چیز کھانے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش ہمارے لئے اچھا خاصا مسئلہ بن گئی۔ شہر کے بھرے بازاروں میں ہمیں کوئی ایسا تھڑا یا تخت پوش دکھائی نہ دیا جہاں بیٹھ کر ہم اطمینان سے اپنا دستر خوان بچھا لیتے، اُس وقت آسمان پر بادل تو موجود تھے لیکن بوندا باندی کچھ دیر کیلئے تھمی ہوئی تھی۔ آخر شہزادے نے تجویز کیا کہ اب آگے جو بھی ریستوران ہمارے راستے میں آئے گا ہم اس میں چلے جائیں گے اور وہاں ایک میز پر چائے یا کافی کا آرڈر دے کر ہم اپنا کھانا کھول لیں گے اور اطمینان سے بیٹھ کر کھائیں گے۔ اس تجویز پر میرے اور شہزادے کے درمیان پھر تکرار ہوئی۔ میرے نزدیک کسی ریستوران میں بیٹھ کر اس طرح کی حرکت کرنا بہت معیوب بات تھی۔ لیکن شہزادے نے ایک نہ سنی اور ہمیں دھکیل کر ایک بڑے سے ریستوران میں لے گیا۔ اندر پہنچے تو وہاں منظر ہی کچھ اور تھا۔ پورا ڈائننگ ہال خوش خوراک اور لاگورما قسم کے لوگوں سے پُر تھا اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ زیادہ تر باتیں کرنے اور قہقہے لگانے میں مصروف تھے، اور کھانا ختم کرنے کی انہیں کوئی جلدی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہال کے ایک طرف ہمیں سیڑھیاں اوپر جاتی ہوئی دکھائی دیں، ہم انہیں کامیابی کا زینہ سمجھتے ہوئے اوپر چڑھ گئے۔ اوپر کا اتنا ہی بڑا کمرہ نیچے سے بھی زیادہ پُر ہجوم تھا، اور ایک طرف دیوار کے ساتھ انتظار کرنے والوں کی ایک قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم بھی اس قطار میں جا شامل ہوئے۔ وہاں کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد میرا ماتھا ٹھنکا اور ساری صورت حال سمجھ میں آئی۔ ہم دراصل ایک ایسے ریستوران میں گھس آئے تھے جس کے خاص پکوانوں (SPECIALITIES) کا دور دور تک شہرہ تھا، اور زالتس برگ میں آنے والے سیاحوں کے پروگرام میں اس ریستوران میں کھانا کھانا لازماً شامل ہوتا تھا۔ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہمیں زالتس برگ کا جو مختصر سا تعارف نامہ دیا گیا تھا اُس میں بھی یہاں کے پکوانوں کا ذکر تھا۔ شہزادے کی طبیعت اب کچھ زیادہ مضمحل ہو رہی تھی، اور طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو نے ہماری آتش شکم بھی تیز کر دی تھی۔ ہم مجبوراً نیچے اتر کر باہر گلی میں آئے، اور ایک مناسب کنج کی تلاش میں اپنی اسی مہم پر نکل پڑے۔ اگلے ہی موڑ پر ہم ایک چوراہے میں آنکلے جو "موتسارت پلاٹز" کہلاتا تھا اور اس کے وسط میں اس عظیم موسیقار کا ایک مجسمہ بھی نصب تھا۔ ہم نے اس مجسمے کو تھکی تھکی نگاہوں سے دیکھا، اور یہ جان کر مایوس ہوئے کہ اس کے آس پاس بھی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں تین آدمی اطمینان سے بیٹھ کر اپنا کھانا کھا سکتے۔ موتسارت اپنے فن میں ضرور عظیم ہوگا، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا، لیکن اس وقت ہماری حالت ایسی نہیں تھی کہ ہم وہاں زیادہ دیر کھڑے ہو کر اس کے بارے میں سوچ سکتے۔ اُس وقت ہماری حالت ایسے راہگیر کی سی تھی جسے نیا جوتا کاٹ رہا ہو اور اس کی منزل کا ابھی کچھ پتہ نہ ہو۔ موتسارٹ پلاٹز سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہمیں بالآخر کیتھیڈرل کے قریب ایک عمارت میں صاف ستھری سیڑھیاں میسر آگئیں جو شارع عام سے ہٹ کر تھیں اور وہاں لوگوں کی آمد و رفت بھی زیادہ نہیں تھی۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر اپنا دستر خوان بچھایا اور اتنی یکسوئی اور انہماک کے ساتھ کھانا تناول کیا جیسے ہمارا زالتس برگ آنے کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھنڈے کوکا کولا کا ایک ایک ٹن پیٹ کے اندر انڈیلا تو ماند پڑتی ہوئی آنکھوں میں یکایک چمک آگئی۔ زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر تبدیل ہونا شروع ہوا۔ سڑکوں پر چلتے پھرتے لوگ خوبصورت لگنے لگے اور گرد و پیش کی دنیا دلچسپ اور امکانات بھری دکھائی دینے لگی۔ موتسارت اب یقیناً عظیم تھا اور اس کی موسیقی ہر طرف ہوا میں تھی۔ میرا دل چاہا کہ ایک پھیرا موتسارت کے گھر کا اور لگنا چاہیئے اور اس کی یادگاری اشیاء زیادہ غور سے دیکھنی چاہئیں، اور اس کے خطوں پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیئے، لیکن اول تو اتنا وقت باقی نہیں رہ گیا تھا، دوسرے شہزادے کی صحت ایسی نہیں تھی کہ اُسے مزید جسمانی مشقت دی جاتی۔ چنانچہ ہم نے قلعے کے نیچے واقع اُس میدان کا رُخ کیا، جہاں ہم لوگوں کو دو بجے جمع ہونے کے لئے کہا گیا تھا۔

زالس برگ، اس نام کا لفظی ترجمہ ہوگا، نمک کا قلعہ! اور اس شہر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس پورے علاقے میں نمک کی کانوں کی بڑی فراوانی ہے۔ زالس برگ کی تاریخ تیرہ سو برس پیچھے تک جاتی ہے۔ ساتویں صدی کے اوائل میں ایک قدیم رومی بستی کے کھنڈرات پر اس شہر کی بنیاد پڑی اور یہ اس وقت کے ایک مسیحی صومعے (MONASTRY) کے گرد آباد ہوتا اور پھیلنا شروع ہوا۔ اور ایک ہزار برس تک یہ شہر اساقفۂ اعظم (ARCHBISHOPS) کا دارالحکومت بنا رہا، جو مقدس سلطنت ... کے تحت طاقتور حکمراں شمار ہوتے تھے۔ مذہبی اقتدار کا صدیوں پر پھیلا ہوا یہ دور اس وقت ختم ہوا جب ۱۸۰۲ء میں ایک عہد نامے کی رو سے اس شہر کو دینی نظام کے تحت دے دیا گیا۔ مسیحی لاٹ پادریوں کے اس ہزار سالہ دورِ فرماں روائی کی نشانیاں اس شہر کی اسقفی (EPISCOPAL) عمارات اور امرائے شہر کے رہائشی محلات ہیں جن پر طاوس رینے ساں اور بارروق عہد کے اثرات خصوصیت کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان مذہبی فرماں رواؤں میں ایک لاٹ پادری وولف ڈیٹرش بھی تھا۔ جسے خوبصورت عمارتیں بنانے کا سودا تھا۔ چنانچہ اس نے رزیڈنس (شاہی رہائش گاہ) ... کا مشہور محل، دربار کا اصطبل، اور کاپوچینے کی پہاڑی خانقاہ جیسی عمارتوں کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لیا۔ لیکن نہ جانے بے چارے سے کیا خطا ہو گئی کہ شاہ پاپائے روم کے حکم سے گرفتار ہو کر شہر کے اونچے قلعے کے زنداں میں ڈال دیا گیا، جہاں پانچ برس کس مپرسی کی حالت میں گزارنے کے بعد وہ راہیِ ملکِ عدم ہوا۔ اس بدنصیب کی خطا شاید یہ ٹھہری ہو کہ اس نے شہر کی تزئین و آرائش کے لئے اتنے بڑے تعمیری منصوبے کیوں ... لئے کہ مقامی طور پر وصول ہونے والے ٹیکسوں کا بڑا حصہ بجائے روم پہنچنے کے عمارت سازی کے اس شوقِ فضول کی نذر ہو گیا۔ آج زالس برگ کا سارا حسن اسی خطاکار اسقفِ اعظم وولف ڈیٹرش کے ذوقِ جمال کا مرہونِ منت ہے جس نے اس شہر کو شمالی علاقوں کا "روم" بنانے کا خواب دیکھا تھا، اور جو انجام خواب دیکھنے والوں کا ہمیشہ ہوا کرتا ہے، وہی اس کا بھی ہوا تھا!

... جس سیاح اور جغرافیہ داں نے دنیا کے "تین خوبصورت ترین شہروں میں سے" ایک قرار دیا ہے، اس نے کچھ زیادہ غلط نہیں کہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گوتھک اور رینے ساں اور باروق اور روکوکو طرز ہائے تعمیر کے شاہکاروں کی جو انجمن اس شہر میں سجی ہے وہ کم ہی کسی دوسرے شہر میں دکھائی دے گی۔ اس عمارتی حسن و جمال کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بڑھ کر یہاں کا منظر دلکش ہے، جو اسے ایک پرستانی شہر بنائے دیتا ہے۔ یہ شہر ہر طرف پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک ... سبز پوش وادی میں واقع ہے جس کے وسط میں دریائے زالسخ انگریزی حرف 'S' کا سا خم بناتے ہوئے گزرتا ہے۔ شمال کی جانب کاپوچینے کی پہاڑی ہے جو شہر کے سرہانے ایک نگراں ماں کی طرح بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔ اور مغرب میں مونکس برگ (پادریوں کا پربت) ہے جس کی چوٹی پر ... زالس برگ کا قلعہ نیچے سے دیکھئے تو یوں لگتا ہے جیسے اس کا تعلق زمین سے کم اور بادلوں سے زیادہ ہو۔ جنوب مغرب میں پوری وادی کے نشیب پر اونٹرس برگ کا وہی پہاڑ سایہ فگن رہتا ہے جس کے کوہستانی راستوں پر سے گزر کر ہم یہاں آئے تھے، اور جس کے عقب میں عظیم آلپس کی ابدی برفوں والی بلوریں چوٹیاں یہاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک اور قدرے فروتر پہاڑی سلسلہ گائیس برگ کے نام سے اس شہر کے جنوب مشرق میں پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ شہر پہلے اس تیز رفتار دریائے زالسخ کے مغربی کنارے پر ہی آباد تھا، بعد میں اتنا بڑا اور نسبتہً نیا شہر دریا کے مشرقی کنارے پر بھی آباد ہو گیا، اور دریا پر باندھے ہوئے متعدد پل شہر کے ان دونوں حصوں کو آپس میں جوڑے رکھنے کا کام دینے لگے۔

زالس برگ کا یہ منظری اور تعمیراتی حسن ہی اسے دنیا کے شہروں میں ایک امتیاز اور انفرادیت بخشنے کے لئے کافی تھا۔ اس پر مستزاد اس شہر کی خوش نصیبی یہ ہوئی کہ اب سے تقریباً دو سو برس پہلے ایک ایسی شخصیت کا تعلق اس کے ساتھ قائم ہوا جو خود امر ہو کر اس شہر کو بھی امر کر گئی، اور اس کی شہرت اور دلکشی کو اس نے چار چاند لگا دیئے! ہمارے ہاں اگر کسی نے مغربی کلاسیکی موسیقی کے ضمن میں صرف ایک ہی نام سن رکھا ہو تو مجھے یقین ہے وہ موتسارٹ (MOZART) کا ہوگا، اس لئے کہ اپنے کام کی وسعت، ہمہ گیری اور قبول عام میں جو مرتبہ اور شہرت اس نے پائی ہے وہ دنیائے موسیقی میں اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ پھر موتسارٹ کا فن جتنا خواص کے لئے ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ عوام کے لئے ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے جن کے کانوں کی ایک اعلیٰ درجے کی موسیقی سننے کے لئے تربیت نہیں ہوئی، اور میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی نووارد کو مغربی کلاسیکی موسیقی کی چاٹ لگانا ہو تو اسے شروع

میں موتسارٹ کی جی مائنر میں سمفنی نمبر چالیس، اور اس کا ہر دلعزیز "آئینے کا ئینے نخت موزیک" (ایک چھوٹا سا شبانہ نغمہ ساز) سننا چاہیئے؛ اگر قدرت نے اسے اچھے سُروں سے متاثر ہونے کے لیے کان دیے ہوں گے تو وہ جلد یا بدیر اس موسیقی کے سحر تلے آکر رہے گا! موتسارٹ نے اسی شہر زالتس برک میں جنم لیا، اور اپنی مختصر زندگی کے چھتیس برسوں میں سے پہلے پچیس برس اُس نے اسی شہر میں بسر کیئے۔ وہ جن حالات میں یہ شہر چھوڑنے پر مجبور ہوا وہ اس موسیقار کے لئے کوئی باعث فخر نہ تھے اور اسی لئے اس نے پھر کبھی اس شہر میں واپس آنے کا نہ سوچا اور آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں ہی انتقال کیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جس شہر سے اُسے ایک دن بے آبرو ہو کر نکلنا پڑا تھا اب اُسی شہر میں سب سے زیادہ اُس موسیقار کی یاد منائی جاتی ہے۔ اس سے متعلق دو عجائب گھر بھی اس شہر میں موجود ہیں، اور اس کے نام سے منسوب ایک چوک میں اس کا مجسمہ بھی نصب ہے۔

زالتس برک کو زمانہ قدیم سے موسیقی سے ایک خاص نسبت چلی آتی ہے، اور اس کے کلیساؤں میں بجنے والی موسیقی کی تاریخ سات آٹھ صدیاں پیچھے تک جاتی ہے۔ پہلا اطالوی اوپیرا جو کوہستان آلپس کے شمال میں واقع علاقوں میں پیش کیا گیا وہ زالتس برک ہی کے شہر میں ۱۶۱۹ء میں سٹیج کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں مشہور آسٹرین شاعر اور تمثیل نگار ہوگو فان ہوف منستھال نے رچرڈ شتراس اور میکس رائین ہارٹ سے مل کر یہاں ایک فیسٹیول تھیٹر کمپنی قائم کی جس کے زیر اہتمام زالتس برک میں ہر سال ۲۶ جولائی سے ۳۰ اگست تک ایک جشن تمثیل منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر پورے یورپ سے اس جشن کے شائقین کھنچے چلے آتے ہیں خصوصیت کے ساتھ ہوف منستھال کا مشہور کھیل JEDERMAN (ہرکس) دیکھنے کے لئے جو ہر سال بڑی پابندی سے کیتھڈرل کے چبوترے اور سیڑھیوں پر کھیلا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ شہر میں متعدد دوسری جگہوں پر موسیقی کا ایک میلہ برپا ہوتا ہے جس میں کنسرٹ پیش کئے جاتے ہیں، آرکسٹرا اور چیمبر کی موسیقی کے مختلف شاہکار سننے کو ملتے ہیں، کلیساؤں میں دیوقامت ارغن نغمہ سرا ہوتے ہیں، اوپیرا اور مجالس رقص اور نجانے کس کس چیز کا اہتمام ہوتا ہے ——— اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ جشن کی ان ساری تقریبوں میں ایک چیز جو روح کی طرح جاری و ساری رہتی ہے وہ موتسارٹ کی موسیقی ہے!

موتسارٹ کون تھا؟ اور جرمن کلاسیکی موسیقی کی روایت میں اس کا مقام زمانی اور فنی اعتبار سے کہاں متعین ہوتا ہے؟ اس بارے میں چند ایک باتیں شاید اس ہلکی پھلکی سفری سرگذشت کے قاری کے لئے زیادہ بار خاطر نہ ہوں!

وولف گنگ اماڈیس موتسارٹ کا زمانہ اٹھارویں صدی کا نصف آخر ہے (جنوری ۱۷۵۶ء۔ دسمبر ۱۷۹۱ء)۔ وہ صرف چھتیس برس اس دنیا میں جیا، اور اتنی مختصر سی مہلت عمر میں اُس نے جو بڑے اور چھوٹے تخلیقی کام انجام دیئے اُن کا شمار چھ سو سولہ (۶۱۶) تک پہنچتا ہے۔ انسان ایک طرف اُس کے کاموں کی اس طویل فہرست کو دیکھتا ہے، اور دوسری طرف اُس کی کم عمری کو، تو یوں لگتا ہے کہ جیسے اپنی تخلیقی قوتوں میں وہ کوئی انسان نہیں، دیوتا، ایک اساطیری اور ماورائی وجود، جو اس مقصد سے زمین پر آیا تھا کہ موسیقی کے ضمن میں وہ انسانیت کو اتنا کچھ دے جائے جو اس کے لئے رہتی دنیا تک کافی ہو! موتسارٹ صرف تین برس کا تھا جب وہ پیانو کے سُر چھیڑنے لگ گیا تھا، اور اپنی آٹھ سالہ بہن کی نقل کر کے اس کا بجایا ہوا قطعۂ موسیقی ہو بہو دُہرا دیتا تھا۔ اس کی قوت سامعہ اتنی حساس تھی کہ وہ چار برس کی عمر میں اپنے بڑوں کو یہ بتلانے لگ گیا تھا کہ وائلن کا فلاں نوٹ سُر سے ایک چوتھائی ہٹا ہوا ہے۔ پانچ برس کی عمر میں وہ اعتماد اور پختگی کے ساتھ پیانو بجا سکتا تھا اور چھ برس کی عمر میں اس نے موسیقی کمپوز کرنا شروع کر دی تھی۔ دوسرے لفظوں میں، اس کے تخلیقی عمل کا آغاز ہو گیا تھا۔ فن کی دنیا میں ایسے پیش رس (PRECOCIOUS) عہدِ طفلی کی مثال شاید ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی۔

لیکن موتسارٹ کی زندگی کا یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ اتنی نادر صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہونے کے باوجود وہ کوئی اچھی قسمت ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔ یہ فنکار جو اپنی موسیقی کی صورت میں بنی نوع انسان کے لئے روح کی آسودگی اور اس کی مسرت و رفعت کا اتنا بڑا سامان چھوڑ گیا، خود اسے اپنی زندگی میں زیادہ مسرت، آسودگی اور عزت و وقار حاصل نہ ہو سکا اور اس کے ان چھتیس برسوں کا ایک بڑا حصہ دربدری، خستہ حالی اور ناقدر امرا کی ملازمت کرنے اور ان کے ہاتھوں ذلت اٹھانے میں گذرا۔ موتسارٹ کی اس کم نصیبی کے کئی اسباب تھے، اس کا ایک بڑا سبب تو اس کا عہد

تھا جس میں موسیقار کو بطور ایک فنکار معاشرے میں ابھی کوئی باعزت مقام حاصل نہیں ہوا تھا، اور وہ اپنی اور اپنے فن کی پرورش کرنے کے لئے طبقۂ امرا کی سرپرستی کا محتاج تھا۔ دوسرا اس کا ذمے دار ایک بڑی حد تک اس کا غریب، اور کوتاہ نظر (UNIMAGINATIVE) باپ بھی تھا، جو اپنے وقت کا ایک اچھا موسیقار ہونے کے باوجود زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے جب اپنے کمسن بچے میں ایک بڑے جینیئس کی علامات دیکھیں تو اپنی ذاتی محرومیوں کی تلافی کی خاطر اپنے بیٹے کی نادر الشال طفولیت کا بڑی بے دردی سے فائدہ اٹھایا اور موتسارٹ کو، جبکہ وہ صرف چھ ہی برس کا تھا، دنیا کے سامنے سٹیج پر پیش کر کے اور پھر اسے یورپ کے شاہان و امراء کے درباروں میں لے جا کر اس پر فنکارانہ ذمے داریوں اور سفر کی صعوبتوں کا ایسا بوجھ ڈالا جو بڑوں اور جوانمردوں کی کمر بھی دہری کر دے۔ اس کے نتیجے میں موتسارٹ اپنے اس سہ۔ نکھرے اور پُرحیرت بچپن سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا جو اس کی شخصیت کی تعمیر میں ایک قدرتی اور توانا بنیاد کا کام دے سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مزاج اور کردار میں کبھی بالغ نہ ہو سکا، اور نہ اس کی شخصیت میں وہ توازن اور خود اعتمادی پیدا ہوئی جو ایک صحتمند اور خوشگوار عہدِ طفلی گذارنے کے بعد انسان میں قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ موسیقی کو چھوڑ کر وہ زندگی کے کسی معاملے میں بھی اپنے آپ پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا، اور روزمرہ پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے مسائل میں رہنمائی کے لئے اپنے باپ سے رجوع کرتا تھا۔ روپیہ پیسہ خرچ کرنے کا اسے اتنا سلیقہ بھی نہیں تھا جتنا ایک اوسط ذہن کے انسان میں ہوتا ہے اور بڑی محنت سے کمایا ہوا پیسہ وہ فضول چیزوں پر خرچ کر کے پھر سے تنگ دست ہو جاتا۔ اسے اپنے دوستوں اور دشمنوں کی بھی پہچان نہیں تھی اور اپنے لئے زندگی میں وہ کبھی صحیح قسم کے دوستوں کا انتخاب نہ کر سکا۔ زالسبرگ کے ایک اور عجائب گھر "موتسارٹ میوزیم" میں ننھے موتسارٹ کی ایک تصویر آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس تصویر میں وہ پیانو پر بیٹھا ہے، اس کے سامنے بائیں ہاتھ اس کی بڑی بہن کھڑی ہے اور ان کی پشت پر اس کا طویل القامت باپ اپنے کندھے پر وائلن رکھے اسے بجا رہا ہے۔ موتسارٹ کی عمر اتنی چھوٹی ہے کہ پیانو پر بیٹھے ہوئے اس کے پاؤں زمین سے بہت اوپر بلندی پر لٹک رہے ہیں لیکن اس ننھے سے جسم پر جو چہرہ لگا ہے وہ ایک بڑی عمر کے ایسے انسان کا ہے جس کا ذہن تفکرات سے بوجھل اور جس کے اعصاب مسلسل تناؤ کی حالت میں ہیں۔ اپنے اثر کے اعتبار سے یہ ایک بھیانک تصویر ہے، اور اگر یہ اصل سے زیادہ ہی بولی نہیں ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس بچے پر زندگی نے کیسا ستم روا رکھا تھا اور اس کے نتیجے میں اس کی شخصیت کس طرح سے اینٹھ کر رہ گئی تھی۔

مغربی کلاسیکی موسیقی[*] کے شجرے میں اس کی جرمن شاخ سب سے توانا اور مرکزی خیال کی جاتی ہے، اور اس شاخ پر جو سدا بہار پھول کھلے ہیں ان میں سب سے نمایاں اور خوش رنگ پھول موتسارٹ ہے۔ اس روایت کے روشن جنے کا آغاز یوہن سیبسٹین باخ (۱۶۸۵–۱۷۵۰ء) سے ہوتا ہے، جو آج کی مروج موسیقی کا جدِ امجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور جس نے کلیساؤں میں بجنے والی ارغن موسیقی (ORGAN MUSIC) میں ایک اہم کام اپنے پیچھے چھوڑا ہے۔ پھر وائلن کے لئے اس کی ترتیب دی ہوئی موسیقی اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے آج بھی اتنی ہی تازہ اور ولولہ انگیز ہے جتنی وہ اڑھائی سو برس پہلے تھی، اور لندن، برلن، لائپزگ اور وی آنا کے ایوان ہائے موسیقی میں لوگ آج بھی اس کا وائلن کنسرٹ سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ باخ کا ہمعصر ایک اور اہم موسیقار فریڈرک ہینڈل (۱۶۸۵–۱۷۵۹ء) تھا، جو ابتدا میں کچھ عرصہ جرمنی میں رہنے کے بعد پہلے اٹلی اور پھر انگلستان چلا گیا۔ اس کا جرمن آقا جو پہلے ہنوور کا الیکٹر تھا، ایک عجیب تاریخی اتفاق سے جارج اول کا لقب پا کر انگلستان کا فرماں روا بن گیا۔ یہ بادشاہ اس موسیقار پر اس زمانے سے ناراض چلا آتا تھا جب ہینڈل اس کی مرضی کے بغیر جرمنی کو چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ چنانچہ جارج اول کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہینڈل نے اپنے ایک دوست کے مشورے سے اپنا مشہور نغمۂ آب (WATER MUSIC) ترتیب دیا اور ایک کھلی چاندنی رات میں دریائے ٹیمز کی لہروں پر بہتے ہوئے ایک

---

[*] آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مغربی کلاسیکی موسیقی میں بنیادی اہمیت اور رواج آلاتی (INSTRUMENTAL) موسیقی کو حاصل ہے۔ ناطق (VOCAL) موسیقی کی حیثیت وہاں ثانوی ہے، اور اس کا استعمال اب صرف اوپیرا میں ہوتا ہے جبکہ ہمارے ہاں برصغیر کی کلاسیکی موسیقی میں ناطق موسیقی کو آج بھی فوقیت حاصل ہے اور ہمارے ہاں تصور یہ ہے کہ اچھے گویے کی آواز کی جگہ کوئی ساز نہیں لے سکتا۔ میرے نزدیک آلاتی موسیقی اس اعتبار سے بہت وسیع اور لامحدود ہوتی ہے کہ سننے والا اپنے موڈ اور مزاجی کیفیت کے مطابق اس کے سُروں کی تعبیر ایک سے زیادہ طریقوں سے کر سکتا ہے:

شاہی بجرے میں اپنی یہ موسیقی سنا کر اس نے بادشاہ کا دل موہ لیا اور اپنے روٹھے ہوئے مربی کی عنایات پھر سے حاصل کر لیں۔ کھلی ہوئی اس موسیقی کو اگر آج بھی آسمان کے نیچے چاندنی رات میں سنا جائے تو یہ انسان کو اس بے کیف اور اکتا دینے والی زندگی سے بہت دور خواب و خیال کی دنیا میں لے جاتی ہے جہاں ہر وقت ایک نیلگوں جھٹپٹا چھایا رہتا ہے، اور پہاڑی جھرنوں سے گرتے اور جھاگ اڑاتے ہوئے آبشاروں کے پرشور نغمے، اور نیچے دھیمی چال سے بہتی ہوئی ندی کے کومل سُر باری باری سے انسان کو اپنی موسیقی کے سحر تلے لا کر اس پر ایک خود فراموشی طاری کر دیتے ہیں۔ باخ اور ہینڈل کے بعد باخ کے چار باصلاحیت بیٹوں کے نام آتے ہیں جو سب کے سب اپنے وقت کے اچھے موسیقار تھے۔ ان میں سب سے چھوٹے بیٹے کارل فلپ عمانوئیل باخ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے بعد آنے والوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ایک زمانے میں اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ جب صرف 'باخ' کا نام لیا جاتا تھا تو اس سے کارل فلپ عمانوئیل ہی مقصود ہوتا تھا اور اس کے بارے میں بیتھوون کا یہ جملہ مشہور ہے کہ "موسیقی میں کارل فلپ عمانوئیل باخ ہم سب کا باپ ہے۔" جرمن روایت میں اگلا بڑا نام فرانز جوزف ہیڈن (۱۷۳۲ء-۱۸۰۹ء) کا ہے جو آسٹرین نژاد تھا، اور مغربی کلاسیکی موسیقی میں اسے بجا طور پر 'بابائے سمفنی' کا لقب دیا جاتا ہے، اس لئے کہ موسیقی کی یہ صنف جسے آج ہم سمفنی کا نام دیتے ہیں، اپنی موجودہ صورت میں ہیڈن ہی کے ہاں تشکیل پائی تھی۔ موسیقی میں اس کا تخلیقی کارنامہ کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے بے حد وقیع ہے۔ ہیڈن کے بعد ہمارا یہ موسیقار وولف گنگ امادیس موتسارت (۱۷۵۶ء-۱۷۹۱ء) موسیقی کے افق پر طلوع ہوا اور اپنے فن کے نور سے ایک دنیا میں اجالا کر گیا۔ موتسارت نے اپنے عہد کی موسیقی میں ایک ایسی دلکشی (CHARM) اور آن (GRACE) پیدا کی جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ خصوصیت کے ساتھ سمفنی اور سوناٹا[1] کی اصناف کو جو اس سے پہلے بھی موجود تھیں، اس نے اپنے اسلوب خاص سے سنوارا اور نکھارا اور ان کے اندر جذباتی احساس کا کچھ مزید عنصر شامل کر کے، انہیں ایک غیر معمولی صوتی حسن کے ساتھ ساتھ گہرائی اور اثر آفرینی عطا کی۔ ہیڈن موتسارت کے بعد بھی زندہ رہا تھا، اس اعتبار سے یہ دونوں فنکار ہمعصر ٹھہرتے ہیں لیکن موتسارت نے بزرگ ہیڈن سے بہت کچھ اخذ کیا تھا، خصوصاً چہار آہنگ تانت (STRING QUARTET) کی موسیقی میں وہ اسے اپنا استاد تسلیم کرتا تھا۔ تاہم جب اس نے خود اس چہار آہنگ موسیقی میں اپنے وہ چھ شاہکار ترتیب دیئے جو اس نے اپنے استاد کے نام معنون کئے تو انہیں سن کر ہیڈن بھی دم بخود رہ گیا، اور موتسارت کے باپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "میں خدا کے سامنے اور پوری دیانت کے ساتھ تم سے کہتا ہوں کہ جتنے موسیقاروں کو میں جانتا ہوں یا جن کا نام میں نے اب تک سنا ہے، ان میں تمہارا یہ بیٹا سب سے بڑا موسیقار ہے۔" ہیڈن اور موتسارت دونوں بڑے اور سچے فنکار تھے، اور ایک دوسرے کی عظمت کا اعتراف کرنے میں وہ اپنے لئے کوئی عار نہیں سمجھتے تھے!

موتسارت کے بعد اب مغربی کلاسیکی موسیقی کے ایوان میں ایک ایسا شخص داخل ہوا جس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ بطور ایک فنکار اپنے مقام اور مرتبے سے خود بھی آگاہ ہے اور دنیا کو بھی اس سے آگاہ کرنے کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ وہ اس ایوان میں ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ بیٹھا اور مجمع کے درمیان اپنا راستہ بناتا ہوا اس کے شہ نشین تک جا پہنچا اور پھر پوری خود اعتمادی کے ساتھ اس پر متمکن ہو گیا ـــــ یہ لڈوگ ان بیتھوون[2] (۱۷۷۰ء-۱۸۲۷ء)

---

[1] سوناٹا (SONATA)، سمفنی (SYMPHONY) اور کنچرٹو (CONCERTO)، موسیقی کی ان تینوں صورتوں میں ایک بنیادی وصف مشترک ہے، اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک میں تین یا چار حرکات (MOVEMENTS) ہوتی ہیں۔ پہلی موومنٹ میں جو ذرا طویل ہوتی ہے، موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے اور اس میں ایک سے زیادہ سُر لگا کر ان کے درمیان ربط قائم کیا جاتا ہے۔ اس کی موسیقی عموماً گمبھیر اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ دوسری موومنٹ جو آہستہ خرام طول اور قدرے حزن آمیز ہوتی ہے زندگی کا ایک مختلف رُخ سامنے لاتی ہے۔ تیسری موومنٹ اس کے بالکل برعکس چنچل، خوش طبع اور رقص کا انداز لئے ہوئے ہوتی ہے۔ اور چوتھی اور آخری موومنٹ میں جسے فینالے FINALE کہا جاتا ہے، موضوع کو ایک بار پھر سمیٹ کر دہرایا جاتا ہے، اور یہ موومنٹ اکثر بہت وسیع، پرشور اور ہیجان خیز ہوتی ہے۔ موسیقی کی ان تینوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ جہاں سوناٹا میں سازوں کی تعداد ایک یا دو تک محدود ہوتی ہے (مثلاً پیانو، یا وائلن یا دونوں) وہاں سمفنی میں پورے آرکسٹرا سے کام لیا جاتا ہے جس میں سازوں کی تعداد ساٹھ سے لے کر ایک سو بیس یا اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ رہا کنچرٹو تو اس میں ایک خاص ساز (وائلن، پیانو، ویولا) پیش منظر میں رہتا ہے اور موسیقی کو LEAD کرتا ہے جبکہ پورا آرکسٹرا اس کے پس منظر میں رہتے ہوئے اس کا ساتھ دیتا ہے۔ چنانچہ جب وائلن کنچرٹو کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس موسیقی میں مرکزی رہنما ساز وائلن ہے۔

[2] BEETHOVEN کا جرمن تلفظ ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ میں نے دو تین جرمنوں سے اس کا صحیح تلفظ دریافت کیا تو جواب میں انہوں نے یہ نام کچھ اس طرح لیا: بے ٹ ہوون، بے ٹ ووِن، یا اس کے بین بین۔ میں نے خود عائد کردہ پابندی کے تحت اسے بیتھوون ہی لکھا ہے، آپ چاہیں تو اسے بیتھوون پڑھیں، یا اسے مشرقی جامہ پہنا کر بیٹھوون کر لیں۔ ایک بات کا البتہ خیال رہے کہ شروع کی آواز 'بے' ہے 'بی' نہیں ہے۔

تھا، جس کے فن کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اُس نے پہلی بار موسیقی میں انفرادی سوچ اور فکر کا عنصر داخل کیا، اور اپنے عہد کی تاریخی، سماجی اور جذباتی صورتِ حال کو اپنی موسیقی میں سمو کر اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ بیتھوون کے ساتھ موسیقی کا کلاسیکی دور اپنے خوبصورت انجام کو پہنچا، اور رومانی دور کی ایک شاندار ابتدا رہوئی، نیز اس کے ساتھ موسیقاروں کی غلامی اور بے چارگی کے اس دور کا بھی خاتمہ ہو گیا جو موتسارت کی زندگی کے آخری زمانے تک باقی رہا تھا۔ بیتھوون سے پہلے کے موسیقار اپنے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے امراء و اعیان کی سرپرستی، اور مشاہرے کی صورت میں اُن کی مالی اعانت کے محتاج ہوتے تھے، اور اُن کا کام اپنے آقاؤں کی تفریحِ طبع کے لئے موسیقی ترتیب دینا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ موسیقی کی انہی اصناف میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے جو اُن کے مالکوں کو پسند ہوتی تھیں۔ زالتس برگ کے لاٹ پادری نے جب وی آنا کا دورہ کیا تو موتسارت بھی اس کے عملے میں شامل تھا۔ وی آنا کے شاہی مہمان خانے میں، اس کی جو "قدر افزائی" ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے باپ کو ایک خط میں لکھتا ہے: "دربار کے دو خصوصی خدمتگار (VALETS) کھانے کی میز پر سب سے اعلیٰ نشستوں پر بیٹھتے ہیں۔ شکر ہے مجھے کم از کم اتنا شرف تو حاصل ہے کہ میں مطبخ کے باورچیوں سے ذرا آگے ایک بہتر نشست پر بیٹھتا ہوں۔" موسیقی کی تاریخ میں، اس زمانے کے حالات پڑھتے ہوئے کچھ اس طرح کا منظر ذہن میں آتا ہے کہ موتسارت کے زمانے تک ایک موسیقار امراء و اشراف کی مجلس میں رسائی پانے کے لئے اُن کے دروازے پر ڈرتے ڈرتے دستک دیتا ہے، اور وہ دروازہ کسی کے لئے کبھی کھلتا ہے اور کبھی نہیں کھلتا۔ جس خوش قسمت موسیقار کے لئے وہ دروازہ کھلتا ہے، وہ اس میں داخل ہو کر ایک طرف دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے، اس انتظار میں کہ ولی نعمت جب اور جیسی فرمائش کریں وہ حکم بجا لائے، اور اپنے فن کا مظاہرہ کرے۔ حالات اسی نہج پر چلے جاتے ہیں، تا آنکہ ایک دن بیتھوون منظر پر نمودار ہوتا ہے، اور آتے ہی پاؤں کی ایک ٹھوکر سے یہ دروازہ کھول دیتا ہے اور اندر داخل ہو کر اعلان کرتا ہے کہ میں آگیا ہوں، اور میں ایک فنکار ہوں جس کا مرتبہ تم جیسے بے ہنر اہلِ ثروت سے کہیں اونچا ہے، اس لئے تمہیں مجھ کو وہ عزت دینی ہوگی جس کا میں حقدار ہوں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ میں موسیقی، اپنے فن کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے ترتیب دوں گا، نہ کہ تمہارے دل بہلاوے کے لئے، اور تمہیں وہی کچھ سننا ہوگا جو میں تمہیں سناؤں گا، اس لئے کہ میرا ایک رؤیا (VISION) ہے اور زندگی کے بارے میں میرا اپنا نقطۂ نظر ہے جس کا اظہار میں اپنے سروں میں کرنا چاہوں گا۔ نیز موسیقی میں میں سارے روایتی قاعدوں کا غلام بھی نہیں ہوں گا۔ موسیقی کی گرامر اب وہ ہوگی جس پر میں اپنے سُر ترتیب دوں گا! ——— بیتھوون نے اپنی زبان سے شاید یہ الفاظ نہ کہے ہوں، لیکن اپنے رویئے اور طرزِ عمل سے اُس نے دنیا کو جو کچھ بتایا وہ یہی کچھ تھا اور اسی لہجے میں تھا۔ یہ واضح طور پر ایک ایسے فنکار کا لہجہ ہے جس نے اپنے اندر الوہی لمس کو محسوس کر لیا تھا، اور اسے اپنے اس منصب کا عرفان حاصل تھا جس پر فائز ہو کر وہ اس دنیا میں آیا تھا۔ یہ اُسی الوہی لمس کا شعور تھا جس نے اسے تقدیر (FATE) جیسی جابر قوت کا مقابلہ کرنے کا بھی عزم اور حوصلہ بخشا۔ وہ ابھی تیس برس کا تھا کہ کسی جسمانی عارضے کے باعث اس کی سماعت متاثر ہو کر ختم ہونی شروع ہوئی اور چند ہی برس میں حالت یہاں تک پہنچی کہ موسیقی کی دنیا کا یہ دیو کانوں سے بالکل بہرہ ہو گیا۔ اپنی فنکارانہ زندگی کے اتنے بڑے المیے پر پہلے تو وہ بہت غمگین، اور دل شکستہ ہوا، لیکن پھر جیسے اپنے اندر تخلیقی آگ کی تپش محسوس کرتے ہوئے اُس نے حالات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور یہ دعویٰ کیا کہ "میں اپنی تقدیر کا گلا گھونٹ دوں گا۔ وہ مجھ پر کبھی غلبہ نہیں پا سکے گی!" چنانچہ آگے چل کر جب اس نے اپنی عظیم پانچویں سمفنی مکمل کی تو ایک فتحمندانہ آسودگی کے لہجے میں کہا "تقدیر اب میرے دروازے پر دستک دے رہی ہے!" اس کے اس جملے کی مناسبت سے بیتھوون کی یہ محبوبِ عالم پانچویں سمفنی اب FATE SYMPHONY کہلاتی ہے۔

بیتھوون نے اپنے دور کی موسیقی میں رائج نفاستوں اور رسمی وضعداریوں اور رکھ رکھاؤ کو جوتی کی نوک پر مارا، اور موسیقی کو انفرادی جذبے اور احساس کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ انیس برس کا تھا جب فرانس کے انقلابی باستیل (BASTILLE) کے زندان خانے پر ہجوم کر کے آئے تھے، اور فرانس میں بادشاہت کا خاتمہ اور جمہوریت کا قیام اس کے ایامِ شباب کے واقعات ہیں۔ انقلابِ فرانس کے اثرات اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور ہالینڈ میں بھی پہنچے تھے، اور یوں پورے یورپ میں سیاسی اور مذہبی آمریت دم توڑنے لگی تھی، اور اس کی جگہ انسانوں کی آزادی، مساوات اور ملی

بھائی چارے کی تحریک چل پڑی تھی۔ بیتھوون نے اپنے عہد کے ان تغیرات سے بہت گہرا اثر لیا تھا۔ وہ انسانوں کی آزادی اور ان کی عالمی برادری کا ایک محکم شعور رکھتا تھا۔ حساس جب اس کے ہاں خوبصورت اور ہیجان خیز سُروں میں ڈھل کر نکلا تو دنیا کو ایک ایسی عظیم الشان موسیقی سننے کو ملی جس کی نظیر نہ بیتھوون سے پہلے اور نہ اس کے بعد کوئی پیش کر سکا۔ بیتھوون نے سمفنی کی صنعت میں کافی اہم اور دور رس اضافے کئے اور اسے شخصی اظہار کا وسیلہ بنا کر ایسی بلندیوں پر لے گیا جہاں اس کے بعد شاذ و نادر ہی کوئی فنکار پہنچ سکا۔ اُس کی آخری اور نویں سمفنی آفاقی موسیقی میں آج بھی حرفِ آخر سمجھی جاتی ہے اور اس کی ایک ایک موومنٹ اپنی وسعت، عمق اور فنکارانہ حسن و تاثیر میں موتسارت کی پوری پوری سمفنیوں پر بھاری ہے!

بیتھوون کے بعد موسیقی کی یہ جرمن روایت رومانی دور میں داخل ہو کر اپنا سفر جاری رکھتی ہے، اور شوبرٹ، شومان، مندلس سوہن، واگنر اور براہمس جیسے نشاناتِ راہ نصب کرتی ہوئی انیسویں صدی کے آخر تک چلی جاتی ہے۔

اس پوری روایت پر اگر آپ ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں موتسارت کا مقام بہت اہم اور نمایاں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ بیتھوون اس پوری روایت کا نقطۂ عروج قرار پاتا ہے۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھئے تو وہ اپنے اس مقام کے لئے دراصل ہیڈن اور موتسارت کا مرہون ہے۔ آج کی موسیقی کی پرشکوہ عمارت کے لئے ہیڈن نے بنیاد مہیا کی۔ اس پر موتسارت نے ایک خوبصورت منزل تعمیر کی، اور بیتھوون نے اس عمارت کو اور اونچا کر کے اس پر میکلانجلو کے گنبد جیسا ایک خوبصورت تاج رکھ دیا! بیتھوون کے بغیر موتسارت تو پیدا ہوا اور اس نے اپنی بے پناہ تخلیقی قوتوں سے کلاسیکی موسیقی کو مالا مال کر دیا۔ لیکن اس سے شاید کوئی بھی انکار نہ کر سکے کہ موتسارت کے بغیر بیتھوون پیدا نہیں ہو سکتا تھا!

موتسارت کی زندگی اور اس کے تخلیقی عمل کو اہلِ نظر دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور ۱۷۸۱ء سے پہلے کا ہے جس میں وہ زالتس برگ کے لاٹ پادری کے ہاں ملازم تھا اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنے میں وہ پوری طرح آزاد نہیں تھا۔ جب اس کے فن کی شہرت دوسرے ملکوں اور شہروں تک پھیلنے لگی تو اس کے باہر آنے جانے پر بھی پابندی لگ گئی۔ ۱۷۸۱ء کے آتے آتے موتسارت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کھلی فضاؤں کا یہ پنچھی دربار کے پنجرے میں پھڑپھڑانے لگا اور ایک دن اس کی زبان سے انجانے میں خدا جانے کیا بات نکل گئی کہ لاٹ پادری بہت چراغ پا ہوا اور اس کے لئے بدمعاش، بے ایمان، اور نیچ کے الفاظ استعمال کئے۔ اس پر موتسارت نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اور زیادہ دن نہ گذرے کہ اس نے دربار کے ایک افسرِ اعلیٰ کاؤنٹ کارل آرکو کے سامنے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس موقع پر ان دونوں کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوئی اور کاؤنٹ نے موتسارت کی کمر پر لات مار کر اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ زالتس برگ میں یہ موتسارت کا آخری دن تھا۔ اس کے بعد وہ اگر اس شہر میں کبھی آیا بھی تو ایک مہمان کی حیثیت سے۔ اس کی زندگی کے آخری دس سال جو وی آنا میں گذرے اس کی تخلیقی کارکردگی کے اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انہی برسوں میں موتسارت کے اسلوبِ موسیقی میں گہرائی اور معنویت ہوئی اور انہی میں اس نے اپنے وہ سارے بڑے شاہکار تخلیق کئے جن کی وجہ سے موسیقی کی دنیا میں اُس کا نام قیامت تک زندہ رہے گا!

اپنے اس آخری دور میں اُسے شہرت اور قدرشناسی تو نصیب ہوئی لیکن مالی طور پر وہ کبھی آسودہ اور بے فکر نہ ہو سکا۔ اُس زمانے میں لکھی ہوئی موسیقی کی اشاعت اور کاپی رائٹ کا کوئی رواج نہیں تھا، اس لئے ایک فنکار کو اپنی تخلیقات کا بہت ہی محدود صلہ ملتا تھا اور پھر اُن پر دوسرے لوگ بھی ہاتھ صاف کر لیا کرتے تھے۔ آخر عمر میں موتسارت اپنی روزمرہ ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنے دوستوں اور قریبی ساتھیوں سے قرض مانگنے پر مجبور ہوا۔ اور یہ تقاضے روز بروز مجنونانہ (HYSTERICAL) ہوتے چلے گئے۔ ایک طرف کام کی کثرت اور دوسری طرف روزگار کے تفکرات اور بیوی کی علالت کی وجہ سے اس کی صحت بگڑتی چلی گئی۔ آخر دسمبر ۱۷۹۱ء کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات کے نصف حصے میں اُس نے دم توڑ دیا۔ اُس کی زندگی کے المیے کی طرح اُس کی موت بھی ایک عجیب المیہ تھا، اس کی بیمار بیوی جو اس حادثے پر اپنے حواس کھو بیٹھی تھی، اس کے لئے ایک بہت ہی معمولی اور کم قیمت جنازے کا انتظام کر سکی۔ گنتی کے چند لوگ موتسارت کے جنازے کے ساتھ ہو لئے کر اس کے گرجے تک گئے، جہاں آخری دعا پڑھی گئی۔

اس بعد خدا جانے کیا ہُوا شاید باد و باراں کا کوئی طوفان آیا کہ وہ چند لوگ بھی تتر بتر ہو گئے، اور جنازہ جب قبرستان کی طرف روانہ ہُوا تو صرف ایک کتا اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ یہ عظیم موسیقار بالآخر سینٹ مارکس گرجے کے آنگن میں نادار لوگوں کی ایک مشترکہ قبر میں دفن ہُوا، جہاں نعش ندہی کے لئے اس وقت کوئی کتبہ یا نشان بھی نہ لگایا جا سکا! — آج موتسارت کی قبر کا کسی کو یقینی علم نہیں، اور جس جگہ کے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہاں موتسارت دفن ہے، وہاں ایک شکستہ ستون نصب ہے جس پر ایک غمزدہ اور سوگ کرتے ہوئے فرشتے کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

مغربی کلاسیکی موسیقی کی روایت اتنی پُرمایہ ہے کہ اس میں انسان دو یا تین موسیقاروں کا انتخاب کر کے اُن کے ساتھ اپنا پورا جیون بتا سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ابھی تک موتسارت اور بیتھوون کی قید میں ہوں۔ یہ دو تو میرے محبوب فنکار ہیں، لیکن ان کے جداگانہ اسلوبِ موسیقی کے باعث ان کے ساتھ میرا رویہ ایک جیسا نہیں ہے۔ مثلاً جب میں اپنی روزگاری مصروفیات سے تھک کر گھر آتا ہوں تو شام کو آرام کرسی پر دراز ہو کر موتسارت کی کوئی ہلکی پھلکی سمفنی لگا دیتا ہوں۔ موتسارت کی موسیقی میری تھکی ہوئی رُوح کو جھولا جھلاتی ہے، اسے لوری دیتی ہے اور انسانی جذبات کے پورے سرگم پر سے گذر جانے کے باوجود وہ میری روح میں تلاطم برپا نہیں کرتی، اسے جھنجھوڑتی نہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی موسیقی سنتے سنتے میں اپنے خیالوں میں کہیں دور نکل جاتا ہوں، یا کوئی کتاب یا رسالہ دیکھنے لگتا ہوں۔ موتسارت جو بنیادی طور پر ایک تفریح بہم پہنچانے والا (ENTERTAINER) ہے، اس کا قطعاً بُرا نہیں مانتا اور اپنے بیٹھے اور مدھر سُر بکھیرتا چلا جاتا ہے، انگریزی شاعر آر۔ ایس تھامس کے الفاظ میں:

THIS PLAYER WHO SO BEAUTIFULLY SUFFERS

FOR EACH OF US UPON HIS INSTRUMENT.

اس کے مقابلے میں بیتھوون کو میں صرف اُس وقت سنتا ہوں جب میں تازہ دم ہوتا ہوں اور ہر طرح کی فکروں سے آزاد ہو کر یکسوئی کے ساتھ موسیقی سننے کی صلاحیت اپنے اندر پاتا ہوں، اور میرے اندر اتنا حوصلہ ہوتا ہے کہ اپنی روح کے تاروں کو اس کی بے رحم انگلیوں کے حوالے کر دوں، وہ اس لئے کہ بیتھوون کی موسیقی سنتے ہوئے انسان کی رُوح اس تنکے کی مانند ہوتی ہے جو ایک طوفانی موج کے سینے پر سوار ہو۔ ابھی وہ پربتوں کی چوٹیوں پر ہوتی ہے اور ابھی ایک وادی کے پاتال میں۔ کبھی وہ نیاگرا کے پُر شور آبشار میں گھری ہوتی ہے اور کبھی اس کے گرد صحرا کا سکوت ہوتا ہے۔ بیتھوون کی سمفنی میں ایک لمحہ وہ ہوتا ہے جب پورا آرکسٹرا سننے والے پر ہر طرف سے ہجوم کر کے آتا ہے اور اُس کے حواس پر چھا جاتا ہے، اور دوسرے ہی لمحے پوری سمفنی وائلن کے ایک مہین تار پر اپنا توازن قائم رکھے ہوئے ہوتی ہے اور ایسی کومل اور مدھر آواز اس ایک تار سے نکلتی ہے جیسے دُور بَن کے اندر کوئی کوئل گا رہی ہو! پھر بیتھوون ایسا موسیقار ہے جو پوری توجہ اور انہماک چاہتا ہے۔ وہ اپنے سننے والے سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے اور اُس کے خیال کو اِدھر اُدھر بھٹکنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ روح میں ایک اضطراب اور ہیجان پیدا کرتا ہے اور اس کی کوئی سمفنی یا کنچرٹو سننے کے بعد انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک شدید اور عمیق روحانی تجربے سے گذرا ہے، اس نے ایک نیا جنم لیا ہے! — اس وجہ سے جہاں موتسارت کیلئے میرے دل میں محبت اور چاہت ہے، وہاں بیتھوون کے لئے مرعوبیت اور احترام ہے!!

اُس دن دو بجے جب سب لوگ پروگرام کے مطابق کاپیٹن پلاٹز میں پہنچ گئے تو طالب علم سیاحوں کا یہ سارا گروہ ہوہن زالتس برگ کے اُس قلعے کی سیر کو اوپر چڑھا جس کے بارے میں یہ امر مسلم ہے کہ وسطی یورپ میں یہ سب سے قدیم قلعہ ہے جو اپنے ساز و سامان اور زیبائش کے ساتھ پوری طرح محفوظ چلا آتا ہے۔ اس قلعے کی بنیاد تو بارھویں صدی کے آغاز میں لکڑی کے ایک مضبوط مورچے کی صورت میں پڑی لیکن بعد کے زمانوں میں اس پر اضافے ہوتے چلے گئے اور آج یہ جس حالت میں ہے اس سے لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ ایک چھوٹا سا فصیل بند شہر پہاڑی کی بلندی پر آباد ہو گیا تھا۔ جس میں محلات تھے، حمام تھے، اصطبل تھے۔ گھڑ سواری کی تربیت گاہ تھی، ہسپتال تھا، ایوانِ عدالت اور زندان اور تعذیب خانے تھے، کلیسا تھے اور اناج

کے گودام تھے۔ قلعے پر جانے کے لئے چڑھائی بہت پُر مشقت تھی۔ ذرا کچھ فاصلہ چڑھنے کے بعد ہمیں وہ لوگ بہت ہوشیار اور دور اندیش معلوم ہوئے جنہوں نے پیدل اوپر چڑھنے کی بجائے کیبل ریل (FUNICULAR) سے جانے کو ترجیح دی تھی۔ وہ لوگ کبھی کے اوپر پہنچ چکے تھے جبکہ ہمارا پیدل پسند گروہ آدھے راستے میں سانس لینے کے لئے ایک جگہ رکا ہوا تھا اور ہم ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلی دے رہے تھے کہ قلعہ دیکھنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان اس کے اصل اور تاریخی راستوں سے گذر کر اوپر جائے۔ اپنی آدھی جسمانی قوت راستے کی چڑھائی میں صرف کر چکنے کے بعد جب ہم اوپر پہنچے تو قلعے کے اوپر کے چند ایک حصے دیکھنے کے بعد ہی ہمارا حوصلہ جواب دے گیا اور ہم نے اس امر پر اتفاق کیا کہ اتنے بڑے قلعے کو دیکھنے کے لئے چند گھنٹے نہیں چند دن درکار ہوں گے۔

قلعے کے ایک بڑے سے کمرے میں پچھلی کئی صدیوں میں استعمال ہونے والے جنگی ہتھیار اور فوجی لباس عہد بعہد تاریخی ترتیب کے ساتھ آراستہ تھے۔ ان اشیاء کی نمائش اور ان کے بارے میں معلومات مہیا کرنے کا طریقہ اتنا مفصل اور دلچسپ تھا کہ اس پہلے ہی کمرے میں ہمارا ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اس کے بعد ہم دوسرے کمرے میں گئے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ وہاں اس قلعے کی پوری سیاسی تاریخ سے متعلق دستاویزات، عہد ناموں، صلح ناموں، احکام، اعلانات، سفارتی مراسلوں، جنگی رپورٹوں، نیز تاریخی کتابوں اور رجسٹروں کا ایک بیش بہا ذخیرہ اپنی اصل حالت میں محفوظ تھا۔ یہ کمرہ ایسا تھا کہ اس میں بیٹھ کر نہ صرف اس قلعے کی، بلکہ شہر زالس برگ کی کئی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ اپنی تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ مرتب کی جا سکتی تھی۔ اس کمرے میں میری دلچسپی کا بہت سا سامان تھا اور میں یہاں کچھ وقت لگانا چاہتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے یہ دیکھ کر مجھے وہیں چھوڑا اور خود آگے چل دیئے۔ جرمن زبان میں مجھے کچھ شد بد ہو چکی تھی، اس لئے میں نے ان صلح ناموں اور شاہی اعلانوں کی رسمی اور پُر تکلف عبارتوں کو پڑھنے اور ان کا مطلب اخذ کرنے میں کافی وقت صرف کر دیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے ان قدیم شاہی احکام و فرامین کا اسلوب چاہے وہ جرمن میں ہو، انگریزی میں یا کسی اور زبان میں، بہت گرویدہ کرنے والا لگتا ہے۔ میرے وطن (سابق ریاست بہاولپور) کے شاہی دربار سے اردو زبان میں ایک گزٹ "صادق الاخبار" کے نام سے نکلا کرتا تھا، اور اس میں میری خاص دلچسپی کی چیز وہ اعلانات اور فرامین ہوتے تھے جو ایک بھاری بھرکم مفرس و معرب زبان میں اس گزٹ کے صفحۂ اول پر شائع ہوتے تھے، اور ان میں مطلب کی اصل بات آدابِ شاہی کے زربفت و کمخواب میں لپٹی ہوئی اپنی بے چارگی کا ایک عجوبہ منظر پیش کرتی تھی ——!

ایک اور کمرہ جو اس کمرے سے متصل تھا، زمانہ جنگ کا کوئی کنٹرول روم لگتا تھا۔ اس کی دیواروں پر فوجی اہمیت کے نقشے آویزاں تھے۔ درمیان میں ایک میز پر محدب شیشہ، مسطر، قلمدان اور اس طرح کی دوسری اشیاء اور آلات تھے۔ اور کمرے کے ایک طرف کونے میں شیشے کی دیوار کے پیچھے قرونِ وسطیٰ کی جنگ کا ایک سہ ابعادی منظر بجلی کی بالواسطہ روشنیوں سے اس طرح منور کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی دیوتا ہے اور ایک بلندی پر بیٹھا نیچے انسانوں کو میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار دیکھتا ہے! ایک اور کمرہ جس کی طرف ہم نے اپنے ساتھیوں اور دوسرے سیاحوں کو بہت آتے جاتے دیکھا GOLDENE STUBE (سنہری حجرہ) کہلاتا تھا۔ محل کے اس کمرے کی تزئین و آرائش حیران کن تھی۔ کندہ کاروں نے ایک نادر قوتِ متخیلہ سے کام لیتے ہوئے اتنی باریکی اور نفاست اپنے عمل میں پیدا کی تھی کہ پورا کمرہ ایک جڑاؤ زیور کا سا تاثر دیتا تھا جس میں سرخ، نیلے اور سنہری رنگ اپنی جگمگاہٹ سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتے تھے۔ اس کمرے میں سب سے زیادہ جاذبِ توجہ چیز ایک کونے میں ایستادہ خوبصورت رنگین ٹائیلوں سے بنا، پانی گرم کرنے کا حمام تھا، جس کی اونچائی تقریباً چودہ فٹ تھی اور اس میں لگی ہوئی ہر ٹائیل پر روغن چڑھی منبت کاری (GLAZED RELIEF) کا بہت خوبصورت کام کیا گیا تھا۔ حمام کے نیچے کا بڑا مستطیل حصہ پتھر میں تراشے ہوئے آٹھ شیروں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ سامنے کے دو کونوں پر دو بڑے مسیحی ولیوں کی مورتیاں تھیں۔ حمام کے اوپر کے ہشت پہلو حصے پر رنگین منبت کاری میں مسیحی روایت کے بعض اہم واقعات کی تصاویر نقش تھیں۔ اس طرح یہ حمام قرونِ وسطیٰ کے فنِ ظروف سازی کا نقطۂ کمال تھا، اور اپنے زمانے کی ایک خاص ہنرمندی کا نادر آخری شاہکار رہا۔ —— ان تین چار کمروں کی سیر کے بعد ہمیں تھکن اور درماندگی نے آلیا، اور قلعے کی وسعت اور عظمت

کے سامنے ہمارے شوق سیاحت اور جذبۂ تجسس نے ہتھیار ڈال دئے۔ چنانچہ ہم اس کے بعد قلعے کے چند ایک دوسرے حصوں پر اچٹتی سی نظر ڈال کر باہر آ گئے اور گھاس کے تختے پر بیٹھ کر اپنی ہم جماعت امریکی لڑکی ڈوروتھی ولیمز کی زبان سے تاریخی عمارتوں اور قلعوں کے موضوع پر دلچسپ باتیں سننے لگے۔

قلعے سے نیچے اترنے سے پہلے ہم نے اس کے ایک کنارے پر جا کر نیچے شہر کو دیکھا تو اس منظر کے حسن کے سامنے ہم جیسے سانس لینا بھول گئے۔ بلندی سے دیکھنے پر ہر شہر خوبصورت لگتا ہے، لیکن زالٹس برگ اپنی تاریخی عمارتوں اور سبز اور بنفشی رنگ کی ڈھلواں چھتوں، گنبدوں اور نوکیلے میناروں کے ساتھ کسی مصور کے عمل کی طرح خوبصورت، متناسب اور مکمل دکھائی دیتا ہے، جس کے درمیان میں زالسخ دریا ایک بپھری ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتا ہوا، اپنے پانی میں آسمان کے رنگ کا عکس لئے یوں بہتا جاتا ہے جیسے کوئی چھوٹی سی ندی ہو۔ ہم کافی دیر قلعے کی اونچائی پر محلوں اور تھیٹروں اور کلیساؤں کے اس شہر کا خوبصورت عکس آنکھوں کی راہ سے اپنے ذہن کے پردے پر بٹھاتے رہے، اور اس کے بعد ایک آسودہ روح لیکن تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ ڈھلوان اور خمدار راستوں سے نیچے اترنے لگے۔

اب شام ہو چلی تھی اور اس شہر سے ہماری واپسی کا وقت زیادہ دور نہیں تھا۔ قلعے کے نیچے، اس کے عین قدموں میں ہمیں ایک چھوٹا سا قبرستان نظر آیا اور ہم اس میں چلے گئے۔ یہ قبرستان کیا تھا، ایک قطعۂ چمن تھا یا پھولوں کی نرسری! بھیگے اور نکھرے ہوئے گھنے سبزے کے درمیان سفید، نارنجی اور بھورے پتھر کی خوبصورت قبریں بنی تھیں، جن کے سرہانے سنگ مرمر کے کتبے ایستادہ تھے اور ان پر تصویریں لگی تھیں۔ قبروں کی سلوں پر پانی کے پیالے رکھے تھے۔ کہیں کہیں ٹائم پیس گھڑیاں بھی موجود تھیں اور ان پر بجلی سے جلنے والی چوشیشہ قندیلیں نصب تھیں۔ مغربی جرمنی کے صوبہ بواریا اور اس سے متصل زالٹس برگ کے علاقے میں رومن کیتھولک مذہب کا غلبہ ہے اور اس مذہب کے ماننے والے اپنے مرنے والوں کو بہت یاد کرتے ہیں اور ان کا خیال کبھی دل سے نہیں نکالتے۔ ان کے بارے میں شاید یہ لوگ اس طرح کا اعتقاد بھی رکھتے ہوں کہ ان عزیزوں کی روحیں ان قبروں پر منڈلاتی رہتی ہیں، اور اگر قبروں کے ارد گرد سبزہ اور پھلواڑی ہو، پینے کا پانی بھی رکھا ہو، وقت دیکھنے کے لئے گھڑی بھی موجود ہو تو وہ اپنے گھر کی سی آسودگی محسوس کرتی ہیں۔ قبرستان کی اس رونق، تر و تازگی، مہک اور خوبصورتی کو دیکھ کر میں نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا "اگر مجھے یقین ہو کہ میں مرنے کے بعد اسی قبرستان میں دفن کیا جاؤں گا تو میں اسی وقت مرنے کے لئے تیار ہوں!" میرے ساتھیوں نے میرے اس خیال کی تائید کی اور اتنی اچھی بات کرنے پر مجھے داد دی۔ اگر یہی جملہ، میں نے دل میں سوچا، کسی بڑے اور مشہور آدمی کی زبان سے نکلا ہوتا تو قابل روایت مقولہ (QUOTABLE QUOTE) بن کر کتابوں میں نقل ہوتا، لیکن اب؛ ایک معمولی اور گمنام انسان کے منہ سے نکل کر یہ ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا ——— ساری خرابی دراصل معمولی اور گمنام ہونے میں ہے!

قبرستان سے باہر نکلتے ہی قریب آئس کریم کی ایک چھوٹی سی دوکان تھی۔ ہم آئس کریم کھانے کے لئے وہاں چلے گئے، اور اسی لمحے ہماری ہم جماعت ایرانی لڑکی پروانے بھی وہاں آ نکلی۔ ہم سب نے آئس کریم کا ایک ایک کپ لیا اور اس شہر زالٹس برگ کے بارے میں اپنا اپنا خیال ظاہر کرنے لگے۔ پروانے جنوبی ایران کے علاقے اہواز کی ایک سانولی سلونی لڑکی تھی جو صرف فارسی زبان جانتی تھی اور جرمن پہلی مغربی زبان تھی جس کی تعلیم وہ یہاں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں حاصل کر رہی تھی، لیکن اس کے گھرانے میں کبھی امارت یا سرداری ضرور رہی ہوگی کہ اس لڑکی کی شخصیت اور طور طریقے میں ایک ملکہ کی سی آن بان تھی۔ اسے میں جب بھی دیکھتا مجھے یوں لگتا جیسے وہ انگریزی لفظ GRACE کی ایک چلتی پھرتی تعبیر ہو۔ لمبے کھلے ہوئے سیاہ بالوں والی، نکلتے ہوئے قد کی یہ لڑکی انسٹی ٹیوٹ کے ہجوم میں دور سے پہچانی جاتی تھی ——— جب آئس کریم ختم ہو گئی تو سب کی طرف سے پیسے دینے کیلئے میں دکاندار کی طرف متوجہ ہوا، پروانے نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا، کہ پیسے وہ دے گی۔ میں نے اس کی پیش کش کو نظر انداز کرنا چاہا تو وہ روٹھ کر تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو چل دی۔ میں بھاگ کر اس کے پیچھے گیا اور اسے منا کر واپس لے آیا۔ اہواز کی اس گندم گوں شہزادی کے ہوتے ہوئے آئس کریم کا بل کوئی دوسرا ادا کرتا ——— یہ کیسا ابراہ ہونے لگا تھا!

واپسی کے سفر میں شہزادہ کافی علیل اور کسلمند دکھائی دیتا تھا۔ جرمنی میں آکر اُسے دراصل خون کے دباؤ کی کمی کی شکایت رہنے لگی تھی، اور جب بھی اُسے یہ تکلیف ہوتی، اُس کا جسم ڈھیلا پڑ کر نقاہت کا شکار ہو جاتا، اور اُس کی بینائی بھی اس سے متاثر ہونے لگتی۔ بس میں اسے شیخ نے سہارا دے رکھا تھا اور اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ میں اپنے ان دو ساتھیوں سے کچھ فاصلے پر بس کے عقبی حصے کی ایک نشست پر بیٹھا تھا، دن بھر کی تھکن سے چور اور اپنے ذہن میں نئے شہزالنس برگ کی رنگ آمیز دنیا بسائے ہوئے۔ لیکن جب بھی شہزادے کی طرف دھیان جاتا، تصورات کا وہ سارا سلسلہ ٹوٹ جاتا، اور میں سوچنے لگتا کہ اٹھ کر شہزادے کے پاس جا بیٹھوں اور اُس کی خدمت اور دیکھ بھال میں شیخ کا ہاتھ بٹاؤں لیکن پھر اندر سے کوئی چیز مجھے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھتی، اور اس کے لئے طرح طرح کے جواز مہیا کرتی "تم محض وضعداری نبھانے کے لئے ایسا کرنا چاہتے ہو جس کی قطعاً ضرورت نہیں، شہزادہ اس وقت بہتر ہاتھوں میں ہے۔ تم یہ کام کبھی ڈھنگ سے نہیں کر سکو گے، اور اسے خواہ مخواہ ایک بہتر خدمت سے محروم کر دو گے۔" بس اب آنوبان کے اس حصے سے گزر رہی تھی جو اس علاقے کی بڑی اور مشہور جھیل کیم سے کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے۔ موسم اگر اچھا ہوتا تو یہاں جمعہ کی شام سے ہی آخر ہفتہ کی چہل پہل شروع ہو جایا کرتی تھی، لیکن اس دن بہت کم لوگ اس جھیل کے کناروں پر دکھائی دیتے تھے۔ شام کا نور جھٹپٹا اب دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں تحلیل ہو رہا تھا اور بس کے شیشے میں بجائے باہر کے منظر کے اب مجھے ایک ایسے آدمی کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا جو کسی اندرونی کشمکش سے دوچار تھا اور اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

آخن میوٹ پہنچ کر ہم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائننگ ہال کی میزوں پر بکھری ہوئی اُس دن کی ڈاک میں سے اپنے خط تلاش کرنے لگے۔ میں نے آہستہ آہستہ شہزادے کے قریب جا کر اُس سے اس کی طبیعت کا حال پوچھا، تو وہ دل کا غبار نکالے بغیر نہ رہ سکا۔ نگاہیں نیچی کئے خطوں کو ٹٹولتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم کیا کرو گے میری طبیعت کا پوچھ کر؟ تمہیں کبھی کسی کی پرواہ ہوئی ہے؟ کوئی جئے یا مرے! — تمہیں تو صرف اپنے آپ سے پیار ہے!"

یہ کہہ کر اس نے گھوم کے میری طرف دیکھا، غالباً میرا ردعمل معلوم کرنے کے لئے، اور اس کے ساتھ ہی اس کے ماتھے پر پڑی ہوئی سلوٹیں غائب ہو گئیں، اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو گیا اور ایک مہر بھری مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ "لیکن دیکھ لو" وہ کہنے لگا "کہ اس کے باوجود ہم تمہارے ساتھ وفا کا رشتہ نبھائے جاتے ہیں۔"

شہزادے کا دل بہت بڑا تھا اور اپنے دوستوں کی ان کوتاہیوں پر وہ زیادہ کڑھنے والا نہیں تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن ایک جملہ جو میرے متعلق اُس کی زبان سے نکل گیا تھا، میرے دل میں کھُب کر رہ گیا اور میں اس کے بارے میں کئی دن تک سوچتا رہا۔ شاید اُس کا مشاہدہ میرے بارے میں صحیح تھا یا شاید پوری طرح صحیح نہیں تھا اور اس نے بے خیالی میں ایک بات کہہ دی تھی کون جانے؟ — ایک چیز البتہ میں نے ضرور محسوس کی کہ وہ شہزادے کی طرح کے دوست ہی ہوتے ہیں جن کے اُجلے من کے آئینے میں انسان اپنا اصل چہرہ دیکھ سکتا ہے!

(مسلسل)

باہر رات ہے (خانہ بدوش)

مستنصر حسین تارڑ

آسمانوں پر محیط سنہری کونج پرواز کر چکی تھی اور اس کی جگہ ایک سفید چمکتا آسمان تھا، تیز دھوپ تھی۔

"ہیلو مسٹا نسر" ہرات سے ایرانی سرحد تک جانے والی ویگن کے باہر لیزا کھڑی تھی۔ میں نے برابر کی خالی نشست پر نگاہ ڈالی اور باہر آگیا۔

"بخار ہے کیا؟" اس کی چوبی انگلیاں میرے گال پر ثبت ہو گئیں۔ "تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟"

"میں نے اس کائنات کے پہلے طلوعِ آفتاب کو ننگی آنکھوں سے دیکھا ہے اس نئے ...... اور دیکھو اب وہاں روشنی ہے۔"

"کہاں؟" اس کے چہرے سے تحیّر کی کونپل پھوٹی۔

"وہاں" میں نے شہر سے فرار ہوتی ہوئی سڑک کا راستہ روکے کھڑی بھوری پہاڑیوں کی طرف دیکھا

"تم یقیناً میری کی طرح افغانی چرس کے کش لگاتے رہے ہو۔" وہ ایک پشیمان سی ہنسی ہنس دی "دیکھو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے ..... اور جو کچھ میں تم سے کہنا چاہتی ہوں اسے سن کر تم مجھ سے فیڈ اپ ہو جاؤ گے۔"

"کہاں تک؟"

"یہاں تک" اس کی ہتھیلی ایک مکانکی سپاہی کی طرح سیلوٹ کرتی ہوئی سینے پر جم گئی "لیکن ..."

"تم نے میرے ہمراہ سفر کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"

"ہاں ... اور مجھے افسوس ہے۔" اس نے نظریں نیچی کر لیں "تم سمجھتے ہو ناں کہ میں میری کو اس طرح نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے جو میرے سہارے کے بغیر یہیں کہیں مشرق میں گم ہو جائے گا مر جائے گا۔"

"ہاں میں سمجھتا ہوں لیزا ..." میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا "خدا حافظ .... اور خوش نصیبی تمہارے ساتھ ہو۔"

"مجھے خوش نصیبی کی کیا ضرورت ہے" وہ اپنے سیاہ پیراہن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تلخی سے بولی "میسر نہ ہو تو میں اس کی قیمت ادا کر کے خرید بھی سکتی ہوں ....." اس نے جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے اور سر جھٹک کر چلی گئی۔

افغان دکاندار نے کہا تھا، لیزا تو ایک عام سی امریکی لڑکی ہے خان زمان کی پوستین کے لئے تو الو بھی بیٹھ بھی ..... لیزا واقعی ایک عام سی امریکی لڑکی تھی۔ وہ بازار کے درمیان میں چل رہی تھی اور خان زمان کی سیاہ پوستین اس کے نیم رضامند جسم کے ساتھ بڑے وحشیانہ انداز میں لپٹتی چلی جا رہی تھی۔

بتفارہ مدرسے کے سربریدہ میناروں سے بجھ پر اپنا ہیئت کے نیلے لشکارے ڈالے کہ ان کی نیم شکستہ نیلی ٹائلیں دھوپ میں چمک رہی

تھیں اور ہماری ویگن دھول اڑاتی ہوئی اُن میں سے گذر گئی۔ ایران سے آنے والے سیاحوں پر شہر ہرات کے پہلے راز انہی میناروں کے پڑتے ہیں۔ میناروں سے پرے کوٹھریوں کے ایک ڈھیر میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور اُن کے باہر چند آسودہ مزاج گدھے منہ اُٹھائے سڑک کی جانب دیکھ رہے تھے۔ جیرلڈ ایئرکنڈیشنڈ ہوٹلوں کی راحت چھوڑ کر یہیں کہیں کسی کچی کوٹھڑی میں سنہری کونج کے پروں میں مُنہ دیے سو رہا تھا۔

ہرات سے باہر نکلتے ہی سائیکل سواروں کا ایک جوڑا ہمارے ساتھ ہو لیا۔ مشقت کرتے ہوئے جسم پسینے سے چمک رہے تھے اور وہ اپنے پہیوں پر ایک ایسی سُنڈی کی طرح کبڑے ہو رہے تھے جسے تنکے سے چھوا جائے تو وہ اپنا درمیانی دھڑ فوراً اوپر اٹھا کر وہیں جم جاتی ہے۔ ہالینڈ کے رہنے والے اس جوڑے سے یہ میری پہلی ملاقات نہ تھی۔ سید خاں کی بس کا ٹائر پنکچر ہونے پر جب ہم قریبی پہاڑی سلسلے پر جا براجمان ہوئے تھا اُس روز پہلی مرتبہ میں نے انہیں اپنے نیچے پھیلی طویل سڑک پر دو نقطوں کی صورت میں رینگتے دیکھا تھا۔ پھر صحرائے مرگ کے ایک قہوہ خانے میں اُن سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں میاں بیوی سنگاپور سے ہالینڈ تک سائیکلنگ کر رہے تھے۔ وہ پاکستان کے بارے میں بے حد شاکی تھے کہ وہاں ایک علاقے میں سے گذرتے ہوئے ایک باریش بزرگ کی قیادت میں لوگوں نے خاتون کی اس "بے حیائی" پر اُس پر پتھر مارے کہ وہ چادر اوڑھ کر سائیکلنگ کیوں نہیں کرتی، نیکر اور ٹی شرٹ کیوں پہنے ہوئے ہے۔ اُسے یوں نیم برہنہ دیکھ کر پورے ملک کا اخلاق خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ نیم خواندہ افغانستان انہیں پسند تھا جس کے وسیع صحراؤں میں وہ تن تنہا سفر کرتے رہے اور کسی نے اُن کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ایک جگہ چڑھائی شروع ہوئی تو وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر ویگن سے پرے ہو گئے اور سائیکلوں سے اُتر کر انہیں بلندی کی طرف دھکیلنے لگے۔

ہرات سے دو گھنٹے کی مسافت پر اسلام قلعہ کی سرحدی چوکی تھی جہاں پر ویگن ڈرائیور نے ہمارا سامان چھت سے اتارا اور کسٹم ہاؤس کے ایک بوسیدہ کمرے میں ڈھیر کر دیا۔ کسٹم افسر صاحب چونکہ ابھی ناشتہ کرنے میں مصروف تھے اس لیے حکم ہوا کہ آپ لوگ اتنی دیر میں وہ سامنے جو خیمہ ہے اُس میں براجمان ہیلتھ افسر سے اپنے ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر مہر ثبت کروا لیں۔ ہیلتھ افسر شلوار اور بنیان پہنے ایک بینچ پر بیزار بیٹھا تھا اور اس کے آگے میز پر رنگ برنگی دوائیوں کی شیشیاں بکھری پڑی تھیں۔ وہ ہر ایک کے ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر ایک [illegible] نظر ڈال کر مہر لگا دیتا۔ البتہ جونہی کوئی پاکستانی سامنے آتا اُسے خیمے کے ایک کونے میں کھڑے ہو جانے کا حکم دے دیا جاتا۔ جب دیگر قومیتوں کے سیاح فارغ ہو کر خیمے سے باہر نکل گئے تو اُس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انتہائی بیزاری سے کہا، "تمہارے سرٹیفکیٹ نامکمل ہیں۔ ان پر ٹی بی کے ٹیکوں کی مہریں نہیں ہیں۔"

"لیکن جب میں طورخم کے راستے افغانستان میں داخل ہوا تھا تو اس بارڈر پر تو اس سرٹیفکیٹ پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔" میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"مجھے اعتراض ہے۔" اُس نے یکدم گرج کر کہا۔ "آئی ایم ہیلتھ آفیسر۔"

"لیکن جناب...... میں ابھی ایک انتہائی عاجزانہ قسم کی گفتگو کا آغاز کرنے کو تھا کہ اُس نے باہر کھڑے سپاہی کو اشارہ کیا اور اُس نے ڈنڈا لہرا کر ہم سب کو خیمے سے خارج کر دیا۔

صورت حال تشویشناک تھی۔ ہیلتھ سرٹیفکیٹ پر مُہر کے بغیر ہم سرحد عبور نہیں کر سکتے تھے۔ سارے پاکستانی بھائی بندھے ہوئے کھسر پھسر کر رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ ان میں سے بیشتر لوگ نوکریوں کی تلاش میں جلا وطن ہوئے تھے اور سفر کے دوران ذرہ برابر قانونی یا غیر قانونی دشواری بھی انہیں ہراساں کر دیتی تھی۔ فیصلہ ہوا کہ ہم میں سے ایک شخص ہمت کر کے دوبارہ اندر جائے اور افسر صاحب سے اس مشکل کو حل کرنے کا طریقہ دریافت کرے۔ مجھے اس مشن کے لیے متفقہ طور پر چن لیا گیا۔ میں اندر جانے کے لیے ابھی کمر کس رہا تھا کہ ملیشیا کی شلوار قمیض میں ملبوس ایک وجیہہ نوجوان نے جھجکتے ہوئے مجھ سے کہا "صاحب میرا نام غلام محمد ہے۔ مجھے بھی لے چلو۔ پشتون ہوں اور فارسی میں بات کر سکتا ہوں۔"

خیمے کے اندر داخل ہوتے ہی افسر صاحب گرجنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ میرے ساتھی نے انتہائی لجاجت سے فارسی میں کوئی داستان شروع

کردی۔ اُدھر سے کوئی سخت سا جواب آیا کیونکہ غلام محمد کا منہ لٹک گیا۔

"کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کہتا ہے کہ ٹی بی کے ٹیکوں کے بغیر آپ سرحد عبور نہیں کر سکتے، اس کا واحد حل یہ ہے کہ آپ سب کو ٹیکے لگائے جائیں گے......"

"تو لگوا لیتے ہیں۔"

"چار مرتبہ لگیں گے" غلام محمد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہر ہفتے کے بعد، یوں پورا کورس ایک ماہ میں مکمل ہوگا اور یہ عرصہ ہمیں کسٹم ہاؤس سے باہر واقع خاردار تاروں میں گھرے کرنطین کیمپ میں گذارنا ہوگا...."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے ہراساں ہو کر کہا۔

"ہو سکتا ہے" غلام محمد آرام سے بولا "افغانستان ہے بابا..... اور کہتا ہے کہ ایک ماہ بعد آپ بے شک ہنسی خوشی سرحد عبور کر جائیے گا۔"

"ایک ماہ؟" میں نے سراسیمگی کا تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی "یہاں اس ویرانے میں؟ واپس پاکستان جانا پڑے گا۔"

"کہتا ہے واپس بھی نہیں جا سکتے۔"

"پھر؟"

"پھر آپ باہر چلیں، میں دوبارہ کوشش کرتا ہوں۔"

ایک طویل وقفے کے بعد ایک مسکراتا ہوا غلام محمد باہر آیا اور مخلوق کے سوکھے حلقوں اور کپکپاتی انگلیوں کو نوید دی کہ صاحب کہتا ہے میں ابھی تمام ٹیکے لگا کر مہر لگا دیتا ہوں البتہ اس رعایت کے لئے سو افغانی فی کس ٹیکوں کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔ ہم اطمینان کے گہرے سانس لیتے ہوئے خیمے میں داخل ہوئے۔ شتابی سے سو سو افغانی صاحب کی ہتھیلی پر رکھے، وہ آستینیں چڑھا کر بازو آگے کر دیئے۔ صاحب نے اپنی زنگ آلود سرنج میں کوئی رنگدار شے بھری، ہمارے بازوؤں کی جانب دیکھا اور پھر اُسے میز پر رکھ کر ہمارے سرٹیفکیٹوں پر مہریں لگا دیں۔

"اور ٹیکے؟"

"تم سب خاصے صحت مند ہو، تمہیں ٹی بی نہیں ہو سکتی۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"لیکن اگر کسی نے اعتراض کیا تو؟"

"آئی ایم ہیلتھ آفیسر" وہ گرج کر بولا۔

ہم اپنے سرٹیفکیٹ سمیت کر فوراً باہر آگئے۔ کسٹم ہاؤس میں پہنچے تو ہمارا سارا سامان پڑتال کے بعد ویگن کی چھت پر باندھا جا چکا تھا۔ غلام محمد نے ازراہِ شکایت کسٹم آفیسر سے کہا کہ ہیلتھ آفیسر نے بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے اور ہم سے ناجائز طور پر سو سو افغانی وصول کر کے مہر لگائی ہے۔

"بہت بُرا آدمی ہے، بہت بُرا۔" اس نے ایک چوڑی مسکراہٹ کو گالوں تک پھیلایا "میرا خیال ہے میں تمہارا سامان دوبارہ چیک کروں اُس میں سے ضرور کوئی قابلِ اعتراض شے برآمد ہو جائے گی۔"

میں نے غلام محمد کو اشارہ کیا اور ہم دونوں جلدی سے باہر آ کر ویگن میں سوار ہو گئے۔ اِدھر ہماری ویگن اسلام قلعہ کی عمارت سے نکل رہی تھی اور اُدھر ہی سائیکل سوار جوڑا سیٹیاں بجاتا ہوا کسٹم ہاؤس کے اندر داخل ہو رہا تھا۔

ایرانی سرحد پر طیب آباد کے دھول آلود قصبے کی بجائے اب ایک نیا نکور شیشے اور المونیم کا بنا ہوا وسیع کسٹم ہاؤس تھا جہاں پاسپورٹ اور چیکنگ کے مراحل بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ کسٹم ہاؤس کے شوکیسوں میں وہ سوٹ کیس، جوتے، ٹائر اور مختلف اشیا بھی سجی تھیں۔

جن میں چرس وغیرہ چھپا کر سمگل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان شو کیسوں کے اوپر سمگلر حضرات کی تصاویر آویزاں تھیں، اور اُن پر بڑے حروف میں قومیت درج تھی۔ فرطِ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس شعبے میں ہم ایک مثالی ملک بن کر ابھرے تھے۔ بیشتر تصاویر اپنے پاکستانی بھائیوں کی تھیں۔ دس شو کیسوں میں سے سات پر ہمارے پیارے ملک کا نام جگمگا رہا تھا یعنی ساری دنیا ایک طرف اور ہم ایک طرف۔ اللہ کرے زورِ...

کسٹم ہاؤس کے باہر مشہد جانے والی ہوائی جہاز نما بس کھڑی تھی۔ کنڈکٹر بے حد رقیق القلب واقع ہوا تھا، چنانچہ اُس نے ہر مسافر سے، اُس کی حیثیت کے مطابق کرایہ وصول کیا جو معمول سے دگنا تھا۔ مسافروں میں سری لنکا کی رہنے والی ماں بیٹی بھی شامل تھیں جو مدراس سے یہاں تک مسلسل سفر کرتے کرتے اتنی چکرا چکی تھیں کہ ہر بات پر کہتیں "بھائی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہم جا رہے ہیں کہ آ رہے ہیں"۔ قدوقامت اور چہرے میں ایک دوسرے سے اتنی مشابہ تھیں کہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ کونسی ماں ہے اور بیٹی کونسی ہے۔ چنانچہ ایک سرسری سی نشانی یہ تھی کہ اگر ان کی طرف دیکھا جائے تو جو مسکرائے گی وہ بیٹی ہوگی اور.... ظاہر ہے دوسری ماں ہوگی۔

اُسی شام ہم مشہد پہنچ گئے۔ تہران کے لئے بس سات بجے روانہ ہوتی تھی، ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اپنی نشست مخصوص کروائی، سامان لگیج کمپارٹمنٹ میں رکھا اور اڈے سے باہر آ گیا۔

ایک مرتبہ پھر میرا رُخ اُن نیلے گنبدوں اور میناروں کی جانب تھا جن کے سائے تلے ایک ایسی ہستی محوِ خواب ہے جس کے دم سے ایران سانس لیتا ہے، زندہ ہے۔ ہم ایسے لوگ تو کائنات کی ناقابلِ فہم وسعت میں خوردبین سے بھی نظر نہ آنے والے جرثومے ایسی زندگی رکھتے ہیں۔ ہم شہروں کی جانب جاتے ہیں کہ اُن میں آباد ہو سکیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے سامنے خود کائنات سمٹ کر جرثومہ بن جاتی ہے۔ شہر ان کی طرف آتے ہیں تاکہ خود کو آباد رکھ سکیں۔ بلخ کے ایک بزرگ خواب میں دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اُن سے مخاطب ہیں "میرا جسدِ خاکی شہر سے دس کوس کے فاصلے پر دفن ہے۔ اُس مقام کو پہچانو۔" یہی خواب جب مسلسل سات روز تک وارد ہوتا رہا تو بزرگ نے اُس مقام پر جا کر کھدائی کی، چند ہڈیاں برآمد ہوئیں اور ایک قرآن پاک جو حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا تحریر کردہ تھا۔ اُس ویرانے میں ایک عالی شان مزار تعمیر ہوا۔ آہستہ آہستہ بلخ کے باسی اس مزار کی جانب کھنچنے لگے۔ بلخ ویران ہوا اور مزارِ شریف کا ویرانہ آباد ہو گیا۔ اسی طرح مشہد ایک ویران گاؤں تھا اور چند کوس کے فاصلے پر فردوسی کا شہر طوس بے مثل تھا۔ امام رضا نے گنبدِ شاہی کی بجائے عوام کی سانسوں میں سانس لے کر زندہ رہنے کا قصد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ مشہد میں دفن ہوئے اور اُن کی ابدی بادشاہت کا اقرار کرنے کے لئے طوس اُجڑا اور مشہد کا بے نام قصبہ اُن کے دم سے آباد ہو گیا۔

روضے کی پُرپیچ جالی بھنور کی آنکھ ہے جس کے گرد جم کر کھڑا ہونا ناممکن ہے۔ ہجوم کی لہروں کا زور آپ کو گردش میں لے آتا ہے اور آپ آنسوؤں سے بھیگے چہروں، جالی کی جانب پھڑپھڑاتے بازوؤں میں شامل ہو کر طواف کرنے لگتے ہیں۔ میں کائنات کا ایک چھوٹا سا جرثومہ اُس ہستی کے مرقد کے گرد بہہ رہا ہوں جو خود ایک کائنات تھی.... دہقان تھا آذربائی جان کا اور اُس سیاہ چادر میں اُس کی بیوی بند تھی۔ یہ صاحب تہران کے کروڑپتی سوداگر تھے اور اس جدید لباس میں اُن کی سوس سکول میں اخلاق یافتہ بیٹی۔ یہ ایک تبریزی ملا تھا اور اُس کے ساتھ قم کے مدرسے کا ایک طالب علم، ادھر ایک فلسفی تھا اور اس کے قریب شیراز کا ایک حکیم۔ مگر یہ ظاہری پہچان چاندی کے ان دبیز دروازوں میں داخل ہونے سے پیشتر تھی۔ اس وقت وہ صرف آنسوؤں سے بھیگے چہرے ہیں، پھڑپھڑاتے بازو ہیں۔ یہ سب ہیریں ہیں جو دریا پار کر کے رانجھن کے ڈیرے تک پہنچنا چاہتی ہیں....

میں نے ایک نوجوان کو دیکھا جس کے دونوں بازو فضا میں بلند تھے اور ان میں جکڑا ہوا ایک پانچ سالہ گول مٹول بچہ لوگوں کے سروں کے اوپر معلق تھا۔ بچے کی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں روضے کی جالی چھونے کے لئے بے چین تھیں۔ جالی اُس کی کانپتی انگلیوں کے قریب آتی تو نیچے ہجوم میں

پھنسے ہوئے اُس کے باپ کے پاؤں بے اختیار اُکھڑ جاتے اور وہ پھر دور ہو جاتا۔ بچہ مایوس ہو کر زور زور سے سر ہلاتا اور پھر جد وجہد میں مصروف ہو جاتا۔ ایک مرتبہ خاصی دیر تک روضے کی جالی اس کی پہنچ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر رہی اور وہ اپنے آپ کو کھینچ کھینچ کر اس کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا رہا، مگر اس بار بھی ہجوم نے اُس کو دور کر دیا۔ بالآخر تھک ہار کر وہ واقعی بچہ بن گیا۔ وہ ننھی ہتھیلیوں کو بھینچ کر جیسے جالی کو اپنے پاس بلانے لگا، التجا کرتے ہوئے، ضد کرتے ہوئے غصے میں بڑبڑاتے ہوئے، امام سے ناراض ہوتے ہوئے ...... اور پھر اُس کی کھلی انگلیاں جالی کی جانب مقناطیس کی طرح تیرنے لگیں یا شاید جالی اُن کی جانب کھنچتی چلی گئی اور پھر دو نارنگی کی پھانکوں ایسے ہونٹ اُس پر ثبت ہو گئے میری آنکھوں کے کونوں میں نمی کے دو نقطے پھوٹے اور ایک لکیر کی طرح پھیلتے چلے گئے، مجھے اپنے بیٹے یاد آ رہے تھے۔

میں روضے سے باہر نکلا تو ایک جم غفیر امام کے حضور پناہ لینے جا رہا تھا، شہر امام کے پاس جا رہا تھا تاکہ خود کو آباد رکھ سکے۔

میں نے پلنگ میں مست ایک سنجوئی کی طرح دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ بس کی ونڈسکرین پر پھوار پھیل رہی تھی۔ وائپر کا سہاگہ شیشے پر پھسلتا تو لمحہ بھر کے لئے صبح کی ہلکی سفیدی نظر آ جاتی۔ میرے برابر کی نشست پر تہران یونیورسٹی کا طالب علم رضا ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا پچھلی شب مشہد سے روانگی کے بعد ہم دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے تھے۔ مگر جونہی میں اُس سے شاہ کے بارے میں کچھ پوچھتا تو وہ ہونٹ مقفل کر کے بس سے باہر دیکھنے لگتا۔ قدرے توقف کے بعد وہ منہ پھیرتا اور کہتا "باہر رات ہے"۔

ایک مقام پر بس نے سڑک کو چھوڑا اور ایک پہاڑی کے پہلو میں بیٹھے چند قہوہ خانوں کے جھرمٹ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ میں باہر نکلا، بارش رک چکی تھی۔ ہوا میں نم آلود بوسے کی سی تازگی تھی۔ مسافر قہوہ خانوں کے باہر کرسیوں پر بیٹھنے لگے، اُن میں سے کچھ سڑک سے نیچے اتر کر ایک ندی کے کنارے اپنے چہروں پر چھینٹے مار مار کر رات کی باسی تھکن کو اتارنے لگے ہیں۔ بھیگی زمین پر احتیاط سے قدم رکھتا ندی تک گیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا تو اُس کی یخ بستگی نے میری انگلیوں کو باقی بدن کی سستی سے کاٹ کر زندہ کر دیا۔ میں نے پورے بدن کو اسی طور زندہ کرنے کا سوچا اور ندی کے ساتھ ساتھ پہاڑی کے اوپر چڑھنے لگا۔ ایک مقام پر جہاں ندی خم کھا کر نیچے آ رہی تھی، مسافر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے جلدی سے کپڑے اتارے اور مایہ برف کے اُس جھنجھناتے تھال میں اتر گیا۔ دو چار ڈبکیوں نے ہی کپکپی طاری کر دی اور میں باہر آ گیا۔ جب میں ناشتے کے لئے قہوہ خانوں کی جانب آیا تو میرا بدن ٹکسال میں تازہ نکلے نویں نکور سکے کی طرح کھنک رہا تھا۔ میں نے پہلے دو کپ میٹھا دہی کھایا اور پھر قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔
اتنے میں تہران کی جانب سے ایک بس نمودار ہوئی اور سڑک سے اتر کر ہماری بس کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو گئی۔ اونگھتے آنکھیں ملتے مسافر باہر نکلتے اور تھکے جسموں کو گھسیٹتے یا تو ندی کا رخ کر لیتے اور یا اِدھر اُدھر کرسیوں پر پھیل جاتے۔ ان میں تین پاکستانی لڑکے بھی تھے جو مجھے دیکھ کر میری میز پر چلے آئے، سلام دعا کے بعد وہ ناشتے میں مشغول ہو گئے۔ گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ لاہور کے باسی ہیں اور تین چار ماہ کی آوارہ گردی کے بعد وطن واپس جا رہے ہیں۔

"آپ حضرات روزگار کی تلاش میں یورپ گئے تھے؟" میں نے سگرٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہم حضرات "نکلے تری تلاش میں" کے سلسلے میں یورپ گئے تھے" اُن میں سے ایک منہ بنا کر بولا۔

"جی!" میرا سگرٹ لبوں تک جاتے جاتے رُک گیا۔

"آپ مستنصر حسین تارڑ کو جانتے ہیں؟" بڑھی ہوئی داڑھی والے لڑکے نے دہی کا چمچہ منہ میں گھسیڑتے ہوئے غصے سے پوچھا "یہ اسی گدھے کے .... کی کارستانی ہے!"

اب میں باقاعدہ نروس ہو گیا۔ مگر میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ اس گدھے کے ... میرا مطلب ہے میرے بارے میں اتنے پُرخلوص جذبات کیوں رکھتے ہیں مگر وہ تو یہ بیان دے کر مزے سے دہی کھانے لگے تھے۔

"یہ جو.... بہت ٹیڑھے نام والے حضرت کا حوالہ آپ نے دیا ہے تو انھوں نے یقیناً آپ پر بہت بڑا ظلم وغیرہ کیا ہے۔

"ظلم؟" وہی پرخلوص نوجوان چمک کر بولا "ہماری بیڑیوں میں بیٹھ گیا جی۔ سفرنامے وغیرہ لکھتا ہے۔ اس کا ایک سفرنامہ پڑھ کر ہم تینوں دوستوں کی عقل کا میٹر مخالف سمت میں گھوم گیا اور ہم اپنے اپنے دھندے چھوڑ، اس کی کتاب بغل میں داب آوارہ گردی کے لئے نکل کھڑے ہوئے..... اب پتہ نہیں واپسی پر اسے موٹر مکینکی کا کام ملتا ہے یا نہیں۔ میرے بینک والے بغیر چھٹی کے چلے جانے کے باوجود مجھے واپس لیتے ہیں یا نہیں اور اس کو تو اس کا ابا کپڑے کی دوکان پر بیٹھنے کی اجازت بالکل نہیں دے گا، بہت منع کیا تھا اس نے۔" وہ پیالی پر جھکا اور قہوہ پینے لگا۔

میرا سگرٹ انگلیوں میں سلگ سلگ کر بے چارگی سے راکھ گراتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پھر ہمت کی "اچھا تو یہ صاحب آپ کی بیڑیوں میں بیٹھ گئے.... کیسے؟"

"جھوٹ بولتا ہے جی" وہی نوجوان اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کہنے لگا "ایسے ایسے قصے جوڑ کرسناتا ہے۔ بندہ پاگل ہو جائے... اوئے" اس نے ساتھی کو مخاطب کیا "کیا لکھا ہے اس نے نوح کے پہاڑ کے بارے میں کہ جی چاندی کا بنا ہوا ہے۔ اپنی شملہ پہاڑی جتنا ہے اور وہ جو شہزادوں کے جزیرے تھے، اللہ بچائے۔ اتنی مکھیاں اور مری ہوئی مچھلیوں کی بو....."

یار اسے اچھی لگی ہوں گی یہ جگہیں،" تیسرے صاحب نے بے چارگی سے کہا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا "اب ونیس، وارپس کے قصبے اپنی خوبصورتی اور ہیبت سے بندے کو پاگل نہیں کرتے، اور سٹاک ہوم...."

"ہاں ہاں... لیکن ٹوٹی پھوٹی دیواروں، ورملبے کے ڈھیروں کو دیکھ کر جو فدا ہوتا ہے تو جان عذاب میں ڈال دیتا ہے۔"

"اپنا اپنا تجربہ ہوتا ہے پیارے،" میرا حمایتی ہنس کر بولا "اب ہمیں بھی تو ایسے تجربے ہوئے ہیں جو اس کے خواب میں بھی نہیں آسکتے۔ وہ جب سویڈن میں...." اس کے بعد وہ اپنے سفر کے واقعات دہرانے میں اتنے مگن ہوئے کہ میری موجودگی سے غافل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد میری بس کا ہارن بیتابی سے بجنے لگا اور میں چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تینوں مجھے انجان جان کر یورپ تک کے مدت کے بارے میں تفصیلات سمجھانے لگے اور میرے ساتھ ہی چلے آئے۔ میں بس میں سوار ہونے لگا تو انھوں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا کہ جی میرا نام یہ ہے اور یہ ہیں میرے ساتھی..... واپسی پر ملاقات ضرور ہونی چاہیئے اور... آپ کا اسم شریف؟ میں چپکا کھڑا رہا کہ مجھ میں ہمت نہ تھی انھیں اپنا نام بتانے کی... میں جانتا تھا کہ ان کا ردعمل شرمندگی کا ہوگا اور... ہوا۔ میرا نام سن کر کچھ دیر کے لئے تو وہ جیسے نفی میں معلق ہو گئے اور پھر انھوں نے خالص لاہوری انداز میں معافیاں مانگنی شروع کر دیں..... سرجی معاف کر دیجئے ہم تو آپ کے بچے ہیں اور ہمیں تو پہلے ہی کچھ کچھ شک ہو رہا تھا مگر آپ کا لباس... بڑھی ہوئی شیو اور پھر ایران کے اس قہوہ خانے کے باہر آپ سے ملاقات.. ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے ڈھارس تو بہت بندھائی مگر وہ شرمندگی کی چادر اوڑھے رہے۔ جب تک بس حرکت میں نہ آگئی وہ قطار باندھے منہ بسورے کھڑکی کے باہر کھڑے رہے۔

"یہ نوجوان خدا یا تمہیں کوئی بہت برگزیدہ ہستی سمجھتے ہیں،" علی رضا جو اس صورت حال کا بغور جائزہ لیتا رہا تھا سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"ان نوجوانوں نے چند لمحے پیشتر مجھے خربیلے کے خاندان کا ایک فرد قرار دیا تھا۔"

"بالے بالے" اس نے سر زور زور سے ہلایا "مگر کیوں؟"

میں نے روئیداد بیان کر دی۔ علی رضا بے پناہ محظوظ ہوا اور اس کے ہونٹ ربڑ کی طرح پھیلتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "باہر رات ہے۔"

"رات؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا "بادلوں کی وجہ سے قدرے تاریکی ہے ورنہ تو...."

"تم میری آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے۔" اس کا سر جھکا، ٹھوڑی سینے پر ٹک گئی اور اس نے ناک کی ہنسی کو چٹکی میں دبا کر اپنے آپ کو سوچ

کے حوالے کر دیا۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا "پچھلی شب تم شاہ کے بارے میں مجھے کرید رہے تھے ... میں گریز کر رہا تھا صرف اس لئے کہ تم خفیہ پولیس ساواک کے ایجنٹ بھی تو ہو سکتے تھے ..."

"مگر میں تو پاکستانی ہوں!"

"وہ پیسے کے پجاری ہیں، اُن کی کوئی قومیت نہیں، پاکستانی بھی ہو سکتے ہیں!"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ تم نے ابھی اپنے ادیب ہونے کا ذکر کیا ہے میں تم پر بھروسا کرتا ہوں۔ کوئی بھی سچا تخلیقی ذہن ظلم کا ایجنٹ نہیں ہو سکتا ..." علی رضا کے نوجوان چہرے پر بوڑھی سوچوں کا جال سا بچھ گیا۔ "میرا نام علی رضا نہیں ہے۔ میرا نام "الف" ہے، میں ایران کا پہلا نصف ہوں، میں آغاز ہوں مگر میرے آغاز اور انجام پر مکڑی کے چہرے والے اُس عفریت کا سایہ ہے۔ جو شاہ ہے۔ اُس کے پاؤں ہمیشہ گیلے رہتے ہیں، جرنیلوں، سرمایہ داروں اور ساواک کے ایجنٹوں کے بوسوں سے۔ ایک روز ہم بھی اُسے بوسہ دیں گے، ایک بوسۂ مرگ۔ ایشیا کی سب سے بڑی اور جدید ترین آلاتِ قتل سے لیس فوج وہ دیوار ہے جو شاہ اس آخری بوسے سے بچنے کے لئے اپنے آگے تعمیر کر رہا ہے۔ مگر ہم دھات اور بارود کی اس دیوار کو چاٹ لیں گے اور پھر وہ ہمارے سامنے ننگا کھڑا ہوگا ..... پچھلے ماہ میں اور میرا ایک عزیز ترین دوست یونیورسٹی سے واپسی پر ملکی حالات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے ہم قدرے لاپرواہ ہو گئے، اور بس میں سوار ہو کر بھی وہی باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پیچھے بیٹھا ہوا مسافر ساواک تھا... دوسرے روز میرا دوست یونیورسٹی جانے کے لئے گھر سے نکلا اور اُس کے بعد آج تک اُس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اُس کے بوڑھے والدین اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ لکھانے کے لئے پولیس سٹیشن بھی نہیں گئے۔ جانتے ہو کیوں؟ پولیس انہیں بھی گرفتار کر لیتی۔ اس بوڑھے اور اس کی بیوی نے الزام لگایا ہے کہ ان کے بیٹے کی گمشدگی میں شاہ کا ہاتھ ہے اور یہ صفِ اول کی غداری ہے۔ چنانچہ وہ اپنا کمرہ مقفل کر کے چپکے چپکے بین کرتے رہتے ہیں اور وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ایران کے ہزاروں گھرانوں میں ایسے مقفل کمرے ہیں جن کے فرشوں پر ماتم کے سیاہ قالین بچھے ہیں ....،، علی رضا بلکہ ایران کا الف، ایران کا آغاز اپنے انجام کو آزاد کرانے کی جدوجہد کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتا رہا اور میں دم بخود، رنجیدہ سنتا رہا۔

ہم تبرستان کے صدر مقام آمل میں پہنچ گئے۔ آمل بہت دیدہ زیب شہر تھا مگر "الف" کی گفتگو کے بعد اُس کی کنکریٹ کی عمارتیں اور سیمنٹ کے فٹ پاتھ، ایک ایسے مورچے کی صورت میں نظر آئے جو شاہ نے حفاظت کی خاطر اپنے دیہات کے اور اپنے درمیان تعمیر کر رکھے ہیں۔ کچے اور پس ماندہ ایرانی دیہات جو شہروں کے مورچوں کے عقب میں منتظر ہیں ..... شہر ہمیشہ آسائش کی افیم پر اونگھتے رہتے ہیں اور دیہات جفاکشی کے ہتھوڑے ہاتھ میں لئے چوبی چہروں والے عفریتوں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔[1]

ایرانی لینڈ سکیپ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو ہمیں فارسی شاعری میں ملتی ہے اور دوسری وہ جو ہمیں دیکھنے میں ملتی ہے۔ دونوں میں خاصا طویل فاصلہ ہے۔ ایک طرف رکنا باد ہے، گلاب کھلتے ہیں اور دوسری جانب چٹیل میدان، بنجر ٹیلے اور بے آب و گیاہ صحرا پھیلتے ہیں۔ اس تفاوت کی وجہ شاید یہ ہے کہ ایران (جتنا کہ میں نے دیکھا) میں سبزہ و آب قدرے کم کم ہیں اور ایک ایرانی شاعر جونہی ایک سبز پتے یا پانی کی بوند کو دیکھتا ہے تو بے تامل بے قابو ہو جاتا ہے ..... ہمارے ایک عزیز دوست جو تہران میں قیام پذیر تھے اپنے لئے کسی بہتر رہائش گاہ کی تلاش میں تھے۔ ان کے دفتر میں کام کرنے والے ایک ایرانی نے انہیں ایک قیام گاہ کے بارے میں بتایا جو اتفاقاً کرائے کے لئے خالی تھی اور ساتھ ہی مسرت سے لبریز ہوتے ہوئے خوشخبری سنائی کہ گلشن دارد۔ یعنی ساتھ میں گلشن بھی ہے۔ ہمارے دوست جو خود بھی شاعر ہیں گلشن کے نام پر حافظ و سعدی کے دیوانوں میں غرق ہو گئے ور فوراً حامی بھر لی چونکہ وہ قیام گاہ صرف چھٹی کے روز ملاحظہ کی جا سکتی تھی اس لئے وہ پورا ہفتہ وہ ایرانی صاحب ہر دوسرے

---

[1] سفر ایران جون ۱۹۷۸ء

قفقزے میں اُن کی اس خوش بختی پر رشک کرتے کہ انھیں ایک ایسی قیام گاہ ملنے والی ہے جو کہ ... گلشن دارو چھٹی کے روز انھیں ایک تنگ گلی میں لے جایا گیا۔ ایک بوسیدہ کواڑ کھول کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ ایک مختصر سا صحن اور ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ۔ ہمارے دوست نے بے صبری سے پوچھا، گلشن کجاست؟ اس پر ایرانی نے دردانے کے ساتھ زمین میں گڑی ہوئی ایک پژمردہ ٹہنی پر قربان ہوتے ہوئے اعلان کیا گلشن! ..... یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایران واقعی قدرے سرسبز ملک ہو مگر پنجاب کے ہریاول سے بچھڑتے میدانوں کی عادی آنکھیں ہی ادھر سبزہ و آب کو کم دیکھتی ہوں۔ بہرطور تہران سے تقریباً سو میل دور ایک وادی میں سے گذر ہوا جس میں پنجاب کی سبز خوبصورتی کا عکس تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ایک خطۂ زمین جس پر چاول کے کھیت بچھے ہوئے ہیں اور ان کی نم خوشبو کے درمیان آپ کی بس ناک اُٹھا کر سونگھتی ہوئی چلی جاتی ہے یہاں دھوپ اور بادلوں کا ایک مسلسل کھیل رونما ہوتا رہتا ہے۔ ابھی بس کی ونڈسکرین پر بارش کے قطرے پھوٹ رہے ہیں اور اُسی لمحے دھوپ کے تیز فلیش آنکھوں کو چندھیانے لگتے ہیں۔ وادی کے خاتمے پر ایک پرپیچ پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا اور ہم ایک تیراک کی طرح بریسٹ سٹروک کی طرز پر طویل سرنگوں میں ڈبکیاں لگاتے اور پھر چمکتی سڑک پر نمودار ہوتے آگے بڑھنے لگے۔

ایک سرنگ کے دہانے پر ٹریفک رُکی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ سب مسافر کھڑے ہو گئے۔ کھائی کی جانب سڑک کے گرد کا حفاظتی جنگلا ٹوٹا ہوا تھا اور نیچے گہرائی میں کئی ہزار فٹ نیچے ایک دریا کی چمکتی لکیر تھی اور اُس لکیر میں ایک ڈِنکی کھلونا تھا۔ کھلونا نظا نہیں اس بلندی سے لگ رہا تھا وہ کسی غیر ملکی سیاح کی مائکرو بس تھی کسی پالتو کتے کی طرح دریا کے بیچ اوندھی پڑی ہوئی۔ پانی کا ریلا ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں میں سے گذرتا تو وہ یوں دھیرے دھیرے ہلتی جیسے اس کتے کو بوٹ کی نوک سے گدگدی کی جا رہی ہو۔ امدادی پارٹیاں رسّوں کی مدد سے نیچے اتر رہی تھیں سیاحوں کی لاشیں نکالنے کے لئے۔

سرنگ کے اس پار اترائی شروع ہو گئی۔ ڈرائیور نے انجن بند کر دیا، اور ہم بوئنگ جیٹ کی طرح بیٹھتے دلوں کے ساتھ نیچے ہوتے چلے گئے۔

تہران پہنچ کر علی رضا مجھ سے جدا ہوا۔ "میں تمہیں ضرور اپنے گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دیتا ....." وہ رنجیدہ ہوا، مسکرایا اور چار جانب نگاہ ڈال کر بولا "بحران دنوں ..... باہر رات ہے!"

ایران کا آغاز مجھ سے ہاتھ ملا کر اُس رات میں گم ہو گیا، اس ضمانت کے بغیر کہ وہ اپنا انجام آزاد دیکھنے کے لئے زندہ رہے گا یا اُس کی لاش بھی دریائے خراج کی تہہ میں ہزاروں ایرانی نوجوانوں کے گلتے جسموں کو نوید دے گی کہ ابھی رات کے خلاف جنگ مسلسل ہے اور مکڑی کے چہرے والے شاہ اور بوسۂ مرگ کے درمیان ایک دن مزید کم ہوا۔

میں نے اپنا سامان کاندھے پر بوجھ کیا اور قیام تہران کے لئے کسی رہائش گاہ کی تلاش میں بس سٹیشن سے باہر آ گیا۔

"مسافر خانہ دہقان نو" کی عمارت ایک پرانی کاروان سرائے تھی جو شاید کسی زمانے میں شہر سے باہر ویرانے میں ہو گی مگر اب شہر رینگتا ہوا اُس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ دالان عبور کر کے مینیجر کے دفتر میں پہنچا اور سوالِ رہائش دراز کیا۔ اُس نے چابیوں کا ایک گچھا دراز میں سے نکالا اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"تخت ندارد" وہ دوسری منزل پر واقع ایک بوسیدہ دروازہ دھکیلتے ہوئے بولا۔

"ہم گداگر لوگ ہیں ہمیں تخت کی خواہش بھی نہیں" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"باشے" اُس نے سر ہلایا۔

کمرے میں واقعی کوئی تخت نہ تھا یعنی چھت کے علاوہ صرف فرش ہی فرش تھا۔ چارپائی، میز کرسی وغیرہ ندارد۔ میرے جسم کی تھکاوٹ نے اسی کو غنیمت جانا اور میں اپنا سلیپنگ بیگ فرش پر بچھا کر اُس میں ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ایک اجنبی ملک کی بجائے ایک ایسی وادی میں پہنچ چکا

تھا جس میں دنیا بھر کے انسان اپنی زندگی کا نصف حصہ گزارتے ہیں۔ موت کے عارضی تجربے سے روشناس ہوتے ہیں۔ میرا جسم آہستہ آہستہ تھکاوٹ کی کینچلی اتارتا رہا جانے اس عمل میں کتنا عرصہ لگا۔ مگر جب میں اس وادی سے واپس آیا تو اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پایا۔ باہر واقعی رات تھی اور اندر میں ایک بھرے پُرے ایرانی گاؤں میں سانس لے رہا تھا۔ بے شمار بچے تھے جو نیچے پھدکتے، ادھر ادھر کھیل رہے تھے، چند مرد تھے جو میرے پہلو بہ پہلو ٹانگیں پھیلائے سو رہے تھے، ایک دہقان خاتون پورا کا ڈاٹ چادر میں روپوش چولہے پر ایک چھوٹی سی دیگ چڑھائے کسی طعام کی تیاری میں مشغول تھی۔ سلگتی لکڑیوں کا دھواں پورے کمرے کو ایک دھندآلود پہاڑی قصبے کا روپ دے رہا تھا۔ میں قدرے ہراساں ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ کونے میں اونگھتے ایک سفید ریش دہقان نے مجھے دیکھ کر ایک چوڑی مسکراہٹ میرے سامنے رکھ دی اور خانہ دار خاتون سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس نے چادر کا پلو چہرے پر کھینچا، دیگ میں ڈوئی ڈبو کر ایک محلول نکالا اور ایک پیالے میں گرا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ سبزیوں اور گوشت کا گاڑھا سوپ تھا جس کا مزا دھواں دھواں تھا۔ سوپ ختم کر کے میں نے بڑے میاں اور خاتون کا شکریہ ادا کیا اور پھر اُٹھ کر گھومتا ہوا منیجر کے پاس جا پہنچا۔ "میرے کمرے میں ایک ایرانی گاؤں آباد ہو گیا ہے۔"

"ہونا بھی چاہیے۔" وہ ایرانیوں کی روایتی لاتعلقی سے بولا۔

"کیوں؟"

"انھوں نے کرایہ ادا کیا ہے۔"

"اور میں نے؟"

"تم نے بھی ادا کیا ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر یہ کہ تم سب نے کمرے میں سونے کا کرایہ ادا کیا ہے، جا کر سو جاؤ۔"

یہ گفتگو جیسی کہ ظاہر ہو رہا ہے اتنی رواں نہ تھی بلکہ نیم فارسی میں بمشکل تمام ان خیالات کا اظہار ہوا۔ نتیجہ کا ستیاناس یہ تھا کہ اس مسافر خانے میں کمرے کرایے پر نہیں ملتے بلکہ صرف سونے کی جگہ کرائے پر ملتی ہے اور وہ مجھے ملی ہوئی ہے۔ چاہے اس کے گرد ایک ایرانی گاؤں آباد ہے چنانچہ میں اسی طور گھومتا ہوا اس کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں اس موڈ میں ہرگز نہیں تھا کہ تہران کے قیام کی چند راتیں اجتماعی کھیتی باڑی کے ماحول میں گزاروں، چنانچہ میں نے خیابان امیر کبیر کا رخ کیا جو دنیا بھر کے سیاحوں میں اپنے سستے مسافر خانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دنیا بھر کے سیاح مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں اور مسافر خانوں کے مالک کمرہ پُری کے بعد اب انھیں دو ڈالر فی کس کے حساب سے غسل خانوں، برآمدوں، چھتوں اور تہہ خانوں میں فٹ کر رہے ہیں۔

رہائشی صورت حال تشویش ناک تھی۔ خاصی تگ و دو کے بعد خیابان کے آخر میں "مسافر خانہ نادر" ملا جو بے حد چپ چاپ اور خالی خالی سا نظر آ رہا تھا مگر یہاں سوال سے پیشتر ہی جواب مل گیا۔ میں مایوس ہو کر جانے کو تھا کہ ایک خوش باش کھلے ہوئے سفید چہرے والی بڑی اماں سفید چادر اور شلوار قمیض میں ملبوس سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نمودار ہوئی جسے دیکھتے ہی ادھیڑ عمر منیجر بچوں کی طرح کلکاریاں مارنے لگا۔ بڑی اماں نے بزبان فارسی اسے بے شمار دعاؤں سے نوازا اور اس کے جھکے ہوئے گنجے سر پر بڑی شفقت سے [illegible] منیجر مؤدب ہو کر سر جھکائے بدستور کلکاریاں مارتا رہا بڑی اماں وہاں سے فارغ ہوئیں تو میرے سر پر دست شفقت پھیرنا شروع کر دیا۔ "پتر تمھیں پہلے نہیں دیکھا۔"

"جی میں ابھی آیا ہوں۔"

"کون سے کمرے میں ہو؟"

"جی کمرہ تو..." میں نے بڑی اماں کو ہمدرد پا کر پوری کتھا بیان کر دی۔ اس نے منیجر کے جھکے ہوئے سر پر ایک اور پیار دیا اور پھر اس سے کچھ کہا جواب میں وہ دیر تک ننگے کبوتر کی طرح غٹکتا رہا۔ پھر بڑی اماں مجھ سے مخاطب ہوئیں "یہ شہدا بھی ٹھیک کہتا ہے پتر، واقعی کوئی جگہ نہیں ہے۔ کل صبح

کویت والے جا رہے ہیں تم آ جانا بستر مل جائے گا۔" میں شکریہ ادا کرکے جانے کو تھا کہ بڑی اماں نے پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ "کل ناشتہ میرے ساتھ کرنا پتر، جیتے رہو۔"

کھلی کھڑکی میں سے ہلکے بخار ایسی سست حدت والی دھوپ آ رہی تھی اور میں اطمینان سے اُبلی ہوئی سوّیوں اور دودھ کا ناشتہ کر رہا تھا۔ سوّیوں پر چھڑکی ہوئی چینی میرے دانتوں تلے کڑکڑا رہی تھی۔ سامنے بڑی اماں میرے لئے قہوہ بنانے میں مصروف تھیں اور بار بار پوچھتیں، بیٹے چینی اور چاہیے، سوّیاں ابھی بہت ہیں تم نے ہی ختم کرنی ہیں۔۔۔۔ پچھلی شب تو میں نے جوں توں کرکے ایرانی گاؤں میں گزاری اور آج صبح سویرے "مسافرخانہ نادر" میں چلا آیا جہاں حسب وعدہ مجھے ایک خوبصورت ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بستر الاٹ کر دیا گیا اور اب میں بڑی اماں کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اماں جی آپ ایران میں زیارتیں کرنے آئی ہیں؟" میں نے سگرٹ سلگاتے ہوئے دریافت کیا۔

"پتر میں تو پھیرے باز ہوں۔"

"کیا باز ہیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"پھیرے باز پتر" بڑی اماں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سب لوگ مجھے مائی پھیرے باز کہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہوتا ہے پتر۔ میرے دونوں بیٹے بھی اسی کاروبار میں ہیں۔ ہمارا ہیڈکوارٹر بغداد میں ہے اور چھوٹا وہیں رہتا ہے۔ بڑا بیٹا جرمنی سے مرسیڈیز گاڑیاں لاکر بیروت میں فروخت کرتا ہے۔ میں نے ایران، شام اور ترکی سنبھالا ہوا ہے۔ بڑے سے تو پچھلے ماہ انقرہ میں ملاقات ہوئی تھی مگر چھوٹا چھ ماہ سے پھیرے پر ہے۔ میں تہران آتی ہوں تو وہ دمشق چلا جاتا ہے۔ دمشق پہنچتی ہوں تو وہ جدہ بیٹھا ہوتا ہے۔ خیر رب سچا کبھی نہ کبھی تو میل کرائے گا۔ اللہ حیاتی دے بڑے سُچّے اور پیسے بیٹے ہیں۔۔۔" اُس کی بوڑھی آنکھوں میں نمی آگئی اور وہ سنہرے فریم کی عینک اتار کر آنسو پونچھنے لگی۔ "بہت کہتے ہیں کہ مائی جی آرام کرو، ہم جو ہیں کمانے والے۔۔۔ مگر دیکھو ناں پتر، رزق وہی حلال ہوتا ہے جو انسان خود کمائے۔"

"بے شک، بے شک۔" میں نے سوّیاں نگلتے ہوئے کہا "مائی جی ایران، شام اور ترکی آپ نے سنبھالا ہوا ہے؟"

"آہو پتر۔"

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کس طرح سنبھالا ہوا ہے؟"

"بس پتر ترکی سے مال خریدا اور ایران لے آئے۔ یہاں سے مال ڈالا تو شام لے گئے۔ ہر جگہ پھیرے بازوں کے مخصوص مسافرخانے ہیں، وہاں مقامی لوگ آکر مال خرید لیتے ہیں۔"

"لیکن مائی جی یہ تو۔۔۔۔ کچھ غیر قانونی سا سلسلہ نہیں ہے سمگلنگ وغیرہ۔۔۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ناں پتر۔۔۔" مائی جی نے کانوں کی لویں چھوتے ہوئے سر ہلایا "ہم کسٹم والوں کو اُن کا حق دیتے ہیں۔۔۔۔ کوئی چھپا کر تھوڑا لاتے ہیں۔۔۔۔ بڑا کرم ہے رب سچے کا، مجال ہے کسی سرحد پہ یا ایرپورٹ پر کوئی کسٹم افسر مائی پھیرے باز کے مال کو ہاتھ لگائے۔ سبھی دید لحاظ کرتے ہیں۔"

"سرحد عبور کرتے ہوئے اتنے سامان کے ساتھ کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی؟"

"ہاں ایک مرتبہ شام کے بارڈر پر عملہ تبدیل ہو گیا تھا تو اُن بچوں نے ہمیں روک لیا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر ہم نے پورے کسٹم ہاؤس کے شیشے توڑ دیئے۔۔۔ پولیس آئی پھر فوج آگئی۔۔۔۔ بہرحال مال ہم نے پھر بھی نکال لیا۔"

میں مائی پھیرے باز کی شخصیت سے خاصا متاثر ہو چکا تھا، قدرے غیر قانونی ہی سہی مگر اس عمر میں بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار یوں دندناتے پھرنا بہر طور ایک کارنامہ تھا "آپ سارا سال پھرتی ہی رہتی ہیں؟"

"نہیں پتر، حج کے دن تو میں سوہنے سرکار کے پاس مکے اور مدینے میں گذارتی ہوں....." مائی جی کی آنکھوں میں نمی نے پھر یلغار کر دی "بس ایک ہی ارمان ہے پتر کہ اللہ توفیق دے۔ عمر ہے تو پورے بارہ حج کر لوں، وس تو ہو گئے....."

"ہو گئے؟"

"ہاں ہو گئے۔"

"کبھی پاکستان جانے کا خیال نہیں آیا مائی جی؟"

"پتر وطن وطن ہوتا ہے، خیال کیوں نہیں آتا، یہ تو رزق کی خاطر ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ اخیر عمر تو وہیں گزرے گی۔ بری امام کی درگاہ کے آس پاس..... بس میرے بیٹے کچھ نرم دل ہیں کاروبار کو سمجھتے نہیں پچھلے دنوں چھوٹے نے کویت کا ویزا منگوا لیا....."

"کویت کا؟ سنا ہے مشکل سے ملتا ہے۔"

مائی جی کا دین دار چہرہ مسکرانے لگا "نہیں پتر، بڑے اچھے لوگ ہیں یہ سفارت خانوں والے۔ کل عراق کا ویزا لگوانے گئی تو بڑی خلقت تھی سفارت خانے کے باہر، سب کو جواب مل رہا تھا، مجھے تو اندر بلا لیا کرسی دی۔ ان کو بھی ہم ان کا حق دیتے ہیں پتر۔"

"تو آپ کا چھوٹا بیٹا کویت چلا گیا؟"

"نہیں پتر یہی تو بتانے لگی تھی۔ اسے بغداد میں ایک غریب شخص ملا، بے یار و مددگار، ضرورت مند تھا بے چارہ۔ میرے بیٹے نے ترس کھا کر اپنا ویزا اسے دے دیا، صرف دس ہزار میں۔ بڑا نرم دل والا ہے، اللہ حیاتی دے۔"

اتنے میں دستک ہوئی اور ایک غیر معمولی ایرانی یعنی طویل قامت، چوغے میں حرکت کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے قریب پہنچ کر سر جھکا دیا۔ مائی جی نے حسب عادت اس کے سر پر دست شفقت پھیرا اور پھر دونوں شدھ فارسی میں گفتگو کرنے لگے۔ ایرانی نے چوغے کی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر مائی جی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر مختلف اشیاء کی فہرست تھی جو وہ اگلے پھیرے میں مائی جی سے خریدنا چاہتا تھا۔ مائی جی نے بڑی پھرتی سے سب اشیاء کے آگے قیمتیں درج کیں، ٹوٹل کیا اور کچھ رقم ایڈوانس وصول کر کے، ایرانی کو اگلے ماہ کی ایک تاریخ دی، سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ عقیدت سے سرنگوں بامراد مرید کی طرح جھومتا ہوا چلا گیا۔

"مائی جی یہ جو ویزا آپ کے بیٹے نے ایک ضرورت مند کو بخش دیا، تو یہ اس نے اپنے پاسپورٹ سے اس کے پاسپورٹ پر کیسے منتقل کر دیا؟" میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

مائی جی میرے اس بے وقوفانہ سوال پر دل کھول کر ہنسیں "پتر اپنے عراق میں بڑا بڑا کاریگر ہے پاسپورٹ بنانے کا، ایک پاسپورٹ کے صفحے دوسرے میں اتنی نفاست سے فٹ کرتے ہیں کہ مجال ہے..... اپنے سفارت خانے والے بھی مدد کرتے ہیں... حق ملتا ہے انھیں بھی.... خیر پتر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہاں سے ترکی جاؤں گا اور....."

"وہاں ایرانی ڈزسیٹ لے جاؤ، بہت پیسے چھوڑیں گے مگر تین پھول والے نہیں پتوں والے" مائی جی نے صلاح دی۔

"اور وہاں سے بیروت جاؤں گا....."

"ترکی سے مرسڈس کے وہیل کپ خرید لینا، بیروت میں دگنے پیسوں میں بک جائیں گے۔"

"راستے میں دمشق بھی ٹھہروں گا..."

"دمشق!" مائی جی نے ایک طویل ہچکی لی جیسے فوت ہونے کو ہیں پھر ایک ٹھنڈی یخ سانس بھری اور زار و قطار رونے لگیں "دمشق جا رہے ہو!"

"نہ جاؤں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"جاؤ پتر جاؤ، جم جم جاؤ، وہاں میرے لئے بھی دعا کرنا..." وہ اپنی سفید چادر سے ناک پونچھتے ہوئے ایک اور ہچکی لے کر بولیں۔

"کروں گا مائی جی ضرور کروں گا، لیکن کہاں پر؟" میں آنسوؤں سے لبریز اس صورت حال سے خاصا پریشان ہو گیا۔

"موسیٰ کے مصلے پر..." انھوں نے چادر میں ایک اور "شوں" کی۔

"وہ کہاں پر ہے؟"

"حضرت ابراہیم کے مصلے کے ساتھ..."

"دمشق میں ہیں؟"

"دمشق سے چند کوس کے فاصلے پر، اس پہاڑ پر جہاں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا... میں نے وہاں نفل پڑھے تھے مصلوں پر.... ہائے پتر کیا بتاؤں، اللہ کی قدرت، سبحان اللہ... سبحان اللہ..." مائی جی بدستور روتی رہیں "جونہی قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو مارے وحشت کے چٹان کی زبان باہر نکل آئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کروڑوں سال بعد آج بھی وہ چٹان ہابیل کی موت پر آنسو بہاتی ہے میں نے خود دیکھا ہے... اور ان ہاتھوں سے..." اس نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر چلو بناتے ہوئے سسکی بھر کر کہا "میں نے خود وہ پانی پیا ہے.... چٹان روتی ہے پتر... وہاں جانا تو میرے لئے دعا کرنا"

"اچھا مائی جی"

"اور بی بی زینب کے مزار پر بھی جانا"

"اچھا جی..."

"اور دمشق میں صرف عبداللہ ہندی کے ہوٹل میں ٹھہرنا، اپنا آدمی ہے!"

مائی جی اس کے بعد کچھ دیر خاموش رہیں۔ بمشکل اپنے رواں آنسوؤں کو روکا اور زیر لب آیاتِ قرآنی کا ورد کرتی رہیں اور پھر اٹھ کر سبز قہوہ بنانے لگیں۔

قہوہ خوشبو اور ذائقے کی زبانوں سے عبارت تھا۔ اتنی دیر میں پھر دستک ہوئی اور ایک اور ایرانی ڈھیلے لٹکتے سوٹ میں چھتا ہوا اندر آگیا۔ اس نے حسب دستور سر جھکایا اور ایک فہرست مائی جی کے آگے رکھ دی۔ میں نے مائی جی کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کمرے میں چلا آیا جو اس نیک دل خاتون کی سفارش سے مجھے ملا تھا۔ یہاں چار بستر بچھے تھے جن میں سے ایک کا انتخاب کر کے میں لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دستک ہوئی اور ایک صاحب اندر تشریف لے آئے "مال ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"مال؟ کونسا مال؟"

"پھیرے باز؟" انھوں نے قریب آ کر کہا۔

"نہیں نہیں،" میں مسکرانے لگا "میں تو سیاح ہوں!"

وہ صاحب مایوس ہو کر سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

ابھی میں اپنے آپ کو بستر پر دراز کرنے کو ہی تھا کہ ایک اور دستک ہوئی اور ایک ایرانی نمودار ہو گیا "مال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں ہے" میں نے درشتگی سے کہا۔

"پاکستانی ہو؟" اُس نے صاف اردو میں پوچھا

"ہاں ..."

"کمال کے پاکستانی ہو۔ مال ہی نہیں ہے" وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

ایک مختصر وقفے کے بعد پھر دستک ہوئی۔ جو صاحب اندر آئے انھیں میں نے بولنے کا موقع ہی نہ دیا "مال نیست!" میں نے انگلیاں نچا کر کہا۔ "نیست ....؟" وہ سر کھجا کر بولے اور للکتے ہوئے باہر چلے گئے۔

میں اب بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا کہ آنے دو۔ اس مرتبہ جو صاحب اندر آئے انھوں نے دستک دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، اُن کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں کو جتنا بھی خشمگیں بنایا جا سکتا تھا بنایا اور انگلیاں نچلاتے ہوئے کہا "مال نیست"۔ اُن صاحب نے بُرا سا منہ بنا کر میری جانب دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کیا بکواس کرتے ہو اور پھر کھڑکی کے قریب والے بستر پر بیگ رکھ کر کپڑے بدلنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میری طرح مسافر ہیں اور اسی کمرے میں قیام کرنے آئے ہیں۔ میں نے جھینپ کر تولیہ بغل میں دابا اور غسل خانے میں جا کر شیو بنانے لگا۔

شاید اس میں میری کسی ذہنی کیفیت کا دخل تھا کہ اُس دوپہر تہران کا روشن دن مجھے بجھا بجھا سا لگا اور اسی بجھتی ہوئی کیفیت کی لپیٹ میں آ کر اس کی گلیوں بازاروں میں رواں چہرے بھی کچھ آؤٹ آف فوکس اور راکھ ہوتے دکھائی دیئے۔ رنگ جیسے نچڑ گئے ہوں۔ میں پوری دوپہر بے مقصد گھومتا رہا۔ تہران میرا دوست نہ بنا، مجھ سے کھنچا کھنچا سا رہا۔ میں نے چوڑے فٹ پاتھ پر سجے درجن بھر تصویری کارڈ خریدے اور ایک پارک میں بیٹھ کر اُن پر اپنے دوستوں عزیزوں کے نام گھسیٹ دیئے۔ پھر ایک بس پر سوار ہوا جو معلوم نہیں کدھر کو جاتی تھی۔ آخری سٹاپ پر پہنچ کر بھی میں اپنی نشست پر براجمان رہا تا آنکہ وہ مجھے واپس اُسی سٹاپ پر لے آئی جہاں سے میں بوریت کے بوجھ تلے دب کر اُس میں سوار ہوا تھا۔ شام ہوئی تہران کے وہ چہرے جو دن کی روشنی میں بےرنگ سے تھے اب اُنہی کے خدوخال پر رنگ برنگی روشنیوں اور بےباکی کی فصلیں اُگنے لگیں مگر میں بجائے اس کے کہ ایک تھکے ہوئے بیل کی طرح ان فصلوں پر منہ مارنے کی کوشش کرتا، شہر کی سردمہری میں ٹھٹھرتا واپس اپنے نئے ٹھکانے پر چلا گیا۔

"مسافر خانہ نادر" میں میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو میرے بستر پر ایک شخص بھنگڑا ڈال رہا تھا... اُس نے رنگین لنگی کے اوپر ایک امریکی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر بڑے بڑے حروف میں MAKE LOVE NOT WAR لکھا ہوا تھا اور وہ "ایلی ایلی" کے نعرے بلند کرتا بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ دوسرے بستر پر ایک صاحب آنکھیں لال گلال کئے کھیر اونش کر رہے تھے۔ بستروں کے درمیان میں تپائی پر ایک بوتل دھری تھی اور قابلِ فہم طور پر شراب کی تھی۔

"او آئے، او آئے" بھنگڑے کا شوقین مجھے دیکھ کر بستر سے اترا اور زبردستی بغل گیر ہو گیا۔

"کون آئے، کون آئے" کھیر کھانے والے نے چونک کر پوچھا۔

"اوئے اپنے باؤ جی آئے ... اُٹھ اوئے ڈھینگر، باؤ جی کے لئے پیگ بنا" اُس نے نحیف نوجوان کے پیٹ میں ایک معقول قوت کا گھونسا رسید کرتے ہوئے حکم دیا۔ وہ غریب لڑکھڑا کر بستر پر گرا اور پھر فوراً ہی ربڑ کے گڈے کی طرح سیدھا ہو گیا۔

"اوئے باوے تیری میں کواری کو ..... کتنی مرتبہ کہا ہے مارا نہ کر میرے گردے کمزور ہیں" ڈھینگر نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔

"اوئے ڈھینگر تیری میں ماں .... باؤجی کے سامنے گالی دیتا ہے" اُس نے ڈھینگر کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا "بنا پیگ باؤجی کے لئے"۔

"نہیں بھائی جی آپ پئیں ... میں ذرا ـــــ"

"نہیں جی یہ نہیں ہو سکتا" باوے نے ہاتھ جھٹک کر گرم ہوتے ہوئے کہا۔

"میں دراصل .. میں بہت فل ہو کر آیا ہوں باہر سے .."

"اچھا ..." باوا منہ کھول کر ہنسنے لگا "تو پھر کھیرا کھاؤ"۔

میں چپکے سے بیٹھ کر کھیرا کھانے لگا۔

کمرہ تو میرا ہی تھا مگر حسب دستور میری غیر موجودگی میں یہاں دیگر مسافران کو بھی فٹ کر دیا گیا تھا۔ کھڑکی کے قریب اس کمرے کا چوتھا باسی یعنی وہی ایرانی ہماری طرف پشت کئے اس ہنگامۂ مے نوشی سے بے خبر مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کھیرے ختم ہو گئے۔

"اُٹھ اوئے ماں کے خصم ..." باوے نے ڈھینگر کو ایک تھپڑ نما تھپکی دی۔ "جا کھیرے لا"۔

ڈھینگر جھومتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"یہ جو ڈھینگر ہے ناں اپنا یار ہے" باوا پیار سے بولا۔

"ہاں وہ تو لگتا ہے"۔ میں نے خوفزدہ آواز میں آہستہ سے کہا۔ باوا اس وقت خمار کی اُس حالت میں تھا جب بجلی کے کھمبے سڑک کے بین درمیان میں چہل قدمی کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔

"ہم دونوں آج ہی کویت سے آئے ہیں ... وہاں سے مال لائے ہیں۔ ہمیشہ اسی مسافر خانے میں ٹھہرتے ہیں یہ سالا بک خود بخود آتا ہے"۔

"آپ پھیرے باز ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے"۔ اُس نے دونوں ہتھیلیوں کو اس طرح اٹھایا جیسے ان پر رکھے وزن کو بیلنس کر رہا ہو۔

"کھیرے تو نہیں ملے، یہ لے آیا ہوں" ڈھینگر اندر آ گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک تربوز تھا۔

"اوئے کھوتی کی اولاد شراب کے ساتھ تربوز کون کھاتا ہے ...."

"نہیں ملتے کھیرے ..." ڈھینگر نے روٹھتے ہوئے کہا۔

"اوئے گوالمنڈیئے کاں یاروں سے ناراض نہیں ہوتے"۔ باوے نے اسے پیار سے ایک زوردار تھپڑ لگایا۔

"آپ گوالمنڈی کے ہیں؟" میں نے ڈھینگر سے پوچھا۔

"جی باؤجی"۔

"میرا کاروبار بھی اسی علاقے میں ہے"۔

"اچھا ..." ڈھینگر گلوگیر ہو گیا۔ "باؤجی آپ دادو کو جانتے ہیں؟"

"کیا کرتا ہے؟"

"چکڑ چھولے بیچتا ہے چوک میں ... میرا تایا ہے، اُس کی ایک آنکھ میں نقص ہے"۔

"کانا ہے ..." باوے نے تربوز کاٹتے ہوئے قہقہہ لگایا "دادو کانا چھولیاں والا ..."

"اوئے باوے تیری ئیں ... تجھے شرم نہیں آتی میرے تلمے کے سے گستاخی کرتا ہے ..." ڈھینگر لرزتے ہوئے بولا۔

"اوئے رنجیت سنگھ کی اولاد چپ کر کے بیٹھ ..." باوے نے ڈھینگر کے سر پر ایک ٹھاپ لگائی اور ڈھینگر غصے میں آکر سامنے رکھا گلاس ڈیک لگا کر پی گیا۔

"اور آپ کہاں کے ہیں؟" میں نے باوے سے دریافت کیا۔

"میں سیالکوٹ کا ہوں، وہاں بھی کاروبار ہے"

"اوئے باوے خدا کو جان دینی ہے ..." ڈھینگر سیدھا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "باؤ جی یہ وہاں ایک سنیارے کی دکان پر کام کرتا تھا۔ کوکے بناتا تھا"

"اوئے موج سنیارا لے گیا ..." باوے نے گلا پھاڑ کر گلاس اندر کیا اور پھر اٹھ کر میرے بستر پر بھنگڑا ڈالنے لگا۔ میں بھی چونکہ اسی بستر پر بیٹھا ہوا تھا اس لئے اس کے کودنے سے پسنجر گاڑی میں بیٹھے کسی مسافر کی طرح بے اختیار ہلنے لگا۔

"اوئے پھر مروائے گا ..." ڈھینگر میز پر گھونسا مار کر بولا۔

باوا بدستور بھنگڑا ڈالتا رہا چنانچہ ڈھینگر اپنا بدبودار منہ میرے قریب لے آیا "جہاں جاتا ہے گھٹ لگا کر بھنگڑا ڈالنے لگتا ہے اور پھر ہم دونوں کو مسافر خانے والے نکال دیتے ہیں۔ آج بھی اس نے راہداری میں ایک سکھنی کو چھیڑا تھا۔ وہ تو سکھ کوئی شریف سکھ تھا ورنہ یہ قتل ہو جاتا ..... باؤ جی آپ ہی اسے منع کریں ..."

"میں کیسے منع کروں؟"

"آپ کے بستر پر ناچ رہا ہے، منع کر دیں۔"

"کر دوں؟" میں نے جرأت جمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"آہو..."

"ہے بھائی باوا صاحب ..." میں نے ایک خوفزدہ مسکراہٹ چہرے پر پھیلاتے ہوئے گذارش کی "یہ بستر ٹوٹ جائے گا، ہوٹل والے شاید پسند نہ کریں، آپ سے قیمت وصول کریں گے۔"

باوا ہانپتے ہوئے رکا اور لنگی کا ایک لڑ کھول کر اس میں بندھے ہوئے نوٹ ہوا میں اڑا دیئے "اوئے ہمارے پاس رقمیں ہیں لٹا دیں گے۔"

ڈھینگر کی سرخ آنکھیں باقاعدہ لٹو کی طرح گھومنے لگیں۔ وہ زیر لب گالیاں بکتا فرش اور بستر پر سے نوٹ جمع کرنے لگا۔ اس دوران باوا چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جونہی اس نے نوٹ اکٹھے کر کے اسے واپس کئے اس نے بڑی احتیاط سے انہیں لنگی میں باندھا اور ایک زبردست قسم کی بڑک لگا کر پھر سے ناچنے لگا۔ ڈھینگر نے تربوز کی طرف رجوع کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی کے دوران ہمارا ایرانی شریک کبھی کبھار کروٹ بدل کر ہمیں گھورتا اور پھر منہ پھیر کر اونگھنے لگتا۔

تہران اس مرتبہ بہت ہی نامہربان ہے، میں نے سوچا۔ پچھلی شب فرش پر گذری مرغیوں اور بچوں کے ساتھ، آج سارے دن میں ایک بھی ایسا لمحہ نہ آیا جو دیوانگی سیاحت کا جواز بنے اور اب میں ہوں اور یہ تربوز کھاتا ڈھینگر اور میرے بستر پر ناچتا باوا۔ اس وقت یہ بھی ممکن نہ تھا کہ میں اپنا سامان اٹھا کر کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں نکلتا چنانچہ میں نے ڈھینگر کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے "کتنے بجے سونے کا پروگرام ہے؟"

"ہیں؟" ڈھینگر چوکنا ہو گیا "ابھی تو ہم نے بیئر پینی ہے، ٹھنڈک کے لئے۔ وسکی کی گرمی دور، جگر کی گرمی دور ... دفع دور۔"

"اور اس کے بعد؟"

"اُس کے بعد ہم ذرا معشوقوں کو پکڑنے جائیں گے، وہاں ....."، ڈھینگر شرماتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگ یہی شغل کرتے رہتے ہیں تو مال کب اور کس وقت بیچتے ہیں؟"

ڈھینگر کھسک کر میرے قریب آگیا اور بڑی رازداری سے کہنے لگا "باؤجی میں تو چار ٹرنک لایا ہوں، اپنا مال ہے، اور بادے کا تو صرف ایک ہے....."

"اوئے....." بادا فوراً پلنگ سے نیچے اتر آیا "تو نیں کی او۔ دکیا کہا ہے؟ میرے پاس صرف ایک ٹرنک ہے؟"

ڈھینگر قدرے خوفزدہ ہوا مگر میری جانب دیکھتے ہی اپنا منحنی سینہ پھلا دیا "آہو کہا ہے میں نے....."

بادے نے اُسے ایک زنانے کا طمانچہ رسید کیا "اوئے جل ککڑ باؤجی کے آگے ہماری بے عزتی کرتا ہے ....." وہ میرے قریب منہ لا کر بولا "باؤجی ٹرنک ایک ہی ہے لیکن مال اپنا ہے اور اس کے تین ٹرنک سیٹھ کے ہیں، یہ تو کمیشن پر کام کرتا ہے ....."

کمیشن پر کام کرنا غالباً اُن کے نزدیک ڈوب مرنے کا مقام تھا کیونکہ ڈھینگر ایک دم کھڑا ہو گیا "اوئے تیری میں ماں کو ....."، وہ باقاعدہ بادے پر حملہ آور ہو گیا۔ بادا اُس کی ناتواں مکیاں کھاتا رہا اور مسکراتا رہا۔ ڈھینگر نے تاؤ میں آکر اپنے حملے تیز کر دیئے۔ اس دھینگا مشتی میں جانے کس طرح بادے کے چہرے پر ایک گہری خراش آگئی۔ اُس نے مسکرانا بند کیا، تکیے کے نیچے سے ایک خنجر نکالا اور ایک زوردار بڑک لگا کر گالیاں اگلتا غریب ڈھینگر کی طرف بڑھا۔ ڈھینگر ایک دم چوکنا ہو گیا اور دروازے کی جانب لپکا لیکن بادے نے پیچھے سے اُس کی شلوار کے درمیان میں ہاتھ اُڑس کر اُسے بستر پر گرا لیا اور اُس کے سینے پر سوار ہو کر خنجر لہراتا بڑکیں لگانے لگا۔ میں آہستہ سے کھسکتا کھسکتا ایک کونے میں تک گیا۔ ڈھینگر نے نہ جانے کیسے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور پھر دروازے کی جانب بھاگا۔ اس دوران بادے نے خنجر جو لہرایا تو ڈھینگر ایک دم پلٹ پڑا "اوئے مار دیا" اُس کے بازو میں سے خون برس رہا تھا، اُس نے ہاتھ لگا کر اس کی گیلاہٹ محسوس کی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا "اوئے بادے مار دیا..... اوئے تیری میں کواری..... اوئے بہن ..... میں مر گیا.... لوکو میں مر گیا"

ڈھینگر نے شراب کی بوتل اُٹھا کر فرش پر دے ماری اور پھر "مر گیا، مر گیا" کا شور مچاتا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اب بادا قدرے سوبر ہوا اور خنجر میرے تکیے کے نیچے چھپا کر میرے سامنے آکھڑا ہوا "باؤجی آپ آرام سے بیٹھیں ہم تو شغل میلہ کر رہے تھے!"

میں نے دوسری جانب نگاہ ڈالی تو دوسرے کونے میں وہ ایرانی دیوار کے ساتھ گٹھ سے چپکا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد مسافرخانے کا مالک کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ہمراہ دو سپاہی بھی تھے۔ نھوں نے ریوالور تان کر ہم تینوں کو ایک قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ ایرانی مسافر نے انھیں کچھ کہا تو اسے دوسری جانب کھڑے ہونے کی اجازت مل گئی۔ سپاہیوں کے ہمراہ ڈھینگر بھی کھڑا تھا، اور اُس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بدستور رو رہا تھا اور چلا رہا تھا کہ لوکو میں مر گیا۔ ایرانی سپاہی باآواز بلند کچھ کہہ رہے تھے۔ اُدھر مسافرخانے کا مالک جانے کیا کہہ رہا تھا۔ اِدھر بادا کچی پکی فارسی میں جانے اُنھیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاصے بحث و مباحثے کے بعد سپاہی آگے بڑھے اور مجھے اور بادے کو بازوؤں سے جکڑ لیا۔ وہ ہمیں گرفتار کر رہے تھے۔ میں نے اپنی مختصر فارسی میں انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ میرا ان دو حضرات سے کسی قسم کا تعلق واسطہ نہیں، سوائے اس کے کہ میں بھی پاکستانی ہوں، مگر وہ سر ہلا کر "بلے بلے" کہتے رہے اور مجھے کمرے کے باہر گھسیٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ اتنی دیر میں ایرانی مسافر آگے آیا اور اُس نے انھیں غالباً یہی بتایا کہ میں یقینی طور پر ان دو کا ساتھی نہیں ہوں اور میں صرف اُن کے ساتھ کمرہ شیئر کرنے کا قصوروار ہوں۔ اُس کی سفارش پر پولیس نے مجھے نیم دلی سے چھوڑ دیا اور بادے کے ساتھ ڈھینگر کو بھی گرفتار کر کے لے گئی۔ ان کے رخصت ہونے پر مسافرخانے کے مالک نے کمرے کی صفائی کروائی، شیشے کے بکھرے ہوئے ٹکڑے چنے، باقی ماندہ تربوز بغل میں دابا اور رحم سے معذرت کر کے واپس چلا گیا۔ ایرانی نے اشاروں اشاروں میں بتایا کہ اب اُسے نیند نہیں آرہی چنانچہ اُس نے اپنے بیگ میں سے واڈکا کی ایک بوتل نکالی، اور اُسی تپائی پر رکھ دی جس پر تھوڑی دیر

پہلے ڈھینگا اور بادے کی بوتل دھری تھی۔ اس سے بیشتر کہ وہ مجھے پینے کی دعوت دیتا میں نے طمانیت کی ایک لمبی سانس بھری اور اپنے بستر میں گھس گیا

تہران کی سرد مہری اگلی صبح بھی جوں کی توں قائم تھی۔ چمکتی دھوپ کے باوجود وہ اپنی لاتعلقی کی ٹھنڈی سانسوں سے میرے بدن کو یخ کرتا رہا۔ تہران آج بھی وہی کتاب تھا جسے میں کل پڑھ چکا تھا اور اس میں کہیں بھی میرے لئے چاہت کا ایک لفظ نہ تھا، صرف بے مہری تھی، کھچاوٹ تھی۔ چہرے راکھ ہوتے ہوئے، گلیاں بازار بجھتے ہوئے۔ تہران آج میرا دوست نہ بنا، مجھ سے دور رہا۔ چنانچہ میں نے بھی اس شہر نامہربان کو نظر انداز کیا اور اپنا رخ اس کے ایک ایسے باسی کی جانب کر لیا جو میرا دوست تھا ... میں نے سُکھ دیپ کو فون کیا... کال آپریٹر سے منتقل ہو کر ایک نسوانی آواز تک پہنچی "مسٹر سُکھ دیپ میٹنگ میں ہیں نو کالز ..." ساتھ ہی کلک ہوئی اور فون بند ہو گیا۔ میں نے پھر ڈائل کیا۔

"مسٹر سُکھ دیپ میٹنگ ....."

"مجھے صرف ایک منٹ کے لئے ملا دیں بہت دور سے آیا ہوں ..."

"کون صاحب بات کریں گے؟"

"تارڑ"

"جی تا... تارر ..." ایرانی سیکرٹری میری "ڑ" پر اٹک گئی۔

آپ پلیز ملا دیں، میں اُن کا ایک غیر ملکی دوست ہوں"

"ہیلو سُکھ دیپ ہیر" .... ادھر سے ایک بھرپور کھروری آواز آئی۔

"سُکھ دیپ تم نے کہا تھا کہ کبھی تہران واپس آنا، ہم دن کے اُجالے میں کہیں چلیں گے ... میں آ گیا ہوں"

"جنٹلمین وی میٹنگ از اوور ... تھینک یو" جواب آیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

اُدھر خاموشی طاری رہی۔

"ہیلو ہیلو" مجھے شبہ ہوا کہ فون بند ہو گیا ہے۔

"اوئے ..... سسرے کیا ہیلو ہیلو لگا رکھی ہے" کچھ دیر بعد پھر اُس کی آواز آئی "کچھ عقل کر، یہاں جن سوہروں کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا انہیں نہیں بھیجنا تھا کمرے سے باہر..."

"وہ یقیناً مجھے پہچان نہیں پایا تھا کسی اور کے دھوکے میں تھا" سکھ دیپ میں تارڑ بول رہا ہوں، پاکستان والا"

"اوئے آہو ... تو بھی مسلا ہی رہے گا۔ تیرا کیا خیال ہے کہ اس تہران میں کوئی اور سسر ہے جس کے لئے میں اپنی بزنس میٹنگ ختم کر سکتا ہوں۔ کیا حال ہے؟"

"مل کر پوچھ لے..." میری باچھیں کھل گئیں۔

پندرہ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر نیلے رنگ کی وردی میں جرنیلوں ایسی سنہری پی کیپ سجائے ایک صاحب اٹینشن کھڑے تھے "مسٹر سُکھ دیپ نیچے گاڑی میں بیٹھے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، میں اُن کا شوفر ہوں"

فٹ پاتھ کے پہلو میں کھڑی سیاہ مرسیڈیز کی پچھلی نشست پر سُکھ دیپ بمع اپنی پٹیالہ طرز کی پگڑی کے بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا... سُکھ دیپ کا تیسرا روپ۔

پہلا روپ تو اب دھندلانے لگا ہے... جب میں اور وہ ساؤتھ اینڈ کی ہائی سٹریٹ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہر سکرٹ پر مٹنے کی نظریں لئے گھوما کرتے تھے۔ ہماری انگریز دوست لڑکیاں اس حرکت پر بے حد برا مانتی تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم کچھ کچھ "ہومو" ہیں۔ جب وہ رات گئے حالت خمار میں میرے کمرے کے باہر کھڑا ہو کر بے تحاشا قہقہے لگایا کرتا تھا۔ کافی ہاؤس میں داخل ہوتا تو اس کی پگڑی میں ٹانکا ہوا عام شیشے کا ٹکڑا کوہِ نور کی طرح چمکتا اور لڑکیاں اس ہندوستانی "مہاراجے" پر مرمٹتیں۔ ہم دونوں ایسے پرندے تھے جن کے پر نئے نئے اُگے تھے، اور ہم انہیں اندھی پرواز کے لئے اندھا دھند استعمال کرتے مگر وہ طالب علمی کا، کم عمری کا پیریڈ تھا، آزاد اور بے دریغ مجنونوں کا زمانہ... پھر ہم اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ گئے... سکھ دیپ کا دوسرا روپ آج سے چھ برس پہلے کا تھا۔ جب میں اپنے گھونسلے سے اڑاری مار کر باہر نکل آیا اور تہران میں ہمارا میل ہو گیا وہ اب بھی اسی طور لاپروا اور ہنس مکھ اور مخلص تھا۔ صرف شادی ہو چکی تھی اور ایک وسیع کاروبار کا مالک تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خوشی سے اپنے خوابیدہ پر پھڑپھڑائے اور ہم دونوں شمران کے قہوہ خانوں میں جھرنوں اور آبِ جو کی موسیقی پر جھومتے دریائے خراج کے کناروں پر رواں کیسپین سمندر کی طرف برق رفتاری سے پرواز کرنے لگے۔ اس کی سپورٹس کار مازندران کے جنگلوں میں اُڑتی، ریچھوں اور بھیڑیوں سے بچتی بچاتی رات کے پچھلے پہر ہیں، رامسر لے گئی۔ وہاں اس نے اپنی بیوی کو فون کیا اور "میں چلی پٹیالے" کی دھمکی سن کر فوراً سوپر ہو گیا۔ ہم دونوں کو اسی رات واپس تہران لوٹنا پڑا۔ اس نے جدا ہوتے ہوئے کہا تھا "واپس آنا، ہم پھر کیسپین چلیں گے لیکن دن کے اجالے میں" اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگا کر تہران کی کہر آلود صبح میں گم ہو گیا تھا

اور اب، اس وقت "مسافر خانۂ نادر" کے فٹ پاتھ کے پہلو میں وہ ایک پرانی سپورٹس کار کی بجائے سیاہ مرسیڈیز کی پچھلی نشست پر بمع اپنی پٹیالہ طرز کی پگڑی کے بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا تھا... سُکھ دیپ کا تیسرا روپ۔ مجھے دیکھ کر وہ انجان سا بن گیا اور داڑھی میں سے پھوٹتی مسکراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ ہنستا ہوا باہر نکلا اور ایک اداس ریچھ کی طرح مجھ پر جھپٹتے ہوئے بغلگیر ہو گیا۔ "اوئے تارڑا، اوئے تارڑا"، وہ بار بار کہہ رہا تھا اور قہقہے لگا رہا تھا مگر اس کے بھرپور قہقہے میں کہیں کہیں دکھ کی دراڑیں تھیں جیسے قدرے اداسی خلا میں کھینچ رہی ہو۔

"کیسے ہو سکھ دیپ؟" میں نے تہران کی سرد مہری میں گرمیٔ یار محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھ لو" وہ پیچھے ہٹا اور بازو پھیلا کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پہلے سے قدرے صحت مند۔ داڑھی میں چند سفید بال۔ کھلا ہوا وسیع سکھ دیپ۔

"بال بچے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں"، وہ سمٹ کر بولا "بیٹھو کار میں"۔

کار کا انجن قالین پر براجمان ایک مغرور ایرانی بلی کی طرح ہلکے ہلکے غرانے لگا۔

میں نے سُکھ دیپ کی جانب دیکھا۔ وہ انگریزوں کے بقول بالکل درست طور پر ملبوس تھا۔ اس کی مسکراہٹ ابھی تک اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور ایک دم شرمندہ سا ہو کر کہنے لگا "یار، مائنڈ نہ کرنا، میں آج صرف ایک گھنٹے کے لئے تمہارے ساتھ رہ سکوں گا۔ میں نے بچوں سے وعدہ کر رکھا ہے کہ چار بجے انہیں نہلانے کے لئے سومنگ پول لے کر جاؤں گا۔"

"یہ تمہارا نہلانے کا خبط ابھی تک نہیں گیا۔" ہنس دیا "مجھے کیسپین کے سمندر میں ڈبکی لگوانا چاہتے تھے اور اب بچوں کو سومنگ پول پر لے جا رہے ہو!"

"نہیں اگر تم کہتے ہو تو..."

"نہیں سکھ دیپ بچوں سے کیے ہوئے وعدے پورے کرنے چاہئیں ... اور خاص طور پر سکھ بچوں سے کیے ہوئے وعدے..."

"اوئے تارڑا تو کبھی میرے بچے دیکھ نا ں ... واہگورو کی قسم ایسے بچے ہیں کہ..."

"مجھے یقین ہے کہ بہت ہی خوبصورت ہوں گے ... سنا ہے کہ گدھے کے بچے اور سکھ کے بچے جب چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو بہت خوبصورت ہوتے ہیں..."

"اور جب بڑے ہو جاتے ہیں تب؟" وہ دل کھول کر ہنستا ہوا کہنے لگا۔

"تب وہ علی الترتیب گدھے اور سکھ میں بدل جاتے ہیں۔"

"اوئے" وہ باچھیں کھلاتا ہوا بولا "کم از کم بچپن میں تو خوبصورت ہوتے ہیں اور مسلوں کے بچے.... اب تمہیں ہی دیکھو... خیر یار چھوڑ اس سسرے مسافرخانے کو اور بوریا بستر اٹھا کر میرے گھر چلے آؤ... میں شام کو اسی ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"پر کیوں؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"اگر بھابی کو پتہ چل گیا کہ میں وہی تارڑ ہوں جو چھ برس پہلے اُس کے ڈارلنگ خاوند کو اغوا کر کے کیسپین کے کنارے لے گیا تھا تو... وہ تو مجھے مار دے گی۔"

سکھ دیپ بجھ سا گیا۔ اُس نے گھر چلنے کی دعوت کو دہرایا نہیں۔ خاموشی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" میں نے اُس کی طویل خاموشی میں مخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں ..." اس کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔

"سکھ دیپ ہم کل مل لیں گے۔ تم بے شک ابھی چلے جاؤ اپنے بچوں کے پاس۔"

"اوئے نہیں اوئے" وہ یکدم نارمل ہو گیا "ہم کینگی ان چلتے ہیں پیٹ پوجا کے لئے۔ چار بجے میں بچوں کے پاس چلا جاؤں گا اور کل دفتر سے چھٹی کر کے ہم دونوں تہران کو ذرا سرخ کریں گے انشاء اللہ!"

انشاء اللہ کے استعمال پر میں قدرے چونکا مگر پھر خیال آیا کہ افغان سکھ تو باقاعدہ لاحول ولا قوۃ بھی پڑھتے ہیں۔

سیاہ مرسیڈس کینگی ان ریسٹوران کے باہر کھڑی ہوئی اور ایرانی بلی کی غراہٹ بند ہو گئی۔

"سکھ دیپ وہ تمہاری سپورٹس کار کہاں گئی؟" ریسٹوران کی نیم تاریک سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"یار اُس کا حادثہ ہو گیا تھا... ایک ایرانی سسرے نے دے ماری اپنی گاڑی۔ پتہ ہے پولیس نے جرمانہ بھی مجھے ہی کیا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اُس کی گاڑی کھڑی تھی اور میری چل رہی تھی" اس نے ایک بے دھڑک قہقہہ لگایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زیر زمین ریسٹوران کی تاریکی میں لوگ سر جھکائے شاید کچھ کھا رہے تھے اور ویٹر میزوں کے درمیان جھکے جھکے چوروں کی طرح چل رہے تھے۔ ہم ایک کونے میں بیٹھے تو چوروں کی نسل کا ایک فرد ہمارے پاس چلا آیا، میز پر دو ٹوکریاں سجائیں اور چلا گیا۔ ایک اور صاحب اندھیرے میں سے نمودار ہوئے اور دو مگ ہمارے سامنے جما کر دھیرے سے غروب ہو گئے۔ روشنی اتنی قلیل تھی کہ دوسری میزوں پر بیٹھے لوگوں کے بارے میں قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں یا سر جھکائے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ بہرحال ہم دونوں شطرنج نہیں کھیل رہے تھے کیونکہ ہمارے سامنے بانس کی ٹوکریوں میں کینگی طرز کا خصوصی روست چکن تھا اور مگ ایرانی آب جو سے لبریز۔ مختصر وقفوں کے بعد تاریکی میں مقیم وہی صاحب دبے پاؤں نمودار ہوتے اور خالی مگ کی جگہ ایک اور مگ

رکھ جاتے جو خالی نہ ہوتا۔ آنکھیں نیم تاریکی کی عادی ہونے لگیں، اور ریستوران طلوعِ آفتاب کے ولیس محوں میں ہرات کی تصویر کی طرح روشن ہوتا چلا گیا اور ہم اپنے جسموں میں پھیلتی روشنی کی تمازت سے آسودہ ہوتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے پچھلے چھ برسوں کی تفصیل سنانا چاہی مگر تمام تر ذکر واقعات دس منٹ میں ختم ہوگئے کیونکہ یہ زندگی ایک مشینی آدمی کی تھی جو ڈائل پر درج ہندسوں کے تحت شب و روز میں سے ٹک ٹک کرتا گزرتا جاتا تھا، کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرے میں حرکت کرتا ہوا۔

"اور تم؟ تم کیا کرتے رہے سُکھ دیپ؟"

سُکھ دیپ نے لبریز مگ کے دبیز جھاگ کے گول دائرے میں پھونک ماری، اور اُس میں سمٹتے ہوئے سوراخ پر ہونٹ رکھ کر ایک طویل گھونٹ بھرا "میں؟" اُس نے مونچھوں پر سے جھاگ پونچھتے ہوئے سوچا۔

"اوئے" وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا "چار بجنے والے ہیں، میں ذرا بچوں کو فون کر آؤں" اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا وہ کاؤنٹر پر کھڑا ڈائل گھما رہا تھا۔

"انھیں کہا ہے کہ پانچ بجے آجاؤں گا۔۔" وہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا "تمہارا ایک مسئلہ چاچا آیا ہوا ہے"

"لیکن سُکھ دیپ بچے تو۔۔۔۔"

"چھوڑ تارڑ۔۔۔۔ چار کی بجائے پانچ بجے نہا لیں گے، نہانا ہی ہے ناں؟" اس نے ایک اور طویل گھونٹ بھرا۔ وہ آبِ جو کی گرمی کے باوجود کچھ بجھا بجھا سا تھا۔

"اوئے تارڑ۔۔۔۔۔۔۔ وہ یکدم چوکنا ہو گیا "یہ تم پاکستان جا کر کتابیں وغیرہ بھی لکھتے ہو؟"

"ہاں" میں خوش ہو کر بولا "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہو گیا؟"

"مجھے اس طرح معلوم ہو گیا کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی پاکستانی سیاح تمہاری کتاب بغل میں دابے مجھے تلاش کرتا ہوا میرے دفتر میں آنکلتا ہے اور بس گھورتا مجھے دیکھتا ہے اور دانت نکالتا ہے"

"تو مشہوریاں ہوگئیں ناں تمہاری۔۔۔۔"

"آہو" اس نے ایک بے پناہ قہقہہ لگایا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو کر مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگا "تم غلط باتیں بھی تو لکھ دیتے ہو"

"غلط باتیں؟"

"آہو۔ دارو کے بارے میں ڈنڈی مار گئے ناں۔۔۔"

سکھ دیپ درست کہتا تھا۔ میں مجرم تھا۔ ہم جس نقلی معاشرے میں رہتے ہیں وہاں بلند رہیں سے شریفانہ طور پر گزرنے کے لئے کسی محفل میں بیٹھنے کے لئے، رشتہ داروں سے میل جول رکھنے کے لئے ڈنڈی مارنی ہی پڑتی ہے۔ نہ ماریں تو وہ مار دیں۔ سوفی صد سچ کی شراب ہمیں کبھی ہضم نہیں ہوتی، ہم قے کر دیتے ہیں۔

پورے پانچ بجے سکھ دیپ پھر اُٹھا اور کاؤنٹر پر جا کر بچوں کو فون کیا کہ وہ تیار رہیں انھیں ہر صورت میں چھ بجے سوئمنگ پول پہلے جایا جائے گا۔ اُس کی غیر موجودگی میں مَیں نے ریستوران میں چہل قدمی کرتی ایک خاتون خوانچہ فروش سے ایک سگار خریدا اور سلگا لیا۔

سُکھ دیپ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک گہرے بھورے رنگ کے مشروب کی بوتل تھی "آبِ جو میں بات نہیں، اسے چکھتے ہیں"

"بارہ مگوں کے بعد تو ظاہر ہے نہیں رہتا۔۔۔۔ مگر یہ ہے کیا؟"

"تمہیں گنے پسند ہیں؟"

"گنّے؟ یعنی کماد؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ آبِ جو کا تریقینا ہوا تھا۔

"آہو گنے .... یہ گنے کا رس ہے، صاحب لوگ اِسے رَم کہتے ہیں"۔ اُس نے ڈھکن اتار کر مشروب کو سونگھا "خالص پونے گنے کا رس ...."

رس واقعی خالص تھا کیونکہ اس کی چند چسکیوں نے اُسے خوش باش بنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہوا میں شکاری کتے کی ناک سکیڑتے ہوئے کہنے لگا "اوئے یہ کپڑا جلنے کی بو کہاں سے آ رہی ہے؟"

میں نے بتایا کہ میں سگار پی رہا ہوں۔

"اوہ .... بیہودہ ہو لیکن خالصہ تم کو نہیں پتا صرف گنے کا رس پیتا ہے"۔ وہ پہلی مرتبہ کھل کر ہنسا اور گلاس کو ڈیک لگا کر پی گیا۔ مگر یہ سرخوشی عارضی تھی۔ اُس نے جبڑے بھینچ لیے اور سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اُس نے بجھی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ایک ایسے شخص کی طرح گویا ہوا جو مکمل طور پر نارمل ہے اور جس کے خون میں الکوحل کی مقدار زیرو فی صد ہے۔ "تم شاید سمجھتے ہو کہ میں ہمیشہ اسی طرح بلانوشی کرتا ہوں۔ نہیں تارڑ.... صرف جب تم ملتے ہو تب: تمہیں ملتے ہی وہ تمام سال پرانی کینچلی کی طرح میرے جسم سے اترنے لگتے ہیں جنھوں نے مجھے اُن دنوں سے جدا کر رکھا ہے جب ہر درخت سرسبز لگتا ہے اور ہر بدصورت بطخ راج ہنس دکھائی دیتی ہے .... "اگلی ہیگر ڈکی شی" کی طرح تم گذشتہ زمانوں کی ایسی آگ ہو جو مجھے پھر سے آزاد اور خوبصورت کر دیتی ہے ... تمہارے ساتھ میں نیچرل محسوس کرتا ہوں جب کہ دوسروں کے سامنے مجھے ایک مدبّر اور سنجیدہ سکھ دیپ کی اداکاری کرنا پڑتی ہے ...."

چھ بجے اُس نے بچوں کو اطلاع کی کہ بس جانِ پدر میں سات بجے ہر صورت پہنچ جاؤں گا۔ سات بجے سکھ دیپ نے فیصلہ کیا کہ اب شام ہو چکی ہے۔ یہ کوئی وقت ہے نہانے کا۔ بچوں کو کل نہلا دیں گے۔

ریستوراں پُر ہو چکا تھا۔ نشستوں کے خواہشمند لوگ سیڑھیوں میں کھڑے میزوں پر رکھی خوراک کی مقدار سے اندازہ لگا رہے تھے کہ کونسا گاہک اب اُٹھنے کو ہے۔ ایک ایرانی جوڑا بہت دیر سے ہمارے سروں پر کھڑا ہمیں ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

سکھ دیپ رَم کا آخری گھونٹ بھر کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ویٹر کو بل کے لئے کہا "یہاں تو میلہ لگ گیا ہے۔ کسی ویرانے کو ڈھونڈتے ہیں"۔

بل دو صفحوں پر مشتمل تھا۔ سکھ دیپ نے جیب سے عینک نکال کر ٹوٹل چیک کیا اور ویٹر سے کہنے لگا "جانِ برادر میں یہاں اپنی بارات لے کر تو نہیں آیا، اتنا بل؟"

ویٹر جھکی ہوئی حالت میں مسکراتا رہا۔

"دو چار ایکڑوں میں اُگے گنے کے رس کا بل تو اتنا ہی آنا چاہیئے"۔ میں نے بل پر نگاہ ڈال کر اسے تسلی دی۔

"اوئے ہو"۔ اُس نے ایک فلک شگاف قہقہہ ریستوراں میں بکھیرا اور بل ادا کر دیا۔

ریستوراں سے باہر آ کر اس نے ڈرائیور کو فارغ کر دیا اور خود سٹیرنگ سنبھال لیا۔

"کیا اب ہم پرواز کرنے کو ہیں؟" میں نے ڈیش بورڈ کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں تارڑ۔ اب میں نے تیز رفتاری چھوڑ دی ہے .... وہ اور زمانے تھے ....اب تو میں قدرے بزدل ہو گیا ہوں، سوئی چالیس کو عبور کرے تو سپیڈومیٹر پر مجھے اپنے بچوں کی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔ تم فکر نہ کرو"۔

سیاہ مرسیڈس تہران کی گاڑھے سوپ ایسی ٹریفک میں رینگنے لگی

"تہران ویسے کا ویسا ہی ہے"۔ میں نے شاہ رضا کی آسودہ اور پُرآسائش شاہراہ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا "کچھ بھی نہیں بدلا"۔ "یہاں تک کہ شاہ بھی نہیں بدلا"۔

"وہ نہیں بدلے گا" سکھ دیپ سٹیرنگ پر انگلی بجاتے ہوئے بولا "اُسے بدل دیا جائے گا۔ حالات ٹھیک نہیں ... ہم ہندوستانی جو یہاں کی شہریت

رکھتے ہیں ہمیں بھی اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں... ہو سکتا ہے جب تم اگلی مرتبہ یہاں آؤ تو میں اس وقت مشرقی پنجاب میں کھیتی باڑی کر رہا ہوں۔"

"اچھا ہے قریب آجاؤ گے۔"

"آہو" وہ مسکرایا "میں ادھر بارڈر پر آکر ہر روز نعرے لگایا کروں گا کہ بھیجو اس سسرے تارڑ کو وہ اپنا یار ہے۔ وہ تنگ آکر بھیج دیں گے۔"

مرسیڈیس ایک بلند آہنی دروازے کے پیٹ میں تھوتھنی لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ملحقہ کیبن میں سے ایک پہرے دار نکلا جسے سکھدیپ نے ایک کارڈ دکھایا اور دروازہ کھول دیا گیا۔ یہ تہران کلب تھی۔ سومنگ پول کے سامنے سینٹرل بار کا دروازہ تھا ہم اندر چلے گئے۔ بے پناہ ہجوم تھا۔ زیادہ تر غیر ملکی صحافی تھے جو ایران کے چیدہ چیدہ کاروباری لوگوں اور فوجی افسروں سے گھل مل کر تازہ ترین صورت حال کے بارے میں مواد اکٹھا کر رہے تھے۔ صحافی جو شراب نوشی کے باوجود اپنے حواس بجا رکھے ہوئے تھے اور دوسرے لوگ جن کے حواس ہی نہیں تھے۔ سکھدیپ کو دیکھ کر بار کا انچارج باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک وزنی چوبی تختی۔ مختلف کمروں میں سے ہوتے ہوئے ایک آبنوسی دروازہ سامنے آیا۔ انچارج نے قفل میں چابی کو گھمایا۔ اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک بلند چوبی چھت کا، فرنیچر کی پالش کی مہک اور اونی قالینوں کے گرم ماحول والا کمرہ تھا۔ کسی انگریز جنرل کی قد آدم تصویر مینٹل پیس کے اوپر سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔

"اس سفید لنگور نے اپنے پنجاب میں بڑی تباہی مچائی تھی پھر یہاں آگیا..." سکھدیپ ایک صوفے میں آرام سے گرتا ہوا کہنے لگا "یہ اس کا پسندیدہ کمرہ تھا اور اب میں اسی صوفے پر بیٹھ کر ایرانی آب جو پیتا ہوں جہاں یہ سسرا سکاٹ لینڈ کی وسکی پیا کرتا تھا۔"

انچارج خوراک کے ہمراہ آب جو کا ایک سرد گلاس بھی لے آیا۔

"کتنے دن ایران میں ٹھہرو گے؟"

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج چکے تھے "ایک دن بھی نہیں آج تبریز چلا جاؤں گا، وہاں سے ارض روم، پھر شام، لبنان..."

"جب آتے ہو افراتفری میں آتے ہو" وہ ناراض ہو گیا "تین چار روز تک میں فارغ ہو جاؤں گا۔ پھر ایک ہفتے کے لئے ہم کیسپئن جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مازندران کے جنگلوں میں فراٹے بھرتے ہوئے..."

"بھابی جازت دے دے گی؟ اس نے تو ایک رات کا اعتبار نہیں کیا تھا اور کہاں پورا ایک ہفتہ..."

سکھدیپ نے سر جھکایا اور گوشت کے ٹکڑے میں کانٹا چبھو کر اسے دیر تک دیکھتا رہا۔

مرسیڈیس میرے مسافرخانے کی طرف رواں تھی اور سکھدیپ واقعی اسے انتہائی سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔ خاموشی کا بوجھ ناقابل برداشت ہونے لگا تو اس نے کیسٹ ریکارڈر آن کر دیا... ایک بھاری آواز والا شخص ہیر پڑھ رہا تھا۔ اس کا لہجہ نرم اور دل گداز نہ تھا بہت درشت تھا مگر وہ ایک ایک لفظ کی ادائیگی اتنی شدت سے کر رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اچھا لگنے لگا۔

"یہ سیتل کی آواز ہے" سکھدیپ گہری تھکاوٹ کی ایک سانس بھرتے ہوئے بولا "یہاں ہندوستانی سکول میں ٹیچر ہے اور میرا جاننے والا ہے۔ جب بھی بوجھ بڑھتے ہیں تو میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں اور ہیر سنتا ہوں... یہ وجود میں گھلتی ہے، سکھ دیتی ہے۔"

"سکھ تو تمہاری ذات کا حصہ ہے۔"

"صرف نام کا..." وہ مدھم ہو کر بولا اور پھر سیتل کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر ہیر کے بول گنگنانے لگا۔ وہ اپنے آپ میں مگن تھا، میری موجودگی سے یکسر بے خبر۔ کیسٹ ختم ہوئی تو کیسٹ ریکارڈر جو چند لمحے پہلے زندہ تھا، ہم سے باتیں کر رہا تھا یکدم مردہ ہو گیا۔ لوہے کا ایک بیکار نیم گرم ٹکڑا۔

"تارڑ یار چلو سیتل سے ہیر سنتے ہیں..." سکھدیپ نے بے بسی سے سٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے میری منت کی۔

"اس وقت؟"

"اس وقت کیا ہے؟ صرف ایک ہی تو بجا ہے۔" اس نے پورا سٹیرنگ گھما کر مرسیڈس کو واپس کر دیا۔

سیتل کا فلیٹ تہران کے علاقے "بہارستان" کی ایک عمارت کی چوتھی منزل پر تھا جیسے لندن کے ساؤتھ ہال میں خالصہ راج کرتا ہے۔ اسی طور بہارستان میں ہر سُو سکھ اپنی رنگ برنگی پگڑیوں میں گھومتے نظر آتے ہیں۔ ہم ہانپتے ہوئے سیتل کے فلیٹ تک پہنچے۔ کال بیل بہت دیر تک بجتی رہی۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک خاتون ناگواری کے موسموں میں جمائیاں لیتی ہوئی ہمارے سامنے آ گئی۔ سکھ دیپ کو دیکھتے ہی جائی مائی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا "بھراجی آپ ..... آیئے آیئے ... ہمارے بھاگ کہ آپ نے یاد کیا۔۔"

"سیتل کہاں ہے بھابھو؟" سکھ دیپ نے بے چینی سے فلیٹ کے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا

"وہ تو گوردوارے گئے ہیں ..." بھابھو نے اطلاع کی۔

"گوردوارے؟" سکھ دیپ نے تھوک نگلتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا "کیا تکلیف ہے اُسے؟"

بھابھو میری موجودگی میں کچھ شرمندہ سی محسوس کر رہی تھی، اُس نے سکھ دیپ کے قریب جا کر کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا اور پھر میرا بازو پکڑ کر بالکل بچوں کی طرح درخواست کی "آؤ گوردوارے چلتے ہیں، نزدیک ہی ہے، سیتل کو پکڑ لاتے ہیں۔"

گوردوارے کے عالیشان ہال میں، اکھنڈ پاٹھ جاری تھا۔ ہم نظریں نیچی کئے جوتے اتار کر اندر داخل ہو گئے۔ دائیں طرف سینکڑوں پگڑیاں جھکی ہوئی تھیں اور بائیں جانب عورتیں اور بچے بصد احترام آنکھیں نیچی کئے بیٹھے تھے۔ سامنے تخت پوش پر گرنتھ صاحب کے اوراق پر جھکا ایک نرم چہرے والا بوڑھا سکھ تھا۔ اس کی سفید ریشمی داڑھی پنکھے کی ہوا سے دھنی ہوئی روئی کی طرح مقدس کتاب پر پھیل رہی تھی۔ فانوس روشن تھے اور فرش پر قالینوں کی تہیں تھیں سکھ دیپ کو دیکھ کر بیشتر چہروں پر حیرت کی مسکراہٹوں کا ردعمل ظاہر ہوا۔ ہمارے لئے جگہ بنائی گئی اور ہم دونوں بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ سکھ دیپ کی نظریں سیتل کو تلاش کرنے لگیں۔

"وہ ہے سسرا ......" سکھ دیپ نے مجھے کہنی مارتے ہوئے دوسرے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں سکھ ہی سکھ تھے اور اُن میں سے کسی ایک سکھ کا تعین کرنا میرے لئے بے حد دشوار تھا۔

"سسرا سر جھکائے بیٹھا ہے اوپر ہی نہیں دیکھتا۔" سکھ دیپ نے بے چین ہو کر سرگوشی کی۔ ہمارے قریب کی وہ داڑھیاں جو فرش کو چھو رہی تھیں ناگواری سے قدرے اوپر اٹھیں اور سکھ دیپ نے فوراً ایک عقیدت میں ڈوبی ہوئی آہ بھر کر سر جھکا لیا۔

"یہ تمہارے مولوی صاحب ہوتے ہیں؟" میں نے گرنتھ صاحب پر جھکے سکھ کے بارے میں آہستہ سے پوچھا۔

"یہ بھائی سنت سنگھ ہیں۔" وہ سہجے سے بولا۔

"کس کے بھائی؟"

"اوئے کسی کے بھی نہیں۔ چپ کر کے پاٹھ سُن!"

اتنی دیر میں بھائی سنت سنگھ نے بلند آواز میں کسی بانی کے بول پڑھے اور تمام حاضرین سربسجود ہو گئے۔ میں شتر مرغ کی طرح گردن اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ سکھ دیپ نے کن اکھیوں سے مجھے دیکھا "اوئے سسرے، مار کھائے گا خالصوں سے، سر نیچا کر۔" میں وہیں دبک گیا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ پوری محفل میں ایک سر ایسا ہے جو ڈھکا ہوا نہیں ہے اور وہ اس کے دوست کا ہے، چنانچہ اس نے فوراً جیب سے رومال نکال کر میرے سر پر رکھ دیا۔

آخر میں کڑاہ پرشاد تقسیم ہوا اور پاٹھ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ سکھ دیپ فوراً ہی سکھوں کے ایک ہجوم کے نرغے میں آ گیا جو اس کی گوردوارے

میں آمد پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ کچھ کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے اقرار کر رہا تھا کہ ہاں واہگورو کی واہگورو جانے۔ وہ جب چاہے اپنے بندے کے دل میں اپنا پریم پھونک دے اور بندہ دھرم کی راہ پر چلتا ہوا گوردوارے پہنچ جائے۔ اس دوران میں سیتل بھی ہمارے قریب آ چکا تھا۔ سکھ دیپ نے جلدی سے اس کا بازو تھاما اور ہم ہال میں سے نکل کر صحن میں آ گئے۔

"تیری ہیر سننے کے لئے آج مجھے گرنتھ صاحب بھی سننا پڑا ہے" سکھ دیپ نے ہنستے ہوئے سیتل کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

گوردوارے کے صدر دروازے پر بھائی سنت جو خاص طور پر اس پاٹھ کے لئے دہلی سے تشریف لائے تھے لوگوں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ میری باری آئی تو میں نے بھی اُن کی تعظیم کی اور جھک کر ہاتھ ملایا۔ اُس نرم چہرے والے سفید ریش بزرگ نے مجھے بھی سکھ ہی جانا اور بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "پتر تم نے کیس اور داڑھی صاف کرا کے واہگورو کی ناراضگی مول لے لی ہے۔ دھرم میں استرے کی مناہی ہے۔ خالصہ داڑھی سے ہی سجتا ہے:

بڑا نالائق سکھ ہے بھائی صاحب" سکھ دیپ نے کہا: "ولایت کی ہوا کیا لگی ہے دھرم کو ہی بھول گیا ہے!"

اب میں بھائی صاحب کو کیسے بتاتا کہ سکھ دیپ ہر ہفتے اپنی داڑھی اور کیس تراشتا ہے مگر استرے کے ساتھ نہیں جس کی دھرم میں مناہی ہے۔ بلکہ الیکٹرک شیور کے ساتھ کہ اُس کا تو گرنتھ صاحب میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔

ہم واپس سیتل کے فلیٹ میں آئے تو بھابھو نے بڑے اہتمام سے کھانے کی میز سجا رکھی تھی اور اُس پر سکھ دیپ کی پیاس بجھانے کے لئے "پانی" کی وافر مقدار بھی موجود تھی۔ پانی رنگدار تھا۔ سیتل چونکہ خود بھی شعر کہتا تھا اس لئے اُس نے دو سامعین کی موجودگی کا فائدہ اُٹھایا اور جی بھر کر اپنے شعر ساز اور ترنم سے سنائے۔ اس دوران سکھ دیپ پہلو بدلتا رہا۔ بالآخر ہیر کی باری آئی اور رات کے تین بجے تک حافظؔ و سعدیؔ کی سرزمین پر ہم نے اپنے پنجاب کے وارث شاہ کا پر اثر کلام سیتل کی پاٹ دار اور جذباتی آواز میں سننا شروع کیا۔

انسان اپنے وطن سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو جائے۔ کتنے ہی چولے کیوں نہ بدلے اندر سے اُس کی دھرتی اُس کے سانسوں اور رگوں کے تحرک کے گرد ریشم کے کیڑے کی طرح اپنی باس اور وحشی چاہتوں کا ایک چولا سہجے سہجے بنتی رہتی ہے۔ اور جب بھی دور دیسوں میں زمین کی گرم آواز اُس کے کانوں میں اترتی ہے تو پرائے چولے موم کی کینچلی کی طرح پگھلنے لگتے ہیں اور اندر سے وہی اپنا چولا نکل آتا ہے۔ ہیر کی لے مجھے واپس لے گئی اُس بلند مزار پر جس کا گنبد کھلا ہے، جس کا پلنگ رنگ رنگیلا ہے اور جس کے رنگ وہی ہیں جن سے میرے اندر کا چولا رنگا ہوا ہے ۔۔۔ سیتل آنکھیں بند کئے ایک ہاتھ کان پر رکھے ہیر کی آہوں کو اپنی زبان دے رہا تھا۔ سکھ دیپ سر جھکائے بیٹھا تھا اور بھابھو کرسی سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔

ہم سیتل کے فلیٹ کی سیڑھیاں اُترے تو سکھ دیپ مجھے بہت خاموش کچھ دور سا لگا۔ واپسی پر کار چلاتے ہوئے بھی وہ ایک سحر زدہ وحشی کی طرح سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مسافر خانے کے نیچے کار کھڑی کر کے وہ باہر نکل آیا اور مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ "خدا حافظ اور یار اتنی افراتفری میں نہ آیا کرو!"

میں نے گھڑی پر وقت دیکھا تو چار بج رہے تھے۔ مجھے بے اختیار پھر وہ رات یاد آئی جب کیسپین کے کنارے سکھ دیپ کو اُس کی بیوی نے فون پر ڈانٹا تھا کہ فوراً واپس آؤ ورنہ میں چلی پٹیالے اور وہ انتہائی فرمانبرداری سے کوہ البرز کی خطرناک گھاٹیوں میں کار چلاتا صبح کاذب کے وقت تہران پہنچ گیا تھا۔

"خدا حافظ سکھ دیپ" میں نے حدتِ یار کو محسوس کرتے ہوئے کہا "اور ہاں بہت دیر سے گھر جا رہے ہو۔ اگر آج بھی جاتے ہی بھابھی نے "میں چلی پٹیالے" والی دھمکی دے دی تو؟"

"وہ تو چلی گئی پٹیالے" اُس نے کار کی نشست پر گرتے ہوئے کہا۔ "دو سال ہو گئے اُسے مرے ہوئے" سیاہ مرسیڈس سٹارٹ ہوئی اور پھر ایک ... کی طرح تہران کی سیاہ رات میں جذب ہوتی چلی گئی۔

مسافتیں

عطاء الحق قاسمی

ہم لوگ رات کو ڈھائی بجے حجرے کے اونچے نیچے فرش پر بستر بچھا کر لیٹے تھے اور صبح چار بجے غاشو پہلوان نے ہمارے کمبل اتار کر پرے پھینک دیئے تھے۔ اسے خدشہ تھا کہ مبادا ہم خواب غفلت کے مزے لیتے رہیں اور اس دوران نماز قضا ہو جائے۔ غاشو پہلوان کو تو محض جگانا تھا۔ جب کہ ہم اس ضمن میں یقین کی منزل میں تھے لیکن جب یخ کر دینے والی ٹھنڈک جسم میں سرایت کرنا شروع ہوئی تو رفتہ رفتہ نیند آنکھوں سے غائب ہوتی چلی گئی۔ اور پھر ایک ایک کر کے اس حجرے کے سبھی زائرین اپنے بستر سمیٹتے ہوئے اُٹھے اور اپنے رب کو یاد کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ نواز ہاشمی، خواجہ مجید، خواجہ حفیظ اور یعقوب بھٹی[۱] بھی اُٹھ بیٹھے تھے۔ اور گٹھڑی بنے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے غاشو پہلوان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ غاشو نے سارے کمبل ایک کونے میں ڈھیر کئے ہوئے تھے اور اس خزانے پر سانپ کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اچانک میری نظروں کے سامنے میرا بچپن گھوم گیا۔ جب فجر کی نماز کے وقت اباجی اسی طرح لحاف کھینچ کر پرے پھینک دیتے تھے اور اس کے بعد حسب ضرورت چارپائی وغیرہ بھی الٹا دیا کرتے تھے۔ اس دوران میرے "حجرہ میٹ" نیند کی گرفت سے پوری طرح آزاد ہو چکے تھے اور یہ "گل محمد" اب "جنبش" کی طرف مائل نظر آنے لگے تھے۔ غاشو پہلوان دروازے کے درمیان میں کھڑا تھا۔ سارے کمبل اس کے قبضہ قدرت میں تھے۔ جو "گل محمد" اپنے پاؤں سے چل کر دروازے تک پہنچتا، غاشو پہلوان اسے اس کا کمبل دیتا اور اسے کمرے سے باہر بھیج کر پھر دروازے کے درمیان میں کھڑا ہو جاتا۔ حتیٰ کہ یہ دور جام مجھ تک بھی پہنچا، یا یہ کہ میں بھی چل کر جام تک پہنچا اور پھر کمبل اپنے گرد لپیٹ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

اور باہر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ابھی اندھیرا چھٹنے میں دیر تھی۔ تاہم روشنی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں اس ہلکی روشنی میں اس سمت نکل گیا جہاں کھیت ہی کھیت تھے اور جہاں جملہ مومنین لوٹے سے لوٹا ملا کر بیٹھے تھے۔ واپسی پر دربار کے بڑے گیٹ کے سامنے سڑک پر انہی دکانداروں سے دوبارہ ملاقات ہوئی جو رات کو اپنی عارضی دکانیں نصب کرنے میں مشغول نظر آئے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک اپنی دکان کے چبوترے پر کمبل اوڑھے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ اتنے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے روضے سے ملحقہ مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور سرہند کی خاموش فضاؤں میں پھیل گئی۔ قیام پاکستان سے قبل سرہند مسلمانوں کی آبادی تھی اور یہاں غیر مسلم ٹاکواں ٹاکواں نظر آتے تھے۔ لیکن ہجرت کے بعد درگاہ کے سجادہ نشین اور ان کی اولاد کے سوا اب پورے قصبے میں ایک مسلمان بھی نہیں ہے۔ کبھی یہ قصبہ بھی ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری اذان سے

۱۔ گزشتہ ماہ یعقوب بھٹی کا انتقال ہوگیا۔

گونجتا ہوگا۔ لیکن آج اس درگاہ سے باہر کسی دوسری مسجد سے کوئی اذان بلند نہیں ہوئی۔ چنانچہ اذان ختم ہوئی تو فضاؤں پر دوبارہ سناٹوں کا راج ہوگیا۔ تاہم اس آواز سے میرے اندر ایک ارتعاش سا پیدا ہوا اور پھر میرے صنم کدۂ دل کے سبھی بت ایک ایک کرکے پاش پاش ہوتے چلے گئے۔ میں مسجد میں جانے کے لئے بڑے گیٹ میں داخل ہوگیا۔ جہاں دونوں اطراف میں واقع حجروں کے برآمدوں میں ہزاروں بھارتی مسلمان مرد، عورتیں اور بچے فرش پر بچھی پرالی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور اب رفتہ رفتہ نیند سے بیدار ہو رہے تھے ان برآمدوں کے آگے بھی دوسرے شہروں سے آئے ہوئے مسلمانوں کی دکانیں تھیں جو اشیائے خورد ونوش، اگربتیوں، کتابوں عطریات اور نگینوں وغیرہ سے متعلق تھیں۔ یہ دکاندار بھی اب بیدار ہوکر مسجد کی جانب جا رہے تھے۔ میں بھی اس ہجوم کے ساتھ رنگین مچھلیوں والے تالاب سے وضو کرکے مسجد میں داخل ہوگیا، جو ہندوستان بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ یہاں مجھے بمشکل ایک کونے میں جگہ ملی۔ نماز کے بعد میں حضرت مجددؒ کے روضے کی طرف گیا جنہیں اقبالؒ نے ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان کہا ہے۔ وہاں عقیدت مندوں کا اتنا ہجوم تھا کہ لحد مبارک تک پہنچتے پہنچتے قریباً پندرہ منٹ صرف ہوگئے یہاں لوگ سانس روکے کھڑے تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں باآوازِ بلند ذکر کی بھی ممانعت ہے۔ چنانچہ یہاں اتنی خاموشی تھی کہ سانسوں کی صدا تک سنائی دیتی تھی۔ لوگ دعا مانگ کر دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے تاکہ قطار میں کھڑے دوسرے لوگوں کے لئے جگہ خالی کرسکیں۔ برآمدے میں کچھ بزرگ چادروں سے چہرے چھپائے مراقبے کے عالم میں تھے۔ میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے مگر ہونٹ وا نہ ہوئے کہ یہ وہ مقام تھا جہاں چہرے ہی دعا بن جایا کرتے ہیں۔

یہاں سے فراغت کے بعد میں واپس اپنے حجرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ مسجد سے حجرے تک قریباً دو سو گز کے درمیانی ٹکڑے میں واقع دکانیں اب آباد منظر آرہی تھیں۔

حجرے میں خواجہ ہاشمی اور بھٹی پہلے سے براجمان تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے پاندان کھولے ہوئے تھے اور دہری دہری گلوریوں سے "ناشتے" میں مشغول تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلے پنجابی دیکھے تھے جو پان کے اس طرح دلدادہ تھے کہ صبح سے پان خوری کا آغاز کرتے تھے اور رات گئے تک یہ شغل فرماتے تھے۔ خواجہ مجید کے علاوہ ان میں سے ہر ایک شخص دن میں بلا مبالغہ ساٹھ ستر پان کھاتا تھا۔ مجھے اپنے بستر پر بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک پچکے ہوئے گالوں والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر تیس پینتیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ مگر وہ پچاس کے پیٹے میں لگتا تھا۔ اس نے میلا سا پاجامہ اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ مجھے اس کے جسم میں کہیں کوئی چیز گڑبڑ محسوس ہوئی۔ غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ کبڑا ہے۔

"السلام علیکم بابو جی!" اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد میرے ہم سفروں کو سلام کیا۔ اس کے انداز میں بہت مسرت اور گرم جوشی تھی۔ "مجھے پتہ چلا کہ آپ پہنچ چکے ہیں۔ بہت دیر سے آپ کو "تلاش" کر رہا تھا۔ اب کہیں آپ کا کمرہ ملا ہے۔"

میرے ہم سفروں نے اسی مسرت اور گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور پھر خواجہ مجید نے کہا "ہم بھی تمہیں تلاش کر رہے تھے۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ اس بار بھی سہارنپور والے حافظ جی ہی کے ساتھ آئے ہو؟"

"جی بابو جی!" اکبر نے کھلی ہوئی باچھوں کے ساتھ جواب دیا۔ جس سے اس کے سامنے والے لمبے لمبے دانت مزید نمایاں ہوگئے۔

"اب تم یوں کرو کہ دوڑ کر ہم لوگوں کے لئے چائے لے آؤ۔" خواجہ صاحب نے کہا، جس پر وہ "ابھی آیا بابو جی" کہہ کر کمرے

سے نکل گیا۔

"اکبر ہمارا پرانا دوست ہے!" خواجہ مجید نے مجھے بتایا۔ "ہم یہاں ہر سال مجددؒ کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں۔ وہ سہارنپور کے ایک ہوٹل میں بیرا ہے، اس ہوٹل کا مالک ہر سال عرس کے موقع پر یہاں اپنی دکان لگاتا ہے اور اکبر ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ بہت اچھا انسان ہے!"

اکبر چائے لے آیا تھا، میرے ہم سفروں نے انڈے کا حلوہ، ڈبل روٹی، بسکٹ اور ناشتے میں استعمال ہونیوالی کتنی ہی چیزیں اپنے اپنے ڈبوں میں سے نکالیں اور دستر خوان سجا کر بیٹھ گئے۔ یہ سب اشیاء وہ پاکستان سے اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اکبر چائے رکھ کر لوٹنے ہی کو تھا کہ خواجہ حفیظ نے اس سے کہا "ہم نے تمہارے لئے رشتے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ایک بڑی خوبصورت لڑکی تمہارے لئے تلاش کی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ پہلے میں لڑکے سے خود بات کروں گی!"

"آپ تو باؤجی" ہمیشہ" یوں ہی مذاق کرتے ہیں" اکبر نے کھلکھلاتے ہوئے کچھ اس ناامیدی سے کہا جس میں کچھ کچھ امید کی جھلک بھی تھی!

"نہیں یار بالکل سچ کہہ رہے ہیں، مجھ پر یقین نہیں تو بھٹی صاحب سے پوچھ لو۔" خواجہ حفیظ نے یعقوب بھٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس پر خواجے کے اس گواہ نے فوراً "ہاں" میں سر ہلایا

"باؤجی آپ بھی مذاق تو نہیں کر رہے؟" اکبر کو غالباً کچھ کچھ یقین آچلا تھا، چنانچہ اس نے ایک بار پھر تصدیق کے لئے یعقوب بھٹی سے پوچھا۔

"بھئی اس میں مذاق کی کونسی بات ہے!" اس بار لواز ہاشمی نے بھی اپنی طرف سے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ "تم ایک دفعہ ہاں تو کر دو!"

"تو جی، پھر میری طرف سے ہاں ہی سمجھیں۔" اکبر نے شرماتے شرماتے کہا۔ "میں نے تو اپنی دلہن کے لئے بڑے "کھوبصورت" دو جوڑے بھی سلوا کے رکھے ہوئے ہیں۔"

"بس ٹھیک ہے ہم اگلی بار آئیں گے، تو بات پکی کر لیں گے۔" خواجہ مجید نے غالباً اس طول پکڑتے مذاق کو ختم کرنے کے لئے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی اکبر حجرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پاؤں خوشی سے ڈگمگا رہے تھے۔

"خواجہ صاحب اس غریب کے ساتھ یہ مذاق نہ کریں۔ وہ آپ کی بات کو سچ سمجھ بیٹھا ہے۔ اب وہ سارا سال دلہن کے خواب دیکھتا رہے گا۔ اور اگلے سال جب آپ یہاں آئیں گے تو اس کا یہ خواب ایک بار پھر بکھر جائے گا۔" میں اس دوران خود کو تکلیف میں محسوس کر رہا تھا۔ سو میں نے بالآخر اس کا اظہار کر دیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" خواجہ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ابھی تک ہوٹل کے مالک حافظ جی نے اس کی یہ غلط فہمی دور کر دی ہو گی اور یوں بھی وہ ایسی باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ ہم اگر اس سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں تو وہ خود ہمیں اس پر اکسانے لگتا ہے۔!"

دریں اثنا ہم نے ناشتہ کر لیا تھا۔ اکبر برتن اٹھا کر دروازے سے نکل رہا تھا۔ ایک کشمیری مسلمان اندر داخل ہوا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی اور اپنی کمر کے گرد اس نے کمبل لپیٹا ہوا تھا۔ وہ انیس بیس برس کا نوجوان تھا۔ "السلام علیکم" کہنے کے بعد وہ سیدھا میری طرف آیا۔ غالباً میرے کشمیری خدوخال کی بنا پر اس نے میرا حال احوال کشمیری ہی میں دریافت کرنا

مناسب سمجھا۔ "کیا چھس کھبرۂ؟" اس کے چہرے پر ایک دلنشیں مگر بے بس مسکراہٹ تھی۔
"وارے تھِفس" میں نے اسے کشمیری ہی میں اپنی خیریت کی اطلاع دی اور اس کے ساتھ ہی میری دو کیبلری ختم ہوگئی کہ یہ دونوں لفظ میری پھوپھی اماں نے مجھے بچپن میں سکھائے تھے۔ جو کئی پشتوں سے پنجاب میں آباد ہونے کے باوجود ابھی تک روانی سے کشمیری بول لیتی تھیں۔

کشمیری نوجوان نے غالباً میرے لہجے سے اندازہ لگالیا کہ میں بناسپتی کشمیری ہوں، چنانچہ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ "میں اپنے بھائیوں سے ملنے آیا ہوں۔" اور پھر وہ باری باری سب کے ساتھ مصافحہ کر کے آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب دس بجنے کو تھے۔ اور پروگرام کے مطابق ہمیں یہاں سے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحدؒ کے مزار پر حاضری دینے کے لئے جانا تھا۔ ہم دربار سے نکل کر دائیں جانب پختہ سڑک پر چلنا شروع ہوگئے۔ قریباً ایک میل چلنے کے بعد بائیں جانب کھیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ جن کے درمیان میں جہانگیر کے زمانے کا ایک تاریخی قبرستان تھا۔ ہمیں اس قبرستان سے گذر کر ایک ٹیلے پر واقع شیخؒ کے مزار پر جانا تھا۔ یہاں اچھوت عورتیں گود میں بچے اٹھائے خیرات کے لئے "کنیا دان کنیا دان" کہتی ہوئی زائرین کے پیچھے پیچھے بھاگتی تھیں۔ بھارتی مسلمان جوق در جوق شیخ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد واپس آرہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق کانپور، سہارنپور، مراد آباد اور احمد آباد سے تھا۔ انہوں نے روئی سے بھری صدریاں پہنی ہوئی تھیں۔ ہمارے سینوں پر پاکستان کا بیج تھا چنانچہ وہ انتہائی محبت سے ہماری طرف بڑھتے، مصافحہ کرتے بغل گیر ہوتے اور بے بس نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ ایک بوڑھا کشمیری جھکی ہوئی کمر کے ساتھ دونوں کاندھوں پر ایک ایک کلہاڑی رکھے ہمارے قریب سے گذرا۔ اس نے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور میرے وطن کے لئے دعا کرو" کہہ کر آگے کو چل دیا۔ میں چلتے چلتے تھک گیا تھا چنانچہ دم لینے کے لئے ایک پرانی قبر کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اتنے میں میلے برقعوں میں ملبوس دو خواتین ادھر ادھر دیکھتی ہوئیں ڈرتی ڈرتی میرے قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک نے گود میں بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ وہ میرے سینے پر سجے ہوئے سبز رنگ کے بیج کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی تھیں، چنانچہ ان میں سے ایک جھجکتی جھجکتی آگے بڑھی اور دھیمی آواز میں کہا۔ "بیٹے تم پاکستان سے آئے ہو۔"

"ہاں ماں جی، میں پاکستان سے آیا ہوں۔"

"بیٹے!" یہ لفظ ادا کرنے کے بعد اس کی آواز رندھ گئی اور اپنے ساتھ والی خاتون کی گود میں موجود بچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میرا پوتا ہے۔ اس کے باپ کو ہندوؤں نے چند سال قبل قتل کر دیا تھا۔ اس کے سر پر پیار دو۔" وہ غالباً کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر شدت غم سے اس کی آواز اس کے اندر گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر یہ نحیف و نزار سا بچہ اپنی گود میں لیا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ میری زبان گنگ ہوگئی تھی۔ خاتون نے لرزتے ہاتھوں سے بچہ واپس گود میں لیا۔ اور پھر کچھ کہے بغیر نقاب کے پلو سے آنسو پونچھتی ہوئی اپنی بہو کے ساتھ واپس چلی گئی۔

میری تھکن میں اضافہ ہوگیا تھا۔ میں بوسیدہ قبروں میں سے گذرتا ہوا کھلی پگڈنڈی پر آگیا۔

بھارتی مسلمانوں کے مصافحوں اور معانقوں کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا۔ ان میں سے ایک سفید ریش بزرگ بھی تھے۔ انہوں نے مجھے روک کر گلے لگایا، ماتھا چوما اور پھر بغیر کچھ کہے میرے کاندھوں پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگے۔ ان کی ہچکیاں اس

سینکڑوں سال پرانے قبرستان میں دفن ہوتی چلی گئیں۔ میں نے راستہ بدل لیا۔ میں ان لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک دوسری طرف سے میں شیخ رح کے مزار پر پہنچا، فاتحہ خوانی کی اور واپس اپنے حجرے میں چلا آیا۔ کھل کر رونے کے لیے خلوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ امیرے باقی ساتھی بھی حجرے میں واپس آ گئے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی مسلمان عورت یا مرد حجرے میں داخل ہوتا اور پاکستان میں مختلف شہروں میں بسنے والے اپنے عزیزوں کے بارے میں متعلقہ شہر کے مکین سے ان کی خیریت دریافت کرتا یا اپنی خیریت کا پیغام بھیجتا۔ لیر کوٹلے کی رحمت بی بی نے مجھ سے کہا "ماڈل ٹاؤن چکیاں کے نزدیک سعدی دھوبی کا گھر ہے، اسے کہنا کہ میں نے پاسپورٹ بنوا لیا ہے۔ اب وہ نذیراں کی شادی کا دعوت نامہ بھیج دے۔" ایک پچاس پچپن کی عورت حجرے میں داخل ہوئی اور لائل پور کے ایک شخص سے لوگوں کا نام لے لے کر پوچھتی رہی کہ کیا وہ انہیں جانتا ہے۔ ہر بار نفی میں جواب ملنے پر اس کے چہرے پر غم کی گہری لکیریں پھیل جاتیں۔ آنسو اس کی پلکوں کی دہلیز پر تھے جنہیں وہ بار بار واپس آنکھوں میں لے جاتی۔ اس نے ہمیں کوئی پیغام نہیں دیا اور ہمارے ذریعے اسے کسی کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔ واپس جاتے ہوئے اس نے کہا "میرے ویرنے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے گلہ تھا کہ میں اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکی۔ تم بھی میرے ویر ہو۔ میں یہاں اکیلی ہوں میرے لیے دعا کرنا۔"

اگلے روز فجر کی نماز کے بعد پاکستانی وفد کے ارکان نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر چادر چڑھائی۔ بعد ازاں قرآن خوانی ہوئی۔ مسجد ہندی مسلمانوں سے بھری ہوئی تھی۔ مسجد کے باہر بھی عقیدت مندوں کا ہجوم تھا اور یہ ہجوم مرکزی دروازے سے باہر سڑک پر واقع دکانوں تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ ختم قرآن اور ایصال ثواب کے بعد وفد میں شامل پیر صاحب چورہ شریف نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ان کے لبوں سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات لاؤڈ سپیکر کے ذریعے سینکڑوں کی تعداد میں مسجد کے باہر کھڑے دم بخود سامعین کے دلوں میں اترتے چلے گئے۔ انہوں نے مریضوں کی شفایابی کے لیے دعا کی۔ بے اولادوں کے لیے اولاد کی دعا کی۔ اور پھر انہوں نے کہا "اے خدا کچھ دعائیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دلوں میں مچل کر رہ جاتی ہیں لب پر نہیں آتیں مگر تو پژمردہ چہروں پر لکھی ہوئی دعائیں پڑھ سکتا ہے۔ تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ تو سب کے دکھوں سے واقف ہے۔ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے خدا یہ بے زبان دعائیں سن اور پژمردہ چہروں پر رونقیں لکھ دے۔" اس دعا میں نجانے کیا اثر تھا کہ مجمع میں سسکیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پھر ہچکیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ دکھی لوگوں کے آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ کر انہی کی قمیصوں پر جذب ہو رہے تھے۔ چاروں طرف آہ و بکا کا عالم تھا۔ مجھے یوں لگا میں میدانِ کربلا میں کھڑا ہوں جہاں تپتی ہوئی ریت ہے اور جھلسے ہوئے چہرے ہیں۔

ہونے والا بادشاہ

محمد خالد اختر

عظمت اللہ خاں چک زئی کو میں نے پہلی بار برٹش کونسل لائبریری میں دیکھا جس کا میں پچھلے اٹھارہ سال سے ممبر چلا آ رہا ہوں (کسی زمانے میں وہاں دوسرے تیسرے روز سنڈے آبزرور، سنڈے ٹائمز، نیو سٹیٹس مین اینڈ نیشن کا پہروں مطالعہ کرنے اور کتابوں کی رفاقت میں خود کو بھولنے کی خاطر جایا کرتا تھا مگر اب کبھی کبھار ہی جاتا ہوں) ستمبر ۱۹۸۹ء کے دن ہوں گے۔ اس مہتم بالشان واقعے کی تاریخ یاد نہیں۔ ہم "ک۔ن۔" عربی کا عالم، وہ سفرنامہ نگار، وہ "مت" — ماہر موسیقی اور محقق، لائبریری میں اپنی ہفتوں کی زائد المیعاد کتابیں لوٹانے گئے تھے، میں جہاں سنڈے آبزرور کے کتابوں کے صفحوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک اس کی موجودگی سے آگاہ ہوا۔ وہ میز کی دوسری طرف میرے سامنے کھڑا اخباروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جیسے اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ اگلے لمحے وہاں نہ پا کر وہ دوسری میز کی طرف لپکا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک بے چین اشتیاق، ایک حریصانہ دریافت کی چاہ سی تھی۔ دوسری میز پر بھی اس نے کچھ رسائل الٹ پلٹ کئے اور پھر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ تیسری میز پر تھا۔ اس کی غیر معمولی وضع قطع، مستعد حرکات اور عام ہیئت نے میری نگاہوں کو مسخر کر لیا۔ میں نے پہلے سوچا وہ کوئی افریقی مغربی خطوں کا باشندہ ہے۔ اس کے ذرا بھاری چہرے کی گندمی رنگت میں وہ دودھیا چاکلیٹ کی سی ہلکی جھلک تھی جو مغربی خطوں کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ وہ لمبا تھا اور کسی قدر گٹھیلا۔ سر پر میلی سی رنگین کاڑھے ہوئے کپڑے کی گول ٹوپی، سلیٹی رنگ کا کمبل کاندھے پر، بسنتی انگرکھا نما کرتا اور پاجامہ، پاؤں میں کھڑاؤں۔ اس کا چوڑا چہرہ ایک پریشان نوکیلی مخروطی داڑھی سے سجا ہوا تھا۔ ہونٹ موٹے بھرے بھرے اور نرم تھے —— افریقی ہونٹ۔ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تھا؟ اور کینیا کے نجات دہندہ اور پیشوا جومو کینیاٹا کی تصویر میرے ذہن میں آئی۔ وہ جومو کینیاٹا سے انتہائی طور پر مشابہت رکھتا تھا۔ اس کے افریقی نژاد ہونے کا تقریباً مجھے یقین سا ہو گیا۔ اس حلیئے اور ہیئت کے ساتھ وہ برٹش کونسل میں کیا کر رہا ہے؟ کس خاص میگزین یا آرٹیکل کی تلاش میں وہ سرگرداں ہے، جو اسے مل نہیں رہا۔

میں اس کی عجیب حرکات کو دیکھتا رہا اور اس کی شخصیت نے مجھے رجھا لیا۔ یہ نہیں کہ عجیب الخلقت لوگ برٹش کونسل میں نہیں آتے۔ اس عمدہ کتاب خانے میں ہر وضع اور طرز کے لوگ آتے ہیں۔ اور ایک بار (مجھے یاد ہے) میں نے وہاں گیروا کپڑوں میں ملبوس ایک ہندوستانی سادھو کو دیکھا جو ایک صحرائی جانور لگتا تھا، یا ایک تبتی جو شاید اپنی اصل زندگی میں ہمالیہ کی چوٹی پر بھبھوت ملے، دھونی رمائے، شیر آسن جمائے ٹھنکے منکے سے درست پرمیشور سے لو لگاتا ہوگا۔ (وہ پنچ (PUNCH) کے کسی مضمون میں غرق تھا اور دو تین بار فقرے کی مزاحیہ بندش پر اس کے گنگنانے کی آواز بھی سنائی دی۔ جب میں برٹش کونسل میں جاتا وہ وہاں پنچ یا سنڈے آبزرور یا سنڈے ٹائمز پڑھتا ہوا موجود ہوتا —— اور پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔ شاید واپس اپنی ہمالیہ کی چوٹی پر ڈیرہ جمانے کے لئے)۔ ایسے لوگ وہاں آتے ہیں مگر انسان اپنی تجسس کی حس اور اپنے ہم نفسوں سے تعلق سے اس درجہ عاری ہو چکا ہے کہ ان کی طرف دھیان نہیں دیتا جو میری نظر میں قابل افسوس بات ہے۔ اگر ہم دوسروں سے مطلب نہیں رکھتے، ہر ڈگر اور ہر ہیئت کے آدمی سے رفاقت اور دوستی سے بات نہیں کرتے تو کیا ہم دھتکارے ہوئے بدنصیب نہیں؟ —— سب سے تاریک زنداں میں قیدی —— زنداں جو ہماری اپنی ذات کا ہے۔

میں اس آدمی میں گم تھا۔ میں اس سے پوچھ گچھ کرنے اور یہ جاننے کے لئے کہ وہ کون اور کیا ہے، مر رہا تھا۔ یہ اپنی رٹ پر پڑے ہوئے جاسوس کی وجہ یہ میرے لئے آسان بات نہیں تھی۔ میں ایک بے حد شرمیلا، جھینپو اور ڈرپوک سا شخص ہوں اور اجنبیوں سے بات کرنے کے خیال ہی سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، ہاتھ پاؤں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں — اس بار افریقی کو جاننے اور اس سے بات کرنے کی خواہش میری قدرتی جھینپ پر غالب آگئی۔ اگلی بار جب وہ میری میز پر اپنی میگزین کی تلاش میں آیا اور اس پر پڑے اخباروں کو الٹ پلٹ کرنے لگا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اپنے میں جرأت پیدا کر کے میں میز کے دوسری طرف گیا جہاں وہ کھڑا تھا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں بھی کوئی اخبار ڈھونڈ رہا ہوں، میں نے سرسری سے انداز میں اس سے پوچھ ہی لیا۔ "ایکسکیوزمی کیا آپ کا تعلق افریقہ یا مغرب سے نہیں؟"

ایک میٹھی رفیقانہ مسکراہٹ اس کے خوشگوار مطمئن چہرے پر آئی اور اس نے بڑے لطف و کرم سے جواب دیا "نہیں میں افریقہ یا مغربی خطوں کا نہیں، پاکستان میرا وطن ہے۔"

میں نے امید کی کہ اپنے سوال سے میں اس کی نظروں میں احمق نہیں بنا۔ اس کے افریقی ہونے کے بارے میں میری تھیوری پر خاک پڑ گئی۔ وہ اپنے بارے میں باتیں کرنے کے لئے تیار تھا گو وہ ان باتونی اجنبیوں میں سے نہیں تھا جن کی زبان پہلے کھلنے کے بعد قینچی کی طرح چلتی ہے اور جو پہلے ہی ہلے میں تمہیں اپنے اور اپنے مورثوں کے کارناموں کی مفصل تاریخ بتا کر دم لیتے ہیں۔ وہ کم گو، اور فضول گو نہیں تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام عظمت اللہ اچکزئی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ سات آٹھ سال کا تھا۔ اصل مولد امروہہ تھا جہاں سے ہجرت کر کے اس کے خاندان کے لوگ کراچی میں آن بسے۔ چند سال پہلے اس نے کراچی یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا اور اسے ایک اچھی خاصی ملازمت مل گئی مگر کچھ مدت کے بعد اس کا جی ملازمت سے بھر گیا۔ اس نے استعفیٰ دے دیا۔

"میں تین ماہ سے لاہور میں ہوں۔ یہاں میرا ایک بھائی مغل پورہ ریلوے ورکشاپ میں فورمین ہے۔" اس نے کہا "میں اس کے پاس ٹھہرا ہوں۔"

میں نے پوچھا کہ اس نے استعفیٰ کیوں دیا اور اب اپنی معاش کے لئے اس کا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی ملازمت اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھی اور وہ غلط طریقوں سے روپیہ کمانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ایک پنہاں پُراسرار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیلی۔ "وہاں میری زندگی ضائع ہو رہی تھی۔ میں ایک انوکھا شخص ہوں — ایک اور بات بھی تھی — جیسے آپ جلد ہی جان جائیں گے۔ قدرت نے مجھے ایک اور بڑے کام کے لئے بنایا ہے۔"

اس نے یہ بات ایسے بھولپن سے کہی کہ مجھے اس پر ہنسنے کا خیال تک نہ آیا۔ میں نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا — تعجب کرتے ہوئے کہ اس فقرے سے اس کی مراد کیا تھی۔ تقدیر اس سے کیا کام لینا چاہتی تھی۔ کونسے دور کے افق اس کی مدنظر تھے؟ میں خود کو بے جا طور پر متجسس ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر ایک کے اپنے خواب ہوتے ہیں، چند ایک ان کی باتیں کرتے ہیں اور بہت سے ان کو اپنے سینے میں قبر تک لے جاتے ہیں۔

ہم اب کسی ارادے کے بغیر میز سے ہٹ کر کتابوں کے شیلفوں کے پُرسکون خانے میں آ کھڑے ہوئے — دو اجنبیوں کی دوستانہ گفتگو جن کے ستارے ایک دو گھڑی کے لئے آن ملے ہوں، جو ایک دوسرے کے گُن کو جانچ رہے ہوں۔ اپنی عجیب ہیئت کے باوجود پُرشفقت، نرم طبیعت، نرم گفتار شخص تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس کے گلے میں چاندی کا تعویذ ہے، اور بائیں کلائی میں ایک کڑا جس کے سرے سانپ کے منہ کی صورت کٹے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں اور وہ کھردرے دہقانی ہاتھ نہیں تھے بلکہ نازک اور نفیس، ایک آرٹسٹ اور سوچنے والے کے ہاتھوں کی طرح، بارہ چھلے پہنے جن میں رنگ برنگے پتھروں کے نگینے جڑے تھے۔ وہ فی الواقع ایک افریقی چیف کی طرح پُرتجمل لگتا تھا، رائڈر ہیگرڈ کا کوئی کردار۔ کئی ان کہے سوال میرے ہونٹوں پر تھے جن کا پوچھنا میں نے مناسب نہیں جانا۔

میں نے کہا "آپ کو انگریزی ادب سے بڑا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں پڑھنا مفید ہے"۔ وہ انگریزی زبان جس میں ہم گفتگو کر رہے تھے، ہچک ہچک کر بولتا تھا، مگر وضاحت کے ساتھ بنا وٹی لہجے کے بلکے سے شائبے کے بغیر کیونکہ وہ ایک سادہ اور بے میل آدمی تھا۔ "ادب سے اگر آپ کا مطلب فکشن وغیرہ سے ہے تو مجھے اس کا قطعی شوق نہیں۔ فکشن کا مطالعہ تضیعِ وقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جب میں لاہور میں ہوں میں برٹش کونسل تقریباً روزانہ آتا ہوں، میں ٹائمز آبزرور کے سیاسی صفحات، نیوسٹیٹسمین اینڈ نیشن، سپیکٹیٹر، اکانومسٹ اور دوسرے انگریزی رسائل بغور دیکھتا ہوں۔ وقت گزاری کے لئے نہیں بلکہ اس لئے تاکہ میں کم سے کم وقت میں سیاسیات پر عبور حاصل کروں۔ ان رسائل میں بڑے کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور لیڈروں کی سیاسی غلطیوں اور فروگزاشتوں کا پتہ چلتا ہے جن کی وجہ سے وہ مار کھا گئے اور طاقت ان کے ہاتھ سے چلی گئی۔ — جب میں سمجھوں گا کہ مجھے سیاسی علم پر مکمل ماسٹری ہو گئی ہے تو ایک مملکت کا راج پاٹ مجھے مل جائے گا۔ (I WILL GET A COUNTRY) ابھی میں نے سیاسیات کو پوری طرح قابو میں نہیں کیا لیکن وہ وقت اب دور نہیں۔"

میں اس غیر متوقع انکشاف پر ایک بار ہل گیا۔ کیا عظمت اللہ اچک زئی کا دماغ درست حالت میں تھا — ؟ پھر میں نے سوچا کہ اگر وہ سودائی ہے تو دنیا کے ممالک کے رہنما پریذیڈنٹ اور بادشاہ سب ہوشمند اور صحیح الدماغ تھے؟ ہوشمندی مختلف لوگوں میں مختلف نوعیت اور ڈھنگ کی ہوتی ہے۔

سو میں نے اپنا چہرہ سیدھا رکھا اور اس کی بات پر حیران ہوئے بغیر متانت سے پوچھا "کیا آپ پاکستان کا نظم و نسق سنبھالنے والے ہیں؟" میں اس کے کھیل میں پورے خلوص اور دردمندی سے شریک ہو گیا (وہ اتنا شفیق اور حلیم اور نرم مزاج تھا) اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا، اس کی ٹانگ کھینچ رہا تھا تو تم غلطی پر ہو۔ میں نے اسے گوف (GOOF) نہیں سمجھا۔ اس نے شاید ایسے احمقانہ سوال پوچھنے پر مجھے "گوف" جانا کیونکہ ایک عیارانہ سیاسی سی مسکراہٹ اس کے بھرے گیلے ہونٹوں میں نمودار ہوئی۔ اس کے بھولے متین چہرے پر ہوشیاری کا سایہ سا گذرا (میں نے ایسا سوچا) ایک سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے شخص کی مانند اس نے اس سوال کا صاف اور واشگاف جواب دینے سے گریز کیا۔

"اس سوال کا جواب اس مرحلے پر دینے کی مجھے اجازت نہیں" اچک زئی نے بائی لائٹ کا سگرٹ سلگایا۔ وہ ایک چین سموکر تھا۔ "پاکستان کی تخصیص نہیں کوئی بھی مملکت مجھے مل سکتی ہے۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا۔ اس کا فیصلہ تب ہو گا جب میری سیاسی بصیرت مکمل ہو جائے گی — یعنی دنیا کے موجودہ سربراہوں سے بڑھ چڑھ کر۔ میں ان کی سیاسی غلطیاں کبھی نہیں کروں گا اور اس لئے لوگ مجھے ہمیشہ اقتدار کی کرسی پر رکھیں گے۔"

اس نے مجھے سمجھایا کہ اس وقت دنیا کے ملکوں کے سربراہوں میں سیاسیات کے علم کا فقدان ہے۔ ان کو اتنی دسترس نہیں جو اسے اس وقت بھی حاصل ہے۔ اسی لئے وہ ایسی فاش سیاسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ ان کی مملکتوں میں گدھے کے ہل پھر جاتے ہیں اور اقتدار کی کرسی ان کے تلے سے کھینچ جاتی ہے۔ اس کی سیاسی بصیرت اتنی بے عیب ہو گی کہ لوگ اس کی حکومت سے روگردانی نہیں کریں گے۔ دوسری مملکتیں بھی اسے ہی اپنا سربراہ بننے کی دعوت دیں گی۔ میں نے پوچھا کہ آیا اس نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے کوئی سیاسی پارٹی بنائی ہے۔ اس نے بھولپن اور اعتماد سے جواب دیا کہ جب وہ سیاسی مسائل پر مکمل طور پر حاوی ہو جائے گا تو لوگ جان لیں گے کہ ملکی امور کو سلجھانے کے لئے اس سے بہتر آدمی موجود نہیں۔ وہ خود ہی اسے اقتدار سونپ دیں گے۔ اور اسے حکمراں منتخب کر لیں گے۔ وہ اس کا ہر معاملے، ہر کڑے وقت میں ساتھ دیں گے۔ کیونکہ ان کو اس کے فرمانروا ہونے کی اہمیت کا علم ہو گا۔ میں نے اس سے اسلامی نظام، جمہوریت، سوشلزم کے متعلق کچھ بحث کرنے کی کوشش کی مگر میں نے بھانپ لیا کہ انگریزی رسائل اور مجلوں کے بغور مطالعہ کے باوجود اس کا سیاسی اور معاشی نظریات کا علم ایک بچے کا سا ہے۔ ان کو ان نظریات میں قطعی دلچسپی نہیں تھی اور وہ معصومیت سے یہ سمجھتا تھا کہ سیاسیات پر عبور کے بعد لوگ خود اس کے پاس چل کر آئیں گے اور اس سے عامل بننے کی درخواست کریں گے۔ پارٹی سسٹم کو شاید وہ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اس کی اسے پروا نہیں تھی اور اس کا فرمانروائی کا CONCEPT منتخب جمہوری صدر یا پرائم منسٹر بننے سے کہیں آگے تھا۔ وہ بادشاہ بنے گا۔ اپنے ملک کے سیاہ و سفید کا مختار۔ نہ ریفرنٹ کے دخل۔ ہیروں کے تاج اور عصائے شاہی کے ساتھ ایک اصل بادشاہ جسے لوگ خود جڑاؤ تخت پر لا کر

بتھ ئیں گے کیونکہ اس کا علم سیاست وجہاں بانی سب ملکوں کے فرمانرواؤں سے کہیں زیادہ صائب اور اعلیٰ مرتبے کا ہوگا..... عظمت اللہ اچک زئی ——
میں نے سوچا تھی الواقعہ ایک افریقی چیف ہے! اس میں کوئی کلام نہیں کہ سر سے پیر تک وہ رائل لگتا تھا —— سنجیدہ، پروقار انگلیوں کی پور پور چھلے —— کیا یہ پچھلے رائلٹی کا نشان تھے!

"جب مجھے کوئی ملک ملنے کا وقت آیا" اس نے بائی لائٹ پھونکتے ہوئے کہا "میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ دعا کریں کہ میں جلد سیاسیات پر عبور پا لوں۔ بس یہی دیر ہے"۔

مجھے بائی لائٹ پیش کرتے ہوئے اس ہونے والے بادشاہ نے شفقت اور گرمی کے انداز میں مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں کون تھا۔ اور کس پیشے میں کیا کام کرتا تھا۔ میرے بچے کتنے تھے اور ان کی عمریں کتنی تھیں۔ میں نے اسے بتایا۔ اور جب میں نے اسے کہا کہ میں اب پنشن سے پہلے کی لمبی چھٹی پر ہوں۔ اور میرے بچے ابھی سکول میں ہیں اور ان میں سے کوئی فارغ التحصیل ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا تو مجھے کچھ کچھ امید تھی کہ میری آنے والی مشکلات کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے اپنی حکومت میں پرائم منسٹر یا منسٹر آف ٹکنالوجی کی پیش کش کرے گا۔ (تم جانو میں یہ کھیل پوری سنجیدگی سے کھیل رہا تھا) اس نے اس قسم کی کوئی پیش کش نہیں کی مگر چند اچھے و نیاداری کے مشورے دیئے جو اس کی میرے معاملات میں دلچسپی کو ظاہر کرتے تھے۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ یہ بظاہر معصوم سا آدمی ان مشکلات سے پوری طرح واقف تھا جو ایک حکومت کے ملازم کو پنشن کے بعد پیش آتی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ سرکاری خزانہ سے پنشن وصول کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ اس نے مجھے نصیحت کی کہ میں ابھی سے اپنی پنشن کے کاغذات مکمل کرالوں ورنہ بعد میں بڑی مشکل ہوگی اور دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔ گراچیوٹی کی رقم کے بارے میں اس کا مشورہ تھا کہ میں اس میں سے ایک پائی بھی خرچ نہ کروں اور ساری کی ساری رقم کسی بنک میں فکسڈ ڈپازٹ کے کھاتے میں جمع کرادوں..... منسٹر آف ٹکنالوجی کے عہدے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں، جس سے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کس قسم کی حکومت اپنی نئی مملکت میں قائم کرنے کا ارادہ اس کے ذہن میں تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مبہم طریق سے کہا "میں اپنے منصوبے کو آخری شکل دے رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقی یوٹوپیا ہوگی —— اس میں کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ سب کے لئے عدل و انصاف ہوگا اور سب ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔ میں پولیس رکھنے کے حق میں نہیں۔ جب کوئی کسی پر ظلم نہیں توڑے گا کسی کے حق کو نہیں مارے گا تو پولیس کیوں؟

میں کئی اور دوسرے سوالات اس سے اس کی نئی مملکت اور خود اس کے بارے میں پوچھنے کا آرزو مند تھا (کیا اس کی کوئی جنسی زندگی تھی اور کس قسم کی)، مگر میرے دوست کاؤنٹر پر پی تی کتابیں اٹھوا کر کے میرا انتظار کر رہے تھے —— کچھ حیران کہ میں ایک عجیب الہیئت مخلوق سے کیا باتیں کر رہا ہوں۔ میں نے عظمت اللہ اچک زئی سے دوبارہ ملاقات کی تمنا کا اظہار کر کے رخصت چاہی —— اس سے ہاتھ ملایا —— ایک ڈھیلا ڈھیلا ہاتھ (میرے خیال میں بادشاہوں اور سربراہان مملکت تاجداروں کے ہاتھ اپنے وزیروں اور درباریوں سے مصافحہ کرتے وقت ایسے ہی ڈھیلے ہوتے ہیں) میں جانے لگا تو اس نے کہا "آپ ابھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ وقت آنے پر سب جان لیں گے ....:

"بہت اچھا:

میں نے اپنا قول نبھایا اور جب میرے ساتھیوں نے پوچھا کہ میں اس آدمی سے گھل مل کر کیا باتیں کر رہا تھا تو میں نے بات کا رخ بدل دیا انھوں نے بھی تقاضا نہیں کیا کیونکہ عظمت اللہ اچک زئی کی ذات میں ان کی دلچسپی اتنی ہی تھی جتنی ایک آوارہ کتے میں۔

عظمت اللہ اچک زئی بھول جانے کی چیز نہ تھا۔ اس کی پرکشش رائل شخصیت میرے خیالوں میں رہی۔ جب کبھی میں برٹش کونسل لائبریری میں جاتا میری آنکھیں اسے ضرور ڈھونڈتیں۔ اور ایک دن وہ مجھے وہاں بیٹھا مل گیا۔ وہ کتابوں کے طاقوں کے خانے میں ایک میز پر بیٹھا اپنے بائی لائٹ کا دھواں اڑاتا سنڈے آبزرور پڑھنے میں منہمک تھا —— شانت اور مطمئن۔ اس کی انگلیوں کے چھلوں کے بڑے بڑے پتھر پھیکے پن سے دمک رہے تھے۔

میں اس کی طرف گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک تپاک کی میٹھی مسکراہٹ مجھے دی۔ ہونے والا بادشاہ دو مہینے بعد بھی مجھے نہیں بھولا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے میری طرف اپنا ڈھیلا ہاتھ بڑھایا۔

میں اُس کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور اس سے پوچھا کہ اس کی سیاسیات پر کامل ماسٹری اب کتنی دور ہے اور اس کے حصول میں اب مزید کتنا وقت لگے گا۔ اس نے سیدھا جواب نہ دیا۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک ظفریابی کی چمک تھی اور چہرے پر شادمانی کی کیفیت۔

"دوست بس کام ہو گیا ہے۔ آپ جلد ہی خوش خبری سنیں گے......"

"سچ مچ عظمت اللہ صاحب؟"

"ہاں دس دسمبر سے پندرہ دسمبر کے درمیان کسی دن مجھے ملک مل جائے گا ـــ یہ بیٹی سے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے ـــ میرے حامی جمع ہونے والے ہیں۔"

"کانگریچولیشنز۔ بہت بہت مبارکباد!"

مملکت میں میرے منصب عہدے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں! ـــ کیا عظمت اللہ اچک زئی کو پتہ نہیں تھا کہ میں ریٹائر ہو رہا ہوں اور میرے پاس رہنے کو گھر نہیں۔ میں نے خود کو اس قسم کا کوئی اشارہ دینے سے روکا۔ بادشاہ متلون مزاج ہوتے ہیں۔ ان کے منہ کو آنا اچھا نہیں ہوتا۔

ہم نے پانچ دس منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر میں نے اس سے رخصت لی۔

وہ عظمت اللہ اچک زئی سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں اسے نہیں ملا۔ میں نہیں جانتا کہ آیا اسے اپنی مملکت کی فرمانروائی جس کی دھن وہ باندھے تھا ماہ دسمبر کے موعودہ دنوں میں ملی یا نہیں۔ (میں ایک مدت سے اخبار نہیں پڑھتا نہ ٹیلی وژن دیکھتا ہوں) میں دل سے یقین کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ماورائی مملکت جو اس زمین پر غالباً نہیں، اس کو آخر کار مل گئی ہے اور وہ مسرور اور مطمئن مردوں اور عورتوں کی کسی نسل پر (جو اس مملکت کے باسی ہیں) عدل و انصاف اور کشادہ دلی سے حکومت کر رہا ہے۔ اس کے بوڑھیا ہیں رعایا پر گھٹن اور دکھ کے بادل نہیں چھاتے۔ وہ فکر سے آزاد گلی کوچوں میں گاتے اور ناچتے ہیں اور دنیا کے سارے فرمانرواؤں اور شہنشاہوں کو اپنے بادشاہ ہز میجسٹی عظمت اللہ اچک زئی کے سامنے سیاسی بصیرت اور جہانبانی کے آداب میں ہیچ جانتے ہیں۔ ہاں اچک زئی کو مملکت ضرور مل گئی ہے کیونکہ وہ بہت سوں سے زیادہ اپنی وضع اور طریقے میں "اٹل" تھا۔

کیا عظمت اللہ اچک زئی اپنی حکومت کا پرشکوہ وژن دیکھنے کی بنا پر پاگل تھا؟ میں نہیں جانتا ـــ وہ ہو نا بھی تو کیا۔ ان میں سے تقریباً سب کے سب پاگل ہیں۔

فتح و شکست

مشکور حسین یاد

میں جس طرح ہارنے کا قائل نہیں ہوں اُسی طرح جیتنے کا بھی قائل نہیں۔ فی الوقت میں اُس ہار جیت کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے ہمیں روزمرّہ زندگی میں اکثر و بیشتر واسطہ پڑتا ہے، خواہ باتوں ہی باتوں میں سہی، ایک دوسرے پر چھا جانے کی خواہش، مخاطب سے اپنی بات منوانے کا جذبہ۔ ویسے ہار جیت کو وسیع معنی میں لیا جائے تو میں تب بھی اس کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک ہارنا جیتنا قطعی طور پر وحشیانہ فعل ہے۔ آدمی پوری طرح انسان بن جائے تو ہارنے یا جیتنے کا خیال اُس کے دِل میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ مکمل طور پر انسان کا جانور پن ہے جو اُس کے دِل میں ہارنے کا خدشہ یا جیتنے کی خواہش پیدا کرتا ہے۔

ممکن ہے میرے اس نظریۂ فتح و شکست کے تحت آپ کے دِل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہو کہ اگر یہ بات ہے تو دُنیا کے بڑے بڑے فاتحین کے بارے میں کیا رائے ہے؟ معاف کیجئے مجھے اُن میں سے ایک بھی بڑا انسان نظر نہیں آتا۔ یہ سب کے سب جانور تھے اور بس اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان نام نہاد فاتحینِ عالم میں سے تمام کے تمام میں جانور پن اپنے پورے شباب پر تھا۔ الحمدللہ کہ میرے آقائے نامدار سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور اُن کے سچے پیرو کاروں نے دفاع کے علاوہ کبھی کوئی اور جنگ نہیں لڑی۔ دیکھ لیجئے تمام غزوات کی حیثیت دفاعی ہے اور دفاع کے طور پر جنگ لڑنا کسی طور بھی وحشیانہ فعل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ایک اور بات بھی واضح کرتا چلوں کہ اگر کوئی ہار جیت کا قائل نہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ لڑنے کا بھی قائل نہ ہو — ہار جیت اور لڑائی کو لازم و ملزوم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ہم بغیر لڑے ہار جیت سکتے ہیں اور بغیر ہار جیت کے لڑ سکتے ہیں۔ لڑنا لہو گرم رکھنے کا ہی ایک بہانہ نہیں، لہو کو حفظ و امان میں لانے کے لیے بھی ازبس ضروری ہے۔ بہر حال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ تاریخِ عالم میں کسی سُورما کا خواہ کتنا ہی بڑا مقام کیوں نہ ہو لیکن اگر اُس نے دفاعی جنگ نہیں لڑی بلکہ وہ از خود کسی قوم یا ملک پر حملہ آور ہوا ہے تو تاریخِ انسانیت میں اُس کا کوئی مقام نہیں۔

ہاں تو میں ذکر کر رہا تھا اُس ہار جیت کا جو ہمیں آئے دِن روزمرّہ زندگی میں پیش آتی رہتی ہے۔ زید چاہتا ہے بکر سے اپنی بات منوائے اور بکر کی خواہش ہے کہ زید اُس کی بات کو تسلیم کرے۔ ظاہر ہے کہ حق بات کو تسلیم کرنے میں کوئی عُذر نہیں ہونا چاہیئے اور ناحق بات کو نہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ ہی اسے تسلیم کرانے پر اصرار کوئی عقلمندی کی دلیل، لیکن ہوتا یہ ہے کہ عموماً ہم حق بات کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ناحق بات کو تسلیم کرانے پر اصرار۔ مجھے ذاتی طور پر ایسی صورتِ حال میں حق بات کو تسلیم نہ کرنے والے پر بھی رحم آتا ہے اور ناحق بات تسلیم کرانے والے کے اصرار پر بھی میرے دِل کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں آخر یہ شخص ایک غلط بات کو تسلیم کرانے پر کیوں اَڑا ہوا ہے؟ اس کی سُوجھ بُوجھ کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ اپنے غلط اصرار پہ غور کیوں نہیں کرتا؟ مجھے اِس طرح کے بر خود غلط شخص پر غصّہ بھی آتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس کی ناسمجھی پر میرا دِل روتا بھی ہے۔ میں ایسے عالم میں درد و کرب کی عجیب منزلوں سے گزرتا ہوں جن کو شاید ماہرینِ نفسیات نے ابھی تک کوئی نام نہیں دیا۔ میرے لیے حق بات کو نہ ماننا اور ناحق بات کو منوانے پر اصرار کرنا دونوں ہی تکلیف دہ امر ہیں۔ حق بات کو تسلیم کیوں نہ کیا جائے اور ناحق بات پر اصرار کیوں کیا جائے، اپنی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی۔ مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ جب تک کوئی میری حق بات کو تسلیم نہیں کرتا میں اُس وقت تک بھی مُبتلائے کرب رہتا ہوں۔ اور جب کوئی میری اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے مجھے اُس وقت بھی سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بلکہ یہ دوسری تکلیف پہلی تکلیف سے کہیں زیادہ شدید اور تڑپا دینے والی ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں تو چونکہ غصہ شامل ہوتا ہے کہ فلاں شخص میری حق بات کو کیوں نہیں مان رہا ہے، اس لیے اس تکلیف میں وہ کسک اور چبھن نہیں ہوتی جو دوسری صورت والی تکلیف میں ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں مدِمقابل SURRENDER کر رہا ہوتا ہے۔ ادھر میرا غصہ ختم ہوا اور اُدھر آہ! میں بیان نہیں کر سکتا۔ سوچنے لگتا ہوں مجھ ایسے ایک فردِ بشر کی پوری انا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی۔ آپ خواہ ہزار کہیں کہ اپنی ہار ماننا بھی سچائی کی طرف ایک قدم ہے لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں کہ میں اس سچائی کے قدم سے پہلے کی کیفیت کو اپنی آنکھوں سے نظارہ نہیں کر سکتا۔ میں یہی سوچ کر ہاتھ مسلتا رہ جاتا ہوں کہ میری طرح کے اس شخص نے حق کو تسلیم کرنے میں اتنی دیر کیوں لگائی۔ خواہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی، خواہ شخصیت کی دوبارہ تعمیر کی خاطر ہی سہی، اُسے شکست سے کیوں دوچار ہونا پڑا۔ وہ اس حق بات کو اس سے پہلے بھی تسلیم کر سکتا تھا۔ انسان کے پاس تسلیم و رضا ایک ایسا اختیار ہے جو اُسے بہت سی مجبوریوں اور ذلتوں سے بچا لیتا ہے۔ اس شخص نے اتنی معمولی سی بات کو پہلے سے کیوں نہ جان لیا۔ شکست یا ہار کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو اُس میں آدمی کو ندامت سے دوچار ہونا پڑتا ہے — اور — کسی شخص کو ندامت کی زد میں آتے ہوئے دیکھنا میرے خیال میں کسی انسان کے بس کا روگ نہیں۔ کم از کم میں کسی کو اپنے سامنے نادم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ ندامت انسان پر عجیب افتاد ڈالتی ہے۔ اُسے عجیب طرح لخت لخت کرتی ہے۔

کانٹوں میں گھسیٹنے والا محاورہ، پاش پاش کرنے والی بات اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ انسان کی ندامت کی صحیح کیفیت کو واضح نہیں کرتے۔ ندامت زدہ انسان کچھ بھی تو نہیں ہوتا، کچھ بھی تو نہیں رہتا۔ حد یہ ہے کہ اُس پر کمزور، مجبور اور مظلوم ایسے الفاظ بھی صادق نہیں آتے۔ صحیح معنوں میں ہارنے والے انسان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ کمزور، مجبور اور مظلوم ہو۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ندامت سے دوچار ہو۔ گویا یوں سمجھیے کہ شکست اور ندامت لازم و ملزوم ہوئے۔

صحیح معنوں میں ہارنے کی بات میں اس لیے کر رہا ہوں کہ بعض وقت دُنیا کی نظروں میں ایک انسان ہار رہا ہوتا ہے لیکن صحیح معنوں میں وہ ہار نہیں رہا ہوتا بلکہ اس ضمن میں ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس وقت اُس پر ظلم ہو رہا ہوتا ہے۔ ظلم خواہ کتنی بھی شدت اختیار کرے، مظلوم سے اُس کی عزتِ نفس نہیں چھین سکتا۔ ندامت کا پہلا بھرپور وار انسان کی عزتِ نفس پر ہوتا ہے، خواہ اس کی نوعیت کسی انداز کی بھی کیوں نہ ہو۔ میرا مطلب ہے کہ خواہ ندامت بذاتِ خود عزتِ نفس کو بچانے کے لیے ہی کیوں نہ وارد ہو رہی ہو۔

مجھے جس طرح ہارنے سے ذہنی کوفت ہوتی ہے اسی طرح جیت جانے سے بھی کوئی خاص مسرّت حاصل نہیں ہوتی۔ جیتنے کی صورت میں ایک لمحہ کے لیے تو شائد میری انا کو تسکین پہنچتی ہو گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں سخت قسم کے کرب میں مُبتلا ہو جاتا ہوں۔ مگر انسانی فطرت کا ڈھیٹ پن ملاحظہ فرمایئے۔ اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ جیتنے کی خوشی ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہوتی، میرے دل میں جیتنے کی خواہش بھی موجود رہتی ہے اور میں بہر حال جیتنے کی کوشش بھی کرتا رہتا ہوں، جس کے نتیجے میں مجھ پر مسلسل قیامتیں ٹوٹتی رہتی ہیں۔ کیا کروں۔ اپنے جیت جانے کی خواہش و سعی کے باوصف مجھ میں کسی کو ہارتا ہُوا دیکھنے کی بھی ہمت نہیں۔ یہ ایک ایسی صورتِ حال ہے اور غالباً واحد صورتِ حال جس سے نمٹنے کی سکت کم از کم مجھے ایک انسان میں نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں زیادہ سے زیادہ ایک انسان یہی کر سکتا ہے کہ اس صورتِ حال کو وقوع میں نہ آنے دے۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر اس کا ایک حل یہ تلاش کیا ہے کہ دوسرے انسان کی شکست کا رُخ اپنی طرف موڑ لیتا ہوں اور یوں تمام تر طنز و مزاح کا نشانہ میری اپنی ذات بن جاتی ہے۔ میرے خیال میں دوسرے کو نادم دیکھنے کے بجائے اپنے آپ کو ذلت کا ہدف بنا لینا زیادہ بہتر رہتا ہے۔ ویسے بھی زندگی کے بیشتر دُکھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں دوسروں کی ذات میں دیکھنے کی نسبت اپنی ذات پر جھیل جانا آسان ہے۔ جہاں تک عرقِ انفعال کے قطروں کو موتی سمجھ کر چُن لینے کا سوال ہے، یہ کام صرف شانِ کریمی کو زیب دیتا ہے۔ وہی بات کہ میں تو کسی کو ریزہ ریزہ دیکھنے کی نسبت اپنے آپ کو ریزہ ریزہ کر لینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

انور شعور

○

کسی شام چپکے سے دَر آئے گا — جو بھولا ہُوا ہے، وہ گھر آئے گا
زمیں پر کہیں بھی چلا جائے وہ — زمیں گول ہے، گھوم کر آئے گا
جو ہم نے کہا تھا، نظر آ گیا — جو ہم کہہ رہے ہیں، نظر آئے گا
اکیلا نہ جا، رات کا وقت ہے — تجھے گھپ اندھیرے میں ڈر آئے گا
سفر میں کہیں کوئی جنگل ہرا — کہیں کوئی اُجڑا نگر آئے گا
گنواؤ گے جس کے لیے مدّتیں — وہ عرصہ بہت مختصر آئے گا
کرو خدمتِ صاحبانِ ہُنر — ہُنر سیکھنے سے ہُنر آئے گا
ترا قول تھا عُمر بھر کے لیے — مجھے یاد تو عُمر بھر آئے گا
محبّت میں پڑتی نہیں جھرّیاں — میں پہچان لوں گا اگر آئے گا

شعورؔ اس طرح جا رہا ہے وہاں
نہ آیا مجاہد تو سر آئے گا

○

تجھ سے کس کس طرح نباہ نہ کی — ہم نے نفرت نہ کی کہ چاہ نہ کی
بے حسی سی کیے رہے طاری — اور حاصل کوئی پناہ نہ کی
راہِ دل ہو کہ راہِ دُنیا ہو — گاہ کی اختیار، گاہ نہ کی
مُنہ پہ کالک ضرور ملوا لی — اپنی فردِ عمل سیاہ نہ کی
تاج و خود و عمامہ و دستار — بارِ سر کوئی بھی کُلاہ نہ کی
دائمی زندگی کے لالچ میں — عارضی زندگی تباہ نہ کی
دل کا ہمدرد کون ہو جس نے — کبھی پروائے انتباہ نہ کی
حُسن کا سائباں کشادہ رہا — کی محبّت کسی نے خواہ نہ کی
جس نے اُس کی طرف نگاہ اُٹھائی — پھر کسی کی طرف نگاہ نہ کی

عُمر کیا شے تھی کیا بتاؤں شعورؔ
تُو نے کس شے کی قدر آہ نہ کی

انور شعور

○

تری تلاش میں نکلے ہُوؤں کا حصّہ ہیں
وہ صُورتیں جو نہ معدوم ہیں نہ پیدا ہیں

ہزار ذائقے ہوں گے حیات کے لیکن
ہم ایک ذائقۂ تلخ سے شناسا ہیں

بکے ہوئے ہیں تماشے یہ زندگی کا یقیں
تماش بین ہیں یہ لوگ یا تماشا ہیں

ہمیں ہو شرم ذرا بھی تو ڈوب مرنے کو
چناب و جہلم و راوی ۔ بہت سے دریا ہیں

عجب تھے سچ کے لیے جان دینے والے بھی
پڑے ہیں شہرِ خموشاں میں، پھر بھی زندہ ہیں

یہ گاہ گاہ کا ملنا بھی ہے بہت ورنہ
ہمارے تم ہو بھلا کیا، تمھارے ہم کیا ہیں

بڑوں کو دیکھ کے ہوتی ہے سخت حیرانی
یہ کوئی اور نہیں ہیں، ہمارے آبا ہیں

تم اب سے قبل بھی ملتے تھے، اب بھی ملتے ہو
ہم اب سے قبل بھی تنہا تھے، اب بھی تنہا ہیں

○

کسی شام چپکے سے در آئے گا
جو بھولا ہوا ہے، وہ گھر آئے گا

زمیں پر کہیں بھی چلا جائے وہ
زمیں گول ہے، گھوم کر آئے گا

جو ہم نے کہا تھا نظر آ گیا
جو ہم کہہ رہے ہیں، نظر آئے گا

اکیلا نہ جا رات کا وقت ہے
تجھے گھُپ اندھیرے میں ڈر آئے گا

سفر میں کہیں کوئی جنگل ہرا
کہیں کوئی اُجڑا نگر آئے گا

گزارو گے جس کے لیے مدّتیں
وہ لمحہ بہت مختصر آئے گا

کرو خدمتِ صاحبانِ ہُنر
ہُنر سیکھنے سے ہُنر آئے گا

ترا قول تھا عمر بھر کے لیے
مجھے یاد تُو عُمر بھر آئے گا

محبّت میں پڑتی نہیں جھُرّیاں
میں پہچان لُوں گا، اگر آئے گا

شعورؔ اس طرح جا رہا ہے وہاں
نہ آیا محب ہد تو مزا آئے گا

کشور ناہید

○

یہ کیا! خواب تمہارے نکلے اور عذاب ہمارے
چھلکی چھلکی آنکھیں لیکن دل پایاب ہمارے

یہ کیا! شہر کے پھول بھی پوچھیں رنگِ بہار کی خصلت
یہ کیا! خون ہمارا پہنیں خود احباب ہمارے

یہ کیا! آدھے چاند پہ رونق، آدھے پر تاریکی
یہ کیا! صبحِ تمنّا ان کی، شب القاب ہمارے

یہ کیا! بہتے دریا آنکھیں، جلتے صحرا پاؤں
یہ کیا! بجھ گئے اب کے دلوں میں بھی مہتاب ہمارے

یہ کیا! تجھ سے پوچھ کے اب میں اپنا حال بتاؤں
یہ کیا! اپنا رزق بھی تیرا اور سیلاب ہمارے

یہ کیا! جن کو دیکھنا چاہیں اور نہ دیکھیں ان کو
یہ کیا! آنکھیں بھول نہ پائیں شب آداب ہمارے

یہ کیا! مہر و محبت نکلیں، قہر دیار کے قصے
یہ کیا! آنکھ جو دیکھے اس پر لب غرقاب ہمارے

میرے آنگن، میری کھیتی، مجھ کم ذات سی اکھڑ
تم زندہ کہ ٹوٹ کے بکھریں کب اعصاب ہمارے

○

اب کہاں رسمِ نجابت، خاک پہنا چاہیے
اس اکیلے گھر میں دیواروں کو ڈرنا چاہیے

خلعتِ شہزادگاں، مقبول دیوانوں میں ہے
بے ضمیری کے سفر میں خود سے بچنا چاہیے

اب ہتھیلی پر رکھی آنکھوں میں بینائی کہاں
اب تو احوالِ گزشتہ کھُل کے کہنا چاہیے

بے سر و سامانیِ جاں بھی مقدّر تھی مگر
شہر بھی پوچھے تو اخفائے تمنّا چاہیے

اب تو موجِ خوں گزرتی ہے سروں کو کاٹتی
اب دعاؤں کو بھی ہاتھوں سے چھلکنا چاہیے

بولنا بھولا تو خوابوں نے بھی رخصت مانگ لی
اب زبانوں پر بھی انگاروں کو رکھنا چاہیے

بیڑیاں پہنی تھیں میں نے، تم نے کیوں پردہ رکھا
گنبدوں میں قید آوازوں کو چیخنا چاہیے

خوف بھی دریا کا ہے اور موج بھی دریا کی ہے
قلزمِ خود رفتگی سے اب نکلنا چاہیے

ثروت حسین

○

گر منتظرِ صدا نہ ہوتے
اس پل تو کہیں روانہ ہوتے

دیوارِ سکوں وداع کرتی
بادل ہمیں تازیانہ ہوتے

اندوہِ سفر میں ڈوب جاتے
دُنیا کے تئیں فسانہ ہوتے

ہم خلوتیانِ آب و افلاک
کیا ہوتے اگر ندا نہ ہوتے

مجبوریِ یک نفس کو دیکھو
ساعت سے کبھی زمانہ ہوتے

ثروتؔ یہ درخت یہ ستارے
مٹی سے اگر رہا نہ ہوتے

○

گھر ہے تو کسی کو سونپتا جاؤں
جاتے ہوئے آگ کیوں لگا جاؤں

دیواروں کو ڈھال تھے مرے ہاتھ
جنگل ہے تو راستہ بنا جاؤں

بانہیں وہ شجر کہ روک لیں راہ
آنکھیں وہ بھنور کہ ڈوبتا جاؤں

نشّہ ہو کسی کی قربتوں کا
ایسا بھی نہیں کہ لڑکھڑا جاؤں

نفرت ہے تو منکشف بھی ہوگی
کچھ راز نہیں کہ جو چھپا جاؤں

جاتا ہوں خزاں کی سلطنت کو
تصویرِ بہار کھینچتا جاؤں

ثروت حسین

○

نہیں کہ شہر و بیاباں میں دل لگایا نہ تھا
کوئی مکاں، کوئی منظر پسند آیا نہ تھا

معاشرت کی فصیلوں کے باوجود یہاں
کسی نگاہ نے روزن کوئی بنایا نہ تھا

کبھی کھُلے نہ مکان و مکین، حالانکہ
زمین غیر نہ تھی آسماں پرایا نہ تھا

یہ اُن دنوں کی کہانی ہے جب اندھیروں میں
چراغِ خانۂ امّید جھلملایا نہ تھا

ٹھہر اے سیلِ مسافت ابھی تو یاروں نے
کمر لگائی نہ تھی، بادباں سُکھایا نہ تھا

شبِ ستارہ و ساحل کو خیر باد کہو
کہ اس سے پہلے سمندر نے یوں بلایا نہ تھا

○

اُس دستِ ناز پر کبھی بیعت نہ کر سکے
اپنے سوا کسی سے محبّت نہ کر سکے

دیواروں کو بلند کیا تھا یہ سوچ کر
رُخ اس طرف کا بادِ ہلاکت نہ کر سکے

اُن کے لیے زمین پہ کوئی جگہ نہ تھی
جو کاروبارِ جہل شراکت نہ کر سکے

ہفت آسمان سیر کیے اور کُنجِ دل
اک حرف تھا کہ جس کو حکایت نہ کر سکے

اِک نغمہ تھا تراش کیا خشت و خواب میں
پھر یوں ہُوا کہ اُس کو سماعت نہ کر سکے

پروین شاکر

○

کچھ تو ہوا بھی سرد تھی، کچھ تھا ترا خیال بھی
دل کو خوشی کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ملال بھی
بات وہ آدھی رات کی، رات وہ پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا، اُس پہ ترا جمال بھی
سب سے نظر بچا کے وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رُک گئی گردشِ ماہ و سال بھی
دل تو چمک سکے گا کیا، پھر بھی ترش کے دیکھ لیں
شیشہ گرانِ شہر کے ہاتھ کا یہ کمال بھی
اُس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھئے، بات تھی کچھ محال بھی
میری طلب تھا ایک شخص، وہ جو نہیں مِلا تو پھر
ایسے گرا دُعا سے ہاتھ، بھول گیا سوال بھی
اُس کی سخن طرازیاں میرے لیے بھی ڈھال تھیں
اُس کی ہنسی میں چھپ گیا اپنے غموں کا حال بھی
گاہ قریبِ شاہ رگ، گاہ بعیدِ وہم و خواب
اس کی رفاقتوں میں رات، ہجر بھی تھا وصال بھی
اُس کے ہی بازوؤں میں اور اُس کو ہی سوچتے رہے
جسم کی خواہشوں پہ تھے رُوح کے اور جال بھی
شام کی ناسمجھ ہوا، پوچھ رہی ہے اِک پتہ
موجِ ہوائے کوئے یار! کچھ تو مرا خیال بھی!

پروین شاکر

○

اِس موسم بھی نہیں جلے تو بات نہیں
اب تو دیا نہیں ہے یا پھر رات نہیں

وقت اگر پتّے نہ بچا کے رکھ لیتا
عشق کی بازی میں تھی اپنی مات نہیں

ریت ہُوئی جاتی ہے کس کی یاد میں آنکھ
اس صحرا کے نام کوئی برسات نہیں

زخم کا رشتہ دیکھا ہے تو سوچا ہے
دُکھنے والی تنہا میری ذات نہیں

صرف ترے چہرے سے رستہ ڈھونڈا ہے
ورنہ اب جنگل میں چاند کا ساتھ نہیں

رزق کا جال ہوا نے کس کس پر پھینکا
کون پرندہ ہے کہ جس پر گھات نہیں

جیون راہ اچانک ہی دھندلانے لگی
شاید میرے ہات میں تیرا ہات نہیں

○

کھُلے گی اس نظر پہ چشمِ تر آہستہ آہستہ
کیا جاتا ہے پانی میں سفر آہستہ آہستہ

کوئی زنجیر پھر واپس وہیں پر لے کے آتی ہے
کٹھن ہو راہ تو چھُٹتا ہے گھر آہستہ آہستہ

بدل دینا ہے رستہ یا کہیں پر بیٹھ جانا ہے
کہ تھکتا جا رہا ہے ہم سفر آہستہ آہستہ

خلش کے ساتھ اس دل سے نہ میری جاں نکل جائے
کھنچے تیرِ شناسائی مگر آہستہ آہستہ

ہوا سے سرکشی میں پھُول کا اپنا زیاں دیکھا
سو جھُکتا جا رہا ہے اب یہ سر آہستہ آہستہ

مری شعلہ مزاجی کو وہ جنگل کیسے راس آئے
ہوا بھی سانس لیتی ہو جدھر آہستہ آہستہ

خالد احمد

○

بے رنگ سا، بے رُوح سا، بے جان سا دِن ہے
تاحدِّ نظر پھر وہی ویران سا دِن ہے
کس گھاٹ اُتر جائیں کہ اس کرب سے چھُوٹیں
پھر دل میں ترازو وہی پیکان سا دن ہے
پھر ہاتھ پہ اِک بھول بھرے پل سی ہیں کرچیں
پھر فرش پہ ٹوٹے ہوئے گلدان سا دن ہے
اے کاش یہ خاشاک ہی گروی کوئی رکھ لے
کُٹیا میں پھر اُترا ہوا مہمان سا دن ہے
اس مرگِ مسلسل سے اب اُکتا سے گئے ہیں
پل پل میں رواں پھر وہی سرطان سا دن ہے
اے چشم! زلیخاؤں کو بازار دکھا دے
گلیوں میں پھر اِک چاک گریبان سا دن ہے
آیا ہے وہ پھر ہاتھ میں کشکول تھمانے
پھر دَر پہ وہی بے سرو سامان سا دن ہے
کب جُھنڈ ہیں پیڑوں کے، یہ خیمے ہیں تھکن کے
رستے کی طرح ساتھ پریشان سا دن ہے
اے ہم سَفرو! راندۂ درگاہ رفیقو!
کیا جانیے کس دُھن میں یہ نادان سا دن ہے
یہ رات بھی کیا رات ہے، کاٹے نہیں کٹتی
ایک ایک گھڑی، ایک بیابان سا دن ہے
خالد اگر آنکھیں نہیں، دامن ہی بچھا دے
اب چھت سے اُترنے کو یہ سنسان سا دن ہے

خالد احمد

○

ابھی تاریخ ہیں، تاریخ کا اظہار نہیں ہیں
نقشِ محفوظ ہیں ہم نقش بہ دیوار نہیں ہیں

اپنے پیروں میں پڑے ہیں کہ عدو کھوج نہ پائیں
ہم تو زنجیر ہیں، زنجیر کی جھنکار نہیں ہیں

وہ صدا ہیں کہ پروئی نہ گئی سلکِ دعا میں
سایۂ ابر ہیں ہم، سایۂ اشجار نہیں ہیں

کیا کیا جائے کہ یہ شہر تو زنداں بھی نہیں ہے
کیا کہیں، کیسی اسیری کہ گرفتار نہیں ہیں

آنکھ کی تہہ میں تموّج کی فضا جاگ چکی ہے
ہم جو چُپ ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بیدار نہیں ہیں

سنگ سر چھاؤں کے مانند برستے ہی رہیں گے
یوں تو شانوں پہ ہیں لیکن تہِ دستار نہیں ہیں

○

زُلفیں کھول کے رنجوری کی
کِس کے دُکھوں کی مشہوری کی
آپ تلاشے، آپ تراشے
بات نہ تھی یہ مجبوری کی
رُوپ تمہارا، ہجر کا تارا
آنکھیں شمعیں مہجوری کی
کتنے کاغذ راکھ ہوئے ہیں
ایک تمنّا کیا پوری کی
ایک سوال لیے پھرتے تھے
راہ نہ دیکھی منظوری کی
سانس کی ڈوری ٹوٹ نہ جائے
بات چلی ہے پھر دُوری کی
لفظ بھی اپنے ہاتھ نہ آئے
لاکھ قلم کی مزدوری کی
شہر بھی صحرا ٹھہرا خالدؔ
پگ پگ ڈاریں کستوری کی

خالد احمد

○

ایک غزل کی کیا اوقات
آپ کے دم سے غزل ہر بات

آنکھ کا نیل نہ ڈھل جائے
راہ نہیں پاتے جذبات
ق
جھرنے بہتے رہتے ہیں
پتھر لاکھ سہیں صدمات

دھارے پھوٹ نکلتے ہیں
پتھر رکھتے ہیں جذبات

پتھر پھٹ بھی پڑتے ہیں
جیسا دکھ، ویسے اثرات

میں تو آنکھیں رکھتا ہوں
لفظ نہیں بنتے جذبات

لوگ کھڑے کے کھڑے ہی رہے
راہ نہ دیتے تھے ظلمات

آنکھوں میں در آتے ہیں
آبِ حیات سے احساسات

میرا توشہ آپ کا پیار
آپ سے حرفِ غزل ہر بات

○

کس شان کے پیوند ہیں! کیا چاکِ قبا ہیں!
صحرا کے بگولے تری گلیوں میں گدا ہیں

تارے بھی ہمیں راہ سجھانے سے ہیں قاصر
ہم لوگ عجب دشت نوردانِ انا ہیں

فاقے ہیں، ہمیں گھر سے نکلنا نہیں آتا
آنسو ہیں مگر ہم پسِ دیوارِ رِثا ہیں

یہ شہر کے باسی ہیں کہ اُڑتے ہوئے پتے
یہ شہر کے حاکم ہیں کہ جنگل کی ہوا ہیں

ماؤں سے بچھڑ کر بڑا مشکل ہے پنپنا
کلیوں میں جو خوشبو تھے، وہ خوشبو کے گدا ہیں

ہم گھر سے چلے تھے کہ چلو دھوپ ہی دیکھیں
اے خاکِ رہِ یار! یہ اشجار سے کیا ہیں

خالد تنِ افلاس چھپائے نہیں چھپتا
کس شان کے پیوند ہیں! کیا چاکِ قبا ہیں!

سجاد بابر

○

سوانگ جتنے بھرے ہیں کبھی نبھا نہ سکے
یہ دل جو رُوٹھا تو برسوں اسے منا نہ سکے

بڑے دُلار سے سینچی مزاج کی سرسوں
لہو پلایا مگر سُرخیاں رچا نہ سکے

یہ خشک پتّے، ہواؤں کی چھیڑخانی سے
اُداس جھیل میں کچھ دائرے بنا نہ سکے

وہ لمس ڈور کی صورت بدن سے لپٹا رہا
پتنگ لُوٹ کے لائے مگر اُڑا نہ سکے

وہ کانپتی ہُوئی چلمن کرن کا پیکر تھی
وہی گلی تھی جہاں بخت آزما نہ سکے

چراغ لائے ہیں باہر پھر اُس کی دستک پر
غبار ہو کے ہوا کا مزاج پا نہ سکے

یہی کروں کہ کسی دن اب اس کے مُنہ نہ لگوں
جو آئینہ مری محرومیاں بتا نہ سکے

(دوبئی)

○

سخت مشکل ہوگیا دل کے تقاضے جاننا
گھُپ اندھیرے میں اُبھرتی چاپ کو پہچاننا

اب کسی بھی شور سے ڈرتی نہیں تنہائیاں
رات بھر میں آگیا خوابوں کی چادر تاننا

وقت کا گندہ لہو چہرے پہ سارے مَل چکے
تم سے کس نے کہہ دیا، مجھ کو جُدا گردانا

چند لمحے جھلملا کر یاد بن جاتا ہے وہ
ساحلوں کی ریت پر لکھا ہوا سچ ماننا

یہ سفر جیسے گھُٹن کے پانیوں میں لے گیا
اب ہوا کے نام پر سارے جزیرے چھاننا

میں نے برسوں بعد اپنا آپ ڈھونڈا تھا مگر
پھر سے بے خود کر گیا اُس کا مجھے پہچاننا

(دوبئی)

سجاد بابر

O

مہک سے اُن بارشوں کی نا آشنا ہوئے ہیں
مزاج کے سب حسین موسم ہوا ہوئے ہیں

مسافتوں کے طلسم کی جستجو نے لُوٹا
غبار بن کے بکھرے گھروں سے جُدا ہوئے ہیں

ڈھلے مناظر جنھیں شفق سی فضا ملی ہے
مرے لیے کچھ نہیں، فقط کربلا ہوئے ہیں

وہ گرد سب زرد ہے جو تصویر سے اُتاری!
وہ شہر کیوں یاد آ گئے جو فنا ہوئے ہیں

سبھی اچھوتے سوال جو میرے ہمسفر تھے
بچھڑ گئے ہیں، جو دُور مجھ سے ذرا ہوئے ہیں

کسی نے بیزاریوں کے تابوت کھول ڈالے
یہ حادثے قربتوں میں بھی بارہا ہوئے ہیں

(دو بجے)

امجد اسلام امجد

O

تارا تارا اُتر رہی ہے رات سمندر میں
جیسے ڈوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہوں گے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اُس نے، میں پھر میں تو نہ تھا
کھُل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لَوٹ آیا تھا کشتی جلنے پر
پگھل چکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہوں ایسے امجدؔ رستہ ہستی کا
بے پتواری ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں

امجد اسلام امجد

○

پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارا تھا
ساحل کی اُس بھیڑ میں جانے کون ہمارا تھا

کہساروں کی گونج کی صورت پھیل گیا ہے وہ
میں نے اپنے آپ میں چھُپ کر جسے پکارا تھا

سر سے گزرتی ہر اک موج کو ایسے دیکھتے ہیں
جیسے اس گرداب فنا میں یہی سہارا تھا

ہجر کی شب وہ نیلی آنکھیں اور بھی نیلی تھیں
جیسے اُس نے اپنے سر سے بوجھ اُتارا تھا

جس کی جِھلملتا میں تم نے مجھ کو قتل کیا
پت جھڑ کی اُس شام کا سب سے روشن تارا تھا

ترکِ وفا کے بعد ملا تو، جب معلوم ہُوا
اُس میں کتنے رنگ تھے اس کے، کون ہمارا تھا

ایندھن بن کر سُلگ رہا ہے اب تک میرا جسم
ہجر کی شب وہ دستِ حنائی، ایک شرارا تھا

کون کہاں پر جھُوٹا نکلا، کیا بتلاتے ہم
دُنیا کی تفریح تھی اُس میں، ہمیں خسارا تھا

جو منزل بھی راہ میں آئی، دل کا بوجھ بنی
وہ اُس کی تعبیر نہ تھی جو خواب ہمارا تھا

یہ کیسی آواز ہے جس کی زندہ گونج ہوں میں
صبحِ ازل میں کس نے امجدؔ مجھے پکارا تھا

○

اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہوئے
ہم ہیں وہ سیپ کہ آزادۂ گوہر نہ ہوئے

تھک کے گرتے بھی نہیں، گھر کو پلٹتے بھی نہیں
نجمِ افلاک ہوئے، آس کے طائر نہ ہوئے

پھُول کے رنگ سرِ شاخِ خزاں بھی چمکے
قیدیِ رسمِ چمن، خاک کے جوہر نہ ہوئے

اُس کی گلیوں میں رہے گردِ سفر کی صورت
سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتھر نہ ہوئے

اپنی ناکام اُمیدوں کے خم و پیچ میں گُم
ابرِ کم آب تھے ہم، رزقِ سمندر نہ ہوئے

اس کو بھی حُسن کی تمکین نے بڑھنے نہ دیا
عشق میں ہم بھی کبھی آپ سے باہر نہ ہوئے

عطاءالحق قاسمی

○

منزلیں بھی، یہ شکستہ بال و پر بھی دیکھنا
تم سفر بھی دیکھنا، رختِ سفر بھی دیکھنا

حالِ دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پر
ہاں مگر اس شہر میں اک بے خبر بھی دیکھنا

راستا دیں یہ سلگتیاں بستیاں تو ایک دن
قریۂ جاں میں اُترنا، یہ نگر بھی دیکھنا

چند لمحوں کی شناسائی، مگر اب عمر بھر
تم شرر بھی دیکھنا، رقصِ شرر بھی دیکھنا

جس کی خاطر میں بھلا بیٹھا تھا اپنے آپ کو
اب اسی کو بھول جانے کا ہنر بھی دیکھنا

یہ تو آدابِ محبت کے منافی تھا عطاؔ
روزنِ دیوار سے، بیرونِ در بھی دیکھنا

○

اس کا چہرہ مہرہ یوں جانا پہچانا ہے
جیسے چاند سے جھیل کا رشتہ بہت پرانا ہے

دل دروازہ بند کرو اور پھر تم سوچو تو
یہاں سے کس کو جانا ہے، اب کس کو آنا ہے

اپنا سفر تم اس کی جانب رواں دواں ہی رکھو
پاگل لڑکے! تم نے اس کو کھو کر پانا ہے

تم کو بھی دعوے تھے کتنے وفاشناسی کے
اب پھر تم ہو اور تمھارا روگ پرانا ہے

یہ سب کچھ تو عطاؔ سے ہم نے کہا تھا، پر وہ شخص
کب سنتا ہے بات کسی کی، کب وہ مانا ہے

عطاء الحق قاسمی

○

رتبہ، منصب، ذات نہ لکھنا، نام مقام نہ لکھنا
عشق کرو تو دانہ لکھنا، لیکن دام نہ لکھنا

جب تک وہ بھی اپنے خول سے باہر آ نہیں جاتا
پیار بھرے خط لکھنا، نیچے اپنا نام نہ لکھنا

عشق میں ہیں کچھ کام جو دھیرے دھیرے ہوتے ہیں
دھیرے چلنا، تم آغاز میں ہی انجام نہ لکھنا

اب تو یہ سوچا ہے، عشق سرائے میں سب خانے
پُر جو کرنے ہیں تو ان میں صبح و شام نہ لکھنا

لکھنا دل کی دھڑکن دھڑکن اس کے نام عطاؔ
لیکن اس کا شہر نہ لکھنا، اس کا نام نہ لکھنا

○

ترے لہجے میں خدشے بولتے ہیں
مرے دل میں بھی کیا کیا وسوسے ہیں

یہ موسم، بے ثمر جذبوں کا موسم
وصال و ہجر دونوں ایک سے ہیں

لکھا جاتا نہیں حرفِ تمنا
خطوں میں خط کشیدہ رابطے ہیں

سخن وہ درمیاں آتا نہیں ہے
من و تُو کے یہ کیسے سلسلے ہیں

بُھلا بیٹھے ہیں اپنے آپ کو بھی
کچھ ایسے کام میں اُلجھے ہوئے ہیں

عطاؔ بدلے نظر آتے ہیں چہرے
یہ کیسے بے مروّت آئینے ہیں

عطاء الحق قاسمی

○

آئینے شفاف ہیں، کیوں خواب دُھندلے ہو رہے ہیں
منزلیں تو جاگتی ہیں، راستے کیوں سو رہے ہیں

بے نصیب آنکھیں پرانے منظروں کے درمیاں ہیں
رابطے، بے ربط چہروں کے سوالی ہو رہے ہیں

ڈھونڈنے نکلو، تو ان کو ڈھونڈنا دُشوار ٹھہرے
قافلے، جو اپنے گھر کے آنگنوں میں کھو رہے ہیں

ذائقے کڑوے کسیلے پھر اُگ آئے ہیں زباں پر
کل جو کاٹا تھا عطاؔ ہم آج پھر وہ بو رہے ہیں

○

تانبے جیسی رنگت، ریشم جیسی زُلفوں والا
سویا سویا لگتا ہے بیدار نصیبوں والا

دل کی بستی میں بھی اُترے گا وہ زینہ زینہ
قریوں قریوں، قصبوں قصبوں، شہروں شہروں والا

ایک نظر میں گھائل کیسے ہوتے نہ ہم ایسے بھی
اس کا مُکھڑا دیکھا بھالا، گیتوں غزلوں والا

موٹی موٹی آنکھوں والے عطاؔ کو دیکھا تم نے!
چُپ چُپ رہنے لگا ہے اب وہ ہنستے لفظوں والا

عطاء الحق قاسمی

○

بھٹک رہی ہے عطاؔ خلقِ بے اماں پھر سے
سروں سے کھینچ لیے کس نے سائباں پھر سے

دلوں سے خوف نکلتا نہیں عذابوں کا
زمیں نے اوڑھ لیے سر پہ آسماں پھر سے

میں تیری یاد سے نکلا تو تیری یاد آئی
اُبھر رہے ہیں، مٹے شہر کے نشاں پھر سے

تری زباں پہ وہی حرفِ انجمن آرا
مری زباں پہ وہی حرفِ رائیگاں پھر سے

ابھی حجاب سا حائل ہے درمیاں میں عطاؔ
ابھی تو ہوں گے لب و حرف رازداں پھر سے

○

کوئی روشن لمحہ بھی اب یاد نہیں
چہروں میں وہ چہرا بھی اب یاد نہیں

اپنے گھر کا رستہ تو ہم بھول گئے
اس کے گھر کا رستہ بھی اب یاد نہیں

لفظوں کی قندیلیں بجھتی جاتی ہیں
اپنے ہاتھ کا لکھا بھی اب یاد نہیں

ٹوٹ گیا تعبیر کا کچا دھاگا یوں
کیسا تھا ۔ وہ سپنا بھی اب یاد نہیں

تنویر سپرا

تنویرؔ، استعاروں، کنایوں میں بات کر
دشمن سے گفتگو میں ذرا احتیاط کر

ہر معتدل مزاج کی تسکین کے لیے
شامل کتابِ درد میں بابِ نشاط کر

گلشن میں آزما نئی پیوند کاریاں
پیدا نفی کے پیڑ سے شاخِ ثبات کر

دریا ہے تو ثبوت بھی دریا دلی کا دے
پیاسوں سے مت سلوک مثالِ فرات کر

تاریکیوں سے ان کا نبھاؤ محال ہے
روشن طبیعتوں پہ مسلط نہ رات کر

ہر بار مات دے گئے تجھ کو فریب سے
تنویرؔ دشمنوں سے کبھی تو بھی بات کر

کروں گا مسترد تیری عطا محکم دلیلوں سے
مجھے گر رزق بخشا تو نے اوروں کے وسیلوں سے

دعائیں کس طرح مانگوں میں اپنی جان بخشی کی
مجھے فریاد سے چڑ ہے، مجھے کد ہے اپیلوں سے

پسند آئی نہ تجھ کو پیار وادی تو پلٹ جانا
گھڑی بھر کے لیے نیچے اُتر نفرت کے ٹیلوں سے

پہنچ سکتی ہے تجھ کو بھی کوئی ہستی نشیبوں میں
یہ نکتہ دھیان میں رکھ کر گرا مجھ کو فصیلوں سے

فقط میں ہی نہیں ہوں آشنائے خصلتِ شیطاں
مرے بچے بھی واقف ہو چکے ہیں اُس کے حیلوں سے

بزرگ اپنے جوانوں کی جواں مردی سے جل کر بھی
لڑائی مول لے لیتے ہیں ہمسایہ قبیلوں سے

لہو کی وردیاں تنویرؔ سپرا پہننی ہوں گی
اگر شہرِ شرافت کو بچانا ہے رذیلوں سے

نجیب احمد

○

نفس نفس یہی دھڑکا لگا رہا مجھ کو
لگا نہ دے کہیں داؤ پہ رہنما مجھ کو

مرے خلاف یہ سازش نہ تھی تو پھر کیا تھا
سحر سے پہلے ہوا نے بجھا دیا مجھ کو

خود اپنے ہاتھ سے دیوار و در بنائے تھے
ملا نہ گھر سے نکلنے کا راستہ مجھ کو

کچھ ایسا خواب کسی شاخ پر کھلا کب تھا
ہوائیں دیکھ نہ پائیں ہرا بھرا مجھ کو

امیرِ شہر کو تو زعمِ شہریاری تھا
نجیبؔ کس کی انا کا تھا آسرا مجھ کو

○

ہو رہا ہے کوئی بیدار، یہ ہم جانتے ہیں
رخصتِ شب کے ہیں آثار، یہ ہم جانتے ہیں

نہیں تخریب پسند اپنی طبیعت ورنہ
کون ہے راہ کی دیوار، یہ ہم جانتے ہیں

تم وفا کیش ہو، تم سارے ہنر جانتے ہو
تم کہ ہو مرنے کو تیار، یہ ہم جانتے ہیں

لے کے آئے سرِ بازار وہ غازے کیا کیا
کون ہے کس کا خریدار، یہ ہم جانتے ہیں

تم فقط وقت کی رفتار کے پیمانے ہو
تم نہ آؤ گے سرِ دار، یہ ہم جانتے ہیں

اتنا سیدھا بھی کہاں تھا سخنِ سادہ نجیبؔ
کچھ تو ہو گا پسِ اظہار یہ ہم جانتے ہیں

ستار سید

○

جھڑے کواڑوں سے قفل گل کر، کھلے دریچے، مکان جاگے
اجاڑ بستی میں ایک اک کر کے زندگی کے نشان جاگے

چھنک اٹھی آنگنوں میں پائل، دلہن سی شرم آشنا رتوں کی
دکھوں سے فرصت ملی تو پل بھر میں کتنے دلدار دھیان جاگے

تری شباہت کے رنگ ابھرے بدلتے موسم کے بانکپن میں
اداس آنکھوں کے جلتے صحرا میں پانیوں کے گمان جاگے

غروبِ جاں کے اداس لمحوں میں عکس تیرے مسافتوں کے
ابد نشاں دوریوں کے باطن میں، حیرتوں کے جہان جاگے

وہ بات کہ جس کے تیوروں پر بشارتوں کا گمان گزرے
وہ حرف لکھ جس کے ذائقوں کی حرارتوں سے زبان جاگے

○

کوفۂ جاں میں خواہشِ قتل سلامت رکھنا
پیار سے ملنا، دل کے بیچ، عداوت رکھنا

کیے ہوئے سب وعدوں کو منسوخ سمجھنا
بیعت میں بھی پھر جانے کی نیت رکھنا

قریۂ حرف میں نام بھی اس کا ممنوعہ ہے
مستحسن تھا نام بھی جس کی بابت رکھنا

آنکھ میں پس پا ہوتے ہوئے جذبوں کے لشکر
اور دلوں میں فتحِ مبیں کی چاہت رکھنا

اپنوں میں دکھلائی دیں گے قاتل چہرے
مردہ جسم میں زندہ، آنکھ کی حیرت رکھنا

غلام محمد قاصر

○

چہرہ چہرہ ہر صورت کو اپنی شکل میں ڈھال گیا ہے
شہر کے آئینوں سے باقی سارے عکس نکال گیا ہے

یوں تو عمرِ رواں کا ہر پل اِک اُلجھن میں ڈال گیا ہے
لیکن شاید بھول نہ پاؤں، ہجر کا یہ جو سال گیا ہے

اب تو شاید ذکرِ وفا سُن کر بھی میرا دل نہ دھڑکتا
تیری یاد کا جھونکا پھر اس پھول میں خوشبو ڈال گیا ہے

کون زمانے کے مارے سے اظہارِ ہمدردی کرتا
وہ اپنے ماضی میں گم تھا جس تک میرا حال گیا ہے

غلام محمد قاصر

○

ہر اِک رستا وہیں آ کر ملے گا
اِسی رستے میں اس کا گھر ملے گا

وہی دیوارِ بے سایہ ہے جس میں
بھٹکتی دستکوں کو در ملے گا

دیا جلتا نظر آئے نہ آئے
اُجالا سا منڈیروں پر ملے گا

دریچوں سے ستارے جھانکتے ہیں
اور اکثر چاند بھی چھت پر ملے گا

پرندے اُس طرف جاتے بہت ہیں
وہیں کوئی نہ کوئی پَر ملے گا

ہوا ذرّوں کو کم کم چھیڑتی ہے
وہیں منظر کا پس منظر ملے گا

مہکتی موتیا، سرسبز آنگن
اسی فائل میں سب دفتر ملے گا

بس اب تو اِک نشانی رہ گئی ہے
وہیں قاصر تمہیں اکثر ملے گا

عدیم ہاشمی

○

جم گئی وہ جھیل، پانی کے وسیلے کھو گئے
پیاس کی ڈھارس بندھا کر رنگ نیلے کھو گئے

بجھ گئی ساری بلندی دوپہروں کے سامنے
بن گئے کہسار دھبے اور ٹیلے کھو گئے

جنگلوں میں بھی درختوں کی جگہ گھر اُگ پڑے
بس گئے طبقے، وہ بے طبقہ قبیلے کھو گئے

دھڑکنوں سے بھی ٹہنیوں کی صدا آنے لگی
دل کے جذبوں کے سبھی نغمے سریلے کھو گئے

ٹہنیوں پر پھر اُبھر آئے ہرے آنسو عدیمؔ
ہو گئے تھے ہاتھ جن پتّوں کے پیلے، کھو گئے

(الاسکا)

○

دل عجب گنبد کہ جس میں اِک کبوتر بھی نہیں
اِتنا ویراں تو مزاروں کا مقدّر بھی نہیں

ڈوبتی جاتی ہیں مٹی میں بدن کی کشتیاں
دیکھنے میں یہ زمیں کوئی سمندر بھی نہیں

جتنے ہنگامے تھے، سُوکھی ٹہنیوں سے جھڑ گئے
پیڑ پر پھل بھی نہیں، آنگن میں پتھر بھی نہیں

خشک ٹہنی پر پرندہ ہے کہ پتّا ہے عدیمؔ
آشیانہ بھی نہیں جس کا کوئی پر بھی نہیں

جتنی پیاری ہیں مری دھرتی کو زنجیریں عدیمؔ
اِتنا پیارا تو کسی دُلہن کو زیور بھی نہیں

(الاسکا)

فیصل عجمی

○

جھک کے چلتا ہوں نہ قامت کو نظر لگنے لگے
ورنہ اس شہر کے دروازے سے سر لگنے لگے

مجھ پہ اس راہ میں یوں طعنِ قیام آیا ہے
جیسے اک پیڑ پہ الزامِ سفر لگنے لگے

تیز بارش میں لیے بیٹھے تھے مٹی کے بدن
آسماں کھلتے ہی سب لوگ کھنڈر لگنے لگے

میری بستی سے ہوا اپنی دکاں لے جائے
اس سے پہلے کہ درختوں پہ ثمر لگنے لگے

لوگ دب جائیں گے لہجے کی توانائی سے
اس طرح بول کہ آواز سے ڈر لگنے لگے

دھوپ تو اپنا مقدر تھی مگر ہم فیصلؔ
اس قدر پھیلے کہ برگد کا شجر لگنے لگے

○

تجھ سے ڈرتے ہوئے خود سے بھی نہ ڈر جائیں کہیں
لوگ اس شہر سے ہجرت ہی نہ کر جائیں کہیں

میں پریشاں ہوں یہاں ایسے پرندوں کی طرح
جن کو جانا ہو کہیں اور اُتر جائیں کہیں

لوگ پیڑوں کی طرح خواہشیں رکھتے ہیں یہاں
جسم سب سبز رہیں، چاہے ثمر جائیں کہیں

جتنا ممکن ہو فضاؤں کو مسخر کر لو
اس سے پہلے کہ خلاؤں میں بکھر جائیں کہیں

بے طلب اتنے ہیں فیصلؔ کہ دُعا کو نہ اٹھیں
مجھ کو ڈر ہے کہ مرے ہاتھ نہ مر جائیں کہیں

حسن ناصر

○

اُڑے ہیں قافلے جس دن سے فاختاؤں کے
تمام پیڑ ہیں خاموش میرے گاؤں کے

ہر آبشار بلندی سے گر کے کہتا ہے
کہ مجھ میں قید ہیں سب معجزے گھٹاؤں کے

یہ کس عذاب میں نکلے ہیں لوگ سڑکوں پر
زمین چاٹ رہی ہے نقوش پاؤں کے

تمام عمر رہو ریت کے مکانوں میں
یہ فیصلے ہیں مرے عہد کی ہواؤں کے

سماعتیں تری آواز کو ترستی رہیں
ہجوم بڑھتے گئے اجنبی صداؤں کے

○

اسی لیے تو ستارہ شبِ سیاہ میں تھا
ترے بچھڑنے کا منظر مری نگاہ میں تھا

ابھی تو پچھلی مسافت کی ریت سر میں تھی
اِک اور درد کا صحرا ہماری راہ میں تھا

زباں سے نکلا تو سب حرمتیں گنوا بیٹھا
وہ ایک لفظ جو اب تک مری پناہ میں تھا

اب اس کو ڈھونڈ رہا ہوں روش روش ناصرؔ
وہ ذائقہ جو مرے اوّلیں گناہ میں تھا

یوسف حسن

○

موت کی تاثیر سارے برگ و بر میں آ گئی
اے خدا! کیسی بلا روحِ شجر میں آ گئی

حبس میں ہم نے ہواؤں کی دُعا کیا مانگ لی
زندگی اپنی، بگولوں کے بھنور میں آ گئی

اِک ذرا پسپا ہوئے تھے ہم فصیلِ شہر سے
دشت کی دہشت گری ایک ایک گھر میں آ گئی

اپنے ہی سائے بڑھے مجھ پر جھپٹنے کے لیے
کون سی ساعت مرے دن کے کھنڈر میں آ گئی

ہم تو اُترے تھے کھُلے بازو سمندر دیکھ کر
جلتی بلتی ریت کیسے بال و پر میں آ گئی

یوسف اپنے ریشے ریشے میں سمے کا زہر تھا
پھر تعجب کیا اگر تلخی ثمر میں آ گئی

○

اُمیدِ اہلِ شہر کی بر آئے کس طرح
شاخِ ریا پہ سچ کا ثمر آئے کس طرح

سودا ہے جس کے سر میں ابھی آسمان کا
وہ میرے ساتھ خاک بسر آئے کس طرح

باہر تو موج موج اندھیرے محیط ہیں
اندر سے روشنی کی خبر آئے کس طرح

پوچھو کبھی شکستہ یقینوں کے ڈھیر سے
ہم ظلمتِ گماں سے گزر آئے کس طرح

شب تو ڈھلی ہے جاگنے والوں کے واسطے
سوئے ہوؤں کی صبحِ سفر آئے کس طرح

یوسف کبھی ہے دھوپ تو اس کی منڈیر پر
سائے مرے وجود میں در آئے کس طرح

یوسف حسن

○

کہاں کہاں پہ گرفتِ فلک نہیں جاتی
مگر زمیں سے لہو کی لہک نہیں جاتی

عروج پر ہیں ستاروں کی سازشیں لیکن
پسِ غروب بھی تیری جھلک نہیں جاتی

ہزار دام بچھائے سیاہ سناٹا
دلوں سے تیری صدا کی لپک نہیں جاتی

ترا جمال نظر سے جُدا نہیں ہوتا
فضا سے تیرے بدن کی مہک نہیں جاتی

بس ایک بار ہی تو نے کبھی چُھوا تھا ہمیں
ہماری خاک سے اب تک چمک نہیں جاتی

قدم قدم پہ ہری چھاؤں مہرباں ہے مگر
یہ رہگذار ترے شہر تک نہیں جاتی

○

طوفان سے بچاؤ کی تدبیر کیا کریں
صحرا کی خشک ریت سے تعمیر کیا کریں

اس بے کنار دشت کی سفاک دھوپ میں
جلنے لگیں شجر بھی تو رہگیر کیا کریں

دن کی تو ایک ایک صدا راکھ ہو گئی
سلئے سکوتِ شام کی تفسیر کیا کریں

رگ رگ میں جم گیا ہے لہو برف کی طرح
مٹی پہ تیرے درد کی تصویر کیا کریں

ہر نقش بے ثبات ہے، ہر سعی رائگاں
آبِ رواں کی سطح پہ تحریر کیا کریں

یوسف ہوس کے ہاتھ سے دل بھی ہے لیرلیر
ہم دامنِ دریدہ کی تشہیر کیا کریں

جلیل عالی

○

زندگی کی ہر گھڑی اِک عرصۂ ہجرت مجھے
ایک سپنہ دے گیا کس دشت کی وحشت مجھے

جھانکنا چاہا تھا دیوارِ نظر کے اُس طرف
مل گئی اک عالمِ تصویر کی حیرت مجھے

ذہن میں سوچوں کی کتنی بستیاں بستی گئیں
خواب کیا کیا دے گئی تعبیر کی حسرت مجھے

یوں ہواؤں کے تعاقب میں اُڑا جاتا ہوں میں
اِک نگاہِ واپسیں کی بھی نہیں فرصت مجھے

گفتگو خود سے کیے عالی زمانہ ہو گیا
دُور کتنا لے گئی اغیار کی قربت مجھے

جلیل عالی

○

زندگی کی ہر گھڑی اِک عرصۂ ہجرت مجھے
ایک سپنا دے گیا کس دشت کی وحشت مجھے

جھانکنا چاہا تھا دیوارِ نظر کے اُس طرف
مل گئی اِک عالمِ تصویر کی حیرت مجھے

ذہن میں سوچوں کی کتنی بستیاں بستی گئیں
خواب کیا کیا دے گئی تعبیر کی حسرت مجھے

یوں ہواؤں کے تعاقب میں اُڑا جاتا ہوں میں
اِک نگاہِ واپسیں کی بھی نہیں فرصت مجھے

گفتگو خود سے کیے عالی زمانہ ہو گیا
دُور کتنا لے گئی اغیار کی قربت مجھے

اظہر عنایتی

○

میسر ہو جو لمحہ دیکھنے کو
کتابوں میں ہے کیا کیا دیکھنے کو

ہزاروں قدِ آدم آئینے ہیں
مگر ترسو گے چہرا دیکھنے کو

ابھی ہیں کچھ پرانی یادگاریں
تم آنا شہر میرا دیکھنے کو

پھر اس کے بعد تھا خاموش پانی
کہ لوگ آئے تھے دریا دیکھنے کو

اب اے دیوار و در! خود رہ گیا ہوں
عجائب گھر اکیلا دیکھنے کو

ہوا سے ہی سہی، کھلتا تھا اکثر
مجھے بھی اِک دریچا دیکھنے کو

ابھی کچھ پھول ہیں شاخوں پہ اظہرؔ
مجھے کانٹوں میں اُلجھا دیکھنے کو

(رامپور۔ بھارت)

خالد شیرازی

○

زمیں بچھونا مرا، آسماں مرا خیمہ
ہُوا ہے جانب کوفہ رواں مرا خیمہ

وہی دہن، وہی نیزوں کے پھل، وہی کربل
وہی فرات، وہی دُوریاں، مرا خیمہ

وہی ہے منظرِ آزردگی کہ جس کے لیے
مری طرح ہُوا آتش بجاں مرا خیمہ

اب آسماں بھی کسی کو اماں نہیں دیتا
گرا کچھ ایسے تہِ آسماں مرا خیمہ

زمیں چیزیں بہت ہیں ملال و ماتم کو
نواحِ علقمہ، ریگِ رواں، مرا خیمہ

عجب دیار ہے، چادر نہ چار دیواری
پلٹ کے تکتی ہُوئی بیبیاں مرا خیمہ

جو مجھ پہ ڈھائے گئے ظلم کو نہیں بھُولے
کریں گے نصب وہی اب یہاں مرا خیمہ

مری طنابیں بہتر نہیں ہیں لاکھوں ہیں
گرا سکیں گی نہ اب آندھیاں مرا خیمہ

ہوئی ہے تنگ بہر قافیہ زمیں خالدؔ
اسی زمیں پہ ہُوا آسماں مرا خیمہ

شفیق سلیمی

○

تنِ گداز سبھی پتھّروں سے جاتا رہا
کہ ذوقِ تیشہ وری آزروں سے جاتا رہا

کبھی تمام نہ ہوں گی اُداسیوں کی رُتیں
کہ دائروں کا چلن دائروں سے جاتا رہا

یہ کیا ہوا کہ کوئی بھی نظر میں جچتا نہیں
وہ کون تھا کہ مرے منظروں سے جاتا رہا

وہی مکیں، وہی آنگن، وہی درودیوار
مگر وہ کیا تھا جو بستے گھروں سے جاتا رہا

زمیں تو خیر زمیں تھی کہ تنگ ہم پہ ہوئی
اِک آسماں تھا، سو وہ بھی سروں سے جاتا رہا

تمام عمر اُڑانوں میں کاٹ دی ہم نے
تمام رنگ پروں کا پروں سے جاتا رہا

○

دستار بھی اُچھلی تھی، قلم سر بھی ہوا تھا
یہ سانحہ اک روز مرے گھر بھی ہوا تھا

اس زاویے سے بھی تو کبھی چمکا تھا سورج
اِک سایا مرے قد کے برابر بھی ہوا تھا

روشن تھیں مرے ہاتھ پہ بھی ایسی لکیریں
جو تیرا ہے وہ میرا مقدّر بھی ہوا تھا

پھینکا تھا یونہی بیج جو نفرت کا کسی نے
پودا بھی اُگا اور تناور بھی ہوا تھا

بیٹھا تھا شفیقؔ ایک پرندہ جو شجر میں
ہونا تھا شکار اُس کو، سو اُڑ کر بھی ہوا تھا

نثار ناسک

○

دل یہ کہتا ہے کہ اُس گھر سے کبوتر آ رہا ہے
آنکھ کہتی ہے کہ اِک ٹوٹا ہوا پر آ رہا ہے

پھر درانڈے پر پڑی بیلیں ہری ہونے لگی ہیں
مدّتوں کے بعد جیسے پھر کوئی گھر آ رہا ہے

لمحہ لمحہ خود کو میں محسوس ہوتا جا رہا ہوں
سیڑھی سیڑھی جیسے کوئی میرے اندر آ رہا ہے

بستی والو! سامنے سے بے حسی کو روند ڈالو
اس پہاڑی کے عقب میں ایک لشکر آ رہا ہے

گھر سے نکلا تھا نئی دنیاؤں کو تسخیر نے میں
سامنے تو پھر وہی مانوس منظر آ رہا ہے

قہقہے خوش گپیاں کچھ سرد ہوتے جا رہے ہیں
جیسے جیسے دم بدم نزدیک دفتر آ رہا ہے

○

پرائے لوگوں نے طے کر لیا سفر میرا
کہ میرے پاؤں سے لپٹا رہا ہے گھر میرا

میں عمر بھر کا سکوں دے کے بھی رہا مقروض
وہ سُود خورِ محبت ہے بارِ سر میرا

میں تیری عُمر کے ہر رُوپ کی امانت ہوں
کہ پل رہا ہے تری سیپ میں گہُر میرا

وہ بے ستوں بھی مری ذات، جوئے شیر بھی میں
مجھے اُجاڑ گیا تیشۂ ہُنر میرا

وہ میرا ہو کے بھی ظاہر نہیں ہُوا مجھ پر
یہ اختلاف رہا اس سے عمر بھر میرا

نثار ناسک

○

میری تلاش تو سایہ بن کر پڑی رہی
دھوپ تھی وہ، دیوار کے پیچھے کھڑی رہی

ایسی رُتیں بھی شہرِ وجود پہ اُتری ہیں
اندر دُھوپ کا صحرا، باہر جھڑی رہی

اپنی سوچ کی قطع و برید میں عُمر کٹی
پھر بھی یہ تصویر فریم سے بڑی رہی

حلقہ حلقہ رشتوں کی زنجیر کھُلی
پاسِ وضع کی ایک کڑی تھی، اڑی رہی

جب تُو شہر میں اور میں تجھ سے دُور رہا
کتنی صدیوں کی مسافت وہ گھڑی رہی

○

چاند گھٹا کی اوٹ پہاڑوں پرے پرے
آئی ملن کی رات ستارے ڈرے ڈرے

آنکھیں جیسے چڑھے سمندر پیاسے ہوں
ہونٹ کہ جیسے شہد کٹورے بھرے بھرے

سُن اے ہولتے شہرِ سماعت ٹوٹ بھی آ !
بجھ گئے لفظ کے دیپ لبوں پر دھرے دھرے

پیار جتانے کی ہر کوشش تھکی تھکی
بے تاثیر سے جملے، لہجے مرے مرے

جنگل میں سانپیں سی سازش آندھی کی
شاخ پہ تھر تھر کانپیں پتے ہرے ہرے

○

جوں حباب اپنے ہی ہونے کی قسم ہوں میں بھی
برسرِ موجِ تماشا کوئی دم ہوں میں بھی

قطعۂ ارضِ مسافت ہوں ترے پاؤں تلے
تیری ہمراہی میں دو چار قدم ہوں میں بھی

اپنی تنہائی کے اوراق پہ لکھ لے مجھ کو
صورتِ حرف سرِ نوکِ قلم ہوں میں بھی

میری قرأت کے ثوابوں سے بھی اِک بار گزر
سورۂ عمر میں اِک آیتِ غم ہوں میں بھی

اوس کہہ لو کہ اُداسی مجھے سمجھو ناسک
شب کی شاخوں پہ کھِلا دیدۂ نم ہوں میں بھی

غلام حسین ساجد

○

(نذرِ فراقؔ)

رُکا ہُوا ہوں اُسی نخلِ آرزو کے قریں
گیاہِ سبز کی ٹھنڈک پہ لا رہا ہوں یقیں

میں کیسے مِٹتی ہُوئی خاک پر گرفت کروں
تھکن کی دُھند میں روپوش ہو رہی ہے زمیں

کسی چراغ کو دریا میں ڈوبتے دیکھوں
میں چاہتا ہوں مگر دیکھنے کی تاب نہیں

عطا کیا ہے گلِ وصل اُس نے اور خُوش ہوں
مگر وہ ہجر کی راتیں بھی کتنی اچھی تھیں

کسی کی دھوپ سے یکجا ہوئی تھیں اور آنکھیں
ذرا سی دیر میں کچھ دیکھنے کو بھُول گئیں

ہوا کی تیغ سے پھُولوں کو قطع کرتے ہیں
کہ ہم ہوئے ہیں اسی کارِ رائگاں کے امیں

اُسی کی سمت رواں مشعلیں بتاتی ہیں
بچھڑ گیا ہوں مگر کارواں سے دُور نہیں

فصیل پر سے کوئی روشنی دکھاتا ہے
مگر وہ چاپ ابھی راہ میں ہے اور کہیں

○

کنارِ آتشِ ایّام گھر بنایا تھا
اور ایک پھُول کو اپنی سپر بنایا تھا

گریز اور تجاوز پہ دسترس دی تھی
یہی نہیں کہ اُسے ہمسفر بنایا تھا

اب اُس طرف سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
پسِ شکست جسے مستقر بنایا تھا

گشید کی تھی ستارے سے روشنی کی لکیر
اور اُس کو اپنے لیے راہبر بنایا تھا

اِنھی پلٹتی ہوئی بارشوں نے دھو ڈالا
وہ نقش بھی کہ جسے عُمر بھر بنایا تھا

میں کیوں نہ بھرے ہوئے نیل میں قدم رکھوں
مرے خدا نے اِسے رہگزر بنایا تھا

گنوا لیے تھے نگاہوں کے آئینے ساجدؔ
اور اِک فصیل کے پہلو میں در بنایا تھا

صفدر سلیم سیال

○

بے نیازانہ ترے کوچے سے میں گزرا بھی ہوں
بند کمروں میں تجھے چھپ کر مگر رویا بھی ہوں

مجھ پہ ہیں احساں بہاروں کے، تو دورانِ خزاں
میں گلوں کی ترجمانی کے لیے مہکا بھی ہوں

آج کیسے اُن رفیقوں سے کروں میں اجتناب
جن کے مٹیالے گھروں میں رات دن کھیلا بھی ہوں

میں وہ بادل ہوں جسے ریگِ بیاباں کی تلاش
خشک سالی کے دنوں میں کھیت پر برسا بھی ہوں

کیا بتاؤں کس طرح کٹتی ہے میری زندگی
میں گھٹاؤں میں گھرا ہوں، پیاس کا صحرا بھی ہوں

تُو کہاں ہے، اے مری آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کے نُور
تجھ کو پانے کے لیے میں چاند پر اُترا بھی ہوں

مجھ کو آخر اُن حنائی انگلیوں سے کیا ملا
جن کی خوشبو کے صحیفے آج تک لکھتا بھی ہوں

تم نے چاہا تھا مجھے گر ٹوٹ کر صفدر سلیم
میں تمہارے واسطے پھر دار پر لٹکا بھی ہوں

○

شبِ سفر تھی، مرے ساتھ وہ رہا چپ چاپ
میں رُک گیا تو وہ آگے گزر گیا چپ چاپ

میں کس کا نام پکاروں، میں کس کا ذکر کروں
وہ رنگ تھا، مرے چہرے سے اُڑ گیا چپ چاپ

میں جس کے واسطے شہروں کی خاک چھان آیا
وہ میرے جسم کے اندر چھپا رہا چپ چاپ

ہر ایک شہر میں میری رفاقتیں تھیں بہت
وہ گام گام پہ مجھ سے مگر ملا چپ چاپ

وہ دھوپ تھی، جو مرے جسم و جان میں اُتری
وہ ذائقہ تھا، مرے دل میں بس گیا چپ چاپ

مجھے یقین تھا کہ وہ خود ہی لوٹ آئے گا
اسی لیے تو میں اس سے ہوا جدا چپ چاپ

وہ حبس تھا کہ گھنے پیڑ ہو گئے دو نیم
یہ سانحہ بھی رہی دیکھتی ہوا چپ چاپ

تم اُس کے صبر کا اب اور امتحان نہ لو
وہ سہہ گیا ہے تمہاری ہر اک سزا چپ چاپ

یہی گلہ ہے، مری عادتیں بگاڑ کے وہ
نہ جانے کون سی دُنیا میں جا بسا چپ چاپ

مجھے بھی اس سے شکایت کہ حوصلہ نہ رہا
لپٹ کے مجھ سے وہ کل رات رو دیا چپ چاپ

صفدر سلیم سیال

○

اب اپنے ذہن سے یہ اذیّت نکال دے
گر ہو سکے تو دل سے محبّت نکال دے

جیسا بھی ہوں، مجھے تُو مرے حال پر ہی چھوڑ
لوحِ سفر سے حُسنِ رفاقت نکال دے

تزئینِ جسم و جاں کے لیے اس قدر نہ جل
اپنے بدن سے اب یہ تمازت نکال دے

تعبیرِ خواب، خواب سے اچھی نہ تھی کبھی
اپنے لہو سے میری امانت نکال دے

خوابوں کی سازشیں ہیں تو پھر رات کو نہ سو
اس گوشۂ خیال سے وحشت نکال دے

شاید سکوتِ شام سے پہلے ہوا کی موج
اپنے پروں سے کوئی بشارت نکال دے

ہمّت اگر ہے تجھ میں تو پھر قتلِ گُل کے بعد
صحنِ چمن سے بُوئے شہادت نکال دے

○

شہروں میں لوگ ایسے سکوں باختہ ملے
جن سے ملے وہ با دلِ ناخواستہ ملے

کس بے دلی سے ملتے ہیں اِک دوسرے سے لوگ
مدّت کے بعد جیسے کوئی داشتہ ملے

رستے کی گرد سے مرا چہرہ خراب تھا
لیکن وہ آج بھی مجھے بے ساختہ ملے

ہیں جن کی ٹھنڈی چھاؤں کو یارو ترس گیا
دل کی زمیں پہ ایسے شجر کاشتہ ملے

تزئینِ غم کی مجھ کو ضرورت نہ تھی کبھی
تیری شکایتوں سے وہ آراستہ ملے

کہنا کہ فصلِ گُل میں پرندے بکھر گئے
تجھ کو کہیں جو، بادِ صبا! فاختہ ملے

کرتا ہیں کس کو پیش صفائی میں اے سلیم
تجھے جتنے روشناس، سزا یافتہ ملے

محمد اجمل نیازی

○

بے آباد مکاں ہو جیسے کھُلے ہوئے دروازوں کا
ہر اک شخص ہے اک ویرانہ اپنے گہرے رازوں کا

قریۂ اشک میں دیکھی میں نے حیرت ہجر کے کھلنے کی
اِک میلہ سا بچھڑی ہوئی سب روحوں کی پروازوں کا

شامِ سفر ہم اک دُوجے کی جانب دیکھ نہ سکتے تھے
آنکھ میں آنسو، آئینہ اندیشوں کا اندازوں کا

یوں لگتا ہے، میری دھرتی اک مسجد ہے اُجڑی ہوئی سی
اپنا جیون ایک کنارہ نا مسجود نمازوں کا

ہرے بھرے شہروں میں اجملؔ گمشدگی کا عالم ہے
اِک اسرار ہر اک چوکھٹ پر مِلی جُلی آوازوں کا

○

ہر دل میں قتلِ عام کے الزام کا لہو
روتا ہے میرے درد کے انجام کا لہو

اِک بوند پی کے ڈوب گئے دل کی آگ میں
سیلِ فنا ہے ٹوٹے ہوئے جام کا لہو

یہ قصبۂ ملال ہے یا شہرِ ہم سفر
بے سمت بہہ رہا ہے ترے نام کا لہو

دیوار پر لکھا ہوا اشکوں میں گھُل گیا
جو نقش ہی نہیں ہُوا، کس کام کا لہو

اس بات کے اندھیرے بھی اجملؔ گواہ ہیں
صبحِ فراق تک تو گیا شام کا لہو

عشرت آفریں

○

یہ وصل نہیں تو اور کیا ہے
آئینے سے عکس بولتا ہے

یہ ہجر و وصال جس میں ہم ہیں
اے لذتِ درد، انتہا ہے

بدلے نہ گئے مکین تم سے
سو تم نے مکاں بدل دیا ہے

اب کس سے کیا کرو گے باتیں
آئینہ تو عکس کھو چکا ہے

مت پوچھ اکیلے گھر کی وحشت
مٹی کا مکان گونجتا ہے

تاریکی بھی روشنیٔ جاں ہے
مجھ کو ترا ہاتھ ڈھونڈتا ہے

برسوں سے قبیلے رقص میں ہیں
صدیوں سے الاؤ جل رہا ہے

تم جس کو انا سمجھ رہے ہو
وہ میری بقا کا مسئلہ ہے

رخصت ہوا شہ سوار شاید
خیمے میں چراغ بجھ چکا ہے

○

ابر کے ساتھ ہوا رقص میں ہے
سارے جنگل کی فضا رقص میں ہے

پاؤں ٹکتے ہی نہیں اشکوں کے
جیسے آنکھوں کی دعا رقص میں ہے

درمیاں چیختے انسانوں کے
میرا خاموش خدا رقص میں ہے

کھوکھلا پیڑ کھڑا ہے لیکن
اس کا احساسِ انا رقص میں ہے

خوشبوئیں گونج رہی ہیں مجھ میں
آج پھولوں کی دعا رقص میں ہے

سب لکیروں سے لہو رستا ہے
یوں ہتھیلی پہ حنا رقص میں ہے

نذرِ سیلاب ہوئے اہلِ مکاں
طاق پر اب بھی دیا رقص میں ہے

صابر ظفر

○

اب کہیں اور کہاں خاک بسر ہوں ترے بندے جاکر
زندگی اور بھی مغموم لگے شہر سے آگے جاکر

عدم آباد کے لوگوں کا مزاج ان دنوں کیسا ہوگا
لوٹ آنے کی توقع ہو کسی کو تو وہ پوچھے جاکر

میں گھنا پیڑ ہوں، آیا بھی کبھی جو مرے سائے کو زوال
ان خزاؤں سے بہت دور گریں گے مرے پتّے جاکر

کٹ بھی سکتے ہیں شب و روز مرے، ان ہی گلی کوچوں میں
تیری جانب ہی اگر لوٹنا ہے تیرے نگر سے جاکر

شاعری پھول اگانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے تو ظفرؔ
باغ ہی کوئی لگا تاکہ جہاں کھیلتے بچّے جاکر

○

صورتِ مرگ فقط راہ کی ٹھوکر نکلی
زندگی! تو مرے اندازے سے کمتر نکلی

دھوپ نے دکھ دیا لیکن مجھے تنہا نہ کیا
ایک پرچھائیں مرے جسم سے باہر نکلی

تیرے چہرے سے کھلا مجھ سے بچھڑنے کا ملال
شکل اک اور تری شکل کے اندر نکلی

صرف چکّر ہی نہیں، پاؤں میں زنجیر بھی ہے
میری حالت مری قسمت سے بھی ابتر نکلی

جب بھی چاہا کہ تجھے چھوڑ دوں تیری خاطر
اے ظفرؔ تیری طلب تجھ سے بھی بڑھ کر نکلی

شہناز پروین سحر

○

مشکوک اجنبی کوئی، سارے گھروں میں ہے
قاتل سا پاس بیٹھا ہوا دفتروں میں ہے

سفاک ہاتھ تیر رہے ہیں فضاؤں میں
کٹنے کا خوف اُڑتے ہوؤں کے پروں میں ہے

سُورج جلا کے رکھ گیا سپنوں کے سب گلاب
پھولوں کی راکھ ہے جو ہمارے سروں میں ہے

پانی سے دوستی تھی مگر دشمنی بھری
خنجر بکف کوئی نہ کوئی ساگروں میں ہے

ہم ہیں جو اُٹھ کے چل دیے ملبوں کے ڈھیر سے
چادر بنی ہوئی ہے جو مٹی سروں میں ہے

کاٹی ہے عمر قید مگر آج بھی سحرؔ
اِک قفلِ شہرِ ذات کے بارہ دروں میں ہے

○

شاخِ جاں سے گلاب ختم ہوئے
اور آنکھوں کے خواب ختم ہوئے

دل سے بھی دُور جا چکا ہے کوئی
فاصلوں کے حساب ختم ہوئے

جب ہم اِک دوسرے کو جان گئے
سب سوال و جواب ختم ہوئے

انگلیاں تھک چکیں، قلم ٹوٹ گئے
یوں ادھورے ہی باب ختم ہوئے

اب تو کچھ بھی نہیں ہے لکھنے کو
عُمر بیتی، کتاب ختم ہوئے

وہ خدائی نبھا سکا نہ سحرؔ
سب گناہ و ثواب ختم ہوئے

شہزاد قمر

O

جب تک کہ ہر اِک نقش اُجاگر نہیں ہوتا
میرے لیے منظر کوئی منظر نہیں ہوتا

خود دار ہو، خود سے کبھی باہر بھی تو نکلو
سائے میں کبھی پیڑ تناور نہیں ہوتا

کس آنکھ میں خوابوں کے نہیں عکس اُترتے
ہے کون جو سوچوں کا سکندر نہیں ہوتا

کیا بہتے سرابوں سے نہیں پیاس بھڑکتی
کیا دشت بھی وسعت میں سمندر نہیں ہوتا؟

اب کوئی بھی ہوتا نہیں مصلوبِ معانی
حرفوں کی صلیبوں پہ کوئی سر نہیں ہوتا

یہ کیسی ولایت مجھے وحشت سے ملی ہے
پتھر بھی میرے سامنے پتھر نہیں ہوتا

یادوں کی جڑیں پھوٹ ہی پڑتی ہیں کہیں سے
دل سوکھ بھی جاتا ہے تو بنجر نہیں ہوتا

پردیس تو شہزادؔ ہے خیمے کی رہائش
خیمے کی رہائش میں کوئی گھر نہیں ہوتا

O

سخت مشکل میں پڑی ہیں اب کے جانیں مختلف
تیر بھی سیدھے نہیں رکھتیں کمانیں مختلف

کیا اشارہ دیکھ پاؤں، کیا صدا سُن پاؤں میں؟
آنکھ کی بلیک سے دل کی اذانیں مختلف

دُھوپ کے ہیں رنگ کتنے، چھاؤں کا اِک رنگ ہے
پیار کی بس ایک، نفرت کی زبانیں مختلف

آؤ ہم دونوں گریں اِک تیسرے معیار تک
تیرے بھی سب ٹھاٹ ہیں، اپنی بھی شانیں مختلف

کس طرف شہزادؔ لے جاؤں جہازِ فکر کو
دل سمندر بھی تو رکھتا ہے چٹانیں مختلف

(بحرین)

شہزاد قمر

کوئی بھی تو نہ مرے قد کو بڑھانے آیا
جو بھی آیا وہی دیوار گرانے آیا

سب رہے دُور سے بارش کی دُعائیں کرتے
کون بستی میں لگی آگ بجھانے آیا

پھر کسی سے بھی نبھائی نہ گئی رسمِ صلیب
کوئی آیا بھی تو گھنٹی ہی بجانے آیا

ایک ساون ہی تو آیا مرا پردہ رکھنے
سبز چادر مری دھرتی پہ بچھانے آیا

مجھ سے دیکھے نہ گئے دھوپ کے ڈھلتے منظر
شام سے پہلے ہی میں شمعیں جلانے آیا

کون سی رات کوئی بات نہ کہنے آئی
کون سا دن کوئی قصّہ نہ سنانے آیا

اب کے ابلاغ کی کچھ اور بھی راہیں نکلیں
اب کے ابہام بھی نکتے ہی سمجھانے آیا

کوئی ٹھہرے کہ چلے اس سے مجھے کیا شہزاد
میں تو نقارۂ طوفان بجانے آیا

(بحرین)

بابِ اَلَم کی دیکھ نہایت لکھی گئی
ہم آئے اور یہ سطرِ محبت لکھی گئی

ہر شام کو عذاب کا عرصہ کہا گیا
ہر صبح ایک صبحِ قیامت لکھی گئی

ہر عکس کو مقامِ نمائش عطا ہُوا
ہر آئینے کی آنکھ میں حیرت لکھی گئی

ہاتھوں کی تختیوں پہ تو لکھے ہی تھے سوال
دل کی سلیٹ پر بھی ضرورت لکھی گئی

اب جنگلوں کی آگ بجھانے سے فائدہ ؟
اب تو ہوا کے نام یہ وحشت لکھی گئی

اپنی جگہ سے کوئی پرندہ نہ اُڑ سکا
کچھ اس طرح قفس کی ضرورت لکھی گئی

اس عہدِ جبر میں بھی دھڑکتے رہے ہیں دل
پیڑوں پہ ناخنوں سے محبت لکھی گئی

وہ تو گیا تھا ایک ہی تحریر چھوڑ کر
ذہنوں پہ کیسی کیسی عبارت لکھی گئی

شہزاد ساحلوں پہ چمکنے لگی ہے ریت
دریا کے نام کوئی بشارت لکھی گئی

(بحرین)

شہزاد قمر

○

اٹھاؤ ہاتھ کہ وقت آ گیا دعاؤں کا
پڑا ہے جنگلوں میں پھر سے قحط چھاؤں کا

بس اک کرن ہی نے جھانکا تھا روزنِ در سے
گلی میں شور رہا دیر تک ہواؤں کا

اکیلی جان کو اہمیتیں ملیں کیا کیا
رواں تھا میرے لیے قافلہ بلاؤں کا

بصارتیں تھیں تو کچھ عکس تھے لرزتے ہوئے
سماعتیں تھیں تو اک وہم تھا صداؤں کا

مری سرشت میں لکھا گیا سفر شہزاد
مجھے حساب چکانا تھا پاؤں پاؤں کا

(بحرین)

○

نظر کے سامنے تھا پھر بھی خواب جیسا تھا
وہ عام سا بھی کسی انتخاب جیسا تھا

یہ حرف حرف مناظر ورق ورق ہیں کھلے
وہ ایک بند دریچہ کتاب جیسا تھا

اُس ایک لمحے میں کتنی دعائیں مانگی تھیں
قبولیت کا شرف بھی عذاب جیسا تھا

ہوا کا پورا دباؤ تھا خیمۂ دل پر
مرا غرورِ نظر بھی طناب جیسا تھا

مفاہمت کی ضرورت سے کب مفر تھا مگر
ہر اختلاف گناہ و ثواب جیسا تھا

ہماری پیاس تو رُوحوں کی پیاس تھی شہزاد
ہمارے سامنے دریا سراب جیسا تھا

(بحرین)

قائم نقوی

○

ہر ذہن میں کب مجھ سی شوریدہ سری ہوگی
جو بات بھی ہونٹوں سے نکلے گی، کھری ہوگی

کس فصل کے عنواں ہیں، سب قتل کے ساماں ہیں
کچھ سال گزرنے دو، پھر نوحہ گری ہوگی

کچھ روز تو جی لیں گے، یہ زہر بھی پی لیں گے
جو سانس بھی نکلے گی سینے پہ دھری ہوگی

آنکھوں میں اندھیرے ہیں، راہوں میں لٹیرے ہیں
کب قید سے ہونٹوں کے سچ بات بری ہوگی

اِک روز تو مہکیں گے، اِک روز تو چہکیں گے
اِک دن تو درختوں کی ہر شاخ ہری ہوگی

چہروں پہ ہیں چہرے کیا، قائمؔ کوئی ٹھہرے کیا
آئینوں کی بستی میں آئینہ گری ہوگی

○

وہ بادل بن کے کب چھائے نہیں ہیں
مری دھرتی پہ جو برسے نہیں ہیں

کنارہ ڈھونڈتی پھرتی ہے خوشبو
سبد کے بادباں کھُلتے نہیں ہیں

تنِ تعبیر ہے روشن ہمیں سے
اگر یہ خواب اُن دیکھے نہیں ہیں

تلاشِ رزق میں ہم بھی چلے تھے
مگر گھر لوٹ کر آئے نہیں ہیں

ہمارے ذہن تو کچے ہیں لیکن
ہم اپنی نیند کے کچے نہیں ہیں

دنوں کے ساتھ نکلیں گے شرر بھی
چٹانوں سے اگر نکلے نہیں ہیں

کھڑے ہیں آج بھی قائمؔ وہیں ہم
جہاں سے راستے چلتے نہیں ہیں

محسن شیخ

○

دل گنوایا ہے تو پھر ایسے ہُنر آئے ہیں
تیری گلیوں سے بھی بیگانہ گزر آئے ہیں

یہ تو طے ہی تھا ہری رُت میں ملو گے ہم سے
کیا کہیں راہ میں پھر سُوکھے شجر آئے ہیں

تجھ کو تھا زعم حصاروں کی بلندی پہ مگر
دیکھ ہم سارے مراحل سے گزر آئے ہیں

میں نے جو رنگ فضاؤں میں کبھی دیکھے تھے
اب وہی گھر کی منڈیروں پہ اُتر آئے ہیں

اے زمیں! تجھ سے ہی قائم ہے نمُو کا رشتہ
تیری ہی دین سے شاخوں پہ ثمر آئے ہیں

اُڑ گیا ہاتھ سے خود دار پرندہ محسنؔ
تیری مٹھی میں تو ٹوٹے ہوئے پر آئے ہیں

○

نظر ملائیں مگر یوں کہ دُکھ چھپائے رکھیں
ہم اپنے بوجھ نہ کیوں آپ ہی اٹھائے رکھیں

ہمارے واسطے کیا اور اُلجھنیں کم ہیں
کہ تیرے پیار کو بھی مسئلہ بنائے رکھیں

نہ جانے کون مسافر کہاں سے آ نکلے
کوئی چراغ سرِ راہ بھی جلائے رکھیں

امیرِ شہر کا فرمان ہے کہ اس کے حضور
ہم اختلاف کریں بھی تو سر جھکائے رکھیں

ہماری راہیں جُدا ہیں تو کس لیے محسنؔ
سفر میں ساتھ رہیں اور قدم ملائے رکھیں

جمال احسانی

○

بہت ریا بڑی عیاریوں کے بعد ہوا
وہ مہربان دل آزاریوں کے بعد ہوا

اِک آدمی کی رہائی سے بھی تو ہو جاتا
جو شہر بھر کی گرفتاریوں کے بعد ہوا

ہیں خوب لوگ جنھیں عشق کا مرض لاحق
ہزار طرح کی بیماریوں کے بعد ہوا

ہمیں ہوا ہے جو اندازۂ زمین و زمان
تری نگہ کی فسوں کاریوں کے بعد ہوا

سفر تھا اور محبت کا تھا سفر درپیش
سو فکرمند ہیں تیاریوں کے بعد ہُوا

یہ ہم میں رنگِ حقیقت یونہی نہیں آیا
یہ رنگ پیدا اداکاریوں کے بعد ہُوا

تمام شہر جو دشمن بنا ہوا ہے جمالؔ
اِک آدمی کی طرفداریوں کے بعد ہُوا

○

تیری یاد اور تیرے دھیان میں گزری ہے
ساری زندگی ایک مکان میں گزری ہے

اِس تاریک فضا میں میری ساری عمر
دیا جلانے کے امکان میں گزری ہے

اپنے لیے جو شام بچا کر رکھی تھی
وہ تجھ سے عہد و پیمان میں گزری ہے

تجھ سے اُکتا جانے کی اِک ساعت بھی
تیرے عشق ہی کے دوران میں گزری ہے

دیواروں کا شوق جہاں تھا سب کو جمالؔ
عمر مری اُس خاندان میں گزری ہے

سلیم کوثر

○

طفلانِ شہر کو ، کوئی دیوانہ چاہیے
ایسے میں تم کو گھر سے نکل آنا چاہیے

پیڑوں سے آ ملے ہیں سفیرانِ سبز گام
موسم بدل رہا ہے، اُسے آنا چاہیے

صحرا غبارِ کوچۂ جاناں سے آملا
آوارگانِ عشق کو گھر جانا چاہیے

جب ٹوٹ ہی چکا ہے طلسمِ حصارِ شب
پھر روشنی میں کچھ تو نظر آنا چاہیے

وہ قحطِ تشنہ ہے سرِ بازارِ آگہی
اس چشمِ نیم وا کو بھی میخانہ چاہیے

ہاتھوں میں آ کے رنگ بدل لیں مگر سلیم
پھولوں کو شاخ پر تو نہ مرجھانا چاہیے

○

سب سے پہلے تو پتوار سے گرہِ آبِ رواں کھولنا
پھر مخالف ہوا تیز ہو جائے تو بادباں کھولنا

دُنیا داری کے غم میرے بچپن ہی سے میرے ہمراہ ہیں
منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلنا اور اپنی دکاں کھولنا

سب ہُنر کاریاں حرفِ معجز میں پتھرا گئیں تو کھُلا
سنگ زادوں پہ ممکن نہیں کارِ شیشہ گراں کھولنا

گھر میں سب لوگ تھے، میرے کمرے میں میری کتابیں بھی تھیں
پھر بھی آنکھیں دریچے میں رکھ دینا اور کھڑکیاں کھولنا

جب کبھی میری آواز سے میری سانسیں اُلجھنے لگیں
ایسے عالم میں سب راز مجھ پر مرے رازداں کھولنا

بس وہی مشعلِ حرف سینے میں روشن رکھے تو رکھے
ورنہ کس بس میں کہاں یہ اُجالے تہہِ آسماں کھولنا

یہ نگارِ جہاں ہے سلیم اس میں سب بولتے ہیں مگر
اپنی آواز سب سے الگ رکھ سکو تو زباں کھولنا

سلیم طاہر

بے برگ ڈالیوں پہ گلاب آنا چاہیے
اِک لمحے کو نظر پہ سراب آنا چاہیے

ٹکرا کے شہرِ سنگ کی اُونچی فصیل سے
میری صدا ہی لوٹے، جواب آنا چاہیے

کیوں پانیوں کی زد پہ رہیں کچّی بستیاں
پختہ گھروں پہ بھی تو عذاب آنا چاہیے

میری نظر میں بھی تو جگا اپنے معجزے
مجھ پر بھی حیرتوں کا عذاب آنا چاہیے

ممکن ہے پتھروں سے نمو پھوٹنے لگے
بنجر زمیں پہ عکسِ سحاب آنا چاہیے

کب سے کھڑی ہے نیند کی باندی حضورِ جسم
پلکوں کی اوٹ بھی کوئی خواب آنا چاہیے

طاہرؔ ملے گا کیا تجھے اخفائے حال سے
دل کی تہوں کا رنگ بر آب آنا چاہیے

عذاب سر پہ وہ آیا ہے، ٹل نہیں سکتا
وہ چاہے بھی تو مقدر بدل نہیں سکتا

نہ سینچ آبِ ہوس سے شجر تعلق کا
یہ پیڑ اب کے جو سُوکھا تو پھل نہیں سکتا

تو لاکھ پردوں میں چُھپ کر بھی میرے سامنے ہے
تو میری آنکھ سے بچ کر نکل نہیں سکتا

ترا کہا نہ کریں لوگ تو تعجب کیا
کہ خود پہ بھی تو ترا حکم چل نہیں سکتا

میں موم موم ہوں طاہرؔ سرشت میں اپنی
کڑی دوپہر میں گھر سے نکل نہیں سکتا

ایوب خاور

○

ہجر کا موسم ہے، عمرِ رائیگاں اور ایک میں
ایک صحرائے زمین و آسماں اور ایک میں

وہ بچھڑتے وقت آنکھوں میں سمندر بھر گیا
اب سرِ منظر فقط اک بادباں اور ایک میں

زندگی جیسے کمینے دوستوں کے درمیاں
اِک مری تنہائی، اِک پندارِ جاں اور ایک میں

اس کی آنکھوں کھلنے والے سارے موسم مجھ میں تھے
اب وہی موسم ہیں، بادِ رفتگاں اور ایک میں

جیسے کوئی پھر اچانک لوٹ کر آ جائے گا
منتظر ہے عرصۂ کون و مکاں اور ایک میں

گھر کے اندر کون ایسی چاند راتوں میں رہا
ہاں مگر اِک ساعتِ وہم و گماں اور ایک میں

خاورؔ اتنا ہی بہت ہے اس کہانی کے لیے
اِک تری پلکوں کا جلتا سائباں اور ایک میں

○

ہوا غبار بھرا گھر بھی، میری آنکھیں بھی
بچھڑتے وقت کا منظر بھی، میری آنکھیں بھی

پسِ گمان کہیں ماہتاب اُترتے ہی
اُتر گیا ہے سمندر بھی، میری آنکھیں بھی

اِک ایسا ہجر سرِ رنگ و صوت ہے جس میں
سُلگ رہا ہے گُلِ تر بھی، میری آنکھیں بھی

بس ایک چُپ کی مسافت نے کر دیا ہے نڈھال
اِک آئینے کا مقدر بھی، میری آنکھیں بھی

بُجھا چراغِ تمنّا تو بُجھ گئے خاورؔ
تمھاری یاد کے منظر بھی، میری آنکھیں بھی

حسن رضوی

○

خود اپنے ہاتھ سے اپنے ہی گھر جلاتے ہیں
ہم اپنے شہر میں جشنِ طرب مناتے ہیں

جو دیکھتے ہیں اُسے ہم رقم نہیں کرتے
جو پوچھنا ہے تو کچھ اور ہی بتاتے ہیں

بنا کے ریت کے گھر خود ہی توڑ دیتے ہیں
مگر رُتوں پہ ہی الزام سب لگاتے ہیں

یہ کون لوگ ہیں جو فصلِ گل کے آتے ہی
شجر شجر کے گلے پر چھُری چلاتے ہیں

ہمیں پتہ نہیں تحریر کر رہے ہیں کیا
ہمارے لفظ حقیقت سے خوف کھاتے ہیں

ہمارے قلب ہیں یا برف کی ہیں سلیں ہیں حسنؔ
لہولہو ہیں مگر پھر بھی مُسکراتے ہیں

○

جانے، کیا وابستگی ہے ہم کو زندانوں کے ساتھ
ہاتھ اُلجھتے ہیں ابھی زنجیر کے خانوں کے ساتھ

دشت کی تنہائیوں کا تذکرہ بے سُود ہے
یعنی مستقبل بھی کٹ جائے گا دیوانوں کے ساتھ

اُس کے لہجے کی کھنک سے بول اُٹھتے تھے گلاب
اس کا اِک اِک لفظ کھِلتا تھا گلستانوں کے ساتھ

طائرانِ شہر بھی میری طرح خاموش ہیں
جیسے وہ بھی سُن چکے ہیں کچھ دبے کانوں کے ساتھ

وہ بھی رُت آئے گی، مہکیں گی حسنؔ ویرانیاں
رنگ لکھیں گی ہوائیں سبز عنوانوں کے ساتھ

علی اکبر عباس

○

دن چڑھا، گلی آباد ہوئی، بڑھیوں کی جمی چوپال بھلا
گودوں میں پوتے پوتیوں کی کبھی ناک بہے کبھی رال بھلا

کوئی چرخا ڈاہ لو گڑ کاتے، کوئی بالوں کی رسّی باٹے
کوئی کھیس کے بمبل باندھے تو کوئی لگ جائے اس کے نال بھلا

کوئی چھاج چنگیر بُنے بیٹھی، یا رنگلی پیڑھیوں کی پینکھی
کوئی چاول پھٹکے صاف کرے، کوئی چُننے بیٹھ کے دال بھلا

سن پیسیؑ والے کی گھنٹی، کسی بچّے نے جوڑوں رال کی
چُنی کا کونہ کھول کہا، لو ایک ٹکا میرے لال بھلا

کچھ دُکھ سُکھ پچھلے ویلے کے، کچھ یادیں الھڑ عمروں کی
سب اگلی پچھلی باتوں تک پھیلے باتوں کا جال بھلا

کوئی شادی ہے یا گود بھری، کوئی مرا یا مرنے والا ہے
سب اک دوجی کو آن کہیں سارے گاؤں کا حال بھلا

کھڑکی سے بہو آوازیں دے، چل اندر آ جا ہن بے بے
مجھے ہانڈی روٹی کرتی ہے، ٹکڑے کو آن سنبھال بھلا

کل ان کی کوئی بہو بیٹی یہ سب کچھ دوہراتی ہوگی
اللہ کرے ان گلیوں کے یونہی بیتیں ماہ و سال بھلا

○

جب کھیلے حال دھمال گھٹا اور ناچیں جھونکوں کی پریاں
سنتور چھیڑے پھر بارش کا، ہر تار سے پھوٹیں سُر جھڑیاں

دھرتی بن جائے رنگ فشاں، خوشبو کے لاوے بہہ نکلیں
سب گرد کی کنج اُتر جائے، ہر شاخ کہے ہری آن ہری آن

کوئی باغ نظر کوئی پیہوں صدا کوئی باس وہ بجری کینوں کی
کوئی یاد لچ کوئی ڈال سوچ کوئی پینگاں اسمانیں چڑھیاں

جب رقص مسلسل سے تھک کر رُک جائے ہوا ستانے کو
تو جسم تھپا ور کرتا ہے قدموں پہ پسینے کی لڑیاں

یہ آم رگ و پے میں اُتریں آیات خداوندی کی طرح
رکھتے ہی زباں پر کھل اُٹھیں یہ جامن کلیاں رس بھریاں

ہر سانس نئے پکوانوں کے کچھ ذائقے اُتریں سینے میں
اور تھال پھراتی گلیوں میں کچھ بالڑیاں کچھ ادھ کڑیاں

راشد مراد

○

قرب کا لمحہ اگر حرفِ گماں رہ جائے گا
دُوریوں کا دُکھ دلوں میں جاوداں رہ جائے گا

ہم بچھڑ جائیں گے یوں تو سارے رشتے توڑ کر
ایک رشتہ پھر بھی اپنے درمیاں رہ جائے گا

جا رہا ہے وہ تو گُل کر کے رفاقت کا چراغ
خیمۂ دل میں جدائی کا دُھواں رہ جائے گا

ہمسفر تو راستے کی گرد میں گُم ہو چلا
آنکھ پُتلی میں بچھڑنے کا سماں رہ جائے گا

ہم اگر راشد جڑوں کو کھوکھلا کرتے رہے
استقامت میں شجر ایسا کہاں رہ جائے گا

○

صفائیوں کی بھی آخر سبیل کر لیں گے
یہ بے گناہ بھی کوئی وکیل کر لیں گے

فلک سے چاند ستاروں کی بھیک کیوں مانگیں
جلیل ذہن زمیں کو جمیل کر لیں گے

یہ کج ضمیر محاسب کسی کی دہشت سے
مجھے یقیں تھا، عدالت طویل کر لیں گے

زبانِ خلق سے گویائی چھیننے والے
یہ سوچتے ہیں، سمندر کو جھیل کر لیں گے

ساجد امجد

○

ساز و رختِ سفر نہیں کھلتا — دشت میں کوئی در نہیں کھلتا
اپنے سائے میں بیٹھتے ہیں لوگ — ہر کسی پر شجر نہیں کھلتا
کوئی موجود ہے ضرور یہاں — کون ہے، آنکھ پر نہیں کھلتا
ہر مسافر کا ہے بیان الگ — قصۂ رہگزر نہیں کھلتا
موسمِ شہر کیا کھلے کہ یہاں — خانہ زادوں پہ گھر نہیں کھلتا
یا تو بے سمت ہے سفر اپنا — یا بھٹکنے کا ڈر نہیں کھلتا
ہم بھی کچھ دیکھ کر ہیں مہر بہ لب — وہ بھی کچھ سوچ کر نہیں کھلتا
یہ تاثر ہے ایک جست کا کھیل — نغمۂ بارِ دگر نہیں کھلتا
وہ ترے نام پر کھلے تو کھلے — لمحہ جو عمر بھر نہیں کھلتا

قافلہ کوچ کر چکا ساجدؔ
اپنا پائے نظر نہیں کھلتا

○

قدم آباد ہوئی وسعتِ صحرا ہم سے — کوچہ گردوں میں کہاں بادیہ پیما ہم سے
اس طرح گرد ہوئے ہم کہ نہ ہوگا کوئی — رُخ ہوا کا خس و خاشاک نے پوچھا ہم سے
شاید اُس رات اُسے دیکھ سکے دیکھا تھا ہمیں — بے دھڑک آنکھ ملاتا تھا ستارا ہم سے
ہم سبک سیر سرِ ساحلِ غم تھے پھر بھی — نظر انداز ہوئی موج نہ دریا ہم سے
اور کچھ روز یہ چہرے ہیں، یہ آنکھیں ہیں، یہ خواب — اور کچھ روز رہے گا یہ تماشا ہم سے
یہ عجب شہر ہے، سب ایک سے چہرے ہیں یہاں — کون جانے کہ ابھی کون ملا تھا ہم سے
اپنے سب فیصلے اُس آنکھ سے وابستہ ہیں — دیدنی ہوگا مآلِ غمِ دُنیا ہم سے
ہم کو پہلے بھی نہ ملنے کی شکایت کب تھی — اب جو ہے ترکِ مراسم کا بہانہ ہم سے

اُس کے دم سے تھا، وہ گریہ ہو کہ ہنسنا ساجدؔ
کوئی محفل ہوئی آباد نہ تنہا ہم سے

اعتبار ساجد

باغبانو! ہر شہادت کی خبر گنتے رہو
شہر میں باقی ہیں اب کتنے شجر گنتے رہو

دیکھنا پسماندگانِ آگہی ہیں کون کون
زینتِ شانہ ابھی ہیں کتنے سر گنتے رہو

کون جانے کب پلٹ کر آئیں گے پیغامبر
اب منڈیروں پر حنا آلود پَر گنتے رہو

منزلِ جاں تک رہے قائم رفاقت کا بھرم
ہر پڑاؤ پر متاعِ ہمسفر گنتے رہو

لکھ چکے ہیں مدحتِ شب کتنے فرزندانِ شب
آ چکے ہیں کتنے پیغامِ سحر گنتے رہو

رُوبرو سُورج کے دہرانا مسافت کی کتھا
کتنی آوازیں بدلتا ہے گجر، گنتے رہو

اکتفا چہرے بدلنے کی ادا پر کس لیے
اُس میں ہیں کچھ اور پوشیدہ ہنر، گنتے رہو

شاعرو! لکھتے رہو تمثیلِ دریائے فرات
ناقدو! الفاظ کے زیر و زبر گنتے رہو

خواہشیں یوں مرے گھائل دل و جاں ڈھونڈتی ہیں
تتلیاں جیسے کوئی کُنجِ اَماں ڈھونڈتی ہیں

دِل کسی ندرتِ اظہار پہ قانع ہی نہیں
دھڑکنیں لہجے بدلتی ہیں، زباں ڈھونڈتی ہیں

یہ وہ موسم ہے کہ صحرا میں کھلاتا ہے گلاب
یہ وہ عمریں ہیں کہ ہر لمحہ زیاں ڈھونڈتی ہیں

رُت جگے ڈھلتی ہُوئی عمر میں سجتے بھی نہیں
شب کی قربان گہیں جسمِ جواں ڈھونڈتی ہیں

انگلیاں اُس کے لرزتے ہُوئے اندیشوں کی
دل سے گزریں تو مرے زخمِ نہاں ڈھونڈتی ہیں

ایسی اُجڑی ہیں مری رُوح کی گلیاں اب کے
رہگذاریں تری آمد کے نشاں ڈھونڈتی ہیں

ہم وہ خوش بخت کہ دریا سے ہوئے محوِ کلام
تشنہ رُوحیں تو سرابوں میں اماں ڈھونڈتی ہیں

دل زدہ شہر کی آنکھیں مرے فن میں ساجد
نوحۂ ذات نہیں، ذکرِ بتاں ڈھونڈتی ہیں

زمان کنجاھی

○

زمینِ چشم میں اشکوں کو آج مرنے دو
چڑھا ہوا ہے جو دریا اُسے اُترنے دو

پھر اُس کے بعد میں دیکھوں گا خواب کی تعبیر
خمارِ خواب کو آنکھوں سے تو اُترنے دو

مثالِ باد ہمیشہ سفر رہے جاری
جو اپنے سائے سے ڈرتے ہیں، اُن کو ڈرتے دو

مرے بھی نقش زمانے میں جاوداں ٹھہریں
مجھے بھی وقت کے خاکے میں رنگ بھرنے دو

مجھے تو صبح اُجالوں کی سمت جانا ہے
دیارِ شب میں گھڑی دو گھڑی ٹھہرنے دو

ہوائے شام مجھے راستوں میں کہتی ہے
بکھر رہا ہے اگر کوئی تو بکھرنے دو

جہاں بھی جاؤں اُسی کو میں رُوبرو پاؤں
زماںؔ اِک ایسا سفر اختیار کرنے دو

○

ایسا لمحہ آیا غم کے ماروں پر
سب نے تیرا نام لکھا دیواروں پر

غم کی دھوپ میں دل کی ایسی حالت ہے
جیسے برف پگھلتی ہے کہساروں پر

جو بھی اب دیکھے گا خواب بلندی کا
حرف آئے گا اُس کے ہی معیاروں پر

آئی نہیں جب ایک کرن بھی آنگن میں
خاک اُڑائی اس نے چاند ستاروں پر

پھر بھی اپنے قد کا اندازہ نہ ہوا!
ہم نے چڑھ کے دیکھ لیا میناروں پر

حسن عباس رضا

○

اُس شب کتنا ٹوٹ کے روئے، چاند، ہوا، اور مَیں
تینوں ہی اِک ساتھ اُجڑے تھے، چاند، ہوا، اور میں

چاروں اور تھا سایہ کوئی، اور نہ در و دیوار
ایسے تپتے تھلوں میں اُترے، چاند، ہوا، اور میں

سارے خواب عذاب ہوئے اور سبھی خیال، زوالی
کس بِرتے پھر سپنے بُنتے، چاند، ہوا، اور مَیں

لب، بستر تھے، حبس رُتیں تھیں، اور اماوس رات
کیونکر من کی بپتا کہتے، چاند، ہوا، اور مَیں

کیا منظر تھے، آنکھوں میں جو ناخن گاڑ گئے
کون ستم رت تھی جب بچھڑے، چاند، ہوا، اور میں

چاند، ہوا، اور مجھ میں سجناں، کوئی فرق نہیں
ایک سی رُت کے چاہنے والے، چاند، ہوا، اور میں

حسن رضا، وہ رات مرادوں والی جب بھی آئی
دیکھنا کیسے گلے ملیں گے، چاند، ہوا، اور میں

○

جس پہ چار قدم چل کر شہزادی جائے
ایسے رستے کی توقیر بڑھا دی جائے

جسم خزانوں کی اشرفیاں چُن لینے میں
ہرج نہیں، گر ساری عمر بتا دی جائے

"ق"

تاجِ شہی کے [illegible]ب اُگانے والوں کو بھی
قتلِ گھوں کی ایک [illegible]ک دکھلا دی جائے

حرم سرا کے بھید مبادا کھل جائیں
روزن روزن جاگتی آنکھ بُجھا دی جائے

شہ درِوازوں پر جب خوف اِستادہ ہو تو
کس بِرتے پھر آس محل فریادی جائے

کون گھڑی تقدیر قبیلے کی بدلے گی
جانے کون سمے گھر سے بربادی جائے

گھٹنوں کے بَل چلنے والوں کے ہاتھوں میں
رخشِ صبا رفتار کی باگ تھما دی جائے

انعام الحق جاوید

○

نہ اپنا روپ چھپانا نہ روبرو ہونا
کمالِ جذب ہے پابندِ آرزو ہونا

مہِ زوال رہے گا عروج پر کب تک
رُخِ نصیب یہ لکھا ہے سرخرو ہونا

اُسے خبر ہے کہ آئینہ عکس دیتا ہے
وہ چاہتا ہی نہیں اپنے روبرو ہونا

ہر ایک شخص یہاں خوبیوں کا مالک ہے
یہاں پہ عیب نہ ٹھہرے گا عیب جُو ہونا

کب اس چمن کی فضاؤں کو راس آیا ہے
کسی بھی پھول کا موضوعِ گفتگو ہونا

یہ کس نشیب کی دُنیا میں لوٹ آیا ہوں
پڑا ہے کس کے لیے دھوپ میں لہو ہونا

ہمارے ہاتھ کی بے مائیگی کا مظہر ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی کا بے نمو ہونا

○

نہ پوچھ کیسے ترے دل میں گھر کیا ہم نے
کہ تجھ سے پیار ہی کب سوچ کر کیا ہم نے

شفیقِ شب کے تعاقب میں جگنوؤں کی طرح
رفیقِ راہ پہ تنہا سفر کیا ہم نے

وہ ملکیت تھی تمہاری جو رات گزری ہے
وہ مستعار تھا دن جو بسر کیا ہم نے

بدل سکے نہ یہ دنیا تو کیا کہ دُنیا میں
قیام بھی تو بہت مختصر کیا ہم نے

طویل رات مسافت میں کاٹ دی لیکن
سحر کو قید بنامِ سحر کیا ہم نے

نگاہیں دُور، بہت دُور تک گئیں لیکن
کب اپنی ذات کی جانب سفر کیا ہم نے

یہ واقعہ ہی نہیں، سانحہ بھی ہے جاوید
کوئی بھی کام کہاں وقت پر کیا ہم نے

شجاعت علی راہی

○

چھوٹا سا اِک قطرہ ہوں
لیکن کل کا دریا ہوں

دن بھر گُم سُم رہتا ہوں
نیند میں باتیں کرتا ہوں

شاخ سے لگ کر روتا ہوں
میں اِک سُوکھا پتّہ ہوں

پھُول بنوں تو مر جاؤں
پتھر بن کر زندہ ہوں

موسم کی تقدیر ہوں میں
دستِ صبا پرکندہ ہوں

جگنو ہوں اِک چھوٹا سا
تاریکی سے لڑتا ہوں

دنیا کی باتیں چھوڑو
تم کو کیسا لگتا ہوں

سات سمندر گھوم چکا
لیکن اب بھی پیاسا ہوں

جو کھولے منظر اُس کے
میں اِک بند دریچہ ہوں

○

چلتا پھرتا پارہ ہوں
آوارہ سیّارہ ہوں

یا دُنیا بنجارن ہے
یا پھر میں بنجارہ ہوں

کونجوں سے صحبت میری
میں بھی درد کا مارا ہوں

باہر سے ہوں ایک مگر
اندر سے سیپارہ ہوں

کس کے آگے دل کھولوں
کس کی آنکھ کا تارا ہوں

دنیا ٹھہری نرم زباں
اور میں اِک انگارہ ہوں

روشن ہوں اک مدّت سے
جلتا بجھتا تارا ہوں

○

جس دریا سے ڈرتے ہو
اُس دریا میں اُترتے ہو

جس سے جھگڑا کرتے ہو
دل میں اُسی پر مرتے ہو

کانٹوں میں رہتے ہو مگر
پھُول کی باتیں کرتے ہو

کل تک تم کو ہوش نہ تھا
اور اب آہیں بھرتے ہو

تنہا کمرے میں راہیؔ
کس سے باتیں کرتے ہو

(جدّہ ۔ سعودی عرب)

خالد اقبال یاسر

تعبیر سے محروم ترے خواب بہت تھے
سادہ سی کہانی تھی مگر باب بہت سے تھے

آ لگتی کنارے سے مری کشتیٔ جاں بھی
شاید کہ مرے پاؤں میں گرداب بہت تھے

بے نام ہوئے نام کی تکریم کے ہاتھوں
پہچانتا کیا کوئی کہ القاب بہت سے تھے

افسوس تموّج انھیں ساحل پہ نہ لایا
انمول گہر ورنہ تہِ آب بہت تھے

منظر کی کشش کھینچ تو لائی ہمیں لیکن
ٹھہرا نہ گیا ہم سے کہ سیماب بہت تھے

ہر لحظہ بدلتی ہوئی رُت بس میں نہیں تھی
جو بن پہ تھی برسات تو شاداب بہت تھے

کچھ ہم بھی بہک سے گئے نم ناک ہوا میں
کچھ تم بھی تو آمادۂ ایجاب بہت تھے

ہم اپنے بھی پابند نہیں تھے کبھی یاسرؔ
اٹھ آئے کہ تقریب کے آداب بہت سے تھے

یوسف جہلمی

بے جان ہو کے لوگ ترے وار سے گرے
لیکن نہ اپنی ذات کے معیار سے گرے

جنگل میں کتنے پیڑوں کو آندھی گرا گئی
تنکے نہ ننھّی چڑیا کی منقار سے گرے

کرنوں نے کیا یہ برف کی دستار کھول دی
اُونچے پہاڑ کٹ کے اِسی دھار سے گرے

بارش سے بچ کے آئے تھے کیسی پناہ میں
پتّھر کئی درختِ ثمر دار سے گرے

یوسؔف خراج، حُسن کا معمار لے گیا
مزدور بھی تو شہر کے مینار سے جا گرے

منصورہ احمد

○

تمام شہر میں تیرہ شبی کا چرچا تھا
یہ اور بات کہ سُورج اُفق پہ نکلا تھا

عجیب وجہِ ملاقات تھی مری اُس سے
کہ وہ بھی میری طرح شہر میں اکیلا تھا

میں سب سمجھتی رہی اور مسکراتی رہی
مرا مزاج ازل سے پیمبروں سا تھا

میں اُس کو کھو کے بھی اُس کو پکارتی ہی رہی
کہ سارا ربط تو آواز کے سفر کا تھا

میں گُل پرست بھی گُل سے نباہ کر نہ سکی
شعورِ ذات کا کانٹا بہت نکیلا تھا

سب احتساب میں گُم تھے ہجومِ یاراں میں
خدا کی طرح مرا جُرمِ عشق تنہا تھا

وہ تیرے قرب کا لمحہ تھا یا کوئی الہام
کہ اس کے لمس سے دل میں گلاب کھلتا تھا

مجھے بھی میرے خدا کلفتوں کی داد تو دے
تجھے زمیں پہ بڑے کرب سے اُتارا تھا

○

یہ پتّے جو اپنی شاخ سے بچھڑے ہیں
فصلِ خزاں کے، یا میرے آئینے ہیں

تجھ کو دیکھوں بادل، خوشبو، جھونکے ہیں
اِک چہرے میں کتنے لاکھوں چہرے ہیں

بھیگی رُت میں کوئل کی فریاد سنو!
آج گھٹا کے رنگ بہت ہی گہرے ہیں

کالی رات کا سینہ کاٹ کے، سب تارے
تیرے نام کے جگنو بن کر اُترے ہیں

تیرے خال و خد کو کیا پہچانوں میں
تیرے عکس کے سارے رنگ سنہرے ہیں

شاخیں ننگی ہو کر کیوں چلّاتی ہیں
پت جھڑ کے لمحے تو گونگے بہرے ہیں

ذات کے سبز جزیروں پر کیا موسم ہے!
سرکش موج کے اندھے کالے پہرے ہیں

زاهد فخری

○

کوئی صحیفہ، پریشان اُمتوں کے لیے
کہیں سے روشنی، بھٹکے مسافروں کے لیے

وہ دشتِ خوف سے تجھ کو صدائیں دیتے ہیں
دکھا دے راستہ اَن دیکھی منزلوں کے لیے

یہ کیا کہ تیرے ہی اوصاف گنتے رہتے ہیں
سبیل ہو کوئی اپنی شناختوں کے لیے

اب ایسے بادلوں کو بھیج جو برس بھی سکیں
زمین پیاسی ہے الہام بارشوں کے لیے

نوید بھیج کوئی اُن کے لوٹ آنے کی
چراغ لینے گئے تھے جو طاقچوں کے لیے

اسی زمین سے پھل پھول ہوں عطا ہم کو
دگرنہ حکم ملے پھر سے ہجرتوں کے لیے

ہم عہدِ حال میں جیسے ہیں، تجھ پہ ظاہر ہے
دعائیں مانگتے ہیں خیر کی رُتوں کے لیے

○

کون رویا تھا درختوں کو اُکھڑتے دیکھ کر
چُپ کھڑے تھے سب، زمینوں کو اُجڑتے دیکھ کر

ہم نے اپنی عادتیں بدلیں، سروں کو خم کیا
آسمانوں کو زمینوں پر بگڑتے دیکھ کر

ہجرتیں جن کے مقدّر میں لکھی ہوں کیا کریں
گاؤں خالی ہو گیا پانی کو بڑھتے دیکھ کر

کیا خبر تھی، رُخ ہماری سمت ہوتا جائے گا
رُک گئے تھے ہم انھیں لڑتے جھگڑتے دیکھ کر

وہ بڑا خود سر تھا، آخر پار جانا تھا اُسے
کون اُس کو روکتا دریا کو چڑھتے دیکھ کر

فصلِ گُل کی بے بسی میں ہم برابر تھے شریک
کچھ نہ فخریؔ کر سکے ہم پھول جھڑتے دیکھ کر

خُرّم خلیق

○

اُمید کوئی بھی حاصل نہیں سفر سے ابھی
میں مطمئن نہیں اپنی نئی ڈگر سے ابھی

ابھی تو چاند کو پورا فلک گزرنا ہے
قدم ہیں دُور بہت منزلِ سحر سے ابھی

چھتیں گری ہیں، سلامت مگر ہیں دیواریں
ہے گھر کی شکل بہت مختلف کھنڈر سے ابھی

بصارتوں کے یہ دھوکے، یہ دل کے وہم و گماں
کہ تم ملو گے جو نکلوں گا اپنے گھر سے ابھی

جدائیوں میں بھی ہوں تیری قربتوں کا اسیر
نکل سکا ہوں کہاں خلعتِ اثر سے ابھی

یہ زخم مار بھی ڈالیں تو لوٹ آؤں گا
بہت حساب چکانا ہے شہر بھر سے ابھی

میں پورے قد سے بھی تم تک نہیں پہنچ سکتا
بس ایک آس بندھی ہے شکستہ پَر سے ابھی

سہارا کس لیے اُٹھنے کو مانگ لُوں خرّم
بدن کا ربط تو ٹوٹا نہیں ہے سر سے ابھی

○

ہے بازوؤں میں ابھی زور، مت ڈرا مجھ کو
اگر مرا کوئی دشمن ہے تو دِکھا مجھ کو

اُتار دے مرے سینے میں بھی کرن کوئی
بنا کے آج ستارہ، کہیں سجا مجھ کو

بہت سفر ابھی تیرے بغیر کرنا ہے
کوئی، خدا کے لیے، دے نہ آسرا مجھ کو

میں ڈھونڈ لاؤں گا اُس کو خلا کے غاروں سے
تو ایک بار فضا میں ذرا اُڑا مجھ کو

جلا کے دیپ وہ تاریکیاں مٹا تو گیا
دکھا کے شکل، نئی دے گیا سزا مجھ کو

اگر ہے تو میرا ہمدرد، ہاتھ تھام مرا
بھنور کے چاروں طرف سے نہ دے صدا مجھ کو

یہ موسموں کا بدلنا چھپا گیا خرّم
میں زرد تن تھا، ملا پیرہن ہرا مجھ کو

جاوید احساس

○

انا کو ٹوٹے ہوئے برتنوں میں رکھا ہے
یہی اثاثہ ہمارے گھروں میں رکھا ہے

پرانے دور کی ہر شے نے پیرہن بدلا
مگر چراغ انہی طاقچوں میں رکھا ہے

مرے بدن کی اکائی نہ ڈھونڈ پاؤ گے
کہ عکس ٹوٹے ہوئے آئینوں میں رکھا ہے

جو بال و پر نہیں رکھتے، قفس کی زینت ہیں
کھلی فضا کا تصور پروں میں رکھا ہے

میں سطحِ آب پہ کیسے تمہیں نظر آؤں
چھپا کے میں نے بدن سیپیوں میں رکھا ہے

گزشتہ عہد کی اک یادگار ہوں احساس
مرا وجود عجائب گھروں میں رکھا ہے

○

جب خزاں کے عہد کو بے دست و پا ہونا پڑا
موسموں کے ساتھ جنگل کو ہرا ہونا پڑا

اُس کے پاؤں میں بندھی بیساکھیوں کو دیکھ کر
مجھ کو اپنے قد و قامت میں بڑا ہونا پڑا

ابتدا موسم نے کی تھی صرف پتوں کے لیے
پھر مجھے شاخوں کی خاطر انتہا ہونا پڑا

اپنی سچائی کا خمیازہ بھگتنا تھا مجھے
خود سے ملنے بھی نہ پایا تھا، جدا ہونا پڑا

دھوپ کرنوں کو یہی بازیگری مقصود تھی
خشک صحراؤں کو بھی دریا نما ہونا پڑا

راشد متین

○

توی سورج دہکنا چاہتا ہے
ثمرِ حیرت ہے پکنا چاہتا ہے
نشیبوں کے مکینوں کو خبر ہو
بدن پتھر دھڑکنا چاہتا ہے
دعائیں بوجھ بنتی جا رہی ہیں
فلک دامن جھٹکنا چاہتا ہے
پپیہا خواہشوں کے پَر لگا کر
خلاؤں میں بھٹکنا چاہتا ہے
ستارہ بدلیوں کی اوٹ لے کر
نجانے کس کو تکنا چاہتا ہے
کبھی، اے پیکرِ خوشبو! ادھر بھی
دھنک گلشن مہکنا چاہتا ہے
خیالوں سے نکل جا ایک پَل کو
کوئی پلکیں جھپکنا چاہتا ہے
اماں کی کھوج میں پاگل پرندہ
ابھی کچھ اور تھکنا چاہتا ہے
جو اک مدت سے تھا خاموش راشد
وہ دل اب پھر دھڑکنا چاہتا ہے

عارف محمود

○

صرف راہرو نہ تھے جو گرد گرد ہو گئے
راستے بھی راستوں کے پیچ و خم میں کھو گئے

جل رہے ہیں سرد زرد موسموں کے بادباں
آسماں برس برس کے بال و پر بھگو گئے

تن بدن میں آگ سی لگا گئیں یہ ساعتیں
کیا سنائیں داستان ۔ داستان گو گئے

بازوؤں میں خواب بن کے وہ بکھر گئے مگر
باس کے تمام رنگ آنکھ میں پرو گئے

لذتیں ہی لذتیں تھیں، ذلتیں ہی ذلتیں
کتنے درد تھے کہ ایک رات میں سمو گئے

قفل کون توڑتا درِ دلِ خموش کا
زندگی کے رس بھی زندگی کا زہر ہو گئے

مقبول عامر

رات بیٹھا تھا مرے پاس خیالوں میں کوئی
اُنگلیاں پھیر رہا تھا مرے بالوں میں کوئی

دیدۂ تر نے بڑی دیر میں پہچانا اُسے
رُوپ کھو بیٹھا ہے دو چار ہی سالوں میں کوئی

غمزدہ شب کی گلوگیر ہوا کہتی ہے
یاد کرتا ہے سبھی جاگنے والوں میں کوئی

لذتِ لمس میسّر تھی نہ قربت کی مہک
یُونہی مدہوش رہا تیرے خیالوں میں کوئی

اب تو اِس حال کو پہنچے ہیں کہ جی چاہتا ہے
کاش مِل جائے ترے چاہنے والوں میں کوئی

میں تو شب شہر میں تھا اور اُدھر گاؤں میں
جلتی شمعیں لیے پھرتا رہا گاؤں میں کوئی

یہ عہد پھر سے مرے نقش کو اُبھارے گا
زمانہ اس کو مرے نام سے پکارے گا

اَزل سے آدم و فطرت ہیں برسرِ پیکار
خبر نہیں ہے کہ یہ جنگ کون ہارے گا

ترے وصال سے آباد تھی مری دُنیا
ترا فراق مری عاقبت سنوارے گا

ہمیں یہ غم ہے نگارِ وطن! کہ ہم نہ رہے
تو جانے کون ترا قرضِ غم اُتارے گا

مجھے یقین ہے عامرؔ کہ ایک روز خدا
اِسی زمیں پہ بہشتِ بریں اُتارے گا

محمّد افضل

○

دیر سے دُنیا سوچ رہی ہے، کب کچھ ہوگا
جھُوٹ اور سچ کی بات چلے گی، تب کچھ ہوگا

جھُوٹ اور سچ کے سب معیار بدل جائیں گے
جھُوٹے کہلائیں گے سچے، سب کچھ ہوگا

اِک مدّت سے وقت کی گردش بدل رہی ہے
یوں لگتا ہے، اب کچھُ ہوگا، اب کچھ ہوگا

اپنی اپنی ہانک رہے ہیں شیخ و برہمن
کہتے کہتے تھک جائیں گے، تب کچھ ہوگا

ایسی بھی کیا بے تابی ہے، ہو لینے دو
تم بھی افضل دیکھ ہی لوگے، جب کچھ ہوگا

نورین طلعت

○

تمام عُمر اِسی تاریک گھر ہی رہنا ہے
جو آنکھ ہوگئی تر، اُس کو تر ہی رہنا ہے

ثمر ملا ہے محبّت کی انتہا سے یہی
حیات نخل کو اب بے ثمر ہی رہنا ہے

ہمارے نام تو رُسوائیاں ہی لکھی ہیں
وہ معتبر ہے، اُسے معتبر ہی رہنا ہے

ہمارے گھر میں بھٹکتی پھرے گی تنہائی
ہمارے غم کو تو بس در بدر ہی رہنا ہے

کسی کے گھر کو گرا کر بنائیں اپنا مکاں
ہُنر ہے یہ تو ہمیں بے ہُنر ہی رہنا ہے

فیروز شاہ

○

مجھے یقیں ہے کہ انجامِ شب سحر میں ہے
اگرچہ دُور ہے منزل مگر نظر میں ہے

یہ اور بات کہ موسم ہی بے وفا ٹھہرے
نمو کا جوشش وگرنہ شجر شجر میں ہے

کڑی رُتوں کے مسافر بھٹکتے جاتے ہیں
سنا ہے کوئی گھنا پیڑ رہگذر میں ہے

مرا ندیم تھا وہ نُور نُور لمحوں میں
گئے دنوں کی ضیا آج بھی قمر میں ہے

مکیں خموش ہیں فیروزؔ! کھنڈروں کی طرح
بسا ہوا کوئی آسیب بام و در میں ہے

○

ساحلِ الفاظ پر موتی اُچھالے جائیں گے
بر فصیلِ شہرِ لب، سُورج اُجالے جائیں گے

گرد بادِ وقت میں ہے عزم کی ناؤ رواں
ہاتھ زخمی ہی سہی، چپّو سنبھالے جائیں گے

شہر سے آئے ہوئے خوش رنگ طوفانوں کے سیل
گاؤں کے کچّے مکاں اِک دن بہالے جائیں گے

شاخ سے گر ٹوٹ کر پتّے زمیں پر گر گئے
آندھیوں کے تیز جھونکے سب اُڑا لے جائیں گے

یہ حسیں دریا، یہ اپنی ہی صداؤں کے اسیر
کتنے موتی اپنے دامن میں چھپالے جائیں گے

قمر جاوید

ریت کے جزیروں میں رنگ و آب کی خواہش
میرے گھر اُتر آئی پھر سراب کی خواہش

آنکھ کے سمندر میں حیرتوں کے طوفاں ہیں
پھر سے نیند کی خواہش، پھر سے خواب کی خواہش

آ کہ تیرے دامن میں شوق تتلیاں بھر دوں
تجھ میں جھانک کر دیکھے پھر گلاب کی خواہش

تیرے ساتھ رہنے کی شام تک کسے فرصت
اک سوال کی خواہش، اِک جواب کی خواہش

خوف جنگلوں میں اب رات سے اُلجھتا ہے
شاخ شاخ میں بوئیں آفتاب کی خواہش

محمد الیاس چیمہ

آرزو ہے کہ ستاروں کی چمک پاؤں میں
یوں ہی شاید تری آنکھوں میں سما جاؤں میں

اشتیاق اب کوئی معنی نہیں رکھتا اے دل
اور کیا عذرِ ملاقات کا اپناؤں میں

راستہ صاف بھی ہے، راست بھی ہے، روشن بھی
کس طرح سلسلۂ ذہن کو سلجھاؤں میں

کب تلک شہر کی جلتی ہوئی سڑکوں پہ پھروں
کوئی تو پیڑ پکارے کہ ٹھہر جاؤں

کیا کہوں، خانہ خرابی کا مجھے غم کیوں ہے
چاہتا ہوں، کسی مہمان کو بلواؤں میں

گھر تو خلد سہی، میں بھی گنہگار سہی
رحمتِ حق سے عجب کیا کہ جگہ پاؤں میں

اختلافات

مشکور حسین یاد، ڈاکٹر سلیم اختر، امتیاز علی خاں، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، احمدی بیگم، حفیظ احسن، مسرت ہاشمی، یوسف حسن، ایوب خاور، اظہر عنایتی، جابر علی سیّد، آصف ثاقب،

تازہ شمارہ

پچھلے دنوں مجھے کراچی جانا پڑا تو وہاں معلوم ہوا کہ کسی صاحب نے "فنون" کے لئے رینے گینوں اور عسکری مرحوم کے خلاف مضمون لکھا ہے۔ تجسس پیدا ہوا کہ اس مضمون کو ضرور پڑھوں گا۔ اس میں یقیناً کچھ ٹھوس باتیں کہی گئی ہوں گی لیکن تازہ "فنون" آیا اور ریاض صدیقی کا مضمون پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ تحریر سراسر خام معلومات اور عدم واقفیت کے تحت لکھی گئی ہے۔ نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنا کوئی بُری بات نہیں لیکن سرے سے حقایق ہی کو غلط پیش کیا جائے، کس قدر افسوس کی بات ہے۔ ایک بار تو آپ پر بھی غصہ آیا کہ اس قسم کی تحریروں کے حواشی میں آپ کچھ کیوں نہیں لکھتے۔ ریاض صدیقی صاحب نے بزعم خود عسکری مرحوم کے ذہنی سفر کا تجزیہ فرمایا ہے لیکن وہ تاریخی اعتبار سے بھی درست نہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق عسکری صاحب "۱۹۶۵ء تک مغرب پرستی اور جدیدیت کے فروغ میں پیش پیش تھے" جس سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ صدیقی صاحب نے عسکری صاحب کے سنہ ۱۹۶۰ء میں لکھے ہوئے مضامین ملاحظہ نہیں فرمائے۔ اب یہ مضامین وقت کی راگنی میں مع تاریخ چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے متذکرہ مضمون کے حواشی میں صدیقی صاحب نے رینے گینوں کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ رینے گینوں کی آٹھ کتابیں انگریزی میں ہیں۔ وہ کون کون سی کتابیں ہیں، ذرا صدیقی صاحب بتائیں تو سہی؟ باقی رہی وہ تین کتابیں جن کا ذکر انھوں نے اپنے حواشی میں کیا ہے یعنی (INTRODUCTION TO THE STUDY OF HINDU DOCTRINES) (CRISIS OF THE MODERN WORLD) اور (EAST AND WEST) تو جناب ان کتابوں کا ترجمہ ضرور انگریزی میں ہوا ہے اصل کتابیں فرانسیسی میں ہیں۔ صدیقی صاحب کو تو ایک کتاب کا نام بھی صحیح یاد نہیں۔ وہ ہسٹری نہیں سٹڈی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ریاض صاحب نے ان کتابوں کے نام ہی سُنے ہیں انھیں کھول کر نہیں دیکھا ورنہ پتہ چل جاتا کہ یہ ترجمہ شدہ کتابیں ہیں یا مصنف کی اصل زبان میں ——— کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ اپنی اس بے خبری کے ساتھ لکھنے چلے ہیں رینے گینوں اور عسکری کے خلاف ———۔
مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ان "فاضل" مقالہ نگار نے "جدیدیت" کو غور سے نہیں پڑھا، ورنہ مجھے یقین ہے کہ اس قدر جامع اور بلیغ کتاب کو وہ "بستر پر بیٹھ کر لکھے گئے سرسری نوٹس" بتانے کی کبھی جرأت نہ کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ریاض صاحب بہت مصروف آدمی ہیں، انھیں حجم کر مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں۔ "جدیدیت" تو خیر عسکری صاحب کی ایسی کتاب ہے جسے پوری انسانی زندگی پر حاوی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے لئے واقعی بڑی یکسوئی کی ضرورت ہے۔ ریاض صاحب نے تو "ستارہ یا بادبان" کے مضامین کو بھی غور سے نہیں پڑھا۔ اسی لئے زیرِ بحث مضمون میں اس کتاب سے قریب قریب جتنے حوالے دیئے ہیں سب کے سب غلط کہے جا سکتے ہیں جیسے کوئی یہ کہے قرآن میں آیا ہے کہ نماز کے قریب نہ جاؤ۔ میرا مطلب ہے سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے حوالے دیئے گئے ہیں۔ ریاض صاحب کی عمر کیا ہے، یہ مجھے معلوم نہیں، البتہ ان کے مبلغِ علم کا اس مضمون سے پتہ ضرور چلتا ہے۔ کیا عسکری مرحوم کے بارے میں یہ کہنا سوءِ ادب نہیں کہ "وہ فکری و علمی اختلاف جو ایک بڑے اور بالغ نظر ذہن

میں تخلیقی و تعمیری تحریک کو رہ دیتا ہے اُن کے یہاں ناپید ہے" یا اسی طرح عسکری مرحوم کو اُن لوگوں میں شامل کرنا جو اپنے ہی شجرِ سایہ دار کی شاخیں کاٹتے رہے۔ کیا عسکری مرحوم کے مرتبۂ علم سے ناواقفیت کی دلیل نہیں؟ سچ پوچھیئے تو یہ اُن کی شخصیت پر صریح ظلم ہے۔ ویسے تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کوئی خاص بات بھی نہیں ہے احسان فراموشی تو ہم مسلمانوں کا ابتدا سے شیوۂ بے اختیار رہا ہے

اسی طرح مجھے پروفیسر محمد عثمان صاحب کے تبصرہ معاشرہ دلپذیر کو پڑھ کر افسوس اور ملال ہوا۔ اُنھوں نے محمد حسن عسکری مرحوم کو جذباتی اور انتہا پسند کہہ ڈالا۔ چلیئے ان کی ذات کو کہنا تھا سو کہا تھا اُن کے خیالات و آرا کو جو بڑی حد تک رینے گینوں کے خیالات و آرا ہیں" اردو ادب کی نئی جذباتی لہر سے موسوم کر دیا۔ پروفیسر صاحب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ ان خیالات و آرا کا اردو ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ یہ خیالات و آرا تو پوری انسانی زندگی کے رویّہ پر محیط ہیں۔ عثمان صاحب نے بغیر سوچے سمجھے عسکری مرحوم پر تصوف کی لذت کوشیوں کا الزام بھی لگا ڈالا ہے۔ پروفیسر صاحب کو تصوف کے بارے میں سنے سُنائے خیالات سے زیادہ بھی کچھ علم ہونا چاہیئے۔ تصوف کو فی نفسہٖ بُرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ترویجِ دین کے ضمن میں صوفیائے کرام کی تمام کوششوں پر ہم پانی پھیر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جس تصوف کو ہمارے اکابرین اقبالؔ وغیرہم نے بُرا کہا ہے اور جو بے عملی کی طرف لے جاتا ہے۔ رینے گینوں اور عسکری مرحوم کا وہ تصوف قطعی نہیں ہے۔ سچا تصوف تو عمل ہی عمل ہے لیکن ایسا عمل جس میں خدا کا بندہ خدا کو ایک لمحہ کے لئے فراموش نہیں کرتا۔ اللہ کے خیال کے بغیر خالص مادی ترقی حرص و ہوس کے سوا اور کچھ نہیں رہتی۔ رینے گینوں اور عسکری نے اسی مادی ترقی کی مخالفت کی ہے۔ زبانی طور پر اپنے آپ کو انسان دوست یا ہمدردِ انسانیت کہنا آسان ہے صحیح معنوں میں ہمدرد بننا بہت کٹھن ہے۔ سچے ہمدرد لوگ ٹھاٹ باٹ کی زندگی تو الگ رہی عام راحت کی زندگی بھی بسر نہیں کر سکتے جبکہ معاشرے میں لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا ہو۔ دوسروں کی ہمدردی میں اپنے آپ کو آرام و آسائش سے محفوظ رکھنا ہر کسی کا کام نہیں اسی لئے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ تکمیلِ آرزو کی نسبت ترکِ آرزو دشوار ہے۔ ہم تکمیل آرزو کو عمل سمجھ لیتے ہیں اور ترکِ آرزو کو بے عملی، کس قدر دکھ اور بے حسی کی بات ہے۔ اپنے تبصرے کے آخر میں پروفیسر عثمان صاحب نے محمد علی صدیقی کا اقتباس بطور حمایت پیش کیا ہے۔ محمد علی صدیقی صاحب کے بارے میں مجھے کبھی الگ تفصیل سے لکھنا ہوگا۔ یہ ہمارے اچھے باشعور نقاد ہیں جنھیں ابھی تک یہی معلوم نہ ہو سکا کہ رینے گینوں اور عسکری مرحوم روایت کو کس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی ایک عام قاری کی طرح رینے گینوں کو عقل پرستی اور حقیقت پسندی کا سفاک دشمن کہہ ڈالا۔ صدیقی صاحب ایسے عقلمند اور حقیقت پسند حضرات کو یہ کیسے سمجھایا جائے کہ رینے گینوں اور عسکری صاحب کے مفہوم میں تمام آسمانی صحیفے بھی قرآن پاک سمیت روایت میں شامل ہیں ——— اور سچ پوچھیئے تو یہی مفہوم روایت کا اصل مفہوم ہے۔ صحیفے اللہ کی طرف سے لکھے لکھائے کتاب کی صورت میں نازل نہیں ہوا کرتے، ان کے راوی پیغمبرانِ کرام ہوتے ہیں ——— ہاں یہ ضرور ہے کہ روایت کے اس مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں اشہدان لا الٰہ الا اللہ کہنا پڑتا ہے۔ معلوم نہیں اس شہادت پر عثمان صاحب کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، اور محمد علی صدیقی صاحب اس گواہی کے کہاں تک قائل ہیں ورنہ روایت کا یہ مفہوم سمجھنا اتنا کوئی دشوار نہیں ہے۔ آخر میں پروفیسر عثمان کی دعوتِ فکر کے لئے تصوف کی ایک دو اصطلاحوں کا ذکر کرتا چلوں جن کا ذکر عسکری مرحوم ہی نے کیا ہے۔ مثلاً تصوف کی اصطلاح میں فنا کے معنی ہیں تمام جہالتوں کا مٹ جانا۔ جذبہ کے معنی ہیں اللہ کا بندے کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنا ——— فکر کے معنی ہیں اشیاءِ عالم کو دیکھ کر ذہن کا حقیقتِ عظمیٰ کی معرفت حاصل کرنا ——— تصوف کی اصطلاح میں آہ کمالِ دردِ عشق کی اُس کیفیت کو کہتے ہیں جسے لفظوں میں بیان نہ کیا جا سکے۔ غرض سچا تصوف حرکت و حکمت کے حسین امتزاج سے فروغ پاتا ہے۔ پروفیسر عثمان صاحب نے میری تقریریں سُن کر اور میرے مضامین پڑھ کر ہمیشہ داد دی ہے۔ دیکھتا ہوں میری اس تحریر کی وہ کس قدر داد دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس کی داد یہی ہے کہ وہ عسکری مرحوم کی صرف دو کتابیں "جدیدیت" اور "وقت کی راگنی" غور کے ساتھ پڑھ ڈالیں اور میری یہی گذارش محمد علی صدیقی صاحب کی خدمت میں بھی ہے۔ علم کے راستے میں ہٹ دھرمی کا کوئی مقام نہیں ——— یہاں تو افہام و تفہیم ہی سے کچھ حاصل ہوتا ہے اور اسی سے عزت و آبرو قائم رہتی ہے۔

اس کے علاوہ فتح محمد ملک کا مضمون "ایران — ادب کے آئینے میں" اور اختر جمال صاحبہ کا مضمون پریم چند کی یادیں ... — ... کا مضمون اس معنی میں بے حد بلیغ ہے کہ انقلاب ایران کے بارے میں ہمیں پتہ چلتا ہے کہ معزول شاہ کے خلاف نفرت کوئی آج ... کا مضمون جسے میں انشائیہ کہوں گا، ایک سچے کشادہ دل اور وسیع النظر صاحب قلم کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ کشادہ دلی اور وسعت ... خصوصیت سے میں نے اس لئے دی ہے کہ یہی صفات آج کل اہل قلم میں سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ رہا ممتاز مفتی صاحب کا تعارف فکر تونسوی کے بارے ... کی داد کیا دی جائے کہ مفتی صاحب ہمارے بہت بڑے لکھنے والے ہیں۔ انھوں نے فکر تونسوی کا تعارف کچھ اپنی اور کچھ ان کی زبانی نہایت ... سے میں کرایا ہے — خدا انھیں خوش رکھے — اور اب محمد ارشاد صاحب کے تجزیے کی داد تو میں تفصیل کے ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ شاید کبھی کہہ سکوں۔ ارشاد صاحب کی تحریر میں بلا کی صفائی (CLARITY) ہے۔ مشکل سے مشکل مسئلے کو آسانی سے سمجھا دیتے ہیں۔

اس بار "اختلافات" میں صفحہ ۱۸۰ کی ۱۹ ویں سطر کے آغاز میں میرے ہی خط میں "بُری طرح" کے بجائے "مُبری طرح" چھپ گیا ہے ... مفہوم ہی بدل گیا۔ میں نے لکھا تھا "بُری طرح شکار ہو جاتے ہیں"۔ کتابت کی غلطی سے "مبری طرح شکار ہو جاتے ہیں" لکھ گیا — اختلافات ہی میں کوئی صاحب یوسف عباس ہیں انھوں نے جھنگ سے لکھا ہے کہ موصوف نے میرا انشائیہ "گدھے کی آواز" پڑھا اور وہ انھیں جگت بازی نظر آئی۔ استغفر اللہ! غالباً اس انشائیہ کے عنوان سے وہ گڑبڑا گئے حالانکہ گدھے کی آواز کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے اور اسی سے متاثر ہو کر میں نے یہ سنجیدہ عبارت لکھی تھی جس میں یوسف صاحب کو ہنسی ٹھٹھول کی باتیں محسوس ہوئیں — "کوئی سمجھاؤ کہ ہم سمجھائیں کیا" — یوسف صاحب کو چاہئے کہ وہ اپنے شہر جھنگ ہی میں ادب کے کسی قاری کو میرا یہ انشائیہ دکھائیں یا خود دوبارہ غور سے پڑھیں۔ انشاء اللہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی — میں تو خود انشائیہ کو ایک سنجیدہ صنف ادب سمجھتا ہوں جس کے ثبوت میں میرا تازہ مضمون بھی ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے جو شاید "فنون" کی اسی اشاعت میں شامل ہو سکے۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

آپ نے اس مرتبہ "فنون" کے اداریہ میں دشنام طرازوں کے دبستاں کے بارے میں لکھ کر اپنے لئے مزید گالیاں کھانے کا بندوبست کر لیا ہے۔ دشنامی دبستاں درحقیقت "مافیا" کے اصول پر کام کرتا ہے۔ اوپر مری ہوئی چھپکلی کے پیٹ ایسی زرد رنگت والا آکٹوپس یعنی گاڈ فادر اور نیچے اس کے مٹن رگاڈ فادر کا ڈرٹی ورک کر لے والے کم حیثیت کارندوں کے لئے یہ "مافیا" کی مخصوص اصطلاح ہے)۔ روپے پیسے کی افراط ہے۔ اس لئے "نام مطلوب ہے توفیض کے اسباب بنا" کے مصداق گالیاں دینے کے لئے نہ صرف اپنے پرچے نکال سکتے ہیں بلکہ دیگر پرچوں اور ان کے مدیران کو خریدنے کی استطاعت بھی رکھتے ہیں، اس لئے آپ کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی کہ کوئی "ان بے لگاموں کے منہ میں شائستگی کی لگام دے"۔

یہ ادبی وڈیرے ادب کو جاگیر اور ادیبوں کو مزارعے سمجھتے ہیں۔ بندر بانٹ کے مصداق وہ شہرت تقسیم کرنے کی ترازو لئے بیٹھے ہیں مگر آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ یوں تخلیقات کے نام پر جو صفحات سیاہ ہیں تو درحقیقت یہ ادب کا بیک یارڈ بنا رہے ہیں کہ وقت ان پر زنگ کی تہیں جما دیگا۔ — آپ ان زر مستوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں، زمانہ انھیں اس طرح کھا جائے گا جیسے آگ رسی کو، یہ دوسری بات ہے کہ ان کی فطرت کی کجی کے بل پھر بھی نہ نکلیں گے۔ "فنون" کے اداریہ کو ان کے تذکرہ سے ناپاک نہ کیجئے!

شارجہ والے امتیاز علی خاں صاحب کے علم سے پہلے ہی میں تو ساختیاتی تنقید پر بحث بند کر دی تھی۔ مجھے خدا نے اتنا ظرف دیا ہے کہ مخالفت برداشت کر سکوں اور نہ ہی کبھی میں نے مخالفانہ آراء کا بطور خاص جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح بحیثیت نقاد میں دوسروں پر تنقید کرنے کا حق استعمال کرتا ہوں اسی طرح دوسروں کو بھی یہ حق دینے پر تیار ہوں۔ محمد علی صدیقی صاحب نے "ریکارڈ" درست کرنے کے نام پر میری نیت پر شاید شبہ کیا تھا اس لئے چند امور کی وضاحت کر دی۔ اس کے بعد صدیقی صاحب کا خط آیا کہ میں اس بحث کو مزید نہیں چلانا چاہتا چنانچہ میں خاموش ہو گیا لیکن صدیقی صاحب کی دانست میں "ریکارڈ" ابھی تک درست نہ ہوا تھا کیونکہ انھوں نے مجھے مخاطب کر کے اور یہ سرخی جما کر "انھیں ان کا خوف مبارک ہو" اپنے دل کی

... نگارشات بھی ... اردو میں "بہرحال" اچھی طرح نہ نکلی اس لیے MORE OVER کہہ کر انگریزی میں بھی گر جہ ! تو صاحب عرض ہے کہ میں بتا رہا تھا نہیں
اس لیے مجھے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ؟

اے سنگ بر تو دعویٔ طاقت مسلّم است
خود را ندیدہ ای بخت شیشہ گر ہنوز

(ڈاکٹر) سلیم اختر (لاہور)

فنون کے سالنامے کا وعدہ کر کے معمول کی ایک اشاعت پر ٹرخا دینا صاف بے رحمی ہے، اور اب کے پھر آپ سالنامے کا وعدہ کر رہے ہیں مگر اس پر یقین کون کرے گا۔ میرے خیال میں اب قارئینِ فنون کو یہ دعا کرنی چاہیئے کہ خدا آپ کو ایفائے وعدہ کی توفیق دے۔

حرفِ اول میں آپ نے پاکستان کی ادبی دنیا کے جس روگ کی نشان دہی کی ہے، وہ واقعی وبا کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے جس کا ریب کو یہ بھونڈی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ پچھلے دنوں یہاں بعض پاکستانی اخبارات کے ادبی صفحے میری نظر سے گذرے۔ ان میں بڑی جھلاہٹ کے ساتھ آپ کے ۱۲ سطروں کے اس اداریہ کے خلاف بیسیوں اور سینکڑوں سطریں لکھی گئیں ہیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ نے بہتوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ "چور کی داڑھی میں تنکا" کی ضرب المثل داناؤں نے یونہی تو نہیں گھڑی تھی۔ ان عناصر کو کف در دہاں رہنے دیجیئے اور آپ اپنا مبارک کام کئے جائیے۔ خدا آپ کو برکت دے۔

اب کے "رفتگاں" کے عنوان کے تحت مرنے والوں کی ایک قطار سی لگی ہوئی ہے۔ آپ نے ان مرحومین میں سے بعض کے بارے میں نظمیں اور مضامین شامل کر کے صحیح معنوں میں قارئین کے آنسو پونچھے ہیں۔

فتح محمد ملک نے "روزن در" میں ادب کے آئینے میں جدید ایران کی نہایت بصیرت افروز جھلک دکھائی ہے۔ ملک صاحب سے اور بھی لکھوایئے اور بار بار لکھوایئے۔ یہ شخص تو مجسم متوازن اور روشن خیال تنقید ہے۔ "فن اور فن کار" کی ذیل میں ممتاز مفتی نے فکر تونسوی کی شخصیت پر نہایت بھرپور مضمون لکھا ہے۔ ممتاز مفتی اپنے موضوع فکر تونسوی سے بڑا ادیب ہے مگر جب کوئی بڑا ادیب اپنے سے چھوٹے پر اتنی فراخ دلی سے لکھتا ہے تو انسان کی تہذیبی قدروں کے حاشیے جگمگا اٹھتے ہیں۔ مقالات میں اب کے پھر محمد ارشاد کی بصیرت افروز اور فکر انگیز تحریر نے مسحور کر لیا۔ خدا کرے ان کا یہ تجزیاتی مطالعہ کبھی ختم نہ ہو اور خدا کرے سید علی عباس جلالپوری بھی اس کا نوٹس لیں اور اسی بہانے محفلِ "فنون" میں پھر قدم رنجہ فرمائیں۔ ان کے بغیر فکر و فلسفہ کی محفل سونی ہے۔ باقی تینوں مضامین (گمراہ مغرب، محمد حسن عسکری اور اسلام ___ پریم چند کی یاد میں ___ اور یورپ کا تشدد پسند ...) سراسر تشنہ ہیں۔ اتنے اہم موضوعات پر قلم اٹھانے والے اگر کچھ اور محنت کر لیتے تو کیا برا تھا۔ اور اگر آپ بھی کچھ احتیاط فرما لیتے تو کیا قباحت تھی۔

افسانوں میں ___ میری نظر میں ___ سب سے کامیاب اور موثر افسانہ نیلوفر اقبال کا "مولا داد" ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں کہانی ... یہ منفرد اور دلآویز اسلوب ناپید ہو رہا تھا۔ خدا نیلوفر اقبال کا بھلا کرے کہ وہ افسانے کو افسانہ رہنے دینے کی روایت کا احیا کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں بلقیس ظفر کی "آوازیں" بھی ان کی اس تحریکِ احیائے افسانہ میں شامل ہیں۔ انور عنایت اللہ، میرزا ریاض، کمال مصطفےٰ اور قیوم راہی نے اپنی کہانیوں پر بڑی محنت کی ہے مگر یہ بڑی کہانیاں نہیں بن پائیں۔ بس ٹھیک ہی ہیں۔ آخر میں تین نئے نام نظر آئے یا کم از کم میرے لئے نئے ہیں ... علامت زدہ ہیں۔ ان میں ایم۔ ایم۔ ادیب کی کہانی "نیند کے کالے پاؤں" غنیمت ہے۔ انور سجاد کے ناول "خوشیوں کا باغ" کا ایک باب درج کر کے آپ نے بالواسطہ طور پر یہ انکشاف کیا ہے کہ اب انور سجاد کی علامت سمجھ میں آنے لگی ہے اور وہ اپنی تحریر کے ایک ایک جملے پر محنت کرنے لگے ہیں۔ انور سجاد میں یہ تبدیلی بہت خوش آئند ہیں۔ رد بینہ قزلباش اس دفعہ پھر پاکستان کے لوک ورثے کا ایک شہپارہ لے کر آئی ہیں۔ یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی لوک کہانی "مرزا گاسس" بہت سے پہلوؤں سے علامتی ہے اور اعلیٰ طبقوں کے اخلاقی معیاروں پر بڑے زور کی ضرب ہے۔ رفینہ ...

کو دریافت کر کے "فنون" نے اردو ادب کی ایک اور یادگار خدمت کی ہے۔ سفرنامہ صرف ایک سہی، اور وہ بھی ایک سفرنامے کی تیسری قسط سہی مگر حسین شاہد نے سفرنامے کو ادب پارہ بنانے کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ شخص کسی قسم کی تراہٹ کے بغیر کتنی سچی باتیں کتنی شگفتگی سے سناتا ہے۔ خدا کرے وہ سفر پر ہی رہے۔
صلاح الدین حیدر کے انشائیہ "جنون، جنونی اور مجنون" کو انشائیہ نگاروں کا ماڈل ہونا چاہیئے۔ بہت COMPACT انشائیہ ہے۔

"اختلافات" کا حصہ حسب سابق نہایت بھرپور ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ مشکور حسین یاد تو بہت کٹر قسم کے عسکری پرست ہیں مگر انھوں نے اپنا "کیس" بہت سلیقے اور معقول استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے بس اتنا ہے کہ وہ ایک ہارا ہوا مقدمہ جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انتظار حسین کی "بستی" پر محمد خالد اختر کے تبصرے کو سب کے قریب قریب سبھی "اختلافات نگاروں" نے (بجز میرے) موضوع بحث بنایا ہے اور میری بدنصیبی یہ ہے کہ میں نے یہ ناول ابھی تک نہیں پڑھا۔ پڑھ لوں تو کھل کر کچھ کہوں۔ اور ان شاء اللہ کہوں گا بشرطیکہ یہ موضوع جاری رہا۔

اجمل کمال نے خالد احمد پر برستے ہوئے یہ کمال دکھایا ہے کہ لکھنے والے کو مملکت کی بجائے عوام سے وفادار رہنا چاہیئے اور عوام سے وفاداری پر ریاستوں سے ہزار وفاداریاں قربان کی جا سکتی ہیں؛ —— ان بھولے بادشاہ کو کوئی سمجھائے کہ ریاست زمین کے ایک خالی ٹکڑے کو نہیں کہتے۔ ریاست صرف اس وقت ریاست بنتی ہے جب اس میں عوام بھی بس رہے ہوں اور ریاست سے وفاداری دراصل ریاست کے عوام سے وفاداری ہوتی ہے اور ریاست اور حکومت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ حکومت سے وفاداری ضروری نہیں۔ ادیب کو اپنی ریاست کا، اپنی مملکت کا، اپنے وطن کا وفادار رہنا چاہیئے۔ وہ اس سے وفادار نہیں رہے گا تو عوام کا بھی وفادار نہیں رہے گا کیونکہ جب ریاست تباہ ہو گی تو ساتھ ہی عوام بھی تباہ ہو جائیں گے۔ اجمل کمال صاحب کے "عالمگیر" نظریے کو ہضم کرنے کے لئے پتھر کے پاؤں کا معدہ چاہیئے۔ منصورہ احمد کی تحریر میں وہی صفائی، تازگی اور دیانت ہے جو اس سے پہلے ان کی تحریروں میں اپنا سکہ جما چکی ہے۔ ان خاتون سے تنقیدی مضامین لکھوائیے اور اگر ایسا ممکن نہیں تو "اختلافات" تو بہرحال لکھواتے رہیے۔ فتح محمد ملک کے مضمون "پاکستان اور مشکلاتِ لاالہ" پر منظور احمد کا استفہامی تبصرہ خاصا سخن گسترانہ ہے۔ یہ صاحب مسلمانوں کے مستقبل سے بڑے مایوس معلوم ہوتے ہیں۔ بہت عالمانہ سوالات ہیں اس لئے کوئی عالم ہی جواب دے تو بھلا لگے گا۔ آخر میں یوسف عباس کا "اختلاف" ہے جو سراسر اختلاف ہے۔ یہ صاحب بڑے انتہا پسند معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ کوئی بزرگ ہیں تو لاعلاج ہیں البتہ اگر جوان ہیں تو انہیں چاہیئے کہ اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ انتہا پسندی کا انجام ہمیشہ المناک ہوتا ہے۔ اجمل کمال کی طرح یہ صاحب بھی خالد احمد پر برسے ہیں اور اس کے جس ہیبتناک گناہ پر برسے ہیں، اسی گناہ کے اپنی پوری تحریر میں مرتکب ہوئے ہیں۔ ان میں جوش و خروش بہت ہے منطق و استدلال کی کمی ہے۔ انھیں اپنی ذہانت کو یوں برباد نہیں کرنا چاہیئے۔

اب رہ گئی ضیافتِ فن کی "سویٹ ڈش" یعنی شاعری —— تو تازہ، توانا اور اعلیٰ معاصر شاعری تو "فنون" کا امتیاز خاص ہے۔ نظموں میں احمد ظفر، اقبال کوثر، پروین فنا سید، پروین شاکر، ناہید قاسمی، منصورہ احمد، عشرت آفریں اور محمد سعید نے متاثر کیا اور غزلوں میں ظہور نظر، قتیل شفائی، رشید قیصرانی، (ایک بار پھر) پروین شاکر، رشک خلیلی، نجیب احمد، نثار ناسک، شفیق سلیمی اور (ایک بار پھر) عشرت آفریں نے مسحور کیا۔ ایک ایک شاعر کے بارے میں لکھوں گا تو یہ لذیذ حکایت دراز تر ہو جائے گی۔ اللہ آپ کو اور "فنون" کو اور "فنون" کے معاونین کو سدا سلامت رکھے کہ انہی کے دم سے اس ویرانے میں میرے آس پاس ہمہ وقت چمن سے کھلے رہتے ہیں۔

امتیاز علی خاں (شارجہ)

عین اس وقت جب سالنامے کے سنہرے سپنے تعبیروں کی نایابی کے طفیل اپنی موت مرنے کو تھے، موجودہ شمارے نے اپنی جھب دکھائی۔ خیال تو یہی تھا کہ شاید یہ محض آنسو پونچھنے کی کارروائی ہے لیکن مندرجات دیکھ کر بلکہ پڑھ کر کافی سے زیادہ شرم آئی۔ شمارہ حسب روایت بھرپور ہے۔
سبط علی صبا نے تمنا کی تھی:

مجھے پکار مری فکر کے حوالے سے
میں لفظ لفظ تری داستاں میں رہ جاؤں

اور حقیقت میں اُس کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ شفیع ضامن نے جس طرح صبا کو لفظ لفظ اپنی داستان میں اتارا وہ صرف ایک بہت ہی چاہنے والا حساس دوست کر سکتا تھا۔ اسی مضمون کے حوالے سے مجھے صبا کی تکلیف دہ معاشی حالات کا علم ہوا۔ میں سوچتی رہی کہ برصغیر میں شعر و ادب کے حوالے سے معاشی تنگدستی ایک بہت پرانی جاگیر ہے، جو نسل بعد نسل اہلِ علم کی برادری میں بڑی منصف مزاجی سے تقسیم کی جا رہی ہے۔ یہ ستم ہے کہ پلاسٹک کے بدہیئت گڈے تخلیق کرنے والے صنعت کار دولت کے انباروں کا وارث قرار پاتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ باریک لفظی پیکر تراشنے والے جذبوں کا تخلیق کار اس ملک کے معاشی ڈھانچے میں کسی گنتی شمار میں ہی نہیں آتا۔ یہ اپنے صدیوں پر محیط علمی اور تہذیبی ورثے کے باوجود ہم ان لوگوں کو اس مقام پر رکھتے ہیں کہ اہلِ علم کی فضیلت تسلیم کرانے کے لئے تعارفی دلائل کی ضرورت پڑے اور اتنے بڑے TALENT کے ہوتے ہوئے ان شبینہ کرنے کے لئے کسی QUALIFICATION کی ضرورت پڑے۔ یہ میں کس بحث میں جا پڑی کہ جو برسوں سے چل رہی ہے مگر اپنی تمام لفظی تاثیر سمیت نقادوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ نجانے کتنے ہی جواہر اس رنج سوز الاؤ میں جل کر بھسم ہو گئے۔ رفتگاں تو ایک طرف، ان زندوں کا شمار نہ جانے کتنا ہو جو روز پانی پینے کے لئے روز کنواں کھودتے ہیں اور پانی بھی بقدرِ ظرف ہی میسر آتا ہے یہ کون جانے۔

اسی حوالے سے ایک اور بات بھی ذہن میں آتی ہے۔ آج کل صحافت کے نام پر جو دانے کسے جا رہے ہیں اور ہر ایک دوسرے کو بزعمِ خود عریاں کرنے کے درپے ہے، کیا اس کا ایک نفسیاتی پہلو یہ نہیں کہ یہ HUNGER اور ANGER کا افسوس ناک ملاپ ہے؟ میں جب ماہناموں، ہفت روزوں اور روزناموں کے ادبی ایڈیشن اٹھا کر دیکھتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ کیا اب یہ شہر اپنی فصیلوں کے ہوتے ہوئے بے اماں ہو جائیں گے۔ کیا اس بستی کے مکین لباس پہن کر بھی برادرانِ یوسف کے ہاتھوں مادر زاد برہنہ دکھائی دیں گے؟ اگر شیشے کے گھر میں بیٹھ کر سنگ زنی اسی تسلسل سے ہوتی رہی تو کیا کسی بھی گھر کی چوکھٹ سلامت رہے گی؟ تب کیا ہو گا جب لفظ کی شمعیں بجھ چکی ہوں گی اور انسان اپنے ہاتھوں آخری سچائی کو قتل کر کے یکہ و تنہا اندھے بیابانوں میں بھٹکتا پھرے گا۔

سوچ کا رہوار ذرا سا اور آگے بڑھے تو یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر ان لوگوں کو دو وقت کی روٹی کا یقین مل جائے تو شاید یہ لوگ اس قدر اشتعال سے پتھر نہ پھینکیں اور اتنی شدت سے گالی نہ دیں کہ گالی دیتے ہوئے ان کی اپنی ذات بھی پاتال میں گر جائے اور ان کے چہرے اس نحوست کا بوجھ نہ اٹھاتے ہوئے کسی عفریت کے چہرے میں تبدیل ہو جائیں۔

"پریم چند کی یاد میں" کے عنوان سے اختر جمال کا مضمون پڑھا۔ جذبے اور کرب کی آمیزش سے لکھا ہوا یہ مضمون پریم چند کے متعلق کم اور پاک و ہند کے ادیبوں کے تعلقات کے متعلق زیادہ تھا۔ شروع سے آخر تک یہ بات بہت کھٹکی حالانکہ توقع تھی کہ وہ ہمیں پریم چند اور پریم چند کے فن کے متعلق کچھ بتائیں گی اور مضمون کا نام بھی ایسا تھا کہ مضمون کا کینوس بہت پھیلایا جا سکتا تھا۔ بہرحال اسی ضمن ہی میں یعنی پاک و ہند ادباء کے ضمن میں اختر جمال کے نقطۂ نظر سے مجھے اختلاف ہے، لکھتی ہیں:

"ادب تو ایک سمندر ہے عظیم وحدت ہے، بولیاں اور زبانیں لہریں ہیں جن پر انسانی تہذیب اور ارتقا کی کشتی رواں دواں ہے۔ ہم انگریزی، روسی، فرانسیسی، دنیا کی ہر زبان و ادب کو محبت سے پڑھتے ہیں تو پھر برصغیر کے ادیبوں اور لوگوں کا آپس میں ایک دوسرے سے اجنبی ہونا دکھ کی بات ہے۔"

مذہبی، سیاسی وجوہ کی بنا پر جو خلیج بنی ہے وہ مجھے تسلیم لیکن میری ناقص رائے میں، تو ہمارے ہاں راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور عصمت کو اتنی ہی محبت سے پڑھا جاتا ہے جتنی محبت سے ہم ندیم، فیض، ہاجرہ مسرور اور اشفاق احمد کو پڑھتے ہیں اور اب تو دونوں ممالک کے ادباء، علماء اور شعراء کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی بہت تیز ہے۔ ہاں ہندوستان میں کیا صورت حال ہے اس کے متعلق سردست میں کچھ نہیں جانتی۔

اپنا احساسِ کمتری توڑنے کے لئے میں نے چار بار "خوشیوں کا باغ" پڑھا لیکن بالآخر مجھے شکست تسلیم کرنا پڑی (علامت کا ادراک مجھے آج تک نہیں ہو سکا) مگر میری حوصلہ افزائی کا ایک پہلو یہ تھا کہ پیراگراف الگ الگ سمجھ میں آ گئے مگر عزادارانِ حسینؑ، ام الخبائث شراب، بارش

گ... خاموشی سے سر جھکا کر کام کرنے والے دفتر کے عملے کا آپس میں کیا رشتہ ہے ــــ یہ طے نہیں ہو سکا۔ مکمل ایڈ... کو بہت ... رکھوں تو ...مت پر... ارڈوں میں ... حیات کا بہت دلپذیر نقشہ ہے۔

فسانوں کے حصے میں حسبِ معمول تشنگی محسوس ہوتی رہی۔ موضوع کے اعتبار سے تو سب افسانے گوارا تھے مگر حسنِ بیان کی حد تک ... ل ... بعد ... دور ... تا ... امید ہو چکی ہوں جب ... نظم ... اور ... جیسے شاہکار تخلیق کیے گئے جن میں ... رنگا ... بہت کچھ نغمے ... جذب ہوا کرتے تھے۔

موجودہ شمارے میں ان جذبوں کا پرتو کسی حد تک انور عنایت اللہ کے ہاں قومی پس منظر میں نظر آتا ہے۔ "یوں بھی تو تھا" ایک موثر تحریر ہے بیشتر اس لئے کہ وہ بتاتی ہے کہ ہم نے اپنی کشتیاں خود کس طرح نذرِ آتش کیں؟

نیر زاہد ریاض کی کہانی "مقدمہ" غیر موثر تھا اور کمزور موضوع کی مظہر ہے۔ سب سے بڑی کمی ARTISTIC DETACHMENT کی محسوس ہوتی ہے کہ وہ سارا وقت اپنی ہیروئین کے ذہین صفائی پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

کمال مصطفےٰ نے "مرتد" میں باغی یا انقلابی کا کردار پیش کیا ہے جو انقلابی کی بجائے تمام وقت چوں چوں کا مربہ نظر آتا ہے۔ باغی ... تو ... مضبوط IDEAL کے مالک ہوتے ہیں جبکہ شخص مذکور ایک انتہا پسند نفسیاتی مریض ہے۔ کردار کے علاوہ بیانیہ اور انجام اس قدر بے جان ... ہیں کہ کہانی ختم ہونے پر ذہن کسی تاثر کا بوجھ اٹھانے کی صعوبت گوارا نہیں کرتا۔

قیوم راہی کی "انکشاف" کا موضوع خوبصورت ہے۔ کسی حد تک میکانکی انداز میں لکھے جانے کے باوجود کہانی میں ... صاف نظر آتی ہیں۔

ہندو مسلم تعلقات کے پس منظر میں بلقیس ظفر کی کہانی "آوازیں" دل پر اپنا نقش چھوڑتی ہے۔ کہانی کا آخری حصہ تو دل میں اتر ...

"قائد کے وصال کے فوراً بعد سقوطِ دکن کا سانحہ ہوا تو مجھے یوں لگا کہ تاریخ کے صفحات سے نکل کر پھر ایک سیواجی نے افضل خان کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہے۔ اس دن کے بعد سے تاریخ میرے لئے الفاظ کی نہیں آوازوں کا کیسٹ بن گئی ہے۔ جاگی ہوئی قوم کی کرخت آوازیں، سوتے میں قتل کئے جانے والوں کی لرزہ خیز چیخیں، ستاروں کی ٹمک ٹمک اور بموں کے دھماکے ــــ امن کی اپیلیں کرنے والوں کے دل موہ لینے والے الفاظ، دار ... میں آ جانے والوں کے فلک شگاف نعرے، آوازیں جو صرف جگانے کے لئے ہوتی ہیں، کیا یہ کبھی سلا بھی دیتی ہیں؟ میں آج بھی سوچتی ہوں کہ ... آواز آج بھی سرحد پار سے ہمارے لئے یا اخی کی پکار کا کام دے رہی ہے اور ... ماں اب داستان کے ... پر اٹک گئی ہیں جہاں سے ... یوسف کا رول شروع ہوتا ہے۔"

آصف قاضی نے شاید علامتی افسانہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے وہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا بس ... ہیجان کی زد میں ہے۔

"ایمپلائمنٹ ایکسچینج" اور "نیند کے کانٹے پاؤں" مختصر ہونے کے باوجود بلیغ ہیں خصوصاً "نیند کے کانٹے پاؤں" دل کی سرزمین پر پڑتے ہیں تو لگتا ہے دل سکڑ جائے گا۔

نیلوفر اقبال نے انسان کی نامعلوم آرزوؤں کے حوالے سے "مولاداد" کا کردار بڑی خوبصورتی سے تراشا ہے لیکن اس دفعہ وہ اپنے پچھلے افسانوں کی طرح تاثر کی وحدت کے حصول میں کامیاب نہیں رہیں۔

اور اب مجھے کچھ کہنا ہے اس شمارے کی خوبصورت ترین نثری تحریر "نرگس" کے بارے میں، جسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے افسانہ نگار اس قسم کی تحریریں پڑھ لیں تو شاید انہیں اپنے الفاظ کے جذبے اور تاثیر سے عاری ہونے کا احساس ہو۔ اس ... فن کے عروج پر ہیں کہ الفاظ متکلم ہیں اور ان کی آوازیں مرتعش ہو کر جھرنوں کی موسیقی پیدا کرتی ہے۔

منصورہ احمد (لاہور)

عام فکری مغالطے

"فنون" کے شمارہ اگست سنہ ۶۸ء میں جناب محمد ارشاد صاحب کا مضمون "عام فکری مغالطے" نظر سے گزرا۔ فاضل مضمون نگار یقیناً صاحب علم و بصیرت ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے سید علی عباس جلالپوری کی کتاب پر اظہار خیال کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ زیر نظر مضمون میں سید صاحب کے مقالے بہ عنوان "یہ کہ عقل کو وجدان پر برتری حاصل ہے" پر بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں فاضل مضمون نگار نے عقل و وجدان سے متعلق کئی مسائل اٹھائے ہیں اور برگساں اور ژونگ (JUNG) وغیرہ کے نظریات کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے فاضل مضمون نگار کے موقف اور تشریح دونوں سے اکثر مقامات پر اختلاف ہے لیکن اگر میں اس اختلاف کی وضاحت کروں تو بحث بہت طویل ہو جائے گی، اور ان حضرات کے لئے نہایت صبر آزما جو فلسفہ کے متخصص نہیں ہیں۔ اس لئے میں نہایت مختصر طور پر چند بالکل سامنے کی باتیں عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔

برگساں اور ژونگ عقل و وجدان کے بارے میں کیا نظریہ رکھتے ہیں، اسے چھوڑیئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار کا کیا خیال ہے۔ محمد ارشاد صاحب کا خیال ہے کہ عقل و وجدان کا فرق محض توجیہاتی ہے حقیقی نہیں۔ چلئے مانے لیتے ہیں لیکن آگے چل کر فاضل مضمون نگار ان دونوں میں فرق کی صراحت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "عقل کا وظیفہ اگر مدلل تفکر (DISCURSIVE THINKING) ہے تو وجدان کا وظیفہ رائے یا اعتقاد (BELIEF) فراہم کرنا ہے جو مدلل فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ مدلل فکر کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔"

بلاشبہ عقل دلیل کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور وجدان بلا دلیل دعویٰ کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن عقل و وجدان کا یہ فرق محض توجیہی کیسے قرار پایا؟ یہ تو بنیادی، حقیقی اور نہایت اہم فرق ہے۔ ایک دعویٰ با دلیل، ایک دعویٰ بے دلیل۔ کیا اس میں کوئی فرق نہیں؟ فاضل مضمون نگار سے یہاں اتفاق کرنا بہت مشکل ہے۔

اگر فاضل مضمون نگار صرف اتنا کہتے کہ وجدان (یعنی بے دلیل دعویٰ) کی اہمیت فنون تک محدود ہے تو کوئی مضائقہ نہ تھا کیونکہ کون کافر ہے جو کسی شعر میں دلیل تلاش کرے لیکن وہ لکھتے ہیں کہ وجدان کی اہمیت سائنس اور فلسفہ میں بھی واضح ہے۔ اور اس کے لئے حکیم ارشمیدس کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جس کی رو سے اس پر ایک اہم سائنسی مسئلہ کا انکشاف وجدان کے ذریعے ہوا اور اس خوشی میں وہ حمام سے ننگا نکل بھاگا۔ یہ روایت بھی تسلیم کر لیں میں فاضل مضمون نگار سے گزارش کروں گا کہ وہ غور فرمائیں کہ علوم کی تاریخ میں طبیعیات، کیمیا، ریاضی، فلسفہ، منطق، معاشیات، عمرانیات وغیرہ کے مسائل زیادہ تر مدلل تفکر اور تجربہ وغیرہ کے ذریعے حل ہوئے ہیں یا اس قسم کی "وجدانی حرکات" کے ذریعے جن کا ذکر ابھی کیا گیا ہے؟ علوم بلکہ تہذیب کی ترقی اور نئی دریافتوں کا دار و مدار زیادہ تر عقل پر رہا ہے یا وجدان پر؟ اور اس سات آٹھ سو سال کے عرصے میں جن قوموں نے ترقی کی ہے (جن کے ہم بدقسمتی سے آج دست نگر ہیں) ان کی ترقی میں وجدان کا حصہ زیادہ ہے یا عقل کا؟

لیکن سید علی عباس جلالپوری نے تو صرف یہ کہا ہے کہ وجدان کو عقل سے برتر قرار دینا ایک فکری مغالطہ ہے۔ کیا فاضل مضمون نگار سید صاحب سے متفق نہیں؟ سید صاحب نے وجدان کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ البتہ انھیں شکایت ہے تو یہ کہ بعض قوموں میں صدیوں سے جو عقل پر لعنت بھیجی جا رہی ہے وہ حق بجانب نہیں اور ان قوموں کی فلاح کے لئے مضر ہے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کر دوں۔ فاضل مضمون نگار نے تحریر فرمایا ہے کہ عقل کے دائرہ کار تحدید و تعیین کے ضمن میں اٹھائے جانے والے اعتراضات عقلی ہی ہیں وجدانی نہیں یعنی کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" وغیرہ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عقل کی سب سے بڑی نقاد عقل ہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو کہ اگر ایسا ہے (اور کسی حد تک واقعی ایسا ہی ہے) تو یہ عقل کی عظمت کی دلیل ہے۔ خود تنقیدی، ذہنی پختگی اور "بلوغت" کی علامت ہے۔ ... قومیں اوروں پر تنقید کرنے کی بجائے خود پر تنقید کرتی ہیں۔ دوسروں کی خامیوں اور نارسائیوں پر طنز کرنے کی بجائے اپنے وسائل ... میں اور ان کے مطابق توقعات اور حد امکانات قائم کرتی ہیں۔ نعروں کی بجائے دلائل کا سہارا لیتی ہیں۔ اور یہی قرین عقل ہے۔

مندرجہ بالا معروضات کے باوجود مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ فاضل مضمون نگار محمد ارشد صاحب کا مضمون نہایت وقیع اور فکر افروز ہے۔

(ڈاکٹر) آغا افتخار حسین (اسلام آباد)

ازالہ

"فنون" جنوری، فروری ۱۹۸۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی کتاب "اقبال، ممدوحِ عالم" پر راقم کا تبصرہ شائع ہوا تھا۔ شمارہ جون ۱۹۸۶ء، اگست ۱۹۸۶ء میں امتیاز علی خاں صاحب نے اپنے ایک طویل خط (فنون اگست ۱۹۸۶ء) میں اس شمارے کے دیگر مضامین کے علاوہ اس تبصرے پر بھی اظہار خیال کیا ہے جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

معلوم ہوتا ہے تبصرے کی شروع کی چند سطور نے خانصاحب کو خاصا پریشان کیا ہے ورنہ وہ "مگر..... اخوان کے چکر میں نہ پڑتے۔" آپ کے موقر مجلہ کی وساطت سے ان کے جواب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ میں ایک گوشہ نشین قسم کا آدمی ہوں اور میرا کسی بھی دینی نوعیت کی سیاسی یا سیاسی نوعیت کی دینی جماعت سے قطعاً تعلق کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس تبصرے میں بھی تو ایسا کوئی اشارہ نہیں، خدا معلوم خاں صاحب کو کیونکر ایسا القا ہوا۔ ہاں اگر "شاعرِ اسلام..." کی ترکیب سے کوئی ذہنی کوفت ہوئی ہے تو یہ ترکیب ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم کی ہے اور خاکسار اس ضمن میں کسی قسم کی معذرت کرنے سے معذور ہے کیونکہ مرحوم نے حکیم الامت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے بجا لکھا ہے۔

جہاں تک "شپرہ چشم حاسد" یا حاسدوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں راقم نے ڈاکٹر غلام حسین صاحب ذوالفقار کے ایک کتابچے "سرگزشت اقبال" کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے ایسے متعصب لوگوں کی کارستانیوں کا نوٹس لیا ہے۔ اس سے ہٹ کر یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں ایک ایسا بدباطن گروہ موجود ہے جس نے مختلف انداز میں شاعرِ ملی پر نہ صرف کیچڑ اچھالا ہے بلکہ اسے ایک خاص علاقے تک محدود رکھنے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے کہ شاید اس طرح وہ حکیم الامت کی مسلّمہ عظمت کو کم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ یہاں تفصیل سے اجتناب بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے جو یہ کتاب اس نام سے ترتیب دی ہے تو یہ بھی درحقیقت زبان و ادب کے ایسے ہی اجارہ داروں کی ہرزہ سرائی کے جواب میں ہے، جو بعض بونوں کو تشہیر کی بیساکھیوں پر کھڑا کر کے علامہ ایسے شہرۂ آفاق بلبلِ جلیل کے مقابلے میں قد آور بنانے میں کوشاں ہیں۔

راقم کو اپنے منصب کا بفضلہٖ تعالیٰ پورا پورا خیال ہے اور یہ اسی خیال کے تحت تھا جو میں نے قوم کے عظیم محسن سے کد رکھنے والوں کو ہدفِ خطاب قرار دیا ہے۔

(ڈاکٹر) خواجہ حمید یزدانی (لاہور)

"فنون" کے بارے میں تاثرات

غالباً ۱۰ برس سے میں باقاعدہ طور پر فنون کی قاری رہی ہوں لیکن اب بھی یہ عالم ہے کہ بہت سی چیزیں میری سمجھ میں نہیں آتیں تب جی چاہتا ہے کہ کاش کوئی تو یا وقت باتیں ہمیں سمجھا دیتا۔ میں آپ کے رسالے میں افسانے بہت شوق سے پڑھتی ہوں لیکن یہ افسانے اگر علامتی ہوں تو یقین مانیے پلے نہیں پڑتے۔ اس کے علاوہ محمد کاظم، محمد خالد اختر، علی عباس جلالپوری صاحب اور چند دیگر لکھنے والے میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔ خاص طور پر کاظم صاحب کا سفرنامہ۔ نجانے وہ کیوں اتنا ترسا ترسا کر لکھتے ہیں۔ رسالے میں میں سب سے پہلے ان کا سفرنامہ تلاش کرتی ہوں۔ اتنا منفرد سفرنامہ شاید ہی کسی نے لکھا ہو جتنا وہ لکھ رہے ہیں۔ ان سے کہیں وہ جلد از جلد اپنا سفرنامہ مکمل کر ڈالیں۔ اگر کتابی صورت میں شائع نہیں کرواتے تو بھی "فنون" میں تو کم از کم باقاعدگی سے چھپواتے رہیں۔ ایک تو فنون بھی اتنی دیر سے چھپتا ہے اور دوسرے وہ ہیں کہ اتنی اشاعتیں ان کے سفرنامے کے بغیر گزر جاتی ہیں۔ اس دور میں سفرناموں کی جتنی بھرمار ہے جی چاہتا ہے سب پر پابندی لگا دی جائے کہ لکھنا ہے تو محمد کاظم کا سا سفرنامہ لکھو، نہیں تو گول ہو جاؤ۔

ویسے تو عطاء الحق قاسمی اور مستنصر حسین تارڑ صاحب بھی اچھے لکھنے والے ہیں لیکن میری نظر میں یہ بھی کاظم صاحب کے بعد آتے ہیں۔

فنون میں ایک بہت بڑا حصہ شعر و شاعری کے لئے وقف ہے لیکن میں اپنے پسندیدہ حصے افسانے کی طرف آتی ہوں۔ میں نے پہلے کہا ہے ناکہ مذاق افسانہ اپنے پلے نہیں پڑتا۔ اس لئے جس اشاعت میں ایسے افسانے ہوں میں مایوسی کا شکار ہو جاتی ہوں لیکن اس کے علاوہ آپ کے رسالے میں عام فہم قسم کے بہت اچھے افسانے بھی چھپتے ہیں۔ البتہ نجانے کیا بات ہے کہ ایک حالیہ اشاعت میں افسانوں کا کوئی معیار نہیں تھا۔ یہ معیار جس کی لوگ "فنون" جیسے رسالے سے توقع نہیں رکھ سکتے آپ نئے لکھنے والوں کی بیشک حوصلہ افزائی کیجیے لیکن خدارا ان کی اچھی تخلیقات بھی تو کم از کم ہونی چاہیئے نا۔ آپ نگہت مرزا اور مسرت بخاری، ام عمارہ، مسعود اشعر، اکرم اللہ وغیرہ سے لکھوائیے اور سب سے بڑھ کر خود آپ کیوں نہیں لکھتے۔ اس کے علاوہ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، مسعود مفتی سے لکھوائیے کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ آپ کے ... بھر غم روزگار نے ہی انھیں اتنا مصروف کر رکھا ہے۔

(...)، ملتان

گذشتہ شمارہ

"فنون" کا تازہ شمارہ حسب روایت بڑی پیاری اور خوبصورت تحریروں پر مشتمل ہے۔ یہ امر باعث صد اطمینان ہے کہ "فنون" موجودہ مشکل حالات میں بھی معیاری عصری ادب کی پروجیکشن انتہائی ذمہ داری و دیانتداری سے سرانجام دے رہا ہے۔ اب کے خصوصاً حصۂ نظم بڑی عمدہ اور معیاری تخلیقات پر مشتمل ہے اور شعری ادب کی ارتقائی تابندگی کی بھرپور تصویر پیش کر رہا ہے۔ "فنون" کا ہر شمارہ قریب قریب ایسے ہی معیار کا حامل ہوتا ہے اور یہ سب رونقیں آپ ہی کے دم سے ہیں۔

حمد و نعت میں شہزاد روحانی اور انور شعور کے "منشور انسانیت" اور "نعتیہ" نے بہت متاثر کیا ... چاہیئے کہ تخلیقات کا معیار موضوع اور شخصیت کی عظمت کے ہم پلہ ہونا اشد ضروری ہے۔

تاثیر وجدان کی چاروں نظمیں بہت عمدہ ہیں خصوصاً "اداس پیتا" اور "نارسا"۔ نجید اسلام امجد اور پروین شاکر کی نظموں نے متاثر کیا۔ امجد اسلام امجد بڑا رسا اور متحرک ذہن رکھتے ہیں۔ بھرپور مطالعے کے رچاؤ نے ان کے اندر بھرپور خود اعتمادی اور تخلیقی قوتوں کو جنم دیا ہے، وہ جو کچھی لڑ رہے ہیں۔ یوں تو لکھنے لکھانے کا ایک دور ہوتا ہے جب ہر سوچ معمولی کاوش سے معیاری تخلیقی پیکر میں ڈھل جاتی ہے لیکن اس دور میں بھی احتیاط لازم ہے اور خود احتسابی کے فرائض زیادہ شدید ہو جاتے ہیں۔ مجلہ "تحقیق" پر ان کا تبصرہ پڑھ کر محسوس ہوا کہ کتابوں کے صفحات گنوانے، ابواب کا شمار کرنے اور معقول قیمتوں کی نشان دہی کرنے والے تبصروں کے بجائے وہ ایسی کتابوں پر قلم اٹھایا کریں جن پر انھوں نے واقعی کچھ لکھنا ہو۔ آتش پرستی کا ... پسند آیا لیکن شروع میں انھوں نے جو قلندری کی صفات بیان کی ہیں وہ چنداں ضروری نہ تھیں۔ آتش کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ ... قبیل کے قلندر نہ تھے۔ یہ لفظ تو آج بھی ہمارے روزمرہ میں شامل ہے اور حساب سود و زیاں سے بے نیاز لوگوں کو پیار اور شوق سے قلندر کہا جاتا ہے۔

"کتوں کا سپاس نامہ" میں پروین شاکر کا لب و لہجہ بڑا تلخ ہے۔ میں اس نظم کو معیاری ہونے کے باوجود ایک خام تخلیق قرار دوں گا کیونکہ یہ لب و لہجہ ایک فن کار کے اعلیٰ ظرف کے منافی ... حرکات کی عکاسی کرتا ہے۔ میری حقیر رائے میں ایک سچا فن کار اختلاف بلکہ توہین کے جواب میں بھی ایسا لب و لہجہ اختیار کرتا ہے جو پڑھنے والے کو اس کی فکری عظمت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ فیض اور ندیم کی شاعری میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

عہد حاضر کے شعراء نے اپنی منفرد اور متنوع کاوشوں سے جہاں جدید شاعری کو بہت کچھ دیا ہے وہاں ایک بات اب بری طرح کھٹکنے لگی ہے کہ بیشتر حضرات نے "انتشار ذات" کو اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ آج سے بیس برس پہلے کا فن کار انتشار ذات کا زیادہ شکار تھا۔ اس دور کے اقتصادی

اور معاشی حالات زیادہ دگرگوں تھے۔ آج ان شہروں میں جہاں کچھ عرصہ قبل ادیب اور شاعر اَن گنت سماجی اور معاشرتی مسائل میں مبتلا نظر آیا کرتے تھے اس عہد کے فن کار نسبتاً کسی حد تک آسودہ اور آرزومندانہ زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ترقی کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اقتصادی اور معاشی تحفظ حاصل ہوا اور ہو رہا ہے۔ اپنی ذات کی شکست و ریخت پر غیر ضروری واویلا کرنے کی بجائے انھیں چاہیئے کہ شہروں سے ہٹ کر ان اَن گنت دیہی علاقوں میں بسنے والے انسانوں پر نظر ڈالیں جہاں سماجی اور معاشرتی ارتقا کا عمل صدیوں سے جامد ہے۔ جہاں لوگوں کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ آج سے تیس پینتیس برس پہلے ایک ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ جہاں بیشتر علاقوں میں سکۂ رائج الوقت نہیں جنس کا سکہ چلتا ہے۔ جہاں لوگ آج بھی پیسے کے عوض نہیں محنت مزدوری سے چنی ہوئی کپاس اور گندم کے عوض صابن، نمک اور تیل خریدتے ہیں۔

میں اپنے فن کاروں کی حساس سوچوں اور فکری آبگینوں کی نفی نہیں کرتا۔ انھیں اپنے ذاتی کرب اور داخلی توڑ پھوڑ کے فنی انعکاس کا پورا پورا حق پہنچتا ہے لیکن اس کا غیر ضروری اعادہ بھی ملی اور سطحی سی بات ہے اور ہر فن کار اپنی ذات سے کہیں زیادہ معاشرے کے لئے ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو ہمارے فنکار جس قدر جلد اور شدت سے محسوس کریں گے اسی رفتار سے ہمارا ادب روحِ عصر کی سچی تصویر بنتا جائے گا۔ اس وقت تو ہم اپنے ملک کی تقریباً دس پندرہ فیصد آبادی پر لکھ رہے ہیں۔

"عوامی فن کار چارلی چپلن کے لئے ایک گیت" ایک خوبصورت تخلیق ہے اور ترجمہ بھی اچھا ہے صفحہ ۱۳۶ پر اولین نصف کی بارہویں سطر یوں ہے:

"مگر جب وہ ہوش میں ہوتا ہے تو تمہاری دوستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔"

کیونکہ جس کردار کے ضمن میں یہ جملہ آیا ہے اس کے پاس دولت نہیں ہوتی وہ ایک غریب اور فاقہ مست انسان ہے۔

یہ گیت بڑا پیارا ہے اور اس میں چارلی چپلن کے TRAMP کی فنی تجسیم کی گئی ہے۔ اس کا سارا درد و کرب اور اس کی فنی ذات کی محرومیوں کو اس میں سمونے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے لیکن اتنی جامع تخلیق میں اگر چپلن کی ذاتی زندگی کے کچھ ناقابلِ فراموش المیوں کو بھی شامل کر لیا جاتا تو یہ تخلیق زیادہ جامع ہو جاتی۔ مجھے چپلن کی خود نوشت میں بیان کردہ ایک سانحہ کبھی نہیں بھولتا جہاں وہ اپنی ماں کا ذکر کرتا ہے۔ یہ چپلن کے لڑکپن کا زمانہ ہے۔ گھر میں فاقہ کشی کا دور ہے۔ کئی کئی دن کھانے کو نہیں ملتا۔ ماں بچوں کے لئے جو تھوڑا بہت لاتی ہے انھیں کھلا دیتی ہے خود نہیں کھاتی، بالآخر دیوانی ہو جاتی ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس بیماری کو MAL-NUTRITION کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہے کہ اگر اس خاتون کو کم از کم آج صبح ہی ایک چائے کی پیالی مل جاتی تو اس کا یہ حشر نہ ہوتا۔

محمد کاظم صاحب کے سفرنامے کی قسط قابلِ مطالعہ ہے۔ بڑی خوبصورتی اور بڑے شفاف ذہن سے لکھتے ہیں۔ "فنون کی محفلوں میں محمد خالد اختر اور انھیں ایک روز ہنستے میں اب بھی دیکھ رہا ہوں۔ ان دنوں ان کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا اور انھیں شاید اس کا بہت احساس تھا۔ بے ساختہ ہنستے ہوئے انھیں [illegible] ٹوٹے ہوئے دانت کا خیال آ جاتا تو یہ بدقت تمام ہونٹ کھینچ لیتے۔ ایک آدھ دفعہ مجھے خیال آیا کہ کاظم صاحب ابھی تک اپنے اس معمولی سے [illegible] سے نجات حاصل نہ کر سکے لیکن اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اتنے فاضل اور خوبصورت ادیب ہیں۔

[illegible] اتنی اچھی اچھی چیزیں ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کس کس کی تعریف کروں۔ البتہ افسانوں کا حصہ فنون کے معیار اور روایت [illegible] منصور قیصر کا [illegible] خوب ہے۔ علامتوں میں فنی جامعیت ہے اور پورا افسانہ بے عیب معلوم ہوتا ہے۔ [illegible] کا چرخہ دلچسپ مواد فراہم کرتا ہے۔ [illegible] موضوع پامال ہے۔ یہ افسانہ آج سے دس برس پیشتر لکھا جاتا تو ٹھیک تھا۔ "دستک" بھی یونس جاوید کے فنی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ [illegible] افسانوں میں افسانہ نگار کا سابقہ قاری کی ذہانت سے پڑتا ہے۔ [illegible] نے جس [illegible] کردار پیش کیا ہے وہ کسی [illegible] معلوم ہوتا ہے [illegible] پسندی کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ کئی سوال ذہن میں آتے ہیں [illegible] قسم کے [illegible] معاشرے کا [illegible] بندوبست تو کچھ رجائیت [illegible] نہیں کرتے۔ ایسا کردار بڑا تصوراتی ہوتا ہے۔

اور اس پر بھرپور تخلیقی قوت سے قلم اٹھایا جا سکتا ہے لیکن افسانہ نگار اس کی سرسری عکاسی پر ہی اکتفا کیا اور اسے اپنی ازدواجی روزمرہ زندگی [illegible] چند [illegible] کی [illegible] دیکھ اور دیکھتا رہ گیا۔ اس اثنا میں وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

[illegible] کا افسانہ آخری چند سطور تک ایک بالکل عام اور معمولی سا افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ آخر میں حادثاتی اور ناقابل یقین موت سے [illegible] فنی معیار یا قامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا چاہے اس کا عنوان انوکھی ہی ہو۔

[illegible] داستانوں سے نجات کی ایک کوشش" ایک گوارا افسانہ ہے۔ پڑھے لکھے ذہن کی پیداوار معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے افسانہ نگار کا ذہن مواد میں الجھا ہوا ہے اور کسی ایک نکتے یا خیال کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے پہلے دوسرے [illegible] کی طرف دوڑتا ہے اور کسی ایک کو پوری فنی جامعیت سے پروجیکٹ نہیں کرتا۔ "گھوڑا گاڑی" البتہ ایک اچھا افسانہ ہے۔

"ایک قدم ریاضی، جیسے یا جیومیٹری کا ایک سوال معلوم ہوتا ہے۔ ایسے افسانوں کے اعداد و شمار کمپیوٹر کے حوالے [illegible] افسانہ نگار کے لیے یقیناً اعزاز کا باعث ہوگا۔ ایسے افسانوں کی ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ اور اس میں پیش کردہ رنگوں [illegible] کو بار بار مطالعہ کیا جائے۔ جیسے مسعود اشعر ایک پڑھے لکھے فن کار ہیں اور تجریدی افسانے میں انھوں نے اپنی حیثیت منوائی [illegible] وہ عہد حاضر کے غیر زبانوں کے تجریدی افسانے کا بھی کسی حد تک مطالعہ کر چکے ہیں لیکن میری حقیر رائے میں ایسے افسانے [illegible] قارئین کے لیے نہیں۔ کسی اسلوب فن پر قدرت کا مطلب یہ نہیں کہ فنکار ایک آسانی سے نظر آنے والی [illegible] کی چوٹی پر رکھ دے تاکہ قارئین سے اپنے [illegible] پر مجبور اور لاچار دیکھیں۔ ایسی کاوش کے لئے مرکزی خیال [illegible] MULTI-DIMENSIONAL اور MULTI FORM ہونا چاہیے جس کے لئے ایسا اسلوب فن ناگزیر ہو۔

[illegible] ۳۵۲ ایک [illegible] افسانہ ہے [illegible] ہوتا ہے کہ ایسے افسانوں کو ENJOY کرنے کے لئے مشینری کے کلوں پرزوں [illegible] FUNCTION پر معلومات ان کے پاس ہونی چاہئیں بہرحال۔ اس افسانے میں نئی بات ایک یہ ہے کہ افسانہ نگار نے مشینوں اور پرزوں کو [illegible] کے طور پر منتخب کیا ہے اور اس کے توسط سے وہ بات کہنی چاہی ہے جو وہ دوسرے موجودہ وسائل سے کہہ سکتا تھا۔ [illegible] مجھے محسوس ہوتا کہ پرزوں اور ان کے حرکت اور FUNCTION میں بھی انسانی جذبات و احساسات کی سی کوئی بات ہے۔ وہ افسانوں [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک تازگی ہے۔ چاہے اس کا مواد کسی حقیقی روداد مقدمہ سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔ تاہم مصنف کا انتخاب موضوع و مواد قابل داد ہے۔

ناہید قاسمی کی نظم "جال" اور منصورہ احمد کی نظمیں بہت اچھی ہیں۔ اشرف جاوید کی نظم "ماں" بھی ایک معیاری تخلیق ہے۔ مسرت حفیظ نے "خوشبو برزخ" پر تبصرہ کیا ہے۔

حفیظ احسن (ملتان)

پندرھویں صدی ہجری کا آغاز اور تازہ "فنون" کے طلوع کا ارتباط اگرچہ التزاماً نہیں لیکن معنی خیز ضرور ہے۔ خدا کرے اردو ادب کا یہ نمائندہ مجلّہ آئندہ بھی ہماری عصری حیات کو زبان دیتا رہے اور ہمیں اس کے توسط سے حسب سابق جذباتی اور جمالیاتی آسودگی مہیا ہوتی رہے۔

زیر نظر شمارہ اپنے موضوعاتی تنوع کے اعتبار سے خاصا زرخیز ہے۔ سبھی افسانے حقیقتاً ادب معاشرہ اور اجتماع کی سچی خدمت اور انسانی تہذیب کی حقیقی تعمیر کے ذریعے کی ایک ہی کڑی کے مختلف نام ہیں۔ موجودہ نسل کے جن افسانہ نگاروں نے ادبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اردو افسانے کو نئے نئے موضوعات اور نئے نئے اسالیب سے آشنا کیا، تصورِ حیات اور تصویرِ حیات کو مختلف زاویوں اور متعدد رخوں سے پیش کیا۔ ان میں منصور قیصر کا نام خاص نمایاں ہے۔ ان کے مختصر افسانے نے بڑا متاثر کیا۔ "فورک لفٹ ۳۵۲" والے اسد محمد خاں تکنیک کی نئی راہوں کے وہ تیز رو مسافر ہیں کہ قاری کو

ان کے ساتھ بہا لے جاتا ہے ـــ جناب مسعود اشعر کا افسانہ ایک قدم فکر و فن کی رنگا رنگی سے مزین ایسا افسانہ ہے، جسے بجا طور پر کیفیتوں کا افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ [illegible] اس بات کا باعث ہے کہ ہمارا اردو افسانہ ارتقا اور نمو سے مالا مال ہے اور برابر آگے بڑھ رہا ہے ـــ آپ کا افسانہ "احسان" بجا طور پر خوش ذوقی [illegible] کی ایک عمدہ روایت ہے جس میں حقیقت، صداقت اور واقعیت کے ساتھ ساتھ جذبہ و احساس کا بھرپور رچاؤ بھی شامل ہے۔

مقالات کے حصے میں سرمایہ داری کے مستقبل نے بڑا متاثر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب علمی انکشافات اور فلسفیانہ نظریات عصر حاضر پر اس طرح سے اثر انداز ہوں کہ ان کی چھاپ ہر شعبہ حیات پر دیکھی جا سکتی ہو تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ادب اس سے بچا رہے ـــ جناب اطہر قادری کا مقالہ خیال و فکر کے [illegible] زندگی [illegible] ڈرامہ بیات کے بارے میں فکر کے نئے پیمانے مہیا کرتا ہے ـــ کوکب جمیل کے "ادب کے رقیب" بھی اسی امر پر حاوی [illegible] زندگی ایک رواں دواں حقیقت ہے جو برابر آگے بڑھ رہی ہے اور نت نئے مقاصد تراشتی ہے۔ اس کی رنگا رنگی اور لامتناہی انداز ہی میں رہتے انسان کے راز مضمر ہیں۔ [illegible] ادب انسانی زندگی کا سب سے سچا ترجمان ہے۔ اس لئے یہ بھی زندگی کی طرح بے کراں اور رواں دواں ہے۔

[illegible] بلاشبہ [illegible] کی ضخامت کا باعث ہوا ہے۔ اگرچہ یہ ضخامت یقیناً قارئین کی ضیافت طبع اور جمالیاتی ارتفاع کا سبب بنی ہوگی [illegible] تاہم [illegible] قمر جمیل، ناصر، تنویر سپرا، یوسف جبھی اور سید گلزار بخاری کی غزلیں خصوصیت سے پسند آئیں۔ [illegible] غزل کی شاعری کے ارتکاز کا بہترین نمونہ ہے۔

[illegible] ہمارے ایک [illegible] رہنما کا مکتوب بھی نظر سے گزرا ـــ ان سے گزارش ہے کہ ادیب، شاعر اور فنکار کو کسی بھی فرد کی نسبت [illegible] قوم کا ایک زندہ ہونے کی حیثیت سے سرگرم عمل بھی ہونا پڑتا ہے اور حصول مقصد کے لئے دوسروں کو کسا [illegible] ـــ آپ [illegible] روشن مقصد کے حصول کے لئے زندہ ہے ـــ علاوہ ازیں ہمارے ہاں کے فن کاروں کے بارے [illegible] وہ شعور [illegible] جس کی ملک کو ضرورت ہے۔

[illegible] کے ضمن میں منشور [illegible] گزارش ہے کہ وہ اپنے بسیط و مفید خیالات کو موضوع کی ذراسی تبدیلی سے دوچند فرمائیں اور قارئین کو [illegible] استفادے کا موقع دیں ـــ شکریہ۔

مسرت ہاشمی (جہلم)

گزشتہ چند برسوں سے ہمارے اہل قلم غیر ملکی ادب کی ترجمہ کاری میں خاصے سرگرم ہیں اور اس سلسلے میں افسانوں اور نظموں کے تراجم کی [illegible] مقالات کے بارے میں ہنوز اتنی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی۔ یہ کمی اور بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے جبکہ وطن عزیز میں اپنی زبان [illegible] نظریات [illegible] علمی و ادبی مقالات لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہو، اس قحط الرجال میں [illegible] اس طرف باقاعدہ توجہ کی۔ پال سویزی کے مقالے "سرمایہ داری کا مستقبل" کی تلخیص اور ترجمہ [illegible] کارنامہ ہے۔ پال سویزی نے [illegible] سامراجی حاکمیت اور تیسری دنیا کی نوآبادیاتی۔ جدید نوآبادیاتی حکومیت کو جدلی رشتوں کے [illegible] سامراج کے دور میں انھیں الگ الگ منطقوں میں رکھ کر کلی حقیقت کو دیکھنا اور جاننا ممکن نہیں۔ انھوں نے سامراجی [illegible] کا پر فریب پردہ عمدگی سے چاک کیا ہے۔ سامراج کی زندگی اسی میں ہے کہ تیسری دنیا کی پسماندہ قومیں [illegible] اقوام کی پسماندگی کا بڑا سبب ان پر یہی سامراجی غلبہ ہے۔ چنانچہ جوں جوں قومی آزادی کی تحریکیں کامیاب ہوتی جا رہی ہیں، سامراج کی نام نہاد "فاتح ملکوں" کی سانس اکھڑتی جاتی ہے اور اس تاریخی عمل سے بچاؤ کی کوئی راہ نہیں۔ یہاں تک پال سویزی کے نقطہ نظر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کی اس رائے سے اتفاق کیوں کر ہو کہ آج کے ترقی یافتہ سامراجی ممالک کو

ترقی کے میدان میں پہل کاری حاصل نہیں تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کے طبقہ داری دور میں ایک قومی سماج کے اندر اور بین الاقوامی سماج میں قوموں تک ترقی کی سطحیں ہموار نہیں ہوتیں اور کسی سماج کی اپنی داخلی ساخت اور صورت حال اس کے رول کو متعین کرنے میں اہم ہوتی ہے۔ پہلی دنیا کے ممالک میں بھی تجارتی سرمایہ داری کی کونپلیں تیسری دنیا کے ممالک سے پہلے پھوٹیں۔ انھوں نے اپنے تاریخی عمل میں جاگیرداری سے تجارتی سرمایہ داری میں قدم رکھا۔ پھر اس بنیاد پر تیسری دنیا کے ممالک کو ہر جائز و ناجائز وسیلے سے لوٹا۔ تجارتی سرمایہ داری کو فروغ دیا، پھر صنعتی سرمایہ داری نے مالیاتی اجارہ دار سرمایہ داری یعنی سامراج کا روپ دھار لیا۔ اس عمل میں حقیقی ترقی کا زیادہ امکان تیسری دنیا کی اقوام کے حق میں ہو گیا ہے اور کئی ممالک میں یہ امکان ٹھوس صداقت بن چکا ہے۔ بقول یوسف جمیل:

درافت میں قبولیں گے نہ اب کشکول کا تحفہ　　　　یہ بھی اندھا چھوڑ نہ ہوگا یہ ذلت تو دنیا کی

زیر نظر شمارے کے دوسرے مضامین بھی متاثر کرتے ہیں۔ بالخصوص ترقی پسندی کے مقاصد پر لکھے گئے مضامین نے خاص توجہ حاصل کی ہے۔ انھوں نے خارجی اور داخلی عینیت پسندی اور میکانکی مادیت پسندی کے مغالطوں سے بچ کر درست طرز فکر کے بنیادی نکات تک رسائی حاصل کی ہے۔ سماجی وجود سے فکر و خیال کی تخلیق کے بعد ان کی اضافی آزادی اور سماجی وجود پر فعالیت کو بھی واضح کیا جاتا تو شاید زیادہ بہتر ہوتا۔ کوکب جمیل کا مقالہ "ادب کے رقیب" بھی ایک درست، دلچسپ اور مختصر تحریر ہے۔ غلام محمد قاصر کے بعد جمیل نیازی نے بھی مرتضیٰ برلاس کی شاعری پر سچے اور خوبصورت تاثرات لکھے ہیں۔

خالد احمد نے "بین السطور" میں ایک مرتبہ پھر سنجیدہ سوال اٹھایا ہے اور یقین رکھنا چاہیے کہ ایک مرتبہ پھر ان کے سوال کو کوئی نہیں سمجھے گا۔ کیونکہ ہم لوگ تو نئے سوال کے وجود ہی سے منکر یا خوفزدہ رہتے ہیں۔ اس کا جواب کون دیا کرے اور زندہ حقائق سے صداقت اخذ کرنے کا مطلب ہے اپنی استوار رائے میں ترمیم کا خطرہ مول لینا۔ جو ہمیں قبول نہیں ہے۔ اپنی رائے کو ترمیم سے بچاتے ہوئے ہم خود ہی سمجھ میں نہیں آتے خالد احمد:

چلتا رہے قلم　　　　چلتی رہے زباں

زمین سے وابستگی مختلف زاویوں سے ادب و فن کا موضوع بنتی ہے اور ان میں معتبر ترین زاویہ وہی ہے جس میں زمینی حقیقتیں جگمگا رہی ہوں۔ اقبال کوثر، حسن ناصر، اصغر ندیم سید اور راشد مفتی کی تخلیقات نظمیں، غزلیں اس دائرے میں آتی ہیں۔ اقبال کوثر کی نظمیں قومی شعور کے حوالے سے قومی آزادی اور قومی یک جہتی کے تحفظ کا احساس نمایاں ہے۔ حسن ناصر اپنے موضوع کو تجسیم کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ اصغر ندیم سید کی پچھلے دو تین سالوں کی نظمیں اپنی قومی آزادی کی تحریک کو مواد بناتی ہیں اور یہ تینوں بہت سے تدریجی زاویوں سے منسلک کرتی ہیں۔ راشد مفتی نے اپنی غزلوں میں زمینی شعور کو فلسفیانہ اظہار دیا اور اس زاویے سے سماجی مسائل کے تجزیے کو جدید جمالیاتی سانچوں میں ڈھالا ہے۔

اس شمارے میں شامل شاعروں میں سے بہت سوں نے "بھرپوریت" کا احساس دلایا۔ فہرست طویل ہے مگر چند نام یہ ہیں: ادیب سہیل، سید محسن نقوی، اقبال کوثر، حسن ناصر، احمد اسلم امجد، پروین شاکر، منصور احمد، رحمان الرحمن، غلام حسین ساجد، تجمل جعفری، عاصی کرنالی، خادم رزمی، سعید احمد اختر، شاہد رضوی، انور سعید، راشد مفتی، شاہد واسطی، سجاد بابر، شفیق، قمر رضا، طالب قریشی، منور عزیز، قائم نقوی، یوسف جیلی، مسرت ہاشمی اور راشد مراد۔ جمیل الرحمن نظموں میں حزنیہ احساس کی خوبصورت شعری تصویر کاری کے بہت بتدریج کامیاب ہو رہے ہیں۔ غزلوں میں طالب قریشی نے یہی ہنر اپنی تخلیقی سطح پر دکھایا ہے۔ شہزاد قمر اشاعت میں وقفے کے باوجود اپنی فنی نکھار برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ منور عزیز کی شاعری میں اس کی اپنی پہچان کے آثار موجود ہیں۔ اگر اس نے متانت سے ریاضت جاری رکھی تو اردو غزل میں ایک منفرد لہجے کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کا سماجی شعور لہجے کی معصومیت کے ساتھ شعر میں ڈھلتا ہے۔ یوسف جیلی کی شاعری میں فکری بلوغت کی نشانیاں ہیں

اور اب آخر میں "اختلافات" پر مختصر تبصرے کے ساتھ اختلافات ختم کرتا ہوں۔ منصورہ احمد نے دل کی بات کہی کہ حضرات اختلافات ابھی تک مصحفی کے ایک شعر کو لئے بیٹھے ہیں۔ بہت ہو چکی اب آگے چلئے۔ خورشید جاوید ایک صاحب اعتبار و اسد نگار ہیں۔ اس دفعہ بھی ان کی رائے بچی تلی ہے۔ آئندہ بھی ان کی آراء کا انتظار رہے گا۔ یوسف حسن (چکوال)

تازہ "فنون" اس بار بھی ہمیشہ کی طرح اپنی پہچان آپ بن کر طلوع ہوا ہے۔ مسعود اشعر کا افسانہ "ایک قدم" ٹیلی ویژن پر انہیں کی زبانی سن چکا تھا اب پھر پڑھا تو لطف دوبالا ہو گیا۔ اسد محمد خان آج کل عجیب کیفیتوں سے گزر رہے ہیں۔ ان کا افسانہ "فورک لفٹ ۲۵۲" جبر کی ایک ایسی صورت حال کی ترجمان ہے جس کا شکار ہو کر بااختیار لوگوں کی نسیں بھی پھٹ جاتی ہیں۔ آپ کا افسانہ "احسان" آپ ہی کا اسلوب ہے اور اسے آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ شمع خالد کا افسانہ "ہونی" انسانی منافقت کی عبرت ناک موت ہے۔

حصۂ نظم میں انجم اعظمی کی دونوں نظمیں "تریاق" اور "خوابوں کی رہگذار" متاثر کرتی ہیں۔ انجم اعظمی زندگی کو ایک ناقد کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں اور شاعر کی نظر سے بھی۔ چنانچہ ان کی نظموں میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر کا رچاؤ ملتا ہے — ادیب سہیل کی اس بار کی نظمیں (مخصوص نظمیں) گزشتہ نظموں کے مقابلے میں زیادہ اثر انگیز ہیں۔ "رابطے دکھوں کے" میں حسن نامر حسب معمول شدتِ احساس سے مغلوب ہو کر اپنا آپ کھو دینے کے دکھ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اچھی نظم ایسے ہی شدتِ احساس کا مطالبہ کرتی ہے جو ہمارے امجد اسلام امجد کی نظم "علموں بس کریں او یار" میں اور شدید ہو گیا ہے۔ جس طرح اصغر ندیم سید کی دوسری نظمیں آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتیں اسی طرح ان کی تازہ نظم "آخر ایک دن" بھی قاری کو ایک لمحے کے لیے ضرور روکتی ہے کیونکہ ان کا لہجہ بڑا زوردار اور نظر بڑی گہری ہے۔ ناہید قاسمی کی نظموں میں سے "جال" اور "دکھ" زرخیز نظمیں ہیں اور منصورہ احمد کی نظم "عجیب رت ہے" ان کی پہلی نظم ہے جو انھوں نے حوصلے سے اور سانس روک کے لکھی ہے۔ دروماندوی آندریدکے "چارلی چیپلن کے لئے گیت" جن کا ترجمہ منو بھائی نے کیا ہے، ان میں نثری نظم کا بھرپور ذائقہ ملتا ہے۔

غزلوں کا پہلا حصہ:

شبنم رومانی:	بستیوں کو بانٹنے والا جو خط کھینچا گیا	خط کشیدہ لوگ اس کو رہگذر کہنے لگے
حسن عابدی	جیسے ہم مسافر ہوں بے نشاں منزل کے	جسم ہسپتالوں کا، خون شاہراہوں کا
اطہر نفیس:	کیوں نہ دھوکے پر اعتبار کریں	کچھ حقیقت تو اس سراب میں ہے
محسن احسان:	پرائی محنتیں آؤ کہ بانٹ لیں دونوں	کچھ اس طرح کہ شجر تیرے اور ثمر میرے
خادم رزمی:	مجھے مکان دیا ہے کہ عرصۂ محشر	نظر تو ڈال کبھی اپنی لامکانی سے

غزلوں کا دوسرا حصہ:

خورشید رضوی:	اسے خبر بھی نہیں اور دل میں بستا ہے	وہ اجنبی جسے خط کا جواب تک نہ دیا
	نگاہِ یار سے خوں کا قصاص کیا لیتے	نگاہِ یار نے خوں کا حساب تک نہ دیا
انور شعور:	پرندوں کی چہکار سنتا گیا	ہوا سنسنائے بہت دن ہوئے
پروین شاکر:	ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہی	میں آئینہ تھی، بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا
یوسف حسن:	یہ معجزہ نظر کا کوئی حادثہ نہ ہو	صحرا مثال دن ہیں سمندر صفت بنے
غلام حسین ساجد:	یہ عشق جو میرے سانسوں کی خوراک بنا ہے ساجد	کس محنت کا سرمایہ ہے کس سپنے کی مجبوری ہے
سید حسن ناصر:	گئی رتوں کے مناظر اداس کیا کرتے	جہاں جہاں پہ خلا تھا سجا لیا خود کو

ثروت حسین: دل گرفتہ کہ خوش گمان رہوں — اپنے لوگوں کے درمیان رہوں

جمیل مالی: تنہا تنہا کیوں خود کو بہنیں چیونٹوں کی — مل جل کر جنگل میں رستہ ڈھونڈ نکالیں

نفیس عجمی: تو بہ مدت سے تو ہونے کی ذمتیں مت کر — کہ شب گزیدہ نگر آفتاب مانگتا ہے

جمال حسانی: یہ تجھے یک نظر دیکھنے والوں کا ہجوم — میری ناپختہ بیانی کے سوا کچھ بھی نہیں

نقش منظر: سالہا سال سے تو جس سے گریزاں ہے شگفتہ — ترا بچہ اسی ماحول میں پلتا بھی تو ہے

ن زر احمد: خود یہ رو تا ہے تو پوچھوں تم نے دیر سے کیوں تخون کی — اس کی مجبوری سوچوں تو اپنے سوال پہ دکھ ہوتا ہے

ان غزلوں کی غزل نے تو مجھے دبیزہ کو ثروت وغیرہ کو نڈھال کر دیا ہے۔ اسے میرا حاصل مطالعہ کہیے یا کچھ اور لیکن مجھے حیرانی یہ ہے کہ غزلوں کے پہلے ست سے تنے نکار کیوں نظر نہیں آتا جیسے غزلوں کے دوسرے تنے سے۔ میرا یہ سوال مدیر فنون سے ہرگز نہیں ان شعرا سے ہے جو غزلوں کے پہلے مصرعوں میں ... کوئی نظر بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اچھا شعر تو کوتاہ نظروں کو بھی حیران کر جاتا ہے۔

... مضامین میں ... کا مضمون جو مدعا ... سردار مراد سنگھ شیر گل مجیٹھیہ کے بارے میں ہے۔ نہایت معلوماتی مضمون ہے۔ اور پال سویزی کے خیالات جو خلیق ابراہیم خلیق کے ذریعے "فنون" تک اور پھر ہم تک پہنچے ہیں یقیناً سرمایہ دارانہ نظام کے سلسلے میں ہمارے بہت سے مغالطوں کو دور کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

ایوب خاور (کراچی)

فنون کا تازہ شمارہ اس بار میرے عزیز دوست رحمان خاور صاحب کی کرم فرمائی سے مجھ تک پہنچا۔ خاص نمبر میں اسلوب ایک منفرد طرزِ نگارش کی غمازی ہیں۔ امجد اسلام امجد نے پرانے کے مستقل عنوان سے اساتذہ کے رنگ ہنگے کلام سے جو نکتیں منتخب کیے ہیں واقعی وہ اس مصروف دور کے قارئین کے لئے ایک اہم کام ہے۔ مجھے امید ہے کہ امجد اسلام امجد اپنے اس TARGET کو پورا کرنے کے بعد پوری ادبی دیانت داری کے ساتھ اس دور کے ان تازہ دم فنکاروں کے کلام کا بھی انتخاب کریں گے جن کی آواز اس عہد کی پہچان ہے اور جن کو RECOGNISE کرنے میں لکھنے والوں کے قلم بکتے ہیں۔ اساتذہ قدیم کی عظمتوں سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ان پر تو سالہا سال سے قلم کاری ہو رہی ہے اور بات اس منزل میں ہے کہ ان کی استخوانِ شکستہ جوڑنے کی کوشش میں لکھنے والوں کی ہاتھ خود ہو دینے لگے ہیں۔ قابل رحم ہے اس دور کا فنکار جو ان کرب ناک اور قاتل حالات میں کارِ تخلیق و پرورش لوح و قلم کر رہا ہے۔ اگر اس بدنصیب فنکار کے قدر کا تعین آنے والے وقت اور آنے والی نسل ہی کو کرنا ہے تو اچھا ہوا ساتذہ قدیم کے قدروں کی پیمائش کا کام جاری رکھیں۔

شبنم رومانی کی منظوم انسانیت اردو شاعری کی چند اچھی نعتوں میں شمار کی جانے والی نظم ہے۔ پروین شاکر، شبنم رومانی اور جمال احسانی کی غزلیں پسند آئیں۔ "خلافت" اور تبصرے کے صفحات سے فنون کے ادبی وقار میں ایک اور اضافہ ہوا ہے۔

اظہر عنایتی (رامپور، بھارت)

بعض نئی عروضی غلط فہمیاں

"فنون" کے تازہ شمارے میں جناب یوسف علی لاق اور جناب صوفی عبدالرشید کے مکاتیب نظر سے گزرے۔ راقم کے درشت لہجے کی شکایت بجا ہے لیکن جب کمتی دہلوی عربی عروض کی اصل یونانی عروض کو قرار دیں اور محمد حسین آزاد اسے ایران کے گیتوں سے اخذ کریں تو لہجہ کے درشت ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے اور وہ غیر علمی ہو جاتا ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ان مکاتیب میں لکھنے والوں کا لہجہ گوارا ہے لیکن بعض خلاف واقعہ باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ جناب یوسف علی فرماتے ہیں کہ فعلن فعلن، فعلُ فعولن کا شعبہ ہے اور اس میں تسکین اوسط کا دخل ہے۔ یہ بالکل غلط واقعہ ہے۔ اس لئے کہ فعلن شعبہ ہے فعولن کا (اثلم) اور فعلُ یا فاعِ بھی فعولن کا شعبہ ہے لیکن فعلن کے بعد وجود میں آتا ہے (اثرم) لیکن تسکین اوسط کے عمل سے نہیں بلکہ فعلن فعلن میں پہلے فعلن کے نون کو گرا کر دوسرے فعلن میں اس کا بدل واؤ رکھ دیا گیا ہے۔ اس طرح فعلُ فعولن معرض وجود میں آیا ہے۔ تسکین اوسط صرف تین رکنوں

متفاعلن، مفاعلتن اور فعلاتن پر وارد ہو کر انھیں مستفعلن، مفاعیلن اور فعولن میں بدل دیتا ہے۔

صوفی عبدالرشید صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ شعر عروض پر مقدم ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ فارسی عروض کا بانی نصیرالدین طوسی ہے، محل نظر ہے۔ بلکہ نصیرالدین طوسی سے منسوب معیار الاشعار کا انتساب بھی اب مشکوک ہو گیا ہے اور یہ محض قرون وسطیٰ کے ایرانی فہرست نگاروں، محمود شیرانی اور مفتی سعداللہ مرادآبادی کی قیاس آرائی اور اصرار کا نتیجہ ہے۔ کتاب میں کہیں بھی مؤلف نے اپنا نام درج نہیں کیا صرف یہ لکھا ہے کہ "بہ اصرار بعضے دوستان این رسالہ نوشتہ شد" نام کے اخفا کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ (اگر واقعی محقق ہی اس کا مصنف ہے) فلسفہ، اخلاق اور مابعد الطبیعیات کے مقابلے میں علم عروض انھیں دون مرتبہ معلوم ہوا ہو گا۔ معیار میں عربی اور فارسی عروض دونوں ہیں اور ان کا تقابلی مطالعہ بھی ہے نیز زبان، موسیقی کے حوالے سے شعری آہنگ کا تجزیہ کیا ہے معیار اولاً ایران میں طبع ہوئی جس کی شرح مع حواشی و حالات مصنف ۱۲۸۲ھ میں مفتی سعداللہ مرادآبادی نے شائع کی۔ مرزا محمد قزوینی نے سب سے پہلے اس کے محقق طوسی کی تالیف ہونے سے انکار کیا (مقدمہ المعجم فی معاییر اشعار العجم طبع اوقاف گیب لندن ۱۹۰۹ء) اور سند طلب کی ہے۔ جو بات معیار کے مستند ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ کتاب کے عالمانہ اور محققانہ اسلوب اور ایک ہم عصر شاعر کمال اصفہانی کے ایک شعر کا حوالہ ہے۔ یہ سب کچھ اور محمود شیرانی اور مفتی سعداللہ کے اصرار کو سند عطا نہیں کرتا۔ ہمارے سامنے انعام اللہ یقین کی مثال ہے جن کا دیوان اصلاً مرزا مظہر جان جاناں کا عطا کردہ ہے۔ اس کے گواہ میر تقی میر اور مرزا سودا ہیں (نکات الشعرا، احوال یقین)، لیکن تمام تذکروں میں یقین کا تذکرہ آتا ہے جیسے نکات الشعرا، آزاد وغیرہ کی نظر سے کبھی نہ گزری ہو۔ شیرانی کے حوالے محض خوش فہمی پر مبنی ہیں کیونکہ معیار کا استناد محض قیاس پر مبنی ہے۔ بہرحال اگر معیار کو محقق ہی کی تالیف مان لیا جائے تو بھی یوسف نیشاپوری (۱۰ ویں صدی عیسوی)، بہرامی سرخسی (گیارھویں صدی) اور شمس قیس رازی (تیرھویں صدی) محقق سے پہلے ہوئے ہیں۔ بہرامی اور محمد رازی کی تصانیف کے نام علی الترتیب غایۃ العروضین اور المعجم فی معاییر اشعار العجم ہیں۔ فارسی عروض کا واضع یوسف نیشاپوری ہے جس نے قریب، جدید، مشاکل بحریں ایجاد کیں۔ معیار کا جدید ایرانی ایڈیشن مرتبہ آقائی مدرس رضوی چند سال پیشتر شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی مرتب نے معیار کے مستند ہونے پر شک کا اظہار کیا ہے۔

اردو شاعری میں دوسری زبانوں کے اوزان و بحور کی درآمد کا مسئلہ بھی تحقیق طلب ہے۔ کم از کم بنگلہ زبان کی کوئی بحر اردو میں ابھی تک داخل نہیں ہوئی۔ ہندی سے دوہا چھند، سرسی چھند، وجے ماتی چھند اور سویا چھند ضرور آئے ہیں۔ ہندی دوہا امیر خسرو بو علی قلندر کے عہد میں داخل ہوا لیکن کئی صدیوں تک مقبول نہ ہو سکا۔ امانت لکھنوی نے ادھر توجہ کی۔ بیسویں صدی میں اسے دوبارہ کچھ فروغ ہوا اور جمیل مرزا خانی (جمیل الدین عالی)، مظفر علی سید، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ دوہے پر اتھارٹی ڈاکٹر گیان چند ہیں۔ انھوں نے اس کے کل ۲۶۵ اوزان مرتب کیے ہیں۔ جمیل الدین عالی اور کشور ناہید کے دوہے مقررہ اوزان میں نہیں ہیں۔ ان میں دوہے کی مخصوص بات بسرام مفقود ہے جس سے پورا آہنگ بدل جاتا ہے۔ سرسی چھند میں جو ۲۷ ماتروں کی بحر ہے، اقبال کا گیت "او غافل افغان" ہے۔ وجے ماتی مضاعف سب سے پہلے نظیر کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے ارکان فعلن فعلن ۸ بار ہیں۔ اس کی متعدد صورتیں ممکن ہیں۔ یہ بھی بیسویں صدی میں اردو غزل اور نظم میں داخل ہوا ہے لیکن گزشتہ دس پندرہ سال سے پھر غیر مقبول سا ہو گیا ہے۔ سویا چھند ۳۲ ماتروں کا چھند ہے جس میں میر تقی میر کی بعض غزلیں ہیں "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا"۔ اسی چھند میں ہے۔ بیت چھند یا بحر وارث میں صوفی تبسم کی ایک اردو غزل اور ایک غالب کی فارسی غزل سے منظوم پنجابی ترجمہ یادگار ہیں۔ ماہیا کی صنف کو اردو میں چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی نے متعارف کرایا۔ لیکن ان کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ ان کے علاوہ کوئی بحر اردو میں دوسری زبانوں سے داخل نہیں ہوئی لیکن بعض دیگر کا تعارف ضروری بھی ہے اور پنجابی مثنوی کا دریا چھند جس میں یوسف زلیخا غلام رسول لکھی گئی ہے۔ دوہا اور ماہیا کو اگر فروغ دیا جائے تو اردو شاعری کے آہنگ میں نئی صورتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

جابر علی سید (ملتان)

عروض کے بارے میں

عروض کے بارے میں دیرینہ غلط فہمی فی الوقت دور ہوتی نظر نہیں آتی۔ یہی کہ صرف موزونیتِ طبع ہی شعریت کے اسباب پیدا کرتی ہے، عروض تو محض تک بندی کا ذریعہ ہے بالکل بجا کہا۔ "موزونیتِ طبع عروض کی "دریافت" سے بہت پہلے روبہ عمل تھی، اور اسی کے زور پر شعریت کو خوبصورت خوبصورت صوتی، صوری، اور معنوی اعتبارات ملے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ موزونیتِ طبع ہی نے جذباتی اور فکری مد و جزر سے مختلف النوع "شعری وسائلِ اظہار" پیدا کئے ہیں جنہیں بحریں کہا جاتا ہے۔ تنقیدی شعور نے ان بحروں کے لوازم، متعلقات ترتیب دینے کے ضمن میں "حرکتوں اور سکونوں" کے متوازن سلسلوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی خاطر انہیں علامتی صورتوں میں پیش کیا۔ ان علامتوں سے وزن و بحر کا ایک نظام ظہور پذیر ہوا جس کی تشکیل کا سہرا موزونیتِ طبع کے سر ہے۔ یہ طے ہے کہ موزونیتِ طبع وزنِ شعر سے الگ کوئی چیز نہیں یا وزنِ شعر موزونیتِ طبع سے دور نہیں۔ موزونیتِ طبع کے حوالے سے وزنِ شعر کے جملہ مباحث کو علمِ عروض کہا جاتا ہے۔ شعر کی خوش ترکیبی میں دیگر عوامل کی طرح عروض بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مانو تو دیوتا نہیں تو پتھر۔ ان کے فن سے یہ حقیقت کھل سامنے آتی ہے کہ "مشاہیرِ شعر" نے عروض کے مطالعے میں ہمیشہ باقاعدگی کا اہتمام کیا ہے۔ علامہ اقبال بحروں کی قدر و قیمت سے واقف تھے۔ اس فن پر عبور کا مجھے قطعی دعویٰ نہیں ہے حتی المقدور اس دقیق موضوع پر قلم آرائی کی جرأت کرتا ہوں۔ بخدا کسی کی دل شکنی مقصود نہیں۔

یوسف علی لائق کی عروض کی باتیں پڑھ کر اپنی نالائقی کا احساس دو چند ہوا۔ ان کے سارے الزامات تسلیم، ان کا کہا درست۔ میرے فقروں میں عروض کی تکنیکی زبان بھی عنقا ہے۔ اس بے سلیقگی کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے کوشش کروں گا کہ عروض کی تکنیکی زبان یوسف علی لائق صاحب سے سیکھوں مجھے لائق صاحب کے عروضی مکتوب نے خوش بھی کیا ہے:

شبنم خراب مہر کتاں سینہ چاک ماہ — وہ اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

ایک اور شریکِ سفر نکلا اور میں حیران بھی ہوں!!! حیران اس لئے کہ ان کے ارشادات میں "انگلیاں" اٹھانے کی گنجائشیں بھی موجود ہیں۔ اگر "بحرِ زیرِ بحث" ہندی النسل کی بجائے فارسی النسل نکلتی ہے تو مجھے خوشی ہوگی، مگر یہ حکم لگانے سے پہلے اس قبیل کی بحروں کی تاریخی اہمیت کا اندازہ بھی لگانا ہوگا۔ اس قسم کی بعض بحریں میر خسرو سے بھی منسوب کی گئی تھیں جو بعد میں تحقیق سے گزر کر "بہت بعد کے زمانے" سے متعلق نکلیں۔ یہ بھی تو کہا جاتا ہے کہ "بعد کے زمانے" میں ہندی عروض کے اثرات فارسی شاعری پر مرتب ہوئے ہیں۔ اگر ہوئے ہیں تو فارسی شاعری کے ناموں کو معرضِ خطر میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نوعیت کی بحریں فارسی شاعری کے کس دور میں ملتی ہیں۔ اس طرح سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ عروض سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو آپس میں دست و گریباں ہونے کی بجائے ایسے مسائل کو سنجیدگی سے حل کرنا چاہیئے۔ باہمی اختلافات کو خندہ پیشانی سے نمٹنا چاہیئے۔ لڑنے جھگڑنے یا طنز کے دریا بہانے سے کیا فائدہ۔ لفظ "لے" کو آپ قبول نہیں کرتے تو "بحرِ زدھم" کہئے۔ آخر بحر کی "روانی" کے لئے کچھ نام تو ہوگا۔ چلئے روانی سہی۔ ان بحروں کی "روانی" یا "زدھم" یا "لے" کے پس منظر میں کسی شاعر کی طبعی افتاد موجود ہے۔ ان بحروں کے وقفوں یا سکونوں یا حرکتوں کی بحرِ متدارک اور بحرِ متقارب کے ارکان مزاحف یا غیر مزاحف سے تطبیق پیدا کرنا کوئی "دور از کار" تو نہیں۔ میرے لئے یہ انا کا مسئلہ نہیں۔ میں ایک طالب علم کی حیثیت رکھتا ہوں۔ عروض کے دبستانِ کراچی سا منتہی الفن سلسلۂ تعلیم مجھے میسر نہیں۔

لائق صاحب کہتے ہیں "رباعی کی چوبیس بحریں مخصوص ہیں اور یوں ہیں جیسے زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔ تسکینِ اوسط سے بچانے کے لئے اس کی بحروں کے ہر رکن کے آخری حرف کو ساکن یا موقوف رکھا گیا ہے تاکہ زحافات ناگہانی کا سایہ تک ان پر نہ پڑے۔ یہ صحیح ہے رباعی کی چوبیس بحریں بحرِ ہزج کے مزاحف یا فروعات ہیں لیکن ٹوٹ پھوٹ کی متحمل نہیں۔"

میرے ناقص مطالعے کے مطابق تسکینِ اوسط کا عمل رباعی کی بحروں ہی سے تو خصوصیت رکھتا ہے اور انہیں کے حوالے سے اور کہیں بھی مل سکتا ہے۔ تسکینِ اوسط دو رکنوں کے درمیان ایک ایسا عمل ہے جس سے تین متحرک حروف میں سے درمیانی حرف کو ساکن کر دیا جاتا ہے۔ اس عمل سے رکنوں کی نوعیت تو بدل جاتی ہے مگر موزونیت میں سر مو فرق نہیں پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی کی ساری بحریں ایک تخنیق میں "ذار ذ" ہو کر عدم موزونیت

کا علاقہ پیدا نہیں کرتیں۔ اب دیکھیے تسکین اوسط کی مثال۔ مفعولُ مفاعلن میں ل، م، ت تینوں متحرک ہیں۔ مفاعلن کے پہلے حرف کو جو درمیان میں ہے ساکن کر دیا، دو مفعول کے "ل" سے ملا دیا تو رکن ہاتھ آیا مفعولم جسے معلوم رکن مفعولن سے بدل لیا۔ دوسرا رکن رہ گیا فاعلن یعنی مفعول مفاعلن تسکین اوسط سے مفعولن فاعلن ہو گئے، جو باہمی طور پر بلحاظِ موزونیت یکساں ہیں۔ یہ ارکان رباعی کی بحروں میں موجود ہیں۔ رباعی کی کیا اور مقام پر بھی ہو بحر کے سارے رکن موقوف یا ساکن کبھی نہیں ہو سکتے۔ تسکینِ اوسط کا عمل شجرۂ اخرب کی اس بحر میں ملاحظہ ہو:

اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب
مفعولُ ،	مفاعیلُ	مفاعیل ،	فعَل

(پہلے تینوں رکن آخری حرف میں حرکت رکھتے ہیں)

پہلے دو رکنوں میں تسکینِ اوسط کا عمل ایسے ہوا کہ مفاعیل کا حرف م ساکن ہو کر پہلے رکن مفعول کے "ل" سے جا ملا، رکن بنا مفعولم جسے مفعولن سے بدل لیا۔ دوسرا رکن رہ گیا فاعیل جسے مفعول سے بدل لیا تو بحر بنی:

مفعولن ، مفعول ، مفاعیل ، فعل — متعلق بہ شجرۂ اخرم

پھر دوسرے رکن اور تیسرے رکن کے درمیان اسی طرح تسکین اوسط!! اور بحر!!

مفعولن ، مفعولن ، مفعول ، فعل

پھر تیسرے اور چوتھے رکن کے درمیان تسکین اوسط!! اور بحر!!

مفعولن ، مفعولن ، مفعولن ، فع

اس بحر کے سارے ارکان سبب خفیف رکھتے ہیں۔ رباعی کی بحروں کے ارکان کی ترتیب میں ایک اور تفصیلی پہلو یہ ہے کہ پہلے رکن کے آخر میں اگر سبب ہے تو دوسرے کے شروع میں سبب ہوگا۔ پہلے رکن کے آخر میں وتد ہے تو دوسرے کے شروع میں وتد ہوگا۔ رباعی کی کوئی بھی بحر لے کر اس خصوصیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تسکین اوسط سے بھی اسباب و اوتاد کی یہ ترتیب برقرار رہتی ہے

رباعی کی یہ بحریں بھی تسکین اوسط کے مدارج سے گزر سکتی ہیں:

مفعول،	مفاعلن	مفاعیلن	فاع	(فاع ایک خاص رکن ہے صرف وتد مفروق نہیں)
اخرب	مقبوض	سالم	ازل	
مفعول	مفاعیلن	مفعول	فَعَل	
اخرب	سالم	اخرب	مجبوب	
مفعولن	مفعول	مفاعیلن	فع	
اخرم	اخرب	سالم	ابتر	
مفعولن	مفعول	مفاعیل	فَعَل	
اخرم	اخرب	مکفوف	مجبوب	

(اس قسم کی کئی دوسری بحریں بھی ہیں)

بحر ہزج سے فروع مثنوی کی بحر مفعول، مفاعلن، فعولن تسکین اوسط سے مفعولن، فاعلن، فعولن (دونوں صورتوں میں آخر پر مفاعیل بھی آ سکتا ہے) سے بدل سکتی ہے۔ دونوں بحروں کا اجتماع اسی رشتے سے ایک تخمیس میں جائز ہے۔

آگے چل کر آتی صاحب فرماتے ہیں: "آپ کو شاید معلوم نہیں بحر رمل کے صدر و ابتدا میں صرف فاعلاتن اور فعلاتن ہی کا اجتماع نہیں بلکہ فعولن جیسا

ناخواندہ بھی اس اجتماع میں شامل ہے ...... یہ جو فعلاتن ہے نا، اس کو تسکین اوسط سے مفعولن بنالیا ......" عجیب بات ہے فعلاتن کو تسکین اوسط سے مفعولن بنالیا۔ تسکین اوسط دو رکنوں کے درمیان ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایک رکن کی کسی ترمیم یا تبدیلی کو زحاف کہا جاتا ہے۔ تسکین اوسط اور زحاف میں واضح فرق ہے۔ لائق صاحب فعلاتن کا حرف "ع" ساکن کرکے مفعولن بنا رہے ہیں۔ بحر رمل کے "خاندان" میں کوئی ایسی فروعی بحر نہیں بنتا ہے جس کے صدر و ابتدا میں مفعولن آرہا ہو۔ صدر و ابتدا میں فاعلاتن و فعلاتن کا اجتماع تو دیکھنے میں آتا ہے۔ مثلاً:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

پہلے مصرع کے شروع میں فعلاتن اور دوسرے کے آغاز میں فاعلاتن کا ورود ہے۔ اسے میری کم علمی جانیئے کہ مفعولن کے سلسلے میں میرے پاس کوئی سند نہیں۔ بلکہ بحر رمل کے باب میں مفعولن کا ذکر سُن کر مجھے اپنی جہالت زیادہ کھلنے لگی۔

رئق صاحب نے ٹھیک کہا ہے کہ اردو کی نوک پلک سنوارنے کے لیے کیل کانٹے نہ استعمال ہوں کہ بے چاری منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے جیسے آپ نے میرے خط سے "مصالح" "ہاں" اور "بعض وقت" (وقت کوئی جامد شے نہیں) کی مثال دی ہے۔ آپ کے بنگالی دوست نے بھی بہت خوبصورت بات کہی ہے مگر لائق صاحب یہ جو آپ نے فرمایا ہے کہ "ہندی کی کوئی بحر سواحلِ اردو پر موجزن ہے" کیا اسے ایسے نہیں کہا جا سکتا تھا" ہندی کی کوئی بحر اردو کے ساحل پر موجیں مار رہی ہے"۔ یقین جانیئے "سواحل اردو" اور "بعض وقت" ایک ترازو میں تولے جانے کے لائق ہیں۔

صوفی عبدالرشید خاصے متاثر کرتے ہیں۔ ثروت حسین کے اشعار پر بحث آرائی!! خوب کہی یہ تذکرہ ثروت حسین کی "عدم موزونیت" سے متعلق قطعی نہ تھا۔ مباحث میں کسی شعر کے حوالے سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس پر عدم موزونیت کا بہتان لگایا جارہا ہے۔ ثروت حسین کی شعری صلاحیتوں کے ہم سب قائل ہیں۔ آپ مانیں گے کہ مذاقِ سلیم کی تربیت میں عروض کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ عروض وسائل اظہار کی علامتی نمائندگی کرتا ہے۔ بحر وزن کے پس منظر میں کارفرما جذبات واحساسات کی گوناگوں لہروں کا تعین کرتا ہے۔ عروض شاعری پر ٹھونستا نہیں ٹھونستا بلکہ یہ نغمہ و جذبہ کے تعینات میں ممد و معاون ہے۔ صوفی صاحب نے گوشہ چشمے ادھر کیا میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

تبصرے

فتح محمد ملک ، کرنل محمد خان ، ساقی فاروقی ، ڈاکٹر ظہیر فتحپوری ، جابر علی سیّد ، محمد عبداللہ قریشی ، جمیل ملک ، اے حمید ، ڈاکٹر محمد ریاض ، صدیق جاوید ، ڈاکٹر سلیم اختر ، سیّد ذاکر اعجاز ، امجد اسلام امجد ، صفدر سلیم سیال ، احمد ندیم قاسمی ۔

آخرِ شب (ڈرامے)

مصنف :- محمّد صفدر میر

قیمت :- درج نہیں

ناشر :- کلاسیک ، دی مال ، لاہور

محمد صفدر میر جدید ادب کی وہ بے چین روح ہے جسے معرکۂ ستمبر نے تخلیقی وفور کی دولتِ نایاب سے مالا مال کر دیا ہے ۔ صفدر میر ، برس تک فلم ، تھیٹر اور تعلیم کے چمنستانوں سے "درد کے پھول" چنتا رہا اور جدید اور نئی شاعری کے بیابانوں میں بھوکی راتوں کی درد بھری خاموشی کے عذاب سہتا رہا مگر اس بے چین روح کو جس وسعتِ بیان کی تلاش تھی وہ اسے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس وقت نصیب ہوئی جب بھارتی فوجوں نے اچانک لاہور پر حملہ کیا ۔ یوں سائنٹیفک سوشلسٹ صفدر میر" علی حیدر ، علی حیدر" کے نعرے لگاتا ہوا دعوتِ یلغار دینے لگا ۔

چلو واہگہ کی سرحد پر ۔ چلو واہگہ کی سرحد پر

مگر ادھر صفدر میر واہگہ اور سیالکوٹ کی سرحد پر ، پاکستانیوں کو لہو کی فصیلیں کھڑی کرتے دیکھ کر ، نئی تخلیقی زرخیزیوں اور رعنائیوں کو اپنے فکر و احساس میں جذب کرنے میں مصروف تھا اور اُدھر تاشقند میں ایک نئی سیاسی شطرنج بچھائی جا رہی تھی ۔ پھر ہوا یوں ، کہ صفدر میر کے غازی ایوب خان نے کانپتی ہوئی انگلیوں کے ساتھ اعلانِ تاشقند پر دستخط ثبت کر دیئے ۔ ایسے میں ہر پاکستانی ذہن کو اس سوال نے تہ و بالا کر کے رکھ دیا کہ جب پوری پاکستانی قوم غازی ایوب خان کی قیادت میں آہنی دیوار بن کر سربکف تھی اور پاکستان کی خود مختاری اور سربلندی کا ماتھا کہکشاں کی مانند جگمگا رہا تھا ، تب ہمارے حکمران طبقے نے قدم آگے بڑھانے کی بجائے پسپائی کی راہ کیوں اختیار کی ۔ ؟ اس آتشیں سوال کی کوکھ سے صفدر میر کے وہ مضامین برآمد ہوئے جو اَب سے بارہ برس پہلے "مودودیت اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے نام سے شائع ہوتے تھے ۔ اس کتاب میں صفدر میر نے عہدِ حاضر میں ہماری سیاسی کشمکش کو تین سو برس پر پھیلی ہوئی اُس قومی سیاست کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کا اہتمام کیا ہے جس کی بنیادی حقیقت سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف عوامی جدوجہد ہے ۔ اس جدوجہد کی تابناک دستاویز شاہ عبدالعزیز کا وہ مشہور فتویٰ ہے جو گذشتہ پونے دو صدیوں سے ہماری تحریکِ آزادی کا سنگِ بنیاد بنا ہوا ہے اور پھر اُسی آتشیں سوال سے صفدر میر کے وہ ٹیلی ویژن ڈرامے پھوٹے جو ۱۹۷۵ء میں پاکستان ٹیلی ویژن سے پیش کئے گئے تھے اور اَب "آخرِ شب" کے نام سے کتابی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہیں ۔ "آخرِ شب" کے شروع میں صفدر میر نے پچاس صفحات پر مشتمل بیش قیمت "مقدمہ" بھی شامل کر دیا ہے جو ان ڈراموں کے ساتھ ساتھ

ہمیں ماضی کی تاریخ کو سمجھنے کا درست اور واقعتاً نیا تناظر فراہم کرتا ہے۔

تاشقند کی بساط پر ہمیں کیوں شکست ہوئی؟ اس سوال کا جواب صفدر میر سے سُنیئے۔ اپنے ڈرامے بہادر شاہ ظفر پر بات کرتے ہوئے صفدر میر ہمیں بتاتے ہیں کہ "بہادر شاہ ظفر کے ساتھ بحیثیت قوم ہماری یک آہنگی مکمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شخصیت ہمارے سارے دورِ غلامی میں ہماری قومی نفسیات پر محیط ہے۔ وہ سامراج کے خلاف ہماری بے سروسامان جدّوجہد کا سمبل ہے۔ ہماری قسمت اور بہادر شاہ ظفر کی قسمت ایک ہے۔ وہ ایک عظیم روایت کی آخری کڑی ہے جو ہماری اپنی روایت ہے۔ اس کے دِل پر اپنی دیرینہ عظمت کا نقش کھدا ہے جیسے ہمارے دِل پر۔ اس کی خواہش ہے کہ فرنگیوں کی قید سے آزاد ہو جیسے ہماری خواہش رہی ہے اور اب تک ہے۔ اسے صحیح راستے کا علم ہے جس پر چل کر وہ فرنگیوں کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے، وہ راستہ بخت خان کا راستہ ہے۔ وہ موجود حبشی کا راستہ ہے لیکن نہ وہ زینت محل کا راستہ ہے اور نہ مرزا مغل ولی عہد کا۔ بہادر شاہ ظفر وہ راستہ اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ بخت خان کو کامیابی کی دُعا دیتا ہے۔ وہ موجودہ حبشی کی لاش کے قدموں میں اپنی تلوار رکھ کر اس کی صداقت اور شجاعت کا اعتراف کرتا ہے لیکن خود اُس راستے پر نہیں چل سکتا بلکہ آخر دم تک انگریزوں کی فریب کاریوں سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی، اُن پر بھروسا کیے جاتا ہے۔ آج تک ہمارا قومی کردار یہی رہا ہے اور اسی وجہ سے بہادر شاہ ظفر کی شخصیت میں ہمارے لیے اتنی بے پناہ کشش اور جاذبیت ہے۔ ہم آج تک اُسی دوراہے پر کھڑے ہیں اور اپنے لیے راستے کا انتخاب نہیں کر سکتے۔ ہماری اپنے شاندار ماضی سے وابستگی، ہماری اپنی قومی آزادی کے لیے شدید خواہش، ہماری اس جدوجہد کے لوازم اور ضروریات سے ناآشنائی اور اس کے لیے تیاری کا فقدان یہ وہ عناصر ہیں جو ہمیں بہادر شاہ ظفر کی شخصیت سے ہم آہنگ کرتے ہیں، اسے ہمارا ہیرو بناتے ہیں"۔ اپنی تمثیل میں صفدر میر، بہادر شاہ ظفر کو ایک عظیم المیہ کردار عطا کرتا ہے مگر یہ عظمت غیر حقیقی فلمی ہیرو کی عظمت نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی عظمت ہے جو اپنی کمزوریوں اور اپنے مقدر کا شعور رکھتا ہے۔ بہادر شاہ کا المیہ اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے شاندار اور متحرک ماضی سے عملاً کٹ کر رہ جانے کا شعور رکھتا ہے۔ بخت خان جب اسے ہمایوں کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے تو وہ جواب میں کہتا ہے۔

"ہماری خواہش تو یہی تھی کہ خاندان مغلیہ کی قدیم روایت کے مطابق دشت وصحرا میں ترک تازیاں کریں لیکن ہماری جدید روایت کچھ اور بن گئی ہے۔

بخت خان:۔ ٹھیک ہے۔ شاید یہی بہتر ہے مغلوں کو قید خانے میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔"

اس جدید روایت کے باعث بہادر شاہ ظفر اور ہمایوں میں ہی نہیں بلکہ بہادر شاہ ظفر کی ملکہ زینت محل اور تیمور کی بیوی اولجائی خانم میں تضاد بارِشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آزمائش کی گھڑی میں ملکہ زینت محل کے ہاں اگر طوائفیت بروئے کار آتی ہے، تو اولجائی خانم کے ہاں روحانیت شاید اسی وجہ سے صفدر میر کے ڈرامے کے اُن مناظر کو پڑھتے وقت، جن میں ملکہ زینت محل، حکیم احسن اللہ اور منشی رجب علی کے سے انگریز نواز درباریوں سے مل کر بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں کے ہاتھ بیچنے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ مجھے اولجائی خانم بار بار یاد آتی۔ عزیز احمد کے طویل مختصر افسانے "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" میں آزمائش کی ایسی ہی ایک گھڑی میں تیمور کی بیوی اولجائی خانم، لق ودق صحرا کے ایک ویران کنوئیں میں ہفتوں تن تنہا رہتی ہے، اور تیمور کو اپنی بکھری ہوئی فوج مجتمع کر کے دشمن کا مقابلہ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ مگر یہ زمانہ اور تھا، اور بہادر شاہ ظفر کا زمانہ اور تھا۔ جب تیمور کے گھر سے غیرت اِس حد تک رخصت ہو چکی تھی کہ خود اُس کی اپنی ملکہ دشمن کی آلۂ کار تھی۔ بہادر شاہ کو جو چیز المیہ ہیرو کا قد و قامت عطا کرتی ہے، وہ اپنی صورت حال سے آگاہی، اپنے المناک مقدر کا شعور اور اپنی بے عملی کے زندان سے اُنس ہے۔ سو صفدر میر اگر بہادر شاہ ظفر کے کردار میں ہمیں اپنے قومی کردار کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اور ہماری صورت حال کو

بہادر شاہ ظفر کی صورتِ حال سے مشابہ قرار دیتے ہیں تو بجا کرتے ہیں۔ اس اندازِ نظر سے اپنے ماضی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے اور اس سے بصیرت اندوز ہونے کا عمل "آخرِ شب" کی ہر تمثیل میں کار فرما ہے۔ پوری کتاب پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم صفدر کے ساتھ ماضی سے حال کی جانب سفر کر رہے ہوں۔ اور صرف سراج الدولہ کی تمثیل کا زمانہ ہی بیک وقت "حال اور ۱۷۵۷ء" نہ ہو بلکہ ہر تمثیل کا زمانہ ہمارے زمانے سے آملا ہو۔

اپنی تمثیل "سراج الدولہ" پر بحث کرتے ہوئے صفدر میر لکھتے ہیں۔ "ہماری قومی دیومالا میں سراج الدولہ کا روپ ایک بہادر مگر مظلوم شخص کا ہے جو اپنوں ہی کی غداری سے آفت میں مبتلا ہو کر مارا جاتا ہے۔ یہ تجرید مکمل حقائق کے ایک ضمنی پہلو پر توجہ مرکوز کرنے سے حاصل ہوتی ہے، یعنی میر جعفر کا پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو دھوکہ دینا۔ سراج الدولہ محض اپنوں کی غداری کا شکار نہ ہوا تھا، بلکہ زوال پذیر مغل سلطنت کے ہر علاقے میں موجود ایک طبقاتی کشمکش کا شکار ہوا تھا۔ پلاسی کی لڑائی دراصل ایک سازش تھی جس کے نتیجہ میں سراج الدولہ کے فوجی سرداروں اور اس کی بیوروکریسی نے اُسے حکومت سے برطرف کر کے ملک کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔۔۔۔ سراج الدولہ کا المیہ برِصغیر کی تاریخ میں اور دُنیا کی جدید سامراجی تاریخ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔"

تیسری دُنیا پر سامراج کے قبضے کے پورے دور میں سراج الدولہ کا المیہ اور پلاسی کی لڑائی جو کوئی لڑائی نہیں تھی، کئی بار دہرائے گئے ہیں اور آج تک دہرائے جا رہے ہیں۔ یہ تاریخی شعور سراج الدولہ کے عہد میں برٹش بنیا گٹھ جوڑ کو اور ہمارے اپنے عہد میں عہدِ حاضر کے جگت سیٹھوں اور سامراجی طاقتوں کے اشتراکِ عمل کو بے نقاب کرتا ہے۔ محمد صفدر میر نے اس انقلابی تاریخی شعور کو فنی چابکدستی کے ساتھ سراج الدولہ میں سمو دیا ہے۔ انقلابی شعور کے بھرپور فنکارانہ ظہور کا فریضہ صفدر نے سراج الدولہ کی رُوح کے سپرد کیا ہے چنانچہ ڈرامے کے آخری حصے میں سراج الدولہ کی آواز یوں گونجتی ہے۔

"یہ تھی پلاسی کی مشہور لڑائی جس نے دُنیا کا نقشہ بدل دیا لیکن جو پلاسی میں نہیں لڑی گئی۔ یہ لڑائی جگت سیٹھ کے دیوان خانے میں لڑی گئی یا فورٹ ولیم کے ڈائریکٹروں کی مجلس میں لڑی گئی یا فرنگی کالی کے مندر میں لڑی گئی۔ بہرحال پلاسی کے میدان میں کوئی لڑائی نہیں لڑی گئی۔ یوں نواب سراج الدولہ کا دور ختم ہوا اور نواب میر جعفر کا دور شروع ہوا۔ اور آج تک جاری ہے۔ ویسے اب نہ میں زندہ ہوں، نہ میر جعفر زندہ ہے، ہم دونوں محض استعارے بن چکے ہیں۔ (وہ اپنی زنجیر کو آہستہ آہستہ ہاتھ پر مارتا ہے۔) اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ اس زنجیر کا دوسرا سرا کہاں ہے؟

نہیں جانتے؟

یا نہیں جاننا چاہتے؟"

ہاں صفدر میر! ہم نہیں جاننا چاہتے کہ ۱۷۵۷ء میں مرشد آباد کے قید خانے میں سراج الدولہ جس زنجیر میں اسیر تھا اُس کا دوسرا سرا ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرائے کے سپاہی میر جعفر کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ اُبھرتے ہوئے برطانوی سامراج کے ہاتھ میں تھا۔ سچ کہتے ہو صفدر میر! کہ جب تک ہم اپنی تاریخ کو اس طرح نہیں جان پاتے، ہم یہ تک نہ جان سکیں گے کہ آج ہماری آزادی اور خود مختاری پر کہاں کہاں سے کیسی کیسی کمندیں پھینکی جا رہی ہیں اور جن انگلیوں نے تاشقند کے معاہدے پر دستخط کیے تھے وہ کس کی انگلیاں تھیں؟ — فتح محمد ملک

چھ رنگین دروازے (مجموعہ کلام)

مصنف :- منیر نیازی — قیمت :- ۲۰ روپے — ناشر :- مکتبہ منیر۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

منیر نیازی نے اپنے تازہ مجموعہ کلام "چھ رنگین دروازے" کا انتساب "خوبصورت پاکستان کے نام" کیا ہے۔ اس پر مجھے منیر نیازی کے بہت سے ایسے شعر بھی یاد آئے جو ایک مدت سے دیدہ دل پر دستک دے رہے ہیں اور منیر نیازی کی وہ باتیں بھی یاد آئیں جن میں "دلائے شاعری چیزے

دگر" کا حسن ہے مجھے وہ رات یاد آئی جب منیر نیازی مخصوص مفادات کے ان گروہوں کا تذکرہ کرتے وقت رو دیا تھا جو اپنی چھوٹی چھوٹی عشرتوں کی خاطر، گذشتہ تیس برس سے پاکستان کو اجاڑنے میں مصروف ہیں، پھر منیر کے شعر فضائے یاد کو منور کرنے لگے:

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے — کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

زمیں ہے مسکن شر، آسماں سراب آلود — ہے سارا عہد سزا میں کسی خطا کے لیے

بس ایک ماہِ جنوں خیز کی ضیاء کے سوا — نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا

مکان، زر، لبِ گویا، حدِ شہر و زمیں — دکھائی دیتا ہے سب کچھ یہاں، خدا کے سوا

زوالِ عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں — کھلا نہیں کوئی در بابِ التجا کے سوا

لاحاصلی ہی شہر کی تقدیر ہے منیر — باہر بھی گھر کے کچھ نہیں، اندر بھی کچھ نہیں

طوفانِ ابر و بادِ بلا ساحلوں پہ ہے — دریا کی خامشی میں ڈبونے کا رنگ ہے

ان اشعار میں ایک گہرے، ہڈی تک اتر جانے والے دکھ کے ساتھ اپنے وطن کی تقدیر پر سوچنے کا جو عمل جلوہ گر ہے وہ منیر نیازی کو ملک و قوم کی شاعری کرنے والوں سے زیادہ ملک و قوم کا شاعر بناتا ہے۔ منیر کے ہاتھ میں کوئی پرچم ہے نہ ہونٹوں پر کوئی نعرہ۔ اس کے باوجود اس کی غزل تک میں حسن و محبت کے رنگوں اور نیرنگیوں سے کہیں زیادہ قومی زوال پر گہری اداسی کی فکر انگیز پرچھائیاں لرزاں ہیں۔ منیر نیازی کی شاعری اور "اے وطن، اے وطن" کہہ کر ملک و قوم سے بلند بانگ مگر کھوکھلی محبت جتانے والوں کی شاعری میں وہی فرق ہے جو ایک سچے عاشق کی جانسوزی اور محض خوش وقتی کی خاطر فلرٹ کرنے والوں کی خوشامد میں ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے منیر نیازی نے لکھا تھا کہ ناصر کاظمی کی "شاعری کے بنیادی احساس کو میں اس طرح جانتا ہوں جیسے کوئی اپنے دل کے زخم سے دوسرے کے دل کے زخم کو جانتا ہے"۔۔۔۔۔ منیر نے اپنے وطن کے آشوب اور اپنی قوم کے مصائب کو بھی سیاسی یا سائنسی فارمولوں کی روشنی میں نہیں بلکہ اپنے دکھی دل کے اُجالے میں سمجھا ہے۔

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا — عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد — پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا

راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لیے — مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا

شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا — پھر مجھے اس شہر میں نامعتبر اس نے کیا

شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیر — شہر پر یہ ظلم میرے نام پر اس نے کیا

کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے — سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

حرفِ دروغ غالب شہرِ خدا ہوا — شہروں میں ذکرِ حرفِ صداقت کریں تو کیا

معنی نہیں منیر کسی کام میں یہاں — طاعت کریں تو کیا ہے بغاوت کریں تو کیا

منیر کی شاعری میں شہر اور شہریوں کی نت نئی آفتوں پر باغیانہ گھن گرج کی بجائے ایک دائم بے چینی اور ایک صوفیانہ تحیر کے ساتھ دل کی آنکھ سے لہو رونے کا انداز کارفرما ہے۔ غالب کی طرح منیر نیازی کا پیشۂ آبا بھی سو پشت سے سپہگری رہا ہے مگر غالب ہی کی طرح منیر نیازی بھی نوکِ شمشیر کی بجائے نوکِ سوزن سے کام لینے کے خوگر ہیں۔ فنِ سپاہ گری کی بجائے شاعری کو ذریعۂ عزت بنانے کی وجہ غالب کے ہاں یہ تھی۔

جبکہ نقشِ مدعا ہو وے نہ جز موجِ سراب — وادیٔ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

اور منیر کے ہاں یہ کہ:۔

شکوہ کریں تو کس سے شکایت کریں تو کیا؛ — اک رائیگاں عمل کی ریاضت کریں تو کیا
معنی نہیں منیرؔ کسی کام میں یہاں! — طاعت کریں تو کیا ہے بغاوت کریں تو کیا

عمل کی رائیگانی اور طاعت اور بغاوت ہر دو کی بے معنویت کا یہ احساس منیرؔ کے معاشرتی شعور سے پھوٹا ہے۔ منیرؔ اپنے گرد و پیش یا تو تھکے لوگوں کو مجبوری میں چلتے دیکھتے ہیں اور یا پھر زر اندوزی کی خاطر بگٹٹ بھاگتے ہوئے لوگوں کو عمل سے اپنی زندگی جہنم بناتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ مجبوری میں تھکے تھکے قدم اٹھانے والے لوگ ہوں یا خدائے زر پر یقینِ محکم کے ساتھ پیہم عمل میں مصروف لوگ، ہر دو کی زندگی اور عمل اس نصب العین کی تجلّی سے بے نصیب ہے جسے ۱۹۴۷ء سے پہلے تصوّرِ پاکستان کہتے تھے۔ سو وہ ان دنوں کی یادوں میں گھرے رہتے ہیں جب لوگ عمل سے زندگی کو جنّت بنانے نکلے تھے:۔

"عجیب بستیاں تھیں جن کی یاد نے ہمیں شاعر بنا دیا۔ چھوڑے ہوئے گھروں کی یاد نے کبھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا ہجرت میرا اور ناصر کاظمی کا مشترک تجربہ تھی۔ ایک پرانے گھر سے بچھڑنے کا ملال اور ایک نیا گھر نہ ملنے کا غم۔ پرانی، دلکش، تحفظ کا احساس دینے والی یادوں کے بل پر آئندہ کی تشکیل کی خواہش ـــ ناصر کاظمی کی شاعری انہی یادوں اور خوابوں کا بیان ہے۔"

یاد اور موجود، خواب اور حقیقت کا یہ تانا بانا ہی منیرؔ نیازی کی شاعری میں طلسمات کے ان گنت رنگین اور پر اسرار دروازے کھولتا ہے۔

اردو شاعری کے ایوان میں منیرؔ نیازی کی آواز اس وقت گونجی جب ترقی پسند اور نئے ادب کی تحریکیں اپنے فنی و فکری فیضان کی تکمیل کے بعد ادبی تاریخ کا جزو بن چکی تھیں مگر ان کے نوجوان پسماندگان ترقی پسند اور نئی شاعری کے رسمی مضامین کی جگالی میں مصروف تھے۔ ادھر سیاسی اور تمدنی زندگی میں ابتری اور انتشار روز افزوں تھا۔ پرانی دنیا سے نئی دنیا کو ہجرت کرتے وقت ہماری آنکھیں جن خوابوں سے منور تھیں انہیں فراموش کر کے ہم زر پرستانہ نفسا نفسی کے گرداب میں پھنس چکے تھے۔ ایسے میں منیرؔ نیازی کی تازہ کار اور نادرہ کار آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس آواز میں جسمانی نشاط کے وہ تمام سُر موجود تھے جن کی طلب سے ہماری اجتماعی زندگی عبارت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں خوف و دہشت اور غم و اندوہ کی وہ جھنکاریں بھی سنائی دے رہی تھیں جو اس سحرِ نشاط کے ٹوٹنے پر ہمارا مقدر تھیں۔

چمک زر کی اسے آخر مکانِ خاک تک لائی — بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

اور

ان دنوں یہ حالت ہے میری خواب ہستی میں — سیر رہا ہوں میں جیسے اک خراب بستی میں
خوف سے مفر جیسے شہر کی ضرورت ہے — عیش کی فراوانی اس کی ایک صورت ہے
ان دنوں میں مے نوشی فعلِ سود لگتا ہے — عورتوں کی صحبت میں دل بہت بہلتا ہے

(نظم ـــــــــــ "ڈرائے گئے شہروں کے باطن")

اس شہرِ خرابی میں کہ جہاں قدم قدم پر کوفہ و کربلا یاد آتے ہیں، منیرؔ نیازی کو فقط خدا کی یاد میں سکون ملتا ہے اور صرف اسمِ محمدؐ شاد رکھتا ہے۔

شامِ شہرِ ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تُو — یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تُو
ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی — گھپ اندھیرے جنگلوں میں راستہ دیتا ہے تُو
میں جو اک برباد ہوں آباد رکھتا ہے مجھے — دیر تک اسمِ محمدؐ شاد رکھتا ہے مجھے

ـــ (حمد)

چنانچہ منیرؔ نیازی کا چھٹا اردو مجموعۂ کلام بھی حمد اور نعت سے شروع ہوتا ہے اور اسے پڑھ کر بھی منیرؔ کا وہ دس برس پرانا انٹرویو یاد آتا ہے جس میں اس نے عہد کیا تھا کہ:۔

"یہ ملک ہم نے بڑے چیلنج کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ ہمیں اس کو خوبصورت بنانا ہے۔"

اس عزم کی تخلیقی زرخیزی "چھ رنگین دروازے" میں کچھ یوں نمودار ہوتی ہے کہ منیر پرانی یادوں کے حصار سے نکل کر ایک جہانِ نو کی جانب گامزن ہوتے دکھائی دیتے ہیں :-

ایک نگر کے نقش بھلا دوں، ایک نگر ایجاد کروں ایک طرف خاموشی کر دوں، ایک طرف آباد کروں

رات اتنی جا چکی ہے اور سونا ہے ابھی اس نگر میں اک خوشی کا خواب بونا ہے ابھی
ایسی یادوں میں گھرے ہیں جن سے کچھ حاصل نہیں اور کتنا وقت ان یادوں میں کھونا ہے ابھی
ہم نے کھلتے دیکھنا ہے پھر خیابانِ بہار شہر کے اطراف کی مٹی میں سونا ہے ابھی
بیٹھ جائیں سایۂ دامانِ احمدؐ میں منیرؔ اور پھر سوچیں وہ باتیں جن کو ہونا ہے ابھی

لاحاصل یادوں سے رہائی کی تمنا نے دہشت کی وہ فصیل گرا دی ہے جس کے سائے منیر کی شاعری پر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اب اس کی فضائے سخن میں اُمید کے ستارے روشن ہیں اور جہاں وہ شہر کے اطراف کی مٹی میں سونا دیکھ رہا ہے وہاں اس نے ہر کسی کے چہرے پر خوب صورتی کا ایک مقام بھی دریافت کر لیا ہے :-

ہر کسی کے چہرے پر اک ضیا سی ہوتی ہے
حسن کے علاقے کی اک ادا سی ہوتی ہے

اس صوفیانہ طرزِ احساس نے منیر نیازی کو حیرت کی کراں تا کراں پھیلی ہوئی وسعتوں کا مسافر بنا دیا ہے اور یہ نیا شعری سفر اپنے اندر اَن گنت امکانات رکھتا ہے ۔

فتح محمد ملک

مثبت نتائج (مزاحیہ مضامین)

مصنف :- زاہد ملک ناشر :- یوسف پبلشرز ، راولپنڈی قیمت :- ۲۵ روپے

زاہد ملک سے میری واقفیت دس بارہ منٹ سے زیادہ کی نہیں مگر ان سے دوستی بڑی گہری ہو گئی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے غالب اور امانت علی خان سے واقفیت ایک منٹ کی بھی نہیں مگر غالب سے عشق ہے اور امانت علی خاں سے پیار۔ غالب سے عشق اس کے دیوان کی وجہ سے ہے اور امانت علی سے پیار اس کی آواز کی وجہ سے۔ زاہد ملک سے دوستی، ظاہر ہے کہ اس کے مثبت نتائج کی وجہ سے ہے۔

مَیں زاہد ملک سے دوستی کا حساب، غالب اور امانت کے حساب کی طرح اپنے دِل ہی میں رکھنا چاہتا تھا مگر اصرار ہے کہ زاہد ملک والے حساب کی مکمل بیلنس شیٹ، چار گواہوں کے سامنے، چوپال میں آ کر پیش کروں ورنہ سند نہ رہے گی۔

اَب اے اہلِ چوپال، مَیں خود تو بوجوہ حاضرِ خدمت ہونے سے قاصر ہوں اور اس کوتاہی پر معذرت خواہ ہوں مگر حساب تحریراً حاضر ہے اور باعثِ تحریر آنکہ کتاب مستطاب موسومہ بہ "مثبت نتائج" پڑھنے کے بعد یہ خاکسار مندرجہ ذیل مثبت وجوہ کی بنا پر مصنف کا گرویدہ ہو گیا ہے۔

۱۔ مصنف ایک خوش وضع اور خوبرو شخص ہے۔ جی چاہے تو آپ خود مصنف کو دیکھ لیں اور جی چاہے تو اس کی تصویر دیکھ لیں جو کتاب کے گرد پوش کی پشت پر ہے۔ دیکھ چکے؟ اَب میرا ایمان ہے کہ اگر ایک خوبرو شخص کوئی چیز تخلیق کرنا چاہے تو نتائج ہمیشہ خوبصورت اور مثبت ہوں گے خواہ حاصلِ تخلیق بچے ہوں یا تحریر۔ شاید اِس مقام پر آپ پوچھنا چاہیں کہ کسی کج رُو سے کوئی تخلیقی کاروائی سرزد ہو

جائے تو پھر! پھر کیا عرض کروں، نتائج اتنے گوارا نہیں ہوں گے۔ ثبوت کے لیے آپ اپنے ارد گرد دیکھیں۔ آپ کو کئی ہمارٹ نگاہیں نیچی کیے نظر آئیں گے جیسے کوئی گناہ کر بیٹھے ہوں۔

۲- جہاں تک "مثبت نتائج" کے فنی اور فکری محاسن کا تعلق ہے، اُن پر ہمارے گرائیں، اور ملک کے نامور نقاد، جناب فتح محمد ملک نے حرفِ آخر کہہ دیا ہے اور صرف کہہ ہی نہیں دیا بلکہ بطور پیش لفظ شامل کتاب بھی کر دیا ہے۔ ملک صاحب یعنی نقاد ملک کا ارشاد ہے کہ زاہد ملک ہمارے جسدِ اجتماعی میں سرائت کی ہوئی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی بیماریوں کو جرأت اور بے باکی کے ساتھ، مگر پرلطف اور مسرت انگیز انداز میں بے نقاب کرتا ہے۔

اب مَیں نے بھی مثبت نتائج کے تمام مضامین پڑھے ہیں۔ پڑھے کیا ہیں، خود مضامین نے اپنے آپ کو پڑھوایا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں انتہائی مسرت محسوس ہوتی ہے کہ میرے خیال میں فتح محمد ملک صاحب نے زاہد ملک کو کوئی جھوٹا، یا رعایتی یا مبالغہ آمیز سرٹیفکیٹ نہیں دیا جیسا کہ ایسے موقعوں پر اکثر تبصرہ نگار دوست مروت میں آ کر دے دیتے ہیں۔ زاہد ملک اِس ممتاز مگر محتاط نقاد کی تحسین کے ہر لفظ کے مستحق ہیں۔
فتح محمد ملک صاحب نے ایک خاص چیز نوٹ کی ہے اور وہ یہ کہ مصنف کا امتیازی وصف سیاسی حقائق سے شغف ہے۔ موضوع کوئی سا بھی ہو، وہ قاری کو ہنستے ہنساتے بالآخر کسی نہ کسی سیاسی حقیقت تک لے آتے ہیں۔ اِس ضمن میں انہوں نے "اپریشن ماسکیٹو" سے ایک نہایت دلچسپ اقتباس بھی دیا ہے جس میں مصنف نے بظاہر صوبائی مکھیوں کے خواص گنوائے ہیں مگر اصل رونا پاکستان اور اس کی سالمیت کا ہے۔ اسی طرح "عاشقوں سے برادرانہ اپیل" کا ایک ہنستا مسکراتا پیرا ملاحظہ ہو!

"آج کل ہیروئن یا محبوبہ اپنے ہیرو یا عاشق کو ایک معمولی لغزش پر بھی موت سے کم سزا دینے کے حق میں نظر نہیں آتی۔ بلکہ خود اپنے لیے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر سزائے موت تجویز کر لیتی ہے۔ مثلاً اس کا یہ کہنا:-

جس دِن تیری یاد نہ آئے   اس دن مجھ کو موت آ جائے

اب ہمارا کہنا یہ ہے کہ انسان کی آج کی زندگی بہت معروف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کام کے رش کی وجہ سے محترمہ کو محبوب ایک دو دِن یاد نہ آ سکے یا موصوفہ کو کوئی ایسی اسائنمنٹ دے دی گئی ہو کہ ہزار چاہنے کے باوجود اپنے چاہنے والے کو یاد نہ رکھ سکے۔ ویسے پورے خلوص اور ایمانداری سے سمجھتی ہو کہ جونہی کام سے فارغ ہوئی، عاشق صاحب سے رابطہ قائم کر لوں گی۔ اس لیے ہماری ناقص رائے میں شعر میں جو یاد نہ آنے کی مدت مقرر کی گئی ہے یعنی "جس دِن" مطلب یہ کہ اگر چوبیس گھنٹوں میں فریق ثانی کی "اتفاقاً" یاد نہ آئے تو پھر موت آ جائے یہ مدت بڑھا دینی چاہیئے۔ مثلاً ہماری رائے میں یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالےٰ نے جو یہ سات دِن بنائے ہیں اس میں کوئی مصلحت ضرور ہو گی۔ لہٰذا ہم سات دِن سے پہلے سزائے موت کے حق میں نہیں بلکہ سات دِن کے بعد بھی سزا میں مزید کمی ہونا چاہیئے تا کہ ملزم یا ملزمہ کو اصلاح کا چانس مل سکے اور وہ سدھر کر راہِ راست پر آ سکے لیکن اگر اسے فوراً ہی۔۔۔ (موت)۔۔۔ کے حوالے کر دیا گیا تو پھر یہ انتقامی کارروائی ہو گی۔ اصلاحی کارروائی تو نہ ہوئی۔ لہٰذا ہمارے خیال میں یہ شعر یوں بھی ہو سکتا ہے:-

جس دِن تیری یاد نہ آئے   اُس دِن مجھ کو موچ آ جائے"

"مثبت نتائج" کی اشاعت سے مجھے ایک ذاتی خوشی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ مزاح نگاروں کی برادری میں غیر متوقع لیکن نہایت ہی کھرا اضافہ ہوا ہے۔ برادری کے سردارِ اعلیٰ، پیر و مرشد سید ضمیر جعفری سے التماس ہے کہ آج ہی، اسی چوپال میں، نووارد اور نوجوان زاہد ملک کی دستار بندی کی رسم ادا کریں۔ اگر فوری طور پر دستار میسر نہ آ سکے تو کسی خاتون سے دوپٹہ مستعار لے لیں وہ غالباً پہلے ہی ایک آدھ بزرگ کی گردن سے لٹک رہا ہو گا۔ اگر نہ بھی ہو تو اسے دو چار بل دے کر صافہ بنا لیں اور دستار بندی کی علامتی رسم پوری کر دیں۔

مَیں نے زاہد ملک کو نوجوان کہا ہے۔ وہ آئندہ سات سال تک، یعنی جب تک پچاس سال کا نہیں ہو جاتا، نوجوان ہی رہے گا۔ اور اس کے بعد ساٹھ، ستر، اسّی سال تک صرف جوان کہلائے گا لیکن کبھی بوڑھا نہیں ہو گا نہ بابا کہلائے گا۔ وجہ یہ کہ کوئی حقیقی مزاح نگار بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ ذرا دیکھئے مزاح کے بادشاہ، ضمیر کجکلاہ کو۔ ماشاءاللہ ساٹھ برس کے جوان ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سامعین میں سے کوئی صاحب یا صاحبہ شباب ِدوام کی خاطر مزاح نگاری کو نسخے کے طور پر شروع کر دیں۔ مزاح کے لیے محض نیت کافی نہیں۔ اس کے لیے بڑی ریاضت درکار ہے اور ریاضت سے بھی زیادہ کسی خدا رسیدہ مزاح نگار کی نظرِ عنایت کی ضرورت ہے۔ پنڈی کے متلاشیانِ شباب بوسیلہ مزاح کے لیے سیّد ضمیر جعفری سے کامل تر رہنما ملنا مشکل ہے اور اگر وہ کسی وجہ سے AVAILABLE نہ ہوں تو پھر بلا جھجک زاہد ملک کے ہاتھ پر بیعت کر لیں کہ انہیں بھی سلسلہ مزاحیہ جعفریہ کی درگاہ سے خرقہ عطا ہوا ہے۔ اور آپ کی مراد بھی اسی درگاہ سے پوری ہو گی۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

کرنل محمد خان

شام کا پہلا تارا (مجموعہ کلام)

مصنف :- زہرا نگاہ

قیمت :- ۲۵/ روپے

ناشر :- نام درج نہیں

ڈیئر ہم عصر زہرا نگاہ، سب سے پہلے تو یہ کہ کتاب پڑھ کر مَیں بہت خوش ہوا۔ دس دن کے وقفے کے بعد مَیں نے کل رات آپ کی کتاب پھر پڑھ ڈالی اور جو رائے آپ نے منہ زبانی مانگی تھی اس کا اظہار تحریری طور پر کر رہا ہوں کہ کاغذ پر بھید کھلے۔

میرا خیال ہے شروع میں ہی، ضمنی طور پر اُن باتوں کی طرف اشارہ کرتا چلوں جو مجھے پسند نہیں آئیں تاکہ بعد میں میری پسندیدگی کے کچھ معانی سمجھ میں آ سکیں۔

۱- گرد پوش پر سردار جعفری کی رومانی، مردہ اور بے معنی تحریر نہ کتاب سے انصاف ہے نہ شاعرہ سے۔ بالکل یہی کچھ وہ فہمیدہ ریاض کے لیے بھی لکھ چکے ہیں اور پروین شاکر کے لیے بھی کہہ چکے ہیں۔ ان کی نثر ان کی شاعری کی طرح بے اعتبار ہے۔ اگر آپ کا نام قرۃ العین یا مریم ہوتا تو وہ آپ کا رشتہ ایران اور فلسطین سے نکالتے اور بات کا بتنگڑ بناتے۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے یہ لکھ کر اپنی شلف پر رکھ لیا تھا "الف نے اپنی شاعری کا آغاز غزل/نظم سے کیا تھا جس میں جذبے اور احساس کی فراوانی تھی —— الف نظموں/غزلوں کی طرف مائل ہوا/ہوئی۔ اس شاعری میں آج کی بے چین دُنیا کی بے چین روح ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کی لَے ہے۔ الفاظ نرم اور لطیف ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ الف کی جگہ کبھی فہمیدہ کبھی ساحر کبھی اختر الایمان اور کبھی زہرا کا نام ڈال دیتے ہیں اور پچھلے چالیس سال سے یہی مشغلہ اختیار کر رکھا ہے۔ انہیں آپ کی نظموں میں بھی "ظلم کے خلاف" والی نظمیں پسند آئیں اور یاد رکھیے کہ "یہ ظلم" ترقی پسندوں والا ظلم ہے یعنی "THEM" اور "US" والا۔ وہ ظلم نہیں جس پر آپ نے اپنی بیس خوبصورت نظمیں لکھی ہیں جو آپ کی ذات پر ہوتا رہا ہے اور جس کی طرف مَیں بعد میں اشارے کروں گا۔

۲- عورتوں کی زبان سے ہم مرد زبان سیکھتے آتے ہیں اس لیے ان دو چار غلطیوں سے آپ دامن بچا سکتیں تو بہتر تھا "انتساب" کے پہلے مصرع میں "عذابِ لہو" اگر آپ نے دانستہ طور پر لکھا ہے تو خیر ورنہ "لہو" ہندی کا لفظ ہے اور اضافت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ویسے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس طرح کی تراکیب اُردو میں جاری ہو جانی چاہئیں اگر زبان آگے جانا چاہتی ہے مگر یہ فعل شعوری ہو، لاعلمی میں نہ ہو۔

۳- نظم "شام کا پہلا تارا" میں صفحہ ۱۶ پر بارہویں مصرع میں "راستے" کو آپ نے کھینچ تان کر "فعلن" باندھا ہے جس سے مصرع کا حسن اور نغمہ مجروح ہوتے ہیں۔ یہ لفظ "فعل" کے وزن پر ہے اور اسی میں اس کی موسیقی بند ہے۔

۴- "جرم وعدہ" میں ایک مصرعہ ہے ؎ جہاں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئیں تھیں۔ "سوئیاں" آپ نے بروزن "سُیاں" یا فعلن باندھا ہے جو غلط نہیں ہے کہ بزرگوں نے بھی فعلن لکھا ہے مثلاً جانصاحب کا شعر ہے۔

مجھ کو وہ چاہ نگوڑی نے چبھائیں کو سُیاں تن بدن میں ہیں مرے چبھ رہیں غم کی سوئیاں

مگر یہ تلفظ متروک ہو گیا ہے جیسے لفظ "کبھو" متروک ہو گیا۔ اور اس لفظ کو اب "فاعلن" باندھتے ہیں جیسا شاد کے شعر میں ہے

دکھا کے غیر کو مژگاں کی سوئیاں کیا کیا مرے جگر میں وہ لیتا ہے چٹکیاں کیا کیا

۵- نظم "نیا گھر" میں ایک مصرعہ ہے۔

؎ اس کے دیوار و در فرش و آنگن!

آنگن ہندی ہے اور "واوٗ" فارسی کا حرف عطف ہے۔ فرش عربی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مصرعے سے دونوں "واوٗ" نکال دیئے جائیں اور COMA کا استعمال کیا جائے۔ دیوار کے بعد، در کے بعد، اور فرش کے بعد تو مصرعے میں مزید روانی آجائے گی اور "واوٗ" کی علت بھی جاتی رہے گی۔

۶- نظم "ایک لڑکی" میں غالباً کتابت کی غلطی سے ساتویں مصرعے میں لفظ "ایستادہ" چھپ گیا ہے اور مصرعہ گر گیا ہے اسے "اِستادہ" ہونا چاہئے "ی" کے بغیر "مفعولن" نہ کہ "فاعلاتن"۔

۷- نظم "یہ ہوا کا اک جھونکا" میں ایک مصرعہ ہے۔

؎ ان گھروں کے درو دیوار —— یہ مصرعہ حرفِ عطف کی وجہ سے بے وزن ہو گیا ہے۔ یہاں بھی "واوٗ" کو نکال کر COMA لگا دینے سے مصرعہ وزن میں بھی ہو جائے گا اور رواں بھی۔

۸- آپ کی ایک بہت اچھی نظم "اپنے بیٹے علی کے نام" میں "مشامِ جاں" کا استعمال میرے نزدیک بہت اجنبی ہے کہ مشامِ جاں کا لغوی مطلب "دماغ" ہے خوشبو نہیں۔

اب میں کچھ غزلوں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں اس مجموعے میں ۳۴ غزلیں شامل ہیں مگر میرا انتخاب بہت کڑا ہے۔ میرے کڑے پن سے ناراض ہونے کی ضرورت ہے نہ اداس ہونے کی کہ یہ میرے ساتھ ناانصافی ہو گی۔

مجھے تین مکمل غزلیں اور بقیہ غزلوں کے دس شعر ایسے لگے کہ جی نہال ہو گیا اور آپ کی غزل کا جواز نظر آیا۔ ان کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں چھپنے والی سیکڑوں کتابوں (مجموعوں) میں خال خال کوئی ایسی غزل یا ایسے شعر نظر آتے ہیں کہ غزل کا امکان روشن ہو۔ جو غزلیں مجھے پوری کی پوری پسند آئیں وہ یہ ہیں۔

(۱) اپنا ہر انداز آنکھوں کو ترو تازہ لگا۔

(۲) بیٹھے بیٹھے کیسا دل گھبرا جاتا ہے

(۳) قربتوں سے کب تلک اپنے کو بہلائیں گے ہم

بڑے مارکسی فلسفی ہربرٹ مارکوزے نے ۱۹۷۵ء سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مارکسیت کو دُنیا کی آدھی مزدور آبادی یعنی عورتوں کے حقوق کے لیے جنگ شروع کر دینی چاہیئے کہ یہ مزدور بنتے ہیں۔ یہی بات ایک غریب ملک کے ایک چھوٹے شاعر ساقی فاروقی نے ۱۹۷۰ء سے کہنی شروع کر دی تھی مگر ادب کے رشتے سے کہ FEMALE EXPERIENCE کا جو

ذخیرہ ہندوستان اور پاکستان کی عورتوں میں بند ہے، وقت آگیا ہے کہ وہ لاوے کی طرح اُبلے۔ یورپ کی سوسائٹی بھی مردوں کے زیراثر ہے مگر یہاں این سیکسٹن اور سلویا پلاتھ پیدا ہو کر اور خودکشی کر کے جا چکیں اور شاعری میں ایک تازہ تر امکان کی نشاندہی کر کے بھی۔ مگر انگریزی کی شاعری میں عورتوں کی آواز نے رومانیت سے اظہاریت کی طرف یہ سفر ۵۰ سال میں کیا ہے اور ۱۹۳۰ء سے ہی ایسے معرعے اُٹنے لگے تھے۔ I FULL OF DESIRE I.LAY, THE SKY WOUNDING ME (KATHLEEN RAINE) یا SO THE 1ST FLUTTER OF A BABY FELT IN THE WOMB (ANNE RIDLER) اور ۱۹۶۰ کے لگ بھگ SYLVIA PLATH کا اپنے باپ پر یہ مشہور معرعہ — DADDY, DADDY, YOU BASTARD, I'M THROUGH مگر ہمارے یہاں عورتوں کے تجربات کا اصل اظہار پندرہ سولہ سال سے شروع ہوا ہے۔ یہ انوکھا بھی ہے اور تازہ بھی۔ در کشور ناہید نے اپنی ایک نثری نظم میں ٹھیک ہی لکھا تھا:-

مجھے جن جذبوں نے خوفزدہ کیا تھا اَب میں ان کے اظہار سے دوسروں کو خوف سے لرزتا دیکھ رہی ہوں

اَب اس اظہار کی ایک مثال فہمیدہ ریاض کے ایک معرعے میں دیکھیئے ؏

تم اپنی زباں میرے منہ میں رکھے ، جیسے پاتال سے میری جان کھینچتے ہو

یا پروین شاکر کے اس شعر میں ؎

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی   میں اپنے ہاتھ سے اس کی دُلہن سجاؤں گی

یا شاہدہ حسن کا یہ شعر ؎

مَیں نے ان سب چڑیوں کے پَر کاٹ دیئے   جن کو اپنے اندر اڑتے دیکھا تھا

وغیرہ وغیرہ

مَیں نے اردو اور انگریزی کی خواتین کے تجربات کا پس منظر اس لیے اُجاگر کیا ہے کہ آپ سمجھ سکیں مجھے یہ تین غزلیں کیوں پسند ہیں اور بقیہ نہیں کیوں نہیں۔ اَب اپنی غزل ؏ اپنا ہر انداز آنکھوں کو تروتازہ لگا —— کو لیجئے۔

یہ غزل پہلے معرعے سے آخری معرعے تک ایک پاکستانی / ہندوستانی "عورت" کی سرشاری ہے۔ عورت مَیں نے اس لیے کہا کہ اس میں "لڑکی" کا الھڑپن نہیں جو مثال کے طور پر (اور یہ مثال میں صرف CONTRAST کے لیے لکھ رہا ہوں) پروین شاکر کی ایک خوبصورت غزل ؏ رقصِ شوق سے جب تک انگلیاں نہیں کھُلتیں۔ میں ہے۔ پروین کی غزل میں کنوارپن کی کچی خوشبو ہے آپ کی غزل میں سہاگن کا انبساط ہے۔ محبّت سے لبریز اس غزل میں اندر کی اتھاہ سرخوشی کا بھاری بھرکم پن ہے۔ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پہلے ہی لفظ کے "گھُم و" نے، یکایک محسوس ہونے والی خوشی کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور بحر کی موسیقی کو جنم دیا ہے جو ذات کی امنگ سے ہم آہنگ ہو گئی ہے جیسے آرزو لکھنوی کے ایک معرعے کی ابتدا۔ ؏

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے

آرزو صاحب نے "وہ پلٹ" لکھ کر ابتدا ہی میں وہ TWIST دی ہے جس سے ایک ایسی چال کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے جو واپس آنے والی نہیں۔ یا غالب کے معرعے ؏   الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

میں پہلے ہی لفظ سے وہ ترنگ اور انانیت پیدا ہوتی ہے جو کسی اور طرح ممکن نہ تھی۔ ایک جھٹکے کی کیفیت جیسے کوئی بچہ جلتی موم بتی کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے جلنے کے خوف سے ایک دم ہاتھ کھینچ لے۔

پھر یہ کہ "اپنا ہر انداز آنکھوں کو تر و تازہ لگا۔" کے بعد ایک خاموشی سی ہے۔ جیسے کسی اندرونی لذّت سے مسرور ہونے کے لیے کوئی ایک لمحے کو اپنے آپ میں گم ہو جائے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ دوسرا مصرعہ آتا ہے "کتنے دِن کے بعد مجھ کو آئینہ اچھا لگا۔" دونوں مصرعوں کے درمیان کی خاموشی میں یہ بھی ہے کہ "بہت دنوں مَیں اُداس رہ چکی اور یہ انہونی خوشی OVERDUE تھی" وغیرہ وغیرہ۔ جوں جوں غزل بڑھتی جاتی ہے ایک ایسی گھریلو عورت کی تصویر اُبھرتی جاتی ہے جو روز مرّہ کی یکسانیت سے بور تھی اور اب کسی ایک لمحے نے سب کچھ بدل دیا ہے جیسے کوئی پھولوں کا گلدستہ تھا دے یا تمام کاموں کا شکریہ ادا کر دے یا محبت کا اعادہ کرے، کوئی نہایت سامنے کی معمولی مگر انہونی بات کہ سارے دن کے ROUTINE کے معانی سمجھ میں آنے لگے۔ کوئی ایسی میٹھی بات کہ جس کے بعد باہری آرائش کی ضرورت نہیں رہتی کہ آدمی اندر سے جگمگانے لگتا ہے۔ پھر شروع کے چار شعروں میں دن پھیلا ہوا ہے اور آخری شعر کے اس ٹکڑے سے "وہ جو تھک کر دیر سے آیا" پورے دن کو ریشم کے لچھے کی طرح لپیٹا گیا ہے۔ جو غزل صبح سے شروع ہوئی تھی شام پر ختم ہوئی ہے یہ ایک خوبصورت اور مکمل غزل ہے۔

اب مَیں اپنی پسند کی دوسری غزل کی طرف آتا ہوں یعنی ؏

بیٹھے بیٹھے کیسا دِل گھبرا جاتا ہے ــــ والی غزل۔

اس غزل کے تانے بانے جیسے دِل کی دھڑکن پر بُنے گئے ہوں۔ دَھک دَھک دَھک دَھک ــــــ بیٹھے۔۔۔ بیٹھے ۔۔۔۔۔ ایک حزینہ سرگوشی جو سُننے والوں سے قربت کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ ؏ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے۔ بلکہ اس لیے شاید کہ باہر بہت شور ہے قریب آ جاؤ ــــ یہ اپنے ہی "دوسرے میں" سے خود کلامی بھی ہے اور آنے جانے والے مہمانوں سے بات کرنے کی تمنّا بھی۔ اس میں ایک ایسی عورت کا دُکھ ہے جو تمام دُنیاوی آرائشوں کے باوجود اداس ہے۔ سلیم احمد نے اپنے معرکہ آرا مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" میں بڑی سفاک بات لکھی تھی ــ "آپ عورت کو خوبصورت الفاظ سے خوش نہیں کر سکتے۔ صرف زیور، کپڑے اور نان نفقے سے بھی نہیں یہاں تک کہ صرف اس کام سے بھی نہیں جسے محبت کہتے ہیں۔۔۔۔ عورت یہ سب چیزیں چاہتی ہے مگر الگ الگ نہیں" یہاں مجھے لفظ "کام" کی ہونا کی سے اختلاف ہے اور مجھے معلوم ہے کہ سلیم احمد نے بھی اپنا مسلک بدل لیا ہے مگر انہوں نے بڑی گہری بات کہی تھی۔ اس غزل میں مجھے ایک ایسی عورت کی پرچھائیں نظر آتی ہے جو ہجوم کی طالب ہے مگر جیسے ہجوم تنہا کرتا ہے مگر وہ تنہائی سے کچھ اس درجہ خوف زدہ ہے کہ تیسرے کی کچی ڈور کا عارضی سہارا بھی بہت ہے یہاں مجھے فراق کا ایک شعر بھی یاد آ رہا ہے ؎

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ عالم ہے   کہ جب ملتے ہیں دِل کہتا ہے، کوئی تیسرا بھی ہو

اس غزل میں یہ شعر بھی کہیں چھپا ہوا ہے ــ مگر یہ غزل اس شعر سے ان معنوں میں جُدا ہے کہ تیسرے کی آرزو تو یہ ہے مگر اس لیے نہیں کہ دو روحیں ایک دوسرے کو ایک طرح جان پہچان گئی ہیں کہ مزید گفتگو کا کوئی سلسلہ نہیں بنتا ــ اور تیسرے کے حوالے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نفیس نے کیا بانکا مصرعہ لکھا تھا ؏

عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا)

نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہاں تیسرے کی ضرورت اس لیے ہے کہ دوسرا، وہ جو اپنا ہے، اسے فرصت ہی نہیں اور وہ زندگی کرنے اور زندگی بنانے میں اتنا مصروف ہے کہ جس کے لیے یہ سارے جتن کیے جا رہے ہیں، ساری آلائشیں خریدی جا رہی ہیں وہ نراس ہوتی جا رہی ہے کہ درمیان یا تھکن ہے یا خاموشی اور وہ لفظ نہیں ہیں جن سے جان پہچان بڑھتی ہے۔

؎ اب اس گھر کی آبادی مہمانوں پر ہے   کوئی آ جائے تو وقت گزر جاتا ہے

اس شعر میں جان بوجھ کر ایک استہزائیہ کیفیت کو اجاگر کیا گیا ہے جیسے کوئی کھلنڈری لڑکی توبہ توبہ کرکے اپنے کان چھوئے کہ ہائے اللہ میں نے اتنا سارا سچ سب کے سامنے کیوں کہہ دیا۔

یہ ایک نیا تجربہ ہے اور میں ایسی ہی غزلوں میں "زہر انگاہ" کی نجات دیکھتا ہوں — الخ

اب میں اس کتاب کی اس تیسری اور آخری غزل کا ذکر کروں گا۔ جو مجھے پوری کی پوری پسند آئی اس غزل کے مختلف شعروں میں کئی طرح کی کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں، ایک ہی ذات کی کئی پرچھائیاں جو ایک دوسرے کو کاٹ نہیں رہیں بلکہ ایک دوسرے میں گم ہوتی جاتی ہیں۔ پوری غزل میں ایک سوچ بچار کا لہجہ ہے یعنی یہاں آپ لفظوں کی مشین نہیں ہیں کہ کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ بنے بنائے جذبے اور خیال کھپوں میں نکلتے چلے جائیں۔ نہیں یہ ایک محسوس کیا ہوا درد ہے ؎

قربتوں سے کب تلک اپنے کو بہلائیں گے ہم ڈوریاں مضبوط ہوں گی، چھوٹتے جائیں گے ہم

ایک کشمکش ہے، ایک الجھن ہے۔ صرف قربت کافی نہیں، اس ایک کھلونے سے بہلنا محال ہوتا جا رہا ہے، اس شعر میں اس سوال اور جواب کی گونج ہے :-

(i) THERE SHOULD BE SOMETHING ELSE --- ?

(ii) THERE MUST BE SOMETHING ELSE ---- !

دوسرے شعر میں یہ ہے کہ ہم دو جدا جدا شخصیتیں ہیں، اتفاق سے یا کسی حادثے کے سبب یا انجانے میں یکجا ہو گئے ہیں اور اب اس "آن" کے منتظر ہیں جس میں ذاتوں کی ہم آہنگی میسر آسکے۔ مگر دوسرے مصرعے کی اٹھان میں یہ جھلاہٹ بھی ہے کہ ساری کوششیں رائیگاں گئیں اب وہ "آن" آپ ہی آپ آجاتے تو آجائے۔ پہلے مصرعے میں ایک بڑی خوبصورت بات یہ بھی آگئی ہے کہ ہر چند آپ کی آنکھیں سوتے مہر ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تھوڑی ہی دیر میں آنکھوں کے سامنے سائے ناچنے لگیں گے اور دونوں کی آنکھوں کے سامنے سائے ہوں گے۔ شاید ملن کی ایک کوشش یہ بھی ہو۔

تیسرے شعر کا ایک سامنے کا مطلب تو وہ ہے جس کی طرف ڈاکٹر عبادت بریلوی عنقریب توجہ دلائیں گے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میں یہ ماتم ہے کہ ہم دونوں جسماً اور روحاً خرچ ہو گئے ہیں اور تجدید یا احیا کی کوئی صورت نہیں رہی۔ یہ بہت سوگوار کر دینے والا شعر ہے اور ہم میں سے بہتوں کا المیہ ہے۔

چوتھے شعر میں علم و حکمت کی کتاب کی موجودگی اور پھر اس کا کھلا ہونا بے سبب نہیں ہے۔ یعنی ہنگاموں میں تو ٹھیک تھا کہ پہلے اور تیسرے کے حوالے سے دوسرے تک پہنچنے کا امکان تھا مگر اب کیا ہو کہ دو تھکی ہوئی روحیں اور بدن اپنے خلوت کدے میں ایک دوسرے سے اس لیے محجوب ہیں کہ کہنے کو کچھ نہیں رہا اور دونوں نے یا دونوں میں سے ایک نے فرار کی ایک صورت یہ کر رکھی ہے کہ بستر پر پہلے ہی سے کتاب کھلی چھوڑ دی ہے تاکہ ندامت نہ ہو۔ اور ادھ کھلی کتاب کے یہ معانی بھی نکلتے ہیں کہ ایسی راتیں پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ اور یہ کوئی نرالی بات یا انوکھا واقعہ نہیں۔ یعنی دو ذاتوں نے اپنے درمیان بڑھتی ہوئی اجنبیت سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ پھر کتاب کی موجودگی اس "تیسرے وجود" کی موجودگی کا سمبل بھی ہے جس کے بغیر کسی طرح کا اظہار اور کسی طرح کی رسائی ممکن نہیں رہی۔

پھر یوں ہوتا ہے کہ وسوسوں اور وہموں میں گھرے ہوئے یہ دو لوگ یکایک لگاوٹ سے ایک دوسرے کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ اور وہ بیجا بخش یا کسی ایک کی مغلوب الغضبی یا زک پہنچانے والا کوئی معمولی واقعہ جو پچھلے روز یا پچھلے ہفتے یا پچھلے مہینے ہوا تھا وہ DIRECT UNDERSTADING سے جیسے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے اور اس اجنبیت کی دیوار کے گرتے ہی وہ ساری COMMUNICATION سامنے آجاتی ہے جو دو چار برس میں نہیں بنتی بلکہ زندگی کے طویل سفر کے بعد دستیاب ہوتی ہے اور جس کے پیچھے دکھوں اور سکھوں کا ایک لامتناہی

سلسلہ ہے اور جس کے حصول میں میر صاحب آگ سے خاک ہوئے ؎

اس نے آہستہ سے زہرا کہہ دیا، دل کھل اٹھا — آج سے اس نام کی خوشبو میں بس جائیں گے ہم

غزل پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے ان دس شعروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھیں بار ہا گنگنایا ہے۔ یہ پانچ پانچ شعروں کے دو گروپ ہیں مگر اس سے پہلے مجھے کہنے دیجئے، کہ میں فیض صاحب کی طرح آپ کی شاعری کے تین دَور نہیں بناؤں گا۔ کتاب سے صرف دو دور سامنے آتے ہیں۔ ایک کلاسیکی جس میں آپ کی آواز اپنی نہیں ہے۔ بیشتر مانگے کا اجالا ہے۔ احساس اور خیال دوسروں کے ہیں، آپ صرف لفظوں کی سزا وار ہیں۔ آپ کے گلے میں اجنبی آوازوں کی چھپاکلی ہے مثلاً

- فنا ہو چکی ہیں زمانے کے ہاتھوں ! — تری جلوہ گاہیں، مری سجدہ گاہیں !!
- عمر ساری غم دنیا میں بسر ہوتی ہے — تب کہیں جا کے ترے غم کی سحر ہوتی ہے
- آندھیاں آئیں کئی رنگ ابھرے — آگ برسی تو بہت پھول کھلے
- شورشِ قلب و نظر آخر زباں تک آ گئی — بات یہ اتنی سی تھی، لیکن کہاں تک آ گئی
- گردش مینا و جام دیکھئے کب تک رہے — ہم پہ تقاضا حرام دیکھئے کب تک رہے
- مری غریبی کی خیر یارب مجھے مقامات بو ذری دے — بڑے بڑے صاحب بصیرت یہاں پہنچ کر بھٹک گئے ہیں
- غم بھی اس دل کا آسرا نہ ہوا ! — تیرا احسان تھا ادا نہ ہوا !
- پھولوں سے ہوا بھی کبھی گھبرائی ہے دیکھو — غنچوں سے بھی شبنم کبھی کترائی ہے دیکھو
- خوب ہے صاحبِ محفل کی ادا — کوئی بولا تو برا مان گئے
- بہکے ہوئے بھٹکتے ہوئے کارواں کی خیر — رہبر سے راہزن کی ملاقات ہو گئی
- لو ڈوبتوں نے دیکھ لیا ناخدا کو آج — تقریب کچھ تو بہر ملاقات ہو گئی

وغیرہ وغیرہ

یہ غزلیں زیادہ سے زیادہ لکھنؤ کے بڑے اساتذہ کی، ابھرتے ترقی پسندوں کی، اقبال اور فیض اور ناصر کی یاد دلاتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے انہیں لکھنے والے نے کوئی دکھ نہیں اٹھایا اور دوسروں کے اسلوبِ بیان (PHRASEOLOGY) میں مقید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسی غزلوں کی وجہ سے لوگ آپ کو ASSESS کرنے میں دقت محسوس کریں گے اور آپ کے شعری مقام کے تعین میں دیر لگے گی۔

مگر اس دور میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں کہ پتہ چلتا ہے کہ آپ کو جادوگری کا ڈھنگ آتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے آپ کی تان کے دیپک سے میں بیس سال سے جل رہا ہوں (اس میں آپ کی عمر کی طرف اشارہ نہیں بلکہ میری میٹھے برس میں شامل ہونے کی تمنا ہے۔) آپ تو پہلی ہی غزل سے مشہور ہو گئی تھیں۔ یہاں آج تک یہ سوگ ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ میرے پہلے گروپ کے شعر اسی دور کی یادگار ہیں:۔

- دل بجھنے لگا آتشِ رخسار کے ہوتے — تنہا نظر آتے ہیں غم یار کے ہوتے

- خوش جو آئے تھے پشیمان گئے — اے تغافل تجھے پہچان گئے !

- اے شیشہ گرو، کچھ تو کرو، آئینہ خانہ   رنگوں سے خفا، رُخ سے جُدا یوں نہ ہوا تھا

- اب تک شریکِ محفلِ اغیار کون ہے   ہم بے وفا ہوئے تو خطا وار کون ہے

- کوئی کرتا ہے اگر پیار بھری بات تو ہم !   شہر کا شہر ستاروں سے سجا دیتے ہیں

ان شعروں میں دوسروں سے جان چھڑانے کی کوشش اور اپنی ذات کے آہنگ کی تلاش ہے، ابھی آپ پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئیں مگر اپنی آواز کے تعاقب میں ہیں۔ خاص کر آخری شعر جسے مَیں نے آپ کی نظم سے نکال لیا کہ نظم کمزور ہے اور اسی شعر کی بیساکھی پر کھڑی تھی، یہ شعر مجروح کے شعر — تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے بھی آگے جاتا ہے۔ اور اُس سے بڑا شعر ہے۔ اس میں ایک وحشت اور رقص کی کیفیت بھی شامل ہے۔ خاص کر دوسرے مصرعے میں ایک نشاط انگیز اور لذت آگیں لمحے کو زنجیر کرکے اسے زندہ اور بیتے ہوئے وقت سے الگ کر دیا گیا ہے۔

اب میرے دوسرے گروپ کے شعروں کو دیکھئے:۔

- بھولیں اگر تجھے تو کہاں جائیں کیا کریں !   ہر رہگزر میں تیرے گزرنے کا حُسن ہے

- برسوں ہوئے تم کہیں نہیں ہو !   آج ایسا لگا یہیں کہیں ہو !

- ہم خاک تھے پر جب اسے دیکھا تو بہت روئے   سنتے تھے کہ صحراؤں میں دریا نہیں ہوتے

- کڑے سفر میں مجھ کو چھوڑ دینے والا ہم سفر   بچھڑتے وقت اپنے ساتھ ساری دھوپ لے گیا

- آنکھوں میں دیدار کا کاجل ڈالا تھا !   آنچل پر اُمید کا تارہ ٹانکا تھا !

اس گروپ کے شعر پہلے گروپ کے شعروں سے اس لیے الگ ہیں کہ ان میں اردو شاعری کے مردوں کے بنائے ہوئے استعارے سے ہجرت ہے۔ یہاں آپ نے اپنی آواز کو پا لیا ہے، یہ اُن تین غزلوں کی طرح ہیں جن پر اجمالاً یا شاید تفصیلاً پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں۔ یہ کوئی بہت بڑے شعر نہیں ہیں مگر ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ آپ کے اپنے ہیں۔ اردو شاعری کے کلیشے سے الگ، ان میں اس عورت کے دُکھ اور خواب ہیں جو اپنی ذات کی آزاد فضا میں پہلی بار سانس لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ پَر تول رہی ہے اور نئے آسمانوں کی خبر دے رہی ہے۔ آپ کو ایسے ہی اشعار کے سائے میں سفر کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ میرا بائی یا قرۃ العین طاہرہ تو نہیں بن سکتیں مگر زہرا نگاہ کی طرح ضرور زندہ رہیں گی۔

اب وقت آگیا ہے کہ نظموں پر بات کی جائے۔ مجموعے میں ۵۲ نظمیں ہیں۔ غالباً سال کے ۵۲ ہفتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ مجھے ۲۲ نظمیں پسند آئیں یعنی ۴۲٫۱ فیصد — اس بات پر ہم دونوں کو خوش ہو جانا چاہیئے۔ ہر نظم پر لکھنے کا یارا نہیں کہ خط بہت طویل ہو گیا ہے مگر ان کی بنیادی خوبیوں

کی طرف اشارے کرتا چلوں گا اور کتاب کی کلیدی نظم پر ذرا تفصیل سے گفتگو کروں گا۔

مگر خوبیاں گننے سے پہلے اُن نظموں کی برائیوں کی فہرست دیکھتے چلئے جو مجھے پسند نہیں آئیں :۔

۱۔ سخت رومانی فضا کہ صحت مند آدمی کا دم گھٹ جائے۔ جوش صاحب کے الفاظ میں ؎

جذبہ حاتم کی طرح دریا دل !   شعر قارون کی طرح کنجوس !

پھر فیض کی زبردست چھاپ ہے جیسے "اہتمامِ شبِ امید" "آج کی بات" وغیرہ۔ بزرگ ہم عصروں سے آدمی کو ہر حال میں جان بچانی چاہیئے۔ یہ ایلیٹ اور راشد کا ہی نہیں میرا بھی خیال ہے۔

۲۔ لفظوں کا بیجا استعمال یعنی ایسی صفات کا استعمال جو آنے والے مصرعے کو نہ آگے بڑھاتی ہیں نہ پیچھے ہٹاتی ہیں۔ مثلاً آج کی بات صرف دو مصرعوں سے

(درد میٹھا ہو ۔۔۔۔ تو رک رک کے کسک ہوتی ہے
یاد گہری ہو ۔۔۔۔ تو تھم تھم کے قرار آتا ہے)

کی نظم ہوتی تو کھٹ سے دل پر لگتی اور اس کا پورا IMPACT ہوتا۔

یا "تمہیں وفا کا عہد نامہ" ۲۴ مصرعوں کی بجائے مندرجہ ذیل چھ مصرعوں کی نظم ہوتی تو TO THE POINT ہوتی اور اپنا بہت گہرا نشان چھوڑتی :۔

اجڑے ہوئے گھر کی خامشی میں   نوحے کی ندائیں ایک سی ہیں
ماتم کا ایک سا ہے لہجہ !   رونے کی صدائیں ایک سی ہیں
لاشوں کا کوئی وطن نہیں ہے   مُردوں کی کوئی زباں نہیں ہے

۳۔ کلیشے یعنی اس قسم کے ٹکڑے :۔
"تمنا کے موتی"، "خیالوں کے رنگیں محل"، "روحِ انسانی"، "نرگسِ چشمِ تر"، "نسیمِ سحر" ۔۔۔ اس طرح کی بچاسوں ترکیبیں ان نظموں میں ہیں۔ ان سے نجات کی کوشش بہت ضروری ہے۔

۴۔ سیاست پر صحافیانہ تبصرہ ۔۔۔ جیسے "جنوبی افریقہ" وغیرہ۔ نغمے کو سینے میں تھامنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسندوں کی بے وقت موت کا سبق نہیں بھولنا چاہیئے۔

۵۔ مولویانہ خطابت جیسے "تن نحیف سے انبوہ جبر ہار گیا" اے بہن، اے دوست ۔۔۔ یہ نہ آپ کا لہجہ ہے نہ آپ کی آواز۔ ایسا لگتا ہے آپ کے خیالات وردی پہن کر نکل آئے ہیں شاید ایک لمحے کو آپ بھول گئیں کہ آپ ساڑی میں بہت دلآویز لگتی ہیں۔

۶۔ آخر آخر میں یہ کہ CONCRETE پر آپ بھلے اُڑیئے بلکہ اپنے میاں سے کہہ کر مجھے بھی اُڑوائیے مگر اس پر نظم مت کہیئے۔ یہ نہ شاعری سے انصاف ہے نہ CONCORDE سے۔

اب میں ان نظموں کے عنوانات گنواتا ہوں جو مجھے بہت بہت پسند آئیں / بہت پسند آئیں / اور پسند آئیں :۔

۱۔ شام کا پہلا تارا ۲۔ جرم وعدہ ۳۔ بلاوا ۴۔ متاعِ الفاظ ۵۔ آنگن ۶۔ گل چاندنی ۷۔ اگر تم کہو تو ۸۔ نیا گھر ۹۔ سمجھوتہ ۱۰۔ تراشیدم تشکستم ۱۱۔ کیسی سنہری شام ہے دیکھو ۱۲۔ بن باس ۱۳۔ مری سہیلی ۱۴۔ دیوار ۱۵۔ سوچتی ہوں اپنے رستے لوٹ جاؤں ۱۶۔ نائٹ شفٹ ۱۷۔ ایک لڑکی ۱۸۔ ہمارے اور تمہارے راستوں میں ۱۹۔ علی کے نام ۲۰۔ ایران ۲۱۔ نظر بھر کے تم ان پہاڑوں کو دیکھو ۲۲۔ اندیں شہر مرا سایۂ دیوارے نیست اور ۲۳۔ کچھ

؎ ساقی صاحب کو غلط خبر ملی ہے ۔۔۔ (ادارہ)

دن ہوتے اس گھر میں تھی۔

یہ نظمیں اتنی انوکھی، البیلی اور نئی ہیں کہ جی چاہتا ہے، ہر نظم کا تجزیہ کروں اور APPRECIATION لکھوں مگر یہ ممکن نہیں لیکن جیسا کہ میں نے غلطی سے وعدہ کر لیا ہے اس مجموعے کی کلیدی نظم "شام کا پہلا تارا" پر تبصرہ ضرور کروں گا۔ مگر اس سے پہلے اس عورت کا تذکرہ ضروری ہے جو ان نظموں میں منکشف ہوئی ہے۔

یہ ایک فرنگی کہانی بھی ہے پارٹ(؟) ہندوستانی عورت کی بپتا بھی اور مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کی عورت کا المیہ بھی۔ ان نظموں کی عورت ظلم سہہ رہی ہے مگر اپنی ذات میں سکڑ نہیں گئی ہے بلکہ ہمیں اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا احساس دلاتی ہے۔ اسے اپنے "دوسرے درجے کا شہری" ہونے کا بڑا قلق ہے۔ اس نے اپنے اس رول سے سمجھوتا کر رکھا ہے مگر قبول نہیں کیا ہے۔ وہ اپنی UPBRINGING کے باعث شوہر، محبوب یا بیٹے سے بھی برابری سے نہیں ملتی مگر وہ عورت پن کے غرور کے ٹوٹنے کی گونج سے باؤلی ہوئی جاتی ہے۔ ہم مردوں نے عورت کو کبھی اس کا صحیح مقام نہیں دیا (اور "کبھی" سے میری مراد وہی ہے جو اس لفظ میں ہے)۔ ہم جھوٹ بولتے ہیں جب یہ کہتے ہیں کہ ؎

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا

آپ کی یہ نظمیں اور فہمیدہ ریاض کی کئی نظمیں اور کشور ناہید کی کئی نظمیں اور پروین شاکر کی کئی نظمیں مرد کے دوغلے پن کے گرد آلود شیشے پر ہیرے کی لکیر ہیں۔ میں خوش آمدید کہتا ہوں اور مرد کی بڑائی کی "آرام کرسی" پر بیٹھ کر نہیں بلکہ برابری کی "قالین" پر آلتی پالتی مار کے۔ ان نظموں میں اظہار کو بھی نئے پیرائے ملے ہیں مثلاً:

ع کہاں تک اپنے بوسیدہ بدن محفوظ رکھیں گے!

یا

ع اپنی مٹھی کے گھنگرو بجاتا رہے گا!

یا

ع لائم گرم سمجھتے کی چادر!!

یا

ع برسوں کی تپتی آنکھوں میں دھانی رنگ کھلے جاتے ہیں

یا

ع جسم کی آسائشوں سے کس طرح دامن چھڑاؤں

یہ تو ہوئی اس جہاد کی کہانی جو عورت کی حیثیت سے آپ کے ہاں جاری ہے۔ دوسری طرف وہ جنگ بھی ہے جو تمام شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں کا مقدر ہے۔ ظلم سہتے ہوئے آدمی کے خلاف آواز اٹھانا۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کئی جگہ انداز صحافیانہ ہو گیا ہے مگر چار پانچ نظمیں بہت محسوس کی ہوئی ہیں اور بہت خوبصورت ہیں۔ اس سسکنے والے آدمی کی کراہ ایسے مصرعوں میں عجب طرح سے سنائی دیتی ہے:۔

ع ذرا دیر کو اپنا بہتا لہو اپنی مٹھی میں لے لو

یا

؎ ویرانے میں زندگی بسی ہے سناٹے میں دل دھڑک رہے ہیں

یا

ﷺ اور کب دودھ سے بادل، جو میں سوچوں گا وہ بن جائیں گے

یا

ﷺ کہ میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے

یا

ﷺ اس کے روندے ہوئے جسم سے، صرف کچے لہو کی مہک آ رہی ہے

یا

ﷺ نگاہیں خجل ہیں / زبانیں ورق ہو گئی ہیں !!

وغیرہ وغیرہ

اب آخر میں (اور آخر اس لیے کہ نیند آ رہی ہے) نظم "شام کا پہلا تارا" پر کچھ جملے لکھنا چاہتا ہوں۔

اس نظم میں ایک ایسی عورت ابھرتی ہے جو بظاہر اپنی زندگی سے مطمئن نظر آتی ہے اور اپنے محبوب کی شکر گزار بھی مگر لہجے میں ایک حزنیہ شکن ہے جیسے بہت کچھ پانے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ کھونے کا احساس بھی ہو۔

نظم کے پہلے حصّے اور دوسرے حصّے کے درمیان زندگی کا ایک طویل سفر ہے یا لمبا وقفہ ہے۔ پہلے حصّے میں دو ذاتوں کی جان پہچان ہے۔ مگر ابتدائے عشق میں بھی نوجوان لڑکے لڑکیوں سا والہانہ پن نہیں ہے۔ سپردگی میں بھی تمکنت ہے۔ مگر یہ اردو شاعری کے محبوب کی تمکنت نہیں ہے۔ مصرعوں میں سوچ اور نرمی کا احساس لاشعور میں سہمے ہوئے کسی خوف کی نشاندہی کرتا ہے۔ جیسے کوئی محبت آمیز مگر سہمی آنکھوں سے دلاسہ دے "اداس نہو ہم کھلیں گے آہستہ آہستہ طلسم کی طرح"، یا "ہم نے اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ ہمیں اپنی خوش قسمتی پر اعتبار نہیں آ رہا"، وغیرہ۔

نظم کے دوسرے حصّے کے دو مصرعے ہم سفری اور سنگت اور ساتھ ساتھ دکھوں اور سکھوں میں شرکت کا بہت خوبصورت اظہار ہیں۔ ان مصرعوں کو IMPROVE نہیں کیا جا سکتا۔ ؎ تب میں نے کھڑکی کھولی تھی تم نے پردہ سرکایا تھا!

اس نظم کا کلیدی مصرعہ شام کے ستارے کے بارے میں ہے ؎

ﷺ جس نے ہمیں دکھ سے دیکھا تھا —— اور اس مصرعے کا کلیدی لفظ بھی غالب کے ہشت پہلو مصرعے (تجھ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا) کی طرح "دکھ" ہے —— آخر یہ دکھ کیوں؟ دو محبت کرنے والے، کسی رنجش سے نجات حاصل کرنے کے لیے، ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں کہ ستارہ انہیں دکھ سے دیکھتا ہے۔ اصل میں یہ ستارہ ان دونوں روحوں کے اندر ٹپ ٹپ گرتے ہوئے آنسوؤں کا استعارہ ہے۔ اور یہ آنسو اس سوگ میں ہیں کہ وہ وقت جو ہم دونوں ایک دوسرے کی دردگساری میں صرف کرتے، رائگاں گیا۔

اس نظم میں ایک گداز کرنے والا پہلو یہ بھی ہے کہ دونوں تجدید عہد کرنا چاہتے ہیں مگر مہرِ خاموشی پہلے کون توڑے؟ اصل میں گرمیٔ شوق کے آداب یہ ہیں کہ لفظ شور مچائیں، دریا کی طرح۔ اور تجدیدِ عہد کی تہذیب یہ ہے کہ خاموشی بہتی رہے، ندی کی طرح۔

بہت ملائم نظم ہے، کاش آپ "رات" کا لفظ نکال سکیں۔

اب سوچتا ہوں یہ باتیں تو منہ زبانی بھی کی جا سکتی تھیں، ۳۰ کافیوں، ۱۲ بیڑوں اور وسکی کے ادّھے کے بغیر۔ اسی لیے میں کتابوں پر تبصرے نہیں کرتا۔ مگر خیر ——

آپ کا دوست

ساقی فاروقی

سوچ نگر (مجموعۂ کلام)

مصنف :- حسن عابد

قیمت :- بارہ روپے

ناشر :- کاروان پبلی کیشنز — ۹/۱۶۶ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی۔

"سوچ نگر" ایک کم معروف شاعر کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جو موجودہ جدیدیت زدہ ادبی ماحول کا بیباک ردِّعمل دکھائی دیتا ہے۔ اظہار کے لحاظ سے اس ادبی ماحول میں دو رنگ نمایاں ہیں۔ پہلا رنگ وہ ہے جس کی نمود اب سے رُبع صدی قبل یگانہ، میرا جی اور فراق جیسے جدیدیت نواز شعرا کے جلو میں ہوئی۔ یہ رنگ ماضی سے وابستہ تر و تازہ، تلاش پسند رنگ تھا جو ابلاغ کو اہمیت دیتا تھا اور جس نے بدلتے ہوئے معاشرتی، تجرباتی اور فکری عوامل کو جزوِ فن بنایا تھا۔ اسے کامیابی بھی ہوئی، ناکامی بھی ہوئی، تاہم قاری سے اس کی قربت قائم رہی اور دونوں ایک دوسرے کی مہک سے محروم نہیں ہوتے۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس رنگ میں معیار کے لحاظ سے اضافہ اور مقدار کے لحاظ سے کمی آتی گئی۔ جو نیا رنگ پیدا ہوا اس میں جدیدیت کا شور و غوغا بڑھ گیا لیکن نیا تخلیقی تجربہ کم ہو گیا۔ ذاتی، بے ستوں، ابلاغ کی پیاسی علامتوں، استعاروں اور اظہاری لبادوں کی ایک بھیڑ جمع ہو گئی جس میں نشستِ معنی کا لحاظ کم ہے، نئے احساس اور نئے معاشرتی و تہذیبی منظر کو شعری روپ دینے کی کوشش کم کم ہے اور نئے تجربے کو شعور میں محو کر کے نئی بات پیدا کرنے کی صلاحیت کم کم ہے۔ یہ ایک سنہری موقع تھا جو اس عہد کے شاعر کو میسر آ گیا تھا۔ یا تو میر صاحب کے زمانے میں ایک نیا تہذیبی منظر ابھرا تھا (تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی) یا ایک تہذیبی منظر وہ اجاگر ہوا تھا جس نے اکبر کو پیدا کیا۔ یا اب اس عہد کو میسر ہوا ہے کہ وصال کی صورتیں بھی نئی ہیں اور محرومیوں کی شکلیں بھی مختلف ہیں۔ لیکن حال یہ ہے کہ چکا چوند والا عالم کمیاب ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی دیر کے لیے جگنوؤں کا سماں دکھائی دے جاتا ہے۔ سارا زور لفظ اور اظہار کی ترتیب نو پہ ہے۔ ہر دس پانچ سال کے بعد جدیدیوں کی ایک نئی کھیپ سامنے آ جاتی ہے۔ گویا جدیدیت کو سِن کے ساتھ مناسبت دے دی گئی ہے اور اس بات کو بھلا دیا گیا ہے کہ ماضی کے بہت سے شاعر اب بھی جدید ہیں اور اس زمانے کے بہت سے شاعر (نام نہاد جدید شاعر) خیال، احساس، تجربہ اور اظہار کے لحاظ سے خاصے قدیم ہیں۔ جس طرح تخلیقی تجربے سے عاری محض "کلامِ موزوں" کے بل پر پہلے اکثر "ناشاعر" شاعر بن جاتے تھے، اسی طرح جدیدیت کے مدعی اکثر لوگ نہ جدید ہیں نہ قدیم ہیں بلکہ "ناشاعر" ہیں۔

ان لوگوں نے ادبی ابلاغ کو محدود کیا ہے، ادب اور ادبی رسائل کو محدود تر کیا ہے اور ادب کے قاری کو ادب سے دور کر دیا ہے۔ متذکرہ بالا پہلے رنگ کے مقابلے میں اب اس دوسرے رنگ کے شعرا کی تعداد بڑھ گئی ہے جس سے ناگوار یکسانیت میں اضافہ ہوا ہے، علم و تجربہ کا معیار گر گیا ہے اور ادب کم مایہ ہو گیا ہے۔ بے مایہ اس لیے نہیں ہوا کہ اول الذکر طبقے نے ادب کو زندہ رکھنے کی جو کوشش جاری رکھی تھی، ہنوز جاری ہے۔

اردو ادب کی اس جلتی بجھتی فضا میں حسن عابد کا "سوچ نگر" کوئی بہت بڑا شعری کارنامہ نہیں ہے لیکن اس میں ایسے تازہ جھونکوں کی لطافت رچی ہوئی ہے جو بھولے بسرے خوشگوار ماضی کی طرح پُرلطف ہیں۔ "یہ تازہ وارِدانِ بساط ہوائے دل" زندگی کی ہماہمی حقیقت کی مہکار اور انسانی دھڑکنوں کو خود میں بسائے ہوتے ہیں۔ آواز یہاں صدا بصحرا، بے وقار اور بے سماعت نہیں ہے۔ ایک سلسلہ کلام ہے کہ جاری و ساری ہے۔ کلام اور اندازِ کلام غیر مبہم ہے مگر عمومی نہیں ہے۔ اس میں انسان کا کرب اور اس کے ادکان ہم آواز ہیں۔ وہ خود غرضی جو خود کو قبل از وقت نمایاں کرنے کی خاطر ابلاغ، قاری، زمانہ اور فن سب سے برگشتہ بنا دیتی ہے۔ شاعر میں پیدا نہیں ہوئی۔ انہوں نے

تجربوں اور جذبوں سے کچھ سیکھا ہے، کچھ اخذ کیا ہے، کچھ کہا ہے۔ اس کہنے کا تعلق صرف ان کی ذات سے نہیں ہے، ان کے دوستوں اور گلی کوچوں میں بسنے والوں سے بھی ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں خود سے یا محدود دائرے والوں سے نہیں کہتے، تمام ماحول کو اس گفتگو میں شریک کر لیتے ہیں۔ ان کا یہ تخلیقی رویہ اُس توانا، نیم کلاسیکی، تر و تازہ، ماضی سے وابستہ رنگِ سخن کا احیا۔ کرتا ہے جس نے ادب اور زندگی کو بہت کچھ دیا ہے۔

رسمی نظموں اور غزلوں سے قطع نظر کر ایسے مندرجات کو آئندہ شامل مجموعہ نہ ہونا چاہیئے۔ رومان سے حقیقت تک کا جو مختصر سفر اس مجموعے میں طے کیا گیا ہے وہ اگلی منزلوں کا غماز ہے اور حسب ذیل اشعار سے ترتیب وار نمایاں ہو جاتا ہے۔

لالہ بدن و مثالِ سفیرانِ بحر سے — بھیگے ہوئے پڑے ہیں کنول ساحلوں کے پاس

شہر میں شور ہے اُس شوخ کے آجانے کا — ہر کوئی روپ بھرے پھرتا ہے دیوانے کا

جس نے ہلکان کیا تھا کبھی ہم دونوں کو — دِل میں اب وہ ہوسِ دردِ محبت بھی نہیں

حقیقتوں اور جذبوں کے اِتصال کو اپنے لہجے اپنی لَے میں آواز کا روپ دینے کا مرحلہ بہت جان لیوا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ حسن عابد نے ابھی طے نہیں کیا لیکن وہ اُس تک پہنچ گئے ہیں اور یہ بڑی بات ہے :-

جو روز لاکے مِرے گھر پہ ڈالتا ہے مجھے — وہ راستہ بھی شکستہ بدن ملا ہے یہاں

سماعتیں بھی ہوئیں بدگمانیوں کی اسیر — عجب ہیں درد کے قصے مگر سنائیں کیا

"سرج نگر" حیران نہیں کرتا، ادب کی ٹھہری ہوئی سطح پر لہریں پیدا کرتا ہے۔ اس کی اشاعت سے کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ادب کو زندگی سے قریب کرنے کی توقعات، قارئین کو گلے لگانے کی توقعات، جدیدیت برائے جدیدیت کو بے نقاب کرنے کی توقعات اور اظہار کو بامعنی بنانے کی توقعات۔

ڈاکٹر ظہیر فتحپوری

۲+۲=۵

مصنف: شمیم احمد

قیمت: ۵۰ روپے

ناشر: قلات پبلشرز، کوئٹہ

فراق گورکھپوری، محمد حسن عسکری، سلیم احمد ہمارے ذہین اور چونکانے والے نقاد ہیں۔ شمیم احمد بھی اسی فہرست میں آتے ہیں۔ ان میں بھی وہ خوبیاں یا خامیاں ہیں جو تنقیدی محاذوں کے نتیجے میں پڑھنے والے کو محسوس ہو سکتی ہیں یا ہوتی ہیں۔ "۲+۲=۵" بھی رسل کے غیر اقلیدسی ہندسے اور الجبرا کا چونکانے والا مفروضہ ہے۔

ایلیٹ کی طرح شمیم احمد بھی تنقیدی READJUSTMENTS کے قائل اور عامل معلوم ہوتے ہیں۔ READJUSTMENT میں نئے فنکاروں کا انکشاف، گمنام جوہروں کی تلاش، مسلّمہ عظمتوں سے انحراف اور کہیں کہیں انتہاؤں کے مابین توازن قائم کرنے کی کوشش سب کچھ شامل ہے۔ شمیم احمد

نہ جھکنے والے دائیں بازو کے آدمی ہیں۔ ترقی پسند تحریک اور اس کے لکھنے والوں کے مزعومات سے انہیں چڑ کی حد تک اکراہ محسوس ہوتا ہے۔ ایک مثال پاکستانی کلچر کی دریافت کا مسئلہ ہے۔ جسے 'کلچر — ایک سوال' میں طے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین بٹالوی سے یہ توقع بعید از قیاس تھی کہ وہ پاکستانی کلچر کی تلاش بدھ آرٹ میں کرنے پر زور دیں گے۔ ڈاکٹر بٹالوی کا نظریہ ظاہر ہے کہ محض تاریخی قدامت کے تصوّر پر مبنی ہے اور صرف اس حد تک صحیح ہے کہ پاکستانی تہذیب کا یہ بھی ایک کمپونَنٹ رہا ہے اور اب بھی ہے لیکن بالکل مدہم، غیر متعلق اور خالص زمانی + شمیم احمد صاحب کی تحریروں کے مطالعے کے بعد فوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ ان کا خاص موضوع ادب اور تنقید اور تخلیق سے زیادہ کلچر اور پاکستانی کلچر ہے۔ مغرب میں مختلف گروہوں نے کلچر کی تعریف اور تجزیہ پر لکھا ہے۔ ایک گروہ جس کے سرخیل میتھیو آرنلڈ ہیں، کلچر کو وحشت بربریت اور جہالت سے پاک کرنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے لیے SWEET MESS اور LIGHT کو لازمی عناصر سمجھتا ہے۔ آرنلڈ کو کچھ لوگ PRIG کہتے ہیں یہ سراسر زیادتی ہے۔ آرنلڈ کا کلچر اساسی طور پر رومن کیتھولک فرقہ کا ثمرہ ہے۔ آرنلڈ کے فلسفۂ تہذیب کو اخلاقی عینیت کہا جاتا ہے۔ BE VIRTUOUS! THAT IS GOOD۔ آرنلڈ سے قطع نظر سگمنڈ فرائڈ نے کلچر کو مذہب سے علی الرغم سب سے بڑا اور اہم سماجی عنصر اور قوت بنانے کی کوشش کی ہے۔ فرائڈ کو بآسانی غیر سیاسی ملحد کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا گروہ اشتراکیوں کا ہے جو فرائڈ کے الحاد کو قبول کرتے ہوئے فنونِ لطیفہ کو کلچر کا رکن رکین جانتے ہیں اور اس کو فروغ بھی دے رہے ہیں۔ شمیم احمد کلچر کے لیے باطنی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں جو ظاہر ہے کہ مذہب سے عبارت ہے۔ شمیم احمد نے اس رجحان کی اشاعت کے لیے جرنلسٹ بننا بھی قبول کیا ہے جو خالص ادبی مجلات سے نسبتاً زیادہ اشاعت رکھتے ہیں۔

"۲+۲=۵" تنقیدی انحراف کی علامت ہے۔ مصنف کا لہجہ کہیں تلخ، کہیں طنزیہ، کہیں فہمائش اور کبھی کبھی غلیظ گالی کا ہو جاتا ہے۔ ترقی پسند نقادوں کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"سجاد ظہیر، ڈاکٹر اشرف، سبطِ حسن، ڈاکٹر عبدالعلیم، احتشام حسین سب ایک دوسرے کے والد ہیں۔"

[تخلیق اور تنقید کا صحیح رشتہ]

شمیم احمد کا ایک تنقیدی 'سٹنٹ' غزل پرستی ہے۔ نظم میں انہیں زیادہ سے زیادہ برائیاں نظر آتی ہیں۔ سب وہی جو فراق گورکھپوری (کتاب انہی کے نام معنون ہے) کو نظر آتی ہیں۔

؎ مٹ گئیں نظمیں تو اجزائے تغزّل ہو گئیں

یہ فراق کا مصرع ہے۔ جو نظم کے بارے میں ایک گمراہ کن اور پرورٹ قسم کے خیال کی اشاعت کرتا ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط اور لایعنی ہے کہ صنفِ غزل انتہائی مہذب معاشرے کی تخلیق ہے۔ اور تہذیب کا عطر ہے۔ شمیم احمد لکھتے ہیں:۔

"آج کل کے نوجوان طالب علم اور اردو پر پوری قدرت نہ رکھنے والے افراد کیوں غزل سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ غزل انتہائی مہذب، جذبے اور خیال کے بنیادی تاثر کی سب سے ارتفاع پذیر شکل کا نام ہے"۔ اوّل تو یہ بات ہی درست نہیں کہ فارسی اور اردو غزل تہذیب کے ارتقائی عہد ہی پیدا ہوئیں۔ غزل کا صنفی ارتقاء عربی عجمی اور برصغیر کی زبانوں میں تہذیب یا بربریت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ یہ ایک مہلک منطقی مغالطہ ہے کہ ہم صنفِ غزل کی تہذیب یا بربریت سے تخلیقی تعلق قائم کریں۔ غزل تشبیب کی بازآفرینی ہے اور تشبیب میں ایک قسم کی شعور کی رو چلتی نظر آتی ہے جو غزل کی شکل میں LOWEST EBB پر آگئی۔ عربی اور فارسی کی زبانوں کے کثیر القوافی ہونے کی قوت کا استعمال سب سے زیادہ اور آسانی سے عرب اور عجم کے شاعروں نے کیا۔ مغربی زبانیں قلیل القوافی تھیں اس لیے ان میں نظم کی بجائے غزل قسم کی کسی صنف کا فروغ ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر ناممکن تھا۔ گوئٹے اور جیمز ایلرائے فلیکر کی غزلوں میں ہماری ٹپیکل غزل کی فارم مفقود ہے۔ ان شاعروں کو تو صرف مشرقی تغزل کے انداز اور مٹھاس نے رجھایا تھا۔

جس ادبی حقیقت کی طرف میرا ذہن مائل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ غزل تہذیب کی شاعری ہے اور نظم شاعری کی تہذیب۔ پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری غزل اسلامی فنونِ لطیفہ کا عطرِ عطر ہے۔ خصوصاً موسیقی کا۔ بحیثیت مجموعی میں نہیں سمجھتا کہ غزل صنفی صلاحیتوں کے لحاظ سے کس طرح نظم پر فوقیت رکھتی ہے۔ شمیم احمد غزل کی تہ داری کا ذکر کرتے ہیں۔ غزل کی تہ داری سے مجھے انکار نہیں لیکن یہ خوبی نظم اور خصوصاً ڈرامے میں بھی ملتی ہے، غزل کے پاس اس کا اجارہ نہیں۔ کیا ہماری غزل بحیثیت مجموعی یورپی نظم کے مدِمقابل ہو سکتی ہے؟ تخیل کی وسعت اور پیچیدگی غزل کے بس کی بات نہیں۔ لیکن غزل پھر بھی ایک اچھی اور غیر فانی شاعری کا ظرف ہے اور رہے گی۔

"غزل اور معاملاتِ غزل" میں شمیم احمد صاحب نے کلیم الدین احمد پر بددیانتی کا الزام لگایا ہے۔ شاید جوشِ مخالفت میں انہوں نے متعلقہ سطور نہیں پڑھیں۔ بالواسطہ اور براؤننگ کے حوالہ سے کلیم الدین احمد نے یہ تسلیم کیا ہے کہ نیم وحشی صنفِ شاعری کی اصطلاح انہوں نے جارج سنٹیانا سے لی ہے۔ اس کے علاوہ شمیم احمد صاحب سنٹیانا پر بھی بددیانتی کا الزام لگانے کی طرف مائل ہیں۔ کیونکہ ایک سائنسداں پیپاک PAPAC نے لکھا ہے کہ عقلیت اور سائنس کی ترقی کے زمانے میں شاعری جہالت کی چیز ہے۔ یہاں بھی شمیم احمد صاحب چونک گئے کیونکہ پیپاک نے شاعری کے بارے میں وہی بات کہی ہے جو میکالے نے سبک لیٹن کی تمثیل برتتے ہوئے شاعری کے بارے میں لکھی ہے اور جس کا حوالہ "مقدمہ شعر و شاعری" میں ملتا ہے۔ میکالے اور پیپاک مطلقاً شاعری کے بارے میں بات کر رہے ہیں، صنفِ غزل سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

شاعری کی تخلیق میں ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب یہ فن روحِ مطلق بن کر زبانوں اور قوموں اور ہیئتوں کے اختلاف کو بالکل مٹا دیتا ہے۔ جب ایک خیال سترھویں صدی کے انگریز ڈرامہ نگار شیکسپئر اور اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کے ایک اردو غزل گو شاعر کے ہاں جیسے باہمی مفاہمت بلکہ ہم نشینی کی حالت میں معمولی اختلاف کے ساتھ حیرت انگیز مماثلت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے:

FOR NOTHING IS GOOD OR BAD, BUT THINKING MAKES IT SO,

یہ توہم کا کارخانہ ہے ۔ یاں وہی ہے جو اعتبار کیا (میر)

کیا داخلی تاثریت کا فلسفہ ان سے بہتر لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ (یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ شیکسپئر اور میر دونوں نے گیارہ گیارہ لفظ استعمال کئے ہیں۔) شیکسپئر کی لائن یا لائنوں میں NOTHING اور THINKING کلیدی لفظ ہیں۔ اور میر کے شعر میں توہم کا کارخانہ اور وہی، کے لفظ اساسی ہیں۔ دونوں مثالیں سائنسی معروضیت کی نمائندہ بن گئی ہیں جبکہ اصلاً وہ داخلی تصورات کے پیرائے ہیں۔

"تنقید کی کھڑاؤں" اور "تخلیق اور تنقید کا صحیح رشتہ" دو مضمون اردو تنقید کے اصولی ارتقا پر لکھے گئے ہیں۔ "تنقید کی کھڑاؤں" ایک دلچسپ اور گدگدانے والی تمثیل ہے جسے مصنف نے تاریخِ برصغیر سے لیا ہے اور تنقید پر چسپاں کر دیا ہے۔ اس میں پروفیسر کلیم الدین احمد کو پورا خراجِ تحسین ادا کرنے کے بعد اسے واپس لے لیا گیا ہے جس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ محسوس ہوتا ہے کہ شمیم احمد صاحب کلیم الدین احمد کی خامیوں کا پورا تجزیہ کرنے کی فرصت پا سکت نہ پاتے ہوئے یہ لکھنے پر مائل ہو گئے ہیں کہ وہ تخلیق کا پس منظر واضح کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ الزام غالباً صحیح نہیں ہے کیونکہ کلیم الدین احمد کی تنقید کا ایک اہم بالشان حصہ اسی موضوع پر لکھا گیا ہے اور یہ "اردو تنقید پر ایک نظر" میں نسبتاً زیادہ نمایاں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کلیم الدین نے کوئی مقالہ بعنوان "شعری تخلیق کا پس منظر" نہیں لکھا لیکن تخلیق کے اصول اور مظاہر ان کی تمام کتابوں میں منتشر صورت میں مل جاتے ہیں۔ خود شمیم احمد صاحب کے مقالے "تخلیق و تنقید کا صحیح رشتہ" میں سوائے ترقی پسندوں، حالی، سلیم احمد اور دوسرے نقادوں پر اعتراض یا تخریبی ریمارکس کے کوئی خاص بات نہیں بتائی گئی۔ جو بات بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ تنقید "واردات" کا F. S. R. تیار کرتی ہے، یہ بات دلچسپ ہے لیکن مثالوں کے بغیر کوئی مضمون اچھا نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ شمیم احمد صاحب تنقیدی مقالوں کے بہانے بعض مخالفین کو کوسنے یا گالیاں دینا چاہتے ہیں اور زیرِ تصنیف مضمون کے اساسی تقاضوں کو بھول جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال جمیل الدین عالی ہیں جنہیں وہ بمع ان کے رائٹرز گلڈ کے سخت ناپسند

کرتے ہیں۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ کیا یہ شمیم احمد صاحب کی اصول پرستی، دیانت داری اور غیر معمولی جرأت تو نہیں جو انہیں رائٹرز گلڈ جیسے داہیات ادارے سے متنفر کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی ہے؟

کتاب کو باقاعدہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ادیبوں کے مسائل، مطالعے، ادبی مسائل وغیرہ تنقید ادبی مسائل پر مضامین طویل ہیں اور ان میں منطقی استدلال، عقلی ارتقاء اور فطری روانی ہے۔ یہ ان کے بہترین مضامین ہیں۔ کچھ مختصر مضامین دو قسم کے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مگر اہم موضوعات پر اور 'مطالعے' یعنی بعض فنکاروں حسن عسکری، ابوالفضل صدیقی، جگر، ناصر کاظمی، فرید جاوید، رفیق حسین، قرۃ العین حیدر کی تعینِ قدر سان میں تجزیہ کی قوت ہے اور مثالیں بہم پہنچانے کی صلاحیت۔ مثلاً فرید جاوید جیسے منقبض اور مختل الافعال شاعر کا ذاتی تعارف اور ملاقاتیں دلچسپ ہیں مگر مثالیہ اشعار کا کسی اور شاعر سے تقابل نہیں کیا گیا جس سے تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی کا مطالعہ اس ضمن میں بہتر چیز ہے۔ ابوالفضل صدیقی کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں۔ شاید انہوں نے قاضی عبدالستار اور محمد علی ردولوی کے افسانوں کو ہمدردی کے ساتھ نہیں پڑھا ورنہ ابوالفضل صدیقی کی اتنی تعریف نہ کرتے۔ تینوں افسانہ نگاروں کے ہاں سیٹنگ یو۔پی کے جاگیردارانہ نظام کی شکست و ریخت ہے۔

شمیم احمد میں اپنے استادِ معنوی فراقؔ کی سی تاثریت اور شعریت نہیں البتہ فراق کی نکتہ وری انہوں نے ضرور حاصل کی ہے۔ تو اس طرح ان کے مضامین میں تعارف، تجزیہ، مطالعہ، استدراک، تاثریت، استخراج، انکشاف (تحقیق کے معنوں میں) مثلاً اردو غزل میں محبوب کے لیے صیغۂ مذکر کا پس منظر، فارسی زبان میں مونث صیغہ کا موجود نہ ہونا "۲+۲=۵" ایک امکان ہے اور "۲+۲=۵" شمیم احمد صاحب کی نظر میں آنے والے ادبی امکانات کا جائزہ ہے۔ ذہین نوجوان ادیب اور شاعر کو اس تیز کتاب میں بہت کچھ ملے گا۔ READJUSTMENT کی کئی مثالیں تنقیدی تحقیق کے نمونے، عبارت کا حسن تسلسل، تشریح کی عمدہ مثالیں، جدید اردو تنقید میں گرانقدر اضافہ ہیں جو ہمیں مصنف کے دوسرے مجموعے کی اشاعت کا منتظر بناتے ہیں۔

جابر علی سیّد

تیس پروانے شمعِ رسالتؐ کے

مصنف :۔ طالب الہاشمی

ضخامت :۔ ۵۱۰ صفحات

قیمت مجلد :۔ چالیس روپے

ناشر :۔ مکتبہ چراغ اسلام۔ ۴۰ بی۔ اردو بازار لاہور

یہ کتاب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات بابرکات کا صاف ستھرا مجموعہ ہے جسے طالب ہاشمی صاحب کے شگفتہ قلم نے اردو کتابوں سے نہیں بلکہ عربی کی اصل کتابوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ واقعات کے انتخاب اور پیش کش میں خاصی محنت کی گئی ہے۔ اسلوب نگارش اتنا عمدہ، ایسا دلکش اور عام فہم ہے کہ خواندہ نہایت دلچسپی سے پڑھتا چلا جاتا ہے اور کہیں اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

ویسے تو تمام صحابی شمع رسالت کے پروانے تھے اور ان کے حالات سے بھی پڑھا لکھا طبقہ ناواقف نہیں، مگر جن تیس خوش نصیبوں کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے، ان میں حضرت زیدؓ بن حارثہ محبوب رسولؐ کے لقب سے ملقب تھے، حضرت زبیرؓ بن العوام حواری رسولؐ، حضرت ابو ذر غفاریؓ خلیل رسولؐ، حضرت ابن ام عبدؓ فقیہ الامت، حضرت حذیفہؓ بن الیمان صاحب السر، حضرت خبابؓ بن الارت سادس الاسلام کہلاتے تھے۔ حضرت صہیبؓ رومی کو نعم العبد، حضرت سعدؓ بن معاذ کو صدیق انصار، حضرت ابو ایوبؓ انصاری کو میزبان رسولؐ، حضرت خبیبؓ انصاری

کو بلیغ الارض، حضرت اسیدؓ بن حضیر اشہلی کو نعم الرجل، حضرت ضرارؓ بن ازور اسدی کو ضیغم اسلام، حضرت صخرؓ بن حرب کو سپہ سالار قریش، حضرت سہیلؓ بن عمرو کو خطیب قریش، حضرت ثابتؓ بن قیس انصاری کو خطیب رسول اللہؐ حضرت عمیرؓ بن سعد کو یکتائے زمانہ، حضرت ابوقتادہ حارثؓ بن ربعی کو فارس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ باقی صحابہ بھی بڑے پائے کے ہیں۔ ان سب کے ایمان افروز اور قابل تقلید سوانح حیات ہمارے فکر و ذہن اور اخلاق سنوارنے میں بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حین حیات میں اور ان کے وصال کے بعد ان مقدس صحابہ کرام نے دین اسلام کی جس خلوص اور درد مندی سے خدمت اور حفاظت کی، اس کا اعتراف ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ طالب ہاشمی صاحب نے ان کے پاکیزہ حالات نہایت تحقیق و تفحص اور احتیاط سے لکھ کر ہمارے ایمان کی تازگی کا سامان پیدا کیا ہے۔ اس بے راہ روی کے دور میں جب لوگ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، ایسی شمع دکھانے کی بے حد ضرورت تھی، جس کی روشنی نور نبوت سے چھن چھن کر آ رہی ہو۔ کتاب شروع سے آخر تک افادیت اور سبق آموزی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس میں عبادات و معاملات، حکمت و موعظت اور سرفروشی و جاں نثاری کے واقعات ایسے پیارے اور مؤثر انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ پڑھتے ہی دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

محمد عبداللہ قریشی

جہلم سے عرفات تک

مصنف: شمس کاشمیری

قیمت مجلد: اٹھارہ روپے

ناشر: چناب اکیڈمی۔ ۱۰۴ مرغزار کالونی گجرات

ملنے کا پتہ: مکتبہ فانوس۔ ۳۲ گوردوارجن نگر۔ لاہور۔ ۷

اردو ادب میں اچھے سفرنامے بہت کم ہیں۔ جو موجود ہیں، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یوسف خاں کمبل پوش کے سفر کی کہانی "عجائبات فرنگ"، سرسید کا مسافران لندن، مولانا شبلی کے سفر شام و مصر کی داستان، سید سلیمان ندوی کی سیر افغانستان اور برید فرنگ، سر شیخ عبدالقادر اور مولوی محبوب عالم کے سفرناموں کے علاوہ محمود نظامی کی کتاب نظر نامہ، جی الانہ صاحب کی دیس بدیس، بریگیڈیئر گلزار کا تذکرۂ انگلستان و افریقہ، کرنل محمد خان کی کتاب بسلامت روی اور حکیم محمد سعید دہلوی کی بھی دو ایک کتابیں دکھائی دیتی ہیں، جن میں سیر جرمنی خاصی ضخیم ہے۔ ابن انشاء کی دلچسپ سفری یادداشتیں اور جمیل الدین عالی کی "دنیا مرے آگے" اور "تماشا مرے آگے" بھی خوب ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، محمد خالد اختر اور سید محمد کاظم نے اپنے سفرناموں کے لیے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اب یہ سفرنامے صنف ادب میں شمار ہونے لگے ہیں۔ عورتوں میں قرۃ العین حیدر کی سفری رپورتاژ خصوصاً "ستمبر کا چاند" بیگم اختر ریاض الدین کے سفرنامے "سات سمندر پار" اور "دھنک پر قدم" دلچسپ بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔

بعض لوگوں نے اپنے سفر حج کے تاثرات بھی قلم بند کیے ہیں، جو نثر میں بھی ہیں اور نظم میں بھی۔ اس قسم کے بیسیوں سفرنامے مل جاتے ہیں۔ زیادہ تر تو محض روزنامچہ، رہنما یا گائیڈ کا کام دیتے ہیں اور کچھ حج کی کیفیات سے لبریز ہیں اور واقعی پڑھنے کے قابل ہیں، جیسے الیاس برنی کا مراط الحمید، ممتاز مفتی کا لبیک اور عبداللہ ملک کا حدیث دل وغیرہ یا پھر زیر نظر کتاب "جہلم سے عرفات تک"

جناب شمس کاشمیری نے جہلم سے عرفات تک کی سفری روداد بلا کم و کاست پوری دیانت داری سے سپرد قلم کی ہے۔ یہ سفر دو مرتبہ خشکی کے راستے افغانستان، ایران، عراق، شام، اردن اور ترکی کی سرحدوں سے گزر کر سعودی عرب پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ یہی سفر نگار کی منزل مقصود ہے۔

یہ منزل سفر کے مختلف مناظر کو ایک ایسی یکجائی مہیا کرتی ہے کہ تمام مناظر ایک ہی منظر میں ضم ہو کر ایک منظرِ عظیم کے پرتو محض بنتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ جس راستے اور جن ممالک سے گزر کر سفر نگار اپنے مقصود سے ہم آغوش ہوا، وہ تمام ممالک ہادیٔ برحق صلعم کے پیروؤں اور ایک اللہ کے اَن گنت بندوں کی بستیاں ہیں۔ ان بستیوں کی تمام پہچانیں اپنی اپنی جگہ الگ سہی مگر وادیٔ عرفات میں ان تمام پہچانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا دیکھ کر جو احساس ابھرتا ہے وہ اس سفر کی روئداد کے پہلے چھ ابواب میں خون کی طرح گرداں نظر آتا ہے۔ مگر یہ تمام جذباتی فضا شمس کاشمیری کی نگاہ سے وہ تنقیدی حس سلب نہیں کر پاتی، جو ایک فن کار ہونے کے ناتے ان کا شیوہ رہنا چاہیئے۔ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور وہ تمام خامیاں اور خرابیاں بھی صفحۂ قرطاس پر محفوظ کرتے جاتے ہیں جو ان مسلم اقوام کا لازمی جزو بن چکی ہیں۔ وہ ان خامیوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جھنجھلا کر کہہ اٹھتا ہے کہ آخر یہ سب خرابیاں کب ختم ہوں گی اور ہم اس قعرِ مذلت سے کب اُبھریں گے؟

وہی شمس کاشمیری جو ان تمام مقامات سے ایک کھرے اور کھرُے پاکستانی کی حیثیت سے گزرتے اور اپنی پہچان کو دوسری پہچان کی آغوش میں ڈھلتے دیکھنا پسند نہیں کرتے، ارضِ مقدس پر پہنچتے ہی یوں پگھل جاتے ہیں کہ وہ ملّتِ اسلامیہ کے ایک ادنیٰ رکن کے سوا کچھ اور نہیں رہ جاتے، احرام باندھتے ہی تمام پہچانیں ختم ہو جاتی ہیں اور ایک پہچان میں ڈھل جاتی ہیں۔ مناسکِ حج کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ تمام دُنیا کے باشندے ایک مرکز پر جمع ہو کر یکساں لباس و ماحول میں اپنے خدا کی عبادت کریں اور اپنے جملہ دینی و دنیوی فلاح و بہبود کے ذرائع سوچیں۔ ایسے مقدس موقع اور ایسے مقدّس مقام پر اس عظیم الشان مذہبی برادری کا ایک رکن بن کر، جو روئے زمین کے چاروں کونوں سے کھنچ کر یہاں جمع ہوتی ہے، سب کے ساتھ انتہائی خشوع و خضوع سے خدا کی تقدیس و تسبیح میں مشغول ہونے سے انسان کے دل و دماغ پر اسلام کی صداقت کا جو نقش مرتسم ہوتا ہے اور قلبِ انسانی پر جو روحانی کیفیات وارد ہو سکتی ہیں، ان کا صحیح لُطف توجہ میں شریک ہو کر ہی انسان اٹھا سکتا ہے۔ دیگر فوائد سے قطع نظر اسلام کے گہوارے کو، جہاں کا ذرّہ ذرّہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان مسلسل و گوناگوں مصیبتوں کا شاہد ہے، جو آپ نے بنی نوعِ انسان کے گم کردہ راہ قافلے کو راہِ راست پر لانے میں برداشت کیں، اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں اور اس مقدس سرزمین پر چلنے پھرنے میں قربانیوں اور ایثار کے اسی مبارک زمانے کا لُطف آ جاتا ہے اور روح اس نور سے معمور ہو جاتی ہے، جس نے تمام روئے زمین کو منوّر کر دیا۔

جو کتاب اپنے خوانندگان کے ذہن و دل پر وہی اثرات مرتب کر دے جو خود اس پر وارد ہوتے تھے، تو مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک کامیاب کتاب ہے چاہے نقادانِ فن اسے ادب قرار دیں یا نہ دیں۔ اسے ادبِ عالیہ میں شمار کریں یا نہ کریں۔ کتاب "جہلم سے عرفات تک" دلچسپ بھی ہے، معلومات افزا بھی اور سبق آموز بھی۔ حالاتِ سفر اور معلوماتِ تمدّن و معاشرتِ ممالکِ اسلامیہ سے قطع نظر ہر روشن خیال اور متجسس شخص اس کتاب کو جو حج و ضرورتِ حج، مناسکِ حج اور زیارتِ روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک چشم دید جیتی جاگتی تصویر ہے، قدر کی نگاہ سے دیکھے گا۔ میرے نزدیک تاثیر ہی کسی تحریر یا تقریر کو فن ٹھہراتی ہے۔ مَیں تو صرف یہ کہوں گا کہ اس کتاب نے مجھے متاثر کیا ہے۔ تاثیر اور متاثر کا مادہ ایک ہی ہے اور وہ اثر ہے، جس کی اس کتاب میں کوئی کمی نہیں۔

محمد عبداللہ قریشی

وصال (مجموعۂ کلام)

مصنف:۔ ناصر زیدی | قیمت:۔ بارہ روپے | ناشر:۔ سنگِ میل پبلی کیشنز، چوک اردو بازار، لاہور

زیرِ تبصرہ کتاب ناصر زیدی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو "وصال" کے نام سے شائع ہُوا ہے، اِس سے پہلے اُن کی غزلوں کا ایک مجموعہ "ڈوبتے چاند کا منظر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

ناصر زیدی کی اپنی پہچان غزل کے حوالے سے ہوتی ہے اور غزل میں اُن کے ہاں فراق و وصل کے استعارے گوشت پوست کے پیکر

محبوب یا اپنے جسم و جان سے ہی عبارت ہیں اس لیے اس کی غزل میں ابھی یہ استعارے وُسعت، گہرائی اور گیرائی کی منزلِ فکر و فن کی تلاش میں ہیں ؎

جس میں نویدِ صبح تھی اُس کی تلاش ہے مجھے　　جانے کہاں چلی گئی میری دُعائے نیم شب

وہ تیری چشمِ فسوں ساز تھی کہ موجِ کرم　　وہیں وہیں پہ میں ڈوبا جہاں جہاں ٹھہری

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب عشق کیا کرتے تھے　　ہم جسے چاہتے تھے چوم لیا کرتے تھے

صحرائے عاشقی سے ملے گا کوئی گہر!　　ناصر، یہاں کسی بھی سمندر میں کچھ نہیں

دِل کی گہری ندی میں جو ڈُوبا　　وہ کبھی سطحِ آب پر نہ ملا

ناصر زیدی بُنیادی طور پر حسن پرست اور جمال دوست شاعر ہے جو مظاہرِ فطرت کو راہبر و ہمسفر بنا کر حسن کا رشتہ خیر اور صداقت سے جوڑنا چاہتا ہے۔ یہ ایک حسین راستہ ہی نہیں ایک طویل راستہ بھی ہے۔ ناصر زیدی نے ابھی اس حسین اور طویل راستے پر فراق و وصال کے دو ہی مرحلے طے کیے ہیں۔ حسن، خیر اور صداقت کی یہ تکوین ایک تثلیث ہی نہیں ایک مسلک بھی ہے اور اس مسلک میں اُس وقت تک معنی آفرینی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس کا رشتہ زندگی اور زندگی کے ہزار گونہ مسائل و افکار سے جوڑ کر اس کی کوئی پائیدار نظریاتی اساس مرتب و فراہم نہ کی جائے اور ناصر زیدی اس نظریاتی اساس کے جھمیلے میں پڑے بغیر صرف فراق و وصال کے سہارے ہی ساری منزلیں طے کرنا چاہتا ہے۔ فطرت کی رہنمائی اور شراکت بجا مگر بے زبان فطرت کا سب سے بڑا محاورہ انسان ہی ہے اور "تو شب آفریدی، چراغ آفریدم" کا مفہوم سمجھے بغیر حسن، خیر اور صداقت کو یکجا کر کے ان میں زندگی کی معنویت و بلاغت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ حسن، خیر اور صداقت کی تثلیث میں فکر و فن کی چوتھی سطح کا اضافہ اُس وقت کیا جاسکتا ہے جب حسن، خیر اور صداقت کا لازوال رشتہ انسانیت سے بھی قائم و دائم رکھا جائے۔ ہر چند ناصر یہی کہنے پر مُصر ہے کہ ؎

اگر تم ہی نہ ہو شعروں کا محور　　مرا کیا واسطہ پھر شاعری سے

وہ اور ہوں گے جن کو ہے زعمِ سخنوری　　ناصر! میں نغمہ گر کے سوا اور کچھ نہیں

تاہم وہ فکر و فن کا دریچہ کھول کر کبھی کبھی بیرون بینی کا ثبوت بھی دیتا ہے اور اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کے چہرے سے یُوں نقاب اٹھاتا ہے کہ اُس کی ذات کا حوالہ کائنات کے بعض خیال انگیز حقائق کا اشاریہ بن جاتا ہے ؎

اِس دَورِ کم سواد میں کیسی نمودِ فن　　مقصد حصُولِ زر کے سِوا اور کچھ نہیں

وہ ایک ہم کہ ہمیں موسموں نے کچھ نہ دیا　　کسی کی دھوپ ہوئی اور کسی کے سائے ہوئے

ہمت کوہ شکن ہے مجھ میں　　پھر بھی صدیوں کی تھکن ہے مجھ میں

سب کے غم میں ہوں برابر کا شریک ساری دُنیا کی دُکھن ہے مجھ میں
یُونہی رَوشن تو نہیں شامِ وصال! کوئی مہتاب کرن ہے مجھ میں

ناصر زیدی نے جمالِ محبوب اور حسنِ فطرت سے اپنی غزل کے استعارے چُن کر فراق و وصال کی کشمکش، دوریوں اور یکجائیوں سے مجوبۂ غزل کے نین نقش ابھارنے کی دلآویز کوشش کی ہے۔ ناصر کی ذات میں لَو دیتی ہوئی 'مہتاب کرن' جب کائنات کے اُفق سے ابھرتے ہوئے سورج کے استقبال کو آگے بڑھے گی تو چاند اور سورج کے وصال سے اُس کے شاعری میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوگا۔

جمیل ملک

سینۂ سنگ پہ ریشم کا رستہ (سفرنامہ)

مصنف :- مسعود سلطان بکھیر

قیمت :- ۳۵ روپے

پبلشر :- جودت پبلی کیشنز شالامار ٹاؤن لاہور۔ ۹

بعض لوگ سفر کرتے ہوئے سفرنامہ لکھتے ہیں۔ بعض سفر کرنے کے بعد گھر پہنچ کر سفرنامے کا آغاز کرتے ہیں۔ بعض سفرنامہ لکھنے کے لیے سفر اختیار کرتے ہیں اور بعض سفر کیے بغیر سفرنامہ لکھتے ہیں۔ سفر کے بغیر گھر بیٹھ کر یا لائبریری میں بیٹھ کر سفرنامہ لکھنے کا رواج حال ہی میں پڑا ہے۔ سفرنامہ لکھنے کا یہ جدید طریقہ ہمارے سامنے ایجاد ہوا۔ ہم نے ایک صاحب کو دیکھا کہ سپین کا سفرنامہ لکھ کر اُس کے عنوان کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں اور دوستوں سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ عنوان کیسا ہونا چاہیئے۔ ہم نے سفرنامہ پڑھا تو متاثر ہوئے کیونکہ ہسپانیہ کے ماضی کا ذکر تھا اور ہسپانیہ کے ماضی سے کون متاثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت ہم بہت خوش ہوئے جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اُن صاحب نے یہ سفرنامہ گھر بیٹھ کر یعنی ہسپانیہ کے سفر کی پریشانی اٹھائے بغیر لکھا ہے۔ کیونکہ اس طرح سے وہ صاحب پاسپورٹ بنوانے، پھر ویزا لگوانے، کرائے کا بندوبست کرنے اور پردیس میں جاکر در در کی ٹھوکریں کھانے کی مصیبت سے بچ گئے تھے۔ چنانچہ ہم نے بھی فیصلہ کر رکھا ہے کہ برما اور لنکا کا ایک سفرنامہ گھر بیٹھ کر لکھیں گے۔ دو ایک کتابیں پڑھیں گے، وہاں سے آئے ہوئے دوستوں سے معلومات حاصل کریں گے اور کتاب لکھ کر پبلشر کے حوالے کر دیں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سفرناموں کی ایک تکنیک "ریڈرز ڈائجسٹ" نے متعارف کروائی تھی اور وہ تھی "آرم چیئر ٹریولاگ" یعنی آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر کسی ان دیکھے ملک کا ایسا سفرنامہ لکھنا کہ پڑھنے والے کو ایسا لگے کہ لکھنے والے نے اُس ملک کے چپے چپے کی خاک چھانی ہے۔ آج کل کچھ سفرناموں کی کتابیں "آرم چیئر ٹریولاگ" ہیں اور کچھ ایسی کہ ایئرپورٹ سے اُتر کر ہوٹل میں گئے۔ شام کو جس تنظیم نے بلایا ہے اس کے اجلاس میں شرکت کی۔ دوسرے روز تھیٹر دیکھا۔ شاپنگ پلازا میں نوادرات خریدے۔ ڈاک خانے میں جاکر دوستوں کو کارڈ لکھ کر پوسٹ کیے اور وہاں سے واپس ایئرپورٹ پہنچے۔ جہاز پکڑا اور اپنے وطن واپس آ گئے اور آتے ہی ایک عدد سفرنامہ لکھ کر پبلشر کے حوالے کر دیا۔

ایسے سفرنامے خواہ ہانگ کانگ کے ہوں خواہ آسٹریا اور ہنگری کے، آپ پڑھتے وقت یہی محسوس کریں گے کہ ایک ہی ملک کی سیر کر رہے ہیں۔ کیونکہ ایئرپورٹ شاپنگ پلازا، تھیٹر ہاؤس اور اجلاس تقریباً ہر ملک کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔

لیکن "سینۂ سنگ پہ ریشم کا راستہ" کا سفرنامہ مسعود سلطان نے پاؤں پیدل چل کر لکھا ہے۔ ہر چند کہ وہ ایک عدد کار بھی ساتھ لے گئے تھے مگر حسنِ اتفاق سے اس کار کو بھی پیدل چلنے کا شوق تھا اور وہ ہمیں اس سفرنامے کے صفحات پر جگہ جگہ پیدل چلتی دکھائی دیتی ہے۔ مسعود سلطان جتنے مزے کے آدمی ہیں سفرنامہ بھی انہوں نے اتنے ہی مزے سے لکھا ہے۔ وہ گھر بیٹھ کر بھی یہ سفرنامہ لکھ سکتے تھے اور ہم نے انہیں مشورہ بھی دیا تھا کہ اپنی

بطوطہ کی طرح مارو مارے پھرنے کا زمانہ چلا گیا ہے، اب انہیں بڑے آرام سے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر جس ملک کا چاہیں سفرنامہ لکھنا چاہیے اور پھر پاکستان کے سفرنامے کون لکھتا ہے۔

لیکن چونکہ وہ اور جبل آدمی ہیں لہذا انہوں نے ہمارا مشورہ قبول نہ کیا اور رانی نامی نیلی کار سے کر کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کرتے، کیمرہ کندھے سے لٹکائے، سینہ سنگ پر رواں ہو گئے۔ اور یہ عزم لے کر چلے کہ پاکستان دُنیا کا دوسرا خوبصورت ملک ہے۔ اس کی وادیاں جنت نگاہ ہیں اور شاہراہ ریشم، پاک چین دوستی اور ہمارے جیالے فوجی جوانوں کا بے مثال کارنامہ ہے۔ اور وہ پاک فوج کے اُن بہادر جوانوں کی داستانیں بھی لوگوں کے لیے اپنے ساتھ لائیں گے جنہوں نے اس عظیم شاہراہ کی تعمیر میں شہادت پائی۔

چنانچہ مسعود سلطان صاحب جب وادیٔ گلگت کے دشوار گذار اور طول طویل سفر سے واپس آئے تو پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ہم نے یہی سمجھا کہ ابن بطوطہ ہمارے گھر ہم سے ملنے آ گیا ہے۔ اب انہوں نے سفرنامہ لکھنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اپنے شالامار والے مکان میں سربند ہو گئے۔ تین مہینوں کے بعد ملے تو سفرنامہ "سینہ سنگ پہ ریشم کا راستہ" کا مسودہ ان کی بغل میں تھا۔ مسودہ ہم نے پڑھا۔ ایک دستاویز تھی وطن پاک کے کوہ و کمر کی دلکشیوں اور دل نوازیوں کی۔ کہیں آبشاروں کا ترنم تھا۔ کہیں خوبانیوں کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ کہیں غریب لوگوں کے بوسیدہ مکان تھے جو ساری زندگی باسی خوبانیاں اور چشمے کا پانی پی کر بسر کر دیتے ہیں۔ پاک فوج کے اُن جیالے شہیدوں کا ذکر تھا جنہوں نے وطن پاک کی اس عظیم شاہراہ کی تعمیر میں اپنی جانیں نثار کر دیں۔ ہر صفحے پر ایک نیا اور اوریجنل رنگ تھا۔ بے ساختگی اور وارفتگی تھی۔ جذبے اور لگن کی سچائی تھی۔ فن اور تکنیک کی بھول بھلیوں کا ایک بھی چکر نہیں تھا۔ ایک سیدھی اور صاف چھوٹی سی خوبصورت بھولی بھالی سڑک تھی جس کی ایک جانب خوبانیوں اور شہتوت کے درخت تھے، بادشاہوں کے محل تھے اور دوسری جانب شاہراہ ریشم تھی ــــ ہمارے وطن پاک کی ترقی و خوشحالی کی نئی کرن جس کی روشنی میں ہمت اور یک جہتی اور اتفاق کے ساتھ جد و جہد کر کے ہم اپنی ناداری اور مفلسی کے داغ دھبے دُور کر سکتے ہیں۔

مسعود صاحب بھی سفرنامے میں یہی لکھتے ہیں کہ ہمارے پاک وطن میں حسن فطرت کے ساتھ ساتھ بے پناہ وسائل بھی ہیں جنہیں بروئے کار لا کر ہم دُنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ سفرنامہ اسی جذبہ حُبِ وطن کے ساتھ لکھا ہے اور اہل وطن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی دُوربینوں کا رُخ آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کی طرف سے ہٹا کر پاکستان کی خوبصورت دلکش وادیوں کی طرف کر دیا ہے تاکہ ہم دوسروں کے سنہری تاج دیکھنے کی بجائے اپنے قدموں میں بکھرے ہوئے لعل و گُہر کو بھی دیکھیں، پہچانیں اور پھر دوسروں کے آگے فخر سے گردن بلند کر سکیں۔

سرورق ایسا دلکش ہے کہ اس کے اندر اُتر جانے کو دل چاہتا ہے اور کتاب میں رنگین تصویریں ہمیں اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہیں۔

اے حمید

داستان ہیر رانجھا (مثنوی خندۂ تقدیر)

مصنّف :- فضل حسین تبسم

قیمت :- درج نہیں

ناشر :- اسپارک پبلیکیشنز اردو بازار کراچی

جناب فضل حسین تبسم موضع ٹمن ضلع اٹک کے ایک بزرگ شاعر، محقق اور ادیب ہیں۔ سن اس وقت ۷۰/۷۵ سال کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے ہیر رانجھا کی معروف رومانی داستان کو اردو مثنوی کا موقر جامہ پہنایا اور یوں اردو میں ایک دلپسند مثنوی کا اضافہ کیا ہے۔

داستان ہیر رانجھا کا تاریخی (۱۹۷۹ء) نام انہوں نے "مثنوی خندۂ تقدیر" رکھا۔ اس مثنوی کے خندۂ تقدیر ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ مثنوی ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۹ء کے درمیانی عرصے کے کوئی ساڑھے چار ماہ میں تخلیق ہوئی، مگر کوئی ۲۰، ۲۱ سال بعد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ بعض مصنفوں

کی بے نیازی مسلم، مگر ناشروں کی چیرہ دستی سے بھی ایسی تاخیریں ہمارے ہاں عام ہیں۔

'داستان ہیر رانجھا' پر تقریظ مشہور ادیب و شاعر جناب سید ضمیر جعفری نے لکھی اور "سخنہائے گفتنی" کے عنوان سے خود شاعر نے اس کتاب کا تعارف کروایا ہے۔ ان دونوں سے معلوم ہوا کہ تبسم صاحب نے مثنوی کا مسودہ مولانا عبدالمجید خان سالک اور مولانا صلاح الدین احمد کو دکھایا تھا۔ دونوں مرحومین نے مثنوی کی تعریف کی تھی۔ تبسم صاحب کی اس مثنوی کا کچھ حصہ 'ادبی دنیا' اور بعض دوسرے رسائل میں چھپا بھی ہے۔ تبسم صاحب نے ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے تھے۔ وہ عمر کا بڑا حصہ ہائی سکولوں میں فارسی کے استاد رہے۔ انہوں نے تحریک خلافت میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ تبسم صاحب کے لکھے ہوئے کئی مسودے ابھی اشاعت کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے پنجابی شاعری کی صنف "ماھیا" پر خوب خوب کام کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے علاوہ گیارہویں صدی ہجری کے ایک فارسی شاعر شاہ محمد صالح تبتی تھانیسری پر ان کا محققانہ کام نہایت پرارزش مانا جاتا ہے۔

ہیر رانجھا کی رومانی داستان کے بارے میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ محققین اس داستان کو اکبر تا اورنگ زیب کے زمانوں سے مربوط کرتے رہے ہیں۔ فارسی، پنجابی، سندھی اور اردو سب میں اس داستان کے بارے میں نثر اور نظم دونوں میں لکھا جاتا رہا ہے۔ بظاہر بارہویں صدی ہجری سے اس قصے کو زیادہ شہرت ملی ہے۔ قصے کی جزئیات مختلف متون سب مختلف ہیں۔ تبسم صاحب نے سید وارث شاہ کی پنجابی ہیر کو واقعات کی بنیاد بنایا مگر مافوق الفطرت باتوں کو حذف کر دیا ہے۔ اس سے قبل رفیق خاور صاحب ہیر وارث شاہ کو اردو شعر میں منتقل کر چکے تھے مگر تبسم صاحب نے اپنی مثنوی کی بنیاد ترجمہ پر نہیں، تخلیق پر رکھی ہے۔

مثنوی 'داستان ہیر رانجھا' شاہنامہ فردوسی کی معروف بحر متقارب میں لکھی گئی ہے۔ یہ بحر بزمی اور رزمی مثنویوں کے لیے موزوں خیال کی جاتی رہی ہے۔ امید ہے کہ ادبی ذوق رکھنے والے حضرات مثنوی 'داستان ہیر رانجھا' کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور تبسم صاحب کو مجبور کریں گے کہ وہ اپنے دوسرے مسودوں کو بھی شائع کروائیں۔

ڈاکٹر محمد ریاض

غمگسار (ڈرامے)

مصنف :- میرزا ریاض　　　قیمت :- ۱۵/ روپے　　　ناشر :- سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

ریڈیو، سینما اور ٹیلیویژن نے افسانوی ادب کو مثبت اور منفی دونوں انداز سے متاثر کیا ہے۔ جہاں ان ذرائع ابلاغ نے افسانوی ادب کے قارئین کے ایک بڑے حصے کو افسانہ اور ناول کی خواندگی سے بے نیاز کر دیا ہے، وہاں یہ ذرائع ڈرامے کی تخلیق و تصنیف کا محرک بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں ہمارے ہاں بڑے بڑے افسانہ نگار ریڈیو سے وابستہ ہوتے تو ریڈیائی ڈرامے نے ایک فن اور صنف کی حیثیت اختیار کر لی اور کئی صف اول کے افسانہ نگاروں کے ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے شائع ہوئے۔

ہمارے یہاں ٹی وی کی مقبولیت میں جو روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔ اس میں دوسرے پروگراموں کے علاوہ کامیاب ڈراموں کا بڑا حصہ ہے۔ ڈراموں کے کئی سلسلے ناظرین کی داد و تحسین کی تصدیق سے کامیابی کا امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ ٹی وی کے کئی کامیاب ڈرامے بعض مشہور ناولوں مثلاً خدا کی بستی، شمع اور ذلتوں کے مارے لوگ وغیرہ کی ڈرامائی تشکیلیں تھے۔ مگر بیشتر ڈرامے خاص ٹی وی کے لیے تخلیق ہوئے اور اپنے وقت پر کامیاب ڈرامے قرار پائے۔ ان میں بعض ڈراموں پر مشتمل مجموعے مثلاً "کیسے کیسے لوگ" (از ابصار عبدالعلی) "غمگسار" (از میرزا ریاض) اور طویل ڈرامہ "وارث" (از امجد اسلام امجد) کتابی صورت میں بھی شائع ہو گئے ہیں۔

میرزا ریاض کا شمار اردو کے جدید تر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے یاد رہے علامت نگاروں میں نہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے

"آندھی میں صدا" (۱۹۷۴ء) اور "بے آب سمندر" (۱۹۷۹ء) کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "دست و گریبان" (۱۹۷۶ء) بھی شائع ہو چکا ہے۔ ڈرامے میں کہانی بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور مزاح کی لطیف حس اور WIT اگر زیریں رو کے طور پر ڈرامے میں موجود ہو تو ڈرامہ میں دلچسپی کے امکانات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ میرزا ریاض کی کہانی کہنے اور مزاح پیدا کرنے کی اسی صلاحیت نے ان کے ٹی وی ڈراموں کو کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ "غمگسار" میرزا ریاض کے ٹی وی پر پیش ہونے والے پانچ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ پہلا ڈرامہ "آندھی میں صدا" کا موضوع بظاہر پرانا ہے، یعنی ایک عورت کا دوسری عورت سے حسد، خصوصاً عورت دوسری بیوی بننے کے بعد اپنے شوہر کی پہلی بیوی اور اولاد کو یکسر برداشت نہیں کر سکتی۔ اس موضوع کی ڈرامائی مرحلہ وار پیشکش کو موثر بنانے میں مصنف کے گہرے معاشرتی اور سماجی شعور کا بڑا حصہ ہے۔ دولت کی فراوانی کے ساتھ معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا جو زوال شروع ہوتا ہے اور اس زوال کے گرداب میں انسان جس طرح پھنس کر اپنی آواز کا بھی سراغ نہیں پاتا، یہ اس ڈرامے کا اصل موضوع ہے جسے مصنف نے ڈرامائی فنی مہارت اور تکنیک کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کتاب کا آخری ڈرامہ "جھوٹ" مصنف کے پیشہ ورانہ تجربے اور سماجی مشاہدے کا آئینہ دار ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ معاشی افراط و تفریط افراد کی ذہنیتوں کے تغیر کا باعث ہوتی ہے۔ کالج کے طالب علموں کی زندگی کا ایک عام مشاہدہ ہے کہ اکثر ذہین اور لائق طالب علموں کی زندگی احساس کمتری کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ غریب، ایماندار اور محنتی لوگوں کے لائق بچے امیر دوستوں کی صحبت اور عیش پرستیوں سے متاثر ہو کر بے راہ روی اختیار کرتے ہیں اور آخر میں آوارہ، اوباش اور جرائم پیشہ بن جاتے ہیں۔ اس ڈرامے سے یہ بھی سراغ ملتا ہے کہ معاشرہ کی اخلاقی اور معاشرتی برائیوں (مثلاً رشوت) کے سماجی عوامل اور نفسیاتی محرکات کیا ہیں۔

اس مجموعے کا ڈرامہ "طلسم" ایک اچھا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ ALIENATION یورپ کی سوسائٹی کا ایک بحرانی مسئلہ ہے۔ ڈرامہ نگار نے "طلسم" میں بڑی فنی مہارت سے ہمارے ہاں بھی ALIENATION کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ڈرامہ "غمگسار" میں دردمندی کا احساس اور جذبہ بڑا نمایاں ہے۔ اس میں ایک طرف انسانی رشتوں کی عظمت اور پائیداری کا بیان ہے، تو دوسری طرف وقت کے حوالے سے انسانوں کے باہمی تعلقات کی عارضی بنیادوں کا بھی ذکر ہے، وقت، جو ہر چیز پر حاوی ہے۔ وقت کے جبر سے کوئی مادی اور غیر مادی شے آزاد نہیں۔ اس ڈرامے میں وقت کی قہرمانی اور سفاکی کی جھلکیاں بڑا PATHOS پیدا کرتی ہیں۔ وقت جو صورتوں اور شکلوں کو مسخ کر دیتا ہے، محبتوں اور باہمی رشتوں کو اپنے ملبے تلے دبا لیتا ہے اور جذبوں کے سوتے خشک کر دیتا ہے۔ گویا وقت کی بے رحمی اور ستم رانی اس ڈرامے کا موضوع ہے۔

ریڈیو یا ٹی وی ڈرامے چونکہ مخصوص فنی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر قلم بند کیے جاتے ہیں اور ان کی پیشکش میں ہدایت کار اور اداکاروں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اکثر صورتوں میں اداکار ڈرامے پر اس قدر چھا جاتے ہیں کہ مصنف کہیں پس منظر ہی میں رہ جاتا ہے۔ غالباً اس لیے کہ ایسے ڈرامے کاغذ پر محض بے جان حروف ہوتے ہیں اور ان میں جتنی بھی جان نظر آتی ہے وہ ہدایت کار کا کرشمہ ہوتا ہے یا پھر اداکار کی مسیحائی۔ مگر کئی ڈرامے اتنی توانائی کے مالک ہوتے ہیں کہ وہ مطبوعہ صورت اختیار کرنے پر بے جان نہیں بننے پاتے، جبھی ایسے ڈراموں کی اشاعت قارئین کے حلقہ میں پسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور یہ کھیل اسی شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں جس اشتیاق سے ناظرین انہیں سکرین پر دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ یورپ میں تو اکثر ایسے سکرپٹ شائع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں بھی اس کا چلن ہو رہا ہے۔

میرزا ریاض کے ان ڈراموں کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ٹی وی سکرپٹ ہونے کے باوجود ان میں دلچسپ خواندگی کا خاص وصف موجود ہے۔

صدیق جاوید

بے آب سمندر (افسانے)

مصنف :- میرزا ریاض
قیمت :- ۲۵ روپے
ناشر :- ادارہ فروغ اردو، لاہور

میرزا ریاض کے افسانوں کے اوّلین مجموعے "آندھی میں صدا" کو قارئین اور ناقدین نے بے حد پسند کیا۔ اس حد تک کہ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی طبع ہوا۔ اب ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "بے آب سمندر" آیا ہے۔ میرزا ریاض کی افسانوی کاوشیں اس بنا پر اہم تصور کی جانی چاہئیں کہ افسانوی کساد بازاری کے اس دور میں اس نے اپنی بہترین صلاحیتیں اس صنف کی ترقی کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ میرزا ریاض کے افسانوں کا بنیادی موضوع انسان میں اخلاقی اقدار کا انحطاط اور پھر اس کے نتیجہ میں انسانی شخصیت میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات ہیں۔ اس ضمن میں میرزا ریاض نے بہت ژرف نگاہی سے کام لے کر معاشرے میں سے ایسے نمائندہ کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو اپنی انفرادی حیثیت میں مرد یا عورت سے بڑھ کر اجتماعی سوچ کا استعارہ بھی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ خلا، آٹوگراف، روٹ لیس، تعبیر، نقاب، نشیب وغیرہ اس انداز کی کامیاب مثالیں ہیں۔ ان سب افسانوں کے کردار اگرچہ بے حد "مضبوط" ہیں مگر زندگی کے کرائسس میں ایک لمحہ ایسا بھی آجاتا ہے جو ان کی شخصیت کے داخلی تضادات کو یوں بے نقاب کرتا ہے کہ ان کی فطرت "ایسی بلندی ایسی پستی" کی زندہ تصویر بن کر رہ جاتی ہے۔ شخصیت کے اس کرائسس میں سے "خلا" کی ہیروئین کامران نکلتی ہے جو ناکردہ کار اور مریض خاوند افتخار کی موت کی منتظر تھی کہ آزاد ہو کر اپنے محبوب حمید کے ساتھ اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکے۔ اسی افتخار کی موت کے بعد اس کی نسوانی انا یوں بیدار ہوتی ہے کہ اب حمید کے ساتھ تعلقات کی استواری اسے ایک گھناؤنا فعل محسوس ہوتا ہے۔ یوں یہ بے اخلاق بیوی، بیوہ بن کر اخلاقی اقدار کی عظمت کی امین بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس "نشیب" کا عبدالستار ہے جس نے تیس برس سرکاری ملازمت کی تھی، باوقار اور باعزت طور سے ریٹائر ہوا تھا وہ ایک نہایت محنتی، سرکاری قواعد و ضوابط کا پابند، انتہائی ایماندار اور قابل اعتماد اہل کار تھا، افسران اس پہ بھروسہ کرتے تھے اور اس کے حسن کارکردگی اور اہلیت و قابلیت پر خوش تھے۔" یہی عبدالستار ریٹائر ہو کر معاشی مسائل سے دوچار ہوتا ہے تو اسے قدم قدم پر یہ احساس کرایا جاتا ہے کہ شرافت اب سکۂ رائج الوقت نہیں۔ تنگ آکر علمی و ادبی کتابوں کی دوکان کھولتا ہے لیکن یہاں علم و ادب کا خریدار کون ہے؟

چنانچہ "دارالادب" کو چلانے والا بالآخر فحش کتابوں کے کاروبار میں دولت کماتا ہے۔ اس افسانے کے خوبصورت اختتام میں وہ اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ اپنی بیٹی کی نہایت فحش کتاب کو بھی شائع کر دیتا ہے۔

تو یہ ہے میرزا ریاض کے افسانوں کی دُنیا۔ چھوٹے چھوٹے لوگ اور ان کی چھوٹی چھوٹی کینگیاں لیکن ان سے عمل اور ردعمل کی جو لہریں پیدا ہوتی ہیں، وہ معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں جیسے "تعبیر" جس میں ایک باپ ناجائز ذرائع سے بیٹے کو ڈاکٹر بنواتا ہے اور جس کی دولت سے اس کا پہلا مریض، ایک کم سن بچہ، جل بھن ہو جاتا ہے۔ یا پھر "نقاب" کے پروفیسر صاحب جو بس میں ٹکٹ نہیں لیتے اور یوں اپنے شاگرد کی نفرت کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ افسانے صرف ایک پروفیسر ہی لکھ سکتا تھا اور وہ بھی میرزا ریاض جیسا!

"بے آب سمندر" کے نام میں بھی گہری معنویت ہے۔ سمندر اگر بے آب ہو تو وہ محض صحرا بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح معاشرہ اگر اخلاقی اقدار سے تہی ہو تو وہ محض جنگل بن کر رہ جاتا ہے یوں دیکھیں تو بے آب سمندر ہمارے جنگل معاشرے کے لیے ایک بلیغ استعارہ بن جاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم   بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

لیکن میرزا ریاض کے بموجب تو نہ کہیں پانی ہے اور نہ ہی شبنم ملنے پانے کا مسئلہ — کیونکہ میرزا ریاض کے بموجب تو یہ سمندر ہی بے آب ہے !۔

ڈاکٹر سلیم اختر

دجلہ

معنف :- شفیق الرحمٰن

قیمت :- ۳۰ روپے

ناشر :- غالب پبلشرز پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۶ - لاہور

ہمارے یہاں اَدب برائے اَدب یا اَدب برائے زندگی کے بارے میں بحث برائے بحث تو بہت کی جاتی ہے لیکن اس افسوسناک حقیقت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے کہ اردو ادب میں سب سے زیادہ کمی "خوش دلی" کی ہے۔ ہنستی مسکراتی ہوئی تحریریں، اعصاب کو سکون دینے والے نثر پارے، زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، بوالعجبیوں اور حماقتوں کی داستانیں، نظریوں اور مختلف قسم کے ازموں کی دہشت اور تنگ نظری سے آزاد رہ کر لکھے ہوئے الفاظ — ہمارے اَدبی منظر میں ایک طرح کے جنسِ ممنوعہ بن گئے ہیں۔ جب سے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ "دانشور" کا دم چھلا لگنا شروع ہوا ہے، انہوں نے گویا زندگی کو مزید تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت بنانے کا ٹھیکا لے لیا ہے۔ معاشی۔ عمرانی، نفسیاتی، روحانی، سماجی، جدلیاتی اور پتہ نہیں کن کن تجزیوں کے نشتروں سے اس زندہ مُردے کا پوسٹ مارٹم کیا جا رہا ہے لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ ادب کا سب سے بڑا کارنامہ اُس روحانی مسرت اور جمالیاتی ذوق کی تخلیق اور ترسیل ہے جس سے انسانوں میں اپنی کمزوریوں پر ہنسنے اور دوسرے کی کوتاہیوں سے درگزر کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی غالب نہیں ہوتا کہ دُنیا اس کے سامنے بازیچۂ اطفال ہو لیکن ایسا ہو بھی جائے تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں۔ اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اُس بچگانہ حیرت، تازگی، سادگی اور بھولپن کی حفاظت کی جائے جو ہر گزرتا ہوا لمحہ ہم سے چھیننے کے درپے ہے۔

شفیق الرحمٰن ہمارے اُن چند ادیبوں کی صفِ اوّل میں سے ہیں جنہوں نے اس عظیم اور قابلِ قدر فریضے کو بطریقِ احسن سرانجام دیا ہے۔ اُن کی زیرِ نظر کتاب "دجلہ" اُن کی نویں کتاب ہے۔ اُن کی پہلی آٹھ کتابیں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصے میں شائع ہوئی تھیں گویا "دجلہ" چوبیس برس کے طویل وقفے کے بعد شائع ہو رہی ہے اور اُن کی گزشتہ کتابوں کے برعکس اس میں نہ کوئی مزاحیہ مضمون ہے، نہ پیروڈی ہے، نہ ہلکا پھلکا افسانہ ہے اور نہ ہی "پچھتاوے" پر مبنی کہانیاں ہیں۔ "دجلہ" میں شامل چاروں تحریروں کا سلسلۂ نسب "مزید حماقتیں" کی آخری تحریر "برساتی" سے ملتا ہے جسے بلاشبہ اردو کی دس بہترین تحریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے اِن کے لیے "رپورتاژ" کی ادبی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے۔

لفظ "رپورتاژ" کی تشریح میں مبتلا ہوتے بغیر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اِن چاروں تحریروں — "نیل"، "دھند"، "ڈینوب" اور "دجلہ" میں کیا کہا گیا ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم تحریر نمبر دو یعنی "دھند" کو اس فہرست سے علیحدہ کر لیں کیونکہ یہ رپورتاژ سے زیادہ ایک طویل مختصر کہانی ہے جس میں شفیق الرحمٰن کے مخصوص کردار بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ باقی تینوں تحریروں کے ناموں سے ظاہر ہے یہ دُنیا کے تین مشہور دریاؤں کے نام ہیں جن کے کناروں پر نہ صرف مشہور تاریخی شہر آباد ہیں بلکہ صدیوں کے اس سفر میں اُنہوں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ ابھی اُن کے شہروں، باشندوں، منفرد رنگ اور آثار میں دکھائی دیتا ہے جو یہ جبیں پہ ہیں جو لکھے ہوئے یہ حساب ہیں مہ و سال کے!

شفیق الرحمٰن نے وقت کے ایک خاص حصے میں اِن کی سیاحت کی ہے لیکن ایک بڑے تخلیقی فنکار کی طرح وہ "زمان" کی حد بندیوں کو توڑ کر اُن تہذیبوں کی روح میں اُتر گئے ہیں اور قاری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہنسی ہنسی میں اُسے زندگی کے ایسے گوشے دکھا گئے ہیں جنہیں شاید وہ خود ہزاروں برس کی سیاحت میں بھی دیکھ اور سمجھ نہ پاتا۔

شفیق الرحمٰن کی یہ تحریریں زندگی پر ایمان رکھنے اور اعتماد دلانے والی تحریریں ہیں اور آج جبکہ چاروں طرف چیزیں ٹوٹ رہی ہیں، ایسی تحریریں ایک عظیم نعمت سے کم نہیں۔ زندگی کا شعور یوں تو ہر عظیم اَدب کی پہچان ہوتا ہے لیکن جب یہ شعور مسکراہٹوں کے توسط سے حاصل ہوتا ہے تو اس کی کاٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ دو ایک نمونے ملاحظہ کیجیے۔

"اُس زمانے کے جینئس بڑے عظیم انسان ہوتے تھے، بیک وقت سائنسدان، مہندس، فلسفی بھی ہوتے تھے، شاعری، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ پر بھی عبور ہوتا تھا (آج کل کے انٹیلیکچوئل حضرات کی طرح نہیں کہ من ڈیڑھ من کتابیں پڑھ کر موٹی سی عینک لگائی، بال بڑھائے اور چرچڑے بن کر ہر چیز کی مخالفت شروع کر دی۔"

"پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو رُٹے کافی عرصہ ہو چکا تھا، وہ ترکوں کے خلاف لڑے۔ جب انگریز جنرل ایلن بی ALLEN BY دمشق میں فاتحانہ داخل ہوا تو خوش فہم باشندوں نے ال نبی! ال نبی کے نعرے لگا کر اُس کا استقبال کیا۔"

"سکندر کے جانشین سیلوکس نے سکندریہ آباد دیکھتے ہوئے اٹھارہ اُنیس سکندریہ دیکھے تھے۔ وہ مدت سے انتظار کر رہا تھا کہ کبھی اپنا پرائیویٹ شہر بھی بسائے، اُس نے بابل کو خیرباد کہا اور فوراً دجلے کے کنارے اپنا سلوکیا آباد کیا لیکن یہ شہر زیادہ دیر تک نہیں چلا دراصل سکندر کی عظمت سے سیلوکس کا تحت الشعور بالکل تباہ ہو چکا تھا۔"

"کہتے ہیں کہ بیوی کی دائمی افسردگی سے تنگ آ کر بخت نصر نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اُس کے عہد میں علم ہیئت کو بڑی ترقی ہوئی اور دُنیا کا پہلا کیلنڈر مرتب ہوا بعد میں بادشاہ نے مزید بیزار ہو کر دوروں پر جانا شروع کر دیا اور مصریوں کو شکست دی پھر یروشلم کو تباہ کر کے اتنے سارے یہودی غلام ساتھ لے آیا کہ بغداد میں اب تک یہودی ہیں (یہودی ایک دفعہ کہیں پہنچ جائیں تو پھر واپس نہیں جاتے۔"

۵۷۶ صفحات پر محیط اس کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر اس نوع کی شگفتہ گہری اور برجستہ سطریں جگمگا رہی ہیں۔ اُردو میں ۱۹۸۰ء کا سال اس لیے یاد رہے گا کہ اس میں شفیق الرحمٰن کی "دجلہ" شائع ہوئی تھی۔

کتاب کی طباعت اور کتابت اور اس کا سائز تینوں میں بہتری کی وافر گنجائش موجود ہے کم و بیش یہی بات سرورق پر بھی صادق آتی ہے لیکن ظاہر ہے اِن باتوں کا تعلق کتاب کی معنوی خوبیوں سے اُتنا ہی ہے جتنا کہ ہونا چاہیے!

امجد اسلام امجد

جل تھل (شاعری)

مرتب:۔ محمد اجمل نیازی

قیمت:۔ درج نہیں

ناشر:۔ غالب پبلشرز پوسٹ بکس ۲۱۱۹، لاہور

نئی نسل کے شاعروں میں اجمل نیازی کا نام اب اتنا پرانا ضرور ہو چکا ہے کہ اُسے مستند نوجوان شاعر کہا جا سکے لیکن اُس کا تازہ کارنامہ اُس کی کوئی اپنی شعری کاوش نہیں بلکہ اُس کے آبائی ضلع میانوالی کے شعرا کا ایک انتخاب بمعہ تعارف ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آج جبکہ بین الاقوامی سطح پر اَدب جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد ہو رہا ہے، پاکستان جیسے ایک چھوٹے ملک کے ایک معمول سے بھی زیادہ پسماندہ علاقے کے شاعروں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کرنا اور پورے ادبی تناظر میں اُن کی اس نمائندہ حیثیت کا اعلان کرنا بظاہر خاصی رجعت پسندانہ سی حرکت دکھائی دیتی ہے لیکن اگر اس مسئلے کو بنظرِ غور اور بطریقِ انصاف دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اجمل نیازی کے اس اقدام کے پیچھے کچھ ٹھوس، حقیقی اور اہم وجوہات ہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اُس کا مقصد کسی قسم کے تعصب کو ہوا دینا یا ٹانگوں کے ساتھ لکڑیاں باندھ کر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا قد بلند کرنا نہیں بلکہ وہ تو ہماری تنقید اور

قارئینِ ادب کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہے کہ ادب صرف بڑے شہروں کی جاگیر اور میراث نہیں ہے، وطنِ عزیز کے ہر حصے میں دیکھنے والی آنکھیں اور سوچنے والے ذہن موجود ہیں اور اُن کے فکر و فن کو شامل کئے بغیر کوئی ادبی یا فکری منظر نامہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ کراچی لاہور اور راولپنڈی سے قطع نظر بقیہ سارے ملک میں علمی اور ادبی سرگرمیاں مناسب تشہیر اور فضا نہ ہونے کے باعث یا تو سامنے آ ہی نہیں پاتیں یا پھر اپنی ہی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتی ہیں۔

اجمل نیازی نے "جل تھل" میں جن شعرا کا تعارف کرایا ہے اور اُن کی منظومات شائع کی ہیں اُن میں سے کئی ایک نام ایسے ہیں جو ملک میں موجود گنتی کے چند ادبی پرچوں میں کبھی کبھار چھپنے کی وجہ سے یا تو نظروں سے اوجھل رہے یا پھر قاری اور نقاد سے اُن کا وہ تعلق پیدا نہیں ہو سکا جس میں نام کلام کا حوالہ بن جاتا ہے۔ اس مجموعے کے شائع ہونے سے اب اِن شعرا کو سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ اجمل نیازی نے شاعری کے عصری تناظر سے اپنے تعارفی کلمات میں اِن شاعروں کو جس طرح مربوط کیا ہے اُس سے بھی پڑھنے والوں کو بہت مدد ملتی ہے۔ کتاب کا نام بڑا موزوں اور برمحل ہے۔ کتابت اور طباعت تقریباً گوارا ہے۔

امجد اسلام امجد

ماس اور مٹی (افسانے)

مصنف :۔ محمد منشا یاد
قیمت :۔ ۲۵ روپے
ناشر :۔ ماڈرن بک ڈپو آب پارہ، اسلام آباد

منٹو کے بعد اُردو افسانے کے ساتھ وہی کچھ ہوا ہے جو مشاعرے میں کسی بہت اچھے شاعر کے پڑھنے کے بعد ہوا کرتا ہے سامعین داد دے دے کر اتنے "ہف" (تھک) چکے ہوتے ہیں کہ بعد میں آنے والے شاعر لاکھ سر پٹکیں، اُن کی دال نہیں گلتی۔ منٹو صاحب تو میلہ لُوٹ کر چلے گئے مگر اُن کے فوراً بعد آنے والوں کی ایسی شامت آئی کہ انتظار حسین کو پندرہ سال صرف یہ باور کرانے میں لگ گئے کہ وہ بھی گرہ میں مال رکھتے ہیں۔

ایسے میں ۱۹۶۰ء کی ناراض نوجوان نسل کے افسانہ نگاروں نے اسی میں خیریت سمجھی کہ اُس اسلوب کو ہی رد کر دیا جائے جس میں اتنے بڑے بڑے پہاڑ اُن کی راہ میں کھڑے ہیں چنانچہ علامتی افسانہ انفلوئنزا کی طرح حملہ آور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف پھیل گیا۔ اُدھر امریکہ بہادر نے پاکستان سے تازہ تازہ مصافحہ کیا تھا اور "دست پنجے" کے نشان والی امداد ملک میں آنا شروع ہوئی تھی چنانچہ امریکی ادب کے وہ رویئے جو قریب تھے ہمارے یہاں فیشن کے نشان کے طور پر اُبھرے اور یوں تحریر لکھنے والے سے، لکھنے والے قاری سے اور قارئین بقیہ ہر دو سے دُور ہوتے چلے گئے۔

محمد منشا یاد اُن افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں شمار ہوتا ہے جنہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد قدیم روایت، علامت، جدیدیت، مقصدیت اور قومی ادب کے ملے جلے رویوں کے درمیان آنکھ کھولی اور اس انتشار میں بڑے استقلال کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے لئے ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ اُس کی پہلی کتاب "بند مٹھی میں جگنو" اس کی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کا ہراول تھی لیکن زیرِ نظر کتاب "ماس اور مٹی" میں شامل اُس کی کہانیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنی نسل کا سب سے بہتر، منفرد اور بڑا افسانہ نگار ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں نئی نسل کے جن کہانی کاروں نے غیر معمولی کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن میں مظہر الاسلام، اکرام اللہ، نجم الحسن رضوی اور رشید امجد کے نام خاص طور سے نمایاں ہیں (اچھی کہانیاں لکھنے والوں کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے) لیکن محمد منشا یاد کی صرف ایک کتاب (ماس اور مٹی) میں کم از کم پانچ ایسی کہانیاں

ہیں جنہیں غیر معمولی کہا جا سکتا ہے۔ میری مراد "پانی میں گھرا ہوا پانی"، "اپنا گھر"، "نئی دستک"، "خواہشیں سراب ہیں"، "ادھ" اور "ٹرام" سے ہے۔ ان کہانیوں کا ایک بہت بڑا اعجاز ان کا حیرت ناک ایجاز ہے۔ منشایاد کم سے کم لفظوں میں آسمانوں کا سا انت رکھنے والی حقیقتوں کو یوں سمیٹتا ہے کہ سمندر اور کوزے کی تمثیل حقیقی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کہانیوں میں کسی ایک تکنیک یا انداز کا سہارا نہیں لیا گیا بلکہ علامت، استعارہ، تمثیل، مکالمہ، بیانیہ اور داستانوی سب رنگ یوں گھل مل گئے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک دھنک سی بنتی چلی جاتی ہے۔

جدید افسانے میں کہانی پن کی کمی کا ذکر عام طور پر کیا جاتا ہے۔ نیا افسانہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیے میں اس قدر الجھ گیا ہے کہ افسانے میں واقعہ نگاری کی جگہ جیومیٹری کی اصطلاحات نے لے لی ہے۔ "الف ب سے کچھ کہتا ہے جس کا جواب ج دیتا ہے۔ اس پر ب، ج سے اور الف ب سے لڑنے جھگڑنے لگ جاتے ہیں" اور قاری بے چارہ یہی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے کہ کون، کیوں اور کس سے ہمکلام ہے اور کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے نزدیک تکنیک کے تمام تر داؤ پیچ اس وقت ہوائی تیر رہتے ہیں جب تک اس کے پیچھے ایک باقاعدہ قصہ اور کہانی نہ ہو۔ آپ بے شک بات کہیں سے بھی شروع کریں لیکن "بات" ہونی ضرور چاہیئے۔ قدیم قصوں اور کہانیوں کے پس منظر میں نئے سماجی پیش منظر کو سمجھنے کے لئے جو علامتی کہانیاں لکھی جاتی ہیں ان میں بھی اکثر اوقات اس نکتے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ قصے کی رونق اس کی کہانی سے ہوتی ہے۔ محمد منشایاد کا کمال یہ ہے کہ اس نے جدید اسالیب اور فنی پیرایوں کو بے دریغ استعمال کے باوجود "کہانی" کا سرا ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہ کہانیاں جزئیات کے اعتبار سے یقیناً اتنی مفصل نہیں ہوتیں جتنی کلاسیکل انداز میں لکھی ہوئی کہانیاں ہوتی ہیں بلکہ یہ تو منٹو، غلام عباس، کرشن چندر، بیدی، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمٰن کی ۱۹۵۵ء تک کی لکھی ہوئی کہانیوں سے بھی زیادہ اختصار کی حامل ہیں۔ محمد منشایاد نے اپنے ان بزرگوں سے جو ہنر اکتساب کیا ہے وہ تاثر کی وحدت اور شدت کا کمال ہے کہ یہی روشنی کی وہ لکیر ہے جو تاریک خلا کا سینہ چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے۔

"ماس اور مٹی" میں ماں، فرد اور مٹی کائنات کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس کائنات میں ماورائے زمین عناصر بھی شامل ہیں لیکن منشایاد کا مدار ان معاشی رشتوں اور علائق پر ہے جن میں اس کے عہد کا انسان جی رہا ہے۔ یوں یہ کائنات فرد کی محدودیت سے صاحب عہد کی لامحدودیت تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا نظریۂ فن اور نظریۂ حیات ایک ترقی پسند مشرقی انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو کائنات کی عظمت، انسان کی مساعی اور ان کے درمیان حائل لاکھوں مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے افسانے "ماس اور مٹی" کے ابتدائی حصے میں اس رویے کا بھرپور اظہار ہوتا ہے کہ وہ ہر حال میں زندگی کا اثبات کرنے والوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں کے موضوعات کتنے ہی پیچیدہ اور تہہ دار کیوں نہ ہوں، اس کی بات قاری کے لئے ہمیشہ قابلِ فہم رہتی ہے اور اس کی یہ خوبی اسے واضح طور پر اپنے ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

منشایاد کے ان افسانوں میں اس کی پنجابی تہذیب، روایت اور زبان کی ایک انتہائی خوبصورت آمیزش ملتی ہے۔ بعض اوقات وہ ٹیلی ڈرامے میں استعمال ہونے والی وائس اوور کی تکنیک سے استفادہ کرتے ہوئے ایک ایسا جملہ لکھ جاتا ہے جس میں درجنوں تفصیلات مجسم ہو جاتی ہیں:

"یہ جنت کون ہے؟"

"یہ جنت وہی ہے" "میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا" "جس نے مجھے آٹھویں جماعت کے وظیفے کے امتحان میں فیل کرایا تھا اور سارے گاؤں اور برادری میں بدنام کیا تھا۔"

فرزانہ کو چپ لگ جاتی ہے۔
مجھے اس کی چپ سے ہول آنے لگتا ہے اور میرے اندر کوئی دانت پیسنے اور بلند آواز میں ننگی گالیاں بکنے لگتا ہے۔

(و + ب)

"اہل ثروت کو کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ انہوں نے قحط کے دنوں کے لئے بہت کچھ جمع کر لیا تھا۔ مگر ان کی یہ خوش حالی اس دلہن کی طرح تھی جو نوشہ کے سینے پر سر رکھے اپنے آشنا کی یاد میں تڑپ رہی ہو۔"

(اندھیرے اندھیرے.....)

بلوغت کے احساس اور جنسی شعور کے اوّلین تجربے پر اُردو میں بھی چند لافانی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی کہانی (ا + ب) آئیں محمد منشا یاد نے اس انتہائی نازک موضوع کو جس خوبصورتی سے نبھایا ہے اُس پر اُسے جتنی بھی داد دی جائے کم ہے :

"گرمیوں میں دیہات کے لوگ تہمد کو اچھی طرح باندھ کر سوتے مگر سردیوں میں لحافوں کی وجہ سے اس احتیاط کی ضرورت نہ ہوتی۔ ... جنت بھی لحاف میں منہ سر ڈھانپ کر سوتی لیکن جب پڑوسیوں کا مرغ آدھی رات کو وقتی وبیلا سمجھ کر اذانیں دینے لگتا تو جنت کو گرمی لگتی اور وہ پاؤں مار مار کر لحاف ایک طرف گرا دیتی۔

مٹی کے تیل کے دیئے کی مدھم سی لو اچانک لٹ لٹ کرنے لگتی اور سارے پسار میں روشنی پھیل جاتی۔

دیوار سے لٹکتے ہوئے پرندوں کے چارٹ کا کالا تیتر زور زور سے بولنے لگتا۔

میری پسلی سے ٹیر ٹیر کرتی ٹہری نکلتی اور سارے پسار کا چکر لگا کر پڑچھتی پر جا بیٹھتی۔

مجھے وظیفے کے امتحان کا خیال آتا اور میں کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگتا۔ تاجر خواہ کتنی ہی سستی جنس خریدتا اور کتنی ہی مہنگی فروخت کرتا اُسے نفع کی بجائے اُلٹا نقصان ہوتا۔

نادر شاہ کی فوجیں دجلہ پر چڑھائی کرتیں اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتیں — یہ ساری اینٹیں ایک ایک کر کے رات بھر میرے سر میں لگتی رہتیں ...

پھر ایک رات میں نے پہلی بار آتش بازی کا خواب دیکھا۔ شوں شوں کرتی ہوائیاں اُوپر جاتیں اور آگ کے پھولوں کا باغ سا کھل جاتا۔

پھر ایک ہوائی جس کے سرے پر گولا سا بندھا ہوا تھا شوں شوں کرتی اوپر ہی اوپر چڑھتی گئی۔ پھر کہیں بہت دُور سے پہلے آسمان سے آواز سنائی دی ٹھاہ — ٹھاہ۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ آنکھ کھُلی تو میرا لباس پسینے میں تر تھا جسم سیاہ ہو چکا تھا اور سارے پسار میں بارُود کی بُو پھیلی ہوئی تھی —"

مجموعی اعتبار سے "گھاس اور مٹی" افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو نئے افسانے کے اعتدال پسندانہ رویّے کی نمائندگی کرتا ہے اور ہمیں حوصلہ دیتا ہے کہ افسانے کے دامن سے جمود اور بے معنویت کے دھبے دھو دیئے گئے ہیں۔

اسلم کمال کا سرورق نہایت معنی خیز اور خوبصورت ہے۔

امجد اسلام امجد

لفظ کھردرے

مصنف : تنویر سپرا

قیمت : ۲۰ روپے

ملنے کا پتہ : سول ایجنٹ : مکتبۂ فنون ۴۳۔ میکلوڈ روڈ۔ لاہور

شاعری ایک سماجی اور معاشرتی عمل ہے جس کا خمیر معاشرتی زندگی ہی سے اُٹھتا ہے اور اس کا تخلیق کرنے والا یعنی شاعر بھی اُسی معاشرہ کا فرد ہوتا ہے شاعری جس کی ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔ یہ ترجمانی اور عکاسی شاعر کی اپنی آگہی اور اُس کے اپنے شعور کا فنکارانہ اظہار ہوتی ہے جسے وہ اپنے گرد و پیش کے حقائق اور مسائل کے گہرے تجربے اور مشاہدے سے حاصل کرتا ہے۔ اس لیے ہر سچے شاعر کی شاعری پر اُس کی اپنی شخصیت، اپنے لہجے، اپنے اُسلوب اور فکر و دانش کی گہری چھاپ ہوتی ہے یہ بات جہاں شاعر کو انفرادیت بخشتی ہے وہاں اُسے معاشرے کے سامنے EXPOSE بھی کر دیتی ہے۔ کیونکہ جونہی کوئی شاعر اپنے تجربات و مشاہدات اور احساس و ادراک کو معرضِ اظہار میں لا چکتا ہے اور اُس کی تخلیق قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتی ہے۔ یہ سوال فوراً اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ حسن و تاثیر اور مفہوم و مواد کے اعتبار سے کس درجے کا ہے۔ کیا اُس میں انفرادیت ہے اور کیا اُس نے کوئی نئی اور دل کو لگنے والی بات کی ہے؟

تنویر سپرا کی پہلی شعری تصنیف "لفظ کھردرے" کے شائع ہو جانے پر بھی اِس سوال کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے اور مَیں نے اس تحریر میں اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی طالبعلمانہ کوشش کی ہے۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے ذکر کیا ہے شاعری بنیادی طور پر شاعر کے اپنے تجربات و مشاہدات کا تخلیقی اظہار ہوتی ہے۔ چنانچہ شاعر کے جذبہ و احساس میں جس حد تک صداقت، خلوص اور آفاقیت ہوتی ہے اور اُس کے لہجے اور اسلوب میں جس حد تک متاثر کرنے کی وسیع تر اور دیرپا صلاحیت ہوتی ہے، اُس کی شاعری بھی اُسی حد تک قابلِ توجہ اور وقیع ٹھہرتی ہے۔ مَیں نے اِنہی معیاروں کو سامنے رکھ کر تنویر سپرا کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمدردانہ سنجیدگی کے ساتھ اور PRE-CONCEIVED IDEAS سے بچ کر "لفظ کھردرے" کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکے گا کہ تنویر سپرا شاعری نہیں کر سکا۔ تنویر سپرا نے جو کچھ کہا ہے غزل کے پیرایے میں کہا ہے اس کی غزل کے لفظ واقعی کھردرے ہیں اور اس کی لسانی تشکیلات میں عام طور پر مترنم مٹھاس اور کیف آگیں لطافت و ملائمت نہیں پائی جاتی لیکن اس کا سبب اس کی خامکاری نہیں اس کی افتادِ طبع ہے۔ وہ جدّت کے جس مقام پر فائز ہے وہاں سے اُسے تازہ کلام بھی متروک سا لگتا ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے کہ روایتی جمالیات کے نازک آبگینے اس کی صہبائے شعر کی تندی کے متحمل نہیں ہو سکتے اِس لیے اس کی غزل کا حسن، ملائمت و شیرینی کے بجائے جذبہ کی شدت و صداقت، لہجے کی آتش کی اور اسلوب کے طنطنہ و جلال کا آفریدہ ہے۔ حسن و جمال کا یہی نظریہ اقبال کو بھی محبوب تھا جو یہ کہتا ہے۔

ـ نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر ! ! نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

مَیں اقبال کے شعر کو تنویر سپرا کے لیے ڈھال نہیں بنا رہا، نہ اس سے میرا مقصود اقبال اور تنویر سپرا کا تقابلی مطالعہ کرنا ہے۔ مَیں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ حسن کے انداز گوناگوں اور اس کی ادائیں بے شمار ہیں اور تنویر سپرا کی غزل کا آتشیں اور توانا اسلوب بھی حسن ہی کی ایک ادا ہے۔

منصور کے مرید ہیں، سرمد کے یار ہیں ہم حسنِ قتل گاہ ہیں، تزئینِ دار ہیں

خالق سے اپنے حسن میں تخلیق بڑھ گئی سورج میں ایک، روشنی میں سات رنگ ہیں

جن کے تکلم میں صرف اُجالے ہی بول سکیں ! یا ربّ نئے بشر کو وہ مہتاب مائیں دے

جگ مگ کرے گا شاہدِ معنی کا انگ انگ ! سپرا وجودِ شعر کو شیشہ قبائیں دے

کہہ رہی ہیں سرحدوں پر چھوٹتی مہتابیاں آ رہی ہے میرے گھر میں پالکی خورشید کی

اِن اشعار میں حُسن کی ہمکتی ہوئی بجلیاں تو شاید نہ ہوں لیکن ان میں حسن کے کڑکتے اور لپکتے کوندے صاف نظر آتے ہیں۔ اور یہ ان اشعار کو دیکھیے جن کا تاثر حساس اور درد مند انسان کی ہڈیوں تک سرایت کر جاتا ہے۔

آج بھی سپرا اُس کی خوشبو مل مالک لے جاتا ہے مَیں لوہے کی ناف سے پیدا جو کستوری کرتا ہوں

رات کی شفٹ چلا کر مجھ کو خوابوں سے محروم کیا میرے آجر نے میری فطرت پر ڈاکہ ڈالا ہے

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

مَیں اپنے بچپنے میں چھو نہ پایا جن کھلونوں کو اُنہیں کے واسطے اب میرا بیٹا بھی مچلتا ہے

تنویر سپرا کی غزل میں تاثر خیزی کے عناصر کھولنے کے لیے مَیں نے اُس کے ان مخصوص مزاج اور رویّہ کے حامل اشعار کا انتخاب اسی لیے بھی کیا ہے کہ یہ ثابت ہو سکے کہ شعر میں تاثیر اُس کے موضوع و مواد سے نہیں بلکہ جذبہ کی شدت اور صداقت سے پیدا ہوتی ہے۔ تنویر سپرا ہی کی طرح پوری شدت سے سوچنے اور پوری قوت سے اظہار کرنے والا ایک اور شاعر مرتضیٰ برلاس بھی ہے۔ یہ دونوں شاعر جب مشاعرہ میں اپنا کلام سنا رہے ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے صحرا میں کوئی تناور پیڑ جل رہا ہے یا کسی اسلحہ خانے میں توپیں ڈھالی جا رہی ہیں۔ لیکن مرتضیٰ برلاس کے لہجے کا تنبیہی انداز بنی اسرائیل کے دورِ انحطاط کے پیغمبروں جیسا ہے جبکہ سپرا کے لہجے میں موسوی آہنگ اور للکار پائی جاتی ہے۔

ہمارا بہت ہی پیارا اور بہت جلد مر جانے والا دوست سبطِ علی صبا بھی ایسے ہی زور دار لہجے کا شاعر تھا لیکن تنویر اور صبا کے لہجے کا فرق اُن کے ایک ہی موضوع پر کہے گئے اِن دو شعروں سے واضح ہو جاتا ہے۔ صبا کہتا ہے :۔

میزانِ عدل! تیرا جھکاؤ ہے جس طرف ! اُس سمت سے دلوں نے بڑے زخم کھا لیے

اور سپرا کہتا ہے ؎

مَیں دیرِ انصاف پہ بم کی طرح پھٹ جاؤں گا گر وکیلوں نے خموشی کی مجھے تاکید کی

"نفظ کھردرے" میں اشعار کی تعداد ۲۵۰ ہے۔ ان میں تنویر سپرا نے بیشتر اشعار ذاتی حوالوں سے کہے ہیں لیکن یہ اپنے اندر سمٹے ہوئے کسی مریض اور خود پرست شخص کی ہذیانی کیفیتوں کا اظہار نہیں بلکہ ان میں ایک صحت مندانہ وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ جس سے سپرا کے ترقی پسندانہ رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک شعر ہے :۔

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

یہ شعر تنویر سپرا کی شاعری پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔

وہ بات اِتنے خلوص اور ایمانداری سے کرتا ہے کہ اُس کے ذاتی دکھ آفاقی علامتوں کا روپ دھار لیتے ہیں جن کے ذریعے وہ معاشرتی تضادات کی بدشکلی کو نمایاں کرنے میں سو فیصد کامیاب رہتا ہے۔

مزدوروں اور کسانوں پر اور لوگ بھی بڑے عمدہ شعر کہتے ہیں۔ ہر جگہ کہتے ہیں، ہر ملک میں کہتے ہیں لیکن تنویر سپرا کی طرح ایسے اشعار کے حقیقی اور جانکاہ تجربوں سے گزرنے والے شعراء بہت کم ہوتے ہیں۔ اِسی لیے تنویر سپرا کی شاعری میں جذبہ کی گرمی اور سچائی اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ لیکن تنویر سپرا کا اندازِ بیان بعض اوقات حد سے زیادہ تفصیلی اور وضاحتی ہو جاتا ہے جس سے اُس کے نقطۂ نظر اور نظریات و خیالات تو بیشک کھل کر سامنے آجاتے ہیں لیکن اس کی شاعری پر صحافتی قسم کی منظوم نثر کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اصُولی طور پر مَیں سپرا کے اِس اندازِ بیان سے اختلاف رکھتا ہوں۔ لیکن ہم یہ بھی تو جانتے ہیں ناں کہ بعض شاعر رموز و علائم سے اپنی نفسیاتی اُلجھنوں، مصلحتوں اور خوفوں پر پردے ڈالتے ہیں اور شاعری تخلیق کرنے کے بجائے JIG SAW PUZZLE بناتے رہتے ہیں۔ تنویر کا راست اسلوب اس چیستانی قسم کی علامت نگاری کے خلاف ایک ردِ عمل اور احتجاج ہے۔

وہ کہتا ہے :۔

بازار میں تو جنسِ بلاغت کی مانگ ہے ہم بو رہے ہیں کشتِ اَدب میں بجھارتیں

وہ کشتِ اَدب میں بجھارتیں بونے کا مخالف ہے اور مضامین کے گرد لفظوں کی اِتنی گھنی باڑیں نہیں گاڑنا چاہتا جن سے فہم کے کپڑے ہی پھٹ جائیں۔

تنویر سپرا کی راست گوئی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ وہ شاعری کو یونیورسٹیوں اور نیشنل سنٹروں، ٹی ہاؤسوں اور ڈرائنگ روموں سے نکال کر کھیتوں اور کارخانوں تک لے جانا چاہتا ہے اور اُس کے کھلے ڈھلے اندازِ بیان کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ تنویر سپرا کسی قسم کی نفسیاتی اُلجھن، خوف یا مصلحت کا شکار نہیں۔ وہ جو کچھ سوچتا اور محسوس کرتا ہے بلا کم و کاست بیان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس نے بڑے ہی معصومانہ انداز میں ایسی باتیں بھی اپنے شعروں میں بیان کر دی ہیں جنہیں سن کر بزرگ لوگ ہنس بھی پڑتے ہیں اور انہیں بے حیائی بھی قرار دے دیتے ہیں۔ مثلاً :۔

شاید بڑھیں گی اور بھی میری مصیبتیں پھر بحث میرے گھر میں ہے املی کی چاٹ پر

تنویر سپرا کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے اُس کی شخصیت کا ایک اور بہت ہی پیارا رُخ سامنے آتا ہے۔ نظریاتی سطح پر وہ لاکھ کٹھور اور INFLEXIBLE سہی لیکن خالص اِنسانی سطح پر وہ ایک محبت کرنے والا اور بھلے مانس شخص ہے۔ محبت کے معاملے میں تو وہ بالکل اللہ تعالٰی کی گائے نظر آتا ہے۔ اور دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچنے جیسی باتوں کو گناہ کبیرہ خیال کرتا ہے۔ اُس کی سادہ لوحی دیکھئے کہ اُس کی محبوبہ اُسے اپنانا چاہتی ہے

لیکن وہ اُسے اِس حماقت سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتاہے اور اُسے اپنے گھرلے جاکر سمجھاتا ہے کہ :۔

چھت کی کڑیاں دیکھ لے، دیوار و در کو دیکھ لے — مجھ کو اپنانے سے پہلے میرے گھر کو دیکھ لے
چند لمحوں کا نہیں، یہ عمر بھر کا ہے سفر — راہ کی پڑتال کرے راہبر کو دیکھ لے

یہ تو خیر لطیفہ تھا، حقیقت یہ ہے کہ تنویر سپرا انسانی رشتوں پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے اُسے اپنے ماں باپ بہنوں بھائیوں اور ہمسایوں سے بھرپور محبت ملی ہے جس کا اظہار وہ بڑے والہانہ اور بے ساختہ انداز میں کرتاہے۔ بہن کی پاکیزہ محبت پر تنویر کے یہ دو شعر کتنے ایمان افروز اور ڈھارس بندھانے والے ہیں :۔

غموں کی دھوپ میں برگد کی چھاؤں جیسی ہے — مرے لیے مری ہمشیر ماؤں جیسی ہے!
بھٹکتا ہوں تو مجھے راستہ دکھاتی ہے — وہ ہم سفر ہے مگر رہنماؤں جیسی ہے

اور نفسا نفسی کے اس دور میں اِس شعر کی محبت بھری فضا کتنی روح پرور ہے :۔

ہو جیسے ایک ہی کنبے کی ساری آبادی — فضا ہمارے محلے کی گاؤں جیسی ہے

تنویر سپرا نے اپنی تصنیف اپنے دو مرحوم دوستوں سبطِ علی صبا اور تنویر جیلانی کی نذر کی ہے جو اُس کے گداز دل ہونے کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ سپرا کا ایک اور جذبہ بھی بے حد قابلِ تعریف اور لائقِ تقلید ہے اور وہ ہے ESPRIT-DE-CORPS اس کا مطلب ہے جماعتی وقار کا احساس۔ مزدوروں اور محنت کشوں کا تو خیر وہ نمائندہ ہے ہی لیکن سپرا شاعروں اور فن کاروں کی جماعت کا رکن بھی ہے اور اُس نے اپنی اِس جماعت کے وقار کے تحفظ کو بھی موضوعِ فن بنایا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس نے یہ اشعار پورے خلوص اور ESPRIT - DE - CORPS کے تحت کہے ہیں۔

تُو نے بھی تنویر اپنا قد بڑھانے کے لیے — جوش صاحب پر لگے بہتان کی تائید کی

اندھوں کو دے رہا ہے سحر کی بشارتیں! — تنویر! صادقین بھی کیا خوب چیز ہے
گنجے بنا رہا ہے وہ گنجوں کے نقش بھی — تنویر! صادقین بڑا بدتمیز ہے
ان کو چھو کر ہر ندی مسموم ہوا — شہبازوں کے جسم بڑے زہریلے ہیں

تنویر سپرا پیشے کے لحاظ سے ایک مزدور ہے لیکن فطرتاً وہ ایک شاعر ہے اس تضاد نے جو ایک اور بڑے تضاد کی پیداوار ہے اُسے ہمیشہ اُس معتدل جذباتی کیفیت اور آسودگی سے محروم رکھاہے جو تخلیق کار کا حق بھی ہے اور اس کی ضرورت بھی لیکن حالات کی ناسازگاری کے باوجود جو کچھ اُس نے تخلیق کیاہے وہ ایک فنی معجزے سے کم نہیں۔ اُس نے اُردو غزل کے نئے اُفق تلاش کئے ہیں اور آئل مین، آئل کین، مل مالک، ریگ مال، شفٹ جیسے الفاظ کو نئی معنویت عطا کر کے غزل کے لفظی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس نے اپنی شاعری میں ابلاغ کی اہمیت کو قدم قدم پر پیشِ نظر رکھاہے اور بڑے بڑے رسک لے کر اپنی شاعری کو عوامی دلچسپی کی چیز بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تصنیف "ارسطو سے ایلیٹ تک" کے مقدمہ میں گوئٹے کا ایک مختصر سا اقتباس پیش کیا ہے۔ مَیں اِس اقتباس کو تنویر سپرا کے دفاع میں نہیں بلکہ اُن لوگوں کے لیے دعوتِ فکر کے طور پر پیش کر کے اپنا مضمون ختم کرتا ہوں جو شاعروں کو کنوئیں کے ڈڈو ہی بنے رہنے پر مُصر ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے۔

"وہ زیادتیاں جو مَیں نے یہاں کی ہیں رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گی مگر اُن سے فائدہ یہ ہوگا کہ زیادہ آزاد فارم اور زیادہ متنوع موضوعات ظہور میں آئیں گے اور زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں رہے گا جس کو شاعری کے لیے مناسب نہ سمجھا جائے۔"

شفیع ضامن

لوحِ محفوظ (مجموعۂ کلام)

تصنیف :۔ جوہر نظامی

صفحات :۔ ۱۲۸ قیمت: ۱۲ روپے

ناشر :۔ مکتبہ تخلیق ۔ لاہور

حضرت جوہر نظامی ایک کہنہ مشق، قادر الکلام، سدا بہار، جوہر دار ممتاز معروف ادبی شخصیت ہیں۔ اُن کا شعری مرتبہ کسی تقریظ و تعارف کا محتاج نہیں ہے، اُن کا پہلا شعری مجموعہ "لوحِ محفوظ" کچھ عرصہ پہلے زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آجکل سخن فہموں کے زیرِ مطالعہ ہے۔ اگرچہ ظاہری تزئین و آرائش اس میں نام کو بھی نہیں ہے لیکن باطنی محاسن سے لبریز ہے۔ جس طرح جوہر نظامی کی طبیعت میں سادگی اور پُر شکوہ درویشی پائی جاتی ہے وہی عکس اس کتاب کے اندر با بر ملتا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام برسوں کی تخلیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے فنی معیار اور تخلیقی کردار کا صحیح اندازہ اس کے عمیق مطالعہ ہی سے ممکن ہے۔ اختصار کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ جوہر نظامی "آشفتگی رنج فراواں" کے شاعر ہیں، جنہوں نے غزل، نظم، قطعات، رباعیات اور گیتوں میں غمِ ذات اور غمِ کائنات کو جاوداں کیا ہے۔ اُن کے یہاں جدید شعراء کی طرح استعاروں، محاوروں اور ترکیبوں کی نئی لغت کا استعمال تو نہیں ملتا لیکن ان کے لہجہ میں ایک تازگی اور شگفتگی ضرور ملتی ہے۔ غزل کے قدیم مزاج اور اُس کی جملہ سابق روایات کو جوہر نظامی نے جوں کا توں رکھتے ہوئے بھی اظہارِ سخن میں بوسیدگی اور کہنگی کا کہیں احساس نہیں ہونے دیا۔ اُن کا شعر عصری حدت اور خارجی صداقت سے خالی نہیں لیکن ابہام و ایہام سے بھی بے نیاز ہے۔ ان میں میر تقی میر کا سہلِ ممتنع ہے مگر اظہارِ غم میں میر کی نزاکت احساس کی بجائے شوکتِ احساس کی فراوانی ہے۔ اُردو غزل کو غم نیزی کا جو سلیقہ میر سے ملا اور جو فانی بدایونی کے ہاتھوں جنازہ بردوشی پر تمام ہوا، اس کا پرتو جوہر نظامی کے کلام میں بہت کم ملتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا تذکرہ بالکل انفرادی انداز میں کرتے ہیں۔ وہ نہ تو میر کی پیروی میں اپنے سرہانے آہستہ بولنے کی التجا کرتے ہیں اور نہ ہی ان کا دل مفلس کا چراغ ہے۔ فانی کی طرح وہ زندگی سے موت کی بھیک بھی نہیں مانگتے بلکہ ان کے کلام میں ایک قسم کی عشرتِ غم کی نوید ملتی ہے۔ اُن کے یہاں احساسِ غم روشن گر ضمیر ہے۔ اُن کی زندگی غم سے عبارت ہے، لیکن حادثات کا سلسلۂ دراز اُن سے زندہ رہنے کا عزم چھین نہیں سکا۔ وہ احساسِ غم خریدنے کے لئے مسرتوں کے خزانوں کے منہ کھول دیتے ہیں لیکن اُن کی یہ مسرتیں ذاتی ہیں اور غم پرائے ہیں۔ اُن کے یہاں دورِ خزاں میں جشنِ بہاراں برپا نہ کرنے والا فریب خوردہ آب و ہوا ہے۔ جوہر نظامی اسی رویّے کے سبب قدیم روایات غزل کے اسیر ہونے کے باوجود نئے طرزِ احساس کے قریب نظر آتے ہیں۔ اُن کے اسی طرزِ احساس نے انہیں قنوطیت سے کافی حد تک بچایا ہے اور وہ چمکتی ہوئی صبح کی آمد کے یقین پر شبِ سیاہ میں بدگمان نہیں ہوتے ؎

آشنا شبِ سیاہ سے میں بدگمان نہیں — آئے گی اک چمکتی ہوئی صبح آئے گی

یہی وجہ ہے کہ تند ہوائیں، سرکش موجیں اور ہیبت ناک تھپیڑے جو طوفانی موسموں کی علامتیں ہیں اُن کی زندگی کی ناؤ کو ڈبو نہیں سکیں۔ قدرت کا یہ حساس قلم جو خود کو لوحِ محفوظ قرار دیتا ہے، مشغلۂ عشق کو بیکار کہتے ہوئے عشق کی بازی ہار جانے کے باوجود مسلکِ عشق ترک نہیں کرتا۔ اسی عشق نے اُن کے سفرِ زندگی کو پُر ہول نہیں بننے دیا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ عشق کے رموز بیان کرنے میں جوہر نظامی نے اقبال کی تقلید نہیں کی اور نہ ہی اپنے قلندرانہ رویّے کو اقبال کی قلندری سے ہم آغوش ہونے دیا ہے۔ یہ ان کا کمالِ فن ہے۔ جوہر نظامی کے کلام میں احساسِ تفاخر کا عنصر بھی کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔ مثلاً ؎

گنجِ گراں مایہ ہے لوگو میری متاعِ علم و ہنر — اپنا اپنا دامن بھر لیں کہہ دو سب کنگالوں کو

اُن کی شاعری میں قناعت پسندی کا رجحان بھی پایا جاتا ہے وہ مصروفِ تگ و تاز رہتے ہوئے بھی برق رفتار دنیا کو یوں مخاطب کرتے ہیں ؎

تلاشِ دانہ تجھے دام میں نہ الجھا دے　　خدا کے واسطے اتنا غمِ معاش نہ کر

تلاش دانہ سے وہ روکتے نہیں لیکن اس تلاشِ دانہ کو کسبِ حلال سے مشروط کرتے ہیں تاکہ ہوس ناک آلودگیاں جو سرمایہ دارانہ نظام میں جڑ پکڑ چکی ہیں، آکاش بیل کی طرح لپیٹ میں نہ لے سکیں۔

جوہر نظامی نے قریب قریب ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، چنانچہ لوحِ محفوظ میں جہاں غزلیات، رباعیات، قطعات ملتے ہیں دوہارے گیت اور آزاد نظم کے نمونے بھی نظر آتے ہیں، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اظہار کے لئے کوئی بھی شعری سانچہ اختیار کرنے کو جائز فعل سمجھتے ہیں یہ اُن کا دیگر روایت پسندانہ شعرا کے برعکس ترقی پسندانہ رویہ ہے۔

صفدر سلیم سیال

مجلہ "سب رس" کا یادِ رفتگاں نمبر

مدیر :۔ خواجہ حمید الدین شاہد

پتہ :۔　ایوانِ اردو۔ ڈی /۲۳۴۱، بلاک بی، تیمور یہ (نارتھ ناظم آباد۔ کراچی)

اردو ادب کے نامور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نہ صرف تحقیق کا گراں قدر سرمایہ چھوڑ گئے ہیں بلکہ کئی زندہ کتابیں بھی تصنیف کر گئے ہیں، ان زندہ کتابوں میں خواجہ حمید الدین شاہد کا نام سرِ فہرست ہے۔ شاہد صاحب ڈاکٹر زور مرحوم کے صحیح معنی میں جانشین ہیں ـــ ایسے جانشین نہیں جو کسی بڑے ادیب یا عالم کی شاگردی، قرابت اور ہم وطنی کی بدولت سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے اُس خلا کو پُر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو ڈاکٹر زور چھوڑ گئے تھے۔ زور صاحب کا اصولِ زندگی یہ تھا کہ جب تک کام کرنے کی سکت ہو کام نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ شاہد صاحب نے اس سنہری اصول کو اپنا کر پاکستان میں اپنے عظیم اُستاد کی روایت کو زندہ کر دکھایا ہے اور اپنی زندگی تحقیق و تدقیق اور اُردو ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ اگرچہ اُن کا بدن اُن کے بلند عزائم کا ساتھ اکثر چھوڑ دیتا ہے، لیکن وہ ہمت نہیں ہارتے اور خرابیٔ صحت کے باوصف ان تھک محنت کرتے ہیں۔ اُن کی شبانہ روز کوششوں کا ٹھوس نتیجہ ایوانِ اُردو اور اس کے ترجمان "سب رس" کی شکل میں موجود ہے۔

اس دور میں جبکہ ڈائجسٹوں کے ٹڈی دل نے ہمارے اَدب اور صحافت پر یورش کر رکھی ہے، "سب رس" جیسے علمی اور ادبی رسالے کا اجرا جہاد سے کم نہیں ہے۔ یہ رسالہ دو سال سے باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا ہے اور مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ یوں تو اس کا ہر شمارہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے، لیکن بعض خاص شمارے حوالے کی کتابیں ہیں۔ ان میں زور نمبر، اقبال نمبر حصۂ اوّل و دوم اور یادِ رفتگاں نمبر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یادِ رفتگاں نمبر "سب رس" کا تازہ ترین خصوصی شمارہ ہے۔ اس میں اُردو کے آٹھ ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے بارے میں بیش قیمت اور نادر مضامین شامل ہیں۔ یہ سب ادیب اُس قافلے سے تعلق رکھتے ہیں جو ۱۹۷۸ء کے دوران بساطِ ہستی سے کوچ کر گیا لیکن جس کے نقشِ پا نئی نسل کے ادیبوں کو صحیح راستے کی نشاندہی کرتے رہیں گے۔ ابراہیم جلیس، ابنِ انشاء، صوفی تبسم، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، آلِ رضا، سیدہ عروج مظہر اور مولانا ماہر القادری ایسی شخصیات ہیں جن کا ذکر کیے بغیر عصرِ حاضر کے اُردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ سب مستقبل میں تحقیق و تنقید کا مسلسل موضوع بنی رہیں گی اور مورخین کو ان کے بارے میں مستند مواد کی تلاش و جستجو رہے گی۔ "سب رس" کا زیرِ نظر شمارہ یقیناً ایک ایسی دستاویز ہے جس میں محققوں اور طلبہ کے لیے ان شخصیات کے بارے میں انتہائی گراں قدر مواد یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسے مرتب کر کے شاہد صاحب نے اُردو ادب کی جو خدمت

انجام دی ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔

یادِ رفتگاں نمبر میں خاص طور پر اُن ادیبوں سے متعلق مضامین بیحد قدر و قیمت رکھتے ہیں جن کی ادبی زندگی کا تشکیلی دور حیدر آباد میں گزرا تھا۔ ابراہیم جلیس اور سعیدہ عروج مظہر حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہیں پروان چڑھے اور وہیں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ زیرِ نظر شمارے میں ان کے ذہنی نشو و نما کے بارے میں جو معلومات شامل ہیں وہ کہیں اور نہیں ملیں گی۔ یہ نادر مواد دونوں ادیبوں کو سمجھنے اور پرکھنے میں بے انتہا اہمیت رکھتا ہے۔

مولانا ماہر القادری کی شاعرانہ صلاحیتیں بھی حیدر آباد ہی میں پروان چڑھی تھیں۔ خود انہی کے الفاظ میں ! "اگر مجھے حیدر آباد دکن میں رہنے کا موقعہ نہ ملتا تو میری شعر و ادب کی پوری قوتیں ابھرنے نہ پاتیں۔" "سب رس" کے یادِ رفتگاں نمبر میں اُس ماہر کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں جس کے تخلیقی جوہر کو حیدر آباد کا ادب پرور ماحول جلا بخش رہا تھا اور یہ جھلکیاں بھی کہیں اور نظر نہیں آئیں گی۔

لیکن شاہد صاحب نے انہی آٹھ شخصیات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ یادِ رفتگاں کا دوسرا حصّہ نکالنے کی تیاریاں بھی شروع کر دی ہیں۔ جو مولانا مودودی، علامہ عبدالعزیز میمن، وزیر الحسن عابدی، پروفیسر عزیز احمد، مولانا رازق الخیری وغیرہ جیسے اربابِ علم اور محققین کیلئے وقف ہوگا۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی　　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

سید ذاکر اعجاز

جزیرہ (مجموعۂ کلام)

مصنف :- شبنم رومانی

قیمت :- ۲۵ ر روپے

ناشر :- مکتبۂ اربابِ قلم - ۲۰۷ گھڑیالی بلڈنگ - صدر، کراچی

شبنم رومانی کے مزاج میں ایک عارفانہ ٹھہراؤ کا اندازہ صرف اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ گذشتہ ۳۵ برس سے شعر کہہ رہا ہے اور اس نے اپنی عمر کی نصف صدی بھی پوری کر لی ہے مگر اس کا پہلا شعری مجموعہ اَب جا کر شائع ہوا ہے۔ شبنم فن میں "کاتا اور لے دوڑی" کا قائل نہیں ہے اور "جزیرہ" کا ایک ایک لفظ، ایک ایک مصرع گواہ ہے کہ شاعر نے بے پناہ ریاض، اور تخلیقِ فن کے معاملے میں بے حد ذمہ داری اور دیانت داری سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبنم کی ہر نظم اور ہر غزل ہمیں تکمیل کا احساس دلاتی ہے۔ یقیناً فن میں تکمیل کا وجود ہوتا ہی نہیں۔ فن کائنات کی طرح مسلسل بدلنے اور بڑھنے کا نام ہے اور خود شبنم نے بھی "جزیرہ" کے آخری شعر میں کہا ہے کہ :

کون دعویٰ کرے تکمیلِ ہنر کا شبنم　　　کہ یہ عالم ہی ابھی عالمِ تشکیل میں ہے

چنانچہ تکمیل کے احساس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ جو کسی فن پارے کے مطالعے کے بعد ایک آسودگی اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے، وہ شبنم کی نظموں اور غزلوں کی بنیادی خوبی ہے۔ نہ کہیں اظہار و ابلاغ میں تشنگی محسوس ہوتی ہے اور نہ زبان و بیان میں۔

ایسی نک سک سے درست شاعری کے معاملے میں یہ خدشہ عموماً درپیش ہوتا ہے کہ شاعر ہیئت کے حسن و آرائش کی طرف زیادہ متوجہ ہونے کے سبب سے موضوع کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہ کر پایا ہوگا، مگر شبنم کی شاعری نے اس خدشے کی نفی کر ڈالی ہے چنانچہ یہ وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو اندر باہر سے خوبصورت ہیں۔ ان کا خارجی حسن ان کے داخلی حسن کی آسودگی بخش تفہیم کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے، اور ان کے داخلی حسن پر خارج کا لباس

جچتا اور پھبتا ہے۔ یوں شبنم کی شاعری نے موضوع اور ہیئت کی تفریق کا جھگڑا ہی ختم کر دیا ہے کیونکہ اس شاعری میں سب کچھ یک جان ہے اور یہ شاعری ایک تخلیقی اکائی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

شبنم رومانی ان شاعروں میں سے نہیں ہے جن کا عمر بھر خود اپنے آپ سے ہی تعارف مکمل نہیں ہوتا۔ شاعری یقیناً شاعر کی ذات کا اظہار ہوتی ہے مگر شاعر جب تک اپنی ذات کی مکمل شناسائی حاصل نہیں کر پاتا، وہ ابلاغ کے معاملے میں اپاہج رہتا ہے اور باقی عمر اس اپاہج پن کے جواز ڈھونڈنے میں گزار دیتا ہے۔ شبنم نے سب سے پہلے اپنی ذات کو جانچا، پرکھا اور برتا ہے۔ پھر جب اسے اپنی پہچان کی روشنی میسّر آئی ہے، اس نے اس روشنی میں زندگی کو جانچا، پرکھا اور برتا ہے اور یوں سنیاس اختیار کرنے کی بجائے زندگی اور اس کے مسائل اور ان مسائل کے مضمرات اور اسرار تک رسائی حاصل کی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اجالے کا، زندگی کے اثبات کا، انسان کے ارتقا کا شاعر ہے۔ قدم قدم پر نفی سے بھی اس کا سابقہ پڑا ہے بلکہ ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں، اس کا سرِ عنوان ہی نفی ہے چنانچہ شبنم کو بھی، کہ وہ ایک بیدار ذہن اور حساس ضمیر کا شاعر ہے، بار بار نفی کی قوتوں سے نمٹنا پڑا ہے مگر اس نے ہتھیار کبھی نہیں ڈالے۔ نفی کے عناصر سے نبرد آزمائی اس کے مزاج میں ہے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی نفی سے لڑتا ہے تو دراصل اثبات کے لیے لڑ رہا ہوتا ہے اور میں نے شبنم کو اس لیے اثبات کا شاعر کہا ہے۔ اثبات کی شاعری یقین و اعتماد کے بغیر مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ یقین انسان کی قوتِ خیر و عدل کی آخری فتح پر، اور اعتماد اس حقیقت پر کہ انسان کا مقدر آخر کار امن، محبت اور روحانی و مادی آسودگی ہے۔ شبنم کے ہاں یقین و اعتماد کی اس توانائی کی افراط ہے۔

ادب کے بعض عناصر کو یہ ضد ہوتی ہے کہ کسی شاعر کے فن کو کسی قسم کے سیاسی اور سماجی تناظر میں رکھ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ اگر ہم سیاسی اور سماجی تناظر کو نظر انداز کر کے کسی شاعر کا جائزہ لیں گے تو یوں سمجھیے کہ ہم اس زندگی اور اس ماحول کو نظر انداز کر رہے ہیں جو شاعر کے کلام میں منعکس ہوا ہے اور اسے منعکس ہونا چاہیے کہ شاعر کے دل و دماغ اگر حساس نہیں ہوں گے تو وہ شعر ہی کیوں کہے گا۔ سیاست اور معاشرت کا تناظر کسی فن پارے کو داغ دار نہیں بناتا بلکہ اسے روشن کرتا ہے اور شبنم رومانی کے کلام کو سیاسی اور سماجی تناظر میں رکھ کر دیکھے بغیر ہم اس کے حسن کلام سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے کہ یہ وہ شاعر ہے جس نے اپنی ذات کے آئینے میں پوری زندگی کا مشاہدہ کیا ہے اور اس زندگی میں سے سیاست اور معاشرت کو خارج کر دیا جائے تو تہذیب اور کلچر کے چہرے بھی اجنبی اجنبی سے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ قارئینِ ادب سے اتنا ظالمانہ مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔ شبنم نے شاید ایسے ہی عناصر کو پیشِ نظر رکھ کر یہ شعر کہا تھا:-

میں جہاں گردشِ حالات سے تھا گرمِ جہاد رقص کرتے ہوئے کچھ لوگ اِدھر سے گزرے

شبنم رومانی مزاجاً ایک نرم گفتار شاعر ہے مگر اس نرمی میں متاثر کرنے کی جو قوت ہے، وہ اسے کتنے ہی بلند بانگ شاعروں سے اونچا کر دیتی ہے۔ یہ نرمی صرف ان شاعروں کے ہاں ہوتی ہے جو اپنی ذات کے علاوہ گرد و پیش کے حالات و مسائل کو پوری طرح سمجھ چکے ہوتے ہیں۔ ایسے شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے، اور کس زاویے سے کہنا ہے اور کس لہجے میں کہنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی نئی معنویتوں کا ادراک رکھنے کے باوجود، اظہار کے نئے پیرایوں پر حاوی ہونے کے باوجود اور جدیدیت کا ایک بلیغ ترجمان ہونے کے باوجود شبنم رومانی اظہار کے معاملے میں اتنا سادہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس نے سامنے کی کوئی بات کر دی ہے۔ مگر ذرا سا رک جائیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادگی کتنی تہہ دار ہے اور اس سنجیدگی میں کتنی شوخی ہے۔ پھر الفاظ کے اندرونی و بیرونی آہنگ کا رمز شناس ہونے کی وجہ سے شبنم شعر کی صورت میں دل و دماغ پر جو وار کرتا ہے وہ بڑا کٹیلا ہوتا ہے اور یہی کٹیلا پن اس کے لہجے کی پہچان اور انفرادیت ہے۔

شبنم نے اپنے کلام میں استعاروں سے بہت کام لیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے اس نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "جزیرہ" بھی استعارۃً ہی منتخب کیا ہے۔ بظاہر "جزیرہ" تنہائی کی علامت ہے اور عصرِ حاضر میں فرد کی تنہائی بھی شبنم کا ایک خاص موضوع ہے۔ مثلاً:-

اَب کے بارش ایک ساتھی دے گئی ‏ ‏ ایک چہرہ بن گیا دیوار پر

مگر "جزیرہ" دراصل سمندر کا استعارہ ہے کہ شبنم کے ہاں زندگی کے موضوعات کا پھیلاؤ سمندر جیسا ہے۔ وہ جزیرے میں محبوس نہیں ہے بلکہ اپنے شعور و وجدان کے اس جزیرے پر کھڑا وہ افق تا افق پھیلے ہوئے زندگی اور اس کے اسرار کے بحرِ زخار کا مشاہدہ کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے ۔

گماں قوی ہے کچھ اتنا، یقین ہو جیسے ‏ ‏ یہ آسمان بھی اپنی زمین ہو جیسے

احمد ندیم قاسمی

صدبرگ (مجموعۂ کلام)

تصنیف :۔ پروین شاکر

قیمت :۔ ۲۶ روپے

ناشر :۔ غالب پبلشر۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۶۔ لاہور

"خوشبو" کو عزیز رکھنے والے جب "صد برگ" کا مطالعہ کریں گے تو ان پر انکشاف ہوگا کہ پروین اپنے گوناگوں تجربات و مشاہدات اور ان سے متعین ہونے والے ادبی رویوں سے اپنی ہی تربیت میں مصروف ہے، اور یاد رہے کہ صرف وہی شاعر اپنی تربیت پر قدرت رکھتا ہے جسے اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد ہو اور جسے علم ہو کہ شاعری میں قناعت پسندی انجماد کی دلیل ہے۔ دراصل ہمارے ہاں شاعری سے صحیح معنوں میں فیض یاب یا لذت یاب ہونے والوں کی تعداد افسوسناک حد تک کم ہے اور شاعر کے نو بہ نو تجربات سے پھوٹنے والی روشنی اس سے بھی کم تعداد کے سخن شناسوں کی دکھائی دے پاتی ہے۔ اسی لیے تو ہمارے ہاں ایسے حضرات بھی موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ "نقشِ فریادی" کے بعد فیض نے اور "ماورا" کے بعد راشد نے اور "برگ نے" کے بعد ناصر نے شاعری کہاں کی ہے، بس تکلف کیا ہے کیونکہ انہیں جو کچھ کہنا تھا وہ تو اپنے اوّلین مجموعوں میں کہہ چکے تھے۔ پروین کے ساتھ بھی یہ حادثہ متوقع ہے کہ "خوشبو" کی بے پناہ مقبولیت اس حادثے کا سبب بنے گی۔ شاعری پڑھنے والوں کی بہت قلیل تعداد یہ دیکھ پائے گی کہ "خوشبو" کی شاعرہ نے "صد برگ" میں زندگی کو زیادہ وسعت زیادہ گہرائی اور زیادہ متنوع زاویوں سے دیکھا ہے۔ "صد برگ" میں اس کے تجربات کا افق تا افق ایک پینورامہ سجا ہوا ہے اور یہ تجربات جب اس کے مزاج میں کھپ کر نظموں اور غزلوں میں اظہار پاتے ہیں تو اردو شاعری کی روایتی دلکشی میں، اس کی لفظیات میں، اس کی علامتوں میں، اس کے استعاروں میں، اس کی تشبیہوں میں، اس کی تصویروں میں، اس کے رنگوں اور خوشبوؤں میں، ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے اور یہ تبدیلی مثبت ہے کیونکہ یہ، آگے بڑھنے اور پھیلنے اور آئندہ ایک روایت بن جانے والی تبدیلی ہے۔ جن قارئین کا ذہن اس غیر مبہم تبدیلی کا ساتھ نہیں دے پائے گا وہ "خوشبو" ہی میں اٹک کر رہ جائیں گے اور "صد برگ" میں "خوشبو" کے پھیلاؤ اور رچاؤ کی تحسین سے قاصر رہیں گے۔ لیکن جو قارئین جانتے ہیں کہ سچا شاعر ہمیشہ آگے بڑھتا اور بدلتا اور اپنی تربیت کرتا ہے، وہ محسوس کریں گے کہ پروین کی بھرپور شعری صلاحیتوں کا ارتقاء ہو رہا ہے اور اس ارتقاء میں زقند کی کیفیت نہیں ہے بلکہ یہ ارتقاء نہایت متوازن اور تدریجی ہے۔ فن کے ہفت افلاک تک پہنچانے والے زینے کا یہ دوسرا قدم ہے اور خود پروین نے "صد برگ" کے ابتدائیہ میں کہا ہے کہ اسے ایک ہزار راتوں تک کہانی کہنی ہے "اور ابھی تو صرف ۲۷ راتیں ہی گزری ہیں۔"

کسی صاحب نے پروین پر بزعم خویش اعتراض کیا تھا کہ پروین تو صرف آشوب کی شاعرہ ہے۔ جب ہماری پوری زندگی ایک آشوب ہے تو صاف صاف کہیے کہ پروین زندگی کی شاعرہ ہے۔ اس نے ایک ایسے معاشرے میں آنکھ کھولی ہے جس نے قدریں توڑی بہت ہیں مگر قائم بہت ہی کم کی ہیں،

اب اگر پروین اس معاشی و معاشرتی شکست و ریخت اور تہذیبی و فکری ٹوٹ پھوٹ کو زبان دیتی ہے تو تسلیم کیجئے کہ وہ صدق و صداقت کی شاعرہ ہے۔ اگر اس کا کوئی گناہ ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کی اکثریت کی طرح مسائل پر سوچنے سے دست کش نہیں ہوئی۔ وہ جانتی ہے کہ مشرق کے سیاسی زوال کا واحد سبب ہی یہ ہے کہ اہل مشرق نے سوچنا ترک کر دیا تھا۔ وہ سٹیٹس کو کے اس قدر عادی ہو گئے کہ جمود کو اپنا جزوِ ایمان بنا لیا اور یوں مسلسل آگے بڑھتی ہوئی زندگی سے بہت پیچھے رہ گئے۔ پروین نے ہمارے دلوں اور دماغوں پر منڈھے ہوئے اس خول کو توڑ کر شعر کے قاری کو سوچنا سکھایا ہے اور یوں زوال کے زنداں کی ایک فصیل توڑ دی ہے۔ وہ شاعری برائے شاعری بھی کر سکتی تھی کیونکہ ہمارے ہاں اس کا عام رواج ہے اور پھر پروین کو حسنِ اظہار پر جو عبور حاصل ہے اس کی وجہ سے اس کے لیے نثر کو موزوں کرتے جانا قطعی مشکل نہیں تھا، مگر پروین کی فنکارانہ دیانت اور حمیّت نے اس اندھی روایت پرستی کے خلاف بغاوت کی ہے، البتہ اس بغاوت میں گھن گرج نہیں ہے، حسن اور محبت اور خیر کی نرمی اور گداز ہے۔ یوں وہ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے نکلی ہے اور ادب کے دیانت دار قارئین شاہد ہیں کہ ہیرا کٹ رہا ہے اور یار لوگ اس کو آشوب کہتے ہیں۔ وہ منفی معنی میں اسے آشوب کی شاعرہ کہتے ہیں۔ میں اسے مثبت معنوں میں آشوب کی شاعرہ کہوں گا۔ آشوب کی شاعرہ یعنی زندگی کی شاعرہ، زندگی کی گہما گہمیوں اور سچائیوں کی شاعرہ، خوشبو کی شاعرہ کہ خوشبو بھی تو نکہتوں کے آشوب ہی کا دوسرا نام ہے۔

"صد برگ" میں پروین ابتدائی جذباتی اور احساساتی دھند سے نکل آئی ہے۔ اگر اس کے فن کے پیکر پر کہیں کہیں اس دھند کے جالے سے اٹکے رہ گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر سہ رہ کرنے والی شاعرہ نہیں ہے۔ وہ ماضی کو حال کے ساتھ مربوط کر کے مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے۔۔۔ "صد برگ" میں اس کی شاعرانہ بصیرت نے زندگی کو دریچوں کی بجائے کھلے میدانوں میں جا کر دیکھا، پرکھا اور برتا ہے اور اپنے اظہار کے ذرائع کے متعدد امکانات آزمائے ہیں۔ یوں اس نے رسمی اور تقلیدی اور فیشن ایبل شاعری کے برعکس صرف سچی شاعری کی ہے۔۔۔ ایسی شاعری جو صرف اس کی اپنی ہے۔ یوں آج پروین پاکستان کی جوان اور جدید شاعری کا بھرم ہے۔ میں جب اس کی شاعری پڑھتا ہوں تو اقبال کا یہ مصرع میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

احمد ندیم قاسمی

داغ داغ دل (مجموعۂ کلام)

مصنف :- دل نواز دل

قیمت :-

ناشر :- التحریر۔ اردو بازار۔ لاہور

دلنواز دل کی شاعری کئی دوسرے پہلوؤں کے علاوہ اس لحاظ سے بھی منفرد شاعری ہے کہ معاصر اربابِ شعر میں سے ہم کسی بھی ایسی نامور شاعر کا نام نہیں لے سکتے جس کے اسلوب اظہار کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ دل کے کلام میں کہیں کہیں اس اسلوب کی جھلک ملتی ہے۔ دل اپنے انداز کا، اپنے آہنگ کا، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اپنی مرضی کا شاعر ہے۔ وہ روایت سے رشتہ برقرار رکھنے کا بھی حامی ہے اور جدت کو مکمل طور پر مسترد کر دینے کا بھی مخالف ہے چنانچہ نہ وہ مکمل طور پر روایتی ہے اور نہ مکمل طور پر جدت پسند ہے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ روایت کی نفی نہیں کرتا تو اس کی غزلوں میں روایت کو بھرپور طور پر منعکس ہونا چاہیئے مگر ایسا نہیں ہوا۔ بعض روایتی علامتیں اور استعارے اس نے یقیناً اپنائے

ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ نئی علامتیں اور نئے استعارے بھی تخلیق کرتا گیا ہے۔ آج ہمیں یہ علامتیں اور یہ استعارے عجیب معلوم ہوتے ہیں مگر ہر جدت پہلی نظر میں عجیب ہی لگتی ہے۔ ناصر کاظمی نے جب کہا تھا کہ "ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی" تو غزل میں "کھڑکی" کے استعمال پر بڑی لے دے ہوئی تھی کہ کھڑکی کی "کھ" اور "ڑ" غزل کی ڈکشن سے ہضم نہیں ہوگی۔ مگر پھر ایک کھڑکی کیا، سینکڑوں ایسے الفاظ آزادانہ استعمال ہونے لگے جو غزل کی ڈکشن سے خارج سمجھے جاتے تھے یا جو کچھ عرصے تک تو استعمال ہوتے رہے مگر بعد میں امام بخش ناسخ نے انہیں خارج کر دیا تھا — دلنواز دل نے بھی نئی علامتوں، نئے استعاروں بلکہ نئی لفظیات کے سلسلے میں بڑی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل وہ غزل نہیں ہے جو ہمیں ماضی میں ملتی ہے یا جو آج کل کہی جا رہی ہے۔ یہ سراسر مختلف غزل ہے اور پھر اس میں سوچ اور فکر کا عنصر اتنا غالب ہے کہ بیشتر اشعار کی تفہیم میں دقت کا احساس ہوتا ہے مگر شاید یہ نئے استعاروں، نئی علامتوں اور نئی لفظیات سے ہماری اجنبیت کا نتیجہ ہے۔ بصورت دیگر دل کے ہاں مفہوم کی کوئی الجھن نہیں ہے۔ اسے غور سے پڑھیئے، رک کر پڑھیئے اور شاعر کے قریب جا کر پڑھیئے تو سب کچھ واضح ہو جائے گا، جیسا کہ خود دلنواز نے کہا ہے،

دل سے وہ اس قدر قریب ہوا — کھل گئیں سب حقیقتیں میری

دلنواز دل تک اگر غزل کے عام قاری کی رسائی براہ راست انداز کی نہیں ہے تو اس کا ایک سبب تو ابھی ابھی عرض کیا جا چکا ہے۔ دیگر اسباب یہ ہیں کہ دل کے مشاہدات، تجربات اور واردات کا تنوع، دوسرے شعراء کے مقابلے میں حیرت انگیز حد تک وسیع ہے۔ اگرچہ حسن و عشق کے معاملات نے اس کے کتنے ہی شعروں کو منور کر رکھا ہے اور ہر سچے اور معقول شاعر کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے، مگر دل صرف حسن و عشق کا شاعر نہیں ہے۔ اس کے موضوع زندگی کے دیگر مظاہر کی طرح لاتعداد اور بے شمار ہیں۔ وہ عشق بھی کرتا ہے تو اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہنا پسند نہیں کرتا۔ ایک ستارے کو ٹوٹتے دیکھتا ہے تو کتنے ہی اسرار حیات اس پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اور پھر وہ ان سب کیفیات کو اپنی غزل میں سمیٹ لاتا ہے مگر اردو غزل کے لیے اس کی فکر کی بعض پرتیں بالکل نئی ہیں اس لیے ہم ان کے عادی نہیں ہیں اور دل کی غزلیں پڑھتے ہوئے چونک چونک پڑتے ہیں مگر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، دل ایک افق تا افق وسیع پینوراما کا شاعر ہے اس لیئے اسے سمجھنے اور اس کے فن سے لذت یاب ہونے کیلئے قاری کو اپنے دل و دماغ میں اتنی ہی وسعت پیدا کرنا ہو گی، ورنہ وہ دل کے اس طرح کے نشتر شعروں پر سے بھی طائرانہ گزر جائے گا۔

نیلی برفانی جھیلوں کے شیشے جیسے سینے — پربت حیرت میں ڈوبے ہیں، سورج بکھرا جائے

کتنی بار مرا ہوں میں اور کتنی بار جیا ہوں — موت و حیات کے اس چکر میں گنتی بھول گیا ہوں

یہ ذرا مختلف قسم کی غزلیہ شاعری ہے مگر ماننا پڑے گا کہ مفاہیم سے چھلکتی ہوئی شاعری ہے اور ساتھ ہی دل آویز شاعری بھی ہے۔

دل کے اشعار کا ذکر چلا ہے تو اس کے چند اور اشعار بھی سن لیجیئے اور اس کے منفرد رنگِ سخن کے بارے میں میری معروضات کی تصدیق کرتے جایئے۔ ملاحظہ کیجیئے :-

اپنے تن کو آگ لگا کر شمع نے کی ہے شہد شن — شب کے دامن میں چنگاری ڈال گیا پروانہ بھی

ساگروں کے ساحلوں پر تشنہ لب ذرے اڑیں — آگ ہو دل میں تو پھر بجھتی نہیں ہے تشنگی

چلتے چلتے تھک گیا ہے آدمی — بلبلا بہتی ندی پر بار ہے

بیتے لمحے آنسو بن کر آنکھوں سے جب چھلکیں — کتنے روشن ہو جاتے ہیں دل کے داغ پرانے

میں کیسی ظلمتوں میں گھرا ہوں، مرے خدا! — سر پہ چمک رہا ہے مرے، آفتاب بھی

زخم بھرنے ہی لگے تھے جب جنوں کے، آگہی سے   کاٹ کر سَر رکھ لیے ہاتھوں پہ اپنے، پاگلوں نے

اگر ہے یہ دُنیا سرائے ، تو پھر   یقیں کر کہ منزل بھی ہو گی کہیں

جلا رہا ہوں جہاں کو جب اپنے ہاتھوں سے   مری مدد کو، فرشتے فلک سے کیوں اتریں

جن کی نظر میں شام کے دُکھ، غم سحر کے تھے   ان کو دلوں کے درد میں چھپ کر خُدا ملے

بنا لیے ہیں زمانے نے پتھروں کے خُدا   مگر اَب آپ ہی ان سے نظر ملا نہ سکے

مَیں نے "داغ داغ دل" میں سے چند ایسے اشعار منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں جو ہمارے قارئین غزل کے ذہنوں کے زیادہ قریب ہیں، ورنہ دلنواز دل کے ہاں تو مضامین سے لدے پھندے اشعار کا ایک چمن کا چمن کھلا ہوا ہے اور پھر یہ اشعار نئی علامتوں اور استعاروں کے علاوہ نئے الفاظ سے بھی آراستہ ہیں اور الفاظ کے مروجہ معانی سے مختلف اور نئے مفہوم دیتے ہوئے پرانے الفاظ سے بھی۔ دلؔ کی شاعری کے حوالے سے یہ لفظیات کا معاملہ بطورِ خاص توجہ کا مستحق ہے کہ دل کو کوئی نیا لفظ تراشتے اور استعمال کرتے ہوئے کوئی جھجک، کوئی INHIBITION محسوس نہیں ہوتی۔ کہیں پنجابی لہجہ آگیا ہے تو اسے آنے دیا ہے۔ کہیں عام بول چال کا لفظ سوجھا ہے، تو اسے بعینہٖ غزل میں سجا دیا ہے۔ یہ جرأت بہت کم اربابِ شعر کو ودیعت ہوتی ہے جبکہ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو آنے والوں کے لیے اظہار و بیان کی کتنی ہی سہولتوں کا بندوبست کر جاتے ہیں۔ دلنواز دل کا شمار انہی جری، خوش فکر اور مستقبل گیر شعراء میں ہونا چاہیے۔

احمد ندیم قاسمی